

رجسٹرڈ ایل نمبر ۷۵۷۹
ٹیلی فون نمبر : ۶۳۷۵۶۳

مجلّہ فنون لاہور

سالنامہ ۱۹۹۱ء

مدیر

احمد ندیم قاسمی

تزئین کار

موجد

شمارہ : ۳۱
جنوری، فروری، مارچ ۱۹۹۱ء

سالانہ چندہ
بذریعہ رجسٹری : -/۲۰۰ روپے
غیر ممالک : -/۲۵۰ روپے
غیر ممالک (بذریعہ ہوائی ڈاک) : -/۵۰۰ روپے

قیمت سالنامہ : -/۱۰۰ روپے

مقامِ اشاعت : ۴-۹ ملک چیمبرز، لوئر مال لاہور (پاکستان)

مندرجات

طویل نظمیں

رباعیات

فن کار اور ان کا فن

غزلیں

گوشۂ گلزار

منظومات:

کہانیاں

افسانے

نظمیں

رپورتاژ

انشائیہ

مزاح

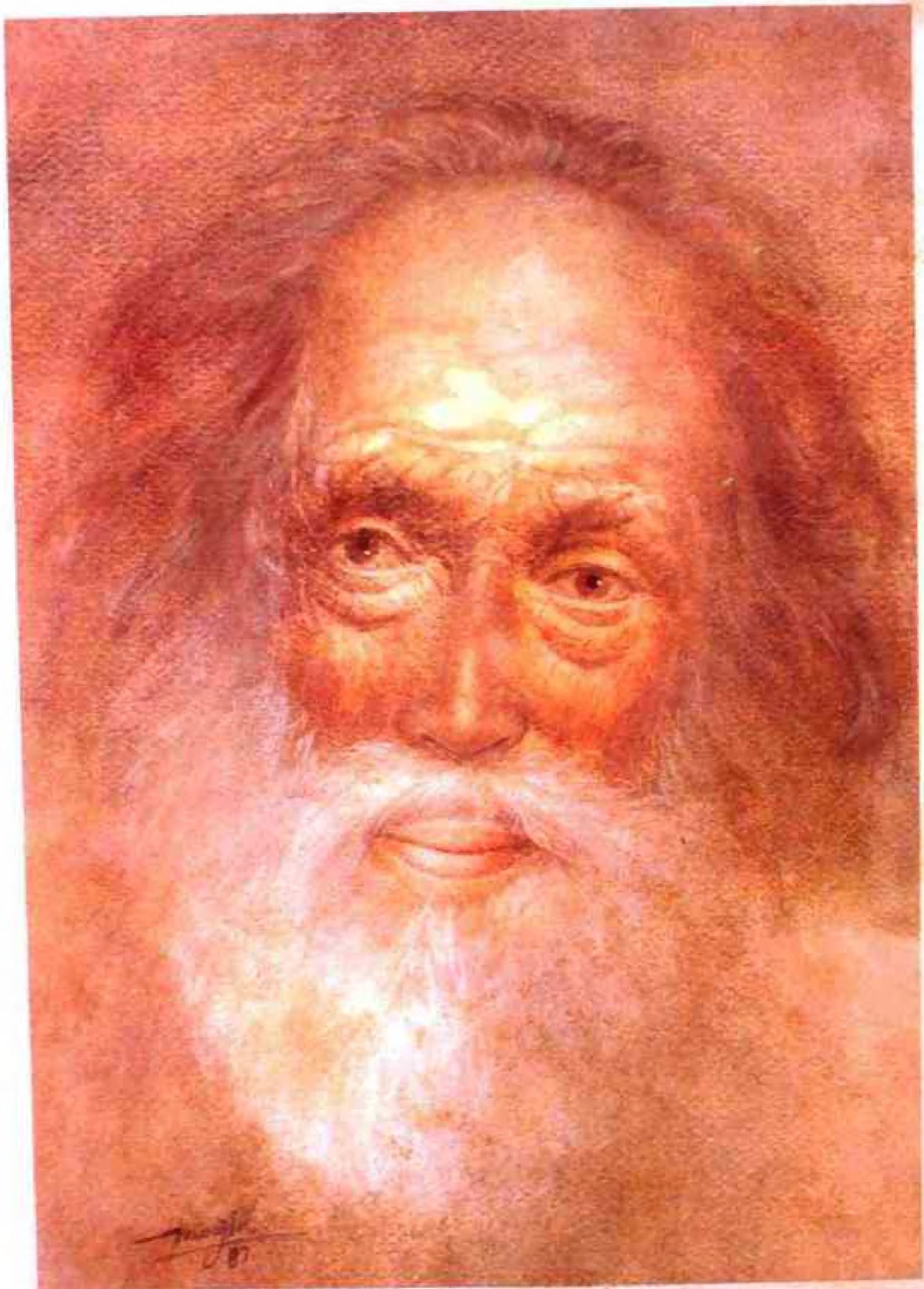
سفرنامہ

غزلیں

اختلافات

تبصرے

سرورق : زوار حسین



DERVESH BABA, PAINTING BY MOOJID



PAINTING BY MOOJID

حرفِ اوّل

ندیم

تنوع اور رنگا رنگی، ہما ہمی اور گہما گہمی، کرید اور جستجو کے الفاظ اپنے مروجہ معانی کے علاوہ ایک علامتی مفہوم بھی رکھتے ہیں۔ یہ زندگی کی بھی مختلف صفات ہیں۔ ادب زندگی کے ظاہر و باطن کی وسعتوں اور گہرائیوں اور ان میں پوشیدہ امکانات کا آئینہ دار ہوتا ہے، چنانچہ ادب میں بھی زندگی کی طرح تنوع اور رنگا رنگی، ہما ہمی اور گہما گہمی، کرید اور جستجو کی کیفیتیں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ جس ادب میں یہ سب کچھ نہیں ہوتا ـــ یعنی چہل پہل نہیں ہوتی، اور آگے بڑھنے کا اضطراب نہیں ہوتا وہ جمود و خمود کا شکار ہو جاتا ہے۔

پاکستانی ادب ـــ اردو کے علاوہ پاکستان کی ہر زبان کا ادب ـــ زندگی کا ترجمان ہے اس لئے متنوع ہے، بوقلموں ہے، مضطرب ہے۔ زندگی اور انسان اور کائنات کے مسائل اور ان کے باہمی روابط و اثرات اور عمل اور ردِ عمل کے تنوع کی وجہ سے، پاکستانی اہلِ قلم کے نظریاتِ حیات اور نظریاتِ فن بھی مختلف اور متنوع ہیں، البتہ ان کی منزل ایک ہے ـــ اور وہ ہے حسن و خیر، توازن و تناسب، صداقت و عدالت کی اقدار کی بازیافت، اور ادب میں، اور ادب کے توسط سے زندگی میں ان کا احیا، اور عصرِ رواں کے حوالے سے ان میں مثبت ترامیم۔

نظریاتِ حیات و فن کے تنوع کی وجہ سے بیان و اظہار کے اسالیب بھی متنوع ہیں۔ کوئی حقیقت نگار ہے۔ کوئی علامت نگار ہے۔ کوئی تجرید نگار ہے۔ کوئی ماورائیت کو عین حیات قرار دیتا ہے۔ کسی کے نزدیک تصوف، زندگی کرنے کا واحد معقول رویہ ہے۔ بعض کو حقائقِ حیات سے مسلسل خوفزدگی ایک قسم کی آسودگی فراہم کرتی ہے۔ وہ اہلِ قلم بھی جو ادب اور زندگی کے ایک ساتھ تصور کو کفر قرار دیتے ہیں، زندگی ہی کا ایک رخ پیش کر رہے ہوتے ہیں اور نہیں جانتے کہ وہ اسی زندگی کے خول میں بند ہیں جس سے وہ بزعم خود فرار حاصل کر رہے ہیں۔

ادب اور مذہبی اعتقاد کے درمیان بھی رشتوں اور رابطوں کی ایک دنیا آباد ہے۔ شاید ہی کسی ملک، کسی قوم یا کسی زبان کا ادب مذہب کے اثرات سے خالی ہو۔ مذہب سے ادب کی اثر پذیری کسی منفی رجحان کی نشان دہی نہیں کرتی، بلکہ عالمی ادب کے جتنے بھی معلوم شہپارے ہیں، وہ مذہب سے نہ صرف اثر پذیر ہیں بلکہ ان کے اکثر مصنفین کو تو انسپیریشن ہی مذہب سے حاصل ہوا ہے۔ اور یاد رہے کہ مذہب کا تعصب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مذاہب تو توہمات و تعصبات کو ختم کرنے اور انسان کو انسانیت یعنی محبت اور ہمدردی اور سچائی اور انصاف کی تعلیم دینے کے لئے آتے رہے ہیں۔ ہمارے ہاں اس کی سب سے روشن مثال اقبالؒ ہیں۔

سالنامہ "فنون" میں قارئینِ کرام شعر و ادب کے اس تنوع کو صورت پذیر ہوتا دیکھیں گے۔ اسی ضمن اردو غزل کے بارے میں بطورِ خاص یہ عرض کرنا ہے کہ وہ اصحاب جو جدید غزل کا مطالعہ، یا جدید اور جدید تر شاعروں کی غزل کا مطالعہ بغور اور بالاستیعاب نہیں کرتے وہ یہ شکایت کرتے پائے جاتے ہیں کہ جدید غزل میں یکسانیت در آئی ہے۔ مجھے ان سے التماس کرنا ہے کہ غزل یقیناً بمقابلہ نظم، افراط سے لکھی جا رہی ہے مگر دو رنہ جایئے، اسی سالنامے میں شامل دو حصوں پر پھیلی ہوئی ایک ایک غزل کا مطالعہ قطعی غیر جانب دارانہ اور غیر متعصبانہ انداز سے کیجئے، آپ کو ان غزلوں کے موضوعات میں حیرت انگیز تنوع نظر آئے گا اور جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، تنوع ہی زندگی ہے۔

اہلِ قلم کی اتنی بڑی تعداد کی ایک ہی شمارے میں شمولیت۔۔۔ پھر ایک مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ بعض معاونین کو تقدیم و تاخیر کے سلسلے میں شکایت ہوتی ہے اور وہ بُرا مان جاتے ہیں۔ ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ "جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے"۔ خوش ذوق لوگ تخلیق پارے کو دیکھتے ہیں، تقدیم و تاخیر کی پیمائش نہیں کرتے۔ مثلاً اگر آپ کی خوبصورت غزل بہت بعد میں چھپی ہے تو اس کی خوبصورتی پر کوئی آنچ نہیں آسکتی۔ اور اگر کسی کی کمزور غزل بہت پہلے چھپ گئی ہے تو اس کی کمزوری پر کوئی پردہ نہیں پڑ سکتا۔ میں بحیثیت مدیر اپنی شعری اور نثری تخلیقات کو اسی مقصد سے سب سے آخر میں درج کرتا ہوں کہ کسی کو تقدیم و تاخیر کی شکایت نہ ہو مگر شکایات کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ میری استدعا ہے کہ اس ضمن میں اہلِ قلم برادری کو وسیع القلبی سے کام لینا چاہیے کہ اگر کوئی فن کار وسیع القلب نہیں تو اس کی فن کاری ہی مشکوک ہو جاتی ہے۔

وفیات

"فنون" کی اشاعت ۳۰ سے لے کر اب تک کتنے بہت سے اہلِ قلم اور اہلِ فن ہم سے جدا ہو چکے ہیں۔ منیر احمد شیخ، بشیر منذر، حکیم محمد نبی خاں، جمال سویدا، رام ریاض اور عائشہ جمال کے علاوہ کوثر چاند پوری، کرار نوری، سراج منیر، مولوی محمد سعید، منور سلطانہ، محمد اسماعیل بھٹی، سید رسول رسا، تبسم رضوانی، نسیم لیہ، نذیر ہاشمی اور زکی انور بھی رخصت ہو گئے۔ ساتھ ہی ناصر جہاں، طفیل نیازی، لطیفی، شیخ اقبال اور نزلا کے سے فن کاروں کا بھی انتقال ہو گیا۔ ادھر بھارت سے شانتا رام اور ڈاکٹر برج پریمی کی وفات کی خبریں بھی آئیں۔ اور یہ سطریں لکھی جا رہی تھیں جب ایران کی ایک دلربا شخصیت آقائے صادق گنجی کے قتل کی روح فرسا اطلاع بھی آگئی۔

منیر احمد شیخ منیر ایک دلربا شخصیت اور ایک خوبصورت ادیب تھے۔ انھوں نے افسانے لکھے، تنقید لکھی، موسیقی پر مضامین لکھے، مگر جو کچھ بھی لکھا، اس میں ان کی شخصیت کی دلربائی اور خوبصورتی کا بھرپور انعکاس ہوتا تھا۔ پھر ایک پاکستانی ڈپلومیٹ کی حیثیت میں بھی انھوں نے جرمنی اور بھارت میں جو شہرت حاصل کی، اس میں ان کے مزاج کے حسن اور ان کی وسیع القلبی اور وسیع المشربی کا بڑا حصہ تھا۔ ان کی اچانک رخصت سے ادب کے علاوہ دوستی اور دوستداری کے معیاروں کو بھی بڑی ٹھیس پہنچی ہے۔

بشیر منذر پنجابی اور اردو کے بڑے شاعر کے کمالات کا ابھی کما حقہٗ تجزیہ و اعتراف نہیں ہوا تھا کیونکہ انھیں نام و نمود سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بہت کم احباب کو معلوم ہے کہ قدرت نے اس شخص کو بچوں اور بڑوں کے لئے اعلیٰ درجے کی شاعری کا جو ملکہ ودیعت کیا تھا، وہ ان کے متعدد مجموعوں میں محفوظ ہے۔ صرف ان مجموعوں کی تحسین کا کام باقی ہے۔

جمال سویدا مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے خاندان کے اس بے مثال رکن نے اپنے قیام لاہور کے دوران طبابت و حکمت کے علاوہ اردو غزل میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے۔ دولت و ثروت کی فراوانی کے باوجود انھیں انسانیت سے پیار رہا۔ وہ ایسی محبوب شخصیت تھے کہ جو شخص ان سے ایک بار بھی ملتا تھا، ان سے قربت اور دوستی کا دعویٰ کرنے میں حق بجانب تھا۔

جدید اردو غزل **رام ریاض** کی موت کی صورت میں ایک گوہرِ گراں مایہ گنوا بیٹھی ہے۔ **عائشہ جمال** نے ایک ناول اور چند افسانے لکھے مگر اپنی چھوٹی بہنوں (خدیجہ اور ہاجرہ) کی طرح اردو فکشن کا باب ان کے ذکر کے بغیر مکمل نہ ہو سکے گا۔ **سراج منیر** ایک ایسے نوجوان تھے جن کا اس عمر میں علم و فن کا تبحر حیران کن تھا اور ان سے اہلِ علم و ادب کو بے شمار توقعات وابستہ تھیں۔ **منور سلطانہ**، **کرار نوری**، **نسیم لیہ**، **تبسم رضوانی** اور **زکی انور** عمدہ شعرا تھے۔ **نذیر ہاشمی** اور **محمد اسماعیل بھٹی** اپنے اپنے علمی و فنی میدان میں منفرد تھے۔ **سید رسول رسا**، **کوثر چاند پوری** اور **مولوی محمد سعید** نے بھی علم و فن کی دنیا میں اپنا سکہ منوایا۔ **ناصر جہاں**، **لطیفی**، **شیخ اقبال** اور **نزلا** کو آسانی سے فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔ **طفیل نیازی** لوک موسیقی کے مانے ہوئے استاد تھے۔ **شانتا رام** فلمی صنعت کے غیر فانی شخصیت تھے اور **ڈاکٹر برج پریمی** نے منٹو کی شخصیت و فن کے تجزیے میں قابلِ تعریف تخصیص حاصل کی تھی۔ **آقائے صادق گنجی** خود بھی ادیب تھے اور اہلِ ادب کے ساتھ ان کے مراسم گہرے اور مخلصانہ تھے۔ "فنون" ان سب کے پس ماندگان کے دکھ میں شریک ہے۔

امجد اسلام امجد

حمد

اے ربِ ملائک وجن و بشر، میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں
خدمت میں تری شرمندہ نظر، میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں

جو تیری ثنا کے لائق ہو، اِک لفظ بھی ایسا پاس نہیں
کیا تابِ سخن، کیا عرضِ ہنر، میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں

قطرے کی نگاہِ حیراں پر، دریا کی حقیقت کیسے کھلے
میں جانتا ہوں یہ بات، مگر میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں

مرے چار طرف ہیں دروازے، مرا سرمایہ بس اندازے
مجھ بے خبرے کو بخش خبر، میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں

یہ ارض و سما کی پہنائی، یہ میری ادھوری بینائی!
مرے عکسِ نمو، مرے آئینہ گر، میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں

مرے کان تری آہٹ سے بجیں، مرے سانس تری خوشبو میں پلیں
مری آنکھیں اپنے خواب سے بھر، میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں

اے نورِ ازل، اے حسنِ ابد، سبحان اللہ، سبحان اللہ
یہ شمس و قمر مری گردِ سفر، میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں

حافظ لدھیانوی

حمد باری تعالیٰ

ہوا چلی تو ہری شاخ میں لچک آئی
نظر فروز ہوئی گلستاں کی رعنائی

سمندروں کی تہوں میں کئی خزانے ہیں
کسی بھی آنکھ نے دیکھی نہیں ہے گہرائی

امید و بیم کی منزل ہی اصلِ ایماں ہے
یہی ہے معرفتِ حق، کمالِ دانائی

کوئی نہ کر سکا اندازہ اس کی وسعت کا
کوئی نہ جان سکا دشتِ جاں کی پہنائی

ترے ہی ذکر سے پائی ہے رُوح نے تسکیں
ملی غموں سے تری یاد سے شکیبائی

کمالِ حسن کا مظہر ہے تیری ہر تخلیق
تری ثنا نے سجائی ہے میری تنہائی

ہر ایک منظرِ شاداب ہے ترا شہکار
ہر ایک شے میں ہے تیری ہی نقش آرائی

مجھے بنایا ہے اقلیمِ شعر کا سلطان
عطا ہوئی ہے مجھے فکر و فن کی دارائی

ہر ایک شعر سے آتی ہے حمد کی خوشبو
ہر ایک لفظ میں ہے دلکشی و زیبائی

اسی پہ رکھی ہے حافظ نے حمد کی بنیاد
رہی ہے پیشِ نظر تیری شانِ یکتائی

عبداللہ جاوید

حمد

وقت کی
جست کی
ابتداء ـــ صدائے کن
انتہا صدائے صور
ارتعاشِ موجِ نور

وقت بھی ہوا ـــ ہوا
نور بھی ہوا ـــ ہوا
سانس بھی ہوا ـــ ہوا

ابتدا و نہ انتہا
اِک فقط صدائے ہُو!!

سیّد مشکور حسین یاد

حمد

کیا آدمی کو اور مرادِ خرد ملے
لیتے ہی تیرا نام حیاتِ اَبد ملے

کیسے ترے شمارِ نوازش کی حد ملے
جب دیکھو بے شمار ملے جو عدد ملے

اُس عبد کے نیاز میں کیا کیا نہ ہونگے ناز
تہذیبِ قلب کو جسے ذوقِ صمد ملے

تیرے کرم سے نور میں تحلیل ہوگئے
جتنے بھی ہم کو خاکِ جسد سے حسد ملے

انعام ہائے جاں کو ہمیں نے بھُلا دیا
تیری جناب سے تو بصد شد و مد ملے

ہے یہ بھی اختیارِ بشر پر نزولِ خیر
کیسے ملے، کہاں سے ملے، کیوں مدد ملے؟

ہم پھر بھی کھینچ پائے نہ کوئی خطِ جمال
ہر چند آگہی سے ہمیں خال و خد ملے

مشکور کوئی جرأتِ عرفان و آگہی
کچھ تو یقینِ دیدہ و دل کی سند ملے

مقبول عامر

حمد

اُس ایک ذات سے اپنا عجیب ناتا ہے
میں جب بھٹکتا ہوں وہ راستہ دکھاتا ہے

سوادِ شب میں بھی روشن ہے راستہ میرا
وہ چاند بن کے مرے ساتھ ساتھ جاتا ہے

یہ سوز و ساز، یہ تابندگی، یہ ہالۂ جاں
کوئی چراغ کی صورت مجھے جلاتا ہے

میں کھو بھی جاؤں اگر زندگی کے میلے میں
وہ مہربان مجھے پھر سے ڈھونڈ لاتا ہے

عجب نہیں کہ کسی روز ہم پہ کھُل جائے
وہ راستہ جو دلوں سے گزر کے جاتا ہے

دل نواز دلؔ

حمد

حمد تیری، ثنا بھی تیری
نے بھی تیری، نوا بھی تیری

درد تیرا، دوا بھی تیری
ورد تیرا، دُعا بھی تیری

چشمِ بینا میں نُور تیرا
اور دل کی صدا بھی تیری

دو جہاں کے سکوت میں تُو
کُن فکاں کی ندا بھی تیری

مٹی تیری ہے، پانی تیرا
آگ تیری، ہوا بھی تیری

ساری رونق ہے تیرے دم سے
یہ فضا، یہ خلا بھی تیری

دلؔ کا جو کچھ ہے سب ہے تیرا
اور اس کی اَنا بھی تیری

نعت

کیسے بیاں کروں مرا سب کچھ سفر میں ہے
مکّے کے ساتھ ساتھ مدینہ نظر میں ہے
ٹھنڈک انھی کے نام سے قلب و جگر میں ہے
راحت اُنھی کی یاد سے ہر چشمِ تر میں ہے
تو ہی بتا اے چشمِ جہاں گرد! دہر میں
کیا اُن سا آستاں کہیں بحر و بر میں ہے!
کملی میں جلوہ زن جو تجلّی تھی فقر کی
کیا ایسا نور انجم و شمس و قمر میں ہے!
جب سے بسی ہے آکے مرے دل میں اُن کی یاد
دُنیا جہاں کی جو بھی ہے نعمت وہ گھر میں ہے
سرکار! ناخداؤں نے چپّو گرا دیے
خستہ ہیں بادبان، سفینہ بھنور میں ہے
اُن سے ہے فیض میرے سخن کا وگرنہ دلؔ
وہ کون سی ہے بات جو میرے ہنر میں ہے

(علامہ) طالب جوہری

قصیدہ

(شاعرِ مشرق کی نذر)

اپنے ماضی میں سفر اور کس قدر ہمت شکن
رتجگوں کے گیت بن جاتے ہیں آنکھوں کی جلن

کھل اٹھے پھر حافظے کے کُنج میں یادوں کے پھول
"مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغِ چمن"

ایک اک بچھڑا ہوا لمحہ ہے مجھ سے ہم کلام
"تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن"

عالمِ تمثیل میں ٹھہرا ہوا اک کارواں
عہدِ رفتہ کی برات اور خلوتوں کی انجمن

نیش زن ہیں حافظے پر کتنے آنچل، کتنے روپ
گود پھیلائے ہوئے ہیں کتنی گلیاں، کتنے بن

وہ بھی کیا دن تھے جب اس کے جسم کی محراب میں
ہر ادا اک لفظ تھی، ہر کیفیت تھی اک سخن

اک تحیر کی علامت، نیم وا ہونٹوں کی قوس
اک تذبذب کی حکایت، چونک اٹھنا دفعتہً

لرزشِ اقرار یعنی اس کی آنکھوں میں کنول
جنبشِ انکار یعنی اس کے ماتھے پر شکن

لفظ قاصر ہیں سماجی بندشوں کے خوف سے
استعارے کے لیے مجبور ہیں نطق و دہن

رسمِ الفت لمس کی فردوس، ریشم کا جسد
حدِ قربت سانس کی عشرت، چنبیلی کا بدن

پھر وہ اک لمحہ کہ جب یہ چوٹ بھی سہنی پڑی
جس کو ہم اپنا سمجھتے تھے، پرایا تھا وہ دھن

اس بھری دنیا میں تنہائی کا احساسِ شدید
اب بھی راتوں کو بڑھا دیتا ہے سینے کی جلن

کوہساروں کی شبِ مہتاب اور تنہا چکور
جنگلوں کی دوپہر اور راہ گم کردہ ہرن

لیکن اس شہرِ شغالاں میں غزل گوئی کا شوق
عصرِ حاضر کی تضاد آمیز کیفیت کا فن

جیسے اک سنسان صحرا میں نہتا قافلہ
اور تعاقب میں اجل بر دوش بھوکے راہزن

ایک سوداگر سفر کی زحمتوں سے بے نیاز
بیچنے نکلا ہو افریقی کنیزوں کے بدن

ایک شہزادہ محل کی سازشوں سے بے خبر
روز و شب سجتا ہو اپنی خلوتوں کی انجمن

بن چکی ہے زندگی کی ہر رسد جنسِ گراں
راہبر کے تند لہجے سے نمایاں ہے تھکن

یہ نہارِ سنگِ فطرت، کینہ جو، نامہرباں
جو دلِ محنت فروشاں پر رہا ناوک فگن

یہ شبِ قاتل کہ ہر اک سانس لیتا آدمی
قبر میں سویا ہوا ہے اوڑھ کر دن کا کفن

یہ خیانت کار تاجر زندگی، جو بے جھجک
بیچ دیتی ہے شریفوں کے بدن کے پیرہن

اے سوارِ رفرفِ ختمِ نبوت المدد
پھر نفس ہے وقت کی فتنہ گری سے شعلہ زن

میں کہ ہوں ابلاغ کی قوت سے بھی کچھ بہرہ یاب
دشتِ نجد ہے مرے فنِ خطابت کا وطن

سوچتا یہ ہوں کہ تیرا تذکرہ کیوں کر کروں
اے کلیمِ طورِ مدحت! اے مسیحِ چرخِ فن!

اے کہ جس کی کفش دوزی افتخارِ بوتراب
اے کہ جس کی ناز برداری مزاجِ ذوالمنن

اے نبیؐ! اک امتی کے لب کو دے اذنِ کلام
اے رسولؐ! اِس ناطقہ کو بخش یارائے سخن

تو امامِ یوسفِ جاں ہے تو میری شاعری
مصر کے بازار کی غربت زدہ اک پیر زن

ڈال دے الفاظ کے کشکول میں معنی کی بھیک
بخش دے روحِ تخیل کو فصاحت کا بدن

حرفِ کُن کا سامعِ اول، اساسِ پنجتن
نورِ مطلق، انجمن بردوش شمعِ انجمن

جس کے پروانے جلے اور جل کے زندہ ہو گئے
آج تک جن کی بقا ہے ہر فنا پر خندہ زن

وہ صریرِ کلکِ قدرت، وہ سفیرِ امرِ رب
وہ ضمیرِ جسم و جوہر، وہ امیرِ فکر و فن

وہ کہ جس کی فکر کے جوہر نُفس اندر نَفس
وہ کہ جس کے نطق کے موتی دہن اندر دہن

کیا شجر، کیا جانور، کیا شمس، کیا نجم و قمر
کیا سمندر، کیا چمن، کیا دشت، کیا کوہ و دمن

کیا سمائے بے نہایت، کیا فضائے بیکراں
کیا زمانِ بے بضاعت، کیا جہانِ پُر فتن

کیا کتابِ اَنفس و آفاق، کیا اوراقِ عقل
کیا قلم، کیا لوح، کیا عرشِ علا کا بانکپن

سب ہیں اُس کی بارگاہِ قُدس کے دریوزہ گر
جو عطا اندر عطا یعنی زمن اندر زمن

انور مسعود

یا جامع المتفرقین!

خدمتِ اقدس میں اذنِ باریابی چاہیے
میرے دو ہمدم بھی میرے ساتھ ہیں
چشمِ گریاں اور قلبِ ناصبور
اے فروغِ بزمِ اعصار و دہور
الاماں! یہ فتنہ ہائے افتراق!
یہ ہوائے زہر آگینِ نفاق!

پارہ پارہ ہو رہی ہے وحدتِ اُمّت حضورؐ
کوئی اسم ایسا نہیں دنیا میں آقا جسقدر
اتحاد آموز ہے اسمِ گرامی آپ کا
ہونٹ بھی آپس میں مل جاتے ہیں جس کے وِرد سے
کیوں نہیں آپس میں ملتے نام لیوا آپ کے؟

عبداللہ جاوید

نعت

یہ طلسمِ بندگی
تیرگی!
کیا زماں، کیا مکاں
کیا عیاں، کیا نہاں
کیا وجود، کیا شہود
صد حجاب درمیاں

اے نبیؐ! پیارے نبیؐ
روشنی!
مجھ کو بھی
تھوڑی روشنی!!

جمیل ملک

نعت

ترے بغیر مکمل نہ تھی ردائے سحر
ترا وجود ہوا باعثِ ضیائے سحر
ازل سے تابہ ابد ہے ترے ظہور کی ضو
تو ابتدائے سحر ہے، تو انتہائے سحر
بڑا مہیب اندھیرا تھا ساری دنیا پر
تجھے رسول بنایا گیا برائے سحر
ترے ہی حسن کا پرتو سحر کے چہرے پر
تجھی کمال سراپا ہے ماورائے سحر
نصیب اسی کو وصالِ محمدؐ و معبود
جو حق پرست ہوا رمز آشنائے سحر
عجب نہیں کہ مری بھی دعا سنی جائے
مری دعا میں ہے شامل تری دعائے سحر
دریچے کھولتی جاتی ہے سب حضوری کے
اذانِ صبح میں ڈوبی ہوئی نوائے سحر
تمام رات درود و سلام میں گزری
سحر نے ہم کو عطا کی تری ردائے سحر
جہاں حضورؐ کی خوشبو قدم قدم پہ ملے
اڑا کے لے گئی ہم کو وہاں ہوائے سحر
یہ حمد و نعت کا سرسبز نقطۂ آغاز
اسی لیے تو میں کرتا رہا ثنائے سحر
جمیلؔ اسم محمدؐ سے ہی اُجالا ہے
یہ مسکرائے تو ہر سمت مسکرائے سحر

سیّد مُنیر

منتہائے خیر و شر
(نعتیہ)

وہ بھی کیا زمانہ تھا
جس میں
دیکھنے والے
آپ
اپنی آنکھوں سے
چہرۂ پیمبرؐ کو
روز دیکھتے ہوں گے

صبح کے اُجالے میں
شام کے دھندلکے میں
سب
زباں کے متوالے
سب
سماعتوں والے
روز
سُن رہے ہوں گے
کلمۂ شہادت کو
دعوۂ رسالت کو
اور ـــــ ،
اُس زمانے میں
دید اور سماعت سے
ذہن بھر گئے ہوں گے
نور اور عبادت سے
گھر سنور گئے ہوں گے

وہ بھی کیا زمانہ تھا ـــ !
جس میں
سارے اہلِ صدق
ظالموں کے سینوں میں
نور ڈھالتے ہوں گے
دل ،
زبان ،
ہاتھوں سے ،
علم کی امانت کو
خود سنبھالتے ہوں گے !

خود سنبھالتے ہوں گے
منبعٔ امامت کی بیکراں ہدایت کو
مخزنِ عبادت کی آخری سخاوت کو

وہ بھی کیا زمانہ تھا
جب
حیاتِ تیرہ کی
اَن گنت وریدوں میں
خون کے اندھیروں میں
نوُر بہہ رہا ہوگا
جب
خدا، زمینوں سے
ہستیٔ مقدس کی
دل کُشا وساطت سے
بات کہہ رہا ہوگا،
ظلمتوں کے صحرا پر چاند رُک گیا ہوگا
نوُر کی ستائش میں وقت جُھک گیا ہوگا

سوچتا ہوں
سوچوں کی آگ سے گزرتا ہوں
حیرتوں نے گھیرا ہے،
نور کے تلاطم میں
ظُلم کا اندھیرا ہے،
بار، بار دل میرا اِک سوال کرتا ہے
کیسے
صبحِ رحمت کے
دل نشیں ٹھکانے میں
نوُر اور ہدایت کے
آخری زمانے میں
شام ڈھل رہی ہوگی
بے شمار سینوں میں
زہر کے دفینوں میں
آگ جل رہی ہوگی
بُغض کے جہنّم میں
جاں پگھل رہی ہوگی

کیسے
اُس زمانے میں
ایسے لوگ بھی ہوں گے
اہلِ کینہ، اہلِ کذب
بندگانِ جور و ظلم
جو
ہر اک ہدایت کی
راہ روکتے ہوں گے
ظلم اور تعدّی کا
کھیل کھیلتے ہوں گے

کچھ سمجھ نہیں آتا،

بار، بار
دل میرا
اِک سوال کرتا ہے
چہرۂ پیمبرؐ کو وہ بھی دیکھتے ہوں گے؟

شبنم رومانی

○

نعت

نام اُن کا حرزِ جاں نہیں ہے
سمجھو کہ کہیں اماں نہیں ہے

سرکارؐ کا جو نہیں ہے قاری
قرآن کا نکتہ داں نہیں ہے

ہشیار، کہ بابِ مصطفےٰ میں
گنجائشِ این و آں نہیں ہے

ہے سایۂ دامنِ رسالتؐ
سَر پر مرے آسماں نہیں ہے

"چُپ" میں بھی ہے کیفِ نعت گوئی
مدحت کی کوئی زباں نہیں ہے

دھڑکن ہے "محمدؐ و محمدؐ"
اک لمحہ بھی رائیگاں نہیں ہے

دل پر تو ہے داغِ عشقِ سرکارؐ
ماتھے پہ اگر نشاں نہیں ہے!

○

نعت

وہی کریں گے حفاظت ہماری جانوں کی
خبر زمین پہ لائے جو آسمانوں کی

ہُوا طلوع حقیقت کا آخری سُورج
جب اُڑ رہی تھی بہت دُھول داستانوں کی

انہوں نے سارے زمانے کے دُکھ سمیٹ لیے
وہ جن کے پاس تھیں سب کُنجیاں خزانوں کی

اذاں میں یہ کھنک سی جو اُن کے نام کی ہے
یہی صدائے جرس بھی ہے کاروانوں کی

خُدا گواہ، مرے ناخُدا کا فیض ہے یہ
ہَوا بندھی ہے ابھی تک جو بادبانوں کی

خورشید رضوی

نعت

لمسِ احمدؐ کے لئے چشم برہ، زنگ آلود
خانۂ دل پہ پڑا قُفلِ گُنہ، زنگ آلود

یا نبیؐ! ایک نظر جو اِسے محکم کر دے
جوشِشِ پیکار میں ہے میری زرہ زنگ آلود

نیم شب گریۂ خلوت مجھے ارزانی ہو
دورِ حاضر کی ہوا سے ہے مژہ زنگ آلود

ہو وہ فیضان کہ سینہ مرا ہلکا ہو جائے
بارِ آہن ہے کوئی دل کی جگہ زنگ آلود

تیرے پیغام کی جدت نہیں کُھلتی اِس پر
کتنی صدیوں سے ہے اُمّت کی نگہ زنگ آلود

رزم گاہِ حق و باطل میں اُترنا کیسا
ہو اگر خنجر و شمشیر سیہ زنگ آلود

ڈال دے پرتوِ انوارِ نبوت دینا
کھول دے فکر کی ایک ایک گرہ زنگ آلود

خُسرُوا! یہ تری جمہور نوازی کا ہے فیض
کہ زمانے میں ہے تاجِ سرِ شہ زنگ آلود

تیرا در وا ہے سدا تیرے غلاموں کے لیے
اہلِ دنیا کا ہر اک بابِ پنہ زنگ آلود

منتظر پھر الفِ صیقلِ انگشت کا ہے
سال ہا سال سے آئینۂ مہ زنگ آلود

ہو عطا ایک تسلسل اِسے تابانی کا
گاہ تاباں دلِ خورشید ہے گہ زنگ آلود

پرتو روہیلہ

نعت

اس میں شامل ہے رضا و کرمِ عزّ و جل — ہر عبادت سے درود آپ کا، اعلیٰ افضل
آپ کے اسم سے ہیں لفظِ جہاں میں معنی — ورنہ یہ دفترِ صد رنگ و نمو بس مہمل
شفقتیں آپ کی ہر گوشۂ گیتی پہ محیط — رحمتیں آپ کی دنیا پہ برستا بادل
آپ کی دین ہے دنیا کو شرف کی منزل — ظلمتِ دہر میں ہیں آپ ہی حق کی مشعل
آپ یکتائے زمانہ ہیں وہ سلطاں جس کا — کوئی نقارہ نہ دربار نہ قلعہ نہ محل
آپ نے قیدِ زماں توڑ کے حق کو دیکھا — عقل ہے آج بھی زندانیٔ اسباب و علل
آپ کی بات بشر کے لئے اسمِ اعظم — وجہِ تقلیدِ جہاں آپ کا ہر ایک عمل
یوں تو ہم سب کے لئے آپ ردائے رحمت — نسب و مُلک کا عورت پہ جو ڈالا آنچل
آپ کے نام پہ قربان ہزاروں جانیں — آپ کے پاؤں کے نیچے مری آنکھوں کے کنول
آرزو ہے کہ یہ بڑھ کر بڑا چھتنار بنے — آپ کے پیار کی پھوٹی ہے جو دل میں کونپل
اِک عنایت کی نظر مجھ پہ بھی آقائے جہاں! — اِک اشارہ مری بخشش کا بھی، مولائے ہل!
اِک جھلک رخِ مبارک کی بھی ارزانی ہو — زندگانی مری بے برگ ہے، ہو جائے سپھل
میں بھی منجملۂ اجرام محبت ہو جاؤں — آفتابِ افقِ خیر! مجھے بھی اک پل

اِک تمنا ہے کہ بس اتنی سعادت مل جائے
روضۂ پاک پہ روتا ہوں کہ آجائے اجل

پرتو روہیلہ

نعت

یہ توفیقِ الٰہی بھی ہے، احساں بھی اب وجد کا
کہ مجھ سا ایک عاصی نام لیتا ہے محمّدؐ کا

محبت فرش ہے اس کا، یہ دربارِ رسالت ہے
یہاں توحید مسند ہے، یقیں تکیہ ہے مسند کا

یہی معراجِ انساں ہے، بدن خاکِ مدینہ ہو
وہ گنبد ہو ٹھکانا طائرِ روحِ مقید کا

نہ جانے اشتراکِ حسنِ معنی کس قدر ہوگا
خدا ہی جانتا ہے راز اُس لفظِ مشدّد کا

رسائی ان کے روضے تک عنایت ہے مشیت کی
سعادت ہے بصارت کی، نظارہ سبز گنبد کا

محبت آپ کی، روزِ جزا ضامن شفاعت کی
غلامی آپ کے در کی، دیا ہے میرے مرقد کا

مجھے بھی، کاشفِ اسرارِ حق! وہ اسم بتلا دے
کہ کھل جائے مرے سینے کے اندر قفل ابجد کا

قیامت میں جو پرسش ہو کہ پرتو کس کا چاکر ہے
پکاروں جذبِ دل سے میں، محمدؐ کا! محمّدؐ کا!

ریاض حسین چودھری

متاعِ عمرِ پریشاں

حضورؐ آپؐ کے ادنیٰ غلام زادے نے
حروف آپؐ کی مدحت کے گنگنائے ہیں
ہجومِ اشک ہے اس کی سلگتی آنکھوں میں
لبوں پہ حرفِ ثنا کے گلاب مہکے ہیں
کرم کے پھول کھلے ہیں وفا کی ٹہنی پر
حضورؐ اس کے مچلتے حسین جذبوں میں
غبارِ شہرِ مدینہ کا نور رہتا ہے
شبیہِ گنبدِ خضرا کو دیکھ کر اکثر
یہ دونوں ہاتھ اٹھا کر سلام کرتا ہے
حضورؐ، آج یہ پوچھا تھا میں نے "دنیا میں
وہ چیز کیا ہے؟ جو سب سے عزیز ہے تجھ کو"
حضورؐ اس نے یہ برجستہ کہہ دیا مجھ سے
"عزیز سب سے مجھے ہے حضورؐ کا روضہ
عزیز سب سے مجھے ہیں حضورؐ کی گلیاں
حضورؐ، سیدِ عالم، جنابِ ختمِ رسلؐ:
متاعِ عمرِ پریشاں ہے یہ مرا بیٹا
حضورؐ آپؐ کے قدموں میں اس کو لایا ہوں
حضورؐ وادیِ بطحا کی بچیوں کے طفیل
غلام زادے کے کمزور، زرد ہاتھوں سے
قبول کیجیے نعتوں کے پھول اور کلیاں
حضورؐ اس کا مقدر رہوں آپؐ کی گلیاں

اے جگت راجہؐ

محمود علی محمود

یہ خواب ہے تو نہ اس خواب سے نکل پاؤں
کھڑا ہوں دُور ۔ بہت دُور ۔ لوگوں کے پیچھے
بھرا ہے خلق کے انفاس سے ترا دربار
عماموں، اچکنوں والے، خدا رسیدہ بزرگ
سبھی ستادہ ہیں، عرشِ بریں کے راجکمار
یہ لوگ کچھ بھی سہی، مطمئن تو ہیں مولا!
کہ ان کی جھولی میں زہد و عمل کی دولت ہے
انہیں خبر ہے کہ راتوں کو جاگنے کا عمل
جلو میں لاتا ہے کوثر، گلاب، شہد، کنول
یہ لوگ پھر بھی تمنائی ہیں عنایت کے
ترے کرم کے، ترے لطف کے، شفاعت کے
کھڑے ہیں دبدھا کے برزخ کنارے، اے خواجہؐ
انہیں نویدِ ارم دے دے، اے جگت راجہؐ
میں گمرہی کا نشاں، میں گناہوں سے بے حال
نہ میرے پاس عبادت کا پھل نہ کوئی کمال
مرا تو سر نہیں اُٹھتا یم ندامت سے
نوازے گا تو مجھے کس طرح شفاعت سے
گلیم پوشؐ ۔ ! ازل کے نبیؐ ۔ ! ابد کے رسولؐ!
مجھے تو کچھ بھی نہیں چاہیے، نہ آگ نہ پھول
بس اک تمنا ہے، مجھ کو یہاں سے بلوائے
بغور دیکھ مجھے، مسکرا کے لپٹا لے
پھر ایسا ہو ۔ وہیں غش کھاؤں اور بجھ جاؤں
یہ خواب ہے تو نہ اس خواب سے نکل پاؤں

حسن عباس رضا

نعت

اک تمنّا ہے کہ وہ خوابِ تمنّا دیکھوں
جس کے ہر عکس میں روشن ترا جلوہ دیکھوں

پیشِ منظر ترا در ہو تو مری آنکھ لگے
آنکھ کھُل جائے تو ہر سُو ترا چہرہ دیکھوں

دیکھنے کی کوئی حد ہو تو میں بتلاؤں بھی
ہاں مگر یہ، کہ تجھے حد سے زیادہ دیکھوں

تیرا پیکر مری آنکھوں میں مجسّم ہو جائے
اے شہہِ حسن و وفا! میں تجھے اتنا دیکھوں

مجھ گنہگار کو اُس شخص پہ رشک آتا ہے
جس کی آنکھوں میں ترا نقشِ کفِ پا دیکھوں

قیوم طاہر

نعت

پاس بھی رہ کر کہہ نہ سکوں مَیں اپنا حال ــــ محمدؐ!
میری آنکھوں میں بکھرا ہے رنگِ ملال ــــ محمدؐ!

ایک جواب کی خواہش ہے، اثبات میں ہو جو آفت!
کوئی لفظ، نہ مصرع، مَیں تجسیمِ سوال ــــ محمدؐ!

بس اک چُلّو، ساقیٔ کوثر! اک اُمید کا سایہ
دُھندلے ہو گئے جلتی دُھوپ میں خدوخال ــــ محمدؐ!

ایک پرندہ، قید ہوئی ہیں جس کی سب پروازیں
تنے ہوئے ہیں چاروں جانب کالے جال ــــ محمدؐ!

بخش ہمیں وہ ہمت، اپنی جاں کا علَم لہرائیں
خوف کے خیموں میں کٹتے ہیں ماہ و سال ــــ محمدؐ!

مجھ کو اپنے رنگ عطا کر، اپنی چھاؤں دے دے
میں اُجڑی بستی کا باسی، تیری آل ــــ محمدؐ!

منیر احمد شیخ کی یاد میں

عطاء الحق قاسمی

مجھے اسلام آباد سے محمد منشا یاد کا فون آیا "تمہیں ایک بُری خبر سنانا ہے۔ منیر احمد شیخ کا انتقال ہو گیا ہے۔" مجھے یوں لگا جیسے میرا سر چکرا رہا ہے۔ اتنے میں ایک دفعہ پھر فون کی گھنٹی بجی یہ فون بھی اسلام آباد سے تھا اور دوسری طرف خالد محمود ربانی تھا "عطا منیر شیخ ہم سے رخصت ہو گیا ہے۔ وہ کراچی انجو گرافی کرانے گیا تھا۔ امریکی سرجنوں کے ہاتھوں میں دم توڑ گیا۔ اس کی میت رات کو ساڑھے بارہ بجے اسلام آباد پہنچے گی!" ایک دفعہ پھر فون کی گھنٹی بجی۔ اس دفعہ بھی خالد محمود ربانی تھا "منیر کا جنازہ کل صبح اسلام آباد سے اٹھایا جائے گا۔" گویا میں منیر احمد شیخ کا آخری دیدار نہیں کر سکوں گا، اپنے اس دوست کی پیشانی کو بوسہ نہیں دے سکوں گا، خوشبوئیں جس کی ہمراز تھیں۔ میں نے سوچا میں اس کے جنازے میں شریک نہیں ہو سکتا تو اس کے قل میں شریک ہو کر اپنے ہاتھ اس کی مغفرت کے لئے اپنے رب کے سامنے پھیلاؤں۔ چنانچہ میں اگلے روز پی آئی اے میں خالد بٹ کے پاس گیا مگر بے پناہ رش کی وجہ سے مجھے صبح کی فلائٹ میں جگہ نہ مل سکی لہٰذا میں نے اور امجد نے پونے ایک بجے کی فلائٹ میں نشستیں بک کرائیں کہ قل تو شام ہی کو ہوں گے اور یوں ہم دعا میں شریک ہو سکیں گے۔ ایک دفعہ پھر خالد محمود ربانی کا فون آیا "قل صبح سات بجے ہیں۔" میں نے سوچا میں رات ہی کو اسلام آباد چلا جاتا ہوں۔ چنانچہ میں نے ایئرپورٹ پر دو پروازوں کا چانس لیا اور پھر مایوس ہو کر واپس گھر چلا آیا۔ منیر شیخ بھی تو اس گھر میں منتقل ہو چکا تھا جہاں سے ہم لوگ اس دنیا میں آتے ہیں اور عارضی طور پر ان گھروں میں آباد ہوتے ہیں جنہیں ہم مستقل سمجھ کر ساری عمر ان کی آرائش میں لگے رہتے ہیں۔

یہ ساری تفصیل میں نے اس لئے بیان کی ہے کہ منیر احمد شیخ نے میرے ساتھ یہ سلوک پہلی دفعہ کیا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ میں اس سے ملنا چاہوں یا وہ مجھ سے ملنا چاہے تو ہم ایک دوسرے سے نہ مل سکیں۔ میں اسلام آباد جاتا تو اسے فون کرتا، اگر میں فون نہ کر پاتا تو وہ میری خبر پا کر خود مجھے فون کرتا اور پھر میں اس کی طرف چلا جاتا یا وہ میری طرف آجاتا اور ہم گھنٹوں دنیا جہان کی باتیں کرتے۔ جب اس سے آخری ملاقات کا وقت آیا تو اس سے ملنے کے لئے میری ساری کوششیں رائیگاں گئیں۔ منیر احمد شیخ جس بستی میں جا کر آباد ہوا ہے کیا اس کی کشش اتنی زیادہ ہے کہ وہاں جانے والا کوئی بھی شخص کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ اس کے عزیز و اقارب اور اس کے دوست نالہ و شیون سے آسمان کا کلیجہ شق کر دیتے ہیں مگر جانے والا ایک عجیب اطمینان کے ساتھ اپنی کاٹ نما چارپائی میں بچوں کی طرح سویا رہتا ہے۔ منیر شیخ! تم اپنی کہانیوں اور اپنے مضمونوں میں بہت سے سربستہ راز بیان کیا کرتے تھے، بہت سے عقدے وا کیا کرتے تھے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم اُن اَن دیکھی سرزمینوں کے بارے میں بھی کچھ بتاؤ جہاں سے بلاوا آنے پر لوگ ایک لمحے کے لئے بھی یہاں نہیں رُکتے اور ایسے جاتے ہیں کہ واپس آنے کا نام ہی نہیں لیتے؟

میں منیر احمد شیخ کے مرنے کے بعد بھی اس سے باتیں اس لئے کر رہا ہوں کہ وہ باتوں کا بہت رسیا تھا۔ جب اس سے ملاقات

ہوتی تو لگتا موضوعات ختم ہونے ہی میں نہیں آ رہے۔ مگر تین موضوعات اس کے بہت پسندیدہ تھے۔ ادب، کلاسیکی موسیقی اور دوست! اسے ان تینوں سے بے پناہ محبت تھی، چنانچہ جب وہ بھارت میں پاکستانی سفارت خانے میں پریس اتاشی مقرر ہو کر گیا تو یہ تینوں چیزیں اس کے وطن کے بہت کام آئیں جس سے اس کی ذہنی اور جذباتی وابستگی بہت زیادہ تھی۔ اس نے فنونِ لطیفہ کے حوالے سے وہاں کی اینٹیلیجنشیا میں اپنے دوست بنائے، چنانچہ منیر شیخ کی بھارت سے واپسی کے بعد جب میں ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے بھارت گیا تو مجھے احساس ہوا کہ سفارت کار کسے کہتے ہیں۔ منیر شیخ نے ادب، موسیقی، صحافت اور ذاتی دوستیوں کو وسیلہ بنا کر اتنا کام کیا تھا اور اتنے غیر محسوس طریقے سے کیا تھا کہ اس کے گہرے اثرات بہت واضح طور پر ثبت نظر آ رہے تھے۔ اسی طرح اس نے مغربی جرمنی میں بھی بطور سفارت کار پاکستان کے ثقافتی خدوخال کو پاکستان کی پہچان کا ذریعہ بنایا اور یہ وہ باتیں ہیں جو ہماری بیوروکریسی کو اچھی نہیں لگتیں، چنانچہ اسے کھڈے لائن لگا دیا گیا اور اس ضمن میں اتنی مستقل مزاجی کا مظاہرہ کیا گیا کہ انتقال کے وقت بھی محکمۂ اطلاعات و نشریات میں اس کی پوسٹنگ ایسے شعبے میں تھی جس میں کسی کو انتقال کے بعد بھی لگا دیا جائے تو کوئی فرق نہیں پڑتا!

منیر احمد شیخ کے تین افسانوی مجموعے، دو تنقیدی مضامین کے مجموعے اور ایک کتاب کلاسیکل موسیقی کے موضوع پر شائع ہوئی مگر اس میں نرگسیت کم تھی، وہ اپنی تخلیقات کے حوالے سے بہت کم بات کرتا بلکہ مجھے تو لگتا کہ اس کے دل میں اپنی پروجیکشن کی خواہش بھی نہیں تھی، اور اگر تھی بھی تو اس نے کبھی اس کا اظہار نہ کیا تھا، چنانچہ اس کے بارے میں اخبارات و رسائل میں بہت کم شائع ہوتا تھا، حالانکہ وہ اگر چاہتا تو اس کے لئے "خبروں" میں رہنا بہت آسان تھا۔ اس کی زیادہ دوستیاں نقادوں کے ایک موثر گروپ سے تھیں مگر اس نے کبھی اپنی ان دوستیوں کو "کیش" نہ کرایا۔

وہ ایک درویش انسان تھا اتنا درویش کہ جونیجو صاحب کے زمانے میں اسے پرائم منسٹر کا پریس سیکرٹری بنایا گیا تو اس نے یہ ذمہ داری بادلِ نخواستہ قبول کی، چنانچہ بہت ہی کم عرصے میں اس نے اس ذمہ داری سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔ اسے اقتدار کی غلام گردشیں پسند نہ تھیں۔ وہ ایسا منصب چاہتا تھا جس میں رعب اور دبدبہ نہ ہو حالانکہ "سول سرونٹ" کہلانے والے ایسے عہدوں کے لئے اپنے ضمیر سرکار کے پاس گروی رکھ دیتے ہیں۔ مگر منیر شیخ اپنے ملک کی خدمت فنونِ لطیفہ کے حوالے سے کرنے کا خواہش مند تھا اور ہماری ستم ظریف بیوروکریسی نے منیر شیخ کو فنونِ لطیفہ کے فروغ کے لئے قائم متعدد اداروں کے قریب بھی نہ پھٹکنے دیا اور ان اداروں میں ہمیشہ ایسے افراد کو متعین کیا جن کا فنونِ لطیفہ سے کوئی تعلق نہ ہو اور اگر ہو بھی تو ان میں اتنا تکبر ضرور موجود ہو کہ فنونِ لطیفہ سے شغف کے باوجود فنونِ لطیفہ سے وابستہ افراد کو وہ حقیر سمجھتے ہوں۔

منیر احمد شیخ ایک بہت وجیہہ و جمیل شخص تھا، سرخ و سفید رنگ، دراز قد اور تیکھے نقوش! وہ مردانہ حسن کا مکمل نمونہ تھا۔ اس کے چہرے پر نظر کی عینک تھی اور وہ ان چند لوگوں میں سے تھا کہ نظر کی عینک بھی جن کی خوبصورتی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ اس کا باطن شاید اس کے ظاہر سے بھی زیادہ خوبصورت تھا۔ ایک بے پناہ محبت کرنے والا شخص، دوستوں کی تکلیف پر تڑپ اٹھنے والا حساس انسان! چنانچہ جب گزشتہ ماہ اسلام آباد میں اکیڈمی آف لیٹرز کے زیر اہتمام منعقدہ منصور قیصر کے تعزیتی جلسے میں اس سے ملاقات ہوئی تو منصور کے ذکر پر اس کی آنکھیں چھلک چھلک پڑتی تھیں۔ منصور قیصر کی موت ہم دونوں کا مشترکہ دکھ تھا چنانچہ منیر اگلے روز اسلام آباد ہوٹل میں صرف منصور قیصر کی باتیں کرنے کے لئے آیا اور ہم دونوں بہت دیر تک منصور کو یاد کرتے رہے۔ منیر شیخ کو یہ بات سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ جو زندگی اور موت کا گورکھ دھندہ ہے، ہماری گواہی اس میں کیوں ڈال

دی گئی ہے، جبکہ ہم اس سلسلے میں پوری طرح بے خبر ہیں؟ اور جوبات میں سمجھنے سے قاصر تھا وہ یہی تھی کہ جانے والے لوٹ کے کیوں نہیں آتے اور ہمیں اس دیس کی کہانیاں کیوں نہیں سناتے جس کی کشش میں وہ اپنے پیاروں کو ہمیشہ کے لئے وداع کہہ دیتے ہیں؟ منیر شیخ کی خاموشی سے مجھے یوں لگا جیسے وہ اس کا کھوج ضرور لگائے گا، چنانچہ وہ ۲۹ مئی کو اس کا کھوج لگانے نکلا اور ابھی تک نہیں لوٹا۔ میرے دوست! کیا دوسروں کی طرح تم بھی واپس نہیں آؤ گے!

(بشکریہ روزنامہ نوائے وقت)

دو آخری خط

منیر احمد شیخ

"منیر احمد شیخ کے یہ دو آخری خط ہیں جو انہوں نے مدیر 'فنون' کے نام لکھے تھے۔ دوسرا خط ۸ مئی ۱۹۹۰ء کو لکھا گیا جس میں انہوں نے اپنے عزیز دوست اور اردو کے ایک عمدہ ادیب منصور قیصر کا ماتم کیا تھا۔ اس کے بیس روز بعد وہ خود بھی انتقال کر گئے اور اردو ادب زرخیز دل و دماغ کے ایک خوبصورت ادیب سے محروم ہو گیا ——— ادارہ"

۲ مئی ۱۹۹۰ء

اسلام آباد

مکرمی و محترمی! اسلام نیاز۔

آپ کا ۲۴ اپریل کا گرامی نامہ مجھے پرسوں ملا۔ اسے پڑھ کے مجھے اپنے آپ پر بے حد افسوس ہوا کہ ٹیلی فون پر گفتگو کے دوران میرا ایک جملہ آپ تک بالکل غلط انداز میں پہنچا جس سے آپ کو میرے بارے میں غلط فہمی ہو گئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے ہرگز ہرگز یہ نہیں کہا تھا کہ "مجھے تو 'فنون' کی پالیسی اب تک سمجھ میں نہیں آئی"۔ میں نے آپ سے یہ کہا تھا کہ دو تین افسانوں کی واپسی کے بعد مجھے اپنے آپ پر شک ہونے لگا ہے کہ میں 'فنون' کی پالیسی کو کیوں نہیں سمجھ سکا۔ فون پر اس جملے کی ترسیل سے غلط فہمی کا امکان اس لئے پیدا ہو گیا کہ میں جو کہنا چاہتا تھا اس کی وضاحت کا موقع نہ مل سکا۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ اتنے برس کی رفاقت کے بعد بھی اگر میں ایسی تحریریں آپ کو اشاعت کی غرض سے بھیج رہا ہوں جو کسی نہ کسی وجہ سے قبولِ خاطر نہیں ہوتیں تو اس میں ضرور میری کم فہمی کو دخل ہو گا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ آپ نے فون پر مجھ سے یہ کہا کہ میں ایسی تحریروں سے احتراز کرتا ہوں جن میں ذاتیات کا شائبہ ہو جائے تو میں نے جواب میں یہ عرض کیا تھا کہ یہ یقیناً میرے افسانے کی کمزوری ہو گی اور اس کے بارے میں مجھے سوچنا ہو گا۔

آپ کا خط دیکھ کر مجھے شدید ندامت ہوئی کہ نہ صرف یہ کہ میرے دل کی جو بات تھی وہ آپ تک پہنچانے میں ناکام رہا بلکہ اس کے اُلٹ آپ کے ذہن پر ایک بالکل ہی دوسرا تاثر مرتب ہوا۔ آپ اس غلط فہمی کی وجہ سے دل پر بوجھ بھی لئے پھرتے رہے جس سے مجھے انتہائی دُکھ ہوا کہ اس کا باعث میں ہوں۔ آپ سے میرا رشتہ احترام و محبت کے باوجود ایسا ہے کہ اگر کوئی سچی یا کھری بات کہنا ہو تو میں اس رشتے کے اعتماد کی بنا پہ کہنے سے کبھی جھجک محسوس نہیں کرتا، مگر یہ بات تو ایسی تھی جو نہ تو کسی ناگواری کے موڈ میں کہی تھی اور نہ اس سے مقصود آپ سے کوئی گلہ تھا۔ اگر کچھ تھا تو فقط اپنی کم مائیگی اور کوتاہی کا اقرار تھا جسے میں آپ تک نہ

پہنچا سکا۔ میری اس کوتاہی کے سبب آپ کو جو تکلیف پہنچی ہے اُس کے لئے تہ دل سے معافی کا خواستگار ہوں۔

میری نوے فی صد تحریریں "فنون" ہی میں شائع ہوتی رہیں اور مجھے ہمیشہ اس بات پہ فخر رہا اور ہمیشہ رہے گا کہ مجھے "فنون" کے صفحات میں بڑی عزت و احترام کی جگہ ملتی رہی۔ یہ ترجمہ جو میں نے آپ کو بھیجا تھا اس میں مجھے عورت ذات کی مظلومیت کا ایک شدید تاثر ملا تھا جو افسانہ نگار نے بڑی کامیابی سے قاری تک پہنچایا تھا۔ یہ اندازہ میں نہ کر سکا کہ بدقسمتی سے ہم اپنے معاشرے میں اتنا سچ بھی نہیں بول سکتے۔ میرے نزدیک یہ افسانہ جنسی افسانہ نہ تھا اور نہ ہی افسانہ نگار نے جنسی لذت کا سامان مہیا کرنے کی کوشش کی تھی۔

بہرحال اب اس پر مٹی ڈالیئے۔ میں نے ترجمہ داخل دفتر کر دیا ہے اور آئندہ کے لئے کوئی بھی تحریر ارسال کرنے سے پہلے مزید احتیاط کو لازم رکھوں گا۔

والسلام۔ فقط

دُعاگو، خیر طلب

منیر

اسلام آباد

۸ مئی ۱۹۹۰ء

مکرمی و محترمی قاسمی صاحب

سلام نیاز ___ اُمید ہے کہ آپ کے گرامی نامے کے جواب میں میرا مکتوب آپ کو مل گیا ہوگا۔

برادرم اور بے حد عزیز دوست منصور قیصر کے انتقال پر ایک مضمون اُس کی یاد میں لکھا ہے اور اس خیال سے کہ مرحوم کی تحریروں میں سے کچھ نمونے بھی اس مضمون کے ساتھ شائع ہو جائیں تو ایک گوشہ منصور قیصر کے نام کا "فنون" میں بن سکتا ہے۔

یہ دونوں نمونے منصور کی دونوں کتابوں کے دیباچے ہیں اور عمدہ تحریریں ہیں جو اُس کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتی ہیں۔ ایک دیباچہ اُس کے افسانوں کے مجموعے "بے چراغ بستی" سے ہے اور دوسرا اُس کے کالموں کے مجموعے "ثقافتی کالم" سے۔

یہ حاضر خدمت ہیں، آپ جس طرح چاہیں فیصلہ کریں۔ باقی سب خیریت

والسلام۔ فقط

طالبِ خیریت

منیر

یاروں کا یار — منصور قیصر

منیر احمد شیخ

منصور قیصر جو کل تک اسلام آباد کی محفلوں کی جان تھا اور اس کی تحریروں کو یار لوگ بڑے مزے لے لے کر پڑھتے تھے اور اس کے کاری وار سے خوفزدہ بھی رہتے تھے، ایک طویل عرصے تک اپنے گھر کے ایک کمرے میں بڑی لاچاری اور بے بسی کی زندگی کاٹتا رہا۔ ایسے جاندار اور زندگی سے محبت کرنے والے کو اس بے چارگی میں دیکھ کر، انسان کی بے چارگی اور بے بسی کا خیال آجاتا تھا کہ جو دوسرے کو ایسی حالت میں دیکھ کر یہ گمان کرتا ہے کہ یہ صورت تو دوسرے شخص کو در پیش ہے اور میں اس سے محفوظ ہوں۔ شاید وہ نہیں جانتا کہ ہر انسان اس دنیا میں اتنا ہی مجبور اور کمزور ہے جتنا منصور قیصر جیسا صحت مند اور قوی انسان مجبور ہے اور اس سے کسی کو مفر نہیں۔ بس اتنا ہے کہ تندرستی کی حالت میں انسان اسی زعم میں گرفتار رہتا ہے کہ وہ اس دھرتی پہ اسی طرح ہمیشہ اکڑ کے اور سینہ پھلا کے چلتا رہے گا مگر منصور قیصر کی بے بسی ایک مرتبہ جھنجھوڑ کے رکھ دیتی تھی کہ اس قید خانے کی مشقت ہم سب کا مقدر ہے۔

منصور قیصر پہ چند سال پہلے فالج کا حملہ ہوا۔ جس سے اُس کا دایاں پہلو یعنی آنکھ، ہاتھ اور ٹانگ بے جان ہو گئے۔ منصور نے اس حملے کا بڑے حوصلے سے مقابلہ کیا اور اس جسمانی معذوری کے سامنے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا۔ دوستوں نے دیکھا کہ وہ ہاتھ میں چھڑی تھامے اور آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگائے، ایک ٹانگ کو گھسیٹتا گھسیٹتا بڑی باقاعدگی سے محفلوں میں جاتا رہا اور آہستہ رفتار میں مضامین اور افسانے بڑھتا رہا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ٹیلی ویژن میں اپنی ملازمت کے فرائض کی ذمہ داری بھی ادا کرتا رہا۔ پھر اُس پہ دوسرا حملہ فالج کا ہوا تو اس کے بعد اُس کے جسم کا بایاں پہلو بھی منجمد ہو گیا یعنی دوسرے ہاتھ اور دوسری ٹانگ کے ساتھ اب زبان بھی لڑکھڑا گئی اور اس میں لکنت آگئی۔ وہ لکھنا چاہتا تو ہاتھ نہ چلتے، لکھنے کے لئے بولنا چاہتا تو زبان ساتھ نہ دیتی۔ پھر بھی وہ دوستوں کو فون کرتا رہتا اور آہستہ آہستہ بڑی تنگ و دو کے ساتھ ٹوٹتے لفظوں اور اذیت ناک طویل وقفوں کے ساتھ باتیں کرتا۔ اُس کی اس جنگ کو دیکھ کر کبھی کبھار بڑی حیرت ہوتی کہ کس حوصلے سے یہ شخص ہتھیار ڈالنے سے انکار کئے جا رہا ہے اور پھر دیکھتے دیکھتے تیسرا حملہ ہوا تو منصور قیصر کی بینائی، ہاتھ، ٹانگیں اور ریڑھ کی ہڈی سب بے حس ہو گئے۔ منصور جس کی باتوں، جملوں اور قہقہوں سے محفل میں جان پڑ

جاتی تھی۔ اب اُس کا بے جان جسم اسلام آباد کی سرحدی بستی فیض آباد میں بدنام اور منحوس اوجڑی کیمپ کی دیوار کے عین سامنے ایک کٹے ہوئے درخت کی طرح زمین پر گر پڑا ۔ اور مرتے دم تک اُسی طرح کٹ ہوا بے حس و بے نُور پڑا رہا۔ منصور کے دونوں بیٹے جو ڈاکٹر ہیں اور اپنے باپ سے بے حد محبت کرتے ہیں، قدرت کے اس فیصلے کے سامنے چُپ بُت بنے کھڑے رہے۔ منصور نے اپنے سامنے سب کو بے بس کر دیا تھا۔ اُس کی افسانہ نگار بیوی، کہکشاں، بڑے حوصلے اور ہمت سے منصور کے ٹھیک ہو جانے کی آس لگائے بیٹھی رہی اور کسی بڑے افسانے کے وجود میں آنے کا خاکہ بنتی رہی مگر منصور اب افسانے کی سیڑھیوں سے نیچے اُتر کر گھناؤنی حقیقتوں کی اتھاہ گہرائیوں میں جا رہا تھا۔ وہ اب نہ منہ سے کچھ کہہ سکتا تھا، نہ آنکھوں سے کسی کو دیکھ سکتا تھا۔ بس سانس کی ایک دھونکنی تھی جو چل رہی تھی۔ ملنے والے زور زور سے آوازیں دے کے اُسے پکارتے تھے تو بڑی دیر کے بعد اُس کے گلے میں سے ایک دردناک . . . . آواز نکلتی، وہ اپنے ملنے والوں کی پُکار کا جواب دینے کی کوشش کر رہا ہوتا۔

راولپنڈی اور اسلام آباد میں اُس کے دوستوں کی کمی نہیں تھی۔ جنہوں نے دن رات منصور کے ساتھ بسر کئے۔ کسی ایک کے روزگار کا اُسے غم لاحق رہتا اور وہ اُس وقت تک چین سے نہ بیٹھتا جب تک انہیں روزگار نہ مل جاتا۔ وہ ہر ایک کے دُکھ درد میں شریک ہوتا۔ ایسا مخلص اور دردمند انسان کم ہی دیکھنے میں آیا۔ مگر زمانے کی بے مرّوتی دیکھئے کہ جس وقت وہ ابھی کچھ کچھ دیکھ سکتا تھا اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں کچھ کچھ کہہ سکتا تھا، وہ گھر میں بستر پہ تنہا پڑا دوستوں کا انتظار کھینچتا جو اُس کی تنہائی کی اذیت کو کاٹ سکتے تھے مگر اُس کے دوستوں نے اُسے یادوں کے پردے سے مٹا دیا۔ وہ اب اس قدر تنہا ہو گیا کہ اُس نے دنیا سے تعلق کے سارے راستے خود ہی منقطع کر دیئے۔ اب اگر کوئی چاہتا بھی کہ اُس سے مل پائے تو یہ ممکن نہ رہا تھا۔ منصور قیصر نے بھی اب اپنے سارے دروازے بند کر دیئے اور دنیا سے پردہ کر لیا۔

اس گوشہ نشین پر نہ اب سورج طلوع ہوتا تھا نہ شب کی سیاہی اس پر اپنا جادو ڈالتی تھی۔ وہ بے حس پڑا کبھی کبھی بڑی لمبی سی آواز سینے کے اندر سے نکالتا ۔ ایسی آواز جو برسات میں بھیگے ہوئے جنگلوں کی سیاہ رات کے اندر سنائی دیتی ہے اور جسے سُن کے درختوں میں سوئے ہوئے پرندے سہم جاتے ہیں۔ یہ زمانہ اُس سے محبت کرنے والوں کے ساتھ ایسا سلوک کیوں روا رکھتا ہے ۔ یہ عقدہ انسانی عقل سے ابھی تک نہیں کھُل پایا۔

میں آج جب پیچھے مڑ کے دیکھتا ہوں تو مجھے یاد آتا ہے کہ ۷ستمبر ۱۹۹۲ء کو منصور قیصر کی پچاسویں سالگرہ پر میں نے اُس پر ایک مضمون لکھا تھا۔ اُس میں مَیں نے کہا تھا: "ہمارا منصور کے خلوص نے ساری عمر مجھے اُس کے ساتھ جکڑے رکھا۔ اُس سے الگ ہونا تو کجا، میں اُلٹا اس خوف میں رہتا ہوں کہ زندگی کے اس ساتھ میں وہ کبھی مجھ سے جُدا نہ ہو جائے۔"

بالآخر وہی ہوا۔ وہ میرا ساتھ چھوڑ گیا اور جب منصور جیسا کوئی پیارا دوست ساتھ چھوڑ جاتا ہے تو

وہ اس دنیا سے اکیلا نہیں جاتا، اپنے ساتھ پیچھے چھوڑے ہوئے دوستوں کی زندگی کا ایک حصّہ بھی قبر میں لے جاتا ہے۔ یہ جسے دنیا کہتے ہیں، ہمعصروں ہی کا دوسرا نام ہے۔ جب وہ ساتھ چھوڑنے لگتے ہیں تو پھر اپنی زندگی بھی سُکڑنا شروع ہو جاتی ہے۔ منصور نہیں مرا، اُس کے ساتھ میری زندگی کا ایک حصّہ بھی سردخانے میں جا گرا۔ اب یہ شہر اور یہ زندگی منصور قیصر کے بغیر گزارنا ہوگی۔ بلاشبہ یہ تنہائی، سب تنہائیوں سے زیادہ اذیت ناک ہے۔

منصور قیصر ۱۶ اپریل کو نہیں مرا۔ وہ اُس روز مر گیا تھا جب میں اُس کی عیادت کے لئے آج سے دو سال پہلے اُسے ملنے کے لئے گیا۔ مجھے دیکھتے ہی اُس نے ٹوٹتی ہوئی آواز میں مجھے پکارا اور سنائی دینے والی سانس کے ساتھ اِس جملے کو بار بار دُھرایا: "بھار جی! اب یہ وقت آگیا ہے کہ مجھ سے ہاتھ میں قلم نہیں پکڑا جا رہا۔ اب میں کبھی تندرست نہیں ہوں گا۔" پھر تھوڑے توقف کے بعد اس نے یہ سوال مجھ سے پوچھا "بھار! کیا میں ٹھیک ہو جاؤں گا؟" میں اس کی گرتی ہوئی آواز کے اندر یہ دیکھ رہا تھا کہ ٹھیک ہونے والی اب کوئی بات واقعی نہیں رہی تھی۔ لیکن میں اس کے باوجود اُسے جھوٹے دلاسے دیتا رہا مگر اُس کے چہرے سے یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ میرے جھوٹے الفاظ کو بڑے صبر کے ساتھ برداشت کر رہا ہے۔ منصور ۲۰ اپریل کو نہیں مرا۔ ۱۶ اپریل کو وہ صرف دفن ہوا۔

زندگی میں اُس نے میرا بڑا ساتھ دیا اور آخر تک نبھانے کی کوشش کرتا رہا مگر یہ کایر، دوستی اور اور بے بضاعتی دیکھیئے کہ میں اُسے کفن میں بڑے سکون کے ساتھ سویا ہوا دیکھ کر اُس کے ساتھ قبر کے کنارے تک بھی چل کے نہ جا سکا۔ عمر بھر ایک جیسے، سرخ و سفید روشن چہرے کو ہمیشہ مسکراتے ہوئے دیکھتے رہنے کے بعد اب اُسی چہرے کو موت کی زردی ملی سفیدی میں دیکھ کر میرے جسم کی رگ رگ سے زندگی نکل گئی اور میرے لئے ایک قدم اُٹھانا بھی مشکل ہو گیا۔ میں نے اپنے پاس کھڑے دوست ڈاکٹر لیئق بابری سے کہا! بابری صاحب! اب یہاں سے چلتے ہیں۔ منصور قیصر کے چہرے پر مٹی ڈالنے کی ہمت مجھ میں نہیں۔ شاید پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ میں ایک بچھڑنے والے دوست کے آخری سفر میں اُس کی آخری آرامگاہ تک اُس کے ساتھ چل کر نہ جا سکا۔ منصور یہاں بھی مجھ سے مضبوط نکلا۔ اُس نے مر کر مجھے بے بس کر دیا۔ میں شاید بزدل تھا۔ اُسے چھوڑ کے بھاگ کھڑا ہوا۔ میں اُسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ میرے اس طرح بھاگ جانے پر اُس نے حسبِ معمول قہقہہ لگایا ہوگا اور آواز دی ہوگی "بھار! لبس نَس گیا ایں۔ ایہہ یاری تے نہ ہوئی، چھولیاں دا دُدھ ہویا۔"

اب جبکہ اُس کے عزیز اور دوست مل کر اُسے منوں مٹی کے نیچے دبا آئے ہیں اور جو کل تک ایک حقیقت تھی، اب افسانہ بن گئی ہے تو منصور کی دو باتوں نے میرے ذہن کو گھیرا ہوا ہے۔ ایک تو یہ کہ منصور نے اپنی طویل اور اذیت ناک بیماری کے سامنے آخری وقت تک ہتھیار نہیں ڈالے۔ وہ زندہ رہنے کے لئے مسلسل لڑتا رہا۔ اپنے آپ سے بھی اور دوسروں سے بھی۔ وہ چل بھی نہیں سکتا تھا مگر گھسٹتا گھسٹتا دیواروں کو تھامتا، جُوں تُوں جلسہ گاہوں میں پہنچ جاتا تھا اور دوستوں کے درمیان بیٹھتے ہی اُس کا گلاب چہرا

کھل اُٹھتا، اُسے زندگی مل جاتی۔ دوست اُس کی سب سے بڑی متاع تھے۔ وہ موت کے لپکتے ہوئے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کے اُنہیں جھٹکنے کی زبردست کوشش کرتا رہا مگر یہ لڑائی اتنا طول پکڑ گئی کہ وہ نڈھال ہو گیا، تھک کے زمین پر گر گیا۔ موت نے بالآخر اُسے چت کر دیا۔

دوسری بات اُس کی وہ خصوصیت تھی جو اُس کی شناخت بن گئی تھی۔ وہ اس ریاکار اور بے حد منافق معاشرے کو بغیر کسی خوف و خطر یا لگی لپٹی کے، بے نقاب کرنے میں کسی چیز کی پروا نہ کرتا تھا۔ اس کی صاف گوئی اور بے باکی دنیاداروں اور ریاکاروں کے لئے ناقابلِ برداشت ہو جاتی۔ لوگ اُسے بیوقوف سمجھتے تھے کہ بات کہتے وقت اُسے موقع کی نزاکت اور اپنے نفع نقصان کا ذرا خیال نہیں رہتا۔ اُس کی سچی اور کھری کھری باتوں کا کھردراپن اُس کے دوستوں اور دشمنوں کو بہت چبھنے لگا تھا مگر وہ زندگی کی پاکیزگی اور اُس کے حُسن کو برقرار رکھنے پر اس قدر یقین رکھتا تھا کہ جہاں کسی نے زندگی کی حرمت اور اس کے تقدس کو پامال کرنے کی ذراسی بھی کوشش کی، وہ شمشیر برہنہ بن کر ایسے لوگوں پر جھپٹ پڑا۔ وہ زندگی کی حسین قدروں کو مسخ ہوتے دیکھ کر پاگل ہو جاتا تھا اور پھر وہ دنیا والوں کی زبان میں "ہوش مندی" کھو دیتا تھا۔ منافقتوں، دھوکہ بازیوں اور غلط بیانیوں کے سامنے وہ نیزہ بن کے کھڑا ہو جاتا اور سچی بات کہنے کی پاداش میں اپنا گھر بھی لُٹا دیتا۔ اسی حق گوئی کی وجہ سے اس کا روزگار چھین لیا گیا اور اُسے کہا گیا کہ تمہارے قلم کی بے باکی کے ہم متحمل نہیں ہو سکتے۔ وہ بے روزگار ہو گیا مگر اس بے روزگاری کے زمانے میں بھی اُس نے اپنی جنگ مسلسل جاری رکھی اور اپنے مسلک سے ایک لمحے کے لئے بھی رُو گردانی نہ کی۔

دوستو! کہنا بہت آسان ہے، دعوے کرنا اُس سے بھی آسان مگر اس ظالم دنیا میں منصور قیصر بننا بڑا ہی مشکل ہے۔ منصور قیصر بننے کے لئے زندگی ہی میں مفلوج ہونا پڑتا ہے، اتنا مفلوج جتنا زمانے اور خود منصور قیصر نے مل کر اُسے کر دیا تھا، یہاں تک کہ ایک روز اس میں اپنی سب سے عزیز متاع ۔۔ اپنے قلم کو ہاتھ میں تھامنے کی سکت بھی باقی نہ رہی۔ اس طاقت کے کھُس جانے کے بعد جسم کے دوسرے حصے بڑی تیزی سے بے جان ہوتے گئے۔ قلم کے بغیر منصور نے جینا گوارا نہ کیا اور دنیا سے مکمل کنارہ کر لیا۔

دو دیباچے

منصور قیصر

رُو بُرو (دیباچہ "بے چراغ بستی")

کہانی سننا، کہانی سنانا، کہانی پڑھنا اور کہانی لکھنا میری کمزوری ہے۔ مجھے ایسی کہانی بے حد متاثر کرتی ہے جو بظاہر بہتے پانی کی طرح ہو لیکن لہروں میں تہ در تہ معنی پوشیدہ ہوں۔ مجھے کہانی کا خیاپن بھی اچھا لگتا ہے کہ اس میں سے تازگی کی خوشبو آتی ہے۔ وہ کہانی مجھے اپنے ساتھ لے کر نہیں چلتی جس میں اُسلوب کی بازی گری تو ہو، لیکن کہانی کا شائبہ تک نہ ہو۔ اسی طرح ایسی کہانی میرے ساتھ مکالمہ نہیں کرتی جو علامتوں کے جنگلوں میں سے تو گزرتی ہو لیکن علامتوں کو بے نقاب نہ کرتی ہو۔ فکشن میں تجربہ کا بھی ایک حُسن ہوتا ہے کہ وہ شاعری کی طرح فکشن کو بھی کہیں سپاٹ نہ کر دے لیکن ایسی تجرید جو احساس و معنی کو ہی دائرہ ابلاغ سے خارج کر دے ادب کے کسی زمرے میں شامل نہیں ہوتی۔

میں ادب میں فنی حُسن، مقصدیت اور جمہوری نظریات کا قائل ہوں۔ میرے نزدیک وہی زندہ ادب ہے جس کا تخلیق کار اپنے عصر کی سچائیوں سے کومٹ منٹ کرتا ہے اور اپنا مواد براہِ راست اپنی دھرتی سے حاصل کرتا ہے۔ مجھے یہ دعویٰ تو نہیں کہ زیر نظر مجموعے میں مَیں نے کوئی غیر معمولی افسانے شامل کئے ہیں لیکن کم از کم اس بات سے میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے عصری سچائیوں سے بدعہدی نہیں کی۔

زیرِ نظر کتاب میں میرے چند ایسے افسانے شامل ہیں جو میں نے ۱۹۵۳ء اور ۱۹۸۳ء کے دوران لکھے۔ پرانے افسانے بھی اس خیال سے شامل کئے ہیں کہ قاری کے ذہن میں میرے تخلیقی سفر کی ہلکی سی تصویر بن سکے۔ اس مجموعے کے افسانے قارئین پر کوئی تاثر چھوڑتے ہیں یا نہیں، یہ میرا مسئلہ نہیں کیونکہ میں نے یہ افسانے کسی شہرتِ عام کے لئے منصوبہ بندی کے تحت نہیں بلکہ تخلیقی کرب کے اظہار کے لئے لکھے تھے۔ اس ضمن میں مَیں اپنے ان پیارے احباب کا بھی بے حد ممنون ہوں جنہوں نے یہ افسانے زمانے کہاں کہاں سے تلاش کر کے مجھے مہیا کئے کہ میرے پاس میری ان گنت تحریروں کی طرح یہ بھی محفوظ نہیں تھے۔ میری لاپرواہیوں سے میرے بے شمار مطبوعہ افسانے بھی ضائع ہو چکے ہیں۔

میری ہمیشہ خواہش رہی کہ میں ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے جانا جاؤں لیکن میری بدقسمتی ہے کہ زندگی بھر قلم کے ذریعے رزق کمانا پڑا اور اس ذریعہ روزگار نے میری شناخت ایک ڈرامہ نگار، مزاح نویس اور ایک کالم نگار کی حیثیت سے کروا دی۔ تاہم وہ بے شمار اَن دیکھے قارئین بھی میرے لئے قابلِ احترام ہیں جو میری طنزیہ و مزاحیہ تحریروں سے پیار کرتے ہیں۔

اس مجموعے کا نام میں نے محکمہ مال کی ایک اصطلاح سے لیا ہے۔ میں نے پڑھا تھا کہ محکمہ مال کی کھتونیوں میں اگر کسی بستی کا نقشہ موجود ہو لیکن بظاہر اس کا نام و نشان مٹ چکا ہو تو اسے اصطلاحاً بے چراغ بستی کہتے ہیں۔ بس بچپن میں ہی یہ نام میرے

دماغ سے چپک گیا تھا اور سوچا تھا کہ جب بھی کبھی کتاب چھپی تو یہی نام رکھوں گا۔ میں قبلہ احمد ندیم قاسمی صاحب کا بھی تہِ دل سے ممنون ہوں کہ انہوں نے نہ صرف میرا سب سے پہلا افسانہ "لاکھوں کے بول سہے" (کاپی میرے پاس محفوظ نہیں) روزنامہ امروز کے ادبی ایڈیشن میں شائع کیا تھا بلکہ باقاعدہ میری حوصلہ افزائی بھی کی۔ اسی طرح پیارے افسانہ نگار دوست احمد داؤد بھی تشکر کے مستحق ہیں کہ ان کی توجہ اور محنت کے نتیجے میں ہی یہ مجموعہ اشاعت کے مرحلوں سے گزر سکا۔ مصور اور افسانہ نگار دوست احسان علی قریشی کا بھی شکر گذار ہوں جنہوں نے پورٹریٹ کا تحفہ دیا۔ مصور منصور راہی بھی قابلِ ستائش ہیں جنہوں نے سرورق بنایا۔ آخر میں میں اپنے آبائی شہر ملتان کو بھی سلام پیش کرتا ہوں جو میری جنم بھومی ہے اور جس کے مجھ پر بڑے قرض ہیں۔

منصور قیصر
فیض آباد۔ راولپنڈی

۷ ستمبر ۱۹۸۳ء

ثقافت کے نام پر (دیباچہ "ثقافتی کالم")

صاحب! دنیا کے کسی موضوع پر ماہر بننے کے لئے باقاعدہ اعلیٰ تدریسی علم حاصل کرنا پڑتا ہے۔ پھر اس میں اپنا تجربہ اور مشاہدہ بھی شامل کرنا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ گدھوں کے علاج کے لئے بھی ڈگری یافتہ ہونا ضروری ہے۔ لیکن ایک علم ہمارے ہاں ایسا ہے کہ اس کا ماہر بننے کے لئے کسی یونیورسٹی میں داخلہ لینے کی ضرورت ہے نہ کسی تحقیقی کام کی۔ بس تھوڑا سا ذوق پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ خواہ اس ذوق کا کوئی سر پیر ہو یا نہ ہو۔ یہ علم ہے ثقافت کا۔

جو چاہے، جب چاہے اور جہاں چاہے کلچرل ایکسپرٹ بن کر کلچر سے لے کر سوشل کلچر تک کا تیا پانچہ کر سکتا ہے۔ ہمارے ہاں ثقافت کا موضوع اس قدر مظلوم ہے کہ اس کی حیثیت غریب کی جورو کی سی بن کر رہ گئی ہے۔ جسے اور کوئی کام نہیں آتا وہ ثقافت کا ٹھیکیدار بننے کے لئے اپنے ٹینڈر خود ہی منظور کروا لیتا ہے۔ ہمیں یاد ہے کہ جب پاکستان میں غیر ملکی ماہرین کے تعاون سے پہلی بار ڈیم تعمیر ہونے لگا اور دریا کا رُخ موڑنے کے لئے کئی دیہات خالی کروائے گئے تو ہمارے ایک دوست نے جانے والے دیہاتیوں کا بوجھ کم کرنے کے لئے برتن، توے، چمٹے، پراتیں، پیڑھے، چنگیریں، مرغیوں کے ڈربے، کبوتروں کی کابکیں، گائے بھینسوں کے گلے کی گھنٹیاں، پرانے کپڑے اور اس قسم کی کئی چیزیں اونے پونے خرید لیں۔ سجا کر باہر "پاکستان ہینڈی کرافٹ اینڈ انٹیکس" کا بورڈ لگا دیا۔ یوں ہمارے اس دوست نے نہ صرف خوب مال کمایا بلکہ لوک ثقافت کے ماہر کی حیثیت سے تین بین الاقوامی کانفرنسوں میں بھی دوسروں کے خرچے پر شرکت کی۔

ہم ایک اور صاحب کو جانتے ہیں جو دوسری جنگِ عظیم میں خچروں والی بٹالین میں ہوتے تھے اور جسے ہمارے ہاں "خچر پاتری" کہا جاتا ہے۔ کافی عرصے بعد ملے تو ــــ خیر خیریت کے بعد معلوم ہوا کہ وہ آج کل ایک ثقافتی ادارہ چلا رہے ہیں۔ ہم نے پوچھا۔ حضرت! یہ اتنی بڑی تبدیلی کیسے؟ خچروں کی صحبت سے نکل کر ثقافت کی محفلوں میں کیسے آ گئے؟ فرمانے لگے کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد میں نے خچروں کے کلچر پر ایک مضمون لکھا تھا جس میں یہ ثابت کیا تھا کہ خچر جس علاقے کا ہوگا، اسی علاقے کی زبان بولے گا اور یہ کہ خچر خچر کلادیری نہیں ہوتا۔ وہ مضمون اتنا پسند کیا گیا کہ مجھے خچری ثقافت کا ماہر سمجھا جانے لگا اور یوں میں نے اپنا ایک ثقافتی ادارہ قائم کر لیا۔

ہم نے پھر تعجب سے استفسار کیا، حضرت! مگر خچری ثقافت سے انسانی ثقافت کا کیا تعلق؟

مسکرا کر بولے۔ بہت ہی بھولے بادشاہ ہو۔ میری تازہ تحقیق کے مطابق دونوں ثقافتوں میں کوئی تفریق نہیں۔ انسان سے اس کی قوتِ گویائی چھین لی جائے تو پھر انسان اور خچر میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

ہم خاموش ہو گئے۔ ہماری خاموشی کی وجہ یہ تھی کہ ہم خود بھی ایک جعلی ماہر ثقافت ہیں۔ لیکن ہم اپنے جعلی پن کا اقرار پبلک میں نہیں کرتے اور بقول کسے پبلک پر صرف جعلی عکس ڈالتے ہیں۔ ہم ماہر ثقافت کیسے بنے، یہ ایک طویل داستان ہے جسے بیان کرنے کا یہ وقت نہیں۔ پھر یہ کہ اس داستان میں کچھ پردہ نشینوں کے نام بھی آتے ہیں اور کچھ ٹریڈ سیکرٹس بھی ہیں جن کا انکشاف خود ہماری شہرت کے لئے خطرے کا باعث ہے۔ تاہم پبلک کے پُرزور اصرار پر کچھ عرض کئے دیتا ہوں۔

ہمیں اپنے دوستوں اور عزیزوں کو متأثر کرنے کا ابتدار سے ہی شوق تھا لہٰذا انہیں مرعوب کرنے کے لئے کہ ہم فنونِ لطیفہ کے بڑے دلدادہ ہیں، ہم نے اپنا ڈرائنگ روم تاریخ کے آثارِ قدیمہ اور لوک ادب سے متعلق کتابوں مصوری کے شاہکاروں، لوک داستانوں کے نمونوں اور آلاتِ موسیقی سے سجا رکھا تھا۔ لیکن کوشش یہ ہوتی تھی کہ کوئی ہم سے اس موضوع پر گفتگو نہ کرے کیونکہ ہم منطقی طور پر یہ نہیں بتا سکتے تھے کہ صحن میں پڑے ہوئے کائی زدہ گھڑے کو اور باورچی خانے میں پڑی ہوئی چنگیر چھاج اور چائی کو اور غسل خانے میں پڑے ہوئے لوٹے کو ڈرائنگ روم میں کیوں سجا رکھا ہے۔ ایک بار ہمارے ایک پروفیسر دوست نے ہمارے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر اور ہماری چائے پی کر ہمیں لتاڑا اور کہا۔ یہ سب کیا بکواس ہے۔ ہم نے کہا یہ ہماری ثقافت ہے! وہ بولا کہ ثقافت کوئی مردہ شے نہیں کہ اسے ڈرائینگ روم کے میوزیم میں سجا دو۔ ثقافت ہماری روزمرّہ کے تہذیبی عمل اور ردِ عمل کا نام ہے۔ اس کے عاملی اسباب پر متفکر ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے وطن کی تاریخ جغرافیہ ہی ہماری ثقافتی شناخت ہے۔

لیکن اس پروفیسر دوست کی کوئی بات ہمارے پلّے نہ پڑی کیونکہ ان دنوں ہم نے ابھی منشی فاضل نہیں کیا تھا۔ جب ہم نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا (ویسے آپس کی بات ہے کہ صحافت ایسے مشن کو پیشہ کہنا خاصی غیر ثقافتی حرکت ہے) ہاں تو جب ہم ثقافت میں آئے تو ایک روز ایڈیٹوریل سٹاف کی میٹنگ میں فیصلہ ہوا کہ اخبار میں فنون و ثقافت کے بارے میں ایک ہفتہ وار ایڈیشن شروع کیا جائے۔ ہم نے اس ایڈیشن کے لئے رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کر دیں۔

اِدھر اُدھر سے دو چار مضامین لے کر جب ہم نے دو چار ایڈیشن شائع کئے تو ماہر ثقافت کے طور پر ہماری دھوم مچ گئی۔ شہر میں جہاں کہیں کوئی موسیقی کی محفل ہوتی، کوئی مصوری کی نمائش ہوتی، کوئی ادبی مذاکرہ ہوتا، کوئی فوک آرٹ کی تقریب ہوتی ہمیں مہمانِ خصوصی بنایا جاتا اور ہم وہاں ایسی ایسی ماہرانہ رائے دیتے کہ فنونِ لطیفہ کو سچے دل سے سمجھنے والوں کا دل چاہتا کہ وہ ہمیں جوتیاں ماریں لیکن وہ فائن آرٹس کا خون ہوتے دیکھ کر اس خیال سے خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتے کہ ہمیں اپنے اس اخباری ایڈیشن میں اس تقریب کی رپورٹ بھی لکھنا ہوتی تھی یعنی ثقافت ہماری کمزوری تھی اور پبلسٹی ثقافت والوں کی۔

ہماری حماقت آلود خود سری کا یہ عالم تھا کہ ایک بار ایک محفل موسیقی میں ایک نامور موسیقار نے ایک راگ چھیڑا۔ ہم نے داد دی۔ "واہ واہ، سبحان اللہ! کیا خوب صورت مالکونس ہے"۔ ایک صاحب نے ہمیں ٹوکا کہ یہ مالکونس نہیں جے جے ونتی ہے —— ہم نے فوراً ایک لیکچر پلا دیا کہ کن کن تالوں اور پلٹوں سے راگ جے جے ونتی راگ مالکونس بن جاتا ہے۔ وہ صاحب یوں ہکّا بکّا رہ گئے جیسے ہماری عقل کا ماتم کر رہے ہوں۔ ہماری اس ماہرانہ شہرت کا ہی نتیجہ تھا کہ ہم قومی

ثقافت کے موضوع پر ہونے والی دو قومی کانفرنسوں اور ایک بین الاقوامی کانفرنس میں مدعو ہو چکے ہیں اور نہ جانے آئندہ کہاں کہاں گل کھلائیں گے۔

ایک بار ہم نے اپنے محلے کے ایک حلوائی کو کچے میں دہی بلوتے دیکھ کر پوچھا: "معلوم ہے تم کون سا ثقافتی عمل کر رہے ہو؟" وہ حیران ہو کر بولا "کیوں جی! میں کوئی جرم کر رہا ہوں؟" ہم نے کہا "نہیں، ہم نے صرف یہ پوچھا ہے کہ کیا کر رہے ہو؟" وہ بولا "دیکھ نہیں رہے ہو کہ میں دہی رڑک کر لسی بنا رہا ہوں، تم کیا کر رہے ہو؟"

اب ہم کیا جواب دیتے کہ ہم ایسے ماہرین، ثقافت کی دہی رڑک کر مفادات کی لسی بناتے ہیں اور پھر اسے ڈبے کے بھاؤ بیچتے ہیں۔ آخر ثقافت کی دوکانداری بھی تو قائم رکھنی ہے نا، کیا خیال ہے آپ کا؟

سید انور

شہزاد منظر

اردو کے مشہور افسانہ نگار سید انور نصف صدی تک مسلسل افسانے لکھتے رہنے کے بعد ۶ مارچ ۱۹۹۰ء کو ۷۴ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ ان کا شمار ۱۹۴۰ء کے عشرے میں منظر عام پر آنے والے اردو کے ممتاز افسانہ نگاروں میں ہوتا تھا۔ ان کا تعلق افسانہ نگاروں کی اس نسل سے تھا، جن میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی، اختر اورینوی اور سہیل عظیم آبادی وغیرہ شامل تھے۔ ۱۹۴۰ء کا عشرہ اردو ادب کا سنہرا دور کہلا سکتا ہے۔ اس دور میں بڑے بڑے شاعر، افسانہ نگار، نقاد اور دانشور پیدا ہوئے اور اپنی تخلیقات کے ذریعے اردو ادب میں گراں قدر اضافہ کیا۔ سید انور اس نسل کے اہم افسانہ نگار تھے، لیکن اس وقت انہیں صف اوّل کے افسانہ نگاروں میں اس لئے شمار نہیں کیا گیا کہ وہ اس دَور کے مزاج اور فیشن کے مطابق افسانے نہیں لکھتے تھے، یعنی ان کے افسانے سیاسی اور انقلابی نوعیت کے نہیں ہوتے تھے۔ وہ برصغیر ہندوستان میں انقلابی جدوجہد کا زمانہ تھا۔ ترقی پسند ادبی تحریک اپنے نقطۂ عروج پر تھی اور صرف ایسے افسانوں اور نظموں کی پذیرائی ہوتی تھی جن میں انقلابی جوش و خروش، کٹر گرم حب الوطنی اور سامراج دشمنی کا جذبہ موجزن ہو یا جن میں مزدور، کسان اور متوسط طبقے کے بھوک افلاس کے مسائل بیان کئے گئے ہوں۔ دوسری جانب اس دور میں مقبولیت ان افسانہ نگاروں کو حاصل تھی جو جنس کے موضوع پر نہایت جرأت اور بے باکی کے ساتھ افسانے لکھ رہے تھے۔ سید انور ان دونوں قسموں کے افسانہ نگاروں سے مختلف تھے۔ اس لئے اس دور میں انہیں زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔ جس طرح اس زمانے میں غلام عباس کو زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہوئی حالانکہ غلام عباس نے اس دور میں بھی بعض اچھے اور خوب صورت افسانے لکھے۔ لیکن نقادوں نے بحیثیت مجموعی ان دونوں افسانہ نگاروں کو نظر انداز کیا اور ترقی پسندی کی باڑھ بھڑ میں ان کے افسانے دب کر رہ گئے۔ البتہ جوں جوں وقت گزرتا گیا غلام عباس اور سید انور ابھر کر سامنے آگئے۔ انہیں صحیح معنوں میں قیام پاکستان کے بعد اہمیت حاصل ہوئی۔ اس ضمن میں غلام عباس، سید انور کی بہ نسبت زیادہ خوش قسمت واقع ہوئے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ سید انور سے سینئر تھے اور ۳۶-۱۹۳۵ء سے افسانے لکھ رہے تھے۔ دوسری وجہ یہ کہ ان پر محمد حسن عسکری، احتشام حسین اور عصمت چغتائی جیسے بڑے ادیبوں نے مضامین لکھے تھے۔ اس کے برعکس مجھے یاد نہیں کہ اس دور کے کسی اہم افسانہ نگار یا نقاد نے انور کی افسانہ نگاری پر کوئی مضمون لکھا ہو۔ سید انور کو اس بات کا شدید احساس تھا لیکن وہ پبلک ریلیشنگ کے فن سے ناآشنا تھے، اس لئے خاموش تھے اور کسی سے شکوہ شکایت نہیں کرتے تھے۔ اگر وہ زمانہ ساز ہوتے تو وہ بھی مدیروں سے کہہ کر اپنا گوشہ نکلوا سکتے تھے۔ ان علمی اور ادبی اداروں نے بھی ان کی پذیرائی نہیں کی جو دُور دراز مقامات سے مشاہیر ادب کو بلا کر ان کی پذیرائی کرنے میں شہرت رکھتے تھے۔ سید انور کو اس کا شدید احساس تھا کہ ناقدین نے اردو افسانہ نگاری کا

جائزہ لیتے وقت ان سے کبھی انصاف نہیں کیا، جبکہ وہ ۴۰ سال سے مسلسل افسانے لکھ رہے ہیں۔

سید انور ۱۵ فروری ۱۹۲۶ء کو پنجاب کے ضلع لدھیانہ کے گاؤں کوٹلا جنیر میں ایک انتہائی مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے پردادا کا شمار برصغیر کے ان برگزیدہ علمائے کرام میں ہوتا تھا جو انگریزوں اور انگریزی تعلیم و تہذیب کے شدید مخالفوں میں شامل تھے۔ چنانچہ ان کا سرسید احمد خاں اور ان کے ہم نواؤں سے فطری طور پہ تصادم ہوا اور وہ طویل عرصے تک سرسید اور ان کے رفقائے کار کے خلاف محاذ آرائی میں مصروف رہے۔ سید انور کے دادا کی بھی قطعی مذہبی ماحول میں پرورش ہوئی۔ وہ پنجابی زبان کے شاعر اور اپنے دور کے مشہور صوفی تھے اور "مولانا روم" کے نام سے پنجابی میں شاعری کرتے تھے۔ وارث شاہ کی ہیر پڑھنے میں انہیں ملکہ حاصل تھا جس کی وجہ سے انہیں بڑی شہرت حاصل تھی۔ ان کے مریدوں کا حلقہ بہت وسیع تھا اور وہ دور افتادہ علاقوں میں پیر کی حیثیت سے مشہور تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ ایک سید محمد حسن شاہ اور دوسرے سید محمد حسین شاہ۔ سید انور، سید محمد حسن شاہ کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی کا نام اصغر حسین اور سرور حسین (مرحوم) ہے۔ ان کی والدہ کا نام مخدومن بی بی (رضیہ) ہے۔ ان کے دادا بھی انگریزی تعلیم و تہذیب کے شدید مخالف تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی اولاد انگریزی تعلیم حاصل کرے۔ لیکن سید انور کے والد سید محمد حسن شاہ جدید دور کے تقاضوں سے واقف تھے۔ وہ اپنے قدامت پسند ماحول میں شدید گھٹن محسوس کرتے تھے۔ ان کے اندر رفتہ رفتہ خاندان سے سرکشی اور ماحول سے بغاوت کا جذبہ پیدا ہونے لگا اور وہ اپنے ماحول سے فرار ہونے کی خواہش محسوس کرنے لگے۔ وہ اس کے لئے مناسب موقع کی تلاش میں تھے۔ سید انور کی دادی کا انتقال ہونے پر ان کے دادا نے ان کے والد کو لدھیانہ سے کفن لانے کے لئے بھیجا۔ انہوں نے گھر سے فرار ہونے کے لئے اس موقع کو غنیمت جانا۔ وہ کفن لانے کے لئے گئے تو پھر واپس نہیں آئے اور لدھیانہ میں جا کر سیدھے انڈین پولیس فورس میں شامل ہو گئے۔

سید انور کا خیال تھا کہ ان کے والد سید محمد حسن شاہ کا یہ ایک انقلابی اور ترقی پسند اقدام تھا۔ وہ اگر اپنے دقیانوسی ماحول سے بغاوت نہ کرتے تو وہ اور ان کی آئندہ نسلیں قدامت پسندی اور دقیانوسیت کی راہ پہ گامزن رہتیں۔ اس اعتبار سے سید انور اپنے والد بزرگوار کے اس اقدام کو قدر کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ ان کے والد اگرچہ زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھے لیکن انہوں نے اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی اور جدید تعلیم و تہذیب کے حصول میں ان کی مدد کی۔

سید انور زمانۂ طالب علمی سے ہی شعر و ادب کے شائق اور ذہین طالب علم تھے۔ انہوں نے آٹھویں جماعت میں وظیفہ حاصل کیا اور ثانوی تعلیم مکمل کرنے کے بعد کالج میں اسکالرشپ حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ انہوں نے تعلیم کے لئے اپنے والد پہ بوجھ نہیں ڈالا اور ٹیوشن پڑھا کر اپنے تعلیمی اور ذاتی اخراجات پورے کرتے رہے۔

سید انور نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا اور اپنا تخلص انور تجویز کیا، لیکن جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، ان میں اسکول کے زمانے سے ہی ادبی ذوق پیدا ہو چکا تھا جو کالج میں پہنچنے کے بعد مزید پروان چڑھا۔ کالج کے زمانے میں ان میں فکری انقلاب برپا ہوا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ہمارا معاشرہ انتہائی پس ماندہ ہے۔ اس کی بنیادی وجہ فکر و خیال کی فرسودگی ہے۔ ان کے والد اگرچہ ایک روشن خیال شخص تھے، لیکن ان کا گھریلو ماحول ہنوز دقیانوسی تھا۔ انہوں نے چھوٹی عمر سے ہی محسوس کر لیا تھا کہ ان کے گھر والوں نے مذہب کو سادہ لوح عوام کے استحصال کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ ان پڑھ عوام کی سادہ لوحی سے پیری مریدی کے پردے میں مالی فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ چنانچہ ان میں بغاوت کا جذبہ بیدار

ہو گیا۔ انہوں نے دوران تعلیم اپنے مطالعے کو صرف شعر و ادب تک محدود نہیں رکھا۔ مذہب، تاریخ اور سیاسیات وغیرہ سے متعلق جو بھی کتابیں ملیں، پڑھ ڈالیں۔ ان کتابوں کے مطالعے سے وہ اس دور کی ادبی، سیاسی اور فکری تحریکوں اور رجحانات سے متاثر ہوئے۔ ابتدا میں ان پر علامہ اقبال کا گہرا اثر ہوا۔ اس دور میں اقبال ہی اپنے عہد کے سب سے بڑے شاعر تھے، لہٰذا وہ اقبال کے رنگ میں نظمیں کہنے لگے۔

سید انور نے ۱۹۳۱ء میں گورنمنٹ اسکول لدھیانہ سے میٹرک کیا۔ انہوں نے جب ۱۹۳۸ء میں گورنمنٹ کالج لدھیانہ سے گریجوایشن کیا تو ان کے سامنے دو راہیں تھیں، مزید تعلیم کے لئے لاہور جانا (اس دور میں لدھیانہ میں ایم۔ اے تک کی تعلیم کا انتظام نہیں تھا) یا پھر ملازمت کا حصول۔ انہوں نے دوسری راہ اختیار کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دوسری عالمی جنگ کے بادل منڈلا رہے تھے۔ اسپین میں خانہ جنگی کے بہانے اتحادی اور محوری طاقتوں کے درمیان عالمی جنگ کی مشقیں شروع ہو چکی تھیں اور عہد آفریں تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ ملک کا نوجوان طبقہ عجیب اضطراری کیفیت میں مبتلا تھا۔ سارے ہندوستان میں جنگ آزادی نے شدت اختیار کر لی تھی۔ سیاسی بے چینی دور کرنے اور ہندوستانیوں کو مطمئن کرنے کے لئے صرف دو سال قبل ۱۹۳۵ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ نافذ کیا گیا تھا۔ صوبوں کو داخلی خود مختاری دی جا چکی تھی۔ اس کے باوجود سیاسی بے چینی ختم نہیں ہوئی تھی۔ ہندوستان میں مزدوروں کی پہلی کل ہند تنظیم "انڈین ٹریڈ یونین کانگریس" قائم ہو چکی تھی۔ اسی دور میں انڈین کمیونسٹ پارٹی اور انجمن ترقی پسند مصنفین بھی قائم ہوئی تھی اور سارے ہندوستان میں انقلاب روس کے زیر اثر سوشلزم کو پسندیدہ نگاہ سے دیکھا جا رہا تھا اور مارکس، اینگلز اور لینن کے تصورات مقبول ہونے شروع ہو گئے تھے۔ اس وقت تک مسلم لیگ اور ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے لئے علیحدہ وطن کا مطالبہ نہیں کیا تھا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مفاہمت کی کوششیں جاری تھیں۔ اسی دور میں نیاز فتح پوری اور عبدالماجد دریاآبادی نے نوجوان طبقے کو فکری طور پر متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ سید انور کو دوران تعلیم اور اس کے بعد علامہ نیاز فتح پوری اور مولانا عبدالماجد دریاآبادی کی تحریروں کے مطالعے کا اتفاق ہوا اور وہ ان سے گہرے طور پر متاثر ہوئے۔

سید انور نے کالج کے زمانے میں مغربی مصنفوں، بخصوص گالزوردی، سامرسیٹ مام اور جارج برنارڈ شا سے متاثر ہوئے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس دور کے زیادہ تر دانش ور جن مغربی مصنفین سے متاثر ہوئے ان میں برٹرینڈ رسل اور جارج برنارڈ شا شامل تھے۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ۱۹۳۰-۴۰ء کی دہائی میں منظر عام پر آنے والے ہندوستانی ادیبوں نے جس انقلابی ماحول میں قلم سنبھالا، اس میں صرف شا ہی ایسے مصنف تھے، جن کی "فے بین ازم" محکوم ہندوستان کے نوجوان ادیبوں کو اپیل کر سکتی تھی۔ اس وقت سائنٹفک سوشلزم یا کمیونزم پر کڑی پابندی عائد تھی اور ہندوستان میں مشکل ہی سے مارکسزم اور کمیونزم کے بارے میں کتابیں دستیاب تھیں۔ شا کے اثر نے سید انور کو اپنے خیالات و جذبات کے اظہار کے لئے ذریعۂ اظہار تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا اور انہوں نے شاعری ترک کر کے افسانہ لکھنا شروع کر دیا۔ سید انور نے شا سے متاثر ہو کر ڈرامے کے بجائے افسانے کی صنف کی جانب توجہ کیوں دی؟ سید انور نے اس بارے میں بتایا کہ چوں کہ اردو میں جدید اسٹیج کا کوئی وجود نہیں تھا اور نہ اردو میں ڈرامانویسی کی توانا روایت موجود تھی۔ اس لئے انہوں نے افسانے کی جانب توجہ دی۔ اس دور میں اگر اردو میں ڈرامانگاری کی روایت موجود ہوتی تو وہ شاید ڈرامے لکھنا شروع کر دیتے۔ انہوں نے افسانے کو ہی ذریعۂ اظہار بنایا اور اپنا خاندانی نام ترک کر کے صرف "انور" کے نام سے لکھنا شروع کر دیا۔ نام خفیہ رکھنے کی ایک وجہ بحریہ کی ملازمت بھی ہو سکتی ہے۔ اس دور میں سوائے شفیق الرحمٰن اور انور کے متحدہ ہندوستان کی مسلح افواج میں اور کوئی ادیب موجود

نہیں تھا۔ اعلانیہ افسانے لکھنے یا شاعری کرنے کے لئے فوجی حکام سے تحریری اجازت لینی ضروری تھی۔ فیض، راشد اور چراغ حسن حسرت وغیرہ بہت بعد میں انگریزی فوج میں شامل ہوئے۔

کالج کے زمانے میں ہی سید انور کی ساحر لدھیانوی، حمید اختر، شفیع منصور، علامہ لطیفی، ابن انشاء، ظہور نظر اور پنچھی باورا سے دوستی ہو گئی تھی۔ ان ابھرتے ہوئے ادیبوں اور شاعروں کی صحبت میں سید انور کے خیالات کو اور بھی جلا ملی۔ ۱۹۳۸ء میں ان کے رشتے کی بہن اقبال فاطمہ سے ان کی شادی ہو گئی۔ اس کے ایک سال بعد انہوں نے ۱۹۳۹ء میں رائل انڈین نیوی میں بحیثیت ایجوکیشن آفیسر ملازمت کر لی۔ انڈین نیوی میں ملازمت کے دوران انہوں نے کئی بے مثال افسانے لکھے۔ بحریہ سے وابستہ ہونے کے باعث انہیں کافی پڑھنے، لکھنے اور سیر و سیاحت کرنے کا موقع ملا۔

سید انور کا پہلا افسانہ "جنگ کو جانے والے جہاز میں" اگست ۱۹۴۰ء کے ماہنامہ "نگار" لکھنؤ میں شائع ہوا۔ یہ افسانہ انہوں نے زمانہ جنگ میں عدن میں لکھا تھا۔ اس دور میں "نگار" اردو کے صف اول کا ادبی اور علمی جریدہ تھا اور اس میں مجنوں گورکھپوری جیسے مشہور اہلِ قلم کے افسانے شائع ہوتے تھے۔ اس دور کے "نگار" میں کسی نئے ادیب کا شائع ہو جانا اس کے مستند ادیب ہونے کا ثبوت تھا۔ سید انور کے اس افسانے کی نیاز فتح پوری نے بڑی تعریف کی اور ان کی فن کارانہ صلاحیت کو پُر شکوہ الفاظ میں سراہا۔ ان کا دوسرا افسانہ "اعتراف گناہ" ۱۹۴۱ء میں ماہنامہ "نگار" لکھنؤ میں ہی شائع ہوا، جس کا نیاز فتح پوری نے نام بدل کر "جہاد" رکھ دیا۔ ان کا تیسرا افسانہ "بادلوں کے پیچھے" ۱۹۴۲ء میں "ساقی" دہلی میں شائع ہوا۔ اس کے بعد وہ "ساقی" اور "جامعہ" دہلی جیسے معروف رسائل میں باقاعدگی سے شائع ہونے لگے۔

وہ ۱۹۴۱ء میں متحدہ ہندوستان کے نیول ہیڈ کوارٹر (بمبئی) میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہوئے۔ یہیں ان سے اس دور کے مشہور ادیبوں مثلاً کرشن چندر، ابراہیم جلیس، میراجی اور کالج کے دوست ساحر لدھیانوی اور حمید اختر سے ملاقات ہوئی اور وہ انجمن ترقی پسند مصنفین (بمبئی) کی تنقیدی نشستوں میں باقاعدگی سے شریک ہونے لگے۔ ترقی پسندوں سے گہری یاری کے باوجود وہ کبھی اشتراکیت کے حامی نہ بن سکے، البتہ وہ برنارڈ شا کی طرح مزاجاً لبرل اور انسان دوست تھے۔ انہیں روس کے مشہور دانشور اور انقلابی رہنما ٹراٹسکی کے قتل کا بے حد صدمہ تھا، جسے اسٹالن نے میکسیکو میں قتل کروا دیا تھا۔ سوشلزم کے مطلقیت پسند نظام کو پسند نہ کرنے کے باوجود انہیں اس کے انسان دوستانہ پہلو سے ہمدردی تھی۔

ان کے افسانوں کے ابھی تک تین مجموعے "آگ کی آغوش میں" (مطبوعہ ۱۹۴۶ء) "منزل کی طرف" (مطبوعہ ۱۹۵۰ء) اور "سورج بھی تماشائی" (مطبوعہ ۱۹۶۲ء) اور ایک ناول "ایک اور سومنات" (مطبوعہ ۱۹۸۰ء) شائع ہو چکا ہے اور افسانوں کے دو مجموعے "مستقبل کی خوشبو" اور "گہرے سمندروں میں" اور ایک ناولٹ "خوشبو کا خون" (جو "مقدس مریم" کے عنوان سے "نقوش" میں چھپ چکا ہے) زیرِ طبع ہیں۔ ان کا ناول "ایک اور سومنات" ۱۹۸۱ء کی ابتدا میں شائع ہوا تھا۔ یہ ناول اس اعتبار سے منفرد ہے کہ بحریہ کی زندگی کے بارے میں یہ اردو میں پہلا ناول ہے۔ "ایک اور سومنات" ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ جس میں انہوں نے اپنی بحری زندگی کے تجربات پیش کئے ہیں۔ ناول ۴۸ گھنٹے کے واقعات پر مشتمل ہے یعنی ناول ۶ ستمبر کو دوارکا پر حملے سے شروع ہوتا ہے اور ۷ ستمبر ۱۹۶۵ء کو ختم ہو جاتا ہے۔ اس ناول میں انہوں نے جنگ اور امن کے فلسفے سے اپنے مخصوص انداز میں بحث کی ہے۔

اس مختصر سے مضمون میں ان کے افسانوں کا تجزیہ ممکن نہیں ہے۔ میں نے مرحوم سے ان کی زندگی اور فن پر کتاب لکھنے

کا وعدہ کیا تھا۔ انشاء اللہ میں یہ وعدہ ضرور پورا کروں گا۔ ان کے فن کے بارے میں صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ انہیں افسانے لکھنے کا فن آتا تھا۔ ان کے افسانوں کی سب سے بڑی خوبی چست پلاٹ، کہانی کی گٹھی ہوئی بُنت، گہرا سماجی طنز اور شعور اور ڈرامائیت ہے۔ ان کے افسانوں میں آخر الذکر خوبی جارج برنارڈ شا کے ڈراموں کے مطالعے سے پیدا ہوئی تھی۔ ان کے افسانوں میں مکالمے کی فراوانی بھی ڈرامے سے ان کی دلچسپی کی مرہونِ منت ہے۔ وہ اردو کے ان افسانہ نویسوں میں سے تھے جن کے افسانوں میں کلاسیکی افسانے کی ساری خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں بلا کی ریڈیبلیٹی ہوتی تھی۔ افسانے کا پہلا پیراگراف پڑھتے ہی قاری مصنف کے سحر میں گرفتار ہو جاتا تھا۔ ابتدا میں جو سسپنس پیدا ہوتا تھا وہ افسانے کے آخر تک قائم رہتا تھا۔ یہ کرافٹ مین شپ آج کے دور میں تقریباً ناپید ہو چکی ہے۔ اس کا اندازہ ان کے افسانے "خون" "کند ہم جنس باہم جنس" "جنس اور جنیس" "جگنو کی روشنی" "مقدس مریم" اور ان کے دیگر افسانوں کے مطالعے سے ہوتا ہے۔ وہ عموماً زندگی کی حقیقتوں اور سچے واقعات سے افسانے کا موضوع منتخب کرتے تھے جس کی وجہ سے ان پر کئی بار مقدمہ چلتے چلتے رہ گیا تھا۔ انہوں نے میراجی اور دوسرے بہت سے سچے کرداروں پر افسانے لکھے۔ انہوں نے افسانے کے لئے بعض ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جن پر ان سے قبل کسی نے افسانہ نہیں لکھا مثلاً "خون" یا بحریہ کی زندگی اور اس کے تجربات پر ان کا شاہکار افسانہ "کند ہم جنس باہم جنس" اور "مقدس مریم" وغیرہ۔ "مقدس مریم" اردو میں جنریشن گیپ کے موضوع پر لکھا جانے والا پہلا افسانہ ہے۔

سید انور کی افسانہ نگاری کا ۴۰ سال سے زیادہ مدت پر محیط ہے۔ اس دوران انہوں نے لاتعداد افسانے لکھے جن میں بعض افسانے اردو کے بہترین افسانوں میں شمار کئے جا سکتے ہیں، لیکن افسوس موجودہ نسل ان کے ادبی کارناموں سے زیادہ واقف نہیں ہے۔ اس لئے کہ ان کے افسانوں کے تمام مجموعے نایاب ہیں۔ ۴۰ سال تک مسلسل افسانے لکھنے کے باوجود کسی نقاد نے ان کی طرف توجہ نہیں کی اور نہ ان افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ کیا۔ حد تو یہ ہے کہ اردو افسانے کے بارے میں لکھتے وقت ان سے انصاف کبھی نہیں کیا گیا۔ اس لئے اگر انہیں نقادوں سے عدم توجہی اور ناقدری کی شکایت تھی تو کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ مصطفٰے زیدی نے اپنے شعری مجموعے "کوہ ندا" میں لکھا ہے کہ ریکوگنیشن کے بغیر ہمیشہ شعر کہتے رہنا ناممکن ہے، لیکن سید انور نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ ناقدین کی عدم توجہی اور ناقدری کے باوجود مسلسل لکھتے رہنے کی سکت رکھتے تھے۔ انہیں اپنے فن پر کامل اعتماد تھا۔ انہیں یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن ان کی بھرپور پذیرائی ہوگی۔ لوگ ان کی قدر کریں گے اور اردو افسانے کی تاریخ میں انہیں جائز مقام مل کر رہے گا۔

ابوالعلاء معرّی

عربی شاعری میں فکر و فلسفہ اور یاس و برہمی کی آواز

محمد کاظم

- یہ زندگی تمام کوفت اور تھکن ہے
  مجھے حیرت اُس پر ہے جو زیادہ جینے کی آرزو رکھتا ہے
- تم رہین آفات زمانہ ہو، اور ان سے کبھی رہائی نہ پاؤ گے
  چاہے اس امید میں کتنے ہی گرما و زمستاں گزار دو
- اے موت! اب نزول کر کہ یہ زندگی مذموم ہو چلی ہے
  اور اے نفس! متانت کا دامن تھام کہ زمانے نے تمسخر اختیار کیا ہے

اپنی قبر کے لئے کتبہ

- یہ ظلم میرے باپ نے مجھ پر کیا تھا، میں نے یہ ظلم کسی پر نہیں کیا

زندگی کے بارے میں یہ خیال کہ یہ مصائب و آلام کا مجموعہ ہے جن سے انسان مر کر ہی نجات پا سکتا ہے، کوئی نیا نہیں ہے۔ جب سے انسان نے ہوش سنبھالا ہے اور اس زندگی کے بارے میں سوچنا شروع کیا ہے، اُس نے اپنے آپ کو عموماً دکھوں میں گھرا ہوا اور مسائل و مشکلات سے دوچار ہی محسوس کیا ہے۔ اس کا یہ احساس جب شدت اختیار کر لیتا ہے تو زندگی اس کے لئے ایک بوجھ بن جاتی ہے اور وہ تمنا کرنے لگتا ہے کہ کاش وہ اس دنیا میں نہ آیا ہوتا —— مسیح سے سات سو برس پہلے یونانی شاعر ہومر، جو ویسے ایک خوش فکر شاعر تھا، اپنی رزمیہ نظم "ایلیڈ" میں کہتا ہے: "جتنی چیزیں بھی یہاں (اس دنیا میں) ہیں اور سانس لیتی ہیں، ان میں انسان سے زیادہ بدنصیب اور کوئی نہیں"۔ پھر پانچویں صدی قبل مسیح میں یونان ہی کا تمثیل نگار سوفوکلیز اپنے ایک المیہ ڈرامے "ایڈی پس اٹ کولونس" میں لکھتا ہے کہ "اس دنیا میں پیدا نہ ہونا سب سے اچھی اور پسندیدہ بات ہے۔ لیکن جب انسان ایک دفعہ پیدا ہو جائے تو پھر اس سے اچھی بات اور کوئی نہیں کہ جتنا جلد ہو سکے وہ وہیں لوٹ جائے جہاں سے آیا تھا" —— ادھر مشرق میں بدھ مت کی ابتدا ہی اس نظریے سے ہوتی ہے کہ برائی اور دکھ انسان کی ذات میں ازل سے موجود ہیں، اور یہ زندگی اپنی حقیقت میں ایک معصیت ہے جس سے انسان کو، جب تک اس میں شعور و آگہی باقی ہے، کبھی نجات نہیں ملے گی۔ اس کے پس منظر میں ویدانت کا وہ فلسفہ ہے جس کے مطابق آتما (روح) ہی اصل اور حقیقت ہے، باقی جو کچھ ہے (یعنی یہ دنیا اور اس کے مظاہر) سب مایا ہے، دھوکا ہے، سراب ہے؛ اس لئے خرابی اور برائی اس کے خمیر میں رچی ہوئی ہے، اور وہ شخص بڑا نادان ہے جو عکس کو اصل سمجھ لیتا ہے اور اپنی جان ایسی باتوں میں کھپائے رکھتا ہے جو سراسر بے حقیقت اور فریب ہیں۔

ہند و یونان کے حکما اور ادبا کے یہاں سوچ کا یہ انداز تو سمجھ میں آتا ہے کہ اس کے پیچھے فکر و دانش کی ایک تاریخ تھی، ایک طویل روایت تھی۔ لیکن جب خلافتِ عباسیہ کے مسلم معاشرے میں پروان چڑھنے والا ایک عرب شاعر اُٹھ کر اس طرح کی بات کرتا ہے کہ

تعبُ ھذہ الحیاۃ فما أعـــجبُ الّا من راغبٍ فی ازدیاد

یہ زندگی تمام کوفت اور تھکن ہے۔ مجھے حیرت اُس پہ ہے جو اس میں زیادہ جینے کی آرزو کرتا ہے

یا وہ اپنے اردگرد ہونے والے ظلم اور ناانصافی سے مایوس ہو کر موت کی طرف دیکھتا اور اسے آواز دیتا ہے:

فیا موتُ زُرْ إنّ الحیاۃ ذمیمۃٌ

- - - - - - - - - -

اے موت! اب نزول کر کہ یہ زندگی مذموم ہو چلی ہے

- - - - - - - - - - - - -

تو ادب سننے والے کو اچنبھا ہوتا ہے یہ بات کئی اعتبار سے بڑی انوکھی لگتی ہے۔ اوّلاً اس لئے کہ یہ عرب شاعر مذہباً مسلمان تھا، اور اسلام اور دوسرے آسمانی مذاہب کی ایک مشترک خصوصیت یہ ہے کہ ان کی تعلیمات میں حیات بعد الموت کے عقیدے کی وجہ سے رجائیت کا ایک مثبت عنصر بہرحال موجود ہوتا ہے۔ مذاہب کا کہنا یہ ہے کہ اس دنیاوی زندگی بھلے ہی مصائب و آفات سے پُر ہو، آخر چند روزہ ہے اور ایک دن ختم ہو جائے گی، اس کے بعد ایک دوسری زندگی ہے جو ہمیشہ باقی رہے گی، اور اس میں مذہب کی راہ پر چلنے والے انسان کو ان سارے دکھوں، محرومیوں اور ناانصافیوں کے بدلے میں، جو اس نے اس زندگی میں جھیلی ہوں گی، راحت، آسودگی اور عیش دوام میسر ہوگا ---- دوسرے اس وجہ سے کہ ایک عرب شاعر کا زندگی اور اس کے مسائل کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا اور ایک نتیجے پر پہنچنا اور پھر اپنی خاص فکر اور اپنے انفرادی احساس کا اظہار اپنے شعروں میں کرنا اس وقت کی شاعری کی عام ڈگر سے ہٹی ہوئی ایک چیز تھی۔ کوئی شک نہیں کہ عربی شاعری نے زمانۂ جاہلیت سے چل کر عباسی دورِ حکومت کے وسطی زمانے تک پہنچتے پہنچتے بہت سے مدارج طے کر لئے تھے اور اس کی ہیئت اور اسلوب میں بھی خاصی تبدیلیاں واقع ہو چکی تھیں، پھر ہمسایہ عجمی تہذیبوں کے اثر سے اس میں کچھ زاہدانہ و صوفیانہ اور کسی حد تک فلسفیانہ مضامین بھی راہ پانے لگے تھے۔ لیکن اس سارے ارتقا کے باوجود یہ شاعری اپنے روایتی موضوعات (مدح، فخر، مرثیہ، ہجو، وصف و بیان وغیرہ) کے دائرے سے باہر کم ہی نکلی تھی۔ رہا فکر و فلسفہ اور حیات و کائنات کے بارے میں سوچ بچار اور خیر و شر، عقل و وجدان اور جبر و اختیار کے مسائل پر گفتگو اور رائے زنی، تو یہ باتیں اس سے پہلے عربی شاعری کا موضوع کبھی نہیں بنی تھیں اور نہ شعراء نے اپنی نظموں کو اس طرح کی مفکرانہ آراء کے اظہار کا وسیلہ بنانے کی طرف زیادہ دھیان دیا تھا۔

عربی شاعری کو یہ نیا لہجہ دینے اور اسے ایک بالکل نئی راہ پر چلانے والا یہ شاعر ابوالعلاء معرّی تھا جو آج سے تقریباً ایک ہزار سال قبل ملک شام کی ایک آبادی معرّۃ النعمان میں پیدا ہوا اور جس نے خلافتِ عباسیہ کا وسطی زمانہ دیکھا بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں، بسر کیا تھا۔ اس لئے کہ ہوش سنبھالنے سے بہت پہلے اس کی دونوں آنکھوں کی بینائی جاتی رہی تھی اور اس نے زندگی کے اتنے طویل برس نابینائی کے گھپ اندھیرے میں گزارے تھے۔ معرّی عربی ادب کی تاریخ کے ایک ایسے دور کے آخر میں آتا ہے جو عام مؤرخین کے نزدیک نہ صرف سیاسی اعتبار سے بلکہ فکری، ثقافتی اور ادبی اعتبار سے بھی ایک سنہری دور تھا۔ اس (عباسی) دور میں اُس سے پہلے بشار بن بُرد، ابوالعتاہیہ، ابونواس، ابوتمام، بُحتری اور متنبّی جیسے اکابر شعراء گزر چکے تھے۔ اور خصوصیت کے ساتھ متنبّی جیسے قد آور شاعر کے بعد تو یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کے طرزِ سخن کی آب و تاب کے سامنے اب صدیوں تک کسی شاعر کا چراغ نہ جل سکے گا، لیکن متنبّی کے تھوڑا عرصہ بعد ہی ابوالعلاء معرّی کی آواز نے دنیا کو چونکا دیا، اور لوگوں نے دیکھا کہ ایک اور نہایت بڑا جینئس عربی شاعری کے افق پر نمودار ہوا ہے۔ یہ آواز اتنی اچھوتی، اتنی مختلف اور اپنے اندر فکر اور سوچ کا ایسا طاقتور عنصر لئے ہوئے تھی کہ لوگ چاہے اس سے پوری طرح اتفاق کرتے ہوں یا نہ، اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ پھر آگے

چل کر اہلِ مشرق سے زیادہ اہلِ مغرب نے اس شاعر میں دلچسپی لینی شروع کی اور اسے اپنے مطالعے اور تحقیق کا موضوع بنایا۔ چنانچہ پچھلی چند صدیوں میں جتنا کام ابوالعلاء معرّی پر مختلف یورپی ممالک میں ہوا ہے اتنا کسی اور عربی شاعر یا ادیب پر نہیں ہوا۔ انگلستان کے مارگولیتھ سے لے کر جرمنی کے فان کریمر اور بروکلمان تک اور فرانس کے میسینیوں اور ہنری لاؤسٹ سے لے کر روس کے کراچکووسکی تک ایک درجن کے قریب نامور مستشرقین ایسے ہیں جنھوں نے معرۃ النعمان کے اس نابینا شاعر کی زندگی اور فن کے بارے میں بہت قابلِ قدر کام کیا ہے۔

معرّی کی شاعری اور شخصیت میں وہ کیا خاص بات ہے جس میں وہ عربی شعر و ادب کی پوری تاریخ میں اتنا منفرد اور مختلف دکھائی دیتا ہے، اس کی آواز سب آوازوں سے الگ پہچانی جاتی ہے اور اس کے فن پر بحث و تحقیق اور مطالعے و مباحثے کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے؟ ان سوالات کا جواب قاری کو اس مضمون میں مناسب موقعوں پر مل جائے گا تاہم ابتدائی تعارف کے طور پر معرّی کی شخصیت اور اسلوبِ شعر کی بعض نمایاں خصوصیات کا ایک مختصر ذکر یہاں نامناسب نہیں ہوگا۔

—— معرّی پہلا عرب شاعر ہے (اور ایک لحاظ سے آخری بھی) جس نے خالص فکر کو اپنی شاعری کے ایک غالب حصے کا موضوع بنایا، اور ان سب روایتی موضوعات کو جو زمانۂ جاہلیت سے عربی شاعری میں مقبول و مروّج چلے آتے تھے یک قلم ترک کر کے اپنے ایک بڑے اور اہم دیوان "لزوم مالا یلزم" (مختصراً "لزومیات") کو اپنے افکار و نظریات کے لئے وقف کر دیا۔

—— فکری شاعری کرتے ہوئے معرّی نے اپنے کلام کی فن کارانہ تزئین و آرائش سے مکمل اجتناب کیا، اور اپنی شاعری میں حسنِ بیان سے زیادہ ابلاغِ معنی کو اہمیت دیتے ہوئے ایک ایسا سادہ اور بے تکلف طرزِ سخن اختیار کیا جسے دوسری زبانوں میں منتقل کرنا عربوں کی عام شاعری کی بہ نسبت بہت آسان پایا گیا۔[1]

—— اپنی روایات اور مذہبی تعلیمات کے برعکس اس نے ایمان و وجدان کے مقابلے میں عقل و خرد کو برتر وسیلۂ علم قرار دیا اور اپنے شعروں میں عقل کی فضیلت پر زور دیا۔ اس نے مذہب کی ظاہری اور رسمی صورت کی، جو اس وقت معاشرے میں رائج تھی، کھل کر مذمت کی اور ایسا کرتے ہوئے اس نے اسلام سمیت تمام مذاہب کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔

—— اس نے صرف شاعری ہی نہ کی، بلکہ نثر بھی لکھی اور نثر میں ایک رسالہ (رسالۃ الغفران) ایسا لکھا جس کے متعلق مغرب کے بعض اہلِ نظر نے بھی تسلیم کیا کہ اس نے اطالوی شاعر دانتے کی "طربیۂ خداوندی" (Divine Comedy) کے لئے نمونے کا کام دیا تھا۔

—— اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حیات و سرشتِ انسانی کے بارے میں اس نے خالصتہً قنوطی نقطۂ نظر قائم کیا، اور اس دنیا کی زندگی کو سراسر دکھ اور کوفت قرار دیتے ہوئے اسے رد کیا، اور انسان کے "نہ ہونے" کو اس کے "ہونے" سے بہتر بتایا۔ اپنے اس نظریے پر عمل کرتے ہوئے اس نے کبھی شادی نہ کی، کہ اپنی صلب سے کچھ اور انسانی افراد کو اس دنیا میں لانے کا مطلب یہی ہوگا کہ ان کو بھی جینے کے عذاب میں مبتلا کیا جائے۔ چنانچہ اپنی وفات سے قبل اپنی قبر کے لئے اس نے جو کتبہ تحریر کیا وہ اس کے اسی خیال کا اظہار تھا:

هذا جناه ابي عَلَيَّ وما جنيتُ على أحد

یہ ظلم میرے باپ نے مجھ پر کیا تھا، مگر میں نے یہ ظلم کسی پر نہیں کیا

معرّی کی شاعری اور اس کی زندگی کے حالات پڑھتے ہوئے کچھ ایسے سوالات قاری کے ذہن میں ابھرتے ہیں جن کے بارے میں ایک سے زیادہ اور باہم متضاد آرا پائی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ ابوالعلا بنیادی طور پر شاعر تھا، یا مفکر و فلسفی؟ اور جب اپنی فکر میں وہ ایمان و وجدان

[1] یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ترجمے کی چھلنی سے گزر کر جہاں عربوں کی بیشتر قدیم شاعری اپنا بہت سا حسن اور تاثیر کھو دیتی ہے، وہاں معرّی کی شاعری زیادہ کچھ کھوئے بغیر دوسری زبان کے جامے میں بھی اپنا جوہر برقرار رکھتی ہے۔ مغربی دنیا میں اس کی شاعری کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے۔

کے مقابلے میں عقل کی برتری تسلیم کرتا ہے تو کیا وہ ایک مسلمان کہلایا جا سکتا ہے؟ — اسی طرح زندگی کے بارے میں اس کا نقطۂ نظر کیا یہ انسان کو لازماً قنوطیت کی طرف لے جاتا ہے یا یہ اسے محض حقیقت پسندی پر آمادہ کرتا ہے اور اسے زندگی کے روشن پہلوؤں کے ساتھ ساتھ تاریک پہلو بھی دیکھنے کے لئے کہتا ہے۔ اور اگر اس کا یہ رویہ کڑی قنوطیت (Stark pessimism) ہے تو ایسا کیوں ہے؟ اور اس کے پیچھے کیا مخصوص حالات تھے؟ — ابو العلاء معرّی کے بارے میں یہ سوال بہت اہم اور برمحل ہیں، اور ان پر بحث و مناقشے کا سلسلہ جو ایک عرصۂ دراز سے جاری ہے، ابھی تک ختم نہیں ہوا۔ اس مضمون میں ان سوالات میں سے ہر ایک کا ایسا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی جائے گی جو حقائق سے دور بھی نہ ہو اور عقل و روایت کو بھی زیادہ سے زیادہ مطمئن کر سکے!

ابو العلاء معرّی کی زندگی کے بارے میں کچھ جاننے کے لئے ہم تاریخ میں ایک ہزار سال پیچھے چلتے ہیں — یہ دسویں صدی عیسوی کا ربع آخر ہے۔ دولتِ عباسیہ اپنے عروج و شباب کے سنہری دور کو ڈیڑھ صدی پیچھے چھوڑ کر اب ادھیڑ عمر کے عہدِ ضعف و درماندگی سے گذر رہی ہے، جس میں ایران کا بُویہ خاندان بغداد میں آکر امورِ خلافت پر عملاً قابض ہو چکا ہے اور خلیفہ عباسی کی حیثیت محض ایک پنشن خوار اور نام کے حکمران کی رہ گئی ہے جسے بُویہی "امیر الامراء" جب چاہتے ہیں معزول کر دیتے ہیں اور اس کی جگہ دوسرے خلیفہ کو تخت پر بٹھا دیتے ہیں۔ دنیا کے ایک بڑے حصے پر پھیلی ہوئی مسلم سلطنت کا کوئی ایک مرکزِ اقتدار باقی نہیں رہا، بلکہ اقتدار اب چار مراکز پر بٹا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ بغداد میں نام کی حکمرانی عباسی خلیفہ الطائع باللہ کی ہے، جبکہ اصل حکمران بُویہی امیر عضد الدولہ ہے۔ مصر میں فاطمی خلفاء کا سکہ چلتا ہے اور خطبوں میں اولوالامر کے طور پر انہی کا نام لیا جاتا ہے۔ وہ اپنی طاقت کی وجہ سے شام و حجاز کے لئے ایک مستقل خطرہ بنے ہوئے ہیں۔ اُدھر شمالی شام میں — جو ہمارے شاعر کا وطن ہے — بنو حمدان کی چھوٹی سی حکومت قائم ہے، جو اپنا وجود برقرار رکھنے کے لئے شمال میں بازنطینی حکومت سے مسلسل برسرپیکار چلی آتی ہے۔ حمدانی حکومت کے طاقتور، علم دوست اور ادب پرور امیر سیف الدولہ کا عہد ختم ہوئے ابھی چند ہی برس گذرے ہیں، اور نہ صرف شام بلکہ پورے عرب کی فضا میں نامور شاعر متنبّی کے اُن قصائد کی گونج سنائی دیتی ہے جو اس نے اس صاحبِ ذوق امیر کی مدح میں نظم کئے تھے۔ اقتدار کا ایک اور مرکز غرناطہ ہے جہاں بنو امیہ کی اندلسی حکومت کے سب سے طاقتور اور لائق ترین خلیفہ عبدالرحمان الناصر کا عہد تمام ہوئے صرف چودہ برس گذرے ہیں، اور اس کے نتیجے میں اِدھر اُدھر جن فتنوں نے سر اٹھایا تھا اُن سے نیا خلیفہ حکم ثانی نمٹنے میں مصروف ہے۔

اس تاریخی پس منظر میں اب ہم زمان و مکان کے تعین کے ساتھ بات کرتے ہیں — سال ۳۶۳ ہجری (۹۷۳ عیسوی) تھا اور بستی معرۃ النعمان تھی جو حلب کے جنوب میں، دمشق جانے والی شاہراہ پر بیس میل کی مسافت پر واقع ہے۔ یہاں ایک تنوخی خاندان میں جس کے افراد زیادہ تر عالم، قاضی اور شاعر تھے، ۲۸ ربیع الاول کو جمعہ کے روز غروب آفتاب کے وقت ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام احمد اور کنیت ابو العلاء رکھی گئی۔ یہ لڑکا ابھی ساڑھے تین برس کا تھا کہ اس پر چیچک کے مرض نے حملہ کیا جس کے نتیجے میں اُس کا چہرہ تو داغدار ہوا ہی تھا، اس کی بائیں آنکھ کی بینائی بھی جاتی رہی، اور دائیں آنکھ میں سفیدی اترنی شروع ہوئی۔ چھ برس کی عمر کو پہنچ کر یہ لڑکا پوری طرح نابینا ہو گیا، اپنے بچپن کے اس حادثے کا ذکر کرتے ہوئے آگے چل کر ابو العلاء داعی الدعاۃ کے نام اپنے ایک خط میں لکھتا ہے:

و قد علم الله أنّ سمعي ثقيل وبصري عن الابصار كليل: وقُضي عليَّ وانا ابن أربع لا أفرّق بين البازل والرُّبع۔	اللہ جانتا ہے کہ میری سماعت میں نقص ہے اور میری آنکھ دیکھنے سے قاصر ہے۔ جب میں چار برس کا تھا تو میری تقدیر میں یہی لکھا گیا کہ میں اشتر اور بچہ اشتر میں تمیز نہ کر سکوں۔

ایک اور موقع پر وہ رنگوں کی بات کرتے ہوئے کہتا ہے "رنگوں میں سے میں صرف لال رنگ جانتا ہوں، اس لئے کہ چیچک کے مرض میں مجھے جو کپڑا پہنایا گیا تھا وہ کسنبھ[1] میں رنگا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی رنگ میرے ذہن میں نہیں آتا۔" مصنف ابن العدیم نے اس زمانے کے ایک شخص ابو منقذ کا قول نقل کیا ہے جس نے ابو العلاء کو اس کے بچپن میں دیکھا تھا۔ وہ اُس کا حلیہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے "وہ ایک چیچک زدہ چہرے والا بدرُولا کا تھا، ماتا کی وجہ سے اس کی آنکھوں پر سفیدی چھا گئی تھی، اور یوں لگتا تھا جیسے ایک آنکھ سے اسے صرف پرچھائیں سی دکھائی دیتی ہے۔"

ابو العلاء کے گھرانے میں علم تھا، شاعری تھی اور علمی فضا تھی۔ اس گھریلو ماحول اور اس کے نابینا پن نے اس کے لئے ایک ہی راستہ متعین کیا، اور وہ تحصیل علم کا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے والد سے لغت، نحو اور ادب کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اسی طرح اپنے بعض بزرگوں اور ایک عالم یحییٰ بن مسعر سے حدیث کا درس لیا۔ اس کے بعد وہ حلب چلا گیا، اور وہاں جا کر اس نے سیف الدولہ کے دربار کے مشہور نحوی اور ماہر آثار، ادب و تاریخ ابن خالویہ کے حلقے کے اہل علم سے ادب و لسانیات میں اکتساب فیض کیا۔ شام کے اکثر شہروں میں اُن دنوں کتب خانے ہوا کرتے تھے۔ صرف حلب میں بیس ہزار کتابوں کا ذخیرہ موجود تھا۔ جب ابو العلاء نے اس علمی خزانے سے فیض حاصل کر لیا تو مزید علم کی جستجو میں اس نے انطاکیہ اور طرابلس کا رخ کیا۔ انطاکیہ اُن دنوں بازنطینیوں کے قبضے میں تھا اور یہاں، اور طرابلس میں امراء اور اہل ثروت نے بڑے بڑے کتب خانے قائم کر رکھے تھے۔ ابو العلاء نے ان کتب خانوں سے جی بھر کر فائدہ اٹھایا اور اپنے مطلب کی بہت سی تصانیف کو سن کر اپنی یادداشت میں محفوظ کر لیا۔

انسانی صلاحیتوں کے معاملے میں قدرت کا دستور کچھ ایسا ہے کہ اگر ایک طرف وہ ایک در بند کرتی ہے، تو دوسری طرف وہ ایک اور در کھول دیتی ہے۔ معری کی آنکھوں کا نور جب زائل ہو گیا تو قدرت نے اس کی تلافی اس طرح سے کی کہ اسے ایک بے پناہ حافظے کی دولت عطا کی۔ معری کا قول ہے کہ "میں نے ایسی کوئی چیز نہ سنی جسے میں نے حفظ نہ کر لیا ہو، اور ایسی کوئی چیز حفظ نہ کی جسے میں بعد میں بھول گیا ہوں۔" ابن العدیم اپنی کتاب "الانصاف" میں ابن منقذ سے روایت کرتا ہے کہ انطاکیہ کے ایک کتب خانے کے خازن نے مجھ سے کہا:

> "ہم نے تمہارے لئے ایک ایسی عجوبہ چیز چھپا رکھی ہے کہ اس طرح کی چیز تم نے کبھی دیکھی نہ سنی ہوگی۔ ایک نابینا لڑکا ہے جو روزانہ یہاں آتا ہے اور میں نے چند دن میں اسے متعدد کتابیں یاد کرا دی ہیں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ میں کتاب کا ایک یا دو باب اسے پڑھ کر سناتا ہوں، تو وہ ان میں سے بعض مقامات، جن کے بارے میں اُسے شک ہوتا ہے دوبارہ سنتا ہے، اور پھر وہ پورے کے پورے باب اپنے حافظے سے سنا دیتا ہے ...... چنانچہ وہ اس عجوبہ چیز کو میرے سامنے لایا، تو میں نے دیکھا کہ وہ ایک چیچک زدہ چہرے والا بدرو سا لڑکا تھا ..... اور ایک طویل القامت شخص، جو شاید اس کا کوئی رشتے دار تھا، اس کا ہاتھ تھامے پھرتا تھا۔"

ایک روایت جس میں شک کرنے کی مجھے کوئی وجہ دکھائی نہیں دیتی، یہ ہے کہ طرابلس جاتے ہوئے جب ابو العلاء شہر لاذقیہ سے گذرا تو وہاں دَیرِ فاروس میں ٹھہرا۔ اس دَیر میں ایک راہب رہتا تھا جو اگلے وقتوں کے کچھ علوم کی باتیں کیا کرتا تھا۔ یہاں اُس کی زبانی ابو العلاء نے قدیم فلاسفہ کے کچھ ایسے اقوال سُنے جنہوں نے اسے اپنے بعض عقائد کے بارے میں شک میں مبتلا کر دیا، اور اس سے ان اقوال کا کوئی رد نہ بن پڑا۔ چنانچہ عام خیال یہ ہے کہ اس واقعے کے بعد اس کے ذہن میں شک و تذبذب راہ پا گیا اور یہ کیفیت جس نے آگے چل کر اس کے سارے نظام فکر کو متاثر کیا، اُس کے اوائل زمانے کی شاعری میں بھی رونما ہو کر رہی۔ ابو العلاء کے بعد کے کلام سے اس کے شواہد ملتے ہیں کہ اس نے ان سفروں میں مسیحیت اور یہودیت کا بھی کافی مطالعہ کیا تھا۔ مصری ادیب

---

[1] عربی میں العصفر یعنی Safflower۔ ہندی میں اسے کسنبھ، کسمبھ یا کھسم کہتے ہیں۔ اس کا دوسرا نام زعفرانِ کاذب ہے اور اس سے سرخ رنگ بنایا جاتا ہے۔

اور مصنف طٰہٰ حسین لاذقیہ کے اس واقعے کو اس لئے زیادہ قرینِ قیاس قرار دیتے ہیں کہ ایک تو دو مورخ قفطی اور ذہبی اس کے راوی ہیں، دوسرے لاذقیہ کا ذکر معرّی کی ایک نظم میں آتا ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ "لاذقیہ میں اسلام اور مسیحیت کے درمیان ٹھنی ہوئی ہے۔ ایک طرف پادری ناقوس بجاتا ہے تو دوسری طرف شیخ ہے جو غصے میں گرجتا ہے۔ ہر کوئی اپنے مذہب کی حمایت کرتا ہے۔ خدا جانے صحیح بات کیا ہے"[1]!

حلب اور شام کے دوسرے شہروں میں اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد ابوالعلاء لسانیات، نحو اور ادب میں کامل ہوگیا اور بیس برس کی عمر میں واپس معرہ لوٹ آیا۔ اس اثنا میں اس نے اپنے اندر شاعری کی طرف ایک فطری میلان محسوس کیا اور گیارہ برس کی عمر سے ہی مشقِ سخن کرنے لگا۔ اگلے وقتوں کی طرح اس زمانے میں بھی شاعری کا ایک رائج اور ہر دل عزیز موضوع "مدح" تھا جس کے وسیلے سے شاعر لوگ امراء و رؤسا کو خوش کر کے ان سے بھاری انعام و اکرام پاتے اور اپنی معاش کا بندوبست کرتے تھے۔ یہ روایت دراصل عربوں میں زمانۂ جاہلیت سے چلی آتی تھی، اور مدح سرائی ہر زمانے میں عربی شاعری کا ایک مستقل موضوع رہی تھی۔ فضا میں اس وقت بھی شاعر متنبّی کے مدحیہ قصائد کی بازگشت سنائی دیتی تھی، اور فنِ شعر میں ابوالعلاء حمدانی دربار کے اس ملک الشعراء سے بہت متاثر تھا۔ چنانچہ اس نے بھی اپنی شاعری کا آغاز مدح سرائی سے کیا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے اپنی اس مدح سے کبھی کوئی ذاتی غرض وابستہ نہ کی، بلکہ اس سے محض مشق و ریاضت کا کام لیا۔ اپنے پہلے دیوان "سقط الزند" کے مقدمے میں وہ کہتا ہے:

ولم أطرق مسامعَ الرؤساء بالنشيد، ولا مدحتُ طالباً للثواب، وإنما كان ذلك على معنى الرياضة وامتحان السوس	میں نے رؤسا کو اپنی نظمیں نہیں سنائیں اور نہ میں نے انعام کی خاطر مدح سرائی کی۔ یہ سب کچھ محض ریاضت کے طور پر اور اپنی طبعِ شاعر کو پرکھنے کی خاطر تھا۔

ابوالعلاء کی اس بات کی صداقت کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ معرہ واپس آنے کے بعد پندرہ برس تک اس کی تمام تر آمدنی کا ذریعہ صرف تیس دینار سالانہ کا وہ وظیفہ رہا جو مقامی حکومت کی جانب سے اسے اس کی معذوری کے استحقاق کی بنا پر ملتا تھا۔ اپنے نابینا پن کی وجہ سے وہ ایک خادم رکھنے پر مجبور تھا۔ چنانچہ اس محدود وظیفے کا آدھا حصہ وہ اپنے خادم کو دے دیتا تھا اور باقی آدھا حصہ اپنے آپ پر خرچ کرتا تھا۔ اتنی قلیل رقم میں اس کی گزر اوقات ہو جاتی ہوگی یا نہیں؟ اور اگر نہیں تو اس کی ضروریاتِ زندگی کون مہیا کرتا تھا؟ اس کے وہ تلامذہ جو اس کے پاس تحصیلِ علم کے لئے آتے تھے؟ یا اس کے متمول ماموں جن میں سے بعض شام کے شہروں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے؟ ہمارے لئے ان سوالوں کا جواب شاید اتنا اہم نہیں ہے۔ ہمارے لئے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ابوالعلاء کی غیرت اور عزتِ نفس نے یہ کبھی گوارا نہ کیا کہ وہ کسی امیر یا حاکم کی شان میں قصیدہ کہہ کر اس سے انعام و اکرام پائے اور اپنی مالی حالت آسودہ کرے۔ شروع کی دو تین نظموں کو چھوڑ کر جو بقول اس کے اس نے مشق و ریاضت کی خاطر کہی تھیں، اس کے دیوان "سقط الزند" میں جتنی بھی مدحیہ نظمیں ہیں، وہ بجائے امراء کے سب کی سب فقہاء اور اہلِ علم کی شان میں ہیں۔

حلب اور انطاکیہ اور طرابلس کے علمی سفروں سے واپس آنے کے بعد ابوالعلاء اپنے گھر میں مقیم ہوگیا۔ اس نے اب تک اتنا علم حاصل کر لیا تھا کہ اسے اب کسی سے مزید کچھ سیکھنے کے لئے کہیں جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ آگے چل کر وہ اپنے ماموں ابن سبیکہ کے نام ایک خط میں لکھتا ہے:

---

[1]
في اللاذقية فتنة ما بين أحمد والمسيح
قسّ يعالج دلبة والشيخ من حنق يصيح
كل يعزز دينه يا ليت شعري ما الصحيح!

ومنذ فارقتُ العشرین من العمر ما حدّثتُ
نفسی باجتداء علم من عراقیّ ولا شآمیّ

جب سے میں نے اپنی عمر کے بیس برس پورے کئے، میرے دل میں کبھی یہ خیال نہ آیا کہ علم کی طلب میں کسی عراقی یا شامی عالم کے پاس جاؤں۔

معرّہ میں قیام کے پندرہ برسوں میں اس نے وہ تمام نظمیں کہیں جو اس کے پہلے دیوان "سقط الزند"[1] میں شامل ہیں۔ اس اثنا میں اس کی شاعری کا چرچا حلب، اور شام کے دوسرے شہروں سے نکل کر عباسی دارالسلطنت بغداد جا پہنچا تھا۔ بغداد اُن دنوں صرف حکومت کا مرکز ہی نہیں علم و ادب کا بھی کعبہ تھا جہاں مملکت کے طول و عرض سے آئے ہوئے اہلِ علم و ہنر اور اربابِ شعر و ادب جمع تھے۔ ایک سے ایک بڑھ کر کتب خانہ اُس شہر میں موجود تھا جن میں کتابوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی تھی۔ علم و ادب کی طلب رکھنے والوں کے لئے یہ ایک کبھی نہ ختم ہونے والا خزانہ تھا۔ ان کتب خانوں کا تذکرہ ابوالعلاء نے بھی سن رکھا تھا، اور بغداد کا سفر اختیار کرنے کی خواہش اس کے دل میں بھی چٹکیاں لینے لگی تھی، لیکن اس کے لئے وہ مناسب موقع کے انتظار میں تھا۔

یہ موقع اس کے لئے جلد ہی پیدا ہو گیا۔ ۳۹۵ھ میں جبکہ ابوالعلاء بتیس برس کا تھا، اس کے والد نے انتقال کیا۔[2] ایک تو اس سانحے سے اس کی زندگی متاثر ہوئی، اور اس کے لئے معرّہ کو چھوڑ کر کہیں نہ جانے کا جو ایک بڑا سبب تھا وہ باقی نہ رہا۔ دوسرے یہ ہوا کہ اس کو تیس دینار سالانہ کا جو وظیفہ ملتا تھا وہ حلب کے ایک نئے گورنر نے آتے ہی بند کر دیا۔ گذر اوقات کے لئے ظاہر ہے اب صرف تدریس کا مشغلہ ہی اس کے پاس باقی رہ گیا تھا جس کے لئے معرّہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسیع میدان بغداد میں تھا۔ چنانچہ ابوالعلاء نے بغداد جانے کا قصد کیا اور اس کے ایک ماموں نے اس کے اس سفر کے لئے ایک کشتی مہیا کر دی۔ ۳۹۹ھ میں ہمارا یہ شاعر حلب سے روانہ ہو کر دریائے فرات میں اس کشتی میں سوار ہوا، اور تین ماہ کے ایک طویل اور پُرمصائب سفر کے بعد بالآخر بغداد پہنچ گیا۔

یہاں ابوالعلاء کی زندگی کا ایک دور ختم ہوتا ہے۔ بغداد میں اس نے صرف ایک برس اور سات ماہ قیام کیا اور پھر معرّہ واپس آ گیا۔ اپنے خوابوں کے شہر بغداد سے اس کی اتنی جلد واپسی کی وجہ کیا ہوئی؟ اس کی والدہ کی علالت کی خبر؟ پیسے کی کمی؟ یا شعر و ادب کے ایک سرپرست کی اس کے ساتھ بدسلوکی؟ ان میں سے کوئی ایک وجہ، یا دو یا تینوں؟ ——— جو کچھ بھی تھا وہ دارالسلطنت میں زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا۔ بغداد کے قیام کا یہ مختصر سا عرصہ اس کی زندگی کا ایک ایسا موڑ ثابت ہوا جس نے اس کی آئندہ زندگی کا سارا طور ہی بدل کے رکھ دیا۔ چنانچہ اس نے معرّہ واپس آ کر اپنے آپ کو اپنے گھر میں یوں محبوس کیا کہ پھر اپنی موت تک ـــ تقریباً پینتالیس برس کا عرصہ ـــ وہ کم ہی کہیں باہر گیا۔ یہ اس کی زندگی کا دوسرا اور طویل ترین دَور تھا، اور اسی دَور میں اس نے اپنی شاعری کا انداز بدل کر اس کو اپنے فلسفہ و فکر کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور عربی شاعری میں ایک بالکل ہی نئی طرح ڈال دی!

ابوالعلاء کے ساتھ ہم بغداد ضرور جائیں گے۔ لیکن اس وقت مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اُس کے پہلے دَور کی اس شاعری کے کچھ نمونے دیکھتے چلیں جو اس نے معرّہ میں رہتے ہوئے تخلیق کی تھی اور جس سے اس نے اپنا پہلا دیوان "سقط الزند" ترتیب دیا تھا۔ اس کی یہی وہ شاعری تھی

---

[1] "سقط الزند" کے لفظی معنی ہیں چقماق کی آگ سے نکلنے والی چنگاریاں۔ محاورۃً آتشِ تخلیق کے پہلے شرارے۔

[2] ابوالعلاء کے والد کے سالِ وفات کے بارے میں مارگولیوتھ سے لے کر عبدالعزیز میمن اور طٰہٰ حسین تک سب لوگوں سے تسامح ہوا ہے۔ سب نے معجم الادباء کے مصنف یاقوت الحموی کی تائید میں یہ سال ۳۷۷ھ قرار دیا ہے جبکہ معرّی کی عمر بمشکل چودہ برس تھی۔ ۱۹۴۴ء میں شام میں منعقدہ ہزار سالہ جشنِ معرّی کے موقع پر ایک مستشرق ڈاکٹر جبرئیل جبور نے اپنے مقالے میں اس تاریخ کے نادرست ہونے کی طرف توجہ دلائی اور کہا کہ اس واقعے کی صحیح تاریخ ۳۹۵ھ ہے جیسا کہ ابن العدیم نے کہا ہے، اور اس کے لئے اس نے ایک مضبوط دلیل یہ دی کہ معرّی نے اپنے والد کی وفات پر جو مرثیہ کہا اس میں چند اشعار ایسے ہیں جو چودہ برس کا ایک نوخیز لڑکا کسی صورت میں نہیں کہہ سکتا تھا ——— ہم مستشرقین کو اکثر برا بھلا کہتے رہتے ہیں، لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ غلطی پر ہوں اور ہم ہمیشہ صحیح ہوں!

جس کی شہرت اس سے بہت پہلے دوسرے شہروں سے ہوتی ہوئی دارالسلطنت بغداد تک جا پہنچی تھی!

اپنے پہلے دیوان "سقط الزند" میں، جو معرّی کے دورِ شباب کی شاعری پر مشتمل ہے وہ بالعموم عربی شعری روایت کے دائرے کے اندر رہتا ہے، اور اپنا خاص اسلوبِ سخن اور اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے اُن سب موضوعات پر طبع آزمائی کرتا ہے جو عربی شاعری میں شروع سے لے کر اس کے زمانے تک متداول چلے آتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنے عہد کے اصحابِ فضل و کمال کے لئے مدح سرا ہوتا ہے، بچھڑ جانے والے بزرگوں، عالموں اور فقیہوں کے مرثیے کہتا ہے اور فخر و مباہات پر آئے تو اپنے بارے میں ایسے اشعار کہہ جاتا ہے جن سے لگتا ہے کہ اسے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا پورا شعور حاصل تھا، اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ان صلاحیتوں کی وجہ سے معاصرین میں اس کے حُسّاد پائے جانے لگے ہیں۔ ہجو میں بھی اس نے کچھ اشعار کہے، اگرچہ کسی فردِ معلوم کو سامنے رکھ کر اسے اپنی مذمت و بدگوئی کا ہدف نہیں بنایا۔ وصف و بیان میں وہ قدیم شعراء کی روش پر چلتے ہوئے اپنے شعروں میں سواری کے جانوروں، سفروں، محبوب شخصیتوں، سیف و سناں اور زرہ بکتر وغیرہ کی تصویر کشی کرتا ہے اور ان کے علاوہ چاند، ستاروں اور مناظرِ قدرت کی بھی بات کرتا ہے غزل (عشقیہ شاعری) کے موضوع[1] پر اس نے کچھ زیادہ تو نہیں کہا کہ اپنے نابینا پن اور اُس وقت کے معاشرتی حالات کی وجہ سے وہ کسی نسوانی وجود کی طرف مَیل و رغبت محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم غزلیہ شعروں کی چاشنی اس کے کلام میں یہاں وہاں مل ضرور جاتی ہے۔ ہاں ایک خاص بات، جو معرّی کے اس پہلے دور کے کلام میں تواتر کے ساتھ سامنے آتی ہے وہ "الحکمۃ و دانش" ہے یعنی شعروں میں حکمت و دانائی کی باتیں کرنا، ایسی باتیں جو اپنی سچائی کی وجہ سے رفتہ رفتہ کہاوت اور مثال کا درجہ اختیار کر لیں۔ شاعری کا یہ زمانہ اگرچہ اس کے دورِ شباب کا تھا جس میں انسان پر غلبہ عقل و خرد کا نہیں بلکہ جذبے اور جوش و ولولے کا ہوتا ہے، تاہم معرّی کے ایامِ شباب کی ان نظموں پر بھی فکر و دانش کی ایک نمایاں چھاپ دیکھی جا سکتی ہے۔

معرّی کے جو سوانحی تذکرے ہم تک پہنچے ہیں ان میں کہیں یہ اشارہ نہیں ملتا کہ اس کی زندگی میں کوئی ایسی عورت آئی تھی جس کی طرف اس نے جذباتی کشش محسوس کی ہو۔ چنانچہ اس کی عشقیہ شاعری پڑھتے ہوئے ہمیں اس کیفیت کی توقع تو نہیں کرنی چاہیئے جو کسی شاعر کے کلام میں عشق کی آنچ سے گزرنے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ غزل کے موضوع پر شعراء ہمیشہ سے کچھ نہ کچھ کہتے چلے آئے تھے وہ بھی یہ ریت نبھانا چاہتا تھا۔ اس غرض سے اس نے اپنے خیالوں میں ایک محبوب بسایا، اور اپنی شاعری میں اس سے باتیں کیں۔ یہ باتیں کچھ اس طرح کی ہیں کہ:

> "اے اسیرِ پازیب: یہ کیا نادانی ہے کہ ایک نازک اندام، جس کے لئے نظر اٹھا کے دیکھنا بھی دوبھر ہو، وہ زیوروں کا بوجھ اٹھائے پھرے؟"

ایک اور شعر میں کہتا ہے:

> "کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں کسی راہ پر چلا ہوں تو تمہارا خیال میرا ہم سفر بن کر میرے ساتھ نہیں چلا، کبھی وہ میرے آگے ہوتا ہے اور کبھی پیچھے[2]"

ایک اور موقع پر شکوہ کرتا ہے کہ:

> "تمہاری وجہ سے مجھ پر جو گزری ہے وہ اگر آفتاب کے ساتھ گزرتی تو مارے پژمردگی کے طلوع نہ ہو سکتا اور اگر برق کے ساتھ گزرتی تو چمکنا بھول جاتی"

---

[1] عربی زبان میں "غزل" شاعری کا ایک موضوع ہے، اس کی ایک ہیئت یا صنف نہیں، جیسا کہ اردو میں ہے۔

[2] بادیۂ عرب کے تصورات کے مطابق بہترین ہم سفر وہ ہوتا تھا جو رات کے اندھیرے میں آگے آگے چلے اور دن کے اجالے میں پیچھے پیچھے!

یہ ساری باتیں اپنی جگہ ٹھیک ہیں اور غزل کی شاعری میں شعرا اسی طرح کی باتیں اُس زمانے میں کیا کرتے تھے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان میں معرّی کا خاص انداز نہیں پایا جاتا۔ یہ عباسی دور کے کسی بھی دوسرے شاعر کے شعر ہو سکتے ہیں، چاہے اس کا تجربۂ عشق سچا ہو یا محض خیالی اور تصوراتی! معری کی عشقیہ شاعری پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالتے ہوئے مجھے البتہ چند ایک شعر ایسے مِل جاتے ہیں جن میں اس کا اپنا لب و لہجہ اور اپنا خاص طرزِ احساس دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کی ایک نظم جاہلی قصیدے کے نمونے پر تشبیب سے شروع ہوتی ہے اور اس کا مطلع ہے:

مِنْكِ الصُّدُودُ وَمِنِّي بِالصُّدُودِ رِضًى مَنْ ذَا عَلَيَّ بِهٰذَا فِي هَوَاكِ قَضَى

"تمہاری جانب سے بے رُخی ہے اور میں اس بے رُخی پر راضی برضا ہوں، وہ کون ہے جس نے تمہاری چاہت میں مجھے اس حال کو پہنچا دیا ہے!"

محبوب کی سرد مہری اور بے پروائی کے مقابلے میں شاعر کا یہ رواقی (Sto i cal) رویہ اس وقت کی شاعری میں ایک نئی اور انوکھی چیز تھی۔ پھر معرّی نے یہ مضمون جس طرح سے باندھا ہے اور اس کے لئے الفاظ کی نشست اور صوتی کیفیت کا جس طرح سے خیال رکھا ہے اس سے یہ شعر عربی زبان میں ایک بے حد خوبصورت اور سبک چیز بن گئی ہے۔ اس شعر کا پہلا مصرع ایسا ہے کہ اپنی نغمگی کی وجہ سے اپنے آپ زبان پر چڑھ جاتا ہے اور پھر ذہن سے کبھی محو نہیں ہوتا۔ "منکِ الصدودُ ومنی بالصدودِ رضًی"! یہ مصرع میرا خیال ہے یک طرفہ محبت کرنے والوں کے لئے ایک منشور کا کام دے سکتا ہے۔ اسی طرح اس کا ایک اور شعر ہے کہ

أَبْلَى وِدَادِي لَكُمْ زَمَانٌ أَلْيَنُ أَحْدَاثِهِ حَدِيدُ

"آپ کے لئے میری محبت کو وقت نے فرسودہ کر دیا ہے۔ وقت، جس کے نرم سے نرم واقعات بھی اپنی سختی میں مثلِ آہن ہوتے ہیں!"

وقت ایک تصوّر تو وہ ہے جو فلاسفہ کے یہاں زمانۂ قدیم سے موضوعِ بحث چلا آتا ہے۔ دوسری طرف وقت کا ایک سادہ سا مفہوم ہم عام انسانوں کے نزدیک یہ ہے کہ وقت عبارت ہے حرکت سے اور تغیرِ احوال سے! یہ وقت کی کارفرمائی ہی ہے کہ جو کل تھا وہ آج نہیں ہے "اور جو آج ہے وہ کل نہیں رہے گا۔ وقت کا اثر انسان کے اس جذبۂ عظیم پر کیا ہوتا ہے جس کا نام محبت ہے؟ معرّی اس بارے میں یہ کہتا ہے کہ وقت کی گرد اس گہرے اور عمیق انسانی جذبے کے نقوش کو بھی دھندلا کر دیتی ہے، اور جوں جوں وقت گذرتا ہے اور اس کے حوادث انسان پر اثر انداز ہوتے ہیں تو محبت کے اس تعلق میں کمی اور پژمردگی کے آثار پائے جانے لگتے ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ معرّی نے یہ بات اپنے تجربے سے نہیں کی تھی، اس لئے کہ ایسا کوئی تجربہ اس کی زندگی میں تھا ہی نہیں۔ لیکن اپنے فہم و دانش سے اس نے ایک ایسی بات کہہ دی جو اگلے زمانوں کے رومان پسندوں کے نزدیک بے شک بے تکی ہو۔ آج کے حقیقت پسندوں کے نزدیک وہ کافی حد تک صحیح اور واقعاتی ہے ــــــ میرا خیال ہے یہ ایک عام تجربے کی بات ہے کہ جس طرح غم کی شدید کیفیت ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کا کرب ہلکا ہوتا جاتا ہے اسی طرح جذبۂ عشق کی آگ بھی وقت اور حالات کے اثر سے بالآخر ٹھنڈی پڑ جاتی ہے، اور اس کی راکھ میں کوئی دبی ہوئی چنگاری کبھی رہ جائے تو رہ جائے، بعض حالات میں وہ بھی نہیں رہتی۔

معرّی کے اس پہلے دیوان میں چند ایک نظمیں ایسی ہیں — زیادہ تر مرثیے — جو اس کے اسلوبِ شعرگوئی کا بہت اعلیٰ اور عمدہ نمونہ پیش کرتی ہیں۔ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ اگر اس کا بیشتر کلام ان نظموں کے اسلوب اور انداز کا ہوتا تو عربی شاعری کی تاریخ میں معرّی کا شمار چوٹی کے گنے چنے شعرا میں ہوتا۔ ان میں سے زیادہ مشہور نظم ایک مرثیہ ہے جو اس نے اپنے ایک جوان فقیہ دوست، ابو حمزہ تنوخی کی موت پر کہا تھا۔ اس مرثیے کے شروع میں اور پھر آخری بند میں شاعر اپنے اس خیال کا اظہار کرتا ہے کہ موت زندگی سے اتنی قریب ہے کہ ان دونوں کے مظاہر میں

بعض اوقات اشتباہ ہونے لگتا ہے، اور موت کے سوگ اور شادی کے نغمے میں بظاہر کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ اس نظم کا مطلع ہے:

غَیرُ مُجْدٍ فی مِلّتی و اعْتِقادی نَوْحُ باكٍ وَلا تَرَنُّمُ شادِ

"میرے عقیدہ و مسلک میں دونوں لاحاصل ہیں، ماتم گسار کا نوحہ ہو یا مطرب کا ترنم!"

اس سے اگلے شعروں میں کہتا ہے:

"اگر غور کیجیے تو سنادُنی دینے والے کی آواز بھی اُسی طرح ہوتی ہے جیسے کوئی گھر گھر خوش خبری سنا تا پھرے۔"

"اور جھولتی ہوئی شاخ پر یہ جو فاختہ گو گو رہی ہے تو کون جانے یہ گریہ کر رہی ہے یا کوئی گیت گا رہی ہے"

"ہمارے اِس عہد کی قبروں نے تو اتنی ساری زمین گھیر رکھی ہے۔ وہ قبریں کیا ہوئیں جو قوم عاد کے زمانے سے چلی آتی ہیں؟"

"زمین پر جب بھی چلو تو اپنا قدم ہلکا رکھو، اس لیے کہ زمین کی کھال اُنھی مرنے والوں کے جسموں سے ہی تو بنی ہے"

۔۔۔۔۔۔

"کتنی ہی قبریں ایسی ہی ہوں گی جو ایک سے زیادہ مرتبہ مدفن بنیں اور وہ اپنے اندر متضاد انسانوں کے جمع ہو جانے پر خندہ زن ہوئے بغیر نہ رہ سکیں"

۔۔۔۔۔۔

"دُبِ اصغر کے ان دو چمکتے ستاروں سے پوچھو کہ انھوں نے روئے زمین پر اب تک کیسے کیسے رنگ دیکھے، اور کیسی کیسی بستیوں کا مشاہدہ کیا"

"اور وہ (ستارے) کتنی مرتبہ دن چھپنے پر نمودار ہوئے اور رات کے اندھیرے میں سفر کرنے والوں کو راستہ دکھایا"

"یہ زندگی تمام کوفت اور تھکن ہے، مجھے حیرت اس پر ہے جو اس میں زیادہ کا طلبگار ہوتا ہے"

"اگر سوچو تو موت کی گھڑی کا غم اس مسرت سے کہیں زیادہ ہوتا ہے جو ایک ولادت کے موقع پر محسوس کی جاتی ہے"

"اور انسان جو پیدا کئے گئے تو باقی رہنے کے لئے ہی پیدا کئے گئے ہیں۔ وہ لوگ گمراہی میں ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ایک دن ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائیں گے"

"انسان فنا نہیں ہوں گے، صرف منتقل کئے جائیں گے، سعی و عمل کے اِس گھر سے اُس دوسرے گھر کو جس میں یا تو بدبختی ان کی منتظر ہو گی یا خوش طالعی"

"موت کی استراحت ایک طرح کی نیند ہے جس سے جسم کو آرام ملتا ہے اور زندگی یوں سمجھو کہ جاگتے رہنے کا عمل ہے"

موت و حیات کے بارے میں اپنے ان خیالات کا اظہار کرنے کے بعد وہ اپنے مرحوم دوست کے مناقب بیان کرتا ہے اور اس کے احباب و اقارب سے کہتا ہے کہ اس کو اچھے طریقے سے الوداع کہو، کہ آگے جانے والے کے لئے پُر خلوص الوداع ہی سب سے اچھا زادِ راہ ہو سکتا ہے، اور اسی ضمن میں کہتا ہے کہ

وَاغْسِلُوهُ بِالدَّمْعِ إنْ كانَ طُهْرًا وَادْفِنُوهُ بَيْنَ الْحَشَا وَالْفُؤادِ

"اسے اپنے آنسوؤں سے غسل دو، اگر یہ پاک ہوں، اور اسے اپنے دل اور پہلو کے درمیان دفن کرو"

پھر وہ مرحوم کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تم اپنی جوانی کو ساتھ لئے راہ پہ چلے جاؤ، تم اس لائق ہو کہ دن اور رات کی گھٹائیں تمہاری منزل کو سیراب کریں گی اور تمہارے سوگ میں ایسے ایسے مرثیے کہے جائیں گے کہ اگر وہ آنسوؤں میں بدل جائیں تو لکھی ہوئی سطروں کو بہا لے جائیں۔

نظم کے آخر میں وہ پھر موت اور فنا کے موضوع کی طرف آتا ہے، اور زحل، مریخ اور ثریا کے نام لے کر کہتا ہے کہ یہ سب ایک دن بجھ جائیں گے یا بکھر کر وسعتِ افلاک میں گم ہو جائیں گے اور یہی حال زمین پر ہر ٹھکانے کا ہوگا:

کلّ بیت للهدم ما تبتنی الورقاءُ و السیّد الرفیعُ العماد

"جو گھر بھی بنا ہے، چاہے وہ کسی عالی مرتبت سردار کا ہو یا ایک پھوہڑ فاختہ[۱] کا ایک دن منہدم ہو کے رہے گا"

اور نظم کو اس شعر پر ختم کرتا ہے:

واللبیبُ اللبیبُ من لیس یغترُّ بکونٍ مصیرہ للفساد

"اور دانا تو صحیح معنوں میں وہی ہے جو ایک ایسے سنسار سے جس کا انجام خرابی ہے، دھوکا نہیں کھاتا"

آپ نے دیکھا کہ اپنے دوست کے مرثیے میں، موقع کو غنیمت جانتے ہوئے، معرّی ان تمام خیالات و احساسات کا اظہار کرتا ہے جو زندگی اور موت کے بارے میں اس کے دل و دماغ میں ایامِ شباب ہی سے پرورش پانے لگے تھے۔ اس نظم میں البتہ وہ حیاتِ انسانی کی بقا اور آخرت کی زندگی میں یقین رکھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن بعد کے ایک مرثیے میں، جو اس نے اپنے باپ کی موت پر کہا تھا وہ اس بارے میں متذبذب اور گومگو کی کیفیت میں مبتلا نظر آتا ہے۔ چنانچہ اس دنیا سے گذر جانے والوں کے متعلق ایک شعر میں اپنے تجسس کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے:

طلبتُ یقیناً من جُهینةَ عنهمُ ولن تخبریني یا جُهینُ سوی الظنّ
فإن تعهدیني لا أزال مُسائلاً فإنّي لم أُعْطَ الصحیحَ فأستغني

"میں جُہینہ[۲] سے پوچھا مجھے صحیح صحیح بتاؤ کہ اُن (گذر جانے والے) لوگوں کے ساتھ کیا ہوا۔ لیکن میں جانتا ہوں اے جُہینہ کہ تم اس معاملے میں سوائے ظن و گمان کے اور کچھ نہیں بتا سکو گی۔"

"تم اگر دیکھتی ہو کہ میں برابر سوال کئے جا رہا ہوں تو وہ اسی لئے ہے کہ مجھے اب تک شافی جواب نہیں ملا جس سے میرا تجسس جاتا رہے"

ایک اور نظم جو مدحیہ ہے اور جو معرّی نے الشریف موسیٰ بن اسحاق کے ایک قصیدے کے جواب میں کہی تھی، اس میں ایک شعر ایسا ہے جسے پڑھتے ہوئے گمان ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے اپنے ایک شعر کا خیال شاید معرّی سے لیا تھا۔ نظم کے ابتدائی اشعار ہیں:

"یاد و میرا دل بہلاؤ کہ میری تابندہ آرزوئیں بجھ گئی ہیں، اور یہ اندھیرا ہے کہ ختم ہونے میں نہیں آ رہا"

"اگر کچھ لوگوں کی چاہت کو تم بھلا بھی دو، تو کم از کم مجھے اُن لوگوں میں رکھنا جو تمہیں ہمیشہ یاد آتے رہیں گے"

"کئی راتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اپنے سیاہ ملبوس کے باوجود صبح کی طرح حسین لگتی ہیں"

"ان میں ہم اپنے مشاغلِ لہو میں رواں دواں رہتے ہیں، جبکہ رات کا ستارہ اپنی جگہ حیران کھڑا دیکھتا ہے"

... ...

"اور مجھے آج کی یہ رات حبشی دلہن کی طرح لگی ہے، جو سفید موتیوں کی لڑیوں سے آراستہ ہو"

... ...

---

[۱] عربوں کے یہاں فاختہ کو گھونسلا بنانے کے معاملے میں سخت پھوہڑ اور بے سلیقہ سمجھا جاتا ہے، چنانچہ ایک ضرب المثل ہے "أخرقُ من حمامة" وہ فاختہ سے بھی زیادہ اناڑی اور بدسلیقہ ہے۔

[۲] عربی میں ایک ضرب المثل ہے کہ "وعند جُهینة الخبرُ الیقین": اصل واقعہ کا علم تو جہینہ ہی کو ہے۔ اس کے پس منظر میں یہ واقعہ ہے کہ قبیلہ بنی جہینہ کے ایک آدمی نے اپنے ایک ہم سفر حصین غطفانی کو قتل کر دیا۔ اور جب وہ قیس کے قبیلے میں واپس آیا تو حصین کی بیوی اپنے خاوند کے بارے میں ہر ایک سے پوچھتی پھرتی تھی۔ اس پر اس نے یہ شعر پڑھا کہ وہ ہر سوار سے حصین کے بارے میں پوچھتی ہے حالانکہ اصل حقیقت کا علم تو جہینہ کو ہے۔

"اندھیری رات اور جنگل کی گمبھیرتا میں جب دُب اصغر کے دو ستارے طلوع ہوئے تو میرا ساتھی کہنے لگا،"

اب آگے وہ شعر ہے:

نحنُ غَرْقی فکیفَ یُنقذُنا نجمـــانِ فی حَوْمَۃِ الدُّجی غَرِقانِ

"ہم جو اندھیرے میں ڈوبے ہیں تو ہمیں یہ دو ستارے کیا نجات دلائیں گے جو خود تاریکی کے سمندر میں غرق ہیں۔"

علامہ اقبال کا شعر ہے:

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا   جو خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں

کوئی شک نہیں کہ علامہ کا شعر نہ صرف اپنے خیال و معنی میں بلکہ زبان و بیان کے حسن میں بھی معری کے شعر سے بلند ہے، لیکن دو نو شعروں کے مضمون میں جو مماثلت پائی جاتی ہے اس سے یہ کوئی مستبعد نہیں لگتا کہ اوپر کا شعر کہتے وقت شاعرِ مشرق کے ذہن کے کسی گوشے میں وہیں اس نابینا شاعر کا مذکورہ بالا شعر ہو۔ ابوالعلا معری کے عنوان سے "بالِ جبریل" میں ان کی جو نظم ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے معری کے بارے میں کافی کچھ پڑھ رکھا تھا اور اس کے دیوان "لزومیات" اور اس کی نثری تخلیق "رسالۃ الغفران" سے واقف تھے۔ چنانچہ اس بات کا قوی امکان ہے کہ اس کا دیوان "سقط الزند" بھی ان کی نظر سے گزرا ہو اور اس کا یہ قصیدہ ان کے مطالعے میں آیا ہو۔

فخر و مباہات کے موضوع پر معری نے جو نظم کہی ہے، وہ اپنے ادبی و شعری حُسن میں اس کے کلام کی خوبصورت ترین چیزوں میں سے ایک ہے۔ میں اپنے ذوق کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ بلاغت، حُسنِ ادا، سلاست و بے ساختگی کے اعتبار سے معری اس نظم میں اُس مقامِ بلند پر فائز دکھائی دیتا ہے جہاں اس کے ساتھ امرؤ القیس، زُہیر اور نابغہ جیسے جاہلی شعرا کھڑے ہو سکتے ہیں۔ یہاں اس کے ساتھ میں متنبی کا نام بھی نہیں لوں گا کہ متنبی میں تکلف ذرا زیادہ ہے، پھر وہ اپنے کلام میں صحتِ زبان اور قواعد کے معاملے میں کافی بے احتیاط ہے جبکہ معری کا سارا کلام لغت و نحو میں سند کا درجہ رکھتا ہے۔ نظم کا مطلع ہے:

أَلَا فی سبیلِ المجدِ ما أنا فاعلُ   عفافٌ وإقدامٌ وحَزْمٌ ونائلُ

"میں جو کچھ بھی کروں عالی آن و شان کے لئے کرتا ہوں، چاہے وہ پاک دامنی ہو، بسالت ہو، قوتِ ارادی ہو یا جود و کرم ہو"

اگلے شعروں میں کہتا ہے:

"کچھ لوگوں کے نزدیک میرے گناہ بے حساب ہیں، اور میرا سب سے بڑا گناہ تو علوِّ منزلت و فضیلت ہی ہے۔"

- - - - - - - -

"میری شہرت شہر شہر پھیلی ہے، کوئی ہے جو پوری روشنی والے اس سورج کو چھپا سکے"

"میرے اندر جو چیز مضمر ہے اُس نے شب و روز کو بھی فکر و تردد میں مبتلا کیا ہے، اور جو کچھ میں برداشت کیے ہوئے ہوں اس کا بوجھ پہاڑ بھی نہیں سہہ سکتے"

"اور میں اگرچہ آخری زمانے میں آیا ہوں، میں وہ چیز لانے والا ہوں جو اگلے لوگوں سے بھی نہیں بن پڑی"

- - - - - - - -

"اور جب میں نے دیکھا کہ لوگوں میں جہالت عام ہے تو میں نے ایسا رویہ اختیار کیا کہ لوگ سمجھے میں بھی جاہل ہوں"

"کیسی عجیب بات ہے کہ ایک ناقص انسان تو فضل و کمال کا دعویٰ کرے، اور کیسے افسوس کا مقام ہے کہ ایک صاحبِ فضل و کمال یہ ظاہر کرنے پر مجبور ہو کہ وہ ناقص ہے"

"اور جب مادر[1] حاتم طائی کو بخل کا طعنہ دینے لگے اور باقل[2] قس کو گونگا اور بے زبان بتائے۔"

"اور جب وہ ننھا سا مدھم ستارہ سُہیٰ سورج سے کہے کہ تم دکھائی نہیں دیتے، اور جب اندھیرا صبح کو یہ عیب لگانے کہ تمہارا رنگ پھیکا اور زرد ہے۔"

"اور زمین اپنی حماقت سے آسمان کے منہ آنے لگے، اور کنکر پتھر اپنا مقابلہ ستاروں سے کرنے لگیں۔"

"تو اے موت نزول کر، کہ یہ زندگی مذموم ہو چلی ہے، اور اے نفس متانت کا دامن تھام کہ زمانہ تمسخر پر اُتر آیا ہے۔"

اوپر ذکر ہوا کہ عام نقادوں کی رائے کے مطابق اپنے اس پہلے دور میں ابوالعلاء معری نے بعض نظمیں ایسی کہی ہیں جن میں وہ فن شعرگوئی کی آخری بلندیوں کو چھوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہ نظمیں تعداد میں آٹھ، دس یا اس سے کچھ زیادہ ہوں گی (جبکہ پورا دیوان ۷۳ نظموں پر مشتمل ہے) یہاں سوال یہ ہے کہ "سقط الزند" کی یہ چند گنی چنی نظمیں ہی کیوں اس کے فن کا اعلیٰ معیار پیش کرتی ہیں۔ دیوان کی دوسری نظموں کے بارے میں یہ بات کیوں نہیں کہی جا سکتی؟ ـــ اس کا ایک سیدھا اور دیانتدارانہ جواب معری کی زبانِ حال سے یوں ہو گا کہ ع

اے روشنی طبع تو برمن بلا شدی!

ابوالعلاء معری کو جس چیز نے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے، اور جس سے اس کی تخلیقات کے ایک بڑے حصے کا حسن گہنا کے رہ گیا ہے وہ زبان و بیان کے معاملے میں اس کی مشکل پسندی اور اس کا شوقِ اظہارِ کمال ہے۔ اس کی طبع شاعر کا یہ نرالا پن (Eccentricity) اس کے پہلے دیوان "سقط الزند" اور اس کی نثری تخلیق "رسالۃ الغفران" میں زیادہ مواقع پر اور اکثر ناپسندیدہ صورت میں سامنے آتا ہے جبکہ اس کے دوسرے دیوان "لزومیات" میں اس کا بیان تو سادہ اور صاف ہو گیا ہے، لیکن شاعر کی مشکل پسندی نے یہاں ایک دوسری صورت اختیار کی ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ چھ سال کی عمر میں جب معری کی آنکھوں کا نور پوری طرح جاتا رہا تو قدرت نے اس نقصان کے عوض اسے ایک حیرت انگیز اور افسانوی (Mythical) قسم کا حافظہ عطا کیا۔ اس حافظے کی مدد سے ہمارے شاعر نے جہاں دوسرے علوم حاصل کئے وہاں عربی لغت سے بھی آگاہی حاصل کی، اور عربی الفاظ و محاورات کا پورا ذخیرہ اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا، چنانچہ عربی زبان و روزمرہ پر اس کے عبور کا یہ عالم تھا کہ اس کے کلام کا ایک شارح تبریزی کہتا ہے "میں نہیں سمجھتا کہ عرب قوم نے آج تک کسی چیز کے لئے کوئی لفظ بولا ہو، اور معری اس سے آشنا نہ ہو"۔ اس زمانے کے اہل نقد و نظر کہتے تھے کہ "ایک ماہر لغتِ عرب مشرق میں ہے اور دوسرا مغرب (اندلس) میں، اور ان کے سوا تیسرا کوئی نہیں، یعنی ابوالعلاء معری اور ابن سیدہ"۔ لغتِ عرب پر اس کامل دسترس نے جہاں ابوالعلاء کو مرجع خلائق بنا دیا اور علوم لغت و نحو و عروض میں اسے استاد اور امام کا درجہ عطا کیا، وہاں اسے اس شوقِ فضول میں بھی مبتلا کر دیا کہ موقع بے موقع اپنے لغوی کمالات کا اظہار کر کے لوگوں پر اپنی دھاک بٹھائے۔ اس کی خاطر وہ اپنے اشعار میں مروّج اور روزمرہ استعمال کے الفاظ چھوڑ کر اکثر ایسے مشکل اور نامانوس الفاظ و مفردات لاتا جو بادیۂ عرب میں بے شک سمجھے جاتے ہوں، شہروں میں بسنے والوں کے لئے عام فہم نہیں ہوتے تھے اور بغیر لغت سے رجوع کئے نہیں سمجھے جا سکتے تھے۔ اسی طرح وہ چونکہ تاریخ اور ایامِ عرب کا بھی عالم تھا، اپنے شعروں میں وہ جا بجا ایسے تاریخی حوالوں اور رموز و اشارات سے کام لیتا کہ جن کی طرف ایک عام سامع یا قاری کا ذہن منتقل نہیں ہو پاتا تھا۔ پھر معاملہ صرف لغت اور زبان تک محدود نہیں تھا، شاعری کے مضمون اور خیال میں بھی اس کی کوشش عموماً یہ ہوتی تھی کہ شعرا کی عام روش سے ہٹ کر کوئی بات کرے

---

[1] مادر قدیم عرب معاشرے میں ایک بے حد بخیل شخص تھا۔ عربی میں مثل ہے اَبْخَلُ مِن مادر، یا مادر سے بھی زیادہ کنجوس۔
[2] باقل (ایادی) زمانۂ جاہلیت میں بہت ہی کم گو شخص تھا، اور قس بن ساعدہ بہت بڑا خطیب تھا جو عکاظ کے میلے میں تقریریں کرتا تھا۔

اور اپنے شعروں میں کوئی دور کی کوڑی لائے جسے سن کر لوگ حیران و مبہوت رہ جائیں۔ اپنی اس عجوبہ خصوصیتِ مزاج (Ideosyncracy) سے جیسا میں سمجھتا ہوں، اس نے انجانے میں اپنی شاعری کے ایک بہت بڑے حصے کا حُسن غارت کر دیا۔ چنانچہ اس کے دیوان "سقط الزند" کی بیشتر نظمیں اُس کی اس تعقیدِ لفظی اور پُرتصنع اندازِ بیان کا شکار ہو کے رہ گئی ہیں۔ لیکن جب جب وہ اپنے اس رجحانِ طبع کو دبانے میں کامیاب ہوا ہے اور اس پر ایک شاعرانہ خیال جس طرح سے نازل ہوا ہے اُس نے اسی طرح اُسے نظم کر دیا ہے، اور آمد کو آورد نہیں ہونے دیا، وہ فن کی بلندیوں تک جا پہنچا ہے۔ ایک مصری ادیب احمد الشایب نے دمشق میں منعقد ہونے والی معری کی ہزار سالہ برسی کے موقع پر ایک مضمون پڑھا تھا جس کا عنوان تھا "ابوالعلاء معری — کیا وہ ایک شاعر تھا یا فلسفی؟"۔ اس میں وہ معری کے دالیہ مرثیے پر جو اس نے اپنے فقیہہ دوست کی موت پر کہا تھا، اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس میں حسنِ بیان اور رفعتِ فکر و خیال دونوں اس طرح سے یکجا اور ہم آہنگ ہوئے ہیں کہ اس کی مثالیں عربی شاعری میں دور دور تک نہیں ملتیں۔ اس کے الفاظ میں "ابوالعلاء نے دراصل اپنی اس نظم میں ساری دنیا کا مرثیہ کہا ہے، اور وہ زندگی اور موت کے درمیان کسی برزخ میں کھڑا اس بات پر آنسو بہاتا ہے کہ آخرت کی زندگی اس دنیا کی زندگی کے درپے کیوں ہے، اور موت کو زندگی پر غلبہ و استیلاء کیوں حاصل ہے؟" آگے کہتا ہے "اگر ابوالعلاء کی ساری شاعری یا زیادہ تر شاعری اس نظم کے نمونے کی ہوتی تو اُس کے مقابلے میں کوئی عرب شاعر بھی کھڑا نہیں ہو سکتا تھا اور وہ یقیناً شعرائے عرب کا سردار قرار پاتا۔" ——— احمد الشایب کی رائے سے کوئی چاہے تو بے شک اختلاف کر سکتا ہے لیکن مجھے اس کی بات میں کافی صحت اور وزن دکھائی دیتا ہے۔

جو کچھ بھی ہو، ابوالعلاء جب بغداد جانے لگا ہے تو اُس کی ان سب نظموں کی شہرت وہاں اس سے پہلے پہنچ چکی تھی۔ لوگ اب اُس شاعر کو دیکھنا اور اُس سے ملنا چاہتے تھے جس نے آنکھوں سے معذور ہوتے ہوئے بھی یہ دعویٰ کیا تھا کہ میں اگرچہ آخری زمانے میں پیدا ہوا ہوں لیکن میں جو بات کہنے چلا ہوں وہ پہلے کسی سے نہیں بن پڑی۔ معلوم نہیں لوگوں نے اس کے اس دعویٰ کو کتنی سنجیدگی سے لیا ہوگا۔ تاہم وقت نے بالآخر ثابت کر دیا کہ جو باتیں معری اپنے دیوان "لزومیات" میں کہہ گیا وہ نہ اس سے پہلے کسی نے کہی تھیں اور نہ بعد میں فکر و فلسفہ اور آزادیٔ اظہار کے غلغلے کے باوجود کوئی کہہ سکا۔ ایسا لگتا ہے کہ معری اپنے وقت سے ایک ہزار سال پہلے پیدا ہو گیا تھا۔

(جاری ہے)

غنیۃ المنیہ

فارسی زبان میں ہندوستانی رقص و موسیقی پر اوّلین کتاب

رشید ملک

ہندوستان کی عازلیت اور اپنے علوم و فنون کو غیر ملکیوں یا ملیچھوں سے محفوظ رکھنے کی شدید خواہش اور اصرار کے باوجود مسلمانوں نے اپنے اقتدار کے ہر دور میں ہندوستان کی زندگی کے ہر پہلو کے علاوہ یہاں کے علوم و فنون، فلسفہ، نظریات اور ثقافت کو سمجھنے کی بھرپور کوششیں کی ہیں۔ ایسے لوگوں میں حکیم ابوریحان البیرونی حضرت امیر خسرو علیہ رحمۃ اور ابوالفضل سرِ فہرست ہیں، ان حکماٗ نے اہلِ ہنود کے تعصبات کے باوجود اپنا اپنا کام بہت حد تک مکمل کیا اور اپنی مساعیِ جمیلہ کے درخشاں نقوش آئندہ نسلوں کے لئے چھوڑ گئے۔ آج بھی برعظیم کا مطالعہ کرنے والے محققین کے لئے یہ نقوش ان کی تحقیق کا نقطۂ آغاز ہیں۔

حالیہ انکشافات کے مطابق برعظیم کی موسیقی کے بارے میں مسلمانوں کی کاوشوں کا آغاز کتاب "غنیۃ المنیہ" سے ہوتا ہے۔ اس کتاب کا واحد قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری، لندن میں جو اب برٹش لائبریری کا حصہ بن گئی ہے، محفوظ ہے۔ اس لائبریری کے فارسی مخطوطات کی فہرست مرتب کرتے وقت ہرمن ایتھے نے اس کتاب کے بارے میں یہ ملاحظات پیش کئے ہیں:

Ghunyat - almunyat (غنیۃ المنیۃ)

The richness of desire, a treatise on Indian music,compiled by an anonymous author in the reign of Sultan Abu- muzaffar Firuzshah (that is Firuz-uldin Tughlak, who reigned A.H. 752-790 =A.D.1351-1388), A.H. 776 (A.D. 1374-1375 at the request of his learned patron, the governor of Gujrat, Amir Shamus- aldaulah wa-aldin Ibrahim Hasan Aburaja (ابورجا) who a short time before had induced him to translate from Arabic into Persian the کتاب فرید الزمان فی معرفت الالحان on Persian music. This treatise, based on Indian Sources, is divided into two kisms, four babs and eighteen fasls.

اس مخطوطے کے مطالعے کا اعزاز علی گڑھ کی بیگم خورشیدا ین حسن کو حاصل ہوا۔ اپنی تحقیق پر مبنی ایک مقالہ بعنوان "ارلی است پرشین مینوسکرپٹ آن انڈیا میوزک" The Earliest Persian Manuscript on Indian Music انھوں نے آل انڈیا ہسٹری کانگرس کے ۱۹۶۱ء کے اجلاس میں پیش کیا۔ جس کا ایک مختصر تعارف اس کانگرس کی کارروائی کا حصہ ہے۔

بیگم صاحبہ مرحومہ کا تعلق نواب رام پور کے خاندان سے تھا۔ رام پور کو موسیقی کی روایات میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ ویسے بھی یہ خاندان علوم و فنون کی پرورش کے لئے مشہور ہے۔ رام پور کا سرکاری کتب خانہ ہندوستان کے کتب خانہ آصفیہ، جو اب اسٹیٹ لائبریری آندھرا پردیش ہے، سالار میوزیم اور خدا بخش لائبریری، جو اب اورینٹل لائبریری پٹنہ کہلاتی ہے، کے بعد برعظیم میں شاید اہم ترین ہے اور عربی،

فارسی اور اردو زبانوں کے نادر مخطوطات کی دولت سے مالا مال ہے۔ یہ کتب خانہ اور جناب امتیاز علی عرشی، جو ساری زندگی اس کتب خانے سے وابستہ رہے۔ علمی دنیا میں شاید کبھی نہ بھلائے جا سکیں گے۔

موسیقی کے علم و فن میں بھی اس گھرانے کی خدمات بہت اہم ہیں۔ یہاں موسیقی پر کتابوں کی تصنیف کا کام بھی ہو رہا تھا (نغمات السند اردو زبان میں موسیقی کی ایک اہم تصنیف ہے) اور ہندوستان کے مختلف علاقوں سے بڑے بڑے فن کار بھی یہاں جمع تھے۔ یوں رام پور میں موسیقی کی ایک علیحدہ اور ممتاز روایت چلی آ رہی ہے جسے موسیقی داں طبقہ رام پور سہسوان گھرانے کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اس صدی میں اس گھرانے نے بڑے قد آور فن کار پیدا کئے ہیں۔ چنانچہ موسیقی سے لگاؤ بیگم صاحبہ کو ورثے میں ملا۔ نورالحسن جیسے مورخ کی رفاقت اور علی گڑھ کی علمی فضا نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ اس کتاب کا دیباچہ جناب سید نورالحسن صاحب ہی نے تحریر کیا ہے۔

انڈیا آفس لائبریری سے اس مخطوطے کی مائیکروفلم حاصل کرنے کے بعد بیگم صاحبہ نے بڑی عرق ریزی سے نہ صرف مرتب کیا بلکہ اس کا ایک انگریزی ترجمہ بھی تیار کیا۔ ان کا یہ کام فل سکیپ کے ایک سو سترہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ زیر نظر کتاب جو جناب شہاب سرمدی کی تدوینی کاوش ہے، محترمہ خورشید نورالحسن کی تحقیق و تفحص پر مبنی ہے۔

کتاب کی اندرونی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ فیروز تغلق ـــ "ابوالمظفر فیروز شاہ السلطان جلالۃ الملک و سلطنتہٗ" کے زمانے میں یہ کتاب ضبط تحریر میں آئی۔ اس بادشاہ کا زمانہ ۷۵۲ھ (۱۳۵۱ء) ـــ ۷۹۰ھ (۱۳۸۸ء) ہے۔ فیروز شاہ تغلق کے بارے میں تقریباً تمام مورخ متفق ہیں کہ وہ ایک درویش انسان تھا جو "تاج شاہی بر دارد"۔ سراج عفیف اسے ایک ولی اللہ خیال کرتا ہے۔ اس بادشاہ نے اسلامی شریعت کے نفاذ کے لئے بہت تگ و دو کی اور اس کے دور میں دیگر علوم و فنون کی خاصی پرورش بھی ہوئی۔ اس بادشاہ کے عہد میں علوم فقہ پر فوائد فیروز شاہی لکھی گئی۔ اسی زمانے کی ایک اور کتاب فتاویٰ تتار خانیہ کا موضوع اسلامی فقہ ہے۔ فقہ فیروز شاہی بھی اسی زمانے کی ایک اور کتاب ہے جس کا موضوع بھی یہی ہے۔ یہ اپنے زمانے کی بلند پایہ کتابیں شمار ہوتی ہیں اور ہندوستان میں اسلامی فقہ کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل ہیں۔

فیروز شاہ اپنی درویشانہ طبیعت کے ساتھ ساتھ اپنے زمانے کے فنون میں گہری دلچسپی رکھتا تھا۔ شمس سراج عفیف اس بات کا شاہد ہے کہ بادشاہ دن کا کچھ حصہ موسیقی سننے، رقص دیکھنے میں اور دیگر دلچسپیوں میں صرف کرتا تھا۔ اس کی تاج پوشی کے وقت جو محفل موسیقی برپا ہوئی وہ اکیس دن جاری رہی۔ ظاہر ہے کہ ان محفلوں میں امراء اور دیگر کار مندان دولت نے بھی بھرپور حصہ لیا ہوگا۔

سلطان فیروز تغلق کے زمانے میں "...... ملک الامراء ملاذ و الکبراء شمس الدولہ و الدین ابراہیم حسن ابو رجا احسن اللہ الیہ فی الدین و الدنیا در شہور ست و سبعین و سبع مائۃ بہ نیابت ایالت عرصہ و دو گجرات مفوض" ہوا اور انصرام سلطنت میں مشغول ہوا۔ اس کی موجودگی میں "عامہ رعایا و کافہ برایا در ظل عیش و ظلیل آسائش نہ مشابہ آرام و قرار یافت کہ آواز نالۂ زار جز زیر تار از تار مرمار ہیچ گوش نہ شنید و طمانچہ بیداری جز از روئے دف از ہیچ دست نہ رسید" (۱ الف)۔ یہ خوش حالی کی تصویر ہے اور اس میں رنگ غنا کی سُروں سے بھرے گئے ہیں۔

ابراہیم حسن ابو رجا کو ایرانی اور ہندوستانی موسیقی دونوں سے شغف تھا۔ اور "ہجوم اشغال" کے طبیعت میں راہ پانے کے بعد "دفع ملال" (۲ الف) کے لئے وہ موسیقی کی طرف رجوع کرتا تھا۔ اس کے ان اشغال میں دیگر عمائد سلطنت بھی شامل ہوتے تھے۔ اس شوق کو دیکھ کر "غنیۃ المنیہ" کے مصنف نے ایرانی موسیقی پر توجہ دی، اور کتاب فرید الزمان فی معرفت الالحان بہ بشارت شریف ازعرفی

بہ پارسی ترجمہ کردہ در آمد" (۲ الف)۔ ابھی تک محققین کو اس کتاب کا سراغ نہیں مل سکا اور اس کتاب کے بارے میں معلومات صرف ان تفصیلات تک ہی محدود ہیں جو کتاب "غنیۃ المنیہ" کے مقدمے سے حاصل ہو سکتی ہیں اور وہ صرف ایک جملے تک جو ہم اوپر درج کرتے ہیں۔ لیکن جناب پروفیسر نور الحسن کا خیال ہے کہ زمانہ حال کے کھوجیوں نے اس کتاب کا واحد نسخہ ڈھونڈ نکالا ہے۔ یہ اس وقت انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی، کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔[1]

"غنیۃ المنیہ" کے مصنف کا نام محققین کو معلوم نہیں ہو سکا۔ اس بارے میں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس زمانے کی فقہی تحریکوں کے زور شور کی وجہ سے مصنف نے اپنا نام خفیہ رکھنا احسن خیال کیا ہوگا۔ یہ خیال بھی ہے کہ یہ دونوں کتابیں خود ابراہیم ابو رجا کی تصنیف کردہ ہیں۔ یہ قیافے ہی ہیں اور ابھی تک اصل حقیقت آشکار نہیں ہو سکی۔

ہمارے لیے "غنیۃ المنیہ" کی اہمیت فنی بھی ہے اور تاریخی بھی، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس کی تاریخی اہمیت اس کی فنی اہمیت سے کہیں زیادہ ہے۔

فنی لحاظ سے "غنیۃ المنیہ" کا تعلق ہندوستانی سنگیت یعنی موسیقی، رقص اور سازنوازی سے ہے۔ اس زمانے میں جب یہ کتاب تصنیف ہوئی پنڈت سارنگ دیو (۱۲۱۰ء – ۱۲۴۷ء) کی ہندوستانی موسیقی پر قاموس سنگیت رتناکر وجود میں آ چکی تھی۔ "غنیۃ المنیہ" کی تصنیف کے وقت اس کے مصنف کے سامنے یہ کتاب بھی تھی لیکن ہمارے مصنف نے صرف اسی کتاب پر اکتفا نہیں کیا۔ وہ یہ اعلان کرتا ہے کہ "طبقۂ زبان دانان ہندوی و طوائف سازندان وگویندگان سرود، و نوازندگان مزامیر طرق در دو ہر نوع و ہر جنس از نزدیکان و دور، بر سدۂ علیا جمع آمدند و از مصنفات اہل ہند کہ درین علم فراہم آوردند، بدین اسامی بھرت، سنگیت رتناکر و سنگیت رتناولی، سنگیت بنود، سنگیت مدرا، ختگ راگر نو" (ورق ۳ الف) یہ سب کتابیں اپنے اپنے زمانے کی اہم، بنیادی اور فکر انگیز کتابیں ہیں۔ مصنف اعلان کرتا ہے کہ یہ کتابیں ان کے ماخذ تھے۔ آج کل ان کتابوں میں سے سنگیت مدرا اور راگر نو مفقود ہیں۔

موسیقی پر سنسکرت کتابیں موضوع کو کم از کم سات ابواب پر تقسیم کرتی ہیں: (۱) سُور ادھیائے (۲) راگ ادھیائے (۳) پر بندادھیائے

---

[1] راقم نے اس نسخے کو بچشم خود دیکھا ہے۔ جناب احمد ندیم قاسمی کی وساطت سے ایک درخواست انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی کو بھیجی گئی تو بکمال عنایت جناب ڈاکٹر فرخی نے اس مخطوطے کی ایک فوٹو کاپی عنایت فرمائی۔ راقم ان دونوں حضرات کا تہہ دل سے مشکور ہے۔

نسخے کی جلد کے فوراً بعد آنے والے صفحے پر یہ عبارت درج ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ فرید الزماں فی معرفت الالحان۔ سب سے پہلے فیروز شاہ بہمنی کے عہد میں جو محکمہ تالیف و ترجمہ دکن میں قائم ہوا یہ نادر روزگار کتاب اس عہد کی زرین یادگار ہے۔

ہندی رقص و سرود میں اس سے مبسوط کوئی کتاب نہیں۔ پہلا حصہ فن موسیقی پر اور دوسرا رقص پر مشتمل ہے۔ اس نسخہ کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اسی عہد کا مکتوبہ ہے۔ شان خط رسم الخط اس کی قدامت کی دلیل ہے۔

۱۔ مخطوطہ ناقص الاول ہے اور اور نہ ہی ترقیمہ موجود ہے۔

۲۔ مخطوطے کے پہلے موجودہ ۱۸ ورق ہندوستان کی موسیقی پر مشتمل ہیں جن میں تال، پر بندہ، انواع موسیقی، مزامیر اور موسیقی کچھ اور موضوع زیر بحث آئے ہیں لیکن تال کے بیان پر زور زیادہ ہے۔ مخطوطے کا باقی حصہ یعنی ورق ۱۹ سے لے کر ورق ۵۰ تک ہندی رقص پر مشتمل ہے جن میں رقص کی سنسکرت اصطلاحات کی بھرمار ہے۔ اس مخطوطے کا موضوع ہندوستانی رقص ہے۔

۳۔ کتاب غنیۃ المنیہ کے مصنف کے بیان کے مطابق اس کی تصنیف فرید الزماں فی معرفت الالحان کا موضوع "سرود پارسی" ہے۔ ایسے بھی یہی تاویل کرتا ہے۔ ان وجوہات کی بنا پر یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ وہ کتاب نہیں ہے جسے غنیۃ المنیہ کا مصنف اپنی "سرود پارسی" پر تصنیف بعنوان فرید الزماں فی معرفت الالحان کہتا ہے۔ جناب نور الحسن صاحب کو غلط اطلاع پہنچی ہے۔ انھیں شاید یہ اطلاع انجمن کے کتب خانے کی فہرست سے ملی ہے جہاں فہرست مرتب کنندگان نے کتاب پر ورق صرف محولہ بالا نوٹ پر ہی انحصار کیا ہے اور مخطوطے کو بنظر غائر نہیں دیکھا۔

(۵) تال ادھیائے (۶) وادن ادھیائے اور (۷) نرت ادھیائے۔

سُر ادھیائے کے تحت آواز، اس کا مخرج، ہیئت، اس کی پیدائش کے عوامل، شروتی، اس کا تصور اور افادیت، سُر بحیثیت ایک غنائی اکائی، سُروں کا باہمی تناسب، سُر کے مدارج، استھان اور اس کا تصور، گرام اور اس کا تصور، سُر کے درجے، سُروں کا تعلق — وادی، سم وادی، انووادی، اور ویوادی سُر — کے موضوعات زیر تحت آتے ہیں۔ بعض اوقات سُر کو ایک غنائی اکائی کی حیثیت کے علاوہ دیگر نقطہ ہائے نظر سے بھی دیکھا جاتا ہے مثلاً مابعد الطبیعیات، فلسفہ، یوگ اور تانترک زاویوں سے بھی اس پر غور کیا جاتا ہے۔ یہ روش "غنیۃ المنیہ" کے زمانے میں عام تھی۔ اسی کی ہم عصر کتاب "سنگیت رتناکر" کا ایک مکمل باب (باب اول) محض سُر کی بحث کے لئے وقف ہے اور اس میں سُر کو بحیثیت ایک غنائی اکائی کے دیکھنے کے علاوہ دوسرے نقطہ ہائے نظر سے بھی اس پر غور کیا گیا ہے۔

راگ ادھیائے کے تحت راگ کا تصور، اس کی ہیئت، ساخت، انواع، صف بندی اور اس کے معیار — اڈو، شاڈو اور سمپورن، صبح، شام، دوپہر اور رات کے راگ، جنک میل راگ اور ٹھاٹھ اور ان سے استخراج کرنے والے یا ان پر مبنی راگ اور راگ سے متعلق دیگر امور ہر ابتدائی کتاب کے دوسرے باب میں زیر بحث آتے ہیں۔

پرکیرن ادھیائے کا تعلق موسیقی کے اس شعبے سے ہے جسے ہم راگوں کے بولوں کی تصنیف و تالیف کا نام دے سکتے ہیں۔ اس کے تحت آنے والے موضوعات میں شبد (لفظ) ابھید (گانا) بھید، گمک کا تصور، استھائی، انترا، سنچاری، ابھوگ وغیرہ شامل ہیں۔

پربند ادھیائے کے تحت موسیقی کی انواع زیر بحث آتے ہیں۔ ان کے علاوہ پربند جو ازمنۂ وسطیٰ میں ہماری موسیقی کی روایت کی ایک اہم نوع تھی، سادھرا، دھروپد اور خیال جیسی شاعری کی اصناف جو موسیقی میں مروج رہی ہیں یا ہیں۔ گندھرو موسیقی، مارگ یا دستوری موسیقی مروجہ موسیقی کی بحث بھی اسی عنوان کے تحت آتی ہے۔

وادادھیائے مختلف ساز، ان کی قسمیں اور سازوں پر مشتمل ہے۔

نرت ادھیائے میں رقص پر بحث پائی جاتی ہے۔

"غنیۃ المنیہ" سُر کی ہیئت پر بحث کی بجائے گرام کے تصور سے شروع ہوتی ہے۔ ہماری غنائی روایت میں نظریئے کے اعتبار سے موسیقی میں تین گراموں یعنی شرج گرام، گندھار گرام اور مدھم گرام کا ذکر ملتا ہے اور مصنفین نے بڑی باریک بینی اور عرق ریزی سے ان میں فرق اور ان کے تعین کرنے کے طریقوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ امر بھی واضح کیا ہے کہ گندھار گرام ہماری دنیاوی موسیقی میں موجود نہیں ہے۔

ان تینوں گراموں کی ہیئت کو ہمارا فاضل مصنف سمجھ نہیں پایا۔ اس نے ان تین گراموں میں ایک اور گرام بعنوان تار گرام داخل کر دیا ہے۔ تار گرام کا ذکر موسیقی کی مستند کتابوں میں کہیں نہیں ملتا۔ یہ مصنف کی اپنی اختراع ہے اور اس بات کی غماز ہے کہ یہ موضوع ہمارے فاضل مصنف کی گرفت سے باہر ہی رہا۔ لیکن کتاب میں جہاں مصنف نے ہر گرام کے نقشے دیئے ہیں وہاں ہر سپتک کو بغیر کسی وضاحت کے مندر، مدھیہ اور تار میں تقسیم کر دیا ہے جس سے قاری یہ نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ موسیقی کی ان دو بنیادی تصورات کو مصنف نے غیر ضروری طور پر الجھا دیا ہے۔ اس اعتراض کی وضاحت کچھ یوں کی جا سکتی ہے۔

ہماری موسیقی چونکہ ایک گلئی فن ہے اس لئے سہولت سے گلے سے آواز پیدا کرنے کی اہلیت کے پیش نظر اسے صرف تین سپتکوں تک محدود کر دیا گیا ہے۔ پہلا سپتک مندر کہلاتا ہے دوسرا مدھیہ یعنی درمیانہ اور تیسرا تار یعنی بلند تر۔ سپتک اس سے بھی زیادہ ہو سکتے ہیں جیسے یورپی موسیقی کی "اوپرا" کی غنائی روایت میں ہوتا ہے جہاں فن کار کبھی کبھی چھٹے ساتویں سپتک تک بھی پہنچ جاتا ہے اور

ہمارے ہاں بھی فن کار کبھی کبھی تیسرے سپتک یعنی تار سپتک سے بلند تر ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک سپتک کو تین حصوں میں تقسیم نہیں کیا جاتا بلکہ مندر، مدھیہ اور تار کی اصطلاحات سے تینوں سپتکوں کے تین مختلف درجے مراد ہیں جیسے پہلا (مندر) دوسرا اور میانہ (مدھیہ) اور اوپر کا آخری اور تیسرا سپتک (تار)۔ اگر ایک سپتک کو حصوں میں تقسیم کرنا ہو تو اس کے صرف دو حصے تسلیم کئے جاتے ہیں۔ پہلا حصہ پورو انگ کہلاتا ہے جو بنیادی سُر شڑج سے شروع ہو کر یعنی مدھیم یعنی چوتھے سُر پر ختم ہو جاتا ہے۔ دوسرا حصہ اترانگ کہلاتا ہے اور یہ مدھیم سے لے کر سپتک کے اگلے سا تک جاتا ہے۔ مدھیم کا سُر سپتک کے دونوں حصوں کو باہم مربوط کرتا ہے اور اسی وجہ سے مدھیم یعنی وسطی یا درمیان میں واقع ہونے والا سُر کہلاتا ہے۔ اسی بنیاد پر راگوں کو بھی پورو انگ کے راگ اور اترانگ کے راگوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس تقسیم میں معیار صرف یہی ہے کہ راگ کا زیادہ انحصار پہلی چار سُروں پر ہے یا سپتک کی آخری چار سُروں پر۔ ایک سپتک کو تین حصوں میں تقسیم کرنا ایسی فاش غلطی ہے جس کی توقع موسیقی پر سرسری نظر رکھنے والے شخص سے نہیں کی جا سکتی۔ "غنیۃ المنیۃ" کے فاضل مصنف نے اس غلطی کو کم از کم تین نقشوں میں دہرایا ہے۔ (۵ ب اور ۶ الف اور ۶ ب مطبوعہ متن ۱۰ اور ۱۱ اور ۱۲)

اس کوتاہی سے یہ تاثر بھی ملتا ہے کہ مصنف کے ذہن میں گراموں کا تصور بھی واضح نہیں اور وہ تینوں گراموں میں فرق اور ان کے تعین کی وضاحت نہیں کر سکا۔ زمانہ حال کی نظری اور عملی موسیقی میں یہ تصورات متروک ہو چکے ہیں اور ہماری غنائی روایت کی بنیاد صرف شڑج گرام تک ہی محدود ہے۔

شُرتی کا تصور بھی نظری موسیقی میں ایک بنیادی تصور ہے اور اس پر مباحث بھرت کے نٹ شاستر سے لے کر ہمارے زمانے میں پروفیسر جیراز بھائی تک آتے ہیں۔ (جیراز بھائی اور سٹون: ۱۹ تا ۱۳۲) لیکن ہمارے فاضل مصنف نے شرتیوں کے موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ اس بحث کو سپتک، سُر اور گرام سے پہلے آنا چاہیئے تھا کیونکہ سُر، سپتک اور گرام کا انحصار انہی شرتیوں پر ہے۔

سنسکرت زبان میں لفظ گندھرو کی طرح شرتی بھی کثیر المفہوم لفظ ہے بطور اصطلاح کے یہ مذہب میں رائج ہے۔ ویدوں کو شرتی کے علمی زمرے میں ڈالا جاتا ہے جہاں اس کے معنی ہیں وہ جو سنا گیا اور ذیلی معنی الہامی کے ہیں یعنی وہ جو الہام کیا گیا اور موسیقی میں بھی یہ لفظ بطور اصطلاح کے مروج ہے اور اس سے مراد وہ چھوٹی سے چھوٹی آواز ہے جسے انسانی کان سن سکتے ہیں لیکن موسیقی میں شرتی سے متعلق بحث کے کئی پہلو ہیں اور اگر ان کی تفصیل میں جائیں تو معاملہ بہت طویل ہو جائے گا۔ اور مختصراً یہ بحث ان امور سے متعلق ہے۔

شرتیوں کی تعداد۔ ان کی انفرادیت (ہر شرتی کا ایک نام ہے اور اس کا ایک مقررہ مقام ہے جہاں سے وہ اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتی) ان کا بطور غنائی وقفوں یا فاصلوں کے برابر ہونا یا برابر نہ ہونا۔ شرتیوں کا سُر کے تعین میں کردار اور پھر سُر کے درجات (شدھ تیور، اتی تیور اور تیور تم اور پھر کومل، اتی کومل وغیرہ) کے تعین میں ان کا کردار۔ گراموں میں تفریق اور امتیاز اور ان کے تعین میں شرتیوں کا کردار، شرتیوں کی ذہنی ہیئت اور یہ سوال کہ کیا وہ عملی طور پر گلے سے ادا ہو سکتی ہیں اور کسی غنائی تالیف میں ان کی موجودگی ظاہر ہوتی ہے۔ یا وہ محض نظریاتی تصور ہیں۔

شرتیوں کی بحث کی یہ کچھ جہتیں ہیں جن کو ہمارے فاضل مصنف نے قطعاً نظر انداز کر دیا ہے۔

فارسی زبان میں موسیقی کی تحقیق کی دعویدار کتابیں سنسکرت کی اس قدیم روایت کو پیش نظر نہیں رکھتیں۔ ان تمام مباحث کو فارسی کی کتابیں ایک یا دو ابواب میں بند کرنے کی کوشش کرتی ہیں جس سے ان کی حیثیت محض ایک ابتدائی مدخل کی رہ جاتی ہے۔ ان میں کچھ ضروری اصطلاحات کے یعنی وہ جن کو فارسی کتاب کا مصنف ضروری خیال کرتا ہے، فارسی ترجمہ کر کے اپنے تحقیقی منصب سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ اس طرح موضوع کا مغز تو غائب ہو جاتا ہے اور فارسی داں قاری کے ہاتھ محض پوست آتا ہے۔ فارسی کے ایسے تراجم موسیقی کے

موضوع کی روح کے اندر جھانکتے دکھائی نہیں دیتے، گو "غنیۃ المنیہ" نے مندرجہ بالا سکیم کو مدِنظر ضرور رکھا لیکن اس کی مجموعی صورت حال تقریباً تقریباً وہی ہے۔ کتاب اس بات کی دعویدار ہے کہ اس کے مصنف کے سامنے موسیقی پر سنسکرت کی سات کتابیں جن میں اس موسیقی کی قاموس سنگیت رتناکر بھی شامل ہے۔ اسے ہندو ماہرینِ فن کی خدمات بھی حاصل تھیں لیکن موسیقی کی مندرجہ بالا موضوعات کو کل چھپن (۵۶) صفحات میں بند کر دینا ایسا ایجاز ہے جو ممکن نہیں (باقی سینتالیس صفحات کا تعلق ہندی رقص سے ہے) یہ طریق کار موضوع کے علمی اور عملی تقاضوں کا پورا پورا احاطہ نہیں کر سکتا لیکن اس امر کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ موسیقی کے شعبے میں یہ کتاب مسلمانوں کی اولین کاوش تھی۔ مسلمان اپنے ساتھ خود اپنی غنائی روایات لے کر آئے تھے، اور کتاب کی تصنیف تک وہ ہندوستان کی مضبوط و توانا لیکن مختلف اور منظم روایات پر ابھی تک علمی اور عملی طور پر حاوی نہیں ہو پائے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت امیر خسروؒ (اعجاز خسروی میں در انشعاب اصول و فروع موسیقی) اور ابوالفضل (آئین اکبری میں سنگیت) کو شامل کر کے مسلمان ہندوستان کی موسیقی پر ایک بھی ایسی کتاب تصنیف نہیں کر پائے تھے جو موضوع کا خاطر خواہ احاطہ کرتی ہو۔ (لہجات سکندر شاہی کے بارے میں راقم کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ باوجود بیس برسوں پر محیط تمام کوششوں کے اس مخطوطے کو دیکھنے کا موقع نصیب نہیں ہوا۔)

ایسی ہی روش کی بنا پر سنسکرت سے فارسی "تراجم" پر اٹھارویں صدی کے اختتام کے قریب مشہور و معروف مستشرق سر ولیم جونز نے کہا تھا کہ "مغلوں کو (جس سے اس کی مراد مسلمان تھے) ترجمے کا صحیح شعور نہیں تھا۔ وہ (کتابیں) اصلی متن اور اس پر اپنی حاشیہ آرائی کو ملا کر ایک کمزور پیرا فریز پیش کر دیتی ہیں۔ وہ سنسکرت الفاظ کو فارسی میں لکھنے کا حیلہ تو کرتی ہیں لیکن اس عمل میں بری طرح ناکام رہتی ہیں چنانچہ جو شخص ہندوؤں کو فارسی کتابوں کے ذریعے جانتا ہے وہ ہندوؤں کو جان ہی نہیں سکتا۔ اسی لئے جو اہلِ فرنگ ہندوؤں کے شفاف علمی چشموں کی بجائے ہندوستان پر مسلمانوں کی لکھی ہوئی کتابوں پر (جن کی صورت گدلی نالیوں کی ہے) انحصار کرتا ہے، گمراہ ہونے اور گمراہ کرنے کے خطرے سے ہمیشہ دوچار رہتا ہے۔ میری تنقید کی نکوہش کی اس شدت سے میں نہ ابوالفضل، نہ اس کے بھائی فیضی، نہ محسنی فانی اور نہ مرزا خان کو بری قرار دیتا ہوں۔" (ولیم جونز ۱۷۹۶)

یہ فتویٰ بڑا سنگین ہے اور ایک سویپنگ سٹیٹمنٹ ہے۔ اس کی بنا اس زمانے کی علم و دانش پر تھی جس میں آریائیت کے فتنے کی آبیاری شامل تھی اور اس میں سیاسی بنا پر مسلمانوں اور ان کے علوم و فنون کے بارے میں اہلِ فرنگ کے تعصبات بھی شامل تھے جن کا اظہار تمام شعبہ ہائے علوم میں بالعموم اور تاریخ میں بالخصوص نظر آتا ہے۔ یہ فتویٰ تنگ نظری اور علمی تعصبات پر مبنی دکھائی دیتا ہے۔ اس فتوے کے اندر بھی ایک ستم ہے۔ سر ولیم جونز جیسا صاحبِ علم اور باریک بین محقق محسن فانی کو محسنی فانی لکھتا ہے اور اورنگ زیب کے زمانے کی کتاب "تحفۃ الہند" کے مصنف مرزا محمد بن فخرالدین محمد کو مرزا خان لکھتا ہے۔ ان کے بعد آنے والے محقق موخرالذکر فاضل کو مرزا خان ہی لکھتے آئے ہیں اور سند ٹھہرے خود سر ولیم جونز مصنف ایشیاٹک ریسرچز اور بانی رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال۔

اگرچہ یہ فتویٰ "غنیۃ المنیہ" کی تصنیف کے چار سو سال بعد صادر ہوا اور یہ کتاب اس مفتی کے مطالعہ میں بھی نہیں آئی تھی تاہم اس کے مندرجات پر صرف ایک نظر ڈالنے سے سر ولیم جونز کی ژرف نگاہی پر تعجب ہوتا ہے کیونکہ یہ کتاب موسیقی کی اصطلاحات کی فارسی زبان میں صرف تشریحات پر مبنی نظر آتی اور اس میں نظری بحثیں دکھائی نہیں دیتیں۔ یہ تاثر بھی ملتا ہے کہ موضوع کے بنیادی تصورات ہمارے گمنام فاضل مصنف کی گرفت میں نہیں آئے۔

لیکن باوجود ان فنی اور موضوع سے متعلق کوتاہیوں اور خامیوں کے اس کتاب کی ایک تاریخی اہمیت ہے جو اس کی فنی اہمیت سے کہیں زیادہ ہے۔

برعظیم کی موسیقی پر فارسی زبان میں لکھنے کا آغاز تو اسی کتاب "غنیۃ المنیہ" سے ہوتا ہے۔ تا حال اس موضوع پر فارسی زبان میں یہ اولین کتاب

شمار ہو سکتی ہے۔ آئندہ تحقیق شاید کوئی اور انکشاف کرے۔ یہ سلسلہ اس کتاب سے شروع ہو کر سکندر نودہی کے لہجات سکندر شاہی سے ہوتا ہوا آئین اکبری کے کچھ حصوں، تحفۃ الہند، راگ درپن، اصول النغمات آصفیہ سے گزر کر واجد علی شاہ کی صوت المبارک پر ختم ہوتا ہے۔ کچھ کتابیں سنسکرت کتابوں کا ترجمہ ہونے کی دعویدار ہیں۔ اس امر کی مدعی مرزا روشن ضمیر کی سنگیت پاریجات اور فقیر اللہ کی راگ درپن ہیں۔

تیرھویں صدی میں دونوں غنائی روایتیں ہندوستان میں موجود تھیں اور دونوں متوازی خطوط پر گامزن تھیں۔ ایرانی روایت مسلمان اہل اقتدار کے ہاں مقبول تھی تو ہندی روایت مقامی لوگوں میں۔ اس زمانے میں دو کتابیں بیک وقت وجود میں آئیں۔ ایک فرید الزماں فی معرفت الالحان ہے اور دوسری کتاب غنیۃ المنیہ۔

اس سے یہ استدلال جائز نہیں کہ یہ دونوں روایتیں ایک دوسرے کی طرف مدغم ہونے کی غرض سے بڑھ رہی تھیں (نور الحسن: ۹) بلکہ یہ کہنا زیادہ قرین قیاس ہے کہ ان دونوں کتابوں کے بیک وقت ضبط تحریر میں آنے سے ان روایات کی الگ الگ حیثیت مسلم ہوتی ہے۔ فارسی روایت کا ہندی روایت میں ادغام یا ہندی روایت کو متاثر کرنے کا مسئلہ ہمارے ہاں خصوصاً مسلمانوں میں قومی تفاخر کا ایک جزو بن چکا ہے۔ ہندو حکما کے لئے یہ امر جزو ایمان ہے کہ ہندی موسیقی پر ایرانی روایت نے کوئی اثر نہیں ڈالا۔ ایک غیر جانبدار طالب علم کے لئے یہ صورت حال بڑی مشکلات کھڑی کر دیتی ہے۔

اس ادغام کے نظریے کے پیرو شاید یہ نہیں جانتے کہ ہندی موسیقی اور مشرق وسطیٰ کی موسیقی کی ہیئتیں مختلف ہیں۔ ہندی موسیقی کی بنیاد بائیس شروتیوں پر ہے جن کو ہم مائیکرو ٹونز کہہ سکتے ہیں، لیکن مشرق وسطیٰ کی موسیقی کے سکیل کی بنیاد ۲۴ مائیکرو ٹونز پر ہے۔ (ہیلم ہولٹز: ۲۸۱ تا ۲۸۴) یہ موسیقی کی ہیئت کا وہ بنیادی مسئلہ ہے جو "غنیۃ المنیہ" کے مصنف کے پلے نہیں پڑ سکا اور وہ اسی چکر میں الجھ گیا۔ ایک یورپی محقق کا اس موضوع پر خیال ہے کہ:

> Despite the spread of Islam into South and South-East Asia the impact of its musical theories in these areas has been negligible.It might be thought that the teachings of Safi al-Din and his school, which dominated Islamic theory down to the sixteenth century would have been introduced into India during the Mogul period. But the strictly mathematical analysis of scale, perhaps the most characteristic element in this corpus of theory, was alien to the native Sanskrit tradition, and later Persian works on Indian Music are either concerned with practice-- or at least with the classification of modes and the related doctrine of ethos--or are simply translations of Sanskrit texts.

(رائٹ: ۴۹۵)

مسلمان ہندوستان میں تقریباً آٹھ سو سال تک اقتدار میں رہے لیکن مشرق وسطیٰ سے ہی ان کی فکر اور تخیل سے فیضان حاصل کرتے رہے۔ ان کی نظم و نثر میں تشبیہات، تلمیحات اور استعارے مشرق وسطیٰ کی ادبی روایات کی پیروی کرتے رہے۔ انھوں نے کبھی ہندوستان کے ماحول کا ذکر نہیں کیا۔ یہاں کے دریا، پہاڑ، پھول، پرندے، درخت، بن، موسم وغیرہ ان کے لئے باعث دلچسپی نہیں تھے (عزیز احمد: ۲۵۲ اور ۷۵ اور ۸۷)۔ وہ یہاں صدیوں تک رہنے کے باوجود مشرق وسطیٰ کی فنی روایت سے علیحدہ نہ ہو سکے۔ اگر شاعری اور ادبیات میں یہ عالم تھا تو موسیقی تو اور بھی لطیف تر فن ہے۔ چنانچہ یہ باور کرنا مشکل ہے کہ مسلمانوں نے اپنی غنائی روایات کو ہندی غنائی روایت سے متاثر ہونے کا کوئی موقع دیا ہو لیکن دوسری طرف یہ دعویٰ ہے کہ مشرق وسطیٰ کی غنائی روایت نے ہندی روایت کو متاثر کیا۔ ایسا ہونے کی

ایک وجہ یعنی دونوں روایتوں کے تکنیکی کا بنیادی فرق اوپر بیان ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کی روایت اس قدر منظم، قدیم اور توانا تھی کہ اس پر سوائے چند غیر ملکی تجربوں" (وائٹ ۲: ۵۰) کے بیرونی روایت کوئی اثر مرتب نہ کر سکی۔ یہ درست ہے کہ پچھلی چند صدیوں میں عملی موسیقی پر مسلمان چھائے رہے ہیں۔ تمام عظیم فن کار مسلمان ہی تھے اور ہیں۔ لیکن یہ سارے موسیقار اپنے آپ کو ہندو نائیکوں کی اولاد قرار دیتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیے کہ عملی موسیقی میں ان کی جدتوں اور اختراعات پر مبنی نظریات ہندوؤں نے سنسکرت ہی میں منضبط کیے اور موسیقی کا ریکارڈ نہ ہونے کی وجہ سے آج ان کو تلاش کرنا محال ہے۔ مثال کے طور پر ہندو اور مسلمان سب اس بات کے معترف ہیں کہ خیال گائکی میں تان کو مروج کرنے والے بڑے محمد خاں تھے لیکن سوائے اس زبانی روایت کے جو کچھ عرصے بعد اپنی موت آپ مر جائے گی، ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں۔ اسی طرح یہ کہا جاتا ہے کہ خیال میں سرگم کرنے کے عمل کو پنجاب میں بہرے عبدالوحید خاں نے مروج کیا لیکن آج کل کے "قوم پرست" موسیقاروں کے سامنے ہم یہ بات نہیں کہہ سکتے، کیونکہ اس سے فساد کا اندیشہ ہے۔

حضرت امیر خسرو واحد شاعر تھے جنھوں نے اپنے کلام میں ہند اور ہندی ماحول اور یہاں کی زندگی کا ذکر کیا۔ چنانچہ وہ اپنے مقبول ہوئے کہ آج کل کی موسیقی کا بابا آدم انھیں ہی خیال کیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود کہ ہندی موسیقی میں ان کی دلچسپی کی کوئی شہادت ان کے کلام سے یا ان کے ہمعصروں سے ہمیں دستیاب نہیں ہوتی، ہم ہندوستان کی موسیقی کے کئی راگوں، سازوں اور اوضاع کو ان ہی کے کھاتے میں ڈالتے ہیں۔ اس ضمن میں ہندو محققین بھی اپنے روایتی تعصب کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں اور حضرت امیر خسرو کو مسلمانوں کے دیے ہوئے نائک کے درجے کو تسلیم کرتے ہیں۔ برنی نے تو ان کے متعلق صرف اتنا ہی کہا تھا کہ "در موسیقی گفتن و ساختن کمال داشت" اور اس امر کی تشریح نہیں کی کہ وہ کون سی موسیقی تھی جس میں انھیں کمال حاصل تھا لیکن ہم فارسی سے نابلد "موسیقی گفتن و ساختن" کی غلط توجیہات اور تفاسیر کر کے ایک شاعر بے بدل کو اورنگ زیب کے زمانے سے صوفیوں کی صفوں سے اٹھا کر قوالوں کے طائفے میں بٹھانے پر اصرار کر رہے ہیں اور اپنی قومی تفاخر کے جذبے کی تسکین کر رہے ہیں۔

"غنیۃ المنیہ" حضرت امیر خسرو کے زمانے کی کتاب ہے لیکن اس موضوع پر قطعاً خاموش ہے۔ اس میں نہ ان راگوں کے نام ملتے ہیں جو صاحب "راگ درپن" فقیر اللہ سیف خاں ان کے نام نامی سے منسوب کرتا ہے، نہ ان تانوں کا ذکر ہے جو مشرق وسطیٰ کی موسیقی سے مخصوص ہیں اور جن کو متعارف کروانے کا سہرا حضرت امیر خسرو کے سر باندھا جاتا ہے، نہ ان سازوں کا ذکر ہے جو ان کی ایجاد قرار دیے جاتے ہیں اور نہ ہی ان اوضاع کا کہیں ذکر ہے جن کو ان کی اختراعات میں شمار کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر وحید مرزا نے تو صرف اتنا کہا تھا کہ انھیں حضرت امیر خسرو کی نگارشات میں ستار کا نام کہیں نظر نہیں آیا (وحید مرزا: ۲۲۹، ۲۳۰)۔ لیکن "غنیۃ المنیہ" ان تمام افسانوں کی تنقیح کر دیتی ہے جن کو حضرت امیر خسرو کے نام سے منسوب کرنے کی روایت فقیر اللہ سیف خاں نے اپنے سازندوں کی شنید پر شروع کی تھی۔ (راگ درپن: ۵) اس موضوع پر مذکورہ بالا محقق "غنیۃ المنیہ" کے حوالے یا مطالعے کے بغیر یہ کہتا ہے:

> But although Persian music was cultivated under the Moguls as well as under the earliest dynasties it is difficult to judge how radically it affected the Indian tradition. Accounts of Amir Khusraw's (d. 1325) innovations, for instance, are evidently exaggerated; but among the numerous modes, rhythms, and forms he is credited with introducing there are nevertheless several that can be traced to Persian and Arabic sources: the modes *'ushaq*, *nigar*, and *zangula*; the rhythms *khamsa* and *sul-fakhta*; and the forms *qawl*, *basit*, *firudasht*, and *tarana*, the latter two evidently much altered.
>
> (وائٹ ۳: ۵۰)

بقول سید نورالحسن صاحب مصنف "غنیۃ المنیہ" شاستروں میں بیان کردہ اصولوں اور اصطلاحات سے ہٹ کر مقبول زمانہ امور کی طرف زیادہ توجہ دیتا ہے۔ یہ نکتہ بڑا اہم ہے۔ ایک طرف تو یہ اس امر کی طرف بلیغ اشارہ ہے کہ ہندی غنائی روایت دیوی دیوتاؤں کی وضع کردہ کوئی سماوی روایت نہیں جیسا کہ داتیلم اور نٹ شاستر کے زمانے سے لے کر بیسویں صدی تک کے شاستری ہمیں باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسا خیال کرنے کی وجہ شاید یہ تھی کہ تمام فنون خصوصاً سربانی روایت سے وابستہ تمام فنون کی جڑیں اساطیر میں ہیں اور ایک قدیم رجحان یہ بھی تھا کہ جس چیز یا روایت کے آغاز کے بارے میں علم نہ ہو اسے اساطیر یا دیوی دیوتاؤں سے منسلک کر دیا جائے۔ دوسری طرف یہ رشتہ اس امر کی دلیل ہے کہ ہندوستان کی غنائی روایت کی جڑیں دراصل عوامی موسیقی میں ہیں۔ موسیقی کو مارگ اور دیسی اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے۔ مارگ موسیقی سماوی یا دیوتاؤں کی موسیقی ہے۔ جو دراصل وہ مذہبی موسیقی جس کے منضبط اصول تھے، اور مذہبی متون مثلاً رگ وید کو گانے کے لئے، دعاؤں کے لئے اور قربانیوں پر مناجات گانے کے لئے مخصوص تھی۔ دیسی موسیقی عوام کی موسیقی تھی جو انسانی زندگی کے مختلف مراحل پر انسانی جذبات کا اظہار کرتی ہے جس کی کئی مقامی صورتیں تھیں جن میں علاقائی، قبائلی اور موسمی نسبتیں پیش پیش ہیں اور راگوں کے ناموں سے ظاہر ہوتی ہیں۔

دیسی موسیقی کے رشتے کا موسیقی کے اوضاع سے بھی پتہ چلتا ہے۔ پربند، دھروپد، خیال، ٹھمری، گجری یہ سب شاعری یا دیسی عوامی موسیقی کی اوضاع تھیں، جو ہماری غنائی روایت میں راہ پا گئیں۔

ہماری موسیقی کے مروجہ بول بھی ہندوستان کی غنائی روایت کے عوامی موسیقی سے رشتے کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان بولوں میں وہ زبان استعمال نہیں ہوتی جو درباری ہو یا جو شاعر اور ادیب استعمال نہیں کرتے ہیں بلکہ موسیقی کے بولوں میں عوام کی زبان اور عوام کا روزمرہ ہی استعمال ہوتا ہے۔

اس نکتہ کی دوسری اہمیت یہ امر ہے کہ یہ مشاہدہ ہماری غنائی روایت کے اس اصول کی نشاندہی کرتا ہے کہ ہمارے ہاں عمل کو اولیت حاصل ہے اور نظریہ عمل کے بعد وضع ہوتا ہے۔ ہماری تمام کتابوں کی تصنیف و تدوین سے یہ شہادت دستیاب ہوتی ہے کہ عمل یعنی موسیقار آگے ہوتا ہے اور گرنتھ کار یا شاستری اس کے پیچھے چلتا۔ گرنتھ کار کا صرف اتنا کام ہے کہ موسیقار کے وہ تجربات جو عوام کی پسند کی کٹھالی سے گزر کر روایت کا حصہ بن جائیں، وہ ان کا احاطہ کرے اور ان پر مبنی نظریہ وضع کرے چنانچہ ہندی روایت میں عمل پہلے آتا ہے اور نظریہ بعد میں وضع ہوتا ہے (دیکھ: ۸۷) یہی وجہ ہے کہ صاحب "غنیۃ المنیہ" شاستروں سے ہٹ کر مروجہ عملی موسیقی کا ذکر کرتا ہے۔

جس طرح صدیوں پرانا ایک ٹوٹا ہوا بت، مٹی کے برتن کا کوئی ٹکڑا یا اینٹ ایک ماہر آثار قدیمہ کو اپنی متعلقہ تہذیب کی پوری واردات بتا دیتا ہے اسی طرح ہندوستان کے سنگیت —— رقص و موسیقی —— پر یہ چند اوراق، جو اس موضوع پر فارسی زبان میں لکھی گئی اولین دستاویز ہے۔ ایک تربیت یافتہ مورخ کو اس عہد کی پوری ثقافتی داستان بیان کر دیتی ہے۔

راقم جناب ڈاکٹر مختار الدین احمد پرو وائس چانسلر جامعہ علی گڑھ کا تہہ دل سے مشکور ہے کہ انھوں نے کتاب "غنیۃ المنیہ" کا مطبوعہ متن راقم کو بڑے تردد سے بھجوایا اور جب یہ مقالہ محترمہ خورشید نورالحسن مرحومہ کے اس تعارف کی وجہ سے رک گیا جو محترمہ نے انڈین ہسٹری کانگرس ۱۹۷۱ء میں پیش کیا تھا تو محترم ڈاکٹر صاحب نے پھر دستگیری فرمائی اور انڈین ہسٹری کانگرس کی کارروائی سے محترمہ کے ارشادات کی ایک فوٹو کاپی روانہ فرمائی۔ اللہ اس علم دوست فاضل کو جزائے خیر سے نوازے۔

BIBLIOGRAPHY

1. Ansari, Dr Nurul Hasan and Shukla, Dr Shutrughan (eds) — Rag Darpan, Dept. of Persian, Delhi University, New Delhi, 1981

2. Aziz Ahmad — Studies in Islamic Culture in Indian Environment, OUP. paperback, 1970

3. Ethe, Dr Herman. — Catalogue of Persian Manuscripts in India Office Library, London, 1903-37

4. Jairazbhoy, N.A and Stone, A.W., — *Intonation in Present-day North Indian Music*, Bulletin of the School of Oriental and African, Studies, London, vol. 26, 1963.

5. Jones, Sir William., — *Musical Modes of the Hindus*, reprinted in Rosenthal, The Story of Indian Music, William Reeves, London, 1937.

6. Nurul Hasa n — *Foreword* to Ghunyat- ul- Muniya, described below.

7. Shahab Sarmadee (ed) — Ghunyat-ul-Munya, Centre of Advanced Study, Dept. of History, Muslim University, Aligarh, Asia Publishing House, New Delhi, 1978.

8. Wade, B.C., — Music in India--The classical Tradition, Prentice-Hall History of Music Series, N.Jersey, 1979.

9. Wahid Mirza, Dr., — Life and Works of Amir Khusrau, Lahore, reprint, 1962.

10. Wright, O., — *Music*, in Schacht and Bosworth (eds), The Legacy of Islam, OUP. paperback, 1979.

روشن خیالی اور اُردو ادب میں اس کی روایت

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

آج کی شام "روشن خیالی" کے عنوان سے جس موضوع پر اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی ہے، اس کی زندہ مثال ہمارے سامنے سبطے بھائی (سید سبط حسن) کی صورت میں موجود ہے اور جب کسی شے کی عملی و معروف مثال سامنے ہو تو پھر اسے نظری طور پر زیر بحث لانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پھر بھی موضوع کی نوعیت ایسی ہے کہ اس پر اظہار خیال کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

روشن خیالی خواہ اس کا تعلق، سماج و تاریخ سے ہو یا فلسفہ و مذہب سے، علم و فکر کے بغیر جنم نہیں لے سکتی جس نسبت سے کوئی فرد یا معاشرہ علم و فکر سے منور ہوگا اسی نسبت سے اس میں روشن خیالی کا عنصر حاوی نظر آئے گا۔ یہاں میں "علم و فکر" کے الفاظ میں تجرباتِ حسی و باطنی کی اُن ساری جہات کو شامل کر رہا ہوں جو، وحی و الہام، وجدان و عرفان، تخلیق و تعبیر، اور تجدد و اجتہاد' سب کا احاطہ کرتی ہیں۔

روشن خیالی جس کا منبع، میں نے علم و فکر اور اس کی مختلف جہات کو قرار دیا ہے انسان کے حق میں نعمتِ عظمیٰ، رحمتِ الٰہی اور نشانِ عظمت ثابت ہوئی ہے۔ تاریخ کے ہر دور اور دنیا کے ہر مذہب و معاشرے میں اس کی برکتوں کا ثبوت ملتا ہے۔ ہماری اپنی تاریخ اور ہمارا اپنا مذہب تو روشن خیالی کا سب سے بڑا داعی بھی ہے اور سب سے بڑا مظہر بھی۔

قرآن کریم میں، اس قسم کی آیات "لا اکراہ فی الدین" (یعنی دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے)، اور "لیس للانسان الا ماسعیٰ" (یعنی ایک آدمی اتنے ہی کا حقدار ہے جتنی وہ سعی کرتا ہے)، انسان کے لئے روشن خیالی کے باب میں ازلی نشانیاں، اور آئینی ضمانتیں ہیں۔

حضور اکرمؐ کا یہ فرمانا کہ:

"رنگ و نسل کے اعتبار سے کالے پر گورے کو اور عجمی پر عربی کو کوئی فوقیت نہیں۔ فوقیت ہے تو صرف تقویٰ کو کہ تقویٰ، خدا ترسی کا دوسرا نام ہے۔"

اسی کے ساتھ یہ اعلان کہ:

"آج کے دن سب کو معافی ہے حتیٰ کہ اسے بھی جس نے ابو سفیان کے گھر میں پناہ لی ہو۔"

روشن خیالی کی یہ ایسی مثالیں ہیں، جن کی پیروی سے انسانی معاشرہ تا ابد منور رہ سکتا ہے۔ روشن خیالی کی اس مشعل کو فکر و دانش کے نمائندوں نے اپنی بساط بھر ہمیشہ جلائے رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے عہد میں علامہ اقبال کا یہ فرمانا کہ:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

اور تہذیب انسانی کے ارتقاء کے وسیلے سے "اسرارِ خودی" کے دیباچے میں یہ کہنا کہ:

○ یہ مضمون سبطے بھائی کی زندگی میں پریس کلب کراچی میں "سید سبطِ حسن" کے ساتھ ایک شام کے تحت پڑھا گیا تھا۔ پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔ (ف۔ف)

"بنی نوعِ انسان کی ذہنی تاریخ میں سری کرشن کا نام ادب و احترام سے لیا جائے گا کہ اس عظیم الشان انسان نے ایک دلفریب پیرائے میں اپنے ملک و قوم کی فلسفیانہ روایات کی تنقید کی اور اس حقیقت کو آشکار کیا کہ عمل اقتضائے فطرت ہے اور اسی سے زندگی کا استحکام ہے۔"

ان کے روشن خیال ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے اور اسی روشن خیالی نے انھیں آفاقی شاعر کے مرتبے پر فائز کیا ہے۔

اسلامیات و اقتصادیات کے حوالے سے، جہاں سید الاحرار مولانا حسرت موہانی کا یہ قول کہ:

"اشتراکیت سے اسلام کو کوئی خطرہ نہیں مجھے دیکھو کہ باعمل سچا مسلمان بھی ہوں اور پکا کامریڈ بھی۔"

روشن خیالی کی ایک عظیم الشان مثال ہے، وہاں سیاسیات و تہذیبی تاریخ کے حوالے سے سید سبطِ حسن کا اپنی تحریروں میں یہ اصرار کہ:

"ریاست کو اشیائے صرف کی ملکیت کا حق، خواص خواص افراد کو نہیں، عوام کو ملنا چاہیے اور ان کے استعمال کا پیمانہ محض افراد کی محنت و کارکردگی نہیں بلکہ ان کی بنیادی ضرورتوں کو بنایا جانا چاہیے۔"

روشن خیالی کا ایک واضح نشان ہے۔ مختصر یہ کہ روشن خیالی کا ہر پہلو خواہ اس کا تعلق کسی بھی شعبۂ حیات سے ہو، فکر و دانش اور عمل و اجتہاد سے مشروط ہے اور جو قومیں، ان شرائط کو پورا کرتی ہیں وہی دنیا میں احترام، اعزاز اور پاسبانی و حکمرانی کی مستحق ہوتی ہیں۔

ہمارے موجودہ زوال کا بڑا سبب یہی ہے کہ ہم ایک عرصے سے روشن خیالی کی نعمت سے محروم ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ پچھلی دو تین صدیاں، برِعظیم کے باسیوں، خصوصاً مسلمانوں کے لئے ابتلا و زوال کی صدیاں رہی ہیں۔ اپنے ایمان و عقائد کے اظہار و تحفظ کے لئے، ان کے پاس پرجوش نعروں، اور بے جان روایتوں کی پرستش کے سوا کوئی ایسا ساز و سامان نہ تھا کہ وہ جدید فکر و دانش اور علم و عمل سے مسلح ہو کر مغرب کا مقابلہ کر سکتے۔ علامہ اقبال کے لفظوں میں مسلمانوں نے تین سو سال سے علم و فکر کی تازہ ہواؤں کے سارے دروازے اپنے اوپر بند کر لئے تھے۔

ایک عرصے کے بعد حضرت شاہ ولی اللہؒ نے ان دروازوں کو کھولنے کی کوشش کی۔ تاریخی حوالوں اور مثالوں سے مسلمانوں کو وضاحت سے سمجھایا کہ ملتِ اسلامیہ کی تقدیر محض عقائد و تقلید یا روایت پرستی کی تبلیغ سے نہیں بدل سکتی۔ اس کے لئے احکامِ قرآنی کے تحت تفکر و تدبر اور اجتہاد و عمل سے کام لینا از بس ضروری ہے۔ ان مجددانہ افکار نے مسلمانوں کے ذہنوں کو بدلنے میں یقیناً بہت اہم کردار ادا کیا لیکن اُن کے تابعین و مقلدین نے شاہ صاحب کی دکھائی ہوئی راہ پر تادیر قائم رہنا پسند نہ کیا۔ غضب یہ ہوا کہ شاہ ولی اللہؒ نے جس خانقاہی اندازِ فکر اور طرزِ عمل کے خلاف آواز بلند کی تھی، چند روز بعد انھی کے خانوادے کے لوگ اسی طرف رجعت کر گئے۔ اس رجعت کے نتیجے میں ہمارے بیشتر مفکرین، مصلحین ملک و ملت کے اساسی و عظیم تر مقاصد پر نگاہ رکھنے کے بجائے فروعی مسائل اور فقہی موشگافیوں میں اُلجھ کر رہ گئے۔ لیکن پہلے ملتِ اسلامیہ میں شیعہ و سُنّی کے نام سے صرف دو فرقے تھے۔ وہ بھی برائے نام، لیکن انیسویں صدی میں مذہب کے فروعی اختلافات نے تنگ دلی و تقلیدِ محض کے ہاتھوں ایسا زور پکڑا کہ مقلد، غیر مقلد، وہابی، نیچری، دیوبندی، بریلوی، اہلِ حدیث اور اہلِ قرآن کے نام سے درجنوں حلقے پیدا ہو گئے۔ پھر ان طبقوں کی تقسیم در تقسیم ہوئی اور آج اس قسم کے حلقے، اپنے متشددانہ اور جارحانہ مزاج کے ساتھ جتنی بڑی تعداد میں موجود ہیں، وہ بہتّر سے بھی کئی گنا زیادہ ہیں۔ پھر ان کا تشدد بھی اس نوع کا ہے کہ یگانہ کا شعر اکثر یاد آتا ہے:

سب ترے سوا کافر، آخر اس کا مطلب کیا؟
سر پھرا دے انسان کا، ایسا خبطِ مذہب کیا؟

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد برعظیم کے مسلمانوں پر قیامت کا عالم گزر گیا۔ اس قیامت کے بعد غاصبوں کی طرف سے اصلاحِ قانون و عدالت کے نام سے مسلم ثقافت و تہذیب اور مذہب و عقائد پر جو تباہیاں لائی گئیں، ان کی طرف سنجیدگی سے توجہ کرنے اور ہوش مندانہ جائزہ لینے والا کوئی نہ تھا۔ سرسید احمد خاں کے سوا نہ تو کسی نے ۱۸۵۷ء کی سیاسی تبدیلی اور اس کے دور رس نتائج پر غور کیا، یا جنگ آزادی یا بغاوتِ ہند کے سلسلے میں کوئی قرطاس ابیض تیار کیا گیا، نہ لارڈ میور کی "لائف آف محمدؐ" جیسی دل آزاد کتاب کا مدلل رد لکھنے کی کسی میں ہمت ہوئی، نہ ڈبلیو ڈبلو ہنٹر کی مسلم کش کتاب "اور انڈین مسلمان" کا کسی نے نوٹس لیا، نہ مغرب و مشرق کی قیامت خیز آویزش کو سمجھنے کی کوشش کی گئی اور نہ تباہ شدہ مسلمانوں کی از سرِ نو سیاسی و سماجی اور تہذیبی و تعلیمی شیرازہ بندی کی طرف کوئی توجہ دی گئی۔

اس کے برعکس جن لوگوں نے اس طرف توجہ کی، انھیں طرح طرح سے مطعون کیا گیا۔ کفر و الحاد کے فتوے صادر کئے گئے۔ مغربی تعلیم کا حصول حرام قرار پایا۔ سرسید احمد خاں سے مصافحہ کے بعد صابون سے تین دفعہ ہاتھ دھونا یوں ضروری ٹھہرا کہ وہ کرسٹان سے ہاتھ ملاتے تھے۔ غرضیکہ ہمارے بیشتر مشرقی علما و مصلحین، اہم سیاسی و سماجی مسائل سے قطع نظر کرکے لاحاصل مذہبی بحثوں میں الجھے رہے۔ ان کی بحث کے خاص خاص موضوعات یہ تھے۔

(۱) ہندوستان دارالحرب ہے یا نہیں۔
(۲) قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق۔
(۳) حضور اکرمؐ کا مثیل و نظیر پیدا ہو سکتا ہے یا نہیں۔
(۴) عیدین کی نماز عیدگاہوں کے علاوہ عام مسجدوں میں بھی ادا کی جا سکتی ہے یا نہیں۔
(۵) انسان مجبورِ محض ہے یا ارادہ و اختیار کا مالک بھی ہے۔
(۶) خدا قائم بالذات ہے یا صفات بھی رکھتا ہے۔
(۷) مذہب اپنی تفہیم کے لئے عقل و فکر کی اجازت دیتا ہے یا بغیر سوچے سمجھے قبول کر لینے پر مجبور کرتا ہے۔

ہرچند کہ یہ مسائل نئے نہ تھے۔ مسلمانوں کا باشعور و روشن خیال طبقہ بہت پہلے ان پر اپنے فیصلے سنا چکا تھا اور برعظیم کے روشن خیال سماجی مصلحین و مفکرین، ان فیصلوں کو اپنائے ہوئے تھے۔

اردو زبان و ادب کے حوالے سے ان فیصلوں کو جن کی اساس تدبر و تفکر پر رکھی گئی تھی، سب سے پہلے پوری جرأت کے ساتھ عملاً سرسید احمد خاں نے اپنایا۔ قرآن میں ایک جگہ نہیں متعدد جگہ مذہب کے باب میں عقل و فکر سے کام لینے کا حکم دیا گیا ہے۔ سورۂ انعام میں یہاں تک کہا گیا ہے کہ:

> "وحی ہمیشہ انھی لوگوں پر نازل کی جاتی ہے جن کے ذہن، علم و فکر سے منور ہوتے ہیں اور جو ہر مسئلے میں شعور و تدبر سے کام لیتے ہیں۔"

سورۂ الاعراف میں حکم دیا گیا ہے کہ:

> "جو لوگ مسائلِ حیات میں عقل اور مشاہدے سے کام نہیں لیتے وہ جانوروں سے بدتر ہیں۔"

اس طرح کی متعدد آیات ہیں جن کی روشنی میں باشعور مسلمان مفکرین نے مذہب کے باب میں عقل و تدبر سے کام لینے کو ضروری خیال کیا۔ اس طرزِ فکر نے اسلام اور اس کی اقدار کو دنیا میں از سرِ نو استوار کرنے میں جو اہم کردار ادا کیا ہے، وہ کسی سے پوشیدہ

نہیں ہے، لیکن کم علمی و تنگ نظری کے شکار مولویوں نے ہمیشہ، اس طرزِ فکر کی مخالفت کی اور تقلید و روایت پرستی ہی کو ذریعہ نجات سمجھا۔ نتیجتہً سرسید احمد خاں کے طرزِ فکر کی داد ان کے عہد کے چند بڑے ادیبوں، مثلاً محسن الملک، مولوی چراغ علی، مولانا حالی، ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا شبلی کے سوا کوئی اور نہ دے سکا۔ مذہبی علما و مصلحین کا بڑا گروہ ان کے خلاف فتوے صادر کرنے ہی میں لگا رہا اور اب تک یہ سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں باقی ہے۔

زندگی میں لوگ کسی کو بُرا بھی سمجھتے ہیں تو مرنے کے بعد معاف کر دیتے ہیں لیکن سرسید احمد خاں کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ اکبر الہ آبادی نے، جنھیں خود بھی سرسید احمد خاں سے بعض مسائل میں اختلاف تھا، سرسید کے خلاف مولویوں کی جارحانہ ذہنیت کے بارے میں کیا خوب کہا:

مر کے چلے جو سوئے جنت سید لٹھ لے کے امام ابو حنیفہؒ دوڑے

مولوی صاحب نہ چھوڑیں گے خدا گو چھوڑ دے گھیر ہی لیں گے پولس والے سزا ہو یا نہ ہو

سرسید کی طرح، ان کی فکر سے متاثر ہونے والوں کو بھی تنگ نظر مولویوں نے لعن طعن کا نشانہ بنایا۔ مولانا شبلی کی تصانیف "کلام اور علم کلام"، علامہ اقبال کی نظم "شکوہ" اور مولانا نیاز فتح پوری کی تصنیف "من و یزداں" کی اشاعت پر کفر کے فتوے جاری کئے گئے۔ انھیں کافر و ملحد بتایا گیا لیکن ان سارے اقدامات کے حاصل پر غور کیجیے تو اندازہ ہو گا کہ تیرگی کے پرستار، عمر بھر گھاٹے کا سودا کرتے رہے۔

روشن خیالی کا جو چراغ، شاہ ولی اللہؒ نے روشن کیا تھا اس کی روشنی ہزار رکاوٹوں کے باوجود، سرسید کی جرأت مندانہ اقدام سے بہر حال تیز تر ہو گئی، پھر اس کی لَو سے مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا محمد علی جوہر، مولانا نیاز فتح پوری اور علامہ اقبال کے ہاتھوں کئی لَویں پیدا ہو گئیں اور آج خدا کا شکر ہے کہ اردو شعر و ادب کا ایوان بحیثیت مجموعی روشن خیالی سے خاصا منور ہے۔

آج کی روشن خیالی میں سب سے گراں قدر حصہ علامہ اقبال کا ہے۔ انھوں نے فلسفۂ خودی کی تعمیر کے سلسلے میں کئی اجزا کا نام لیا ہے لیکن خودی کے اغراض و مقاصد کے حصول کا مدار انھوں نے عمل اور صرف عمل پر رکھا ہے۔ ایک جگہ نہیں جگہ جگہ تعمیر خودی کی اولین شرط عمل کو قرار دیا ہے۔ متعدد جگہ واضح الفاظ میں اظہار کیا ہے کہ میں ہر شخص کو زبردستی مسلمان نہیں بنانا چاہتا بلکہ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ آدمی اپنے اعمال سے اپنے عقائد کا ثبوت فراہم کرے:

من نہ گویم از بتاں بیزار شو کافری، شائستۂ زنار شو

ایک جگہ یہاں تک کہہ دیا ہے کہ بیدار و باعمل کافر، بے عمل اور اونگھتے ہوئے مسلمان سے بہتر ہے:

کافرِ بیدار دل پیشِ صنم بہ ز دیندارے کہ خفت اندر حرم

یہی وہ خیالات ہیں جن کا اظہار علامہ نیاز فتح پوری نے اردو نثر میں قرآن و حدیث کے حوالے سے حد درجہ مدلل اور موثر انداز میں کیا۔ بقول مجنوں گورکھپوری: "نیاز کی فکر انگیز علم سے آراستہ نثر اور اس کے دلکش اسلوب نے اردو زبان و ادب کو ایسی توانائی و تازگی اور روشنی بخشی کہ نئی نسل کے باشعور طبقے کو آگے بڑھنے میں دیر نہ لگی۔" اس روشنی میں آگے قدم بڑھانے والوں میں اور ادب کے رشتے سے، اس روشنی کو تیز تر کرنے والوں میں اولین نام، پروفیسر مجنوں گورکھپوری اور ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے ہیں۔

انھوں نے ادب کو زندگی کے جدلیاتی عناصر کے حوالے سے پرکھنے کی بناء ڈالی، اور اردو تنقید کو ایک جاندار سائنٹفک نہج عطا کر دی۔

مجنوں اور اختر حسین رائے پوری کی ادبی زندگی کے ابتدائی دور ہی میں "انگارے" نام کی کتاب سامنے آئی اور کچھ اس انداز سے آئی کہ اردو ادب کے ایوانِ فکر میں روشن خیالی کو ایک مستحکم قدر کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اردو نثر خصوصاً تنقید لفظی بحثوں سے آگے بڑھ کر مذہب، اسلام، تاریخ، تمدن، سیاسیات، سماجیات، اور تہذیب و ثقافت پر بہت کچھ لکھا گیا۔ اس خاص مرحلے میں سید سبطِ حسن کا قلم سب سے ممتاز اور بے باک ثابت ہوا۔ ان موضوعات و عنوانات پر جس بے باکی، روشن خیالی اور حریتِ قلم و وسعتِ مطالعہ کے ساتھ سید سبطِ حسن نے لکھا ہے کسی اور نے نہیں لکھا۔ انھوں نے دوسرے ادیبوں کی طرح محض مبہم خیالات نہیں، بلکہ ہر موضوع پر پوری پوری کتابیں دی ہیں۔ انھوں نے اپنی تصانیف کے ذریعے اردو نثر میں روشن خیالی اور آزادیٔ فکر کے اس علم کو بلند کیے رکھا جس کی بنیاد سر سید احمد خاں نے ڈالی تھی اور جس کی ترویج و اشاعت میں علامہ شبلی، علامہ اقبال، مولانا حسرت موہانی، علامہ نیاز فتح پوری، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور مجنوں گورکھپوری نے اپنے اپنے انداز سے زورِ قلم صرف کیا تھا۔

بینک سُود کا مغالطہ

محمد ارشاد

موجودہ صدی مسلمانوں کی تاریخ کی عجیب و غریب صدی ثابت ہو رہی ہے۔ اس سے پہلے کی تمام صدیوں میں اسلام کو بطور دین جانا اور مانا جاتا تھا۔ موجودہ صدی میں اسے ازم سمجھا جاتا ہے۔ پڑھے لکھے مسلمانوں کا خیال ہے کہ اسلام بھی کیپیٹل ازم، سوشلزم، کمیونزم طرح کی کوئی چیز ہے۔ وہ دیگر ازموں کے ساتھ اس ازم کا تقابلی مطالعہ کرتے ہیں اور پھر ہمیں یہ بتا کر خوش ہوتے ہیں کہ اسلامزم دیگر ازموں سے بہتر اور فائق ازم ہے۔

اسلامزم ان کے ان خود ساختہ سیاسی اور معاشیاتی نظریات پر مبنی ہے جن کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ یہ اسلام کی روح کے عین مطابق ہیں، جبکہ درحقیقت ان میں اسلام کی روح کی بجائے ان کی اپنی روح جھلک رہی ہوتی ہے۔ اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ان کے "اسلامی" سیاسی و معاشیاتی نظریات کو روبہ عمل لایا جائے تو مسلم دنیا میں "اسلامی انقلاب" برپا ہو جائے گا۔ گزشتہ کئی دہائیوں سے یہ لوگ "اسلامی انقلاب" لانے کی کوششوں میں مصروف اور سرگرداں ہیں۔ چنانچہ چند سال پہلے "اسلامی انقلاب" کی سمت پہلا "مثبت" قدم جو مالیاتی نظام کی اصلاح کی خاطر اٹھایا گیا تھا بلا سود بنکاری نظام کا تعارف تھا جس کی صلاح "اسلامی ماہرین معاشیات" کی طرف سے آئی تھی۔ بلا سود بنکاری سے مراد نفع ونقصان کی بنیاد پر ہر اس جائز کاروبار لوگوں کی شرکت تھی جس میں بنک لوگوں کا وہ روپیہ لگاتے ہیں جو بنکوں میں جمع ہوتا ہے۔ بلا سود بنکاری کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ "اسلامی ماہرین معاشیات" کے نزدیک بنکوں کا طریق کار غیر اسلامی رہا ہے کیونکہ بنک اپنے کھاتہ داروں کو ان کی جمع شدہ رقوم پر ایک معینہ مدت کے بعد ایک معین اضافی رقم دیتے ہیں اور یہ اضافی رقم سود ہے اور سود اسلام میں حرام ہے۔ چنانچہ مسلمان کھاتہ داروں کو حرام خوری سے بچانے کی خاطر بلا سود بنکاری کا نظام متعارف ہوا، لیکن بعض دوسرے "اسلامی ماہرین معاشیات" نے "بلا سود بنکاری" کو بلا سود بنکاری تسلیم نہیں کیا۔ ان کے خیال میں یہ سودی بنکاری ہی تھی، محض نام بدل دینے سے شے کی حقیقت نہیں بدل جاتی۔ بلا سود بنکاری کی صلاح دینے والے "اسلامی ماہرین معاشیات" نے اس کے جواب میں کبھی کچھ نہیں کہا۔ بہرحال "اسلامی ماہرین معاشیات" کے ہر دو گروہ اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ بنک سود وہی سود ہے جس کی شریعت نے ممانعت کی ہے۔

سود یقیناً حرام ہے اور اس کی حرمت بنص قطعی ثابت ہے۔ اسے کسی بھی دلیل سے جائز ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن موجودہ حالات میں بنک سود آیا واقعی سود ہے؟ "اسلامی ماہرین معاشیات" کے نزدیک یہ واقعی سود ہے اور شرعاً حرام ہے۔ کیونکہ یہ بالکل سامنے کی بات ہے کہ سو سے ایک سو گیارہ زیادہ ہوتے ہیں۔ پس ہر بنک جو اپنے کھاتہ دار کو ایک معینہ مدت کے بعد اس کی اصل رقم پر جتنی رقم بھی اضافی طور پر دیتا ہے، سود دیتا ہے اور لینے والا سود لیتا ہو جاتا ہے یہ اضافی رقم سو روپے پر گیارہ روپے ہو یا کم و بیش۔

پروفیسر گب نے اپنی کتاب "محمڈن ازم" میں ایک جگہ لکھا ہے کہ علامہ جمال الدین افغانی کے شاگرد مفتی محمد عبدہٗ، بنک سود کے

جواز کے قائل تھے۔ لیکن پروفیسر موصوف نے یہ بیان نہیں کیا کہ مفتی محمد عبدہٗ نے کن دلائل کی بنیاد پر یہ فتویٰ دیا تھا۔ قیاساً یہی کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ بنک جمع شدہ رقوم تجارتی کاموں میں لگاتے ہیں اور اس طرح نفع کماتے ہیں۔ اس طرح اگر اس نفع کا کچھ حصہ اپنے کھاتہ داروں کو جن کی رقوم سے کاروبار کیا جاتا ہے، دے دیتے ہیں، تو اس میں کوئی برائی نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ بنک سود کے جواز کے فتویٰ کی بنیاد یہی بات ہو، لیکن ہمارے علماء اس جواز کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے دلائل ان کتابوں میں دیکھے جاسکتے ہیں جو "سود" کے موضوع پر اردو میں لکھی جاچکی ہیں۔

ہمیں فریقین کے دلائل سے دلچسپی نہیں بلکہ اس موقعے پر اس بات سے دلچسپی ہے کہ آیا بنک اپنے کھاتہ داروں کو ان کی جمع شدہ رقوم پر واقعتاً اور حقیقتاً کوئی اضافی رقم دیتے بھی ہیں؟ یہ درست ہے کہ سَو سے ایک سو گیارہ زیادہ ہوتے ہیں ـــــ لیکن یہ کہ سَو روپے سے ایک سو گیارہ روپے زیادہ ہوتے ہیں، یہ مغالطہ ہے۔

آج کل کا مالیاتی اور معاشیاتی نظام بے حد پیچیدہ اور گنجلک ہے اور "اسلامی ماہرین معاشیات" کے عقل و فہم سے بالکل بالا ہے۔ موجودہ معاشیاتی اور مالیاتی نظام کی بنیاد کاغذ کے ان پرزوں پر ہے جن کی اپنی قیمت نہایت معمولی اور ان پر لکھی ہوئی قیمت نہایت غیر معمولی ہوتی ہے۔ سونے چاندی کے دینار و درہم کی طرح ان کی اصل قیمت اور ان پر لکھی ہوئی قیمت یکساں نہیں ہوتی۔ ایک تولہ سونے کے دینار سے اگر مہر مٹا بھی دی جائے تو بھی اس کی وہی قیمت رہتی ہے جبکہ کرنسی نوٹوں کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ پس کرنسی نوٹوں کی قدر (VALUE) یکساں نہیں رہتی، بدلتی رہتی ہے۔ ان کی قوتِ خرید میں کمی ہوتی رہتی ہے۔ آج سے بیس سال پہلے ایک امریکی ڈالر ہمارے پونے پانچ روپے کے برابر تھا۔ آج ایک امریکی ڈالر بائیس روپے سے زیادہ کا ہے۔ اسی زمانے میں پینتیس ڈالر ایک اونس سونے کے برابر تھے۔ آج ایک اونس سونا شاید سات آٹھ گنا زیادہ ڈالروں کے برابر ہے۔

معاملے کی مزید وضاحت ایک انتہائی آسان مثال سے کی جاسکتی ہے۔ فرض کیا آج سے بیس سال پہلے ایک شخص کے پاس تیس ہزار روپے تھے اور ان میں سے آدھے روپے یعنی پندرہ ہزار تو اس نے بنک میں رکھوا دیئے تھے اور آدھی رقم یعنی پندرہ ہزار کا سونا (پلاٹ یا دکان، مکان، زرعی زمین) خرید لیا تھا جو سو تولے تھا۔ آج بیس سال بعد وہ سونے کو دوبارہ روپوں میں تبدیل کرواتا ہے تو اُسے تقریباً چار لاکھ روپے ملتے ہیں اور بنک سے ساری رقم بھی نکلوا لیتا ہے تو اُسے ایک لاکھ روپے (بالفرض) ملتے ہیں۔ ہمارے "اسلامی ماہرین معاشیات" کی تحقیق اور فتویٰ کی رو سے ان ایک لاکھ روپوں میں پچاسی ہزار روپے سود ہیں اور حرام ہیں لیکن سونے کی روپوں میں تبدیلی کے نتیجے میں حاصل ہونے والے تین لاکھ پچاسی ہزار روپے جائز اور حلال ہیں۔ ان کی سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آئے گی کہ بنک اپنے اس کھاتہ دار کو پچاسی ہزار روپے زیادہ نہیں دے رہا بلکہ پورے تین لاکھ روپے کم دے رہا ہے۔ اب اگر وہ شخص "اسلامی ماہرین معاشیات" کے "اسلامی" مشورے پر عمل کرتے ہوئے اپنے "اصل" پندرہ ہزار روپے وصول کرتا ہے اور اُسے دوبارہ سونے میں تبدیل کرتا ہے تو اب اُسے سو تولے سونا ملنے کی بجائے پونے چار تولے سونا ملے گا۔ اور مکان خریدنے کی بجائے وہ صرف ایک دیوار ہی خرید سکتا ہے۔ اس طرح وہ غریب اُن پندرہ ہزار روپوں کی بجائے جو بیس سال پہلے اس نے جمع کروائے تھے، اُسی زمانے کے کل پانچ سو روپے وصول کر رہا ہے۔

یہ ہے "اسلامی نظامِ معیشت" کی بنیاد پر آنے والے اس "اسلامی انقلاب" کی ایک جھلک جس کی نوید ہمارے "مفکرینِ اسلام" اور "اسلامی ماہرینِ معاشیات" ہمیں آئے دن سناتے رہتے ہیں۔ کسی شاعر نے ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا ہے:

قرآن کی روح نہ سمجھے تم لفظوں کی غلامی کرتے رہے
اسلام تو دینِ مکمل ہے بس عقل تمہاری آدھی ہے

قرآن میں سود کی حرمت واضح الفاظ میں بیان ہوئی ہے اور سود لینا اور دینا دونوں یقینی طور پر حرام ہیں۔ اگر کوئی شخص ایک سو سیر گندم یا جو پر ایک چھٹانک کی بڑھوتری بھی وصول کرتا ہے تو حرام خوری کا مرتکب ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی سو تولے سونا یا چاندی پر ایک رتی بھی بطور اضافہ دیتا یا لیتا ہے تو سود دے رہا یا لے رہا ہے۔ اسی طرح کاغذی کرنسی کی قیمت اور قوت خرید اگر کسی ایک سال میں گھٹنے بڑھنے سے بالکل محفوظ رہتی ہے تو اس سال اس پر اضافی رقم سود شمار ہوگی، ورنہ نہیں۔ لیکن اس صورت میں ہر کھاتہ دار کا سال دوسرے کسی بھی کھاتہ دار کے سال سے مختلف ہو سکتا ہے۔ ایک کا جنوری کی کسی تاریخ سے دوسری جنوری کی اسی تاریخ تک اور دوسرے کا فروری کی کسی ایک تاریخ سے دوسری فروری کی اسی تاریخ تک وعلیٰ ہذا القیاس۔ لیکن موجودہ زمانے میں کسی بھی کرنسی کی قوت خرید کا گھٹنے بڑھنے سے محفوظ رہنا ممکن ہی نہیں ہے۔

ہمارے علما، فقہا، مفکرین و ماہرین اسلام اپنی ہر غلطی کو اجتہادی غلطی کہہ کر ٹال جاتے ہیں اور اظہار افسوس کرنے کی بجائے یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ درست اجتہاد پر تو دو ثواب ہیں ہی، غلط اجتہاد پر بھی ایک ثواب مل ہی جاتا ہے۔ لیکن انھیں ہمیشہ ایک ثواب ہی حاصل کرتے پایا گیا ہے۔ ان کا ایک ثواب اپنی جگہ، ان کے ایک ثواب سے امت نے جو جو نقصانات اٹھائے ہیں، اس کا حساب رکھنا انھوں نے کبھی پسند نہیں کیا۔ مزید براں ان کی اجتہادی غلطیوں سے خود اسلام کا حلیہ جس طرح مسخ ہوتا رہا ہے، انھیں اس کی بھی کبھی پروا نہیں رہی:

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہ و صوفی و ملا کی ناخوش اندیشی

لیکن موجودہ وقت میں فقیہ و صوفی و ملا سے زیادہ خطرناک ملاح وہ لوگ ہیں جنھیں اسلام اور جدید مغربی نظریات دونوں پر عبور کا دعویٰ ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے اسلام کو ازم بنا کر رکھ دیا ہے۔ مغربی نظریات سے انھیں کتنی واقفیت حاصل ہے اس کی وضاحت بنک "سود" کے بارے میں ان کے رویے سے بخوبی ہو جاتی ہے۔

تاریخِ ادب — مقاصد و محرّکات

ڈاکٹر سلیم اختر

تاریخ کیا ہے — ؟

مہ و سال کی ایام شماری؟ حوادث کی ریاضی؟ یا ان کے علاوہ بھی اور کچھ؟

اب تک ماضی کی جن شخصیات، ان کے کارناموں اور فکر و فن کی خوشبو امر ثابت ہوئی۔ جن حوادث نے چراغوں کی لو سرد کی، جن انقلابات کو گردوں مثال گردانا گیا اور جن تہذیبوں کا ڈوبے تاروں کی مانند ماتم کیا گیا۔ یہ سب وقت کی عظیم جست کے رزمیہ میں محض فٹ نوٹس ہیں۔ بنیادی طور پر وقت تخریب کار ہے اور سب سے بڑا غارت گر۔ تباہی پسندیدہ کھیل اور بربادی مرغوب مشغلہ، بچۂ ناداں کی طرح کھلونے بناتا، بگاڑتا اور توڑتا جاتا ہے۔ کمزور انسان جاہل اور خسارہ میں رہنے والا سہی مگر وہ تخریب پسند وقت کے جبر سے آزاد ہونے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہا، چنانچہ تولید سے لے کر تخلیق تک۔ وقت کے خلاف نبرد آزمائی میں انسان نے جو جو انداز اپنائے، ان کا تنوع تہذیب و تمدن کی اساس مہیا کرتا ہے۔

وقت کی شبِ تار میں "چراغ آفریدم" کا نعرہ بلند کر کے انسان اپنے وجود کا اثبات کرتا ہے — رنگ ہو یا سنگ و خشت نغمہ ہو یا حرف و صوت — ذرائع اظہار کے تنوع کی اساس گردشِ ماہ و سال سے ماورا ہو کر امر ہو جانے کے واحد جذبہ پر استوار ملتی ہے۔

تولید سے انسان "اپناپن" دوسرے وجود میں منتقل کرتا ہوا اسی طویل زنجیر میں ایک کڑی کی صورت اختیار کر جاتا ہے جو آج کے انسان کا بعید ترین ماضی کے انسان سے سلسلہ استوار کرتی ہے۔ یہ انسانی زنجیر جہاں جینز اور کروموسوز سے تشکیل پاتی ہے وہاں خوف، واہمے، آرزوئیں اور جبلتیں بھی اس کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ ادھر خواب اور علامات "آج" اور "کل" کے انسان میں نفسی رابطہ کا باعث بنتی ہیں یوں کہ بعض اوقات جذباتی اور احساساتی سطح پر دونوں کے دل ایک ہی تال پر دھڑکتے ہیں۔ اسی دھڑکن کا سراغ "آرکی ٹائپس" سے ملتا ہے۔

حرف اپنی اساسی صورت میں آلاتِ صوت کی متنوع حرکات اور ہوا کے تال میل سے جنم لیتا ہے۔ پھر مختلف حروف کے ساتھ مل کر الفاظ کا روپ اختیار کر کے زبان کی صورت میں ایسی منظم وحدت کی تشکیل کرتا ہے جو فرد اور افراد میں روابط کے انداز مہیا کر کے کبھی انہیں قریب لاتی ہے تو کبھی دوری کا باعث بنتی ہے۔ زبان ایسا دو دھاری آلہ ہے جس سے بیک وقت محبت اور نفرت کا کام لیا جاتا ہے کبھی یہ ذریعۂ اظہار ہے تو کبھی اندازِ اخفاء!

لفظ سماجی ضرورت تھا اس لئے اس نے ایک دن ایجاد ہونا ہی تھا جس دن لفظ کی صورت میں انسان کو اسمِ اعظم مل گیا اسی دن سے تہذیب و تمدن کو محفوظ کرنے کے عمل کا آغاز بھی ہو گیا اور یوں تاریخ عالمِ وجود

میں آگئی۔

"تاریخ" پہلے اساطیر، قصص، روایات اور ضرب الامثال کی صورت میں ملتی تھی۔ یوں کہ حقیقت اور افسانہ شام ہوتے کی مانند گھلے مل کر جن پرچھائیوں کی تخلیق کرتے وہ زیادہ قدآور، زیادہ خوش منظر اور زیادہ دہشت ناک نظر آتیں۔ اسی لئے یہ انسانی تخیل کے لئے سامانِ تہیج مہیا کرتی رہتیں۔

لفظ سے لفظ پیوست ہوا تو مالا کی مانند فقرہ ظہور پذیر ہوا اور گلدستہ جیسی تخلیق! سادہ بیانی کی صورت میں لفظ نے حقیقت بیانی سے کوائف مہیا کئے تو پیچیدگی سے تخلیق کا ترفع پایا۔ لفظ کے یہ دونوں روپ قابلِ قدر ہیں کہ ایک کے بغیر انسان بہرہ ہوتا تو دوسرے کے بغیر نابینا۔

یادگار کارناموں کو الفاظ میں مقید کر کے انسان مطمئن ہوگیا تو تخلیق کو لفظ کی مہک دے کر امر ہوگیا۔

تاریخ ادب لفظ اور تخلیق کی اس مہک کی طرف توجہ دلانے کے فن کا نام ہے۔ اسی لئے لفظ "تاریخ" کے اشتراک کے باوجود کسی ملک کی تاریخ اور اس کے ادب کی تاریخ میں خاصہ فرق ہوتا ہے۔ ملک کی تاریخ بنیادی طور پر سیاسی نظام میں تغیرات اور ان کے محرکات کا ریکارڈ ہے۔ پہلے کیونکہ ملک میں سیاسی اقتدار کی اعلیٰ ترین صورت کا مظہر بادشاہ ہوتا تھا اس لئے قدیم تواریخ بادشاہوں کے احوال اور ان کی فتوحات، ہزیمتوں، ان کے خلاف بغاوتوں اور سازشوں کے کوائف پر مشتمل ہوتی تھیں۔ جدید دور میں بادشاہ متروک قرار پائے تو اب تاریخ صدر، وزیراعظم اور آمر کے تذکرہ سے مرتب ہوتی ہے۔ اگرچہ تاریخ کا یہ تصور خاصہ محدود ہے کیونکہ ملک کی تہذیب و تمدن، مذہب، فنونِ لطیفہ، ذرائع پیداوار اور معاشرہ کی تشکیل کرنے والے سیاسی، سماجی، تمدنی اور متنوع نوعیت کے دیگر اثرات کے عمل اور ردعمل سے جنم لینے والی عصری تصویر کی "دید" کے بغیر تاریخ محض یک طرفہ اور یک رُخ ثابت ہوتی ہے۔ اس لئے ایک اچھی تاریخ میں بطورِ خاص ان امور کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے لیکن اس کے باوجود بالعموم تاریخ بادشاہوں کے احوال کے مترادف ہی نظر آتی ہے۔

ادب کی تاریخ کا معاملہ عام تاریخ کے مقابلہ میں خاصہ نازک اور پیچیدہ ہے۔ اس لئے کہ یہ تاریخ کے مروج تصور کے مطابق محض ایام شماری نہیں اور نہ ہی معلومات و کوائف مرتب کرنا ہے اگرچہ تاریخ میں یہ سب کچھ بھی شامل ہے لیکن بنیادی طور پر یہ تخلیق اور تخلیق کاروں کا مطالعہ ہے۔ اگر ایک طرف تاریخ ادب سے تخلیق کی معیار بندی ہوتی ہے تو دوسری طرف تخلیق کاروں کی انسانی اور تخلیقی شخصیت کا مطالعہ بھی کیا جاتا ہے۔ ادبی مورخ کا کام یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا کیونکہ ان کے ساتھ ساتھ اسے ان تمام سیاسی، سماجی، تہذیبی، تمدنی اور روحانی عوامل کا تجزیاتی مطالعہ بھی کرنا ہوتا ہے جو کسی عہد کو مخصوص رنگ دے کر خصوصی تقاضوں پر مبنی خاص نوع کی فضائے تخلیق معرضِ وجود میں لاتے ہیں جو عوام کو بالعموم اور تخلیق کاروں کو بالخصوص خاص طرح کے نفسی سانچے میں ڈھال کر کبھی تو اس عہد کی فضائے تخلیق سے ہم آہنگ کرتی ہے تو کبھی متصادم۔ یہی وجہ ہے کہ ایک عہد کے مخصوص ذہنی رجحانات اور تخلیقی میلانات سے ہم آہنگ اکثریت کے ساتھ ساتھ محدود اقلیت میں معیارشکن، انحراف پسند اور باغی بھی ملتے ہیں۔ ادبی مورخ کے لئے یہ سب امور اور ان کے باہمی عمل و ردعمل کو ملحوظ رکھنا لازم ہے کہ ان سب کے تال میل سے صورت پذیر ہونے والے ذہنی، فکری اور تخلیقی تناظر سے مرتب نظر کر کے تخلیق اور تخلیق کار کا درست مطالعہ اگر ناممکن نہیں تو دشوار یقیناً ہے۔

ادبی مورخ جب ذہنی رجحانات، تخلیقی میلانات اور فنی روایات کی بات کرتا ہے تو عام مورخ کے مقابلہ میں اس کا کام اسی بنا پر زیادہ مشکل ثابت ہوتا ہے کہ یہ سب گریزپا سے ہیں جبکہ عام مورخ کا مواد زیادہ ٹھوس ہوتا ہے۔ اس امر کو یوں سمجھیئے کہ اپنے کسی معاصر تخلیقی فن کار کو اس کی تمام تر نفسی پیچیدگیوں اور کرداری تضادات سمیت سمجھنا آسان نہیں لیکن جب ادیب اور ادبی مورخ میں خاصہ زمانی بُعد اور وسیلۂ تفہیم صرف تخلیق ہی ہو تو پھر ادبی مورخ کی مشکلات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ لمبی چوڑی تفصیلات میں جائے بغیر صرف اس مثال سے یہ نکتہ سمجھا جا سکتا ہے کہ بادشاہ کے خلاف اور کسی تخلیقی روایت کے خلاف بغاوت سے وابستہ عوامل و مقاصد کی تفہیم، تجزیہ اور تصریح میں خاصہ فرق ہے۔

تاریخ ادب کیا ہے؟ ادبی مورخ کا کردار کیا ہوتا ہے؟ سوال آسان مگر جواب مشکل!

تاریخِ ادب کی تعریف ان الفاظ میں کی جا سکتی ہے:

کسی زبان کی جغرافیائی حدود سے مخصوص لسانی، روحانی، تہذیبی، تمدنی، سماجی، سیاسی اور اقتصادی عوامل و محرکات کے عمل اور ردِ عمل سے تشکیل پانے والے ذہنی تناظر میں وقوع پذیر ہونے والی تخلیقات کی معیار بندی، لسانی مضمرات اور تخلیقی شخصیات کا مطالعہ تاریخ نگاری اور ان ہی کا مطالعہ، تجزیہ و تحلیل اور تشریح ادبی مورخ کا بنیادی فریضہ!

ادب خلا میں جنم نہیں لیتا اور نہ ہی ادیب ہوا بند ڈبوں میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کا عصری تقاضوں سے مثبت یا منفی اثرات قبول کرنا لازم ہے کہ یہ اثرات سانس کی مانند اس کے تخلیقی وجود کے لئے ضروری ہیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس کے عہد میں ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی کے مباحث تھے یا نہیں، یا یہ کہ وہ شعوری طور پر کس تصورِ ادب کا حامل رہا اس لئے کہ ادب برائے زندگی کے تصور کو مسترد کرنا بھی تو کسی تصور ہی کا مرہون منت ہوتا ہے۔

مخصوص عصر سے وابستہ عوامل و محرکات کسی صنم کدہ میں ایستادہ بتوں کی مانند ٹھوس صورت میں نہیں ملتے کہ کوئی پجاری بنا تو کوئی بت شکن! عموماً رجحانات اور تخلیقی میلانات غیر مرئی روپ میں ملتے ہیں اور فکری رویوں اور کرداری سانچوں میں ان کے سراغ تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ اس کا اگر واحد نہیں تو کم از کم اہم ترین ذریعہ تخلیق ہوتی ہے۔ تخلیق کس اسلوب میں ظہور پذیر ہوئی یا ہیئت کے کس سانچہ میں ڈھلی اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا بلکہ ان کے اعلیٰ اور معیاری یا برعکس ہونے سے بھی کچھ فرق نہیں پڑتا کہ ہر نوع کی تخلیقات اپنے گیسٹالٹ کی صورت میں اپنے عصر اور پھر اس کے حوالہ سے معاشرہ کے نقوش اجاگر کرتی ہیں۔ تخلیق اپنے انفرادی وجود سے بڑھ کر بحیثیت مجموعی عصر کے لئے اشاریہ بھی بن جاتی ہے۔ اسے لکھنؤ کی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے اگر محض لکھنوی غزل کو ملحوظ رکھ کر لکھنوی معاشرہ کے خدوخال اجاگر کرنا چاہئیں تو شاید یوں مرتب ہونے والی تصویر شوخ ہونے کے باوجود مجمل سی ہوگی لیکن جب اسی کے ساتھ مرثیہ، مثنوی اور ریختی کو بھی شامل کر لیں تو پھر لکھنوی معاشرہ اپنی تمام چکاچوند اور داخلی تضادات سمیت نمایاں تر ہو جاتا ہے۔ ریختی کا ذکر ہوا تو یہ امر بذاتِ خود معنی خیز ہے کہ ریختی صرف لکھنؤ ہی میں پروان چڑھی ـــــ دہلی، علی گڑھ، حیدرآباد یا لاہور میں نہیں ـــــ یہ شہر بھی طوائفوں سے ناآشنا نہ تھے لیکن لکھنؤ میں جس طرح طوائف کو مرکزِ ثقافت قرار دیا گیا وہ صرف اسی تمدن سے مخصوص ہے اسی لئے ریختی کے لئے صرف لکھنؤ ہی کی مٹی زرخیز ثابت ہو سکتی تھی۔

۱۸۵۷ء کے بعد سر سید احمد خاں کی تحریک ان کے رفقاء کی تحریروں اور ان کے خلاف اکبر الٰہ آبادی اور

"اودھ پنچ" کے ردعمل کے تجزیاتی مطالعہ سے بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ کسی عصر سے وابستہ مخصوص تقاضوں کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا مطالعہ ہی اسی تناظر کی تشکیل کرتا ہے جس میں تخلیق اپنے زمانہ کا آئینہ قرار پاتی ہے تو تخلیق کار آئینہ ساز!

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند ادب کی تحریک کا آغاز اتفاقیہ (یا شوقیہ) نہ تھا، بلکہ ۱۹۱۰ء ـ ۱۹۲۰ء کی رومانیت، غلام ہندوستان کی اقتصادی لوٹ کھسوٹ، عوام کی زبوں حالی کے نتیجہ میں ناداری اور بے کاری کی تلخیاں، ملائیت کا غلبہ اور ان کا پیدا کردہ ذہنی اور اعصابی تناؤ ـــــ یہ سب عوامل ردّعمل کے جس نقطۂ عروج کی طرف ذہنوں کو لئے جا رہے تھے ترقی پسند ادب کی تحریک ان سب کا منطقی نتیجہ تھی۔ اگر حالات یوں سازگار نہ ہوتے تو لندن کا یہ منصوبہ ملک گیر سطح پر ادیبوں کو متاثر نہ کرتا۔ باقی رہا ۱۹۳۶ء ـــ تو یہ سنہ اضافی ہے ایک دہائی آگے پیچھے بھی ہو سکتی تھی البتہ ملکی صورتِ حال کی مخصوص نوعیت کا ہونا لازمی شرط ہے۔"

یہ تین مثالیں بہت نمایاں ہیں لیکن اسی انداز کی مثالیں کمیاب نہیں کہ تاریخِ ادب ایسی مثالوں سے ہی عبارت ہے۔ کسی بھی اہم ادبی رجحان کی تشکیل، تخلیقی تجربہ اور بغاوت کے پس منظر میں عوامل و محرکات کا سلسلہ دراز ملتا ہے۔ لہٰذا تخلیق کے ساتھ ساتھ تخلیقی محرکات کا مطالعہ بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ بظاہر جداگانہ یا منفرد ہونے کے باوجود بھی ان میں اٹوٹ رشتہ ہوتا ہے، بادل اور بارش جیسا ـــــ بادل کا ذکر آیا تو یہ واضح کرنے کی ضرورت نہ ہونی چاہیئے کہ کتنے ارضی، آبی اور فضائی عوامل کے نتیجہ میں بادل جنم لیتا اور بارش کا تحفہ دیتا ہے۔ جس طرح بارش کا قطرہ اپنی تمام انفرادیت کے باوجود بادل کو جنم دینے والے تمام جغرافیائی عوامل کا امین ہوتا ہے، اسی طرح تخلیق منفرد وجود کی حامل ہونے کے باوجود بھی کسی زبان کی جغرافیائی حدود سے مخصوص لسانی، روحانی، تہذیبی، تمدنی، سماجی، سیاسی اور اقتصادی عوامل کے عمل اور ردعمل سے تشکیل پانے والے "ذہنی تناظر" کی مظہر ہوتی ہے۔

اب تک صرف تخلیق کا تذکرہ ہوا تخلیق کار کا نہیں، حالانکہ نفسیاتی لحاظ سے تخلیق ـــــ تخلیق کار کی شخصیت کی توسیع کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔ شخصیت جتنی بڑی گہری اور اعلیٰ ترین تخلیقی صلاحیتوں کی حامل ہوگی، تخلیق بھی اتنی ہی اعلیٰ گہری اور عظیم ثابت ہوگی اور لان جائی نس کے "ترفع" کی حامل بھی۔ ادب کے سماجی یا عمرانی مطالعہ میں یہ اساسی الجھن جنم لیتی ہے کہ عصری عوامل و محرکات اور ان سے جنم لینے والے ذہنی تناظر میں یکسانیت کے باوجود اور ایک ہی عہد کے سیاسی، سماجی، روحانی اور اقتصادی حالات میں اشتراک کے باوجود تمام ادیب یکساں ذہنی سطح، مشترک سوچ اور باہم مشابہ تخلیقات کے حامل نہیں ہوتے۔ جزوی طور پر تو ایسا ہی ہوتا ہے اور بادی النظر میں یہی محسوس ہوتا ہے کہ ایک خاص عہد کی تخلیقات کے تنوع کی اساس اسی "یکسانیت"، "تکرار"، "اشتراک" اور "مشابہت" پر استوار ہوتی ہے جو کسی عہد کو دیگر زمانوں سے ممتاز اور منفرد بناتی ہے۔ جبھی تو ایک ہی عہد میں سانس لینے والے تمام تخلیق کار ہمیشہ زندہ نہیں رہتے۔ صرف دو طرح کے تخلیق کار زندہ رہ سکتے ہیں ایک تو وہ جو محض ادیب یا قلم کار کی عام سطح سے بلند ہو کر صحیح معنوں میں تخلیق کار ثابت ہوئے اور دوسرے وہ جنہوں نے عصری تقاضوں سے بغاوت کی، روایت پر تجربہ کو ترجیح دی اور مسلمات سے انحراف کیا: اول الذکر عمومی تقاضوں کی ہم نوائی میں مائل تخلیق ہو کر عمر بھر متعین راہ پر گامزن رہتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس زیادہ اعلیٰ، گہری تخلیقی شخصیت اور ارفع تخلیقی صلاحیتوں کی بنا پر ایک ادیب معاصرین کے مقابلہ میں نمایاں تر ہونے کے ساتھ ساتھ شہرت اور مقبولیت کے لحاظ سے طبعی عمر بھی پاتا ہے اور بعض اوقات ایک

شہر، ایک دبستان، ایک تحریک یا ایک عہد کے لاتعداد ادیبوں سے منفرد اور ممتاز بھی قرار پاتا ہے۔ اسماء گنوانے کی ضرورت نہیں کہ ادب کا معمولی سا طالب علم بھی یہ جانتا ہے کہ اردو ادب کی تاریخ میں زندہ تخلیق کاروں کی تعداد کتنی ہے؟

یکساں حالات میں ہم عصر ہونے کے باوجود مختلف تخلیق کاروں میں جو ذاتی ایچ، انفرادیت اور منفرد فکری رویے ملتے ہیں یہ ان کی نفسی ساخت کی بنا پر ہے۔ میرؔ، سوداؔ اور دردؔ ایک ہی شہر میں رہائش پذیر تھے مگر وسیلہ اظہار میں یکسانیت (غزل) کے باوجود تینوں کی شاعری کے انفرادی رنگ کی تشکیل انفرادی نفسیات کی بنا پر ہے۔ میر تقی میرؔ نے جن حالات میں زندگی بسر کی۔ جنون کے جو ذہنی ہفت خواں طے کیئے اور اس کے باعث جس ابنارملٹی (جیسے خود میرؔ نے "بے دماغی" اور "کم دماغی" سے تعبیر کیا تھا) نے جنم لیا۔ ان کے نتیجہ میں ٹیکٹس جیسی شخصیت ہی معرض وجود میں آسکتی تھی، سوداؔ جیسی جارح اور دردؔ جیسی مرنجاں مرنج شخصیت نہیں! اسی انداز پر غالبؔ، مومنؔ اور ذوقؔ یا حالیؔ شبلیؔ اور آزادؔ جیسے معاصرین بلکہ ہر عہد کے معاصرین کا مطالعہ کر کے ان کی شخصیت کی نفسی اساس کی روشنی میں اس امر کا تعین کیا جاسکتا ہے کہ یکساں حالات کے باوجود یہ کیوں ایک دوسرے سے منفرد یا برعکس نظر آتے ہیں۔ اپنے عہد میں فیضؔ اور ندیمؔ کے مقابلہ میں وزیر آغا کی کوتاہ قامتی کو بھی اسی انداز پر سمجھا جاسکتا ہے۔

دراصل خارجی حالات اور داخلی کوائف کے تال میل سے ہی تخلیقی شخصیت رنگ انفرادیت اپنا کر معاصرین میں نمایاں تر نظر آتی ہے اور ادبی مورخ کا کام ان سب عوامل کے تناظر ہی میں تخلیق اور تخلیق کار کا مطالعہ کرنا ہے، یوں کہ دونوں محدب شیشہ تلے نظر آئیں۔ بحیثیت مجموعی اردو ادب کی تاریخوں میں بنیادی نقص ہی یہی ہے کہ ان میں صرف تخلیق سے دلچسپی ظاہر کی جاتی ہے، تخلیق کار سے نہیں! حالانکہ تخلیق سے تخلیق کار کو جدا کرنا گوشت سے ناخن جدا کرنے کے مترادف ہے۔ "آب حیات" کی تحقیقی اغلاط سامنے کی سہی لیکن اس کی مقبولیت میں جواب تک کمی نہیں آسکی تو خوش رنگ اسلوب کے ساتھ تخلیق کاروں کا ڈرامہ بھی اس کا باعث ہے۔ چنانچہ دہلی اور لکھنؤ کے شاعر چلتے پھرتے، ہنستے بولتے شعر پڑھتے حتیٰ کہ لڑتے جھگڑتے بھی نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ محققین نے جن واقعات کو ساقط الاعتبار قرار دیا ڈرامائیت کی بنا پر وہی عوام پسند ٹھہرے۔

اس سے یہ خطرناک سوال پیدا ہوتا ہے کہ تخلیق کار کی زندگی کے کن واقعات کا بیان ہو، شخصی کوائف، نجی معلومات اور بایو ڈیٹا تو خیر لازم ہوتا ہی ہے۔ کیا شخصیت کے کمزور، ناقص اور خام پہلو بھی اجاگر کیے جائیں؛ یعنی مولانا حالیؔ کے الفاظ میں اس کے پھوڑوں کو ٹھیس پہنچائی جائے، کیا قطرہ سے گوہر بننے تک کے تمام مراحل کا بیان ہو اور عہد سے لحد تک تمام کوائف مہیا کئے جائیں یا نمایاں امور زیست اُجاگر کئے جائیں۔

اس ضمن میں کوئی خاص فارمولا تو تجویز نہیں کیا جاسکتا ادھر احوال و کوائف کے بیان میں خود تاریخ ادب کی ضخامت کا بھی خاصہ دخل ہوگا چنانچہ مفصل، مختصر یا مختصر ترین تاریخ ادب کے پیمانہ کی مناسبت سے ہی سوانحی مواد میں ردّ و قبول ہوگا۔ میں ذاتی طور پر اس کا قائل ہوں کہ تخلیق کار کی زندگی کے ان واقعات اور حوادث کو نمایاں کرنا لازم ہے جن کا اس کے تخلیقی رویہ یا بعض مخصوص تخلیقات سے بالواسطہ یا بلاواسطہ قسم کا تعلق بنتا ہے۔ بالفاظ دیگر نفسیاتی اہمیت کے وہ وقوعات ضرور نمایاں کئے جائیں جنہوں نے اس کے تخلیقی لاشعور کو مثبت یا منفی لحاظ سے متاثر کیا۔

اس ضمن میں میر تقی میرؔ کی مثال خصوصی توجہ چاہتی ہے، والد کی وفات، نامساعد حالات، ناکام عشق، جنون اور

پھر اس کے نتیجہ میں "کم دماغی" — یہ سب امور اس کی تخلیقی شخصیت کو ایک خاص سانچہ میں ڈھالنے کا باعث بنتے ہیں لہٰذا ان سے صرفِ نظر کر کے میر کی غزل اور بعض مثنویوں کو صحیح طور پر نہیں سمجھا جا سکتا — اسی طرح ولی، سودا، درد، مصحفی، آتش، انشا، غالب، مومن، داغ، الغرض سبھی اہم تخلیق کاروں کے بارے میں نفسیاتی اہمیت کے نجی مواد کی فراہمی کی ضرورت ہوگی اگر یہ نہ ہوگا تو اسلوب و عروض کے حوالے سے ان کی شاعری کا سطحی مطالعہ ہوگا۔ غالب، مومن، داغ، شیفتہ کے معاشقوں کے بارے میں معلومات ملتی ہیں لہٰذا ان کی روشنی میں کلام کا زیادہ بہتر اور گہرا مطالعہ ممکن ہے جس کے نتیجہ میں کلام میں لاشعور کی کارفرمائی سے "زائد معانی" کی زیریں سطح بھی دریافت کی جا سکتی ہے۔

متقدمین یا متاخرین کے بارے میں مفصل سوانحی کوائف نہیں ملتے (کوائف کیا بعض اوقات تو تاریخ پیدائش تک نزاعی ہوتی ہے) یہ درست ہے اسی لئے فقدانِ مواد کے باعث شخصیت کے مطالعہ سے درگزر کیا جا سکتا ہے لیکن جن تخلیق کاروں کے بارے میں نفسی مواد دستیاب ہو اس سے ضرور استفادہ کرنا چاہیے۔

تاریخِ ادب کی تحریر، تدوین بلکہ مطالعہ تک کا کوئی اصول ہونا چاہیئے۔ ایسا اصول جو اس لحاظ سے ہمہ گیر ہو کہ اس کی روشنی میں جملہ اصنافِ ادب کے آغاز، نشوونما اور تشکیل کے مراحل کی تفہیم ممکن ہو یہی نہیں بلکہ مستقبل کے لئے بھی سمت نما ثابت ہو اردو میں مختلف اسالیبِ نقد ملتے ہیں۔ چنانچہ تاریخی، عمرانی، جمالیاتی، نفسیاتی اور مارکسی اندازِ نظر سے دلچسپی رکھنے والے ناقدین ملتے ہیں۔ لیکن ہماری تمام اہم ادبی تاریخوں کو صرف "تاریخ" کے طور پر لکھا گیا۔ یعنی حالاتِ زندگی اور کلام پر تبصرہ اور بس، لیکن کسی ادبی مورخ نے کبھی کسی مخصوص نظامِ نقد کو تخلیق اور تخلیق کاروں کے مطالعہ کے لئے محدب شیشہ بنانے کی کوشش نہ کی۔ ویسے یہ طریقہ آسان بھی نہیں کہ مخصوص زاویۂ نگاہ سے مطابقت رکھنے والے مواد کی فراہمی آسان نہیں ہوگی۔ اگر مواد فراہم ہو بھی گیا تو اس کی تشریح و تعبیر دشوار ہوتی ہے۔ اگرچہ مخصوص علمی زاویۂ نگاہ کی پابندی کے باعث دائرہ کار نسبتاً محدود ہو جاتا ہے لیکن تاریخ ادب کا یہ عمیق مطالعہ زیادہ افادہ بخش ثابت ہوتا ہے کہ خوبیاں اور خامیاں مخصوص تناظر میں اجاگر ہوتی ہیں۔ یہ اندازِ نظر پسندیدہ بھی ہو سکتا ہے اور برعکس بھی۔ اس کا فیصلہ ذاتی نوعیت کا ہوگا۔ ہمارے ہاں اہم اسالیبِ نقد کے اصولوں کی روشنی میں ادبی تاریخیں قلم بند نہ کی گئیں اگر ان تنقیدی دبستانوں سے استفادہ کیا جائے تو اردو ادب کی تاریخ نگاری میں یہ نئی جہت ہوگی۔ تاہم بعض مورخین نے حسبِ ضرورت ان دبستانوں سے مخصوص اندازِ نظر سے استفادہ بھی کیا اس سلسلہ میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی "تاریخ ادب اردو" کا ذکر کیا جا سکتا ہے ان کے طریقہ کو ECLECTISM سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یعنی ہر نوع کے نظامِ فکر سے استفادہ۔ تاہم انہوں نے بالعموم تہذیبی اور عمرانی عوامل اجاگر کرنے کی خصوصی کاوش کو انہوں نے میر اور بعض دیگر شعراء کے مطالعہ میں نفسی امور کو بھی مدِنظر رکھا ہے۔ رام بابو سکسینہ کی "تاریخ ادب اردو" میں بھی کسی حد تک یہی طریقہ روا رکھا گیا ہے یہ طریقہ اس بنا پر افادہ بخش ہے کہ کسی مخصوص نقطۂ نظر کی پابندی کے برعکس تخلیق اور تخلیق کار کے حوالہ سے عمومی مطالعہ میں وسعت، پھیلاؤ اور کشادگی کا احساس ہوتا ہے۔ البتہ عمیق مطالعہ والی خاصیت نہ پیدا ہو سکے گی۔ یوں کہ تخلیق، تخلیق کار اور عصر ایک دوسرے کا آئینہ بن جائیں۔

کسی بھی تخلیق، تنقید یا تحقیق کی مانند تاریخِ ادب بھی فردِ واحد کے قلم کا ثمر ہے۔ وہ ایک نقطۂ نظر رکھتا ہو یا متنوع تصورات کا حامل ہو یا سرے سے اس کا کوئی نقطۂ نظر ہی نہ ہو۔ یہ سب امور اس کی تاریخ میں منعکس ہونے چاہئیں۔

اس لئے اجتماعی طور پر لکھی گئی تاریخیں کامیاب نہ ہوئیں، ہمارے ہاں جامعہ پنجاب اور بھارت میں علی گڑھ یونیورسٹی کی تاریخوں میں جو کیڑے نکالے گئے تو دیگر وجوہات کے علاوہ بنیادی سبب یہ بھی تھا کہ یہ ایک مصنف کی تحریر نہ تھی، ناقص مواد اور تکرار و توارد نے انہیں افادہ بخش نہ بننے دیا۔ یہ درست ہے کہ متنوع اور منتشر مواد کو مربوط کرنے کے لئے ایک مدیر بھی ہوتا ہے لیکن پتہ کچا کچا ہم!

ادبی مورخ کے سامنے اصناف و رجحانات و میلانات اور انحراف و بغاوت کی صورت میں تمام ادب کا لینڈ سکیپ ہوتا ہے جس میں تخلیقی اعتبار سے بعض ادوار سبد گل نظر آتے ہیں تو کچھ تخلیق کار شجر سایہ دار! کچھ تخلیقات سدا منور تو بیشتر جگنوؤں کی مانند! اگر تاریخ نگار (قدیم تذکرہ نگار کی مانند) بلا اعتبار معیار و انتخاب سب کا تذکرہ کرتا جائے تو ایسی تاریخ ادب معلومات و کوائف کے باوجود بلحاظ مزاج ڈیپارٹمنٹل سٹور کا منظر پیش کرے گی جہاں سب کچھ مل جاتا ہے۔ تاریخ ادب میں معیاری اور غیر معیاری اور اچھے اور برے کے تذکرہ سے تاریخ نگار کی محنت (اور بعض صورتوں میں تو مشقت) کے اظہار کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ اس تنقیدی حس سے معرا ہے جو انتخاب اور حسن انتخاب میں امتیاز سکھاتی ہے۔ ہر تحریر اور کتاب کا ادب اور تخلیق ہونا ضروری نہیں۔ جب تک ادبی مورخ کے پاس نقاد کا تخلیقی ذہن اور کسوٹی بننے والی آنکھ نہ ہوگی اس وقت تک وہ تحریر اور تخلیق میں امتیاز نہ کر پائے گا۔ لہذا ادبی مورخ کے لئے حسن ذوق (یا پھر ذوق حسن) کے ساتھ تنقیدی نگاہ، تخلیقی ذہن اور زندگی کے بارے میں سائنٹفک شعور بھی ہونا چاہیے۔ اس سے اس میں تخلیقات اور تخلیق کاروں کے بارے میں ذاتی رائے کے اظہار کی اہلیت پیدا ہو گی اور نقاد کی مانند ادبی مورخ کے لئے بھی یہ صفت اساسی ہے۔ فراہمی مواد میں تساہل سے درگزر کیا جا سکتا ہے، کوائف میں اغلاط اور تحقیق کے نقائص گوارا کئے جا سکتے ہیں (کہ یہ خارجی ہیں) مگر ذاتی رائے کا فقدان ناقابل معافی ہے (کہ یہ داخلی ہے) تاریخ میں تنقید کا رس بھی اسی سے پیدا ہوتا ہے۔ رائے کے درست، نادرست یا متنازعہ ہونے سے بھی فرق نہیں پڑتا کہ رائے بہر حال ذاتی ہی تو ہوتی ہے۔ رائے اگر کسی تنقیدی نظریہ پر استوار ہو تو پھر دیگر حضرات کے لئے اس کے مقبول یا نامقبول ہونے سے بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑتا کہ ادبی نقاد کی مانند ادبی مورخ نے بھی رائے ہی کی صورت میں فیصلہ صادر کرنا ہوتا ہے۔ ویسے تو تخلیق کاروں یا تخلیقات کے انتخاب میں بھی بالواسطہ فیصلہ پنہاں ہوتا ہے مثلاً متعدد معاصرین سے صرف نظر کے بعد جب چند تخلیق کاروں کا مطالعہ کیا تو ایسا انتخاب یوں ہی اٹکل پچو نہیں ہوتا بلکہ ردّ و قبول پر مبنی ایسے انتخاب کی اساس کسی تخلیقی نظریہ، ادبی تصور یا تنقیدی حس پر استوار ہوتی ہے، یہ بالواسطہ فیصلہ ہے لیکن صرف نظر کرنے کے برعکس ان کا نام لے کر خامیاں اُجاگر کرتے ہوئے تقابل کے بعد ممتاز تخلیق کاروں کی خوبیاں اُجاگر کی جائیں تو یہ بلاواسطہ تنقیدی عمل قرار پاتا ہے اور یہی بنیادی فریضہ ہے ادبی مورخ کا!

رائے کی تشکیل میں پسند و ناپسند، ترجیحات، تعصبات وغیرہ مخصوص کردار ادا کرتے ہیں اور یہ سب ادبی مورخ کی انفرادی نفسیات سے ماورا نہیں۔ مثلاً مولانا محمد حسین آزاد نے "آب حیات" میں مصحفی، بہادر شاہ ظفر اور غالب سے جو سلوک اور ذوق سے جو حسن سلوک روا رکھا اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ پہلے ایڈیشن میں مومن کا ذکر ہی گول کر دیا یہ سب ان کی ترجیحات کا غماز ہے۔ ایسی ترجیحات سب کی ہوتی ہیں، تنقیدی اساس مستحکم ہو تو

یہی تنقیدی رائے بن جاتی ہے ورنہ بصورت دیگر تعصب کا نام پائے گی تاہم ترجیحات اور تعصبات میں لطیف سے فرق ہے ترجیحات مرحومین کے بارے میں ہوتی ہیں جیسے کچھ "میریئے" ہیں تو کچھ "غالبئے" (یا غالب شکن یگانہ کے الفاظ میں "بجلیے") مرثیہ کی بحث میں "انیسیے" اور "دبیریے" ملتے ہیں۔ یہی حال "اقبالیوں" اور "فیضیوں" کا ہے۔ اس نوع کی ترجیحات کے نتیجہ میں تنقیدی حس معطل ہو جاتی ہے۔ یوں پسندیدہ شاعر کو جائز و ناجائز طور پر بقیہ پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اس ضمن میں مولانا شبلی کی "موازنہ انیس و دبیر" کا نام لے دینا کافی ہے جس میں شبلی نے واضح طور پر انیس کے حق میں ڈنڈی ماری ہے۔ یہ انداز ترجیح بعض اوقات اچھی خاصی FIXATION کی صورت اختیار کر جاتا ہے اور یوں پسندیدہ شخصیت کا معیار بنا کر دوسروں کی خامیاں اُجاگر کی جاتی ہیں۔ تاہم اتنا ہے کہ زمانی فاصلہ کی بنا پر اس میں ذاتیات کا عنصر شامل نہیں ہوتا اور والہانہ پسندیدگی کی اساس کلام پر استوار ہوتی ہے۔

تعصب میں البتہ جو والہانہ پسندیدگی اور انتہائی ناپسندیدگی ملتی ہے اس کا تعلق کسی تنقیدی تصور یا کلام کی فنی خوبیوں یا خامیوں سے نہیں ہوتا بلکہ یہ سراسر ذاتی تعلقات اور شخصی روابط کی بنا پر ہوتا ہے۔ اس لئے ترجیح کے مقابلے میں تعصب منفی قرار پاتا ہے کیونکہ آنکھوں پر ذاتیات کی پٹی بندھ جانے کے بعد بصارت کے ساتھ ساتھ تنقیدی بصیرت بھی غائب ہو جاتی ہے۔ ترجیح کے برعکس تعصب معاصرین سے ہوتا ہے کہ یوں ہدف سامنے ہوتا ہے یہی نہیں بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تعصب میں اضافہ نفرت اور خشونت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ہر عہد کے ناقدین اور ادبی مورخین میں ترجیحات اور تعصبات ملتے ہیں یہ مثبت رویہ نہیں لیکن کیا کیا جائے کہ حقیقت یہی ہے۔

معاصرین پر قلم اٹھانا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہے۔ قدیم تذکروں سے لے کر جدید تواریخ تک معاصرین کے بارے میں ظاہر کی گئی مثبت یا منفی آراء کے نتیجہ میں ہمیشہ نزاعات نے جنم لیا۔ پہلی مثال میر تقی میرؔ کا تذکرہ "نکات الشعراء" بنتا ہے مگر آخری نہیں۔ شیفتہ کا تذکرہ "گلشن بے خار" (م ۱۸۳۷ء) صائب تنقیدی آراء کی وجہ سے تذکروں میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ دیباچہ کے دعویٰ کے مطابق شیفتہؔ نے ذاتی تعلقات سے بلند ہو کر تذکرہ قلم بند کیا مگر معاصرین نے جب اس میں اپنے یا اپنے اساتذہ، تلامذہ یا احباب کے بارے میں آراء کو خاطر خواہ نہ پایا تو شیفتہ پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی۔ بنیادی اعتراض احباب نوازی کا تھا یعنی شیفتہ نے اپنے خاص احباب غالبؔ، مومنؔ، آزردہؔ اور وحشتؔ کے بارے میں جانبداری کا اظہار کیا۔ اس ضمن میں شیفتہ اور مومنؔ کی محبوباؤں یعنی نزاکت اور صاحب جی کی تعریف کو بھی ہدف بنایا گیا چنانچہ جواب آں تذکرہ کے طور پر "گلشن بے خار" کے جواب میں نصر اللہ خویشگی نے "گلشنِ ہمیشہ بہار" لکھا۔ ادھر نظیرؔ اکبرآبادی کے شاگرد بھی استاد کے تذکرہ سے ناخوش تھے، چنانچہ نظیرؔ کے شاگرد قطب الدین باطنؔ نے "گلشن بے خزاں" (۱۸۷۵ء) لکھ ڈالا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہ ہونی چاہیئے کہ انہوں نے شیفتہ ان کے احباب اور محبوبہ کے ساتھ کیسا حسنِ سلوک کیا ہوگا۔

"آبِ حیات" میں آزادؔ نے مصحفی کا تذکرہ کوئی اچھے الفاظ میں نہ کیا تھا۔ لہٰذا جب افسر امروہوی نے "مصحفی" قلم بند کی تو آزاد کو رگید ڈالا (ص: ۳۰-۱۲۷) اسے فوری ردِّ عمل نہیں قرار دیا جا سکتا کیونکہ دونوں کتابوں کی تاریخ اشاعت میں کوئی صدی بھر کا فاصلہ ملتا ہے۔ اس سے یہ نکتہ بھی مترشح ہو جاتا ہے کہ منفی رائے کتنی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ تو کیا ادبی مورخ دل آزاری سے پرہیز کرے؟

تاریخ، تحقیق اور تنقید زخمی دلوں کے مرہم کا نام نہیں اسی لئے اگر رائے کے اظہار سے چند نازک طبع ادیب ناخوش یا ناراض ہوتے ہیں تو عدم اظہار کے لئے یہ کوئی معقول جواز نہیں، اسی طرح یہ جو نام نہاد مشرقی شرافت کا ایک معیار یہ ہے کہ بزرگوں کی خطا پکڑنا بذاتِ خود خطا ہے تو یہ بھی درست نہیں اگر حافظ محمود شیرانی اور قاضی عبدالودود نے آزاد اور شبلی کی بزرگوں کو پیشِ نظر رکھا ہوتا تو ان کی اپنی اہمیت کیا ہوتی؟ اگر ناقد، محقق یا مورخ کو اپنی رائے کی درستی کا یقین ہو تو پھر کسی کی پرواہ نہ کرے خواہ یہ رائے خودپسندی کے شیش محل کو چکنا چور ہی کیوں نہ کر دے۔ دراصل رائے حال اور معاصرین کے مقابلہ میں مستقبل اور قارئین کے لئے ہوتی ہے اور اسی لئے قابلِ احترام! اس کی درستی یا نادرستی کا فوری فیصلہ ممکن نہیں ہوتا یہ وقت کے ہاتھ میں ہوتا ہے جو کہ بڑا ظالم ہے اور تاریخ اس ظالم کا اہم ہتھیار۔

غزل سے متعلق چند تصریحات

پروفیسر نظیر صدیقی

اردو شاعری میں غزل کی اہمیت: اردو شاعری بہت سی اصناف پر مشتمل ہے جن میں سے زیادہ تر قدیم ہیں اور چند جدید مثلاً قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رباعی، قطعہ، شہر آشوب، واسوخت، ریختی، مثلث، مربع، مخمس، مسدس، ترکیب بند، ترجیع بند، مستزاد وغیرہ قدیم اصناف ہیں۔ گیت، دوہا، سونٹ، نظم معرا، نظم آزاد جدید اصناف ہیں اور نثری نظم اور ہائیکو جدید تر۔

ان تمام اصناف میں ابھی تک غزل کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل رہی ہے۔ جس کا ایک اہم ثبوت یہ ہے کہ غزل کا شاعر اور اصناف میں طبع آزمائی کرے یا نہ کرے، اور اصناف کے شعرا کسی نہ کسی حد تک غزل ضرور کہتے رہے ہیں، یہاں تک کہ نثری نظم لکھنے والے شعرا بھی غزل کہہ رہے ہیں۔ غزل میں ہر صنف کے شاعروں نے کشش محسوس کی ہے۔ وہ ہر صنف کے شاعروں کا دامن دل کھینچتی رہی ہے۔

غزل نہ صرف شاعروں میں سب سے زیادہ مقبول رہی ہے بلکہ اردو شاعری کے قارئین میں بھی اسے دوسری اصناف سخن سے زیادہ مقبولیت حاصل رہی ہے۔ اردو شاعری کے قارئین جس حد تک غزل سے لطف اندوز ہوتے رہے ہیں اتنا کسی اور صنف سخن سے لطف اندوز نہیں ہوتے۔ جس طرح علوم و فنون میں ادب عام دلچسپی کی چیز ہے، اسی طرح شاعری میں غزل عام دلچسپی کا مرکز ہے۔

غزل کو لکھنے والوں اور پڑھنے والوں میں برابر کی مقبولیت حاصل رہی ہے۔ اردو شاعری کا نہ صرف قدیم سرمایہ زیادہ تر غزلوں پر مشتمل ہے بلکہ عہد حاضر میں بھی نظم نگاری کے فروغ پانے کے باوجود اردو شاعری کا زیادہ تر حصہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ کسی بھی اردو رسالے کو اٹھا کر دیکھیے، اس میں جتنی غزلیں ہوتی ہیں اتنی نظمیں نہیں ہوتیں۔ آج کل شعراء کے جو مجموعہ کلام چھپ رہے ہیں، ان میں بھی زیادہ تر غزلوں ہی کے مجموعے ہیں یا پھر نظموں کے مقابلے میں غزلوں کی تعداد زیادہ ہے۔

اردو شاعری میں غزلیں نہ صرف تعداد کے اعتبار سے زیادہ کہی گئی ہیں بلکہ معیار کے اعتبار سے بھی ان کا پلہ نظموں سے بھاری رہا ہے۔ اردو شاعری میں جس صنف کا سرمایہ سب سے زیادہ وقیع رہا ہے، وہ غزل ہی ہے۔ جتنے اچھے اور عظیم شاعر اردو غزل کو مل سکے ہیں، اتنے اردو شاعری کی کسی اور صنف کو اب تک نہیں ملے۔ ولی، سودا، میر، درد، قائم، مصحفی، انشا، جرأت، آتش، ناسخ، غالب، مومن، ذوق، داغ، امیر، حالی، شاد، حسرت، فانی، اصغر، جگر، یگانہ، فراق، اقبال، فیض، ناصر کاظمی یہ سب کے سب بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے اور غزل میں ان کی کارکردگی دوسری اصناف سخن سے بدرجہا بہتر اور برتر ہے۔ صرف اقبال اور فیض کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ نظم و غزل دونوں میں مساوی عظمت کے مالک ہیں اور اس عظمت کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ نظم میں اقبال اور فیض کے عظیم ہونے کا سبب غزل میں ان کا عظیم ہونا ہے۔ اگر وہ غزل گوئی میں

باکمال شاعر نہ ہوتے تو نظم نگاری میں بھی باکمال شاعر نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کی نظموں کا اصل حسن غزلوں کا حسن ہے۔ اگر ان کی غزلیں آفتاب ہیں تو ان کی نظمیں مہتاب۔ مہتاب کے حسین ہونے سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن سبھی جانتے ہیں کہ ماہتاب کا حسن آفتاب سے مستعار ہوتا ہے۔ اس نکتے کی مزید وضاحت آئندہ صفحات میں دیکھیے گا۔

ابھی جن شاعروں کے نام لیے گئے۔ ان میں سے بعض نے دوسری اصناف سخن میں بھی کامیابی اور کمال حاصل کیا، مثلاً سودا اردو میں قصیدے کے بہترین شاعر تسلیم کئے گئے ہیں۔ سودا کے بعد ذوق اردو قصیدے کے دوسرے بڑے شاعر ہیں۔ سودا اور ذوق کے علاوہ انشا، مصحفی اور غالب نے بھی اپنے اپنے رنگ میں اچھے قصیدے کہے ہیں۔ لیکن یہ تمام شعراء اپنی غزلوں کی وجہ سے زندہ ہیں، نہ کہ اپنے قصیدوں کی وجہ سے۔ اول تو قصیدہ بحیثیت صنف خود ہی مر چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس صنف میں سودا، ذوق اور دوسرے شاعروں کے جو کمالات ہیں، ان کی تاریخی اہمیت تو باقی رہے گی لیکن ان کے کمالات سے پڑھنے والوں کی دلچسپی نہ برقرار رہی ہے، نہ رہ سکتی ہے۔ غزل کے اوسط درجے کے اچھے شعر میں بھی زندہ رہنے کی جتنی صلاحیت ہوتی ہے اتنی اول درجے کے قصیدے میں بھی نہیں ہوتی۔ قصیدے کو PERIODIC شاعری کہنا یعنی ایک مخصوص دور کی شاعری کہنا غلط نہ ہوگا جبکہ اس کے برعکس غزل TIMELESS یعنی ابدی شاعری کی حیثیت رکھتی ہے۔ غزل نے اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ وہ ہر دور میں زندہ رہ سکتی ہے۔

غزل کے بارے میں طرح طرح کے اندیشے تھے، مثلاً یہ کہ وہ انسانی تاریخ کے موجودہ صنعتی دور کی عکاسی نہ کر سکے اور ختم ہو جائے یا یہ کہ وہ عہد حاضر کی تہذیبی پیچیدگیوں کی ترجمانی میں کامیاب نہ ہو سکے یا یہ کہ بیسویں صدی میں نظم نگاری کے بڑھتے ہوئے رجحان کے باعث اس کی مقبولیت باقی نہ رہے لیکن یہ تمام اندیشے غلط ثابت ہو چکے ہیں۔

اردو کے بعض شعرا غزل کی بجائے بعض دوسری صنفوں میں اپنے کمالات کی وجہ سے زندہ ہیں لیکن ان کی تعداد اتنی کم ہے کہ انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ مثلاً میر حسن اور پنڈت دیا شنکر نسیم اپنی مثنویوں کی وجہ سے زندہ ہیں۔ انیس اور دبیر اپنے مرثیوں کی وجہ سے زندہ ہیں، جان صاحب اور رنگین اپنی ریختیوں کی وجہ سے زندہ ہیں بشرطیکہ انہیں بھی زندہ کہا جا سکے۔ نظیر اکبرآبادی یقیناً اپنی نظموں کی وجہ سے زندہ ہیں۔ ۱۹۳۰ء کے بعد کے نظم نگاروں میں بعض شعرا صرف اپنی نظموں کی وجہ سے زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے، مثلاً میراجی اور ن۔م راشد۔ اول تو ایسے شعراء کی تعداد بہت محدود ہے، دوسرے یہ کہ نظموں کے سہارے زندہ رہنے والے شعرا غزل کے بڑے شاعروں کی طرح لوگوں کے دلوں اور حافظوں میں اتنے زندہ نہیں ہیں جتنے کہ عالموں اور ناقدوں کے ذہنوں اور تاریخ کے صفحات میں زندہ ہیں۔

ان تمام باتوں سے جو نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ غزل نہ صرف یہ کہ اردو کی سب سے زیادہ جاندار اور پائدار صنف ہے بلکہ یہ کہ وہ اپنے اچھے اور عظیم نمائندوں کو روزمرہ زندگی کا جزو بنانے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔

غزل کی گوناگوں خوبیوں اور اس کی تمام تر دائم رہنے والی اہمیت کو سامنے رکھ کر ہی پروفیسر رشید احمد صدیقی نے کہا تھا کہ غزل اردو شاعری کی آبرو ہے لیکن اسے بے آبرو کرنے کی کوششیں بارہا ہو چکی ہیں۔ اردو کے ایک ممتاز نظم نگار عظمت اللہ خاں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ غزل کی گردن بے تکلف مار دینی چاہیئے۔ اردو ادب کے مشہور نقاد پروفیسر کلیم الدین احمد نے غزل کو ایک نیم وحشی صنف سخن قرار دے دیا تھا۔ جوش ملیح آبادی نے غزل کو بے ربط گفتگو کا مجموعہ ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا لیکن غزل ان جارحانہ اعتراضات کو بھی سہہ گئی۔ عظمت اللہ خاں غزل کی گردن نہ مار سکے۔

پروفیسر کلیم الدین احمد غزل کے قارئین کو اس بات کا قائل نہ کر سکے کہ غزل نیم وحشی صنفِ سخن ہے۔ جوش ملیح آبادی کسی حد تک غزل کو بے ربط گفتگو ثابت کرنے کے باوجود اسے پرستارانِ سخن کی نظر سے گرا نہ سکے۔ سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ پروفیسر کلیم الدین احمد اور جوش ملیح آبادی غزل کے کٹر مخالف ہونے کے باوجود ذاتی زندگی میں غزل ہی کے اشعار کے رسیا تھے، نہ کہ نظم کے اشعار کے۔ جادو وہ جو سر پر چڑھ کر بولے، سو غزل بھی ایک ایسا ہی جادو ہے۔ ناممکن ہے کہ کوئی شخص صاحب ذوق ہو یعنی ذوقِ شعر رکھتا ہو اور غزل کی شاعری میں جو ساحری پوشیدہ ہے، اس کا قائل نہ ہو۔

غزل کی حمایت میں جو باتیں کہی گئی ہیں، ان میں غزل کی ان خوبیوں کی نشاندہی ملتی ہے جو غزل کو ہمیشہ زندہ رکھیں گی، مثلاً فراق گورکھپوری نے کہا ہے کہ غزل کے اشعار انتہاؤں کا سلسلہ ہوتے ہیں جس سے ان کی مراد یہ ہے کہ غزل کا ہر شعر کسی صورتحال کے نقطۂ عروج کو بیان کرتا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے کہا ہے کہ غزل کے اشعار میں بسی ہوئی بجلیاں ہوتی ہیں، مطلب یہ ہے کہ غزل کے اشعار خیال اور جذبے کو برقا دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان میں بجلی کی سی تیز روشنی اور گرمی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان نے غزل کو دروں بینی کا آرٹ قرار دیا ہے، یعنی غزل انسانی نفسیات کی گہرائیوں اور پیچیدگیوں کو معلوم کرنے کا آلہ ہے۔ اچھی غزل اندر جھانکنے سے پیدا ہوتی ہے، نہ کہ باہر دیکھنے سے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کا خیال ہے کہ غزل غزل ہونے کے علاوہ ایک نقطۂ نظر، ایک اندازِ فکر، ایک اصولِ تخلیص اور ایک سلیقۂ اظہار بھی ہے۔

غزل کی صحیح تعریف و تصور: دوسرے اصنافِ ادب کی طرح غزل کے باب میں بھی سب سے پہلا مسئلہ غزل کی تعریف کا ہے۔ دوسرے اصنافِ ادب کی تعریف عموماً جامع اور مانع نہیں ہوتی یعنی جزوی طور پر صحیح ہوتی ہے۔ یہی حال غزل کی تعریف و تصور کا ہے۔ غزل کے بارے میں یہ تصور عام ہے کہ غزل نام ہے حسن و عشق کی شاعری کا۔ غزل میں حسن و عشق کی شاعری ضرور ہوتی ہے بلکہ زیادہ تر حسن و عشق ہی کی شاعری ہوتی رہی ہے۔ اس کے باوجود یہ نہ تو غزل کا صحیح تصور ہے، نہ اس کی صحیح تعریف۔ اس تعریف اور اس تصور کے غلط ہونے کا سب سے واضح ثبوت یہ ہے کہ حسن و عشق کی شاعری مثنوی میں بھی ممکن ہے، قطعے میں بھی، رباعی میں بھی، پھر غزل اور ان اصناف میں فرق کیا رہا؟

یہاں یہ نکتہ سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ اردو شاعری کی اصناف میں بعض کی تعریف صرف موضوع کے حوالے سے ہوتی ہے بعض کی تعریف صرف ہیئت کے حوالے سے اور بعض کی دونوں حوالوں سے، مثلاً شہر آشوب اس نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی ملک کی تباہی و بربادی بیان کی گئی ہو۔ شہر آشوب کی تعریف صرف اس کے موضوع کے حوالے سے کی جاتی ہے۔ اسی طرح عام مرثیے کی تعریف یہ ہے کہ مرثیہ وہ نظم ہے جو کسی کی موت پر لکھی گئی ہو اور جس میں مرنے والے کی خوبیاں بیان کی گئی ہوں لیکن جب مرثیے سے مراد وہ نظم ہو جس میں واقعاتِ کربلا بیان کیے گئے ہوں تو ایسی نظم کے بارے میں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ ایسا مرثیہ مسدس کی شکل میں لکھا جاتا ہے۔ اسی طرح قصیدے کی تعریف بھی موضوع اور ہیئت دونوں کے حوالے سے ہوتی ہے، یعنی قصیدہ وہ نظم ہے جو کسی کی مدح میں لکھی جائے اور جس کی ہیئت غزل سے مشابہ ہوتی ہے۔ ہیئت کے اعتبار سے غزل اور قصیدے میں فرق صرف اتنا ہے کہ غزل کے سارے مطلعے غزل کے شروع میں آتے ہیں اور غزل کا مقطع بالکل آخری شعر ہوتا ہے۔ جبکہ قصیدے میں ضروری نہیں کہ سارے مطلع شروع ہی میں آئیں۔ چونکہ قصیدہ طویل نظم ہوتا ہے اس لئے اس میں کچھ مطلعے بیچ میں بھی آ سکتے ہیں جہاں سے قصیدے کا دوسرا حصہ یا بقیہ حصہ شروع ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ضروری نہیں کہ قصیدے میں مقطع بالکل آخری شعر ہو۔ قصیدے کے آخری تین چار شعروں میں مقطع کہیں بھی آسکتا ہے۔

غزل اردو شاعری کی ان اصناف میں سے ہے جن کی تعریف صرف ہیئت کے حوالے سے ہونی چاہیئے۔ جس طرح مثنوی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ مثنوی شاعری کی وہ صنف ہے یا مثنوی اس نظم کو کہتے ہیں جس کے ہر شعر کے دونوں مصرعے مقفیٰ ہوتے ہیں اور جس کے تمام اشعار معنوی اعتبار سے مسلسل ہوتے ہیں، اسی طرح غزل کی تعریف یوں ہونی چاہیئے کہ غزل شاعری کی وہ قسم ہے جس کے پہلے شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں، اسے مطلع کہتے ہیں۔ غزل میں ایک سے زائد مطلعے ہو سکتے ہیں مگر وہ سب کے سب شروع ہی میں ہونے چاہیئں۔ مطلع یا مطلعوں کے بعد جو اشعار ہوتے ہیں، ان کے صرف دوسرے مصرعوں میں قافیے آتے ہیں۔ غزل کے آخری شعر میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے اور اسے مقطع کہتے ہیں۔

تو یہ ہوئی غزل کی تعریف ہیئت یا فارم (FORM) یا شکل کے اعتبار سے اور غزل کی تعریف صرف ہیئت ہی کے اعتبار سے ہونی چاہیئے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں؟

جواب یہ ہے کہ کسی غزل کا کوئی ایک موضوع نہیں ہوتا۔ ایک غزل میں جتنے اشعار ہوتے ہیں، تقریباً اتنے ہی اس کے موضوعات ہوتے ہیں۔ تقریباً کا لفظ اس لیئے استعمال کیا جا رہا ہے کہ ایک غزل میں بعض اوقات ایک ہی موضوع پر دو یا دو سے زیادہ شعر بھی ہو سکتے ہیں مثلاً پانچ شعر کی ایک غزل ہے۔ ممکن ہے کہ اس میں دو شعر حسن وعشق کے بارے میں کہے گئے ہوں، تیسرا کسی سماجی صورت حال کے بارے میں، چوتھا کسی سیاسی واقعے کے بارے میں اور پانچواں انسانی فطرت کے بارے میں۔ اس لحاظ سے غزل میں شعر تو پانچ ہوئے لیکن موضوعات چار ہی رہے۔ تو ایسی صورت میں جبکہ ایک غزل میں عموماً ایک سے زائد موضوعات ہوتے ہیں یہ کہنا کیا معنی رکھتا ہے کہ غزل شاعری کی وہ قسم ہے جس میں حسن وعشق کا ذکر ہوتا ہے یا حسن وعشق کے معاملات بیان کیئے جاتے ہیں؟ یہ تو غزل کی نہ صحیح تعریف ہے نہ اس کا صحیح تصور۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ غزل کے بارے میں یہ غلط تصور کیونکر پیدا ہوا کہ غزل نام ہے حسن وعشق کی شاعری کا، آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ اردو میں ایم اے کرنے والے اور اردو لیکچرار یا پروفیسر کی حیثیت سے کام کرنے والے بھی بسا اوقات غزل کی یہی تعریف اور اس کا یہی تصور پیش کرتے ہیں؟

اس غلط فہمی کے تین سبب ہیں، اوّل تو غزل کے یہ ابتدائی معنی کہ غزل نام ہے عورتوں سے یا عورتوں کے بارے میں بات کرنے کا۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ غزل بنیادی طور پر عشقیہ جذبات کے اظہار کے لئے وجود میں آئی۔ تیسرا سبب یہ ہے کہ غزل اپنی تاریخ کے ایک طویل عرصے تک زیادہ تر حسن وعشق ہی کی شاعری رہی۔ قدیم شعرا کی پوری پوری غزلیں صرف حسن وعشق سے متعلق موضوعات پر مبنی ہیں۔ بیسویں صدی تک زیادہ تر غزل گو ایسے ملتے ہیں جن کی ہر غزل کے بیشتر اشعار حسن وعشق ہی سے متعلق ہیں۔ حالؔی پہلے شاعر تھے جنہوں نے غزل کے اس غالب رجحان کو بدلنے کی کوشش کی اور اقبالؔ اردو کے وہ شاعر ہیں جنہیں اس رجحان کو بدلنے میں سب سے زیادہ کامیابی نصیب ہوئی۔ ان کے ہاں کثیر تعداد میں پوری پوری غزلیں ایسی ہیں جن میں حسن وعشق سے متعلق ایک شعر بھی موجود نہیں۔ اس کے باوجود ان کی غزلوں میں غزل کا سارا حسن موجود ہے۔ عشقیہ غزلیں نہ کہنے کے باوجود اقبالؔ کے ایک عظیم غزل گو ہونے میں شک نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ جب اردو کے قدیم سے قدیم غزل گو کی شاعری میں حسن وعشق کے علاوہ دوسرے موضوعات بھی موجود ہیں تو غزل کو صرف حسن وعشق کی شاعری کیونکر کہا جاتے اور کیا ایسا کرنا غلط نہیں؟ جدید شاعروں میں ایسے غزل گو بہت ہیں جن کی غزلوں میں حسن وعشق کے مضامین بالکل نہیں ملتے۔ خود قدیم شاعروں کے ہاں بہت سی غزلیں ایسی ملتی ہیں جن میں حسن وعشق کی کوئی بات نہیں ہوتی۔

غزل کی تعریف صرف اس کی ہیئت کے حوالے سے ہونی چاہیئے۔ اس کی تعریف میں کسی بھی موضوع کا حوالہ دینا غلط ہوگا۔ غزل صرف ایک ہیئت ہے جس میں کسی بھی خیال یا تجربے یا جذبے یا کیفیت کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ غزل اردو شاعری کی وہ واحد صنف ہے جس میں بیک وقت کئی موضوعات پر شعر کہے جا سکتے ہیں اور کہے جاتے رہے ہیں۔ لہٰذا غزل کو صرف حسن و عشق کی شاعری کہنا غلط ہے اور سراسر غلط۔ اب دونوں قسم کی غزلوں کی دو چار مثالیں دیکھئے۔

عشق بے تاب جاں گدازی ہے　　حسن مشتاق دل نوازی ہے
جو ہوا راز عشق سوں آگاہ　　وہ زمانے کا فخر رازی ہے
پاکبازاں سوں یوں ہوا مفہوم　　عشق مضمون پاکبازی ہے
جا کے پہنچی ہے حد ظلمت کوں　　بس کہ تجھ زلف میں درازی ہے
تجربے سوں ہوا مجھے ظاہر　　ناز مفہوم بے نیازی ہے
اے ولی عشق ظاہری کا سبب　　جلوۂ شاہد مجازی ہے

(ولی دکنی)

اس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا　　چھوڑا وفا کو ان نے مروت کو کیا ہوا
امیدوار وعدۂ دیدار مر چلے　　آتے ہی آتے یارو قیامت کو کیا ہوا
اس کے گئے پر ایسی گئی دل سے ہم نشیں　　معلوم بھی ہوا نہ کہ طاقت کو کیا ہوا
جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف　　اے کشتۂ ستم تری غیرت کو کیا ہوا
تھی صعب عاشقی کی بدایت ہی میر پر　　کیا جانیئے کہ حالِ نہایت کو کیا ہوا

(میر تقی میر)

تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے　　کس لئے آئے تھے ہم کیا کر چلے
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے　　ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
کیا ہمیں کام ان گلوں سے اے صبا　　ایک دم آئے ادھر، اودھر چلے
دوستو دیکھا تماشا یاں کا بس　　تم رہو اب ہم تو اپنے گھر چلے
ایک میں دل ریش ہوں ویسا ہی دوست　　زخم کتنوں کے سنا ہے بھر چلے
شمع کی مانند ہم اس بزم میں　　چشم نم آئے تھے دامن تر چلے
ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ　　جب تلک بس چل سکے ساغر چلے
درد کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب　　کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

(خواجہ میر درد)

فطرت کو خرد کے رو برو کر　　تسخیر مقام رنگ و بو کر
تو اپنی خودی کو کھو چکا ہے　　کھوئی ہوئی شے کی جستجو کر
تاروں کی فضا ہے بیکرانہ　　تو بھی یہ مقام آرزو کر

بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو کر

(اقبالؔ)

ان غزلوں میں پہلی دو غزلیں سرتاسر عشقیہ غزلیں ہیں۔ لیکن تیسری اور چوتھی غزل بالکل غیر عشقیہ ہے جبکہ وحید کوئی جدید شاعر نہیں، میرؔ کے ہم عصر ہیں۔ اس زمانے تک غزلیں زیادہ تر عشقیہ ہی ہوا کرتی تھیں لیکن جیسا کہ پچھلی سطروں میں بتایا گیا، قدیم شعرا کے یہاں بھی ایسی غزلیں ملتی ہیں جن کا حسن و عشق کے مضامین سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ غزل نام ہے اس شاعری کا جس میں حسن و عشق کی باتیں ہوتی ہیں۔ غزل کو حسن و عشق تک محدود کرنے کے معنی اس کی وسعت کو ختم کر دینے اور اس کی اہمیت کو کم کر دینے کے ہیں۔

غزل کی روایات اور رموز و علائم :۔ غزل کی روایات کیا ہیں؟ اس سوال کا جواب اس بات پر منحصر ہے کہ ہم یا آپ روایت سے کیا مراد لیتے ہیں۔ ہر وہ بات جو پہلے سے چلی آرہی ہے، اسے روایت میں شمار کیا جاتا ہے۔ روایت سے ملتا جلتا ایک لفظ اور ہے، رسم۔ اور اس کے معنی بھی تقریباً وہی لئے جاتے ہیں جو روایت کے لئے جاتے ہیں۔ یعنی رسم سے مراد بھی وہ باتیں ہیں جو پہلے سے ہوتی چلی آرہی ہیں۔ اسی لئے بسا اوقات "رسمی" اور "روایتی" کے الفاظ بالکل مترادف معنوں میں استعمال کئے جاتے ہیں، مثلاً جب ہم غزل کے رسمی مضامین اور روایتی مضامین کا ذکر کرتے ہیں تو ان دونوں فقروں سے ہمارے مراد ایک ہی طرح کے مضامین ہوتے ہیں۔ محبوب کو سنگدل اور رقیب کو روسیاہ کہنا غزل کا رسمی مضمون بھی ہے اور روایتی مضمون بھی۔ تو کیا رسم اور روایت میں کوئی فرق نہیں ہے؟ کیا رسمی اور روایتی دونوں الفاظ بالکل ہم معنی ہیں؟

اس میں شک نہیں کہ یہ دونوں لفظ بھی بعض اوقات بالکل ہم معنی الفاظ کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ بات ذہن نشین کر لینے کی ہے کہ اب لفظ رسمی بُرے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور لفظ روایتی اچھے معنوں میں، غزل بلکہ شاعری میں رسمی عناصر اور روایتی عناصر کا فرق اچھے اور بُرے صحت مند اور غیر صحت مند عناصر کا فرق ہے۔

۱۹۱۷ء میں جب مغربی ادب کے عظیم نقاد ٹی ایس ایلیٹ نے 'روایت اور انفرادی صلاحیت' کے عنوان سے اپنا عہد آفریں مقالہ لکھا تو اس نے اپنے مقالے کی ابتدا ہی میں اس بات کا اعتراف کیا کہ ہم (یعنی انگریزی ادب والے) زیادہ سے زیادہ اس لفظ کو "صفات" کے طور پر استعمال کرتے ہوئے یہ کہہ دیتے ہیں کہ فلاں کی شاعری "روایتی" یا حد درجہ روایتی ہے۔ یہ لفظ عیب اور مذمت کے علاوہ شاذ ہی کسی دوسرے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اگر کبھی دوسرے معنی میں استعمال ہوتا بھی ہے تو مبہم تعریفی معنی میں۔

آگے چل کر ایلیٹ نے کہا کہ اگر روایت کے معنی یہ ہیں کہ اپنے سے پہلی نسل کے طریقوں اور کامیابیوں کا آنکھ میچ کر یا سہمے سہمے اتباع کیا جائے تو ایسی صورت میں یقیناً روایت کی حمایت سے گریز کرنا چاہیئے۔ ہم نے خود ایسے بہت سے رجحانات کو مرتے دیکھا ہے۔ یہ بات مسلم ہے کہ جدت تکرار سے بہتر ہے۔ روایت کا معاملہ بہت وسیع اہمیت کا حامل ہے۔ یہ میراث میں نہیں ملتی اور اگر کوئی اسے حاصل بھی کرنا چاہے تو اس کے لئے بڑے ریاض کی ضرورت پڑتی ہے۔ اول تو اس کے لئے تاریخی شعور کی ضرورت پڑتی ہے جو ہر اس شاعر کے لئے لازمی ہے جو پچیس سال کی عمر کے بعد بھی شعر کہتا رہے۔ تاریخی شعور کے لئے ادراک کی ضرورت پڑتی ہے، نہ صرف ماضی کی ماضیت کا ادراک بلکہ اس کی حالت (PRESENTNESS) کا ادراک بھی۔ تاریخی شعور ادیب کو مجبور کرتا ہے کہ لکھتے وقت جہاں اسے اپنی نسل کا احساس

رہے۔ وہاں یہ احساس بھی رہے کہ یورپ کا سارا ادب ہومر سے لے کر اب تک اور اس کے ملک کا سارا ادب ایک ساتھ زندہ ہے اور ایک ہی نظام سے مربوط ہے"۔

"کوئی شاعر، کوئی فنکار، خواہ وہ کسی بھی فن سے تعلق رکھتا ہو، تن تنہا اپنی کوئی مکمل حیثیت نہیں رکھتا۔ اس کی اہمیت اور اس کی بڑائی اس میں مضمر ہے کہ پچھلے شعرا اور فن کاروں سے اس کا کیا رشتہ ہے؟ الگ رکھ کر اس کی اہمیت متعین نہیں کی جاسکتی۔ اسے پچھلے شعرا اور فن کاروں کے درمیان رکھ کر تقابل و تفاوت کرنا ہوگا۔"

ان اقتباسات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ٹی ایس ایلیٹ کے نزدیک اپنے سے پہلی نسل کے طریقوں کی تقلید یا تکرار کا نام روایت نہیں بلکہ روایت اس تاریخی شعور سے عبارت ہے جس میں ماضی کی ماضیت کا ادراک بھی موجود ہو اور ماضی کی حالیت کا بھی، یعنی ماضی صرف وہ نہیں ہے جو گزر چکا بلکہ وہ بھی ہے جو حال کی تشکیل میں حصہ لے رہا ہے۔ ادب کے حوالے سے ماضی کی ماضیت اور ماضی کی حالیت کا مفہوم غالباً یہ ہے کہ ادب کے پورے سرمائے کو ایک ساتھ زندہ اور ایک دوسرے کے ساتھ (ماضی کے ادب کو حال کے ادب کے ساتھ) مربوط تصور کیا جائے۔

روایت کا یہ وسیع اور پیچیدہ تصور ممکن ہے آسانی سے قابل فہم نہ ہو لیکن اتنا ضرور ہے کہ ایلیٹ کے متذکرہ مضمون کے بعد لفظ روایت جو اپنی قدر اور اہمیت کھو چکا تھا، باعزت لفظوں میں شمار ہونے لگا۔ بقول حسن عسکری (جنہیں اردو ادب کا عظیم نقاد کہنا غلط نہ ہوگا) ایلیٹ کے اثر سے روایت کا لفظ فیشن میں داخل ہوگیا۔

لیکن حسن عسکری نے ۱۹۶۲ء میں "روایت کیا ہے؟" لکھ کر نہ صرف ایلیٹ کے مضمون پر زبردست حملہ کیا بلکہ روایت کے تصور کو ایلیٹ سے بھی زیادہ دشوار بنا گئے۔

اس بات کا احساس تو خود ایلیٹ کو بھی تھا کہ اس کا مضمون "مابعد الطبیعیات یا تصوف کی سرحدوں کی طرف رجوع کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور ایسے علمی نتائج کی طرف لے جاتا ہے جنہیں شاعری میں دلچسپی رکھنے والے ذمہ دار اشخاص ہی استعمال کر سکتے ہیں۔"

حسن عسکری نے روایت کے تصور کو بالکل مابعد الطبیعیاتی بنا دیا۔ جب ادب کی کوئی بحث مابعد الطبیعیات میں داخل ہو جائے تو پھر وہ ادب کے طالب علموں کے بس کی بات نہیں رہتی، نہ اس کا سمجھنا آسان، نہ اس کا سمجھانا آسان۔ اس کے باوجود ادب کے طالب علموں کو اس بات سے بے خبر نہیں رہنا چاہیئے کہ انسانی ذہن ادب کی کس بحث کو کہاں سے کہاں لے گیا ہے۔

ہم نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ کیا رسمی اور روایتی دونوں الفاظ بالکل ہم معنی ہیں؟ ایلیٹ کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ کم از کم ۱۹۱۷ء تک لفظ روایتی اور لفظ رسمی میں کوئی فرق نہیں تھا، گو ایلیٹ نے روایتی کے ساتھ لفظ رسمی کہیں استعمال نہیں کیا۔ انگریزی میں روایت کے لیے TRADITION کا لفظ ہے اور رسم کے لئے CONVENTION کا۔ انہی سے TRADITIONAL اور CONVENTIONAL کے الفاظ بنے ہیں۔ آج کل مغربی تنقید سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ ادب میں جو چیز روایتی ہے، وہ تو قابل قدر ہے اور جو چیز رسمی ہے، وہ قابل قدر نہیں ہے۔ ادب کے روایتی عناصر قابل جذب ہوتے ہیں اور رسمی عناصر لائق رد۔

ہر ادب بلکہ ہر صنف ادب کی کچھ روایات مسلمات ہوتے ہیں۔ اس ادب کی بہتر تحسین و ادراک کے لئے ان روایات و مسلمات سے واقفیت ضروری ہے۔

چونکہ غزل کا ایک غالب موضوع محبت رہی ہے، اس لئے غزل کے طالب علموں کا ذہن اس بارے میں واضح رہنا چاہیئے کہ اردو غزل میں محبوب سے کیا مراد ہے اور اس میں محبوب کتنی قسم کے ہیں؟

یہ بات بھی ہماری روایت کا جزو ہے کہ عام طور پر ہمارے معاشرے میں محبت کی دو قسمیں تسلیم کی جاتی ہیں حقیقی محبت اور مجازی محبت۔ حقیقی محبت وہ ہے جس کا تعلق خدا سے ہوتا ہے اور مجازی محبت وہ ہے جس کا تعلق انسان سے ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے شاعری میں صرف دو قسم کے محبوب ہونے چاہئیں تھے لیکن اردو شاعری میں تین قسم کے محبوب نظر آتے ہیں ۔ حقیقی محبوب جو خدا ہے۔ مجازی محبوب جو کوئی نسوانی شخصیت ہے۔ پھر مجازی محبوب جو کوئی حسین و جمیل لڑکا ہے۔

اگرچہ اردو شاعری کے دکنی دور میں ہندی شاعری کی روایت کے زیر اثر غزل میں محبت کا اظہار عورت کی طرف سے بھی ہوا ہے لیکن دکنی دور سے قطع نظر اردو غزل کی عام روایت رہی ہے کہ محبت کا اظہار مرد کی طرف سے ہوتا رہا ہے۔ ایسی غزلیں یا غزل کے ایسے اشعار جن میں محبت کا اظہار مرد کی طرف سے ہوا ہے، ان میں محبوب صرف عورت نہیں، مرد بھی ہے۔ اگر محبت دو مخالف جنسوں میں ہو تو اسے صنفی محبت کہتے ہیں، اگر ایک ہی جنس کے دو افراد میں ہو تو اسے ہم جنس محبت کہتے ہیں، جو اگرچہ معاشرتی، اخلاقی اور قانونی نقطۂ نظر سے معیوب تصور کی جاتی ہے لیکن نہ صرف اردو غزل میں بلکہ دنیا کے ہر ادب میں پائی جاتی ہے۔

محبت کے اظہار میں اردو غزل کی یہ روایت بہت عجیب و غریب ہے کہ اگر محبوب نسوانی شخصیت بھی ہے تو اس کے لئے بھی صیغۂ تذکیر ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب بات یہ ہے کہ اگرچہ محبوبہ یعنی لڑکی یا عورت کے لئے صیغۂ تذکیر کا استعمال نہایت غیر فطری اور مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے لیکن غزل میں یہ بات نہ غیر فطری معلوم ہوتی ہے نہ غیر مانوس نہ مضحکہ خیز۔ یہی نہیں بلکہ اگر محبوبہ کے لئے غزل میں صیغہ تانیث استعمال کیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ وہ طرز بیان مضحکہ خیز معلوم ہو اور شعر کی ساری لطافت جاتی رہے۔ مثلاً غزل کے دو ایک شعروں کو لیجئے اور ان میں صیغۂ تذکیر کو صیغۂ تانیث سے بدل کر دیکھئے ۔

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو | وہی ایک شہر میں قاتل رہا ہے

(ولی دکنی)

مری خلوتوں کی یہ جنتیں کئی بار سج کے اجڑ چکیں | مجھے بارہا یہ ہوا گماں کہ تم آرہے ہو کشاں کشاں

(اقبال عظیم)

ممکن ہے بعضوں کو یہ مصرعے اس طرح بھی اچھے ہی لگیں ۔

وہی اک شہر میں قاتل رہی ہے

مجھے بارہا یہ ہوا گماں کہ تم آرہی ہو کشاں کشاں

لیکن محبوبہ کی نسوانیت کے اعتبار سے یہ طرز بیان اردو غزل کے بیشتر قارئین کے لئے شاید ہی مانوس ہو۔ اختر شیرانی نے غزل میں محبوبہ کے لئے صیغۂ تانیث استعمال کرنے کی بنیاد ڈالی لیکن ان کی یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔

اردو غزل کی تدریس میں محبوب کے لئے صیغۂ تذکیر کے استعمال سے بھی زیادہ نازک مسئلہ ایک اور ہے، سکولوں اور کالجوں میں اردو ادب کے اساتذہ جب بچی عمر کے طلبہ کو غزلیں پڑھاتے ہیں تو معاشرتی اور تہذیبی نزاکتوں کی بنا پر وہ غزل کے ہر عشقیہ شعر کا محبوب خدا کو قرار دیتے چلے جاتے ہیں۔ نوجوانوں کے اثر پذیر ذہنوں پر یہ بات منقش ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس میں غزل کو نقصان یہ پہنچتا ہے کہ جو اشعار واضح طور پر انسانی محبوب کے بارے میں ہیں، انہیں بھی توڑ مروڑ کر خدا سے منسوب کر دیا جاتا ہے۔ غزل کی تدریس کا یہ طریقہ صحیح نہیں۔ بہتر تو یہی ہوتا کہ کم از کم میٹرک تک کے طلبہ کو

غزلیں نہ پڑھائی جائیں۔ اگر انہیں غزلیں پڑھانا ہی ہیں تو پھر غزلوں کے ساتھ زیادتی نہ کی جائے۔ ایک حل یہ بھی ہے کہ میٹرک بلکہ انٹرمیڈیٹ تک کے نصاب میں صرف ایسی غزلیں رکھی جائیں جن میں عشقیہ اشعار نہ ہوں۔

یہ بات غزل کی روایات اور مسلمات میں سے ہے کہ غزل کے عشقیہ اشعار میں اسم معرفہ کا استعمال نہیں کیا جاتا صرف ضمیر سے کام لیا جاتا ہے۔ آپ، وہ، تم، تو، اس، ان، انہیں وغیرہ غزل میں ان ضمائر کی وہی حیثیت ہے جو افسانوں میں کرداروں کی ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ ضمائر صرف محبوب کے لئے استعمال نہیں ہوتے لیکن شعر کے نفس مضمون سے قاری کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ ضمائر کس کس کے لئے استعمال ہو رہے ہیں۔ اگرچہ غزل میں اسم معرفہ (یعنی محبوب کا نام) استعمال نہ کرنے میں معاشرتی تقاضوں کو بھی دخل رہا ہوگا لیکن اب جبکہ پردہ داری کا دور گزر چکا ہے اب بھی غزلوں میں کسی سلمیٰ یا کسی ریحانہ کا نام نہیں آیا۔" یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی"۔ اس قسم کے مصرعے اور شعر نظم ہی کے لئے زیادہ موزوں معلوم ہوتے ہیں۔

چونکہ غزل میں ہر بات دو مصرعوں کے اندر مکمل کرنی پڑتی ہے، اس لئے غزل اپنی ساخت کے اعتبار سے ایجاز و اختصار اور رمز و کنایہ کا فن ہے۔ اس میں کسی قسم کی تفصیل کی گنجائش نہیں۔ جب تفصیل ممکن نہ ہو تو تعمیم ضروری ہو جاتی ہے۔ غزل میں کسی صورت حال کا بیان ممکن نہیں، صورت حال کی طرف صرف اشارہ کیا جا سکتا ہے یا اس کا لب لباب بیان کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل میں رموز و علائم سے کام لینے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ گل و بلبل، شمع و پروانہ، صید و صیاد، قفس و آشیاں، دیر و حرم، برق و باراں، ساحل و سمندر، طوفان و تلاطم، شراب و ساقی، بہار و خزاں، گل و گلچیں، نسیم و صبا، جادہ و منزل، بادہ و ساغر، قاتل و مقتول، یہ اور اس طرح کے جتنے الفاظ غزل میں آتے ہیں استعاروں، کنایوں اور علامتوں کے طور پر آتے ہیں۔ ان کی مدد سے بڑے سے بڑا مضمون دو مصرعوں کے چوکھٹے میں آجاتا ہے۔ اس طرح شعر یاد رہ جانے کے قابل بن جاتا ہے اور شاعر اظہار و اختصار دونوں کا حق ادا کر دیتا ہے۔ دورِ حاضر کے ایک جواں شاعر جمال احسانی نے بہت صحیح کہا ہے۔

جمال کھیل نہیں ہے کوئی غزل کہنا
کہ ایک بات بتانی ہے، اک چھپانی ہے

غزل کے بہت سے اچھے شعروں میں کچھ کہنے اور کچھ چھپانے کا انداز پایا جاتا ہے۔ بات ادھوری کہی جاتی ہے لیکن اس کے باوجود یا اسی کے باعث اثر دونا ہوتا ہے مثلاً

نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے
پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے

کہاں میخانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پس اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

(غالب)

کل میں نے محبت کو اس عجب طور سے دیکھا
آنکھوں نے تو کم دل نے بہت غور سے دیکھا

(محبوب عارفی)

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

(میر)

کسی کا یوں تو ہوا کون عمر بھر، پھر بھی
یہ حسن و عشق تو دھوکا ہے سب، مگر پھر بھی

(فراق)

غزل میں جو رموز و علائم استعمال ہوتے ہیں، ان سے جہاں ایک طرف غزل میں رعنائی اور زیبائی پیدا ہوتی ہے، وہاں دوسری طرف انسانی فطرت اور انسانی زندگی سے متعلق ناگفتنی کو گفتنی بنانے میں بھی مدد ملی ہے۔ مثلاً انسانی فطرت کی کمزوریوں کو ڈھکے چھپے انداز میں بیان کر دیا گیا ہے یا انسانی زندگی کے ان پہلوؤں کو بھی بیان کر دیا گیا ہے جن کے بیان پر پابندیاں عائد ہیں۔

مہرباں ساقیٔ محفل کو جو پایا ہے روش اب یہ ضد ہے کہ ہر اک جام ہمیں تک پہنچے

(روش صدیقی)

تماشائے گلشن، تمنائے چیدن بہار آفرینا گنہگار ہیں ہم

(غالب)

جناب شیخ سے کہہ دو اگر سمجھانے آئے ہیں کہ ہم دیر و حرم ہوتے ہوئے میخانے آئے ہیں

(بیکل اتساہی)

غرورِ سرو و سمن سے کہہ دو کہ پھر وہی تاجدار ہوں گے جو خار و خس والیٔ چمن تھے عروجِ سرو و سمن سے پہلے

(فیض)

فیض نے اردو غزل کے سرمائے میں ایک اہم اضافہ کیا ہے، وہ یہ کہ انہوں نے عشق کی زبان میں عشقیہ شاعری سے زیادہ سیاسی شاعری کی ہے۔ ان کے الفاظ یا آج کل کی اصطلاح میں ان کی لفظیات عشقیہ ہوتی ہیں اور ان کی شاعری کا متن سیاسی ہوتا ہے، مثلاً ان کے کچھ اشعار دیکھیے ؎

اک طرزِ تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک اک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

فیض ان کو ہے تقاضائے وفا ہم سے جنہیں آشنا کے نام سے پیارا ہے بیگانے کا نام

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

فیض نے یہ ٹیکنیک نہ صرف غزلوں میں استعمال کی ہے بلکہ اپنی نظموں میں بھی۔ یوں تو غزل کے اشعار میں یہ گنجائش ہمیشہ رہی ہے کہ ان کی تعبیر و تشریح ایک سے زیادہ مفہوم میں ہو سکتی ہے لیکن فیض کی غزلوں کے دو سطحی مفہوم ان کا ایک خاص اکتساب ہے۔

قدما کی غزلوں میں عاشقانہ اشعار پر عارفانہ اشعار کا دھوکا اور عارفانہ اشعار پر عاشقانہ اشعار کا دھوکا اکثر ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ عشق حقیقی ہو یا مجازی دونوں میں کیفیتیں تقریباً یکساں ہوتی ہیں، اسی لیے ان کا اظہار بھی یکساں ہوتا ہے۔ شاید اسی لئے یہ بات کہی گئی کہ تصوف برائے شعر گفتن خوب است یعنی شعر کہنے کے لیے تصوف بہت خوب ہے اور یہی وجہ ہے کہ غزل اور تصوف میں بہت گہرا تعلق رہا ہے۔

اردو غزل پر تصوف دو طریقے سے اثر انداز ہوا ہے۔ ایک تو تصوف کے اثر سے اردو غزل میں وسیع المشربی، رواداری اور انسان دوستی کی اقدار نے فروغ پایا ہے، دوسرے تصوف کے حوالے سے اردو غزل میں ایسے موضوعات آتے ہیں جو انسانی زندگی کے بنیادی فلسفے سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً وحدت و کثرت، خیر و شر اور جبر و اختیار کے مسائل۔ ان مسائل کا اطمینان بخش حل تو نہ کبھی ملا ہے، نہ مل سکے گا لیکن ان مسائل سے انسانی ذہن کی پنجہ آزمائی شعر و ادب میں گہرائی پیدا کرتی رہی ہے۔

اردو شاعری میں غزل کی مرکزیت :- اردو شاعری میں موضوع اور اسلوب دونوں کے اعتبار سے بیسویں صدی کی

تیسری دہائی تک غزل کو مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ غزل کے موضوعات کا دائرہ دوسری تمام اصناف سخن سے زیادہ وسیع رہا ہے۔ انسانی زندگی کے جتنے پہلو غزل میں منعکس ہوتے رہے ہیں، اتنے کسی اور صنف سخن میں نہیں ہوئے۔ غزل میں دوسری تمام اصناف کے موضوعات کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ مثلاً اس میں قصیدے کی مدح اور مرثیے کا ماتم، مثنوی کی منظر نگاری اور شہر آشوب کی نوحہ گری، واسوخت کی برہمی اور بیزاری اور ریختی کی تہدید اور طعنہ زنی۔ ان تمام چیزوں کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔ اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ اردو غزل کا اسلوب دوسرے تمام اصناف سخن کے اسالیب پر اثر انداز ہوا ہے۔

اردو غزل کے اسلوب کا سب سے نمایاں وصف EPIGRAMMATIC ہوتا ہے۔ ہر اچھی غزل چبھتے ہوئے انداز بیان یا کاٹ دار انداز بیان کی حامل ہوتی ہے۔ غزل میں کسی بات کا صرف بیان کر دینا کافی نہیں ہوتا بلکہ اسے اس طرح بیان کرنا ہوتا ہے کہ بات بیک وقت دل میں اتر جائے اور زبان پر چڑھ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جتنے اشعار غزل کے زبان زد عام ہوئے ہیں یا زبان زد عام ہونے کے قابل رہے ہیں ان کے اسلوب میں کسی نہ کسی حد تک غزلیت ضرور پائی جاتی ہے۔ یہ خوبی اور خصوصیت اردو نظم کے پہلے عظیم شاعر نظیر اکبر آبادی کے یہاں بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بیسیوں مصرعے اور شعر زبان زد عام ہیں۔ مثلاً ؎

- سب جیتے جی کے جھگڑے ہیں سچ پوچھو تو کیا خاک ہوئے ۔۔۔ جب موت سے آ کر کام پڑا سب قصے قضیے پاک ہوئے
- ٹک دیکھ لیا دل شاد کیا خوش وقت ہوئے اور چل نکلے ۔۔۔ • کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

غزل کے اسلوب کا اثر قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، قطعہ، رباعی غرض کہ ہر اہم صنف میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ قصیدے کا انداز بیان غزل کے برعکس پُرشکوہ ہوتا ہے۔ اس کی زمین ثقیل اور سنگلاخ ہوتی ہے۔ اس کے باوجود ہم غالب کے کسی قصیدے میں اس طرح کے شعر دیکھتے ہیں ؎

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق ۔۔۔ بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

تو یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ غزل قصیدے پر بھی اثر انداز ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ مثنوی کے بہت سے شعر غزل کے مطلعوں سے مشابہ نظر آتے ہیں۔ مرثیوں میں ہر بند کا پانچواں اور چھٹا مصرع غزل کے مطلعوں سے قریب محسوس ہوتا ہے۔ دو شعر والے قطعے اور دو شعروں پر مشتمل رباعیوں کے دوسرے شعروں میں عموماً مضمون کی وہ تکمیل اور اسلوب کی وہ برجستگی پائی جاتی ہے جو غزل کے اشعار کی خصوصیت ہوتی ہے۔ مثلاً جوش ملیح آبادی کی ایک رباعی کا دوسرا شعر اور فیض کے ایک قطعہ کا (دو شعر کا قطعہ) کا دوسرا شعر دیکھیے ؎

مفلس کہ امیروں کے گناتے ہیں گناہ ۔۔۔ دولت انہیں دے دو تو قیامت کر دیں (جوش)

سے تعلق رکھنے والی نظمیں غزلوں سے قریب ہوتی ہیں بلکہ ان نظموں کی کامیابی کے مدارج کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ غزلوں سے کس حد تک قریب ہیں۔

پہلی روایت سے تعلق رکھنے والی نظمیں اپنی رعنائی اور توانائی کا سامان غزل سے لیتی رہی ہیں۔ اردو شاعری کی بنیادی روایت غزل کی روایت ہے جو تصدق حسین خالد، ن۔م راشد اور میراجی کی نظم نگاری سے پہلے تک پوری قوت کے ساتھ اردو شاعری میں کارفرما رہی ہے۔ اس کے بعد اردو شاعری کا اردو غزل سے رشتہ ٹوٹ گیا۔ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی سے اردو شاعری مغربی شاعری کی روایت سے وابستہ ہو گئی اور یہ وابستگی اقبال کی وفات کے بعد مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی ہے۔

اب کسی لیلیٰ کو بھی اقرارِ محبوبی نہیں ان دنوں بدنام ہے ہر ایک دیوانے کا نام (فیضؔ)

دور حاضر کے بہت سے نظم نگاروں کی نظموں میں نہ صرف غزل کا اسلوبی حسن کار فرما نظر آتا ہے بلکہ ان کی نظموں کے بہت سے اشعار ایسے ہیں کہ اگر وہ غزلوں میں ملا دیے جائیں تو کبھی محسوس بھی نہ ہو کہ وہ نظموں کے اشعار تھے مثلاً ؎

مجھ سے ملنے میں اب اندیشۂ رسوائی ہے میں نے خود اپنے کیے کی یہ سزا پائی ہے

حسن نے جب بھی عنایت کی نظر ڈالی ہے میرے پیمانِ محبت نے سپر ڈالی ہے (مجازؔ)

غنچہ و گل تھے یہی لیکن یہ رعنائی نہ تھی اس گلستاں میں بہار اس دھوم سے آئی نہ تھی (مجازؔ)

ذکر جس کا زہرہ و پرویں کے کاشانے میں ہے وہ صنم بھی آج اپنے ہی صنم خانے میں ہے (مجازؔ)

تیرے گلشن کی بدولت گل بداماں ہم بھی ہیں تیرے نغموں کے اثر سے نغمہ ساماں ہم بھی ہیں

(سردار جعفری)

زندگی یوں تو ہمیشہ سے پریشان سی تھی اب تو ہر سانس گراں بار ہوئی جاتی ہے

(ساحرؔ)

تو نے خود اپنے تبسم سے جگایا ہے جنہیں ان تمناؤں کا اظہار کروں یا نہ کروں

(ساحرؔ)

ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا ورنہ ہمیں جو دکھ تھے بہت لادوا نہ تھے

(فیضؔ)

اقبالؔ اور فیضؔ اردو کے ان دو شاعروں میں سے ہیں جو بیک وقت باکمال غزل گو بھی ہیں اور باکمال نظم نگار بھی۔ لیکن ان دونوں کے باکمال نظم نگار ہونے میں ان کے باکمال غزل گو ہونے کو دخل ہے۔ ان کی نظموں کا سارا حسن اور سارا آب و رنگ وہی ہے جو ان کی غزل میں موجود ہے۔ اگر یہ اپنے اپنے رنگ کے باکمال غزل گو نہ ہوتے تو باکمال نظم نگار بھی نہ ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ دورِ حاضر کے ایک ممتاز نظم نگار اختر الایمان، اقبالؔ اور فیضؔ کو نظم نگاروں میں سرے سے شمار ہی نہیں کرتے۔ وہ ان دونوں کو صرف غزل گو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن اس نقطۂ نظر میں نہ صرف ایک قسم کی انتہا پسندی موجود ہے بلکہ اردو شاعری میں نظم نگاری کی دو روایتوں سے انکار یا ناواقفیت بھی۔

اردو شاعری میں نظم نگاری کی دو بڑی روایتیں ہیں۔ پہلی روایت وہ ہے جو دکن میں مثنوی نگاری سے شروع ہو کر اقبالؔ اور فیضؔ کی نظم نگاری پر ختم ہوتی ہے۔ دوسری روایت وہ ہے جو ۱۹۳۰ء کے بعد تصدق حسین خالد، ن۔م۔ راشد اور میراجی سے شروع ہو کر نثری نظم لکھنے والوں تک جاری ہے۔ اختر الایمان نظم نگاری کی دوسری روایت سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسری روایت کے نظم نگاروں کو پہلی روایت سے تعلق رکھنے والی نظموں کے پس پردہ غزلیں نظر آتی ہیں، کیونکہ پہلی روایت

مرکز سے محیط تک

ساختیت اور "بعد از جدیدیت"

قاضی قیصر الاسلام

سارتر کی وجودی فکر جہاں ایک طرف اپنی نوعیت میں بہت زیادہ کارتیزی اور وجودیاتی قدامت پسندی کے زیر اثر صورت پذیر ہوئی تھی، تو دوسری طرف اُس کی فکر خاص طور پر دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کے بعد شخصی اور سیاسی سطح پر حقیقی معنوں میں جرمن فکر پر اپنا بہت زیادہ اثر ڈالتی نظر آتی ہے۔ اور اس فکر کی یہ مذکورہ صورتِ حال علمی میدان میں ایک ایسی جرات مندانہ ترقی اور نشوونما کے بالمقابل تشکیل پذیر ہوتی نظر آتی ہے جہاں ایک طرف تو علم تفسیر[۲] اور تنقیدی نظریئے[۳] کا چرچا تھا تو دوسری طرف 'سائنس اور زبان' کے مختلف فلسفیانہ شعبوں کے محیط پر ایک بالکل ہی نیا رجحان فکر ماہرینِ علم و سائنس کے لئے انتہائی دلچسپی کا سبب بنا ہوا تھا۔ مگر اُدھر فرانس میں فکر کی یہ صورت حال، جرمنی کی مذکورہ فکری صورت حال کے برعکس یہ تھی کہ وہاں سارتر کی وجودی فکر کے خلاف ایک ایسا ہی تند و تیز ردعمل، بڑے ہی ڈرامائی انداز میں شروع ہو چکا تھا، جیسا کہ کبھی خود وجودی فکر کے لئے وہاں کے اہل فکر و نظر میں ایک جنون سا پایا جاتا تھا — یہ تو ہمیشہ ہی سے ہوتا آیا ہے کہ خواہ کوئی سا بھی فکری ردعمل ہو۔ وہ کسی ایک واحد فلسفی تک محدود نہیں ہوا کرتا بلکہ یہ ردعمل پوری جدید فکری تحریک کے حوالے سے فلسفے کی دنیا میں رونما ہوا کرتا ہے۔ لہٰذا فرانس میں بھی کچھ ایسی ہی فکری صورت حال پیدا ہوئی اور فکر کے میدان میں ایک ایسے ردعمل کا پیدا ہونا۔ فلسفے کے کسی بھی سنجیدہ قاری کے لئے کبھی حیرت انگیز نہیں ہوا کرتا کہ یہ تو ایک لاابدی فکری تسلسل کا ناگزیر نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ اس فکری ردعمل سے متاثر ہونے والے بعض ایسے اہل علم و نظر نے جو اس ردعمل سے متاثر تو ضرور تھے مگر نسبتاً کم کم متاثر تھے۔ اس

---

۱ THE END OF THE SELF: "STRUCTURALISM"; "POST-MODERNISM"; FOUCAULT, AND DERRIDA

۲ HERMENEUTICS خصوصاً انجیل اور تورات اور بالعموم دوسری مقدس کتابوں کے حوالے سے۔

۳ "CRITICAL THEORY OF SOCIETY" اس نظریے کے بانیوں میں سے قابل ذکر نام خصوصاً ہارکیمر اور مارکوز اور عموماً ہبرماس نیز اڈورنو کے ہیں۔ اس نظریے کے تحت یہ خیال راسخ ہے کہ معاشرے کو اُس کی پوری کلیت میں دیکھا جانا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اسے مکمل طور پر سائنسی نہج پر نہ پرکھا جائے۔ (اس نظریئے کا تعلق فرانکفرٹ مکتبہ فکر سے ہے)

فکری رد عمل کے نتیجے میں پیدا ہونے والے نظریات کو ایسے مفکرین کی حیثیت سے جو تصورات یا نظریات پر مبنی کسی نظام کو کسی نہ کسی نام سے موسوم کرنا یا اُس پر کوئی نہ کوئی لیبل لگانا نسبتاً زیادہ پسندیدہ خیال کرتے ہیں، اس فکری رد عمل کو بھی، جو یہاں ہمارا زیر بحث موضوع ہے، "بعد از جدیدیت"[1] کے عنوان سے موسوم کیا ہے۔ چنانچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ "بعد از جدیدیت"[2] کی اسی فکری تحریک کے تحت جو سارتر کی وجودی فکری تحریک کے خلاف ایک رد عمل کے طور پر معرض وجود میں آئی۔ یورپ کی جدید فکر کی بیشتر حدود یا نظاموں کا ایک باضابطہ استرداد عمل میں آیا۔ اس استرداد فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ میں رائج مختلف نقطہ ہائے نظر جو پہلے ہی متزلزل ہو چکے تھے اور اُس وقت کے عصری تقاضوں کی تسکین کا باعث نہ تھے،

یعنی ہماری وہ صلاحیت فکر و جستجو کہ جس کے تحت آج کا یہ سائنسی انسان یہ جاننے کے لیے بے چین و مضطرب ہے کہ یہ دنیا جس میں ہم برسوں سے سانس لے رہے ہیں ہوا واقعتاً ہے کیا؟ اس سوال کا جواب دینے میں ناکامی کا شکار تھے اور اس کے ساتھ ہی یہ نظریات تاریخ کی کوئی ایسی نئی تعریف و تعبیر کرنے میں بھی کامیاب نہ تھے جو وقت و حالات کے تقاضوں کے مطابق ہو سکتی اور "جدید انسان" کو مطمئن کر سکتی۔ صرف یہی نہیں بلکہ "بعد از جدیدیت" کے اس فکری رجحان کے تحت "ذات"[3] اور موضوع کے دو مظاہر کی جو کبھی یکساں متصور ہوا کرتے تھے۔ اپنی دو جداگانہ جہتیں متعین کی جانے لگیں۔ گویا مختصراً اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ماورائے تجربی فکری صورت حال کی "التباس نظری"[4] یا عیارانہ خیالی کی مفروضہ سازی کی پوری کی پوری جعلی عمارت جسے فکری عیاشی بھی کہا جا سکتا ہے، یکلخت منہدم ہو کے رہ گئی۔ آج کا جدید انسان ایک سائنسی انسان ہے اور وہ اصل حقیقت کی جستجو میں بے سر و پا مفروضات حقیقت پر انحصار کرنے پر بالکل تیار نہیں۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ دنیا کی "وہ اصل حقیقت" جس میں وہ خود بھی بہ حیثیت ایک "وجود موجود"[5] یا "ہستی موجود" کے بھرپور سرگرمیوں کے ساتھ شامل ہے، جیسی کہ یہ "اصل حقیقت واقعتاً ہے" وہ جدید انسان کے علم میں آئے۔ اور "اصل حقیقت" سے متعلق لاطائل تعبیرات و تغیرات کے گورکھ دھندے سے اُسے ہمیشہ کے لئے نجات مل جائے۔ چنانچہ ایک موقع پر مائیکل فوکو خود یہ لکھتا ہے کہ:۔

> "فکر کی دنیا میں مَیں نے جو کچھ بھی کام کیا ہے اس کا واحد مقصد ہی یہ ہے کہ ہم انسانوں کے لئے ایک ایسی تاریخ مرتب کریں، جس کی تمام جہتیں اور تمام پہلو بے کم و کاست آج کے جدید انسان کی نگاہ کے سامنے بالکل واضح اور روشن ہوں یعنی ایک ایسی تہذیبی و ثقافتی تاریخ کا کھلا منظر ہماری نظروں کے سامنے ہو جس

---

[1] POST-MODERNISM

[2] POST-MODERNISM

[3] SELF AND SUBJECT

[4] TRANSCENDENTAL PRETENCE

[5] EXISTENCE-BEING-THERE OR DASEIN

کے تحت ہم انسان زندگی کرنے کے عمل سے گزرتے ہیں ۔"

گویا فوکو کا کہنا یہ ہے کہ جس ثقافتی و تہذیبی تاریخ کے تابع رہتے ہوئے ہم زندگی کا پورا سفر طے کرتے ہیں ۔ اُس کا ہر نقشِ قدم ہماری گرفت میں ہونا چاہیئے ۔ یہ ہماری اپنی شناخت کا سفر ہے ۔ اس لئے "اصل حقیقت" کی دریافت کا اصل مدار کہیں اور نہیں ہونا چاہیئے ۔ اُسے بھی ہماری اپنی شناخت کی قندیل سے ہی روشن ہو کر ہماری اپنی ہی تاریخ کا حصہ ہونا چاہیئے ، پھر ہم اسے اور کہیں کیوں ڈھونڈیں ۔

چنانچہ ہابرماس کی مشہور زمانہ تصنیف "جدیدیت پر فلسفیانہ مقالہ"[1] کے فاضل مقدمہ نویس اور ماہر عمرانیات تھامس میکارتھی[2] نے اپنے مقدمہ میں ہابرماس کے حوالے سے ایک بڑا وقیع اور معتبر جائزہ "جدیدیت کے خاتمے"[3] کے موضوع پر ، عہد حاضر کے فکری ، سیاسی ، معاشرتی اور معاشی پس منظر میں پیش کیا ہے ۔ اس میں وجودی فکر[4] ، ساختیت اور ساخت شکن فکری موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے ۔ ہم اپنے قارئین کی دلچسپی کے لئے میکارتھی کی تحریر کے چند اقتباسات کا ماخوذ بیان یا ان کا آزاد ترجمہ یہاں پیش کر رہے ہیں ۔

" ہابرماس اپنی تصنیف " جدیدیت کے موضوع پر ایک فلسفیانہ مقالہ"[5] میں لکھتا ہے کہ ہم آج بھی نوہیگلی[6] یا جواں سال ہیگلی مفکرین کے عہد میں سانس لے رہے ہیں ۔"

یہ بات غالباً ہابرماس نے اس لئے لکھی ہے کہ نوہیگلی نوجوان مفکرین کا فکر کے میدان میں بس یہی ایک کارنامہ رہا ہے کہ انہوں نے خود کو ہیگلی فکر کی ان مساعی سے دور ہی رکھا جن کے تحت یہ کوشش کی جاتی رہی تھی کہ "تنویریاتی"[7] سے متعلق موضوع[8] ۔ مرکزی فکری استدلال یا موضوع ، مرکزی تعقل کو "مطلق علم"[9] کی فکری صورت حال سے تبدیل کر دیا جائے ۔ ہم یہ بات بھی بخوبی جانتے ہیں کہ کارل مارکس[10] کے علاوہ بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے دیگر مفکرین نے بہت پہلے ہی "روح"[11] کے مسئلے کو اس کی بلند و بام رفعتوں سے نیچے اُتار کر اسے زمین کی حقیقی وسعتوں کی اُس پست وادی سے روشناس

---

[1] "THE PHILOSOPHICAL DISCOURSE OF MODERNITY" BY JURGEN HABERMAS; PUBLISHER, BASIL BLACKWELL (1988)

[2] THOMAS MCCARTHY

[3] THE END OF MODERNITY

[4] EXISTENTIALIST THOUGHTS/STRUCTURALISM AND DE-CONSTRUCTION

[5] "THE PHILOSOPHICAL DISCOURSE OF MODERNITY" BY J. HABERMAS BASIL BLACKWELL-1988

[6] NEW OR YOUNG HEGELIANS

[7] ENLIGHTENMENT

[8] SUBJECT-CENTERED REASON

[9] ABSOLUTE KNOWLEDGE

[10] KARL MARX

[11] SPIRIT

کرایا جہاں ہم انسان حالات کے تنگ و تاریک اور تلخ و ترش حقائق کے درمیان زندگی بسر کرنے کے عمل سے ہمہ وقت سرگرم پیکار رہتے ہیں۔ گویا اس طرح ان فلاسفہ نے فلسفے کی بے بضاعتی یا ناطاقتی کا پول کھول کے رکھ دیا۔ اُس دور سے لے کر آج کے دور تک روح کو حقائق کی سنگتی اور بودیتی فضا سے آشنا بنائے جانے کا کام بڑی تیزی کے ساتھ ہوتا آرہا ہے، اور اس کے ساتھ ہی عقل و استدلال، ضرورت سے بڑھی ہوئی پراگندہ خیالی اور اس کی فکری آبرو باختگی[1]، نیز تاریخ اور روایت، معاشرے اور اقتدار، دستور اور مفاد، جسم اور خواہش اور نہ جانے کہاں کہاں۔ اس کے (عقل کے) غیر ضروری عمل دخل کی "چارہ و ناچارہ[2]" روش نے بالآخر بعض مفکرین کو اس بات پر اُکسایا کہ وہ اس مکروہ انسانی صورت حال کا نوٹس لیں اور پھر اس کے سدباب کے لئے کوئی موثر اقدام کریں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ فلسفہ میں ایسے بہت سے معتبر نام ملتے ہیں کہ جنہوں نے "عقل[3]" کی اس فتنہ گری اور عیارانہ فطرت کا سخت نوٹس لیا ہے مثلاً سب سے پہلا نام خود نطشے کا ہی ہے جس نے نہ صرف یہ کہ فلسفے کی زوال آمادگی کا چرچا کیا ہے بلکہ اُس نے فلسفے کے خاتمے کا اعلان بھی کیا ہے اور اس طرح گویا اُس نے نہ صرف یہ کہ عقل کا ماتم کیا بلکہ "غیر عقلیت[4]" کا دور بھی صحیح معنوں میں یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ اُدھر دوسرا بڑا نام "ابلاغ و زبان[5]" کے حوالے سے وٹگنسٹائن کا ہے جس نے (زبان کے حوالے سے) معالجانہ ہمدردی کے پیش نظر زبان کی لاچاری یا بے زبانی کا شدید احساس کیا اور یوں وہ بھی ترسیل جذبات اور ابلاغ و اظہار کے میدان میں جہاں کچھ کہنا ممکن ہی نہ ہو، وہاں "چُپ" رہنے کا مشورہ دے کر عقل کو خیر باد کہتا نظر آتا ہے یعنی اُسے بھی اس کے علاوہ اور کوئی علاج یا تدبیر سجھائی نہ دی۔ ان مفکرین میں سے تیسرا معتبر اور وقیع نام ہائیڈیگر کا ہے۔ جس نے ہستی کے گڈریئے کا خطاب پایا ہی اس لئے کہ اسے (ہستی کو) عقل کے چابک سے ہانکنا اُس کے لئے ممکن ہی نہ ہو سکا تھا۔ اس نے فلسفے کے سب سے قدیم مسئلہ "وجود" کو، جسے عقل کی گتھیوں سے آج تک سلجھایا جانا ممکن نہ ہو سکا "ہستی موجود[6]" یا "وجود وہاں موجود" کے تذکروں تک محدود کر دیا اور انسانی فرد کی ہستی کو اُس کی ہنگامی اور ہیجانی صورتِ حال کے تحت ایک نیا نام دیا، یعنی اسے (انسانی فرد) مسٹر وجود[7] وہاں موجود یا پھر دازمن کہہ کر اپنی جان چھڑالی۔ غرضیکہ عصر حاضر میں جہاں کہیں بھی نکل جائیے فلسفے کے نابود ہونے کی گونج چاروں طرف سے سنائی دے رہی ہے اور زیادہ تر فلاسفہ کا محبوب موضوع بھی یہی ہے اسی لئے دنیا بھر میں اس پر گرما گرم بحثیں جاری ہیں۔ چنانچہ ابتداء میں اس موضوع پر جو گفتگو ہوئی اُس کے دوران تبصروں اور آراء کا تنوع اُبھر کر سامنے آیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ فرانس میں بعد از ساختیتی[8] موضوع فکر کا

۱۔ OVER-WEHLMING "IMPURITY" OF REASON

۲۔ UN-AVOIDABLE ENTANGLEMENT

۳۔ REASON

۴۔ IRRATIONALITY

۵۔ COMMUNICATION OR LANGUAGE

۶۔ DASEIN OR BEING-THERE OR MR BEING-THERE

۷۔ MR BEING-THERE OR DASEIN

۸۔ POST-STRUCTURALISM

موضوع ہی ان لکچروں کے لئے ایک نقطۂ آغاز ثابت ہوا ہے۔ علاوہ ازیں نطشے اور ہائڈیگر ہی وہ دو بڑے نام ہیں جنہوں نے موضوع زیرِ تذکرہ کے لئے بڑھ چڑھ کر کام کیا اور اس بحث کا ایجنڈا طے کیا۔ تیسرا نام ہابرماس کا ہے جس نے بنیادی کام اس ضمن میں یہ کیا کہ عصرِ حاضر کی فرانسیسی فکر کے دوران اس انتہا پسند ناقدینِ فلسفہ کے اُن سوالات کو بطور چیلنج قبول کیا اور ان اعتراضات کا از سرِ نو جائزہ لیا جو انہوں نے "عقل" کو ہدفِ تنقید بناتے ہوئے دنیائے فکر کے سامنے پیش کئے۔ ہابرماس نے ان کے ان ہی سوالات کا جواب دینے کی کامیاب مساعی کی ہیں اور بعض ایسی راہیں تجویز کی ہیں جن پر غور و فکر کر کے "جدیدیت" کے لئے کسی مثبت جہت کا تعین کیا جانا ممکن ہے اور اس طرح گویا اُن الجھنوں کو دُور کیا جا سکتا ہے جن کے باعث فکر کے میدان میں وہ سوالات پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کی وجہ سے اگلی منزل کا فکری سفر معرضِ التوا میں پڑتا نظر آتا ہے۔" اس سلسلے میں ہابرماس کی فکری حکمتِ عملی صاف نظر آتی ہے کہ کسی طرح وہ دنیائے فکر کے غوطہ خوروں کو دوبارہ ان کے فکری گرداب سے نکال کر تاریخی فکر کے ان چوراستوں[1] پہ لا کر یکجا کر دے۔ جن پر بالآخر ہیگل اور اس کے پیرو کار نو ہیگلین، نطشے اور ہائڈیگر سب ہی پہنچے ہیں اور نہ صرف یہ کہ یہ مایۂ ناز اہلِ علم و دانش ان چوراستوں پر آ کر اکٹھے ہوئے بلکہ انہوں نے "انسانی تقدیر" کو بدل دیئے جانے کے لئے بڑے اہم اور پُر تدبیر فیصلے بھی کئے ہیں۔ آج ان ہی فیصلوں کا یہ نتیجہ ہے جن کے باعث "جدیدیت" کے بعد کی وہ فکر سامنے آئی ہے جسے ہم ساختیتی[2] فکر اور ساخت شکن[3] فکری ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ مگر ہمیں ایسا نظر آتا ہے کہ ہابرماس اپنے فکری سفر کے دوران اپنے پیچھے چلنے والوں کو ایک واضح راہ تو دکھا نظر آتا ہے مگر خود اپنے ان مقلدین کے ہمراہ چلنے پر آمادۂ کار نظر نہیں آتا۔ کیونکہ اُس نے موضوع، فکری تعقل[4] یا موضوع مرکزی استدلال کی قطعی نفی کئے جانے کے لئے بھی خود عقلی استدلال کو ہی اپنا آلۂ کار بنایا ہے اور اپنے اس استدلال کو اس نے ایک نیا نام دیا ہے، جسے وہ "ابلاغی عمل[5]" کے نام سے موسوم کرتا ہے۔

ہابرماس کی فکر کا مرکزی نکتہ "جدیدیت" کو موضوعِ بحث بنانا ہے۔ اس کی یہ بحث جمالیاتی نقطۂ نظر سے نہیں کی گئی ہے بلکہ اس کا تمام کا تمام تناظر فلسفیانہ ہے۔ مگر اُس نے بہر حال اپنے ان مباحث کے دوران بعض اہم فکری تہ داریاں کو بھی اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور فکری تہہ داریاں یہ ہیں کہ فلسفیانہ[6] تنقید پر جدیدیت کے ضمن میں جمالیاتی[7] تنقید نے اپنے کیا اثرات مرتب کئے ہیں۔ یعنی شیلر کے دَور سے لے کر نطشے کی رومانی فکر کے عہد تک کیا کچھ فکری ماجرا فلاسفہ کے پیشِ نظر رہا ہے اور انہوں نے ان مسائل کے لئے کیا کچھ حل پیش کیا اس کا بھی تذکرہ اُس نے کیا ہے اور پھر اس طرح وہ

---

۱ HISTORICAL CROSS-ROADS

۲ STRUCTURALISM

۳ DE-CONSTRUCTION

۴ SUBJECT-CENTERED REASON

۵ COMMUNICATIVE ACTION

۶ PHILOSOPHICAL CITIQUE

۷ AESTHETIC CRITIQUE

آج کی ساختیتی فکر کے پیچیدہ مزاج مسائل کی بھول بھلیوں میں داخل ہو کر وہاں بھی فکر کی ایک نئی شمع جلانے کی سعی کرتا نظر آتا ہے۔ اس طرح وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ گویا وہ ایک صورت حال کہ جسے "بنیادی تجربہ" یا پھر یوں کہہ لیجئے کہ جسے آج کی جدید فکر میں "مخصوص تجربہ" کا نام دیا جاتا ہے، دراصل اپنی حقیقی نوعیت میں ایک ایسا تجربہ ہے جو فکر کے عمل کو سائنس و مذہب، اخلاقیات و افادیت کے بندھے ٹکے اصولوں کی پابند یا محدود صورت حال سے جو اس پر برسوں سے عائد چلی آ رہی ہے، آزاد بناتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ فکر کے میدان میں قیود و حدود کی اس صورت حال سے مذکورہ آزادی کا یہ امکان آخر پیدا کیوں کر ہوا، تو اس ضمن میں پورے وثوق کے ساتھ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ابھی حال ہی میں فن کی دنیا سے متعلق "آواں گارد"[1] نامی ایک ایسی تحریک معرض وجود میں آئی ہے، جس نے فکری آزادی کے حصول کے اس پورے عمل میں اپنا بھرپور کردار ادا کرتے ہوئے ــــ موضوعِ معقول کی حاکمیت یا مقتدر حیثیت[2] پر زبردست حملے کئے۔ جس سے ہوا یہ کہ موضوعِ معقول کا وہ حکمانہ یا جابرانہ رجحان فکر، جو اپنے اندر "اَنا مرکزیت" مرعوب و مغلوب کُن روشِ فکر کا غالب رجحان رکھتا تھا، وہ اب قطعاً بے اثر ہو کے رہ گیا ہے اور اس طرح جدید فکر میں "کھُلے پن" کا حوالہ آج کے انسان کا طرہ امتیاز ٹھہرا ہے اور یہ اسی سفاکانہ فکری تنقید کا لازمی نتیجہ ہے کہ آج کی بہروپ بدلتی دنیا میں لاینحل مسائل کی بھی بہرحال ایک واضح شکل اُبھر کے ہمارے سامنے آتی ہے۔ چنانچہ اب جب کہ ضعف و ناتوانی کی اصل بنیاد کا سراغ لگ گیا تو پھر قوی امید یہ بھی رکھی جا سکتی ہے کہ ہمارے سماجی معالجین اپنی فکر کے تیز نشتر سے معاشرے کے پورے جسم پر نمودار ہونے والے اُن داغ دھبوں کو بھی دھو سکیں گے جو مثل سرطان کے انسانیت کو ایک کرب اور ایک اکراہ کے ہاتھوں نڈھال اور بوجھل بناتے جا رہے ہیں۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نطشے سے لے کر باتیل[3] کی فکر کے پورے دورانیے میں، وہ ایک فکری نہج کہ جسے "عقل کا ماجرائے دگر"[4] یا بہ الفاظ دیگر غیر عقلی طرزِ فکر بھی کہہ سکتے ہیں اور جسے اس سے پہلے کے فکری ادوار میں راندۂ درگاہ قرار دے کر خارج از بحث قرار دیا جاتا رہا تھا، اب اس پورے فکری دور میں اس غیر عقلی اندازِ نظر نے کچھ اس طرح سے بار پایا کہ اس کے لئے ایک محکم محور کی مسلسل جستجو کی جاتی رہی۔ ہر چند کہ غیر عقلیت[5] کی جستجو کا یہ عمل عموماً داخلی رمزیت کے پیکرِ حساس میں ہی لپٹا ہوا تھا پھر بھی اس فکری عمل نے وقت کے تقاضوں کو پورا کیا اور وہ بھی اس طرح کہ پھر بعد ازیں یہی غیر عقلی اندازِ نظر تنقیدی عمل کے لئے بھی ایک معیار کی حیثیت اختیار کرتا چلا گیا۔

ہابر ماس نے فن کی بالقوۃ صلاحیت کے ابتدائی مواد کو بھی موضوعِ بحث بنایا ہے تاکہ عقل کے پارہ پارہ

---

۱ AVANT-GRADE ART فن کی دنیا سے متعلق وہ طبقۂ فکر جو فن کے میدان میں جدید ترین تصورات کے علاوہ بالکل ہی اچھوتی فنی تکنیک کی نہ صرف یہ کہ حمایت کرتا ہو بلکہ اُسے رائج کرنے میں بھی اپنی پوری مساعی سے کام لیتا ہو۔

۲ SOVEREIGN RATIONAL SUBJECT

۳ BATAILLE

۴ OUTLAWED THE "OTHER" OF REASON

۵ IRRATIONALITY

آنات کو جستہ جستہ بہم کر کے انہیں مربوط رکھا جا سکے اور صرف یہی نہیں بلکہ اُس نے نطشے اور ہائیڈیگر کے اُن خیالات کو بھی موضوع بحث بنایا ہے، جن کے مطابق ان دونوں فلاسفر نے ایک اساطیری تصور کے بنیادی خیال کی از سر نو جمالیاتی تشکیل کی کوشش کی اور اس طرح ڈائنوسس (خدائے غائب[4]) کے تصور کو ایک نئے تخلیقی پیکر میں ڈھالا۔

مگر جمالیات کی بڑھتی ہوئی اہمیت اور وقعت کا موضوع، جدیدیت کے فلسفیانہ مقالے کا محض ایک پہلو ہے جس کی مکمل بحث کا بنیادی انحصار موضوعاتی عقلیت کی تنقیدی فکر پر ہے۔ ہم اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ عقل یا استدلال اور خود مختار عقلی موضوع سے متعلق محکم تصورات کا فروغ ڈیکارٹ کے عہد سے لے کر کانٹ کے دور تک ہوتا رہا ہے اور اس حقیقت کے باوجود کہ اس پر زبردست تنقیدی حملے چاروں طرف سے ہوتے رہے ہیں ڈیڑھ سو سال تک عقلیاتی فکر کے بہت ہی گہرے اور وسیع اثرات انسانی فکر پر مرتب ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ دور تنویر کے فکری ناقدین کے خیال کے مطابق ان مذکورہ فلاسفر نے انسان کی تعریف سے متعلق جو نظریات پیش کئے ہیں۔ ان کے ڈانڈے مغربی انسان دوستی کی فکر سے جا ملتے ہیں۔ جو ان ناقدین کے خیال کے مطابق انسانی معاشرے میں طویل سازشی روش اور دہشت پسندانہ رجحانات کے نتیجے میں اُبھر کے سامنے آئے ہیں۔ لہٰذا مذکورہ ناقدین نے فلسفے کے نابود ہونے یا اس کے خاتمے کا اعلان کرتے ہوئے یہ کہا کہ یہ تو دراصل مابعد الطبیعیات کی تباہی و بربادی کا دور ہے۔ جسے ان ناقدین نے ایک بالکل ہی نئے نام سے موسوم کیا ہے اور وہ ہے "ساخت شکن[11]" فکری رجحانات۔ اب یہ فکری رجحان خواہ منفی جدلیاتی فکر کے نام پر ابھر کے سامنے آیا ہو، یا پھر اس کی ایک وجہ تحقیق نسبیات فکر انسانی کا وہ تسلسل بھی ہو سکتا ہے جو مابعد الطبیعیاتی فکر سے متعلق انسان اپنی تخلیق کے اول دن سے کرتا چلا آ رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ ناقدین فکر جس خاص انداز نظر کو اپنی تنقیدی فکر کا نشانہ بنا رہے ہیں، اس انداز فکر کی نوعیت ہی دراصل زعیمانہ خود

---

[1] FRAGMENTED MOMENTS OF REASON

[2] AESTHETICALLY RENEWED MYTHOLOGY

[3] DIONYSUS

[4] یہ تصور بڑی حد تک امام غائب مہدی علیہ السلام کے ظہور کی روایت سے مماثل ہے۔

[5] SUBJECTIVISTIC RATIONALISM

[6] WESTERN HUMANISM

[7] COMPLICITY

[8] TERROR

[9] END OF PHILOSOPHY

[10] META-PHYSICS

[11] DE-CONSTRUCTION

[12] GENEALOGY

[13] SELF-ASSERTIVE AND NOTION OF REASON

فکری سے ملو ادعائیت کی ایک صورت ہے اور اسی باعث عقل کے تصور میں بھی مبالغہ آمیزی کا گراف اوپر کی جانب ہی بڑھتا نظر آتا ہے اور اس مبالغہ آمیز فکری رویوں کے ڈانڈے بھی مغرب کی اس فکر سے جا ملتے ہیں جس میں "نطق مرکزی[1] تجریدی فکری صورتحال" کا عنصر زیادہ شدید ہے۔ چنانچہ مذکورہ بالا بیان سے یہ بات واضح ہوتی نظر آتی ہے کہ موضوع مرکزی تنقیدی فکر،[2] دراصل ایک طرح کی دیوالیہ ثقافت[3] پر انتقادِ فکر کا کھلا پیش خیمہ یا ماجرا ہے۔

اس تجربے کے بعد یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ فلسفے کے خاتمے کا اعلان عام، دراصل مابعد الطبیعیات[4] کا خاتمہ ہے جس کے باعث "ساخت شکن"[5] فلسفہ معرض وجود میں آیا ہے۔ جس پر ہم آئندہ سطور میں ساختیت[6] کے حوالے سے روشنی ڈالیں گے اور یہ دکھانے کی کوشش کریں گے کہ "ساخت"[7] سے آخر کیا مراد ہے اور اگر ساخت سے مراد کسی ایسے کل[8] شے سے ہے جو اپنے اجزائے ترکیبی کے باہم ہو جانے کی صورت میں اپنے اجزاء کے "حاصل جمع"[9] تک محدود نہیں ہوا کرتا بلکہ اس حاصل جمع سے ایک ذرہ زیادہ ہی کسی ساخت کو تشکیل دے کر پھر ایک "کل" بناتا ہے تو پھر ایک ایسی ساخت کو جو اپنے حاصل جمع میں کچھ زیادہ ہی ہوا سے بے ساخت یا منتشر کیے جانے کی ضرورت کیوں پیش آئی اور پھر اب اگر ساخت شکن فکر اپنا کوئی مثبت نتیجہ برآمد کر رہی ہے تو وہ کیا ہے۔

جن لوگوں کی تاریخ پر گہری نظر ہے وہ یہ بات اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ فکر انسانی سے متعلق شخصیات ہوں یا پھر فکری تحریکیں ہوں، دونوں ہی صورتوں کی قدر و منزلت یا پھر ان کی واقعی اہمیت کا کوئی قطعی یا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنا اتنا آسان کام نہیں خصوصاً اندازہ کیے جانے کا یہ کام اس وقت تو اور بھی دشوار گزار عمل پڑتا ہے جب کم و بیش شخصیتوں اور تحریکوں کا تعلق آج کی اس دنیا سے ہو جس میں حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ نظریات میں بھی بڑی تیزی کے ساتھ تبدیلی کا عمل ہو رہا ہے اور پوری ترقی یافتہ دنیا میں یہ عمل کم از کم یورپ کے حوالے سے فرانس میں تو بہت تیزی کے ساتھ ہوتا نظر آتا ہے اور فرانس میں تو یہ عمل کچھ اس قدر تیزی کے ساتھ ہوا ہے کہ کل تک اگر کوئی فلسفی اپنی فکر کے بام عروج پر تھا تو آج وہ لوگوں کے ذہن سے بالکل محو ہو چکا ہے اور اس کی جگہ کوئی نیا فلسفی اپنی فکر کی جوت تیزی کے ساتھ جگاتا نظر آتا ہے اور پھر جونہی اس فلسفی کے بعد کی نئی نسل فکر کی کوئی

۱ے LOGOCENTRISM

۲ے CRITIQUE OF SUBJECT CENTERED REASON

۳ے CRITIQUE OF BANKRUPT CULTURE

۴ے THE END OF MEATA-PHYSICS

۵ے DE-CONSTRUCTION

۶ے STRUCTURALISM

۷ے STRUCTURE

۸ے WHOLE

۹ے SUM-TOTAL

از سر نو تاریخ مرتب کرنے بیٹھتی ہے تو اُس وقت یہ نسل اس فلسفی کو بھی فکری اعتبار سے بے جان اور مردہ قرار دے دیتی ہے اور اسے صاف نظر انداز کر جاتی ہے اور اگر کسی عنوان سے اس کا تذکرہ ہوتا بھی ہے تو اس تذکرے کی نوعیت محض حاشیے پر لکھی گئی اُس ضمنی عبارت کی رہ جاتی ہے جس کی اساس فرسودہ یا کہنہ آرا، یا تجربوں پر رکھی گئی ہو۔

مگر اب فرانس میں فلسفے کی حالیہ تاریخ نویسی کا عمل اپنے وسیع تر تناظر میں کچھ اور انداز میں ہو رہا ہے۔ جس کا تذکرہ کچھ یوں ہے:۔ "بعد از جدیدیت"[1] کا فلسفہ بنیادی طور پر سارتر، ڈیکارٹ اور جرمنی کے ان مفکرین کے خلاف جو فکری اعتبار سے ان کے ہم بین ہیں، ایک شدید ردعمل کی فکری صورت حال ہے اور فرانس میں اس فکری ردعمل کا آغاز کسی فلسفی کی فکر سے نہیں ہوا ہے بلکہ یہ ابتداء تو ایک معروف ماہر بشریات لیوی اسٹراس[2] کی جانب سے ہوئی ہے، جس نے سارتر کی فکر کے جواب میں قلم اٹھایا اور اپنی فکر کے گل بوٹے کھلائے۔ آیئے اب یہ دیکھتے ہیں کہ لیوی اسٹراس کا نظام افکار کیا ہے۔

لیوی اسٹراس کا نظام فکر ان معنوں میں ایک منفرد نظام تصورات ہے کہ یہ نہایت موزوں اور خوبصورت انداز میں ایسے تمام نظریات کا پول کھول کے رکھ دیتا ہے۔ جن میں انسان کی "بنیادی فطرت"[3] جیسے اہم موضوع کو زیر بحث لایا تو گیا ہے تاہم ان نظریات کو بغور دیکھتے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان نظریات کو تشکیل دیتے وقت فکری سنجیدگی سے قطع نظر، فکری تن آسانیوں سے کام لیا گیا ہے۔ چنانچہ تن آسانیوں[4] کی فکر پر مبنی ان نظریات میں خود وجودی نقطۂ نظر بھی شامل ہے جو یہ دعویٰ کرتا رہا ہے کہ انسان کی اپنی کوئی "بنیادی فطرت" وقت پیدائش ہوتی ہی نہیں، بلکہ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے" انسانی فرد[5] "اپنی فطرت خود بناتا ہے اور وہ "بن جاتا ہے" کہ جو وہ "بن جانا چاہتا" ہے۔ چنانچہ لیوی اسٹراس سارتر کی اُس فکر کو متہم کرتا ہے، جس کے تحت یہ کوشش کی گئی ہے کہ اُس شعور کو اُجاگر کیا جائے جس پر پیرس کی مخصوص مہذب و شائستہ فکر کی چھاپ لگی ہوئی ہے مگر اس شائستہ فکر کا انطباق بعینہٖ پوری کی پوری انسانیت پر کیا جانا، سارتر کا اصل مقصود رہا ہے اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس فکر کے تحت غلطی سے یہ مفروضہ بھی قائم کر لیا گیا ہے کہ بورژوا طبقے کی آزادی اپنی نوعیت میں ہمہ گیر یا کائناتی ہے لہذا اس فکری صورت حال سے انکار کر دیا جائے۔ اور سارتر کا یہ انکار[6]، دراصل تاریخ پر موزوں گہری نگاہ ڈالے بغیر، اور تفصیلی تحقیقی عمل کے فقدان کے علاوہ، انسانی ذہن کی مکمل کائناتی یا ہمہ گیر ساخت و ترکیب کے سیر حاصل مطالعہ کے بغیر، نتیجے کے طور پر بس یونہی وارد ہوا ہے

---

[1] POST-MODERNISM

[2] CLAUDE LIVI-STRAUSS (B. 1908)

[3] HUMAN NATURE

[4] ARM CHAIR THEORY OF HUMAN NATURE

[5] HUMAN INDIVIDUAL

[6] REFUSAL

غرضیکہ لیوی اسٹراس[1] نے کارتیزی فکر (ڈیکارٹ کا تصورِ ذات) کے موضوعی تصوّرِ ذات[2] کو قطعی طور پر مسترد کر دیا اور اس تصور کی جگہ کلی یا ہمہ گیر ساختوں پر مبنی ایک بالکل ہی نیا تصور یا نظریہ پیش کیا جس میں فکری بوالہوسی اور نحوست کا واضح مظاہرہ کیا گیا ہے۔ اور وہ اس طرح سے کہ اس نئے تصورِ انسان میں "ذات کی مرکزیت" (جیسے کہ کانٹ کے یہاں "ذات" یا "ارادے" کا تصور دیا گیا ہے۔ . . . یعنی یہ کہ انسانی فرد بجائے خود خودنگری[3] یا خود کو ہدایت دینے پر قدرت رکھتا ہے اور اسی باعث وہ فرشتوں پر فضیلت رکھتا ہے کیونکہ انسان کے اندر خود ہی ایک "اخلاقی ارادہ[4]" سرایت کئے ہوئے ہے جس سے وہ ہدایت پاتا رہتا ہے اور فرشتوں میں "ہدایت یافتگی" کی یہ صفت موجود ہی نہیں، اسی سے انسان فرشتوں سے افضل ہستی قرار پاتا ہے) کو ختم کر کے اُس زبان کو مرکزیت دی گئی ہے جو وہ بول رہا ہوتا ہے۔ یعنی بہ الفاظ دیگر اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ "انسانی قلب[5]" کو "انسانی دماغ[6]" کے تابع کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ "انسانی قلب" کو "انسانی دماغ" کے تابع کر دیئے جانے کی اس کوشش کو لیوی اسٹراس کی فکر کے حوالے سے "نظریہ ساختیت[7]" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہی وہ نظریہ ہے جسے آج کی جدید فکر میں ایک اہم فکری محیط کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ چنانچہ جہاں ایک طرف لیوی اسٹراس کے اس نظریے کے تحت وہ ایک فکری صورتحال جو ڈیکارٹ[8] اور روسو[9] کے عہد سے یورپی فلسفے کی دنیا میں غالب چلی آ رہی تھی اور جس کے تحت انسانی فکر کی اساس میں ریاکارانہ[10] فکری رُجحانات کے باعث ماورائی ادعائی حقیقت کی ایک ایسی دنیا تشکیل پاتی جا رہی تھی جو حقیقت سے بہت بعید مصنوعی نمودِ فکر کی غماز اور شارح نظر آتی تھی، وہ مسترد ہو کے رہ گئی۔ وہیں دوسری طرف اُس کی انقلابی فکر کے تحت انسانی فکر کے لئے سائنسی بنیادوں پر ایک بالکل ہی "نئی اساس" کی نمود عمل میں آئی اور یہ انقلابی فکری تحریک لیوی اسٹراس کا "نظریۂ ساختیت[11]" ہے۔ جس کی ابتداء کا سہرا دراصل ساسر نامی ایک ماہر لسانیات[12] کے ان لکچروں کے سر جاتا ہے جو اُس نے ۱۹۰۷ء سے لے کر ۱۹۱۱ء کے دورانیہ میں جنیوا[13] یونیورسٹی میں دیئے

---

[1] LEVI-STRAUSS

[2] CARTESIAN SUBJECT-SELF

[3] SELF-DIRECTIVE EXISTENCE OR BEING

[4] ETHICAL WILL

[5] HUMAN HEART OR SELF

[6] HUMAN BRAIN

[7] THEORY OF STRUCTURALISM

[8] DESCARTES

[9] ROUSSEAU

[10] TRANSCENDENTAL PRETENCE

[11] STRUCTURALISM

[12] LINGUSTICS

[13] GENEVA

تھے۔ زبان یا لسانیات کا یہ نظریہ جس کی ابتداء ساسئر[1] سے ہوئی اور لیوی اسٹراس کے "ساختیت" کے نظریے تک پہنچتے پہنچتے اس میں مزید استحکام اور فروغ کی صورتیں پیدا ہوئیں، اس نظریے کے تحت یہ باور کیا جاتا ہے کہ زبان کے مطالعاتی جائزے کے دوران "یک وقتی[2]" اور "کئی وقتی[3] (تاریخی) نقطہ ہائے نظر میں واضح امتیاز کو ملحوظ نظر رکھنا چاہیئے، یعنی بہ الفاظ دیگر ساسئر نے یہ استدلال کیا کہ مخصوص اور منفرد زبانوں کی ہمہ وقتی توضیح و تفصیل کے عمل کو یکساں طور پر سائنسی بنیادوں پر بروئے کار لانا چاہیئے اور ایسا اس لئے بھی ہونا چاہیئے کہ زبانوں کے درمیان یہ تفصیلی جائزہ ان کے تشریحی مقاصد کو پورا کر سکے، کیونکہ زبان اپنے تشریحی عمل میں علّتی ترکیب تسلسل[4] کے باعث، ساختیتی[5] ترکیب کی حامل اس لئے ہوتی ہے کہ اس تشریحی عمل میں زبان کی "یک وقتی" یا "کئی وقتی" (تاریخی) ہر دو صورتوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ یعنی اس عمل کے دوران کسی سوال کا کوئی سا بھی مختلف جواب ہمیں مل سکتا ہے۔ مثلاً ذرا اسی سوال کو لے لیجئے ـــــ کہ "اشیاء جیسی کہ وہ ہیں آخر وہ ایسی کیوں ہیں؟" اب اس سوال کا جواب اگر دینا مقصود ہو تو یہ جواب کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اب بجائے اس کے کہ مخصوص صورتوں اور ان صورتوں سے وابستہ مفاہیم[6] کے تدریجی ارتقاء کے مختلف مراحل کو اس کے تاریخی تناظر میں دیکھا جائے اور پھر ان صورتوں کے معنوں کا تعین کیا جائے، قطع نظر اس کے یہ نظریہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ تمام صورتوں اور ان سے وابستہ مفاہیم کا کسی مخصوص لسانی نظام کے فریم کے اندر رہتے ہوئے کسی مخصوص لمحۂ زمان میں باہم ایک دوسرے کے ساتھ مربوط اور وابستہ ہو جانا کس طرح ممکن ہو جاتا ہے۔ گویا لیوی اسٹراس کے اس نظریے کا اصل مقصد ہی صرف یہ تھا کہ انسانی فکری صورت حال کے اس قدیم بت کو یکسر منہدم کر دیا جائے جس کے تحت "ذات[8]" اور "موضوعیت[9]" کے تصور کی بالادستی مسلّم اور محکم ہوا کرتی تھی اور اس کی جگہ "ہمہ گیریت" یا "کلیت[10]" اور معروضیت[11] کی فکری صورت حال کو نہ صرف یہ کہ قیام حاصل ہو بلکہ اس فکر کو مستحکم تر کیا جائے۔ اس نظریئے کے اجراء کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ گزشتہ تین سو سال سے انسان کی قوت مندی یا طاقتوری سے متعلق اس شاؤنی لہجہ[12] یا گفتگو کو نہ صرف یہ کہ ختم ہو جانا چاہیئے بلکہ کم و بیش اسی انداز نظر یا

---

۱ SAUSSURE

۲ SYNCHRONIC

۳ DIACHRONIC

۴ CAUSAL SYNTHETICAL CONTINUITY

۵ STRUCTURAL BASE

۶

۷ MEANINGS ۸ SELF

۹ SUBJECTIVITY

۱۰ UNIVERSALITY

۱۱ OBJECTIVITY

۱۲ CHAUVINIST TALK

اس لہجے کے باعث انسانی معاشرے میں جو ثقافتی اختلافات بڑی تیزی کے ساتھ از سرِ نو آموجود ہوئے تھے۔ ان کی مکمل پرکھ کر کے ان کی ٹھیک ٹھیک نشاندہی کر دینا چاہئیے۔

غرضیکہ لیوی اسٹراس کی فکر پر مذکورہ بالا گفتگو کے بعد اب ہم اپنی گفتگو کے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ ہم بعد از جدیدیت[1] کی فکری نہج پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالیں گے۔ "بعد از جدیدیت" کی فکر سے ہماری مراد سارتر کی وجودی فکر کے خلاف وہ فکری ردِ عمل ہے جو فرانس میں نمو پذیر ہوا۔ تاہم صحیح معنوں میں بعد از جدیدیت کی فکر کا آغاز فکری انقلاب کا وہ دوسرا مرحلہ ہے، جسے لیوی اسٹراس کی فکر یا پھر یوں کہئیے کہ "ساختیت" کے خلاف ایک فکری بغاوت کا نام دینا زیادہ مناسب ہوگا۔ گویا ہم اس دوسرے فکری ردِ عمل کو جو ساختیت کے خلاف ایک بغاوت کا درجہ رکھتا ہے ایک اور نام سے بھی موسوم کر سکتے ہیں اور وہ معروف نام ہے۔ "بعد از ساختیت[2]" کا فکری دھارا ـــــ اور اس فکری دھارے کے دو نمائندہ فلسفیوں میں سے قابلِ ذکر نام مائکل[3] فوکو اور ژاک[4] ڈریڈا کے ہیں۔ جن کی فکر کا جائزہ ہم آگے چل کر فرداً فرداً لیں گے۔ ان کے تذکرے سے پہلے ہم ان کے دَور کے فکری تناظر پر مختصراً روشنی ڈالیں گے۔

اگر ہم ان دونوں مذکورہ فلاسفر کے عہد کے فلسفیانہ پس منظر پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں یہ نظر آئے گا کہ فوکو ہی وہ حقیقی مورّخ اور فلسفی ہے جس نے سب سے پہلے "ساختیت" کے نام کو قطعی طور پر فکری دنیا سے خارج کیا اور پھر دوسرے حملے میں اُس نے فلسفے کو نہ صرف یہ کہ ہدف تنقید بنایا بلکہ اسے بھی ختم کئے جانے کی بھرپور کوششیں کیں اور ان کی جگہ اُس نے اپنی جو فکر دنیا کے سامنے پیش کی۔ اس کی اس فکر میں اصرار اس بات پر کیا گیا کہ تاریخ کے عمل میں "تسلسل[5] یا تواتر" کے بجائے، انقطاعِ تسلسل[6] کا ماجرا قدم قدم پر اس عمل کو تقسیم کرتا رہتا ہے۔ گویا بہ الفاظ دیگر تاریخ نام ہے ٹوٹ ٹوٹ کے از سرِ نو سلسلوں کے جُڑتے رہنے کا اور یہ کہ حصولِ علم کے میدان میں "قوت یا طاقت" کا کردار ہی مرکزی حیثیت کا حامل ہے۔

اُدھر دوسرا بڑا فلسفی ژاک ڈریڈا ہے جو ہسرل[7] اور ہائیڈیگر[8] کا شاگرد ہے۔ تاہم وہ ہائیڈیگر کی فکر سے زیادہ متاثر ہے اور اس کے برعکس ہسرل کی فکر میں موجود جھول یا مغالطوں پر اس کی نگاہ بڑی گہری ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں ہے

---

[1] POST-MODERNISM

[2] POST-STRUCTURALISM

[3] MICHEL FOUCAULT

[4] JACQUES DERRIDA

[5] CONTINUITY

[6] DIS-CONTINUITY

[7] HUSSERL

[8] HEIDEGGER

ہوسرل کی فکری خامیوں پر ہی اُس کی نظر ہے بلکہ وہ تو مابعد الطبیعیاتی[۱] فکر کی اُس پوری روایت پر بھی بڑی گہری نظر رکھتا ہے جس کا سلسلہ ماضی میں نہ صرف یہ کہ روسو[۲] اور ڈیکارٹ[۳] کی فکر سے جا ملتا ہے بلکہ یہ سلسلہ تو جدید قدیم یونانی فکر تک جا پہنچتا ہے۔ چنانچہ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ روسو ہمیشہ سے ہی ایک اہم مفکر قرار دیا جاتا رہا ہے لہذا "بعد از جدیدیت[۴]" کے فکری دور میں بھی اُس نے اپنی فکر کے گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ ہر چند کہ اُس کی فکر کے یہ اثرات اپنی نوعیت میں ابہام کے حامل ضرور ہیں، تاہم ان اثرات کی اہمیت سے انکار کیا جانا ہرگز ممکن نہیں۔ اور وہ اس اعتبار سے کہ وہ لیوی اسٹراس ہو کہ ژاک ڈریڈا ان دونوں ہی فلاسفر نے روسو کی فکر کو از سرِ نو سمجھنے اور سمجھانے کی تشریحی کوششیں کی ہیں اور یہ دونوں فلسفی بہرحال اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ روسو ایک انتہائی اہم فکر کا حامل فلسفی ہے اور وہ اس وجہ سے اہم ہے کہ جہاں روسو کی فکر کے باعث جدید فلسفے کے لئے راہیں استوار ہوئیں تھیں، تو دوسری طرف ٹھیک اُسی دن روسو کی اس فکر نے جدید فلسفے کی تباہی و بربادی کے لئے پہلا بیج بھی کشتِ فکرِ انسانی میں وہیں کہیں خاموشی کے ساتھ رکھ دیا تھا۔

فلسفے کی دنیا میں "بعد از جدیدیت" کے عہد کی فکری تحریک کا پورا عمل، صرف یہی نہیں کہ ماقبل ادوار کے ریاکارانہ[۵] فکری طرزِ عمل کی مستقل اور مسلسل ادعائی قوتوں کے خلاف، کہ جو برسوں سے جاری و ساری چلی آ رہی تھیں، ایک کھلی بغاوت یا ایک واضح فکری ردِ عمل کی حیثیت رکھتا ہے، بلکہ یہی فکری ردِ عمل جدیدیت کے دور کی فکری حدود[۶] اور تعینات کے علاوہ اس عہد کے پیش از قیاسی[۷] مفروضات پر بھی ایک کھلی بغاوت کا درجہ رکھتا ہے —— اور جدیدیت کے دور کے وہ فکری تعینات اگر انہیں واضح اور خصوصی طور پر بہ حیثیت موضوعات کے دیکھا جانا مقصود ہو تو وہ موضوعات یہ ہیں کہ "ذات[۸]" کے وسیع تر مفہوم پر مستقل اصرار کی فکری صورتحال اور ہمارے اپنے علم کے سلسلے میں اعتبار و اعتماد کا پورا ماجرا۔ دراصل ہماری اپنی ذات ہی سے وابستہ ایک ناگزیر لزومِ فکری ہے اور علاوہ ازیں ہمارا ضرورت سے بڑھا ہوا قبل از تجربی[۹] ایک ایسا ایقان ہے کہ ہم سب انسان خواہ وہ کہیں اور کسی علاقے میں کیوں نہ رہتے بستے ہوں، دراصل اپنے آخری تجزیے میں "ایک جیسے ہی ہیں"۔ چنانچہ خود لیوی اسٹراس کی مثال ہی کو پیشِ نظر رکھئے تو ہمیں یہ واضح طور

---

۱ METAPHYSICAL TRADITION

۲ ROUSSEAU

۳ DESCARTES

۴ POST-MODERNISM

۵ TRANSCENDENTAL-PRETENTIOUS

۶ PREMISSES

۷ PRE-SUPPOSITIONS

۸ SELF

۹ A PRIORI ASSURANCE

پر نظر آئے گا کہ جس وقت وہ "ذات" اور "موضوع" یا "موضوعیت" کے مروجہ تصورات کو اپنی شدید تنقید کا نشانہ بنا رہا تھا، وہ اپنے اس انحراف و استرداد کے ذریعہ ہی جو اس نے جدید فکری رویوں پر کیا۔ سچ پوچھیے تو وہ اس وقت فکری اعتبار سے ایک جدیدیت پسند فلسفی ہی تھا۔ اب اگر ادھر ڈیوڈ ہیوم سے لے کر سارتر تک کے اس فکری دور پر ایک نگاہ ڈالی جائے تو وہاں بھی ہمیں جدیدیت پسند مفکرین میں سے کچھ نہ کچھ فلسفی ایسے ضرور مل جاتے ہیں جنہوں نے "ذات" اور "موضوع" کے تصورات کو علیحدہ علیحدہ خانوں میں رکھ کر انہیں ایک دوسرے سے ممیز کیا۔ اور یہ کہ "شیئے بذاتہٖ" کا تصور اس دور کی فکر میں بہ حیثیت ایک موضوعِ فکر کے کچھ بہت زیادہ دنوں تک فلسفیوں کے زیرِ بحث نہیں تھا۔ مگر ہاں اس کے برعکس "ذات" کا تصور پھر بھی فلسفیوں کے لئے ایک زیرِ بحث مسئلہ ضرور تھا کیونکہ اس زمانے کی فکر میں ایسی مثالیں ملتی ہیں جہاں "ذات" کے مسئلے کی یا تو نفی کی جاتی رہی ہے یا پھر کم از کم اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی کوششوں کا ایک تسلسل سا ضرور ملتا ہے، صرف اتنا ہی نہیں ہوا بلکہ "ذات" کا یہی مسئلہ "کائناتی تطبیقات و تناسبات" کے حوالہ جاتی فریم میں بھی دور تک پھیلا نظر آتا ہے، یا پھر "ذات" کا یہ تصور "کائناتی ارادے" میں تحلیل و ضم ہوتا نظر آتا ہے اور پھر اس طرح "شخصِ واحد" کے تفکر و تخیل پر اصرار کی فکری صورتِ حال اس دور کی فکر میں یا تو موجود رہی، یا پھر اس "موضوعیت" سے فرار کی کوئی صورت اس دور میں نظر نہیں آتی۔ یہاں تک کہ اگر ہم خود ہائیڈیگر کی فکر پر غور کریں تو وہاں بھی ہمیں اس کے دازآئین کے تصور یا ہستی وہاں موجود کے تصور میں بھی، اس سے کچھ زیادہ مختلف فکری صورتِ حال نظر نہیں آتی۔ اور وہ بھی اس حقیقت کے باوجود کہ ہائیڈیگر کی تو پوری کوشش ہی یہی تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح "موضوع یا موضوعیت" سے متعلق تمام کی تمام لفظیات کے سلسلے کو یکسر ختم کر دے۔ مگر وہ اپنی اس فکری مساعی میں کچھ بہت زیادہ کامیاب ہوتا نظر نہیں آتا، کیونکہ ایسا کرنے کے لئے بھی اُسے بہرحال مظہریاتی فکر کا ہی سہارا لینا پڑا کہ جو بجائے خود موضوعی فکر کی ہی ایک تبدیل شدہ صورت ہے اور یوں ہائیڈیگر کی فکر میں بھی "شخصِ واحد" کا تصور بہرحال کچھ اس انداز سے باقی ہی رہتا ہے کہ اس موضوعیت سے بالکل قطع نظر کر لینا اس کے بس کی بات معلوم نہیں دیتی۔ یعنی یہ کہ "شخصِ واحد" کا تصور اس کے یہاں بھی کسی نہ کسی حیلے بہانے سے اس کی فکر کا ایک جزوِ لاینفک ہی بنا رہا ہے۔

---

۱ SUBJECT

۲ SUBJECTIVITY

۳ SELF

۴ SUBJECT

۵ IT-SELF OR THING-IN-ITSELF

۶ COSMIC PROPORTIONS

۷ COSMIC WILL

۸ DASEIN OR BEING-THERE

۹ FIRST-PERSON FRAMEWORK

غرضیکہ اس پوری فکری صورت حال کے پس منظر میں وہ پہلا فلسفی جس نے "ذات" کے تصور کے ایک ایسے فکری تسلسل کو جو جدید دور کی فکر میں بھی بے چون وچرا قبولیت عام پاتا رہا تھا۔ اُس تصور کے اُس پورے ڈھانچے کو جس کی اساس ہی "شخص واحد" کے تصور پر تھی، بالآخر مسترد کر دیا اور گویا اس طرح سے نہ صرف یہ کہ ذات کا خاتمہ اپنے انجام کو پہنچا بلکہ "شخص واحد" کے تصور کی پوری تخیلی عمارت بھی منہدم ہو کے رہ گئی۔ لیوی اسٹراس نے ڈیکارٹ کے اس مشہور زمانہ مقولے کو کہ "اندیشم پس ہستم" یعنی یہ کہ "میں سوچتا ہوں اس لئے ہوں"[1] کو یکسر مسترد کر دیا اور اس کے علاوہ اس نے روسو کے اس رومانوی نقطۂ نظر کو بھی مسترد کیا جس کے تحت یہ خیال کیا جاتا تھا کہ انسان اپنی ابتداء میں بالکل آزاد تھا اور نہایت شریفانہ زندگی گزار رہا تھا مگر جوں جوں وہ تہذیب کے پھندوں میں جکڑتا چلا گیا اس سے اس کی فطری آزادی چھن گئی اور وہ تعصبات کا شکار ہو کر مصنوعی احتیاجات کا پابند ہو کر رہ گیا۔ چنانچہ لیوی اسٹراس نے روسو کے اس رومانوی خیال کو ذہنی عیاشی کا نام دے کر مسترد کر دیا۔ لیوی اسٹراس اس نقطۂ نظر سے بھی اتفاق کرتا ہے کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمیں اپنے ثقافتی و تمدنی، نیز تخیلی سیاق و سباق سے کبھی کوئی مفر نہیں ہوا کرتا۔ مگر وہ اپنے اس اتفاق رائے کے باوجود اس بات پر بھی یقین رکھتا ہے کہ اگر ہمیں اپنی ذات کی سچائیوں[2] کا سراغ لگانا مقصود ہو تو پھر ہماری یہ سچائیاں ہمارے شعور کے بطن بطون میں کہیں جاگزیں نہیں ملیں گی بلکہ ہمیں ان سچائیوں کی تلاش اگر کرنا ہے تو پھر انہیں ہماری اسی دنیا میں تلاش کرنا ہوگا جس میں ہم زندگی کے عمل سے گزر رہے ہوتے ہیں، اور ہم زندگی کے اس عمل کے دوران جن تاثرات، جن تخلیقات اور جس طرح کے بھی تخلیقی پیداواری ہنر و فن کو جنم دے رہے ہوتے ہیں، یعنی جس میں ہمارا ادب، ہماری داستانیں[4] اور اساطیر[5]، اس کے علاوہ ہماری زبانیں[6]، ہمارے مختلف النوع ثقافتی ورثے[7] وغیرہ اور نہ جانے "کیا کیا کچھ"، شامل ہوا کرتا ہے۔ زندگی پر محیط یہ ساری صورتِ احوال الغرض ہماری اپنی سچائیوں کی حقیقی امانت دار ہیں، مگر ہماری اپنی ذات کی سچائیوں کا یہ حصول صرف اُسی وقت ممکن ہے جب ہم مختلف ثقافتوں اور تمدنوں کے تال میل[8] کا تقابلی مطالعہ بہ نظر غائر کریں تب کہیں ہم "انسانی دماغ" کی کل ساختوں کی محض ایک جھلک ہی دیکھ لینے پر قادر ہو سکیں گے۔

لیوی اسٹراس کا کہنا ہے کہ ہم انسان اپنی پیدائش کے اولین لمحے میں شعور سے عاری محض ایک زندہ وجود سے زیادہ کچھ اور نہیں ہوتے بلکہ اس کے برعکس ہم انسان صرف اور صرف ایک معاشرتی مخلوق[9]، اپنے اپنے تناسلی تسلسل کی محض ایک پیداوار،

---

[1] I THINK, THEREFORE, "I AM"

[2] TRUTHS OF OURSELVES

[3] EXPRESSION AND CREATIONS

[4] STORIES

[5] MYTHS

[6] LANGUAGES

[7] CULTURAL HERITAGE

[8] CROSS-CULTURES

[9] SOCIAL CREATURE

[10] GENETICS

زبان اور ثقافتی رشتوں[1] میں گندھے ہوئے تربیت یافتہ ایک پیکر وجود ہوا کرتے ہیں۔ لہٰذا موضوع، معروض[2] کی امتیازی صورت حال جس کی حیثیت فلسفے کی دنیا میں ایک مسئلے یا ایک مقدمے کی ہوتی ہے، یہ فکری صورت حال بجائے خود ایک ایسی فکر کا درجہ رکھتی ہے جو علم بشریات[3] کی سطح پر ایک تحقیق و جستجو کے عمل کی متقاضی صورت حال ہے اور لیوی اسٹراس اس فکری صورت حال سے کوئی نتیجہ یا حل اس طرح برآمد نہیں کرتا کہ وہ اس فکر کی کوئی از سر نو تعریف کر دیتا بلکہ اُس نے اس سے یکسر چشم پوشی اختیار کرتے ہوئے اس کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ لہٰذا اس بیان کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ساختیت کا وہ نظریہ جو لیوی اسٹراس اور سارتر نے وضع کیا ہے وہ ایک سائنسی فکری صورت حال ہے اور ڈیکارٹ و کانٹ کی پیش کردہ مظہریاتی[4] فکر کا کوئی دوسرا متن یا اس کا کوئی دوسرا رُخ نہیں ہے۔ ساختیت[5] کا نظریہ اس بات پر بھی کوئی ایسا اصرار نہیں کرتا جیسا کہ ڈلتھے[6] اور علم تفسیر[7] کے فن سے متعلق ماہر علماء نے اپنے اپنے افکار کے حوالوں میں، معاشرتی علوم اور فطری علوم کے درمیان طریقۂ کار کے ضمن میں اکثر ایک واضح امتیاز کی جانب نشاندہی کی ہے۔ البتہ اس میں کوئی کلام نہیں کہ یہ نظریہ نہ صرف یہ کہ موضوع کی تحقیق کے دوران اس کی اہمیت کو قطعاً مسترد کرتا ہے بلکہ یہ نظریہ معنی و مفہوم کی اہمیت کو بھی قطعاً نظرانداز کرتا ہے۔ ساختیت ایک ایسا نظریہ ہے جو انسانی تفاعل یا انسانی سرگرمیوں کی تمام تر صورتوں کے معروضی قوانین کے لئے سائنسی تحقیق کا اہم فریضہ انجام دیتا ہے، اور وہ اپنے اس کام (تحقیقی عمل) کا آغاز اس طرح کرتا ہے کہ یہ سب سے پہلے انسانی تفاعل کے بنیادی عناصر (افعال و الفاظ[8]) اور پھر ان عناصر سے متعلق ان تمام تر صورتوں کی تفصیلی درجہ بندی کرتا ہے، جن کے تحت یہ عناصر ایک دوسرے کے ساتھ باہم منضبط و مربوط ہوا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر لیوی اسٹراس تین مختلف تصورات کے درمیان موجود باہمی تفاعل کی منضبط صورت حال کی نہ صرف یہ کہ تحقیق کرتا ہے بلکہ مختلف مخصوص معاشرتی سطحوں پر ان کی واقعی ساختوں سے بھی بحث کرتا ہے اور وہ تین مختلف تصورات یہ تین مختلف الفاظ ہیں۔ یعنی۔ خام[9] یا کچا، پختہ[10] یا پکا ہوا، بوسیدہ[11] تعفن زدہ یا سڑا گلا ہوا وغیرہ۔ اور پھر کہیں کہیں لیوی اسٹراس اوڈیپس[12] کی اسطورہ پر بھی

---

[1] CULTURE-BOUND EDUCATION

[2] SUBJECT-OBJECT DISTINCTION

[3] ANTHROPOLOGY

[4] PHENOMENOLOGY

[5] STRUCTURALISM

[6] DILTHEY

[7] HERMENEUTICS

[8] ACTION AND WORDS

[9] RAW [10] COOKED

[11] ROTTEN

[12] OEDIPUS MYTH یونانی دیومالا کا ایک اہم کردار جسے بڑی وقعتی کے ساتھ مار ڈالنے کا حکم ملا تھا اور جس کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ کسی اور ملک کے گھر میں پلا بڑھا اور پھر جب وہ بڑا ہوا تو روایت کے مطابق اس نے دیوتاؤں کی اس بدعا کو پورا کیا کہ وہ اپنے باپ کو قتل کرے گا۔ (مترجم)

پوری آزادی کے ساتھ کھل کر بحث کرتا نظر آتا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ وہ اس دیو مالائی داستان کی غیر متغیر ساختوں پر بھی مختلف معاشروں کے "طیفِ نوری[1]" حوالوں کے پس منظر میں تفصیل بحث کرتا نظر آتا ہے۔ چنانچہ یہاں اگرچہ ہمارا اصل مقصود انسانی تفاعل کی ساخت کو متعین کرنے والے اُن اصولوں اور تصورات کو واضح کرنا ہے اور اس بات کی یہاں کوئی گنجائش نہیں کہ ہم یہ بھی بتائیں کہ اس تفاعل کی ماورائی ساخت کا مسئلہ کیا رہا ہے، تاہم اس ضمن میں ہم یہاں اتنا ضرور کہیں گے کہ لیوی اسٹراس نے تصورات کی بعینہٖ ماورائی صورت حال کو تو ضرور مسترد کیا ہے، مگر اس کے ساتھ ہی اُس نے یہ ضرور کیا ہے کہ کلی علم کے حصول کے سلسلے میں دنیائے فکر کو ایک بالکل ہی نیا اور جدید نوعیت کا اعتماد فراہم کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے انسانی فطرت سے متعلق علم کی بعینہٖ صورت حال کو بھی اسی جدید اعتماد کی کسوٹی پر رکھ کر جانچا جانا چاہیئے۔ ساختیت کے نظریے کے تحت جن ساختوں کو دریافت کیا گیا ہے وہ ساختیں شعور کے قبل از تجربی قوانین کے تحت ظہور کرنے والی نمود کی صورتیں ہرگز نہیں، بلکہ یہ ساختیں تو ہمیں انسانی دماغ کی کل ساخت سے متعلق معتبر شہادت ضرور فراہم کرتی ہیں۔

ساختیت[2] کے مرکزی تصورات میں سے ایک بنیادی تصور "اختلاف[3]" کا تصور ہے۔ جو الفاظ و محاورات کی اضافیت[4] کے اظہار کے لئے ایک قریب ترین راہ کھولتا ہے۔ یعنی ایک دوسرے کے مدمقابل الفاظ (اضداد[5]) کے معنوں کی شناخت کا پورا دارومدار ان کے دُو بدو آنے کے بعد، ظاہر ہونے والے فرق یا اختلاف پر ہوا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم یہاں انگریزی زبان کے تین الفاظ "MERRY" "MARY" "MARRY" پیش کرتے ہیں۔ ان تینوں الفاظ میں حرفِ علت[6] (VOWEL SOUNDS) یعنی "a" کی آوازیں موجود ہیں۔ اب حرفِ علت "a" کی آواز کا اس فرق کا اندازہ کہ جو مذکورہ الفاظ میں موجود ہے، ہمیں اُسی وقت ہو سکتا ہے۔ جب ان الفاظ کو بولنے والا شخص ان الفاظ کو ادا کرتے ہوئے، ان کے تلفظ[7] کے ہلکے سے فرق کو ملحوظِ طرزِ ادا رکھے۔ گویا اس بیان سے معلوم یہ ہوا کہ ہماری زبان کی صوتیات (علم صوتیات[8]) میں حرفِ علت "a" کی آواز کی کوئی متعین شکل بجائے خود موجود نہیں، بلکہ آوازوں کے اس تعین کا انحصار علم صوتیات کے مطابق بعض دوسرے حروفِ علت کے مناسبت یا ان کے مدمقابل مستعمل ہونے پر ہے۔ یعنی حروفِ علت کی آوازوں[9] کا فرق ان کے محل استعمال سے مشروط ہے اور یہ کہ ان کی شناخت (آوازوں کی شناخت) کا معاملہ، کبھی کسی مطلق یا دائم متعین صوت کا متحمل

---

[1] SPECTRUM

[2] STRUCTURALISM

[3] DIFFERENCE

[4] RELATIVITY OF TERMS

[5] CONTRAST OR OPPOSITE USES

[6] (VOWEL- a)

[7] ACCENTS

[8] PHONETICS

[9] SOUNDS

نہیں ہوا کرتا۔ لہٰذا مشہور ماہرِ لسانیات سا سیور[1] ہی وہ شخص ہے جس کا یہ نظریۂ صوتیات، ساختیت کے نظریے کا بنیادی اصول ٹھہرا، ساختیت وہ نظریۂ لسان[2] ہے جو عناصر[3] کے کسی نظام میں موجود عناصر (اجزاء) کی ترتیب میں ممکنہ تبدیلیوں[4] کی صورتحال اور ان عناصر کی واقعی صف بندی[5] کے عمل کے دوران رونما ہونے والے اختلافات[6] کی ہر دو صورتوں کے درمیان موجود امتیاز کے پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔ یہاں ایک بار پھر ہم لیوی اسٹراس کے اس نقطۂ نظر کو واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ ماہرِ لسانیات جس ایک پہلو پر زیادہ زور دیتا ہے وہ یہ ہے کہ ان عناصر کے معنی[7] یا مفہوم (خواہ یہ آوازیں (اصوات[8]) ہوں یا ثقافتی تصورات[9] ہوں) بجائے خود کسی اہمیت کے حامل نہیں ہوا کرتے۔ بلکہ عناصر کے اس پورے نظام میں اگر کوئی پہلو ان کا اہم ہے اور جسے قابلِ اعتنا گردانا جا سکتا ہے وہ ان کا اس نظام کے اندر رہتے ہوئے محل استعمال[10] ہے جس کے باعث ان کی شناخت کا تعین ممکن ہو پاتا ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ عناصر کے درمیان رشتوں یا روابط کی حقیقی نشاندہی کا مجاز اگر کسی کو حاصل ہے تو وہ آدمخاص صرف اور صرف "انسانی دماغ[11]" ہے جب کہ عناصر کے مفہوم یا معنی کی صورتحال ان پر محض ایک اضافے[12] سے زیادہ کچھ اور نہیں۔ یعنی یہ اضافی صورتحال صرف ایک ناگزیر[13] موضوعیت کا ماجرا ہے۔ ایک ماہرِ لسانیات کا اصل مقصودِ نظر یہ کبھی نہیں ہوا کرتا کہ وہ ہمیں یہ بتائے کہ کسی "شئے" کا "معنی و مفہوم" کیا ہے، بلکہ اس کی ذمہ داری تو صرف یہ ہے کہ وہ ہمیں کسی نظام میں موجود عناصر کی واضح شناخت سے روشناس کرا دے۔ اس کے علاوہ اس کی دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ان عناصر کے اندر موجود ان کی متخالف صورتوں کے ساتھ ساتھ ہمیں اُن قوانین سے بھی آگاہ کرے جن کی وجہ سے یہ اختلافات عناصر کے درمیان پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً ذرا ان ہی الفاظ کو ملاحظہ کیجیے ——— "خام[14] یا کچا / پختہ یا پکا ہوا" "فطری[15] / ثقافتی"، "نر / مادہ[16]" وغیرہ۔ اب ہم ان ہی الفاظ کو جملوں میں استعمال کر کے ان کے فرق یا اختلاف کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں:۔

۱۔ شیشہ بنانے کی صنعت میں ریت کو خام مواد کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

۲۔ روٹی کچی رہ گئی ہے یا پھر کچے ذہنوں کے بچوں کے سامنے کوئی غلط حرکت کرنا اُن کو غلط راہ پر لگانے کے مترادف ہے۔

اب ان تینوں جملوں میں لفظ "خام یا کچے" کے معنوں کا اختلاف یا فرق نہایت واضح ہے۔ جملوں کے مذکورہ نظام میں

---

[1] LINGIUST DE SAUSSURE
[2] THEORY OF LANGUAGE
[3] SYSTEM OF ELEMENTS
[4] POSSIBLE PERMUTATIONS
[5] ACTUAL DEPLOYMENT
[6] DIFFERENCE
[7] MEANING
[8] SOUNDS
[9] CULTURAL CONCEPTS
[10] THEIR PLACE IN SYSTEM
[11] HUMAN BRAIN
[12] MEANING ADDED TO
[13] INEVITABLE-SUBJECTIVITY
[14] RAW / COOKED
[15] NATURAL / CULTURAL
[16] MALE / FEMALE

لفظ (عناصر) کا محل استعمال ان کے معنوں کے فرق کو صاف ظاہر کرتا نظر آرہا ہے۔ جس کی مزید وضاحت کی یہاں کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اپنے محل استعمال کے رشتوں میں گندھا ہوا یہ لفظ "خام یا کچا" اپنے معنی کے فرق کو از خود ظاہر کر رہا ہے

اسی طرح ایک اور جملہ دیکھئے ـــــ اور فرق کو خود ہی ملاحظہ کیجئے:۔

۱۔ بعض امراض مادہ[1] حیوانوں کو نر حیوانوں[2] کے مقابلے میں زیادہ ہوتے ہیں۔

۲۔ وہ شخص بڑا نر[3] (بہ معنی مردانگی) اور حوصلے کا پختہ[4] (بہ معنی مضبوط) ہے وغیرہ

مندرجہ بالا جملوں کے نظم و ترتیب کے نظام میں لفظ "خام" یا "کچے[5]" اور "نر" کے محل استعمال کے اعتبار سے ان کے معنی کے فرق کو ظاہر کیا گیا ہے۔ مگر معنوں کا یہ فرق کسی ایک ہی لفظ کو مختلف جملوں میں استعمال کر کے ظاہر کیا گیا۔ اسی طرح متخالف الفاظ مثلاً "خام یا پختہ" کے جملوں میں محل استعمال سے معنوں کے فرق کو ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً یہ جملہ دیکھیے۔

۱۔ "سنگ مرمر کو مجسمہ سازی کے لئے خام مواد کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ مگر مجسمہ کی تجسیم و تشکیل کے بعد اس مجسمہ کے فن کارانہ حسن کا انحصار، کسی فنکار کی فنکارانہ صلاحیت اور اس کے پختہ مشاہداتی عمل پر ہوا کرتا ہے"

اب اس جملے میں لفظ "خام مواد" فطری وسیلے کے طور پر استعمال ہوا ہے جب کہ پختہ مشاہداتی عمل میں لفظ "پختہ" مہارت فن و صناعی کے حوالے سے انسانی کوششوں کے مصنوعانہ کمال کو ظاہر کر رہا ہے۔ یعنی لفظ "خام" میں "فطرت[6]" اس کے معنی کا قریبی حوالہ ہے، تو لفظ "پختہ" میں "صناعت[7]" اس کے معنی کا قریبی حوالہ ہے۔ لہٰذا ان مثالوں سے ظاہر یہ ہوا کہ لفظ "خام" ہو کہ "پختہ"، دونوں لفظوں کے کسی متعین معنی کا تعین کرنا تقریباً امر محال ہے۔

غرضیکہ اب اگر ہم الفاظ اور اُن کے معنوں کے مندرجہ بالا تجزیاتی عمل سے ملنے والے نتائج کو پیش نظر رکھیں، تو پھر ایک ایسا ہی تجزیاتی عمل ہمیں مختلف معاشروں کی سطح پر، ان معاشروں کے درمیان پائے جانے والے 'اختلافات' سے بھی روشناس کرا سکتا ہے اور ہم ان اختلافات سے متعلق نہ صرف یہ کہ ایک ٹھوس تجربی علم ہی حاصل کر سکیں گے بلکہ خود انسانی فطرت سے متعلق ٹھوس نظریاتی علم بھی ہمارے ہاتھ آ سکے گا اور پھر ہم اس طرح سے خود کو "ذات، مرکزی ماورائی روایت" کے ہاتھوں آئندہ پیش آنے والی کسی بھی صورت حال یا پھر ماضی میں گزری ہوتی کسی بھی صورت حال، دونوں کے "اچھے یا برے نتائج" کے اندیشوں یا خدشوں سے صاف بچا سکیں گے۔ (مسلسل)

---

[1] FEMALE-ANIMAL

[2] MALE ANIMAL

[3] MALE

[4] COOKED

[5] RAW

[6] NATURAL OR NATURALITY

[7] ARTIFICIALITY OR ARTIFICIAL OR CULTURAL

مجلّہ فنون

آئندہ ہر سہ ماہی کے بعد شائع ہوگا

سال میں اس کے چار شماروں کی تقسیم یوں ہوگی

- پہلا شمارہ : جنوری ، فروری ، مارچ
- دوسرا : اپریل ، مئی ، جون
- تیسرا : جولائی ، اگست ، ستمبر
- چوتھا : اکتوبر ، نومبر ، دسمبر

بدل اشتراک کی صورت اس طرح مقرر ہوئی ہے

- سالانہ چندہ : ۲۰۰ روپے
- بذریعہ رجسٹری : ۲۵۰ روپے
- دوسرے ممالک : ۳۵۰ روپے
- دوسرے ممالک (ہوائی ڈاک سے) : ۵۰۰ روپے

فون نمبر: ۲۱۵۷۶۳

مینجر سہ ماہی فنون — ۳۹/۶ ملک چیمبرز، لوئر مال۔ لاہور (پاکستان)

اُردو کا پہلا افسانہ نگار ــ ایک تعارف

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

ہمارے ہاں اردو افسانے کی جڑوں کی تلاش کا عمل قدرے تاخیر سے شروع ہوا۔ محققین کو قدیم اردو شاعری کی جُوما چاٹی سے فرصت نہ ملی تو ناقدین نے یہ فریضہ سنبھالا اور اس ضمن میں پہلا قدم ہی غلط پڑا۔

۱۹۵۵ء میں پروفیسر وقار عظیم نے پریم چند کو اردو کا پہلا افسانہ نگار شمار کرتے ہوئے کہا:-

"ہندوؤں کا زاویۂ نظر خالص سیاسی تھا۔ مثلاً پریم چند کا پہلا افسانہ "دنیا کا سب سے انمول رتن" اسی سیاسی رُجحان کا حامل ہے۔"[۱]

دوسری طرف ۱۹۶۱ء میں پروفیسر احتشام حسین نے سجاد حیدر یلدرم کو اردو کا پہلا اور پریم چند کو دوسرا افسانہ نگار کہا:-

"ہم کو جو ابتدائی افسانہ نگار ملتے ہیں، ان میں دو نام نمایاں طور پر نظر آتے ہیں ایک سجاد حیدر یلدرم کا، دوسرا پریم چند کا۔ دونوں کی افسانہ نویسی کی ابتداء کم وبیش ایک ہی زمانے سے ہوتی ہے۔ پریم چند کا پہلا افسانہ ملا ہے جو ۱۹۰۵ء کا لکھا ہوا ہے، عنوان ہے "دنیا کا سب سے انمول رتن"۔"[۲]

یاد رہے کہ اس سے قبل پروفیسر وقار عظیم افسانے سے متعلق اپنے اوّلین مضامین میں سلطان حیدر جوش اور نیاز فتح پوری کو اردو کے اوّلین افسانہ نگار بتا چکے تھے جب کہ پریم چند کو اردو کا پہلا افسانہ نگار شمار کرنے والے باقاعدہ محققین میں ڈاکٹر قمر رئیس کا نام بہت نمایاں ہے۔

پریم چند اردو کے اوّلین افسانہ نگار کیوں کر مانے گئے؟ اس کی تفصیل بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ ۱۹۳۲ء میں پریم چند نے اپنے ہندی ادبی مجلّہ "ہنس" بنارس کے "آتم کتھا نمبر" کے لئے "جیون سار" کے عنوان سے اپنی قلم کاری کی

۱۔ سیمپوزیم "اردو افسانے میں روایت اور تجربے" شرکاء: سعادت حسن منٹو، پروفیسر وقار عظیم، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، شوکت تھانوی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، انتظار حسین، حمید اختر اور محمد طفیل، مشمولہ "نقوش" لاہور (افسانہ نمبر۔ دو جلدیں) صفحہ ۱۰۲۷ جلد دوم، ۱۹۵۵ء

۲۔ اردو افسانے پر ایک سیمپوزیم، منعقدہ لکھنؤ ۱۹۶۱ء، مشمولہ "اعتبارِ نظر" از احتشام حسین مطبوعہ کتاب پبلشرز چوک لکھنؤ ۳، طبع اوّل ۱۹۶۵ء صفحہ ۱۳۸

رُوداد لکھی، جس میں انہوں نے اپنے افسانے "دنیا کا سب سے انمول رتن" کو نہ صرف ۱۹۰۷ء کی تخلیق قرار دیا بلکہ اس کی اشاعت رسالہ "زمانہ" کانپور ۱۹۰۷ء میں بتائی۔ پریم چند کے اس بیان کا اردو ترجمہ پہلی بار رسالہ "زمانہ" کانپور (مرتبہ دیانرائن نگم) کے "پریم چند نمبر" مطبوعہ ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا۔ پریم چند لکھتے ہیں:

"میری سب سے پہلی کہانی کا نام تھا "دنیا کا سب سے انمول رتن" وہ ۱۹۰۷ء میں رسالہ "زمانہ" کانپور میں چھپی"۔[1]

پریم چند کے اس بیان پر ہمارے محققین نے آمنا و صدقنا کہا اور پھر چل سو چل۔ جملہ مضامین اور نصابی کتب میں پریم چند کو اردو کا پہلا افسانہ نگار تسلیم کر لیا گیا۔

دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ دیانرائن نگم نے "زمانہ" کانپور "پریم چند نمبر" ۱۹۳۷ء میں پریم چند اور رسالہ "زمانہ" کے تعلق کے حوالے سے پریم چند کی مطبوعہ تحریروں کا جو اشاریہ مرتب کیا تھا اس میں افسانہ "دنیا کا سب سے انمول رتن" کا حوالہ کہیں موجود نہ تھا، جب کہ "زمانہ" کانپور کی فائل بابت ۱۹۰۷ء تا ۱۹۰۸ء بھی اس ضمن میں خاموش ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ افسانہ "دنیا کا سب سے انمول رتن" کو ہی پریم چند نے اپنا اولین افسانہ کیوں شمار کیا؟ اس کے جواب کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں:

۱۔ بطور افسانہ نگار اولیت حاصل کرنے کی خواہش۔ اس ضمن میں سلطان حیدر جوش کا بیان دلچسپی سے خالی نہیں۔[2]

۲۔ افسانہ لکھا تو ۱۹۰۷ء میں ہو لیکن جون ۱۹۰۸ء ("سوزِ وطن" کا سالِ اشاعت) تک شائع نہ ہو پایا ہو۔ واضح رہے کہ یہ افسانہ "سوزِ وطن" کے علاوہ اور کہیں دیکھنے کو نہیں ملتا۔[3]

۳۔ بہت ممکن ہے کہ پریم چند افسانہ "عشقِ دُنیا اور حُبِّ وطن" (مطبوعہ "زمانہ" کانپور بابت اپریل ۱۹۰۸ء) کا حوالہ دینا چاہتے ہوں اور بھول کر غلط نام کا اندراج کر گئے ہوں۔

لیکن یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوگا کہ پریم چند نے "جیون سار" ۱۹۳۲ء میں قلم بند کیا اور ۱۹۳۶ء (سالِ وفات) تک اس بیان کی تردید کیوں نہ کی؟

بہر طور، وجوہات کچھ بھی ہوں۔ اُس دور کے جملہ ادبی مجلّوں کو کھنگالنے کے بعد اب یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ پریم چند کا پہلا افسانہ "دنیا کا سب سے انمول رتن" نہیں بلکہ "عشقِ دنیا اور حُبِّ وطن" ہے، جو "زمانہ" کانپور بابت اپریل ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا۔

تحقیق کی سطح پر غلط فہمیوں کا یہ سلسلہ "مطالعۂ یلدرم" (۱۹۷۱ء) از ڈاکٹر سید معین الرحمٰن سے ہوتا ہوا مجلہ "سیپ" کراچی (۱۹۸۸ء) میں شائع ہونے والے سلطان حیدر جوش کے خاکے "پہلی کرسی کے حضور" از ابوالفضل صدیقی تک چلا آیا ہے۔

---

[1] بحوالہ "زمانہ" کانپور (مرتبہ دیانرائن نگم) پریم چند نمبر ۱۹۳۷ء، صفحہ ۲

[2] بحوالہ "پہلی کرسی کے حضور" از ابوالفضل صدیقی، مطبوعہ "سیپ" کراچی ۱۹۸۸ء

[3] "حُبِّ وطن کے قصّے معروف بہ سوزِ وطن و سیرِ درویش"، مطبوعہ گیلانی الیکٹرک پریس بک ڈپو، لاہور، طبع اوّل ۱۹۲۹ء، صفحہ ۱۷ تا ۲۱

پروفیسر احتشام حسین کے بعد ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے سجاد حیدر یلدرم[1] کو اور ابو الفضل صدیقی نے سلطان حیدر جوش کو (جوش کے اپنے بیانات کی روشنی میں) اردو کا اولین افسانہ نگار شمار کیا ہے۔
یہ سب تحقیق طلب امور سے متعلق تن آسانی کا کیا دھرا ہے، وگرنہ اردو ادب کے اولین ادبی مجلوں سے کون واقف نہیں، رسالہ "زمانہ" ...... "معارف" علی گڑھ، "مخزن" لاہور، "اردوئے معلّی" علی گڑھ اور "اوَدھ پنچ" علی گڑھ جیسے ادبی رسائل ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں، جن کا حصول مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن ہرگز نہیں اور اگر اس بحث کو چند بھارتی محققین کی طرح سر سید احمد خاں کی تحریر "گزرا ہوا زمانہ" (مطبوعہ "تہذیب الاخلاق" علی گڑھ بابت: یکم صفر ۱۲۹۰ھ مطابق ۳۱ مارچ ۱۸۷۳ء) تک پھیلا دیا جائے تو بھی فنی لوازم ہی حتمی رائے قائم کرنے کی بنیاد ٹھہریں گے۔ سو لگے ہاتھوں یہ قضیہ بھی صاف کر لیا جائے، سر سید احمد خاں کی تحریر "گزرا ہوا زمانہ" دیکھتے چلیں:

گزرا ہُوا زمانہ

برس کی اخیر رات کو ایک بڈھا اپنے اندھیرے گھر میں اکیلا بیٹھا ہے۔ رات بھی ڈراؤنی اور اندھیری ہے۔ گھٹا چھا رہی ہے۔ بجلی تڑپ تڑپ کر کڑکتی ہے، آندھی بڑے زور سے چلتی ہے۔ دل کانپتا ہے اور دم گھبراتا ہے۔ بڈھا نہایت غمگین ہے، مگر اس کا غم نہ اندھیرے گھر پر ہے نہ اکیلے پن پر اور نہ اندھیری رات اور بجلی کی کڑک اور آندھی کی گونج پر اور نہ برس کی آخیر رات پر۔ وہ اپنے پچھلے زمانے کو یاد کرتا ہے اور جتنا زیادہ یاد آتا ہے، اتنا ہی زیادہ اس کا غم بڑھتا ہے۔ ہاتھوں سے ڈھکے ہوئے منہ پر آنکھوں سے آنسو بہی بہے چلے جاتے ہیں۔
پچھلا زمانہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھرتا ہے، اپنا لڑکپن اس کو یاد آتا ہے، جب کہ اس کو کسی چیز کا غم اور کسی بات کی فکر دل میں نہ تھی۔ روپے اشرفی کے بدلے ریوڑی اور مٹھائی اچھی لگتی تھی۔ سارا گھر ماں باپ، بھائی بہن اس کو پیار کرتے تھے۔ پڑھنے کے لئے چھٹی کا وقت جلد آنے کی خوشی میں کتابیں بغل میں لے مکتب میں چلا جاتا تھا۔ مکتب کا خیال آتے ہی اس کو اپنے ہم مکتب یاد آتے تھے۔ وہ اور زیادہ غمگین ہوتا تھا اور بے اختیار چلا اٹھتا تھا۔
"ہائے وقت، ہائے وقت! گزرے ہوئے زمانے!! افسوس کہ میں نے تجھے بہت دیر میں یاد کیا۔"
پھر وہ اپنی جوانی کا زمانہ یاد کرتا تھا۔ اپنا سرخ سفید چہرہ، سڈول ڈیل، بھرا بھرا بدن، رسیلی آنکھیں، موتی کی لڑی سے دانت، امنگ میں بھرا ہوا دل، جذباتِ انسانی کے جوشوں کی خوشی اسے یاد آتی تھی۔ اس آنکھوں میں اندھیرا چھائے ہوئے زمانے میں ماں باپ جو نصیحت کرتے تھے اور نیکی اور خدا پرستی کی بات بتاتے تھے اور یہ کہتا تھا کہ "ابھی بہت وقت ہے" اور بڑھاپے کے آنے کا کبھی خیال بھی نہ کرتا تھا۔ اس کو یاد آتا تھا اور افسوس کرتا تھا کہ کیا اچھا ہوتا اگر جب ہی میں اس وقت کا خیال کرتا اور خدا پرستی اور نیکی سے اپنے دل کو سنوارتا اور موت کے لئے تیار رہتا۔ آہ وقت گزر گیا! اب پچھتائے کیا ہوتا ہے۔ افسوس میں نے آپ اپنے تئیں ہمیشہ یہ کہہ کر برباد کیا کہ "ابھی وقت بہت ہے۔"
یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ٹٹول ٹٹول کر کھڑکی تک آیا۔ کھڑکی کھولی، دیکھا کہ رات ویسی ہی ڈراؤنی ہے۔

---

[1] بحوالہ "اردو کا پہلا افسانہ" از ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، مطبوعہ "فنون" لاہور، بابت نومبر۔ دسمبر ۱۹۸۹ء

اندھیری گھٹا چھا رہی ہے، بجلی کی کڑک سے دل بیٹھا جاتا ہے، ہولناک آندھی چل رہی ہے، درختوں کے پتے اُڑتے ہیں اور ٹہنے ٹوٹتے ہیں، تب وہ چلا کر بولا " ہائے ہائے میری گزری ہوئی زندگی بھی ایسی ہی ڈراؤنی ہے جیسی یہ رات" یہ کہہ کر پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اتنے میں اس کو اپنے ماں باپ، بھائی بہن، دوست آشنا یاد آئے جن کی ہڈیاں قبروں میں گل کر خاک ہو چکی تھیں۔ ماں گویا محبت سے اس کو چھاتی سے لگائے آنکھوں میں آنسو بھرے کھڑی ہے۔ یہ کہتی ہوئی کہ ہائے بیٹا وقت گزر گیا۔ باپ کا نورانی چہرہ اس کے سامنے ہے اور اس میں یہ آواز آتی ہے کہ کیوں بیٹا ہم تمہارے ہی بھلے کے لئے نہ کہتے تھے۔ بھائی بہن دانتوں میں انگلی دیئے ہوئے خاموش ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری ہے۔ دوست آشنا سب غمگین کھڑے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب ہم کیا کر سکتے ہیں۔

ایسی حالت میں اس کو اپنی وہ باتیں یاد آتی تھیں جو اس نے نہایت بے پروائی اور بے مروتی اور کج خلقی سے اپنے ماں باپ، بھائی بہن، دوست آشنا کے ساتھ برتی تھیں۔ ماں کو رنجیدہ رکھنا، باپ کو ناراض کرنا، بھائی بہن سے بے مروت رہنا، دوست آشنا کے ساتھ ہمدردی نہ کرنا یاد آتا تھا اور اس پر ان گلی ہڈیوں میں سے ایسی محبت کا دیکھنا اس کے دل کو پاش پاش کرتا تھا۔ اُس کا دم چھاتی میں گھٹ جاتا تھا اور یہ کہہ کر چلا اٹھتا تھا کہ ہائے وقت نکل گیا۔ ہائے وقت نکل گیا، اب کیوں کر اس کا بدلہ ہو!

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا اور ٹکراتا لڑکھڑاتا کھڑکی تک پہنچا۔ اس کو کھولا اور دیکھا کہ ہوا کچھ ٹھہری ہے اور بجلی کی کڑک کچھ تھمی ہے پر رات ویسی ہی اندھیری ہے اس کی گھبراہٹ کچھ کم ہوئی اور پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اتنے میں اس کو اپنا ادھیڑ پنا یاد آیا جس میں کہ وہ جوانی رہی تھی اور نہ وہ جوانی کا جوبن، نہ وہ دل رہا تھا اور نہ دل کے ولولوں کا جوش۔ اس نے اپنی اس نیکی کے زمانے کو یاد کیا جس میں وہ بہ نسبت بدی کے نیکی کی طرف زیادہ مائل تھا۔ وہ اپنا روزہ رکھنا، نمازیں پڑھنی، حج کرنا، زکوٰۃ دینی، بھوکوں کو کھلانا، مسجدیں اور کنوئیں بنوانا یاد کر کے اپنے دل کو تسلی دیتا تھا۔ فقیروں اور درویشوں کو جن کی خدمت کی تھی، اپنے پیروں کی جن سے بیعت کی تھی اپنی مدد کو پکارتا تھا، مگر دل کی بیقراری نہیں جاتی تھی۔ وہ دیکھتا تھا کہ اس کے ذاتی اعمال کا اسی تک خاتمہ ہے۔ بھوکے پھر ویسے ہی بھوکے ہیں۔ مسجدیں ٹوٹ کر یا تو کھنڈر ہیں یا پھر ویسے ہی جنگل ہیں۔ کنوئیں اندھے پڑے ہیں۔ نہ پیر اور نہ فقیر، کوئی اس کی آواز نہیں سنتا اور نہ مدد کرتا ہے اس کا دل پھر گھبراتا ہے اور سوچتا ہے کہ میں نے کیا کیا، جو تمام فانی چیزوں پر دل لگایا۔ یہ پچھلی کچھ پہلے ہی کیوں نہ سوجھی، اب کچھ بس نہیں چلتا اور پھر یہ کہہ کر چلا اٹھا ہائے وقت، ہائے وقت! میں نے تجھ کو کیوں کھو دیا۔"

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا۔ اس کے پٹ کھولے تو دیکھا کہ آسمان صاف ہے، آندھی تھم گئی ہے، گھٹا کھل گئی ہے، تارے نکل آئے ہیں، ان کی چمک سے اندھیرا بھی کچھ کم ہو گیا ہے۔ وہ دل بہلانے کے لئے تاروں بھری رات کو دیکھ رہا تھا کہ یکایک اس کو آسمان کے بیچ میں ایک روشنی دکھائی دی اور اس میں ایک خوبصورت دلہن نظر آئی۔ اس نے ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنا شروع کیا۔ جوں جوں وہ اسے دیکھتا تھا وہ قریب ہوتی جاتی تھی، یہاں تک کہ وہ اس کے بہت پاس آ گئی۔ وہ اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر حیران ہو گیا اور نہایت پاک دل اور محبت کے لہجے سے پوچھا کہ تم کون ہو۔ وہ بولی کہ میں ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی ہوں۔ اس نے پوچھا کہ تمہاری تسخیر کا بھی کوئی عمل ہے۔ وہ بولی ہاں ہے، نہایت آسان پر

بہت مشکل ہو کوئی خدا کے فرض اس بدوی کی طرح جس نے کہا کہ " واللہ لا ازید ولا انقص" ادا کرکے انسان کی بھلائی اور اس کی بہتری میں سعی کرے اس کی میں مسخر ہوتی ہوں۔ دنیا میں کوئی چیز ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے۔ انسان ہی ایسی چیز ہے جو اخیر تک رہے گا۔ پس جو بھلائی کہ انسان کی بہتری کے لئے کی جاتی ہے وہی نسل در نسل اخیر تک چلی آتی ہے۔ نماز، روزہ، حج زکوٰۃ اسی تک ختم ہوجاتا ہے۔ اس کی موت ان سب چیزوں کو ختم کر دیتی ہے۔ مادی چیزیں بھی چند روز میں فنا ہوجاتی ہیں۔ مگر انسان کی بھلائی اخیر تک جاری رہتی ہے۔ میں تمام انسانوں کی روح ہوں، جو مجھ کو تسخیر کرنا چاہے انسان کی بھلائی میں دل و جان و مال سے ساعی ہو۔ یہ کہہ کر وہ دلہن غائب ہوگئی اور بڈھا پھر اپنی جگہ آبیٹھا۔

اب پھر اس نے اپنا پچھلا زمانہ یاد کیا اور دیکھا کہ اس نے اپنی پچپن برس کی عمر میں کوئی کام بھی انسان کی بھلائی اور کم سے کم اپنی قومی بھلائی کا نہیں کیا تھا۔ اس کے تمام کام ذاتی غرض پر مبنی تھے۔ نیک کام جو کئے تھے ثواب کے لالچ اور گویا خدا کو رشوت دینے کی نظر سے کئے تھے۔ خالص قومی بھلائی کی خالص نیت سے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

اپنا حال سوچ کر وہ اس دلفریب دلہن کے ملنے سے مایوس ہوا۔ اپنا اخیر زمانہ دیکھ کر آئندہ کرنے کی بھی کچھ امید نہ پائی، تب تو نہایت مایوسی کی حالت میں بے قرار ہوکر چلا اٹھا " ہائے وقت، ہائے وقت، کیا پھر تجھے میں بلا سکتا ہوں؟ ہائے میں دس ہزار دینار دیتا اگر وقت پھر آتا اور میں جوان ہوسکتا۔" یہ کہہ کر اس نے ایک آہ سرد بھری اور بے ہوش ہوگیا۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ اس کے کانوں میں میٹھی میٹھی باتوں کی آواز آنے لگی۔ اس کی پیاری ماں اس کے پاس آکھڑی ہوئی، اس کو گلے لگا کر اس کی بلی لی۔ اس کا باپ اس کو دکھائی دیا۔ چھوٹے چھوٹے بھائی بہن اس کے گرد آکھڑے ہوئے۔ ماں نے کہا کہ بیٹا کیوں برس کے برس دن روتا ہے؟ کیوں تو بے قرار ہے؟ کس لئے تیری ہچکی بندھ گئی ہے؟ اٹھ منہ ہاتھ دھو، کپڑے پہن، نوروز کی خوشی منا۔ تیرے بھائی بہن تیرے منتظر کھڑے ہیں۔ تب وہ لڑکا جاگا اور سمجھا کہ میں نے خواب دیکھا اور خواب میں بڈھا ہوگیا تھا۔ اس نے اپنا سارا خواب اپنی ماں سے کہا اس نے سن کر اس کو جواب دیا کہ بیٹا بس تو ایسا مت کر جیسا کہ اس پشیمان بڈھے نے کیا، بلکہ ایسا کر جیسا تیری دلہن نے تجھ سے کہا۔

یہ سن کر وہ لڑکا پلنگ پر سے کود پڑا اور نہایت خوشی سے پکارا کہ او یہی میری زندگی کا پہلا دن ہے۔ میں کبھی اس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤں گا اور ضرور اس دلہن کو بیاہوں گا جس نے ایسا خوبصورت اپنا چہرہ مجھ کو دکھلایا اور ہمیشہ زندہ رہنے والی شے کی اپنا نام بتلایا۔ او خدا، او خدا تو میری مدد کر۔ آمین!

پس اے میرے پیارے نوجوان ہم وطنو! اور اے میری قوم کے بچو، اپنی قوم کی بھلائی پر کوشش کرو، تاکہ اخیر وقت میں اس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤ۔ ہمارا زمانہ تو اخیر ہے اب خدا سے یہ دعا ہے کہ کوئی نوجوان اٹھے اور اپنی قوم کی بھلائی میں کوشش کرے، آمین!

سرسید احمد خان کی یہ تحریر اپنے آغاز میں یقیناً افسانہ کہلانے کی مستحق ہے اور ہیئت کے حوالے سے اس تحریر میں شعور کی رو کا اولین استعمال بھی دیکھنے کو ملتا ہے، جو آگے چل کر احمد علی اور قرۃ العین حیدر کے ہاں فنی پختگی تک پہنچا، لیکن اس تحریر کا وسط اور اختتامیہ اسے واضح طور پر ایک اصلاحی مضمون بنا دیتا ہے۔ آغاز تخیلی رنگ

لئے ہوئے ہے۔ ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی کے ظاہر ہوتے ہی سرسید احمد خان کی اصلاح پسندی اس افسانوی آغاز کو اصلاحی مضمون کی طرف کھینچ لے جاتی ہے۔ جبکہ تحریر کا اختتامیہ تو ہے ہی اصلاحی مضمون کا ۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سرسید احمد خاں کی جملہ تحریروں میں فنِ افسانہ کی طرف پیش قدمی دکھائی نہیں دیتی ۔ زیادہ سے زیادہ تمثیل یا حکایت کی جھلکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ "گزرا ہوا زمانہ" ان کی واحد تحریر ہے جو افسانہ بنتے بنتے رہ گئی ۔

دراصل یہ تحریر اس زمانے کی ہے جب ہمارے ہاں فکشن کے خلاف باقاعدہ ایک ردِ عمل کی صورت دکھائی دی۔ علی گڑھ تحریک کے نمائندہ مجلّے "تہذیب الاخلاق" علی گڑھ میں فکشن کے لئے کوئی گوشہ مخصوص نہ تھا۔ مولانا نذیر احمد دہلوی فکشن کی طرف آئے بھی تو اصلاحی جذبے کے تحت ناول کی بجائے تمثیلی قصے کی طرف نکل گئے اور مولانا محمد حسین آزاد نے "نیرنگِ خیال" (حصہ اوّل) کے دیباچے میں لکھا ۔

> "اب وہ زمانہ بھی نہیں کہ ہم اپنے لڑکوں کو ایک کہانی طوطے یا مینا کی زبانی سنائیں۔ ترقی کریں تو چار فقیر لنگوٹ باندھ کر بیٹھ جائیں یا پریاں اڑائیں، دیو بنائیں اور ساری رات ان کی باتوں میں گنوائیں۔ اب کچھ اور وقت ہے اور اس واسطے ہمیں بھی کچھ اور کرنا چاہیے" [۱]

ڈاکٹر آغا مسعود رضا خاکی ۱۹۶۵ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور کے لئے اپنا تحقیقی مقالہ لکھتے ہوئے رقم طراز ہوئے کہ۔

> "۱۹۰۳ء میں "مخزن" میں راشد الخیری کا "نصیر اور خدیجہ" شائع ہوا جس کو اردو کا پہلا افسانہ سمجھا جاتا ہے" [۲]

حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر خاکی کی رسائی "مخزن" لاہور کی فائل تک نہ ہو سکی اور اپنے تحقیقی مقالہ کو شائع کرتے وقت انہوں نے پھر اسی تساہل سے کام لیا جس کی نشاندہی اوپر کی جا چکی ہے۔ ڈاکٹر خاکی کی اس ادھوری تحقیق کو بنیاد بنا کر ڈاکٹر انوار احمد نے "مخزن" شمارہ ۳، جلد ۶، بابت دسمبر ۱۹۰۳ء میں سے راشد الخیری کا یہ افسانہ بعنوان: "نصیر اور خدیجہ" ڈھونڈ نکالا [۳] جو "مخزن" کے مذکورہ شمارے میں ۲۷ تا ۳۱ تک کے صفحات گھیرے ہوئے ہے۔

ڈاکٹر انوار احمد نے تاحال اس افسانے کا متن شائع نہیں کیا۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کے اوّلین افسانے کو نذرِ قارئین کیا جائے۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ راشد الخیری کی کتاب "مسلی ہوئی پتیاں" میں یہ افسانہ "نصیر اور خدیجہ" کے عنوان سے شامل نہیں کیا گیا۔ "مسلی ہوئی پتیاں" میں اس کا عنوان "بڑی بہن کا خواب" ہے جو اس کتاب کے اوّلین ایڈیشن مطبوعہ: عصمت بک ڈپو دہلی طبع اوّل: ۱۹۳۷ء کے صفحہ ۲۸ تا ۳۲ پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

یوں تاریخی اعتبار سے اردو میں طبع زاد افسانے کا آغاز درج ذیل طریق پر ہوا۔

۱۔ افسانہ: "نصیر اور خدیجہ" از راشد الخیری مطبوعہ "مخزن" لاہور، دسمبر ۱۹۰۳ء

---

[۱] "نیرنگِ خیال" (حصہ اوّل) مطبوعہ: مفیدِ عام پریس، لاہور، طبع اوّل ۱۸۸۰ء

[۲] بحوالہ "اردو افسانے کا ارتقاء" مقالہ برائے پی ایچ ڈی پنجاب یونیورسٹی لائبریری اردو سیکشن صفحہ ۱۶۳ مطبوعہ: مکتبۂ خیال لاہور، طبع اوّل، اگست ۱۹۸۷ء، صفحہ ۱۵۵

[۳] "اردو افسانہ، تحقیق و تنقید" بیکن بکس، ملتان، طبع اوّل ۱۹۸۸ء صفحہ ۴۲

۲۔ افسانہ "دوست کا خط" از سجاد حیدر یلدرم، مطبوعہ "مخزن" لاہور: اکتوبر ۱۹۰۶ء

۳۔ افسانہ: "غربت و وطن" از سجاد حیدر یلدرم، مطبوعہ: "اردوئے معلیٰ" علی گڑھ: اکتوبر ۱۹۰۶ء

۴۔ افسانہ: "نابینا بیوی"۔ از سلطان حیدر جوش، مطبوعہ: "مخزن" لاہور، دسمبر ۱۹۰۷ء

۵۔ افسانہ: "عشقِ دنیا اور حُبِ وطن" از پریم چند، مطبوعہ: "زمانہ" کانپور: اپریل ۱۹۰۸ء

یاد رہے کہ یلدرم کا افسانہ "نشہ کی پہلی ترنگ" مطبوعہ: "معارف" علی گڑھ، شمارہ ۲، جلد ۳ اکتوبر ۱۹۰۰ء خلیل رشدی کے ترکی افسانے کا ترجمہ ہے، طبع زاد افسانہ نہیں، یلدرم نے ترجمہ کرنے کے لئے خلیل رُشدی کے اس افسانے کو مجلّہ "ثروتِ فنون" سے انتخاب کیا تھا اور یہیں سے یلدرم کی ترجمہ نگاری کا آغاز ہوا۔ جبکہ پطرس بخاری، ڈاکٹر معین الرحمٰن اور قرۃ العین حیدر نے یلدرم کے کام کو ORIGINAL کرتے ہوئے ان کے افسانوی تراجم "ثالث بالخیر"، "صحبتِ ناجنس" اور "خارستان و گلستان" کو بھی طبع زاد قرار دیا، اور یوں اس خالصتاً تحقیقی معاملے کو تادیر کھٹائی میں ڈالے رکھا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر ایرکن ترکمان (صدر شعبہ السنہ شرقیہ، سلجوق یونی ورسٹی، قونیہ۔ ترکی) نے اصل متن سے تقابلی جائزہ کے بعد ان تینوں تحریروں کو ترکی افسانوں کے تراجم ثابت کر دیا۔

"عصمت" کراچی (راشد الخیری نمبر) کے مطابق راشد الخیری کو افسانہ "نصیر اور خدیجہ" لکھنے کی تحریک ان کی والدہ رشید الزمانی بیگم کی سنائی ہوئی دو یتیم لڑکیوں کی کہانی سے ہوئی، جن کے ماموں نے ان کی طرف سے لاپرواہی برتی۔ اس افسانے کو سر شیخ عبدالقادر نے "مخزن" لاہور کے شمارہ ۳، جلد ۶ بابت دسمبر ۱۹۰۳ء میں شائع کرتے وقت بطور مُدیر ایک مختصر نوٹ سے مزید نمایاں کر دیا۔ عبارت درج ذیل ہے:

> "یہ مضمون مدت کے تقاضوں کے بعد ہمیں اپنے دوست مولوی محمد عبدالراشد صاحب، مترجم عدالت ہندولیست سے ملا ہے۔ صاحب موصوف شمس العلماء مولانا حافظ نذیر احمد کے عزیزوں میں ہیں اور زبان پر خوب قدرت رکھتے ہیں خصوصاً مستورات کی زبان بے تکلف لکھتے ہیں۔ چنانچہ مولوی نذیر احمد صاحب کی لاجواب کتابوں کے بعد مولوی عبدالراشد صاحب کی کتاب منازلُ السّائرہ اپنے قسم کی ایک لاجواب کتاب ہے جس میں مستورات کی زبان نہایت خوبی سے لکھی ہے۔ اس مضمون میں بڑی بہن (خدیجہ) اپنے بھائی نصیر کو خط لکھتی ہے اور دوسری مری ہوئی بہن کے بچوں کی خراب حالت کی طرف اس کی توجہ دلاتی ہے۔ خط اس بےساختہ پن سے لکھا گیا ہے کہ بےاختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔"

لے "پگڈنڈی" امرتسر (یلدرم نمبر) شمارہ ۵، جلد ۹

لے "اردو کا پہلا افسانہ" مطبوعہ "فنون" لاہور سالنامہ ۱۹۶۹ء

لے "کارِ جہاں دراز ہے" مکتبہ اردو ادب لاہور، طبع دوم س۔ن

لے دیکھیے "سجاد حیدر یلدرم اور ان کے ترکی تراجم" مطبوعہ "ماہِ نو" لاہور جون ۱۹۸۸ء

لے اس افسانے پر راشد الخیری کا اصل نام محمد عبدالراشد درج ہے۔

راشد الخیری کا اور اردو زبان کا پہلا افسانہ "نصیر اور خدیجہ" خط کی تکنیک میں لکھا گیا ہے اور یہ تکنیک اس دور کے فکشن کی مقبول ترین تکنیک کہی جا سکتی ہے۔ انگریزی ادب میں پہلی بار سیموئل رچرڈسن (۱۶۸۹ء - ۱۷۶۱ء) نے اس تکنیک کو اپنے تمثیلی قصے "پامیلا" میں برتا اور لیو پیپے نے اسی تکنیک میں آٹھ خطوط پر مشتمل اپنا افسانہ "آئینہ" مکمل کیا۔[1]

راشد الخیری عالمی سطح پر اس تکنیک کو برتنے والے تیسرے تخلیق کار ہیں۔ انہوں نے "نصیر اور خدیجہ" (مطبوعہ: ۱۹۰۳ء) کے بعد یہ تکنیک اپنے دس دیگر افسانوں میں برتی۔ ان کا دوسرا طبع زاد افسانہ "عصمت و حسن" (مطبوعہ "مخزن" لاہور ۱۹۰۶ء) "کثرتِ ازدواج" (مطبوعہ "مخزن" لاہور ۱۹۰۸ء) "نند کا خط بھاوج کے نام" (مطبوعہ "عصمت" دہلی جون ۱۹۰۸ء) اور افسانوی مجموعہ "مسلی ہوئی پتیاں" (طبع اول، ۱۹۳۷ء) میں شامل کُل گیارہ افسانے (زمانۂ تخلیق: ۱۹۰۳ء تا ۱۹۱۹ء) اسی تکنیک کے حامل ہیں۔

ترک افسانہ نگار احمد حکمت مفتی اوغلو (۱۸۷۰ء - ۱۹۲۷ء) نے تگ بھگ ۱۹۰۵ء میں اس تکنیک کو برتا اور سجاد حیدر یلدرم اس کے ایک افسانے ("صحبتِ ناجنس" مطبوعہ "مخزن" لاہور فروری ۱۹۰۶ء) کو ترجمہ کرتے ہوئے پہلی بار اس تکنیک سے متعارف ہوئے۔ پھر یہ تکنیک انہیں اس قدر بھائی کہ اپنے طبع زاد افسانوں "دوست کا خط" (مطبوعہ "مخزن" لاہور اکتوبر ۱۹۰۶ء) اور "گمنام خطوط" (مشمولہ "حکایات و احتساسات" مطبوعہ: ۲۷-۱۹۲۶ء) کو اسی تکنیک میں مکمل کیا۔ یہاں تک کہ ہمارے ہاں یہ سلسلہ قاضی عبدالغفار کے "لیلیٰ کے خطوط" اور میرزا ادیب کے "صحرا نورد کے خطوط" تک پہنچا، جو بلاشبہ اس تکنیک کے ورتارے کا بامِ عروج ہے۔

اور اب ملاحظہ کیجیے راشد الخیری کا افسانہ "نصیر اور خدیجہ" جو اردو کا پہلا افسانہ ہے۔

نصیر اور خدیجہ

شاباش بھائی نصیر شاباش! چھوٹی بہن مر کے چھوٹی۔ بڑی بہن کو جیتے جی چھوڑا۔ غضب خدا کا تین تین چار چار مہینے گزر جائیں اور تم کو دو حرف لکھنے کی توفیق نہ ہو۔ حفیظہ کے نکاح میں، وہ بھی چچی جان کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ ملتان کی بدلی ہو گئی۔ وہ دن اور آج کا دن خیر صلاح کیسی یہ بھی خبر نہیں کہ لاہور میں ہو یا ملتان میں، نصیر میاں! بہن بھائیوں کا رشتہ تو بڑی محبت کا ہوتا ہے ایسی کون سی پانچ سات بہنیں بیٹھی ہیں جو دل بھر گیا۔ دور کیوں جاؤ بھائی سلیم ہی کو دیکھ لو ایک چھوڑ دو بہنیں ساتھ ہیں اور کس طرح؟ گھر بار کی مختار۔ اندر باہر کی مالک سیاہ کریں، چاہے سفید۔ نہ بھائی کی اتنی مجال کہ دم مار سکے، نہ بھاوج کی اتنی طاقت کہ ہوں کر سکے۔ کسی کو دیکھ کر تو سیکھا کرو۔ ایک وہ بھائی بہنوں کو آنکھوں پر بٹھایا، بھانجا بھانجی کی شادیاں کیں، بھانجوں کو پڑھا لکھا کر نوکر کرایا۔ ایک تم بھائی ہو کس کا بھانجہ اور کیسی بہن۔ چاہے کوئی مرے یا جئے تمہاری بلا سے۔ خدا کا شکر ہے، میں تو تمہاری روپیہ پیسہ کی بھی بھوکی نہیں، خالی محبت اور میٹھی زبان کی خواستگار ہوں لاچو کہیں خدانخواستہ تمہارے دَر پر آ کر پڑتی تو کتے کے ٹھیکرے میں پانی پلوا دیتے، آخر میں بھی تو سنوں خطا قصور وجہ سبب، کچھ تو بتاؤ ایسی لاپروائی بھی کس کام کی۔ اچھے سے غرض نہ بُرے سے مطلب۔ بہن کے تم نہیں بھائی کے تم نہیں، صادق ہوتے

---

[1] لیو پیپے کے افسانے سے خیال مستعار لے کر ف۔ م۔ افضل نے افسانہ "آئینہ" لکھا تھا جو "ہمایوں" لاہور بابت مارچ ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا۔

مر گئی اور تمہاری صورت دیکھنی نصیب نہ ہوئی ۔ اماں رہیں نہیں، ابا اُدھر چلے گئے میں اس قابل نہیں ۔ بڑے بھائی اس لائق نہیں ۔ اب تمہارا دلّی میں کون بیٹھا ہے جس کو خط لکھو ۔ تم تو خدا سے چاہتے تھے کہ کوئی موقعہ ملے تو ایک سرے سے سب ہی کو عاق کر دوں ۔ ابا کا تج کو جانا اور نگے کو مٹھلیے کا بہانہ ہو گیا ۔ بہن اور بھائی ماموں اور بھائی سب کو بالائے عاق رکھا ۔ چچا لاپروا، چچی خطاوار، بھائی خود غرض ، بہن گنہگار ۔ غرض کُنبے کا کُنبہ اور خاندان کا خاندان چھوٹے اور بڑے ، بڈھے اور جوان ، مرد اور عورت ، بوڑھا اور بچہ ایک بھی اچھا نہیں ۔ محبت نہیں مروّت ہی سہی ۔ بال بچوں کا ساتھ رکھنا گناہ نہیں ہے دنیا جہان میں ہوتی آئی ہے ۔ مگر یہ اندھیر کہیں نہیں دیکھا کہ الگ گھر کرتے ہی سب کو دھتا بتائی ۔ اماں کا مرنا ہماری تو مٹی پلید ہوئی مگر تم کو عید ہو گئی ۔ شفقت محبت پہلے ہی رخصت ہو چکی تھی ۔ جو کچھ تھوڑا بہت لحاظ تھا وہ بھی گیا گذرا ہوا ۔ اللہ تم کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے ۔ الٰہی تمہارے بچوں کی ہزاری عمر ہو ۔ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھو ۔ اب سے دُور اگلے برس ذرا ظہیر کو بخار ہو گیا تھا ۔ کیسے گھبرائے گھبرائے پھرتے تھے ۔ تم کو آٹھ برس کے بچے کی یہ کچھ مامتا تھی ۔ اماں کو تمہاری کتنی ہو گی ؟ نصیر میاں دنیا کے جھگڑے تو ہمیشہ ہی رہیں گے ۔ بال بچے شادی بیاہ سب ہی کچھ ہو گا ۔ اب اماں تمہاری صورت دیکھنے نہیں آئیں گی ۔

صادقہ کے بچوں کو اماں اپنی زندگی تک کلیجہ سے لگائے رہیں اُن کا مرنا تھا کہ تینوں کی مٹی ویران ہو گئی ۔ پرسوں دونوں لڑکے بسم اللہ کا حصہ لے کر آئے تھے میں باہر کی چارپائی پر بیٹھی ہوئی رضائی ٹانک رہی تھی ۔ چھوٹا آ کر گلے سے لپٹ گیا کچھ خون کا جوش تھا کہ اُس کی صورت دیکھتے ہی میری طبیعت بھر آئی ۔ غلاموں کی بھی حالت اچھی ہو گی جیسی ان بچوں کی تھی ۔ پھٹا ہوا کرتہ ٹوٹی ہوئی جوتی ، پاجامہ چکٹ ، ٹوپی چوہا ، بدن پر سیروں میل ، آنکھوں میں الغاروں ببیڑ ان بچوں کو دیکھ کر مجھ کو وہ دن یاد آ گیا کہ جب تک دونوں کی الحالقین نہ آ گئیں ۔ صادقہ رابعہ کی چوتھی میں نہ گئی ۔ دیکھ تو تین چار ہی برس کے اندر اندر ۔ کیا کیا ہو گیا ۔ بُرا نہ ماننا تم قیامت تک بھی اپنے بچوں کو اس طرح نہ پالو گے جس طرح صادقہ اپنے بچوں کو پال گئی ۔ خدا کی قسم بھری ہوئی عطر کی شیشیاں کھڑے کھڑے حمید نے غارت کی ہیں ۔ تقدیر کی خبر نہ تھی کہ صادقہ کی اولاد یوں برباد ہو گی ۔ میں نے تو دیکھا نہیں مگر دادا جان ذکر کیا کرتے تھے کہ غدر سے پہلے اس مکان پر ہاتھی جھومتا تھا ۔ آج جا کر دیکھو بے کنڈی کا ایک کواڑ چڑھا ہوا ہے اور چکنی مٹی کی ایک دیوار چُنی ہوئی ہے ۔ بڑے نواب کی آنکھ کا بند ہونا تھا کہ گھر بھر میں جھاڑو پھر گئی ۔ میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے مسعود کے بیاہ میں صادقہ کی ساس کو گنگا جمنی پنکھے جھلے جا رہے تھے ۔ لونڈیاں اور مامائیں گوندنی کی طرح زیور میں لدی ہوئی تھیں ۔ دیکھتے ہی دیکھتے کچھ ایسا زمانہ پلٹا کہ آج پانی پینے کا کٹورہ بھی نہ رہا ۔ مٹکے میں آٹا برکت ، پتیلی میں کپڑے اللہ کا نام ۔ بدن میں طاقت نہیں ، ہاتھ پاؤں میں سکت نہیں ۔ چلنے پھرنے سے مجبور ، دیکھنے سے معذور آنکھیں تھیں تو ایک آدھ کرتہ دو ایک ٹوپیاں کر کرا لیتی تھیں ۔ اب اتنی بھی نہیں پڑوس کا حق سمجھو خدا کا خوف جانو ہاتھ پاؤں کی خیرات کھوجی جان تین روپیہ مہینہ دیتی ہیں ۔ بس یہ کل کائنات ہے ۔ اس میں کیا آپ کھائیں کیا بچوں کو کھلائیں ۔ تین روپیہ چار دم ، ایک لڑکی کا ساتھ ، کیا کریں کیا نہ کریں ۔ تین روپیہ مہینہ کا تو سوکھا اناج چاہیئے ۔ جو جو کچھ رکھا تھا سب ہی کچھ کر چکیں ، چکیاں پیسیں ، سلائیاں کیں ۔ ہاں اتنی بات رہ گئی کہ دَر دَر ہاتھ نہیں پھیلایا ۔

صادقہ کے بچے کسی غیر کے بچے نہیں ہیں ، مری ہوئی بہن کی نشانی ہیں ، شاباش تمہاری ہمت پر ، تم پردیس میں بیٹھے راج کرو اور صادقہ کے بچے دو دو دانے کو محتاج ہوں ۔ دلّی میں آ کر دیکھو شہر میں کیا نام بدنام ہو رہا ہے آخر برس میں دو برس

میں اپنے ہاں کی نہیں سسرال کی شادیوں میں تو آؤ گے سب کو یاد ہے کہ اللہ رکھو لڑکی کا بیاہ سر پر آرہا ہے یا یہ بھی وہیں کر لوگے ؟ اپنے پرائے کنبہ، محلہ، میل ملاپی جان پہچان تمام دنیا جہنم میں تھوک رہی ہے کس کس کا منہ کیلو گے ؟

بڑے بھائی اس لائق ہوتے تو تم سے کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ بیچارے آپ ہی اپنی پریشانیوں میں گھرے ہوتے ہیں۔ نوکری چھوٹی، چوری ہوئی، مقدمہ ہارے۔ چار روپیہ مکان کے آجاتے تھے وہ بھی نہ رہے۔ اندر کا دالان ہوا ہو ہی رہا تھا ایک ہی چھینٹے میں اڑا اڑ کر کے آن پڑا۔ اس کے ساتھ ہی ملبی کوٹھری بھی بیٹھ گئی۔ اتنا بھی پاس نہیں کہ اینٹیں اور ملبہ تو بٹوا دیں۔ چار سو روپیہ کے قرض دار بیٹھے ہیں۔

ایک لے دے کر منجھلی خالہ رہ گئیں وہ اکیلی کیا کیا کریں۔ صادقہ کے بچوں کو پالیں، بڑی بہو کی ٹہل کریں۔ اپنے گھر کو دیکھیں، جس کا نہ کریں اُسی سے بُری۔ روپیہ پیسہ کے قابل نہیں، ہاتھ پاؤں سے باہر نہیں، جس کے ہاں ضرورت دیکھتی ہیں آموجود ہوتی ہیں۔ کہنے کو جس کا جو جی چاہے کہہ لو۔ خلق کا حلق تھوڑی بند ہو سکتا ہے۔

ماموں اور باپ میں فرق نہیں ہوتا مگر سمجھو تو۔ نہ سمجھو تو بھانجا بھانجی تو خیر اپنی اولاد بھی غیر ہے۔ خدا گواہ ہے میری تو اگر جان تک کام آجائے تو دریغ نہیں۔ اپنے بچے کم اور صادقہ کے بچے زیادہ۔ مگر ذرا عقل سے کام لو۔ ساری دنیا میں بدنام ہوں، مری ہوئی ہڈیاں اُکھڑواؤں، اماں باوا کی ناک کٹواؤں، دادی دادا تک کو پٹواؤں۔ جب ان کے ساتھ رکھنے کا نام لوں۔ میں خود پرائے بس میں ہوں، شہر کا معاملہ سسرال کی بات، ساس نندوں کا ساتھ ہر وقت کی جھک جھک، رات دن کی پٹ پٹ، کنبے بھر میں ذلیل ہونا، عمر بھر کے لئے مٹی پلید کرنی، گھروں میں لڑائیاں ڈالنی، دلوں میں فرق ڈالنے کس خدا نے بتائے ہیں۔ اماجان تو پہلے ہی فرماتی ہیں کہ میکے کا بھرنا بھرتی ہے۔ بچوں کو رکھ لوں تو زندگی ہی دوبھر ہو جائے۔ تم کو ماشاءاللہ اسی روپے ملتے ہیں، دو میاں بیوی دو بچے کل چار دم، اسی روپیہ کیا کم ہیں۔ بڑا مانو یا بھلا جس طرح ہو سکے صادقہ کے بچوں کو پانچ روپیہ مہینہ دو۔ یہ روپیہ رائیگاں نہیں جائے گا، یہاں نیک نام وہاں سرخرو۔ نصیر میاں حق داروں کا حق سمجھو اللہ برکت دے گا۔ پھلو گے پھولو گے، دنیا کی بہار دیکھو گے، روزگار میں ترقی ہوگی۔ ان بچوں کو عزیز سمجھو ظہیر اور حمید میں فرق نہیں ہے۔ بھائی بہن کی اولاد ایک ہوتی ہے، یہ بیچارے بھی کیا یاد کریں گے کہ کوئی ماموں تھا۔

دلہن بیگم کو بہت بہت دُعا، بچوں کو پیار، اب تو ماشاءاللہ بچی پاؤں پاؤں چلتی ہوگی۔ اچھا خدا حافظ!

روز جمعہ

خدیجہ

سوویت انڈالوجی — ۲

رسول طاؤس

شمال مغربی ہندوستان اور وسط ایشیا کے تہذیبی لین دین پر شاید سب سے زیادہ تحقیقی تنقیدی اور تخلیقی نوعیت کا کام رُوسی عالم سرگئی فیودرووچ اولڈنبرگ نے کیا ہے۔ جو برصغیر کے بارے میں نئے اور پرانے غیر ملکی عالموں کے درمیان ایک مضبوط پل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اولڈنبرگ (۱۸۶۳-۱۹۳۴ء) زارِ روس کے ایک جرنیل کا چشم و چراغ تھا جو رُبع صدی (۱۹۲۹-۱۹۰۴ء) تک روس کی اکیڈمی آف سائنسز کا مستقل سیکرٹری رہا۔ وہ یورپ کے سارے مستشرقین سے خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے اور بُدھمت پر اُس کی تحریریں آج بھی حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہیں۔ اولڈنبرگ نے پیرس، لندن اور کیمبرج میں قیام کے علاوہ کئی برس تک مغربی یورپ کے مستشرقین سے قریبی رابطہ رکھا اور روسی عالموں سمیت مغربی عالموں کی اُن کوتاہیوں کی بھی نشاندہی کی جو ہندوستان کے متعلق ان عالموں نے اپنی تحقیق میں غلط مفروضوں پر روا رکھی تھیں۔ اولڈنبرگ نے یونیورسٹی میں سنسکرت، عربی، فارسی چینی اور تبتی زبانوں کی تعلیم حاصل کی۔ اُسے پالی زبان کا ایک بڑا رمز شناس مانا جاتا ہے۔ قدیم رسم الخطوں کے سلسلے میں اُس کی تنقیدی نظر خود اُس کے اساتذہ کے لئے بھی مسرت کا باعث بنی ہوئی ہے۔ ان تمام خوبیوں سے زیادہ اُس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ جب ہندوستان کے نقادِ فن کمار سوامی سے لے کر یورپ کے بڑے بڑے عالم ہندوستان کی تہذیب اور فنون کو باقی تمام دنیا سے کوئی الگ تھلگ چیز ثابت کرنے پر تُلے ہوئے تھے، اُس وقت بھی اولڈنبرگ کی نگاہ ہند کی تاریخ کو عالمی تاریخ کے تناظر میں دیکھ سکتی تھی۔ چنانچہ ہڑپہ کی تہذیب کے آثار کی دریافت سے پہلے بھی اولڈن برگ اسی خیال کا حامی تھا کہ ہند کی تہذیب صرف آریوں کی دین نہیں ہے بلکہ مقامی تہذیبوں کے ساتھ آریائی قبائل کے تہذیبی اتصال کا نتیجہ ہے۔

جب کمار سوامی نے اپنی مشہور معروف انگریزی تصنیف انٹروڈکشن ٹو انڈین آرٹ (۱۹۲۳ء) شائع کر کے دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ ہندوستان کا تمام تر فن خالص ہندو مذہب کی بنیاد پر قائم ہے اور گندھارا تہذیب کا وسطی ہند کے آرٹ پر کوئی اثر نہیں ہے۔ کیونکہ گندھارا آرٹ محض یونانی یا رُومی آرٹ کا چربہ ہے، تو اولڈنبرگ نے بہانگِ دہل یہ بات کہی کہ ہندوستان کا آرٹ عالمی آرٹ ہی کا ایک حصّہ ہے اور ہندوستان تہذیبی لین دین میں باقی دنیا کے ساتھ برابر کا شریک رہا ہے۔

اس سے پہلے جب ۱۹۰۰ء میں جرمن سکالر البرٹ گرنیویڈل نے برلن سے اپنی کتاب "بدھسٹ آرٹ اِن انڈیا" شائع کر کے بدھسٹ آرٹ کو قدیم ترین فن قرار دیا تو اولڈنبرگ نے اس کی واضح طور پر تردید کی۔

بدھ مت کے بارے میں اولڈنبرگ کی تنقیدی صلاحیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ تقریباً ایک صدی پہلے (۱۸۵۶ء) اُس نے اپنے ایک مضمون 'بدھ مت اور اُسطوری کہانیاں' میں یہ بات واضح کی تھی کہ بدھ مت کی خالص مذہبی تحریروں اور اسطوری یا علامتی تمثیلوں میں ایک بنیادی فرق یہ نظر آتا ہے کہ "برہمنوں کی مذہبی اجارہ داری کے خلاف لڑنے والا ابتدائی بدھ مت دھیرے دھیرے خود بھی اُن ہی مذہبی روایات کا شکار ہوا ہے جو برہمن نے عام لوگوں کو شکار کرنے کے لئے قائم کی تھیں"؛

اولڈنبرگ کا یہ تجزیہ درحقیقت بُدھ مت کے اُس طویل سفر کا اجمالی خاکہ ہے جو بدھ مت نے ہن یان سے مہایان اور جنوب سے شمال بلکہ شمال مشرق سے شمال مغرب تک طے کیا۔ اس کٹھن سفر میں بُت شکن گوتم بُدھ کو سب سے بڑا بُت بنا کر گندھارا کے برہمن نے کپل وستو کے شہزادے سے خطرناک انتقام لے لیا۔ بُدھ مت کے قدیم آثار کے بارے میں اولڈن برگ ابتدا سے ہی اس بات پر زور دیتا رہا ہے کہ یہ آثار عام معتقدات سے بُدھ مت کی قربت کی نشاندہی کرتے ہیں اور اُنہی عمومی قوانین کے دائرے میں آتے ہیں، جو دوسرے مذاہب کے عروج و زوال کے پیچھے کارفرما رہے ہیں۔ اولڈن برگ نے ہمیشہ گندھارا آرٹ کے گہرے مطالعہ کی ضرورت پر زور دیا۔ ابتداء میں اکثر ماہرین گندھارا آرٹ کو رومی یونانی آرٹ کی ایک مقامی صورت خیال کرتے تھے لیکن اس مرحلے پر اولڈنبرگ نے اس حقیقت کی طرف نشاندہی کی کہ گندھارا آرٹ نے شمال مغربی ہندوستان کے علاوہ نیپال، تبت، مشرقی تُرکستان، وسطی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا کے فنون کو بھی متاثر کیا ہے۔ اس نے ۱۹۰۱ء میں اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ ہندوستانی آرٹ پر گندھارا آرٹ کے اثرات کی تحقیق کے لئے گندھارا کے آثار کا گہرا مطالعہ کرنا بہت ضروری ہے۔

اولڈنبرگ نے آثارِ قدیمہ کی اہمیت جتلاتے ہوئے اُن مقامات پر سائنسی طریقے سے کھدائی کرنے پر زور دیا جہاں ایسے آثار ملنے کی توقع کی جاتی ہے۔ اُس نے خاص طور پر ہڑپہ میں کھدائی کے کام کو بہت اہمیت دی اور یہ دلیل پیش کی کہ موریہ خاندان کے دَور کے جو ناکافی آثار دریافت ہوتے ہیں، وہ اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ اس سے پہلے یہ علاقہ ثقافتی لحاظ سے بہت ترقی یافتہ ہوگا اور وادیٔ سندھ میں قدیم آثار کی کُھدائی سے ہی ہندوستانی آرٹ کے سرچشمے کو دریافت کرنا ممکن دکھائی دیتا ہے۔ وہ برطانوی مؤرخوں کے برعکس تیسری اور چوتھی صدی قبل مسیح کے آثار کو ہندوستان کی معاشرتی اور ثقافتی ترقی کی راہ میں محض نشانِ منزل خیال کرتا ہے۔

لوک ادب کے مطالعہ سے قدیم تہذیبی آثار کا کھوج لگانا بھی اولڈن برگ کا ایک اہم مشغلہ تھا اور کوئی دو سو برس پہلے ۱۸۸۸ء میں اُس نے برہت کتھا کے تفصیلی مطالعہ پر زور دیا تھا۔ بعد میں گوناڈیہ کی اسی برہت کتھا کو دسویں اور گیارہویں صدی کے کشمیری برہمن عالموں شیمندر کی برہت کتھا منجری اور سوم دیو کی "کتھا سرت ساگر" کا منبع قرار دیا گیا۔ اولڈنبرگ نے پہلی بار برہت کتھا کے مطالعہ کے لئے تبت کی لوک روایات اور بدھ مت کی قدیم کتابوں سے اعانت کو لازمی قرار دیا۔ تقریباً ایک صدی بعد اب روسی عالم سریبریاکوف نے برہت کتھا پر اپنی تحقیق مکمل کر لی ہے۔ شیمندر کی "وتال پنچویمشتیکا" کو گوناڈیہ کی برہت کتھا کا مختصر نثری رُوپ سمجھا جاتا ہے (برہت کتھا کا کوئی نسخہ ہم تک نہیں پہنچا ہے)

اولڈنبرگ پہلے یہ بات بتا چکے تھے کہ کاشغر بدھ مت کی سنسکرت تحریروں کا ذخیرہ ثابت ہو سکتا ہے۔ چنانچہ

۱۸۹۰ء میں اولڈنبرگ نے کاشغر سے خروشتی رسم الخط میں پراکرت زبان کا ایک مخطوطہ دریافت کیا جو مہاتما بُدھ کے اقوال پر مبنی کتاب دھم پد (مذہب کا راستہ) کا مقامی روپ تھا۔ یہ کتاب پہلی صدی عیسوی کی تصنیف مانی گئی ہے جس کی پراکرت زبان شہباز گڑھی میں پائے گئے اشوک کے کتبوں کی زبان سے ملتی جلتی ہے۔ اولڈنبرگ نے بجا طور پر نشاندہی کی تھی کہ دھم پد کا یہ سنسکرت مسودہ گندھارا سے کاشغر پہنچا ہو گا۔ اس نسخے کی اشاعت سے اولڈنبرگ کی شہرت علمی دنیا میں دور دور تک پھیل گئی اور ۱۸۹۹ء میں روم کے مقام پر مستشرقین کی بین الاقوامی کانگرس میں روسی عالم وی رودیوف نے ترکستان میں پائے جانے والے قدیم آثار پر ایک اہم مقالہ پیش کیا۔

وسطی ایشیا اور خاص طور پر مشرقی ترکستان کے علاقے میں بدھ مت کے قدیم مخطوطات اور فنِ صورت گری کا مطالعہ اولڈنبرگ کا خاص میدان رہا ہے۔ اس میدان میں رسم الخط اور زبانوں کی تحقیق کے علاوہ اُسے اس معاملے میں بھی تخصیص حاصل ہے کہ مشرقی ترکستان میں اُس نے جس تحقیقی مہم کی قیادت کی تھی اُس میں دریافت کیے گئے قدیم آثار آج ماسکو میں مشرقی علوم کے مطالعاتی مرکز کا ایک بیش بہا سرمایہ ہیں۔

کاشغر میں مقیم روسی قونصل خانے کے ناظم این پیٹروسکی نے آج سے ایک صدی پیشتر براہمی رسم الخط میں جو مخطوطہ سنسکرت کی تحریر سمجھ کر بھیجا تھا۔ اُس کے بارے میں اولڈنبرگ نے ۱۸۹۲ء میں ہی یہ بات واضح کی تھی کہ یہ سنسکرت زبان نہیں ہے بلکہ یہ ختن کے قدیم شاکا قبائل کی زبان ہے اور اس نوعیت کی بُدھ مت سے تعلق رکھنے والی تحریریں کاشغر میں دریافت ہونے کے بڑے امکانات موجود ہیں۔ جن کی طرف توجہ دینا بہت ضروری ہے۔ ان انکشافات کی وجہ سے کئی یورپی ممالک میں مشرقی ترکستان کے آثارِ قدیمہ کی تحقیق کے سلسلے میں کئی کمیٹیوں کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۹۰۹ء میں اولڈنبرگ ترکستان کی تحقیقی مہم پر گیا اور ۱۹۱۴ء میں اس نے اپنی مہم کا حال شائع کیا تو معلوم ہوا کہ بدھ مت کے دور سے تعلق رکھنے والے ایک ہزار غاروں سے لے کر نقوش اور تصاویر تک کئی خزانے روسی ترکستان میں اب بھی موجود ہیں جو اپنی شناخت اور تعارف کے محتاج ہیں۔ پہلی صدی عیسوی سے لے کر دسویں صدی عیسوی تک وسطی ایشیا میں ان قدیم آثار کو دیکھ کر ہی اولڈن برگ نے یہ پتے کی بات کہی تھی کہ "دنیا کے ایک وسیع و عریض خطے میں پھیلے ہوئے لوگوں (بدھوں) کے لئے اس ہند۔ بودھی تہذیب کا وہی اہم مقام ہے۔ جو مقام یورپ کے لئے بحیرۂ روم کی تہذیب کو حاصل ہے۔"

جب انقلاب روس کا گھر بیج رہا تھا اور چاروں طرف سے خصوصی مفاد رکھنے والے طبقے انقلاب کی ناکامی کے لئے ماسکو پر حملہ کر رہے تھے تو اُسی پُر آشوب دور (۱۹۱۸ء) میں انقلاب کے رہنما وی۔ آئی۔ لینن نے اکیڈمی آف سائنسز کے مستقل سیکرٹری اولڈن برگ سے بھی ملاقات کی تھی۔ لینن کی اس گفتگو سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

"تو یہ ہے آپ کا موضوع (مشرقی تہذیب و تمدن کی تحقیق) جو بظاہر دُور کی بات معلوم ہوتا ہے، لیکن ہم سے بہت قریب ہے۔ آپ عوام سے ملئے۔ آپ (روسی) محنت کشوں کے پاس جا کر اُن کو ہندوستان کی تاریخ کے بارے میں بتائیے۔ انہیں صدیوں سے ظلم کے تلے دبے ہوئے لوگوں کے بارے میں بتائیے جو برطانوی حکمرانوں کے غلبے کا شکار ہیں اور پھر دیکھئے کہ عام لوگ آپ کے جذبات کا کتنا پُرجوش خیر مقدم کرتے ہیں۔ پھر آپ کو یقیناً اپنی نئی تحقیق کے لئے ایک نیا ولولہ

مل جائے گا اور آپ کی تحقیق یقیناً سائنسی اہمیت کی حامل ہو گی۔"

اکیڈمی کے تاریخی ریکارڈ میں نو اپریل ۱۹۱۸ء کی ایک تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس روز عوامی نمائندوں کی کونسل (جس کے چیئرمین لینن تھے) کے سیکرٹری نے اکیڈمی کے مستقل سیکرٹری اولڈنبرگ سے ملاقات کر کے انہیں تحقیقی کاموں کے بارے میں کونسل کی ہر ممکنہ امداد کا یقین دلایا اور جب خانہ جنگی کے بدترین دور یعنی اگست ۱۹۱۹ء میں پیٹروگراڈ کے مقام پر اولڈنبرگ نے بدھمت کے آثار کی نمائش کا اہتمام کیا۔ اور ۱۹۱۹ء ہی میں روسی ادیب میکسیم گورکی نے عالمی ادب کے ایک ایسے اشاعت گھر کا اہتمام بھی کیا۔ جہاں مشرق و مغرب کے بہترین ادب پاروں کو روسی زبان میں منتقل کیا جا سکے تو اس کے مشرقی ادب کے شعبے کی سربراہی اولڈنبرگ کو ہی سونپی گئی۔ جنوری ۱۹۲۱ء میں بھی ایک ایسی ہی اہم ملاقات کا تذکرہ ملتا ہے۔ جب لینن نے گورکی اور اولڈنبرگ سمیت اہم ادیبوں سے ادبی اور ثقافتی صورتِ حال پر تفصیلی گفتگو کی تھی۔

سرگئی اولڈنبرگ کے بعد بھی روسی سکالروں کی برصغیر سے دل چسپی کا سلسلہ برابر قائم رہا۔ ان روسی سکالروں کی فہرست میں کچھ بین الاقوامی شہرت کے لوگ بھی شامل ہیں۔ لیکن سن بیس اور تیس کی دہائیوں میں جو کام سرگئی اولڈن برگ کی ذاتی کاوشوں اور دل چسپی سے ہوا وہ یقیناً ایک اہم کارنامہ ہے۔ (مسلسل)

ابن رشد اور مذہب و فلسفہ کا نزاع

خلیل احمد

"یہ ممکن ہے کہ یونانی فلسفہ اپنے حیات بخش رستے پر رواں رہتا اور اسلام کسی عہد ظلمت سے واقف بھی نہ ہوا ہوتا"۔
(اے۔ جے۔ آربری)

مسلم فلسفے کی کہانی اُس پیچ در پیچ الجھاؤ کی کہانی ہے جو مذہب اور فلسفے کے نزاع کے گرد بنا گیا۔ مسلم زمین پر یونانی منطق اور فلسفے کے جڑ پکڑنے اور پھلنے پھولنے کے ساتھ اسلامی الٰہیات دل میں ایک مسلسل چبھن پیدا ہو گئی تھی۔ اس سے نجات حاصل کرنے کی بے شمار کوششیں کی گئیں جو ناکام ثابت ہوئیں اور نتیجتاً مشرق وسطیٰ کی مسلم ذہنی زندگی اور ثقافت ناتواں، جامد اور تخلیقی رنگ سے عاری ہو کر رہ گئی۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ مسلم فلسفیوں اور الٰہیات دانوں، عقیدہ پرستوں اور عقلیت پسندوں، روایت پرستوں اور جدت پسندوں، آزاد طبعوں اور آزاد خیالوں، متکلمین اور منحرفین، بنیاد پرستوں، پارساؤں، صوفیوں اور سکالروں، مصلحوں اور معلموں، سیاسی مدبروں اور سیاست دانوں، خلفاء اور بادشاہوں کی بہترین کوششوں کے باوجود یہ چبھن ویسے ہی موجود ہے۔ آج بھی یہ اپنا وجود، اگرچہ اب مختلف طور پر مغربی فلسفے اور سائنس کی صورت میں، اکثر اور زیادہ شدت سے کرداتی ہے۔

اپنے مذہب کے لئے یونانی منطق اور فلسفے کے مضمرات و منکشفات سے نبرد آزمائی میں مسلم فلاسفہ کئی نظریات سے رجوع لائے۔ تاہم اُن کے ذہنوں میں اول و آخر مقصد اپنے مذہب کا تحفظ ہی تھا۔ اس نازک علمی صورت حال کا ادراک انھوں نے دو اہم مسائل کی شکل میں کیا۔ اول، مذہب اور فلسفے کے مابین نزاع کو کیسے دور کیا جائے؟ اور دوم، فلسفے کے پھیلاؤ کو کس طرح روکا جائے؟ کہا جا سکتا ہے موخرالذکر اول الذکر کے حل کی طرف ایک قدم کے طور پر ابھر کر سامنے آیا تھا۔ درحقیقت، فکر یونانی کی آمد سے پہلے ہی مسلم مفکرین فلسفیانہ امور کے فروغ کو روکنے کی طرف مائل تھے۔ اُن کے نزدیک خلاف مذہب لامذہبی اور غیر مذہبی خیالات وسیع پیمانے پر پھیلنے سے روکنے کے لئے یہی سب سے محفوظ طریقہ تھا۔ آگے چل کر اسی طریقے کو نظری ڈھانچے میں تشکیل کر لیا گیا۔ اس سے مقصود "باطنی" علوم کی ترویج کو مسلمان علماء میں محدود کرنا ہی نہ تھا جو مسلم معاشرے کی ایک مختصر اقلیت پر مشتمل تھے، بلکہ مسلمان عامۃ الناس کی اعلیٰ تعلیم کے راستوں کو مسدود کرنا بھی تھا۔ لہٰذا یہ کہنا بجا ہوگا کہ اگر ایک طرف فلسفے کے خطرات کو دور کر کے عوام کا ایمان بچا لیا گیا تو دوسری طرف، نتیجتاً، علم کی جمہوری ترویج کا انسداد بھی ہو گیا۔

مذہب اور فلسفے کے اس نزاع میں موخرالذکر کو مکمل شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ علمیاتی سطح پر وحی اور عقل کے درمیان اس معرکے میں راسخ الاعتقادی اور مذہبی قطعیت نے تحمل، اعتدال، اور انسانی جانبداریت پر غلبہ پا لیا۔ مختصراً یہ کہ عقل کو رد عقل اور فلسفے کو غیر فلسفہ بنا دیا گیا۔ "جب ہم ابن خلدون (۱۳۳۲-۱۴۰۶) تک پہنچتے ہیں"، تو اُسے یہ اعتراف کرتے ہوئے سنتے ہیں کہ "عقل ..... خدا کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتی، اُس کی احدیت کو نہیں جان سکتی اور نہ ہی اُس کی صفات کو پا سکتی ہے۔ خدا ناقابل ادراک ہے اور ہمیں وہ کچھ قبول کر لینا چاہیے

جو کچھ اس کے بارے میں اس کے پیغمبر بتاتے ہیں۔" (۲)۔ ڈنکن بی۔ میکڈانلڈ تمام حجت یوں کرتا ہے: "یہ تھا اسلام میں فلسفے کی تباہی کا نتیجہ۔" اسی بات کو ایک پارسا ملا اپنی اصطلاحات میں اس طرح ملفوظ کرے گا: "اس دنیا کو کھو کر مسلم امہ نے خدا کی خوشنودی حاصل کر لی اور پھر جنت الفردوس بھی" لیکن اسی بات کو بیان کرنے کا ایک سماجی سائنس داں کا انداز بالکل مختلف ہوگا۔ اس کے مطابق مسلمان عوام نے اس طرح ناقابلِ تلافی نقصانات اٹھائے اور ناقابلِ علاج زخم بھی کھائے۔ نہ صرف مسلمان برادری کے وقار کو بڑا دھچکا لگا، بلکہ جیسا کہ ہمیں اسلامی تاریخ کے صفحات بتاتے ہیں، اس نزاعی جنگ میں پھنس کر مسلم دنیا کے عمدہ اور عظیم ترین ذہن ضائع بھی ہوئے۔

ابن رشد مسلم مغرب کا ایک ایسا ہی عمدہ اور عظیم فلسفی تھا۔ وہ موحدین کے دور میں بارھویں صدی عیسوی گزرا ہے۔ وہ سب سے بڑا شارح ارسطو اور فلسفے کا آخری حامی و ناصر گردانا جاتا ہے۔ ابن رشد پر الحاد کا فتویٰ لگا اور اسے قرطبہ سے جلا وطن ہونا پڑا۔ اس کی فلسفیانہ تصنیفات اس کی آنکھوں کے سامنے سرِ عام شعلوں کی نذر کی گئیں۔ کہا جاتا ہے کہ بسترِ مرگ پر اس کے ہونٹوں پر یہ الفاظ تھے، "میری روح فلسفے کی موت مر رہی ہے۔" (۴)

اپنے پیش روؤں کی طرح ابن رشد بھی یہ تسلیم کرتا ہے کہ صداقت دو طرح کی ہوتی ہے، فلسفیانہ اور مذہبی۔ اس سے پہلے دوسرے مسلم فلاسفہ بھی مسلمہ طور پر یہی خیال رکھتے تھے۔ وہ اپنی معصومیت میں، ان مقدمات سے آغاز کرتے تھے: قرآن سچائی ہے اور فلسفہ (بھی) سچائی ہے۔ (۵) ان میں اکثر فلسفی دونوں میں سے کسی ایک مقدمے کو بھی ترک کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ فلسفہ اس لیے کہ عقل اور اپنے شخصی حکم کی صحت پر ان کا یقین تھا۔ مزید براں انھوں نے اسے (فلسفے کو) کم و بیش ایک متضاد تفکر کی شکل میں نہیں، بلکہ صداقت کی ایک صورت کے طور پر قبول کیا" (۶) عرب فلسفی الکندی (۸۰۳-۸۷۳) پہلے ہی اس علمی رویے کا مکمل اظہار کر چکا تھا: "یہ مناسب ہے کہ ان لوگوں کا بے انتہا شکر گزار ہوا جائے جنھوں نے سچائی (کی تلاش میں) ذرا سا بھی حصہ ڈالا ہے، اُن کا تو ذکر ہی کیا جنھوں نے بہت زیادہ اضافہ کیا۔ ہمیں سچائی کو تسلیم کرنے میں شرم محسوس نہیں کرنی چاہیے، چاہے یہ کسی بھی ذریعے سے ہم تک پہنچے، حتیٰ کہ چاہے یہ گزری ہوئی نسلوں اور غیر لوگوں سے بھی پہنچے۔ کیونکہ جو سچائی کی جستجو کرتا ہے، اُس کے نزدیک خود سچائی سے بڑھ کر کوئی چیز زیادہ قدر و قیمت کی حامل نہیں ہوتی: نہ تو یہ کبھی بے وقعت ہوتی ہے اور نہ کبھی اسے پستی کا شکار کرتی ہے جو اس کی تلاش کرتا ہے، بلکہ اُسے مشرف و معزز کرتی ہے۔" (۷)

جہاں تک مذہب کا تعلق تھا، اُن کے آباؤ اجداد، قریبی اعزہ اور ہم قوموں کا دین ہونے کی حیثیت سے یہ اُن پر جیسے کہ جبلی طور پر واجب تھا۔ اپنی کتاب "تہافت التہافت" میں ابن رشد واضح طور پر بیان کرتا ہے: "ایک عالم آدمی کی فضیلت کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ان نظریات کو نہ جھٹلائے جن کے درمیان رہ کر اُس کی پرورش ہوئی ہے، اور یہ کہ اُسے نہایت انصاف سے ان نظریات کی تشریح کرنی چاہیے، اور یہ کہ اُسے یہ سمجھنا چاہیے کہ ان نظریات کی روح اُن کے آفاقی کردار میں پنہاں ہے، ان کی تخصیصیت میں نہیں، اور یہ کہ اگر وہ ان مذہبی اصولوں کے بارے میں شک و شبہے کا اظہار کرتا ہے جن کے درمیان اُس کی پرورش ہوئی ہے، یا اُن کی تشریح اس طرح کرتا ہے کہ وہ پیغمبروں کے متخالف معلوم ہوں اور ان (پیغمبروں) کے راستے سے منحرف ہو جائے، وہ اس بات کا سب سے زیادہ مستحق ہے کہ کافر کی اصطلاح اُس پر منطبق کی جائے، اور وہ اس سزا کا سزاوار ہو جاتا ہے جو اُس مذہب میں کفر کے لئے قائم کی گئی ہے جس میں اُس کی پرورش ہوئی ہو۔" (۸)

لہٰذا مذہب اور فلسفے میں سے انھوں نے کسی ایک پر بھی شک و شبہے کا اظہار نہیں کیا، بلکہ اس کے برعکس، انھوں نے دونوں کو صداقت کی قطعی اشکال کے طور پر قبول کر لیا۔ اُن کا یہ قبول اس نازک دعوے میں مضمر خطرات کے احساس سے بالا تھا۔ علیاتی طور پر عقل اور وحی کو ایک ساتھ علم کے دو ذرائع کا درجہ دیا گیا۔ علم کے صوفیانہ ذریعے کے سلسلے میں یہ واضح ہے کہ ابن رشد اگرچہ صوفیا کے

براہِ راست علم سے انکار نہیں کرتا، تاہم وہ یہ دلیل ضرور دیتا ہے کہ اس کا تجربہ اس حد تک عمومی نہیں کہ اسے الٰہیاتی علم کی بنیاد بنا لیا جائے۔(۹)
یہاں چلتے چلتے یہ اضافہ بے جا نہ ہوگا کہ اکثر صوفیا نے عقل اور وحی دونوں کو رد کیا اور اُن کی جگہ صوفیانہ اشراق کو متمکن کیا۔ منصور الحلاج (متوفی ۹۲۲) نے "خدا کے براہِ راست علم" کے اپنے تجربے کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: (۱۰)

اب حق (سچائی) اور میرے درمیان کوئی چیز حائل نہیں
چاہے یہ عقلی منطقی علم ہو،
چاہے دلیل اور وحی ہو؛
اب، روشن منور راہ (یعنی حق کی تابانی نے
میری نظروں سے دور کر دیا ہے
ہر جھلملاتی، ٹمٹماتی روشنی کو

تاہم اس کے مقابلے میں مستثنیات ڈھونڈنا مشکل نہیں۔ مثال کے طور پر، یہ ابوبکر الرازی (؟۹۲۳-۸۶۵) تھا جس نے علم اور سچائی کے جہانوں میں فلسفے کو بلا شرکتِ غیرے حکمرانی کے حق سے سرفراز کیا" وہ ایک جرأت مند اور جیء اد مفکر تھا۔ اس نے مذاہب مذمت کی، جو اُس کے مطابق، دنیا میں خیر کی نسبت شر زیادہ لائے، اور اُس کی نظر میں یہ تمام کسی حد تک متناقض ذات کا شکار ہیں"(۱۱) اُس نے قطعی طور پر انکار کیا کہ فلسفے کی مذہب کے ساتھ مصالحت کا کوئی امکان بھی ہے۔ اُس کے مطابق، مذاہب — ان میں سے اکثر — فلسفیانہ تفکر اور ایک لحاظ سے سائنسی تحقیق کے دشمن ہیں ...... وہ اس بات کا مؤید بھی تھا کہ عقل کو وحی پر برتری حاصل ہے"(۱۲) الرازی کی نظر میں، "یہ صرف فلسفیانہ جستجو سے ہی ممکن ہے کہ انسان اپنی حالت کو بہتر بنا سکے: "جس نے بھی مطالعے اور تحقیق کے لیے سعی کی اور اپنے آپ کو اس میں منہمک کیا وہ سچائی کے راستے پر چل پڑا۔ حقیقتاً، انسانی روحوں کو اس دنیا کی دلدل اور تیرگی سے پاک اور آئندہ دنیا کے لئے سلامت رکھا جا سکتا ہے — لیکن یہ فلسفیانہ تفکر ہی سے ممکن ہے"(۱۳) یہاں اس بات کی طرف دھیان دلانا مناسب ہے کہ اگر مذہب نے، مغرب اور مشرق ہر دو جگہ، فلسفے کے مسائل کو پیچیدہ بنایا تو فلسفے نے بھی جواباً، مذہب کو لاینحل مسائل میں الجھا کر رکھ دیا، حد یہ کہ عقلی سطح پر اسے تقریباً ناممکن بنا دیا۔ اس سلسلے میں الرازی اور الراوندی وغیرہ کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔

فلاسفہ سے قطع نظر، الٰہیات دونوں کے گروہوں میں، عقل کو دعویٰ صداقت سے محروم کرنا اور وحی کو حقیقی علم کے تنہا اور مطلق سرچشمے کا منصب عطا کرنا، قریب قریب ایک اخلاقی فیشن تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ سند، وحی، اور عقل، اور کبھی بیک وقت ان تینوں سے بھی رجوع لاتے تھے۔ انھوں نے عقل کی ایک یکتا خاصیت کا فائدہ یوں اٹھایا کہ عقل کو عقل ہی کی مخالفت میں اور اسی کو نابود کرنے کے لیے استعمال کیا۔ مزید یہ کہ تقریباً تمام مسلمان فلسفی، اپنے دوسرے اختلافات کو نظر انداز کرتے ہوئے، عقلی علم کو چند منتخب لوگوں تک محدود رکھنے پر بھی اتفاق کرتے تھے۔

لیکن ان تمام فلسفیوں کے لیے کسی تسلی بخش نتیجے پر پہنچنا تقریباً ناممکن تھا جنھوں نے فلسفے اور مذہب دونوں کو صداقت کے دو مظاہر کے طور پر قبول کیا تھا۔ ان میں سے اکثر نے ان دونوں کے مابین کسی نہ کسی طرح کی مصالحت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ابوبکر الرازی اور دوسروں کی طرح وحی کو رد کرنے کے لیے جرأت، اور استقلال کی ضرورت تھی جبکہ الٰہیات دانوں کی طرح عقل کو مسترد کرنے کے لیے کچھ بھی درکار نہ تھا۔ اول الذکر اتنا ہی مشکل اور مردانہ کام تھا جتنا آخر الذکر آسان اور معتقدانہ۔ اور فلسفے اور مذہب کو صداقت اور تیقن کے یکساں دعووں کے ساتھ پہلو بہ پہلو رکھ دینا ایک بچگانہ کرتب تھا؛ تاہم وحی کو عقل سے بالاتر مقام عطا کرنا یا وحی کو عقل کے تابع کر دینا

ہی کسی حل کا درجہ رکھتے تھے، اور ان کو بلا امتیاز کام میں لایا گیا۔ یہ حل بھی مذہبی صداقت کی ماہیت کے لیے کس حد تک مہلک ثابت ہوتا ہے اور دوہری صداقت کے نظریے کی حیثیت سے ناکام ہو جاتا ہے ——— یہ اس تحریر میں آگے چل کر دکھایا جائے گا۔

صداقت کی دو اقسام فلسفہ اور مذہب کے مقام کے بارے میں ابن رشد کی تحریروں میں ہمیں کوئی فیصلہ کن رائے نہیں ملتی۔ اس کی دلیل کے ارتقا کے مطالعے یا مذہب کو فلسفے کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی اُس کی کوشش کو مجموعی طور پر پرکھنے سے ہی ہم اُس کے خیالات کو جاننے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ بنیادی طور پر ہمارا انحصار اُس کی ایک اہم تحریر "کتاب فصل المقال و تقریر ما بین الشریعۃ و الحکمۃ من الاتصال" (کتاب فیصل متعلق بہ تذکرہ، اور اس تعین کے بارے میں کہ مذہب اور فلسفے میں کیا رشتہ ہے) پر ہوگا۔ اسے عربی سے انگریزی میں جارج ایف ہورانی (Georage F. Hourani) نے منتقل کیا ہے۔ (۱۴) جس طرح "تہافت التہافت"، "تہافت الفلاسفہ" کے الزامات کا نکتہ بہ نکتہ رد ہے، "فصل المقال" کافی حد تک (الغزالی کی) "فیصل التفرقہ" کا قانونی (شرعی۔ خ۔ ا) استرداد ہے: "جس میں ابن رشد نے اس قانونی سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے کہ کتاب قرآن کی کونسی تمثیلی تعبیرات (تاویلات) بطور کفر رد کرنے کے قابل ہیں۔۔۔" (۱۵)

اگر الغزالی (۱۱۱۱-۱۰۵۸) نے، جسے ابن رشد "مرتد فلسفہ" (۱۶) کا نام دیتا ہے، اس طرح کے نازک امور کو شہرت عام نہ دی ہوتی تو ابن رشد کے خیالات بھی لفظی وجود سے عاری رہتے اور ہما شما تک نہ پہنچتے کیونکہ وہ عام انسانوں کے لیے نہیں تھے۔ "قانون (شرع۔ خ۔ ا) کے خلاف اور فلسفے کے خلاف"، الغزالی کے اس "جرم" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، ابن رشد کتاب فصل المقال کے دوسرے باب میں اپنا اعتذار یوں پیش کرتا ہے: "اگر یہ ایسا نہ ہوتا کہ اس معاملے (یعنی مذہب اور فلسفے کے درمیان ارتباط) اور ان سوالات کو، جن پر ہم نے بحث کی ہے، اتنی شہرت دی گئی ہوتی تو ہم اپنے آپ کو اس موضوع پر ایک لفظ بھی لکھنے کی اجازت نہ دیتے؛ اور ایسا کرنے پر ہمیں عذر بھی نہ تراشنے پڑتے۔۔۔۔۔۔" (۱۷)

ابن رشد کے مطابق یہ ایک "حقیقت ہے کہ فلسفہ مذہب کی ساتھی اور دودھ شریک بہن ہے۔" (۱۸) وہ ایک بات پر متاسف ہوتا ہے کہ "ہماری روح اُن برے قیاسات اور بگڑے ہوئے اعتقادات کی وجہ سے بہت دکھ اور تکلیف میں ہے جو اس مذہب (یعنی اسلام۔ خ۔ ا) میں سرایت کر آئے ہیں، بالخصوص ایسی آفات جو اُن لوگوں کے ہاتھوں برپا ہوئی ہیں جو فلسفے کے ساتھ اپنی قربت کے دعویدار ہیں۔" مزید براں "عداوت، نفرت اور مخاصمت سے قطع نظر، جو اس طرح کے (آزار) دونوں کے درمیان ابھارتی ہیں"، مذہب اور فلسفہ "فطرتاً اور ماہیتاً رفیق اور جبلی طور پر ایک دوسرے سے محبت کرنے والے ہیں۔" (۱۹) اگرچہ دونوں کے مابین نزاع اور کشاکش موجود ہے اور فلسفے نے مذہب کو گہرے زخم بھی لگائے ہیں، تاہم وہ دونوں، دودھ شریک بہنیں، "رفیق"، اور "محب" ہیں، فطرتاً بھی، ماہیتاً بھی اور جبلی طور پر بھی: ان بیانات کا خواہش مندانہ کردار صاف عیاں ہے۔ واقعتاً، اگر فلسفے اور مذہب کی نوع اور فطرت ایک ہی ہے اور اگر ان دونوں کے درمیان کوئی غیر ہم آہنگی اور پھوٹ نہیں ہے، تو ان کو ہم آہنگ بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ محتاط طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ "تکالیف"، "آزار"، اور "عداوت"، "نفرت" اور "مخاصمت" کے باوجود ابن رشد ان دونوں کے درمیان ایسی کسی صورت حال کے موجود رہنے کی اجازت نہیں دیتا ہے کیونکہ اس طرح اُس کی ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کو بے معنی اور لاحاصل قرار دیا جا سکتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر، وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ مذہب اور فلسفے میں اگرچہ مغائرت پائی جاتی ہے لیکن اس کی نوعیت بنیادی اور لازمی نہیں، بلکہ ظاہری اور عارضی ہے۔

اب ہم اس بات کی طرف آتے ہیں کہ ابن رشد اور فلسفے کے مابین تعلق کے بارے میں کیا تصور رکھتا ہے۔ کتاب فصل المقال کے آغاز میں وہ یہ اقرار کرتا ہے کہ "فلسفے کا عمل موجودات اشیاء کا مطالعہ اور صناع کی نشانیاں دیکھتے ہوئے ان پر غور و فکر ہے، اس سے بڑھ کر

کچھ نہیں"۔ وہ کہتا ہے کہ "اشیا اپنی صناعت کے بارے میں ہمارے علم کے واسطے سے صرف صناع کو ظاہر کرتی ہیں، اور جتنا مکمل ہمارا یہ علم ہوتا ہے صناع کے بارے میں ہمارا علم اتنا ہی مکمل ہوتا جاتا ہے"(۳۰) ایک دوسری جگہ وہ استدلال کرتا ہے کہ "وہ جو صناعت کو نہیں سمجھتا وہ صناعت کے ثمر کو بھی نہیں سمجھتا اور جو صناعت کے ثمر کو نہیں سمجھتا وہ صناع کو نہیں سمجھتا"(۳۱) اس کے خیال میں فلسفہ صناعت الصنائع ہے۔(۳۲)

ابن رشد کی یہ دلیل نہ صرف اُس کی بنیادی فکر کے حق میں ہے کہ قرآن نے فلسفیانہ علم کے حصول کو واجب قرار دیا ہے اور موجودات پر غور و فکر کی دعوت دی ہے اور اس کی حوصلہ افزائی کی ہے، بلکہ اُس کے اِس نقطۂ نظر کو بھی تقویت پہنچاتی ہے کہ فلسفہ خدا، تخلیقات اور خود کی تفہیم کا علم ہے۔ اس طرح، بالآخر، مذہب اور فلسفہ ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے ہیں، یا دوسری صداقت کا نظریہ وحدتِ صداقت کے نظریے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہاں پر ہی اصل مسئلہ سامنے آتا ہے اور مشکلات سر اٹھاتی ہیں۔ فصل المقال کے انگریزی ترجمے کے نہایت ہی عمدہ تعارف میں جارج ایف ہورانی اس بات کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہتا ہے کہ "اگر ابن رشد 'دوہری صداقت کے نظریے' کا علمبردار ہوتا، جیسا کہ اس کے بارے میں تیرھویں صدی کے لاطینی حلقوں میں خیال کیا جاتا تھا، تو کوئی مسئلہ پیدا ہی نہ ہوتا۔ الہامی صداقتیں 'مذہبی اقلیم' اور دنیا کی صداقتیں 'فلسفیانہ اقلیم' میں سچ ہوتیں اور ان کے درمیان کوئی تضاد پیدا نہ ہو سکتا۔ مسئلہ صرف اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ وہ صداقت کا وحدانی نظریہ پیش کرتا ہے۔ کتاب فرقان بھی اُسی دنیائے حقیقت کے بارے دعاوی کرتی ہے جس کے بارے میں فلسفہ؛ لہٰذا اگر ان میں سے کسی ایک میں بھی غلط دعوے موجود ہوں تو ان کے درمیان نزاع قابلِ فہم ہے"۔ (۳۳)

اس کے مقابلے میں ماجد فخری کا خیال ہے کہ "ابن رشد دراصل اپنے دوہرے علم (فلسفہ اور الٰہیات) کے نظریے میں بہ آرام متمکن ہے جس کے مطابق صداقت دوہری ہے اور ہر ایک اپنے اپنے دائرے میں درست"۔ (۳۴) ابن رشد کے "دوہری صداقت کے نظریے" کی وضاحت کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ "عقل اور ایمان کے دائروں کے مابین امتیاز کرنے کے بجائے، ابن رشد متابعت قائم کرتا ہے جس میں ایمان کی سلامتی کو قربان کر دیا جاتا ہے اور الٰہیات کے دعاوی کو بالجبر دبانے کے لیے عقل کو مجاز ٹھہرایا جاتا ہے۔ اس طرح، الٰہیات اور فلسفہ یعنی ایمان اور عقل کے دائروں کے درمیان تفریق کرنے کے بجائے انھیں وسعت و رسائی اور مابعد الطبیعیاتی بنیادوں کے لحاظ سے ہم نوع قرار دے دیا جاتا ہے۔ چلیے اس لحاظ سے نہ سہی کہ ان کا مُثبت مواد و مافیہ کیا ہے، کم از کم اس لحاظ سے تفریق کی جانی چاہیے تھی کہ ان کی صحت و درستگی کی بنیادیں کیا ہیں"۔ (۳۵) اس طرح ماجد فخری نے اپنے پہلے بیان کی خود ہی کسی حد تک تغلیط کر دی ہے، کیونکہ متابعت قائم کرنے کا مطلب بالآخر یہی ہے کہ ایک کی برتری دوسرے پر تسلیم کر لی گئی ہے۔

فلسفے کے بارے میں لکھنے والے ایک پاکستانی بھی اسی نقطۂ نظر کے حامی ہیں: "ابن رشد کا خیال یہ ہے کہ مذہب اور فلسفہ اپنے اپنے معطیات و مافیہ کے باب میں نہ سہی، کم از کم صداقتِ مشترک کے اظہار کے بارے میں ضرور ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہیں۔ صحیفۂ آسمانی کی ہر تمثیل بہ سبب اس کے کہ وہ عوام کی عقل کے عین مطابق ہوتی ہے، عوام کی نظر میں صداقتِ تامہ کا حکم رکھتی ہے مگر فلاسفہ اسے صداقتِ تامہ تسلیم نہیں کرتے۔ یہی حال عوام کا بھی ہے کہ صحیفۂ آسمانی کی کسی تمثیل کو جب فلاسفہ اپنے تصورات کے رنگ میں پیش کرتے ہیں تو وہ ان کی سمجھ میں نہیں آتی اس لیے وہ اسے صداقتِ تامہ نہیں مانتے۔ لہٰذا بہتر تو یہی ہے کہ عوام اور فلاسفہ دونوں کی تعبیرات کو دو صداقتوں کی حیثیت سے الگ الگ ہی رکھا جائے اور اس نقطۂ نظر کو تسلیم کر لیا جائے کہ بعض باتیں دینیات کی رو سے صحیح ہوتی ہیں خواہ انھیں فلسفہ قبول نہ کرے اور اسی طرح بعض باتیں فلسفے کی رو سے صحیح ہوتی ہیں، خواہ انھیں دینیات تسلیم نہ کرے۔ اس طرح ابن رشد کے ہاں عالمِ رحمت سے عالمِ فطرت الگ کر دیا گیا۔ اول الذکر عالم اہلِ دینیات کی تلاش و جستجو کے لیے مختص کر دیا گیا اور بعد الذکر کو سائنس دانوں اور فلسفیوں کی عالمانہ تگ و تاز کے لیے"۔ (۳۶)

یہاں اس بات کی وضاحت بجا ہے کہ ابن رشد اس نام نہاد منسوب کردہ "دوہری صداقت کے نظریے" کی بنیاد اپنے انسانی عقل

کے درجات کے نظریے پر نہیں رکھتا، جیسا کہ مذکورہ بالا اقتباس سے قیاس گزرتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اُس نے "صداقت ثلث کا نظریہ" وضع کیا ہوتا۔ مزید براں یہ کہنا کہ وہ صداقت کے دو مختلف یعنی مذہبی اور فلسفیانہ اظہارات کو بہت اہمیت دیتا تھا، اُس کے نقطۂ نظر کی درست تفہیم میں رکاوٹ ڈالنے کے مترادف ہے۔ اگر مذہب اور فلسفہ مواد اور اظہار دونوں میں مختلف اور متمیز تصور نہ کیے جاتے ہوئے اچھا کہ یہ اُس کے وقت میں کیے جاتے تھے، تو ابن رشد نے ان کی مصالحت کا کام اپنے ذمے ہرگز نہ لیا ہوتا۔ اختلاف کی عدم موجودگی میں مذہب اور فلسفے کے درمیان ہم آہنگی کی کوشش کار لاحاصل معلوم ہوتی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ ابن رشد انھیں متمیز اور قابلِ تفریق نہیں سمجھتا؛ بلکہ یہ کہنا سچائی سے زیادہ قریب ہے کہ وہ ان کے درمیان مصالحت کی کوشش محض اس لیے کرتا ہے کہ انھیں ہم آہنگ اور ایک دوسرے کے دوست تصور نہیں کیا جاتا، اور اکثر دو متحارب فوجوں کی طرح برسرِ پیکار کر دیا جاتا ہے۔ ابن رشد کے ضمن میں خاص طور پر یہ غلط فہمی بہت عام ہے کہ اُس نے صداقت کے دوسرے نظریے کی وکالت کی، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ نظریہ، اُس سے صدیوں پہلے سے، شعوری یا غیر شعوری سطح پر مسلمان دانشوروں میں غیر متشکل طور پر کسی نہ کسی صورت میں موجود تھا؛ اور ابن رشد کو پہلے ہی سے موجود ان لرزاں بنیادوں پر اپنی فکر کی عمارت تعمیر کرنا پڑی۔

دوہری صداقت کے نظریے سے متعلق ڈاکٹر فضل الرحمٰن کسی قدر مختلف نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ ان کے مطابق "اپنی کتاب 'فصل المقال' میں ابن رشد نے نیم مشابہ، نیم اختلافی نقطۂ نظر دیا اور "دو صداقتوں" ـــــ ایک مذہبی اور ایک عقلی ـــــ کے نظریے کے اظہار کے انتہائی قریب آگیا۔"(۲۷) لیکن ہماری رائے میں ابن رشد کی فکر کا حقیقی اور بنیادی نکتہ یہ ہے کہ صداقت اپنی اصل میں ایک ہے۔ اس سلسلے میں یہ دلیل دی جاسکتی ہے کہ اگر وہ اس طرح کا عقیدہ نہ رکھتا ہوتا تو اُس نے کتاب فرقان کو محض تعبیر و تاویل کی ایک چیز بنا دیا ہوتا۔

یوں مذہب اور فلسفے یا مذہبی یا فلسفیانہ اقالیم کے ادغام سے بہت سی مشکلات پیدا ہوئیں۔ ابن رشد ان تمام سے عہدہ برآنہ ہوسکا۔ شاید وہ ان مخفی خطرات سے بے خبر تھا جو اس ناقابلِ اتحاد متحدین کی اتحادیت میں پوشیدہ تھے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ اپنے مقصد سے شدید جذباتی وابستگی رکھتا۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ "صداقت، صداقت کی متخالف نہیں ہوتی بلکہ متوافق ہوتی ہے اور اس کی شہادت بنتی ہے۔" اس کا کہنا ہے کہ "چونکہ یہ مذہب (یعنی اسلام ـ خ ا) حق ہے اور اُس تعلیم کی طرف مدعو کرتا ہے جو صداقت کے علم تک رہنمائی کرتی ہے، ہم مسلمان لوگ یقینی طور پر جانتے ہیں کہ استدلالی علم ایسے (نتائج) تک رہنمائی نہیں کرتا جو کتاب فرقان میں موجود بیانات سے متنازع ہوں۔"(۲۸) یہی وجہ ہے کہ قرآن میں بیان کی گئی صداقتوں اور استدلالی علم کی صداقتوں میں کوئی تضاد واقع نہیں ہوسکتا، کیونکہ یہ جوہرِ صداقت ہے کہ صداقت صداقت کے متخالف نہیں ہوتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایک ہی صداقت ہے جو کتاب فرقان میں اور/یا استدلالی اور فلسفیانہ علوم کی کتابوں میں ظہور پاتی ہے۔

تاہم جب بھی استدلالی علم کسی وجود کے بارے میں کسی علم تک پہنچتا ہے، تو کتابِ فرقان میں وہ وجود یا تو ناگزیر طور پر ظاہر نہیں کیا گیا ہوتا یا ظاہر کیا گیا ہوتا ہے۔ اگر یہ ظاہر نہیں کیا گیا ہے تب تو کوئی تضاد نہیں، اور یہ بالکل اُس معاملہ کی طرح ہے جس میں اُس عمل کو فقیہ کو قیاس کی مدد سے کتابِ فرقان سے اخذ کرنا پڑتا ہے جس کی نوع کے بارے میں ظاہر نہیں کیا گیا ہے۔ اگر کتابِ فرقان اس کے بارے میں کچھ کہتی ہے تو لفظوں کا ظاہری مفہوم اس سے متعلق استدلال کے نتائج سے ناگزیر طور پر یا تو متوافق ہوتا ہے یا متخالف۔ اگر یہ (ظاہری مفہوم ـ مترجم) متوافق ہوتا ہے تب تو کوئی حجت نہیں۔ اگر یہ متخالف ہوتا ہے تب اس کی تمثیلی تعبیر کی ضرورت پڑتی ہے۔"(۲۹) مذہب اور فلسفے کے درمیان فرد کیا ہوا نزاع یہاں عقل اور وحی کے درمیان نزاع کی صورت میں ایک مرتبہ پھر اُبھر آتا ہے۔ اگر صداقت ایک ہے تو اس کی دو (یا زیادہ) صورتوں عقل اور الہام کے درمیان کسی نزاع یا تضاد کا مطلق کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ پھر بھی اگر مذہبی صداقت اور فلسفیانہ صداقت میں نزاع یا تضاد پیدا ہوتا ہے یا ان کے درمیان کوئی توافق پیدا نہیں ہو پاتا، تو مذہبی صداقت کی تاویل خاص انداز سے کرنی پڑے گی۔ یا اگر عقلی صداقت۔ الہامی صداقت

کے مطابق نہیں، پھر بھی الہامی صداقت ہی کی مناسب تعبیر کرنی پڑے گی۔ ان دونوں صورتوں میں واقعتاً کوئی فرق نہیں۔ صورتِ حال کو کسی بھی طرح پیش کریں، وہی نتیجہ سامنے آئے گا۔ اپنے خلوص اور مذہبی اعتقاد میں اور شاید بے خبری میں ابن رشد، مذہبی صداقت کو عقلی صداقتوں کے ساتھ صلح کرنے پر مجبور کر دینا چاہتا ہے۔

ہمارے لیے یہاں ابن رشد کے تمثیلی تعبیر کے طریق کار کی تفصیل میں جانا غیر متعلق ہے؛ دو اہم سوالات کے اُس نے جو جواب دیئے وہ یہ دکھانے کے لیے کافی ہوں گے کہ ابن رشد جیسے ایک فلسفی کے لیے فلسفیانہ صداقت کے ساتھ (مذہبی صداقت کا ۔ خ۔) اتفاق ایک لازمی معیار تھا۔"(۳۰) اور یہ کہ تمثیلی تعبیر قطعی طور پر عام لوگوں کے لیے نہیں تھی، چاہے اُن کا جو بھی مقام ہو۔ تفسیر کے اس طریق کار کے سلسلے میں دو بنیادی سوال سامنے آتے ہیں: پہلا یہ کہ ہم اس بات کا تعین کیسے کرتے ہیں کہ آیا تمثیلی تعبیر کی جائے یا نہیں؛ اور دوسرا یہ کہ کتاب فرقان کی تمثیلی تعبیر کرنے کا حق کسے ہے؛ دوسرے سوال کے بارے میں ابن رشد کا کہنا ہے کہ کتاب فرقان نے "ہمیں تاکید کی ہے کہ خدائے بلند و برتر اور اس کی تمام تخلیقات کا استدلالی علم حاصل کریں۔ لیکن یہ ترجیحاً بہتر ہے اور اس کے لیے ضروری بھی، جو خدائے بلند و برتر اور دوسرے موجودات کو استدلالی طور پر سمجھنا چاہتا ہے، کہ وہ پہلے استدلال کی اقسام اور ان کی شرائط (صحت۔ مترجم) اور اس بات کا فہم حاصل کرے کہ استدلالی توجیہہ جدلیاتی لسانی، خطیبانہ اور کاذبانہ توجیہہ سے کس طرح مختلف ہے۔"(۳۱) اس کی تحصیل میں وہ کسی بھی طرح کے فرقہ وارانہ تعصبات کو جگہ دینے کے خلاف ہے ہمیں متقدمین کی کتابوں سے فیض حاصل کرنا چاہیئے۔ یہ غیر ضروری ہے کہ آیا یہ کتابیں ہم مذہبوں نے لکھیں یا اُن لوگوں نے جو ہمارے اعتقاد سے مختلف اعتقاد رکھتے ہیں؛

علم منطق کے حصول کے بعد جس کی مدد سے ہم موجودات اور ان میں پوشیدہ صناعت کے اشاروں پر غور و فکر کرنے کے قابل ہوتے ہیں ...... ہمیں چاہیئے کہ موجودات کا اس ترتیب اور انداز سے جائزہ لینا شروع کریں، جو استدلالی منطقی اشکال کے فن سے ہم نے سیکھا ہے۔"(۳۲) کتاب فرقان کی تعبیر کرنے والے کی اہلیت کے ضمن میں اپنی تجویز کردہ ضروری شرائط کو قابل اعتراض سمجھتے ہوئے وہ وضاحت کرتا ہے کہ "اگر کوئی شخص غلطی کرتا ہے یا ان (منطقی اور فلسفیانہ علوم کی ۔ خ۔) کتابوں کے مطالعہ میں ٹھوکر کھاتا ہے اس وجہ سے کہ اس میں فطری استعداد مفقود تھی یا اُس نے ان (کتابوں) کا مطالعہ غیر منظم طریقے سے کیا، یا اس پر جذبات غالب آ گئے، یا اسے کوئی استاد نہ ملا جو ان (کتابوں) کے مواد کو سمجھنے میں اُس کی رہنمائی کرتا، یا ان سب وجوہات یا ایک سے زیادہ وجوہات کے اجتماع (کی وجہ سے ایسا ہوا)۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ انھیں ان لوگوں کے لیے ممنوع قرار دے دیا جائے، جو انہیں سمجھنے کے اہل ہیں ...... ایک شخص جو کسی فرد کو فلسفے کی کتابوں کے مطالعے سے روکتا ہے، کیونکہ بہت سے بُرے لوگوں میں سے کچھ (افراد) ان کے مطالعے سے گمراہی کا شکار ہو جانے والے کہے جا سکتے ہیں، وہ ایسے شخص کی طرح ہے، جو ایک پیاسے فرد کو ٹھنڈا، تازہ پانی پینے سے روکتا ہے، یہاں تک کہ وہ پیاس سے مر جاتا ہے، کیونکہ اس (پانی) سے کچھ لوگ دم گھٹ کر مر گئے تھے۔ اس لیے کہ پانی کی وجہ سے دم گھٹ کر مرنا ایک حادثاتی معاملہ ہے، لیکن پیاس کے سبب موت لازمی اور ضروری (امر) ہے۔"(۳۳)

اب یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اگرچہ اُس نے کھلے طور پر بیان نہیں کیا، "لیکن ابن رشد کے دعاوی میں یہ بات پوشیدہ ہے کہ کتاب فرقان کی تمثیلی تعبیر کا حق استدلالی عالموں یعنی فلاسفہ کو ہے۔" اور "فلسفیوں کو کتاب فرقان کے مفہوم کے معاملے میں برتر ٹھہرایا جاتا ہے"، کیونکہ "اپنے علم فطرت میں وہ کتاب فرقان کے صحیح مفہوم کے انتخاب کا اصول رکھتے ہیں: وہ یہ ہے جو فلسفے کی مدد سے معلوم کی جانے والی حقیقت کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔" مزید یہ کہ "الٰہیات داں نااہل ہیں ..... وہ صرف جدلیاتی توجیہہ تک پہنچ سکتے ہیں جس کا آغاز عامیانہ طور پر قابلِ قبول مقدمات سے ہوتا ہے۔ وہ درست تاویل کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے کیونکہ وہ استدلالی علم کی تعلیم سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔"(۳۴)

تاہم ایک مختلف موقع پر اور مختلف انداز میں، ابن رشد بالکل صاف طور پر یہ اعلان کرتا ہے کہ "کتاب فرقان کو فلسفے سے متفق ہونا

چاہیئے ......" (۳۵) اس صورت حال میں جبکہ الٰہیات دان اس کام کے اہل نہیں، اور قطعی کوئی حیثیت نہیں، یہ مذہبی مفکر ہے، جو منطق اور فلسفے کی خوب گہری سمجھ رکھتا ہے، جسے کتابِ فرقان کی تعبیر کی نازک ذمہ داری سونپی جاتی ہے۔ لیکن کتابِ فرقان کی تعبیر کے حق کے ساتھ، فلسفی کو مطلق اور بے لگام آزادی نہیں دے دی گئی، بلکہ اس کے حق فیصلہ اور آزادی کو مشروط اور مختلف طرح کے توقعات کا پابند بنایا گیا ہے۔ اولاً، (اور یہاں پہلے سوال کا جواب بھی موجود ہے) اس کے جواب میں کہ ہم اس بات کا تعین کیسے کرتے ہیں کہ آیا تمثیلی تعبیر کی جائے، یا نہیں، اور اگر کی جائے تو کئی ممکنہ تعبیرات میں سے کس کو درست مانا جائے؟ "ابن رشد غزالی کے وضع کردہ قوانین کے مکمل نظام کو قبول کرتا ہے: اس کے مطابق مفہوم کی پانچ ممکنہ سطحیں ہیں، اور کتاب فرقان کے ایک پیرے یا ایک جملہ کی گہرے معنی تک "تاویل" کی اجازت صرف اس صورت میں دی جاتی ہے اگر زیادہ لغوی مفہوم کا ثابت ہونا ممکن ہو۔ ناممکن صورت یوں ظاہر ہوتی ہے اگر یہ پیرا کتاب فرقان کے ایک زیادہ مستند پیرے سے صاف طور پر متضاد ہو، چونکہ کتاب فرقان خود اپنی تنقیص خود نہیں کرتی (اس لیے) اول الذکر پیرے کی تمثیلی طور پر تعبیر کی جانی چاہیے، پہلی سطح پر جو کہ اس کی آخر الذکر کے ساتھ مصالحت کرتی ہے۔" (۳۶) یہاں ان قوانین کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ دوسری اور نہایت اہم شرط، جو وہ کسی بھی ایسی تعبیر پر عائد کرتا ہے، یہ ہے کہ اگرچہ "کتاب فرقان کو فلسفے کے ساتھ متفق ہونا چاہیئے (لیکن) صرف اس حد تک جس حد تک آخر الذکر حقیقت کا صحیح علم دیتا ہے۔" (۳۷) تاہم اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ابن رشد نے فلاسفہ کو بلاشرکت غیرے کتاب فرقان کی تعبیر کا حق اور آزادی نہیں دی فلسفے کے بارے میں لکھنے والے ایک اور پاکستانی نے ابن رشد کے اس نقطہ نظر کی شدت کو دھیما کر کے بیان کیا ہے تاکہ اسے راسخ العقیدہ مسلمانوں اور فلسفے کے طالب علموں کے لیے قابلِ قبول بنایا جا سکے۔ اُن کے مطابق ابن رشد کا "پہلا اصول یہ ہے کہ فلسفے کو مذہب کے ساتھ متفق ہونا چاہیئے۔" (۳۸)

اب ہم "ایسی تمثیلی تعبیرات" کے مسئلے کی طرف آتے ہیں "جو ان لوگوں پر ظاہر کی جانی چاہئیں جو ان تمثیلوں کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔" (۳۹) اسے بھی جم غفیر کے ایمان کو بچانے کی خاطر ایک اور بڑی خارجی موثر پابندی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس کی مدد سے نہ صرف فلسفیانہ علوم کی تعلیم و تعلم کو محدود کیا گیا بلکہ عام لوگوں کے مذہب کو بھی تحلیل ہونے سے بچانے کے لیے استعمال کیا گیا۔ ابن رشد کے مطابق لوگوں کی تین جماعتیں ہیں اور اس تقسیم کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ حقیقت کی تفہیم کی طرف کیا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ پہلی جماعت میں لوگوں کی بڑی اکثریت آتی ہے ان کی عقلی تفہیم کی استعداد محدود ہوتی ہے یعنی "لسانی و خطیبانہ توجیہہ" کی سطح تک، جس کی بنیاد وہ آرا ہوتی ہیں جو عام لوگوں کو قائل کرنے والی ہوتی ہیں لیکن جو تنقید کے سامنے ٹھہر نہیں سکتیں۔" (۴۰) دوسری جماعت "جدلیاتی تعبیر کے لوگوں" پر مشتمل ہوتی ہے، جو "جدلیاتی توجیہہ" کے اہل ہوتے ہیں، "جس کی بنیاد ان آرا پر ہوتی ہے جو بالعموم قبول کی جاتی ہیں اور جنہیں صاحبِ فکر اغلب جانتے ہیں۔" (۴۱) "تعبیرِ یقینی کے لوگ" تیسری جماعت کہلاتے ہیں۔ وہ "استدلالی توجیہہ" سے مستفید ہوتے ہیں، جس کی بنیاد یقینی مقدمات پر ہوتی ہے؛ (۴۲) اور ابن رشد کا کہنا ہے کہ "یہ فطرتاً اور تربیتاً" یعنی فلسفے کے فن میں، "استدلالی جماعت ہوتی ہے۔" نہایت کھلے طور پر وہ یہ تنبیہ کرتا ہے کہ تعبیر "(کی یہ قسم ـ رخ ۱) جدلیاتی جماعت پر بالکل ظاہر نہیں کی جانی چاہیئے، عامۃ الناس پر تو قطعاً نہیں۔" (۴۳)

اس "ممانعت" کی ابن رشد دو وجوہات بیان کرتا ہے: اول یہ کہ جب ایسی تمثیلی تعبیرات، جن کی بنیاد استدلالی توجیہہ پر ہو، لسانی و خطیبانہ یا جدلیاتی جماعت پر ظاہر کی جاتی ہیں، جن کے ارکان میں عام علم سے دوری کے سبب اس کی تفہیم کی استعداد مفقود ہوتی ہے، تو دونوں، جو ظاہر کرتا ہے اور جن پر یہ ظاہر کی جاتی ہیں، "کفر کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔" (۴۴) دوم یہ کہ جب یہ تمثیلی تعبیرات نااہل عامۃ الناس پر ظاہر کی جاتی ہیں، یہ انہیں کاذب معلوم ہوتی ہیں، کیونکہ ان میں کتاب فرقان کے تمثیلی مفہوم کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، اور یوں وہ اس (یعنی کتاب فرقان ـ رخ ۱) سے روگرداں ہو جاتے ہیں، اور جو بھی لوگوں کو کتابِ فرقان سے دور کرتا ہے وہ کافر ہے۔" (۴۵) اس ضمن میں ابن رشد

اپنے نقطۂ نظر کی صراحت ایک تمثیل کی مدد سے کرتا ہے۔ جب ایک بیمار شخص طبیب کے پاس علاج کے لیے جاتا ہے، تو طبیب اُسے علمِ طب کے اصول سمجھانے نہیں بیٹھ جاتا بلکہ اُس کو مرض سے نجات دلانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ان تمام لوگوں کو طبیب بنا دینا ممکن نہیں کیونکہ اُن میں وہ صلاحیت اور استعداد ہی نہیں جس کا تقاضا استدلالی علوم کرتے ہیں۔ ابن رشد کے ان خیالات کو جنہیں تعقلی جماعتوں کا نظریہ کہا گیا ہے،‘‘ (۴۶) نظریۂ درجاتِ عقلِ انسانی نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ جارج ہورانی نے ابن رشد کے ان خیالات کو فلسفے میں ایک نہایت مضبوط روایت (اشرافیہ) سے منسوب ٹھہرایا ہے۔‘‘ (۴۷)

اس مرحلے پر ہم استفسار کر سکتے ہیں کہ کیا ابن رشد کو مذہب اور فلسفے کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش میں کچھ کامیابی ہوئی یا اس کا منصوبہ کلی طور پر ناکام ہو گیا۔ اگر ہم اُس کے خیالات کو دیکھیں تو ہم اس بات کے مجاز نہیں کہ اس کی کوشش کو 'توافق' یا 'ہم آہنگی' کا نام دیں۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا ہے، اُس کی نظر میں مذہب اور فلسفہ لازمی طور پر ایک، یا لازمی طور پر ہم آہنگ ہیں: لہٰذا اُن کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کے عذر کے کیا معنی؟ یہ امر اُس کی کتاب کے عنوان سے بھی صاف عیاں ہے: ’’کتاب فصل المقال و تقریر ما بین الشریعۃ والحکمۃ من الاتصال‘‘ (کتابِ فیصل متعلق بہ تذکرہ، اور اس تعین کے بارے میں کہ مذہب اور فلسفے میں کیا رشتہ ہے)۔ تاہم اگر ہم مذہب اور فلسفے کو علیحدہ، ممتاز اور آزاد حیثیت دیں، یا وحی یا عقل کو لازمی طور پر ناموافق ٹھہرائیں، تو ہمیں ابن رشد کی تگ و دو کوششوں کے اس سلسلے میں رک کر دیکھنا پڑے گا جن کا مطمحِ نظر مذہب اور فلسفے میں ہم آہنگی یا توافق پیدا کرنا تھا۔ (۴۸) مزید براں مبالغہ آرائی اور توضیح واقعہ کے خوف کے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسی تمام کوششوں کا مقدر لازمی اور منطقی طور پر دونوں میں سے کسی ایک یا دوسرے کو غیر معتبر یا نامعقول ٹھہرانا ہوتا ہے۔ ایٹین گلسن نے جو قرونِ وسطیٰ کے یورپی فلسفے پر سند کا درجہ رکھتا ہے، اپنی کتاب عقل اور وحی قرونِ وسطیٰ میں میں ایک بڑی دقیقہ رسی کی بات کہی ہے: ’’جہاں بھی اور جب بھی ایمان اور عقل کے تعلق کا مسئلہ اٹھے گا، اس کے حل کی مجرد کیفیات لازماً یکساں رہیں گی۔‘‘ (۴۹) ہمارے مطالعے سے بھی اس بات کو تقویت پہنچتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ابن رشد کا بے تصنع خلوص اُسے ایک مشتبہ فلسفی بنا دیتا ہے۔ اُس پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اُس نے کتابِ فرقان کے مفہوم کو فلسفیانہ صداقتوں سے متطابق کرنے کے عمل کو قانوناً اسلامی قرار دیا۔ اس اعتراض میں کافی سچائی موجود ہے۔ ابن رشد کے اپنے نقطۂ نظر سے یہ عیاں ہے کہ چونکہ کتابِ فرقان حرفِ آخر، ناقابلِ تبدیل اور سہو و خطا سے قطعی طور پر مبرا ہے، لہٰذا جو راستہ کھلا رہ جاتا ہے وہ یہی ہے کہ اس کے مفہوم کو معلوم حقیقت کے ساتھ تمثیلی طور پر مطابقت آمیز بنایا جائے۔ کم از کم ابن رشد کے معاملے میں یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اپنے تمثیلی تعبیر کے طریقِ کار کے ذریعے سے اُس نے قطعاً یہ کوشش نہیں کی کہ فلسفیانہ علم کی سیادت، صداقت اور اس کے تیقن کو ثابت کرے، لیکن اُس کی دلیل کے ارتقا سے منطقی طور پر یہی بات سامنے آتی ہے۔

ابن رشد کی مصالحانہ فکر کے مقابل اعتراضات قطار اندر قطار کھڑے نظر آتے ہیں، لیکن یہاں ہمارا مقصد ان اعتراضات کا جائزہ لینا نہیں ہے۔ اپنی کتاب فصل المقال کے تتمے میں جو جزئیات کے بارے میں خدا کے علم کے مسئلے سے متعلق ہے، وہ کہتا ہے کہ جو یہ نہیں جانتا کہ گرہ کیسے باندھی جاتی ہے وہ اسے کھول بھی نہیں سکتا۔ (۵۰) ابن رشد ہی کے الفاظ میں، نتیجے کے طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ خود اپنی ہی باندھی ہوئی گرہ نہ کھول سکا۔ اُس کی کوشش 'قرونِ وسطیٰ کے اسلام میں وحی اور عقل کے درمیان مصالحت' کی آخری کوشش تھی۔ (۵۱) ابن رشد کی بحثیں لیکن وہ تیمی اور عقلی آواز کو ابن تیمیہ کی غیر مصالحت پسندانہ ملامت کی گرج نے خاموش کر دیا۔ (۵۲) اس طرح مسلم دنیا میں ابن رشد کے بعد فلسفہ رو بہ تنزل ہو گیا۔ ابن خلدون (متوفی ۸۰۶ھ) تک آتے آتے، فلسفہ اپنے مقام سے اس حد تک گر چکا تھا کہ وہ اسے جادو، تعویذ، گنڈے، الکیمیا اور ستارہ شناسی کے برابر ٹھہراتا ہے۔ (۵۳)

مذہب اور فلسفہ کے درمیان 'تعلق' کے بارے میں ابن رشد کے یہ خیالات سنجیدہ غور و فکر کا تقاضا کرتے ہیں، کیونکہ دوسری چیزوں کے علاوہ، یہ اس کے نظریۂ تعلیم کو بھی بنیاد فراہم کرتے ہیں، جس کی جڑیں عقلی امتیاز میں پیوست کی جاسکتی ہیں۔ اس کے اکثر پیش رو بھی اس عقلی امتیاز کی وکالت کرتے تھے۔ ابن رشد کے ان خیالات کی ہمارے عہد سے مناسبت کو ظاہر کرنے کے لئے دو وجوہ پیش کی جاسکتی ہیں: پہلی تو یہ کہ آج بھی ہمارے معاشرے میں عمومی تعلیم کے 'غیر جمہوری نقطہ نظر' کے ماننے والے موجود ہیں اور اس کی ترویج بھی کی جا رہی ہے؛ اور دوسری اور نہایت اہم' یہ کہ ابن رشد کی طرح ہر مسلمان آج بھی "مذہبی جدت پسندوں کے المیے" سے دوچار ہے، جو کتاب فرقان اور اپنے وقت کے علوم دونوں کو صحیح مانتے ہیں" (۲۰ د)۔ بلاشک، ہر باشعور اور کھلا ذہن رکھنے والا پاکستانی بھی اس المیے کے سامنے لاچار اور بے بس ہے۔ قطع نظر اس سے کہ آیا اُسے اس تحریر سے کچھ مدد ملتی ہے یا نہیں، ایک چیز بہرحال صاف طور پر سامنے آتی ہے کہ ابن رشد کی کامیاب ناکامیوں اور ناکام کامیابیوں کے ذریعے سے ہم بہت کچھ سیکھ بھی سکتے ہیں۔ اور بہت کچھ سیکھتے ہوئے سے دامن بھی چھڑا سکتے ہیں؛

حوالہ جات

1-Avberry, A. J.,Revolation and reason in Islam, Geovge Allen & Unurin, London, 1957; P.56

2-Mac Donald, Duncan B., Development of Muslim Theology, Constitutional theory and Jurisprudence, Khayats, Beirut, 1965; P. 242

3-Ibid; P.242

۴۔ دیکھیں محمد لطفی جمعہ، تاریخ فلاسفۃ الاسلام، ترجمہ: ڈاکٹر میر و'

۴۔ دیکھیں محمد لطفی جمعہ، تاریخ فلاسفۃ الاسلام، ترجمہ: ڈاکٹر میر ولی الدین، مسعود پبلشنگ ہاؤس کراچی، ۱۹۶۴ء؛ ص ۲۱۹

5-Mac Donald, Muslim Theology, P.162

6-Ibid; P.162

7-Quouted in age of belief: The Medieval Philosophers by Anne Fremantle, New American Library, New York, 1954; P.115

اس کا مقابلہ ارسطو کے قول سے کیا جا سکتا ہے جس کے خیالات سے الکندی بخوبی واقف تھا: "افلاطون عزیز ہے لیکن صداقت کہیں بڑھ کر"

8-Averroes Tahafut al-Tahafut (The Incohevence of the Incohevence) Volumes I and II, Trams. by Simon Van Den Bergh, E.J.W.Gibb Memorial Trust, London, 1978; P.360

9-Mac Donald; Muslim Thealogy, P. 236

10-Quouted in A.J.Arberry's Revelation and Reason, P. 29

11-Fremantle's The Age of Belief, P.116

12-Sheikh, M. Saéed, Studies in Muslim Philosophy, Sh. Muhammad Ashraf, London, 1974; P. 73

13-Fremantle's The Age of Belief, P.116

14-Averroes on the Harmony of Religion and Philosphy, E.J.W. Gibb Memorial Trust, London, 1961

15-Hourani's Introduction to his translation of Fasl al-Maqal P.5

۱۶۔ ڈی: بوئیر، فلسفۂ اسلام، ترجمہ: احسان احمد، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۰ء، ص: ۲۴۲

17-Averroes on the Harmony of........; P.62

18-Ibid., P.70

19-Ibid., P.70

[اس سلسلے میں محمد لطفی جمعہ کی رائے دلچسپی سے خالی نہیں: "ابن رشد نے اپنی اس عجیب کتاب کو ایک قسم کی ظرافت آمیز اعتذار (اپولوجیا) پر ختم کیا ہے جس میں اس نے فلسفہ اور دین میں تطبیق پیدا کی ہے، وہ ایک ایسے رشتہ ازدواج کے مشابہ ہے جس کے ذریعے دو مختلف الطبائع افراد یعنی عورت و مرد میں ضرورت کے تحت ارتباط پیدا کیا جاتا ہے حالانکہ طبیعت، مزاج اور میلانات کے اعتبار سے ان میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس کی مثال ایک حاذق قسیس کی ہے جس کا شیوہ ہر امر میں صلح پسندی ہے"۔ (فلاسفۂ اسلام، ص: ۱۸۶)]

20-Ibid., P.44

21-Ibid., P.47

22-Ibid., P.48

23-Hourani, Introduction, PP. 22-23

24-Fakhry, Majid, Islamic Occasionalism and its Critique by Arerroes and Aquinas George Allen & Unurin, London, 1958; P.16

25-Ibid; P.113

۲۶۔ میاں محمد شریف، مسلمانوں کے افکار، ان کی ابتدا اور حاصلات، مجلس ترقی ادب، لاہور

27-Rahman, Dr.Fazlur, Islamic neurodology in History, Central Institute of Islamic Research, Karachi; 1965; P.122

مزید یہ کہ "بعد میں تیرہویں صدی کے یورپ میں "دوہری صداقت" کے اس نظریے نے کافی شہرت پائی جہاں یہ اب بھی پیرس یونیورسٹی میں ابن رشد کے تیرہویں صدی کے ایک مشہور پیروکار سیگر بار بنٹائی سے منسوب خیال کیا جاتا ہے، جس کے نظریات کو تھامس ایکوئیناس نے سخت ملحدانہ قرار دے کر رد کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ تاریخ میں ایسا کوئی فرد نہیں گزرا جس نے اس "دوہری صداقت" کے نظریے کا دعویٰ کیا ہو"۔ (ایضاً، ص: ۱۲۲)

28-Arerroes on the Harmony of........ P.50

29-Ibid., P.50

30-Hourani's Introduction, PP.25-26

31-Averroes on the Hazmony of......., P.45

32-Ibid., P.47

33-Ibid., P.48-49
ابن رشد کے ان خیالات اور فرانسس بیکن کے بیان میں مماثلت قابل غور ہے: "یہ صحیح ہے کہ تھوڑا سا فلسفہ انسان کے ذہن کو دہریت کی طرف مائل کر دیتا ہے۔"

34-Houzani's Introduction, P. 24

35-Ibid., P. 25

36-Ibid., P. 23-24

37-Ibid., P. 25

38-Sheikh, M. Saeed, Studies in Muslim Philosophy, P. 201

39-Averroes on the Hazmony of........,P.53

40-Houzani's Introduction, P. 33

41-Ibid., P. 33

42-Ibid., P. 33

43-Averroes on the Hazmony of......,P.65

44-Ibid., P. 66

45-Ibid., P. 67

46-Houzani's Introduction, PP. 32-33

47-Ibid., P. 36

۴۸- ای۔ آئی۔ جے روزینتھل کے مطابق "اگرچہ اس (ابن رشد) نے مذہب (یعنی شریعہ۔ خ۔ا) اور یونانی فلسفے میں تطبیق پیدا کرنے کی طویل روایت کی پیروی کی، لیکن اپنے پیشروؤں پر بہت زیادہ انحصار کے باوجود وہ اُن سے بہت آگے نکل گیا۔"
(See 'Averroes' in Encyclopaedia Brittanica)

49-Quouted in A.J. Arberry's Revelation and Reason, P. 8

50-Averroes on the Hazmony of......, P. 128

51-Arberry, A.J. Revelation and Reason, P. 67

52-Ibid., P. 69

53-Ibid., P. 69

54-Houzani's Introduction, P.27

ضیا جالندھری

ہم

بچھی ہوئی ہے بساط کب سے
زمانہ شاطر ہے اور ہم
اِس بساط کے زشت و خوب خانوں میں
دستِ نادیدہ کے اشاروں پر چل رہے ہیں
بچھی ہوئی ہے بساط ازل سے
بچھی ہوئی ہے بساط جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا ہے
بساط ایسا خلا ہے جو وسعتِ تصور سے ماورا ہے
کرشمۂ کائنات کیا ہے
بساط پر آتے جاتے مُہروں کا سلسلہ ہے

بساطِ ساکت ہے وقتِ مطلق

بساط بے جنبش اور بے حس ہے
اپنے مہروں سے لاتعلق ہے
اِس کو اس سے غرض نہیں ہے
کہ کون جیتا ہے
اور کس نے شکست کھائی

وجودِ حادث، وجود مُہرے

بساطِ ساکت کی وسعتوں میں
زمین، اہلِ زمین، افلاک، اہلِ افلاک
اپنی اپنی معینہ ساعتوں میں لپیے گزر رہے ہیں
کہ جیسے آنکھوں سے خواب گزریں

بساط پر جو بھی ہے
وہ ہونے کی مہلتوں میں اسیر
پیہم بدل رہا ہے
وجود وہ حدتِ رواں ہے
جو نت نئی ہیئتوں میں باقی ہے
اور اس کو فنا نہیں ہے

جہاں پہاڑوں کے آسماں بوس سلسلے ہیں
وہاں کبھی بحر موج زن تھے
جہاں بیاباں میں ریت اُڑتی ہے
بادِ سموم گونجتی ہے

وہاں کبھی سبزہ زار و گلگشت کا سماں تھا
بلند و بالا، حقیر و ہیچ
اِس شکست و تعمیر کے تسلسل میں بہہ رہے ہیں
شکست و تعمیر کے تسلسل میں تو ہے، میں ہُوں

ہم ایسے مُہرے
جنھیں ارادے دیے گئے ہیں
پہ جن کی توفیق پر حدیں ہیں
جنھیں تمنّا کے رنگ دِکھلا دیے گئے ہیں
مگر وسیلوں پہ قدغنیں ہیں
جنھیں محبّت کے ڈھنگ سِکھلا دیے گئے ہیں
پہ دست و پا میں سلاسل نو بنو
تو گردن میں طوق پہنا دیے گئے ہیں

جو ہے جو اَب تک ہُوا ہے، جو ہو رہا ہے
اُس سے کسے مَفر ہے
کوئی جو چاہے
کہ عہدِ رفتہ سے ایک پَل پھر سے لوٹ آئے
کہا ہوا لفظ اَن کہا ہو سکے
تو اُس آرزو کا حاصل وہ جانتا ہے
بہت سہی اختیار و امکاں
مگر ہواؤں کے سامنے
برگ و خس کی تابِ مجال کیا ہے

تو نے غنچہ میں اُس کا اپنا کمال کیا ہے

تری نگاہوں میں تیرا غم کوہ سے گراں تر ہے
تو سمجھتا ہے
تیرے سینے کے سُرخ لاوے سے
شہر و قریہ پگھل رہے ہیں
خزاں زمستاں تری اُداسی کے آئنے ہیں
تو مشتعل ہو تو زلزلوں سے زمین کانپے
تجھے گماں ہے
کہ گُل کِھلے ہیں ترے تبسّم کی پیروی میں

یہ پھُول کو اختیار کب تھا
کہ کون سی شاخ پر کِھلے
کون کنج میں مسکرائے
اور کِن فضاؤں میں خوشبوئیں بکھیرے
نحیف شعلہ جمال کونپل
جو دستِ نازک کی نرم پوروں سے دھیرے دھیرے
دریچۂ شاخ کھول کر
صبح کی سپیدی میں جھانکتی ہے
یہ سوچتی ہے
کہ باغ سارا اُسی کے دم سے مہک رہا ہے
اُسی کے پرتو سے گوشہ گوشہ دمک رہا ہے
اُسی کے دیدار میں مگن

خوشبوؤں سے بوجھل ہواؤں میں
شوخ تتلیاں رقص کر رہی ہیں

وہ بے خبر ہے
کہ شاطرِ وقت کی نظر میں
کوئی اکائی
شجر حجر ہو کہ ذی نفس ہو
نظامِ کُل سے الگ نہیں ہے
وہ یہ نہیں جانتی کہ ہستی کے کارخانے میں
اس کا ہونا نہ ہونا بے نام حادثہ ہے
اور اس کے حصّے کا کُل اثاثہ
وہ چند لمحے، وہ چند سانسیں ہیں
جن میں وہ خواب دیکھتی ہے
سلیقۂ ذات سے چمن کو سنوارنے کا
بہارِ جاں کو نکھارنے کا

(۲)

بجا کہ ناپائدار ہے یہ وجود میرا
میں غیر فانی حیات کے سلسلے میں
اِک نہج کی کڑی ہوں
رہینِ گردش بھی، مرکزِ کائنات بھی ہوں
جو میں نے دیکھا ہے، وہ مرے خوں میں رچ
گیا ہے
جو میں نے سوچا ہے، مجھ میں زندہ ہے
اور جو کچھ سنا ہے مجھ میں سما گیا ہے
ہوا کی صورت ہر ایک احساس
میری سانسوں میں جی رہا ہے
ہر ایک منظر مرے تصوّر میں بس گیا ہے
میں ذاتِ محدود اپنی پہنائیوں میں
اِک کائنات بھی ہوں

مری رگوں میں وہ جوششِ جاوداں رواں ہے
جو شاخ میں پھول کی نمو ہے
جو بحر میں موج کی تڑپ ہے
پرِ کبوتر میں تابِ پرواز ہے
ستاروں میں روشنی ہے
میں اپنے ہونے کے سب حوالوں میں رونما ہوں
میں جا بجا صورتِ صبا ہوں
غزالِ خوش چشم کی کلیلوں میں کھیلتا ہوں
ہمکتے بچّے کی مسکراہٹ ہوں
پیرِ شب خیز کی دعا ہوں
میں مہر میں، ماہتاب میں ہوں
یہ کیسی چاہت ہے جس سے میں
ایک مستقل اضطراب میں ہوں
وہ کون سی منزلِ طلب تھی
کہ رانجھا رانجھا پکارتی ہیر

آپ ہی رانجھا ہو گئی تھی

فلک سے انوار
کوہ سے چشمے
شاخ سے پھول پھوٹتے ہیں
مگر ہر اک پھول میں نمی بھی ہے روشنی بھی

زباں میں الفاظ،
آنکھ میں دید،
دل میں احساس رکھ دیے گئے ہیں
یہ لفظ، احساس، دید اک دوسرے کا پیوند ہو گئے ہیں
نمود و تخلیق کے عمل بار بار دہرائے جا رہے ہیں
جمالِ ارض و سما کی تکمیل ہو رہی ہے
محبت اعجازِ سرمدی ہے

تمہاری آنکھوں کی مسکراہٹ میں
میری چاہت کی روشنی ہے
یونہی شگوفوں کے پاس بیٹھی رہو
شعاعوں کو عارض و لب سے کھیلنے دو
ہوا کے ہاتھوں کو اپنے گیسو بکھیرنے دو
بہار کی ساری خوشبوئیں
اپنے بازوؤں میں سمیٹ لو
میرے چشم و دل کو یقیں دلاؤ
کہ تم فقط خواب ہی نہیں ہو

گزرتے بادل کا کوئی عکسِ رواں نہیں ہو
تم اِک حقیقت ہو، محض وہم و گماں نہیں ہو
مرے قریب آؤ اور مری ذات کو مٹا دو
مجھے تم اپنے جمال کی ضو میں جذب کر لو
وصال میں فرد کی فنا ہے
وصال میں فرد کی بقا ہے
بہار کی دید عارضی ہے
بہارِ تجرید دائمی ہے

وداع کے وقت آنسوؤں میں
وہ سارے منظر جھلک رہے ہیں
جو شاخِ جاں پر گلوں کی صورت کھلے ہوئے تھے
وہ سارے امکاں جھلک رہے ہیں
جو کرچی کرچی بکھر گئے ہیں
بکھرنے والوں کو اپنے مرکز کی آرزو ہے

نہیں مجھے اس طرح نہ دیکھو
کہ جیسے نظروں میں، روح تک اُڑی آ رہی ہو
یہ ہاتھ کچھ دیر اور رہنے دو میرے ہاتھوں میں
کچھ نہ بولو
کہ میں یہ نایاب لمحے آنکھوں میں جذب کر لوں
یہ ثانیے روح میں چھپا لوں
ہر ایک لمحہ اِک ارمغاں ہے

تمھاری چاہت کا ارمغاں ہے
یہ تابندہ ایسے پھول ہیں
جو کہ کھلتے رہتے ہیں دل ہی دل میں
شگفتہ رہتے ہیں رہتے دم تک

یہ چند لمحے کسی کسی کے نصیب میں ہیں
وگرنہ عمریں
غموں کے کانٹے نکالنے میں گزر گئی ہیں

(۳)

وہ شام ہوٹل میں اس طرح آئی
جیسے دشمن کی فوج اُترے
جگہ جگہ جست اور کانسی کے برتنوں جیسے چہرے
جھم جھم کھنک رہے تھے
تمام ہوٹل جگر جگر جگمگا رہا تھا
میں کنجِ تنہائی میں تحیّر سے دیکھتا تھا
کہ کیسے خوش باش ہیں جنھیں یہ خبر نہیں ہے
کہ ان کی بنیاد اکھڑ چکی ہے

ہوائیں مسموم ہو چکی ہیں
شجر پھلوں سے لدے ہیں لیکن
جڑوں کا زہران پھلوں کے ریشوں تک آ گیا ہے

جو حال اب ہے کبھی نہیں تھا
حیات خوار و زبوں تو تھی لیکن اتنی خوار و زبوں نہیں تھی

وہ دیر سے انتظار گہ میں
ہر آنے والے کو نظروں نظروں میں ناپتی تھی
لباس کی شوخی و جسارت
سنگھار کی جدّت و مہارت کے باوجود
اس کا گوشۂ چشم عمر کی چغلی کھا رہا تھا
نگاہ نووارد اجنبی پر پڑی تو اس طرح مسکرا دی
کہ جیسے اُس کی ہی منتظر تھی
اُٹھی، قریب آئی اور بولی
میں ایک مدّت سے خدمتِ خلق کر رہی ہوں
دُکھے دلوں کا علاج کرتی ہوں
رنگ اور روشنی کے شہروں میں
شامِ تنہائی کی دل افسردگی سے واقف ہوں
آپ اکیلے ہیں تو کوئی انتظام کر دوں
یہاں سے میں دُور دُور ملکوں کو
ہر طبیعت کے گاہکوں کی پسند کا مال بھیجتی ہوں
وفا، محبّت پرانی باتیں ہیں اب انھیں کون پوچھتا ہے
بڑے بڑے اُونچے اُونچے لوگوں سے رات دن میرا واسطہ ہے
یہ صاحبانِ وقار و نخوت
خریدنا اور بیچنا خوب جانتے ہیں
یہ دام دیتے ہیں اور راحت خریدتے ہیں

بجا ہے یہ بھی کہ بے بسوں کی انا و عزت خریدتے ہیں
مگر جب آتے ہیں بیچنے پر
تو بے تکلف ضمیر تک اپنا بیچ دیتے ہیں
جاہ و ثروت کی منڈیوں میں
میں کہہ رہی تھی کہ آپ چاہیں تو
آج کی رات کا کوئی انتظام کر دوں

وہ شام کے وقت خوں میں لت پت
سڑک کنارے پڑا ہوا تھا
گزرنے والوں سے کہہ رہا تھا
ہمیں ہمارے محافظوں سے
نجات کا راستہ بتاؤ
وہ خواہشِ اقتدار و دولت میں
ہم کو نیلام کر رہے ہیں
اخوت و اتحاد کا درس دینے والے
خود اپنے بچوں کے خوں سے
حرص و ہوس کی شمعیں جلا رہے ہیں
ہماری اقدار
آج متروک فیشنوں کے لباس کی طرح
ان کی نظروں سے گر چکی ہیں
اب اُن کی اولاد اُن کی ریشہ دوانیوں سے پناہ
تازہ بتازہ نشوں میں ڈھونڈتی ہے
انھی کی شہ پا کے نسلِ نو
اپنی پیاس اِک دوسرے کے خوں سے بُجھا رہی ہے
یہ سنگدل جشنِ مرگِ انبوہِ بے گناہاں منا رہے ہیں
کوئی ہمیں ان عجیب صورت
حریص، بے مہر کرگسوں سے
نجات کا راستہ بتاؤ

یہ نغمۂ کائنات کی بے سُری صدائیں ہیں
کوئی ان سے نجات کا راستہ بتاؤ

(۴)

ہم اپنے خوابوں میں جی رہے ہیں
ہم اپنے صبح و مسا سے تنگ آ کے
خواب بُنتے ہیں اور خوابوں میں جی رہے ہیں

بساطِ ساکت سے کوئی شکوہ
نہ شاطرِ وقت سے گلہ ہے
ہمیں شکایت ہے آدمی سے
کہ آدمی آدمی کا دوزخ بنا ہوا ہے

عجیب تضادات کا مرقع ہے آدمی بھی
یہ اہرمن بھی ہے اور یزداں جمال بھی ہے
صداقت و حسن کا طلب گار بھی وہی ہے
بہیمیت اور وحشت و جبر کا پرستار بھی وہی ہے

زمیں پہ قابیل کے قبیلے کی رسمِ بیداد اوج پر ہے
مگر ہمارا عذاب اُس سے بھی تلخ تر ہے
کہ ہم جو ہابیل کے حواری تھے
عہدِ ہابیل میں بھی زنجیری رہے ہیں
شباہتوں کے فریب خوردہ تھے، یہ نہ جانا
نقاب پوشوں میں کون کیا ہے
ہمیں تو غم تھا کہ نشۂ اقتدار
قابیل ہو کہ ہابیل
جس کسی کو چڑھا
وہ انسانیت کو تاراج کر گیا ہے

ہمارے خوابوں سے ڈر رہے ہیں
وہ ڈر رہے ہیں کہ خواب الفاظ میں ڈھلے تو
دروغ کے پردے چاک ہوں گے
اور ان کے چہروں کا غازہ اُترا
تو آئینے بھی عذاب ہوں گے

ہم ایسے ٹھہرے
جنھیں ارادے دیے گئے ہیں
پہ جن کی توفیق پر حدیں ہیں
ہمیں شکستیں ہوئیں مگر ہر شکست مہمیز ہو گئی ہے
ہمارے ساتھی گرے پہ رفتار اور کچھ تیز ہو گئی ہے

یہاں کی سنگین بے حسی میں
ہماری کوشش کا حال یہ ہے
کہ جس طرح کوئی تیتری
اِک خزاں زدہ باغ بے نمو میں
پھری بہاروں کی جستجو میں
تبسمِ گُل کی آرزو میں
شجر شجر شاخ شاخ بے تاب پھر رہی ہو

ہمارے ہوتے بہار آئے نہ آئے لیکن
ہمیں یہ تسکین ہے کہ ہم نے
حیاتِ ناپائدار کی ایک ایک ساعت
چمن کی ہیئت سنوارنے میں گزار دی ہے
فضائے ہستی نکھارنے میں گزار دی ہے

سید ضمیر جعفری

ایک رئیس زادے کے جشنِ سالگرہ پر

قصرِ زر کار میں اِک جشنِ طرب
رامش و رنگ کے عنوان سے آراستہ ہے
طشتِ خوشِ نابِ طلائی میں سجل شمعوں
میں جھلمل کرتی
اطلس و دیبا و زربفت کی جا جم پہ سجی
دُور دیسوں کی ہر اک نعمتِ کم یافتہ
آراستہ ہے
ایک منظر کہ شگفت آور و دل خواستہ ہے

غرفہ ہائے چمن اندام کی محرابوں میں
خانہ زادانِ کمر بستہ کے ساتھ
ایستادہ و سُرود آمادہ
طائفہ نغمہ سرایانِ نوا باختہ ہے
یہ گدایانہ سُرود
تاج و اورنگ کے ــــ سُرساز ــــ کا پرداختہ
خود ساختہ ہے

صف بہ صف ——— چار طرف
دستِ نورین و نگاریں سے بجاتی ہوئی دَف
چھَن! چھَنن! چھَن ——— چھُند چھُند!
"حوریاں رقص کناں ساغرِ شکرانہ زوند"
ساز ہیں سحرِ سرود
بول ہیں شکر و قند
لیکن اے بالا قدِ بالا حصارِ خورسند!
تیری سنگین فصیلوں کے تلے ———
شورِ گریہ ہے بلند!

شور ——— تشنہ و گرسنہ غمیں انسانوں کا
شور ——— مجروح سسکتے ہوئے ارمانوں کا
کارگر جن کے سُلگتے ہوئے ہاتھ
اِن فصیلوں کی چنائی کے لیے
کوہساروں کی چٹانوں کی سِلیں ڈھالتے ہیں
کھیت ان بھوکے کسانوں کے، ہمیں پالتے ہیں

اِن کے مدقوق بدن ڈھانپنے سے قاصر ہے
ان کی روئیدہ کپاس

اِن کے کھلیانوں میں بُھوک
اِن کے دریاؤں میں پیاس
ٹوٹتی سانسوں میں دَم توڑتی گویائی سُن !
آدمیت کی یہ مرتی ہوئی شہنائی سُن !
کرب صدیوں کا
جو خود کاشتہ بر داشتہ، پنداشتہ ہے !

اِن کے بچّے انھیں پیارے ہیں، مگر
اِن کے آتے ہوئے جاتے ہوئے سال
(اِن کے مدفون بزرگوں کی طرح)
ریگِ محرومی میں چُپ چاپ گزر جاتے ہیں
کتنے پھُول ــــ آب سرابوں کی طرح
نادمیدہ ہی بکھر جاتے ہیں
کھلنے پاتے نہیں ــــ مُرجاتے ہیں
کس خرابے میں یہ اندوختہ، انداختہ ہے !

قصرِ زر دار میں اِک جشنِ طرب
رامش و رنگ کے عنوان سے آراستہ ہے

آفتاب اقبال شمیم

دھوپ اور دھند ــــــ ۲

(۱)

جیسے میں کوئی ساز ہوں جس کے تاروں کو
آتے لمحے اپنی اپنی
آسودہ یا ناآسودہ کیفیت میں
چھیڑیں اور گزر جائیں
یوں لگتا ہے
جیسے میں اپنے اس گھور اکیلے پن میں
پیاس ہی پیاس کی بے آواز صدا سے لے کر
شوخ سُروں کے ہولی کھیلتے رنگوں تک
ایک رواں میلے کی اُڑتی دھول میں چلتا رہتا ہوں

(۲)

پی اور پی کر
یاد جگا اُن نانوشیدہ گھونٹوں کی
جن کی چھوڑی ریت پہ تو محرومی کی فرمائش پر
آنسو اور لہو کے غم سے
شعر اُگاتا رہتا ہے

(۳)

کیا خواری اور کیا خود داری!
دانے کی پستی سے لے کر اوجِ پرِ شہ بازاں تک
طائر کو اُڑتے رہنا ہے حدِ سفر کے امکاں تک
میں بھی کیا ہوں،
جینا چاہوں تو جینے کے بدلے میں
سوچوں، رسموں اور دلیلوں پر فائز
مختاروں کی
سب شرطیں تسلیم کروں

(۴)

دیکھو جاناں!
دُور بگولا اُڑتا ہے پیلی سہ پہر کے آنگن میں
گُم کردہ رونق کا ہلکا سایہ سا
جاتا لمحہ ڈالے آتے لمحے پر
آؤ نا گلگشت پہ جائیں اس مہلت کے رستے پر
جس میں سپنا پڑتا ہے
نیم فراموشی کی میچی آنکھوں سے
دیکھیں اور نہ دیکھیں دھوپ کے گالوں پر
چھینٹے سے مسکانوں کے
دیکھیں اور نہ دیکھیں، گہرے سبزے سے
چُنتے ہیں جو طائر نے سوکھے خار و خس کاشانوں کے

(۵)

ایذا دے کر کیسا لطف اُٹھاتے ہو
کل جو ظلم ہوا تھا اُس کا بدلہ لینا
بیشک تم پر بر حق ہے
لیکن آج سے گزرے کل کا ہرجانہ کیوں لیتے ہو
یوں تو آنے والے
اپنے بعد میں آنے والوں سے اپنا تاوان بھی مانگیں گے
یعنی بے الزاموں کو
جنم جنم کے آنسو پینے رہنا ہے
قرضے کی میراث پہ اُن کو دائم جیتے رہنا ہے

(۶)

غیب کا کوئی چشمہ جیسے
جسم کے اندر بہتا ہے
جس کے گھٹنے بڑھنے سے من کی دھرتی کا
رنگ بدلتا رہتا ہے
جو ہر سے ساگر تک کتنے رُوپوں میں
جو گن دھوپ تماشے کی
اس بستی میں گیتوں کی مالائیں پہنے
زُلفیں کھولے، بڑی بڑی سی آنکھوں سے
ذرے کے گمبھیر خلا میں جانے کیا کیا تکتی ہے
چشمے سے سیراب زمیں کو شاید پیاس لگی ہے

(۷)

اُن سے کہنا
وہ سپنا جو کم خبری کی
کچی پکی نیند میں ہم نے دیکھا تھا
ٹوٹ گیا ہے
اُن سے کہنا
خواب تو خواب ہی ہوتا ہے
ہم نے لڑکپن سے اب تک
جس شہرِ مثال میں جا کر بسنا چاہا تھا
اُس میں رہنے سے پہلے ہی
بدلے وقت نے آ کر ہم کو
دیس نکالے کا فرمان سنایا ہے

(۸)

ناسنجیدہ
بے احساس زمانے کے
جور سے بچنے کی خاطر
ایک فرار ضروری تھا
سو اُس نے آنکھیں پلٹا کر
اندر کے گلشن کی لمبی سیریں کیں
باہر کے نیلے رقبے میں چوب و خشتِ تصور سے
بے در، بے دیوار مکاں تعمیر کیے
اُس آوارہ گرد نے یوں تو
چاہا تھا تریاق ملے

جسم کے پھیلے زہرِ اذیت کا
قسمت دیکھیں، اُس کو غم کے بدلے میں آفاق ملے

(۹)

سرما کے ننگے پہناوے میں
جُھنڈ کھڑے ہیں پیڑوں کے
جن کے پیچھے امبر کا بن نیلے پن میں پھیلا ہے
جانے یہ آہٹ سی کیا ہے
وقت میں وقت سے باہر کی
گہری چُپ کے ٹھہراؤ میں
گونج کے اندر گونج کا محشر اُٹھتا ہے
جیسے کوئی ناقہ سوارِ دشتِ سوس بپا کر دے
اُندی دُھوپ کے صحرا میں
شور اکیلے سناٹے کا
جیسے کوئی سانس بچائے بیٹھا ہو
بوڑھ کے نیچے ساکت سا
اندھیارے کی دُھول اُڑاتی
روشنیوں کی آندھی میں

(۱۰)

خون بہا تو
کسب صدا کے پیشہ ور نے جانے کیوں
بے قابو ہو کر
شہرِ سماعت کے اُونچے مینارے پر
چوک میں ہونے والے قتلِ طفلاں کا اعلان کیا
اگلے روز دُھلی سڑکوں کے چہرے سے
رنگِ ندامت غائب تھا
لیکن اس کا
حاکمِ مقتل کیا کرتا
وہ آواز گواہی کی
دسترسِ جاروب کشاں سے باہر تھی

(۱۱)

کیسے کھوٹے کھوٹے سے تم رہتے ہو
ناموجود کی دُنیا میں
دیکھو! اُن آتی جاتی باراتوں کو
جن کے آگے آگے ست رنگے سہرے میں
آج کا دولہا چلتا ہے
جس پر وقت نچھاور کرتا جاتا ہے
چھن چھن گرتی نذریں رنج و راحت کی
اور جنھیں نیچے موجود کی نگری کے
لُوٹ رہے ہیں روز کی افراتفری میں

خالد احمد

رحمان باباؒ کے لئے

رہی گُل گُوں جمالِ جسم کی صُورات بھر
کُھلی آنکھوں سے دیکھی پُھوٹتی پُورات بھر
کئی شمعیں سرِ طاقِ شبستاں جل بجھیں
بڑی مدھم نہ میرے پیار کی لَو رات بھر

عروسِ مَے پسِ پیراہنِ مِینا رہی
مگر وجہِ نشاطِ دیدۂ بینا رہی
برہنہ چشمِ ناظر تھا فرازِ طور پر
گرفتۂ خوابِ خاکِ وادیٔ سینا رہی

شرارِ عشق رُخ کو حُسن کا لپکا دیا
مرے مولا نے میرا غم مجھے لَوٹا دیا
صُراحی سے اُنڈیلیں برکتیں کس آن کی
پیالہ بھر دیا لیکن نشہ چھلکا دیا

مرا غم آج پھر اظہار کے ہالے میں ہے
یہ زندانی ابھی اُلجھا عجب جالے میں ہے
نشاطِ وصل کیا اور انبساطِ ہجر کیا
یہ مَے خوں میں نہیں شامل اگر پیالے میں ہے

قیامت تھا، قیامت قامتوں کا سامنا
چراغوں کی جگہ ہاتھوں میں سورج تھامنا
یہ غم غارت گروں کی شان کے شایاں نہ تھے
مرے دل میں بھی ہوتی کاش کوئی کامنا

نمودِ فن سرِ دیوانِ فن ہونے کو ہے
سخن آرا، مرا سلطانِ فن ہونے کو ہے
صفِ دل ماندگاں مصروفِ آرائش رہے
جمالِ غم، سروسامانِ فن ہونے کو ہے

بہلنا ہو تو اے نادان، تینوں ایک ہیں
مہ و مہر و رخِ تاباں، تینوں ایک ہیں
شبِ تربت، شبِ فرقت، شبِ ظلمت لئے
لحد، گھر، شہرِ نا پرساں، تینوں ایک ہیں
وہ لبِ لعلیں، وہ دل خارا، وہ رخ مرجاں ہے
الگ کیونکر لگیں اے جاں، تینوں ایک ہیں
تہی دست و تہی داماں فقیروں کے لیے
یہ لعل و گوہر و مرجاں، تینوں ایک ہیں
سپاہی کیا، سپہ سالار کیا، سلطان کیا
تہِ تیغِ اجل ساماں، تینوں ایک ہیں

پڑے کس پر نظر، کشکول ٹھہرے کس کا سر
بریدہ تن، سرِ میدان، تینوں ایک ہیں
تہی آواز کانوں، بے زبانوں کے لیے
بیاباں، شہر، نخلستان، تینوں ایک ہیں
وہ باورچی ہو، ساقی ہو، مہِ یعقوب ہو
رہائی تک پسِ زندان، تینوں ایک ہیں
یہ تارا ہے کہ جگنو ہے کہ آنسو، کیا کہیں
کہ جھلمل ہیں، سرِ مژگاں، تینوں ایک ہیں
صفِ اعدا، صفِ یاراں، صفِ نوحہ گراں
نگاہِ نم، نہ ہو حیراں، تینوں ایک ہیں
شرابِ سرخ، مٹی کا کٹورا، خونِ دل
بہم ہو جائیں تو اے جاں، تینوں ایک ہیں
یہ دکھ، یہ شعر، یہ نغمہ، گلِ خوشبو، مے گل
رباب و زخمہ و رحماں، تینوں ایک ہیں
جدا دستِ گدا، دستِ سخا، دستِ دعا
مگر پیشِ شہہِ شاہاں، تینوں ایک ہیں

اُسے دیکھا تو آنکھوں کو بہت اچھا لگا
وہ جب بولا تو کانوں کو بہت اچھا لگا
کشادہ رخ، کشادہ دل، کشادہ در رہا
وہ تنہائی کے ماروں کو بہت اچھا لگا

دلِ آگاہ! کیا ناخوب ہے، کیا خوب ہے
تجھے ہر سانس کس کا امتحاں مطلوب ہے
گلِ منصور کھلتے ہیں صلیبِ شاخ پر
کلیساؤں میں عیسیٰ آج تک مصلوب ہے

اِک اَن دیکھے سے اندیشے میں دم بستہ رہے
غزالانِ ختن ہر آن رم بستہ رہے
دیارِ ہُو میں بھی غم آشنا غم بستگاں
نمو کے نام پر نم دیدہ، نم بستہ رہے

اُڑا وہ رنگ تو سب رنگ پیلے ہو گئے
تنِ رعنا کے سب ملبوس ڈھیلے ہو گئے
مرے مولا! اُٹھاؤں کس طرح دستِ دعا
کہ اب تو کہنیوں تک ہاتھ نیلے ہو گئے

ہوائے آتشیں دریائے گل کیوں کر ہوئی
تری مزمور گئی یعقوبِ دل کیوں کر ہوئی
ترا ماہِ سخن پرتو تھا کس اندوہ کا
گلِ نغمہ مرے ہونٹوں کی سِل کیوں کر ہوئی

جمالِ سادہ میرے نطق کا طالب رہے
مرا فن بے نیازِ کاغذ و قالب رہے
مرا رنگِ سخن معمورۂ تاثیر ہو
مرا اقبال میرے عجز پر غالب رہے

مرے تن میں مہکتی ہیں مری چاروں رُتیں
مرے فن میں چہکتی ہیں مری چاروں رُتیں
مری خاکِ سخن اس زرِ زمیں کی گرد ہے
مرے بن میں لہکتی ہیں مری چاروں رُتیں

حُدی خوانو! ہم آہنگِ جرس کچھ اور ہے
کہ زخمہ گر پسِ تارِ نفس کچھ اور ہے
ہوا کے کان پڑتی کیا نوائے بے نوا؟
کہ شورِ ماتمِ خاشاک و خس کچھ اور ہے
پلٹ جا، ڈھیر کر کے دولتِ اشکِ ہنر
نگاہِ نکتہ رس! وہ نکتہ رس کچھ اور ہے
مہِ شہرِ نگاراں، روئے یارِ مہرباں
غمِ آسانوں کو سامانِ ہوس، کچھ اور ہے
وہ رُخ مکھڑا نہ تھا داؤدؑ کے مزمور کا
کہ میرے شہد لب کا رنگ رس کچھ اور ہے

دَرِ بے در پہ دیتے کیا دعا کی دستکیں
کہ درویشوں کے زیرِ دسترس کچھ اور ہے
لہو جلتا رہا کرب و بلا کے طاق میں
چراغِ خانۂ آفاق رس کچھ اور ہے
قبا پر سلوٹیں ہیں اور تن پر جھرّیاں
سرِ کاغذ بھی غم اب کے برس کچھ اور ہے

غبارِ خاک اور افلاک کے مابین تھے
ابابیلوں کی صورت شام سے بے چین تھے
پلٹ کر دیکھنا، ذرا سی گردن موڑنا
کہ تیرے حسن کا گھر بار تیرے نین تھے

تنِ توسن پہ برسے عمر بھر کوڑے بہت
ستم یاروں نے رخشِ نطق پر توڑے بہت
زمیں صحرائے فن کی سینچتے کیا چشمِ نم
کہ اس مٹی میں بھی پھول کم، روڑے بہت

خدایا کیا ہوئے، کیا خوبصورت لوگ تھے
عجب شفاف رُخ، شفاف طینت لوگ تھے
ترے دُکھ اور سُکھ تھے رنج و رزقِ رفتگاں
کہ زیرِ خاک زندہ خاک سیرت لوگ تھے

سرِ آفاقِ فن کیا کیا نہ کر لاتے رہے
ہوا کی طرح تیرے گرد چکراتے رہے
تری خوشبو میں بس پایا نہ دیوانِ ہُنر
گلِ اطرافِ گُل، گائے میں گندھواتے رہے

مثالِ موجِ دریا، ریت پر لکھنا سکھا
گئے دن کی کہانی رات بھر لکھنا سکھا
بیاضِ ریگِ دریا، موجِ نم کب سے بہے
سرِ لوحِ ہوا، اے چشمِ تر! لکھنا سکھا

تہی دست و تہی داماں، تہی ساماں رہوں
بس اک دھن میں مگر آوارہ و گریاں رہوں
مرے بابا مری سوچیں مجھے رستہ نہ دیں
غریقِ موجِ دریائے غمِ جاناں رہوں

بہت ذی عزت و ذی شوکت و ذی شان تھا
غمِ جاں بھی بلا کی آن کا مہمان تھا
غمِ جاناں مری سانسوں میں دم بھرتا رہا
اسی جگمگ سے جھلمل خانۂ ویران تھا

کب آساں تھا، سکونِ بے سُتوں کا چھیڑنا
لرزتے ہاتھ سے ٹوٹے ہوئے پٹ بھیڑنا
مِرثانی مری آنکھوں میں پانی بھر گیا
مجھے سکھلا گیا اندھے کنویں تک گیڑنا

یہ کیسا تار کھینچا، خول کیسا بُن دیا
ہنر مندی نے دیوارِ ہنر میں چُن دیا
گرفتارِ بلا ہوں، کرمِ ریشم کی طرح
یہ کیسا ہُن دیا، مولا یہ کیسا گُن دیا!

سرِ کاسہ دعاؤں کی کھنک تک یاد ہے
زرِ خالص کو شرماتی چمک تک یاد ہے
بھری آنکھوں تہی داماں پھرا ہوں شہر میں
نوائے بے نوائی کی کسک تک یاد ہے

طلسمِ درہم و دینار سر کیسے ہوا
مرا کارِ محبت کارگر کیسے ہوا
مثالِ موج، دنیا سر پٹک کر رہ گئی
یہ گھر تعمیر ریگِ نرم پر کیسے ہوا

عجب خاکی لکیروں کا نگر بنتا گیا
تنِ چوبِ سُبک دیمک کا گھر بنتا گیا
سخاوت اب خزانوں میں کمی لانے لگی
نکو کاروں کا دل ارژنگِ زر بنتا گیا

گلابی آبخورے بیچ کھاتا کس طرح
میں اِن آنکھوں کے ڈورے بیچ کھاتا کس طرح
مرے گُنڈال تھے خوفِ خدا عشقِ نبیؐ
یہ مٹی کے کٹورے بیچ کھاتا کس طرح

طلسمِ سوزن و شیرازہ و پیوند ہوں
جنوں کیشوں میں شامل ہوں نہ دانشمند ہوں
مرے تلووں پہ بھی مل دے توکل کی حنا
زِ سر تا پا اگر تقدیر کا پابند ہوں

رگوں کے بام و دَر سے خون کا سر پھوڑنا
سمندر کی طرح اپنے کنارے توڑنا
بہت دشوار ہے یہ کارِ غم اے ارضِ غم!
بدن ڈھاتے ہوئے دریاؤں کا رخ موڑنا

سرِ ماتم سرا، آہستہ آہستہ تڑپ
سرِ دارِ عزا، آہستہ آہستہ تڑپ
نمو کاری ذرا مدھم سُروں کا کھیل ہے
تنِ بسمل ذرا، آہستہ آہستہ تڑپ

سرِ بازارِ جاں کیا کیا نہ ہنگامے رہے
مگر کچھ اہلِ دل، ہر آن دل تھامے رہے
کروں اے جاں! شہِ شہرِ انا کی نذر کیا
مرے فتراک میں لکھے ہوئے نامے رہے

منڈیریں اُڑ گئیں، چڑیوں کا چرچارہ گیا
فقط گرد و غبارِ کارِ دُنیا رہ گیا
ہَوا کے ساتھ مٹی کے گھروندے چل دیے
جنازے اُٹھ گئے، کہرام برپا رہ گیا

دُعا کے تیر پر پارہ چڑھا تاثیر کا
مرا کشکول ترکش بن گیا تقدیر کا
خبر کیا کس کا نالہ تھا، یہ کس کی آہ تھی
ہدف میر صفِ اعداء ہوا کس تیر کا

دُکھوں کے پاؤں میں حلقہ دعا کا ڈالنا
گلِ ماتم نمو میں، نم ثنا کا ڈالنا
گراں جانو، یہ دُکھ تو بیج ہیں دانائی کے
یہ دُکھ بونا مگر پانی رضا کا ڈالنا

چراغِ شام، طاقِ صبح کا تارا ہُوا
ستارہ وقت کے ہاتھوں میں سیارا ہُوا
چراغِ کارواں، بے کارواں جل بجھ گئے
دُعاؤں کا دُھواں، اُڑتا ہُوا پارا ہُوا

گلابِ صبح پر عطرِ ضیا، کیا ڈالنا
سوا نیزے کے چہرے پر نگہ کیا ڈالنا
کھُلے تو بھُربھُری مٹی بھری مٹھی کھُلے
تنِ گلگوں پہ زنگاری قبا کیا ڈالنا

عجب مہکار کے ہالے میں ہوں مثلِ گلاب
عجب تر انگلیاں ہیں زخمۂ تارِ رباب
مزامیرِ غمِ جاں ہیں ابھی نوحہ کناں
یہ چُپ ہو لیں تو چھیڑوں نغمۂ حسن و شباب

یہ کس کے رُوبرو آئینہ پانی ہوگیا
رُخِ شفاف یکسر آسمانی ہوگیا
عجب گہرائی میں دشن عجب اُونچائی تھی
مہِ بُرجِ انا، مہتابِ ثانی ہوگیا

ارادت کا تقاضا ہے کہ لب بستہ رہوں
طلب بستہ رہوں لیکن ادب بستہ رہوں
جمالِ کسب کی جھلمل مجھے گھیرے رہے
مثالِ کرمکِ شب تاب، شب بستہ رہوں

درِ خیرالوریٰ پر التجا بستہ رہے
پھر اُن کا مبتلا کیوں ابتلا بستہ رہے
مجھے اصلِ اصولِ فن رہے عشقِ نبیؐ
مرے باباؒ! مرا فن ارتقا بستہ رہے

سبد یہ تا ابد سبز و تر و تازہ رہے
کھُلا مجھ پر تری شفقت کا دروازہ رہے
ترا رستہ، مرا رستہ رہے اے پاک باز
تری آواز کا پرتو یہ آوازہ رہے

یہ تن آکاس بیلوں کے لیے پھلتا رہے
چراغِ شام بن کر صبح تک جلتا رہے
مرے باباؒ! ترا دم ہر قدم ہمراہ ہو
ترا بیٹا تہِ آفاقِ غم چلتا رہے

سب اہلِ تمکنت ہیں صاحبِ تمکین ہیں
مرے باباؒ! مرے احباب کیوں غمگین ہیں
وہ چشمِ سُرمگیں نمناک ٹھہری کس طرح
مرے مولا! یہ آنسو کس قدر نمکین ہیں

ترا ہر نقشِ فن، عرشِ سخن کا چاند ہے
مرا سُورج، ترے تاروں کے آگے ماند ہے
رگِ الفاظ میں چلتا لہو جمتا نہیں
ترا اِک اِک سخن تیرے لہو کی ناند ہے

تنِ خاکی پہ کیا مٹی کے ذرّے تاڑنا
سرِ انگشتِ حنا سے خاکِ تن کیا جھاڑنا
شکستہ جاں، شکستہ پا، شکستہ پیرہن
لباسِ تار پر کیا بیل بوٹے کاڑھنا

ترا مہ فام مٹی میں ملایا جائے گا
یہ گُل اندام مٹی میں ملایا جائے گا
اسی مٹی سے پھُوٹیں گی تری نم نکہتیں
کہ اُس کا نام مٹی میں ملایا جائے گا۔

دُکھوں کی ڈار سے بچھڑی ہوئی اِک کونج ہے
یہ مجموعہ تیری کُرلاہٹوں کی گونج ہے

جوش ملیح آبادی

رباعیات
(انتخاب از "جنون و حکمت")

دل، رسم کے سانچے میں نہ ڈھالا ہم نے
اسلوبِ سخن نیا نکالا ہم نے
ذرات کو چھوڑ کر حریفوں کے لیے
خورشید پہ بڑھ کے ہات ڈالا ہم نے

ہر دعوئ ارتقا کو مانا میں نے
ہر گوشہ کائنات چھانا میں نے
سب جان چکا تو اے حرفِ دم ساز!
میں کچھ نہیں جانتا، یہ جانا میں نے

گل پر ہیں نقوشِ دستِ باری اب تک
جنباں ہے دلِ بادِ بہاری اب تک
انساں کی پیمبری کا در ہے مسدود
فطرت کی پیمبری ہے جاری اب تک

عالم ہیں ہزار یوں تو گورے کالے
اس پر بھی بہت شاذ ہیں حکمت والے
پھرتی ہیں جہالتیں نہ جانے کتنی
کاندھوں پہ عبائے علم و دانش ڈالے

کس نقش میں رنگِ حی و قیوم نہیں
موہوم ہے اس طرح کہ موہوم نہیں
پردے میں ہے اک قوتِ اعلیٰ تو ضرور
اس کے اوصاف کیا ہیں؟ معلوم نہیں

اس فکر میں اک عمر سے ہوں بے خور و خواب
کس طرح معطل ہوں رسوم و آداب
اچھی تو ہے وضعِ راست گوئی، لیکن
برداشت بھی کر سکیں گے اس کو احباب؟

ہر صاحبِ جوہر کو سبک سر کر دے
فطرت کو زبوں کر کے زبوں تر کر دے
افلاس کہ کھینچتا ہے ایماں کی طرف
کمبخت مسلسل ہو تو کافر کر دے

ہر سانس کو وقفِ صد شرارت کر دیں
اخلاق کی کچھ عجیب حالت کر دیں
مفلس کہ امیروں کے گناتے ہیں گناہ
دولت انھیں دے دو تو قیامت کر دیں

تعریف نہ کر رفیقِ جانی! میری
پامال بہت ہے زندگانی میری
یہ مجھ میں شرافت جو نظر آتی ہے
بنیاد ہے اس کی، ناتوانی میری

فتنے کی ندی میں ناؤ کھیتا ہوں میں
دھوکے کی ہوا میں سانس لیتا ہوں میں
اتنے کوئی دشمن کو بھی دیتا نہیں جُل
جتنے خود کو فریب دیتا ہوں میں

تقدیر کے دائرے میں آنا ہی پڑا
سر، پائے مشیت پہ جھکانا ہی پڑا
واقف تھیں مآلِ گل سے کلیاں لیکن
پھوٹی جو کرن تو مسکرانا ہی پڑا!!

کیا جانیے چہرہ زرد ہوتا کیوں ہے
دل رنج و الم سے سرد ہوتا کیوں ہے
افسوس کہ اتنا بھی نہیں ہے معلوم
کانٹا چبھنے سے درد ہوتا کیوں ہے

خونیں چشمے ابل رہے ہیں، یا رب
خنجر سینوں پہ چل رہے ہیں، یا رب
تجھ کو بھی خبر ہے کہ تری دنیا میں
چھوٹوں کو بڑے نگل رہے ہیں، یا رب

انساں کی جس قدر بھی طراری ہے
بس وقت گزارنے کی عیاری ہے
افسوس کہ بے معرفتِ رازِ حیات
جینا کتنی شدید بیکاری ہے!

ہر علم کو یاں قلیل پایا میں نے
ہر راہ کو بے دلیل پایا میں نے
اللہ کی مخلوق پہ ڈالی جو نگاہ
انساں کو بہت علیل پایا میں نے

جس وقت جھلکتی ہے مناظر کی جبیں
راسخ ہوتا ہے ذاتِ باری کا یقیں
کرتا ہوں جب انساں کی تباہی پہ نظر
دل پوچھنے لگتا ہے "خدا" ہے کہ نہیں؟

یہ نارِ جہنم، یہ سزا، کچھ بھی نہیں
یہ دغدغۂ روزِ جزا، کچھ بھی نہیں
اللہ کو "قہار" بتانے والو!
اللہ تو "رحمت" کے سوا کچھ بھی نہیں

اے شدتِ غم سے جان کھونے والی
اشکوں میں جوانی کو ڈبونے والی
حاصل ہو تجھے خندۂ صبحِ عشرت
اے پردۂ شب میں گھٹ کے رونے والی!

پھر صبر کی تلخ مے پیے لیتے ہیں
پھر اپنا گریبان سیے لیتے ہیں
کل ملنے کا وعدہ ہے تو خیر او ظالم!
ہم اور بھی ایک دن جیے لیتے ہیں

پھر دل میں خوشی کا راج دیکھا میں نے
پھر فرقِ جنوں پہ تاج دیکھا میں نے
پلٹے جو سفر سے تم، تو اک عمر کے بعد
اپنی جانب پھر آج دیکھا میں نے

جانے والے قمر کو روکے کوئی
شب کے پیکِ سفر کو روکے کوئی
تھک کر مرے زانو پہ وہ سویا ہے ابھی
روکے، روکے، سحر کو روکے کوئی!

پُرہول شکم، عریض سینے والو!
خوں، قومِ تہی دست کا پینے والو!
تم اہلِ خرد سے کیوں نہ رکھو گے عناد
خیرات پر احمقوں کی جینے والو!

نیکی کی ہمیں راہ بتاتے رہیے
اللہ سے ہر آن ڈراتے رہیے
پینے والوں کو کہتے رہیے بے دین
اور شوق سے مالِ غیر کھاتے رہیے

کیا فائدہ شیخ! تجھ سے کہنے میں مجھے
خشکی میں تجھے لطف سفینے میں مجھے
عیاش تو دونوں ہیں، مگر فرق یہ ہے
کھانے میں تجھے مزا ہے، پینے میں مجھے

ہر آن جفا سے قلب ڈر جاتا ہے
ہر بات پر آسماں بپھر جاتا ہے
کرتا ہوں اسے مالِ غنیمت میں شمار
جو لمحہ فراغت سے گزر جاتا ہے

غالب ہے مرا جذبۂ غیرت مجھ پر
اک قہر ہے ناکسوں کی صولت مجھ پر
زاہد اگر آج مے کو جائز کر دے
اک قطرہ بھی پھر پیوں تو لعنت مجھ پر

کیا اسے شیخ! ملے گا گل فشانی کر کے؟
کیا پائے گا توہینِ جوانی کر کے؟
تو آتشِ دوزخ سے ڈراتا ہے انھیں!!
جو آگ کو پی جاتے ہیں پانی کر کے!!

جھکتا ہوں کبھی ریگِ رواں کی جانب
اڑتا ہوں کبھی کاہ کہشاں کی جانب
مجھ میں دو دل ہیں، اک تو مائل بہ زمیں
اور ایک کا رخ ہے آسماں کی جانب

آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا
آ گئے کئی صدیوں سے ترانہ اپنا
قدرت سے ملا ہے مجھ کو صد حیف یہ حکم
بہروں کو سنائے جا فسانہ اپنا

جب رخصتِ شباب پارا پارا ہوگا
دل کو رونے کا بھی نہ یارا ہوگا
حیراں ہوں کہ داغِ شیب و ننگِ پیری
کیونکر مری عزت کو گوارا ہوگا!!

ماضی نے جھلک اپنی دکھائی کیا کیا
تاریخ نے کی جلوہ نمائی کیا کیا
نکلا جو بصد شکوہ سلطاں کا جلوس
شاعر کی گدائی مسکرائی کیا کیا

سادہ نت ہوں، کب کسی سے ڈرتا ہوں میں
دوزخ سے نہ زندگی سے ڈرتا ہوں میں
اس طنطنہ و بہادری کے باوصف
دنیا! ترے آدمی سے ڈرتا ہوں میں

ہر منظرِ زشت و خوب بھاتا ہے مجھے
ہر ذرہ نئی جھلک دکھاتا ہے مجھے
پھولوں میں بھی امتیاز کرتا تھا کبھی
کانٹوں پہ بھی اب تو پیار آتا ہے مجھے

اسرار کا عقل میں نہ آنا دیکھو
ہر گام پہ سو فریب کھانا دیکھو
مشغولِ مباحثہ ہیں پیرانِ کہن
بوڑھے بچوں کا بچپنا دیکھو

کیا شیخ کی خشک زندگانی گزری
بے چارے کی اک شب نہ سہانی گزری
دوزخ کے تخیل میں بڑھاپا بیتا
جنت کی دعاؤں میں جوانی گزری

شیون ہی میں گو شباب کاٹا ہم نے
پر، عہد یہ کامیاب کاٹا ہم نے
آنکھوں نے تمام رات تارے توڑے
اور صبح کو آفتاب کاٹا ہم نے

محمد ارشاد

تاثرات و تفکّرات

بصورتِ رباعیات

١٩٧٩ء تا ١٩٨٨ء

نقطوں کی ریت عمر ساری چھانی
کیا بات عجب تھی ہم نے جی میں ٹھانی
ڈھیری زرِ قلب¹ کی لگی جب دیکھی
دی پھونک ہوا میں، پھینک دی ہمیانی

گرداں ہیں مہ و مہر و زمیں، ثور و سہیل
آیا نہ سمجھ میں کچھ، کھلاڑی کا کھیل
کیا جانیے، کون کون ہے، کیا ہے کیا
کولھو، کولھو کا بیل، تیلی، تل، تیل

ہاں کچھ بھی ہے رہ، دراز بھی اے ہمراہ
کہسار میں کون چل سکا سیدھی راہ
لاٹانگیں ہزار گز کی، پھر مجھ سے پوچھ
چوٹی تک راہِ مستقیم و کوتاہ

خود ہی بھیجے ہمیں یہاں، بھیج بلائے
رہنے میں یہاں ہمارے، اُس کا کیا جائے
دنیا بھی اسی کی جب ہے جیسے عقبیٰ
کیا کھوئے جو یاں رہیں، بُلا کر کیا پائے

کیا مالک کیا کمیں، ہے کولھو کا بیل
کیا شاداں کیا غمیں، ہے کولھو کا بیل
گھومے ہر چیز دوسری چیز کے گرد
کیا سورج کیا زمیں، ہے کولھو کا بیل

سمجھے تھے ہمیں آنا تھا، جانے والے
آگے ہوتے ہم سے، ساتھ جانے والے
ٹھوکر کھا کر، اجل کے پاؤں میں گرے
ہاتھوں سے چھڑا کے ہاتھ جانے والے

---

¹ زرِ قلب: کھوٹا زر۔ ح: کیسۂ زر

برگد تلے یا کہ میکدے میں بیتے
دکھ سے خیام ہی نہ گوتم جیتے
ہر دل صد پارہ، ہر جگر ہے صد چاک
کس کس کو رفو کرتے، کیا کیا سیتے

صیاد کو مل گئی چمن کی میری
بلبل کی داد، داد؟ یا نچیری!
خود مدعی، خود گواہ، خود ہی منصفؔ
یہ داد گری ہے یا کہ داداگیری؟

آزاد ہو، خو وہی غلامی کی ہے
خوبی کی نہیں یہ بات، خامی کی ہے
چاٹا ہے اُسی کو تم نے اے اہلِ وطن
جس نے تم سے نمک حرامی کی ہے

سجدے کر کے ماتھا اپنا پھوڑا
سجدہ ریزی سے مُنہ نہ لیکن موڑا
وافر ہے بہت خدا پرستی اپنی
جس کو چاہا خدا بنا کر چھوڑا

باراں، شبنم نہ چشمِ پُرنم سے دُھلے
دھو ڈالیے مَل مَل کے اگر ہم سے دُھلے
کس گھاٹ پہ جا کے دھوتے لوحِ جبیں
گنگا جل سے نہ آبِ زمزم سے دُھلے

موسم ہو کوئی بھی، گرمی ہو یا سردی
نفسا نفسی ہے اور فردا فردی
گلیوں میں وطن کی اب بجائے اسلام
اسلام گری ہے اور مُلّا گردی

اے میرے وطن! ترا ہے اللہ والی
یہ حال رہا تو جا چکی بدحالی
تیرے ارباب کا نرالا ہے ڈھب
پھولے ہوتے ڈب ہیں اور جھولی خالی

اے رب العالمین! اے پالنہار!
اُمّت ہے فقیہہ و پیر کا اب بیوپار
ہے گرم "اسلام" کا ہر سُو بازار
تومان، روپے، ریال، ڈالر، دینار

اے واعظِ شہر! تونے یہ کیا ٹھانی
دنیا کی نہ دیں کی ہی حقیقت جانی
کہتے ہو، نہیں ہے دین و دنیا میں فرق
حضرت! ہے دودھ دودھ، پانی پانی

اَمرِ دنیا و اَمرِ دیں ایک نہ جان
ہے اس کے خلاف مصطفےؐ کا فرمان
ھا: اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاَمْرِ دُنْیَا[۲]
مُلّا کی نہ سُن، نبیؐ کی سُن، او نادان!

۱۔ ماخوذ از فیض
۲۔ حدیث نبوی۔ صحیح مسلم۔ تم اپنے دنیاوی امور مجھ سے بہتر جانتے ہو۔ انتم اعلم بامر دنیاکم

مَافَاتَ مَضٰی وَلَا یَکُوْنُ مَاکَانْ[1]
دَالَتْ لَھُمُ الدَّوْلَتُہٗ مَنْ ذَانْ فَدَانْ
کے گرود روز رفتہ باز؟ اے اخوان
اِنْ کُنْتُمْ صَادِقِیْنَ ھَاتُوْا بُرْھَانْ

کاغان، سوات، ہنزہ، گلگت، چترال
جنت ہیں مگر ہیں اہل جنت بدحال
باور آیا کہ جنتی لوگ اکثر
ہوں گے مسکین و مفلس و بے زر و مال

بیماری، بھوک، جنگ، غربت، کشکول
یہ لوٹ کھسوٹ، دھاندلی، دھونس، مخول
کل تو پوچھے گا، آج ہم پوچھتے ہیں
ہاں ہاں لمن الملک؟ خدایا کچھ بول!

کرکے ہمیں فی الارض خلیفہ مجعول
کہنے لگے پھر ہمیں ظلوم اور جہول
گر اہل تھے ہم تو کیوں یہ طعن و تشنیع
گر اہل نہ تھے ہم تو ہوئی کس سے بھول؟

ہے کام اور انتقام قدرت کا عجیب
ٹل کر رہتا ہے وقت آنے پہ نصیب
دنیا میں جیسی کرنی ویسی بھرنی
ہوتا نہیں کیا جہاز ہشکلِ صلیب؟

ہے چال تری زمین کی دائرہ دار
کج رہ مرکب پہ کردیا مجھ کو سوار
اب حکم ہے، اختیار کر سیدھی راہ
مرکب کو سدھار یا مجھے اس سے اتار

پی لی ہے کر کے تھوڑی تھوڑی میں نے
اک قطرہ پیالے میں نہ چھوڑی میں نے
جو بچ رہی پینے سے، قلم میں بھر لی
جب چاند سے چاندنی نچوڑی میں نے

ہم ہیں لیلائے فکر و فن کے مجنون
وہ حشمت و جاہ و مال و زر پر مفتون
بھونرے پھولوں میں، گندگی میں کیڑے
کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْھِمْ فَرِحُوْن

مارا تھا انا کو، خاک ہستی کی تھی
آباد کسی سے دل کی بستی کی تھی
دوزخ میں جل رہا ہوں اک مدت سے
کچھ دن میں نے بھی بت پرستی کی تھی

گُل سے ہے غرض ہمیں نہ لالے سے ہے
بلبل کے چہچہے نہ نالے سے ہے
کب ہوں گے دور دُکھ نبی آدم کے
جو بھی ہے سخن اسی حوالے سے ہے

---

[1] جو گزر گیا سو گزر گیا، جو تھا سو اب نہیں، دولت و امارت دو مردوں کی طرف پھیر دی گئی، جو گزر در ہوا سو گزر در ہوا اور جس نے یہ حقیقت جان لی سو مان لی، وہ دن جو گزر چکا ہے کب لوٹ کر آیا؟ اے اخوان (المسلمین) اگر تم سچے ہو تو لاؤ برہان (تاکہ ہم مان لیں کہ تم صحابہؓ کرام کا دور لے آؤ گے)۔

اسلم انصاری

رُباعیّات

میں حرف ہوں، میرا لبِ گویا تُو ہے
میں سازِ سخن ہوں، مرا نغمہ تُو ہے
جو تجھ کو ترستا ہے وہ ساحل ہوں میں
جو مجھ میں اُمڈتا ہے، وہ دریا تُو ہے

ایماں ہو تو محراب کا خم کافی ہے
انساں ہو تو انسان کا غم کافی ہے
صناع کا اک نقشِ مُرصّع ہے بہت
خلّاق کی اِک موجِ رقم کافی ہے

خوابیدہ شراروں کے مقدر جاگے
تیشے کی صدا آئی تو پتھر جاگے
اِک یاد نے برپا کیا طوفانِ خیال
مہتاب جو اُبھرا تو سمندر جاگے

تصویر میں ٹھہرا ہوا نغمہ تو نہیں
خوابوں کا سمن پوش دریچہ تو نہیں
سایہ تو نہیں یہ کسی دیرآنے کا
دُنیا کسی آواز کا دھوکا تو نہیں

اِک موجِ تبسم سے کِھلا، رنگ ہُوا
یا اپنی جراحت میں حنا رنگ ہُوا
دیکھے کوئی بکھرا ہوا شیرازۂ گُل
آشفتۂ اظہار کا کیا رنگ ہوا

ساحل پہ گہر ریز ہوئی موجِ شعور
اُبھری تو بہت تیز ہوئی موجِ شعور
اِک قطرۂ بیتاب سے طوفان اُٹھا
کیا سیلِ گراں خیز ہوئی موجِ شعور

صحراؤں کی دُوری سے ندا سُنتا ہُوں
کچھ کہتی ہے جب تیز ہوا سُنتا ہُوں
ساحل سے سمیٹ آتا ہوں موجوں کا سکوت
اور گھر میں سمندر کی صدا سُنتا ہوں؛

کھنچتی ہے کماں، تیر نکل جاتا ہے
دن دیکھتے ہی دیکھتے ڈھل جاتا ہے
کس طرح گزر جاتی ہے اِک فصلِ بہار
کس طور سے اک عہد بدل جاتا ہے

لہرایا اُداسی نے جب اپنا آنچل
شاخوں پہ پرندے ہوئے بوجھل، بے کل
اِک یاد مچلنے لگی دریا دریا
اِک شام اُترنے لگی جنگل جنگل

اک سنگ تہِ آبِ رواں باقی ہے
اِک نقش پسِ نقشِ گماں باقی ہے
کہتا ہے عنادل سے بہاروں کا سکوت
کیا اب کوئی اسلوبِ فغاں باقی ہے؟

جو سطحِ خموشی پہ بکھر جاتے ہیں
کیا جانئے نغمے وہ کدھر جاتے ہیں
کتنے ہی تموّجاتِ احساس و خیال
الفاظ کو بس چھُو کے گزر جاتے ہیں

نکہت کی حلاوت سے لرز جاتا تھا
وہ رنگ کے پرتو سے سُلگ اُٹھا تھا
کس طرح تھا توسیعِ خزاں میں کوشاں
اک لمحہ کہ تا صبحِ بہار آیا تھا

بے برگ مسافتوں میں بھٹکی ہو گی
قریہ قریہ ٹھٹھک کے ٹھہری ہو گی
شاخوں میں نمو پاتی ہوئی رُوحِ بہار
کانٹوں بھرے جنگلوں سے گزری ہو گی

اس شعلۂ تصویر میں حدّت کب تھی
اِس آئینے میں غیر کی صورت کب تھی
خود اپنی پرستش کا ہے دھوکا سارا
انسان کو انساں سے محبّت کب تھی

الفاظ کی زنجیر بنا لایا ہے
آوازوں کے کچھ تیر بنا لایا ہے
اک دوست نے کل مجھ پہ کیا تھا احساں
آج اُس کی وہ شمشیر بنا لایا ہے

دل آئنہ ہے، اس پہ تحیّر کیسا
فن دین ہے فطرت کی تجنّز کیسا
وہ قامتِ بالا ہو کہ ہو سروِ خیال
اِک مصرعِ موزوں پہ تفاخر کیسا

انجامِ سفر ہے تشنہ کامی، یارو
حاصل ہے شعورِ ناتمامی، یارو
مقصودِ سخن ہو ہم کلامی لیکن
تقدیرِ سخن ہے خود کلامی، یارو

دو آتشہ — اسیر عابد کا "دیوانِ غالب"

انور مسعود

جن دنوں میں لاہور میں ایم۔اے کا طالب علم تھا۔ ناصر کاظمی مرحوم سے ملنے کا اتفاق ہوتا رہتا تھا۔ ایک دن میں نے ناصر سے پوچھا کہ "آپ میر تقی میر کے بڑے معتقد اور شیدائی ہیں اور یہ بھی مشہور ہے کہ آپ کی شاعری پر میر کے اثرات بہت گہرے ہیں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ غالب کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟" تو ناصر نے فوراً جواب دیا کہ بھائی! غالب کے قریب جانے سے تو ہمارے پَر جلنے لگتے ہیں" ناصر کاظمی کی اس بات پر میں بہت غور کرتا رہا اس لئے کہ اُس نے ایک انتہائی سچی بات کہی تھی۔

غالب کی امیجری پر غور کیا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کے ہاں زیادہ تر تصویریں آگ سے بنتی ہیں اور اس کی پیکر تراشی آتشی ہے۔ آگ میں جتنی خاصیتیں ہیں وہ سب کی سب غالب کی شاعری میں پائی جاتی ہیں۔ کیا اس شعر میں شعلے کی سی لپک نہیں ہے۔

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تُو کیا ہے
تمہی کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

شعلے کا رُخ بلندی کی طرف رہتا ہے اور وہ سر جھکانا نہیں جانتا۔ "سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سر گراں کیوں ہو؟" اس شعر میں یہی رویہ تو بول رہا ہے۔ غالب کے جوہرِ اندیشہ میں بلا کی گرمی ہے۔ سوزِ غم ہائے نہانی اور آہِ آتشیں کے بیکراں سلسلے ہیں۔ اس کے پسندیدہ رنگ میں آگ کی سُرخیوں کے مختلف شیڈز (SHADES) دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ آنکھوں سے بہتی ہوئی جوئے خوں میں بھی شمع فروزاں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ وہ خود بھی کہتا ہے

لکھتا ہوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخنِ گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پہ انگشت

عبدالرحمن چغتائی کو غالب کی اس آتش مزاجی سے کمال درجے کی شناسائی حاصل تھی، اسی لیے تو اُس نے:

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے!
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

کی تصویر بناتے ہوئے ایک جلتا ہوا چراغ دریا کی لہروں کے حوالے کر دیا ہے۔ میرؔ اور غالبؔ کا موازنہ کیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ میرؔ کی امیجری آبی ہے اور غالبؔ کی آتشی بلکہ میرؔ کے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ

ایک سب آگ — ایک سب پانی

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ناصر کاظمی نے جس آگ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اسیر عابد نے اس کے نزدیک جانے کا حوصلہ پیدا کر لیا ہے۔ ترجمہ اور پھر غالب کا ترجمہ اور پھر اس کے پورے دیوان کا ترجمہ اور پھر ٹھیٹھ پنجابی میں اس ریختہ کا ترجمہ جو رشکِ فارسی ہے۔ یہ کام صرف اسیر عابد کے ہاتھوں سرانجام پایا ہے۔ "جُز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار"

"مجنوں باجوں عشق مدانے کوئی رڑے نہ چڑھیا سی"

ابھی ابھی عرض کیا جا چکا ہے کہ عبدالرحمٰن چغتائی نے غالب کی آتش پیکر تراشی کے راز کو پا لیا ہے۔ اسیر عابد کا پنجابی ترجمہ بھی گواہی دیتا ہے کہ وہ غالب کی نوائے آتشیں کے جملہ سوزناک پیرایوں کا محرم ہے۔ اسے بھرپور احساس ہے کہ وہ ایک بڑی منفرد اور تند و توانا آواز کے الاؤ کو پنجابی کے الفاظ میں ڈھال رہا ہے۔ اس ترجمے اور ترجمانی کے دوران میں اُسے غالب کے تخیل کی آتش کرداری کا بدرجۂ اتم ملحوظ رہا ہے۔ اسیر عابد کے ترجمے میں ایسی مثالیں جا بجا دکھائی دیتی ہیں۔ غالب کہتا ہے:۔

دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار　　　اس چراغاں کا کروں کیا کار فرما جل گیا

ترجمے کے تیور دیکھئے:

دل ہُندا تے آپے تینوں بلدے داغ دکھاندا　　　میں ایہ دیوے کتھے بالاں بالن والا بلیا

قابلِ غور بات یہ ہے کہ اسیر عابد نے "داغوں کی بہار" کا ترجمہ "بلدے دیوے" کیا ہے۔ غالب کا مشہور شعر ہے۔

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا　　　ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

اسیر کا ترجمہ یوں ہے:۔

جگ دُنیا تے نقش وفا دا من بھرواسا ہویا نہ
ایہ کوئی لفظ نصیباں سڑیا معنے جوگا ہویا نہ

ملاحظہ فرمائیے "نصیباں سڑیا" کا اضافہ غالب کے مزاج سے کتنا ہم آہنگ ہے۔
غالب کا یہ شعر دیکھئے:۔

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز　　　پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

اسیر عابد نے اس کے ترجمے میں "دُھوخ" کا لفظ استعمال کر کے اس تاثر کو کیا آتشناک بنا دیا ہے۔

آخر پیڑاں ہالی دُھوخ نہ کڈھی سی　　　فیر ترے ٹُریئے دا ویلا یاد پیا

غالب فرماتے ہیں:۔

دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا　　　نالہ کرتا تھا وَلے طالبِ تاثیر بھی تھا

ترجمہ ملاحظہ ہو:۔

اکھیں ویکھ کے غیر نوں ایس تائے کیوں نہ ہوے کلیجڑے ٹھنڈ مینوں
ساڑ پھوکدا سی نال ہوکیاں دے نالے حاصلاں دا طلبگار وی سی

اس ترجمے میں "ایس تائے" اور "ساڑ پھوکدا سی" کے استعمال سے کیفیتِ شعر کس قدر قرینِ مزاجِ غالب محسوس ہوتی ہے۔ اب یہ شعر اور اس کا ترجمہ دیکھئے:۔

سب رقیبوں سے ہیں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں!

سارے سڑن رقیباں توں پر سینے ٹھنڈ زلیخا دے
مصری ناراں تک یوسف نوں بکیاں بکیاں ہو گئیاں

اس مقام پر ناخوش کا ترجمہ "سڑن" سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے اور "ناراں" کے لفظ میں "شعلہ رخانِ مصر" کی کیا تصویرِ فروزاں دکھائی دیتی ہے۔

غالب کا ایک اور شعر یاد آ رہا ہے جس میں آگ کا ہم معنی کوئی لفظ موجود نہیں لیکن اسیر کے ترجمے سے یوں لگا ہے جیسے کسی شعلہ زار کی نقاب کشائی ہوئی ہے:۔

ہوئی ہے کثرتِ غم سے تلف کیفیتِ شادی کہ صبحِ عید مجھ کو بدتر از چاکِ گریباں ہے

دُکھ دیاں فوجاں سکھ سواداں نوں اینج اگاں لائیاں نیں
عید سویرا لگے جیویں پاٹا گلماں لیراں دا!

اسیر عابد نے کیفیتِ شادی کے تلف ہو جانے کو آگ کا الاؤ کہا ہے اور پھر اس الاؤ کو "پاٹا گلماں لیراں دا" کہہ کر تشبیہ کو معتبر کیا ہے۔ جب الاؤ سے شعلے اُٹھتے ہیں تو وہ "پاٹیاں لیراں" کا ایک پھریرا سا بن جاتا ہے۔ یہ ترجمہ غالب کے سخنِ گرم سے کتنا ہم آہنگ ہے۔

اس ضمن میں صرف ایک اور شعر کا حوالہ دے کر مضمون کو آگے بڑھاتا ہوں۔ غالب کی ایک غزلِ مسلسل کا ایک معروف شعر ہے۔

جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے روز بازارِ جاں سپاری ہے

اسیر نے اپنے ترجمے میں غالب کی آتش مزاجی کی رعایت کس قرینے سے ملحوظ رکھی ہے۔

فیر اَج رُوپ ڈھنڈورے دِتے ناراں نے
تتے تا عشقاں نے چند واری اے

ترجمے کے بارے میں بس اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ "لبکم و شواز" ہے۔ رُوحِ خیام کو جذب کئے بغیر فٹز جیرالڈ کا ترجمے اور ترجمانی کا عظیم کارنامہ ہرگز وجود میں نہیں آ سکتا تھا۔ کسی جذبے اور خیال کو ایک زبان سے دوسری زبان میں اس طرح منتقل کر دینا کہ اس کی تاثیر اور کیفیت برقرار رہے بڑا جان جوکھوں کا کام ہے اور اس میں سو فیصد کامیابی امرِ محال ہے۔ مترجم کے لئے ضروری ہے کہ مصنف کا مزاج شناس ہو، اس کی زبان سے گہری آگاہی رکھتا ہو اور اپنی زبان میں ایسی استعداد کا حامل ہو جس کے بل پر زبان نئی جہتوں اور نئے ذائقوں سے آشنا ہو سکے۔

مجھے اسیر عابد کا ترجمہ شدہ دیوانِ غالب کا نسخہ ڈاکٹر انعام الحق جاوید کی معرفت صرف اتنے عرصے کے لئے ملا کہ میں اسے بمشکل کہیں کہیں سے دیکھ سکا۔ اس سرسری مطالعے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس کتاب کے کماحقہٗ مطالعے کے لئے بڑی توجہ اور بڑا وقت درکار ہے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ غالب کے گنجینۂ معنی تک کامل رسائی اتنی آسانی سے نہیں ہو پاتی اور ذہن کو گوہرِ معانی تک پہنچنے کے لئے بسا اوقات کئی ہفت خواں طے کرنا پڑتے ہیں۔ اس مختصر سے مطالعے سے صرف یہ عرض کر سکتا ہوں کہ اسیر عابد کے ترجمے کی سب سے بڑی خصوصیت اُس کی

خستگی ناپذیر تلاش ہے۔ وہ لفظی ترجمے سے گریزاں ہے اُس کا ہدف یہ ہے کہ غالب کے ہاں جو ایکسپریشن (EXPRESSION) موجود ہے۔ پنجابی میں اس کا صحیح متبادل تلاش کیا جائے اور غالب کی ترکیبوں کو پنجابی ماحول اور پنجابی فضا کے مطابق ڈھالنے کی اس کی کاوش واقعی قابلِ ستائش ہے۔ ستائش کے لفظ سے غالب کا مصرع یاد آیا:

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا

اور اب اس ستائش گری کا اسیر عابد کے ہاں پنجابی ایکسپریشن ملاحظہ ہو:

"ملاں ایڈا ٹوہر بنائے جیہڑے باغ بہشتاں دا"

غالب نے کہا تھا "کچھ خیال آیا تھا وحشت کا"۔ اب اس کا لفظی ترجمہ مقصود ہوتا تو مسئلہ بالکل سیدھا تھا۔ "کجھ خیال آیا سی وحشت دا" لیکن اسیر عابد دل کی تسلی کا کیا کرے! وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر پنجابی کا کیا پیرا یہ لے کر آیا ہے:

"دل کیتا سی جھل کدائیے"

غالب کی ترکیبوں کو پنجابی تراکیب میں ڈھالنے میں اُس نے عجیب ندرتِ ایجاد سے کام لیا ہے۔ غالب کے "طاقِ نسیاں" کی صورت اسیر عابد کے ہاں "بھُل پڑ چھتی" ہے۔ "سوزِ نہاں"، "گجھا سیک" ہے۔ "دلِ حسرت زدہ" — "سدھراں بھنڈیا دل" اور خوباں کے ساتھ اسد کی "چھیڑ" پنجابی میں "اِٹ کھڑکا" بن گئی ہے۔ جلاّد کے آگے نشاط کے ساتھ چلنے کی کیفیت "جھنگڑے" کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ اور غالب کی "نوائے سروش" اسیر کے ہاں "جبریل لکارا" بن گئی ہے۔

اسیر عابد کوشش یہ کرتا ہے کہ غالب کا خیال پنجابی کی پوشاک پہن کر ویسی ہی سج دھج والا دکھائی دے جیسا کہ لباسِ ریختہ میں لگتا ہے۔ غالب کہتا ہے:

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی

اسیر کا ترجمہ دیکھئے

دل توں ہندی نین کٹاری وچ کلیجے لیہہ گئی

غالب کہتا ہے

ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق

اسیر کا ترجمہ دیکھئے

جھل عشقے دی چوگ لکھی اے ٹھنگر وٹیاں اُتے

غالب نے کہا

سر کھجاتا ہوں جہاں زخم سر اچھا ہو جائے

اسیر نے یوں ترجمہ کیا

اوتھے فیر کھلو ہن اے جتھے پیروے پھٹ ٹھر بینڈ پیا

بھر دیں یک گوشۂ دامن گر آبِ ہفت دریا ہو

ذرا ترجمے کے تیور ملاحظہ ہوں :

میری جُھنڈ نہ گِلی کردی چھیڑی ست سمندراں دی

مصرعوں کے بعد اب نمونے کے طور پر دو تین شعر

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے جس دم چاہو — میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

ترجمہ — مٹھیاں ہو کے سدلے مینوں بھاویں کیہڑے ویلے
میں کوئی لنگھیا ویلا نئیں جو پرت کے آ نئیں سکدا

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب — تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

ترجمہ — تیرے "صوفی" دے ویروے واہ سائیں، اُتوں غالبا کُلک بیان تیرا
جے کر پین دی تینوں نہ مار ہُندی ساڈے لئی توں ولی اوتار ہوندا

داغِ دل گر نظر نہیں آتا — بُو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

ترجمہ — جے کر سل دے دا نظریں آوے نہ !
یار طبیبا تینوں مشک دی آوندی نئیں

جہاں اسیر کو یہ احساس ہوتا ہے کہ پنجابی ایکسپریشن غالب کا ساتھ نہیں دے رہا تو پھر وہ ایسے معاون کلمات لاتا ہے جو اس کمی کو بطریقِ احسن پورا کر دیتے ہیں اور یہ وہ اہم بات ہے جس کی طرف احمد ندیم قاسمی صاحب نے بھی بھرپور اشارہ کیا ہے۔ غالب کی مشہور غزل "کوئی صورت نظر نہیں آتی" کا پورا ترجمہ اس اہتمام کی گواہی دیتا ہے۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد — پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

ترجمہ — مَنیا منتھے ٹیکیا اجر ودھیرے نیں
ایسے پاسے طبع کمبختی آوندی نئیں

اس شعر میں "کمبختی" کے اضافے نے کیفیتِ شعر کو بھرپور طریقے سے پنجابی میں منتقل کر دیا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ اسیر عابد لفظی ترجمے سے گریزاں ہے وہ غالب کی ردیفوں اور بحروں کا پابند بھی نہیں ہے بلکہ اس نے تو ترجمہ کرتے ہوئے غالب کی پہلی غزل کی ردیف اور بحر بھی بدل دی ہے۔ غالب نے اس غزل کے پہلے شعر میں بڑے معرکے کا مضمون باندھا ہے۔ کاتبِ تقدیر کے حضور تشکر کے ساتھ شکایت کو بھی ملا دیا ہے۔ اسیر عابد اس غزل کا ترجمہ کرتے ہوئے ردیف کے لئے "سائیں" کا لفظ لے کر آیا ہے اور اس مقام پر پنجابی میں اس سے زیادہ موزوں ردیف کا انتخاب ممکن بھی نہیں ہے۔ بحر بھی اس نے "ہیر" کی منتخب کی ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

ترجمہ — چتر چیکداں چتر کار کیہڑے، کھیڈ کمن گُنھیا وچ تحریر سائیں
چولے کاغذی ساریاں مورتاں دے ایہے دسیاں دے تقصیر سائیں

اس شعر میں تو یوں لگتا ہے جیسے اسیر عابد کا ایک ہاتھ غالب کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا سید وارث شاہ کے ہاتھ میں۔

اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ غالب کا مشاہدہ مرکب ہے۔ وہ جب کسی ایک نقطے پر نظر ڈالتا ہے تو اس کی نظر تمام مربوط نقطوں کا احاطہ کر لیتی ہے۔ اسی کو اس کی پہلوداری کہا جاتا ہے۔ غالب کی اس پہلوداری اور اس کے منفرد اسلوب بیان کو پنجابی کے رنگ میں رنگنے کی اسیر عابد نے ایسی کوشش کی ہے جس کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

میرے کئی شاعر اور ادیب دوستوں نے اس بات کا برملا اعتراف کیا ہے کہ غالب کے بہت سے ایسے شعر جن کے معانی اُن پر پوری طرح واضح نہیں ہو سکے تھے، اسیر عابد کے ترجمے کے مطالعے سے اُن مشکل اشعار کے مفہوم کے دریچے کھل گئے ہیں۔ میں نے بھی اس ضمن میں اس ترجمے سے بڑا استفادہ کیا ہے۔ بلاشبہ اسیر عابد کا ترجمۂ دیوان غالب، غالب شناسی کے سلسلے میں بھی ایک 'عقدہ کشا' کارنامہ ہے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ترجمہ اصل متن سے بُعد پیدا کرتا ہے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ اسیر عابد کا ترجمہ غالب کے متن سے زیادہ قریب کر دیتا ہے۔

اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ ایشیائی زبانوں میں سے کس زبان کا کس زبان میں انتہائی زوردار ترجمہ ہو سکتا ہے تو میرا جواب ہے فارسی کا پنجابی میں۔ ہمارے صوفی شعرا نے رومیؔ، سعدیؔ اور حافظ شیرازؔ کے بعض اشعار کے بڑے جاندار ترجمے کئے ہیں۔

سُن لکڑدی وِنجلی کولوں درد وچھوڑا دُکھ دا

یہ مصرع "بشنو از نَے چوں حکایت می کند" کا ترجمہ ہی تو ہے۔ پورا شعر ایک مصرعے میں سمٹ آیا ہے۔

نال شراب رنگ مصلّےٰ جے ہادی فرماوے

یہ حافظ کا ترجمہ ہے کہ "بہ مے سجّادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید" اور یہ سعدی سے استفادہ ہے۔

دُشمن مرے تے خوشی نہ کریئے سجناں وی مر جانا

اے دوست بر جنازۂ دشمن چو بگذری شادی مکن کہ بر تو ہمیں ماجرا رود

فارسی سے ہماری نئی نسل بہت دور ہوتی جا رہی ہے۔ اسیر عابد کو میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ ہمارے صوفی شعرا کی اس روایت کی تجدید کرے اور غالب کے فارسی کلام اور حضرت علامہ اقبال کے فارسی اشعار و آثار کو پنجابی میں ڈھالنے کا اہتمام کرے۔ اس لئے کہ ایک پڑھا لکھا اور خوش ذوق پنجابی بانگِ درا، بالِ جبریل اور اردو شاعری کے دیگر شاہکاروں سے پہلے ہی گہری شناسائی رکھتا ہے۔ اسیر عابد کے ترجمۂ دیوان غالب میں ہمارے پنجابی کے عظیم متقدمین کے تراجم کی سی جو آب و تاب پائی جاتی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس کی وجہ یہی ہے کہ غالب کی اردو بڑی فارسیت مآب ہے۔

اسیر عابد کے دیوانِ غالب کے منظوم پنجابی ترجمے کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوتا رہا ہے کہ ہر شعر کا ترجمہ کرتے ہوئے اسیر عابد یہ سوچتا رہا ہے کہ غالب اگر اپنی انہی قلبی اور ذہنی توانائیوں کے ساتھ اکبر آباد کے بجائے لاہور یا اس کے مضافات میں پیدا ہو گیا ہوتا اور پنجابی میں شعر کہتا تو اس مضمون کو کس پیرائے میں بیان کرتا۔ اس ضمن میں اسیر عابد نے پنجابی زبان کے امکانات کو ٹٹولنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے اور اس کامیاب کوشش نے پنجابی زبان کو مالا مال کر دیا ہے۔ شریف کنجاہی صاحب نے اسیر عابد کے ترجمے پر تبصرہ کرتے ہوئے

درست کہا ہے کہ :۔

"پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر بہانا ہر تیشے والے کے بس کی بات نہیں، یہ کام اسیر عابد ہی کر سکتا تھا۔"

اس مقام پہ شریف کنجاہی صاحب کے بعد رُوحی کنجاہی صاحب کی اس رائے کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا جس کا اظہار انہوں نے اسیر عابد کے ترجمے سے متعلق منعقدہ ایک تقریب میں کیا ہے۔ رُوحی صاحب کا خیال ہے کہ :۔

"اس دور میں اردو اور پنجابی کے بیشتر شعرا تخلیق کے نام پر ترجمہ کر رہے ہیں اور وہ بھی ناکام ۔ جبکہ اسیر عابد کا امتیاز یہ ہے کہ اس نے ترجمے کے نام پر زبردست تخلیق کارنامہ انجام دیا ہے۔"

میں نے اسیر عابد کو جو مشورے دیے ہیں وہ بھی اس بنیاد پر دیے گئے ہیں کہ اس کی ترجمہ کرنے کی استعداد نے مجھے حیرت میں ڈال رکھا ہے۔ اس کی یہ صلاحیت ایسی توانا اور منفرد ہے کہ :

خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھیے

"قلماں انگلاں منہ وچ پائیاں کیہ لکھیے چا ایہنوں"

"راجہ گدھ" اور اس کا اینٹی ہیرو

شاہین مفتی

مرد اور عورت کے بے انت تعلق سے ابھرنے والی ان ہونی، غیر متوقع، انوکھے واقعات کی مخزن کہانیاں عوام الناس کے حافظے میں منڈلاتی رہتی ہیں۔ ہندو دیوتا تواشتری نے آخر آخر آدمی کو مخلصانہ مشورہ دیتے ہوئے کہا تھا "جس طرح بھی ہو سکے عورت سے نبھاؤ کیونکہ اگر تم اس کے ساتھ نہیں رہ سکتے تو اس کے بغیر بھی نہیں رہ سکتے۔"

"راجہ گدھ" بھی آدم و حوا کے باہمی رشتوں کی ایک لامتناہی کہانی ہے جس کی اُڑتی پتنگ پروفیسر سہیل اپنے شاگردوں کے ہاتھ میں دے کر خود منظرِ عام سے ہٹ گیا ہے۔ اس ڈور کا مٹیریل کیسا ہے، اسے مانجھا کیسا لگایا گیا ہے، اس کی طوالت کتنی ہے، یہ کون سے رنگ میں رنگی ہے اور اس کا دوسرا سرا کہاں ہے؟ اس تجسس میں نسلوں کی نسلیں دیوانی ہو رہی ہیں اور کہانی کے سب کردار سہیل کی طرح اپنے اصلی نیوکلس سے کٹ گئے ہیں۔ لامرکزیت کے باعث ہر کردار اِدھر اُدھر ٹامک ٹوئیاں مارتا پھرتا ہے اور ایک دوسرے کے دائرے کا اسیر ہو کر اصل مرکز سے ہٹ گیا ہے۔ دیوانگی اور مقدس دیوانگی، صراط اور صراطِ مستقیم کے درمیان ایک باریک، مبہم اور لطیف پل ہے۔ اسمِ اعظم گم ہو چکا ہے اور ہر مسافر منزلِ عشق کا سراغ مانگتا پھرتا ہے مختصراً:

انجام یہ کہ گردِ سفر لے کے آ گیا

بانو نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا ہے: "میں ۵۶ سال سے مختلف قسم کے راجہ گدھ دیکھتی چلی آ رہی ہوں۔ اس کے باوجود کہ ہمارا معاشرہ حدود و قیود کا قائل ہے اور اتنی لبرل ازم ابھی نہیں آئی کہ آپ عشق میں مبتلا ہو کر کسی لڑکی کو فون کریں اور اسے سکوٹر پر بٹھا کر ساتھ لے جائیں، اس کے باوجود میرا مشاہدہ ہے کہ ہمارے معاشرے کا ہر دوسرا لڑکا اور ہر بارھویں لڑکی راجہ گدھ ہے۔"

خیر یہ اعداد و شمار تو شعبۂ شماریات کا حصہ ہے، حیرت ہے کہ مصنفہ نے اس محبت کی کہانی میں حوا کے کردار کو اتنا غیر متعلق کیسے قرار دے دیا، جبکہ اس ناول میں مرد سے زیادہ عورتوں کے کردار علامتی یا سطحی طور پر راجہ گدھ بنا کر پیش کئے گئے۔

علامت کسی نامعلوم شے کا بہترین اظہار ہونے کی بنا پر موضوع کی ماہیت پر اشارہ ہونے کے ساتھ ساتھ شعور و لاشعور کی سطحوں کے درمیان رابطے کا کام بھی کرتی ہے، بلکہ بہت حد تک یہ حرکیاتی

فکشن کی بھی مالک ہے لیکن بانو کے راجہ گدھ شعور و لاشعور کی حدوں پر خارجی اور داخلی سطحوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ وہ محبت اور جنس کے موضوع پر از خود بہت اُلجھی ہوئی ہیں مثلاً محبت کے بارے میں ایک جگہ مصنفہ نے لکھا ہے:

"معاشرے میں محبت کے خمیر کی وجہ سے کئی قسم کا ناگوار BACTERIA بیکٹریا پیدا ہوا ہے۔"

دوسری جگہ لکھا گیا ہے:

"محبت سنید لباس میں ملبوس عمر و عیار ہے۔ ہمیشہ دوراہے پر لا کر کھڑا کر دیتی ہے۔ اس کی راہ پر ہر جگہ راستہ دکھانے کو صلیب کا نشان گڑا ہوتا ہے۔ محبتی جھمیلوں میں کبھی فیصلہ کن سزا نہیں ہوتی، ہمیشہ عمر قید ہوتی ہے۔ جس معاشرے نے محبت کو علم بنا کر آگے قدم رکھا وہ اندر ہی اندر اس کے انتشار سے بُری طرح متاثر بھی ہوتا چلا گیا۔ جائز و ناجائز محبت کے کچھ ٹریفک رولز بنائے لیکن ہائی سپیڈ معاشرے میں ایسے سپیڈ بریکرز کسی کام کے نہیں ہوتے، کیونکہ محبت کا خمیر ہی ایسا ہے۔ زیادہ خمیر لگ جائے تو بھی سوسائٹی پھول جاتی ہے کم رہ جائے تو بھی پپڑی کی طرح تڑخ جاتی ہے۔" ص ۹۱

اس دانش مندی کے باوجود ناول کے کردار المحبت کا نعرہ لگاتے ہوئے اپنے آپ سے پوچھتے پھرتے ہیں:

"جب روح لاحاصل محبت کرتی ہے، یہ دیوانے پن سے ہمکنار کیوں ہوتی ہے؟"

"دیوانگی کی سب سے بڑی وجہ عشق لاحاصل، عشق لاحاصل، عشق لاحاصل۔"

یوں سمجھیے کہ محبت و عشق کے اس رد و قبول کے باوجود مصنفہ نے اپنے ناول کی بنیاد اسی عشق لاحاصل پر رکھی ہے۔ جنس کے موضوع پر اظہار کرتے ہوئے مصنفہ نے پرندہ جدت کہلوایا ہے۔

"انسان کی ساری قوت اُس کی جنسی طاقت میں پوشیدہ ہے۔ اس گھوڑے پر اس کے زانو سختی سے جمے ہوں تو وجدان تک پہنچتا ہے۔ ڈھیلا بیٹھا ہو تو دیوانہ وار گرتا ہے اور پاگل کہلاتا ہے۔ دنیا کا رُجحان ہو تو شاعری، مصوری، موسیقی، آرٹ جنم لیتا ہے۔ دنیادار کا رُخ ہو قوت تیز ہو تو رُجحان کی حدیں چھو لیتا ہے۔ اگر یہ قوت منقبض ہو جائے تو خودکشی کر لیتا ہے۔ عشق لاحاصل ہو جائے اور گھوڑا سوار کو گھسیٹے تو انسان پاگل ہو جاتا ہے۔"

ایک دوسرے مقام پر ناول میں درج ہے:

"سب سے بنی قابیل غالب آتے تھے، سیمی اور پاک محبت کی بارش کے لئے کوئی دعا نہیں مانگتا۔ سب ہی جنسی بھوک، قلبی تھکن اور روح کے خلاء کی وجہ سے دیوانے ہو رہے تھے۔ ہر وہ شخص جس کی روح میں حرام مال پہنچ رہا ہو، چہرے بشرے سے راجہ گدھ بن جاتا ہے۔ اس کی آنکھیں وحشی ہوئی، چہرہ سبزی مائل پیلا، بال بکھرے ہوئے اور ہڈیاں نمایاں ہوتی ہیں۔ روح کا حرام کھانے والا ہزاروں میں پہچانا

جاتا ہے۔"

مصنف بیک وقت محبت اور جنس کو اسفل ترین اور افضل ترین نعمت قرار دیتے ہوئے اپنے کرداروں کو کسی منطقی انجام سے ہمکنار نہیں کر سکیں اور راجہ گدھ کی علامت ہر طرح کی تفصیلات، گفتگو، مکالمہ آرائی، تقابل بلکہ جگہ جگہ گدھ جاتی کے اعادے کے باوجود کوئی ایک وحدت تاثر قائم کرتی دکھائی نہیں دیتی، البتہ جہاں کہیں علامت لفظی اور تاثراتی قوت کو منقلب کر کے پس منظر میں چلی گئی ہے بات زیادہ واضح ہو کر سامنے آئی ہے۔ اماں تو بہ توبہ، ماسی الفت، چاچا غلام اور عزیز کا نقش کے کردار گدھوں اور سیم و تھور کی سرزمین کے پس منظر میں بہتر تاثر دیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں جبکہ قیوم کے باپ کا بظاہر گدھ والا بہروپ کردار کو کچھ زیادہ متحرک نہیں کر سکا، اگرچہ قیوم نے اپنے آپ سے سوال کیا کہ کیا اس کا باپ عشق لاحاصل سے دیوانہ ہوا ہے یا اس نے چاچا غلام محمد کے ساتھ مل کر حرام کھایا ہے یا موت کے انتظار نے اُسے پاگل کر دیا ہے؟ سانڈل بار کے سانڈ اور گدھ کو گڈ مڈ کر دینے سے ایک STILL تصویر ابھری ہے جو تہا حضور ہے لیکن اثر انگیز نہیں، اگرچہ اس کے پس منظر میں ایک وسیع و عریض سنسان حویلی اور ماتمی فضا کا سرمئی اندھیرا بھی پھیلا ہوا ہے:

> "میں نے پلٹ کر ایک بار پھر حویلی کی طرف نظر کی، ابا او پر ممٹی پر کھڑا تھا، اس کے دونوں بازو آگے کو بڑھے ہوئے تھے۔ گدھ عمارت کی آخری اونچائی پر مالی خولیا کی لپیٹ میں کھڑا تھا۔"

یہیں مصنف نے حلال و حرام کے فلسفے کو بھی موضوع کے ساتھ ساتھ ہنکانے کی کوشش کی ہے۔ زیادہ مقامات پر یہ ایک طرح مذہبی پراپیگنڈہ بن کر رہ گیا ہے۔ سب اساطیر کی کہانیوں کی طرح یہ فلسفہ اس ناول کا ساتواں در ہے جس پر دستک دینا منع ہے۔ رزق حرام، جرائم، خودکشی، زناکاری، حیاتیاتی تبدیلیاں، تخلیقی جرثومے کی نفسیات، مشرق و مغرب کی بھیتی، پروفیسر سہیل، یوگا، السر، ہومیو پیتھی، معاشرتی پابندیاں اور ایسے ہی دوسرے بہت سے مباحث ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گفتگو کی مختلف شاہراہوں پر ٹہلتے پھرتے ہیں اور اس طرح محبت اور اسلامی محبت، جنس اور اسلامی جنس، رزق اور اسلامی رزق، تعلق اور اسلامی تعلق کا ایک ذاتی فلسفہ اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے (اس بات سے قطع نظر کہ اسلام میں روح کی تلاش اور عجمی تصوف کو کون سے گراف میں رکھا جا سکتا ہے)۔

بانو کا کہنا ہے "مذہب کے بہت سے احکامات ایسے ہیں جن کا ادراک محال ہے اسی لئے مذہب میں ماننے کا مقام ہے جاننے کا نہیں" چنانچہ اس حصے کو قارئین کے ذاتی ادراک کے حوالے کیا جا سکتا ہے، تاہم یہیں ناول کے کرداروں کے حوالے سے علامت کے مسئلے کو آگے بڑھایا جاتا ہے۔

کہانی کی اصل ہیروئن سیمی (حوا) ایک رزق حرام کھانے والے گھرانے کی پیداوار ہے۔ اپنے نیوکلس سے کٹی ہوئی آخر آخر درماندہ لیکن گدھ نہیں۔ قیوم کہانی کا اصل ہیرو ــــ بہت حد تک اینٹی ہیرو (آدم) مفعول و فاعل کا طیب و غریب ملغوبہ، ایک اُدھالی ہوئی پاکیزہ عورت کا بیٹا ہے لیکن گدھ ہے۔ آفتاب کے کردار پر محبت کے الزام کے علاوہ انگلی نہیں اٹھ سکتی۔ اس لئے کہا نہیں جا سکتا کہ وہ راجہ گدھ کے درجے کو پہنچتا ہے یا نہیں، تاہم کچھ الیاس ضرور ہے جس نے اُس کی اگلی نسل کو عام انسانی سطح سے علیحدہ کر دیا ہے۔ ایک بات مصنف سے پوچھنے کی ہے کہ اس کے اس آتشیں صفت باہ و جلال، معصومیت اور حسن سے مزین کردار نے محبت سے منحرف نہ ہونے کے باوجود قطع تعلقی کے راستے کو اپنایا، معاشرتی و مذہبی مقررہ حدود کے اندر زندہ رہا، وہ طیب راستے پر چلا، پھر بھی وہ کیوں ایک نارمل نسل کی تخلیق سے

محروم رہا؟

آفتاب کی بیوی ایک ناکام عاشق کی لاش کے ساتھ زندہ ہے اس لئے گدھ ہے۔ سہیل اور ماسٹر غلام رسول کو نظریات وعلم کی بدہضمی ہو گئی ہے اس لئے گدھ ہیں۔ عابدہ اور روشن کے کرداروں کے بارے میں مصنفہ کا رویہ کافی روادارانہ ہے۔ دونوں ذاتی حرام کاری کے باوجود قابلِ اعتناء نہیں، سوائے اس کے کہ راجہ گدھ کی صحبت انہیں آخرکار صحت یاب کر کے معاشرے کا کارآمد کل پرزہ بنا دیتی ہے۔ رہی امتل تو وہ ایک حرامی معاشرے کی پیداوار ہونے کے باوصف صرف جسمانی طور پر گدھ ثابت ہوتی ہے۔ علامتی گدھ نہیں بن سکتی۔

"کسی امتل العزیز طوائف کو اس کے بیٹے نے قتل کر دیا کل رات" (ص ۵۳)

راجہ گدھ کی مختلف محبتی یا جنسی تثلیثوں پر ایک نگاہ ڈالیئے:

قیوم، سیمی، آفتاب

سیمی، آفتاب، زیبا

آفتاب، سیمی، سہیل

سہیل، سیمی، قیوم

حیدر، سیمی، قیوم

عابدہ، سیمی، قیوم

قیوم، عابدہ، وحید

سیمی، قیوم، امتل

سیمی، قیوم، روشن

قیوم، روشن، افتخار

قیوم، سیمی، ابراہیم

جمع تفریق یا ضرب تقسیم کے مدارج سے گزر کر صرف دو کردار باقی بچتے ہیں، سیمی اور قیوم۔ اس بات سے قطع نظر کہ قیوم سیمی کا مطلوب نہیں، قیوم ہی وہ راجہ گدھ ہے جو کہانی کے پہلے صفحے سے آخری سرے تک اڈاریاں مارتا پھرتا ہے۔ قیوم کا رزق صرف عام میں مردار سے بندھا ہوا ہے۔ "کرگس جاتی کو یہی حکم ہے کہ وہ عشقِ لاحاصل کے تعفن کو عام نہ ہونے دے۔" یہ راجہ گدھ کہیں سیمی کا مردہ کھانے پر مامور ہے تو کہیں عابدہ کے وجود کی خالتو گندگی سے فیض یاب ہو رہا ہے۔ اس کے ارد گرد بدن کی ناآسودگی ہے۔ اپنے وجود کی حیرتوں کا انکشاف ہے۔ معاشرتی ناانصافیاں ہیں، سیم تھور کی سرزمین ہے، امتل کا سماج ہے، روشن کا جنم لینے والا بچہ ہے، باکرہ لڑکی کی تلاش کا خواب ہے، اور مرد و عورت کے ایسے بہت سارے رابطے جن کی انہیں سمجھ نہیں لیکن سارا زمانہ ان کی نوعیت سے آگاہ ہو چکا ہے۔

قیوم میں کہیں کوئی ارتقائی صورت پیدا نہیں ہو سکی۔ وہ شروع سے آخر تک ایک مجہول کردار ہے۔ اگرچہ بانو نے اُسے بدن اور روح کے درمیانی راستے پر کافی پریڈ کرائی ہے اور جوگیوں یوگیوں کے آسنوں سے بھی نوازا

ہے۔ لیکن وہ ایک کٹھ پتلی کردار ہی رہا ہے جسے مصنفہ نے جہاں جی چاہا ہے مردار کھانے کا حکم دے دیا ہے۔ بانو ایک طرف تو اس مردار کھانے والے کا بڑا درجہ متعین کرتی ہیں۔

"ہم جیسے آزاد لوگ جب محبت کے ہاتھوں مرتے ہیں تو معاشرے میں بند جکڑے ہوئے معاشرے میں تعفن پیدا ہوتا ہے۔ ہماری بیماری کے جراثیم بڑے مہلک ہوتے ہیں۔ اگر تم جیسے دھرماتما لوگ موجود نہ ہوں تو ہماری بیماری تو وبا کی شکل میں پھوٹ نکلے۔ بڑا درجہ ہے تمہارا قیوم۔"

دوسری جانب اسی کردار کو پاگل پن کی اسفل ترین سیڑھی پر کھڑا کر دیا ہے:

"افراہیم خوابوں کی آخری سیڑھی پر موجود تھا۔ میں پاگل پن کی پہلی اور اسفل ترین سیڑھی پر مجذوب کھڑا تھا۔ اور ہم دونوں کے درمیان انسان کا مسئلہ ارتقاء کھنچی کمان کی مانند تنا ہوا تھا۔ انسان کو ایب نارمل سے سُپر نارمل تک پہنچنے کے لئے جانے ابھی کس کس منزل سے گزرنا ہے۔"

کہانی کے آخری حصے میں کچھ مذہبی واہموں اور خوابوں کے طفیل آفتاب کے بیٹے افراہیم کو ولایت کے درجے کے قریب قریب پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے جبکہ ہمارا ہیرو ایک نفسیاتی کلینک سے برآمد ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی

مصنفہ کی انتہائی کوشش کے باوجود افراہیم ایک نیم مجہول اور نیم مجذوب کردار سے زیادہ کچھ نہیں اور روح کی رسائی تک کا وہ خواب، بھی مٹی میں مل چکا ہے جس تک قیوم قبرستان تک آ گیا تھا۔ دھنسی ہوئی قبر کے اوپر ایک گدھ کی اڑان کا پَر تو ہے اور بس، اس طرح راجہ گدھ کی علامت گدھ کی برتری اور بدتری کے بین بین پنکھ پسار کر بیٹھ گئی ہے کہ:

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

تاہم بانو نے اخلاقی اور معاشرتی صفائی کا جھاڑو اس خاکروب کے ہاتھ میں دے دیا ہے جسے عرفِ عام میں کہانی کا واحد متکلم، بیان باز، میجر کردار قیوم کہا گیا ہے۔ چہرے بشرے سے روح کا حرام کھانے والا، آنکھیں دھنسی ہوئی چہرہ سبزی مائل پیلا، بال بکھرے ہوئے، ہڈیاں نمایاں۔ جسمانی رفاقت کا بانجھ مسافر، احساسِ گناہ اور ہمہ شکستگی کے ملبے تلے دبا ہوا، اپنی دھرتی سے کٹا ہوا، جس کی زندگی بیرونی کوائف سے رشتہ توڑ چکی، کسی گرو کا متلاشی جو نسے کھینچ کر اپنے علم جتنا بڑا کر دے، بھُس میں سوئی تلاش کرنے والا، چاند راتوں میں گھر کی چھت پر کھڑا ہونے والا راجہ گدھ بانو کا پسندیدہ، بانو کا دھتکارا ہوا، زندگی کے لمس سے بے زار، تھوڑا تھوڑا خوش فہمیوں کا شکار، جس کے دل میں شک و شبے کے کیڑے پلتے رہتے ہیں اور اندرونی خود پسندی ٹیڑھی میڑھی ہو کر تن بدن میں زہر گھولتی رہتی ہے، یہاں تک کہ عمر کے ایک خاص حصے میں اس کا جگر اور معدہ خراب ہو جاتے ہیں۔ ایسے چاند راتوں کے پچھلے پہر VISIONS دکھائی دیتے ہیں۔ HALLUCINATIONS سے سرگوشتا ہے اور وہ آٹھوں پہر تلاوت الوجود میں مبتلا رہتا ہے۔

غور کیجئے کہیں اس بیمار اور کمزور کردار کے ذہن میں فرائڈ کے "پوشیدہ شہزادے" کا تصور ہی موجود نہ ہو۔ جو سماج کی توقعات پر پورا نہ اُترنے کے باعث صرف کوڑا کرکٹ پر ہی اکتفا میں عافیت سمجھنے لگے۔ فالتو بحثیں، بےجوڑ وارداتیں، لایعنی ذہنی جگالی، اپنے ہی اندر تقسیم ہو جانے والا شخص، اپنی ذات، اپنے سائے سے ہراساں۔ جب ہم اپنے سائے کو قبول نہیں کرتے تو یہ اضلالی صورت میں ہمارا پیچھا کرتا ہے۔ کابوس بن کر، شعور کی دیوار پر لرزیدہ بھوت کی صورت لیکن اگر ہم اسے اپنے وجود کا حصہ بنا لیں تو یہ ہماری ذہنی صحت کا ضامن بن سکتا ہے۔ اطمینان کا دروازہ بہت تنگ ہے اور کوئی بھی شخص اپنے حصّے کی روحانی اذیت سہے بغیر اس میں داخل نہیں ہو سکتا۔ قیوم اس دروازے سے باہر کھڑا ہے، ان دیکھی دنیا کے انکشاف کی خواہش کے ساتھ لیکن اُسے دروازہ پاٹنے کا حکم نہیں۔

قیوم کی رفاقت میں دوستوسکی کے پرنس میشکن سے ملاقات بھی خوب رہے گی۔ بے شک ہمارے صدیوں تک آتے آتے ہزار چہرہ آدمی کا تصور دھندلا گیا، ہیرو کی وہ طاقت گم ہو چکی جو روایتی اژدھے کو موت کے گھاٹ اتار کر تحفظ کا علم بلند کر سکتی تھی اور کنواریاں اس فتح مند شجاع کے خواب دیکھا کرتی تھیں۔ پھر بھی دوستوسکی کا یہ کافردی، احمق اور بے وقوف شہزادہ محبت کے مارے دلوں کی دُعا میں بندھ جانے کو کافی ہے۔

پرنس میشکن کے کوائف پر نگاہ ڈالئے۔ راج پوتی النسل قیوم کی طرح ایک خاندانی آدمی، چندرا کے دھتکارے ہوئے چوہدری کی طرح موروثی رئیس زادہ۔ ماں باپ کے سائے سے محروم، لڑکپن سے ذہنی بیماریوں میں مبتلا، کسی دوسرے جزیرے سے اپنی دھرتی کی جانب اس کی واپسی ہوتی ہے، ماضی کے ورد۔ مستقبل کے خوابوں اور انجانی دنیا کی تلاش کے نیک جذبات کے ساتھ، طبیعت میں بھلمنساہٹ کا عنصر نمایاں ہے۔ دشمنی کسی سے نہیں۔ حسد و رشک کے جذبات سے بے بہرہ ہے۔ سب رقیبوں سے خوش ہے۔ دکھی، آبرو باختہ اور مجرمانہ ذہنیت کے دھتکارے ہوئے لوگوں کی کافی و شافی پناہ گاہ ہے۔ امن اور سلامتی کا پرچم بلند کرنے والا یہ شخص کسی معاشرے کو درکار نہیں طبقوں فتنوں اور سازشوں میں کٹے پھٹے سماج کو اس کی ضرورت نہیں تو پھر ایک دن وہ اپنے مرگی کے دوروں، ہونٹوں کی نیلاہٹوں، طرح طرح کے واہموں اور ایک چھوٹی سی پوٹلی کے ساتھ سوسائٹی کے منظر نامے سے صورتِ سوال، خالی ہاتھ گم ہو جاتا ہے۔

اس ناول میں بھی محبت اور جنس کے نام پر کئی تثلیثیں اُجاگر ہوتی ہیں۔

پرنس میشکن ، نستاشیا فلی پوونا ، رگوژین
پرنس میشکن ، نستاشیا فلی پوونا ، گاوریلا اردالیونچ
اگلایا یپان چین ، پرنس میشکن ، گاوریلا اردالیونچ
پرنس میشکن ، اگلایا یپان چین ، ایپولیت
توتسکی ، نستاشیا فلی پوونا ، گاوریلا
اگلایا یپان چین ، پرنس میشکن ، نستاشیا فلی پوونا

محبتوں سے لبریز اس کہانی کا انجام حیران کن ہے۔ پرنس اُس کی مقتول معشوقہ اور اس کا صلیب بدل بھائی (قاتل)، ایک چھت تلے جمع ہیں۔ مکالمہ اُبھرتا ہے ــــ

"رات ہم دونوں یہاں گذاریں گے ایک ساتھ۔ بستر تو اس کے سوا اور کوئی ہے نہیں، میں جانوں ایسا کریں دونوں صوفوں سے تکیے اُتار لیں، یہاں پر اُدھر پردے کے پاس اسی والے پلنگ کی بغل میں ڈال دیں، تم بھی، میں بھی کہ ساتھ سو لیں گے، تو یہی اچھا کہ وہ یہیں پڑی رہو ے ابھی تو ہمارے بازو میں ۔ ۔ ۔ ۔ میرے تمہارے پہلو میں ـــ"

بہرحال جب گھنٹوں بعد دروازہ توڑا گیا، لوگ اندر آئے تو انہوں نے قاتل کو بے ہوش اور تیز بخار کی حالت میں پایا۔ پرنس اس کے پہلو میں برائے نام بستر پر چپ چاپ بیٹھا تھا (سمی کے رومال کے ہمراہ عابدہ کے جوتے رکھنے والے قیوم کی طرح) ہر بار جب بیمار کی چیخ بلند ہوتی وہ جلدی سے اپنا کانپتا لرزتا ہاتھ بڑھاتا اس کے بالوں اور گالوں پر یوں پھیرنے لگتا جیسے اُسے تھپک رہا ہے، سہلا رہا ہے۔ لیکن وہ اس حال کو پہنچ چکا ہے کہ نہ پوچھنے والوں کے سوال کچھ سمجھ آتے نہ اندر آنے اور گھیرنے والوں کو پہچان سکا۔ اگر خود ڈاکٹر شنیڈر بھی سوئٹزرلینڈ سے اپنے پرانے شاگرد اور مریض کو دیکھنے آتا اور اس حال میں دیکھتا تو اُسے تبھی کی حالت یاد آجاتی جب وہ سوئٹزرلینڈ میں اس کے پاس علاج کے پہلے سال میں تھا۔ ڈاکٹر یہ دیکھ کر مایوسی میں ہاتھ جھٹک دیتا اور اُس طرح اب بھی کہتا ـــ "ایڈیٹ کہیں کا۔"

قیوم کی مجہولیت، اعصاب زدگی، کائنات کے لاینحل مسئلوں میں الجھنا، پشیمانی، محبت کی اندر ہی اندر سلگتی چتائیں، غم خواریاں، پابندیٔ فعل کا بحران، سماجی عمل کی سیڑھیوں کو ناپنے کی خواہش، شناخت اور عدم شناخت کے المیئے اُسے بدقسمتی کے اُسی دائرے میں گھسیٹ لاتے ہیں جن سے پرنس میشکن کی قسمت بندھی ہے۔

مجھے کہنے دیجئے کہ قیوم کی نیک نیتی اور بے چارگی نے اُسے بڑا کردار بننے سے ہر جگہ روک کر اس کے ہاتھ میں احتیاج اور نامرادی کا کشکول پکڑا دیا ہے۔ پڑھنے والا اُسے پرنس کی طرح "احمق" نہیں تو "بے چارا" کہہ کر ضرور پکار سکتا ہے۔ کیا خبر یہ راجہ گدھ کی کامیابی ہے یا بے بسی۔

بانو نے خیال ظاہر کیا ہے کہ زندگی جیسی اور جہاں بھی بسر ہو جائے اس کی میزان ایک ہی رہتی ہے۔ محبت کی اس کہانی کی میزان کیا ہے، آپ کا ادراک یقیناً صحیح فیصلہ کر سکے گا، تاہم اسے بار بار پڑھا جا سکتا ہے اور اس کے لئے بانو مبارکباد کی مستحق ہیں۔

ناروے میں "لٹل پاکستان"

ڈاکٹر محمد اجمل نیازی

مشہور شعرا نوح ناروی اور زیبا ناروی کا نام ہم نے پہلی بار سنا تو بڑے خوش ہوئے کہ ناروے میں بھی اردو شاعری کا ڈنکا بجنے لگا ہے۔ اس کے بعد کچھ مایوسی ہوئی جب پتہ چلا کہ یہ دونوں بزرگ بھارت کے ایک شہر نارہ کے رہنے والے ہیں۔ جمشید مسرور پاکستان سے جا کر ناروے کی شہریت بھی لے چکا ہے مگر اپنے نام کے ساتھ ناروی نہیں لکھتا۔ لگتا ہے اسے شہرت حاصل کرنے کا شوق نہیں۔ پہلی بار زیبا ناروی کو دیکھ کر لوگوں کا وہی حال ہوا ہوگا جو روحی کنجاہی کو دیکھ کر میرا ہوا تھا۔ زیبا اور روحی نام کی کئی اداکارائیں ہمارے ہاں موجود ہیں۔ برادرم روحی کنجاہی کو شاعرہ سمجھ کر ایک مشاعرے میں لوگ اچھے خاصے بے قابو ہوئے جا رہے تھے۔ جب انہوں نے روحی کنجاہی کو دیکھ لیا تو آپے سے باہر ہوگئے۔ میرا مفت مشورہ جمشید کو یہ ہے کہ وہ فوراً "جمشید مسرور ناروی" بن جائے۔ اسے بڑا فائدہ ہوگا۔

جمشید ۷۷ء میں پاکستان سے ناروے گیا تھا۔ ویزا لگوا کر۔ اب ناروے سے پاکستان آیا ہے۔ ویزا لگوا کر۔ یہ ایک انوکھا تجربہ ہے جس نے اس کی ادبی شخصیت کو ایک انفرادیت عطا کر دی ہے۔ ناروے میں جمشید کے لئے تخلیقی تجربات کے بڑے مواقع ہیں۔ ناروے میں جو جو کام اسے کرنا پڑتے ہیں وہ نثری نظم لکھنے کے لئے بڑے موزوں ہیں۔ مگر اسے نظم اور غزل لکھنے کا بڑا شوق ہے جسے آپ ضد بھی کہہ سکتے ہیں۔ وہ آہیں بھرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ناروے میں شاعری کرتے رہنے کے لئے اسے کچھ مشکل راستوں سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ مثلاً وہ عشق پاکستانی عورتوں سے کرتا ہے اور تعلقات نارویجن عورتوں سے رکھتا ہے۔ عشق کرنے کے لئے کسی تعلق کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جب تعلق پوری طرح قائم ہو جائے تو عشق ہوا ہو جاتا ہے۔ شادی سے پہلے ہم جس لڑکی کو پورے وثوق سے باور کرا دیتے ہیں کہ اس کے بغیر زندگی گزارنا ناممکن ہے، شادی کے بعد اسی کے ساتھ زندگی گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ناروے کا شہری ہونے کے باوجود جمشید نے شادی ایک پاکستانی لڑکی کے ساتھ کی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ شاعری کے لئے بے حد سنجیدہ ہے۔ ہمارے ہاں ایک روایت یہ بھی ہے کہ میاں بیوی کے تعلقات اچھے نہ بھی ہوں اور نوبت جھگڑے فساد گالم گلوچ اور مار پیٹ تک پہنچ جائے مگر طلاق دینا یا طلاق لینا پسند نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح نباہ کرتے رہنے میں کرب اور قرب کے یکساں مواقع ملنے سے وہ شخصیت بنتی ہے جو شاعری کے لئے بڑی موزوں اور مددگار ہوتی ہے۔ مغرب میں تو لوگ شادی ہی اس لئے کرتے ہیں کہ اس کے بغیر طلاق دی نہیں جا سکتی۔ شاید اسی لئے وہاں غزل نہیں لکھی جا سکتی۔ ہمارے شاعر اپنی شاعری کو چار چاند لگانے کے لئے محبت کرتے ہیں۔ پھر ہمیشہ کی جدائی ڈالنے کے لئے اس کے ساتھ شادی کر لیتے ہیں۔ بلاشبہ یہ کیفیت بھی شاعری کے لئے بڑی اعلیٰ صورت حال مہیا کرتی ہے۔ جمشید اچھا شاعر ہے۔ سو اس نے یہ ساری شرائط پوری کرنے کا تہیہ کیا

ہوا ہے۔ جبکہ اس کی شاعری میں درد اور نشاط کی ہم آہنگی سے جو ترفع پیدا ہوا ہے اس کے لئے کسی شرط کی ضرورت نہیں۔

بتا کہ رات کے اصنام کب پگھلتے ہیں — ترے لبوں میں سویروں کے شہر پلتے ہیں
تمہاری یاد کے گلبن، تمہارے غم کے چمن — مرے مکان میں کتنے چراغ جلتے ہیں
بُلا رہے ہیں غمِ زندگی کے افسانے — تمہاری یاد سے فرصت ملے تو چلتے ہیں
اسے بھُلا کے بہت مطمئن نہ ہو جمشید — یہ راستے بھی کہیں دور جا نکلتے ہیں

اُتری ہو کرن جیسے کوئی چاند نگر سے — تو خود کو کبھی دیکھ ذرا میری نظر سے
کھوئے ہوئے لمحے کہیں آواز نہ دے دیں — گزرا ہوں بہت تیز تری راہ گزر سے
آکر کوئی دہلیز سے پھر لوٹ گیا ہے — خوشبو سی لپکتی ہے مرے سایۂ در سے
اک بار کوئی رات کی گلیوں میں ملا تھا — ہر روز مجھے خوف سا آتا ہے سحر سے

جمشید ناروے میں دو دو نوکریاں کرتا ہے۔ یہ تجربہ دو دو شادیوں سے اتنا مختلف نہیں۔ اُسے ہمارے ملک میں اُوور ٹائم کہتے ہیں۔ اُسے اوپر کی آمدنی بھی کہا جا سکتا ہے۔ ایسے میں عام طور پر دوسری شادی یا دوسری نوکری کی نوبت نہیں آتی۔ اس کے بغیر ہی کام چل جاتا ہے۔ جمشید ایک ریسرچ کونسل میں ملازمت کے ساتھ ساتھ پولیس ملازمین کے لئے معاون کا کام بھی کرتا ہے۔ اگر وہاں کوئی بھارتی یا پاکستانی جرم کر دے تو دورانِ تفتیش پولیس کو مفید مشوروں سے نوازتا ہے۔ عجب پولیس ہے جو ایک پڑھے لکھے آدمی کے مشوروں پر عمل کرتی ہے۔ ہمارے ہاں جب سی ایس پی افسران بھی محکمۂ پولیس میں جاتے ہیں تو اچھے خاصے اَن پڑھ بن جاتے ہیں۔ ناروے میں ایک المیہ یہ ہے جسے طرفہ تماشا بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہاں اور دوسرے یورپی ملکوں میں پاکستانی اور دوسرے مسلمان ایک جیسے کام یعنی جرم کرتے ہیں۔ جرم بھی ایسے جو ناروے میں نہیں ہوتے۔ ہم اپنی ان روایات کی پابندی میں بڑے استقامت کا مظاہرہ کرتے ہیں اپنے ملک کی دھاک اسی طرح بٹھائی جا سکتی ہے۔ جمشید بھی اپنی روایات سے بڑا پیار رکھتا ہے۔ چنانچہ نارویجن پولیس نے خاص طور پر اس کی خدمات حاصل کی ہیں۔ پاکستانی اپنا قومی تشخص برقرار رکھنے کے لئے وہ حرکتیں کرتے ہیں جو پاکستان میں کیا کرتے تھے۔ بالکل مشرقی سٹائل میں چوری چکاری اور بدکاری کرتے ہیں۔ پہلے جرم کا تعلق گھر سے ہے، دوسرے کا گھر والی سے ہے۔ ہم جسے بدکاری کہتے ہیں اُسے مغربی ممالک اور ناروے میں کوئی خاص برائی نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن مشرقی بالخصوص پاکستانی لوگ اس کام میں بھی کوئی نہ کوئی غلطی ضرور کر بیٹھتے ہیں۔ آخر حبُّ الوطنی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔

جمشید نے مجھے بتایا کہ ایک کیس میں یہ ہوا کہ ایک شوہر نامدار نے تین بچوں والی اپنی زوجۂ محترمہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جمشید کے مطابق اُس عورت کا قصور یہ تھا کہ وہ روپے پیسے، کار، کوٹھی کی فرمائش کرتی رہتی تھی، یعنی عورتوں نے بھی وہاں جا کر اپنی عادتیں نہیں بدلیں۔ شوہر غصے میں تو آتا رہتا تھا، تنگ بھی آ گیا۔ یہ بھی روٹین ہی تھی، کبھی کبھار وہ بجنگ آمد بھی ہو جاتا تھا۔ ایک دن نجانے کیا خاص بات ہوئی کہ شوہر صاحب نے اپنی بیوی کو تہ خانے میں بلایا۔ وہ چُپ چاپ بلکہ خوش باش چلی گئی کہ نجانے اتنی مدت بعد میاں صاحب کو میری کیا ضرورت پڑ گئی ہے۔ شوہر نے ضروری کام کی بجائے اُسے قتل کر دیا۔ جمشید نے اس کیس کے سلسلے میں پولیس کو یہ مشورہ دیا کہ ہمارے ہاں عورتوں

کو اس طرح کے دھوکے دینا مردوں کا پرانا شیوہ ہے۔ لہٰذا قتل سے پہلے دھوکہ دہی کا مقدمہ چلنا چاہیئے۔ جمشید ان نیم تھانیدارانہ کاموں میں شاعرانہ رویہ نہیں چھوڑتا۔ اس نے پورا ناروے دیکھ لیا ہے۔ ناروا کام بھی ہوتے دیکھ لئے ہیں جو ہم یہاں صرف انگریزی فلموں میں دیکھتے ہیں۔ جمشید نے اپنے ان مشاہدات کو بھی شعری تجربات میں بدلنے کی بہت اچھی کوششیں کی ہیں۔

وہ چلی
وہ چلی دیکھو لبھائے
اُس نگاہِ نازنین میں
سرخیٔ مے
اور ہونٹوں پر لیے
سب اہلِ محفل کے لبوں کی تشنگی
بوسے تیرے بوسے میرے
جن کا نشہ جاتا نہیں
شاید اُسے دل توڑنا آتا نہیں

جن کو دھوکے تھے محبت کے، انہوں نے آخر
سال ہا سال اُسے وصل کی عریانی دی
اور اک روز اُسے درد کی چادر دے کر
ایسی چادر جو اُسے اور برہنہ کر دے
شہر در شہر بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا

تم تھکن سے چُور ہو، اُس نے کہا
اس قدر ویران و تنہا، اس قدر بے جان و دل
اتنے بے پروا رہے تو ہو سکیں گے مندمل
زخمِ دل کیسے۔ چلو آتی ہوں مَیں
یہ کہا اور گیسوئے زرّیں بکھیرے
اور آہستہ سے کھولے دودھیا سینے کے بند
آنسوؤں کے درمیاں اُس نے جلائی جسم کی قندیلِ زرد
پھر مرے بستر میں رات بھر کے ساتھ کو
جیسے بچپن میں وہ جگنو آ گیا تھا رات کو

وہ اب سے دس بارہ برس پہلے "فنون" میں شائع ہوتا تھا۔ سو اب اُس کے کنفرم شاعر ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ جمشید نے ایم اے اُردو بھی کر رکھا ہے۔ ہمارے بیشتر لکھنے والے ایم اے اردو ہیں۔ اس لحاظ سے جمشید اپنا بھائی بنتا ہے۔ وہ ناروے میں اردو زبان و ادب کے فروغ کے لئے کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے۔ وہ ایسے علاقے میں رہتا ہے جہاں زیادہ تر پاکستانی رہتے ہیں۔ اس محلے کا نام انہوں نے لٹل پاکستان رکھا ہوا ہے۔ ہمارے کئی لیڈر اور دانشور پاکستان کو لٹل پاکستان بنانے کی بڑی کوششیں کرتے رہتے ہیں۔ ایک اجنبی ملک میں اپنا ملک قائم کرنا کمال کی بات ہے۔ یہ ایک منفرد سفارتی معرکہ ہے۔ وہاں جمشید کی شاعری بھی ایسا ہی کوئی کارنامہ ہے۔ یہ بھی کوئی معمولی تجربہ نہیں کہ جمشید کو ناروے میں نار وال یاد آتا رہتا ہے۔

سچے پاکستانی ناروے جا کر بھی اپنے جھگڑوں سے باز نہیں آتے۔ ناروے والوں نے فرزند اقبال ڈاکٹر جاوید اقبال اور صدر آزاد کشمیر سردار محمد عبدالقیوم خاں کے جھگڑے کا تماشا بھی دیکھا۔ جمشید یہ جھگڑالو تقریب اٹنڈ نہ کر سکا تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ جسٹس صاحب اور سردار صاحب دونوں کشمیری ہیں۔ بجائے پنجابیوں کو پنجابیوں سے اور کشمیریوں کو کشمیریوں سے لڑانا اتنا آسان کیوں ہے۔ جمشید ناروے میں پاکستانیوں کے جھگڑے ختم کرواتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اُس تقریب میں وہ موجود ہوتا تو یہ جھگڑا ہرگز نہ ہوتا۔

جمشید اب پکا پکا نارویجن ہے۔ اسے نارویجن زبان بھی آتی ہے مگر اس کے شعروں سے پاکستان کی خوشبو آتی ہے۔ ناروے میں وہ خوش ہے، خوشحال ہے اسے کوئی محرومی نہیں۔ ہر چیز آسانی سے مل جاتی ہے پھر بھی اس کی شاعری میں ایک تڑپ ہے ایک انوکھی جدائی کا نشہ ہے۔ کسی کے لئے تڑپنے کا شوق فراواں ہے۔ ناروے والا محبوب ہماری غزل کے محبوب کی طرح ظالم اور ہمارے علاقے کے محبوب کی طرح بزدل نہیں۔ اس کے باوجود ناکام تمناؤں کا ہجوم جمشید کے ارد گرد رہتا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ شعر کہتے ہوئے پاکستان میں ہوتا ہے۔ کوئی کمٹمنٹ اس کی اپنے دل کے ساتھ ہے اور وہ اپنے آپ کو مسترد نہیں کرنا چاہتا۔ اس نے اپنے شعری مجموعے کا نام "شاخِ منظر" رکھا ہے۔ ایسی ہی کوئی شاخ تھی جس کے بارے میں کہا گیا ہے۔

گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے
پھر اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے

جمشید کی شاعری میں منظروں کا یہی حال ہوا ہے۔ وہ بکھرتے ہوئے پھولوں کی پتیوں پر شعر لکھتا ہے۔ پھر اندر کی خوشبو ایک زیر لب گنگناہٹ کی طرح ایک تلاطم مچا دیتی ہے۔ وہ ناروے میں بھی اُسی موسم کا منتظر ہے جس کا پاکستان میں رہتا تھا۔ وہ بیک وقت دو ملکوں کا باشندہ ہے۔ اس کیفیت کو دو کشتیوں میں قدم والے محاورے سے مربوط نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک ایسی دوئی ہے جو جذبوں کی اکائی سے جنم لیتی ہے۔ انتظار اور اضطراب جمشید کی آنکھوں میں گھلا ملا نظر آتا ہے۔ یہ ملاپ اس کے شعروں میں بھی ہے۔ اہل مغرب بھی اب کسی اضطراب کا شکار ہو رہے ہیں۔ انہیں بھی جمشید کی شاعری سمجھ میں آنے لگی ہے۔ وہ وہاں مقبول ہوتا جا رہا ہے۔ پاکستانیوں اور بھارتیوں میں اس کی شاعری مذکور رہتی ہے۔ جب وہ اپنی شاعری کو نارویجن میں ڈھالتا ہے تو کئی خواتین و حضرات اصل شاعری کا مکمل مزا لینے کے لئے اردو سیکھنے کی ضد کرتے ہیں۔ کئی ایک یہ ضد پوری کر چکے ہیں۔

نارویجن لٹریچر کے حوالے سے السن کا نام ادب کے طالب علموں کے لئے بڑی دلچسپی کا حامل رہا ہے۔ کسی موازنے والی بات کے بغیر میں جمشید کی دوست شاعری کو السن کے دیس والوں کے لئے مشرق تحفہ کہتا ہوں۔ ہمارے لئے بھی یہ شاعری ایک تحفہ ہے۔ تحفہ دیسی ہے مگر آیا پردیس سے ہے۔ شاخ منظر پر کھلے ہوئے پھولوں کی رنگا رنگی میں سب کے لئے ایک اپنائیت ہے۔

غلط گمان نہ کر میری خشک آنکھوں پر
سمندروں میں جزیرے ضرور ملتے ہیں
سُلگ اٹھی ہے تری یاد میں فضائے خیال
کہ جیسے تیرگیٔ شب میں پھول کھلتے ہیں

چاند جب جھیل میں اُترا تو مناظر کی طرح
مجھ کو چھو کر ترے بازو ترے شانے گزرے

دن راستوں کے ساتھ بکھرنا لگی لگی
شب جاگ کر تری تصویر دیکھنا

اب تم کو دیکھ کر بھی دھڑکتا نہیں ہے دل
تم وہ نہیں رہے کہ مرے دُکھ بدل گئے

چاند کا زخم کھلا رات کی ویرانی میں
اجنبی ساحلوں پہ یادِ وطن کی صورت

تم سے وابستہ ہر اک چیز جلا دی میں نے
اب تو ہر سمت مرے گھر میں دُھواں پھیلا ہے

کہاں ہے حسن کی منزل، میں اتنا جانتا ہوں
یہ انتہا مرے دل سے کہیں گزرتی ہے
تمام رات کی بیداری کا ثمرہ ہے جمشید
ہوائے آخرِ شب بھی کلام کرتی ہے

اس مجموعے میں شامل نظموں اور غزلوں میں صاف محسوس ہونے والا فرق ہے۔ نظموں میں مغرب کی جھلک

دکھائی دیتی ہے۔ غزلوں میں مشرق کی کسک محسوس ہوتی ہے۔ یہ تجربہ ہمیں نظم اور غزل کے امتیاز کو سمجھنے میں بھی مدد دے سکتا ہے۔ نظم میں محتاط اور مہذب انداز سے بیان کیے گئے جنسی معاملات کی کشش، اور غزل میں بے ساختہ اور برجستہ اسلوب میں لکھے گئے رومانی جذبات کی کشمکش نظر آتی ہے۔ جمشید یہ نہیں بھولتا کہ وہ ناروے میں ہے اور پاکستان کی یاد اس کے اندر رہتی ہے۔ مراجعت کی خواہش اس کے دل میں تڑپتی ہے اور ابھی واپسی کے امکانات نہیں ہیں۔ وہ ابھی واپس آنا بھی نہیں چاہتا۔ مختلف کیفیتیں اس کے لہو میں جھگڑتی رہتی ہیں۔ آدمی اپنے اندر اس تصادم اور تلاطم میں مزا لینے لگتا ہے تو ایک تخلیقی توانائی اس کا حوصلہ بڑھاتی ہے۔ جمشید کی شخصیت اس کی شاعری میں آہستہ آہستہ منتقل ہونے لگتی ہے۔

لٹل پاکستان کے اس شاعر کو ہم آدھے ادھورے پاکستان میں حیرت سے دیکھ رہے ہیں۔ ہم دونوں اس حقیقت سے پوری سچائی کے ساتھ آگاہ ہیں کہ پاکستان جتنا بھی چھوٹا ہو جائے وہ رہے گا پاکستان ہی ——— تشکیل اور تکمیل کے ابھی کتنے ہی مرحلے باقی ہیں۔ اس موقعے پر میری ایک اور حیرت بھی میرے سامنے آکھڑی ہوتی ہے کہ پاکستان کہیں بھی قائم ہو سکتا ہے۔ ناروے کے ایک محلے میں بھی۔ ایک ہی نظریاتی کیفیت سے بھرے ہوئے دل میں۔ میں جب بھارت گیا تو وہاں جس جگہ میں کھڑا ہوتا تھا پاکستان قائم ہو جاتا تھا۔ ناروے میں لٹل پاکستان کے باشندے ایک خوبصورت شاعر جمشید مسرور نے نظریۂ پاکستان کی ایک انوکھی توجیح سے ہمیں آگاہ کیا ہے۔

درد دب سکتا ہے لیکن دل سے جا سکتا نہیں
لاکھ دریا خشک ہوں جولانگہ سیلاب ہے
اس چھت کے تلے دو دن بسر کر لیجیے
سر پیاسے ہیں بنیادِ مکاں سیراب ہے
تو لا سکتا کوئی اک شاخ منظر توڑ کر
اب بھی سنتے ہیں کہ تیرا رہ گزر شاداب ہے

تشخص کا طالب ــــ محمد اجمل نیازی

نجیبہ ظفر

ادب کے مندر میں محراب تعمیر کرنے والا اجمل نیازی شناخت کے سفر میں ایک منزل اور مار گیا۔ وہ ایک سچا مسافر ہے اور سچے مسافر ہمیشہ شجر سایہ دار کی طرح مسافر نواز بھی ہوتے ہیں۔ "تشخص" اس مسافرت اور مسافر نوازی دونوں کا منظر نامہ ہے۔ یہ نئی دنیاؤں کی دریافت اور نئی پرانی بہت سی دنیاؤں کے درمیان اپنی ایک الگ دنیا کی آبادکاری کی واردات ہے۔ "تشخص" کا ہر مضمون بظاہر اک جہانِ دیگر کا ساسماں رکھتا ہے مگر اس کثرت میں وحدت کا رنگ اتنا نمایاں ہے کہ اجمل نیازی کے لئے "منہ چھپانے" کا کوئی موقع نہیں۔ وہ ہر پردے میں عریاں اور ہر حجاب میں بے نقاب ہے۔ ایک مخصوص طرزِ تحریر کے آئینے میں، لفظ سے لفظ ملاتے، بات سے بات نکالتے اور ذات کی گھات سمجھاتے، اجمل نیازی ایک متحرک اور گویا سکوت کے ساتھ اِدھر سے اُدھر آتا جاتا نظر آتا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ کتاب دراصل اجمل نیازی کا اپنا خاکہ ہے تو بے جا نہ ہو گا۔ کیونکہ کتاب کے پڑھنے سے جو شخصیت سب سے زیادہ کھل کر، اپنے زشت و خوب، پسند ناپسند، اندھیرے اُجالے کے ساتھ ہمارے ادراک پر منکشف ہوتی ہے وہ اجمل نیازی کی اپنی شخصیت ہے۔ میرا خیال ہے خود اسے بھی اس خود نمائی کا احساس ہے۔ کتاب کا نام ہی اعترافِ جرم کی ایک مہذب صورت ہے۔

یوں تو کتاب میں بے شمار دریچے ہیں، ہر دریچہ ایک نئی سمت میں کھلتا ہے، ہر سمت سے مختلف قسم کی خوشبوئیں اور لُوئیں آتی ہیں، مختلف النوع مناظر دکھائی دیتے ہیں اور ہر دریچے کے اندرونی جانب اجمل نیازی آپ کے قریب کھڑا، کبھی انگلی کے اشارے سے کبھی ابرو کی حرکت، کبھی نگاہ کی خفیف سی لرزش سے نظارگی کے نئے نئے زاویے سجھاتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ دیکھنے والے خود دیکھنے کی چیزوں کو دیکھ لیں۔ اس لئے وہ سادہ لوح چھوٹے دکانداروں کی طرح نئے اور انوکھے مال کو ہاتھ میں پکڑ پکڑ کر گاہک کو نہیں دکھاتا بلکہ ماہر اور ہشیار سیلز مین کی طرح اوپر کی شیلف میں نمایاں مقام پر اچھے خوبصورت انداز میں سجا دیتا ہے کہ آنے والے کی پہلی اور بے اختیار نظر اس پر پڑے۔ پھر وہ اسے قریب سے دیکھنا چاہے، اس شوق میں آگے بڑھے، قریب جائے، مشاہدہ کرے اور اپنی اچھی یا بُری رائے خود قائم کرے۔

کتاب کے مضامین کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری کا ذہن بار بار رشید احمد صدیقی کی طرف پلٹتا ہے۔ رشید صدیقی نے بھی اپنے دوستوں اور ہم عصروں کے خاکے لکھے ہیں۔ وہ بھی اندر کے آدمی کو باہر کے آدمی پر ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے ہاں بھی وجود سے وراء اک جہانِ معنی کے اسرار کھلتے دکھائی دیتے ہیں۔ الفاظ کی سطوت و شوکت ان کے ہاں بھی نمایاں

نہ تشخص ـ مصنف محمد اجمل نیازی، ناشر پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، نو نہال - لاہور - قیمت ۶۰ روپے

ہے۔ اجمل نیازی بھی کھُلے آنگنوں اور وسیع دالانوں سے گزر کر اندر کی مقفل نیم تاریک کوٹھڑیوں پر متجسس پلکوں سے دستک دیتا ہے۔ اس کی نگاہ اندھیروں کو ٹٹولتی، غاروں کے منہ کھولتی، اندر ہی اندر گہری اترتی چلی جاتی ہے۔ جیسے روشنی کی ایک کرن گمشدہ خزینوں کی کھوج میں سمندروں کے سفر پہ نکلے۔

وہ یافت اور بازیافت دونوں پر قادر ہے۔ معمولی معمولی باتوں، چھوٹے چھوٹے واقعات کو ایک گہری معنویت عطا کر کے ان سے اپنی تصویر میں رنگ بھرتا ہے۔ لفظ اس کا ہتھیار ہیں، خیال ان کی دھار ہے۔ اس کا ہر لفظ ایک علامت ہے، ایک دروازہ ہے، ایک منتر ہے جو خیال کا باب کھولتا ہے۔ اس کے لفظ اور خیال میں سچی دوستی ہے۔ جہاں کہیں کوئی خیال پیدا ہوتا ہے۔ لفظ اس کی طرف دوڑے چلے آتے ہیں اور جہاں وہ کوئی لفظ لاتا ہے خیال اس میں سمائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے لفظوں میں خیال آفرینی کی بھرپور قوت اور خیالوں میں اظہار کی مکمل قدرت موجود ہے اور اس نے اس قوت اور قدرت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ جیسے کوئی شاطر سیاست دان اپنے معصوم حواریوں کی بے خبری سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

"خطۂ تدریس کی سلطنت" اور "ایک گھر کے دو راستے" اس کتاب کے بہترین مضامین ہیں۔ پہلا خاکہ ڈاکٹر نذیر کا ہے اور دوسرا اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کا۔ ڈاکٹر نذیر احمد کا خاکہ پڑھتے ہی ذہن میں "نذیر احمد کی کہانی" کچھ ان کی کچھ اپنی زبانی" کی بازگشت گونجنے لگتی ہے۔ وہی استاد اور شاگرد کا پیار اور محترم تعلق۔ مضمون کے پس منظر میں خوشبو سے بوجھل ہوا کی طرح دھیرے دھیرے چلتا رہتا ہے۔ بہار کی ہوا، جو اپنے پیچھے کئی طرح کے محبت بھرے تحفے چھوڑ جاتی ہے۔ یہ واحد خاکہ ہے جس کا ہر لفظ ایک پُرخلوص اور سچی انوالومنٹ میں ڈوبا ہوا ہے۔ ایک گہری وابستگی، محبت اور عقیدت کی ملی جلی جذباتی کیفیت اور ان تھک روانی ــــ ڈاکٹر نذیر کی یادیں، ان کی باتیں جیسے اجمل کے دل سے امڈی چلی آ رہی ہیں۔ ایک پہاڑی جھرنے کی طرح جھومتی، لہلہاتی، گنگناتی، وارفتگی سے جھاگ اڑاتی، ایک اندرونی لگن سے سرشار فضا ــــ جو گورنمنٹ کالج کی فضا ہے۔ اس مخصوص فضا اور مانوس ماحول کے پس منظر میں ایک محترم، ہردلعزیز اور پیاری ہستی کا چہرہ ابھرتا ہے۔ وہ چہرہ جو اس ساری فضا میں یہاں، وہاں، دمکتا ہے، مہکتا ہے، چہکتا ہے:۔

> "ڈاکٹر نذیر کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے گورنمنٹ کالج کے مغربی طرز تہذیب و تعلیم کی رنگ آرائیوں میں مشرقی انداز و اطوار کی سادگیوں کی خوشبو شامل کر دی۔ اس طرح ایک مربوط اور مضبوط تخلیقی، علمی ماحول وجود میں آ گیا۔ فضاؤں کو بیوروکریٹک رجحان کی بجائے ڈیموکریٹک مزاج نصیب ہوا اور جمہوری رنگ میں عوامی امنگ گھلتی چلی گئی۔ گورنمنٹ کالج کے انگریز یا انگریز نما پرنسپلوں کے برعکس ڈاکٹر نذیر شلوار قمیص میں ملبوس، پاؤں میں دیسی جوتی، لمبے بکھرے ہوئے بال، چہرے پر جیتی معصومیت، لگتا تھا کہ کوئی جیتی پرنسپل کے دفتر پر قابض ہو گیا ہے۔"

ساری کتاب میں سراپا نگاری کی یہ اکلوتی مثال ہے۔ ایسی تصویر کسی اور کی نہیں بن سکی۔ شاید اجمل نے کسی اور کا مطالعہ اتنی باریکی، اتنے تجسس، اتنے شوق سے کیا ہی نہیں کہ اس کی وضع قطع، چال ڈھال، چلت پھرت، بول چال،

اٹھک بیٹھک کو یوں آئینہ کر سکے۔ اس خاکے کا کمال یہ ہے کہ اس میں ایک زندہ، متحرک اور فعال شخصیت رواں دواں نظر آتی ہے۔ باقی تمام خاکوں میں اس نے ساکن تصویروں سے کام لیا ہے۔ ان تصویروں میں بہت سے پوز، بہت سے زاویے ہیں لیکن ایک ہزار ساکن تصویریں مل کر بھی ایک متحرک فلم کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ یہی ایک خصوصیت اس خاکے کو ممتاز اور جاندار بناتی ہے:

"وہ لڑکوں کے ساتھ مل کر جلوس نکالنے سے کبھی نہیں کتراتے تھے مگر یہ بھی ہوا کہ جلوس ریگل چوک پہنچ گیا اور ڈاکٹر صاحب کو ریڈیو سٹیشن پر اطلاع ملی کہ ہنگامہ ہو گیا ہے۔ وہ ریگل چوک پہنچے۔ ایک طرف صدر یونین، دوسری طرف پرنسپل صاحب۔ دونوں نے تقریریں کیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ڈاکٹر صاحب لڑکوں کو لے کر واپس کالج آ گئے۔ اب اکیلا طالبعلم اسمبلی ہال جا کر کیا کرتا۔ وہ بھی سر جھکاتے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ سچے استاد سے بڑا لیڈر کون ہو سکتا ہے۔"

یہ صحیح معنوں میں ایک مکمل خاکہ ہے۔ تحریر میں بے ساختگی ہے، شگفتگی ہے، روانی ہے، آمد ہی آمد ہے۔

"ایک گھر کے دو راستے" اس پہلے خاکے سے مختلف مگر پیاری تحریر ہے۔ ایسی تحریر جسے پڑھ کر بانو جی سے پیار ہو جائے اور اشفاق احمد پر رشک آئے۔ طرزِ بیان یہاں بھی باقی مضامین کا سا ہی ہے مگر اس طرزِ بیان کی پتلی شفاف جلد کے نیچے اور سا گلابی پن جھلک رہا ہے جو کہیں اور نہیں دکھتا۔ پتہ نہیں یہ گلابی پن اشفاق اور بانو کی ہم رنگی کا ہے یا اجمل نیازی کی نیرنگی کا۔ مگر یوں لگتا ہے اجمل کے پاس اس موضوع پر کہنے کو بہت کچھ ہے، اسے سوچنے اور انتظار کرنے کی مہلت نہیں ملتی، وہ مسلسل ایک کے بعد دوسری، دوسری کے بعد تیسری کھڑکی کھولے چلے جاتا ہے۔ اس کے فقرے روشنی کے گولے ہیں جنہیں وہ ہر سمت سے اشفاق اور بانو کے گھر پر پھینک رہا ہے۔ ہر فقرہ ایک نیا منظر روشن کر دیتا ہے، ہر لفظ نئی جہت آغاز کرتا ہے، ہر خیال ایک نیا راستہ دریافت کرتا ہے۔ اجمل ان دونوں سے متاثر بھی ہے اور مرعوب بھی۔

"وہ اپنی یگانگتوں کو ظاہر ہونے سے بچاتے رہتے ہیں۔ ان دونوں کو پانا مشکل ہے۔ وہ دونوں مِس انڈرسٹُڈ مخلوق ہیں۔ ان پر نگاہِ غلط انداز بھی ڈال کر دیکھ لیجئے سارے اندازے غلط ہو جائیں گے۔ ان سے بہتر اور کمتر آدمی ہوں گے مگر ان کے جیسا اور کوئی نہیں ـــ بانو پُر اسرار لگتی ہیں۔ اشفاق صاحب اسرار لگتے ہیں۔ دونوں صوفی ہیں، ملامتی صوفی۔ دونوں کا عمل اپنا اپنا ہے۔ ردِ عمل ایک سا۔"

ایک اور قابلِ ذکر خاکہ "آپ بیتی کا جہانِ دیگر" کے عنوان سے قدرت اللہ شہاب پر لکھا گیا ہے۔ شہاب صاحب کی شخصیت کے اسرار و رموز ایسے نہیں کہ انہیں کھول کر بیان کیا جا سکے۔ اس بات کا اجمل کو بھی بخوبی احساس ہے۔ اسی لئے وہ ان کی شخصیت پر روشنی نہیں ڈالتا بلکہ ان کے شفاف اندھیروں میں جھانکنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کوشش میں اسے کیا ملا۔ یہ بھی نہیں بتاتا۔ اس ضمن میں اجمل نیازی اور شہاب صاحب کے درمیان ایک ناقابلِ بیان سے رابطے کا سراغ ملتا ہے۔ یہ رابطہ کس سطح پر ہے یہ جاننا ہر سطح کے آدمی کے بس میں نہیں۔ اجمل نے بھی اس رابطے کو سطح پر لانے کی کوشش نہیں کی۔ اسے شہاب صاحب کی گہرائیوں اور پہنائیوں میں چھپائے رکھا۔ مضمون پڑھنے والا شہاب صاحب کو

سمجھ نہیں سکتا، جان نہیں سکتا۔ ایک انجان حیرت میں اُلجھ جاتا ہے اور اُسی کے بقول حیرت ایمان کی دہلیز ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ قاری کو ایمان کی دہلیز پر لا کھڑا کرتا ہے مگر دہلیز پار کرنے کی توفیق بھی تو ہر ایک کو نہیں ملتی۔ کیسں یہ مضمون ایک کشش انگیز دعوت نامہ ہے جو دہلیز پھلانگنے پر اُکساتا ہے۔ یہاں میدان سے باہر کھڑے ہو کر تماشا دیکھنے کی اجازت نہیں:

"کچھ لوگ پُراسرار ہوتے ہیں کچھ لوگ پُراسرار لگتے ہیں۔ شہاب صاحب میں یہ دونوں اوصاف تھے۔ اتنا بڑا افسر اور اتنا بڑا آدمی۔ اتنا سادہ آدمی اور اتنا گہرا آدمی۔ جاننے والا آدمی تھا، مگر ماننے والا تھا۔"

کالم نگاری کا نگار خانہ، دیکھ کبیرا ابسیتا اور انشائیے کا میٹھا کنواں، شگفتہ اور انبساط آمیز تحریریں ہیں جو اک خندۂ زیرِ لب پر مجبور کرتی ہیں۔ شاید اس پُر لطف اثر انگیزی میں کچھ کمال ان شخصیتوں کا بھی ہو۔" اور پھر بیاں اپنا....." سونے پر سہاگہ ہے:

"وہ ایک بکھرا ہوا آدمی ہے بلکہ بکھرتا ہوا آدمی ہے اور بکھرتا ہوا آدمی ہی نکھرتا ہوا آدمی ہوتا ہے۔ اس کی زندگی رونقوں سے بھرے کھلے میدان کی سی ہے جہاں سارے موسم، سارے وقت بڑے شوق۔ محبت اور بڑی سہولت کے ساتھ سما جاتے ہیں جہاں ہر طرح کے کھیل تماشے، میلے ٹھیلے، جلسے جلوس اور دوسرے اجتماعات ہو سکتے ہیں۔"

(کالم نگاری کا نگار خانہ)

"جلد سازی کے اس نازک اور خطرناک کام میں یونس کو ایک خفیہ دوست "ف" کی بھرپور مدد حاصل ہے۔ کئی مرتبین قسم کے محققین نے 'ف' سے شروع ہونے والے نام کے ادیبوں کی فہرست بنانا شروع کر دی ہے..... یہ جھگڑا ابھی مفید ہو رہا ہے کہ "یہ "ف" صاحب ہے یا صاحبہ۔ کچھ اسے صاحباں بنا رہے ہیں۔ صاحباں کوئی سیانی محبوبہ یعنی دوست نہ تھی۔ عورت کے بارے میں میرا خیال ہے کہ یہ بے وقوف ہے نہ عقلمند ہے اگر کبھی سلیقے سے بات کہہ دے تو بڑی بات نہ ہو پیاری بات ضرور ہو جاتی ہے۔"

(انشائیے کا میٹھا کنواں)

"کبیر خان اور عطاالحق قاسمی کے کچھ ملکی لوگوں کے بارے میں اور کچھ غیر ملکی نازنینوں کے بارے میں خیالات ملتے جلتے ہیں۔ جذبات ذرا ذرا مختلف ہیں۔ ارادے تو بالکل ہی مختلف ہیں۔ کبیر خاں گناہِ کبیرہ کے قریب نہیں پھٹکتا اور عطاالحق قاسمی گناہِ صغیرہ کے قریب نہیں پھٹکتا۔"

(دیکھ کبیرا ابسیتا)

"عورت اور زندگی میں بہت کچھ مشترک ہے کہ آدمی نہ مرنا چاہتا ہے نہ کنوارہ رہنا چاہتا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے کہ آدمی (عورت اور مرد) جیسی زندگی چاہتے ہیں جو انہیں نہیں ملتی۔ ہماری زندگی کوئی اور بسر کر رہا ہے اور ہم نجانے کس الّو کے پٹھے

کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔"

(پنجابی کہانی کی ایک ماں)

کتاب ختم کرنے کے بعد خیال آتا ہے کہ یہ صرف خاکوں کی کتاب نہیں۔ اجمل نیازی نے محض شخصیت نگاری نہیں کی جیسا کہ کتاب کے آغاز میں "ہم عصروں کے لئے کلمۂ حق" کہتے ہوئے اس نے اقرار بھی کیا ہے کہ "میں نے اپنے مضامین کا منظر تخلیقی رکھا ہے اور پس منظر تنقیدی۔"

کچھ مضامین ایسے بھی ہیں جہاں منظر، پس منظر اور پس منظر پیش منظر ہو گیا ہے۔ یہ شاید وہ لوگ ہیں جن کے ساتھ اجمل کی ذاتی، قلبی اور جذباتی وابستگی اتنی گہری نہیں اس لئے لفظوں میں خلوص و محبت کی چاشنی کا وہ شہد آگیں ذائقہ نہیں۔ صرف نقطۂ نظر کی گلرنگی ہے جو تسکینِ نظر کا سامان تو بہر حال کرتی ہے۔ مگر کہیں کوئی بے نام سی تشنگی بھی چھوڑ جاتی ہے۔ جو چپکے چپکے "یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید" کا ورد کرتی رہتی ہے مگر ان مضامین میں ہمیں اجمل کے قلم کا تخلیقی و تنقیدی اسلوب نظر آتا ہے جو تفہیم ادب اور معیارِ فن کے تعین میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

حق تو یہ ہے کہ اجمل کی یہ کتاب اس کے ہم عصروں کے لئے کلمۂ حق ہی نہیں ان کے حق میں کلمۂ خیر بھی ہے۔ اس کے ہم عصروں پر لازم ہے کہ وہ اس کے لئے جزائے خیر کی دعا کریں۔

قتیل شفائی



اسے منا کر غرور اُس کا بڑھا نہ دینا
وہ سامنے آئے بھی تو اُس کو صدا نہ دینا

خلوص کو جو خوشامدوں میں شمار کر لیں
تم ایسے لوگوں کو تحفتاً بھی وفا نہ دینا

وہ جس کی ٹھوکر میں ہو سنبھلنے کا درس شامل
تم ایسے پتھر کو راستے سے ہٹا نہ دینا

سزا گناہوں کی دینا اُس کو ضرور لیکن
وہ آدمی ہے، تم اُس کی عظمت گھٹا نہ دینا

جہاں رفاقت ہو فتنہ پرواز مولوی کی
بہشت ایسی کسی کو، میرے خدا! نہ دینا

قتیلؔ مجھ کو یہی سکھایا مرے نبیؐ نے
کہ فتح پا کر بھی دشمنوں کو سزا نہ دینا



یہ مرا بجھتا سلگتا بن، یہ میرے رات دن
کس طرح کٹتے بھلا تجھ بن، یہ میرے رات دن

بیتے ساون کہہ رہے ہیں، یہ چھما چھم تھے کبھی
اب تو ہیں گویا فقط کن من، یہ میرے رات دن

مَیں نے ارمانوں کا پہلا رقص دیکھا تھا جہاں
کاش ہو جاتے وہیں ساکن، یہ میرے رات دن

ڈھونڈ لاتے ہیں ہمیشہ میرے جُرموں کا جواز
یہ مرے سب سے بڑے محسن، یہ میرے رات دن

تُو سمجھتا ہے جُدا خود کو اگر مجھ سے تو پھر
سینکڑوں سے ضرب دے کر گن، یہ میرے رات دن

ڈر رہا ہوں عمر کی ناپائیداری سے قتیلؔ
وقت کے ہاتھوں نہ جائیں چھن، یہ میرے رات دن

محب عارفی



خیالِ ذہن شکن سے زبان بجھ جائے
یہ ہو تو ہاتھ مرے کوئی شعرِ تر آ جائے

میں اپنے آپ سے محروم ہو کے رہ جاؤں
جو زندہ رہنے کا مجھ کو یہاں ہنر آ جائے

ہمارے مٹنے سے دُنیا ہوئی ہے ایسی نہاں
کہ جیسے بیج سے باہر کوئی شجر آ جائے

بنائی میں نے جو بے صورتی کے پتھر سے
میں کیا کروں اُسی مورت پہ دل اگر آ جائے

چمن تمام تو آہٹ پہ اُس کی جھوم اُٹھا
یہاں یہ خبط، وہ سیلِ ہوا نظر آ جائے

بھنور مُصر ہے کہ آغوشِ تنگ میں دریا
تمام وسعتِ نخوت سمیٹ کر آ جائے

کشش بھی اس کی غضب، رعبِ حسن بھی ایسا
کہ سامنا ہی نہ کر پاؤں، وہ اگر آ جائے

اَب آرزو ہے کہ ہر آرزو سے باز آ جاؤں
یہ آرزو بھی تو ایسی نہیں کہ بر آ جائے

رہو گے پھر بھی محبؔ سطحِ بحر ہی سے دوچار
اگر تمھارے لئے تہہ بھی سطح پر آ جائے

حنیف فوق

○

تپتے ہوئے صحرا پہ ترس کھائے تو اچھا
یہ ابر ذرا کھل کے برس جائے تو اچھا

کب سے ہے فضاؤں میں رچی گردِ کدورت
کچھ چشمِ فلک اشک ہی برسائے تو اچھا

موسم تو بدلتے ہی رہے ہیں مگر اب آنکھ
منظر کے بدلنے کی خبر لائے تو اچھا

کھلتی ہوئی کلیوں کی دمِ صبح بشارت
شبنم سی خنک دم کو بھی گرمائے تو اچھا

مالی بھی گلِ تازہ کے مانند ہو خرم
مٹی سے شگوفوں کی مہک آئے تو اچھا

آزاد ہوں افکار بھی خوشبو کا سفر بھی
دیوار جہاں بھی ہو، ہوا ڈھائے تو اچھا

اک نعرۂ مستی ہو بنامِ رخِ گیتی
ہر جام سے ہر جام جو ٹکرائے تو اچھا

لمحات کی زنجیر تو پگھلے گی بہر طور
صدیوں کی طلب روح کو تڑپائے تو اچھا

آباد ہوں شہروں میں کہ ویرانوں میں بھٹکیں
اک بوئے نفس خواب جو مہکائے تو اچھا

خاروں کی زباں سے جو سنا آبلہ پا نے
ہر بستۂ لب زخم وہ کھلوائے تو اچھا

انساں کے قدموں سے جو ہے دشت پہ تحریر
ہر ذرۂ موجود کو لرزائے تو اچھا

آندھی وہ چلے نیچے مکاں جس سے ہوں محفوظ
ہاں قصرِ فلک بوس جو اوندھائے تو اچھا

اک بار قریب آکے ذرا دل کی صدا سن
آوازۂ اسرار تجھے بھائے تو اچھا

ہے قریۂ مہتاب کی رونق تو اسی سے
یہ چہرۂ ارضی ہے، نہ گہنائے تو اچھا

سو رنگِ حقیقت تو لپیٹے ہے یہ تصویر
اک رنگِ تصور بھی جو پھیلائے تو اچھا

بیزار ہوں ہم خود سے، زمیں سے کہ فلک سے
جی حرفِ محبت سے نہ اکتائے تو اچھا

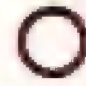
خورشید نشاں آج بھی ہو تابشِ جمہور
محنت کا ثمر شاخ پہ رسیائے تو اچھا

آنچل کبھی پرچم ہو تو پرچم کبھی آنچل
اک رنگ سرِ کشورِ جاں چھائے تو اچھا

ہوں فیض و نظیری کہ ندیم ان کا سخن اب
بجلی سی رگِ عصر میں دوڑائے تو اچھا

محفل میں لئے دامنِ جاں میں ہے شرر فوق
خود سلگے تو بہتر ہے، جو سلگائے تو اچھا

محشر بدایونی



انسان پہ کیا گزر رہی ہے
انسانیت آہیں بھر رہی ہے
اب کیا ہے دفاعِ ظُلم کے پاس
تاریخ سوال کر رہی ہے
دیواریں تو ساری ہیں اِدھر کی
اور چھاؤں اُدھر اُتر رہی ہے
ہم اب بھی زبان سے رہیں کیا
تہذیبِ سلف بکھر رہی ہے
گُم اپنی ہوا میں ہیں بگُولے
مَوج اپنی جگہ بپھر رہی ہے
باہر سے ہو کچھ بھی اُٹھنے والا
اندر سے اُٹھان اُتر رہی ہے
آسودۂ غم ہے، کوئی رُت ہو
وہ شاخ جو بے ثمر رہی ہے
اپنی ہی خبر رہی ہے اُن کو
اور اپنی بھی کیا خبر رہی ہے
خود کوزے بناتے خود بکھر جاتے
یہ قسمتِ کوزہ گر رہی ہے



وقتی یہ حسابِ ظُلم کب ہے
تاریخ کے حافظے میں سب ہے
ہم پہلے بھی کم دُکھی نہیں تھے
یہ حال کبھی نہ تھا جو اب ہے
جانوں کو لگا شدید آزار
سنگین ہی اِس کا کچھ سبب ہے
وہ رُت ہے نہ اب وہ ہمنوا ہیں
اب نوحہ گری ہی کارِ لب ہے
احساس کے بند ٹوٹتے ہیں
لیکن یہ شکستگی عجب ہے
دل جلتا ہے، کچھ کھُلے بھی آخر
کب تک یہ تمازتِ غضب ہے
دستار کی دھجیاں نہیں ہیں
لوگو، یہ ہلاکتِ نسب ہے
کیا موت ہی اب ہے چارۂ جاں
ہر لمحۂ عُمر خوں طلب ہے

احمد ظفر

(نذرِ غالب)



آرزو نے کیا کھویا، جستجو نے کیا پایا
تجھ سے ہم کلامی میں موت کا مزا پایا

ناگ کی طرح سرکا کیوں سحر کا سناٹا
شہر سا گھنا جنگل شب کو بے صدا پایا

اتصال روحوں کا جسم جسم کب ہوگا
دوست جس کو سمجھے ہم دشمنِ وفا پایا

چاہتوں کی منزل بھی جانے کیسی منزل ہے
دل نے ہر مروت کو وجہِ صد ریا پایا

آئینے کو پتھر پر کیوں گرا رہا ہوں میں
کس نے اس زمانے میں پیار کا صلہ پایا

نام ہے ظفرؔ میرا، غم ملا تو غم کیسا
ہر شکست پر خود کو جرأت آزما پایا

(نذرِ غالب)



دھوپ کی شدت میں ہر نخلِ تمنا جل گیا
شہر صحرا بن گیا، صحرا میں صحرا جل گیا

موت مجھ کو جشن کی صورت میں آئی کس طرح
میں چراغِ رہگزر تنہا تھا، تنہا جل گیا

پھول جس کے جنبشِ لب سے کھلے ہیں بارہا
گرمیِ افکار سے اس کا سراپا جل گیا

بارہا چشمِ تماشا میں جو روشن ہو گئی
دیکھنا، اس آگ میں کیا کچھ رہا، کیا جل گیا

زندگی، میرے لیے احمد ظفرؔ الزام ہے
دامنِ دل کیا جلا، دامانِ دنیا جل گیا

احمد ظفر

(نذرِ غالب)



اشک شبنم نہ ہوا ۔ دیدۂ معنی نہ ہوا
میں ترے در پہ رہا، پھر بھی تجلی نہ ہوا

زندگی آبِ جواہر سے لرزتی دیکھی
کوئی پتھر مری تقدیر کا ثانی نہ ہوا

راستے میرے لیے پاؤں کی زنجیر ہوئے
اپنے احساس کا ہر چند میں قیدی نہ ہوا

خون پک جائے جہاں نانِ جویں کی خاطر
کوئی بھی حرف وہاں حرفِ تسلی نہ ہوا

میں کہ ہر دور کی تصویر لیے پھرتا ہوں
مجھ سے بڑھ کر کوئی مجموعۂ شعری نہ ہوا

یہ تساہل ہی مری مرگِ مسلسل ہے ظفر
میں طلب کے کس رستے کا جو راہی نہ ہوا

(نذرِ غالب)



ہماری ابتدا کیا انتہا کیا
ہمارے بعد دنیا میں رہا کیا

وہ جس پر جان دیتا ہے زمانہ
ہم اس سے ورغلائیں گے بھلا کیا

ہم اپنے آپ میں کھوئے رہے ہیں
کس بت سے تقاضائے وفا کیا

لیے پھرتی ہے منتِ خاک کس کی
مرے کوچے سے آئی ہے صبا کیا

جسے تحریر نے زندہ کیا ہے
کرے گا پی کے وہ آبِ شفا کیا

روایت یہ کسی منصور کی ہے
ہماری بات ہوتی برملا کیا

سمندر کی طرح خاموش تھے ہم
ملی ہم بے نواؤں کو نوا کیا

حسین احمد ظفر سے پوچھتے ہیں
کبھی دیکھا ہے تم نے آئینہ کیا

سید ضمیر جعفری

○

خلاصہ یہ مرے حالات کا ہے
کہ اپنا سب سفر ہی رات کا ہے

اب اک رومال میرے ساتھ کا ہے
جو میری والدہ کے ہاتھ کا ہے

انا کیا —— عجز کو گرداب سمجھو!
بڑا گہرا سمندر ذات کا ہے

خدا اشعارِ رسمی سے بچائے
یہ قتلِ عام سچی بات کا ہے

تپش کتنی ہے ماں کے آنسوؤں میں
یہ پانی کون سی برسات کا ہے

مجھے بہتر ہے کچی قبر اپنی
کسی گنبد سے اجو خیرات کا ہے

خورشید رضوی

○

یہ سوچتا ہوں، مرے ماہ و سال کا کیا ہو
ہجومِ نقص میں خوئے کمال کا کیا ہو

ہر ایک صبح اُداس اور ہر ایک شام اداس
یہ جس کا حال ہو، اس خستہ حال کا کیا ہو

حقیقتوں کو تو ہموار کر لیا مَیں نے
خیال دشمنِ جاں ہے، خیال کا کیا ہو

کھلا نہ کچھ نفسِ واپسیں کی حیرت میں
شکست و فتح و عروج و زوال کا کیا ہو

مناسبت ہی مرے دل کو زخم سے ٹھہری
مگر عبث، ہوسِ اندمال کا کیا ہو

جہاں جواب نہیں، صرف بازگشت آئے
وہاں جنونِ صدا و سوال کا کیا ہو

لکھوں میں خود کو سراپا فسردگی خورشید
مگر شگفتگیٔ خال خال کا کیا ہو

جلیل حشمی



مَیں نے کہاں دستک دی ہے — دیر ہوئی خاموشی ہے
آج بھی رزق نہیں اترا — آج کی رات بھی کل سی ہے
دل میں کوئی تو ہوگا — اک آواز سی آتی ہے
اپنا اپنا حصّہ ہے — اپنی اپنی جھولی ہے
دیا جلایا تھا مَیں نے — روشنی تم نے لے لی ہے
گھروں میں دن داخل ہوگا — رات گلی سے نکلی ہے
پانی لے گیا لوگوں کو — کشتی تو نہیں ڈوبی ہے
پھول ضرور کھلا ہوگا — مَیں نے تتلی دیکھی ہے
اس میں لگام ہے دوراں کی — یہ جو فقیر کی مٹھی ہے
کم کم ملنا لوگوں سے — یہ عادت بھی اچھی ہے
سائیں! حال سنو گے کیا — اب تو ایک کہانی ہے
پاس تھی جو خاکسترِ دل — وہ بھی ہَوا کو دے دی ہے
پُورا کون ہے میری جاں — دُنیا سدا ادھوری ہے
تجھ کو دیکھ کے سوچتا ہُوں — کُھل کر برکھا برسی ہے
تیرا نام جو لکھتا ہُوں — انگلی جگمگ کرتی ہے

ایک ہی داؤ میں سب ہارا
حشمی بڑا جواری ہے

تیرے ہاتھ میں آئینہ ہے — بستی ساری بے چہرہ ہے
کون سی بستی سے گزرا ہے — دریا کا پانی میلا ہے
ناؤ ریت پہ پڑی ہوئی ہے — ڈوبنے والا ڈوب چکا ہے
دستاویزِ چمن ہے پُوری — یہ جو اک پیلا پتا ہے
باہر کیا تم دیکھ رہے ہو — اندر بھی کچھ ٹوٹ رہا ہے
آگ لگی تھی کہاں نہ جانے — میرے گھر میں دھواں بھرا ہے
تجھ سے گزر کر کیسے جاؤں — تجھ سے آگے تو پردہ ہے
حیرت نہیں ترے آنے پر — کیا تو رستہ بھُول گیا ہے
آنکھ میں جھل جھل ہیروں کی ہے — پیکر خاک کا بنا ہُوا ہے
سنتا ہوں ہر سانس میں نوحہ — نغمہ گری کی یہی سزا ہے
لہر کو آتے دیکھ رہا ہُوں — ریت پہ میرا نام لکھا ہے

اہلِ کرم پچھتائے حشمی
مجھ پر کیوں احسان کیا ہے

گوہر ہوشیارپوری



یہاں کون اُس کے سوا رہ گیا
زمانہ گیا، آئینہ رہ گیا

وہ حُسنِ سراپا نہ حُسن آفریں
مگر ہر کوئی دیکھتا رہ گیا

چلو کیا ہُوا، روشنی ہی تو تھی
یہاں دیکھنے کو بھی کیا رہ گیا!

ہماری کچھ اپنی روایت بھی تھی
کتابوں میں لکھا ہُوا رہ گیا

خدائی کو بھی ہم نہ خوش رکھ سکے
خدا بھی خفا کا خفا رہ گیا

مقدر کہیں کجکلاہی کرے
کوئی گھر میں محوِ دعا رہ گیا

کہیں ایک چُپ بھی رسا ہو گئی
کوئی بولتا بولتا رہ گیا



دیکھنے میں ایک شخص اچھا بہت
بات کی، تو بات کا تیکھا بہت

درد کے اُٹھنے کا منظر یاد ہے
چاند اُس شب صبح تک چمکا بہت

ربط کچھ تو سرسری سا چھوڑ دو
اِک اشارہ ہی سہی، تھوڑا بہت

اُس کے آگے نطق و لب پتھرا گئے
گنگ ٹھہرا بولنے والا بہت

سنگ زن کا دستِ شفقت چاہیے
غمگساری کو بھری دُنیا بہت

تم نے پہلی موج تو دیکھی نہیں
اب تو پھر دریا نہ تھا اِتنا بہت!

ان زمینوں، ان زمیں زادوں کی خیر!
آنے والی کل ہے تابندہ بہت

گوہر ہوشیارپوری

○

جاتی رُت سے پیار کرو گے
کر لو بات، اُدھار کرو گے!

کتنی قسمیں، خالی قسمیں
کتنے قول قرار کرو گے

تب مِل کر احسان کیا تھا
اب مِل کر ایثار کرو گے

جتنے خواب، اتنی تعبیریں
کتنے داغ شمار کرو گے

اے انکار کے خوگر لوگو
اور بھی کوئی وار کرو گے

درد کے دلکش پھول کھلا کر
روحوں کو گلزار کرو گے

اُس کے نام کو ناد بنا کر
پیاسوں کو سرشار کرو گے

فرض کرو ہم مر نہ سکے، تو
جینے سے انکار کرو گے

فرض کرو ہم ہار گئے، تو
قبر کہاں تیار کرو گے!

○

سر پہ کوئی آسمان رکھ دے
اک منہ میں مگر زبان رکھ دے

آ، صلح نہیں، سلام تو لے
یہ تیر چڑھی کمان رکھ دے

اتنا بھی نہ بے لحاظ ہو جا
تھوڑا سا تو خوش گمان رکھ دے

تجھ کو تری حکمتیں مبارک
اِک ہاتھ پہ اِک جہان رکھ دے

پھر ہم کو گدائے رہ بنا کر
رہ میں پئے امتحان دے کر

تفصیل کہیں گراں نہ پڑ جائے
اک حرف میں داستان رکھ دے

اب دھیان کی بات چھڑ گئی تو
کچھ اس سے الگ بھی دھیان رکھ دے

محسن احسان

○

مسموم شہر کی ہے فضا، کچھ نہ کچھ تو ہے
اے دل جوازِ آہ و بکا کچھ نہ کچھ تو ہے

شاید نہ پڑھ سکیں اسے کچھ کج قیاس لوگ
دیوارِ برہمی پہ لکھا کچھ نہ کچھ تو ہے

کردار کھیل میں جو زلیخا کا ہے، سو ہے
یوسف بھی مبتلائے خطا کچھ نہ کچھ تو ہے

اک مشتعل چراغ کی لو بجھ گئی تو کیا
تاریک بامِ قصر ہوا کچھ نہ کچھ تو ہے

اک راکھ کا ہے ڈھیر نگاہوں کے سامنے
جلنے کے بعد گھر میں بچا کچھ نہ کچھ تو ہے

تشکیک کی ہوا ہی کچھ ایسی چلی کہ اب
ہر دل میں اشتباہِ خدا کچھ نہ کچھ تو ہے

اک اشکِ انفعال ہے، معراجِ انفعال
صد شکر فکرِ روزِ جزا کچھ نہ کچھ تو ہے

نرمی ہے گفتگو میں، مگر اس کے باوجود
محسن تمہارے سر میں ہوا کچھ نہ کچھ تو ہے

○

تیرگی ہے صحن میں تابندگی دیوار پر
آئینے جڑتی رہی ہے زندگی دیوار پر

سب جلالِ منصبی سیلِ فنا لے جائے گا
لاکھ ہم لکھتے رہیں پائندگی دیوار پر

ظلمتیں اتریں کچھ ایسے، کھا گئیں حرفوں کا نور
خونِ دل سے کی تھی کچھ رخشندگی دیوار پر

بام و در کو دیکھتی رہتی ہیں میری حسرتیں
کون چسپاں کر گیا شرمندگی دیوار پر

دو گھڑی سائے میں وہ ٹھہرا تھا لیکن آج تک
ہے عجب اک عالمِ رقصندگی دیوار پر

عمر بھر ہم نے کیے ہیں جمع مردہ تجربے
اور سمجھتے ہیں کہ لکھ دی زندگی دیوار پر

حزیں لدھیانوی



قلب کو برف آشنا نہ کرو
گل کسی طور پہ دیا نہ کرو
زندگی بھی ہے ایک مرگِ دوام
تم جو جینے کا حق ادا نہ کرو
جس میں پھولوں پہ پاؤں دھرنا پڑے
اختیار ایسا راستہ نہ کرو
زہر پی جاؤ بانکپن کے ساتھ
زہر چکھنے کا تجربہ نہ کرو
گر سکھاتے جو جنگ بازی کے
ایسی دانش کو رہنما نہ کرو
ظلم تو ظالموں کا شیوہ ہے
قہر ہے، تم جو تجزیہ نہ کرو
سب خزاں زادے کہہ رہے ہیں حزیں
یاں پہ ذکرِ گل و صبا نہ کرو



مرے کلام میں پیچیدہ استعارہ نہیں
کہ حرفِ صدق چھپانا مجھے گوارا نہیں

مرے لئے یہی موجیں ہیں دامنِ الیاس
بھنور میں ہوں، مرے دونوں طرف کنارہ نہیں

دعائیں مانگتا ہوں صبح کے اجالوں کی
اندھیری وصل کی شب بھی مجھے گوارا نہیں

ترے مزاج کے ریشم میں کیسے آگ لگی
مری غزل کا خنک لفظ تو شرارہ نہیں

دل و دماغ کو کیا دے گا روشنی وہ حزیں
نئی حیات کا جو لفظ گوشوارہ نہیں

سیّد منیر



(نذرِ غالب)

سایہ ظلم سرِ خلق خدا ہوتا ہے — جب بھی پرچم شبِ یلدا کا کھُلا ہوتا ہے
جانتے بھی ہیں کہ ہے ظلم کی بالادستی — یہ بھی کہتے ہیں کہ بندوں کا خدا ہوتا ہے
ذہن ابلاغ کا پابند ہُوا ہے ایسے — قرض گویا سحر و شام ادا ہوتا ہے
ظلمتِ شہر شب و روز پہ یوں ہے طاری — ہر سحرگاہ کا خورشید بُجھا ہوتا ہے
رات بھر جاگنے والوں نے بتایا ہے ہمیں — رات بھر شہر کا دروازہ کھُلا ہوتا ہے
ایک آسیب کسی پردہ تاریکی سے — بار بار آتا ہے اور شکل نما ہوتا ہے
اُس کے آنے کی خبر، اس کے زمانے کا طلسم — سرِ تسلیم و رضا سب کا جُھکا ہوتا ہے
شبِ آغاز کی باتوں میں شبستان کا رنگ — دن مگر قلعہ تعزیر و جفا ہوتا ہے
وہی پرکارِ جفا اور وہی قرطاسِ وطن — دائرہ جبر کا ہر سمت کھنچا ہوتا ہے
اب تو یہ حال ہُوا ہے کہ ہر اک رستے پر — راہ روکے ہوئے اک راہ نما ہوتا ہے
نسبتِ عہدِ گذشتہ سے بقولِ غالب — "روز اس شہر میں اِک حکم نیا ہوتا ہے

سب سمجھتے ہیں منیرؔ اور کہے جاتے ہیں
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے"[۱]

۱؎ یہ شعر میرزا نے مہدی مجروح کے نام ۱۸۵۹ء میں ایک خط میں لکھا تھا۔ اُس وقت کے دلّی کے حالات کے بارے میں ہے۔
نوائے سروش۔ مکمل دیوان غالب۔ غلام رسول مہر۔ صفحہ ۱۰۱۹۔

سیّد منیر



گلی کوچوں میں جب سب جل بُجھا آہستہ آہستہ
گھروں سے کچھ دھواں اُٹھتا رہا آہستہ آہستہ
کئی بے چینیوں کی شدّتِ اظہار کی خاطر
مجھے ہر لفظ پر رکنا پڑا آہستہ آہستہ
تجھے تو علم ہی تھا رفتہ رفتہ عمر گزرے گی
مناسب تھا کہ تو دل توڑتا آہستہ آہستہ
عدم، ہستی، فنا، اور پھر بقا، اک دائرہ سا ہے
سمجھ میں آہی جائے گا خدا آہستہ آہستہ
مسیحائی کی صبحوں، صبر کی راتوں کے آنگن میں
لہو بہتا رہا، بہتا رہا، آہستہ آہستہ
فصیلِ شہر بنتے ہی چلے آتے علم اُس کے
مری پہچان کا پرچم کھلا آہستہ آہستہ
اطاعت میں بھی تحریمِ انا کی فکر لازم ہے
سرِ تسلیم بھی اپنا جُھکا آہستہ آہستہ
منیرؔ اہلِ تحمّل کا جنوں سے واسطہ کیا ہے
محبت جرعہ جرعہ اور وفا آہستہ آہستہ



یاد کے تہوار میں وصل و وفا سب چاہیئے
رات کے ریشم میں لپٹی آپ کی چھب چاہیئے
پھر حلاوت سے چھلکتے جام خالی ہو گئے
پھر غزل کو آپ کی شیرینیٔ لب چاہیئے
رات کی وادی میں ساری رونقیں آباد ہیں
دن کے ویرانے میں بھی اک گلشنِ شب چاہیئے
اپنے غم کی رات میں اوروں کے غم کا چاند دیکھ
دَرد کی تشہیر میں تنویر کا ڈھب چاہیئے
سوچ اور الفاظ کی بے چینیوں میں کچھ بھی ہو
بات کی تہ سے نکلتا صاف مطلب چاہیئے
روشنی کے جبر نے آنکھوں کو خیرہ کر دیا
اب بصارت کے لئے کچھ ظلمتِ شب چاہیئے
رسم کی یکسانیت نیّت کا پردہ بن گئی
جو منافق کا نہ ہو، ایسا بھی مذہب چاہیئے
اپنے غم کی اُلجھنیں سلجھاؤ گے کب تک منیرؔ
درد عالمگیر ہو جائے، یہی اب چاہیئے

رضی اختر شوق

(نذرِ غالب)



میں کہاں اور عرضِ حال کہاں / وہ کہاں اور مرا خیال کہاں
میں ستارہ نہ تم گلاب ہوئے / مل رہے ہیں، مگر وصال کہاں
روز اک زخم مانگتا ہے عشق / میری گٹھڑی میں اتنا مال کہاں
وائے کم فرصتی کہ مجھ سے بھی / ہے مرا رابطہ بحال کہاں
آگ سوچوں تو خاک لکھتا ہوں / متفق لفظ اور خیال کہاں
چوٹ ویسے ہی دل پہ کاری تھی / دے گیا نغمہ گر بھی تال کہاں
اپنی تفسیرِ ذات مجھ سے نہ کر / میں بھی اب آئینہ مثال کہاں
نسلِ آدم پہ جو بھی اب گزرے / اِس عمارت کی دیکھ بھال کہاں
کیا خبر یہ قصیدہ خوانوں کو / کر دیے لفظ پایمال کہاں
ہے وفا کا صلہ وفا، سچ ہے / لیکن ایسی کوئی مثال کہاں
لاکھ کرتے رہو مسیحائی / زخم میں تابِ اندمال کہاں
مجھ کو پامالِ عمر کرتے ہوئے / جا رہے ہیں یہ ماہ و سال کہاں
میں چلوں یوں فگار پا کب تک / میں رُکوں، یہ مری مجال کہاں
پوچھتا ہوں جوازِ کون و مکاں / لے گئی جرأتِ سوال کہاں
تھی بہت آئینے کی چاہ ہمیں / آئینہ ہے تو خد و خال کہاں

اسد اللہ خاں کی دین ہے یہ
شوق تم ایسے خوش خیال کہاں

رضی اختر شوق



جب کبھی شہر گئے، دیدۂ تر لے آئے
اپنی پلکوں پہ کوئی تازہ خبر لے آئے

ہم نے کس لمحۂ وحشت میں شجر کاٹ دیا
اتنی مہلت بھی نہیں دی کہ ثمر لے آئے

میرے قاتل کو خبر دو کہ زمینِ دل میں
اُس نے بوئے تھے جو خنجر وہ ثمر لے آئے

ہم ہیں وہ راندۂ دنیا کہ ہوئے آپ میں گم
اور نادیدہ زمانوں کی خبر لے آئے

جن کے خوابوں کی یہ دنیا تھی اُنھی کو سونپی
اور اپنے لئے دنیائے دگر لے آئے

اپنے گھر کے در و دیوار کو ویران کیا
اور جاں اپنی سر کوئے ہنر لے آئے

یوں جُڑے راکھ کہ ہر لفظ کو شب تاب کیا
ابر کو پھر یہ دعا دی کہ گہر لے آئے

میری آواز کو تصویر بنا دے یا رب
دے مرے خواب کو نغمہ جو اثر لے آئے

روح کے بندِ قبا توڑ کے نکلیں مرے رنگ
دے وہ آہن کہ جو دیوار میں در لے آئے

طلبِ زر میں یہ احساس رہا ہم کو کہ شوق
جیسے ہم گردِ سرِ راہ گزر لے آئے



کیسے کٹے قصیدہ گو حرف گروں کے درمیاں
کوئی تو سر کشیدہ ہو اتنے سروں کے درمیاں

ایک تو شام رنگ رنگ پھر یہ خواب رنگ رنگ
آگ سی ہے لگی ہوئی میرے پروں کے درمیاں

ایک طرف ہیں جاں بہ لب تارِ نفس شکستنی
بحث چھڑی ہوئی اُدھر چارہ گروں کے درمیاں

ہاتھ لیے ہیں ہاتھ میں پھر بھی نظر ہے گھات میں
ہمسفروں کی خیر ہو ہمسفروں کے درمیاں

اُس کا لکھا یہ کچھ اور تھا، میرا کہا کچھ اور تھا
بات بدل بدل گئی نامہ بروں کے درمیاں

اب جو چلے تو یہ کھلا شہر کشادہ ہو گیا
بڑھ گئے اور فاصلے گھر سے گھروں کے درمیاں

کیسے اُڑوں میں کیا اُڑوں، جب کوئی کشمکش سی ہو
میرے ہی بازوؤں میں اور میرے پروں کے درمیاں

جامِ سفال و جامِ جم کچھ بھی تو ہم نہ بن سکے
اور بکھر بکھر گئے کوزہ گروں کے درمیاں

جیسے لٹا تھا شوق میں یونہی متاعِ فن لٹی
اہلِ نظر کے سامنے دیدہ وروں کے درمیاں

رضی اختر شوق



آئے ہم شہرِ غزل میں تو اس آغاز کے ساتھ
مُدتوں رقص کیا حافظِ شیراز کے ساتھ

اولِ عشق ہے اور ہمسفری کی لذت
اور آہستہ قدم اور ذرا ناز کے ساتھ

اہلِ پندار کی محفل سے تو ویرانہ بھلا
کون آواز ملاتا پھرے آواز کے ساتھ

اول اول تو دھنک بن کے اڑا وہ طائر
اور پھر رنگ بدلتے گئے پرواز کے ساتھ

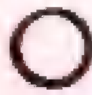
ایک ویران دریچے پہ خزاں کی بارش
کوئی تصویر بناتی رہی آواز کے ساتھ

میں وہ سرشار کہ تھا نشۂ یک خواب بہت
اس نے تعبیر بھی دی خواب کے آغاز کے ساتھ

لَے کی لذت میں وہ دیوار سے غافل طائر
خود بھی پتھر پہ رقم ہو گیا آواز کے ساتھ

ہے کوئی واقفِ اسرار، سرِ میخانہ
کیا یہ مینا سے صراحی نے کہا راز کے ساتھ

ہم نے ہی دل سے ہم آہنگ گلو کو رکھا
لوگ لَے اپنی بدلتے رہے ہر ساز کے ساتھ



جب اس سے بچھڑے تھے، وہ چہرہ سرخ گلابوں کا موسم تھا
پھر جو ملے تو اُس چہرے پر کچھ پت جھڑ سی تھی، کچھ ماتم تھا

جانے کن حالات کی آندھی اس کے سُروں کو بکھیر چلی تھی
وہ اک ایسا گیت تھا جس کی لَے میٹھی تھی سُر مدھم تھا

اُس کے بدن کی جوت تھی ایسی خواب میں جیسے دیے جلے ہوں
اور اُن دیوں کا اُترا کاجل میری آنکھوں کا مرہم تھا

ویرانی تقدیر تھی اُس کی، لیکن روح امیر تھی اُس کی
باتوں میں سچی چاندی تھی، آنکھوں میں کچا نیلم تھا

دریا کے اُجلے پانی میں جیسے بھنور کے پیچ پڑے ہوں
کچھ تو ہوا اس سے برہم تھی، کچھ وہ ہواؤں سے برہم تھا

اب بھی وہی لہجے کی دھنک تھی اب بھی وہی باتوں کی مہک تھی
تلخ بہت دن رات تھے اُس کے پھر بھی مزاج وہی ریشم تھا

توصیف تبسم



آخر خود اپنے ہی لہو میں ڈوب کے صرفِ وغا ہو گے
قدم قدم پر جنگ لڑی ہے، کہاں کہاں برپا ہو گے

حال کا لمحہ پتھر ٹھہرا، یوں بھی کہاں گزرتا ہے
ہاتھ ہلا کر جانے والو! دل سے کہاں جدا ہو گئے

موجوں پر لہراتے تنکو! چلو، نہ یوں اِترا کے چلو
اور ذرا یہ دریا اُترا، تم بھی لبِ دریا ہو گے

سوچو، کھوج ملا ہے کس کو، راہ بدلتے تاروں کا
اس وحشت میں چلتے چلتے، آپ ستارہ سا ہو گے

سینے پر جب حرفِ تمنا، درد کی صورت اُترے گا
خود ہی آنکھ سے ٹپکو گے اور خود ہی دستِ دعا ہو گے

سوکھے پیڑوں کی سب لاشیں، غرقِ کفِ سیلاب میں ہیں
قحطِ آب سے مرتے لوگو! بولو، اب کیا چاہو گے

بات یہ ہے اس باغ میں پھول سے پتا ہونا اچھا ہے
رنگ اور خوشبو بانٹو گے تو پہلے رزقِ ہوا ہو گے

اے میرے ناگفتہ شعرو! یہ تو بتاؤ، میرے بعد
کون سے دل میں قرار کرو گے، کس کے لب سے ادا ہو گے!



وہ اوّلیں درد کی گواہی، سجی ہوئی بزمِ خواب جیسے
وہ چشمِ سُرمہ کلام کرتی، وہ سارے چہرے کتاب جیسے

وہ آنکھ سایہ فگن ہے دل پر جو بےخودی کا ہے استعارہ
گھُلی ہوئی نیلگوں سمندر میں طلعتِ ماہتاب جیسے

بس اک دھماکہ کہ رات کی سرحدوں کا کچھ تو سُراغ پائیں
بس ایک چنگاری چاہتا ہو، فتیلۂ آفتاب جیسے

وہ جس کی پاداش میں سحرزاد اپنی آنکھیں گنوا چکے ہیں
اک اور تعبیر چاہتے ہوں وہ اوّلیں شب کے خواب جیسے

وہ موجِ سرکش جو ساحلوں کو ڈبو گئی، کیسے ٹوٹتی ہے
اس ایک منظر کے دیکھنے کو کھلی ہو چشمِ حباب جیسے

مری مژہ سے ٹپکتا آنسو ہو جیسے ہر ڈوبتا ستارہ
لکھا گیا ہو مری ہی پلکوں پہ رتجگوں کا حساب جیسے

لہو جو رزقِ زمیں ہوا ہے وہ بارشوں میں دھُلا نہیں ہے
تمام آئندہ موسموں کے ہو نام یہ انتساب جیسے

شہزاد احمد



اگر غبار سا ہر سو بکھر گیا ہوتا
نہ جانے صبح کا سورج کدھر گیا ہوتا

ہر ایک شے کو اگر آگہی عطا ہوتی
درخت اپنے ہی سائے سے ڈر گیا ہوتا

چمک ذرا سی اگر آنسوؤں میں آجاتی
تو آسمان ستاروں سے بھر گیا ہوتا

ہم اس کے ہاتھ کی تحریر لے کے کیا کرتے
مکرنے والا تو پھر بھی مکر گیا ہوتا

دلوں کے شہر اسی کے کرم سے زندہ ہیں
وہ چاہتا تو انہیں خاک کر گیا ہوتا

مجھے بھی یاد نہ ہوتا جو شام کا وعدہ
تری طرح مرا دن بھی گذر گیا ہوتا

خدا سے بھی کبھی دادِ وفا نہیں چاہی
مگر کبھی تو کوئی زخم بھر گیا ہوتا

نشان تیرا نہ ملتا اگر مجھے دل میں
تو میں ہوا کی طرح دربدر گیا ہوتا

ہم اپنے دل کے سفر پر اکیلے نکلے ہیں
ہمارے ساتھ کوئی ہمسفر گیا ہوتا

یہ کیا کہ خاک اڑاتے ہیں زرد زرد پتے
ہوا چلی تھی تو گلشن نکھر گیا ہوتا

چھپا ہوا ہی سہی اک جہان میں بھی تو ہوں
مری طرف بھی کوئی دیدہ ور گیا ہوتا

مآلِ عشق کی شہزاد اگر خبر ہوتی
چڑھا ہوا تھا جو نشہ، اتر گیا ہوتا

شہزاد احمد



پھر بیت گئی شام سہانی مرے مولا
پتوں پہ ٹھہرتا نہیں پانی مرے مولا

جب تو متوجہ نہیں، تو ہی نہیں سنتا
پھر کون سنے میری کہانی مرے مولا

جو کچھ مجھے مطلوب ہے تو خود ہی سمجھ لے
میں کیسے کہوں اپنی زبانی مرے مولا

میں صاحبِ ادراک ہوں افلاک ہوں یا خاک
کھلتے نہیں کیوں میرے معانی مرے مولا

میں ذرہ سہی پھر بھی میں تخلیق ہوں تیری
تو نے ہی مری قدر نہ جانی مرے مولا

تو نے مجھے خود اپنی ہی صورت پہ بنایا
میرا ابھی نہیں ہے کوئی ثانی مرے مولا

جس قہر کی پیری کو مجھے سونپا ہے تو نے
ویسی تو نہ تھی میری جوانی مرے مولا

دن رات مرا ذوقِ طلب مجھ کو جلائے
آئے نہ مجھے آگ بجھانی مرے مولا

پھر لکھ ہی دیئے تو نے مقدر میں اندھیرے
سکھلا کے مجھے شمع جلانی مرے مولا

آتا ہے عجب لطف مجھے گریۂ شب میں
یہ بھی ہے مری شعلہ بیانی مرے مولا

ویسے تو بہت عام، بہت عام سی شے ہوں
دے مجھ کو کوئی خاص نشانی مرے مولا

وہ سب سے نئی، سب سے نئی، سب سے نئی ہے
جو شے مرے اندر ہے پرانی مرے مولا

تو نے جو عطا کی مجھے خاص اپنے کرم سے
میں نے بھی وہی بات نہ مانی مرے مولا

اس دہر میں عبرت کے مناظر تو بہت ہیں
جاتی نہیں آنکھوں کی گرانی مرے مولا

رکتا ہوں نہ میں لوٹ کے جا سکتا ہوں شہزاد
ہے مجھ میں بھی دریا کی روانی مرے مولا

مظفر حنفی



خون کے داغ آستینوں پر
اور تمغے انھی کے سینوں پر

ایک ذرّے نے لی تھی انگڑائی
آسماں آ پڑے زمینوں پر

ہم ستارے بنا کے نادم ہیں
آپ نازاں ہیں آبگینوں پر

ہے کہیں گرد باد یا گرداب
دھول اُڑنے لگی سفینوں پر

وہ تو انگارے سے دہکتے ہیں
دل ہمکتا ہے جن حسینوں پر

عشق کرنا کوئی ضروری ہے ؟
شعر کہہ لیں گے نازنینوں پر

اے مظفر سُنی غزل تیری
نُور سا آگیا جبینوں پر



یوں چھاؤں میں جلتا رہوں کب تک مرے مولا
سایہ ابھی پہنچا نہیں سب تک مرے مولا

پھر بھی مری قسمت کے ستارے رہیں بیدار
سو جائیں اگر دستِ طلب تک مرے مولا

چھوڑا تھا کنارہ کہ ذرا شغل رہے گا
محصور ہوں گرداب میں اب تک مرے مولا

بچّوں کا نہیں ذکر کہ تہذیب و ادب سے
بیگانہ ہیں کچھ اہلِ ادب تک مرے مولا

بہتر تو سرافراز کے اوپر ہی چلیں گے
فریاد نہ آئی مرے لب تک مرے مولا

دن گرد اڑانے کے لیے تھا سو اڑا لی
پھر آگیا ویرانۂ شب تک مرے مولا

منظور کہ قبضے میں رہے مملکتِ فن
تلوار پہ چلتا رہوں جب تک مرے مولا

کیا دیر ہے، مجھ کو بھی اجازت ہو رجز کی
حرف آنے لگا نام و نسب تک مرے مولا

اِک بار مظفر کو بھی توفیق عطا کر
مزدور بھی جاتے ہیں عرب تک مرے مولا

(کلکتہ۔ بھارت)

مظفر حنفی



یہ معرکہ کہ ہے بڑا صبر آزما بھائی!
کسی کو ٹھیس نہ لگ جائے دیکھنا بھائی!

اِک اور وار کہ شہ رگ نہیں ہوئی سیراب
مرے عزیز، مرے دیر آشنا بھائی!

تجھے پتہ ہے، کنارے نہیں رہے محفوظ
بہاؤ تیز ہے، مجھ سے نہ دُور جا بھائی!

ہمیں کہ دولتِ آفاق بھی زیادہ نہیں
جو ہو سکے تو بس اک سانس بھر ہوا بھائی!

یہ اور بات کہ ترکش میں تیر ہی کم ہیں
ترے سوا مرا دُنیا میں کون تھا بھائی

ہم اپنے آپ پہ تلوار جب اُٹھاتے ہیں
لہو سفید نکلتا ہے، ہاتھ لا بھائی!



اگر یہ سرد لاوا میرے اندر سے نکل آئے
سوا نیزے پہ اِک سُورج اسی گھر سے نکل آئے

چمکتی نرم ٹھنڈی ریت ساحل سے بلاتی تھی
ہزاروں "العطش" کہہ کر سمندر سے نکل آئے

ہمارے زخمِ سر کو ناخنِ وحشت ہی کیا کم تھے
کہ عصری آگہی کے سینگ بھی سر سے نکل آئے

وتیرا سر بلندی، سنگساری اس کا ثمرہ ہے
ہمارا سر جُھکے تو خون پتھر سے نکل آئے

مظفر پُر تکلف محفلوں میں گھُٹ رہا تھا دم
قلم ہاتھوں میں آتے ہی مرے پَر سے نکل آئے

(کلکتہ، بھارت)

علامہ طالب جوہری



جیسے ہی زینہ بولا تہہ خانے کا
کنڈلی مار کے بیٹھا سانپ خزانے کا

ہم بھی زخم طلب تھے اپنی فطرت میں
وہ بھی کچھ سچا تھا اپنے نشانے کا

راہب اپنی ذات میں شہر آباد کریں
دیر کے باہر پہرہ ہے ویرانے کا

وقت کی قینچی اُس کے پروں کو کاٹ گئی
شمع سے رشتہ ٹوٹ گیا پروانے کا

بات کہی اور کہہ کر خود ہی کاٹ بھی دی
یہ بھی اک پیرایہ تھا سمجھانے کا

صبح سویرے شبنم چاٹنے والے پھول!
دیکھ لیا خمیازہ پیاس بجھانے کا

بنجر مٹی پر بھی برس، اے ابرِ کرم
خاک کا ہر ذرہ مقروض ہے دانے کا

طالب اس کو پانا تو دشوار نہ تھا
اندیشہ تھا خود اپنے کھو جانے کا



الفت کی رسم و راہ سے اتنا وہ بے پروا نہ تھا
کل اجنبی بن کر ملا، پہلے تو وہ ایسا نہ تھا

اس سال کے سیلاب سے سارے کگارے کٹ گئے
دریا کے پیچ و تاب کا، ساحل کو اندازہ نہ تھا

جب قربتوں کی چھاؤں میں اترے حیا کے قافلے
بڑھتے قدم خود رک گئے، آگے کوئی رستا نہ تھا

پلکوں کی چھاگل توڑ کر رزقِ زمیں بنتے رہے
ان آنسوؤں کے واسطے ترکِ وطن اچھا نہ تھا

کیا جبرِ فطرت کا گلہ، جب عہد ہو نامہرباں
دریا میں باڑھ آئی وہاں، بادل جہاں برسا نہ تھا

طالب دریچہ آنکھ کا جب ذات کے اندر کھلا
پلکیں اِدھر جھک کر اٹھیں اور دور تک صحرا نہ تھا

(علامہ) طالب جوہری



جہت کو بے جہتی کے ہنر نے چھین لیا
مری نگاہ کو میرے ہی سر نے چھین لیا

ہے کس کے دستِ کرم میں مہارِ ناقۂ جاں
سفر کا لطف غمِ ہم سفر نے چھین لیا

میں اپنی روح کے ذرّے سمیٹتا کیوں کر
یہ خاک وہ تھی جسے کوزہ گر نے چھین لیا

بھٹک رہے ہیں جوانی کے نارسا لمحات
بہت سے گھر تھے جنھیں ایک گھر نے چھین لیا

بقولِ غالبِ دانا، گزر ہی جاتی یہ عمر
مگر اسے بھی ترے رہگزر نے چھین لیا

شکار گاہ شکاری کے خوں سے رنگیں ہے
زمیں کا رزق کسی جانور نے چھین لیا

سفر کی روح تھا وہ ذوقِ جستجو طالبؔ
جسے چراغِ سرِ رہگزر نے چھین لیا



میں دیارِ قاتلاں کا ایک تنہا اجنبی
ڈھونڈھنے نکلا ہوں خود اپنے ہی جیسا اجنبی

آشناؤں سے سوالِ آشنائی کر کے دیکھ
پھر پتہ چل جائے گا: ہے کون کتنا اجنبی

ڈوبتے ملّاح تنکوں سے مدد مانگا کیے
کشتیاں ڈوبیں تو تھی ہر موجِ دریا اجنبی

کل جو مجھ کو عافیت کی بھیک دینے آئے تھے
کس سے پوچھوں کون تھے وہ، آشنا یا اجنبی

بے مروّت شہریوں نے فاصلے کم کر دیے
ورنہ پہلے شہر کو لگتا تھا صحرا اجنبی

یہ منافق روپ کب سے میری عادت بن گیا
میرے چہرے سے ہے کیوں میرا سراپا اجنبی

آفتاب اقبال شمیم



کبھی خود کو درد شناس کرو، کبھی آؤ نا!
مجھے اتنا تو نہ اُداس کرو، کبھی آؤ نا!

مری عمر سرائے نہکے ہے گلِ ہجراں سے
کبھی آؤ، آکر باس کرو، کبھی آؤ نا

مجھے چاند میں شکل دکھائی دے جو دہائی دے
کوئی چارۂ ہوش و حواس کرو، کبھی آؤ نا

اُسی گوشۂ یاد میں بیٹھا ہوں کئی برسوں سے
کسی رفت گزشت کا پاس کرو، کبھی آؤ نا

کہیں آب و ہوائے تشنہ لبی مجھے مار نہ دے
اسے برکھا بن کر راس کرو، کبھی آؤ نا

سدا آتے جاتے موسم کی یہ گلاب رتیں
کوئی دیر ہیں، یہ احساس کرو، کبھی آؤ نا!



تمیزِ پسرِ زمین و ابنِ فلک نہ کرنا
تم آدمی ہو تو آدمی کی ہتک نہ کرنا

یہ جمع و تفریق، ضرب و تقسیم کی صدی ہے،
عقیدہ ٹھہرا عدد کی منطق پہ شک نہ کرنا

پسِ خراباتِ بند جاری ہے مے گساری
سکھایا جام و سبو کو ہم نے کھنک نہ کرنا

چھلاوے بن جائیں آگے جا کر یہی غزالاں
تعاقب ان مہ وشوں کا تم دُور تک نہ کرنا

یہ غم کہ معنی تجھے لگے ہے سرابِ معنی
اکیلے سہنا، اِسے غمِ مشترک نہ کرنا

آفتاب اقبال شمیم



مَیں بھی کتنا سادہ مزاج تھا کہ یقیں گمان پہ کر گیا
کسی آس پر، کسی یاس میں، کبھی جی اُٹھا، کبھی مر گیا

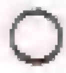
ہوئے منکشف مری آنکھ پر کئی اور زاویے دید کے
کوئی اشکِ ضبط اگر کبھی پسِ چشم آ کے ٹھہر گیا

چلو یارِ وعدہ نواز سے کسی روز جا کے پتہ کریں
وُہ جو اُس کے در کا اسیر تھا، اُسے کیا ہُوا، وہ کدھر گیا

وہ شبِ عجیب گزر گئی، سو گزر گئی مگر اس طرح
کہ سحر کا آئینہ دیکھ کر مَیں تو اپنے آپ سے ڈر گیا

تری آس کیا، کہ ہے ابر کا تو ہوا کے رُخ سے معاملہ
جو سنور گیا تو سنور گیا، جو بکھر گیا تو بکھر گیا

مری رہگذار میں رہ گئی یہی بازگشت صداؤں کی
کوئی بے نمود سا شخص تھا، وہ گزر گیا، وہ گزر گیا



مثالِ سیلِ بلا نہ ٹھہرے، ہوا نہ ٹھہرے
لگائے جائیں ہزار پہرے، ہوا نہ ٹھہرے

کہیں کہیں دُھوپ چھپ چھپا کر اُتر ہی آئی
دبیز بادل ہوئے اکہرے، ہوا نہ ٹھہرے

ورق جب اُلٹے، کتابِ موسم دکھائے کیا کیا
گلاب عارض، بدن سنہرے، ہوا نہ ٹھہرے

وہ سانس اُکھڑی کہ بےحسوں نے غضب میں آکر
گرا دیئے حبس کے کٹہرے، ہوا نہ ٹھہرے

کبھی بدن بدن کے روئیں روئیں میں حواس اُبھرے
کبھی کرے گوشِ ہوش بہرے، ہوا نہ ٹھہرے

اسی کی رفتارِ پا سے اُبھریں نقوشِ رنگیں
کہیں پہ ہلکے، کہیں پہ گہرے، ہوا نہ ٹھہرے

صدائے ہر سُو فلک کے گنبد میں گونجتی ہے
ہوا نہ ٹھہرے، ہوا نہ ٹھہرے، ہوا نہ ٹھہرے

(بیجنگ)

انور مسعود



شدتِ درد میں ہونٹوں پہ دُعا کا ہونا
ثابت اس سے بھی تو ہوتا ہے خدا کا ہونا

آنے والے کسی طوفاں کی خبر دیتا ہے
قریے قریے میں تصادم کی فضا کا ہونا

جانے کیا زنگ کھائے گا یہ وحشی موسم
اس قدر شور دریچوں میں ہوا کا ہونا!

اب تو بارود کا اک ڈھیر بنی ہے دنیا
اب تو باقی ہے فقط ایک دھماکہ ہونا

حُسنِ نیت نہ میسّر ہو تو انور صاحب
ہے خطرناک بہت ذہنِ رسا کا ہونا

احسان اکبر



جو دکھاتے تھے راہیں وہ مخدوش تھیں، جو سناتے تھے وہ بات غفلت کی تھی
تھیں بڑوں سے یہی دوریاں اپنے ہاں، صرف اتنی سی اوقات غفلت کی تھی

ماں نے کب فجر کے وقت اٹھایا ہمیں باپ کب کام پر ساتھ لے کر گیا
پر ان آزادیوں میں پلی نسل پر اک حکومت سی دن رات غفلت کی تھی

گرد آلود تھی اپنی دھرتی بہت، سو قدم اپنی مٹی پہ دھرتے نہ تھے
نیلے ساحل تصوّر میں جب آ بسے اس گھڑی سے شروعات غفلت کی تھی

یوں ارادوں میں سالم تھیں سچائیاں، گفتگو تک سلامت تھیں اچھائیاں
پہلی خواہش بغاوت کی تھی ذہن میں، دل میں ہر دوسری بات غفلت کی تھی

برجیوں بیچ بیٹھی ہوئی فوج پر، یوں تو سلطاں کو دعوے بہت تھے مگر
اگلا دن فصلِ گردن کی کٹنے کا تھا، شہر میں آخری رات غفلت کی تھی

ایک پل یوں ہٹا ایک دن کھو گیا، اک مہینہ برس اک صدی ڈھل گئی
ایک لمحے کی گمراہیوں کی سزا، قرن بھر ایک برسات غفلت کی تھی

عالمتاب تشنہ



سوائے دربدری اس کو خاک ملتا ہے
جو آسمان سے اپنی زمیں بدلتا ہے
میں جب بھی گھر سے نکلتا ہوں رات کو تنہا
چراغ لے کے کوئی ساتھ ساتھ چلتا ہے
عجیب ہوتا ہے نظارگانِ شوق کا حال
ردائے ماہ پہن کر وہ جب نکلتا ہے
بروئے چشم ردائے حجاب تان لی جائے
وہ زیرِ سایۂ گل پیرہن بدلتا ہے
فریبِ قرب تو دیکھو کہ میرے پہلو میں
تمام رات کوئی کروٹیں بدلتا ہے
گزار دیتے ہیں آوارہ گرد آگ کے گرد
جو بے ٹھکانہ ہیں ان کا بھی کام چلتا ہے
ہمارے دم سے بھی ہے موسموں کی گلکاری
چراغِ لالہ میں دل کا لہو بھی جلتا ہے
میں وہ شہیدِ وفا ہوں کہ قتل کرکے مجھے
مرا غنیم تاسف سے ہاتھ ملتا ہے
ہمیں نصیب ہُوا ایسی منزلوں کا سفر
قدم قدم پہ جہاں راستہ بدلتا ہے
ہوائے دامنِ رنگین یہ کہہ گئی تشنہ
ہمارے سامنے کس کا چراغ جلتا ہے

خلیل رامپوری



یہ جو رشتہ ہے میرا مٹی سے
روپ سارا ہے میرا مٹی سے
سبزہ کہتا ہے، لُوٹے جاؤ مجھے
دل کشادہ ہے میرا مٹی سے
میں ستارا نہیں ہوں سورج ہوں
گہرا رشتہ ہے میرا مٹی سے
کاٹ لو پر جڑیں نہ کھودو مری
تم پہ سایہ ہے میرا مٹی سے
میں تو خود رَو درخت ہوں لیکن
پیٹ بھرتا ہے میرا مٹی سے
اچھے لگتے ہیں پھول کھلتے ہوئے
کوئی رشتہ ہے میرا مٹی سے
مطمئن ہوں کہ فصل اچھی ہے
سینہ ٹھنڈا ہے میرا مٹی سے
ہر حویلی میں دیپ روشن ہے
گاؤں زندہ ہے میرا مٹی سے
کس طرح بھول جاؤں مٹی کو
سارا دھندا ہے میرا مٹی سے
بعد مرنے کے بھی رہوں گا ترا
یہ بھی وعدہ ہے میرا مٹی سے
جو کہوں گا وہ سچ کہوں گا خلیل
کیوں کہ رشتہ ہے میرا مٹی سے



تقریریں کرتے رہے ہو بابا سائیں
دنیا کو پاگل سمجھے ہو بابا سائیں
کتنی راتیں چاٹ چکے ہو بابا سائیں
کتنے سورج کھا بیٹھے ہو بابا سائیں
کس کو پانے کی کوشش ہے کس کا دکھ ہے
کھوتے کھوتے سے رہتے ہو بابا سائیں
کس کی چاہت کا یہ روگ لگا ہے تم کو
بیٹھے بیٹھے رو پڑتے ہو بابا سائیں
اپنے آپ کو دیکھو سوچو اور پہچانو
اپنے آپ کو بھول گئے ہو بابا سائیں
تم جو مانگو گے وہ دے گا، بات سنے گا
تم اس کے سچے بندے ہو، بابا سائیں
سچ کی شمعیں جلنے لگتی ہیں آنکھوں میں
جب بھی تم باتیں کرتے ہو بابا سائیں
دریاؤں کو پھیلا دیتی ہیں برساتیں
تم بھی تو رحمت والے ہو بابا سائیں
ہمت اور بڑھا دیتا ہے چڑھتا سورج
اچھا ہے جو ڈھل جاتے ہو بابا سائیں
ہم کو بھی اس دنیا میں پہنچا دو اک دن
جس دنیا میں تم رہتے ہو بابا سائیں

صمد انصاری



روشنی تک روشنی کا راستہ کہہ لیجیے
رات کو شام و سحر کا فاصلہ کہہ لیجیے

دے گئی کتنی بہاریں ایک فصلِ آرزو
رنگ و بو کو موسموں کا خوں بہا کہہ لیجیے

گونجتی ہے عمرِ ویراں میں تمنا کی تھکن
حرفِ غم کو گنبدِ جاں کی صدا کہہ لیجیے

کُند آخر کر گئیں تلوار کو خوں ریزیاں
دوستی کو دشمنی کی انتہا کہہ لیجیے

بال و پَر کھلتے نہیں جن کے نشیمن کی طرف
اُن اڑانوں کو ہواؤں کی غذا کہہ لیجیے

کاٹ دی ہے ناامیدی نے خیالوں کی طناب
فکرِ آوارہ کو اب فکرِ رسا کہہ لیجیے

موسمِ گُل دیکھیے کُھلتے دریچوں کے تلے
بام و در کو شہر کی آب و ہوا کہہ لیجیے

کچھ نہیں ملتا صمدؔ پتھر کو تیشے کے سوا
آذری کو آذری، نامِ خدا کہہ لیجیے



اُترے طلسم شب کے، اُجالوں پہ رات بھر
قرباں ہوئی ہے صبح، چراغوں پہ رات بھر

ظلمت میں اپنی ڈوب گئیں دن کی بستیاں
سورج تمام چھلکے ستاروں پہ رات بھر

خوابوں کی شاخ شاخ پہ لٹکی ہیں حسرتیں
تعمیرِ جاں ہوئی ہے خرابوں پہ رات بھر

اُترے نہیں نشیبوں میں اڑانوں کے حوصلے
بیٹھے رہے پرند بھی شاخوں پہ رات بھر

اک لو نہیں نصیب غریبانِ شہر کو
شمعیں جلی ہیں کتنی، مزاروں پہ رات بھر

ڈھلتی رہی نگاہ میں چہروں کی چاندنی
نازل ہوئے یقین گمانوں پہ رات بھر

پیراہنِ جمال ہے رخصتِ برہنگی
پہنے گئے ہیں جسم لباسوں پہ رات بھر

خوشبوئیں جذب ہو گئیں مہتابیاں صمدؔ
شبنم ہوئی نثار گلابوں پہ رات بھر

سید امداد ہمدانی



چلو ہم اہلِ غم یہ شہر اور گھر چھوڑ جائیں گے
مگر تجھ کو بھی تنہا، اے ستمگر! چھوڑ جائیں گے

فصیلِ شب کو توڑیں گے جو سچائی کے میداں میں
جہاں میں ہم وہ آوازوں کے لشکر چھوڑ جائیں گے

کبھی تو بھی غموں کی فائلوں میں ہم کو ڈھونڈے گا
تری سوچوں میں ہم یادوں کے دفتر چھوڑ جائیں گے

مصور آئیں گے اور میرے دیوار و درِ شب پر
اُجالوں کے کئی شہکار پیکر چھوڑ جائیں گے

جو رستوں کا تعین بھی کرے گا، منزلوں کا بھی
جہاں میں ہم وہ اِک دستورِ رہبر چھوڑ جائیں گے

فضا کہتی ہے، یہ تاریک بادل اتنے برسیں گے
غمِ ہستی کے صحرا میں سمندر چھوڑ جائیں گے

گرا کر شہر میں امداد ہم نفرت کی دیواریں
ہر اِک گھر میں محبت کے کھُلے در چھوڑ جائیں گے

○

ذروں کو آفتاب سے لڑتے ہوئے بھی دیکھ
امداد اپنی آنکھ سے یہ معجزے بھی دیکھ

خیمے صداقتوں کے جو کربل میں نصب تھے
وہ کوفیوں کے ہاتھ سے جلتے ہوئے بھی دیکھ

سینہ سپر ہوں میں ترے تیروں کے سامنے
اے دشمنِ حیات! مرے حوصلے بھی دیکھ

سورج کی آگ سر پہ تو صحرا تپا ہوا
جو طے کئے ہیں ہجر نے، وہ فاصلے بھی دیکھ

کس نے کہا تھا، فن پہ مرے قدغنیں لگا
نغمے مرے، فضاؤں میں اب گونجتے بھی دیکھ

میں دشت و کوہسار میں پیکا چلا گیا
آتے ہیں میرے کام مرے تجربے بھی، دیکھ

شفیق سلیمی



جانے کس ڈگر میں ہیں، بے جہت سفر میں ہیں
شہرِ کم نظر! ہم بھی کب تری نظر میں ہیں

نقش بھی نہیں رکھتے، مشتِ خاک ہیں پھر بھی
چاک پر دھرے ہیں ہم، چشمِ کوزہ گر میں ہیں

اے عذابِ رسوائی! اے عتابِ تنہائی!
کب ترے اثر میں تھے، کب ترے اثر میں ہیں

خواب تک نہیں باقی اب گرفتِ خواہش میں
راستے اڑانوں کے پھر بھی بال و پر میں ہیں

ہم تو شفیق اپنا ہے کتابِ فردا میں
کل بھی ہم خبر میں تھے، آج بھی خبر میں ہیں



نیا منظر بنا کر دیکھتے ہیں
کبھی آنکھیں بجھا کر دیکھتے ہیں

سرِ شاخِ ہوا اک بار پھر سے
چراغِ گُل سجا کر دیکھتے ہیں

گزرتی ہیں کہاں سورج کی راتیں
سرِ کہسار جا کر دیکھتے ہیں

انا کا بوجھ بھی سر سے گرائیں
یہ تہمت بھی اٹھا کر دیکھتے ہیں

چلو دریا میں ڈالیں نیکیوں کو
یہ نیکی بھی کما کر دیکھتے ہیں

(ابوظبی)

سید نواب حیدر نقوی



آبلہ پائی کی اب دل میں تمنا بھی نہیں
اور اب راہ میں وہ آگ کے دریا بھی نہیں

ہائے وہ تلخ حقیقت جو اٹل بن جائے
حیف وہ خواب جو ہر رات بدلتا بھی نہیں

کیسا سورج کہ شعاعوں سے اندھیرا برسے
کیسا مہتاب، کہ بستی میں اُجالا بھی نہیں

ہم نے مانا کہ خیالات بدل جاتے ہیں
ہو تری دید سے اِنکار! اب ایسا بھی نہیں

شہر چھانے تو علاجِ دلِ محزوں نہ ملا
اور صحرا میں کہیں، پیڑ کا سایا بھی نہیں

ہم بھری بزم میں تنہا ہی کھڑے ہیں راہی
اتنے چہروں میں کوئی ایک شناسا بھی نہیں

شوکت ہاشمی



اِک ستارہ شہرِ شب کے پار کچھ اچھا لگا
آسماں پر مجھ کو پہلی بار کچھ اچھا لگا

آج مل بیٹھیں گے میرے ملک کے سب رہنما
آج مجھ کو صبح کا اخبار کچھ اچھا لگا

تم پریشاں ہو، فقیہہ شہر پر تہمت لگی
وہ مجھے بے جُبّہ و دستار کچھ اچھا لگا

اُس کو آتا ہے انا کے ساتھ جینے کا اصول
ہاشمی مجھ کو وہ بدکردار کچھ اچھا لگا

رشک خلیلی



ہم ہیں اسی اک آس پہ زندہ، کل کی خوشیاں باقی ہیں
آج کی رات بسر ہونے میں کتنی گھڑیاں باقی ہیں

دُور سے پھولوں کی شادابی دیکھنے والا کیا جانے
کونسی ٹہنی پر شبنم کی پیاسی کلیاں باقی ہیں

پل پل جینے والوں میں سے اتنا کون بتائے گا
کتنی صدیاں بیت چکی ہیں، کتنی صدیاں باقی ہیں

آنا چاہیں تو سُورج کی پہلی کرنیں آ جائیں
میرے گھر کے دروازے میں کافی جھریاں باقی ہیں

رونق دیکھنے آنے والے رستوں میں کھو جاتے ہیں
پہلا سا اب شہر کہاں ہے، بھول بھلیاں باقی ہیں

چھاؤں میسر آئے نہ آئے، ہم یہ دُعائیں کرتے ہیں
بازوں سے محفوظ رہے، جس پیڑ پہ چڑیاں باقی ہیں



ہر وہ نشاں جو میرا نشانِ حیات ہے
بیکار تو نہیں ہے اگر بے ثبات ہے

آئینہ اس خیال کی ہے آخری مثال
ہر آدمی کے پیشِ نظر اپنی ذات ہے

اے مُسکرانے والے! تجھے یہ خبر نہیں
جو بھی خوشی ہے وہ کسی غم کی زکوٰۃ ہے

ہر لمحہ کربِ نو سے گزرتا ہے آدمی
در اصل دل دھڑکنا بھی اک واردات ہے

کیا کیا خیال و خواب ہوئے ہیں خیال و خواب
میری نظر میں اب کوئی دن ہے نہ رات ہے

ذرّے بھی بے ثبات ہیں تارے بھی بے ثبات
یا رب! یہ کائنات بھی کیا کائنات ہے

رُوحی کُنجاہی



میرے لئے وہ شخص مصیبت بھی بہت ہے
سچ یہ بھی ہے، اُس کی مجھے عادت بھی بہت ہے

ملتا ہے اگر خواب میں، ملتا تو ہے کوئی
اُس کی یہ عنایت، یہ مروت بھی بہت ہے

اُس نے مجھے سمجھا تھا کبھی پیار کے قابل
خوش رہنا ہو تو اتنی مسرت بھی بہت ہے

اُلفت کا نبھانا تو بڑی بات ہے لیکن
اس دور میں اظہارِ محبت بھی بہت ہے

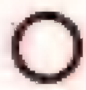
کچھ لوگ ابھی پوچھتے رہتے ہیں مرا حال
سچ پوچھئے تو اتنی عنایت بھی بہت ہے

جانے پہ بضد ہے تو کہوں اس کے سوا کیا
اے دوست! تری اتنی رفاقت بھی بہت ہے

مرجھائے ہوئے پھول ہیں مفلس کا اثاثہ
بیچارے کو یہ رنگ، یہ نکہت بھی بہت ہے

اک فاصلہ قائم ہے بدستور بہر حال
حاصل مجھے اُس شخص کی قربت بھی بہت ہے

جینا تو پڑے گا ہی بغیر اُس کے بھی رُوحیؔ
حالانکہ مجھے اُس کی ضرورت بھی بہت ہے



اپنی مرضی ہی کرو گے تم بھی
کچھ کسی کی نہ سنو گے تم بھی

وقت سے بچ نہ سکو گے تم بھی
جو کرو گے وہ بھرو گے تم بھی

ایک آواز سُنی ہے ہم نے
ایک آواز سنو گے تم بھی

آج آندھی ہو تو مٹی کی طرح
ایک دن بیٹھ رہو گے تم بھی

آج سرکار بنے بیٹھے ہو
کل کو فریاد کرو گے تم بھی

یہی ہوتا ہے، یہی ہونا ہے
ایک دن ہاتھ ملو گے تم بھی

سامنے دیکھ کے انجام اپنا
کب بھلا غور کرو گے تم بھی

تو سنبھالو دل و جاں کی اقلیم
ہم کو کیا یاد کرو گے تم بھی

جب نکل جائے گا رُوحیؔ مطلب
کتنے الزام دھرو گے تم بھی

انور شعور

○

تیری قربت میں بیٹھا ہوں
کیسی جنت میں بیٹھا ہوں

دیوارِ زنداں کے پیچھے
جرمِ محبت میں بیٹھا ہوں

ایک آواز پہ آ جاؤں گا
جیسی حالت میں بیٹھا ہوں

آ جاؤ دو باتیں کر لیں
قدرے فرصت میں بیٹھا ہوں

بیٹھا ہوں تصویر کے آگے
اور حقیقت میں بیٹھا ہوں

ایک جھلک دیکھی تھی اُس کی
اب تک حیرت میں بیٹھا ہوں

سب نقشے ہیں دیکھے بھالے
غم میں، راحت میں بیٹھا ہوں

دیکھ شعورؔ اُس بُت کے آگے
کیسے عبادت میں بیٹھا ہوں

○

بیابان و گلزار دے دو مجھے
یہ دھرتی یہ سنسار دے دو مجھے

کہاں اب محبت کے وہ قدر داں
کوئی اور کردار دے دو مجھے

مسیحا تمھیں مان جاؤں گا میں
دوائے دلِ زار دے دو مجھے

سیوں گا میں گجرا کسی کے لیے
یہ پھول اور یہ خار دے دو مجھے

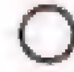
اُسے مصرعِ طرح سمجھوں گا میں
وہ یارِ طرح دار دے دو مجھے

کھلونے بناتا ہوں میں نت نئے
جو چیزیں ہوں بیکار دے دو مجھے

نگر میں تو کوئی اکیلا نہیں
ٹھکانا نگر پار دے دو مجھے

یہ تحفے تحائف اٹھاؤ شعورؔ
بس اپنے کچھ اشعار دے دو مجھے

مختار جاوید



ہدف ہوں، دشمنِ جاں کی نظر میں رہتا ہوں
کسے خبر ہے قفس میں کہ گھر میں رہتا ہوں

مرے یہ زخم تو معمول کے مطابق ہیں
ازل سے شیش محل کے کھنڈر میں رہتا ہوں

اِدھر اُدھر کے کنارے مجھے بلاتے ہیں
مگر میں اپنی خوشی سے بھنور میں رہتا ہوں

نہ میں زمیں ہوں، نہ تو آفتاب ہے پھر بھی
ترے طواف کی خاطر سفر میں رہتا ہوں

میں سایہ دار نہیں اس کے باوجود ، دیکھ
پہن کے دھوپ تری رہ گذر میں رہتا ہوں

یہ کیسی چڑ ہے مجھے تیرگی کے عالم سے
کہ میں چراغ ہوں لیکن سحر میں رہتا ہوں

مجھے غرض ہے فقط اس کی استقامت سے
بہار ہو کہ خزاں، میں شجر میں رہتا ہوں

مجھے شناخت کرو میرے شاہکاروں میں
میں خال و خط سے زیادہ ہنر میں رہتا ہوں



خدا کی ذات نے جب درد کا نزول کیا
مرے سوا نہ کسی اور نے قبول کیا

اگرچہ ایک قبیلے کے فرد ہیں دونوں
تجھے گلاب بنایا، مجھے ببول کیا

کبھی یہ غم کہ ادھورا رہا ہمارا کام
کبھی یہ سوچ کہ جتنا کیا، فضول کیا

ہوا نے گرد اڑائی ہے بارہا میری
پلٹ پلٹ کے زمیں نے مجھے قبول کیا

ہر ایک زخم کو بخشی گلاب کی صورت
بدن کی سیج پہ کانٹوں کو ہم نے پھول کیا

منا رہے ہیں شجر رخصتِ بہار کا سوگ
ثمر تو کیا کوئی پتہ نہیں قبول کیا

کسی کو خود سے زیادہ نہ محتسب جانا
فقط ضمیر کی آواز کو اصول کیا

مختار جاوید



ابر بے وجہ نہیں دشت کے اُوپر آئے
اِک دُعا اور، کہ بارش کی دُعا بر آئے

آنکھ رکھتے ہوئے کچھ بھی نہیں دیکھا ہم نے
ورنہ منزل سے حسیں، راہ میں منظر آئے

کوئی امکان، کہ جاگے کبھی لو ہے کا ضمیر
اور قاتل کی طرف لوٹ کے خنجر آئے

آرزو تھی کہ شجر کو ثمر آور دیکھوں
بُور پڑتے ہی مگر صحن میں پتھر آئے

تجھ سے دریا تو گئے چل کے سمندر کی طرف
مجھ سے قطرے کی طرف اُڑ کے سمندر آئے

آزمائش ہو شجاعت کی تو پھر ایسے ہو
میں اکیلا ہوں، مرے سامنے لشکر آئے

کر دیا دھوپ نے جب شہر کو سایوں کے سپرد
پھر تو دن میں بھی کئی رات کے منظر آئے



بلندیوں کی مسافت پہ ڈالنا مجھکو
مگر نہ گیند کی صورت اچھالنا مجھکو

مرے حلیف، کنویں میں اُتار کر جیسے
کبھی کے بھول چکے ہوں، نکالنا مجھکو

تمام عمر اندھیروں کے درمیاں رکھنا
کسی چراغ کی مانند پالنا مجھکو

رہِ سفر میں تو لغزش کا سامنا تھا مجھے
مگر یہ پاؤں نہ بھُولے سنبھالنا مجھکو

فشارِ موج سے محفوظ ہو گیا ہوں میں
مرے خدا! نہ بھنور سے نکالنا مجھکو

مرے حریف! تری پیاس بار بار بجُھے
مٹا کے میرے ہی سانچے میں ڈھالنا مجھکو

میں صرف شب کا مسافر نہیں ہوں یاد رہے
دکھا کے چاند ستارے نہ ٹالنا مجھکو

نقوی احمد پوری



تمام خوشیاں ہیں اس کے دم سے یہ گھر ہے گھر کا خیال رکھنا
تم اس کی دیوار کو سجانا، تم اس کے در کا خیال رکھنا

کبھی دبے پاؤں گر وہ آئے، حصارِ ظلمت میں جھلملائے
بڑی ہی پیاری سحر وہ ہوگی تم اس سحر کا خیال رکھنا

تمھاری پرواز ان کے دم سے، سبھی تگ و تاز ان کے دم سے
کھلی فضاؤں میں تم جو اُڑنا تو بال و پر کا خیال رکھنا

جو خود بگولوں کے درمیاں ہے، مسافروں پر جو مہرباں ہے
جو دشت میں مثلِ سائباں ہے، تم اس شجر کا خیال رکھنا

کبھی جو میدان میں نکلنا، قدم قدم تمکنت سے چلنا
نہ دیکھنا اپنے جسم و جاں کو، نہ اپنے سر کا خیال رکھنا

تمھارے الفاظ میں چمک ہو، تمھارے لہجے میں بھی کھنک ہو
ہنر کے رسیا ہو تم جو نقوی، تو پھر ہنر کا خیال رکھنا

سلطان سکون



نہ صبح صبح ہوئی وہ نہ شام شام ہوئی
یہ عمر جس کی تمنا لیے تمام ہوئی

وہیں پہ آن پڑی ہے کوئی نئی افتاد
کہیں ذرا بھی طبیعت جو شاد کام ہوئی

نجانے کونسا غم لے کے کل کا دن نکلے
شبوں کی نیند اسی فکر میں حرام ہوئی

بسا بھی سکتے تھے ہم بستیاں محبت کی
ہماری [illegible] مگر نذرِ انتقام ہوئی

خلوص و مہر و وفا سر جھکائے پھرتے ہیں
کہ جب سے خلق زر و سیم کی غلام ہوئی

سکون رونقِ شعر و سخن تھی جس کے طفیل
وہ بزمِ شوق، زمانہ ہُوا، تمام ہوئی

سلطان سکون



کچھ اس ادا سے، کچھ ایسے ہنر سے اُترے گا
وہ ساری عمر نہ قلب و نظر سے اُترے گا

تو پھر یہ رنگِ سیہ کب نظر سے اُترے گا
اب اور کون سا سورج سحر سے اُترے گا

مرے خیال میں یہ انتہائے گریہ ہے
پھر اس کے بعد لہو چشمِ تر سے اُترے گا

مرا نگر کسی آسیب کی لپیٹ میں ہے
اب اس کا سایہ کسی دیدہ ور سے اُترے گا

ہمارے ضبط کی میعاد ختم کب ہو گی
ہمارے صبر کا پھل کب شجر سے اُترے گا

نجانے ختم ہو کب بے جہت سفر اپنا
نجانے بوجھ یہ کب اپنے سر سے اُترے گا

سکونؔ درد کا طوفاں ابھی بہاؤ میں ہے
یہ بوند بوند مری چشمِ تر سے اُترے گا



جب وہ تنہا کبھی ہوا ہو گا
یاد شاید مجھے کیا ہو گا

سوچتا ہوں، مری طرح وہ بھی
میرے بارے میں سوچتا ہو گا

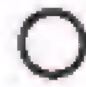
آہ بھر کر ہوں مطمئن ایسے
جیسے اُس نے بھی سُن لیا ہو گا

ایسے مُڑ مُڑ کے دیکھتا ہوں اُدھر
جیسے اب تک وہ دیکھتا ہو گا

ہم بھی کیا کیا نہیں جلے لیکن
وہ بھی کیا کیا نہیں بجھا ہو گا

ہیں یہ خوش فہمیاں سکونؔ اپنی
اُس نے سب کچھ بھلا دیا ہو گا

صبیحہ خاتون صبا



درست ہے کہ یہ دن رائیگاں نہیں گذرے
مگر سکوں سے تو، اے جانِ جاں نہیں گذرے

مزاجِ شہرِ جنوں! اب یہ برہمی کیسی
کس آگ سے ترے پیر و جواں نہیں گذرے

نظر سے دُور سہی پھر بھی کشتگانِ وفا
وہاں سے ہم تو یہ صدمے یہاں نہیں گذرے

مروّتاً وہ مری بات پوچھ کر چُپ ہیں
دگرنہ کب مرے شکوے گراں نہیں گذرے

سمندروں کی ہَوا، دُور دُور سے نہ گذر
وہاں کا حال سُنا، ہم جہاں نہیں گُذرے

ہجومِ کارِ جہاں ہو کہ دشتِ جاں کا سکوت
ترے فراق کے صدمے کہاں نہیں گذرے

ملے تو کیسے ملے قیسِ نیم جاں کا سراغ
کبھی اُدھر سے مرے سارباں نہیں گذرے

گزر گئے وہ جہاں سے، مگر یہ حسرت ہے
کوئی صباؔ سے یہ کہہ دے میاں[۱] نہیں گذرے



سانس لیتے ہوئے پھُولوں کا معطّر سایا
ایک مُدّت سے کہاں ایسا میسّر سایا

میری تقدیر تو ہے ہجر کی تپتی ہوئی دُھوپ
اور ہوں گے کہ ہُوا جن کا مقدّر سایا

گاہ مہکے مری یادوں میں گُلِ تر کی طرح
گاہ بادل کی طرح چھائے وہ بن کر سایا

تاکہ ہجرت کی کڑی دھوپ میں تنہائی نہ ہو
آ گیا ساتھ مرے گھر سے نکل کر سایا

میری کوتاہ قدی مجھ کو جتانے کے لئے
ہو گیا پھر مری قامت کے برابر سایا

وہ مرے شہر میں ٹھہرے بھی تو اتنا ٹھہرے
جیسے پرواز کے دوران زمیں پر سایا

اِن سکوں بخش فضاؤں سے خبردار اے دل!
کشتِ زرخیز کو کر جاتا ہے بنجر سایا

یہ ضروری تو نہیں نور سے روشن ہو وجود
کیسے معدوم ہُوا، ہو کے منوّر سایا

وقتِ رخصت جو مرا زادِ سفر ٹھہری تھیں
اُن دعاؤں کا کہاں اب مرے سر پہ سایا[۱]

اے صباؔ رشکِ بہاراں وہ شجر ٹھہرا ہے
سایۂ گل کے لئے جس نے سدا ترسایا

۱؎ والدِ محترم استید عبدالعزیز شمیم مرحوم
بحوالہ "آہستہ برگِ گل..." فنون لاہور

۱؎ بحوالہ آہستہ برگِ گل گذشتہ فنون، لاہور

صبیحہ خاتون صبا



(زمینِ غالب)

یہ سیلِ اشک مجھے گفتگو کی تاب تو دے
جو یہ کہوں کہ وفا کا مری حساب تو دے

بھری بہار رُتوں میں بھی خار لے آئی
یہ انتظار کی ٹہنی کبھی گلاب تو دے

نہیں نہیں، مَیں وفا سے کنارا کش تو نہیں
وہ دے رہا ہے مجھے ہجر کا عذاب تو دے

یہ خامشی تو قیامت کی جان لیوا ہے
وہ دل دُکھائے مگر بات کا جواب تو دے

ہر ایک واقعہ تاریخ وار لکھ جاؤں
گئے دنوں کی مرے ہاتھ وہ کتاب تو دے

یہ دیکھ کس گُلِ تر پہ نگاہ ٹھہری ہے
نہ دے وہ پھول مجھے، دادِ انتخاب تو دے

گناہ گار سہی، پھر بھی میرے حِصّے کا
تری طرف جو نکلتا ہے، وہ ثواب تو دے



اُس کی شباہت کسی شمس و قمر میں نہیں
ایک اُسے دیکھ کر، کوئی نظر میں نہیں

قاصدِ زہرہ مقام! کہہ اُسے میرا سلام
جس کا نشیمن مری راہگذر میں نہیں

کیا کششِ جذبِ دل، تجھ میں کمی ہے کہ وہ
محورِ سیارگاں، تیرے اثر میں نہیں

چشمِ ستارا شمار، کُشتۂ صد انتظار
دید کی کوئی نوید، انجمِ سحر میں نہیں

ہم جو دِکھاتے نہیں لالہ و گل کی طرح
یہ نہ سمجھنا کوئی داغ، جگر میں نہیں

سبز قبائے چمن، صرف فریبِ نظر
اُس کی کونپل، کسی شاخِ شجر میں نہیں

ایک تجھی کو صبا، کیوں ہے تھکن کا گلہ
موجۂ گل اور ہَوا، کون سفر میں نہیں

(نیویارک)

سیّد یٰسین قدرت



جنوں کا زخم آخر کار مہکا
یہ گل یعنی پسِ دیوار مہکا

شمیمِ یار کی تجسیم ہُوں میں
مرے سینے میں عکسِ یار مہکا

وُہ نکلا صبح کے خورشید کا پھول
نصیبِ کوچہ و بازار مہکا

فقط حق بات کا مُجرم تھا وہ شخص
وہ جب جھُولا، فرازِ دار مہکا

شبوں کے آخری پہروں میں قدرت
ستارہ سا بہ نوکِ خار مہکا



وہ جو خالق تھا، وہ کیوں کر مٹ گیا
بُت رہے محفوظ، آزر مٹ گیا

آندھیاں چاروں طرف چلنے لگیں
اور نقشِ پائے رہبر مٹ گیا

ثابت و سالم سہی میرا وجود
کچھُ نہ کچھُ تو میرے اندر مٹ گیا

درد کا سیلاب لے ڈوبا مجھُے
ساتھ ہی یادوں کا دفتر مٹ گیا

مَیں تو اتنا جانتا ہُوں اہلِ شہر!
زلزلہ آیا، مرا گھر مٹ گیا

خلد سے نکلا تو دُنیا بل گئی
آدمی یعنی مکرّر مٹ گیا

سید عطا جالندھری



سحر کے رُوپ سے اندازۂ صبا نہ لگے
حصارِ شب میں اجالوں کا کچھ پتہ نہ لگے

حیات بھر کا سفر جس کی ہمرہی میں کٹا
یہ کیا غضب ہے کہ وہ شخص آشنا نہ لگے

وہ سادگی میں ہی مجھ کو عظیم لگتا ہے
"خدا کرے کہ اُسے شہر کی ہوا نہ لگے"

فضائے دہر پہ کیسی ہے بے حسی طاری
کہ سانحہ جو گذر جائے، سانحہ نہ لگے

میں معرفت کے عطاؔ آج اُس مقام پہ ہوں
وہ میری ذات سے مجھ کو کبھی جُدا نہ لگے

(برنگھم)

محیط اسماعیل



اندھیری راہوں میں تم ملو گے، نہ ہم ملیں گے
غبار چھٹ جائے گا تو نقشِ قدم ملیں گے

نکل تو آئے تھے دُور زخموں کے شہر سے ہم
کسے خبر تھی، یہاں بھی اہلِ کرم ملیں گے

ترے لیئے اے خزاں! وہ گل ہوں کہ خار و خس ہوں
حروفِ خوش آمدید سب پر رقم ملیں گے

محیطؔ جیتے نہ ہم ضرورت سے کچھ زیادہ
اگر سمجھتے کہ وہ ضرورت سے کم ملیں گے

شبنم شکیل



غم مجھے اُس کی جدائی کا کہاں تھا پہلے
دُور تھا پر وہ قریبِ رگِ جاں تھا پہلے

اب تو آ پہنچے کئی اور بھی دشوار مقام
اُس کی چاہت میں فقط جی کا زیاں تھا پہلے

وقت کی گرد نے دھندلا دیئے سب نقش و نگار
ورنہ دِل ایک دھنک رنگ مکاں تھا پہلے

ہر خوشی میں کوئی غم یاد دلا دیتا ہے
دل کا یہ رُخ مری آنکھوں سے نہاں تھا پہلے

مُڑ کے تکنے سے ہوا اپنا سفر اور کٹھن
وہ پکارے گا ہمیں، کب یہ گماں تھا پہلے

ہر چُبھن دل کی یہ کہتی ہے کہ وہ اک کانٹا
آج تک ہے وہیں موجود، جہاں تھا پہلے



یوں زیست ایسی بے سر و ساماں تو یاں نہ تھی
جس کو جہاں پہ ہونا تھا وہ شے وہاں نہ تھی

صورت گروں میں اہلِ ہنر کم نہ تھے مگر
کرتے تھے جس کو نقش وہ صورت عیاں نہ تھی

دشتِ وفا میں راہ نوردوں کے پاؤں کی
مٹی تھی، دے رہی تھی جو لَو — کہکشاں نہ تھی

حیرت ہے، جس کا دل میں ترازو ہوا تھا تیر
تھی اور ہی کسی کی، وہ اس کی کماں نہ تھی

عائد تھیں یا تو حرفِ تمنا پہ قدغنیں
یا پھر غریب شہر کے منہ میں زباں نہ تھی

شاھد واسطی

○

چمک دمک کو اگر تو نے معتبر جانا
تو اِس کا نام ہے سچائی سے گزر جانا

یہ طے ہُوا کہ اسیری ترا مقدر ہے
تری نظر نے جہاں دام کو شجر جانا

یہ کام اور کسی کا نہیں ہے تیرے سوا
مرے وجود میں چنگاریوں کا بھر جانا

جہاں ہُوا تھا تصادم کسی سے نظروں کا
کبھی کبھار اُسی راہ سے گزر جانا

عجب نہیں کہ نئے دوریوں کا باعث ہو
تری نظر کا مجھے پاش پاش کر جانا

بہت عظیم عطیہ ہے حُسنِ فطرت کا
لہو میں شعر کی لذت حلول کر جانا

تعلقات کشیدہ کئے تھے کیوں شاہد
بہت محال ہوا ہے اب اس کے گھر جانا

○

چمکتی چیز پر للچا رہا ہُوں
بہت کمزور ہوتا جا رہا ہُوں

بہت ننھی سی چنگاری ہے جسکو
لہو کی آگ سے بھڑکا رہا ہُوں

مرے اندر اندھیروں کا نگر ہے
مگر میں روشنی پھیلا رہا ہُوں

کبھی راہی خودی کی منزلوں کا
کبھی اپنا ہی نقشِ پا رہا ہُوں

بہت مضبوط لگتا ہوں بظاہر
مگر اندر سے ٹوٹا جا رہا ہُوں

فلک نے اس طرح پھینکا ہے شاہد
ڈھلانوں سے لڑھکتا جا رہا ہُوں

سید گلزار بخاری



تری ابتدا کوئی اور تھی، تری انتہا کوئی اور ہے
تری بات ہم سے ہوئی تو کیا، ترا مدعا کوئی اور ہے

یہ جو دوریوں کی فصیل ہے، تری سمت سے ہے اٹھی ہوئی
ہمیں کس طرح یہ گماں ہو، ستم آزما کوئی اور ہے

ہمیں شوق تھا بڑی دیر سے کہ ترے شریکِ سفر بنیں
ترے ساتھ چل کے خبر ہوئی، ترا راستا کوئی اور ہے

تجھے فکر ہے کہ بدل دیا ہمیں گردشِ شب و روز نے
کبھی خود سے بھی یہ سوال کر، وہی تو ہے یا کوئی اور ہے

ترے ارد گرد بھی ہیں وہی جو ترے عدو کی صفوں میں تھے
ہمیں تجھ سے اور امید تھی، یہاں ماجرا کوئی اور ہے

کسی اور عصر کے لوگ تھے جنھیں رسم و راہ کا پاس تھا
یہ فضا جو رشتۂ درد سے نہیں آشنا، کوئی اور ہے

کسی مدح گر کو طلب کرو جسے مصلحت کا خیال ہو
تمھیں کیا بخاری سادہ سے، یہ غزل سرا کوئی اور ہے



تو نے یہی چنا ہے تو یہ رنگ ہی سہی
اچھا، مفاہمت نہ سہی، جنگ ہی سہی

ہم بھی تو کانچ کے نہیں، کیوں ٹوٹ جائینگے
ہر ہاتھ میں ہمارے لیے سنگ ہی سہی

احسان مندِ خاک نشیں کب ہوئے ترے
تجھ کو غرورِ افسر و اورنگ ہی سہی

ہم کیا کریں کہ اور کوئی راستا نہیں
ترکِ تعلقات پہ جی دنگ ہی سہی

تیر و کماں اگر ہیں پرانے تو کیا ہوا
صید انگنی کا آج نیا ڈھنگ ہی سہی

تیری تو لے درست ہے پھر تجھ کو فکر کیوں
سازِ سخن مرا غلط آہنگ ہی سہی

پرواز کے لیے ہیں کھلے آسماں بہت
گلزار اک چمن کی فضا تنگ ہی سہی

عطاء الرحمٰن جمیل



تو جس سے گریزاں ہے تماشا تو وہی ہے
کچھ کچھ جو نظر آئی ہے دنیا تو وہی ہے

وہ حرفِ گلہ جو مرے لب تک نہیں آتا
اکثر تری نظروں کا تقاضا تو وہی ہے

دنیا میں حسیں بھی ہیں، ستمگر بھی بہت ہیں
دل جس کا طلب گار ہے، ایسا تو وہی ہے

ڈرتا ہوں تھکن سے کہ یہ کچھ اور بڑھے گی
ورنہ دلِ برباد تمنا تو وہی ہے

تنہا وہ نہیں سب کی نگاہیں نہیں جس پر
سب جس کی نگاہوں میں ہے تنہا تو وہی ہے

کر دیکھیں جمیلؔ آپ بھی اپنی سی جو چاہیں
لکھا ہے مقدر میں جو، ہونا تو وہی ہے



گزرے ہوئے دن یاد دلانے کے لیے آئے
رونے کے لیے آئے، رلانے کے لیے آئے

ٹوٹا نہ کیا وقت نے پیمانِ وفا کا
پیمانِ وفا بھول نہ جانے کے لیے آئے

دنیا ہے یہاں کوئی کسی کا نہیں ہوتا
یہ بات غلط ہے، یہ بتانے کے لیے آئے

گھر اس کا ہے، صرف اس کا ہے، ویراں ہو کہ آباد
بسنے کے لیے آئے، بسانے کے لیے آئے

آنکھوں کی بڑی چاہ، بڑی مانگ، بڑی پیاس
آنکھوں کی بڑی پیاس بجھانے کے لیے آئے

جس ہاتھ کا اک لمس ہے پروانے کو شعلہ
وہ ہاتھ مری سمت بڑھانے کے لیے آئے

لائے ترا پیغام نسیمِ سحری روز
تو بھی تو کبھی مجھ کو جگانے کے لیے آئے

روشن ہے جمیلؔ اس کے تصور سے شبِ ہجر
ہر رات نئی شمع جلانے کے لیے آئے

(ڈھاکا)

عرشی زادہ



"سانولا رنگ کشیدہ قامت، نہ پری ہے نہ کوئی حُور ہے وُہ"
جانے کیا بات ہے پھر بھی ایسی راحتِ خاطرِ رنجور ہے وُہ

رنگ و نکہت ہی نہیں ہے ہر شے چشم و ابرو ہی نہیں ہیں سب کچھ
کچھ تو ہے اُس میں مگر سب سے جُدا، کچھ تو ہے اتنی جو بھرپُور ہے وُہ

نہ تو وُہ مجھ کو بھلا پائے گی اور نہ مَیں اُس کو بُھلا سکتا ہُوں
اُس کی ہر سوچ میں شامل ہُوں میں، میری ہر بات میں مذکور ہے وُہ

اُس دل کی ہو کہ آنکھوں کی ہو پیاس یہ جو پُوری ہو تو وہ کیوں نہ بُجھے
ہے مرے دل کی جو دھڑکن میں شریک، کیوں مری نظروں سے مستور ہے وُہ

کچھ زمانے سے الگ تو نہیں ہم، وہی محرومی وہی موسمِ ہجر
عشق کا جیسے مقدر میں ہوں، حُسن کا ویسے ہی دستور ہے وُہ

جانے کیا کچھ نہ سہی ہے اُس نے، جانے کیا کچھ نہیں گزرا مجھ پر
خستگی سے مَیں اِدھر درماندہ، اور شکستوں سے اُدھر چُور ہے وُہ

میرے مرنے کی خبر بھی اُس کو، اب خُدا جانے ملے یا نہ ملے
کیسی یہ وقت کی بیدردی ہے، کیا ستم ہے کہ جو یُوں دُور ہے وُہ

کون الزام لگاتے کس پر، کون ٹھہراتے خطا وار کسے
اپنے حالات سے مجبُور تھا میں، اپنے حالات سے مجبُور ہے وُہ

(رام پور)

پروفیسر ذکا صدیقی



کہیں خیال بھی پیکر دکھائی دیتا ہے
یہ خواب مجھ کو ہی کیوں کر دکھائی دیتا ہے

ہماری پیاس نے ہم کو کہاں ڈبویا ہے
جہاں سراب سمندر دکھائی دیتا ہے

تمہارے شہر میں کوئی گناہ گار نہیں
سبھی کے ہاتھ میں پتّھر دکھائی دیتا ہے

یہ کون شخص ہے، یہ کس قدر اکیلا ہے
یہ شخص بھیڑ میں اکثر دکھائی دیتا ہے

وہ کون تھا کہ جسے اپنی جستجو تھی کبھی
فرازِ دار پہ اِک سر دکھائی دیتا ہے

(سعودی عرب)

آصف ثاقب



بغیر موجوں کی سازشوں کے بھنور ادھورا ہی رہ گیا ہے
ہماری بوسیدہ کشتیوں کا سفر ادھورا ہی رہ گیا ہے

نہیں جوانوں کے جمگھٹے بھی، نہیں بزرگوں کی محفلیں بھی
نہیں وہ چوپال کے تماشے، نگر ادھورا ہی رہ گیا ہے

گھٹا میں آنسو رکا ہوا ہے، ہوا میں سسکی تھمی ہوئی ہے
محبتوں میں خلوصِ دل کا اثر ادھورا ہی رہ گیا ہے

اٹھان پوری نہ ہونے دی تھی سروں کے سائے کی آندھیوں نے
نہ کوئی پتا نہ کوئی کونپل، شجر ادھورا ہی رہ گیا ہے

لکیریں کیسی ہیں آڑی ترچھی، نہ کوئی نقشہ نہ کوئی صورت
ہماری بے جان انگلیوں کا ہنر ادھورا ہی رہ گیا ہے



گلاب عکس ہے آنسو کی رونمائی کا
عذاب لگتا ہے موسم تری جدائی کا

تمام وار عدو کے، بدن سے دور رہے
لگا جو سر پہ، وہ پتھر تھا اپنے بھائی کا

سمیٹ لے گا کسی دن یہ چاند آنگن سے
کوئی بھروسہ نہیں روشنی پرائی کا

کھلا ہے گھر تو غریبوں کو کیا جسارت ہو
کہ تیرے در پہ تو پہرا ہے نارسائی کا

سروں کی فصل اچانک ہی پک گئی ثاقب
جب اتفاق سے موسم بھی تھا کٹائی کا

اسلام عظمی



اک سلسلۂ نام و انا ساتھ رہے گا
کیسی بھی ہوا ہو، یہ دیا ساتھ رہے گا

شب چھین تو سکتی ہے بصارت مری مجھ سے
لیکن یہ دلِ عکس نما ساتھ رہے گا

جب اور ہی دنیا پسِ دیوارِ سفر ہے
کس طرح سے پھر حرفِ وفا ساتھ رہے گا

اس عرضِ تمنا میں جو کھویا ہے سو کھویا
بس وہ جو ترے دَر سے مِلا ساتھ رہے گا

اب ہوگی مخل کوئی بھی آہٹ نہ کوئی چاپ
اچھا ہے اگر شورِ ہوا ساتھ رہے گا

یہ سوچ کے شدت سے تجھے یاد کیا ہے
تو بھی نہ رہا ساتھ تو کیا ساتھ رہے گا

اک پل کو بھی، تنہا نہ رہے گا کبھی عظمی
جائے گا جہاں، دشتِ وفا ساتھ رہے گا



سنگ آتا ہے کوئی جب مرے سر کی جانب
دیکھ لیتا ہوں میں پھلدار شجر کی جانب

اس مسافت کا کوئی انت نہیں ہے پھر بھی
دن نکلتے ہی میں چل پڑتا ہوں گھر کی جانب

کس نے آواز مجھے ساحلِ جاں سے دی ہے
کشتیٔ دل کہ لپکتی ہے بھنور کی جانب

عین ممکن ہے کہ ہوتا نہ کوئی بھی پتھر
تو نے دیکھا ہی نہیں مڑ کے نگر کی جانب

پھر سے انگاروں کا موسم مرے مَن میں اُترا
پھر بڑھا ہاتھ مرا لعل و گہر کی جانب

یہ جو ہے صورتِ حالات، بدل سکتی ہے
پر نہیں جانا مجھے خیر سے شر کی جانب

وقت دستور سے لاعلم وہی تھے عظمی
جبر موسم میں جو تھے اہلِ خبر کی جانب

(دبئی)

(ڈاکٹر) اسعد بدایونی

○

بچھڑ کے تجھ سے کسی دوسرے پہ مرنا ہے
یہ تجربہ بھی اسی زندگی میں کرنا ہے

میں منظروں کے گھنے پن سے خوف کھاتا ہوں
فنا کو دستِ محبت یہاں بھی دھرنا ہے

ہوا درختوں سے کہتی ہے دُکھ کے لہجے میں
ابھی مجھے کئی صحراؤں سے گزرنا ہے

تلاشِ رزق میں دریا کے پنچھیوں کی طرح
تمام عمر مجھے ڈوبنا اُبھرنا ہے

اداسیوں کے خدوخال سے جو واقف ہو
اک ایسے شخص کو اکثر تلاش کرنا ہے

○

سچ بول کے بچنے کی روایت نہیں کوئی
اور مجھ کو شہادت کی ضرورت نہیں کوئی

میں رزق کی آواز پہ لبیک کہوں گا
ہاں مجھ کو زمینوں سے محبت نہیں کوئی

میرے بھی کئی خواب تھے میرے بھی کئی عزم
حالات سے انکار کی صورت نہیں کوئی

میں جس کے لیے سارے زمانے سے خفا تھا
اب یوں ہے کہ اُس نام سے نسبت نہیں کوئی

لہجہ ہے مرا تلخ، مرے وار ہیں بھرپور
لیکن مرے سینے میں کدورت نہیں کوئی

(علی گڑھ)

ڈاکٹر سعید اختر دُرانی



(نذرِ غالب)

نغمے ہمارے زمزمۂ ناشنیدہ ہیں
"ہم عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہیں"

جو دہر بے نمود ہیں، اُن کی تلاش کر
یہ کہکشائیں کب سے مری چشم دیدہ ہیں

ہیں لامکاں میں یوں مرے افکارِ محوِ سیر
گویا غزالِ دشتِ ازل میں رمیدہ ہیں

شبنم ہمیں نہ جان، کہ ہیں آسماں نژاد
مژگانِ نجمِ صبح کے اشکِ چکیدہ ہیں

تخلیق کے اُفق پہ ہے انسان ماہِ نو
ہم جوہرِ حیات کی تیغِ کشیدہ ہیں

ہم جاودانِ عشق ہیں تریاق سے غنی
آبِ حیات و زہرِ ہلاہل چشیدہ ہیں

یہ اخترانِ کہنہ نہیں ہیں ہمیں قبول
دامن میں اپنے پھول فقط چیدہ چیدہ ہیں

(برمنگھم، برطانیہ)

انجم یوسف زئی



میں چنگاری کی صورت جب راکھ ہوا
میں نے جو کچھ پایا، وہ سب راکھ ہوا

دُکھ تو میں نے جھیلے، ہمت کب ہاری
سونا آگ میں تپ کر بھی کب راکھ ہوا

کونپل کونپل میں نے خواب لکھا لیکن
پھر بھی ایسا لگتا ہے، اب راکھ ہوا

شعلوں سے پروانہ کب جل سکتا ہے
اندر باہر آگ لگی، تب راکھ ہوا

انجمؔ میرا رب تو دائم و قائم ہے
جن کا جھوٹا تھا، اُن کا رب راکھ ہوا

خالد طوُر



دل میں کہیں پڑی تھی وہ تمنا چھپی ہوئی
جس نے اُجاڑ دی مری دنیا بسی ہوئی

آنکھوں میں ان دنوں بھی خلش انتظار کی
مانندِ نارسیدہ نظر ہے کھنچی ہوئی

ظلمت کدہ بدن تھا، نظر بے چراغ تھی
اک عمر دل جلا تو ذرا روشنی ہوئی

وہ دن بھی تھے کہ حسنِ تمازت نظر میں تھا
رہتی تھی سر پہ دھوپ کی چادر تنی ہوئی



اپنا وجود آئینہ ساماں دکھائیے
ہر کم نظر کو جلوۂ جاناں دکھائیے

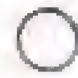
کثرت میں بوند بوند کو ترسی تمام عمر
دنیائے دُوں کو وحدتِ امکاں دکھائیے

باور تو ہو کہ دشت سمندر کا رُوپ تھے
آنکھوں کی پتلیوں میں بیاباں دکھائیے

دل کی ہر ایک ضرب ہے سانسوں کی بازگشت
اب کیا کسی کو خانۂ ویراں دکھائیے

خالدؔ سرابِ وعدۂ فردا گزر گیا
اب گردِ رہگزر کو فراواں دکھائیے

سیّد سجاد جلیل



اس دُنیا کے پیار میں جب بھی دھیان لگے
تیری یاد کا تیر سا دل پر آن لگے

کانچ کا شہر بسا کر لمبی تان کے سو
کون کہے کس سمت سے پتھر آن لگے

ہر چہرے پر فکر ہے، ہر دل میں ارمان
ہنستا بستا شہر ہے، کیوں ویران لگے

دل کی بات کو روک کے ہر کوئی چُپ چاپ
پیچھے اس دیوار کے اک طوفان لگے

آیا نظر تو آکر دل میں بیٹھ گیا
کہنے کو تو عام سا اک انسان لگے



تو بھی میری طرح آشفتہ ہے ہرجائی بھی
بس یہی بات تری مجھ کو پسند آئی بھی

تجھ سے ملنا بھی عبادت ہے بچھڑنا بھی ثواب
یہ بھی برحق ہے، کہ ہے مُوجبِ رسوائی بھی

آئینوں میں ہے نئے عکس اُبھرنے کا خلل
چھن رہی ہے مری اس دور میں بینائی بھی

دل میں شہروں کے تمدن کا سا ہنگامہ ہے
کاٹتا ہے مجھے صحراؤں سی تنہائی بھی

اُس کی بے وجہ عنایت پہ بہت خوش تھا جلیل
پر طبیعت مری اک بار تو گھبرائی بھی

احمد ندیم قاسمی



عجب سُرور ملا ہے مجھے، دُعا کر کے
کہ مسکرایا خُدا بھی، ستارہ وا کر کے

گداگری بھی اِک اسلوبِ فن ہے، جب میں نے
اُسی کو مانگ لیا، اُس سے التجا کر کے

شبِ فراق کے ہر جبر کو شکست ہوئی
کہ میں نے صبح تو کر لی، خدا خدا کر کے

یہ سوچ کر کہ کبھی تو جواب آئے گا
میں اُس کے در پہ کھڑا رہ گیا صدا کر کے

یہ چارہ گر ہیں کہ اِک اجتماعِ بدذوقاں
وہ مجھ کو دیکھیں تری ذات سے جُدا کر کے

خدا بھی ان کو نہ بخشے تو لُطف آ جائے
جو اپنے آپ سے شرمندہ ہوں خطا کر کے

خود اپنی ذات پہ تو اعتماد پختہ ہوا
ندیمؔ یوں تو مجھے کیا ملا وفا کر کے

گلزار

زندگی اور فن میں حسن و خیر سے محبت کرنے والوں کے لیے گلزار کا نام نیا نہیں۔ گلزار کے ہاں ایک دلآویز اثبات سے زندگی اور شاعری کے سرے آپس میں پروئے جاتے ہیں اور کہانی فن سے سلولائیڈ پر منتقل ہوتے ہیں۔ خوشبو، میرا، آندھی، کوشش اور اجازت کے علاوہ بے شمار فلمیں اس صناعی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ان فلموں کی صورت میں گلزار نے نہ صرف مکمل فنی پارے تخلیق کیے ہیں بلکہ کہانی، گیت اور ہدایت کاری کے شعبوں میں نئی سمتیں، رویے اور معیار دیے ہیں۔ گلزار کی فلموں پر حسنِ تخلیق کی بہت گہری چھاپ ہے۔ اس کے باوجود کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ فلم ساز گلزار خالص ادبی سطح پر بھی ایک حساس اور جمال پرست شاعر ہیں اور ایک بہت باریک بین اور چابک دست کہانی کار۔ اس انکشاف کی نوشانے ہم دینہ ضلع جہلم کے تخلیق کار کو سلولائیڈ کی بھول بھلیوں سے نکال کر "فنون" کے صفحات تک لے آئے ہیں — اس اعتماد کے ساتھ کہ اعلیٰ ادبی ذوق رکھنے والے قارئین کے لیے یہ ملاقات تسکین بخش ہوگی۔ (ادارہ)

لمس

وہ ایک نمازی تھا، اس کو محرومیٔ بصارت کا غم نہیں تھا
وہ دونوں ہاتھوں میں لے کے قرآنِ پاک
اس کو لبوں پہ رکھتا تھا اور آنکھوں سے چومتا تھا
جھکا کے پیشانی، یوں عقیدت سے چھو رہا تھا
جو آیتیں پڑھ نہیں سکا، ان کا لمس محسوس کر رہا تھا
میں حیراں حیراں گزر رہا تھا
میں حیراں حیراں ٹھہر گیا ہوں

تمہارے ہاتھوں کو چوم کر، چھو کے اپنی آنکھوں سے آج میں نے
جو آیتیں پڑھ نہیں سکا ان کے لمس محسوس کر لیے ہیں

بے چاری کشتی

چوک سے چل کر، منڈی اور بازار سے ہو کر
لال گلی سے گزری ہے کاغذ کی کشتی
بارش کے لاوارث پانی پر بیٹھی بے چاری کشتی
شہر کی آوارہ گلیوں میں سہمی سہمی گھوم رہی ہے
پوچھ رہی ہے
ہر کشتی کا ساحل ہوتا ہے تو کیا میرا بھی کوئی ساحل ہوگا

بھولے بھالے اک بچے نے
بے معنی کو معنی دے کر
ردی کے کاغذ پر کیسا ظلم کیا ہے!

گلزار

خانہ بدوش

چار تنکے اُٹھا کے جنگل سے
ایک بالی اناج کی لے کر
چند قطرے ٹپکتے اشکوں کے
اور کچھ فاقے سوکھے ہونٹوں کے
مٹھی بھر اپنی قبر کی مٹّی
جھولی بھر آرزوؤں کا گارا
ایک تعمیر کی، لیے حسرت
تیرا خانہ بدوش بے چارہ
شہر میں دربدر بھٹکتا ہے
اک سہارے کی راہ تکتا ہے
تیرا کاندھا ملے تو سر ٹپکے

گھر

جو میری مانو تو تہہ کر دو عرض و طول، یارو!
سیمنٹو سڑکیں، پلیٹو راہیں
اکھاڑ دو مل کے شہر سارا
کہ اینٹ گارے سے گھر بنے ہیں نہ بن سکیں گے

پناہ مل جائے رُوح کو جس کا ہاتھ چھُو کر
اُسی ہتھیلی پہ گھر بنا لو
کہ گھر وہی ہے، جسے پناہ گاہ کہہ سکیں ہم
(تمھارے ہاتھوں میں، مَیں نے دیکھی تھی ایک اپنی لکیر ۔!
اپنی پناہ ـــــ ! جاناں !!)

گلزار

ہم سب بھاگ رہے تھے

ہم سب بھاگ رہے تھے
ریفیوجی تھے
ماں نے جتنے زیور تھے، سب پہن لئے تھے
باندھ لئے تھے ——
چھوٹی مجھ سے —— چھ ساون کی
دودھ پلا کے، خوب کھلا کے، ساتھ لیا تھا
میں نے اپنی ایک "بھمیری" اور اک "لاٹو"
پاجامے میں اُڑس لیا تھا ——
رات کی رات ہم گاؤں چھوڑ کے بھاگ رہے تھے
ریفیوجی تھے ——

آگ دھوئیں اور چیخ پکار کے جنگل سے گذرے تھے سارے
ہم سب کے سب کالے اندھے دھوئیں میں بھاگ رہے تھے
ہاتھ کسی آندھی کی آنتیں پھاڑ رہے تھے
آنکھیں اپنے جبڑے کھولے بھونک رہی تھیں
ماں نے دوڑتے دوڑتے خون کی قے کر دی تھی
جانے کب چھوٹی کا مجھ سے چھوٹا ہاتھ
وہیں اُسی دن پھینک آیا تھا اپنا بچپن ——

لیکن میں نے سرحد کے سناٹوں کے صحراؤں میں اکثر دیکھا ہے
ایک "بھمیری" اب بھی ناچا کرتی ہے
اور اک "لاٹو" اب بھی گھوما کرتا ہے ——!

گلزار

خواب کی دستک

صبح صبح اِک خواب کی دستک پر دروازہ کھولا، دیکھا
سرحد کے اُس پار سے کچھ مہمان آئے ہیں
آنکھوں سے مانوس تھے سارے
چہرے سارے سُنے سنائے
پاؤں دھوئے، ہاتھ دُھلائے
آنگن میں آسن لگوائے ——
اور تنوّر پہ مکّی کے کچھ موٹے موٹے روٹ پکائے
پوٹلی میں مہمان مرے
پچھلے سالوں کی فصلوں کا گڑ لائے تھے ۔

آنکھ کھُلی تو دیکھا گھر میں کوئی نہیں تھا
ہاتھ لگا کر دیکھا تو تنور ابھی تک بجھا نہیں تھا
اور ہونٹوں پر میٹھے گڑ کا ذائقہ اب تک چپک رہا تھا

خواب تھا شاید !
خواب ہی ہوگا !!
سرحد پر کل رات، سُنا ہے، چلی تھی گولی
سرحد پر کل رات، سنا ہے
کچھ خوابوں کا خون ہوا تھا !

گلزار

کیسا چپ چاپ!

بند شیشے ہیں، دریچوں میں کھلے منظر ہیں
سبز پیڑوں پہ، گھنی شاخوں پہ، اور پھولوں پر
کیسے چپ چاپ برستا ہے مسلسل پانی

کتنی مخلوق ہے! ہنگامے ہیں! آوازیں ہیں!
پھر بھی احساس کی اک سطح پہ، ہولے ہولے
کیسا چپ چاپ برستا ہے تصوّر تیرا

بہلاوا

کیسلی رات کے اِک ہاتھ پہ رکھ دی ہے میں نے
چاند کی مصری
وہ دن روٹھا ہوا تھا، دُھول میں لپٹا ہوا تھا
ایک مدّت سے
ترے آنچل سے چہرہ پونچھ کر، بہلا لیا اس کو
خفا تھا میں خود اپنے سے، اب اپنے ہی گلے سے
لگ کے بہلا ہوں
ترے غم کا نمک چکھ کر
بڑا میٹھا لگا ہے زندگی کا ذائقہ مجھ کو!

سن سیٹ بولیوارڈ ؁

گلزار

پوسٹ مارٹم کے وقت بھی، وہ وزننگ کارڈ لاش کی مٹھی میں بھنچا ہوا تھا۔ اُس روز بھی چارو جی، اپنے معمول کے مطابق صبح ساڑھے پانچ بجے اٹھ گئی تھیں لیکن معمول سے تھوڑی سی زیادہ، نسا ہک تھیں۔ صبح سیر کو جایا کرتی تھیں، ہمیشہ ہی اچھی طرح تیار ہو کر: بال، کنگھی ہلکا سا غازہ، تاکہ جلد پر عمر کی جھریاں ہوتے ہوئے بھی، بڑھاپے کے پھٹے ہوئے مسام نظر نہ آئیں۔ پوشاک تو ہمیشہ اُن کے مذاق اور سلیقے کا ثبوت دیتی تھی۔

رشوت سے ہمیشہ کہا کرتی تھیں "دیکھو آج بھی لوگ ہمیں دیکھتے ہیں تو کنکھیوں سے کھسر پھسر کرتے ہیں۔ اشارے کرتے ہیں کہ چارو لتا جا رہی ہیں۔ خود کے لئے نہ سہی، اپنے فینز (FANS) کے لئے ہمیں صحیح سلیقے سے رہنا چاہیئے۔"

رشوت ان کا خانساماں تھا۔

اس روز صبح جب وہ چائے کی ٹرے لے کر اُن کے سامنے گیا تو چارو جی آئینے کے سامنے کھڑی خود سے ہی کچھ بات کر رہی تھیں۔ ذرا سی جھینپ گئیں، رشوت مسکرا دیا۔ اس عمر میں بھی میڈم کی شرمانے کی ادا کمال تھی۔ اسی ادا نے نوجوانی میں لاکھوں پرستاروں کو جاں بحق کیا تھا۔

"رشوت کوئی گوپال داس مشرا آنے والے ہیں ہم سے ملنے: ذرا چائے ناشتے کا انتظام کر لینا۔"

"کون ہیں؟" ذرا تامل سے رشوت نے پوچھا۔

"کوئی رائٹر ہیں۔ ہم پر کتاب لکھنا چاہتے ہیں۔ اُن کا خط آیا تھا۔"

اُس روز چارو جی کی چال میں اُتساہ کچھ زیادہ تھا۔ فلم انڈسٹری سے ریٹائر ہونے کے اتنے سال بعد کسی کو تو اُس تمہا جان کا خیال آیا! شروع شروع میں بہت جرنلسٹ آیا کرتے تھے، اس دور دراز کے بنگلے پر، مہابلیشور روز روز کون آتا ہے؟ اور چارو لتا بھی بہت سال اپنے ایک "کم بیک" کی امید پر جیتی رہیں۔ پھر آہستہ آہستہ یہ آمد و رفت کم ہو گئی ــــ کچھ عمر رسیدہ کرداروں کے رول بھی پیش ہوئے انھیں لیکن، بوڑھوں کے رول چارو جی نے منظور نہ کئے۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر، ٹھوڑی اونچی کر کے، اکثر دیکھا تھا خود کو، گردن پر کوئی سلوٹ نہیں تھی، عمر کا کوئی نشان نظر نہ آیا! ــــ خود سے کچھ مکالمے بھی ہوئے۔ عکس نے کبھی نہ بتایا کہ "تمہاری عمر ہو گئی ہے۔" یہ عکس صرف فلموں میں بولتے ہیں۔

ہاں ڈاکٹر صاحبنی نے ضرور کہا تھا، پہلے ہارٹ ..... ہارٹ پروبلم کے بعد: "دیکھو، تمہارا دل اب اتنا سب نہیں سہہ سکتا جتنا بوجھ اُس پر ڈالتی ہو، کسی دن کھڑے کھڑے فیوز اُڑ جائے گا۔"

"سنگھ صاحب ہوتے تو شاید ...."

رشوت نے خبر دی مشرا جی آئے ہیں۔

"اِیں؟ ــــ ہاں..... مشرا جی؟" انتظار کے باوجود چارو لتا نام سن کر چونک گئیں۔ "بٹھاؤ ــــ نیچے ہال میں بٹھاؤ ــــ صوفوں سے

غلاف اتار دیئے نا؟"

"جی میڈم!"

"اور شیڈ لیمپ، روشن کر دیا؟"

"جی میڈم۔"

رشوودت اپنے فرائض خوب سمجھتا تھا۔ وہ آج بھی میڈم کی دھاک جما کر رکھتا تھا لوگوں پر۔ کبھی کبھار کسی پرستار کا کوئی خط آجاتا تو وہ بازار میں دس جگہ ذکر کرتا۔

چارو جی نے نکلس پہنتے پہنتے محسوس کیا کہ اُن کی گردن کچھ دبی ہو گئی ہے گلو بند ہوتا تو یہ بھی چھپ جاتی لیکن اُسے بکے تو دو سال ہوئے تین ہزار کا لیا تھا کسی زمانے میں، اب بکا تیس ہزار کا! سنگھ صاحب ہوتے تو کبھی نہ بیچنے دیتے۔

چارو لتا جب سیڑھیوں سے اُتریں تو بالکل فلم کا کردار لگ رہی تھیں۔ ابھی آواز آئے گی "سٹارٹ ساؤنڈ—کیمرہ—"

مشرا جی، ہال میں لگے، پھر سنگ مرمر کے بتوں کو غور سے دیکھ رہے تھے، اُن کے ہاتھ میں پیڈ نما کاپی تھی جس میں شاید کچھ نوٹ بھی کر لیا تھا۔ چارو جی کو دیکھ کر، مشرا جی نے بڑے ادب سے نمسکار کیا۔

"تشریف رکھیے۔"

مشرا جی صوفے پر باادب بیٹھ گئے۔ بڑا اثر پڑتا تھا چارو جی کی شخصیت کا۔ بہت دیر تک مشرا جی کے منہ سے کوئی بات نہ نکلی۔ پیچھے سے رشوودت چائے کی ٹرے لے کر آگیا۔ دو طشتریوں میں کچھ میٹھا، کچھ نمکین۔ چارو جی نے چائے بنائی۔

"میرا پتہ کہاں سے ملا؟"

"گوئیل صاحب نے دیا۔ آپ کے منیجر ہیں نا بمبئی میں!"

"ہوں—! بہت اچھا انسان ہے گوئیل۔ بہت سال میرا کام سنبھالا ہے اُس نے، اب بھی وہی دیکھ ریکھ کرتا ہے—
چائے لیجیے—!"

پھر ایک وقفہ پڑتا ہوا بیچ سے گذر گیا۔ چارو جی خود ہی بولنے لگیں— "میں بہت تنہائی پسند ہوں، زیادہ کام کرنا کبھی پسند نہ تھا۔ اس وقت بھی زیادہ فلمیں نہیں کیں، جب دن رات پروڈیوسروں کا تانتا لگا رہتا تھا بس بھاگ کر یہیں آ چھپا کرتی تھی۔"

"میں آپ کا مکان دیکھ سکتا ہوں؟"

"ہاں، کیوں نہیں! تشریف لایئے—"

چارو جی اُنہیں ساتھ لے کر سنگ مرمر کے بتوں کے پاس رک گئیں۔ "اٹلی سے لائی تھی یہ جوڑی، بڑی مشکل ہوئی تھی، اسے صحیح سلامت یہاں لانے میں، کئی سال تو میرے بمبئی والے مکان میں رہے۔ آپ نے تو وہ، نہ دیکھا ہوگا؟"

"نہیں!" بڑا مختصر سا جواب تھا۔ لیکن مسکراہٹ کافی لمبی تھی۔

برآمدے سے گذرتے ہوئے، چارو جی نے بتایا: "بڑے شوق سے یہ مکان بنوایا تھا ہم نے، سنگھ صاحب سے بڑے جھگڑے ہوا کرتے تھے تب۔ کبھی پتھر کے چناؤ پر، کبھی لکڑی کے انتخاب میں۔ یہ ٹائلیں سنگھ صاحب بنگلور سے لائے تھے۔ مکان کا نام میں نے ایک انگریزی فلم سے رکھا تھا SUNSET BOULEVARD اور یہ...... یہ پنجرا...... جس میں کبھی کوئی پرندہ نہیں رکھا ہم نے۔ پتہ نہیں کیوں اٹھا لائے تھے۔ ایک روز وہ......" اور وہ زور زور سے ہنسنے لگیں جیسے کوئی سین کر رہی ہوں۔ ایک بار تو رشوودت نے بھی باہر جھانک کر دیکھا۔ اس طرح ہنستے تو کبھی نہیں دیکھا تھا میڈم کو۔ ہاں وہ زمانہ تھا جب فرد اور نیلا آجایا کرتی تھیں، اُن کی ہم عصر ہیروئنیں!

چارو لتا سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کہہ رہی تھیں ..... "وہ بس یہی کہتی تھی کو قید کر لو اس پنجرے میں ___ کہتے تو پھر وہ بھی سنگ مرمر کا بنوانا پڑے گا ___ سنگ مرمر بہت پسند ہے مجھے۔ اس پر ننگے پیر چلتے ہوئے بہت اچھا لگتا ہے مجھے۔ سنگھ صاحب کو .... یہ انہی کا پورٹریٹ ہے۔"

وہ قدآدم تصویر تھی سنگھ صاحب کی، اوپر کے برآمدے میں لگی۔ دونوں طرف شمعدان، شوبوت نے شمعیں جلا دی تھیں۔ وہ جانتا تھا میڈم وہاں ضرور جائیں گی۔

جپ چاپ کچھ دیر وہ ایک ٹک سنگھ صاحب کے چہرے کو دیکھتی رہیں پھر آہستہ سے دونوں برہنہ آنکھیں پونچھیں اور سر جھکا کے مڑ گئیں۔

مشرا جی پیچھے پیچھے چل رہے تھے اور وہ کہہ رہی تھیں "بڑی چھوٹی تھی ہماری شادی شدہ زندگی۔ صرف تین سال، چار مہینے اور اٹھارہ دن۔"

ایک بار پھر انھوں نے سسکی لی۔

شوبوت ہال سے ٹرے ہٹا چکا تھا۔

پان کے لیے ایک بار چارو جی نے آواز دی۔ جواب نہ پا کر سمجھ گئیں، باہر ہو گا باغ میں۔ یہ خاموشی کا وقفہ اب انہیں اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ مڑ کے مشرا جی سے کہا "آپ کو کچھ پوچھنا ہے؟"

"اس گھر کا رقبہ کتنا ہوگا؟"

چارو جی نے کچھ مبہم سی آنکھوں سے دیکھا مشرا جی کی طرف ___ "رقبہ؟"

"اور بلڈاپ ایریا؟"

چارو جی کچھ بجھ سی گئیں۔ دھیرے سے کہا "گوئیل کو معلوم ہوگا۔"

کوئی بات نہیں۔ میں گوئیل صاحب سے معلوم کر لوں گا۔" مشرا جی کھڑے ہو گئے۔

چارو لتا بھی صوفے کے بازوؤں پر پورا زور دے کر کھڑی ہو گئیں۔ "آپ کو گوئیل نے کس لئے بھیجا تھا؟"

یہ مکان دیکھنے کے لئے۔ کہا تھا شاید جلدی بیچنا پڑے! دیکھ کے رکھو۔ کوئی گاہک تیار ہو جائے تو ......"

"آپ کا نام؟" چارو لتا نے بڑی ترشی سے پوچھا۔

"دھیرج مشرا! پراپرٹی بروکر ہوں، پراپرٹی بیچنے خریدنے کی دلالی کرتا ہوں ___ " اس نے اپنا کارڈ سامنے کر دیا۔

اچانک اُن کا چہرہ لال سرخ ہو گیا۔ ایک بار چلانا چاہا لیکن ضبط کر گئیں گلے سے آواز نہیں نکلی، صرف ہاتھ کے جھٹکے سے اُسے باہر جانے کا اشارہ کیا۔

بروکر نے صفائی دینے کی کوشش کی "دیکھئے گوئیل صاحب نے آپ سے بات کرنے کے لئے منع کیا تھا۔ کہا تھا کہ شاید آپ کو ..."

"گیٹ آؤٹ ___ " اس مرتبہ چارو لتا چلائیں، لیکن آواز میں ایک خرخراہٹ سی آ کے رہ گئی۔

بروکر گھبرا کے فوراً ہی چل دیا۔

کارڈ ہاتھ میں لئے، چارو لتا اُسے باہر جانے تک دیکھتی رہیں، مڑ کے سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے ہی وہ لڑکھڑائیں، دل کا دورہ پڑا اور ....

پوسٹ مارٹم کے وقت بھی وہ وزٹنگ کارڈ لاش کی مٹھی میں بھنچا ہوا تھا ___ !

کس کی کہانی

گلزار

اتنا بھاری نام ہے اتّو کا! تب پتہ چلا جب سکول کے میگزین میں اُس کی کہانی چھپی۔ انل کمار چٹوپادھیائے! چھٹی جماعت ہی سے افسانہ نگار بننے کا شوق تھا اُسے۔ کہانیاں خوب سوجھتی تھیں۔ اور مجھے تو ہمیشہ سے یقین رہا ہے کہ شاعر یا ادیب ہونا کسی خدائی دین کی بات ہے، ورنہ ہر کوئی شاعر نہ ہو جاتا! اتّو میں وہ بات تھی جو بڑے بڑے فنکاروں کو پیدائشی ملتی ہے۔

ہم جب گلی ڈنڈا کھیل رہے ہوتے، تب بھی اتّو سب سے الگ بیٹھا کاپی میں کچھ لکھ رہا ہوتا یا سوچ رہا ہوتا۔ اور مجھے ہمیشہ یہ جاننے کی بے چینی لگی رہتی کہ اتّو کے دماغ میں کیا چل رہا ہوگا؟ — کیسے وہ خلا میں ایک کردار پیدا کرتا ہے اور اسے سامنے پڑے کاغذ پر اتار لیتا ہے۔ پھر وہ چلنے پھرنے لگتا ہے۔ اتّو جہاں جی چاہتا ہے، اُسے وہاں بھیج دیتا ہے۔ جو چاہے اُس سے کروا لیتا ہے اور جہاں جہاں سے وہ گزرتا ہے، کہانی کا ایک پلاٹ بنتا چلا جاتا ہے۔ واہ! یہ افسانہ نگار بھی کمال ہوتے ہیں۔ جسے چاہیں مار دیں جسے چاہیں زندگی دے دیں۔ یہ نا خدائی جیسی بات!

اتّو ہنسا! یہ کالج کے زمانے کی بات ہے: "ایسا نہیں ہے۔ میرے کردار من گھڑت نہیں ہیں اور وہ میرے بس میں بھی نہیں ہیں بلکہ میں اُن کے بس میں رہتا ہوں!"

اتّو اب بات بھی رائٹرز کی طرح کرتا تھا مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ اُس کی کہانی جب "پرتاب"، "ملاپ" یا "جنگ" کے سنڈے ایڈیشن میں چھپتی تو مجھے بڑا فخر محسوس ہوتا۔ میں نے اخبار ماں کو دکھایا: "یہ دیکھو — اتّو کی کہانی، انل کمار چٹوپادھیائے اسی کا نام ہے!"

"اچھا — سنا تو!"

میں نے کہانی پڑھ کے سنائی ماں کو۔ ایک غریب موچی کی کہانی تھی۔ ماں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ "ارے یہ تو اپنے ہی محلے کے بھیکو موچی کی کہانی ہے۔ اُس کی ماں کے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا!"

یہ مجھے بھی معلوم نہیں تھا۔ لیکن میں نے فوراً اتّو کے الفاظ دہرا دیئے: "اُس کی کہانیاں من گھڑت نہیں ہوتیں ماں۔ وہ کردار پیدا نہیں کرتا بلکہ اپنے ماحول سے کردار چنتا ہے۔ اُس کے لیے آنکھ اور کان ہی نہیں، سوچ اور سمجھ کی کھڑکیاں بھی کھلی رکھنی پڑتی ہیں!"

ماں بہت متاثر ہوئی۔ شاید میرے جملوں سے، جو اتّو کے تھے۔

گلی میں ایک بہت بڑا جامن کا پیڑ تھا۔ اُسی کے نیچے بیٹھا کرتا تھا بھیکو موچی! سارے محلے کی جوتیاں اُسی کے پاس آیا کرتی تھیں۔ اور اتّو کا تو وہ اڈا تھا۔ کپڑے چاہے کیسے بھی میلے کچیلے ہوں، "کھیڑیاں" خوب چمکا کے رکھتا تھا اتّو۔

بھیکو اپنے گھسیٹا کو جل کے انگوٹھے میں ٹانکا لگانا سکھا رہا تھا۔ میں نے جب بھیکو کی کہانی اُس کو سنائی تو اُس کا گلا رندھ گیا۔

"ہمارے دکھ درد اب آپ لوگ ہی تو سمجھو گے بیٹا۔ اب آپ نہیں جانو گے ہماری کہانی، تو اور کون جانے گا؟"

انّو کا رتبہ اُس دن سے میرے لئے اور بڑھ گیا۔ وہ سچ مچ پیدائشی ادیب تھا۔

کالج ختم ہوا اور میں دلّی چھوڑ کے بمبئی چلا آیا۔ میری نوکری لگ گئی تھی۔ اور انّو، اپنے بڑے بھائی کی "بیٹھک" پر اُن کا ہاتھ بٹانے لگا، جہاں سے وہ آیورویدا اور ہومیوپیتھی کی دوائیاں دیا کرتے تھے۔ کسی سرکاری دفتر میں نوکر تھے۔ لیکن صبح و شام دو دو گھنٹے اپنی بیٹھک میں یہ دواخانہ بھی چلاتے تھے۔ انّو کے لئے بہت سی نوکریوں کی سفارش کی لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔

میں ایک بار بہن کی شادی پر دلّی گیا تو اُن سے ملاقات ہوئی۔ بہت بیمار تھے مجھ سے کہنے لگے "تمہی کچھ سمجھاؤ انّو کو کچھ کام کاج کرے۔ یہ دنیا بھر کی کہانیاں لکھنے سے کیا ہوگا؟"

میں چپ رہا۔ وہ دیر تک سینے کا بلغم خالی کرتے رہے، پھر خود ہی بولے "وہ حرامزادی اُس کا پیچھا چھوڑ دے تو اُس کی مت ٹھکانے آجائے۔"

میں نے انّو سے پوچھا وہ حرامزادی کون ہے؟

بولا "افسانہ نگاری! بس اُسی کو گالیاں دیا کرتے ہیں بھائی صاحب، وہ سمجھتے نہیں۔ وہ جسمانی بیماریوں کا علاج کرتے ہیں۔ میں سماجی اور روحانی مریضوں کا علاج کرتا ہوں۔ میں سماج کے رِستے ہوئے ناسوروں پر اپنے افسانوں کے پھاہے رکھتا ہوں۔ اندھیرے میں بھٹکتے ہوئے مظلوم انسانوں کے لئے چراغ جلاتا ہوں۔ انھیں ذہنی غلامی کی زنجیریں کاٹنے کے ہتھیار فراہم کرتا ہوں ——"

میرا جی چاہا تالی بجا دوں۔ وہ بہت دیر تک بولتا رہا۔ اس نے بتایا اُس کی پہلی کتاب چھپنے کے لئے تیار ہے۔ ملک کے بڑے بڑے ادبی رسالوں میں اُس کی کہانیاں چھپ رہی ہیں۔ اکثر تقاضے آتے ہیں رسالوں سے لیکن وہ سب کے لئے لکھ نہیں پاتا۔ وہ ایک ناول بھی لکھ رہا ہے، لیکن "بیٹھک" سے اتنا وقت نہیں ملتا کہ وہ جلدی سے پورا کر سکے۔ بڑے بھائی بہت بیمار رہتے ہیں۔ اور اُن کے دو بچے! بے چارے! —— ان بچوں کو لے کر بھی وہ ایک کہانی سوچ رہا تھا!

اُس کی بات چیت میں اب بڑے بڑے مصنفوں کا ذکر آتا تھا۔ کچھ نام میں نے سنے ہوئے تھے۔ کچھ وہ بتا دیتا تھا۔ سعادت حسن منٹو احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی کے بعد "کافکا" اور "سارتر" کا ذکر میرے لئے بالکل نیا تھا۔ کچھ باتیں میرے سر کے اوپر سے گذر گئیں وہ کہانیوں کے پلاٹ بتایا کرتا تھا۔ اب وہ کافکا کی علامت نگاری اور سارتر کی وجودیت کی بات کر رہا تھا۔ مجھے لگا شاید کہانی کہیں پیچھے چھوٹ گئی لیکن انل کمار چٹوپادھیائے نے مجھے سمجھایا "کہانی صرف پلاٹ کے واقعات کی تفصیل اور اس سے پیدا ہونے والے کرداروں کے تعلقات کا ہی نام نہیں ہے، بلکہ ذہنی حادثات کے تاثرات بھی اپنے آپ میں ایک کہانی کو جنم دیتے ہیں اور اس کے جمالیاتی تاثرات کو ......"

بات میرے اوپر سے گذر رہی تھی لیکن میں اُس کے وزن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

انل ایک بار بمبئی آیا۔ کسی رائٹرز کانفرنس میں حصہ لینے۔ اُس کی چاروں دستخط شدہ کتابیں میں نے الماری سے نکال کر دکھائیں —— میں دوستوں کو یہ کتابیں دکھانے میں بڑا فخر محسوس کرتا تھا۔ اتنے بڑے ادیب کی کتابیں! اور اب وہ خود میرے ہاں رہ رہا تھا۔ میں نے بھائی صاحب کے دونوں بچوں والے افسانے کے بارے میں پوچھا۔ "وہ لکھا؟"

اس نے ایک افسوسناک خبر دی "بھائی صاحب گذر گئے، اور رشتے داروں نے مل کر اُن کی بیوہ پر چادر ڈال دی۔ مجھے

شادی کرنی پڑی۔ میں اب اُن دونوں بچوں کا باپ ہوں ـــــ"
پھر روز زرہ کر انل واپس چلا گیا۔
اب میں اُن کے بارے میں اکثر اخباروں میں بھی پڑھ لیا کرتا تھا۔ جب کوئی نئی کتاب چھپتی وہ مجھے ضرور بھیج دیتا۔
برسوں بعد ایک بار پھر دلّی جانا ہوا۔ میں اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔ اُس سے کہا تھا اپنے رائٹر دوست سے ضرور ملاؤں گا۔
اسی شام، جامن کے پیڑ کے نیچے، انل اپنی "کھڑیاں" پالش کرا رہا تھا۔ گھسیٹا سے ـــ اُس کا اڈا اب بھی وہی تھا۔ بات پھر چل نکلی افسانے کی!
"نئی کہانی کا سب سے بڑا مسئلہ حقیقت کا بدلتا ہوا تصور ہے۔ حقیقت صرف وہ نہیں جو دکھائی دیتی ہے بلکہ اصل حقیقت وہ ہے جو آنکھ سے نظر نہیں آتی۔ کہانی صرف ایک منطقی رشتے کا نام نہیں بلکہ اُس کیفیت کا نام ہے جو کردار کے تحت الشعور میں واقع ہو رہی ہے ـــــ"
میں منہ کھولے چپ چاپ سن رہا تھا۔
انل کہہ رہا تھا "پچھلے پچاس برسوں میں بڑی تبدیلی آئی ہے اردو افسانے میں۔ ہماری کہانی نے ان پچاس برسوں میں اتنی ترقی کی ہے کہ ہم اُسے آج دنیا کے کسی بھی ـــــ"
گھسیٹا نے چمکتی ہوئی "کھڑیاں" آگے کرتے ہوئے کہا۔ "کس کی کہانی کی بات کر رہے ہو بھائی صاحب؟ جن کی کہانی لکھتے ہو وہ تو وہیں کے وہیں پڑے ہیں۔ میں اپنے باپ کی جگہ بیٹھا ہوں اور آپ اپنے بھائی صاحب کی "بیٹھک" چلا رہے ہیں۔ ترقی کون سی کہانی نے کر لی ـــــ؟"
'کھڑیاں' دے کر گھسیٹا ایک چپل کے انگوٹھے کا ٹانکا لگانے میں مصروف ہو گیا ـــــ!

بازگشت

تسنیم سلیم چھتاری

نوری نے جب تک ہوش نہیں سنبھالا اسے جمعرات کے دن چڑھاوے کے بتاشوں کا صبح سے انتظار رہتا تھا اور پیر صاحب کے مزار پر جو لال پیلے کرن لگے ہوئے گز گز بھر کے ٹکڑے اُن کے عقیدت مند بطور چادر کے چڑھا جاتے تھے، اُن کا گھونگھٹ لگا کے وہ اپنے خیال میں بالکل دلہن بن جاتی تھی۔ پھر ایک دن یکایک اس کا ذہن جاگ اٹھا اور وہ بغاوت پر آمادہ ہوگئی۔ محلے کی ایک ہم عمر لڑکی نوری کی بہت پیاری سہیلی تھی۔ نوری کے گھر اکثر گھروں سے تیجے کے چنے اور دسویں بیسویں کا زردہ پلاؤ آجاتا تھا۔ جسے کھاتے وقت وہ اپنی سہیلی کو ضرور یاد رکھتی تھی۔ ایک دن جب شام ہونے کو آئی اور وہ سہیلی نہ گلی کوچے میں ملی نہ تالاب کے کنارے نظر آئی تو نوری نے اپنی ماں کی نظر بچا کر ایک رکابی میں تھوڑا سا زردہ نکالا اور کاغذ سے ڈھک کر اس کے گھر پہنچ گئی۔ وہ بے چاری صبح سے بخار میں پڑی تھی۔ نوری نے اس کے قریب جا کر رکابی سے کاغذ ہٹایا اور بڑے پیار سے کہا "دیکھ میں دوپہر سے تیرے لئے میٹھے چاول رکھے تجھے ڈھونڈ رہی تھی ـــــ"

اسی وقت اس لڑکی کی ماں باورچی خانے سے نکل کر آئی اور غصے سے پوچھا "نوری کیا ہے تیرے ہاتھ میں؟ کیا کھلا رہی ہے صابرہ کو......؟"

نوری نے گھبرا کر کہا "کچھ نہیں خالہ تھوڑا زردہ ہے، صابرہ کو بہت پسند ہے ...."

صابرہ کی ماں نے اور بھی بگڑ کر پوچھا "کہاں سے آیا زردہ ......؟"

نوری نے ہکلا کر کہا "پتہ نہیں ..... ابا کہیں سے دے گئے ہیں!"

اس مرتبہ صابرہ کی ماں اپنی بیٹی سے مخاطب ہوئی "دیکھ بے شرم میں پہلے ہی تجھ سے کہتی تھی کہ اس فقیر کی چھوکری کے ساتھ نہ کھیلا کر۔ اب شیخ ہو کر ہماری اوقات یہ رہ گئی ہے کہ مُردوں کے نام کا کھانا کھائیں ـــــ؟"

نوری نے حیرت اور خفگی سے آنکھیں پھاڑیں "خالہ ہم کیوں فقیر ہوتے۔ ہم کیا سڑک پر بھیک مانگتے ہیں؟"

صابرہ کی ماں نے بڑی حقارت سے کہا "تم سے تو سڑک پر بھیک مانگنے والے اچھے ہوتے ہیں ـــــ تمہاری تو ذات ہی فقیر ہے۔ قبر کھودنے اور مُردوں کو نہلانے والوں کا تو ہاتھ کا چھوا ہوا بھی کھانا منع ہے ـــــ"

نوری کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی ہی رہ گئیں۔ دل کی گہرائیوں سے چیخ اٹھی جو حلق تک پہنچ کر گھٹ گئی۔ شدید ذلت کے احساس نے اس کے ننھے سے وجود کو پارہ پارہ کر دیا اور زردہ کی پلیٹ اٹھا کر وہ تیزی سے اپنے گھر کی طرف بھاگی۔ اسے خوف تھا کہ جیسے کوئی راز کھل گیا ہے اور راستے میں جو بھی اسے دیکھے گا وہ زور زور سے فقیرنی فقیرنی کہہ کر چلائے گا۔ صابرہ کی ماں جھوٹی ہے ـــــ میں اپنی ماں سے جا کر شکایت کروں گی۔

ماں سے شکایت کا نتیجہ اور بھی بُرا نکلا۔ اس کی ماں نے نہ صرف اسے گالیاں دیں بلکہ دو ہاتھ بھی لگائے کہ "مُردی تو اس ستیاناسی کے گھر جاکے کیوں مرتی ہے۔ جب دیکھو گھر سے کھانا جُڑا کے اِدھر اُدھر بانٹتی پھرتی ہے۔"

نوری چپ تو ہوگئی مگر اس کے دل کی خلش بڑھتی گئی۔ صابرہ کی ماں نے اپنی بیٹی کو مولوی صاحب کے پاس پڑھنے کو بٹھا دیا اور اس کا نوری کے ساتھ گھومنا پھرنا بند ہوگیا۔ نوری نے اس عمل کو بھی اپنی ذلت سمجھا۔ اور اسے اپنے ماں باپ کے پیشے سے اور خود ان سے گھن آنے لگی۔

ایک مرتبہ اس کی ماں جب کئی گھنٹے بعد گاؤں کے ایک گھر سے لوٹی تو اپنی چادر میں لپٹے ہوئے کپڑوں میں ایک پھولدار ریشمین قمیص نکال کر نوری کو دکھائی۔ یہ قمیص گریبان سے لے کر دامن تک چاک تھی۔ نوری کی ماں نے خوش ہو کر کہا "دیکھ کیسی اچھی قمیص ہے۔ میں بانو کی مشین پر سلوا دوں گی پھر تو اسے عید پر پہننا۔"

نوری کو ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے تلووں میں آگ لگائی ہے اور شعلے بڑھ کر اس کے سراپا کو جھلس رہے ہیں۔ "میں پہنوں گی اس قمیص نو؟ اس مُردے کے اوپر سے اُتری ہوئی قمیص کو تو خود کیوں نہیں پہنتی اسے؟ تیرا بس چلے تو مُردے کا کفن بھی اتار کے مجھے پہنا دے۔" اور لپک کر نوری نے ماں کے ہاتھ سے وہ قمیص چھینی اور اسے تار تار کر دیا۔ ماں نے چولہے سے ادھ جلی لکڑی اٹھائی اور اسے دھمکایا تو نوری نے اور بھی جو منہ میں آیا بکنا شروع کیا۔ یوں بھی وہ گاؤں کی عام لڑکیوں کی طرح تڑتڑاق کرتی تھی مگر آج وہ اس طرح مقابلے پر آئی کہ اس کی ماں کو پلّو پھیلا کر اسے کوسنے کے سوا چارہ نہ رہا۔

نوری جوں جوں بڑی ہوتی گئی ماں باپ سے جھگڑا اور بہن بھائی کو پیٹنے کا سلسلہ بھی بڑھتا گیا۔ گھر کا ہر فرد اس سے نالاں ہوگیا۔

نوری کی ماں نے اپنی پڑوسن سے کہا "اب تم ہی بتاؤ آپا، یہ کمبخت کہتی ہے کہ ہم اپنا کام چھوڑ دیں، تو پھر ہم کیا کریں، فاقے کریں؟ اور جب باپ دادا کے زمانے سے ہم گاؤں کے مُردے ٹھکانے لگاتے آئے ہیں تو اب کام چھوڑ کر کیا ہماری ذات بدل جائے گی۔ یہ رہے گی تو فقیرنی کی فقیرنی۔ کوئی سیدزادی تو نہیں بن جائے گی۔"

نوری کی صورت شکل بُری نہیں تھی۔ عمر کے ساتھ ساتھ اس میں نکھار آ رہا تھا۔ آس پاس کے شہر اور گاؤں کے برادری والے پیغامات بھی بھیجنے لگے مگر نوری حیادار لڑکیوں کی طرح خاموش رہنے والی کہاں تھی۔ وہ فقیروں میں بیاہ کر جانے پر کسی طرح آمادہ نہیں تھی اور اس کے ماں باپ پر ایک ایک پل بھاری ہو رہا تھا۔ ماں بیٹی میں اچھی خاصی دشمنی شروع ہوگئی۔

اسی دوران میں نوری کی خالہ خورجہ سے آئی اور نوری کی ماں نے اسے اپنی پریشانی کا حال سنایا۔ پوری داستان سن کر اس نے کہا "تو مت فکر کر ــــ میں خود تجھ سے اس بارے میں بات کرنے والی تھی۔ تجھے تو پتہ ہے میرے سسر کے بڑے بھائی بیسیوں سال پہلے خورجہ چھوڑ کر فیروزآباد جا بسے تھے۔ وہاں کسی کو پتہ بھی نہیں کہ کیا ذات برادری ہے۔ لوگ انھیں "مرزا جی" کہتے ہیں مگر شادی بیاہ تو آخر اپنی ہی برادری میں ہوگا۔ آج کل وہ اپنے پوتے کا رشتہ تلاش کر رہے ہیں۔ لڑکا چوڑیوں کی فیکٹری میں کام کرتا ہے۔ نوری کے لئے یہ رشتہ بالکل ٹھیک رہے گا۔"

جب خالہ نے نوری کو یقین دلایا کہ فیروزآباد میں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی کہ نوری کے ماں باپ اپنے گاؤں میں کیا کرتے ہیں تو نوری نے شادی کے لئے حامی بھر دی اور پھر رخصت ہو کے فیروزآباد چلی گئی۔

یوں تو یہ تھا کہ نوری کے سسرال والے شیشے کی فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدور پیشہ لوگ تھے اور کوئی نوری کو

حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتا تھا مگر میکے میں ماں سے لڑ لڑ کر نوری کی زبان کھل چکی تھی، اور صبر اور برداشت کا مادہ مزاج میں شامل نہیں تھا، اس لئے جلد ہی ساس سے تو تو میں میں شروع ہو گئی۔

شادی کے سال بھر بعد نوری کے بیٹی پیدا ہوئی اور دوسرے سال لڑکا ہوا۔ ساس کو شکایت تھی کہ نوری محض اپنے بچوں میں لگی رہتی ہے۔ گھر میں جھاڑو برتن میں ہاتھ نہیں بٹاتی۔ نوری کے پاس ان الزامات کا ایک ہی جواب تھا "بڑھیا مجھ سے جلتی ہے۔"

وقت گزرتا گیا۔ اس دوران میں نوری کئی بار اپنے میکے آئی۔ مگر یہاں وہ مرزاجی کی بہو کے نام سے نہیں پکاری جاتی تھی۔ سب یہی کہتے کہ مجیدا فقیر کی لونڈیا سسرال سے آئی ہے۔" نوری کو اب بھی ان الفاظ سے چڑ ہوتی، اس لئے وہ کبھی دس پندرہ دن سے زیادہ نہ رکتی تھی۔ نوری کے دادا سسر تو اس کی شادی کے چند ماہ بعد ہی گزر گئے تھے مگر جب بس کے ایک حادثہ میں اس کے سسر کا انتقال ہو گیا تو دفعتاً اس کی ساس نے طے کیا کہ نوری سب کو کھا رہی ہے!! اب بڑھیا کا بیشتر وقت اپنے خاوند کی یاد میں رونے اور نوری کو بُرا بھلا کہنے میں گزرتا تھا اور نوری گلا پھاڑ پھاڑ کر پڑوسیوں کو سناتی کہ یہ کمبخت میری چوڑیوں کو دیکھ کر جلتی ہے۔ اس کا بس چلے تو میں بھی اسی کی طرح ہو جاؤں۔ نوری کا خاوند منظور طبعاً خاموش مزاج اور صلح پسند تھا۔ پھر اسے بچوں سے بھی محبت تھی۔ بڑا لڑکا تو اس کے ساتھ فیکٹری بھی چلا جاتا تھا اور بیٹی اس قابل ہو گئی تھی کہ جب وہ گھر آئے تو روٹی نکال کر اس کے سامنے رکھ دے، مگر چھوٹا بیٹا جو اب چھ سال کا ہو گیا تھا، ماں کے لاڈ پیار سے اس قدر بگڑ گیا تھا کہ مجال کہ اسکول کا رخ کرے۔ وہ صبح سے شام تک گلی کوچوں میں کھیلتا تھا اور گندی گالیاں بکتا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ سب سے چھوٹی اولاد ایک دائم المریض بیٹی تھی جو سال بھر کی ہونے کو آئی مگر ہر وقت پلنگ پر پڑی روتی رہتی تھی۔ نوری کے خاوند کے لئے گھر کا ماحول بڑا تکلیف دہ ہو رہا تھا۔ اس نے جب سے کمانا شروع کیا اپنے باپ کی طرح سارے پیسے ماں کے ہاتھ میں دیتا تھا مگر سسر کی موت کے بعد نوری نے قیامت ڈھا دی کہ بڑھیا کو کیا حق ہے جو اس پیسے کو ہاتھ لگائے۔ ماں اور بیوی کی اس جنگ میں منظور کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور ایک دن اس نے لاتوں اور گھونسوں سے نوری کی اچھی طرح سے مرمت کر دی ——— نوری کے لئے یہ تجربہ بالکل نیا تھا۔ منظور برا بھلا تو کہتا تھا مگر اس طرح مارتا نہیں تھا۔ پہلے تو نوری نے جی بھر کر ساس کو گالیاں دیں کہ یہ سب اس چڑیل کے علم سے ہوا ہے۔ اور پھر میاں کو گھر چھوڑنے کی دھمکی دی .... جب اس ارادہ پر منظور نے کوئی احتجاج نہیں کیا تو جوش میں نوری نے چاروں بچوں کو ساتھ لیا اور بس میں بیٹھ کر چھتاری پہنچ گئی۔ غصہ اور غم میں وہ یہ بھول گئی کہ مرزاجی کی بہو ہفتہ عشرہ کو ماں باپ سے ملنے نہیں آئی بلکہ مجیدا فقیر کی بیٹی سسرال سے چھوٹ کر میکے آ پڑی ہے ——— یہاں کا حال دیکھا کہ باپ بیمار رہنے لگا ہے۔ اب کسلے اور پھاوڑے چلانا اس کے بس کا کام نہیں رہا۔ جوان بھائی گھر سے بھاگ کر دلی چلا گیا ہے اور وہاں ٹیلر ماسٹر بن گیا ہے۔ نہ کبھی گھر آتا ہے نہ کوئی مالی امداد کرتا ہے اب تو پیر صاحب کے مزار پہ جاروب کشی سے جو تھوڑا بہت مل جائے اسی سے گزارا ہوتا ہے۔

ماں نے دو چار دن تو نوری کا غم سننے سے زیادہ اپنا دکھڑا سنانے میں گزارے، اور پھر یہ بات واضح کر دی کہ اس طرح چار بچے لے کر وہ میکے میں روٹیاں نہیں توڑ سکتی ——— نوری کو احساس ہوا کہ خاوند کا گھر چھوڑ کر اس نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ کیا وہ ذلت اٹھا کر واپس چلی جائے ——— ابھی وہ فیصلہ بھی نہ کر پائی تھی کہ ایک دن اور قیامت ٹوٹی ——— دوپہر کو اس کی بیٹی منی چھوٹی بچی کو کندھے سے لگائے دوڑتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی۔ "اماں، ابا آئے تھے ———"

"کہاں ہیں وہ؟"

"واپس چلے گئے اور منو کو بھی ساتھ لے گئے ——— ہم سب جہاں بس رکتی ہے وہاں کھیل رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ بیڑ

کے نیچے ابا کھڑے ہیں۔ انھوں نے منور کو بلایا اور کہنے لگے کہ میں تجھے لینے آیا ہوں۔ میرے ساتھ گھر چل۔ انوار بولا کہ میں بھی گھر جاؤں گا تو ابا کہنے لگے کہ میں تیری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا اور مجھ سے بولے کہ اپنی ماں سے کہہ دینا کہ میرے لئے وہ مر چکی ہے۔ اگر اس نے کبھی قدم بھی رکھا تو گولی سے ماردوں گا ——— اتنے میں بس آگئی اور ابا منور کا ہاتھ پکڑ کر بس میں چڑھ گئے۔

نوری نے کھڑے سے پچھاڑ کھائی اور چیخ کر رونے لگی۔ اس کی ماں نے اور بھی چیخ کر کہا "اے مُردی اب میری چھاتی پر مونگ دل ——— تجھ جیسی قطامہ کا دنیا میں گزارہ نہیں ہے۔ ہم فقیروں میں تیرا کیسے گزر ہوگا۔ تو تو مرزا جی کے محل میں سے بھی کالا منہ کرکے نکل آئی۔ اب کما اور کھلا اپنے پلّوں کو ———"

نوری کی زندگی کا یہ موڑ بڑا کربناک تھا۔ اس نے میکے یا سسرال میں کبھی مزدوری نہیں کی تھی اور نہ اس کا ڈھنگ آتا تھا۔ مگر اب کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ گاؤں کی عورتوں کے ساتھ وہ محنت مزدوری کے لئے جانے لگی۔ کبھی آلو بیننے کا کام ہے۔ کہیں دھان بنیا جا رہا ہے۔ کسی دن مکّہ کی نلائی ہو رہی ہے۔ نوری صبح سے شام ڈھلے تک کھیت کھلیانوں میں کام کرتی اور جب گھر لوٹتی تو گود کی سوکھی ہوئی بچی کو روتا ہوا اور ماں کو چیختا ہوا پاتی کہ "منّی ڈھینگ کی ڈھینگ ہو گئی ہے مگر اتنی تمیز نہیں کہ بہن کو سنبھال لے۔ یہ گو موت میں لتھڑی ہوئی دن رات میرے کانوں کے پردے پھاڑتی ہے۔ اس سے تو مر جائے تو پنڈ چھوٹے ———"

نوری کے بازو دن بھر کی مشقت سے پھوڑے کی طرح دکھتے اور ٹانگیں شل ہو جاتیں۔ اسے یہ بھی دھیان نہ رہتا کہ منّی سے پوچھے کہ صبح جانے سے پہلے جو منّی کو آٹھ آنے حلوائی کے یہاں سے دودھ لانے کو دے گئی تھی وہ دودھ بچی کے حلق سے اترا بھی یا نہیں۔ وہ مونج کی ٹوٹی چارپائی پر لیٹتی تو منور کا چہرہ کچھ دیر کو اس کے ذہن پر چھا جاتا۔ پتہ نہیں منور کیسے ہوگا۔ کبھی اپنی ماں کو یاد بھی کرتا ہوگا یا اپنے باپ اور دادی کے ساتھ خوش ہوگا۔ اور بچھڑے ہوئے بیٹے کی یاد بھی اس کے ذہن کو دیر تک بیدار نہ رکھ پاتی اور بے ہوشی جیسی نیند اس کے حواس پر چھا جاتی۔

ایک صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو برابر پڑی ہوئی بچی اس کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی، نوری کا دل تڑپ گیا "یہ کمبخت تو ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی ہے۔ آج شام کو مزدوری ملے گی تو اسے حکیم کو دکھا کر دوا لاؤں گی۔"

نوری کئی دن سے زمیندار کے کھلیان میں چنے پر سا رہی تھی، آج کام ختم کر کے شام کو مزدوری ملنا تھی۔ اس نے کندھا پکڑ کر منّی کو جگایا "اٹھ جا منحوس دن چڑھ آیا ہے۔ آج بھولا سے آٹھ آنے کا دودھ ادھار لے آنا۔ شام کو دے دوں گی۔ اس وقت پیسے نہیں ہیں۔"

تقریباً گیارہ بجے منّی دوڑتی ہوئی کھلیان میں پہنچی "اماں اماں بی بی مر گئی۔"

نوری نے چنوں سے بھرا ہوا چھبڑا سر سے اتار کر نیچے رکھ دیا "کیا بکتی ہے مُردی!"

"میں سچ کہہ رہی ہوں، میں سمجھی تھی کہ سو رہی ہے مگر نانی کہہ رہی ہے کہ مر گئی۔"

نوری خاموش کھڑی ٹکٹکی باندھے خلا میں دیکھ رہی تھی۔ منّی نے اسے جھنجوڑا "چل نا اماں نانی بلا رہی ہے۔"

نوری چونکی "کیا کروں وہاں جا کے ...... میرے پاس تو کفن کے پیسے بھی نہیں ہیں۔"

بچی کی موت نے ایک طرح گھر کے ہر فرد کا بوجھ ہلکا کر دیا مگر نوری کے دل میں غم سے زیادہ غصہ کا طوفان ابل پڑا۔ اسے منظور پر غصہ تھا جس نے اس بیمار بچی پر اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیا تھا۔ اپنی ماں پر غصہ تھا جو دن رات بچی کو گالی کوسنے دیتی تھی۔ اپنے اوپر انتہائی غصہ تھا کہ وہ کام سے لوٹ کر کبھی اس بدنصیب بچی کو گود میں لے کر پیار کرنے کی سکت بھی نہ پاتی تھی جس دن نوری کو مزدوری نہیں ملتی تھی۔ اس دن وہ دن بھر منّی اور انوار کو مارتی تھی، اپنی ماں سے لڑتی تھی اور مری ہوئی بچی اور بچھڑے ہوئے منور کو زور زور سے روتی

تھی۔ محلے اور پڑوس والے بھی اس ہنگامے سے نالاں ہو گئے تھے ـــــ ان کمبختوں کو نہ دن چین ہے نہ رات چین ہے۔ سارے گاؤں میں نحوست پھیلا رکھی ہے۔ اللہ ان سب کو غارت کرے۔"

منور کو اس کا باپ لے گیا۔ چھوٹی بچی کو اللہ پاک نے اس کے دکھ سے چھٹکارا دلا دیا۔ منی کو بھی دن بھر بیمار بہن کو کندھے پر لادے رہنے سے نجات مل گئی اور انوار نے سارے گاؤں میں آوارہ گردی، پتنگ اڑانے اور گولیاں کھیلنے میں وقت گزارنا شروع کر دیا۔ کئی مرتبہ یہ شکایت بھی آگئی کہ انوار نے محلے والوں سے پھل بھی اچک لئے ہیں اور حلوائی کی دکان سے مٹھائی چراتا بھی پکڑا گیا ہے۔ نوری آسمان کی طرف منہ اٹھا کر اور پلہ پھیلا کر کہتی "تجھے ڈھائی گھڑی کا ہیضہ آئے، تو مجھے چین سے مرنے بھی نہیں دے گا۔"

نوری کی ماں جہاں جاتی نوری کا رونا لے بیٹھتی "ہمارے تو نصیب پھوٹ گئے ہیں۔ اپنے کھانے کا ٹھکانا نہیں ہے۔ اب اس مسٹنڈی کو کہاں سے بھریں اور اس کے لونڈے نے تو ناک ہی کٹوا دی ہے۔ اب اس بڑھاپے میں چوری کا داغ بھی لگ گیا۔"

نتھو بڑھئی کی لڑکی حامدہ اپنے بھتیجے کے عقیقہ میں میکے آئی ہوئی تھی۔ اس نے کہا "چچی اس کا دوسرا کیوں نہیں کر دیتیں؟ ابھی تو جوان ہے۔"

"کون کرے گا اس سے؟" نوری کی ماں نے چڑ کر کہا۔ "کون سی کنواری ہے۔"

"خیر یہ بات تو نہیں، علی گڑھ میں جہاں ہمارا گھر ہے، وہیں کونے پر ایک پنواڑی ہے۔ رہنے والا تو کسی گاؤں کا ہے مگر بہت دن سے علی گڑھ میں دکان چلاتا ہے، خوب کمائی ہے۔ وہ خود کسی رانڈ بیوہ سے نکاح کرنا چاہتا ہے کہ دو روٹی پکا دے۔ پھر ساس نند کا بھی جھگڑا نہیں، اکیلا ہی رہتا ہے۔"

"کون برادری ہے؟"

"چچی اب برادری کنبے کو چھوڑو، شہروں میں کوئی نہیں پوچھتا ـــــ"

"کیا رنڈوا ہے؟"

"رنڈوا تو نہیں مگر پہلی بیوی چھوڑ رکھی ہے، شاید اولاد نہیں تھی۔ میں نے زیادہ تو سنا نہیں مگر آدمی اچھا ہے نوری کا ٹھکانا ہو جائے گا۔"

"تو پھر اللہ کا واسطہ تم بات چلاؤ اور نوری سے بھی کہو کہ دو کلمے بخش دے۔"

نوری کے سامنے جب حامدہ نے یہ بات چھیڑی تو نوری نے رو کر کہا "آپا تم مجھے یہاں سے لے جا کر بھاڑ میں بھی جھونک دو تو میں اُف نہ کروں گی مگر اب یہاں رہنا میرے لئے دوزخ سے بھی برا ہے۔"

پورا مہینہ بھی نہ گزرا ہو گا کہ نوری نے دوبارہ سرخ گوٹا اور کرن ٹکا ہوا جوڑا پہنا اور ہاتھوں میں ہری چوڑیاں پہن کر اپنے نئے خاوند ایوب کے ساتھ بس میں سوار ہو گئی۔ منی اور انوار بھی اس کے ساتھ چلے گئے۔

ایوب پنواڑی برا آدمی نہ تھا۔ نوری کے ساتھ محبت اور فراخ دلی سے پیش آتا تھا، مگر منی اور انوار کو اپنی اولاد ماننے پر کسی طرح آمادہ نہ تھا۔ منی کو خود بھی ایوب سے چڑ ہو گئی۔ اسے اپنا باپ منظور یاد آتا تھا جو کبھی کبھار فیکٹری سے لوٹتے وقت مٹھائی یا پھل لے کر گھر آتا تھا تو یہ ٹھیک ہے کہ منور کو زیادہ حصہ ملتا تھا مگر یہ بھی نہ تھا کہ علیحدہ بیوی کے ساتھ بیٹھ کر کھا پی لے اور منی محض خالی دونے اور چھلکے اٹھانے کو رہ جائے ـــــ یہ بات نوری کو بھی اچھی نہ لگتی تھی۔ مگر اب وہ کسی قیمت پر بھی خاوند سے جھگڑا کرنے پر آمادہ نہ تھی اور جبھی وہ پھیرا اور کڑکے کی طرح مزدوری کے تصور سے اس کا رونگٹا رونگٹا کانپتا تھا۔ ایوب کسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ مہینہ میں ایک بار دو چار دن کو گھر جاتا تھا مگر نہ کبھی اس نے نوری

کو ساتھ لے جانے کی خواہش کی اور نہ نوری کو کسی گاؤں میں قدم رکھنے کی حسرت تھی۔ آرام سے دو وقت کی روٹی نصیب ہو جاتی تھی۔

پورا سال بھی نہ گزرا ہوگا کہ نوری حاملہ ہو گئی۔ ایوب کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا بیوی کی خاطر مدارات بڑھ گئی کھٹی میٹھی چیزوں کے علاوہ وہ الائچی پڑے ہوئے پان بھی دکان سے لانے لگا اور جب نوری کا جی متلاتا وہ پان کا بیڑا منہ میں رکھ لیتی ــــ مُنّی کو سوتیلا باپ تو بُرا لگتا ہی تھا اب ماں سے بھی وہ خار کھانے لگی اور ماں کو جس طرح دادی نانی کے ساتھ گالی گلوچ کرتے سنا تھا خود بھی وہی عمل دہرانے لگی۔ نوری یوں تو ہر اعتبار سے خوش تھی مگر مُنّی کی جلی کٹی باتیں اور انوار کی غنڈہ گردی نے اس کا ناطقہ بند کر رکھا تھا ایوب سے کچھ کہنے کی ہمت نہ تھی اور بچوں کو مارتی تو وہ چیخ چلا کر سارا محلہ سر پر اُٹھا لیتے۔

بچے کی پیدائش کا وقت آیا تو ایوب نوری کو ہسپتال لے گیا۔ ایوب کی ایک رشتہ کی چچی علی گڑھ میں رہتی تھی۔ اسی نے نوری کو دلہن بنا کر گھر میں اتارا تھا۔ اور وہی زچہ بچہ کی دیکھ بھال کو ہسپتال ساتھ گئی۔

نوری کا یہ پانچواں بچہ تھا مگر اس کی پیدائش ہر بچہ کی پیدائش سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔ تین دن تک درد میں مبتلا رہنے کے بعد اس نے ایوب کے بیٹے کو جنم دیا۔ ایوب کے پاس ساری دنیا کی دولت آجاتی تو اس وقت سب لٹا دیتا۔ نوری کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کہیں کی ملکہ ہے اور ایوب اس کا زرخرید غلام ہے۔

ہسپتال سے گھر لوٹے تو ایوب نے کہہ سن کر چچی کو روک لیا کہ تھوڑے دن ہنڈیا روٹی کر دیں۔ نوری نے ٹھنڈے گرم پانی میں ہاتھ ڈالا تو کہیں بچے کو زکام نہ ہو جائے۔ نوری نے کسی زچگی میں اتنا اصلی گھی اور میوے نہیں کھائے تھے اور نہ کبھی ایسا بالائی پڑا دودھ پیا تھا جو اس مرتبہ نصیب ہوا۔ بچہ تین چار مہینہ کا ہوا تو پھول کر گیند ہو گیا اور نوری پر بھی وزن چڑھ گیا۔ دودھ تو اتنا تھا کہ جڑواں ہوتے تو بھی کم نہ پڑتا۔

نوری بے انتہا خوش تھی۔ بچہ بہت خوبصورت تھا۔ سب بچوں سے زیادہ خوبصورت تھا۔ اور نوری کو دیکھتے ہی کھل جاتا تھا۔ نوری گھنٹوں اسے گود میں لئے دیکھتی رہتی تھی۔ یہ منور کی طرح اسے چھوڑ کر نہیں جائے گا اور انوار کی طرح دل نہیں دکھائے گا۔

جب نوری ایوب کے ساتھ علی گڑھ آئی لوٹ کر چھتاری نہیں گئی تھی اور نہ ماں باپ نے پلٹ کر خبر لی تھی۔ اب ایک ساتھ اطلاع پہنچی کہ اس کے باپ کا انتقال ہو گیا ہے۔

ایوب نے کہا "جلدی سے سامان باندھو۔ دوپہر کی بس سے چلتے ہیں۔"

نوری جھجکی "اب جا کر کیا کروں گی۔ بچہ بہت چھوٹا ہے ــــ۔"

"بچے کا اللہ مالک ہے۔ پھر دنیا کیا کہے گی کہ باپ کے مرنے میں بھی نہیں آئی۔"

"تم ساتھ چلو گے؟ میں وہاں زیادہ نہیں رکوں گی ــــ۔"

"ہاں ہاں میں بھی چلوں گا۔ وہ آخر میرے سسر تھے۔"

نوری نے جلدی جلدی سامان باندھا اور بچوں کو لے کر بس سے چل دی۔ ایوب بھی ساتھ تھا۔ نوری کو ایک ساتھ مرنے والے باپ کا چہرہ یاد آیا اور آنسو بہنے لگے۔

چھتاری سے میل بھر پہلے بس اسٹینڈ ہے جسے دوراہا کہتے ہیں اور وہاں علی گڑھ، اترولی، ڈبائی اور انوپ شہر جانے والی بسوں کا میل ہوتا ہے۔ وہیں چھتاری جانے والی بس بھی ملتی ہے جو اس وقت بھی تیار کھڑی تھی۔ ایوب نے کہا "لاؤ بچہ میری گود میں دے دو تم سامان

لے کر منّی اور انوار کے ساتھ بس میں بیٹھو۔ میں ٹکٹ خریدتا ہوں۔

نوری نے منّی اور انوار کے ہاتھ میں پوٹلی اور بکس تھمایا اور خود لوٹا اور پاندان لے کر بس سے اتر پڑی۔ سڑک پر اس کے میکے کا ایک نوجوان اسے پہچان کر اس کی طرف بڑھ آیا۔ "ارے نوری آپا تم اب آئی ہو! مجید اتاؤ کا گور کفن تو کل شام ہو گیا۔ تمہارا بھائی تو اب تک نہیں آیا۔ چلو جلدی کرو بس سیٹی دے رہی ہے۔"

مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی بس میں وہ بمشکل چڑھ پائی۔ "رحمت بھائی ذرا دیکھنا میرے میاں بیٹھے ہیں۔ بچہ بھی اُن ہی کے پاس ہے۔" بس چل دی تھی۔

"تمہارے میاں؟ نوری آپا میں تو انھیں نہیں پہچانتا۔"

"ارے بھیا! ابھی تو میرے ساتھ علی گڑھ سے آئے ہیں، تمہارے سامنے ہی تو ہم بس سے اترے ہیں ۔۔۔"

"نوری آپا ۔۔۔ کیا وہ چھوٹا سا بچہ کندھے سے لگائے جو بس سے اترا تھا وہ تمہارا میاں تھا؟ مگر ۔۔۔ مگر وہ تو فوراً ہی علی گڑھ جانے والی دوسری بس میں چڑھ گیا تھا ۔۔۔"

"کہاں ہے وہ بس؟" نوری نے چیخ ماری۔

"وہ بس ۔۔۔ وہ تو فوراً ہی چلدی تھی جب تم اس بس میں بیٹھ رہی تھیں ۔۔۔"

نوری نے کھڑے کھڑے آپا پیٹ لیا "یہ کیا ہو گیا اللہ، یہ کیسے ہو گیا ۔۔۔"

جب وہ گھر میں داخل ہوئی اور بلک بلک کر روتے ہوئے ماں سے لپٹی تو اس کے ذہن میں مردہ باپ نہیں اپنے شیر خوار بچے کا خیال تھا۔

وہ رات (اور پتہ نہیں ایسی کتنی راتیں) انگاروں پر گزری۔ اس کے سینے سے دودھ ٹپک ٹپک کر آتش سیال کی طرح اس کے جسم کو جھلس رہا تھا۔ صبح تک اس کا سینہ پتھر کی طرح سخت اور پھوڑے کی طرح تکلیف دہ ہو گیا۔ وہ معصوم بھوک سے کس طرح تڑپ رہا ہوگا! میرے اللہ یہ کیا ہو گیا ۔۔۔!

صبح کو وہ جنونی کیفیت میں ماں اور اپنے بچوں کو بتائے بغیر بس کے اڈے پر پہنچ گئی اور علی گڑھ چلدی ۔۔۔ وہ اپنی مرضی سے تو نہیں آئی تھی، ایوب نے اصرار کیا تھا، اور ایوب تو اس سے محبت کرتا تھا۔ کوئی لڑائی جھگڑا بھی نہیں تھا۔ پھر اس نے ایسا کیوں کیا؟

علی گڑھ پہنچی تو دکان بھی بند تھی اور گھر کے دروازہ پر اسی طرح تالا لگا ہوا تھا جیسے وہ کل چھوڑ کر گئی تھی۔ ایوب کہاں گیا؟ بچے کو کہاں لے گیا؟ اب کہاں تلاش کروں؟ پھر اسے ایوب کی چچی کا خیال آیا اور وہ رکشا لے کر وہاں گئی۔

چچی نے اسے دیکھتے ہی کہا "ارے تو واپس آ گئی؟"

نوری نے رو کر کہا "چچی پتہ نہیں وہ میرا بچہ لے کر کہاں چلے گئے۔ گھر پر تو تالا پڑا ہوا ہے۔"

چچی نے بڑے اطمینان سے کہا "گھر پہ بچہ کو کیا خود پالتا؟ گاؤں لے گیا ہوگا۔"

"گاؤں؟ تو مجھے گاؤں کا پتہ بتا دو میں وہیں چلی جاؤں گی۔"

"گاؤں کیا کرنے جائے گی؟ سوکن کی جوتیاں کھانے؟"

"سوکن؟ مگر وہ تو اسے برسوں ہوئے چھوڑ چکے ہیں ۔۔۔"

"ایوب کیا پاگل ہے جو اپنی بیاہتا کو چھوڑ دے گا۔ اس کی خالہ کی بیٹی ہے۔"

نوری دم بخود رہ گئی "مگر وہ بچہ؟ وہ بچہ تو میرا ہے ——"

"تو کیا ایوب کا نہیں؟ اس کی بیوی میں کیا کمی ہے! بس ایک اولاد کی حسرت تھی۔ آخر زمین جائداد کا وارث بھی چاہیئے، اب اللہ نے وہ بھی دیدیا ——"

"مگر ایوب میرے بچہ کو نہیں چھین سکتا! میں مہر کا دعویٰ کر دوں گی۔ پورے دو ہزار کا مہر بندھا تھا —— میں ایوب کو جیل کرا دوں گی" چچی نے ہنس کر بڑے طنز سے کہا "ایوب نے ایسی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ کیا تو نے اپنے پہلے میاں سے طلاق لی تھی جو ایوب سے نکاح ہوتا؟ تو ایوب کی بیوی ہی نہیں تو پھر مہر کا دعویٰ کس پر کرے گی؟ بھولی بیوی شکر کر کہ تیرے اور تیرے بچوں کے دو سال چین سے گزر گئے، کیسی فاقہ ماری آئی تھی اور اب کیسی سانڈ ہو رہی ہے۔ جا چین سے اپنے گھر بیٹھ۔ اب ادھر کا رخ نہ کرنا۔"

نوری نے چچی کے پاؤں تک پکڑ لیے مگر اس نے گاؤں کا پتہ نہ بتایا۔

جب نوری میکے واپس پلٹی تو اسے پتہ چلا کہ اپنی ہی لاش اپنے ہی بے جان کندھوں پر اٹھانا کیسا اذیت ناک ہوتا ہے۔

چھتاری آکر اس نے زمیندار کے گھرانے میں کھانا پکانے کی نوکری کر لی اور منی کو بھی اپنے ساتھ لگا لیا۔ انوار حسب معمول گلیوں میں واہی تباہی پھرتا رہا۔ نوری جب تنہا ہوتی تو اپنے دونوں گمشدہ بیٹوں کو باری باری یاد کر کے روتی۔

وقت گزرتا گیا اور منی جوان ہو گئی۔ بلند شہر میں اس کا رشتہ بھی طے ہو گیا، مگر نوری کے پاس کیا تھا جو ڈھنگ کا جہیز دے کر منی کو گھر سے رخصت کرے۔ کسی نے اس سے پوچھا "نوری تو نے منی کے باپ کو بھی شادی کی اطلاع دیدی؟"

نوری نے سرد آہ بھری "میں انھیں کیا خبر کرتی، انھوں نے پلٹ کر بھی کبھی اپنے بچوں کا حال نہیں پوچھا، میرا بیٹا تک مجھ سے چھین لیا ——"

"بے وقوفی کی باتیں مت کر —— آخر وہ منی کا باپ ہے۔ کیا پتہ وہ جہیز میں تیری مدد کرے اور اگر وہ شادی میں آیا تو تیرے بیٹے کو بھی ساتھ لائے گا۔"

اس خیال نے نوری کی رگوں میں نیا خون دوڑا دیا۔ وہ دوڑی ہوئی منشی جی کے یہاں گئی اور منظور کے نام مفصل خط لکھوایا کہ اگر منظور اور منور شادی کے وقت نہ پہنچے تو کوئی منی کو ڈولی میں بٹھانے والا بھی میسر نہ ہوگا۔

بارات آنے سے ایک دن قبل ایک پڑوسی نے آکر کہا "نوری منظور بھائی آ گئے ہیں۔ میں نے ابھی انھیں بس سے اترتے دیکھا ہے۔"

"میرا منور بھی تو آیا ہوگا؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں ہے۔ منظور بھائی مزدور بس کی چھت سے سامان اتروا رہے تھے۔"

کچھ دیر بعد ہی منظور پہنچ گیا۔ وہ بیٹی کے لئے مسہری، بستر اور برتن لایا تھا۔ نوری نے کواڑ کی آڑ میں کھڑے ہو کر پوچھا "تم منور کو ساتھ نہیں لائے؟"

منظور نے رکتے ہوئے کہا "اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی —— بخار آ گیا تھا۔"

"تو کیا میرے نصیب میں اپنے بچے کی صورت دیکھنا بھی نہیں ہے۔"

"نہیں نہیں ایسا کیوں کہتی ہو۔ ذرا منی کے بیاہ سے نبٹ لو پھر منور کو جی بھر کے دیکھ لینا، آخر وہ تمہاری اولاد ہے۔"

جب منی اور مہمان رخصت ہو گئے تو نوری اور منظور کا سامنا ہوا۔

"تو اب میں منور کو کیسے دیکھوں گی؟"

"نوری تم میرا کہا مانو تو اپنے گھر چلو —— منور کئی مہینے سے بیمار ہے، اب تو اماں بھی اس دنیا میں نہیں ہے۔ میں اکیلا کام کرنے والا

ہوں۔ بازار کی روٹیاں کھا کھا کر پیٹ بھی ٹھیک نہیں رہتا اور مجھے آنکھوں سے بھی دھندلا نظر آنے لگا ہے۔ ڈاکٹر موتیا بند کی بیماری بتاتا ہے۔ انوار میری جگہ لگ گیا تو میں آپریشن بھی کراؤں گا۔"

نوری نے ایک لمحہ بھی سوچ بچار نہیں کیا "کب چلو گے یہاں سے؟"

پورے راستے نوری منور کا تصور کرتی رہی۔ "وہ تو میری صورت بھی بھول چکا ہوگا ـــــ اور میں اسے کیسے پہچانوں گی۔ بارہ سال میں تو آٹھ نو سال کا کھلنڈرا لڑکا بھی توانا جوان بن جاتا ہے ـــــ "

منور واقعی ماں کی شکل بھول چکا تھا اور اس نے نوری کو دیکھ کر تعجب کا اظہار تو کیا مگر خوشی کا نہیں ـــــ اور نوری جس توانا جوان کو دیکھنے کی منتظر تھی اس نے ایک لاغر اور کمزور لڑکے کو دیکھا جسے روز بخار آتا تھا اور رات بھر کھانستا تھا۔

نوری دل و جان سے منور کی تیمارداری میں لگ گئی۔ ڈاکٹروں نے ایکسرے کرایا۔ منور کو تپ دق ہو گئی تھی!!

علاج مہنگا تھا اور منظور کی کمائی میں گھر بھی چلانا تھا۔ نوری کے پاس وہ دو چار چاندی کے زیور تھے جو ایوب نے بیٹا ہونے کی خوشی میں بنوا دیئے تھے اور نوری نے اپنے اچھے بُرے وقت کے لئے اٹھا رکھے تھے۔ اب منور کے علاج میں وہ ایک ایک کر کے فروخت ہو گئے۔

سات آٹھ مہینے نوری دن رات منور کی پٹی سے لگی رہی اسے اپنے کھانے اور سونے کا بھی ہوش نہ تھا۔ اکثر جو کھانا منور چھوڑ دیتا وہی کھا لیتی تھی اور عموماً وہ سو جاتا تو اس کی پائنتی سکڑ کر لیٹ جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ منور کی طبیعت سنبھلی گئی۔ وزن بڑھنے لگا اور چہرے پر رونق آ گئی۔

اس عرصہ میں میکہ سے کسی پڑوسی نے اس کی ماں کے مرنے کی خبر لکھوا دی تھی مگر وہ منور کو چھوڑ کر کس طرح جاتی اور اب چھتاری لوٹ کر جانے کا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا۔ جس دن منور کا نیا ایکسرے دیکھ کر ڈاکٹر نے اسے بالکل صحت مند قرار دیا نوری نے مٹھائی بانٹی۔ مزار پر چادر چڑھائی اور شکرانہ کا روزہ رکھا۔

اور پھر اسے یکایک اپنی تھکن کا احساس ہوا۔ اس کی اپنی طبیعت گری گری رہنے لگی تھی۔ اگر بیٹوں کی شادیاں ہو جائیں تو وہ چین سے آرام کر سکتی ہے۔

منظور نے اس کی رائے سے اتفاق کیا اور خورجہ میں اپنے رشتہ داروں کو رشتے تلاش کرنے کو خط لکھا۔ بھلا کماؤ لڑکوں کے لئے رشتوں کی کیا کمی ہے۔ دیکھتے دیکھتے نوری اپنے دونوں بیٹوں سے دو بہنیں خورجہ سے بیاہ لائی۔ شادی کی تیاری اور مہمانوں کی بھاگ دوڑ میں نوری بالکل نڈھال ہو گئی اور بخار آنے لگا۔ نئی دلہنیں کیسے چولہا چکی کریں۔ نوری دن بھر بخار میں تپتی اور چولہے میں جھلستی رہتی۔ اسی دوران میں منظور نے اپنی آنکھوں میں موتیا بند کا آپریشن کرا لیا۔ اس کی خدمت بھی نوری کے ذمہ تھی۔ نوری کو اپنی حالت پر تعجب تھا کہ ذرا سی محنت اور تھوڑے سے کام کاج سے بھی اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا ہے اور چکر آ جاتا ہے۔ پھر شام سے ہلکا ہلکا بخار اور رات کھانسی کا ٹھسکہ ـــــ وہ گھبرا گئی۔ شکر ہے گھر میں بیٹے بہوئیں موجود ہیں ـــــ!

سب پر طرہ یہ ہوا کہ منظور کی آنکھوں کا آپریشن بگڑ گیا۔ اب موٹے چشمہ کے باوجود اسے بہت دھندلا دکھائی دیتا تھا۔ منور تو پہلے سے فیکٹری میں ملازم تھا۔ اب منظور نے اپنی جگہ انوار کا نام لکھا دیا اور دونوں کے پیسے سے گھر چلنے لگا۔

نوری کی طبیعت کسی طرح نہ ٹھیک ہوئی تو وہ منظور کے ساتھ اسی ڈاکٹر کے پاس گئی جس نے منور کا علاج کیا تھا۔ ڈاکٹر کو تشخیص میں زیادہ دیر نہ لگی "تمہیں بھی ٹی بی ہو گئی ہے۔ ایکسرے کراتا ہوں مگر یہی دوائیں کھانا ہوں گی۔ لگتا ہے تم نے اپنے بیٹے سے پرہیز نہیں کیا۔

یہ لگنے والی بیماری ہے اور تمہیں مکمل آرام کرنا پڑے گا۔"

منظور نے دونوں بیٹوں کو ڈاکٹر کا فیصلہ سنا دیا کہ اب نوری کا علاج کرانا ہوگا۔ دونوں بیٹے خاموش رہے مگر بہوؤں نے اسی دن نوری کے برتن علیحدہ کر دیئے اور گھونگھٹ سرکا کر باورچی خانہ خود سنبھال لیا۔

بڑی بہو کے بچہ ہونے والا تھا۔ منور نے اس سے کہہ دیا کہ اماں کے قریب نہ جانا۔

نوری بھی بہوؤں اپنے بچوں کا طرزِ عمل دیکھ رہی تھی۔ ایک دن انوار نے کہا "اماں ڈاکٹر کہتا ہے کہ یہ چھوت کی بیماری ہے۔ اب چھوٹے سے گھر میں پرہیز کیسے ہوگا۔ پھر بھابی نے اُلٹا سیدھا کچھ کہہ دیا تو ہم سب سے جھگڑا ہوگا۔ اس سے تو اچھا ہے کہ تو ابا کے ساتھ چھتاری چلی جا۔ وہاں نانی کا گھر خالی ہوگا وہیں اپنا علاج کرا لینا۔ ہم جو ہو سکے گا خرچہ بھیجتے رہیں گے۔ جب اچھی ہو جائے تو چلی آنا۔۔۔۔"

نوری کے سارے احساسات نم ہو چکے تھے "تم جیسا کہو گے وہی کروں گی۔"

چھتاری میں ماں کی موت کے بعد نوری کا بھائی دلّی سے آیا اور گھر بیچ کر واپس چلا گیا، اب وہاں کوئی اور بسا ہوا تھا۔

آخر کار منظور کو زمیندار کی خالی گڑھی میں چوکیدار کی نوکری اور رہنے کو ایک کوٹھری مل گئی مگر نوری کا علاج کیسے ہوگا۔ وہ تو اب پلنگ سے بھی اُٹھنے میں کانپتی ہے اور منظور کو روٹی پکانی نہیں آتی، اس کی تو آنکھیں بھی خراب ہو چکی ہیں۔

بستی والے ترس کھا کر کھانے پینے سے مدد کرنے لگے۔ ایک دن منظور نے بڑی لجاجت سے کہا "نوری تیرا تو خیر یہ میکہ ہے۔ سب تیرے باپ بھائی کی طرح ہیں۔ بھوکا نہیں رکھیں گے اور دوا دارو بھی کرا دیں گے مگر میں تو پردیسی ہوں۔ کب تک ایسے مانگ مانگ کر کھاؤں گا۔ اس سے تو اچھا ہے کہ میں بچوں کے پاس ہی چلا جاؤں! تھوڑے دن بعد پیسوں کا انتظام کر کے آ جاؤں گا۔۔۔۔"

نوری نے لیٹے لیٹے نظر اٹھائے بغیر کہا "تم ٹھیک کہتے ہو، تم اپنے بچوں کے پاس چلے جاؤ۔"

نوری کو تیز بخار چڑھا ہوا ہے۔ دن میں دو ایک بار کوئی نہ کوئی آ کر کھانا پانی پوچھ جاتا ہے مگر اس کوٹھری میں کوئی زیادہ دیر نہیں رُکتا۔ بہرحال نوری کبھی خود کو تنہا نہیں پاتی۔۔۔۔ ماضی کے دھندلے سائے ہمیشہ اس کے گرد و پیش منڈلاتے رہتے ہیں۔ یہ منور ہے اس کا بڑا بیٹا۔ اس کا پلّہ پکڑے کھڑا ہے۔ مگر نہیں یہ کوئی اور ہے۔ منور تو اسے پہچانتا بھی نہیں۔ منور تو دور کھڑا بڑی سرد مہری سے اسے دیکھ رہا ہے یہ تو انوار ہے جو بار بار سرگوشی میں اس سے کہہ رہا ہے "تو یہاں سے چلی جا تو یہاں سے چلی جا۔۔۔۔" اور یہ چھوٹا سا بچہ، یہ اتنا خوبصورت۔۔۔۔ سب سے زیادہ خوبصورت بچہ کس کا ہے جو اسے دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔ یہ بھوکا ہے۔ میں اسے دودھ پلا دوں۔ "اُوہ" دودھ ٹپک ٹپک کر میرے کپڑے بھگو رہا ہے اور سینہ پھوڑے کی طرح دکھ رہا ہے۔"

وہ آہستہ آہستہ اپنے سوکھے ہوئے سینے پر ہاتھ پھیرتی ہے۔۔۔۔!

وہ ناچیز نہیں تھا

ہنس راج رہبر

پھر وہی دستک۔ پھر وہی آواز "رہبر، کیا میں تمہارا دوست نہیں؟ کیا تم میرے بارے میں کچھ نہیں لکھو گے؟ کیا میں ایسا ہی ناچیز ہوں کہ مجھے اٹھا کر ماضی کے کوڑا دان میں پھینک دیا جائے؟"

جیون شیخ کو مرے ہوئے دو سال سے اوپر ہو گئے لیکن یہ دستک اور یہ آواز مجھے متواتر سنائی پڑ رہی ہے اور میں اس کے اس تقاضے کو برابر ٹالتا آ رہا ہوں۔ پہلے یہ دستک اور آواز مہینے ڈیڑھ مہینے میں کبھی کبھار سنائی پڑتی تھی۔ پھر ایک ہی مہینے میں دو بار تین بار اور چار بار سنائی پڑنے لگی۔ میں نے جتنا ٹالا اصرار اتنا ہی بڑھتا چلا گیا۔ اب یہ دستک اور یہ آواز ایک ہی دن میں کئی بار سنائی پڑتی ہے۔ میں جب بھی کچھ لکھنے کا ارادہ کرتا ہوں، جیون شیخ سامنے آ کھڑا ہوتا ہے اور پوچھتا ہے "بتاؤ۔ بتاؤ۔ کیا میں اتنا ہی ناچیز ہوں کہ مجھے اٹھا کر ماضی کے کوڑا دان میں پھینک دیا جائے؟"

دراصل مجھے جیون شیخ کے اس تقاضے کو بہت پہلے پورا کر دینا چاہیئے تھا۔ اس کے کچھ آدرش تھے۔ وہ ان آدرشوں پر زندگی بھر اٹل رہا۔ وہ سماج کو بدلنا اور زندگی کو نئے معنی پہنانا چاہتا تھا۔ اس اعتبار سے اس کے اپنے نام 'جیون شیخ' کی خاص اہمیت ہے اور اس نام کی ایک تاریخ ہے۔ پتا نے اپنے نام ملکھی رام کی نسبت سے اس کا نام چھجو رام رکھا تھا، لیکن جب وہ بڑا ہوا تو اسے چھجو چھجو کہلانا پسند نہیں آیا۔ اپنے لئے یہ نام اس نے چنا تھا، اور پھر بڑی محنت سے اسے پالا پوسا تھا، یوں بھی کہا جا سکتا کہ پھر اسے خونِ جگر سے سینچا تھا۔ لوگ بار بار پوچھتے "تم ہندو ہو یا مسلمان؟" وہ جواب دیتا "نہ ہندو نہ مسلمان، میں ہوں ایک انسان۔"

جیون شیخ نام طویل جد و جہد کی کہانی ہے۔ اس جد و جہد میں وہ جھکا نہیں، ٹوٹ ضرور گیا۔ میں نے اسے ٹوٹتے اور اس کی بسی بسائی گرہستی کو اپنی آنکھوں سے اجڑتے دیکھا۔ پھر بھی اس کی پیشانی پر شکن نہیں آئی۔ وہ مصیبتیں جھیلتا رہا اور مسکراتا رہا۔ مسکراتے مسکراتے ہی وہ جنون کی حالت میں پہنچ گیا۔ اس کی بہکی بہکی باتیں سن کر یار لوگ پھبتیاں کستے اور مذاق اڑاتے تھے۔

پاگل پن کی حالت ہی میں وہ چل بسا۔ میری اس کی آخری ملاقات اس کی موت سے ایک ہفتہ پہلے ہوئی تھی۔ اس دن جیون شیخ پانچ بجے شام کے قریب گلی کے موڑ پر بڑے ڈاک خانے کے قریب مجھ سے اچانک ٹکرا گیا تھا۔ میں کسی کام سے نئی دلّی جا رہا تھا اور وہ مجھ سے ملنے آیا تھا۔

"گھر چلیں؟" میں نے کہا۔

"کوئی ضرورت نہیں۔ تم سے ملنا تھا سو مل لئے۔" اس نے آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ کر جواب دیا اور پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "دو منٹ بات کرنی ہے۔ یہیں کھڑے کھڑے کر لیتے ہیں۔"

سڑک چل رہی تھی۔ گاڑی، رکشا، سائیکل اور پیدل لوگ آ جا رہے تھے۔ جیون شیخ کی بوشرٹ اور پتلون اتنی میلی تھی کہ بس میل ہی میل۔ کپڑے کا رنگ تک اس میں چھپ گیا تھا۔ لگتا تھا پندرہ بیس دن سے نہ شیو کی ہے، نہ نہایا ہے اور نہ کپڑے بدلے ہیں۔ بوشرٹ کے نیچے بنیان تو بالکل چیتھڑا ہو گئی تھی۔ آنے جانے والے سب اجنبی ہی تو نہیں، ان میں جان پہچان کے لوگ بھی تو ہو سکتے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ ہم لوگ سڑک پر کھڑے رہنے کے بجائے

گھر چل کر اطمینان سے بیٹھیں اور جیون شیخ ایک دو منٹ نہیں، جی بھر کر باتیں کرے۔ کام کچھ ضروری نہیں تھا، میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ دیر سے یا دوسرے دن بھی جا سکتا تھا، لیکن جیون شیخ نے جو گھر اور سڑک کے فرق سے اوپر اُٹھ چکا تھا، میری نہیں سُنی۔ وہ آنکھیں چہرے پر گاڑے اور ہاتھ کندھے پر رکھے، وہیں کھڑا رہا اور بات شروع کر دی۔ "سنو دوست، میں ایک ایسی ادھیڑ عمر عورت کو گھر میں لانا چاہتا ہوں جو مجھے سمجھ سکے اور سکھ دکھ کی ساتھی بنے۔ اس کے علاوہ میری کوئی خواہش، کوئی تمنا نہیں۔ نوجوان لڑکیاں بہت ہیں۔ اُن سے بیاہ رچانا جان کا وبال ہے۔ کل ہی مجھے ایک ساتھ تین تین لڑکیاں دکھائی گئیں۔" اس نے ہاتھ کندھے پر سے ہٹا لیا اور دونوں بازو کہنیوں پر موڑ کر بات جاری رکھی۔ "ایک لڑکی گوری چٹی تھل تھل بدن کی ڈبل روٹی جیسی موٹی تھی۔ میں تو اسے دیکھ کر ہی ڈر گیا۔ دوسری لڑکی پتلی دبلی لانبے قد کی تھی۔ یوں سمجھو کہ مجھ سے ڈیوڑھی۔ سر پر گردن تک کٹے چھتری بال۔ بند موہری کا چوڑیدار پائجامہ اور کلائی پر گھڑی بندھی تھی۔ صاف ستھری اور ایک دم ماڈرن۔ آنکھیں اتنی موٹی موٹی۔ تیسری لڑکی سکھوں کی تھی، تندرست نہ لانبی اور نہ موٹی۔ وہ بھی ایک دم ماڈرن۔ کیا کہتے ہیں اسے۔" ایک لمحہ رک کر دماغ پر زور ڈالا اور ننھی سی ہنسی ہنس کر پھر بولا۔ "سکرٹ پہن رکھا تھا اور پھر انگریزی پھٹکار رہی تھی۔ میں نے کانوں کو ہاتھ لگائے اور توبہ کر کے چلا آیا۔"

گھنی بھووں کے نیچے آنکھیں پرناسی چمک رہی تھیں اور اُن میں سپنے تیر رہے تھے۔ میرے یا کسی کے لئے بھی یہ سمجھ لینا آسان تھا کہ جن لڑکیوں کی اس نے ڈرامائی انداز سے تصویر کھینچی ہے، وہ اُس کے پاگل دماغ کی اپج ہیں۔ دھرتی پر سچ مچ اگر ان کا کہیں وجود ہے تو وہ اس کی پہنچ سے باہر ہیں۔

"سمجھ گئے نا، مجھے کیسی عورت چاہیئے؟" قریب سرک کر، کندھے پر ہاتھ رکھ کر اور چہرے پر آنکھیں گاڑ کر وہ پھر بولا۔ "وہ ایک بیوہ اسکول ٹیچر ہو یا کوئی ایسی عورت ہو جس نے شادی نہ کی ہو اور جوانی آزادی کی سنک میں گزار دی ہو، لیکن عمر گزرنے پر اکیلاپن اکھرنے لگا ہو اور اسے بھی میری ہی طرح جیون ساتھی کی تلاش ہو۔ جوان لڑکی نہیں۔ مجھے تو بس ایسی عورت چاہیئے۔ میں نے اپنے تمام دوستوں سے کہہ دیا ہے۔ تم بھی خیال رکھنا اور جب بھی ایسی عورت مل جائے، مجھے بتانا۔"

جان پہچان کے دو شخص قریب سے گزرے۔ انھوں نے ہاتھ اٹھا کر دعا سلام کی اور میں نے بھی ہاتھ اٹھا کر جواب دیا۔ "بتاؤ گے نا؟" کندھے پر ہاتھ کا دباؤ دیتے ہوئے اس نے بچے کے سے معصوم انداز میں تقاضا دُہرایا۔

"ضرور بتاؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔

اب وہ ایک پل بھی نہیں رکا اور منہ سے بھی کچھ نہ بولا۔ مطمئن اور خوشی سے مسکراتا ہوا چلا گیا۔

یہ تقاضا اس نے مجھ سے تیسری یا چوتھی مرتبہ کیا تھا۔ مجھ سے ہی نہیں، میری بیوی۔ اپنی بھابی سے بھی کیا تھا۔ جیون ساتھی گھر میں لانے کا خبط اس کے سر پر سوار تھا اور ان دنوں اسی کو سب سے بڑی مہم بنا رکھا تھا۔ وہ سورج اُگتے ہی گھر سے نکلتا۔ شہر بھر کا چکر لگاتا اور اپنے ہر دوست اور ہر ملنے جلنے والے کے پاس جا کر اپنا یہ تقاضا بچوں کی سی معصومیت کے ساتھ دُہراتا۔ شرمانے لجانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لوگ منہ سامنے ہاں بھرتے لیکن پیٹھ پیچھے کھلّی اُڑاتے۔ اسے پاگل اور سودائی بتاتے۔

اس آخری ملاقات کے کوئی دس دن بعد معلوم ہوا کہ جیون شیخ پیٹ کے مرض سے جنرل ہسپتال میں داخل ہوا اور تین دن بعد وہیں چل بسا۔

میرے دل کو صدمہ پہنچا۔ جیون ساتھی ملے نہ ملے، لیکن جیون شیخ کے اتنی جلدی چلے جانے کی میں نے کلپنا تک نہیں کی تھی۔

رہائشی پلاٹ بیچنے کا دھندا کرنے والے ایک امیر آدمی ست پال کوشک نے جس کو ادب میں دلچسپی تھی اور جو جیون شیخ کی سادگی اور معصومیت کا دیوانہ تھا، اپنے مکان کے پچھواڑے میں ایک دروازہ اور ایک کھڑکی والی تنگ اور تاریک کوٹھری اسے دے رکھی تھی۔ بلّی اور جنگلی اپنے دو بیٹوں کے ساتھ جو گھر اجڑ جانے کے بعد بھی اس کے پاس رہ گئے تھے، وہ اس کوٹھری میں رہتا تھا۔

موت کی خبر سُن کر میں ماتم پرسی کرنے گیا تو بگی اور اس کی دو چچیری بہنوں کو وہاں موجود پایا۔ بگی نے پرجوش ڈھنگ سے خیر مقدم کیا اور بہنوں سے تعارف کرایا۔ "یہ ہیں میرے محسن انکل۔"

"اچھا، اچھا، ہم سمجھ گئیں۔ آپ بھی لیکھک ہیں اور بڑے ڈاک خانے کے پاس رہتے ہیں۔ تایا جی آپ کا ذکر اکثر کیا کرتے تھے۔"

کوٹھری میں دو چارپائیاں، مختصر سا سامان، اور پھر کتابیں ہی کتابیں۔ جیون شیخ کو کتابوں سے بڑی محبت تھی۔ میں جب بھی آیا تو یہی پایا کہ وہ چارپائی پر بیٹھا پڑھ رہا ہے یا کچھ لکھ رہا ہے۔ اس کے علاوہ کسی بات کی سدھ بدھ نہیں۔ کتابیں، کپڑے یا برتن ادھر اُدھر بکھرے پڑے رہیں لیکن اب کتابیں اور دوسری چیزیں قرینے سے رکھی ہوئی تھیں اور فرش بھی صاف تھا۔

دونوں لڑکیاں فرش پر بیٹھیں تھیں اور انگیٹھی پر سبزی چڑھا رکھی تھی۔ میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ بات چیت سے پتہ چلا کہ سوموار کو صبح صبح جیون شیخ کے پیٹ میں اتنا تیز درد ہوا کہ وہ تڑپتا تڑپتا بے ہوش ہو گیا۔ بیہوشی ہی کی حالت میں اسے ہسپتال پہنچایا گیا۔ ڈاکٹر نے انجکشن دیا۔ درد تو شاید تھم گیا لیکن نیند تھی یا بے ہوشی وہ دو دن تک بے سدھ پڑا رہا۔ آنکھ تک نہیں جھپکی۔ تیسرے دن کہیں دوپہر کو ہوش آیا اور اس نے کچھ راحت محسوس کی۔ گھر کے جو لوگ وہاں موجود تھے ان پر ایک نظر ڈالی۔ دھیمے اور تھکے سے سُر میں کچھ بات کی تب پتہ چلا کہ وہ گھر میں نہیں، ہسپتال میں ہے۔

"اُن کے لیے چائے منگوائی گئی" بڑی لڑکی بتا رہی تھی "مگر وہ چائے پیتے نہیں تھے اس لیے انکار کیا۔ پر ڈاکٹر بولا، پیو، فائدہ کرے گی۔ انھوں نے زندگی میں پہلی بار اور آخری بار چائے پی۔ چائے پی کر آنکھیں ایسی بند ہوئیں کہ بند ہی رہیں، پھر نہیں کھلیں۔"

چند منٹ سناٹا رہا۔ ہم مرنے والے کے غم میں ڈوبے رہے۔ جب بات چیت دوبارہ شروع ہوئی تو وہ درد، ہسپتال اور موت سے متعلق نہیں، زندگی، زندہ دلی اور اُس دھن کے بارے میں تھی جو آخری دنوں میں جیون شیخ کے سر پر سوار رہی۔

"وہ جب بھی آتے بیاہ کی بات بڑوں ہی سے نہیں، ہم سے بھی کرنا جھجک کرتے"۔ بڑی لڑکی پھر خوشگوار آواز میں کہہ رہی تھی میں اور چھوٹی لڑکی سن رہے تھے۔ "بگی چائے کے لیے دودھ لینے بازار چلی گئی تھی"۔ "ہمیں ان کی باتیں عجیب لگتیں۔ لیکن رفتہ رفتہ ہم سننے کی عادی ہو گئیں۔ سوچتیں کہ اپنا من بہلا رہے ہیں، بہلانے دو۔ اس میں کسی کا کیا حرج ہے؟ اس خیال سے بات میں بات ملا کر ہم بھی کہتیں۔ "تایا جی، آپ کے لائق عورت ہم نے کھوج لی ہے۔ لیکن بات پکی تبھی ہو گی جب آپ ہمیں مٹھائی کھلائیں گے اور بارات میں ساتھ لے جانے کا وعدہ کریں گے، منہ سے کچھ کہنے کے بجائے وہ ہنسنے لگتے۔ ہنستے ہنستے کہیں دور دیکھنے لگتے اور دیکھتے رہتے۔" تیئس چوبیس برس کی وہ پڑھی لکھی لڑکی اچانک رُکی۔ چند لمحے اپنے آپ میں کھوئی رہی۔ اس کے خوبصورت چہرے پر اداسی کا بادل گھِر آیا اور وہ سُر بدل کر پھر بولی۔ "اُن پر مذاق کا بھی کچھ اثر نہیں ہوتا تھا۔ سمجھانا بجھانا تو بیکار ہو ہی چکا تھا۔"

لڑکی نے ان دو فقروں میں اپنے من کی ساری ہمدردی انڈیل دی اور اس کے یہ الفاظ میرے دل پر ایسے نقش ہوئے کہ جب کبھی دستک سنائی دیتی تو مجھے جیون شیخ کی جوان بھتیجی کی یاد آتی، اس کے یہ الفاظ یاد آتے اور میں سوچتا کہ موت نے سب کچھ ہی بیکار کر دیا۔ ایک مجذوب شخص کی کہانی لکھنے میں کیا تک ہے اور کون اسے پڑھنا پسند کرے گا۔

لیکن بار بار کے تقاضے نے میرے اس تصور کو بدل دیا اور مجھے پھر سے سوچنے پر آمادہ کیا۔ سوچتے سوچتے پہلی ملاقات سے آخری ملاقات تک کی اس کی پوری زندگی میری نظر میں فلم کی طرح گھومنے لگی۔ میں یہ فلم دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ سوچتے سوچتے ایک نیا خیال ذہن میں آیا اور میرے اندر کا ادیب کہہ اٹھا: "لکھو، لکھو ضرور لکھو۔ یہ مجذوبیت بھی غیر معمولی تھی۔ جیون شیخ کی جدوجہد میں گذری زندگی کا لازمی جزو تھی جس تحریک کے لیے اس نے اپنے آپ کو وقف کر لیا تھا، کیا وہ تحریک ہی بیکار نہیں ہو گئی؟ نہ اندولن نے خود کو سنبھالا اور نہ جیون شیخ کو۔ جیون شیخ کی کہانی اس بیکار ہوئے اندولن کی کہانی ہے، جو دیس کی تاریخ کا لازمی جزو ہے۔ اگر تم لکھ سکو تو یہ ایک دل سوز اور پُر اثر کہانی ہو گی اور قاری اسے شوق

سے پڑھے گا۔

اس نئے تصور سے خود مجھے جو تحریک ہوئی، وہ میرے تن بدن میں نشتر بن کر اتر گئی۔ میرا شعور بیدار ہوا اور فکر کو مہمیز لگی۔ ایک دفعہ لکھنا شروع کرکے تبھی دم لیا جب نظر میں گھوم رہی پوری فلم قلمبند ہوگئی۔

سنہ ۱۹۴۴ء کے آخری دنوں کی بات ہے۔ میں دو سال کی نظربندی کے بعد جیل سے رہا ہو کر آیا تھا اور جیل ہی میں کمیونسٹ بن گیا تھا۔ انہیں دنوں جیون شیخ سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ قد درمیانہ، رنگ سانولا، مگر رسا بدن کچھے اور بنیان کا مختصر سا لباس، شاہ عالمی دروازے کے باہر ایک تالاب پر، جہاں میری اور اس کی ملاقات ہوئی، اپنے سے بھی چھوٹی ایک ڈربہ نما کوٹھری میں اس کی رہائش تھی۔ وہ نظمیں، ڈرامے اور افسانے لکھتا تھا اور زندگی کو بدلنے کے سپنے دیکھتا تھا۔ بات چیت سے معلوم ہوا کہ کانگریسیوں اور سوشلسٹوں کی طرح اس کے دل میں بھی کمیونسٹوں کے خلاف سخت نفرت ہے۔ اس کے باوجود وہ مجھے پسند آیا۔ وجہ یہ کہ وہ اپنی بات خود اعتمادی اور صدق دلی سے کہہ رہا تھا اور اس میں مخالف حالات سے لڑنے کی جرأت تھی۔ وہ اپنی اس حالت میں بھی خوش تھا اور اسے زندگی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔

پھر ہم پانچ سال کے بعد لاہور کے بجائے دلی میں ملے اور کچھ ہی دنوں میں گہرے دوست بن گئے۔ ملک کی آزادی کے بعد میں فوراً دلی پہنچ گیا تھا اور دلی پہنچنے میں مجھے کچھ خاص مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا لیکن جیون شیخ اپنی جنم بھومی لائل پور سے مہاجرین کے ایک قافلے کے ساتھ گرتا پڑتا جالندھر پہنچا اور وہیں ٹک گیا۔ اس دوران میں اس نے جو کچھ دیکھا اس پر ایک کتاب لکھی۔ نام تھا "آزادی کی بربادی"۔ رونگٹے کھڑے کرنے والی اپنی یہ کتاب اس نے مجھے بھی بھجوائی۔ سیدھی سادی زبان میں وحشت اور درندگی کی اس نے جو تصویر کھینچی تھی وہ تن من کو جھنجھوڑنے والی تھی۔ آزادی کے نام پر مصنف نے جو سپنے دیکھے تھے وہ سب دھول میں مل گئے تھے پھر بھی وہ مایوس نہیں تھا۔ زندگی اور اس کے روشن مستقبل پر اس کا اعتماد قائم تھا۔
تلنگانا کی کسان جدوجہد چل رہی تھی جس کی رہنمائی کمیونسٹ پارٹی کر رہی تھی۔ دھول میں ملے سپنوں کو حقیقت بنانے کی امید میں جیون شیخ بھی کمیونسٹ بن گیا۔ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح پہاڑی ندی طویل سفر کے بعد سمندر میں جا گرتی ہے، عوام کا ادیب جیون شیخ اپنی جدوجہد کے طویل سفر میں عوام کی نجات کے اندولن سے آجڑا۔

سنہ ۱۹۴۹ء کے آخر میں جب وہ جالندھر سے دہلی آیا تو بیشتر لوگ روپوش تھے اور پارٹی دفتر میں چلا رہا تھا۔ جیون شیخ میرا معاون بن گیا۔ ہم دونوں سکویڈ بنا کر پارٹی اخبار بیچتے۔ چندہ جمع کرتے، اشتہار چھپواتے اور راتوں رات اپنے ہاتھوں دیواروں پر چسپاں کرتے۔ وہ ایک ایثار پسند شخص تھا، اور مقصد کی تکمیل کے لئے اسے چھوٹے سے چھوٹا کام کرنے میں بھی کسی طرح کا پرہیز نہیں تھا۔

ساتھ ساتھ کام کرتے ہوئے میں نے اسے دیکھا سمجھا اور میں اس کے ماضی سے واقف ہوا۔ جیون شیخ کو دیش بھگتی اور شاعری وراثت میں ملی تھی۔ اس کے پتا پنڈت ملکھی رام نے سنہ ۱۹۲۱ء کی سول نافرمانی کے دوران اپنی پولیس کی نوکری چھوڑ دی تھی اور وہ ستیہ گرہ کرکے جیل چلے گئے تھے۔ اس کے بعد وہ اپنی خانگی ذمے داریوں سے منہ موڑ کر آزادی کے سپاہی بنے رہے۔ حب الوطنی کی نظمیں لکھتے اور تابناک مستقبل کے خواب دیکھنے میں مست رہتے۔ نتیجہ یہ کہ جب جیون شیخ یعنی لچھورام کے کھیلنے کھانے اور پڑھنے لکھنے کے دن تھے، غریبی گھر میں آ بیٹھی۔ اسے نہ بچپن کی خوشیاں میسر ہوئیں اور نہ ڈھنگ کی تعلیم۔ جیوں تیوں کرکے مڈل پاس کیا اور کسی مہاجن کی دوکان پر منیم کی نوکری کرنے لگا۔

نوکری اس کی مجبوری تھی، وہ اس کام سے اور دوکان کے ماحول سے بہت جلد اوب گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ ایک دن صبح گھر سے نکلا اور دوکان پر جانے کے بجائے اسٹیشن کا راستہ پکڑا۔ اس کا ارادہ گاڑی میں بیٹھ کر گھر، دوکان اور اس شہر سے کہیں دور۔ بہت دور چلے جانے کا تھا لیکن اسٹیشن پر اس کی ملاقات صادق شیخ سے ہو گئی۔ شیخ اس کے باپ کا دوست اور 'نقارہ' نام کے ہفتہ وار اخبار کا ایڈیٹر تھا۔
اس نے دیکھتے ہی لچھورام کی ذہنی کیفیت کو بھانپ لیا۔ اس کی کہانی سنی، دلاسہ دیا، اور کہا "بیٹا! بھاگ کر کہاں جاؤ گے، جینا ہے تو حالات

سے لڑنا سیکھو؟ وہ شیخ کے ساتھ لوٹ آیا اور پھر اسی کے ساتھ "نقارہ" کے دفتر میں کام کرنے لگا۔

"کیا بتاؤں دوست!" اس نے جوش اور مسرت کے ملے جلے لہجے میں کہا "صادق شیخ بہت ہی بھلے آدمی تھے۔ ان کا دل ہر طرح کے تعصب سے پاک صاف تھا۔ ان سے میں نے حالات سے لڑنا سیکھا اور یہ بھی سیکھا کہ قلم حالات سے لڑنے کا کارگر ہتھیار ہے۔ ان کی یاد میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔ نہ بھلانے کے لئے ہی اپنا نام جیون شیخ رکھ لیا۔"

دیس بھگتی، شاعری اور ایمانداری ۔۔ ان تینوں کا ایک نام جیون شیخ تھا۔ جب تک "تلنگانہ اندولن" چلتا رہا وہ مستعدی اور تندی سے میرے ساتھ کام کرتا رہا۔ اندولن واپس لینے کے پارٹی فیصلہ سے مجھے جو صدمہ پہنچا اسے بھی پہنچا۔ اس کے بعد میرا اور اس کا پہلا کام لکھنا پڑھنا اور روزی فراہم کرنا رہ گیا۔ جیون شیخ کی ضرورتیں زیادہ نہیں تھیں۔ اس نے غریبی سے یہاں تک سمجھوتہ کر لیا تھا کہ اسے اپنی رفیقۂ حیات بنا لیا تھا۔ وہ کبھی ٹیوشن اور کبھی کسی پرائیویٹ انسٹی ٹیوٹ میں اردو پڑھا کر گذارے بھر کے لئے آسانی سے کما لیتا تھا۔ اسے پیسے کی کمی کبھی نہیں ہوئی جیوں جیوں تعلقات وسیع ہوئے اسے تعلیم کی کمی اور بھی زیادہ اکھرنے لگی۔ ذہنی ارتقا کے لئے جن کتابوں کی ضرورت محسوس ہوتی تھی وہ اردو میں دستیاب نہیں تھیں، اس لئے اس نے انگریزی سیکھی۔ پھر روسی سفارت خانے میں اردو پڑھنے والوں کی ٹیوشن مل گئی۔ وہ انہیں اردو پڑھاتا تھا اور خود ان سے روسی سیکھتا تھا۔ لیکن تواریخ اور فلسفے کو سمجھنے کے لئے زبان پر جو عبور ہونا چاہیئے وہ اسے انگریزی پر تھا اور نہ روسی پر۔ پھر بھی سیکھنے اور آگے بڑھنے کی لگن بذاتِ خود ایک کامیابی ہے۔ اس سے جیون شیخ میں جو خود اعتمادی پیدا ہوئی اس سے قلم میں قوت اور خیال میں تازگی آئی۔ حالات سے لڑنے کے لئے صادق شیخ ہی کی یاد میں "نقارہ" ہفتہ وار کو ماہانہ رسالے کی شکل میں نکالنا شروع کیا۔

پہلا شمارہ شائع ہوا تو وہ اسے لے کر میرے پاس آیا۔ اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ "لو، اداریہ پڑھو اور بتاؤ میں نے ٹھیک لکھا ہے نا؟" میں نے پڑھا "نقارہ" کے اجرا کا مقصد یہ بتایا گیا تھا کہ دیس کے محنت کش عوام اپنی سوچ کے رُخ کو پہچانیں۔

"بات تو ٹھیک ہے۔" میں نے اس کی طرف دیکھا اور بات جاری رکھی "لیکن سوال یہ ہے کہ جب خود لکھنے والے ہی سوچ کے رخ کو نہ پہچانتے ہوں تو وہ عوام کو اس کی پہچان کیسے کرائیں گے۔"

جیون شیخ کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ میرا اشارہ جن خود ساختہ مارکس وادیوں کی طرف تھا اور جن کا پارٹی میں بھی بول بالا تھا، جیون شیخ بھی میری ہی طرح ان سے چڑتا تھا۔

"ہم ان سے بھی لڑیں گے۔" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر مضبوط لہجے میں کہا۔

"لڑتے رہو۔ انہیں اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے۔ میرے تیرے جیسوں کی ایمانداری کو وہ پرلے درجے کی بے وقوفی بتاتے ہیں۔"

"ان سے کچھ لینا دینا نہیں۔ مجھے تمہارا تعاون چاہیئے۔ تعاون دوگے نا؟"

"ضرور دوں گا" میں نے وعدہ کیا۔ اس نے تپاک سے ہاتھ ملایا اور مسکراتا ہوا چلا گیا۔

پرچہ باقاعدگی سے نکلنے لگا۔ اس کے لئے جیون شیخ نے دن رات ایک کر دیئے۔ سوتے جاگتے اس کی فکر رہتی تھی۔ وہ خود لکھتا اور دوسروں سے لکھواتا تھا لیکن وہ اس بات کا دھیان ضرور رکھتا تھا کہ کوئی ایسی چیز نہ چھپنے پائے جس سے اس کی اپنی سمجھ کے مطابق عوامی شعور دھندلاتا یا مسخ ہوتا ہو۔ چیز لوٹانے سے لکھنے والا ناراض ہوتا ہے تو ہو اس کی اسے پروا نہیں تھی۔

ذرائع محدود تھے۔ پرچہ حجم میں چھوٹا تھا اور پانچ سو سے زیادہ نہیں چھپتا تھا، لیکن "تلنگانہ اندولن" بند ہو جانے کے بعد اس کے اندر جو خلا پیدا ہوا تھا پرچے نے اسے بھر دیا تھا۔ وہ تن من کی پوری شکتی لگا کر اسے نکال رہا تھا۔ لکھنے کے علاوہ وہ پیکٹ باندھنے، ٹکٹ لگانے اور پوسٹ کرنے کا کام بھی اس کے اپنے ذمے تھا۔ وہ گھوم پھر کر دوستوں کے ہاتھ اسے خود بیچتا بھی تھا۔

وہ خوش تھا۔ اس خوشی کو چار چاند تب لگے جب وہ دولہا بنا اور چاندسی دلہن گھر میں آئی۔ آج تک اس نے کپڑے لتے کی چنتا نہیں کی تھی۔ بوشرٹ اور پتلون پہن رکھی ہے۔ پریس ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا میلی ہے یا صاف یہ بھی کبھی نہیں سوچا تھا۔ شیو بڑھی ہوئی ہے تو بڑھی رہے اس کی بھی کوئی پروا نہیں تھی لیکن بیوی آئی تو کایا پلٹ ہو گئی۔ ہر روز بلا ناغہ شیو ہونے لگی۔ پریس کیے صاف ستھرے کپڑے، چہرے پر بارش میں دھلا کرنیل جیسی خوشنمائی اور ہونٹوں پر لطیف مسکراہٹ۔ اس کا یہ بانکا روپ بیوی ہی کو نہیں دوستوں کو بھی اچھا لگتا تھا۔ اس کی خوشی انھیں اپنی خوشی محسوس ہوتی تھی۔

"سنو دوست" ایک دن اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ایسے پُراسرار لہجے میں کہا جیسے کسی بہت بڑے راز کا انکشاف کر رہا ہو۔ "لائل پور میونسپل کمیٹی کے ریکارڈ سے پتہ چلا ہے کہ میری عمر جو میں سمجھتا تھا اس سے دس برس کم ہے۔"

"دس برس؟"

"ہاں، دس برس۔" اس نے گردن ٹیڑھی کر کے اور چھاتی پھیلا کر فخر سے جواب دیا اور کہا "اس کا مطلب ہوا کہ بیالیس برس کے بجائے میں اب کُل بتیس برس کا ہوں۔"

سوال اُٹھ سکتا تھا لائل پور جس کا نیا نام فیصل آباد ہے اور جو اب پاکستان میں ہے، یہاں دہلی میں بیٹھے بٹھائے تمھیں اس کی میونسپل کمیٹی کا ریکارڈ کہاں سے ہاتھ لگ گیا۔ لیکن شک کا اظہار نہ میں نے کیا نہ کسی اور نے کیا۔ جو کوئی سنتا تھا جوانی لوٹ آنے کی مبارکباد پیش کرتا۔

پہلے ایک چھوٹی سی برساتی میں رہتا تھا۔ اور کھانا اِدھر اُدھر کسی ڈھابے پر کھا لیتا تھا۔ لیکن اب کلا نگر میں کمرہ اور رسوئی کرائے پر لے کر گرہستی بسائی تھی۔ نئی زندگی کے نئے تجربے کا ایک دن اس نے ان الفاظ میں اظہار کیا۔ بیاہ سے پہلے میرے دکھ تکلیف اور کپڑے لتے کی چنتا میری ماں کو رہتی تھی۔ اب پتنی نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ میری ساری ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں۔ میں بس لکھتا پڑھتا ہوں اور انقلابی شعلوں کی پرورش کرتا ہوں۔

"نقارہ" انقلاب کے لیے وقف تھا۔ اس میں وہ کوتا کہانی کے علاوہ سیاسی تبصرے بھی شائع کرتا تھا۔ اس کا ایک تبصرہ مجھے اب بھی یاد ہے۔ جن دانشوروں نے تلنگانہ اندولن کی ناکامی کے بعد مارکسزم کو پرانا اور بے سود کہنا شروع کر دیا تھا، جیون شیخ نے انھیں آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے لکھا تھا "دراصل وہ لوگ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ ہندوستان میں انقلاب اب آیا کہ آیا لیکن اشتراکی انقلاب گیتوں لیکھوں اور نعروں سے اتنی جلدی تھوڑی آجاتا ہے اور پھر اسے کہیں باہر سے نہیں آنا ہے۔ اس دھرتی سے ابھرنا ہے مگر ہمارے اس دیس کی دھرتی بڑی سنگلاخ ہے۔ اس میں انقلاب کا پیڑ اُگتے اُگتے اُگے گا۔ پھر یہ موقع پرست کیسے رُکتے۔ انتظار کرنا ان کا کام نہیں۔"

حالات کو دیکھ کر رُخ بدلنے والے دانشوروں میں اور اس میں فرق یہ تھا کہ جیون شیخ جدوجہد کی راہ پر چلتے چلتے تاریخ کے ایک خاص موڑ پر انقلاب کے قافلے میں آ ملا تھا جبکہ وہ لوگ آندھی کے ساتھ اُڑنے والے خشک پتوں کی طرح اندولن کے ساتھ ہو لیے تھے۔ اندولن ختم ان کا جوش و خروش ختم۔ اس کے برعکس جیون شیخ نے حالات کے خلاف لڑنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ وہ اس پر قائم تھا۔ مارکسزم سے اسے لڑنے کی شکتی ملی تھی۔

اس نے بڑا مارکس وادی ہونے کی ٹریننگ بھی کبھی نہیں پائی۔ وہ اپنے کو ایک چھوٹا مارکس وادی کہتا تھا۔ مارکسزم سے متعلق اس کا کتابی علم واقعی تھوڑا تھا اور اس کے کارن وہ کئی دفعہ الجھن میں پڑ جاتا تھا۔

ایک مرتبہ ہم دونوں ایک ادبی سیمینار میں گئے۔ موضوع تھا آزادی کے بعد ادب زندگی کے قریب آیا ہے یا دور ہٹا ہے —— کہانی کار دیرپال جسے مارکس وادی ہونے کی شہرت حاصل تھی، صدارت کر رہا تھا۔ جب دوسرے بول چکے تو صدارتی تقریر ہوئی۔ جیون شیخ میرے پیچھے والے

بیچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ تقریر کے دوران اٹھ کر وہ میرے پاس آیا اور سرگوشی کے انداز میں بولا "ممتاز حسین اور گوربخش سنگھ کہہ رہے ہیں کہ ویرپال جو بول رہا ہے وہ مارکسزم کی نفی ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟"

"ہاں وہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ویرپال کبھی مارکس وادی تھا ہی نہیں" میں نے جواب دیا۔

"تو وہ کیا ہے؟" جیون شیخ کی تیوری چڑھ گئی۔ "ہم تو اس کی عزت اسی لئے کرتے تھے کہ وہ مارکس وادی ہے۔"

کتابی علم کی کمی نہ جیون شیخ خود پوری کر سکا اور نہ پارٹی ہی نے اس کی مدد کی۔ اسی کی کیا کسی کی بھی نہیں کی۔ حالت یہ تھی کہ خود پارٹی لیڈر ویرپال کو بہت بڑا مارکس وادی ادیب مانتے تھے اور اس کی کتابیں سرخ ٹائٹل کے ساتھ ہر شہر کے پارٹی بک اسٹال پر بکتی تھیں۔ "نقارہ" کے اگلے شمارہ میں جیون شیخ نے اس سیمینار پر میری لکھی رپورٹ شائع کی جس میں میں نے ویرپال کے مارکسزم پر سوالیہ نشان لگایا تھا۔

بیاہ کے بعد جہاں جیون شیخ کا اپنا رنگ روپ نکھرا تھا۔ وہاں "نقارہ" کا بھی نکھر آیا تھا۔ سائز بڑھ گیا تھا اور ساتھ ہی تعداد اشاعت بھی بڑھی تھی۔ پرچے سے پانچ چھ روپے مہینہ کی بچت ہونے لگی تھی اور ٹیوشن کا پیسہ ملا کر گرہست کی گاڑی بخوبی چل نکلی۔ بچت کا سبب وہ اشتہار اور پروپیگنڈا لٹریچر تھا جو اشتراکی خیال کے سفارت خانوں سے چھاپنے کے لئے ملتا تھا۔

چین کے عوامی انقلاب کے بعد اشتراکی ملکوں کا پلڑا بھاری ہو گیا تھا۔ ان میں اور ہمارے دیس میں دوستانہ تعلقات تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ اتفاق سے سوویت روس کا پردھان منتری بلگانن جس دن بھارت آیا اسی دن جیون شیخ کے بڑے لڑکے کا جنم ہوا۔ جیون شیخ نے لڑکے کا نام بلگانن رکھا۔ جو بعد میں "بلگا" بن گیا۔

لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد بلگانن کی جگہ خروشچیف نے لے لی۔ اس نے اسٹالن کی جو تنقید کی اس سے جیون شیخ خوش ہونے کے بجائے چڑ گیا اس کی عقل میں یہ بات آ گئی کہ اسٹالن کے نام پر دراصل مارکسزم کو جھٹلایا جا رہا ہے۔ اس نے مخالف رخ اپنایا اور کسی بھی لالچ پر روسی اور روسی ضمیمے کا پروپیگنڈا لٹریچر چھاپنا منظور نہیں کیا۔

پھر چین روس تنازعہ کھل کر سامنے آیا اور اس سوال پر پارٹی۔ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی اور مارکس وادی کمیونسٹ پارٹی میں تقسیم ہوئی۔ میں اور جیون شیخ دونوں مارکس وادی بن گئے۔ لیکن ڈھائی تین سال بعد یہ مارکس وادی پارٹی پھر تقسیم ہوئی اور ایک تیسری پارٹی بنی۔ ہم دونوں اس میں چلے گئے اور یہ سوچ کر خوش تھے کہ اب بات بنے گی اور دیس کی قسمت بدلے گی۔

لیکن اندولن پھر بکھرا اور جیون شیخ عوامی انقلاب کا جو خواب دیکھ رہا تھا وہ پھر دھول میں ملا۔ اس صدمے سے اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا۔

اس دوران جیون شیخ کی مالی حالت بھی بگڑ گئی تھی۔ بچت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پرچہ نکالنے کے لئے اسے دوستوں، ہمدردوں اور ادیبوں سے چندہ مانگنا پڑتا تھا۔ گھر میں اگر بچہ بیمار ہے تو وہ اس چندے کا ایک پیسہ بھی اس کی دوا پر خرچ نہیں کرتا تھا۔ پرچے کا حساب الگ اور گھر کا خرچ الگ۔ دونوں کو کبھی گڈمڈ نہیں ہونے دیا۔ فاقوں کی نوبت آ گئی۔ کرایہ کہاں سے چکاتا۔ مکان مالک سے جھگڑا کرنا بھی اسے گوارا نہیں تھا۔ وہ رہائشی پلاٹوں کا دھندا کرنے والے اپنے امیر دوست ستیہ پال کوشک کی اس اندھیری کوٹھری میں آ کر رہنے لگا۔ بچے آوارہ ہو گئے۔ بیوی سے گھر کی بری حالت دیکھی نہ گئی۔ وہ ایک دن چپکے سے جانے کہاں چلی گئی اور اس لڑکی کو اپنے ساتھ لے گئی جو تینوں بچوں میں سب سے بڑی تھی۔ اور جس کی عمر اٹھارہ برس کے قریب تھی۔

وہ بیوی اور بیٹی کی جدائی میں تڑپتا رہا اور انہیں تلاش کرتا رہا۔ جب کہیں کوئی سراغ نہ ملا تو یہ سوچ کر صبر کر لیا کہ انقلاب کی قربان گاہ پر آسائشوں اور عزیزوں کی قربانی دینی ہی پڑتی ہے۔ بڑا لڑکا بلگا ایک منی بس کے ساتھ صبح سے شام تک گھومتا اور مسافروں کو چڑھانے کی ہانک لگاتا

ٹن۔ چھوٹا لڑاکا جنگی (اس کا یہ نام محلے کے بچوں کے ساتھ لڑنے جھگڑنے کے کارن پڑ گیا تھا) گلی گلی گھوم کر کسی دوکاندار کے لئے کاغذ کی ردی اور خالی بوتلیں خرید کر لاتا تھا۔ ان دونوں کو جو مل جاتا اسی پر گذر بسر ہو رہی تھی۔ جیون شیخ کا اپنا سارا وقت اسی دوڑ دھوپ میں گذرتا تھا کہ پرچہ وقت پر نکلے۔ "نقارہ" جو اس کے آدرشوں کی اشاعت و ترویج کرتا تھا اسے اولاد سے بھی زیادہ عزیز تھا۔

اس حالت میں بھی اس نے خودداری اور ایمانداری پر حرف نہیں آنے دیا۔ وہ جب کبھی مجھ سے ملنے آتا ہونٹوں پر رجائیت کی مسکراہٹ لئے ہوتا۔ اپنے ذاتی دکھ تکلیف کی چرچا کسی سے نہ کرتا۔ چرچا کا موضوع ہوتی سیاست۔ عوامی جدوجہد سے متعلق جو بھی لٹریچر میرے پاس ہوتا، وہ مجھ سے لے جاتا۔ میری بیوی کہتی "جیون شیخ کھانا کھالو۔" وہ گردن اوپر اٹھا کر مضبوط لہجے میں جواب دیتا "بھابی میں ابھی دودھ پی کر آیا ہوں۔"

کپڑے لتے کی پھر کوئی سدھ بدھ نہیں رہی تھی۔ ایک دن جب میں بیٹھا لکھ رہا تھا وہ اچانک آیا۔ شیو بڑھی ہوئی، بوشرٹ اور پتلون بے حد میلی ایک دم بھوت دکھائی دیتا تھا۔ اس نے آتے ہی شکایت آمیز لہجے میں کہا "میں چینی سفارت خانے گیا۔ وہاں کسی نے مجھ سے بات تک نہیں کی۔"

"ان کپڑوں میں؟" میرے منہ سے یک دم نکلا۔

"کامریڈ، تم بھی کپڑے دیکھتے ہو؟" اس کے تیور بگڑ گئے۔

مجھے اپنی بات پر افسوس ہوا۔ میں جانتا تھا کہ ان کپڑوں میں جو شخصیت چھپی ہے وہ نہایت پاک صاف ہے، اس پر کہیں داغ دھبہ نہیں۔ لیکن ۱۹۶۲ء کے ہنگامے کے بعد سفارت خانے میں اس کے جو واقف لوگ تھے وہ چین لوٹ گئے تھے اور جو نئے آئے تھے وہ اس کی شخصیت کو کیسے پہچانتے سفارت خانے جانے کا مدعا یہ تھا کہ چینی ریڈیو کے ہندوستانی نشریہ کا جو اشتہار پہلے مل جاتا تھا اگر پھر مل جائے تو "نقارہ" کا اگلا شمارہ نکالنے میں آسانی ہو جائے۔

"نقارہ" کو وقت پر نکالنا ہی اس کی سب سے بڑی پریشانی تھی۔ ایک دن وہ اس کے لئے چندہ مانگنے نکلا۔ جون کی ٹھیک دوپہر میں باؤلوں کی طرح ادھر سے ادھر گھوم رہا تھا کہ سڑک پر گرا ہوا بٹوا ہاتھ لگا۔ دیکھا تو اس میں پینسٹھ روپے کے نوٹ رکھے تھے۔ کسی بھی ضرورت مند شخص کا اس چھپر پھاڑ کر آنے والی امداد سے خوش ہونا فطری بات تھی لیکن جیون شیخ کسی دوسری ہی مٹی کا بنا تھا۔ اس نے ایک پل کے لئے بھی اپنے فائدے کی بات نہیں سوچی۔ بٹوے میں اس کے مالک وکیل کا پتہ بھی تھا۔ وہ اسی تپتی دوپہر میں وکیل کے مکان پر پہنچا۔ دستک سن کر وکیل نے دروازہ کھولا تو سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر بھویں چڑھ گئیں "کیا ہے، دیکھتے نہیں آرام کا وقت ہے؟" جیون شیخ نے ہاتھ آگے بڑھا کر کہا "آپ کا بٹوہ۔" وکیل نے بٹوہ لے لیا، کھول کر تسلی کر لی کہ پیسے موجود ہیں اور دروازہ پھر بند کر لیا۔ جیون شیخ کو پانی تک کو نہیں پوچھا۔

جب تک اندولن چلا وہ پرچہ محنت اور جوش و خروش سے نکالتا رہا۔ لیکن اندولن بکھرا تو اس کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ یہ فیصلہ کرنا ممکن نہیں تھا کہ کون گروپ صحیح اور کون غلط ہے۔ وہ اپنے کو جوڑے تو کہاں جوڑے؟ پرچہ نکالے تو کس بل بوتے پر؟ چندہ مانگے تو کیسے مانگے؟

وہ پریشان حالت میں میرے گھر آیا، اور آتے ہی بولا "یار! میں تو تمہارا گھر ہی بھول گیا تھا، پوچھ پوچھ کر بڑی مشکل سے آیا ہوں۔"

کیسے یقین کروں کہ جیون شیخ کو میرا مکان ہی بھول گیا۔ بھونچکا سا اس کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ میں کچھ کہوں نہ کہوں، وہ پھر بولا "بھلا ہو کونے کی اس سٹال والے کا، اس نے بتایا تب آیا ورنہ میں اب بھی ادھر ادھر بھٹکتا رہتا۔" وہ رکا اور تھوڑے توقف کے بعد بولا "خیر اب سنو میں ایک خاص کام سے آیا ہوں۔"

"خاص کام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پرچہ تو اب نکلنے کا نہیں، ایک نئی اسکیم سوچی ہے۔ بتاؤ تم اس میں میرا ساتھ دوگے؟"

"پہلے یہ تو پتہ چلے کہ اسکیم کیا ہے؟"

"اسکیم بہت اچھی ہے۔ تمہاری اچھی کہ نئی نسل کا مستقبل سنورے گا اور انقلاب کی خدمت ہوگی۔" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیا اور ہونٹوں پر ایک ایسی مسکراہٹ نمودار ہوئی جو میں نے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ "ہم ایک نیا تعلیمی ادارہ کھولیں گے۔ اس میں بچوں کو اس ڈھنگ سے تعلیم دی جائے گی کہ انہیں انگریز کی ذہنی غلامی سے نجات ملے گی۔ شروع کرنے کے لیے جگہ چاہیے اور فرنیچر چاہیے۔ اس کی ذمہ داری کوشک جی نے لی ہے۔ اب بتاؤ تم میرا ساتھ دوگے؟"

"ضرور دوں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"بس یہ ادارہ شان سے چلے گا۔ دن کو بچے پڑھیں گے اور رات کو پاس پڑوس کے مزدوروں کو پڑھایا کریں گے۔ اب میں چلتا ہوں۔" اس نے جوش اور مسرت میں بھر کر ہاتھ ملایا اور مسکراتا ہوا چلا گیا۔

میں کچھ لمحے ساکت اور خاموش بیٹھا اس مسکراہٹ پر غور کرتا رہا، جو اسکیم بتاتے وقت جیون شیخ کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی تھی اور جو میں نے پہلی مرتبہ دیکھی تھی۔ یہ مسکراہٹ بڑی عجیب تھی۔ مکان بھول جانے کی جو بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی وہ اس مسکراہٹ نے سمجھا دی۔ اسکیم کے بارے میں مجھے معلوم تھا کہ نہ نو من تیل ہوگا اور نہ رادھا ناچے گی۔

تین چار دن بعد وہ پھر آیا اور آتے ہی پہلے یہ بتایا کہ میں تمہارا مکان پھر بھول گیا تھا۔ "ٹال والے سے پوچھ کر آیا ہوں" وہ کہتا چلا گیا۔ "عورت مہان ہے۔ عورت کے بغیر گھر سونا ہے۔ بچوں کو ماں کی اور مجھے جیون ساتھی کی ضرورت ہے۔ عورت مل جائے تو میں تعلیمی ادارہ اطمینان سے چلاؤں گا۔ تمہیں جیون ساتھی کھوجنے میں میری مدد کرنی ہوگی۔ کروگے نا؟"

"ضرور کروں گا۔" میں نے بلا تامل ہامی بھری۔

اس کے ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ نمودار ہوئی جو مجھے عجیب لگی تھی۔

شام کو جب میں کوئلے کے ٹال کے قریب سے گذر رہا تھا تو اس کے مالک نے مجھے روک لیا۔ "آپ کے پاس ایک سانولا سا آدمی آتا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں آتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"وہ پاگل تو نہیں؟"

میں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ حیرت سے اس کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔

"وہ تین چار دن پہلے بھی آپ کے مکان کا پتہ پوچھ رہا تھا اور آج پھر پوچھ رہا تھا۔"

"ہو سکتا ہے کسی صدمے سے اس کا دماغ ذرا ہل گیا ہو۔" میں نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

اس کے بعد گلی کے نکڑ پر جو آخری ملاقات ہوئی اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ بس یہی جیون شیخ کی کہانی ہے۔ میں نے اسے لکھ کر دوستی کا حق اور تقاضا پورا کر دیا ہے۔ آپ اپنی رائے خود بنائیے۔ میرا تو خیال ہے کہ وہ ناچیز نہیں تھا۔

پھول، چاند، تارے اور درخت

رفعت مرتضیٰ

رات بھر وہ کچی نیند سوتی جاگتی رہی۔ جب بھی اک ذرا ہوشیار ہوتی، یوں لگتا دل پر کوئی بیٹھا ہو۔ ایک بار اسی ڈوبنے ابھرنے کی کیفیت میں اس نے ایک بے چہرہ آواز سے کہا سنو ——میرے پاس تو کچھ بھی نہیں —— بس ایک اکیلا پن —— کوئی آنسرنگ مشین بھی نہیں۔ تو اگر کبھی تم مجھ سے کچھ کہنا چاہو تو میں کیسے سنوں؟ اور جب تم بات کرتے ہو تو بھی کیا اس میں پیغام درج ہوتا رہتا ہے؟ کیا کبھی تم یوں کرتے ہو کہ چپ بیٹھے بس میری باتیں سنتے رہو؟ میں یہ سمجھوں تم نہیں ہو مگر تم وہیں آس پاس کہیں ہو —— کیا تم ہو، نہیں ہو؟ اور میں نے جو کہا پھر وہ میں کیسے سنوں گی؟ کب سنوں گی؟ کوئی سن بھی رہا ہے یا نہیں؟ یہ کیسے جانوں گی؟ کوئی آواز ہی نہیں —— کوئی شور —— کوئی آہٹ —— میں کیسے سنوں؟؟

بے ربط باتوں اشاروں سے الجھتی وہ پھر سو گئی۔

اب وہ ایک پارٹی میں تھی۔ شاید کسی ہوٹل کی رسم افتتاح یا کسی اونچے افسر کے لئے کوئی اس کے شایان شان پارٹی دے رہا تھا۔ مہمان خصوصی نے ایکدم کھڑے ہو کر حکم دیا کہ کمرے کو فوراً ڈی سنٹی سائیز کر دیا جائے۔ کیا کیا جائے؟ اُس کے سوئے ہوئے ذہن کو ایک جھٹکا لگا؟ کیا ہوتا ہے وہ؟ اُس نے خواب میں اس آواز سے سوال کیا مگر کسی جواب سے پہلے ہی وہ سوال اُس کے ذہن کو تھپکی دیتا نکل گیا۔ اچانک وہاں پر موجود لوگوں نے گول گول گھومنا شروع کر دیا۔ چکر۔ متلی۔ وہ کچھ دیر کھڑی دیکھتی رہی۔ پھر وہاں سے ہٹ کر دروازے کی طرف چلی گئی مگر ابھی اس کا ایک پیر اندر ہی تھا کہ کہیں اندھیرے سے ایک عورت نکل کر تیز تیز چلتی اُس کی طرف آئی اور اُس کے پیر پہ پیر رکھ کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اُس کے چہرے پر چھائی مایوسی نے اُسے پھر سے پلٹ جانے پر مجبور کر دیا۔ وہ آہستہ چلتی واپس آئی تو مہمانِ خصوصی نے مسکرا کر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا: "یہ تمہارے شوہر کی ڈیٹ ہے ——"

"تمہاری ہی وجہ سے تو اس کی زندگی میں رونق ہے ——"

"تم چلی جاتیں تو یہ پارٹی اس کے لئے بے معنی ہو جاتی ——"

خواب پھر ٹوٹ گیا —— اس نے چونک کر سر اُٹھایا۔ شاید صبح ہونے والی تھی۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ بستر میں دائیں بائیں لگے بڑھا کر اُسے چھونا چاہا مگر دونوں ہی طرف بستر خالی تھا۔ اُس نے کروٹ بدلی اور پھر سے سونے کی کوشش کی۔ دل اور بھی بھاری تھا بوجھل اور اداس —— خواب پھر شروع ہو گیا ——۔

لوگ آ رہے تھے —— لوگ جا رہے تھے۔ وہ پھر اُسی کمرے میں تھی۔ اب وہاں جگہ جگہ سانپ رینگ رہے تھے۔ کمرے کے فرش سے باہر نکلے چلے جاتے تھے۔ ایک سانپ نے اُس کے کندھے سے لپٹ کر اُس کے کان میں سرگوشی کی۔ اُس نے کندھا جھٹک دیا تو بستر پہ رینگتے لہراتے سانپ اُس پر ہنسنے لگے۔ ان منہ کھلے سانپوں کو دیکھ کر اُسے ڈر بھی لگا مگر اس سے کہیں زیادہ ناپسندیدگی، نفرت، غصہ، حقارت۔

سانپ ہنس رہے تھے، پھنکار رہے تھے۔ پھن پھیلائے جھوم جھوم رہے تھے۔ کبھی آگے بڑھ کر اس سے لپٹنے کی کوشش کرتے۔ وہ اُن کو جھولتا جھوٹا چھوڑ کر پھر خواب سے باہر نکل گئی۔ باہر اندھیرا تھا اور سڑک کے اُس طرف گھروں کی ایک قطار تھی جن کے باہری دروازوں سے لگی سیڑھیاں سڑک تک اتر کر آتی تھیں۔ ایک مکان کے سامنے ایک گاڑی آکر ٹھہری۔ پھر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ کسی نے کمرے سر باہر نکال کر زور سے کہا کہ وہ تو پانچ مرے ہوئے لوگوں کو وہاں ڈال کر چلے گئے ہیں اور خواب سے باہر اندھیرے میں چلتے ہوئے اس نے بھی کہنے والے کو سنا اور آگے جھک کر دیکھا تو اُسے بھی اُن گھروں کے سامنے پانچ سیاہ بنڈل پڑے نظر آئے مگر گھر سے اتر کر نیچے سڑک پر آتی سیڑھیاں خالی تھیں۔ ویسے ہی جیسے سڑک سے اُٹھ کر اوپر گھر کے دروازے پر جاتی سیڑھیاں خالی تھیں۔ اُس کے اندر حقارت، غصہ، نفرت ایک جھاگ جیسا یکدم اُبل کر اُس کے حلق میں بھر گیا ——— "تم کو ہمت کیسے ہوئی؟ میں ہوں کس کے اختیار میں؟ اپنے؟ اُس کے؟ میں نے کچھ بگاڑا تھا تمہارا کیا؟" اُس نے حلق میں آتی اُبکائی کو روکنے کی کوشش کی اور آگے بڑھ کر پھر خواب میں داخل ہو گئی مگر داخل ہوتے ہی ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی۔

"یہ سب تو بہت بھیانک ہے!"

مجھے یہ ریلیشن شپ چاہیے؟

نہیں چاہیے؟ چاہیے: نہیں نہیں نہیں ———

چاہیے۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے سوراخوں بھرے کپڑے سے ایک کے بعد ایک تاگے نکالنے شروع کر دیئے۔

"ہاں چاہیے" ——— ایک بے چہرہ آواز نے آگے بڑھ کر اُسے سینے سے لگا لیا۔ اُس نے پھٹے ہوئے کپڑے کو دونوں ہاتھوں کی مٹھی میں دبا کر ہاتھ اُس کے سامنے کر دیئے۔

"چاہیے ———" اُس بے چہرہ آواز نے پھر سرگوشی کی تو وہ مسکرا دی اور اس بے چہرہ آواز کو ہوا سے لے کر پھول بنا کر بالوں میں سجانے لگی ———

"تم کتنا ہی ——— " مگر کچھ کہنے سے پہلے ہی اُس کی آنکھ کھل گئی۔

پورا بدن دکھ رہا تھا۔ دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں جو اس نے سینے سے بھینچ رکھی تھیں آہستہ آہستہ سینے سے جدا کیں اور دونوں ہاتھ پہلو میں جیسے بہت ڈھیلے ہو کر لیٹ گئے ——— ایک عجیب ہی تھکان تھی جو شاید رات بھر خوابوں میں آتے جاتے رہنے سے تو نہیں تھی مگر کچھ ایسی جو اس سے پہلے ایک بجلی کی طرح پورے بدن میں دوڑتی پھرتی ہے اور اس کے بعد ایک نرم حرارت بن کر رگ و پے میں آہستہ خرام ہو جاتی ہے۔ اس نرم حرارت کی خواہش نے تھکن کے احساس کو اور بھی بڑھا دیا۔ کچھ دیر یونہی لیٹی رہی، چاہتی رہی کہ پھر سو جائے۔ یونہی لیٹی خوابوں میں آتی جاتی رہے۔ پھر اُس نے کوشش کر کے پہلو بدلا اور بستر سے لگی میز کا دراز کھول کر کچھ اخبار، رسالے نکال کر پہلو میں رکھ لیئے۔ بستر کے سامنے کی کھڑکی روشن تھی اور کھڑکی کے چھجے پر کبوتروں کے چلنے پھسلنے، پر جھاڑنے، غٹرغوں، غٹرغوں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کھڑکی سے باہر دیکھتے، کچھ نہ سوچتے اُس میں پہلو میں رکھے اخباروں میں سے ایک اخبار اٹھایا اور بے دلی سے دیکھنے لگی پھر چوتھا صفحہ کھول کر اخبار کو تہ کرتے کرتے کتاب کے جیسا بنا کر اسے اپنے چہرے سے بہت قریب لا کر دیکھنے لگی۔ کچھ دیر یونہی دیکھتی رہی۔ پھر اُسے سینے پر رکھ دیا اور دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھا کر تکیے کے اوپر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ کھڑکی کے چھجے پر سے آتی کبوتروں کے چلنے اُڑنے، پر جھاڑنے پھسلنے اور رہ رہ کر غٹرغوں غٹرغوں کی آوازیں جیسے لوری کا کام کرنے لگیں۔ صبح کی ہلکی ہوا میں کھڑکی کا پردہ ہولے ہولے اُڑنے لگا۔ اُس نے پلکوں کی اوٹ سے کچھ دیر لہراتے پردوں پر دھوپ چھاؤں کو کھیلتے دیکھا۔ پھر سو گئی ——— چاروں طرف

ایک دھند چھائی تھی اور وہ ایک نزدیک سی دوری پہ کھڑا اسے اپنے پاس بلاتا تھا مگر اس کو قریب جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ پھر وہ خود ہی اس کے قریب آیا اور اُس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اُس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

"بہت یاد آتی ــــ" وہ بہت اداس آواز میں آہستہ آہستہ اُس کے دل میں اُترنے لگا ــــ یہ نہ سمجھنا میں بھول گیا۔ وہ خوشبو اب بھی میری سانس میں رچی ہے اور جو تصویر تمہاری میری نظروں کے سامنے ہے ــــ جب میں رات میں لیٹتا ہوں تو رات بھر سونے نہیں دیتی" ــــ وہ چپ ہو گیا اور اُس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے اُس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔

"کیا محبتوں کا موسم ہے یہ ــــ"، اُس نے سرگوشی کی۔

"ہاں۔ موسم تو آن پہنچا۔ تم نے دیکھا نہیں؟ دشتِ تنہائی میں سوئے طائروں کو دیکھا نہیں؟ کیسے پر جھاڑتے اٹھ بیٹھے ہیں۔ سردی کی اداس لمبی شاموں کی تنہائی کے مارے ہوئے ــــ ہارے ہوئے دل میں ایک ہی مہم اور کسی جستجو میں نکل کھڑے ہوئے ہیں ــــ کیا تم نہیں نکلو گی؟ ــــ کیا تم نہیں!!" وہ اُس کے قریب، بہت قریب چلا آیا۔ ایک گھبراہٹ میں وہ جلدی سے پیچھے ہٹی اور اس کے ساتھ ہی خواب ٹوٹ گیا۔

خواب؟ یہ خواب؟ احساس کی شدت سے اُس کی سانس رکنے لگی ــــ تم یہ چھپا چھپی پیغام کیوں بھیجتے ہو؟ اُس نے پہلو میں دھڑکتے دل سے کہا۔ میں بات کو کب کب، کیسے کیسے چھپاؤں؟ بات جو تمہارے من میں ہے ــــ بات جو میرے من میں ہے ــــ بات جس کے سننے کو میں کب سے انتظار میں بیٹھی ہوں ــــ مگر تم یہ چھپا چھپی پیغام کیوں بھیجتے ہو؟ اُس نے اضطرار میں بائیں پہلو پر ہاتھ رکھ دیا اور جیسے ایک بے چینی میں پہلو دبا دبا کر ابھر ابھر کر اوپر آتی بے چینی کو روکنے کی کوشش کرنے لگی۔

"پیغام ــــ"، مگر اس نے بات مکمل کرنے سے پہلے ہی سینے پر سے اخبار اٹھایا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بستر پر رکھے دوسرے اخبار رسالے پھر سے میز کے دراز میں رکھ دیئے اور بستر سے نکل گئی۔

مگر وہ بات جو خواب میں شروع ہوئی تھی ابھی جاری تھی۔ ریلیشن شپ ختم ہو کر بھی کبھی ختم نہیں ہوتی۔ پہلے ہونے کا بندھن، پھر نہ ہونے کا بندھن ــــ اور بات شروع ہوئی کیسے؟

"مجھے کیا معلوم کیسے شروع ہوئی؟" اُس نے اخبار کو گھٹنوں پر رکھا اور دونوں ہاتھ اُس پر پھیرتی، سلوٹیں برابر کرنے لگی۔

"مجھے کیا معلوم کیسے شروع ہوئی تھی" ــــ اس نے مسکرا کر کچھ شرما کر نگاہیں پھیر لیں۔

"بات، کیا تمہیں یاد نہیں؟ کچھ بھی یاد نہیں؟"

"نہیں" اُس نے آہستہ سے کہا۔ پھر سر اٹھا کر خود اپنی ہی آواز کو سننے کی کوشش کی مگر وہ ہوا میں لپٹی دوسری آوازوں سے الجھتی کہیں دور چلی گئی۔ "میں بتاؤں تم نے کب کب چاہا مجھے ــــ کب کب یاد کیا؟ جیسے آج ــــ جیسے اب ــــ بتاؤں؟ بتا دوں؟"

"نہیں" ــــ اس نے ایک ہاتھ کی مٹھی میں دوسرے ہاتھ کو پکڑ کر زور سے دبا دیا۔

"اچھا پہلے کی بات جانے دو ــــ اب آؤ، آج کی بات کرو ــــ مجھ سے بات کرو ــــ بات تو کرو ــــ"۔

"کیا بات کروں؟" کچھ دیر بعد اس نے آہستہ سے کہا۔

"کوئی بھی بات ــــ کچھ بھی بات ــــ"، زمین سے لپٹا کہرہ آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگا۔ دھند کے بادلوں سے لڑتی، راستہ بناتی ایک چھوٹی سی کرن مسکراہٹ بن کر اُس کے چہرے پر پھیلنے لگی۔ اُس نے گھٹنوں پر رکھے اخبار پر دونوں ہتھیلیاں رکھ دیں "بات کریں ــــ مجھ سے بات کریں"؛ اور بات رفتہ رفتہ، آہستہ آہستہ ہونے لگی۔

آج اپنے بارے میں کچھ بتا ہی دو ــــ

"سوال مناسب تو جواب مناسب !"

وعدہ ؟

"وعدہ !"

دیکھنا چاہتا ہوں تم کیسی ہو ــــ

"وہ تو ممکن ہی نہیں "

اچھا تم بولو ــــ مدد کرو میری۔ میں تصویر بناتا ہوں۔

"تو سوال کیا ہے پھر آپ کا ؟"

قد ــــ

"قد ؟ ــــ" وہ الجھن میں پڑ گئی

کیوں کوئی قد نہیں تمہارا ؟

"ہے بھی اور نہیں بھی ــــ"

بحالت میں نہیں رہوں گا ــــ اپنا وعدہ یاد کرو۔

"قد پانچ فٹ تین انچ ــــ" اس نے رکتے رکتے کہا۔

وزن ؟

"وزن ــــ زیادہ "

کتنا زیادہ ؟

"بس زیادہ "

دو سو ؟

"خدا کے لئے !"

ڈیڑھ سو ؟

"توبہ !"

ایک سو تیس ؟

"ایک سو چھتیس ــــ" اس نے آہستہ سے کہا۔

وہ ہنس دیا ــــ تو گداز بدن ہو ؟

"پتہ نہیں "

اور اس سے آگے ؟

"اس سے آگے یہ کہ چہرہ گول ہے اور آنکھیں ؟ ــــ پتہ نہیں کیسی ــــ

نشیلی یا ــــ درد بھری ــــ یا کنول اداس ــــ "

"اجی نہیں ــــ بس کچھ کچھ ایسی جیسی چینی جاپانی ــــ"
اور رنگ ؟ کالا ؟
"نہ نہ"
بادامی ؟
"کچھ ایسا ہی۔ مگر پہلے یہ طے ہو کہ آپ کس بادام کی بات کر رہے ہیں"
تو کیسا بادام ہو ؟ چھلکے والا ؟ بغیر چھلکے کا ؟
"بغیر چھلکے کا ڈرل آؤٹ !"
بال ؟
"بال ــــ بال کالے ہیں بھی اور نہیں بھی۔ کہیں دھوپ کے رخ پر جاؤں تو بھورا رنگ جھلکنے لگتا ہے ــــ مگر اب جلد ہی یہ دونوں رنگ غائب ہونے والے ہیں۔ دائیں کان کے اوپر تو شاید چند ہی دنوں میں چاندی آجائے گی ــــ"
اوہ ــــ !
"کیوں کیا ہوا ؟"
اب کیا پوچھتی ہو کہ کیا ؟ کیسے بتاؤں کہ کیا ہوتی ہے اس عمر کی عورت !
"مجھے پوچھنا بھی نہیں"
پوچھو نہ پوچھو ــــ ایک دن بتاؤں گا ضرور ــــ بتانے آؤں گا ضرور ــــ
"کسی خوش فہمی میں نہ رہیئے آپ ــــ"
دیکھتے ہیں ــــ دیکھیں گے ہم بھی۔ اور چوٹیاں گوندھتی ہو یا بال کاٹ رکھے ہیں ؟
"کٹے ہوئے ــــ"
چہرے کے گرد جیسے چاند کا ہالہ، جیسے ہاتھوں کے حلقے میں پیالہ، جس پر جھک کر پینے کو جی چاہے ؟
وہ انجان ہو گئی۔
اور ہونٹ کیسے ہیں ؟
"ویسے ہی جیسے ہوتے ہیں"
موٹے موٹے، بھرے ہوئے ــــ جیسے شہد رس ــــ
"بس بس، پٹڑی سے اترنے کی ضرورت نہیں ــــ"
اجی یہاں اترنا ہی کون چاہتا ہے ــــ
"اب رہنے بھی دیجئے نا ــــ اس سے آگے نہیں ــــ اور یہ ہنسی کیوں ؟"
کچھ کہوں گا تو ناراض ہو جاؤ گی، پھر کبھی بتاؤں گا موقع آنے پر ــــ
وہ چپ رہی ــــ
چپ کیوں ہو گئیں۔ اور بھی تو کہو کچھ۔ اچھی اچھی باتیں ــــ

"اور کیا بتاؤں؟ سب تو کہہ دیا۔ رہے ہاتھ پیر تو وہ سب کی طرح میرے بھی دو ہاتھ ہیں۔ دس انگلیاں اور ———"

وہ تو میں خود ہی دیکھ لوں گا گن کر ———

اُس کے پیٹ میں تتلیاں اڑنے لگیں، جیسے گدگدی کرنے لگیں۔

اور ——— آگے چلو ———

"اور کیا؟ سب تو بتا دیا۔ اب چھٹی!"

ابھی کہاں ——— ابھی تو بات آدھی بھی نہیں ہوئی۔ بہت باقی ہے ابھی تو ———

"تو پھر کوئی اور بات کیجیے ———"

اور بات کیا ——— اب یہاں تک آگئی ہو تو بھاگو نہیں۔ ——— اس لیے کہ میں اب بھاگنے نہیں دوں گا ———

"واہ! ——— بھاگ کون رہا ہے ——— ؟ میں تو بھاگ سکتی ہی نہیں ———"

یہ ہوئی ناں بات! تو بولو پھر!

"کیا بولوں؟"

اچھا ایک شعر سنو اس کے بعد بولنا۔ سراج الدین سراج کا ہے ———

"سنائیے ———" اُس نے اشتیاق سے کہا چپ ہو کر سنتی رہی۔ پھر بالکل ہی خاموش ہوگئی۔

سنا؟

"فضول ——— بالکل ———" اُس نے رُکتے رُکتے کہا۔

تو میں نے کب کہا کہ میرا ہے۔ سراج الدین سراج کا ہے۔

"جس کسی کا بھی ہو، مجھے نہیں سننا ———"

تو اس کے بغیر تصویر مکمل ہو ہی نہیں سکتی ———

"تو رہنے دیجیے نامکمل۔"

تم نے لمبا گداز بدن ہو۔ اس گداز کی تقسیم بتا دو ———

اُس کے اندر ایک پھلجھڑی چھوٹ گئی ———

"بس اب بند کر رہی ہوں۔" اُس نے تیز چلتی سانسوں کے بیچ کہا۔

نہیں نہیں، ابھی ٹھہر جاؤ ——— ایک منٹ اور رکو ——

"اب نہیں رکوں گی ———"

اچھا بس ایک بات ——— صرف ایک بات اور سن لو ———

"نہیں سنتی میں ———"

یہ بھی نہیں! یہ ——— یہ ——— یہ بھی نہیں؟

وہ سن ہو گئی ———

سنا تم نے؟ میرے پیار سُنے تم نے؟

"کیا؟ کیا سنا میں نے؟" اس نے ہاتھ کی ہتھیلی تپتے ہوئے رخسار پر رکھ دی۔

یہ ——— یہ ———

"نہیں سننا ——— اور نہ ہی سننا ہے مجھے۔ بند کر رہی ہوں بس ———"

ٹھہرو ——— ابھی نہ جاؤ ——— کچھ دیر تو اور رُک جاؤ ———

"اب نہیں ——— بالکل بھی نہیں ———"

پھر بات کرو گی؟ مگر کوئی شرط نہ لگانا ——— پھر پیار نہ کرنے کا کوئی وعدہ نہیں کروں گا ———

"نہیں ——— بالکل بھی نہیں ———" اس نے بات بند کر دی اور دیر تک سینے پر ہاتھ رکھے ہانپتی رہی۔ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو وہ تمتمایا ہوا لال چہرہ اسے کسی اور کا چہرہ لگا اور پیٹ میں پریاں تھیں کہ ہنستی ہی چلی جارہی تھیں ——— بات بند تو اس نے کر دی تھی مگر دل ابھی بات ہی میں اٹکا تھا ——— بات ہوتی رہے۔ کبھی ختم نہ ہو۔ اور ختم کرنے کی جلدی کیا تھی ——— ہر بات کی ایک منزل ایک کلائمکس بھی ہوتا ہے اور وہ کلائمکس کے اس عمودی پہاڑ پر آہستہ آہستہ مگر بغیر پڑاؤ کے بس چڑھتے ہی رہنا چاہتی تھی ——— آگے اور آگے ——— مگر کبھی وہاں پہنچنا نہیں چاہتی تھی۔ منزل کی جستجو اور کھوج منزل پا جانے سے کہیں زیادہ اور بھرپور لذت کا وعدہ ہوتی ہے۔ بات کو ابھی جاری رہنا ہے ——— بات ابھی جاری تھی۔

کب مل رہی ہو پھر؟

"یہ بات کہی کس نے آپ سے؟"

کون کہے گا مگر یہ دل ———!

"اُفوہ ——— بہت شاعری ہو رہی ہے!"

شاعری ———! اس کو شاعری کہتے ہیں۔ اس بے چینی اور بے تابی کی تصویر کھینچنا لفظوں کے بس میں ہو سکتا ہے کیا؟

"تو کون کہہ رہا ہے بے تاب اور بے چین ہونے کو؟"

تم نہیں کہو گی تو اور کون کہے گا ——— حق ہے تمہیں ———

"مجھے نہیں چاہیئے یہ حق ——— رکھئے اپنے ہی پاس!"

تم چاہو نہ چاہو ——— ہم نے تو دے دیا، اور کچھ دے کر ہم پھر واپس نہیں لیتے۔

"اوکے ——— نو پرابلم ———" وہ ہنس دی۔

دیکھو ایک بات کہوں؟

"کہئے ——— ہمیں تو حق دیا ہے آپ نے سننے کا!"

تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہوگا مجھ سے ملنے میں۔ وعدہ ہے میرا ———

"کس بات کا؟"

کیوں ہر بات کی تفسیر تفصیل مانگنے بیٹھ جاتی ہو۔

"تو مجھے کیا معلوم آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔ پیر فقیر ہوں میں کیا؟"

جانتا ہوں سب ——— چلو پھر یہی بتا دو کہ تم کیا کرتی ہو؟

"کچھ بھی نہیں۔"
اور وہ
"کچھ بھی نہیں یہ" وہ اخبار کے حاشیے میں پھول پتے بنانے لگی۔
تو پھر؟ ــــ اوہ ــــ اچھا اچھا سمجھ گیا۔ بس پھر کیا ہے۔ گھبرانے کی بات ہی نہیں کوئی۔
"یہ تو آپ یوں بات کر رہے ہیں جیسے پہلے سے طے ہو!"
بالکل ــــ اس میں شک کی گنجائش ہی کہاں ہے ــــ
"جی واہ ــــ کون کہتا ہے ــــ یک طرفہ فیصلہ کا حق آپ کو کس نے دیا ہے۔"
بس ہے ہمیں حق ــــ اور یہ تو ہونا ہی ہے ــــ اور ہو گا بھی ــــ انشاء اللہ ــــ
"اُفوہ ــــ اس انشاء اللہ کا کیا موقع تھا یہاں؟"
تم تو کہتی تھیں تمہیں کیا معلوم کیا بات کر رہا ہوں ــــ جواب کیسے دیئے پھر؟
وہ چپ ہو گئی۔ پھول پتوں میں رنگ بھرنے لگی۔
کہاں ہو؟
"جی فرمائیے ــــ یہیں ہوں۔ سن رہی ہوں آپ کی دیوانی باتیں" وہ دھیرے دھیرے بولی۔
تو پھر طے ــــ؟
"کیا طے؟ ایسی باتیں مت کریں آپ مجھ سے۔ جو میری سمجھ سے باہر ہوں اور سننے کی بھی ضرورت نہیں آپ کو ــــ"
ناراض کیوں ہو بھئی ــــ
"تو آپ باتیں ہی ایسی کرتے ہیں ــــ"
اچھا تو پھر جانے دو ــــ اچھی اچھی باتیں کرو اور مجھے معاف کر دو ــــ
"نہیں کرتی معاف ــــ غصہ آ رہا ہے مجھے ــــ"
اچھا بھئی اچھا ــــ جو کہا سب واپس لیتا ہوں۔ اب خوش ــــ
وہ پھر چپ ہو گئی ــــ
چپ کیوں ہو گئیں پھر ــــ
"سن رہی ہوں ــــ" وہ اپنے میں آپ مسکرا دی۔
تو پھر طے ــــ؟
"آپ تو بالکل طوطے کے جیسے ہو گئے ہیں ــــ کیا طے ہے؟"
یہی کہ ملو گی ــــ ضرور ملو گی ــــ اور دونوں مل کر کہیں بھی چلیں گے ــــ کہیں بھی۔ جہاں کوئی جاننے والا نہ ہو ــــ
"اچھا؟ کیا واقعی؟"
ہاں ہاں، کسی بھی جگہ ــــ کسی نیوڈسٹ بیچ پر ہی سہی ــــ
"ضرور ضرور جیسے آپ کے اشارے کا ہی تو انتظار ہو مجھے ــــ"
اچھا تو پھر کہیں اور چلے جائیں گے ــــ جہاں بھی تم کہو گی۔ مگر اتنا ضرور خیال رکھنا کہ وہاں بس تم ہو اور میں ــــ کوئی اور جاننے والا نہیں

دور، دور تک بس گھاس ہی گھاس جس پر دور تک لوٹ لگاتے چلے جائیں۔

وہ پھر چپ ہو گئی، سوچنے لگی کچھ، مگر وہ بہت پہلے کی بات تھی جب کوئی بستر میں لوٹ لگا رہا تھا اور اسے بھی شرکت کی دعوت دے رہا تھا۔۔۔ اس نے سر جھٹکا، اب اس کا کیا محل؟

کہاں ہو؟ بولو، بولو۔۔۔ چپ کیوں ہو جاتی ہو بار بار۔۔۔ چپ ہو جاتی ہو تو لگتا ہے میں بالکل تنہا رہ گیا ہوں۔۔۔

"تو آپ بولتے جائیے۔۔۔ میں سن رہی ہوں۔"

صرف سننا ہی کیوں؟ کچھ بولو بھی تو۔۔۔ تمہاری آواز میں تو قُم ہے میرے لئے۔ تم بولتی رہو، میں مر مر کے جیتا رہوں۔۔۔

"واہ۔۔۔ واہ۔۔۔ آپ تو واقعی شاعر ہیں۔"

تو پھر طے ہے کہ کہیں چلیں گے؟

"یہ سوئی ایک ہی جگہ کیوں اٹک کر رہ گئی ہے؟ آگے چلئے ناں!"

وہ تم آنے ہی کہاں دیتی ہو۔ اتنی دیر سے اسی کی تو بات کر رہا ہوں

"اُفوہ۔۔۔"

تمہیں دیکھنے کو جی چاہتا ہے یار۔۔۔ اتنا بہت دل چاہ رہا ہے۔۔۔ کبھی تم نے یوں کیا ہے؟

"کیا؟"

ایک ہی وقت میں دو سے محبت؟ کہ اس سے محبت کرو اور دھیان میں وہ ہو۔۔۔ اس کو چھونا اور اُس کو چاہنا؟ اس کے قریب ہونا اور اس قربت میں اُس کو دیکھنا۔۔۔ اس کو اپنی محبت کا نذرانہ پیش کرنا اور اُس سے کہنا کہ قبول کرو۔۔۔ کہ یہ سب تمہارے لئے ہے۔۔۔!

"اور دل میں کیا؟ بے ایمانی؟؟"

یہ تو کوئی ایسی بُری بات نہیں۔ وہ بھی خوش، میں بھی خوش۔ وقت آنے پر تمہیں بھی خوش کر دوں گا۔ خوش کرنے، خوش رہنے پر میرا ایمان! کسی کو بھی نظر انداز کر کے کسی کا بھی دل نہیں دکھاتا کبھی۔۔۔

"بے ایمان!"

یہ تم بار بار بے ایمان کیوں کہتی ہو مجھے؟ خوش ہونے، خوش رہنے، خوش کرنے میں کوئی حرج ہے کیا؟

"تو پھر شتر مرغ کہوں؟"

وہ بھی کیوں؟

"وہ بھی تو ریت میں سر دے کر خوش ہوتا ہے کہ کہیں کوئی خطرہ نہیں۔ چاروں طرف بس شانتی ہی شانتی ہے۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ کیا وہ اپنے اندر۔۔۔ اندر کے اندر۔۔۔ کیا نہیں جانتا؟"

تم تو سیریس ہو گئیں۔ چلو چھوڑو پھر اس بات کو، اپنی بات کرو۔۔۔ میری بات کرو!

"تو پھر کہئے۔۔۔ سنائیے اپنے بارے میں کچھ۔۔۔"

میں پیار بہت اچھا کرتا ہوں رکسترین لوزہوں۔ جب میں تمہیں چوموں گا، تمہیں پھر اس کے بعد کچھ اچھا نہیں لگے گا۔۔۔

وہ ہنس دی، پیٹ میں پھر سے پھر پھر تتلیاں اُڑنے لگیں۔ اُس نے پیٹ پر ہاتھ رکھ دیا۔

ساتھ لیٹ کے لیٹنا اچھا لگتا ہے، کبھی کچھ نہ کہنا، بس چپ چاپ رہنا، بالوں کو کبھی الجھا دینا، کبھی سلجھانے لگ جانا، کمر کو آہستہ سے چھو لینا اور خوشبوؤں کو گھونٹ گھونٹ پینا۔۔۔ سبھی اچھا لگتا ہے، اور کبھی۔۔۔ اُس کی سانس رُکنے لگی۔

کیا ہوا؟

"آپ کو ایسی باتیں کرنا سکھایا کس نے؟"

اُس نے جس نے مجھے تمہارے لئے اور تمہیں میرے لئے بنایا۔

"بہت نمونے کی چیز ـــ بہت چھانٹ کر بنائی ہے بنانے والے نے" ـــ وہ پھر ہنس دی۔

تو اتنی دیر سے یہی تو بتانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ایک بار مل کر دیکھو تو سہی ـــ

"تو پھر دیکھ ہی لیں گے ایک دن۔ کبھی بنا ہی لیں گے پروگرام ـــ مگر ابھی تو کچھ کام ہے ـــ اجازت؟" وہ بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو دبانے لگی ـــ سہلانے لگی۔ کتنی جلدی دکھ جاتی ہیں انگلیاں ـــ اور انگلیاں ہی کیا ـــ مگر پھر جلدی وہ سنبھل گئی۔

اچھا پیار تو دو ایک ـــ

"وہ کیوں بھلا؟"

بس ایک ـــ

"ایسی باتیں نہیں کریں آپ۔ ہمارا آپ کا وعدہ ہے ـــ یاد ہے کیا کہا تھا؟"

کوئی ایسا وعدہ نہیں ـــ بس ایک بار، بس یہی ایک تو مانگتا ہوں ـــ

وہ ہنس دی پھر پاس رکھا گلاس اٹھایا اور شیشے کی سطح پر زور سے انگوٹھا مسل کر چیکارنے کی سی آواز پیدا کی۔

اب دے بھی دو ناں یار ـــ

"دے تو دیا ـــ" وہ شرمیلی سی ہنسی ہنستی ہوئی بولی۔

وہ کہاں ـــ مجھے تو نہیں ملا ـــ

"تو یہ لیجئے ـــ" اُس نے ایک بار پھر گلاس پر انگوٹھا گھس دیا۔

اب بولو تم اس کے بعد کیا کروں گا میں؟ ـــ بھلا کیا کروں گا میں؟؟

"بس اب جاتی ہوں ـــ آج کے لئے بہت ہے ـــ" اُس نے ہنستے ہنستے بات ختم کر دی۔

میں کیا بہت اِنوالو ہو گئی ہوں؟ اس نے خود سے پوچھا ـــ مگر وہ بھی تو بہت چاہتا ہے مجھے۔ کومٹ منٹ ہو سکتی ہے؟ شاید نہیں، شاید ہو جاتی مگر ہو نہیں سکتی، ویسے ہی جیسے بعض اوقات ہو کر بھی نہیں ہوتی ـــ اُس نے کچھ اور سوچنا چاہا جیسے ـــ جیسے جی جان لڑا کر گھر کی صفائی، کھانے بنا بنا کر فریزر بھر دینا ـــ سبزی چھیلنا۔ چاول چننا ـــ ہوور کرنا ـــ چھتوں دیواروں پر سے جالے اتارنا، باغ میں کھلے گلابوں پر منڈلاتے بھنورے دیکھ دیکھ ہنسنا اور تتلیوں کے سنگ اُڑ جانا ـــ اور کچھ بھی کرنا ـــ جیسے ـــ جیسے ہاتھوں پیروں کو ویکس کرنا اور چکنی پنڈلیوں کے ریشم پر سے پھسل پھسل جانا ـــ اس نے ایک اچٹتی سی نظر اپنے پیروں پر ڈالی ـــ ناخن فائل کرنا ـــ اور ـــ اور ـــ کتنے کام ہوتے ہیں زندگی میں، سوچنے کی فرصت بھی کب ملتی ہے اور لوگ بنا کچھ سوچے، سوچنے کے لئے وقت کا انتظار کرتے مر جاتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں کہ سوچتے سوچتے، سوچتے ہی رہ جاتے ہیں اور کچھ کرنے کی آرزو ساتھ لئے ختم ہو جاتے ہیں۔ کوئی بات ـــ کوئی خیال ـــ گفتگو کا کوئی ٹکڑا کتنے خیالوں، کتنی آرزوؤں کا پیش رو بن جاتا ہے جو کبھی وجہِ تسلی اور کبھی باعثِ احساسِ محرومی۔

میں کیا بہت اِنوالو ہو گئی ہوں؟؟؟

ـــ تو کوئی کومٹ منٹ نہیں؟

"نہیں"

انوولمنٹ کا کوئی وعدہ نہیں ؟
"کوئی وعدہ نہیں ۔"
اوکے —— ابھی اس بات کو یہیں کیوں نہ چھوڑ دیں —— کچھ اور بات کرتے ہیں ۔
"کیا بات ؟"
یہی کہ تم کیا کرتی ہو —— کیا کرتی رہتی ہو ——
"میں کیا کرتی ہوں !" وہ ہنس دی ۔
ہنسی کیوں ؟
"بے موقع ہنسی تھی ۔ جانے دیجئے ۔"
اچھا پھر کہو کیا کرتی رہتی ہو ——
"پڑھتی ہوں ۔"
کیا پڑھتی ہو ؟
"کچھ بھی —— جو بھی ہاتھ لگ جائے ۔"
اور کیا کیا کرتی ہو —— ؟
"شعر پڑھتی ہوں ۔"
صرف پڑھتی ہو ، کہتی نہیں ؟
"ہوں ۔"
ہوں کیا ؟
"بس یہی کہ کبھی کبھی کہہ بھی لیتی ہوں ، کبھی نہیں بھی کہتی ۔ کبھی کچھ شعر اترنے لگتے ہیں ۔ کبھی کچھ شاعری ——"
مرحبا —— جزاک اللہ —— کچھ ادھر بھی عنایت ہو ——
"وہ تو نہیں ——"
وہ تو کیوں نہیں ؟
"اس لئے کہ شاعرہ ابھی حجرے سے باہر نہیں نکلا اور نہ ہی نکلنے کا کوئی ارادہ ہے ——"
مگر ہم تو اپنے ہیں جاناں —— ہم سے کیا پردہ ——
"وہ تو رہے گا ۔"
خیال ہے تمہارا —— پردہ تو کب کا چاک ہو چکا ۔ تمہیں خبر ہی نہیں ہوئی ؟
"اونہہ ——!"
اونہہ کیا —— چلو اب کچھ سنا ہی دو ——
"کہہ دیا نا ——"
کچھ کہا نہیں ۔ کہہ بھی دو اب —— کہہ ڈالو اب تو ——

کچھ دیر کے لئے مکمل خاموشی چھا گئی۔

"کبھی تو ہم بھی ——،" اُس کی نرم آواز اس خاموشی میں آہستہ سے اوپر اٹھی۔

"کبھی تو ہم بھی کسی راہ سے گزرتے ہوئے ——

صدا تمہاری سنیں گے، ٹھٹھک کے ٹھہریں گے ——

پھر اس کے بعد تو جو بھی نصیب، دیکھیں گے ——

"ابھی تو یاد ——،" وہ چپ ہو گئی

کوئی کچھ بولا نہیں۔ کہیں کوئی آواز نہیں ——

"آپ ہیں؟ کچھ دیر بعد اس نے سرگوشی کی۔ مگر کہیں سے کوئی آواز آگے بڑھ کر اُسے سینے سے لگانے نہیں آئی۔

"ہے ریگزار کوئی ——،" اُس نے پھر کہنا چاہا مگر آواز ٹوٹ گئی۔

"کس لئے؟ —— کس کے لئے ——؟" اُس نے چیخ کر کہا اور گھٹنوں پر رکھے اخبار کو دونوں ہاتھوں سے گولا بنا کر اتنی ہی طاقت سے جتنی طاقت اُس کے بس میں تھی —— بستر پر پھینک دیا۔

تیسرا روز اُس کے آنے کا تھا۔ اُس نے اخبار کا گولا اٹھایا اور اُسے گھٹنوں پر رکھ کر دونوں ہاتھوں سے اس کی سلوٹیں برابر کرنے لگی۔

زہے نصیب کب سے ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا ہوں۔ سلام مچھلی شہری کی برسوں پرانی نظم روز پڑھتا ہوں اور سر دھنتا ہوں اور تمہیں یاد کرتا ہوں۔

"وہ کیا؟" وہ ہنس دی —— "میں بھی سن سکتی ہوں؟"

تمہارے ہی لئے تو ہے —— تمہیں نہیں سناؤں گا تو اور کس کو —— سنو پھر ——!

بہت اداس تھی تنہا تھی تم سے ملنے لگی

تم اپنے دل میں یہ سمجھے مجھے محبت ہے ——

"محبت کا وعدہ تو کبھی کسی نے نہیں کیا تھا ——"

جانتا ہوں مگر یہ دل مانے بھی —— کوئی تو اتا پتہ دو اپنا۔ یہ زندگی —— یہ دوری —— جینے نہیں دے رہی اب ——

"کیا بہت یاد آئی؟"

تو پھر کیا؟ ذرا کہیں کوئی آہٹ —— تیز چلتی ہوا، بارش کا قطرہ، بچے کے رونے کی آواز —— میں سر اٹھا کے تمہیں سننے دیکھنے، چھونے کے لیئے بے تاب ہو جاتا —— کاش آواز کا ایک جسم بھی ہوتا —— کہاں تھیں تم؟

"آپ تو کچھ سنجیدہ ہو گئے ہیں ——"

میری زندگی لے لی ہے تم نے اور کہتی ہو کہ سنجیدہ ہو گیا ہوں کچھ —— مگر تم بھی کیا کرو —— تمہارا ستارہ ہی ایسا ہے۔ بد لحاظ بے مروت —— مطلبی ——

"ناراض کیوں ہو رہے ہیں اس قدر آپ؟ —— اور میں کیوں مطلبی؟ کیا بد لحاظی کی میں نے —— یہ الزامات کیوں بھلا؟"

مجھے تو یہی لگتا ہے کہ کیسی رہی ہمیں یونہی ـــــ بس اب تو اسی انتظار میں ہوں کہ کب تم بھی سلام مچھلی شہری کی محبوبہ کی طرح کہو گی ـــ
"کیا کہوں گی؟"
یہی کہ ـــــ

تم اپنے خواب کا اونچا محل سجانے لگے
مجھے بھی ملنے لگے مشغلے مسرت کے
مگر نہیں تو بہر طور یہ سمجھنا تھا ـــ

"خیال و خواب ہیں محدود ایک عورت کے ـــ" اس نے ہنستے ہنستے شعر پورا کر دیا۔
تو پھر میرا خیال ٹھیک ہی ہوا ـــ
"اب آپ کے خیال کا کوئی کیا کرے۔ میں نے تو ایسی کوئی بات نہ کہی کبھی نہ کی کبھی ـــ آپ کا اپنا معاملہ، اپنی سوچ ـــ مجھے کیوں برا کہتے ہیں؟"
چلو پھر چھوڑو ـــ جانے دو اس بات کو، وقت آئے گا تو دیکھیں گے ـــ
"بہت جلدی مفاہمت پر راضی ہو جاتے ہیں آپ۔"
اب پھر تم ہی بتاؤ کہ کیا کریں ـــ بہت یاد آتی ہو ـــ آج صبح آئینہ کے سامنے کھڑا شیو بنا رہا تھا اچانک یوں لگا جیسے تم نے قریب آ کر کندھے پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ ہوا میں رچی خوشبو ہو تمہاری اور وہ گنگنا رہی، میرے بالوں کو چھوتی، میرے شانے پر سر رکھ کر سو گئی ہو۔
اُس بے چینی میں حاشیے پر آڑی ترچھی لکیریں، چاند تارے ـــ پھول چہرے بنانے شروع کر دیے۔ آج اس بات کو ختم ہونا ہی ہے۔ اُس نے ایک آنکھ اور آدھا ہونٹ بنا کر بگاڑ دیا۔ ختم، ختم، ختم۔ اُس نے دل ہی دل میں تکرار سے اپنی ہمت بندھانے کی کوشش کی۔
کہاں ہو؟
"یہیں تو ہوں ـــ"
تم نے کہا تھا خط لکھو گی، تصویر بھیجو گی۔ میں انتظار ہی کرتا رہا۔
"وہی تو کہنا تھا آپ سے ـــ"
سلام مچھلی شہری ـــ!
"وہ نہیں ـــ بس ایک بہت ہی ٹریجک ایکسیڈنٹ ہو گیا ـــ" باتیں آپ ہی آپ ڈھلنے لگیں۔
وہ کیا ـــ؟
"وہ یہ کہ ـــ" اس نے لمحے بھر کے لئے رک کر کچھ سوچا ـــ "وہ یہ کہ خط لکھا تو مگر وہ غلطی سے باہر سے آئے ہوئے خطوں میں مل گیا، اب وہ میز پر کھلا رکھا ہے اور میں، جوابدہ ہوں ـــ" اُس نے جلدی سے بات ختم کر دی۔
کوئی آواز نہیں، کسی نے کچھ کہا نہیں۔ بس خاموشی!
میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا یہ مت کرنا۔ گاڑی تم چلاتی ہو۔ ڈاک خانے چلی جاتیں تو کیا تھا، مگر نہیں ـــ تم کیوں مانو گی میری کوئی بات ـــ
"آپ تو یوں بات کرتے ہیں جیسے میاں بیوی ایک دوسرے کی ناگوار باتوں، عادتوں پر ایک دوسرے سے الجھتے ہیں ـــ

ناراض ہوتے ہیں ـــــ میں بیوی ہوں آپ کی ؟"

حاشیے میں پھول چاند تارے بنتے رہے۔ کچھ دیر کے لئے جیسے ہر بات ختم ہو گئی۔

تمہیں بیوی تو نہیں بناؤں گا۔ دوست رکھوں گا ـــــ لور بن کر رہوں گا۔ بیوی بھی کوئی عورت ہوتی ہے ـــــ !

"کیا مطلب ؟"

مطلب کوئی خاص نہیں ـــــ بس اتنا کہ بیوی بیوی ہی ہوتی ہے۔ نہ کم نہ زیادہ ـــــ

"تو مجھے رکھیل بنانے کا ارادہ ہے محترم کا ؟"

چھی چھی ـــــ کیا گندہ لفظ ڈھونڈ کر نکالا ہے۔ میں محبت کی بات کر رہا ہوں یار ـــــ اور ـــــ کم ٹو تھنک آف اِٹ ـــــ رکھیل بھی کوئی ایسا بُرا منصب تو نہیں۔ کیا رومانس ہے اس میں ـــــ واہ !

"اور اس رومانس کا کیا ہو گا جو پہلے سے ہے ؟"

وہ یہ کہ لٹ سلیپنگ سپا ؤسز لائی ـــــ مگر خدا کے لئے اس محاورے کو درست کرنے نہ بیٹھ جانا ـــــ

"بالکل بے حس ـــــ بالکل ـــــ"

محاورہ ہے بھئی ـــــ اک تھوڑی رد و بدل کر دی تو کیا ہوا، کاہے کو سیریس ہو جاتی ہو ؟

وہ ہنس دی۔ ایک چہرہ ہے میرے سامنے بھولا بھالا ! جس کے ہونٹوں میں رنگ ہے اور آنکھوں میں ـــــ وہ پھر ہنس دی۔ کیا ہے ؟ بہت پھول کھلا رہی ہو آج ہمیں بھی تو دو بھیک میں !

"آپ کی تصویر دیکھی میں نے ـــــ جیسے کسی چھوٹے معصوم بچے کی، جس کو خوب گھس گھس کر، نہلا دھلا کر سنڈے سکول کے لئے تیار کیا گیا ہو ـــــ معصوم ـــــ وہ بھی آپ ! میں بھی کیا بے گیان دھیان سوچتی چلی جاتی ہوں ـــــ"

کیوں بھئی ـــــ کیوں معصوم نہیں ہم ؟ اور رہی تصویر کی بات تو وہ بارہ برس پرانی ہے۔ اب ایسا نہیں ہوں، بوڑھا ہوں، سر کے بال کالے، سینے کے سفید۔

"معجزہ !"

نہیں کوئی ایسا معجزہ بھی نہیں۔ آخر اتنی چیزیں ہیں جوان رہنے، جوان نظر آنے کے لئے۔ ہم ہی کیوں محروم رہیں ؟ اور ویسے بھی بال کم عمری ہی میں سفید ہو گئے تھے۔ جو کوئی دیکھتا، لڑکی دینے سے انکار کر دیتا۔ بس اسی ڈر میں کالے ہو گئے۔

"ظاہر ہے کیوں سفید نہیں ہوں گے۔ جو تعارف ہے آپ کا ـــــ آپ زندہ ہیں یہی کسی معجزے سے کم تو نہیں ـــــ"

ارے ارے اب ایسا بھی غضب نہ کرو

"او کے ـــــ نہیں کرتی۔ اب اجازت ؟"

پھر اب کب یاد کرو گی ؟ کب بات کرو گی ؟ میں تو مارا گیا بنتو !

"بات ؟" وہ الجھ گئی۔ اُس نے حاشیے میں کتنی ہی آڑی ترچھی لکیریں کھینچ دیں۔ پھول چاند تارے مٹی کا ڈھیر بن گئے ـــــ پھر غور سے اس معصوم بھولے بھالے چہرے کو دیکھا ـــــ چہرے سے قریب لا کر دیکھنا چاہا۔ پھر نظریں نیچی کر کے بیٹھ گئی۔ اندر کے من میں کمرہ اترنے لگا ـــــ پھر اُس نے جھکی نظریں اٹھائیں اور اس بھولے بھالے چہرے کے ماتھے پر دو سینگ بنا دیئے۔ آنکھوں میں سیاہی بھر دی اور ہونٹوں پر ایک مکروہ ہنسی رکھ دی۔ کچھ دیر اس ریت کے گھروندے کو گرتے بگڑتے دیکھا۔ پھر ایک جھرجھری لے کر نگاہیں پھیر لیں۔

"میں اب شاید بہت دن کوئی بات نہیں کروں گی ــــ؟

وہ کیوں ـــــ کیوں پریشان کرتی ہو؟ کوئی SADISTIC STREAK ہے تمہارے اندر؟؟

"بہت لو، لو، لو کی میں چلی جاؤں گی۔ نہیں چاہتی کوئی ہنگامہ ہو:

پھر بھی ٹھیک ہی کہتی ہو ـــ مگر اب تم سے بات کرنے کی عادت ہو گئی ہے۔ نہیں ہو گی تو دن کٹیں گے کیسے؟ مت کروایسے تم میرے ساتھ۔ لو کی بھی نہیں کیا؟؟

اس کے گلے میں بھی کچھ پھنسنے لگا ـــــ "وقت کا انتظار میں بھی کروں گی، آپ بھی کیجئے ـــــ شاید کہیں کسی اگلے ہی موڑ پر پھر ملاقات ہو ـــــ"

مگر تب تک؟ معلوم بھی ہے کتنا قاتل انتظار ہو گا یہ!

"وہ تو ہو گا ہی ـــ" وہ دبے لہجے میں بولی۔ گلے کے پھندے سے آواز بھرا رہی تھی۔

رو رہی ہو کیا؟

"وہ کیوں بھلا؟" وہ ہنس دی اور ہاتھ کی پشت سے رخسار پر بہتا آنسو پونچھنے کی کوشش کی۔

"بہت رومینٹک خیالات ہیں آپ کے ـــــ سارہ ٹھیک ہی کہتا ہے آپ کو۔ اب تک کتنی محبتوں کو آپ نے آخری اور سچی اور ہمیشہ رہنے والی محبت سمجھا ہو گا؟ مگر اب جاتے جاتے ایک نصیحت ـــ ایک مشورہ میرا بھی ـــــ اگر قبول ہو ـــــ"

وہ کیا؟

وہ یہ کہ ایسی کوئی چیز نہیں ہے دنیا میں۔ کوئی محبت آخری محبت نہیں ہوتی۔ کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی کمی رہ ہی جاتی ہے اور ہمارے اندر بیٹھا وہ ہمارا دوسرا ـــ کبھی بھی ادھوری اور نامکمل محبت پر قانع ہو کر بیٹھ رہنے کو تیار ہوتا ہی نہیں۔ اس کی تلاش جاری ہے۔ آپ بھی اپنی تلاش جاری رکھیئے۔ اس لئے کہ میں آپ کی حوا نہیں نہ آپ میرے آدم۔ اور اگر ہم ایسا سمجھنے کی غلطی کریں تو وہ غلطی ہی ہو گی ادھوری ـــــ اور نامکمل" وہ اچانک چپ ہو گئی۔

تم راستہ الگ ہو جانے کی نوید دے رہی ہو؟

"میں صرف "لو، لو، لو کی" میں جا رہی ہوں۔ آپ انتظار کیجئے ـــــ وقفہ!"

پھر اس کے بعد پردہ اٹھنے کی امید ہے؟

"وقفے کے بعد کیا ہو گا ـــ کوئی بھی یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے کیا؟"

اچھا ایک بار پیار تو کرو۔

وہ لمحے بھر کے لئے جھجکی، پاس رکھے گلاس کی طرف دیکھا۔ پھر آہستہ سے، نرمی سے اس جاتے ہوئے لمحے کو ہتھیلی پر رکھ کر پیار کر لیا۔

اسی وقت باہر کا دروازہ کھول کر کوئی اندر آیا۔ ہال وے کے فرش پر کچھ سامان رکھنے کی آواز آئی۔ پھر بجلی کا کھٹکا جس کے ساتھ ہی دھندلی روشنی کا غبار اس کے کمرے کے دروازے پر بھی آکر ٹھہر گیا۔

"فائزہ!" آنے والے نے دھیمے لہجے میں جیسے چاروں طرف چھائی خاموشی سے سوال کیا اور اس کے ساتھ ہی وہ ہال وے میں جلنے والی روشنی کے غبار میں ایک خاکے کی طرح دروازے کی چوکھٹ پر ابھر کر کھڑا ہو گیا۔

LOW LOW LOW KEY ے

"یہاں اندھیرے میں بیٹھی ہو۔ نرس نہیں آئی آج ؟"

"منگل کا روز اس کا چھٹی کا دن ہوتا ہے اور میری وہیل چیئر کی بیٹری بھی ڈاؤن ہے ——" اُس نے نرمی سے کہا جیسے بہت دیر سوئے رہنے کے بعد اٹھی ہو۔

"اوہ ——" آنے والے آہستہ سے کہا "موسم کی وجہ سے فلائٹ کچھ دیر کے لیے رک گئی تھی۔ مگر تم دفتر فون کر کے کیرن ——" اُس نے اچانک جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ لمحہ بہت سے ان کہے سوالوں جوابوں سے بوجھل ہو گیا۔

اپنی ہی زبان پہ کوئی بھروسہ کرے تو کیسے کرے —— بے ایمان کیسے پھسل پھسل جاتی ہے —— اندھیرے میں بیٹھی وہ مسکرا دی۔ مگر پھر وہ جیسے سنبھل گیا اور روشنی کے غبارے سے باہر نکل کر اُس کے سامنے آیا اور اُس کی وہیل چیئر کے دونوں ہاتھوں پر ہاتھ رکھتا آگے کی طرف جھکا اور اس کے ماتھے کو ہونٹوں سے اک ذرا چھو کر پھر دروازے کی طرف واپس چلا گیا۔

"تمہارا ٹرپ کیسا تھا ؟" اُس نے نرمی سے پوچھا۔

اندھیرے اجالے میں چلتے اُسے جیسے ایک ٹھوکر سی لگی "ٹھیک ہی تھا۔ مگر تم اسپتال میں تو فون کر سکتی تھیں۔ فیاض سے ہی کہہ دیتیں —— ایک فون ہی تو کرنا تھا۔ ایسا تو نہیں میں تمہارے لیے کچھ کرتا ہی نہیں، کوئی سُنے تو کیا سوچے ؟"

"کوئی سنے ہی کیوں ؟" وہ پھر اُسی نرم آواز میں بولی۔

"اور بتی تو جلا لو —— وہ تو ہاتھ کے پاس ہی ہے تمہارے۔ اک تھوڑا زور تو پہیوں پر ڈال ہی سکتی ہو۔ ورزش اچھی ہے تمہارے لیے ——" وہ پھر پلٹ کر آیا۔

"نہیں ابھی اندھیرا ہی رہنے دو۔ مجھے اچھا لگتا ہے۔" اُس نے جلدی سے اپنے رخساروں پر ہاتھ پھیرنے کی کوشش کی۔

وہ بنا کچھ کہے کمرے سے نکل گیا۔

کتنا اندھیرا ہو گیا تھا یکدم۔ پنچھی پکھیرو بھی چپ چاپ تھے۔ جیسے اس خلا سے اڑ گئے ہوں۔ شاید بادل بھی چھائے تھے۔ اسے یوں لگا جیسے اندھیرے خلا میں بارش کے قطرے آہستہ آہستہ گر رہے ہوں۔ کچھ دیر وہ پوری توجہ اور دھیان سے ان قطروں کے گرنے کی آواز سننے کی کوشش کرتی رہی۔ کہاں سے آ رہی تھی آواز —— کہیں باہر سے یا اُس کے اندر سے —— اُس سے کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔

پھر دوسرے کمرے سے فون اٹھانے کی آواز آئی "ہیلو —— مس انــــ" مگر بولنے والے نے جملہ ادھورا چھوڑا اور چپ ہو گیا۔ پھر کچھ دیر بعد فون واپس رکھنے کی آواز آئی جس نے بعد کی خاموشی کو اور بھی کھوکھلا کر دیا —— اندھیرے کمرے میں اُس نے ہاتھ میں پکڑا اخبار وہیل چیئر سے لگے تھیلے میں ڈال دیا اور دونوں ہاتھ گود میں رکھ کر چپ چاپ بیٹھ کر اُس کی راہ دیکھنے لگی مگر جب وہ دوبارہ اُس کے کمرے کی طرف آتے آتے راستہ بدل کر دوسری طرف چلا گیا تو اندھیرے کمرے میں بیٹھی وہ آہستہ سے ہنس دی اور درد سے سوجی اور ٹیڑھی ہوئی انگلی سے آنکھ سے بہہ کر رخسار پر گرتا آنسو چن لیا ——

چاکِ گریباں

نگہت مرزا

"نہیں ـــــ نہیں!" زلیخا کی گھٹی گھٹی چیخ کچے کوٹھے کی نیم تاریک فضا میں پھڑپھڑا کے رہ گئی۔ دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے شرفو کو تکنے لگی جو جلاد بنا اُس کے سر پر کھڑا تھا۔

"سنا نہیں تو نے؟ میں کہتا ہوں اُٹھ ہاتھ منہ دھو اور کپڑے بدل۔"

شرفو کی آگ اُگلتی آنکھوں سے خوفزدہ ہو کر زلیخا نے جلدی سے نظریں کچی مٹی کے فرش پر جھکا دیں، مگر ہمت نہ ہاری۔ بان کی چارپائی کے پائے کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے وہ دوبارہ چلائی۔ "نہیں۔ میں ایسا نہیں کروں گی۔"

"اچھا!" شرفو نے بظاہر بڑے تحمل سے اس کا جواب سنا۔ مگر دوسرے ہی لمحے اُس کی آنکھوں میں چیتے کی سی چمک پیدا ہوئی اور اس نے کُرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر چاقو نکال لیا۔

زلیخا کے پورے جسم پر کپکپی سی طاری ہو گئی۔ اس نے بچی کھچی طاقت جمع کر کے دروازے کی طرف چھلانگ لگائی مگر شرفو اس کا ارادہ بھانپ چکا تھا۔ وہ اُس پر یوں جھپٹا جیسے شیر اپنے شکار پر جھپٹتا ہے اور بالوں سے پکڑ کر اُسے واپس چارپائی پر لا پھینکا۔

"میں تیری گھر والی ہوں شرفو!" زلیخا نے اُس کے اندر کے سوئے ہوئے مرد کو جگانے کی آخری کوشش کی۔

"جیسے میں کہتا ہوں ویسے کر ـــــ نہیں تو ـــــ" شرفو نے چاقو اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے غصے سے دانت کچکچا کر کہا نیم تاریک کوٹھڑی میں چاقو کی شفاف چمکتی ہوئی دھار ـــــ پل بھر کے لئے زلیخا نے سوچا ـــــ کہ اپنے گلے پر چلنے دے، اچھا ہے جس موت کی وہ ہمیشہ تمنا کیا کرتی تھی آج بالآخر اُس کے سامنے تھی۔

مگر نہ معلوم کیوں، موت کو سامنے پا کر وہ بزدل بن گئی "چل ہٹا اس کو، جیسا تو کہتا ہے ویسے ہی کروں گی۔" اُس نے خوف سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا، یہ آواز جو خود اُس کے اپنے کانوں کو اجنبی لگ رہی تھی۔

"آ گئی نہ راستے پر۔ چل جلدی کر ـــــ" شرفو نے تشکر یا خوشی کے احساس کے بغیر سپاٹ سی آواز میں کہا، اور چاقو بند کر کے نیفے میں اُڑس لیا۔ "بس وہ آتا ہی ہو گا۔"

رات کا اندھیرا اچانک ہی امنڈ آیا تھا اور پہاڑی کی ڈھلوان پر بنے ہوئے مٹی کے اس کوٹھے کو، جو یوں بھی خودرو جھاڑیوں کی اوٹ میں تھا، اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ نیچے پختہ سڑک تھی جو گئی رات تک کاروں اور بسوں کی روشنیوں سے جگمگاتی رہتی۔ سڑک پار گھنے درختوں کے جھنڈ سے پرے آفیسرز کالونی تھی جن کی بڑی بڑی کوٹھیوں میں شام ہوتے ہی ستارے سے جگمگا اٹھتے اور موسیقی اور رنگ و بو کی محفلیں، سڑک پر سے گذرتے اکا دکا پیدل مسافروں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتیں کہ یہ علاقہ شہر

سے باہر تھا۔

آنے والا کب کا جا بھی چکا تھا مگر زلیخا بان کی ننگی چارپائی پر اسی طرح لیٹی رہی چپ چاپ، بے حس و حرکت۔ صرف اس کی کھلی ہوئی آنکھیں اور حرکت کرتی پتلیاں دیکھ کر اس کے زندہ ہونے کا احساس ہوتا تھا۔

من میں ملے جلے غصے اور نفرت کے جذبات اُسے بغاوت پر آمادہ کر رہے تھے۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا اسی طرح ننگی ٹانگوں سیدانی بی بی کے ویڑے میں جا کر اپنے لُٹ جانے کا بین کرے۔ اُس نے شرفو کی ہر جائز ناجائز بات مان لی تھی پر کبھی حرفِ شکایت لب پر نہ لائی تھی، مگر آج تو شرفو نے غضب ڈھایا تھا۔ جب گھر میں بکنے کے لئے کچھ نہ رہا، زلیخا کے گہنے، کپڑے حتیٰ کہ برتن تک بک چکے تو اب آخری بکاؤ مال خود زلیخا رہ گئی تھی۔ اس کی بھی آج بولی لگ گئی۔

یکلخت اپنی بے بسی پر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی "ہائے نی میری مائے۔ تو نے مجھے کیوں جنا تھا؟"

"چل اُٹھ اب، زیادہ نخرے نہ کر۔" شرفو کی کڑک دار آواز میں اُس کی سسکیاں دب کے رہ گئیں۔ چادر کے پلو سے اُس نے آنکھیں صاف کیں، ناک رگڑی اور لالٹین کی مدھم لو میں زمین پر جھک کر اپنی شلوار ڈھونڈنے لگی۔

چھوٹی سی تھی تو ماں مر گئی۔ باپ نے دوسری شادی کر لی۔ سگا بہن بھائی کوئی تھا نہیں۔ سوتیلی ماں پوری ڈائن تھی۔ رج کے اُس نے ظلم کیے۔ نہ صرف گھر کا سارا کام کرواتی بلکہ اُلٹی سیدھی شکایتیں لگا کر باپ سے مار پڑواتی۔ پندرہ سولہ سال کی ہوئی تو ماں نے ڈھیر ساری رقم لے کر گاؤں کے ایک اوباش لڑکے کے ساتھ اس کا بیاہ کر دیا جو ساتھ والے شہر میں سوزوکی چلاتا تھا۔ شادی کو ابھی ایک سال بھی نہ گذرا تھا کہ ایکسیڈنٹ میں وہ چل بسا۔ اور زلیخا کو اُس کی ساس نے، جو اُس کی ماں سے بھی زیادہ ظالم تھی، دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔ زلیخا مایوسی کی چادر اوڑھے، زخموں سے چور جسم کے ساتھ واپس اپنے باپ کی دہلیز پر آ کھڑی ہوئی۔ نہ اندر جانے کی ہمت تھی نہ باہر کا کوئی راستہ نظر آتا تھا۔ جب کافی دیر گذر گئی اور وہ کچھ فیصلہ نہ کر پائی تو اندر سے باپ کی آواز آئی "اب کیا ساری عمر تو میری دہلیز پر کھڑی رہے گی، چل اندر آ جا۔ صبح دیکھا جائے گا۔"

اس کی سوتیلی ماں کے درجن بھر بچے اُس کے ساتھ لپٹ گئے مگر نظر اٹھائے بغیر ہی وہ جانتی تھی کہ دو آگ اگلتی آنکھیں برابر اسے غصے اور نفرت سے گھور رہی تھیں۔

سال بھر کے اندر اندر ماں نے اُس کی دوسری جگہ بات پکی کر دی۔

یہ اُس کا شرافت تھا۔ کون تھا؟ کیا کرتا تھا؟ کسی کو معلوم نہ تھا اور نہ کسی نے جاننے کی ضرورت ہی سمجھی تھی۔ گاؤں میں وہ کسی کے ہاں مہمان ٹھہرا تھا۔ زلیخا اپنے گھر کی دیوار پر اُپلے تھاپ رہی تھی، جب وہ اپنے میزبان کے ساتھ وہاں سے گذرا۔ زلیخا کی دردبھری کہانی گاؤں کے ہر فرد کی زبان پر تھی، شرافت نے بھی سنی اور اگلے ہی روز زلیخا کے لیے رشتہ بھیج دیا جو بغیر کسی رد و کد کے منظور کر لیا گیا۔

پہلے تو اسے اپنی خوش نصیبی پر رشک آیا۔ یہ اینٹوں والا پکا مکان جس کے باہر بڑا سا لوہے کا گیٹ بھی تھا، اس کا تھا۔ شرافت کا تھا۔

"سنو!" جونہی وہ خوشی سے قدم اٹھاتی اس گیٹ کی طرف لپکی جس کی طرف شرافت نے اشارہ کیا تھا، تبھی شرافت کی آواز نے اُس کے قدم روک لیے "یہ گھر شاہ جی کا ہے۔ پیر و مرشد شاہ جی اس علاقے کے سب سے بڑے بزرگ ہیں۔ ان کو سلام کرنے کے بعد ہم ایک دو دن میں اپنے گھر چلے جائیں گے۔"

"اچھا جی!" زلیخا نے مردہ سی آواز میں کہا، اور شرافت کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہو گئی۔

سفید بالوں والی بوڑھی سی عورت ہاتھ میں کالے دانوں والی تسبیح لیے پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ نیچے فرش پر میلے کپڑوں میں ملبوس دو تین عورتیں کام کاج میں مصروف تھیں۔

"بی بی جی کو اچھی طرح سلام کرنا"۔ شرافت نے اسے دروازے میں سے اندر دھکیلتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔

زلیخا مہندی رنگے ہاتھوں سے چادر سنبھالتی سیدھی پلنگ کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

بوڑھی عورت نے تسبیح کو چوم کر تکیے کے نیچے رکھا اور غور سے سر سے پاؤں تک زلیخا کا جائزہ لینے لگی "تھک گئی بچی، بیٹھ جا، دو گھڑی دم لے لے"۔

چہرے کی طرح آواز میں بھی شفقت تھی۔ زلیخا بے اختیار آگے بڑھی اور پلنگ پر بیٹھنے کو تھی کہ فرش پر بیٹھی ہوئی عورتیں چلا اٹھیں "اے نیچے بیٹھ۔ بی بی جی کے قدموں میں"۔

"نہیں جنتے، اسے میرے پاس ہی بیٹھنے دے"۔ سیدانی بی بی بولیں۔ "اس کا معصوم چہرہ میری نظروں کو تازگی بخش رہا ہے"۔

دو دن اُس نے سیدانی بی بی کے ہاں گذارے۔ اس دوران اُسے شرافت کے بارے میں بہت کچھ پتہ چلا۔ وہ لاوارث بچہ تھا۔ شاہ جی اُسے خدا معلوم کہاں سے اٹھا کر لائے تھے۔ ترس کھا کر اپنے ہاں رکھ لیا۔ ذرا بڑا ہوا تو بھینسوں کی رکھوالی اور دودھ دوہنے وغیرہ کا کام اس کے سپرد کر دیا۔ مگر اس کام میں اس کا دل نہ لگ سکا۔ اُس نے شاہ جی کے ڈرائیور سے چپکے چپکے گاڑی چلانا سیکھی اور پھر ایک روز بغیر کچھ بتائے چلا گیا۔

کافی برس گذرنے کے بعد وہ دوبارہ شاہ جی کے آستانے پر لوٹ آیا اور ان کے قدموں میں گر کر رو رو کر معافی مانگی۔ شاہ جی نے اُسے معاف تو کر دیا مگر اپنے ہاں کسی قسم کی ملازمت دینے سے انکار کر دیا۔ جو شخص ایک دفعہ دھوکا دے سکتا ہے اُس کا کیا اعتبار؟ وہ بہتیرا رویا، گڑگڑایا، واسطے دیئے کہ کوئی چھوٹا موٹا کام اُس سے کروا لیں مگر شاہ جی ایک نہ مانے ـــــ ناچار مایوس ہو کر شرافت دوبارہ گمنام وادیوں کی طرف لوٹ گیا۔

وہ کیا کرتا تھا؟ ذریعۂ معاش کیا تھا؟ کچھ کرتا کراتا بھی تھا یا ڈاکے ڈالتا تھا۔ یہاں بھی کسی کو اُس کے بارے میں کچھ علم نہ تھا۔ کافی برسوں کے بعد وہ اب پھر شاہ جی کے ہاں آیا تھا۔ مگر اب کے اکیلا نہیں تھا۔ نئی نویلی دلہن اُس کے ہمراہ تھی۔

دو روز سیدانی بی بی کی صحبت میں گذار کر زلیخا وہاں سے رخصت ہوئی تو اُس کے پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے۔ اُس نے کبھی پیار میٹھے بول نہ سُنے تھے۔ کبھی کسی نے شفقت سے، پیار سے اُس کا نام نہ لیا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ پیار میں کتنی مٹھاس ہوتی ہے کوئی پیار سے نام لے کر پکارے تو جان قربان کرنے کو جی چاہتا ہے۔ سیدانی بی بی نے اُسے پیار کی مٹھاس سے روشناس کرایا تھا۔

اور پھر کتنی ڈھیر ساری نصیحتیں بھی اُس کے پلو میں باندھ دی تھیں۔ "زلیخا! اپنے مرد کی خدمت کرنا۔ اس کے کہے کو کبھی مت ٹالنا۔ یہ رشتہ بڑا نازک ہوتا ہے بچی، کچے دھاگے کی طرح، پتہ بھی نہیں چلتا اور ٹوٹ جاتا ہے"۔

"اچھا جی" ـــــ وہ احمقوں کی طرح منہ کھولے اُن کی طرف تکتی رہتی۔

"اور تو تو ہے بھی بالی عمر کی نادان، نا سمجھ، سُن مرد کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر قدم نہ نکالنا۔ زمانہ بڑا خراب ہے"۔

"اچھا جی"۔ اُس کا منہ کچھ اور کھل جاتا۔

سیدانی بی بی کے کہے بغیر ہی وہ ان باتوں کو اچھی طرح جانتی تھی۔ شرافت کے ساتھ اسے ہر حالت میں گذارا کرنا تھا۔ وہ جو بھی تھا، جیسا بھی تھا اب اس کی آخری پناہ گاہ تھا۔ واپسی کے تو سارے راستے بند ہو چکے تھے۔

اور پھر تو یہ روز کا معمول ہی بن گیا۔

جونہی رات کی تاریکی کچے کوٹھے کو اپنی لپیٹ میں لیتی، شرفو کسی "نئے" گاہک کے ساتھ دروازے پر آموجود ہوتا۔ اُس کے قدم اب کچھ زیادہ ہی لڑکھڑانے لگے تھے۔ اکثر وہ کواڑ پکڑ کے کافی دیر دروازے میں کھڑا رہتا۔ آنکھیں کچھ اور بھی اندر کو دھنس گئی تھیں اور اُن کے نیچے سیاہ حلقے نمایاں ہوتے جا رہے تھے۔ دیئے کی مدھم روشنی میں وہ کسی خونخوار وحشی جانور کی طرح حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکالتا اندر داخل ہوتا۔ اب وہ زلیخا کو پہلے سے تیاری کا وقت بھی نہ دیتا۔ جس گھڑی کوئی "گاہک" آتا اُسے لے کر سیدھا اندر چلا جاتا۔ اُس کی "بولی" کتنے میں طے ہوتی تھی زلیخا کو کچھ معلوم نہ تھا۔ آنے والا اپنی مرضی، اپنی خواہش کے مطابق اُسے استعمال کر کے دبے پاؤں باہر نکل جاتا۔ نہ کسی نے اُس کے ہاتھ میں کچھ دیا تھا نہ اُسے کچھ لینے کی خواہش تھی۔ وہ جانتی تھی شرفو اندر لانے سے پہلے ہی اُن سے سودا چکا لیتا تھا — اُسے اپنے انگ انگ سے نفرت ہو چلی تھی۔ کبھی کبھی اُس کا جی چاہتا شرفو کے نیفے سے چاقو نکال کر اپنی گردن پر پھیر لے۔ اس سے تو سوتیلی ماں کے ظلم ہی بھلے تھے۔ بلا سے سارا دن کولہو کے بیل کی طرح جتی رہتی تھی۔ گالیاں اور کوسنے بھی کھاتی تھی پر تن تو اجلا تھا نا۔ اب جو یہ خونی رات رات بھر اس سے لپٹی رہتی تھیں، جن کی دوسراتھ نے اسے نجس اور ناپاک بنا دیا تھا۔ اب اُسے اپنے آپ سے نفرت ہو گئی تھی۔ پہننے اوڑھنے سے، کھانے پینے سے، غرضیکہ ہر شے سے نفرت ہو گئی تھی۔ دن بھر شرفو کی گالیاں اور ڈانٹ ڈپٹ سنتی کبھی کبھار طیش میں آ کر شرفو اُسے ایک ہاتھ بھی جڑ دیتا مگر ایسا لگتا تھا اُس کے سارے احساسات مردہ ہو چکے تھے۔ اب اُسے نہ کسی کی مار پیٹ کی پروا تھی نہ گالی گلوچ کی۔

ایک شب شرفو کے لائے ہوئے "گاہک" کے سامنے دم سادھے بے حس و حرکت لیٹے لیٹے اُس کے من کے اندر ایک عجیب سی آواز اٹھی۔ تھانے جا کر شرفو کے خلاف رپٹ کیوں نہیں لکھواتی؟ اپنے خیال پر وہ خود ہی چونک اٹھی اور گردن اٹھا کر یوں ادھر اُدھر دیکھنے لگی، جیسے یہ بات کسی اور نے اُس سے کہی ہو۔

تھانے جا کر — دل کی دھڑکنیں ذرا قابو میں آئیں تو اس نے تعجب سے سوچا کہ یہ خیال بھلا اُسے پہلے کیوں نہ آیا۔ کیوں اتنا عرصہ وہ اپنی بوٹیاں کتوں سے نچواتی رہی۔ مگر کیا تھانے والے اس کی بات کا یقین کر لیں گے؟

اور پھر اُس کے بعد — اگر شرفو جیل چلا گیا تو — خود اُس کا کیا بنے گا؟

آنے والا اُس کے ٹھنڈے بے جان سے جسم سے اپنی حسرتوں اور ناکام خواہشات کا بدلہ لینے کی کوشش میں تھک ہار کر واپس جا چکا تھا پر وہ ابھی تک اپنے من کی آواز پر جاگ رہی تھی۔

اگلی صبح شرفو حسب معمول چائے وائے پی کر جانے کے لئے اٹھا تو زلیخا نظریں نیچی رکھ کر دھیمی آواز میں بولی "کنڈی نہ چڑھانا، مجھے ابھی کھیتوں میں جانا ہے۔"

"اچھا!" شرفو جلدی میں تھا ورنہ اس سے پہلے ایک دو دفعہ زلیخا نے ضرورت کے تحت اُسے کنڈی لگانے سے منع کیا تھا لیکن وہ نہیں مانا تھا۔ خود کھڑا ہو کر اُس کا انتظار کرتا رہا تھا اور جب وہ برابر کے کھیت سے فارغ ہو کر نکلی تھی تب اُسے اندر دھکیل کر اور کنڈا چڑھا کر گیا تھا۔ آج اُس نے صرف "اچھا" کہا اور چادر کندھے پر ڈال باہر نکل گیا۔

قسمت اتنی مہربان بھی ہو سکتی ہے؟ زلیخا کو کتنی دیر تک اپنی آزادی کا یقین نہ آ سکا۔ آج وہ دروازہ کھلا تھا جس کو بند دیکھ کر وہ رویا کرتی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے جس کو پیٹا کرتی تھی۔ آج دروازہ کھلا تھا اور زلیخا آزاد تھی۔

بمشکل اُس نے اتنا انتظار کیا کہ شرفو کہیں دور نکل جائے۔ پھر بکسا کھول کر پرانی سی چادر نکالی اور سر سے پاؤں تک اچھی طرح اوڑھ کر دبے پاؤں گھر سے باہر نکلی۔ باوجود ہزار اندیشوں کے اُسے اپنا آپ اتنا ہلکا پھلکا لگ رہا تھا جیسے وہ ہواؤں پر اُڑتی جا رہی ہو۔

تھانیدار نے اس کی گتھا سنی۔ شرافت کا حلیہ پہلے زبانی پوچھا۔ پھر ایک تصویر دکھا کر پوچھا۔ ہاں وہ شرافت ہی کی تصویر تھی۔ تھانیدار اُس کا مشکور تھا کہ اُس نے ایک انتہائی خطرناک ملزم کی نشاندہی کی تھی۔ شرافت عرف شرفو بہت سے مقدمات میں، جن میں قتل کی واردات بھی شامل تھی، پولیس کو درکار تھا۔

زلیخا گھر پہنچی تو شرفو ابھی تک گھر نہ لوٹا تھا۔ اُس نے جلدی جلدی چادر تہہ کر کے بکسے میں ڈالی اور آٹا گوندھنے لگی۔

شام کا اندھیرا پڑتے ہی شرفو لوٹا اور آتے ہی روٹی لانے کی فرمائش کی۔ زلیخا نے کھانا دیا اور خود چولہے کے پاس جا بیٹھی۔ اُس کے کان، جنگل کے جانوروں کی طرح ہر آہٹ ہر کھٹکے کے منتظر تھے۔ شرفو نے کھانا ختم کر لیا۔ کوئی نہ آیا۔ اُس نے برتن مانجھے اور چولہے کے پاس جا بیٹھی۔ شام کا اندھیرا رات کی تاریکی میں بدل گیا مگر کوئی بھی نہ آیا۔ زلیخا کی امید دم توڑنے لگی۔ رات گہری ہونے لگی تو کوٹھے کے باہر جھاڑیوں میں سرسراہٹ ہوئی۔ زلیخا کا مایوس چہرہ کھل اٹھا۔ مرنے والا اُس کا "مسیحا" نہ تھا، "لیٹرا" تھا۔ دیئے کی مدھم لو میں شرفو کے ساتھ ایک بھاری بھرکم آدمی کو دیکھ کر اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

آج پھر!

دل میں اک ہوک سی اٹھی۔ خدایا! میں کب تک ان لیٹروں کے ہاتھوں بکتی رہوں گی۔

شرفو اُسے اندر کر کے باہر جانے کے لئے مڑا۔ ابھی وہ دہلیز پر ہی تھا کہ ایک نامانوس سی آواز اندھیرے کو چیرتی ہوئی بلند ہوئی۔ "وہیں کھڑے رہو، ورنہ گولی سے اُڑا دیئے جاؤ گے۔"

ہتھکڑیاں پہنا کر پولیس والے جب شرفو کو لے جا رہے تھے تو اُس نے اچک کر اندھیرے میں کوٹھے کے کھلے دروازے کی طرف دیکھا اور چلا کر بولا۔ "اندر سے کنڈی چڑھا لے، اور غم نہ کریں بہت جلد واپس آ جاؤں گا۔"

"ہنہ" زلیخا نے اُس کی طرف منہ کر کے زمین پر تھوکا۔ "اللہ کرے ساری عمر تو جیل میں سڑتا رہے۔"

رات رات میں اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اب وہ اس کوٹھے میں نہیں رہے گی۔

سڑک پار کے بنگلوں میں جا کر نوکری کروں گی۔ بان کی کھری چارپائی پر لیٹے لیٹے وہ آئندہ کے منصوبے بناتی رہی۔ بھلا کونسا کام تھا جو اُسے نہیں آتا تھا۔ جھاڑو صفائی، برتن کپڑے، سبھی کام تو وہ کر سکتی تھی۔ بس کوئی اچھی سی بیگم مل جائے تو ساری عمر اُسی کے پاس گذار دوں گی۔ یونہی سوچتے سوچتے رات کے کسی پہر اُس کی آنکھ لگ گئی۔ دن بھر کی تھکی ہوئی تھی۔ سوئی تو ایسی غافل ہو کر دن چڑھے آنکھ کھلی۔

سورج خاصا بلند ہو گیا تھا۔ اُس نے اندازے سے سوچا کہ اس وقت تک تو وہ شرفو کو چائے بھی دے چکی ہوتی ہے۔ جلدی سے چارپائی سے نیچے اتری اور حمام میں جتنا پانی بچا تھا اُس سے نہائی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ نجس جسم کے ساتھ اپنی نئی زندگی شروع کرے۔

نہا دھو کر اُس نے اپنا بکسا کھولا اور صاف کپڑے نکال کر پہنے۔ پھر بیاہ شادی کی رنگین چادر اوڑھی اور کوٹھے کو باہر سے کنڈا چڑھا کر دوبارہ کبھی وہاں واپس نہ آنے کی قسم کھا کر احتیاط سے قدم اٹھاتی نیچے سڑک کی طرف اترنے لگی۔

کالونی میں دو تین گھروں میں پتہ کیا۔ کہیں چوکیدار نے اندر جانے سے روک دیا کہ بیگم صاحبہ سو رہی ہیں۔ کسی نے بتایا کہ فی الحال گھر والوں کو نوکرانی کی ضرورت نہیں۔ بالآخر ایک جگہ اسے امید کی کرن نظر آئی۔ چوکیدار نے بتایا کہ بیگم صاحبہ سو بھی نہیں رہی تھیں اور انہیں ایک عدد ملازمہ کی ضرورت بھی تھی۔

زلیخا کو انٹرویو کے لئے طلب کیا گیا۔ جھجکتے ہوئے اُس نے اندر قدم رکھا۔ گھر کیا تھا جیسے کسی بادشاہ کا محل ہو۔ زلیخا نے چپل باہر ہی اتار دیئے اور دبیز قالین پر یوں پاؤں رکھا جیسے پاؤں تلے کرچیاں ہونے کا خدشہ ہو۔

بیگم اوپر سے نیچے تک سرخ رنگ کے ریشمی گاؤن میں ملبوس بستر پر نیم دراز چائے پی رہی تھی۔ چند ابتدائی باتوں کے بعد بیگم نے اُسے رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ "ٹھیک ہے کل سے تم کام پر آ جاؤ۔" بیگم نے چائے کی پیالی دوبارہ منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔

"میں تو آج سے ہی کام کے لئے تیار ہوں جی۔" زلیخا قالین پر انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ اُس اندھیری کوٹھڑی میں واپسی کے خیال سے ہی اُسے خوف آنے لگا تھا۔ شرفو کے پکڑے جانے کی خبر تو یقیناً رات ہی میں پورے گاؤں میں پھیل گئی ہو گی۔ اب تک خدا معلوم کتنے بھیڑیے جھاڑیوں میں اس کے منتظر ہوں گے۔ خوف سے اُس نے جھرجھری لی اور بیگم کو کچھ سوچتے پا کر لجاجت سے بولی۔ "میرا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے جی۔ اب واپس کہاں جاؤں گی۔"

"اچھا۔" بیگم نے پیالی واپس سائڈ ٹیبل پر رکھ دی اور میز پر رکھے ہوئے ایک بٹن کو دبایا۔ دور کہیں گھنٹی کی آواز گونجی اور ساتھ ہی دروازہ کھول کر ایک آدمی نے اندر جھانکا۔ "جی بیگم صاحب!"

"رحمت۔ یہ آج سے ہمارا کام کرے گی۔ واش روم میں لے جا کر اسے بتا دو کہ کپڑے کہاں دھونے ہیں۔"

"بہتر بیگم صاحب۔"

"جاؤ زلیخا باقی کام بعد میں بتا دوں گی۔"

زلیخا اُٹھ کھڑی ہوئی۔ دروازے میں کھڑے آدمی نے پلٹ کر غور سے اُس کی طرف دیکھا۔ نظریں چار ہوئیں۔ لحظہ بھر کے لئے رحمت کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اُس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور زلیخا کی طرف دیکھ کر بولا "چلو۔"

جونہی وہ دروازے سے باہر نکلی رحمت بجلی کی سی تیزی سے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ "بیگم صاحب، یہ عورت تو رکھنے کے قابل نہیں۔" وہ خاصی اونچی آواز میں بولا۔

"تم جانتے ہو اسے؟" بیگم نے پوچھا۔

"اسے کون نہیں جانتا جی۔ بڑی بدمعاش عورت ہے۔"

"کیا مطلب رحمت؟ ذرا کھل کر کہو۔"

"بیگم صاحبہ اب آپ کے سامنے کیا عرض کروں۔ میں تو حیران ہوں اس عورت کو اتنی جرأت کیسے ہوئی کہ شریفوں کے گھر میں داخل ہو۔"

"مگر مجھے تو وہ بہت دکھی معلوم ہوئی ہے۔ کہتی ہے رات پولیس اُس کے خاوند کو گرفتار کر کے لے گئی ہے۔ کوئی چرس ورس کا چکر تھا شاید۔"

"جھوٹ کہتی ہے بیگم صاحب۔ آپ اس کی باتوں میں نہ آئیں۔ اس نے اپنے آدمی کو خود ہی گرفتار کروایا ہو گا تاکہ یہ کھل کر اپنا کام کر سکے۔ وہ اس کی بُری حرکتوں سے بہت تنگ تھا جی۔ اس کی آوارہ حرکتوں پر اسے مارتا بھی تھا پر اسے تو مردوں کا چسکا ——"

"بس کرو رحمت، اور ہاں سنو اسے کسی بہانے چلتا کر دو۔ خدا کی پناہ کیسی معصوم صورت بنا کر آئی تھی ——"

ہاں —— کچھ کچھ یاد آ گیا تھا اُسے —— ہر دیئے کی مدھم لو میں وہ سارے ایک جیسے ہی تو لگتے تھے جیسے چلچلاتی دھوپ میں زبان نکالے ہانپتے ہوئے کتے۔

وہ سب، جو کل تک بے نام تھے آج اُس کے خلاف گواہ بن کر اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

اس نے سر سے چادر اتار کر بیگم کے بند دروازے کی طرف پھینکی اور پیشتر اس کے کہ رحمت کمرے سے نکل کر اُسے باہر کا راستہ دکھاتا، وہ دروازے کی طرف لپکی اور تیز تیز قدم اٹھاتی باہر نکل گئی۔

آج بالآخر اُسے پتہ چل گیا تھا کہ وہ کون تھی۔

دستک

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

گزشتہ رات معمول سے ہٹ کر کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا۔ ہم سب نے مل کر کھانا کھایا، بچے تادیر چہکتے رہے، تا وقتیکہ موسم سرما کی تعطیلات سے متعلق پروگرام بناتے بناتے ہم سب حسب معمول گہری نیند سو گئے۔

رات کا دوسرا یا تیسرا پہر ہو گا، جب اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے دھیرج کے ساتھ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا یا جیسے دروازے پر دستک ہوئی ہو۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے ساتھ جڑ کر لیٹا ہوا چھوٹا بیٹا بے خبر سو رہا تھا اور برابر کے پلنگ پر بیگم اور ننھی۔ لیکن نیند اچٹ گئی اور میں بدحواس سا ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ چنبیلی کی خوشبو سارے گھر میں بھری ہوئی تھی۔ شاید رات کو باہر کا دروازہ کھلا رہ گیا۔ اس خیال نے مزید پریشان کر دیا یا شاید اس خوشبو کے احساس نے۔ جب کہ چنبیلی کا پودا تو ہمارے قرب و جوار میں کہیں نہیں تھا۔

اپنے کندھوں پر گرم شال لیتے ہوئے، میں ڈرائنگ روم سے گزر کر محتاط قدموں کے ساتھ ٹی۔ وی لاؤنج تک آیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ باہر کا دروازہ واقعتاً کھلا ہوا تھا۔ انجانے خوف کے تحت میں نے ایک ایک کر کے گھر کے سارے بلب روشن کر دیئے۔ باتھ روم اور کچن میں جھانکا، ٹیرس پر سے ہو آیا۔ وارڈروب دیکھ لیے، پلنگ کے نیچے اور پردوں کے پیچھے دیکھ بھال کر ہر طرح کا اطمینان کر لیا ہر چیز اپنی جگہ پر تھی لیکن طبیعت میں ایک بے چینی سی تھی۔ اک انجانا سا خوف، اور چنبیلی کی خوشبو سارے گھر میں بھری ہوئی تھی۔

میں حیران کھڑا تھا کہ اچانک باہر کھلنے والے دروازے کی سمت سرسراہٹ سی محسوس ہوئی جیسے وہاں کوئی تھا اور ابھی ابھی سیڑھیاں اتر گیا ہو۔ میں ایک لحظہ کے لیے رکا اور بنا سوچے سمجھے میں بھی سیڑھیاں اتر گیا۔

میں نے دیکھا کہ رات کو پڑنے والی نرم برف پر انسانی قدموں کے مانند پڑتے ہوئے نشانات تھے۔ کوئی ننگے پاؤں چلتا ہوا نکل گیا تھا۔ یہ کون ہو سکتا تھا، سمجھ میں نہ آیا۔ یا شاید نیند کا خمار ابھی ٹوٹا نہیں تھا اور میں اپنی اس دلیری پر حیران اور ششدر پلٹنا چاہتا تھا کہ کارپورچ کے ستون کے پیچھے، زیرو پاور کے رات بھر جلنے والے بلب کی مدھم نیلی روشنی میں، میں نے اُسے دیکھا۔

وہ کوکی تھی، بلا شک و شبہ، وہی بیس برس پہلے کا ناک نقشہ۔ وہ بالکل ویسی کی ویسی تھی۔ اس کے ساتھ کھیلتے، لڑتے جھگڑتے اور اسے چڑاتے ہوئے میرا لڑکپن گزرا تھا اور جسے اوائل جوانی میں ٹوٹ کے چاہا تھا۔ وہ ننگے پاؤں تھی اور اس نے صرف ایک ہلکی سی چادر لے رکھی تھی۔ وہ سردی سے کانپ رہی تھی اور اس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں چنبیلی کا ہار تھا۔

میں حیران کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہ ویسی کی ویسی تھی اور ان بیس برسوں میں میرے سر کے بال سفید ہی نہیں ہوئے بلکہ کافی حد تک جھڑ چکے تھے۔ اُس کی مخروطی انگلیاں اسی طرح ملائم تھیں، اور ان میں چنبیلی کا ہار جھول رہا تھا۔ اس کی پیشانی کی چمک، رخسار اور ہونٹوں کی تپش ویسی ہی تھی، یا شاید مجھے محسوس ہوئی۔ میں نے اسے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی۔ بس حیرانی سے اسے دیکھتا رہا۔

اس وقت فجر کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ وہ اسی طرح ساکت و جامد، کانپتے ہوئے ہاتھوں میں چنبیلی کا ہار تھامے کھڑی رہی، مونہہ سے کچھ نہ بولی۔ لیکن جب میں اسے اپنے بازوؤں میں بھر لینے کو آگے بڑھا تو اس نے مونہہ پھیر لیا۔ اس کے اٹھے ہوئے بازوؤں میں چنبیلی کا ہار اسی طرح کانپ رہا تھا۔ پھر میں نے وہ ہار ہمیشہ کی طرح لے کر اپنے گلے میں ڈال لیا۔ اس اثنا میں وہ مڑ چکی تھی اور نرم برف پر چلتے ہوئے اس کے قدم تیزی سے اٹھ رہے تھے۔ میں نے اسے آواز دی لیکن وہ رکی نہیں۔ میں نے اسے دوڑ کر روکنا چاہا تو گھٹنوں تک برف میں دھنس گیا، اور وہ تھی کہ سبک قدموں کے ساتھ جیسے برف پر پھیرتی چلی جاتی ہے۔ میں بڑی مشکل سے شوالہ کی جانب اترجانے والی کھڑی ترائی تک چل کر آیا، لیکن ترائی سے آگے وہ نہیں تھی۔

میں وہیں ٹھہر گیا۔ وہ یکلخت کدھر نکل گئی، کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ پھر مجھے حواس کو مجتمع کرنے کے لیئے شاید بہت وقت لگ گیا۔ صبح کی سپیدی میں، میرے سامنے حدِ نگاہ تک ہر طرح کے نشانات سے پاک برف ہی برف تھی۔ میں پلٹا، اپنے گلے کا ہار اتار کر پورچ کے ستون کے ساتھ ٹانگ دیا اور خوف ملی حیرانی کے ساتھ گھر کی سیڑھیاں چڑھ آیا۔

اس وقت میری بیوی جاگ چکی ہے اور کچن میں مصروف ہے۔ اس نے مجھ سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ میں اتنی دیر کہاں رہا۔ شاید اس نے یہ خیال کیا ہو کہ مجھے جاگے ہوئے کچھ زیادہ وقت نہیں گزرا اور رات کی برف باری کے بعد میں چہل قدمی کو نیچے اتر گیا ہوں۔

میں وہ دن یاد کرتا ہوں، جب سارا پچھم تف تف کر رہا تھا۔ جھلار والے کنوئیں کی سمت پانی بھرنے کے لیئے رواں لڑکیوں کی قطار کی رفتار سست پڑ گئی تھی، حجروں میں چلموں کی گڑگڑاہٹ اونچی سرگوشیوں میں دم توڑ گئی تھی اور مغلوں کے حجرے میں تمباکو پینے والے کمیوں نے شام کی بیٹھک ترک کر دی تھی۔

کوکی سے میرے میل جول کی اطلاع اجی کو ذرا تاخیر سے ملی، لیکن انھوں نے دیر نہیں کی۔ پھر کر کار نس سے اپنی تلوار اتار لی اور غصے میں کانپتے ہوئے صرف اتنا کہہ پائے۔ اگر میرا بیٹا حلالی ہے اور مغل خون ہے تو رقعہ پڑھتے ہی شہر سے فوراً واپس آئے گا لیکن پہلے میں اس نمک حرام فیکے کی گردن ماروں گا۔

اس وقت میں شہر میں تھا اور یہ سب میری حقیقی ماں نے بتایا تھا۔

ایسے میں اجی کو کون روکتا۔ حویلی میں بین پڑ گئے اور وہ میری روتی کرلاتی ماں کو پیچھے دھکیل کر صدر دروازہ لانگھ گئے۔ میرے اجی کا گاؤں کی گلیوں میں یوں نکلنا تھا کہ دم بھر میں بھری پُری آبادی ویران ہو کر رہ گئی۔ سب اپنے اپنے گھروں میں دبک گئے اور جب تک وہ فیکے کمہار کے دروازے پر دستک دیتے، فیکا اپنی بیٹی کوکی سمیت غائب ہو گیا۔

اُس رات اجی، ڈولتے سنبھلتے ساری آبادی میں گھوم گئے لیکن فیکے اور کوکی کا سراغ کہیں نہ پایا۔ وہ سخت حیران تھے کہ اُن دونوں کو زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ وہ دن اور وہ رات، اُن کے غصے کی تلوار خود انہی کے لہو میں نیام ہوتی رہی۔

اگلے روز انھوں نے اعلان کیا کہ آبادی میں کوئی ننگے سر نہیں نکلے گا اور حویلی سڑک سے گاؤں کی سمت آنے والے راستوں پر کوئی سوار نہیں آئے گا۔ گزرگاہ سے سب اونٹ کی نکیل اور گھوڑے کی باگیں تھام کر پیادہ پا گزریں گے، مبادا مغل حویلی کی بے پردگی ہو۔ یہ اعلان کر چکنے کے بعد انھوں نے منشی کو طلب فرمایا اور میرے نام شتاب گھر لوٹنے کا رقعہ لکھوایا۔

اُدھر میں اپنے کالج کے بورڈنگ ہاؤس میں، کوکی کا دیا ہوا گجرا بازو میں پہنے، کملائی ہوئی چنبیلی کا ہار گلے میں ڈالے اور سینے پر عطرِ چنبیلی ملے صرف نیلے رنگ کی پتلون اور تسمہ والی چپل میں گھومتا تھا۔

جب اجی کا خط ملا تو یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہو جائے گا۔ لڑکپن گزار کر جوانی کی سرحد پر کوکی

سے میں ملا ہی کتنی بار تھا۔ میں نے تو اکثر اسے گھنٹوں انتظار کرایا تھا۔ ملنے کا وعدہ کر کے بھول جاتا تھا لیکن یہ سب جیسے پلک جھپکتے میں ہو گیا۔

میں نے وارڈن کے کمرے میں بیٹھ کر چھٹی کی درخواست لکھی اور گاؤں کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ میں ابھی جرنیلی سڑک پر اترا ہی تھا کہ کیما آخدی مل گیا۔ اس نے چرتے ہوئے ڈھور ڈنگروں کو وہیں چھوڑ کتابوں اور کپڑوں سے بھرا ہوا میرا اٹیچی کیس اٹھایا اور خاموشی سے آگے ہولیا۔ وہ چپ چپ تھا اور میرے ہر سوال کا جواب ہاں یا نہیں میں دے رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے روک کر پوچھا تو کہنے لگا:

"نیکا، کیا بتاؤں —— تم پڑھ لکھ کر بڑے آدمی ہو گے۔ چھوڑو، جو ہوا سو ہوا۔"

میں چکرا گیا اور اٹیچی کو ایک جھٹکے کے ساتھ اس کے سر پر سے کھینچتے ہوئے وہیں بیٹھ گیا۔ "اب بول بھی۔ بتاتا کیوں نہیں۔ ہوا کیا ہے؟"

"کیا ہونا تھا نیکا۔ تمہاری کھیل تھی اور کسی کی زندگی اجڑ گئی۔ غریب غربا کا کیا ہے۔ بس یونہی گزر جاتے ہیں۔"

"اوئے، کون گزر گیا؟ اب بک بھی۔"

"نیکا —— اللہ تمہیں حیاتی دے۔ بس یوں سمجھو کر فیکے کمہار کی بیٹی کوکی گزر گئی —— تم ٹھہرے مغلوں کی اولاد، اور وہ بے چاری کمہارن میل ہوتو کیسے؟"

"گزر گئی؟"

مجھے چکر سا آ گیا اور اس کی بات پوری نہ سن سکا۔

"پُتر —— تیرہ برس کی لڑکی کسی بڈھے ٹھڈے سے بیاہ دی جائے تو گزر ہی گئی نا ——"

"پر یہ ہوا کیسے؟ کیسے ہوا یہ سب؟؟"

میں گاؤں پہنچنے تک یہی رٹ لگائے رہا لیکن وہ سر پر اٹیچی تھامے تیز تیز قدم اٹھاتا بس چلتا گیا۔

حجرے کے سنگی ساتھیوں نے بتایا کہ جس روز اجی کو پتا چلا ہے، اس کے اگلے روز شام کو فیکے اور کوکی، دونوں باپ بیٹی کو مستان شاہ کے دربار کے بھیواڑے سے برآمد کر لیا گیا۔ پہلے تو دونوں کو کُٹ ماری گئی اور پھر عشا کی نماز کے بعد کوکی کا نکاح، اس کی باپ کے عمر کے ایک کمہار سے پڑھوا دیا گیا۔

میں نے یہ سنا اور چپ چاپ حویلی کی سمت چل دیا۔

لیکن کوکی کو میرے گاؤں پہنچنے کی اطلاع مل چکی تھی اور وہ اپنے گھر سے نکل کر ہماری اونچی ماڑی کے چھجے پر جا بیٹھی تھی۔ سارا گاؤں نیچے حیران کھڑا تھا اور وہ ہماری ماڑی کے روشن دانوں سے جھانکتے اور سینہ کوبی کرتے ہوئے رو رو کر میری والدہ سے ایک ہی التجا کیے جاتی تھی۔

"او مائے نی مائے!! تیرے روشن دانوں میں بیٹھی رہوں گی، جاؤں گی نہیں مجھے یہیں بیٹھے رہنے دے۔"

پھر میں اپنے صحن میں نکل آیا اور وہ مجھے بس ٹکر ٹکر دیکھتی رہی۔ روئی نہیں، چیخی نہیں۔ اس نے کچھ بھی تو نہیں کہا۔ میرے دیکھتے دیکھتے، ہمارے ملازموں نے اسے کھینچ کھانچ کر چھجے پر سے اتارا، ہاتھ پاؤں رسی سے باندھے اور اس کے گھر سے جا کر باہر سے کنڈی چڑھا دی۔ میں گاؤں میں ہوتے ہوئے، کچھ بھی نہ کر پایا۔

ماں نے بتایا کہ اس وقت میں نے میٹرک کے بعد نیا نیا کالج میں داخلہ لیا تھا۔

ابّی نے میرے بازو سے اس کا دیا ہوا کڑا اتار لیا اور منشی کے ہمراہ مجھے دوبارہ شہر بھیج دیا۔ اب میرے گاؤں آنے پر پابندی لگا دی گئی۔ شام کو وارڈن باقاعدگی سے میرے کمرے میں موجودگی کا ریکارڈ رکھتا اور ابّی کو بلا ناغہ خط لکھ کر میری پروگریس سے مطلع کرتا۔

بورڈنگ ہاؤس میں میرے پاس اس کی دو ہی نشانیاں تھیں۔ موتیے کا سوکھا ہوا ہار اور چنبیلی کے عطر کی ایک چھوٹی شیشی۔ ہار کو میں نے کمرے کی کھونٹی پر ٹانگ دیا تھا اور عطر کی شیشی کتابوں والی الماری میں چھپا دی تھی۔ الماری پر تالہ لگا تھا اور میرے کمرے میں چنبیلی کی خوشبو بھری تھی۔

شام کو میں اکثر دوستوں کے ساتھ گھومتا گھماتا لاری اڈے تک نکل جاتا اور نیاز بس سروس کے لیے مخصوص کونے میں اس وقت تک ٹھہرا رہتا جب تک بس آخری پھیرا لگا کر واپس نہ آجاتی۔ آخری پھیرے پر بس سے اترتے ہوئے کریم استاد گاؤں کی خیر خبر بتاتا اور میں دوستوں کے ساتھ چپ چاپ بورڈنگ ہاؤس کی سمت چل پڑتا۔

شہر پھر شہر تھا، ایک ہنگامہ تھا۔

دن گزر رہے تھے اور شہر کے ہنگاموں نے کوکی کی یاد کو دھندلانا شروع کر دیا تھا۔ البتہ سرِ شام دوستوں کے ہمراہ لاری اڈے تک نکل جانا اور آخری بس دیکھ کر پلٹ آنا اب جیسے ایک عادت سی بن گئی تھی۔

ایک دن کریم استاد نے بس سے اترتے ہوئے، مجھے الگ لے جا کر بتایا کہ کوکی نے اپنے خاوند کو چھری مار دی ہے، وہ بچ تو گیا ہے لیکن کوکی کے ہاتھوں اور پیروں میں رسی ڈال کر پابند کر دیا گیا ہے۔ یہ سن کر ایک لحظہ کے لیے اُس کی یاد نے سینے میں کروٹ لی لیکن اگلے روز امتحانات کا شیڈول ملنے پر میں سب کچھ بھول بھال کر اپنی کتابوں میں کھو گیا۔ یہ دھیان بھی نہ رہا کہ اُن کتابوں کے پیچھے ایک چھوٹی سی عطر کی شیشی بھی سنبھال کر رکھی تھی۔

امتحانات کے بعد گرمیوں کی چھٹیاں ملنے والی تھیں اور دجی کے خط سے معلوم ہوا تھا کہ انہی چھٹیوں میں میری بہن کی شادی کی تاریخ طے پائی ہے۔ اجی نے مجھے شادی سے پندرہ دن پہلے گاؤں پہنچنے کی تاکید کی تھی۔

امتحانات کے ریلے نے ساحل پر اساسے گئے سارے گھروندے جیسے مسمار کر دیئے تھے اور میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ چھٹیاں ملیں ڈگریوں اور کتابوں سے بھری اٹیچی کے ساتھ نیاز بس سروس تک چل کر آتے ہوئے گاؤں کے لیے دل میں کچھ زیادہ امنگ نہیں تھی۔ بس ایک ہلکی سی خجالت کا احساس تھا۔ کوکی کے لیے ہمدردی یا رحم کا ایک معمولی سا جذبہ، اور اس کے سوا کچھ نہیں۔

گاؤں پہنچ کر میرا زیادہ تر وقت شادی سے متعلق انتظامات اور حجرے میں دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں میں گزر گیا۔ مجھ سے اتنا بھی نہ ہوا کہ اُدھر جاتا۔ دوستوں سے جو کچھ سنا، وہ میرے لئے نیا نہیں تھا۔ پھر شادی کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ مہمانوں کی ریل پیل میں کسی بات کا ہوش نہ رہا تھا۔

شادی کی رات ڈیوڑھی سے نکل رہا تھا کہ لڑکیوں کا ایک ریلا آیا، جس میں، میں نے اُسے آخری بار دیکھا۔ وہ سب سے پیچھے تھی۔ اس نے اپنے سوئے ہوئے بیٹے کو کندھے سے لگا رکھا تھا اور مجھے دیکھ کر ایک لحظہ کے لیے ڈیوڑھی میں ٹھہر گئی تھی۔ پھر وہ چپ چاپ آگے بڑھ گئی اور میں بھی ڈیوڑھی میں زیادہ دیر نہیں رُکا۔

میری بہن نے مجھے بتایا تھا کہ اُس روز کوکی اُس کے پاس کچھ دیر کے لیے بیٹھی تھی اور اُس نے میرے بارے میں پوچھا بھی تھا۔

اب لڑکیوں سے صرف اتنا سنا ہے کہ اس کے پاس میری پی ہوئی سگرٹوں کے ٹوٹے اب بھی محفوظ ہیں، جو اس نے میرے کمرے سے اٹھائے تھے۔ اُسے مجھ سے کوئی گلہ نہیں۔ کہتی ہے 'وفا تو بے وفا کے ساتھ کی جاتی ہے'۔

جب سب گھر والے سو جاتے ہیں تو وہ سگرٹ کے ٹوٹوں کا ڈبہ نکالتی ہے، ایک ایک ٹوٹے کو ہونٹوں سے لگاتی ہے اور سینت کر رکھ لیتی ہے۔ کسی سے کچھ نہیں کہتی۔

میں بھی کبھی چنبیلی کی خوشبو گھر نہیں لایا۔

لیکن یہ موسم کی پہلی برف باری ہے۔ باہر حدِ نگاہ تک برف جمی ہوئی ہے۔ بیگم کچن میں ہے، بچے گہری نیند سو رہے ہیں اور گھر میں چنبیلی کی خوشبو ہر طرف بھری ہوئی ہے۔

حرامی پلّا

ڈاکٹر آغا سہیل

اوہ! بانگڑو نے اُس پائپ لائن کے اندر بیٹھے بیٹھے ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر باہر جھانکا۔ بڑی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ دور دور تک خاک اُڑتی نظر آتی تھی۔ نہ آدم نہ آدم زاد، سڑکیں یوں خاموش اور ویران تھیں جیسے کوئی انھیں لوٹ کر لے گیا ہو۔ وہ تھوڑا سا کسمسایا، اندر پائپ لائن میں قطار اندر قطار لیٹے ہوئے اپنے ننگ دھڑنگ، چھوٹے بڑے چھ عدد بھائیوں کو دیکھا اور اپنی ماں کے دور دور تک پھیلے ہوئے موٹے تازے لحیم شحیم پُر گوشت جسم کو دیکھا اور ان کے اُن خراٹوں کو سُنا جو اس پوری پائپ لائن میں گونج رہے تھے۔ پھر اپنے پیٹ کی آگ کو شدت سے محسوس کیا۔ ایک طرف شہر پر کرفیو کا سناٹا طاری تھا اور دندناتی گولیوں کا اندیشہ تھا، دوسری طرف پیٹ کی آگ تھی۔ ایک لمحے اُس نے توقف کیا اور پھر آہستہ سے پردہ ہٹا کر پائپ سے باہر نکل آیا۔

بانگڑو دبے دبے قدموں سے آہستہ آہستہ رینگتا ہوا سڑک کے دوسرے کنارے پہنچ گیا۔ شدت کی دھوپ تھی، ذرا سی دیر میں وہ پسینے سے شرابور ہو گیا۔ اُس نے یہ بھی غور کیا کہ پولیس والے کہاں کہاں گھات لگائے بیٹھے ہوں گے۔ جگہ جگہ پولیس کا پہرہ ہوتا تھا اور جو لوگ گھات میں لگے دشمن کی گولیوں سے بچ رہتے تھے وہ کرفیو کے دوران پولیس کی گولیوں کا نشانہ بن جاتے تھے۔ ایک آدھ مرتبہ بانگڑو نے ایک آدھ دکان کی چھت پر بیٹھے لوگوں کو گولیوں کا نشانہ بنتے دیکھا تھا جس طرح بھاڑ میں چنے بھونے جاتے ہیں اور وہ چٹختے ہیں۔ بالکل اسی صورت سے اُس نے گولیوں سے لوگوں کو بھُنتے تڑپتے، خون میں نہاتے اور لاشوں کو ٹھنڈا ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ منظر تھوڑی دیر کو تو اُسے اچھا لگا، لیکن جب اُس نے لوگوں کو تڑپتے اور مرتے دیکھا اور اُن کے بے جان ٹھنڈے جسموں کو دیکھا تو اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے، اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، زبان خشک ہو گئی اور یوں محسوس ہوا کہ جیسے اس کا اپنا جسم بھی ٹھنڈا پڑ گیا ہو۔ رات دیر تک وہ سکتے میں رہا، لیکن جب اُس نے خطرے کو اپنے سے بہت قریب پایا تو معاً اس کا منجمد ہوتا ہوا خون رگوں میں گردش کرنے لگا۔ اُس میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ دوکان کی چھت سے کود کر اتنی تیزی سے دوڑا کہ اس سے پہلے دوڑنے کے لئے اپنے جسم میں اُس نے اتنی توانائی کبھی محسوس نہ کی تھی۔ شاید سارے جسم کی طاقت اُس کے پیروں میں آ گئی اور یہ سوچ کر کہ اب جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا، وہ دوڑا تو دوڑتا ہی چلا گیا۔ اُس کو یہ احساس ہوا کہ اگر کہیں سے گولی آئے گی تو اُس کی تیز رفتاری کے مقابلے میں اُس کا پیچھا نہیں کر پائے گی اور جب ہانپتا کانپتا وہ اپنی جائے پناہ میں داخل ہوا جسے وہ ہمیشہ سے اپنا گھر سمجھتا آیا تھا اور جو لمبے چوڑے چکلے سیمنٹ کے پڑے ہوئے پائپس پر مشتمل تھا تو بے حال ہو کر اپنی ماں کے چوڑے چکلے پُر گوشت جسم پر دھم سے گر پڑا۔ اُس کی ماں نے زور زور سے دو چار دھکے اُسے رسید کیے، دو چار گالیاں اور کوسنے دیئے، جو اُس کی ہمہ وقت کی خوراک تھے، تب اُس نے ہانپتی ہوئی آواز میں سارا ماجرا بیان کیا تھا لیکن اب اس وقت صورت حال قدرے مختلف تھی، کرفیو لگا ہوا تھا، سڑکیں اور بازار ویران تھے، موت کا خطرہ بدستور موجود تھا لیکن سب سے گمبھیر مسئلہ اُس کے پیٹ

کا تھا۔ کئی وقت گزر چکے تھے، نہ اُسے روٹی کا ایک لقمہ ملا نہ سوکھے چنے ملے اور نہ کوڑے کرکٹ پر پڑے ہوئے روٹی یا ڈبل روٹی کے ٹکڑے ملے۔ اُس کے چھوٹے چھوٹے بھائی کئی وقت سے بھوک کے کڑاکے جھیل رہے تھے۔ ماں جو اِدھر اُدھر سے مانگ کے ٹکڑے لے آتی تھی اُن کا سلسلہ بھی بند تھا اور اب اُس کی ماں بار بار اُس سے کہتی تھی کہ تو بڑا ہو گیا ہے، جوان ہو گیا ہے، اپنی روٹی آپ کما، خود بھی کھا، ہمیں بھی کھلا۔

اس نے تو کئی کئی بار بازار کی دوکانوں میں لگے ہوئے آئینوں میں اپنے کالے کلوٹے چہرے کا بغور معائنہ کیا۔ مگر ابھی تو مونچھوں کے مقام پر اسے ایک بال بھی نظر نہ آیا۔ اُس کے چمکدار سیاہ رنگ سے اس قدر پسینہ چھوٹ رہا تھا جیسے اُس نے اپنے جسم کی رنگت اور پسینے کی نمی میں عجب طرح کی کیچڑ اور ریچ جیسا ریگ تارکول سارے جسم پر ملا ہوا ہو اور اس کا سیاہ فام چہرہ تمتما رہا ہو۔ بہرحال اس نے ان باتوں کو بھی ذہن سے جھٹک دیا اور کوڑے کرکٹ پر پہنچ کر اُس نے روٹی کے ٹکڑے تلاش کرنا شروع کیے جو کوشش کے باوجود اُسے نہ ملے۔ وہ ایک ڈھیر سے دوسرے کوڑے کے ڈھیر کی طرف سفر کرتا رہا۔ اِدھر اُدھر آس پاس نگاہ بھی دوڑاتا رہا۔ نیچے سے اوپر، قریب اور دور ہر طرف دیکھتا رہا، اُس جنگلی ہرن کی طرح جس کی گھات میں شکاری کتے لگے ہوئے ہوں اور وہ ان کا نشانہ بننے سے بچتا رہا ہو، بچتا رہے اور اپنی غذا بھی ڈھونڈتا رہے۔ تادیر یہی کیفیت رہی۔ اُس نے کئی بار شہر کے لوگوں کو کوسا۔ کبھی کبھی تو جب شہر میں امن و امان ہوتا تھا وہ بڑے بڑے ہوٹلوں کے سامنے سے گزرتا تھا اور عام طور پر ہوٹلوں کے پچھواڑے سے اُسے اتنا پس خوردہ مل جاتا تھا کہ ٹھاٹ سے خود بھی کھاتا تھا اور سمیٹ کر ماں کے پاس بھی لے آتا تھا۔ اُس کے سارے بھائی موج اڑاتے تھے، ایک دوسرے سے چھینتے تھے، لڑتے جھگڑتے تھے مگر خوش رہتے تھے۔ کوئی نہ کوئی سیٹھ یا سیٹھانی اُسے ایک آدھ روپیہ بھی دے دیتے تھے۔ کبھی کبھی تو دو چار روپے بھی مل جاتے تھے اور یوں دو چار وقت اچھے گزر جاتے تھے، لیکن اب مسئلہ کچھ اور تھا۔ شہر سے امن و امان کوئی لوٹ کر لے گیا تھا۔ ساری رونق کافور ہو گئی تھی۔ لوگ گھروں میں پناہ لیے بیٹھے تھے، بازار بند تھے۔ سڑکیں ویران تھیں اور اوپر سے تیز دھوپ تھی اور پیٹ میں آگ لگی ہوئی تھی۔

اُس نے سوچا اگر کھانے کو کچھ نہیں ملتا ہے تو لاؤ کہیں سے دو چار گھونٹ پانی ہی پی لے۔ پانی کے نلکے کہاں کہاں تھے اُسے سب پتہ تھا مگر کوئی بھی نلکا قریب میں موجود نہ تھا۔ ندی کوئی آس پاس تھی نہیں، جوہڑ بھی خشک پڑے تھے۔ اُسے تو یہ حکمت بھی آتی تھی کہ گندے نالوں میں بہتا ہوا پانی کس کس مقام پر صاف و شفاف ہو جاتا ہے اور وہ نالے میں اتر کر چلو بھر بھر کے صاف پانی پی لیا کرتا تھا، لیکن اب نہ تو آس پاس کوئی نالا تھا اور نہ کہیں پر ایسی کیچڑ تھی جس سے وہ اپنا حلق تر کر لیتا۔

ویسے تو سڑک کافی بلندی پر واقع تھی اور سڑک کے دونوں طرف نشیب میں دور دور تک مٹی کے سوکھے ہوئے تودے تھے جو کبھی کبھار بارش کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ کر بہتے رہتے اور دور دور تک کیچڑ ہی کیچڑ ہو جایا کرتی تھی۔ اب تو آسمان سے بارش بھی نہیں ہوئی تھی۔ سورج کی تیز شعاعیں زمین کی ساری نمی کو چاٹ چکی تھیں۔ سوکھی ہوئی زمین اور جھڑتی ہوئی مٹی اور جا بجا گھٹنوں گھٹنوں ریت، اس ریت میں کہیں کہیں پر تو پاؤں اس طرح دھنس جاتے کہ لگتا جیسے تنور میں پاؤں رکھ دیئے ہوں۔ یا نگوڑ تڑپ جاتا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا اور ریت کے خطوں اور منطقوں سے نکل کر ایسی زمین تلاش کرتا جہاں ریت نہ ہو، مٹی ہو مگر چاندنی راتوں میں یہی ریت ایسی ٹھنڈی ہو جاتی ما نو برف پر چل رہے ہیں۔ جی چاہتا گھٹنوں ریت میں پاؤں ڈالے پڑے رہو۔ اکثر چاندنی راتوں میں ٹھنڈی ٹھنڈی ریت پر لوٹنیاں لگانے میں کتنا مزہ آتا تھا۔ کبھی کبھی تو ساری رات وہ ریت کے فرش پر آرام سے لیٹا سوتا رہتا۔ مگر اُسے پھر یاد آیا کہ وہ بھوکا ہے۔ اور پیٹ میں اُس کی آنتیں تلے اوپر ہو رہی ہیں۔ یکبارگی اُس کا جی چاہا کر سڑک پر چڑھ کر اور آنکھیں بند کر کے وہ دوڑ لگا دے۔ آخر کہیں نہ کہیں تو وہ پہنچے گا اور کسی نہ کسی مقام پر پہنچ کر اُسے کچھ نہ کچھ تو ملے گا، کھانا نہ سہی تو پانی سہی۔

کیسا اس شہر میں کنچن برستا تھا۔ بازاروں میں کیسی رونق ہوتی تھی، کتنا ہجوم ہوتا تھا، رات رات بھر سڑکیں جاگتی رہتی تھیں۔ ٹرک، بسیں، گاڑیاں دن رات زوں زوں کرکے گزرتی رہتی تھیں کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی یا اب یوں لگتا ہے جیسے کوئی عفریت آیا اور ساری آبادی کو نگل گیا، سارا ہجوم چاٹ گیا، سارے بازار ہڑپ کر گیا۔ چلتے چلتے اُسے ایک جھونپڑی نظر آئی۔ اُسے معلوم تھا کہ یہ مائی بھاگاں کی جھونپڑی ہے، جہاں اُس کے ساتھ محض اُس کی مرغیاں رہتی ہیں۔ تب ایک خیال تیزی سے اُس کے ذہن میں کوندا اور اُس نے سوچا کہ اگر کوئی مرغی اس کے ہاتھ لگ جائے تو کیا مزہ آئے۔ مائی بھاگاں یوں تو ہمہ وقت چیختی چنگھاڑتی رہتی تھی، گالیاں کوسنے دیا کرتی تھی، کبھی راہ چلتے مسافروں کو، کبھی اپنے مرغیوں کو، کبھی کبھار بانگڑو کو بھی اور اُس کی ماں کو بھی اور اُس کے سارے بھائیوں کو بھی۔ اُس نے سوچا اگر اُس نے مرغی چراتے دیکھ بھی لیا تو چلو کچھ گالیاں کوسنے ہی دے لے گی، دو چار تھپڑ مار دے گی، ایک آدھ لات گھونسہ رسید کر دے گی لیکن پیٹ کی آگ تو بجھے گی۔ ترکیب اُس کے ذہن میں یہ تھی کہ مرغی ملتے ہی یہاں سے وہ سرپٹ بھاگے گا اور سیدھا اُس کباب والے کی دکان پر پہنچے گا جہاں دکان تو بند ہے مگر کوئی نہ کوئی چیز تو ایسی وہاں ضرور ملے گی جس سے مرغی کو ذبح کیا جا سکے اور آس پاس پڑے ہوئے ڈرموں میں اُسے ٹھنڈا ہونے کو ڈال دیا جائے پھر اُس کے پر صاف کرکے ماں کے پاس لائے گا اور سوکھے پتوں اور لکڑی کے الاؤ میں مرغی بھون کر خود بھی کھائے گا اور اپنے بھائیوں کو بھی کھلائے گا۔ یہ سوچتے ہی اُس میں تھوڑی سی ہمت پیدا ہوئی اور اس نے مٹی کی بنی ہوئی جھونپڑی کی کچی دیوار کے اوپر سے جھانک کر دیکھا۔ اندر سناٹا پڑا تھا۔ شاید مائی بھاگاں سو رہی تھی یا کہیں باہر گئی ہوئی تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ کوئی مرغی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اُس نے ہمت کرکے دیوار پھلانگی اور جھونپڑی کے اندر جھانک کر دیکھا۔ مائی بھاگاں واقعی سو رہی تھی۔ اُس کے بوڑھے اور جھریوں بھرے جسم کا ایک ایک انگ سو رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے پپوٹے بند تھے، منہ کھلا ہوا تھا اور پوپلے منہ سے رال بھی ٹپک رہی تھی اور جا بجا چہرے پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں مگر پھر اُس نے غور کیا کہ مرغیاں کہاں ہیں معاً خیال آیا کہ اس دھوپ میں مرغیاں ضرور ڈربے میں بند ہوں گی۔ اُس نے سوچا کہ اگر اُس نے آنکھ بند کرکے ڈربے میں ہاتھ ڈالا تو مرغیاں چیخنے لگیں گی اور مائی بھاگاں جاگ جائے گی۔ اور وہ رنگے ہاتھوں پکڑا جائے گا۔ پکڑے جانے اور مار کھانے کا اسے ڈر نہیں تھا۔ مرغی چرا کر اور کھا پی کر برابر کر دی جائے، اُس کے بعد مار پڑے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اس سے پہلے ہی وہ اس کے ہتھے چڑھ جائے اور کچھ ہاتھ بھی نہ آئے تو یہ کوئی اچھی بات نہ ہوگی۔ اچانک اُس کی نگاہ ایک ایسے برتن پر پڑی جس میں مرغیوں کے لئے پانی بھرا تھا۔ وہ فوراً جھکا اور بے تحاشا ایک کتے کی طرح برتن میں منہ ڈال کر پانی پینے لگا۔ اس اثناء میں نا معلوم کیا ہوا کہ اولاً تو ڈربے میں تھوڑا سا ہیجان پیدا ہوا، پھر کڑکڑاتا ایک مرغ باہر آیا۔ اُس نے اپنے پر پھڑپھڑائے جیسے انگڑائی لے رہا ہو۔ اپنی منقار آسمان کی طرف بلند کی، دو چار بانگیں دیں اور پھر ڈربے کے قریب آیا، دو چار مرتبہ کڑکڑایا جیسے مرغیوں کو ڈانٹ رہا ہو۔ اس کے بعد ایک مرغی، پھر دوسری، پھر تیسری ڈربے سے برآمد ہوئیں۔ اب بانگڑو نے سوچا کہ اگر وہ مرغ پر ہاتھ ڈالتا ہے تو اسی آنگن میں ایک اکھاڑہ بن جائے گا۔ ممکن ہے مرغ حملہ کر دے اور اگر مرغی پکڑتا ہے تو بھی یہی خطرہ ہے۔ یہ سوچ کر اس نے ڈربے کے اندر جھانکا تو اُسے محسوس ہوا کہ ابھی ایک مرغی ڈربے کے اندر بیٹھی ہوئی ہے۔ غالباً وہ انڈے سے رہی تھی۔ یہ بھی بڑا خطرناک عمل ہے کہ وہ انڈوں پر بیٹھی مرغی کو پکڑے اور لے بھاگے۔ قریب ہی دیوار پر ایک کپڑا پڑا ہوا تھا۔ اُس نے کپڑا اٹھا لیا اور مرغ جو بڑے جوش و خروش اور ولولے میں تھا، اچانک خود ہی دیوار پر چڑھا اور دیوار سے دوسری دیوار پر گیا، پھر وہاں سے چھت پر چڑھ گیا اور چھت کی منڈیر پر چڑھ کر بانگ پر بانگ دینا شروع کر دی۔ بانگڑو نے ایک بار پھر سوئی ہوئی مائی کی طرف دیکھا جو اب دوسری کروٹ

بدل کر سو رہی تھی اور اُسے دنیا و مافیہا کی خبر نہ تھی۔ مرغ بھی مرغیوں کی طرف سے غافل ہو چکا تھا کہ بانگڑو نے تیزی سے ایک مرغی پر کپڑا ڈالا اور فوراً اس کی چونچ کو اپنی مٹھی میں دبا لیا اور دیوار پھلانگ کر یہ جا وہ جا۔ وہ ابھی بھاگ ہی رہا تھا کہ کسی طرف سے ایک کتا اُس کے پیچھے دوڑا۔ اس ہڑبونگ میں کسی کھونٹے سے اُس نے ٹھوکر کھائی اور منہ کے بل گرا۔ چوٹ تو نہیں آئی لیکن مرغی کا منہ کھلا تو اُس نے تھوڑا سا شور مچایا۔ اسی وقت مائی بھاگاں دوڑی ہوئی جھونپڑی کے دروازے تک آئی۔ دور سے اُس نے یہ منظر دیکھ لیا اور چیخنا شروع کر دیا۔ اب ایک طرف کتا تھا، دوسری طرف مائی بھاگاں اور تیسری طرف بانگڑو کے پیٹ کی آگ۔ اُس نے اتنی تیزی سے دوڑنا شروع کیا کہ کتا اُس سے دور رہ گیا۔ دو چار پتھر بھی اُس نے کتے کی طرف اچھالے اور اب اُس نے دیکھا کہ وہ کپڑا جس میں اُس نے مرغی کو لپیٹا تھا کہیں گر چکا تھا۔ مرغی اُس کی بغل میں دبی ہوئی تھی اور وہ بھاگا چلا جا رہا تھا۔ بھاگتے بھاگتے جب اُس نے یہ محسوس کیا کہ وہ تمام ممکنہ خطرات کی حدیں پار کر چکا ہے لیکن کرفیو کی حدود میں موجود ہے تو اُس نے اپنی رفتار دھیمی کر دی۔ ایک جگہ پر اُسے ایک سُتلی کا ٹکڑا پڑا ہوا ملا۔ اُس نے رُک کر اُسے اٹھا لیا اور مرغی کی دونوں ٹانگوں کو نہایت سہولت سے باندھ دیا اور اب اِس فکر میں بچتا بچاتا چلا جا رہا تھا کہ کہیں موقع ملے تو مرغی کا کام تمام ہو اور پیٹ کی آگ بجھے۔

بارے ایک ایسے علاقے میں وہ داخل ہوا جہاں کچھ کچے پکے مکانات بنے ہوئے تھے اور ایک بغلی سی گلی میں کچھ بچے کنچے کھیل رہے تھے۔ وہ تھوڑی دیر کو ٹھٹکا۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ کنچے کھیلے کیونکہ کنچوں کو دیکھ کر اس کی انگلیوں میں کھجلی ہونے لگی لیکن یہ بھلا کیسے ممکن تھا، نہ اُس کے پاس کنچے تھے اور نہ یہ کوئی کنچے کھیلنے کا موقع تھا۔ اُس کو تو اپنے پیٹ کی لگی ہوئی تھی۔ اُس نے یہ بھی دیکھا کہ ایک بچہ اپنے گھر کی دہلیز پر بیٹھا ہوا اپنے دامن میں بھنے ہوئے چنے لیے مزے سے کھا رہا ہے۔ وہ بچے کے قریب پہنچا۔ پہلے تو جی میں آئی کہ جھپٹا مارے اور چنے لے اُڑے لیکن یہ ممکن نہ تھا کیونکہ یہاں بہت سے بچے موجود تھے۔ وہ پکڑا جاتا اور اتنی مار پڑتی کہ بھُرتہ بن جاتا۔ بس وہ ندیدوں کی طرح چنوں کو دیکھتا رہا۔ جانے چنے کھاتے بچے کے جی میں کیا آئی کہ اُس نے خود پوچھا، کھاؤ گے؟ اور اُس نے للچائی نظروں سے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ مرغی کو زمین پر لٹا دیا جو بندھی ہوئی پڑی تھی، اُس نے چنے کھانا شروع کر دیئے۔ کنچے کھیلتے ہوئے بچوں میں سے کسی نے کہا کھیلو گے؟ اُس نے جلدی جلدی چنے پھانک کر اثبات میں گردن ہلائی۔ مرغی اُٹھا کر ایک دوسرے لڑکے کو پکڑائی۔ اپنے دونوں خالی ہاتھوں کو ایک دوسرے سے ملا اور رگڑا، انگلیوں کو چٹخایا اور کنچوں کو ایک ہاتھ میں لے کر انگلی پر کنچا رکھ کر دوسرے کنچے پر نشانہ لگایا کھٹاک سے کنچا لڑھکتا ہوا دور جا گرا۔ دوسرا کنچا۔ تیسرا کنچا۔ اُس کی ماہرانہ انگلیاں تیزی سے کنچوں پر چلنے لگیں۔

مگر اس نے دیکھا کہ سارے بچے غائب تھے۔ مرغی اس کے پاس پڑی ہوئی تھی اور اُس کے سر پر دو تین پولیس والے کھڑے تھے۔ اُن میں سے ایک کے ہاتھ میں بید تھا جو وہ بار بار اپنی پنڈلی پر پٹخ رہا تھا۔ ایک پولیس والے نے اُسے بازو سے پکڑا۔ اُس نے کنچے پھینک کر مرغی اٹھائی اور دوسرے نے اُس کا کان کھینچا اور اُسے دھکیلتے ہوئے قریب ہی سڑک پر کھڑی ہوئی ایک وین تک لے گئے پھر یہ وین ایک تھانے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ یہاں بہت سے اور بھی قیدی موجود تھے، نہ داد نہ فریاد، دو چار دن وہ اسی حوالات میں بند رہا۔ اگر وہ چیختا چلاتا تھا، شور مچاتا تھا اور اپنی مرغی کا تقاضہ کرتا تھا تو اُسے دو چار تھپڑ، ایک آدھ بید پڑتا تھا اور وہ دبک کر دوسرے قیدیوں کے ساتھ جا کر بیٹھ جاتا۔ بعض قیدی ضمانتوں پر رہا ہو گئے، مگر اُسے کوئی بھی پوچھنے نہ آیا۔ کسی کو بھلا اُس کی کیا فکر ہوتی۔

اچانک ایک رات اُس نے دیکھا کہ اس حوالات میں بڑی چہل پہل ہے۔ پولیس کی بہت سی گاڑیاں آ رہی ہیں اور جا رہی

ہیں، بہت سے قیدی لائے جا رہے ہیں۔ اچانک آدھی رات کو اُسے حوالات سے نکالا گیا۔ اُس کے ساتھ اور بھی بہت سے قیدی تھے اور انھیں بندوقوں کے بٹ مار مار کر کہا گیا کہ یہاں سے بھاگو اور دوڑو، جدھر جی چاہے جاؤ۔ قیدی بے تحاشا بھاگے، لیکن اُن پر ہر طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی اور جس طرح بھاڑ میں چنے چٹختے ہیں، اسی طرح سارے قیدی جو بھاگ رہے تھے زمین پر ڈھیر کر دیئے، ان میں بانگڑو بھی تھا۔

دوسرے دن پولیس کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ کچھ مسلح شرپسندوں نے ایک پولیس چوکی پر حملہ کر دیا تھا۔ ان میں سے بیشتر پولیس سے مقابلہ کرتے ہوئے ہلاک ہو گئے۔ ان کے ورثا پولیس کارروائی کے بعد شرپسندوں کی لاشیں حاصل کر سکتے ہیں۔

ساری لاشیں اٹھالی گئیں۔ بانگڑو کی لاش بدستور بے والی وارث پڑی تھی اور مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ نہ جانے کیسے مائی بھاگاں کا ادھر سے گزر ہوا۔ کسی نے اُسے اس لاش کی طرف متوجہ کیا، وہ اُس کے قریب آئی اور چیخ چیخ کر رونا شروع کیا اور زور زور سے گالیاں دینا شروع کیں۔ کسی پولیس کانسٹیبل نے مائی بھاگاں کے قریب جا کر کہا کہ مائی کیا یہ تیرے بیٹے پوتے کی لاش ہے؟

وہ دہاڑی اور زور زور سے بولی "میں اسے نہیں اپنی مرغی کو رو رہی ہوں، جسے یہ چرا کر بھاگا تھا۔ اس کی ماں چھنال تو ایک اور حرامی پلا جن لے گی، میں اپنی پیاری مرغی کہاں سے لاؤں گی۔"

رات تمہیں خواب میں دیکھا

بہاء طاہر

ترجمہ: **مسعود اشعر**

— ۱ —

میں صبح کام پر جاتا ہوں اور شام کو گھر لوٹتا ہوں۔ ہفتہ میں پانچ دن میرا یہی معمول ہوتا ہے۔ میں شمال کے ایک اجنبی ملک کے ایک شہر میں کام کرتا ہوں۔ صبح جب گھر سے نکلتا ہوں تو بس سٹاپ پر بھورے بالوں والی ایک لڑکی کھڑی ملتی ہے۔ اس کے ایک گال پر خوبصورت سا نشان ہے۔ مجھے دور سے آتا دیکھ کر وہ اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیتی ہے۔ ہم خواہ کتنی ہی دیر وہاں کھڑے رہیں، وہ میری طرف بالکل نہیں دیکھتی۔

میں شام واپس آتا ہوں تو ٹیلی وژن آن کرتا ہوں، بند کر دیتا ہوں، پھر ریڈیو کھولتا ہوں، بند کر دیتا ہوں۔ دیواروں پر ٹنگی تصویریں اور الماریوں میں رکھی کتابیں الٹ پلٹ کرتا ہوں۔ آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر اپنے آپ سے باتیں کرتا ہوں۔ پھر رات ہو جاتی ہے

رات کو اکثر میرے دوست کمال کا فون آتا ہے۔ کمال دوسرے شہر میں رہتا ہے۔ وہ عام طور پر مجھ سے پوچھتا ہے "کیا خیر خبر ہے؟ کوئی نئی بات؟" اور میں کہہ دیتا ہوں "کوئی نئی بات نہیں۔" وہ جن حالات میں زندگی گزار رہا ہے اس کی شکایت کرتا ہے۔ میرے اوپر جو بیت رہی ہے، میں اس کا گلہ کرتا ہوں۔ آخر وہ ایک لمبا سانس لیتا ہے اور کہتا ہے "اچھا پھر کل بات ہو گی" ـــــ تھوڑی دیر بعد میں سو جاتا ہوں۔ عام طور پر کتاب پڑھتے ہوئے مجھے نیند آتی ہے۔

اس ہفتے، میرے ساتھ کام کرنے والے ایک شخص فتحی نے تصوف پر مجھے ایک کتاب دی۔ اس فرم میں جس کا مالک ایک عرب ہے، ہم چند عرب باشندے کام کرتے ہیں، لیکن ہمارا منیجر اور باقی ملازم عرب نہیں ہیں۔ اس ماحول میں فتحی کو تصوف سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے گھر واپس جاتے ہوئے بس میں ہی، میں نے وہ کتاب پڑھنا شروع کر دی۔ پڑھتے پڑھتے میں ایک جگہ رک گیا۔ لکھا تھا کہ انسانی روح بعض اوقات جسم سے باہر نکل کر سیر کرنے چلی جاتی ہے۔ عام طور پر ایسا رات کے وقت ہوتا ہے، جب انسان سو رہا ہوتا ہے۔ لیکن روح کا جسم سے نکل کر سیر کو چلے جانا کسی وقت بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے نیند ضروری نہیں ہے۔ جسم کے باہر سیر کرتے ہوئے روح کی ملاقات دوسری ارواح سے بھی ہو جاتی ہے۔ ان میں نیک روحیں بھی ہوتی ہیں اور بد بھی۔ ان روحوں کے درمیان تعلقات بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔

مجھے ڈر سا لگا اور میں نے کتاب بند کر دی۔ میرے ساتھ بیٹھے آدمی نے مجھ سے پوچھا "کتاب کس زبان میں ہے؟" میں جان گیا کہ وہ بھی میری طرح پردیسی ہے کیونکہ اس ملک کے لوگ عام طور سے اجنبی لوگوں سے بات نہیں کرتے۔ جب میں نے اسے بتایا کہ کتاب عربی زبان میں ہے تو وہ بولا "عربی زبان بہت دلکش زبان لگتی ہے۔ اس کے اکثر حروف سطر کے نیچے تک چلے جاتے ہیں۔" میں نے کہا "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا" ـــــ اس پر اس نے کتاب میرے ہاتھ سے لے لی اور ان حروف کی طرف اشارہ کیا جو سطر کے اوپر سے شروع ہوتے تھے اور نیچے تک چلے جاتے تھے۔ کچھ حروف جملوں کے آخر میں تھے جو سطر کے نیچے تک دائرے بناتے تھے۔ میں نے اس کی دلچسپی دیکھ کر اسے ایسے حروف دکھائے جو سطر کے اوپر یا سطر کے برابر تھے لیکن وہ شخص اصرار کرتا رہا کہ پورے صفحے پر نظر ڈالنے سے ایسا ہی لگتا ہے۔

اکثر حروف سطر کے نیچے ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا: "آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" اس پر وہ کچھ پریشان سا ہو گیا۔

اس رات کمال نے پہلے ہی فون کر لیا۔ اس نے پوچھا: "کوئی نئی بات؟" میں نے اسے بتایا کہ انسانی روح جسم سے نکل کر سیر بھی کرتی ہے اور یہ کہ عربی حروف سطر کے نیچے تک جاتے ہیں۔ وہ تھوڑی دیر خاموش رہا۔ پھر پوچھنے لگا "کیا وہاں بھی سردی پڑ رہی ہے؟" میں نے کہا "ہاں یہاں سردی ہے۔" اس نے کہا "یہاں تو برف پڑ رہی ہے۔" پھر یکدم اس نے کہا "روح کس طرح سیر کرتی ہے؟ اور وہ کہاں جاتی ہے؟" میں نے کہا "مجھے نہیں معلوم۔ میں تو شاید یہ کتاب ہی نہ پڑھوں۔" اس نے کہا: "وہ کتاب مجھے بھیج دو۔" میں نے وعدہ کر لیا۔

صبح کام پر روانہ ہوا۔ سخت سردی کی وجہ سے تیز تیز چلتا رہا۔ بھورے بالوں والی لڑکی حسبِ معمول بس شاپ پر کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے اسی طرح منہ موڑ لیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لڑکی کی اس حرکت سے میں پریشان کیوں ہوتا ہوں؟ جہنم میں جائے وہ۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔

روحوں والی کتاب کمال کو پوسٹ کرنا تھی اس لئے میں وہ ساتھ لیتا آیا تھا۔ بس پر سوار ہوا تو سوچا کہ کتاب میں کوئی غیر معمولی بات تو ہے نہیں پھر بھی مجھے اس کا ایک آدھ صفحہ ضرور پڑھ لینا چاہیئے تھا۔ یہ تو معلوم ہو کہ روح کس طرح سیر کرنے جاتی ہے اور کیا کرتی ہے۔ پھر میں نے اس خواہش کو جھٹک دیا۔ ابھی میں بس پر ہی تھا کہ باہر برف پڑنے لگی۔ پہلے ایسا لگا کہ سفید کاغذی کترنیں آسمان سے گر رہی ہیں۔ پھر وہ بھاری اور موٹی ہو گئیں اور انھوں نے بس کے باہر ساری فضا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پھر چاروں طرف سفید چادر سی بچھ گئی۔ ایسی برف باری کے باوجود میں نے ڈاک خانے پر اترنے کا فیصلہ کر لیا۔ کتاب اپنے اوور کوٹ کی جیب میں ٹھونسی کہ بھیگ نہ جائے اور بس سے اتر کر ڈاک خانے کی طرف دوڑ لگائی۔ لیکن یہ بھی خیال تھا کہ کہیں برف پر پھسل ہی نہ جاؤں۔ ڈاک خانے کے باہر کھڑے ہو کر اپنے بالوں اور کوٹ پر سے برف جھاڑ رہا تھا کہ کوئی پیچھے سے آ کر مجھ سے ٹکرا گیا۔ مڑ کر دیکھا تو وہی بس والی لڑکی تھی۔ ایک لمحے کے لئے ہماری نظریں ملیں اور بیک وقت ہم دونوں نے معذرت کے الفاظ کہے، پھر وہ یکدم پیچھے ہٹی اور اندر چلی گئی۔

میں رجسٹری کی کھڑکی کے باہر قطار میں کھڑا ہو گیا۔ ابھی کھڑکی نہیں کھلی تھی۔ کھڑکی کھلی تو میں نے دیکھا، وہی لڑکی وہاں بیٹھی تھی۔ اس نے اپنا اونی کوٹ اتار دیا تھا۔ اس کے بھورے بال کندھوں تک کٹے ہوئے تھے۔ اور بیچ میں مانگ نکلی تھی۔ ماتھے پر پڑے سیدھے کٹے بال اور گال پر خوبصورتی کے نشان سے، اس کا گول چہرہ بچوں کا سا بھولا بھالا لگ رہا تھا۔ میری باری آئی تو میں نے کتاب اس کی طرف بڑھا دی۔ وہ تھوڑی دیر کتاب کی سنہری جلد حیرت سے دیکھتی رہی۔ پھر فوراً ہی اپنے چہرے پر وہ کرختگی طاری کر لی جو اس ملک کے شہری کام کرتے ہوئے طاری رکھتے ہیں۔ اس نے کتاب کو ترازو پر رکھا اور خرچ بتایا۔ اس دوران اس نے ایک بار بھی میری طرف نہیں دیکھا۔

میں وہاں سے چلا تو برف اسی طرح پڑ رہی تھی۔ فٹ پاتھ برف سے ڈھک گئی تھی۔ سڑک پر چلتی گاڑیوں کی چھتیں سفید چادر میں ڈھکی ہوئی تھیں۔ سفیدی میں لپٹی وہ سب ایک جیسی ہی نظر آ رہی تھیں۔ میرے پاس چھتری نہیں تھی۔ برف سے بچنے کے لیے میں ڈاکخانے کے دروازے پر کھڑا رہا۔ سوچ رہا تھا کہ دفتر کو دیر نہ ہو جائے لیکن کر بھی کیا سکتا تھا۔ موسم تو میرے ہاتھ میں نہیں تھا۔ ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا اور وہیں کھڑا ہو گیا۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ اس نے کپڑوں پر سے برف جھاڑی اور کوٹ کی جیب میں ہاتھ ٹھونس کر میرے قریب آ گیا۔ اس کے منہ اور نتھنوں سے نکلنے والی سانس بھاپ بن کر اڑ رہی ہے۔ سامنے سڑک پر آہستہ آہستہ کاریں گزر رہی تھیں۔ اس آدمی نے دوڑ کر چند کاروں سے لفٹ لینے کی کوشش کی لیکن ناکام ہو کر واپس آ گیا۔ اب اس پر نئی برف پڑ گئی تھی۔ وہ غصے میں میری طرف مڑا اور بولا "آپ غیر ملکی ہیں نا؟" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "آپ کے ملک میں بھی ایسے ہی بدمعاش ہوتے ہیں جو اتنی شدید برف باری میں بھی لفٹ نہیں دیتے؟"

میں نے اسے بتایا کہ ہمارے ملک میں صرف دھوپ ہوتی ہے۔ اس نے پوچھا میں یہاں کیوں آیا ہوں؟ میں نے آسمان کی طرف اشارہ کر دیا ـــــ وہ ہنس دیا۔

دفتر میں میرے افسر نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اور بولا "شویہ شویہ" وہ کہتا تھا عربی میں اس کا مطلب ہے "آپ نے دیر کر دی" حالانکہ اس کا مطلب ہے تھوڑا سا۔ میں نے اسے بتایا، ایک ضروری کام تھا۔ بہرحال وہ اس بات پر خوش تھا کہ اس نے عربی بولی ہے اور یہ کہ اس کی عربی میری سمجھ میں آ گئی ہے۔ پھر اس نے پوچھا، کیا حال ہے؟ میں نے کہا آپ کی مہربانی ہے۔

فخی سے ملاقات ہوئی تو اس نے پہلا سوال یہ کیا کہ کتاب پڑھی؟ میں نے کہا نہیں۔ اس نے سر جھٹکا۔ "بڑے افسوس کی بات ہے" اس نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔ پھر اس نے میرے سینے میں اپنی انگلی چبھوئی اور بولا "تمہارے پاس ایسا دل ہے جو ہمیشہ ثمر بار رہتا ہے" میں نے اپنی انگلی اس کے سینے پر ماری اور کہا "دفتر میں ایک ہی باغ کافی ہے" اور وہاں سے چلا آیا۔ شام کو میں گھر چلا گیا۔

سڑک اور فٹ پاتھوں پر برف کے ڈھیر لگے تھے۔ سیاہ سڑک کے دونوں طرف برف نرم چمکدار قالین کی طرح بچھی تھی۔ برف نے پتوں سے خالی پیڑوں کی شاخوں کو لہراتے سانپوں کی شکل دے دی تھی۔ چند سدا بہار درختوں کے پھول سفید برف میں چمک رہے تھے۔ برفباری بند ہو جانے اور ہوا تھم جانے کی وجہ سے سردی کم ہو گئی تھی۔ گھر پہنچ کر میں نے ٹی وی نہیں کھولا۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ ہر سمت برف ہی برف تھی۔ سڑک کے کنارے جو کاریں کھڑی تھیں، اُن کی چھتیں سفید گنبد بن گئی تھیں اور کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کون سی کار کس ماڈل اور کس رنگ کی ہے۔ چاروں طرف خاموشی اور افسردگی کا عالم تھا۔ میں بیٹھ گیا اور اپنے حالات پر غور کرنے لگا۔

کمال نے فون کیا تو میں نے بتایا کہ یہاں بھی برف پڑ رہی ہے۔ اُس نے کہا "میری تو زندگی پر برف پڑ گئی ہے"۔ میں نے پوچھا "کیوں؟" کہنے لگا "میں دس سال سے بینکوں میں کام کر رہا ہوں۔ میں نے ایک مقامی لڑکی سے شادی بھی کی ہے جو خوبصورت اور محبت کرنے والی ہے۔ اس ملک کی شہریت بھی مل گئی ہے۔ لوگ میرے اوپر رشک کرتے ہیں۔ پھر بھی میں خوش نہیں ہوں"۔ میں نے پوچھا "آخر کیوں؟" بولا "کیا بینکنگ سود کا کاروبار نہیں ہے؟ میرا ضمیر مطمئن نہیں ہے"۔ میں نے کہا "اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے"۔ پھر میں نے بتایا کہ "میں نے وہ کتاب بھجوا دی ہے"۔ اسے خوش کرنے کے لئے یہ بھی کہا "اگر تمہاری روح صاف شفاف ہے تو تم اپنے سینے میں باغ اگا سکتے ہو"۔ وہ ہنسا اور کہنے لگا "مجھے بخار سا ہو رہا ہے۔ میں برف میں پھرتا رہا ہوں۔ میں نے پیاز اور لہسن بھی کھایا ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے اس وقت میری روح بوجھل ہے"۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اسپرین کھا کر سو جائے۔

دوسرے دن میں کام پر نہیں گیا۔ ہفتہ کا دن تھا، چھٹی تھی، لیکن صبح ہی صبح سو کر اٹھ گیا۔ بستر میں لیٹے لیٹے ہی اس دن کا پروگرام بنایا۔ اس روز ہفتہ بھر کے لئے کھانے پینے کی چیزیں خریدنا تھیں اور کپڑے بھی دھونا تھے۔ شام کو فلم دیکھنے جانا تھا۔ پورا پروگرام سوچنے کے بعد بستر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

کھڑکی سے باہر دیکھا۔ برف اسی طرح تھی لیکن اس کی چمک ماند پڑ گئی تھی۔ فٹ پاتھ کے وسط میں پیدل چلنے والوں کے پاؤں نے کیچڑ بھرا راستہ بنا دیا تھا۔ سڑک کے کنارے رات کو برف صاف کرنے والی مشین نے برف کے اونچے اونچے ڈھیر لگا دیئے تھے۔ سڑک پر بہت کم لوگ چل پھر رہے تھے۔ لوگوں نے خوب گرم کپڑے پہن رکھے تھے اور جیبوں میں ہاتھ ڈالے اور سر نیچے کئے جس طرح چل رہے تھے اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ باہر شدید سردی پڑ رہی ہے۔

باہر نکلنے سے پہلے میں نے بھی اپنے آپ کو خوب گرم کپڑوں میں لپیٹ لیا، لیکن میں جانتا تھا کہ ناک اور کانوں کے لئے کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے سکارف ناک کے اوپر تک لپیٹا لیکن جلد ہی دم گھٹنے لگا اور گردن ٹھنڈی ہو گئی۔ عام حالات میں تیز چلنے سے سردی کم لگتی ہے لیکن راستے پر برف پڑی ہو تو یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ بہرحال مجھے جانا تو تھا۔ میں نے اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دیا۔ میں نے احتیاطاً دو جوڑے موزے پہن لئے تھے۔ میں نے کپڑے دھونے والی مشینوں سے کام کا آغاز کرنے کا فیصلہ کیا۔ کپڑوں کی گٹھڑی اٹھائے میں وہاں پہنچ گیا۔

وہ سیلف سروس دوکان تھی جس میں کپڑے دھونے کی مشینیں نصب تھیں۔ ان کی نگرانی کے لئے وہاں ایک عورت موجود رہتی تھی جو ان گاہکوں کو صابن بھی دیتی تھی جو اپنے ساتھ نہیں لاتے تھے۔ میں پہنچا تو ساری مشینیں مصروف تھیں۔ ایک مقامی بوڑھی عورت اپنے کپڑوں کی گٹھڑی ساتھ رکھے کرسی پر بیٹھی تھی۔ میں بھی ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا اور کسی مشین کے خالی ہونے کا انتظار کرنے لگا لیکن وہاں دروازے کی درز سے اتنی تیز ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی کہ میں وہاں زیادہ دیر نہیں بیٹھ سکا۔ میں نے اٹھ کر واشنگ مشینوں کے ساتھ ٹہلنا شروع کر دیا۔ میں مشینوں میں لگی شیشے کی آنکھ میں دیکھ رہا تھا جن میں گھومتے کپڑے نظر آ رہے تھے اور یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ کون سی مشین پہلے فارغ ہو گی۔ اچانک میں نے بوڑھی عورت کو تیز آواز میں کہتے سنا "جو مشین پہلے فارغ ہو گی وہ میں استعمال کروں گی۔" میں نے اس عورت کی طرف نہیں دیکھا اور ٹہلنا جاری رکھا۔

ٹھنڈی ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ دو افریقی اندر داخل ہوئے۔ ایک کے ہاتھ میں کپڑوں کی گٹھڑی تھی، دوسرا خالی ہاتھ تھا۔ وہ اپنی زبان میں باتیں کر رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔ وہ دونوں بھی اس مشین کی طرف بڑھے جو ابھی ابھی فارغ ہوئی تھی۔ ایک نے اس مشین کا کپڑے سکھانے والا بٹن دبا دیا۔ مشین چلنے لگی اور وہ دونوں کھڑے اسے دیکھتے رہے۔

بوڑھی عورت نے ایک بار پھر زور سے کہا "یہ مشین میں استعمال کروں گی۔" وہ دبلی پتلی لمبی گردن والی عورت تھی۔ اس کی آنکھیں زردی مائل تھیں جن کی پتلیاں بھوری تھیں اور ان میں کتھئی رنگ کے حلقے تھے۔ اس کا چہرہ چکنا سا تھا جیسے تیل ملا ہو۔

کپڑوں کی گٹھڑی لانے والے افریقی نے نہایت ملائم لہجے میں کہا "محترمہ، میں اس دوست کے ساتھ آپ سے پہلے یہاں آیا تھا میں نے اُن خاتون سے بات کر لی تھی کہ جو بھی کوئی مشین فارغ ہو گی میں اسے استعمال کروں گا۔" اس نے اس نوجوان عورت کی طرف اشارہ کیا جو ایک چھوٹی سی میز کے سامنے کرسی پر بیٹھی تھی۔ نوجوان عورت نے اثبات میں سر ہلایا۔

اب بوڑھی عورت کھڑی ہو گئی اور غصے میں نوجوان عورت کی طرف بڑھی۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئی تھیں اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا "کیا مطلب ہے اس کا؟" اس نے پوچھا "میں اتنی دیر انتظار کرتی رہی اور اچانک ایک آدمی نے آ کر میری باری لے لی۔ اور وہ آدمی بھی کالا۔۔۔ سیاہ فام۔۔۔!"

افریقی کی آنکھوں میں غصہ جھلکا۔ اس نے بوڑھی عورت کی طرف ایک قدم بڑھایا اور دھیمی آواز میں بولا "کیسا زمانہ ہی ہیں آپ؟"

عورت تھوڑا پیچھے ہٹی اور بولی "اس ملک میں ہم سب ایک سسٹم کا احترام کرتے ہیں، ہم ان ملکوں کی طرح نہیں ہیں جہاں۔۔۔!"
افریقی نے آگے بڑھ کر اس کی بات کاٹی "ہم پروا نہیں کرتے آپ کے سسٹم اور آپ کے ملک کی۔ آپ چاہتی کیا ہیں؟"
بوڑھی عورت اور پیچھے ہٹ گئی "میں نے کیا کہا۔ یہی تو کہا ہے کہ تم کالے ہو۔ کیا تم کالے نہیں ہو؟"
افریقی نے اس کے چہرے کے قریب اپنا چہرہ لے جاتے ہوئے کہا "جی ہاں میں کالا ہوں اور مجھے اس پر فخر ہے۔ پھر

کیا ہوا؟ ان خاتون نے آپ کو بتا دیا کہ میں یہاں پہلے آیا تھا۔ اس سے میرے کالا ہونے کا کیا تعلق ہے؟ بولیے کیا مطلب ہے آپ کا؟"

وہ عورت دھڑام سے کرسی پر گر گئی اور مری ہوئی آواز میں بولی "کچھ نہیں۔"

افریقی پیچھے ہٹا اور زور کا قہقہہ لگایا "اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کے اندر آدابِ محفل کی ہی نہیں رجائیت کی بھی کمی ہے۔ سمجھیں آپ ——؟"

اس کے دوست نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ وہ ابھی تک قہقہے لگا رہا تھا۔ اب ان دونوں نے باتیں کرنا شروع کر دیں۔ وہ خوب ہنس رہے تھے۔

بوڑھی عورت خلا میں گھورتی ہوئی بڑبڑائی "میں بھی اب وہ مشین استعمال نہیں کروں گی۔"

افریقی باشندہ مشین سے اپنے کپڑے نکال رہا تھا۔ اس نے تھیلے میں اپنے کپڑے ٹھونسے۔ اور سوکھا سا منہ بنا کر بولا "اوہو یہ تو بہت ہی افسوس کی بات ہے۔ مجھے یہ سن کر بہت ہی صدمہ ہوا۔"

بوڑھی عورت نے غصے میں بھنا کر نوجوان عورت کی طرف دیکھا "تم دیکھ رہی ہو؟"

نوجوان عورت نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "مجھے مت گھسیٹو اس میں۔"

بوڑھی عورت نے اب مدد کے لئے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن اسے میرے سوا اور کوئی نظر نہیں آیا۔ اس نے شیشے کے دروازے کی طرف منہ کرکے بڑبڑانا شروع کر دیا "ہائے اس ملک کا کیا ہوگا۔ کیسا زمانہ آگیا ہے۔"

میں کپڑے دھونے کے بعد ہفتہ بھر کا سامان خریدنے دوکان کی طرف چل دیا۔ لانڈرومیٹ سے نکلتے ہوئے گرمی سے میرا چہرہ تپ رہا تھا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد مجھے سردی سی لگنے لگی۔ میں نے ناک تک مفلر لپیٹ لیا۔

دوکان پر ٹماٹر کی چٹنی، چائے اور چینی خریدتے ہوئے میں نے ڈاک خانہ والی لڑکی کو بھی وہاں کھڑے دیکھا۔ وہ سامان والی ٹرالی دھکیلتی جا رہی تھی۔ ٹرالی میں گلاب کے پھولوں کا گلدستہ، صابن اور کچھ ترکاریاں رکھی تھیں۔ ہم دونوں کی نظریں ملیں۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھری۔ میں دوسری طرف دیکھنے لگا۔

گھر پہنچ کر میں نے کمال کو فون کیا اور اس کی خیریت دریافت کی۔ اُس نے بتایا کہ اس کا بخار اب کم ہے لیکن سر میں چکر باقی ہے میں نے پوچھا کہ کتاب مل گئی؟ اس نے جواب دیا، مل گئی ہے اور وہ پڑھتے ہی واپس کرے گا۔ میں نے کہا "مجھے کتاب کی ضرورت نہیں ہے۔ نیک یا بد روحوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ میرے لئے اس دنیا کے بُرے لوگ ہی کافی ہیں۔" پھر میں نے اسے لانڈرومیٹ کا واقعہ سنایا۔ اس نے بہت آہستہ سے جواب دیا۔ "اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ میں سالہا سال سے یہاں رہ رہا ہوں میں جانتا ہوں یہاں کے لوگ غیر ملکی باشندوں کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ مگر میں نے کبھی اس کی پروا نہیں کی۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ میں ایک تنہا اور ویران ریگستان میں زندگی گزار رہا ہوں۔ کام پر جاتا ہوں تو کسی سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔ میں تو یہ بھی غور نہیں کرتا کہ میرے ساتھ انسان کام کر رہے ہیں یا مشینیں۔ ان کے ساتھ زندگی گزارنے کا یہی بہترین طریقہ ہے۔ یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے۔"

"پھر مسئلہ کیا ہے؟"

"ہم خود ہی مسئلہ ہیں۔ جیسے ہمارے اندر ہیں لیکن ہم نہیں جانتے کہ وہ کیا مسئلہ ہے۔ میں ایک زمانے سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن آج تک تلاش نہیں کر پایا۔ کیا تم خواب کی تعبیر بتا سکتے ہو؟"

"خواب کی تعبیر؟ میں کوشش کروں گا۔" میں نے کہا۔

"رات میں نے خواب میں دیکھا کہ معاویہؓ ابن ابو سفیان سے میری ملاقات ہوئی ہے۔ میں امام حسینؑ اور معاویہؓ کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ معاویہؓ کو غصہ آ جاتا ہے اور وہ کہتے ہیں اسے طہٰ حسین کے ساتھ قید میں ڈال دو لیکن میں وہاں سے بھاگ آتا ہوں میں ایک ٹیکسی پکڑتا ہوں اور پھر اپنے آپ کو قاہرہ کے مقبرہ چوک میں پاتا ہوں۔"

میں نے کمال کو بتایا کہ حضرت امام حسینؑ کی جنگ یزید کے ساتھ ہوئی تھی، معاویہؓ کے ساتھ نہیں۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ خواب ہے یا تاریخ کا سبق۔" اس نے میری بات کاٹی۔ "تم کیا سمجھے؟"

میں نے سوچنے کی کوشش کی لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ "سونے سے پہلے تم کیا کرتے رہے تھے؟" میں نے سوال کیا۔

"میں ٹائپ رائٹر پر پریکٹس کرتا رہا تھا۔"

"ٹائپنگ تمہارے کام کے لئے ضروری ہے؟"

"ضروری تو نہیں لیکن وہ کام تو آتی ہے۔"

"میں تمہارے خواب کی تعبیر نہیں دے سکتا۔"

"خیر جانے دو۔" اس نے کہا "کوئی نئی بات سناؤ۔"

"کوئی نئی بات نہیں۔"

اس شام میں فلم دیکھنے گیا۔ فلم کا نام تھا LATRAVIATA۔ میں دروازے پر کھڑا پہلا شو ختم ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ اور اپنے آپ کو گرم رکھنے کے لئے لوگوں کے ہجوم میں گھسا رہا۔ شوکیس میں لگی فلم کی تصویریں دیکھتے ہوئے میں نے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ ڈائریکٹر نے فلم کی ہیروئن کو کس انداز میں پیش کیا ہے۔ تصویروں میں ہیروئن بالکل ویسی ہی لگی جیسا میں نے سوچا تھا۔ دبلی پتلی، خوبصورت، بڑی بڑی کالی آنکھیں۔ ابھی میں دیکھ ہی رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے کہا "معاف کیجئے، آپ ......" مڑ کر دیکھا تو وہی لڑکی کھڑی تھی، ایک گال پر وہی خوبصورت نشان لئے۔ اس کے ہونٹوں میں سگریٹ دبا ہوا تھا۔

"آپ میرا سگریٹ سلگا دیں گے؟" وہ بند گلے کا سفید سوئٹر اور سفید پتلون پہنے تھی۔ اس کے چہرے پر پاؤڈر نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ کچھ شرمائی اور گھبرائی سی لگ رہی تھی۔ اس وقت مجھے وہ پہلے سے زیادہ ننھی بچی نظر آئی۔ اس کے منہ میں دبا سگریٹ اجنبی اور عجیب سا لگ رہا تھا۔ میں مسکرایا اور جیب سے لائٹر نکالا۔

"لگتا ہے ہم ہر جگہ ملتے رہیں گے۔"

"ہاں شہر بہت چھوٹا ہے۔ میرا نام این میری ہے۔"

میں نے اپنا نام بتایا۔

وہ مسکرائی اور سگریٹ ہونٹوں سے نکال کر انگلیوں میں پھنسا لیا۔ "آج سوچا آپ سے مڈبھیڑ ہو ہی جائے۔"

"تو کیا ہماری جنگ ہے؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے کہا "گھبرائیے نہیں۔ آپ یہ فلم دیکھ رہے ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"یہ فلم آپ کو پسند ہے؟"

"قاہرہ کے اوپیرا ہاؤس میں گئی تھی۔"

"قاہرہ میں اوپیرا ہاؤس بھی ہیں؟" اس نے سوال کیا۔

میں نے کہا "جی بالکل ہیں۔"

وہ پریشان سی سگریٹ کے ساتھ کھیلتی رہی۔ پھر اس نے کہا "اگر آپ بُرا نہ مانیں تو فلم کے بعد ہم کچھ باتیں کر سکتے ہیں؟"

میں نے کہا "جی ہم اسی جگہ ملیں گے۔"

فلم کے بعد موسیقار ورڈی کی دھن اسی طرح میرے دماغ میں گونج رہی تھی جیسے پہلی بار LA DAME AUX LAMELIAS پڑھنے کے بعد گونجی تھی۔ ارین میری سینما سے باہر آئی تو اس کے ساتھ اس کی ایک سہیلی بھی تھی۔ اس نے ہمارا تعارف کرایا۔ دوسری لڑکی نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ پھر ہاتھ ملایا اور چلی گئی۔ سینما سے نکلنے والے لوگ ادھر اُدھر جا چکے تھے۔ فلم ابھی تک میرے ذہن پر سوار تھی۔

"آپ کچھ بجھے بجھے سے نظر آ رہے ہیں۔" اس نے کہا۔

"جی۔۔۔۔"

"میرے دل پر بھی بڑا اثر ہوا ہے۔"

اس نے ہیملٹ کا ایک مکالمہ دہرایا جو ہیملٹ کسی ایسے اداکار کے بارے میں کہتا ہے جو کسی المیہ ڈرامے میں کام کر رہا ہے کہ اس لڑکی یا اس لڑکے سے اس کا کیا واسطہ ہے جس کے لئے وہ رو رہا ہے۔ اس نے اپنے سر کو جھٹکا دیا "فلم کے ہیرو یا ہیروئین سے ہمارا کیا تعلق ہے، ہم ان کے لئے کیوں روئیں۔"

"وہ حقیقی انسانوں سے زیادہ حقیقی ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

سردی بدن میں چبھ رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا "تمہیں کسی خاص کام سے تو نہیں جانا؟"

"نہیں تو۔" اس نے جواب دیا۔

ہم ایک قریبی کیفے میں گھس گئے۔ میز پر ہم ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے۔ میں نے ہنستے ہوئے "یہاں ہم ایک دوسرے کے مدمقابل بیٹھے ہیں۔ اب بتاؤ۔"

وہ بھی مسکرائی "بس ذرا سی جرأت کی ضرورت ہے۔ مجھے غیر ملکی لوگوں سے بات کرنے کی عادت نہیں ہے۔" پھر اس نے جلدی سے کہا "میرا مطلب ہے ایسے لوگ جنھیں میں نہیں جانتی۔"

میں نے قہقہہ لگایا "میں غیر ملکی اور اجنبی ہونے پر شرمندہ نہیں ہوں۔"

وہ شرماتے ہوئے چائے کی پیالی پر جھک گئی "ظاہر ہے۔۔۔۔ ظاہر ہے۔۔۔۔ تم شرمندہ کیوں ہو۔" پھر اس نے سر اوپر اٹھایا اور میری طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ اور بھی سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے کہا "غلط نہ سمجھنا، میرے والد پروٹسٹنٹ پادری تھے۔ انھوں نے مجھے حضرت عیسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے واسطے سے تمام انسانوں سے محبت کرنے کا سبق دیا ہے۔ میں دوسروں کی طرح نہیں ہوں۔"

"وہ تو نظر آ رہا ہے۔" میں نے کہا "لیکن یہاں اتنے بہت سے لوگوں کے سامنے ایک غیر ملکی کے ساتھ بیٹھنے سے تمہیں پریشانی نہیں ہو رہی ہے؟ اور وہ بھی ایسا غیر ملکی جس کا رنگ گندمی ہو؟"

اس کی نیلی آنکھیں میرے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں "بالکل نہیں۔" پھر اس نے آہستہ سے کہا "مجھے یہ بات پریشان نہیں کرتی۔"

"پھر کیا پریشانی ہے؟"

"جیسے کچھ ہو رہا ہے۔ میں بیان نہیں کر سکتی۔ شاید تم میری مدد کر سکو۔"

میں خاموش بیٹھا چائے پیتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کچھ اور کہے گی لیکن وہ بھی خاموشی سے چائے پیتی رہی۔ اس کی نظریں میز پر جمی تھیں۔

پھر یکدم اس نے نرم آواز میں ایسے کہا جیسے بہت کوشش سے کہنا پڑ رہا ہو "میں چاہتی ہوں تم اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔ تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ میرے بارے میں تو تم جانتے ہو۔ میں اسی ملک کی رہنے والی ہوں اور ڈاک خانہ میں کام کرتی ہوں میرے والد کا انتقال ہو چکا ہے اور میں اپنی والدہ کے ساتھ رہتی ہوں۔ مجھے فلم، موسیقی اور کتابیں پسند ہیں۔

میں نے اپنا پتہ بتایا۔

"تم نے ڈاک خانہ سے جو کتاب بھیجی تھی وہ کیا تھی؟ وہی کتاب جس کی جلد پر سنہری کام کیا ہوا تھا؟"

"وہ کتاب اسلامی تصوف پر ہے۔ میں اس کی وضاحت نہیں کر سکتا لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عقل کے مقابلے میں دل کے ذریعے چیزوں کو زیادہ سمجھا جاتا ہے۔ وہ لوگ اپنی روح اس طرح پاک صاف کر لیتے ہیں کہ ان کا دل شفاف ہو جاتا ہے۔"

"راہبوں کی طرح؟"

"بالکل ایسا تو نہیں لیکن میں اس کی وضاحت نہیں کر سکتا۔ دراصل میں خود بھی اسے پوری طرح نہیں سمجھتا۔"

"تم کسی ماورائی قوت پر اعتقاد رکھتے ہو؟"

میں خاموش رہا۔

"میں ایک زمانہ میں رومن کیتھولک عقیدہ اختیار کر کے نن بننا چاہتی تھی۔" اس نے کہا "مجھے سینٹ فرانسس آف اسیسی سے عقیدت ہو گئی تھی جو غریبوں اور بیماروں سے پیار کرتے تھے۔ میں نے ان کی تصویر بھی اپنے کمرے میں لگا رکھی ہے۔ حالانکہ میری ماں اسے پسند نہیں کرتیں۔" پھر یکدم اس نے موضوع بدلا "میں اس دنیا سے بیزار ہو چکی ہوں۔ یہ سب کچھ بیکار ہے۔ بہت سے لوگوں نے اسے سمجھنے کی کوشش کی لیکن سب فضول تھا۔ ہر زمانہ میں یہ حماقت کی جاتی رہی۔ وہی نفرت، جھوٹ، اذیت۔ میں نے افریقہ جانے کا بھی ارادہ کیا تھا تاکہ میں وہاں کسی کی مدد کر سکوں......"

باتیں کرتے کرتے اچانک وہ رک گئی۔ اس نے آنکھیں بند کیں اور بولی "میں معافی چاہتی ہوں۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے میں اپنے آپ کو آپ پر مسلط کر رہی ہوں۔ جب میں نے آپ کا عقیدہ پوچھا تھا تو میں نے آپ کے چہرے کے تاثرات بدلتے دیکھے تھے۔ مجھے معاف کر دیجئے۔ میں بور نہیں کر رہی ہوں۔"

"ارے نہیں، کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا "مجھے تو اینمیری کے عقائد معلوم ہو گئے جبکہ میں نے صرف اپنا نام ہی بتایا ہے۔"

وہ مسکرائی اور انگلیوں میں سگریٹ گھمایا "میں تمہارے ساتھ کھل کر بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"پہلے میرے دماغ میں چند خیالات تھے لیکن آج میں انھیں بالکل بھول چکا ہوں۔" میں نے کہا "میرے ملک میں میرے خیالات کی یا میری کوئی ضرورت نہیں ہے، اس لئے میں نے انھیں بھلا دیا ہے۔ میں بہت سی چیزیں بھلا چکا ہوں۔ لیکن تم نے کہا تھا کہ میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ تم نے کہا تھا کہ میرے اندر کوئی ایسی شے ہے جو تمہیں پریشان کرتی ہے۔ وہ کیا چیز ہے؟"

اس نے آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹائے۔ اس کی پلکیں لرز رہی تھیں۔ پھر اس نے نہایت خشک لہجے میں کہا "اصل بات یہ ہے کہ میں تمہیں بار بار دیکھتی ہوں، قریب قریب ہر روز ایک دو مرتبہ۔"

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے، ہم ایک ہی علاقے میں رہتے ہیں اور ایک ہی وقت پر ایک ہی بس میں سفر کرتے ہیں۔ اس میں عجیب بات کیا ہے؟"

"کوئی نہیں،" اس نے اسی لہجے میں جواب دیا "سوائے اس کے کہ جب تم میرے سامنے نہیں ہوتے تو اس وقت بھی میں تمہیں دیکھتی ہوں۔ تم سے ملاقات سے پہلے میں محسوس کرتی ہوں کہ تم میرے پاس موجود ہو۔ میں آنکھ اٹھاتی ہوں اور تم موجود ہوتے ہو۔ کبھی کبھی تصور میں بھی ایسا کرتی ہوں۔ تم میرے سامنے نہیں ہوتے تب بھی ایسا لگتا ہے جیسے میں تمہیں چھو سکتی ہوں۔"

میں نے مسکرانے کی کوشش کی "شاید تمہیں مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔"

اس نے مسکرائے بغیر جواب دیا "جی نہیں" اور منہ دوسری طرف پھیرتے ہوئے کہا "معاف کرنا، سچی بات یہ ہے کہ میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔"

پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا، آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں، چہرے پر خوبصورتی کا شائبہ تک نہ تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ واقعی وہ مجھ سے نفرت کرتی تھی۔

—۲—

دوسرے ہفتے حسب معمول میں کام پر گیا۔ اور اسی طرح وقت پر گھر واپس آیا۔ برف باری ہو رہی تھی اور سردی بڑھ گئی تھی۔

ایک دن میں فتحی کے کمرے میں گیا اور اس سے کہا کہ میں زندگی سے بیزار ہو چکا ہوں۔ خدا کے لئے مجھے کچھ بتاؤ

"جب میں خود ہی کچھ نہیں جانتا تو تمہیں کیا بتا سکتا ہوں۔ تم میری طرح کرو، اپنے آپ کو آزاد چھوڑ دو۔ ایک دن میں اور تم دونوں اس صحرا کے اندر بے پناہ حسن والا وہ پھول تلاش کر لیں گے جس کا ہم سے وعدہ کیا گیا ہے۔"

میں نے کہا "مجھے ڈر لگتا ہے، تمہاری باتوں سے مجھے تسکین نہیں ملتی۔ میں کوئی ٹھوس بات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ ایسی بات جس سے میرے دل کو سکون ملے۔"

"میں اپنی انا اور اپنی مرضی اس لافانی ذات کے تابع کر چکا ہوں۔"

اس کے بعد ہمارے لئے اس موضوع پر بات کرنے کی گنجائش ہی نہیں رہی۔

کمال نے کئی مرتبہ ٹیلی فون پر مجھ سے بات کی۔ اس نے کتاب کا تذکرہ نہیں کیا لیکن اس نے بتایا کہ وہ بینک سے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ کمال نے کہا کہ وہ اس عرصے میں بہت سے خواب دیکھتا رہا ہے۔ ایک بات ہر خواب میں مشترک ہوتی ہے کہ وہ وائلن بجانا سیکھ رہا ہے۔ ایک مرتبہ اس نے دیکھا کہ وائلن کا گز کہیں کھو گیا ہے اور وہ فیتے سے وائلن بجانے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن پھر اس دوا کی شیشی ٹوٹ جاتی ہے جس کے استعمال سے وہ وائلن بجا سکتا ہے۔ دواؤں کی تمام دکانیں بند ہیں۔ وہ ججوں سے اجازت لینا چاہتا ہے کہ اسے وائلن بجانے کی مہلت مل جائے لیکن اسے اپنے جوتے ہی نہیں ملتے۔ لوگ اسے جوتوں کے بغیر تھیٹر میں داخل ہونے پر مجبور کر رہے ہیں۔

اس ہفتہ چھٹی کے دن این میری نے اپنے بقول میرا شکریہ ادا کرنے کے لئے مجھے اپنے گھر بلایا۔ اس روز ہم صبح بس سٹاپ پر مل کر بات کر چکے تھے۔ اس نے کہا تھا کہ وہ ذاتی پریشانی کا شکار ہے جس کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ کسی نوجوان سے محبت کرتی تھی جو چند ہفتے پہلے اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ دونوں نے شادی کرنے کا بھی فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ سمندر پار چلا گیا اور شادی سے انکار کر دیا۔ وہ کہنے لگی کہ میں شادی کے بغیر بھی اس کے ساتھ رہنے کو تیار تھی۔ شادی کا وعدہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اسے صدمہ اس بات

کا تھا کہ اس لڑکے نے کسی دباؤ میں آکر شادی کا وعدہ کر لیا تھا اور دباؤ ہی میں وعدہ توڑ دیا۔ بہر حال اسے خوشی اس بات کی تھی کہ اس قسم کے آدمی سے اسے جلد ہی چھٹکارا مل گیا۔ پھر اس نے میرے بارے میں باتیں کیں۔ کہنے لگی میں تمہیں پڑھنے اور غیر جانبداری کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ وہ اس طرح باتیں کر رہی تھی جیسے وہ میرے متعلق نہ ہوں کسی اور شخص کے بارے میں ہوں۔ پھر کہنے لگی "مجھے معاف کر دینا" میں نے پوچھا کیا اُن حالات کی وجہ سے وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے جن میں اُس نے مجھے دیکھا ہے؟ کیا میں اسے وہ دوسرا آدمی یاد دلا دیتا ہوں جس سے وہ نفرت کرنا چاہتی ہے؟ کیا کوئی مشابہت ہے اس میں اور مجھ میں؟ کیا ایسا اس لئے تو نہیں ہے کہ وہ باہر چلا گیا ہے؟ وہ جانتی تھی کہ یہ سوال بہت پیچیدہ ہیں۔ اگر میں اس کی مدد کرنے سے انکار کر دوں تو وہ اس کا بُرا نہیں مانے گی بلکہ وہ مجھ سے معافی مانگے گی اور شکریہ ادا کرے گی کہ میں نے اس کی بات تو سُنی۔ اور اگر میں اس کی مدد کرنے کو تیار ہو جاؤں تو وہ عمر بھر میری شکر گزار رہے گی۔

چھٹی کے دن ہم بس سٹاپ پر ملے۔ آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے جو ماحول کو افسردہ بنا رہے تھے۔ سڑکوں کے کنارے اور مکانوں کی بالکونیوں پر برف جمی ہوئی تھی۔ این میری مقررہ وقت پر پہنچ گئی تھی۔ اس نے سفید پتلون اور سفید اونی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ گردن پر مفلر لپیٹ رکھا تھا۔ وہ میری طرف ہچکچاتے قدموں سے بڑھ رہی تھی۔ اس وقت وہ مجھے بہت ہی نحیف اور مرجھائی سی نظر آئی۔

وہ مجھے اپنے گھر لے گئی۔ وہ ایک پرانی سی عمارت میں رہتی تھی جس کی آہنی بالکونیاں آگے کو نکلی ہوئی تھیں۔ موسم بہار میں کئی بار ایسا ہوا کہ میں اِدھر سے گزرا تو بالکونیوں سے جھانکتے سرسبز پودوں اور بڑے بڑے سرخ پھولوں کا حسن دیکھ کر مسحور ہو گیا۔ اب بالکونیاں خالی تھیں اور لوہے کی سلاخوں پر برف جمی ہوئی تھی۔

اس کے فلیٹ تک ہم نے کوئی بات نہیں کی۔ مکان کی تنگ سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے اس نے معذرت کی کہ اس عمارت میں لفٹ نہیں ہے۔ وہ تیسری منزل پر رہتی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ دروازہ پر سفید پردہ پڑا تھا۔ ہم پردہ ہٹا کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے جہاں چھوٹی میزیں رکھی تھیں۔ میزوں پر سفید میز پوش پڑے تھے جن پر خوبصورت گڑیاں اور لکڑی کے چھوٹے چھوٹے مجسمے رکھے تھے۔ چند میزوں پر گملے رکھے تھے جن میں کارنیشن کے پودے لگے تھے۔ کمرے کی دو دیواروں پر الماریاں کتابوں سے بھری تھیں۔ دوسری الماریوں پر سفید پردے پڑے تھے۔ کمرے کے عین وسط میں لکڑی کی ایک لمبی میز پڑی تھی جس کے ساتھ سفید بالوں والی ایک خاتون بیٹھی تھیں۔ وہ موٹے شیشوں کی عینک لگائے کتاب پڑھ رہی تھیں۔

"یہ میری والدہ ہیں" این میری نے کہا۔ اس نے آگے بڑھ کر والدہ کے ماتھے پر بوسہ دیا اور بلند آواز میں کہا "یہ آگئے ہیں"
خاتون نے سر ہلایا اور بولیں "صبح بخیر"
"صبح بخیر" میں نے کہا۔
"زور سے بولو" این میری نے کہا "اونچا سنتی ہیں"

میں اس کی والدہ کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ انھوں نے سر نیچا کئے کئے شفاف نیلی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ این میری نے نیلی آنکھیں اپنی والدہ سے لی تھیں۔ اس کی والدہ عینک کے دبیز شیشوں سے کافی دیر مجھے گھورتی رہیں۔ بار بار عینک ان کی ناک پر پھسل جاتی تھی۔

"افریقہ سے تعلق رکھتے ہو؟" انھوں نے سوال کیا۔

میں نے سر ہلایا۔ انھوں نے چوبی صلیب کے ساتھ ٹنگے سیاہ مکھوٹوں کی طرف اشارہ کیا "افریقہ کی نقاشی اور منبت کاری مجھے پسند ہے۔" انھوں نے جھریوں بھری سفید انگلیاں بھینچ کر ہاتھ اوپر اٹھایا۔ "یہ بہت ٹھوس اور مضبوط ہے۔" پھر مٹھیاں کھول کر اس طرح جیسے کسی کو خوش آمدید کہہ رہی ہوں "یہ بہت ہی نفیس اور ہموار بھی ہے۔ افریقہ کے کس ملک سے آئے ہو؟"

"مصر سے۔" میں نے بلند آواز سے کہا۔

انھوں نے حیرت سے اپنی بھنویں اُچکائیں "مصر؟ ہمیشہ مصر دیکھنے کی میری خواہش رہی۔ میرے شوہر سنہ...... یاد نہیں کس سال مصر گئے تھے۔ اس وقت ہماری شادی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن وہ تصویریں اب تک میرے پاس ہیں۔" انھوں نے میز کا سہارا لے کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ "مجھے یاد ہے میرے شوہر نے بتایا تھا کہ وہ لوگ جادو کرنا جانتے ہیں۔"

"جادو؟"

انھوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میرے شوہر نے خود دیکھا تھا۔"

"اچھا.... ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

وہ بڑی مشکل سے کرسی سے اٹھیں۔ این میری ٹرے میں چائے لیے اندر آئی "ممی آپ آرام کیجیے۔" اس نے زور سے کہا

"لیکن میں انھیں تصویریں دکھانا چاہتی ہوں۔" ماں نے احتجاج کیا۔ جھکی کمر کے ساتھ وہ آہستہ آہستہ ایک الماری تک گئیں اور اسے کھولا۔

این میری نے میز پر چائے کی پیالیاں رکھتے ہوئے معذرت کی "ممی باہر نہیں جاتی ہیں نا۔ اس لیے جب بھی انھیں کوئی مل جاتا ہے تو ان کی باتیں ہی ختم نہیں ہوتیں۔"

"کوئی بات نہیں، پھر کیا ہوا؟"

اس کی والدہ اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھیں "کہاں گئیں وہ؟ کہاں جا سکتی ہیں؟ یہیں تو رکھی تھیں۔"

این میری نے چائے کی پیالی اٹھائی اور بولی "میرے کمرے میں چلو۔"

میں نے اپنی پیالی اٹھائی اور اس کے ساتھ چل دیا۔

اس کا کمرہ چھوٹا سا مگر صاف ستھرا تھا۔ فرنیچر نیا اور دوسرے کمرے کے برعکس بہت سادہ تھا۔ ایک دیوار پر الماری میں کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ الماری کے وسط میں ایک لمبا سا گلدان رکھا تھا جس میں پھول سجے تھے۔ دوسری میز پر سر منڈے سینٹ فرانسس کی تصویریں تھیں۔ سفید رنگ ہر طرف بکھرا ہوا تھا۔ میز پوش، بستر کی چادر اور کھڑکیوں کے جالی دار پردے۔ سب سفید تھے۔ اس نے کھڑکی پرسے پردہ ہٹایا تو سامنے ایک بہت بڑا صنوبر کا درخت نظر آیا۔ آگے کی طرف اُٹھے ہاتھوں کی طرح اس کی لمبی لمبی شاخیں برف سے ڈھکی تھیں۔ دوسرے درخت اس کے گرد گھیرا باندھے کھڑے تھے اور ان کی شاخیں ایک دوسرے میں پیوست تھیں۔ ان سب پر برف چمک رہی تھی۔۔۔ این میری کھڑکی کے ساتھ ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسری میں پھنسا کر ہاتھ گھٹنوں پر رکھ لیے اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

میں ابھی تک چائے کی پیالی ہاتھ میں لیے دروازے کے قریب کھڑا تھا۔ "کھڑکی سے بہت خوبصورت منظر دکھائی دیتا ہے۔"

اس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور بولی "شکریہ، تم بیٹھتے کیوں نہیں؟" اس نے ایک چھوٹے سے آئینے کے ساتھ رکھے

اسٹول کی طرف اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا۔ اب میرے گھٹنے اس کے گھٹنوں کے ساتھ تقریباً ٹکرا رہے تھے۔ ہم دونوں باہر کا نظارہ کرتے رہے اور چائے کا گھونٹ لیتے رہے۔

اس نے میری جانب دیکھے بغیر کہا۔"رات، میں نے تمہیں خواب میں دیکھا۔"

"اچھا... میں اس غلطی کی معافی چاہتا ہوں۔" میں نے مذاق کیا۔

اس نے نظر بھر کر مجھے دیکھا "تم کیوں معافی مانگ رہے ہو اور اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

"جب تم اتنے غمزدہ لہجے میں کہو گی کہ میں نے تمہیں خواب میں دیکھا تو میں معافی نہ مانگوں تو اور کیا کروں؟"

اس نے سر جھٹکا۔"پرسوں رات بھی میں نے تمہیں خواب میں دیکھا تھا۔ میں نے دیکھا ایک ہیبت ناک عقاب اپنے پروں سے کھڑکی پر دستک دے رہا ہے اور بڑے غصے سے میری طرف دیکھ رہا ہے۔ وہ شیشے پر زور زور سے پر مار رہا ہے اور اندر آنے کے لئے بےچین ہے۔ پھر تم آجاتے ہو اور وہ عقاب، تمہیں اپنے پروں میں جکڑ لیتا ہے۔ اس پر میری آنکھ کھل گئی۔ میں رو رہی تھی۔"

اب میں نہیں ہنسا بلکہ میں نے سر جھکا لیا۔

"تم یہ سب کیسے کرتے ہو؟" اس نے نہایت پرسکون لہجے میں سوال کیا۔

"میں!؟...... میں کیا کرتا ہوں؟"

"یہی سب....."

"یہ تم سنجیدگی سے کہہ رہی ہو؟ کیا تم واقعی سمجھتی ہو کہ تمہارے خوابوں میں آنے کے لئے میں کچھ کرتا ہوں۔"

اس نے پریشان سا قہقہہ لگایا، پھر ہاتھ بڑھا کر میرے ہاتھ سے خالی پیالی لے لی۔ پھر اٹھی اور باہر چلی گئی۔

کھڑکی سے باہر صنوبر پر ایک کوا آ کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ کسی خشک جگہ کی تلاش میں اناڑیوں کی طرح ایک شاخ سے دوسری شاخ پر چھلانگ لگا رہا تھا۔ آخر اسے ایک شاخ مل گئی اور اس نے پر پھیلا کر برف جھاڑی اور پھر پر سمیٹ لئے۔

این میری واپس آ گئی۔ اس نے دروازہ بند کیا اور میرے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔"کیا سوچ رہے ہو؟"

"بتایا تو تم ہنسو گی۔" میں نے کہا۔

"پھر تو ضرور بتاؤ۔ میں ہنسنا چاہتی ہوں۔"

"وہ کوا درخت پر اتنا پریشان کیوں ہے؟ ساری دنیا کے لوگ کوّے سے نفرت کیوں کرتے ہیں حالانکہ اس نے کسی کو نقصان نہیں پہنچایا؟"

"تمہیں کوّے اور LA TRAVIATA کی ہیروئین سے ہمدردی ہے۔ تم اصلی انسانوں سے دلچسپی کیوں نہیں لیتے؟"

"زمانہ ہوا میں نے یہ دلچسپی لینا چھوڑ دی ہے۔"

"دنیا سے دردمندی اور احساس ہمدردی کی صفت اٹھ رہی گئی ہے اور شیطنت کی فتح ہو رہی ہے۔ مجھے اس بات پر بھی صدمہ ہوتا ہے کہ ظلم کی ہیروئین مرجاتی ہے کہ اس نے کسی سے محبت کی ہے اور اس نے کسی کے لئے قربانی دی ہے لیکن مجھے اس پر بہت صدمہ ہوتا ہے کہ اس دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جنہیں کھانے کو کچھ نہیں ملتا۔ ایسے بیمار لوگ بھی ہیں جنہیں دوا نہیں ملتی اور اگر دوا ملتی ہے تب بھی وہ مرجاتے ہیں۔ ان کی موت مجھے دکھی کر دیتی ہے۔"

"کسی زمانے میں مجھے بھی ان باتوں سے دکھ ہوتا تھا۔"

"پھر کب سے یہ دکھ بند ہو گیا؟" اس نے پوچھا۔

"مجھے صحیح یاد نہیں۔ شاید اس وقت سے جب سے میں اس ملک میں آیا ہوں یا شاید اس سے بھی پہلے سے، جب میں نے یہاں آنے کا فیصلہ کیا تھا۔"

"تو اب تم کس بات پر اعتقاد رکھتے ہو؟ خالی پن پر، وجود کی نفی پر؟"

"ان پر بھی نہیں۔"

تھوڑی دیر وہ کھڑکی سے باہر خاموشی سے دیکھتی رہی۔ پھر یکسر بدلے ہوئے لہجے میں بولی۔ "شاید یہ درخت تمہارے ملک میں بھی ہوتا ہے۔"

"نہیں لیکن اس علاقے کے آس پاس کہیں ہوتا ضرور ہے۔"

"اگر تم بُرا نہ مانو تو میں پردے کھینچ دوں؟ مجھے ان کی روشنی کے بجائے دھندلکا پسند ہے اس سے لگتا ہے جیسے رات ہو گئی۔"

اس نے پردے بند کئے۔ کمرے میں ہلکا سا اندھیرا چھا گیا۔ وہ کھڑکی کی طرف منہ کئے میرے پاس کھڑی تھی۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا "تمہیں یقین ہے کہ تم میری مدد نہیں کر سکتے؟"

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو وہ برف کی طرح یخ ہو رہا تھا میں نے دونوں ہاتھوں میں اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ میری طرف مڑی اور میرے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔

"تم کون ہو؟" اس نے بہت ہی دھیمی آواز میں سوال کیا۔ "ان خوابوں کا کیا مطلب ہے؟ یہ خواب میرا تعاقب کیوں کرتے ہیں؟"

"تم بتاؤ، تم کون ہو؟ تم میری زندگی میں کیوں داخل ہوئی ہو؟" میں نے اسی لہجے میں کہا۔

"تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

وہ گھٹنوں کے بل سرکتی ہوئی میرے اور قریب آ گئی اور اوپر اٹھ کر میرا ماتھا چوما، اس کے ہونٹ برف ہو رہے تھے۔ میں نے اپنے بازو اس کے گرد لپیٹ لئے "کاش میں تمہاری مدد کر سکتا۔ کاش، میں اپنی مدد کر سکتا۔"

اچانک اس نے اپنا سوئٹر اور اس کے نیچے پہنا ہوا بریزیئر اتار پھینکا اور میرے سینے سے چمٹ گئی میرے گرد لپٹے اس کے بازو کانپ رہے تھے۔ اس نے کہا "آؤ، اگر تم یہی چاہتے ہو تو آؤ۔ وہ سامنے بستر ہے۔"

میں نے آہستہ سے اس کے بازوؤں کے گھیرے سے اپنے آپ کو آزاد کرایا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا "نہیں۔ میں یہ نہیں چاہتا۔ تم خوبصورت ہو، تم واقعی خوبصورت ہو لیکن میں نے کبھی تمہیں ایک بچی سے زیادہ اور کچھ نہیں سمجھا۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا اور اس کا سوئٹر اٹھا کر اس پر پھینک دیا۔

اس نے سوئٹر اٹھایا اور بستر کے کنارے پر بیٹھ گئی اور اسی سوئٹر سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ وہ رو رہی تھی۔ اس کا سارا جسم لرز رہا تھا وہ بار بار کہہ رہی تھی ــــ "پھر بتاؤ...... مجھے بتاؤ...... تم کیا چاہتے ہو؟ تم چاہتے کیا ہو؟"

"جو میں چاہتا ہوں وہ ناممکن ہے۔"

"وہ کیا ہے؟"

"یہ کہ یہ دنیا بدل جائے۔ لوگ بدل جائیں۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میرے کوئی نظریات نہیں ہیں لیکن میرے خواب ضرور ہیں جو ناقابل تعبیر ہیں۔"

"میں ان خوابوں میں کیسے سما سکتی ہوں؟ آخر میں یہ اذیت کیوں برداشت کر رہی ہوں؟"

"میں کیا جانوں؟ میں کیا کر سکتا ہوں تم ہی مجھے بتاؤ، ممکن ہوا تو تمہاری مدد کروں گا۔ کیا تم چاہتی ہو میں اس ملک سے چلا جاؤں؟"

"کیا اس طرح میری اذیت ختم ہو جائے گی؟"

"مجھے کیا معلوم؟ اگر میں یہ نہیں جانتا کہ میں اپنی مدد کیسے کروں تو یہ کیسے جان سکتا ہوں کہ تمہاری مدد کس طرح کی جاسکتی ہے؟"

اس نے سویٹر کی آستینیں تلاش کیں اور اسے پہن لیا۔ تھوڑی دیر وہ سر نیچا کیے اسی طرح بیٹھی رہی۔ پھر آہستہ سے بولی "ہاں اب میں سب کچھ دیکھ سکتی ہوں۔ لیکن یہ سب کتنا بھیانک ہے۔"

"تمہاری سمجھ میں کچھ آیا؟"

"ہاں۔ مگر یہ میرا راز ہے۔"

اس نے بیٹھے بیٹھے ہاتھ بڑھا کر بٹن دبا دیا۔ کمرہ روشن ہو گیا۔

اس نے میری طرف دیکھا اور بولی "مجھے معاف کر دینا۔" پھر مسکرانے کی کوشش کی "جب بھی تم سے ملاقات ہوتی ہے، میں تم سے معافی مانگنے پہ مجبور ہو جاتی ہوں۔ لیکن اب وعدہ کرتی ہوں، آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔"

اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور چہرہ زرد ہو رہا تھا۔

جب ہم باہر نکلے تو اس کی ماں اپنی کرسی پر بیٹھی تھیں اور ایک موٹے سے البم کے صفحے الٹ رہی تھیں۔ انھوں نے مجھے دیکھا تو جلدی سے بولیں "یہ تصویریں مل گئیں۔"

میں ان کے قریب گیا۔ تصویریں پرانی تھیں۔ وہ پرانی زرد تصویریں جن میں گہرے جسے براؤن اور ہلکے جسے بھورے نظر آتے ہیں۔ وہ کرناٹک کے مندر اور اہرام کی تصویریں تھیں۔ انھوں نے ایک تصویر کی طرف اشارہ کیا جس میں ایک شخص اہرام کے سامنے بیٹھے اونٹ پر سوار تھا۔ اس شخص کا ہنستا ہوا گول چہرہ تھا۔ اس نے گہرے رنگ کا سوٹ اور سفید کالر پہنا ہوا تھا۔ اس کے سامنے اونٹ کی مہار تھامے مصری لباس میں ایک شخص کھڑا تھا۔ بڑی بڑی آستینوں والی قمیص سے اس کا دبلا پتلا ہاتھ باہر نکلا ہوا تھا۔ میں نے اس شخص کے چوڑے دہانے اور افسردہ چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہ بالکل میرے باپ کی طرح نظر آ رہا تھا۔

میں نے خاتون سے کہا "یہ تصویر میں لے سکتا ہوں؟"

انھوں نے سر اٹھا کر میری آنکھوں میں جھانکا اور مسکرائے بغیر کہا "میں تمہارا مطلب سمجھتی ہوں۔"

پھر یکدم انھوں نے البم بند کر دیا اور بولیں "معافی چاہتی ہوں۔ یہ تصویر تمہیں نہیں دے سکتی۔"

ڈین میری میز پر ہاتھ رکھے اپنے خیالوں میں کھوئی وہاں کھڑی تھی۔

—— ۳ ——

تیسرے ہفتے برف پگھلی البتہ سڑکوں کے کنارے ابھی برف کے ڈھیر باقی تھے۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور دن کی روشنی ابھی دھندلی تھی۔

فتی نے پریشان لہجے میں مجھ سے کہا کہ تم روز بروز دبلے اور کمزور ہوتے جا رہے ہو تمہیں ڈاکٹر کو دکھانا چاہیے۔ میں نے اس سے کہا، اگر وہ بتا دے کہ اس دنیا کو کیسے سمجھا جا سکتا ہے تو ڈاکٹر سے زیادہ وہ میری مدد کر سکتا ہے۔

"تم اپنے ڈاکٹر خود ہو۔" اس نے کہا "اپنے آپ سے مت لڑو۔"

میں نے کہا "ایسی باتوں سے میرا مسئلہ حل نہیں ہوگا۔"

اس نے افسردگی سے سر ہلایا۔

میرے افسر نے بھی مجھے بلا کر یہی کہا۔ عربی بولنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے کہا "تمہاری صحت "بسیطہ تمام" ہو چکی ہے۔ اس نے کہا کام کی زیادتی کی وجہ سے اگرچہ ان دنوں چھٹی دینا مناسب تو نہیں ہے لیکن اگر میں چاہوں تو وہ مجھے چھٹی دے سکتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ میں کام کر کر کے مر جاؤں۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ مجھے چھٹی کی ضرورت نہیں ہے۔

ہفتہ کے وسط میں کمال نے فون کیا۔ اس نے کہا وہ مجھ سے رابطہ کرنے کی بہت کوشش کرتا رہا ہے لیکن میں ملا ہی نہیں۔ "تم شام کو کہاں رہتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"میں ٹہلنے نکل جاتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اس سردی میں؟"

"ہاں۔"

دینا میری بس سٹاپ پر نظر نہیں آئی۔ دفتر جاتے ہوئے ایک دن میں ڈاک خانہ بھی گیا لیکن وہ وہاں بھی نہیں تھی۔

ایک رات میں نے اسے خواب میں دیکھا۔ اس کے بال لمبے لمبے تھے اور ساحل سمندر پر دوڑ رہی تھی۔ وہ ڈری ڈری سی نظر آ رہی تھی جب میری آنکھ کھلی تو میں پسینے میں شرابور تھا۔ میں پریشان ہو گیا۔

ہفتے کے آخری دنوں میں کمال نے مجھ سے کہا۔ وہ بہت جذباتی ہو رہا تھا "مجھے پتہ چل گیا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ میری پریشانی، میرا سر درد، بے خوابی، ڈراؤنے خواب اور بلا وجہ رونے کا دورہ، سب بجلی کے کرنٹ کی وجہ سے تھا لیکن اب پتہ چلا کہ میں غلطی پر تھا۔"

"کیسی بجلی؟"

"تمہیں نہیں معلوم؟ اس ملک میں ایسے برقی طوفان آتے ہیں جو انسانی دماغ پر اثر کرتے ہیں۔"

میں نے اسے بتایا کہ میں نے کبھی ایسا نہیں سنا۔

"یہ تو سب جانتے ہیں۔ سب کو معلوم ہے۔ تم دیکھتے نہیں یہاں کے لوگ کیسی عجیب و غریب حرکتیں کرتے ہیں۔"

"تمہاری باتوں پر تو مجھے ہنسی آ رہی ہے۔ یہ لوگ اپنے سارے کام نہایت دانش مندی کے ساتھ کرتے ہیں۔ وہ اپنے کاروبار میں کامیاب ہیں خوش حال ہیں، اور صحت مند بھی ہیں۔ کیا یہ بجلی صرف بعض لوگوں کے دماغوں پر اثر کرتی ہے اور باقی لوگوں پر نہیں؟"

کمال نے اسی طرح جذبات بھرے لہجے میں کہا "تم بہت سرسری اور فروعی انداز میں چیزوں کو دیکھتے ہو۔ یہ سب چیزیں کاغذی ہیں۔ یہ اونچی اونچی عمارتیں، بڑے بڑے کارخانے، تیز رفتار ہوائی جہاز اور مجسموں اور پھولوں سے بھرے قبرستان۔ یہ سب گتے کے بنے کھلونے ہیں جن سے بچوں کے سوا اور کسی کو نہیں بہلایا جا سکتا۔ تم انہیں اندر سے دیکھو۔ ان کے اندر کھنڈر کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دے گا۔ تم سڑک پر چلتے لوگوں کو اپنے آپ سے باتیں کرتے دیکھو۔ ہوٹلوں میں لوگوں کو مری ہوئی مچھلی کی طرح خالی خالی نظروں سے ایک دوسرے کو گھورتے دیکھو ان کی تنہائی، ان کی بے خیالی اور ان کی نفرتیں دیکھو۔ کون سی طاقت ہیں اس مقام پر لے آئی ہے۔ انسانی وجود ایک وسیع اور عظیم الشان چیز ہے لیکن ہم اپنی کھال میں اپنے آپ کو بند کر لیتے ہیں۔ ہم حقیقی مسرت اور اصل خوشی سے آنکھیں بند کئے رکھتے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھیں کیوں نہیں کھولیں؟ میں اس راستے پر کیوں نہیں چلا۔ میں نے وہ کتاب کیوں نہیں پڑھی۔"

میں نے پوچھا۔ اب وہ کیا کرے گا؟ اس نے بتایا کہ وہ بینک سے استعفیٰ دے چکا ہے اور مصر واپس جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس نے

مجھے مشورہ دیا کہ اس کے ساتھ میں بھی واپس چلا جاؤں۔ اس نے کہا صحرا کے قریب ہم مکان بنائیں گے۔ ہمارے پیچھے بسیط خلا ہوگا، سامنے سمندر ہوگا اور اوپر آسمان۔ ہم مقابلے کی اس اندھی دوڑ، اس کشمکش، اس بھیڑ بھاڑ اور ان بالغوں کی زندگی سے دور ہو جائیں گے جو بچوں کی طرح لڑتے ہیں۔ ہم باقی عمر آفاقی رحمت کے سائے میں اصلی مسرت و انبساط کے ساتھ گزاریں گے۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کی آرزوئیں پوری ہونے کی دعا کی اور کہا میں اس بارے میں سوچوں گا۔

اس رات میں ٹھیک سے سو نہیں سکا۔ رات بھر این میری کے بارے میں سوچتا رہا۔

صبح کام پر جانے کے لئے وقت سے پہلے ہی نکل کھڑا ہوا اور اس کے گھر کی طرف چل دیا۔ ڈاک خانے سے کچھ پتہ نہیں چلا۔ ڈائریکٹری میں اس کا فون نمبر بھی نہیں ملا اس لئے اس کے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس ملک کے لوگ میری اس حرکت کو مناسب بھی سمجھیں کے یا نہیں۔

میں نے گھنٹی بجائی۔ کوئی جواب نہیں ملا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اتنی جلدی کام پر چلی گئی ہو؟ پھر کیا ہو سکتا ہے؟"

پھر اس کے فلیٹ سے ایک آدمی ہاتھ میں بریف کیس لئے باہر نکلا۔ اس نے استفسار بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔ پھر اس نے اپنے فلیٹ کا دروازہ بند کیا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ لیکن مجھے دوبارہ گھنٹی کا بٹن دباتے دیکھا تو مڑا اور میرے قریب آگیا۔

"یہاں سے آپ کو کوئی جواب نہیں ملے گا۔ لڑکی مر چکی ہے اور اس کی ماں بیمار ہے۔"

"لڑکی؟ کون؟ کیسے؟؟"

اس نے کہا "آپ کو نہیں معلوم۔ بہر حال اگر آپ اس کی والدہ سے ملنا چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے......"

میں نے اس سے سوال کیا۔ "این میری؟ مگر کیسے؟"

"لڑکی نے اپنی جان خود لی۔" اس شخص نے دکھ کے ساتھ کہا "فلیٹ کی بالکونی سے ...... رات کے وقت......"

لیکن اسی وقت دروازہ کھلا۔ بوڑھی خاتون دروازہ کھولے کھڑی تھی۔ اس نے نائٹ گاؤن پہن رکھا تھا۔ سر کے سفید بال الجھے ہوئے تھے۔ کاندھوں پر سیاہ شال تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے چیخ ماری اور پیچھے ہٹ گئی۔

"اب تم مجھے لینے آئے ہو؟ اب میری باری ہے؟"

وہ دروازہ پکڑے پکڑے نیچے گر گئی۔ اس آدمی نے اپنا بریف کیس پھینکا اور اسے اٹھانے لپکا۔ میں پیچھے مڑا اور سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ پھر میں شہر کی سڑکوں پر بھاگتا ہی چلا گیا۔

میں اپنے گھر نہیں گیا۔ کام پر بھی نہیں گیا۔ میں کہیں بھی نہیں گیا لیکن اس رات میں بستر پر تھا۔

نہیں معلوم میں سو رہا تھا یا جاگ رہا تھا جب ان پروں نے پھڑپھڑانا شروع کیا۔ وہ عقاب تھا یا کوئی سایہ۔ میں نے دیکھا۔ میں نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ پروں کی سرسراہٹ سنی، ہاتھ اور آگے بڑھایا۔ میرے سامنے روشنیوں اور رنگوں کا ایسا حسین فوارہ پھوٹ پڑا تھا جو میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پروں کی پھڑپھڑاہٹ میرے ارد گرد سنائی دے رہی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھایا۔ میں آنسوؤں اور سسکیوں کے بغیر رو رہا تھا۔ لیکن میرا ہاتھ آگے بڑھا ہوا تھا۔

باغ

نیلوفر اقبال

ڈپٹی کمشنر شاہجہان خان نے قدِ آدم شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر نئے سیاہ سوٹ میں اپنا جائزہ لیا۔ تھوڑی دیر پہلے اس کا ٹیلر لاہور سے یہ سوٹ تیار کر کے لایا تھا۔ لندن سے لایا ہوا بیش قیمت سوٹ پیس تقریباً دو ہفتہ قبل سلنے کے لیے دیا گیا تھا۔ کوٹ کا بٹن بند کیا تو پیٹ پر سے کچھ کسا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے پہلو کی جانب سے معائنہ کیا واقعی پیٹ کچھ بڑھا ہوا سا تھا۔ کچھ دیر پہلے آئینے کے سامنے تنہائی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے جو ایک ابرو اٹھا کر چہرے پر باوقار سی مسکراہٹ طاری کی تھی وہ فوری طور پر مفقود ہو گئی ——— یہ کیسے بڑھ گیا؟ پچھلے مہینے تک تو بالکل ٹھیک تھا۔ تختے کی طرح سیدھا اور سپاٹ۔ اس نے سانس کھینچ کر پیٹ کو اندر دبا لیا — سروس میں آنے کے بعد اس کی زندگی میں دو ہی باتیں تھیں جنھیں وہ بے انتہا سنجیدگی سے لیا کرتا تھا۔ وزن اور کولیسٹرول۔ وگرنہ زندگی میں آسانی ہی آسانی اور فراغت ہی فراغت۔ ان دونوں پرابلمز کے لئے ڈاکٹر نے ایک ہی علاج بتایا تھا۔ روزانہ گھنٹے بھر کی تیز تیز چہل قدمی۔ اور اس بات کا موقع اس نھنے سے شہر میں آ ہی نہ پاتا تھا۔ کہنے کو تو چھوٹا سا شہر تھا لیکن ملک کے سیاسی حالات ہی ایسے تھے کہ یہ چھوٹا سا شہر بھی بھڑوں کے چھتے کی طرح ہر وقت کسی نہ کسی ہلچل کی لپیٹ میں رہتا تھا اور بحیثیت ڈی سی شہر کا سب سے اہم آدمی ہونے کے ناتے وہ ہر وقت سیاسی نوعیت کی دعوتوں کی زد میں رہتا تھا۔ اور اس طرح ملک کے سیاسی حالات کا اثر براہِ راست اس کے پیٹ اور کولیسٹرول لیول پر پڑ رہا تھا۔ اس نے بُرا سا مُنہ بنایا اور اردلی کو آواز دی۔

"جی جناب"

"ٹیلر ماسٹر کو بلاؤ" شاہجہان خان نے پیٹ کو سہلاتے ہوئے کہا۔

"جی جناب"

ٹیلر ماسٹر سفید قمیض اور سلیٹی کھلے پائنچوں والی پتلون میں ملبوس کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا قد چھوٹا تھا۔ پچکے ہوئے گال اور اوپر سے پیٹی اور سامنے سے گولائی میں اُبھری ہوئی ناک کے اوپر گول شیشوں والی عینک خطرناک حد تک آگے کو جھکی ہوئی تھی۔ "اس شخص کی عینک یقیناً ابھی گر جائے گی" شاہجہان نے سوچا۔ لیکن ٹیلر ماسٹر نے بڑی چابکدستی سے انگلی کی جنبش سے عینک کو پیچھے دبا دیا اور بازو کے گرد فیتہ لپیٹے آگے بڑھا۔

"ماسٹر، ٹائٹ کر دیا اس کو یہاں سے"

ماسٹر نے چاروں طرف گھوم کر ہاتھ پھیر پھیر کر اور چٹکیوں میں لے لے کر کوٹ کو دیکھا اور اس کی سنجیدہ آنکھوں

میں جو کسی مفکر کی آنکھیں تھیں، تفکر کے آثار اُبھرے۔

"یہ شخص جو شکل سے فلاسفر نظر آتا ہے اور جس نے ایسا پیشہ پکڑا ہے جس میں تھوڑی بہت عقل اور کچھ ٹیکنیک کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ معمولی سا کام بھی یہ لوگ ڈھنگ سے نہیں کر پاتے۔ کوئی شک نہیں کہ ان لوگوں نے ترقی نہیں کی۔" شاہجہان نے ٹیلر ماسٹر کو پریشانی کے عالم میں اپنے ارد گرد گھومتے دیکھ کر بیزاری سے سوچا۔

"کچھ ٹائٹ ہو گیا ہے سر۔ ٹرائل کے مطابق بنڈرڈ پرسنٹ صحیح بنایا تھا۔۔۔۔۔"

"میں موٹا ہو گیا ہوں۔"

"نہیں سر۔ ایسے کوئی موٹے نہیں ہوئے۔ بس یہاں سے ذرا سا۔۔۔۔"

"نہیں۔ موٹا ہو گیا ہوں صاف۔ یہی تو مصیبت ہے ان چھوٹے شہروں کی۔ ال فرڈ، نو ایکٹیوٹی۔ خیر ابھی یونہی چلنے دو۔ شام کو بڑا ضروری ڈنر ہے۔ مجھے اس کی ضرورت ہوگی۔"

"بہت بہتر سر۔ ڈنر ہو جائے۔ پھر آ کر لے جاؤں گا۔ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ کوئی بات ہی نہیں۔"

ڈنر علاقے کے سب سے بڑے زمیندار ملک محمد اکبر خان کے گھر پر تھا جو ممبر قومی اسمبلی تھے۔ ان کے ایک دوست وزیر ان دنوں شہر میں آئے ہوئے تھے۔ یہ ڈنر اُن کے اعزاز میں تھا۔ ان کے علاوہ ایس پی راجہ اورنگ زیب مدعو تھے۔ شاہجہان خاں جب ملک صاحب کی کوٹھی پر پہنچے تو وہاں کوئی دوسری گاڑی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ڈرائیو وے پر ذرا آگے کو ملک صاحب کی پجیرو پارک کی ہوئی تھی۔ دوسری گاڑیاں غالباً مہمانوں کو لانے گئی ہوئی تھیں۔ نہ تو وزیر صاحب ابھی تک آئے تھے نہ ایس پی صاحب۔ شاہجہان خان کو پہلے پہنچ جانے پر سخت کوفت ہوئی۔ سوچا ڈرائیور کو گاڑی گھمانے کو کہہ دے اور کچھ وقت یونہی علاقے کی سیر میں گزار دے لیکن سردی کافی تھی۔ عافیت اسی میں تھی کہ اندر چلا جائے۔ اسی دوران ملک صاحب برآمدے میں نکل آئے۔ اب واپسی ناممکن تھی۔ ملک صاحب برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر استقبال کو بڑھے اور بڑے تپاک سے ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ اس ڈرائنگ روم میں شاہجہان خان کی یہ پہلی آمد نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی بارہا وہ یہاں ڈنر اور لنچ پر مدعو ہو چکے تھے بلکہ دو چار بار نہاری کے ناشتے کا دور بھی چل چکا تھا جس کو اچھی طرح کولیسٹرل کا جانی دشمن جاننے کے باوجود شاہجہان خان انکار نہ کر سکے تھے۔ انہیں ہیٹر کے قریب صوفے پر بٹھا کر ملک صاحب فوراً ہی "میں ابھی حاضر ہوا" کہہ کر کسی کام سے اندر چلے گئے اور شاہجہان خان ڈرائنگ روم میں چیزوں کے انبار کا جائزہ لینے لگے۔

ڈرائنگ روم کی تزئین کھدائی والے قدیم طرز کے بھاری بھرکم فرنیچر سے کی گئی تھی۔ صوفوں، آرام کرسیوں اور دیوان پر سرخ اور سنہری مائل زرد رنگ کے پھولوں والا کپڑا چڑھا ہوا تھا۔ اور یہی دونوں رنگ کمرے میں نمایاں تھے۔ تہہ در تہہ سرخ پھولدار قالین تھے۔ مخمل کے سرخ بھاری پردے اور پیتل کے بیشمار سامان سے کمرہ بھرا ہوا تھا۔ دیواریں کئی نمونوں کے قیمتی کلاکوں، پیتل کی منقش پلیٹوں اور ریشمی قالین کے ٹکڑوں سے، جن پر کھجور اور اونٹوں کے قافلوں کے مناظر اور شکارگاہیں اور قرآنی آیات نقش تھیں، مزین تھیں۔ "اس شخص کا بس چلتا تو چھت پر بھی کلاک لگوا دیتا۔ اور دیواروں پر بھی سرخ پینٹ کروا دیتا۔" شاہجہان خان نے سوچا۔ بڑے داخلی دروازے کے اوپر شیر کا کھلے منہ والا

سر اور اس کے دونوں اطراف میں بارہ سنگھوں کے سر نصب تھے۔ قالین پر بھی بڑے صوفے کے سامنے شیر کی مکمل کھال سر سمیت بچھی تھی۔ شیر مر چکنے کے باوجود ڈرانے کی کوشش میں منہ پھاڑے ہوئے تھا۔ اطراف کے لمبے لمبے نوکیلے دانت واضح تھے۔ ان اشیاء سے صاحب خانہ کی شکار سے وابستگی کا اظہار ہوتا تھا اور کھانے کی میز پر بھنے ہوئے تیتر اور بٹیر کی صورت میں یہ شوق اور بھی واضح ہوتا تھا۔

" یہ سب کم پڑھے لکھے اور مالدار زمیندار جب اپنے ڈرائنگ روم کی سجاوٹ پر اترتے ہیں تو نتیجہ کم و بیش ایک جیسا ہی نکلتا ہے۔" شاہجہان نے پیتل کے آفتابوں، کلاکوں اور کھالوں پر اکتاہٹ بھری نگاہ دوڑاتے ہوئے سوچا۔ البتہ ایک نئی چیز اس دفعہ نظر آئی ـــــ یہ فریم کی ہوئی باٹیک ورک کی کچھ تجریدی تصویریں تھیں ـــــ ڈرائنگ روم کے باقی ماحول میں یہ قدرے اوپرا اور مصنوعی سا تاثر دے رہی تھیں۔ وہ غور سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا کہ زمیندار صاحب اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے اسے تصویروں کی طرف دیکھتے ہوئے دیکھ لیا۔

" یہ اپنی بچی کی بنائی ہوئی ہیں ـــــ لاہور میں کرایا ہوا ہے اسے ہوم اکنامکس کالج میں۔ وہ کرتی رہتی ہے یہ سب ـــــ کہتی ہے پورا ڈرائنگ روم بدلو، فرنیچر بدلو۔ پردے لال کیوں لگائے ہیں۔ شیر کو ہٹاؤ۔ بارہ سنگھا کیوں لگایا ہے۔ لوجی کوئی بات ہے بھلا۔ کل کو ماں باپ بھی پرانے لگیں گے ـــــ ہے ہے ہے ـــ!" ملک صاحب مشفقانہ انداز سے ہنسے۔

بچی کے نام پر شاہجہان خاں کا ماتھا ٹھنکا۔ عموماً ایسے ہی زمیندار گھرانوں میں جہاں وہ بار بار کھانوں پر بلایا جاتا تھا کہیں نہ کہیں سے کوئی نہ کوئی بچی یکایک نکل پڑتی تھی۔ کہیں فنکارانہ مہارت سے سجی ہوئی سلاد کی ڈش سے کہیں پیشہ ورانہ مہارت سے تیار کی گئی روسٹ ران سے ـــــ کہیں پستے بادام اور ورق کی دبیز تہوں میں چھپے شاہی ٹکڑوں کی قاب سے۔ اور آج تجریدی تصویروں میں سے ـــــ لیکن وہ بھی گھاٹ گھاٹ کا پانی پیئے ہوئے تھا اور بچیوں کو مکمل طور پر نظر انداز کر کے تمام تر توجہ کھانے پیر مرکوز رکھتا تھا اور دعوت والے گھر سے باہر قدم نکالتے ہی اس گھرانے اور وہاں کی بچیوں کو مکمل طور پر فراموش کر دیتا تھا۔

" فرنیچر بدل لو یا کچھ بھی کر لو۔ رہو گے تو وہی ـــ جاہل کے جاہل ـــــ ہاں ابو ....." شاہجہاں خاں نے ٹھنڈا سانس لیکر سوچا" یہ ماننا پڑتا ہے کہ ملک کی ڈوریاں بہر حال تمہارے ہی ہاتھوں میں ہیں ـــــ خیر جیسے ہم لوگوں کے منہ ویسی ہی .... " ساتھ ہی باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ دونوں تیزی سے دروازے کی طرف بڑھے۔ ایس پی کی گاڑی کو دیکھ کر شاہجہان خان تو ڈرائنگ روم کے وسط سے واپس آ کر ہیٹر کے قریب اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ جب کہ زمیندار صاحب برآمدے میں نکل آئے اور " آؤ۔ جی۔ بسم اللہ" کہتے ہوئے تپاک سے مہمان کو اندر لے آئے۔ شاہجہان خان اور راجہ اورنگ زیب نے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور راجہ صاحب ہاتھوں کو رگڑتے ہوئے ہیٹر کے قریب جا کھڑے ہوئے۔

" باہر بڑی سردی ہے۔ غنیمت ہے اندر ـــ" راجہ اورنگ زیب بولا۔ شاہجہان خان نے گھڑی دیکھی۔ " نو بجنے والے ہیں۔ کوئی پچیس منٹ ہو گئے ہیں مجھے آئے ہوئے۔ آپ تو اچھے رہے۔ اب دیکھیں کتنا انتظار اور ہے ..... "

''گاڑی بھیجے گھنٹہ ہوگیا ہے۔ آنے والے ہوں گے۔ وزیروں کی جان تھوڑی مصیبت میں پھنسی ہے۔ لوگ جان نہیں چھوڑ رہے ہوں گے۔ بیٹھو جی بیٹھو، کون سی جلدی ہے۔ ساری رات اپنی ہے۔'' ملک صاحب بولے

اسی وقت باہر گاڑی داخل ہونے کی آواز آئی۔ زمیندار صاحب باہر کو دوڑے۔ ڈی سی اور ایس پی صاحب بھی ڈرائنگ روم کے دروازے کی طرف بڑھے۔ چند لمحوں بعد ہی ملک صاحب وزیر صاحب کو لئے اندر داخل ہوئے۔ ڈی سی اور ایس پی نے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا اور ہیٹر کے قریب ان کو جگہ دی۔ کچھ دیر وہ سب ایک دوسرے کے حال احوال دریافت کرتے رہے۔ پھر اسلام آباد کے حالات کا تذکرہ ہونے لگا۔ ملک صاحب اٹھ کر کھانے کا حکم صادر کرنے اندر چلے گئے۔ وہ تینوں گفتگو میں مصروف ہوگئے اور ملک کی مختلف اہم اور معروف شخصیات زیرِ بحث آتی چلی گئیں۔ تقریباً پندرہ بیس منٹ کی گفتگو میں یہ ثابت ہوگیا کہ ڈی سی شاہجہان خان، ایس پی راجہ اورنگ زیب اور وزیر صاحب کو چھوڑ کر پاکستان کے باقی تمام قابلِ ذکر لوگ یا کرپٹ تھے یا بیوقوف۔

تھوڑی دیر میں برابر والے کمرے سے پلیٹیں بجنے اور بریانی اور گوشت اور ضرورت سے زیادہ بھنے ہوئے مصالحے کی بو آنے لگی۔

''گرم پانی رکھا ہے سر۔ ہاتھ دھو لیں۔'' کھڑکھڑاتے ہوئے سفید لباس میں ملبوس ایک ملازم نے آکر بڑے ادب سے کہا۔ ان تینوں میں سے کسی نے بھی ہاتھ دھونے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ اسی طرح ہیٹر کے سامنے ہاتھ تاپتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔

''آؤ جی۔ دال روٹی حاضر ہے۔'' زمیندار صاحب کا صحت مند سرخ چہرہ سرخ پردوں کے درمیان سے نمودار ہوا اور وہ تینوں فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔

''پھر وہی ـــ پھر وہی بے پناہ گوشت اور بے رحمی سے انڈیلا ہوا دیسی گھی ـــ یہ لوگ مار ڈالیں گے مجھے۔ دے آرکلنگ می ـــ میرے کولیسٹرول کے دشمن۔'' شاہجہان خان نے کھانے کی میز پر نگاہ دوڑاتے ہوئے مایوسی سے سوچا۔ اپنے گھر میں وہ کارن آئل اور وہ بھی بہت کم کم استعمال کرتا تھا۔ لیکن اپنے گھر میں کھانے کی نوبت کم ہی آتی تھی۔ وہ فیملی والا نہیں تھا، تنہا تھا اس لئے وہاں کے چند گنے چنے متمول لوگ اسے مدعو کرلیا کرتے تھے اور وہ بھی تنہائی کے خیال سے چلا جاتا تھا۔ وگرنہ کھانوں سے وہ تنگ آتا جا رہا تھا ـــ پھر وہی مرغن بریانی ـــ چاول کے ایک ایک دانے سے گھی ٹپکتا تھا۔ دنبہ روسٹ ـــ مرغ کا باربیکیو۔ دو تین قسم کے کباب، بادام پستے سے لیس دو تین قسم کے میٹھے ـــ اور میز کے وسط میں نمایاں وہی بھنے ہوئے تیتر اور بٹیر کی قاب ـــ!

''کیا مصیبت ہے۔'' شاہجہان خان نے بریانی کی پلیٹ اور روسٹ کا بڑا سا پیس کھانے کے بعد سوچا۔ تنگ پتلون بیلٹ والی جگہ سے کاٹے دے رہی تھی۔ اس نے چپکے سے ڈائننگ ٹیبل کی آڑ میں بیلٹ کو ذرا سا ڈھیلا کر کے اوپر والا بٹن کھول دیا اور پھر جیسے چین سا پڑ گیا۔ اس نے کھل کر لمبا سا سانس لیا اور اس کی ذہنی صلاحیتیں جیسے پھر سے عود کر آئیں۔ روسٹ کا ایک بڑا سا ٹکڑا اپنی پلیٹ پر منتقل کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ''مئی کے وسط میں وزیراعلیٰ کا دورہ ہے۔ بہت بڑے جلسے کا اہتمام کرنا ہوگا۔ میں ابھی سے انتظام شروع کروا رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں اس سے پہلے پہلے یہاں کوئی ایسا کام ہوجائے جس سے انتظامیہ کو کریڈٹ جائے اور اس

کی اچھی طرح پبلسٹی ہو۔ وزیر اعلیٰ کی آمد سے یہ ہوگا کہ ٹی وی کوریج بھی کروائی جا سکتی ہے ...۔"

ٹن ٹن ٹن کی تیز آواز سے ڈی سی شاہجہان خان کی بات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ زمیندار صاحب بڑے انہماک سے پلیٹ میں ہڈی مار مار کر گودا نکالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ناکام ہونے پر انہوں نے ایک ہاتھ کا نیم پیالہ سا بنایا اور دوسرے کی کلائی سے ضرب لگا لگا کر یوں کوشش جاری رکھی گویا ان کے لئے موت اور زندگی کا سوال ہو۔ پھر ہڈی کو منہ سے لگا کر جو زور سے کھینچا تو "شڑوک" کی آواز کے ساتھ گودا ان کے منہ میں بلکہ شاید سیدھا معدے میں منتقل ہو گیا۔ ان کے چہرے پر مقدونیہ فتح کر لینے کا سا اطمینان آ گیا اور ڈی سی شاہجہان خان نے اپنی بات جاری رکھی۔

"...... دراصل میں سنجیدگی سے ایک سکیم پر ورک کر رہا ہوں جس سے پتہ چلے گا کہ شہر میں کوئی ٹھوس کام ہوا ہے۔ اس طرح ڈسٹرکٹ کے لئے زیادہ فنڈ بھی سینکشن کروایا جا سکتا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے سر۔" اس نے وزیر صاحب کو مخاطب کیا۔

"بالکل ــ کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔" وزیر صاحب نے ہاتھ کی آڑ میں خلال کرتے ہوئے کہا۔

"سکیم تو میں بہت جلد مکمل کر کے دے دوں گا ــ لیکن روپیہ سینکشن کرانا آپ کا کام ہے۔" اس نے ایم این اے صاحب کی طرف دیکھ۔

"آپ سکیم بنائیں شاہجہان صاحب۔ روپے کی فکر نہ کریں۔ میں تو خود چاہتا ہوں کوئی کام ہو۔ لوگوں نے جان کھائی ہوئی ہے۔ پر کام ایسا ہو کہ نظر آئے۔ ہمیں بھی کریڈٹ جائے کہ علاقے میں کچھ کیا ہے۔ یہ بات آپ کی صحیح ہے۔ ہو وزیر اعلیٰ کے آنے سے پہلے پہلے ــ تاکہ ان کے آنے سے پبلسٹی ہو جائے۔ بعد میں ہوا تو کیا فائدہ۔ ہیں جی ؟"

"پانی کی بڑی پرابلم دیکھی ہے میں نے اس علاقے میں ـــ ! ملکوں وکھوں کا کچھ کریں شاہجہان صاحب ــ" راجہ اورنگ زیب ایس پی نے قیمتی غیر ملکی مشروب کا گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے کہا۔

"اچھا ؟ ایس پی ہاؤس میں پانی کی پرابلم ہے۔ پہلے کیوں نہ بتایا آپ نے ؟ کمال ہے جی۔ کمال ہے۔ یعنی ہمارے ہوتے ہوئے ...... پچ پچ۔ پہلے بتانا تھا آپ نے ہمارے ہاں تو دریا ہے۔ ڈی سی ہاؤس میں تو کوئی پرابلم نہیں خان صاحب ؟" زمیندار صاحب نے تشویش سے کہا۔

"میں تو علاقے کی بات کر رہا تھا" راجہ اورنگ زیب بولا۔

"میرا تو جی سارا پانی آتا ہے لاہور سے۔ ٹینکر آتے ہیں۔ ہمیں کوئی پرابلم نہیں۔ میں نے نہیں پیا کبھی ادھر کا پانی۔ سارے جہاں کے کیڑے، ڈڈو، کیرے ادھر کے پانی میں ہیں۔ نری بیماری۔ آپ بھی نہ پیا کریں۔ پینا بھی ہو تو ابالا دے کر۔ پر کبھی نہ پینا ـــ ویسے بھی پانی پینے کی ضرورت کیا ہے۔ پینے کو اور تھوڑا کچھ پڑا ہے۔ ہے ہے ہے" زمیندار صاحب نے سرور میں ڈوبی آواز کے ساتھ ہنس کر کہا۔

"مجھے بھی زمانے ہو گئے پانی پیے۔ ویسے پانی پینا چاہیے۔ ضرور پینا چاہیے پانی۔ بہت اچھی چیز ہے پانی۔ ڈاکٹر تو کہتے ہیں آٹھ گلاس ہیو روزانہ۔" وزیر صاحب گھمبیر آواز میں بولے

"آٹھ گلاس مطلب سیال شے۔ پانی کوئی ضروری نہیں۔ چاہے دودھ ہو، چائے ہو، لسی ہو۔ بےشک یہ ہو۔"

ایم این اے صاحب نے کہا۔

"یہ بھی ٹھیک ہے۔ یہ بھی ضرور پیو۔ پر پانی بھی پیو۔ پانی ضرور پیو۔۔۔ ورنہ جگر خراب۔ گردے خراب میں نے تو منرل واٹر کی بوتل رکھی ہوتی ہے ریفریجریٹر میں، ادھر اسلام آباد والے آفس میں۔ کبھی گھونٹ سے لیتا ہوں۔ پر ہفتے گزر جاتے ہیں بوتل ختم نہیں ہوتی۔ پانی اچھا ہے اسلام آباد کا پر میں نے ہمیشہ منرل واٹر پیا ہے۔ گردے بچانے ہیں تو پانی ضرور پیو۔ ڈاکٹر کہتا ہے پانی پیو، بہت پانی پیو۔ کدھر سے پیو ادھر اسلام آباد میں تو کھانوں کی بڑی مار ہے۔ ٹائم ہی نہیں ملتا کہ بندہ کبھی پانی پی لے۔۔۔ لوگ کہتے ہیں وزیر عیش کرتے ہیں مجھ سے پوچھو گردے تباہ، جگر تباہ، شوگر ہو گئی جب سے وزارت پکڑی ہے۔۔۔ کسی زمانے میں جب وزارت نہیں تھی تو گھنٹہ گھنٹہ سویرے سیر کرتا تھا۔ اور اب۔۔۔ اب سویرے میں جو نکلو تو خیر نہیں۔ اتار کر سڑک پر کھڑا کر دیتے ہیں اور بھیرو اڑا کر لے جاتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں وزیر عیش کرتے ہیں۔۔۔ اف میرا جگر......"

وزیر صاحب نے اندازاً جہاں جگر کو ہونا چاہیے، وہاں سہلاتے ہوئے کہا۔

"یہ شخص تو کچھ جلدی ہی......" شاہجہان خان نے وزیر صاحب کو گفتگو میں بہکتے ہوئے بھانپ کر کہا۔

"چھوڑو جی۔ آپ کیوں غم کرتے ہیں بچاروں کا۔۔۔ آپ کے پلے سے جاتی ہے بچارو، سرکار کا مال ہے جانے دو سرکار کے کھاتے میں۔ چلو چار دن غریب عوام بھی خوش ہو لے، میٹھے بچارو ہیں۔ آپ یہ قلفی کھاؤ۔ خاص لاہور سے منگوائی ہے۔ شوگر ہو گئی ہے تو خیر سلا ہے۔ شوگر کا تو علاج ہی ہے میٹھا۔ دبا کر میٹھا کھاؤ۔ ڈاکٹروں کی سنے تو بھوکا مر جائے بندہ۔۔ نہ چاول کھاؤ۔۔ نہ روٹی کھاؤ۔۔ میٹھا نہ کھاؤ۔۔ پھل فروٹ نہ کھاؤ۔۔ توبہ جی توبہ۔ میرے بھتیجے کو ہو گئی تھی شوگر۔ میں نے بھی لاہور سے منگوا منگوا کر فالودہ کھلوایا۔ لسی پلائی پیڑے ڈال ڈال کر۔ جان ہے تو جہان ہے۔۔۔ اللہ بخشے کھاتا پیتا مرا۔ ہم نے نہیں مرنے دیا ترس ترس کے۔ الیکشن میں کھڑا ہو رہا تھا میرے مقابلے میں۔ اپنا خون تھا جی۔ وہ ہو جاتا یا میں ہو گیا ہوں۔ بات ایک ہی ہے۔ کھاؤ جی کھاؤ۔ شاہی ٹکڑا ڈالو۔ کھیر بھی کھاؤ اچھی طرح۔۔۔ میں ڈالتا ہوں آپ کی پلیٹ میں..." زمیندار صاحب نے کھیر کی ڈش وزیر صاحب کی طرف سرکائی۔۔۔ "چکر چلا کر سالا وزارت لے گیا میری۔ میں نے بھی میٹھا کھلا کے نہ مارا تو......"

وزیر صاحب نے بڑی خوش اخلاقی سے ان کی پیشکش رد کر دی اور سلاد کی ڈش سے کھیرا اٹھا کر چبانے لگے۔

کھانا ختم کر کے وہ سب ہیٹر کی اطراف میں صوفوں پر ٹانگیں پسار کر بیٹھ گئے۔ ہیٹر کی مدھم مدھم حرارت۔ بھاری مرغن کھانے اور بیش قیمت مشروبات سے سب کے چہرے سرخ ہوئے جا رہے تھے۔ پلکوں پر دھیما دھیما سرور طاری ہو رہا تھا۔ ملازم نے اعلیٰ قسم کے کاجو، پستے اور کشمش کے طشت سامنے لا کر رکھے۔ اور پینے کا سامان بھی یہیں آ گیا۔

"بڑا اعلیٰ کاجو ہے" وزیر صاحب نے ایک ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"میرا تو جی سارا ڈرائی فروٹ انڈیا سے آتا ہے۔ کاجو پہنچ جائے گا آپ کے لئے اسلام آباد۔"

"کاجو تو آتا رہے گا۔ آم بڑا لاجواب ہے آپ کا۔ میں تو آج تک یاد کرتا ہوں۔ میرے باغ کا بھی ہے۔ پر آپ کے آم کا جواب نہیں۔"

"وہ تو آپ کو کہنے کی ضرورت نہیں۔ آپ کی پیٹیاں پہنچ جائیں گی اور شاہجہان صاحب نے بھی آج تک یاد رکھی ہے ہمارا ثمر بہشت۔ آپ نے نہیں کھایا راجہ صاحب ہمارا آم۔ آپ کے آنے کے بعد تو یہ پہلا سیزن ہوگا۔ آپ کے حصے کی پیٹیاں بھی انشاء اللہ پہنچیں گی۔"

"مہربانی۔ مہربانی ملک صاحب۔ آپ کے آم کی تعریف سنی ہے میں نے —— ہاں تو شاہجہان صاحب کیا سکیم ہے آپ کی؟ کچھ پتہ تو چلے۔ وہ تو بات بیچ میں ہی رہ گئی۔"

"عظیم سکیم ہے،" ڈی سی شاہجہان جو کچھ کچھ سرور میں آئے تھے سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کے لئے وزن اور صحت زندگی میں اوّلین فوقیت رکھتے ہیں۔ اور جو مقررہ مقدار سے تھوڑا بہت بھی زیادہ کھا لینے یا پی لینے کے بعد فوراً احساسِ جرم کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا وہ پینے کے معاملے میں بھی بہت محتاط تھے اور اتنی ہی مقدار لیتے تھے کہ حسیات کند ہو جانے کے بجائے کچھ اور تیز ہو جاتی تھیں۔

"دراصل اس علاقے میں آکر میں نے محسوس کیا کہ ہمارے ملک میں بیشتر علاقے کس قدر بیک ورڈ ہیں۔ اب تک پوسٹنگ بڑے شہروں میں رہی۔ تعلیم اور اپ برنگنگ بڑے شہروں میں ہوئی۔ لیکن اس علاقے میں آکر پہلی دفعہ احساس ہوا کہ کس قدر ضرورت ہے یہاں ڈویلپمنٹ کی۔ یہ لوگ تو اس قدر پیچھے ہیں، اس قدر پیچھے کہ میرے خیال میں تو موہنجوڈارو کے لوگ بھی زیادہ سویلائزڈ تھے۔ ان لوگوں کا لائف سٹائل تو یقیناً ان سے بھی قدیم ہے۔ آپ لوگ دیکھیں کہ وہاں کی کھدائیوں میں اعلیٰ تعمیرات کے نشان ملتے ہیں۔ سیوریج سسٹم کا پتہ چلتا ہے۔ پانی کا انتظام تھا۔ ٹینک اور تالاب وغیرہ ملے ہیں۔ لیکن یہاں تو مائی گاڈ —— مائی گاڈ! —— چھپڑوں کا پانی لوگ استعمال کرتے ہیں۔ اسی پانی میں گائیں بھینسیں بھی نہاتی ہیں اور ٹائلٹ سسٹم کا تو تصور ہی نہیں۔ توبہ توبہ! —— پتھر کا زمانہ لگتا ہے یہاں تو —— سخت سردی میں بھی ان کے ننگے کرتوں میں ننگے پھرتے ہیں۔ یعنی موسموں سے خود کو پروٹیکٹ کرنے کا کوئی کانسپٹ ہی نہیں —— سٹون ایج —— بہت دل خراب ہوتا ہے۔ شروع شروع میں میں بڑا اپ سیٹ ہوا۔ ٹرانسفر کے لئے بھی کوشش کی لیکن لگتا ہے کچھ دن یہاں رہنا ہی پڑے گا —— خاص طور پر جب آدمی سٹیٹس یا جاپان وغیرہ سے ہو کر آئے تو بہت افسوس ہوتا ہے ....."

ایم این اے صاحب کا سر ہلکا پھلکا ہو چکا تھا۔ اتنی بھاری گفتگو ان کے ذہن میں گڈمڈ سی ہوتی جا رہی تھی اور اس کو سمجھنے کی کوشش کرنے سے ان کے دماغ پر زور پڑ رہا تھا —— وہ اوپر چھت کی طرف دیکھنے لگے جہاں فانوس کے گرد پتنگوں کا ایک جم غفیر جمع ہو گیا تھا۔ دو ایک تو ان کے کندھوں اور شلوار پر بھی آ بیٹھے۔ جنہیں وہ انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کی مدد سے چٹکیوں سے اڑانے کی کوشش کرنے لگے۔

"لگتا ہے زیادہ ہی ....." انھوں نے شلوار پر سے پتنگا اڑاتے ہوئے سوچا۔

"میں امریکہ رہ کر آیا ہوں۔ واپسی پر پورا یورپ گھوما۔ پھر جاپان گیا —— ان لوگوں کے رہنے سہنے کا ڈھنگ دیکھ کر واقعی دل چاہتا ہے کہ اپنے ملک میں بھی کچھ ہو۔ بہت زیادہ گنجائش ہے یہاں —— اسی لئے میں نے سوچا ہے کہ اپنے TENURE کے دوران کچھ نہ کچھ ضرور کر کے جاؤں گا۔ میرا تقریباً ایک سال اور یہاں رہ گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں جاؤں تو لوگ یاد رکھیں کہ کوئی افسر آیا تھا جو کچھ بنا گیا ....."

"ہسپتال یا سکول کالج کا ارادہ ہے کیا؟" راجہ اورنگ زیب نے پوچھا۔

" ہسپتال ۔۔۔ !" زمیندار صاحب نے تنک کر کہا۔" ہسپتال بنا بھی لو ادھر تو ڈاکٹر کدھر سے لاؤ گے ۔ کوئی ڈاکٹر ٹھہرتا ہے ادھر ؟ پنجرے میں بند کر کے لاؤ پھر بھی نہیں ٹھہرتا ۔۔۔ میں تو سال دو سال میں باہر جا کر چیک اپ کرا لیتا ہوں ۔ چھوٹا موٹا کچھ ہُوا تو لاہور میں جا کر دکھا لیا یا اسلام آباد سے دکھا لیا ۔ اِدھر کے لوگ تو ڈنگر ہیں ۔ انہیں کیا ہسپتالوں کی تمیز ہے ۔ بنا دو ہسپتال ۔ انہوں نے تو پھر حکیم کے پاس ہی جانا ہے ۔ مولوی جب تک پھونک نہ مارے ان کی تسلی نہیں ہوتی ۔ لیڈی ڈاکٹر لا کر رکھ دو ۔ زنانیوں نے پھر دائی بلانی ہے ۔۔۔ ان کو کیا لگے ہسپتالوں سے ۔"

" ملک صاحب نے بالکل ٹھیک کہا ۔۔ اسی لیے تو میں ہمیشہ ہی ڈاکٹر کو گھر پر بلا کر دکھا لیتا ہوں ۔ پیسے چار فرور لگ جاتے ہیں پر ہر کام تسلی سے صاف ستھرا ہو جاتا ہے ۔ مجھے تو بو آتی ہے ہسپتال کے نام سے ۔۔۔ میں نہیں جاتا کبھی ہسپتال ۔ نہ بچوں کو کبھی بھیجوں ۔ گھر پر ڈاکٹر بلا لیا ۔ دکھا لیا ۔۔ شوگر کا ٹیسٹ بھی گھر پر ہو جاتا ہے ۔ آج تو بڑی بد پرہیزی ہوئی ۔ خدا جانے کیا بنا ہو گا میری شوگر کا ۔ ۔ ۔ ۔"

" ہسپتال وغیرہ کا کوئی پروگرام نہیں ہے ۔ آپ کیوں فکر کرتے ہیں ۔" شاہجہان خان نے ہنس کر کہا ۔

" اور خاں صاحب یہ بھی بتا دوں میں ۔ سکول کالج بھی بیکار ہے اس علاقے میں ۔" زمیندار ملک اکبر ایم این اے نے کہا ۔۔" جو کھلے ہیں وہ بھی بیکار جا رہے ہیں ۔۔۔ چوتھی پانچویں سے آگے کوئی جاتا نہیں ان کا گند ڈیا ۔۔۔ نہ کوئی استاق ماسٹر ادھر ٹھہرے ۔ میرے تو جی دونوں لڑکے شروع سے لاہور میں پڑھتے ہیں ۔ میں نے نہیں ادھر خراب کرایا اپنے لڑکوں کو ۔۔ آپ کا بھی تو ماشاء اللہ ایک صاحبزادہ باہر پڑھ رہا ہے ۔ ۔ ۔ ۔" انھوں نے وزیر صاحب کی طرف دیکھ کر پوچھا ۔

" میرے تو جناب ملک صاحب دو لڑکے گھوڑا گلی میں پڑھتے ہیں ۔ چھوٹے لڑکے کو لاہور ایچی سن میں کرایا ہے ۔ اب بڑے ماشاء اللہ دونوں لندن میں پڑھ رہے ہیں ۔ اپنا فلیٹ ہے وہاں ۔ بڑے اچھے چل پڑے ہیں پڑھائی میں ۔ دو سال میں چھوٹا بھی چلا جائے گا ۔"

" ہاں جی اللہ وسیلہ دے تو کیوں نہ آدمی بہترین تعلیم دے ۔ تعلیم تو اللہ کا حکم ہے ۔ سنّتِ نبوی ہے ۔ اِقرأ ۔۔ شریکوں نے بڑا شور مچایا پر میں نے لڑکی کو بھی پڑھایا ۔ لاہور میں داخل کرایا ۔ اب میرے بڑے بیٹے کے بھی پر نکل رہے ہیں کہتا ہے امریکہ بھیجو ۔۔ سوچ رہا ہوں لندن ہی نہ بھیج دوں ۔ آپ کے صاحبزادے بھی اُدھر ہیں ۔ اکٹھے ہو جائیں گے ۔"

" نہیں ملک صاحب ۔ امریکہ ہی ٹھیک ہے ۔ میں بھی سوچ رہا ہوں غلطی کی لندن بھیج کر ۔ امریکہ بھیجنا چاہیئے تھا بندہ وہیں پڑھ جائے اور نیشنیلٹی بھی دلا دے ۔ بچوں کا کوئی نہ کوئی مستقل ٹھکانہ تو ہونا چاہیئے ۔ یہاں تو آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے ۔ آج حکومت ہے تو عرش پر نہیں تو فرش پر ۔ چادر ہاتھ سے نکلی اور کتے پیچھے لگ گئے ہم نے تو خیر جو سہنا تھا سہہ لیا ۔ اولاد کو کیوں خراب کریں ۔ حالات ٹھیک ہوں تو شوق سے اِدھر ہی رہیں ورنہ باہر جائیں عیش کریں ۔ کونسی روپے پیسے کی کمی ہے ۔۔ پھر اس ملک کا تو کچھ پتہ ہی نہیں ۔ اللہ رحم کرے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں تو شاہجہان صاحب ، آپ کی بات تو پھر بیچ میں ہی رہ گئی ۔ تو کوئی کالج یونیورسٹی کا پروگرام بنا رہے ہیں آپ وزیرِ اعلیٰ کے کہنے سے پہلے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

" نہیں جی نہیں ۔۔ سکول کالج کا کوئی پروگرام نہیں ۔ ویسے بھی یہ محکمہ تعلیم والوں کا سر درد ہے ۔۔ میں تو

کچھ اور ہی سوچ رہا تھا — ایسی چیز جو یادگار ہو، نظر آئے جس میں حسن ہو ......"

"واہ" زمیندار صاحب نے کہا۔

"علاقے میں کوئی جان پڑے جس سے لوگ دیکھ کر کہیں کہ واقعی کسی نے کوئی چیز بنائی ہے — باغ۔ بہت شاندار باغ — ایسا شاندار باغ جیسا میں جاپان میں دیکھ کر آیا ہوں۔ خیر ویسا تو ناممکن ہے لیکن اسی سے ملتا جلتا کچھ کم خرچ پر — فوارے ہوں۔ لینڈ سکیپنگ، سوئمنگ پول ...."

"واہ" زمیندار صاحب نے کہا

"...... پھولدار درخت ہوں۔ سٹیچوز[1] ہوں۔ بہترین گلاب۔ ایک طرف بچوں کے لئے پارک ہو۔ فن لینڈ ٹائپ ......"

"بچوں کو تو رہنے ہی دیں — یہ کوئی اسلام آباد یا لاہور کراچی تو ہے نہیں۔ یہاں کے بچوں کو کیا تمیز ہے پارکوں کی۔ فقیروں کی اولادیں۔ چار دن میں پارک کا بیڑہ غرق کر دیں گی۔ ان کو کس لئے گھسانا ہے اندر — سوئمنگ پول میں موتنے کو؟" ایم این اے صاحب بولے۔

"یہ بھی صحیح ہے۔ چلئے بچوں کا داخلہ ممنوع کر دیں گے۔ میرا پروگرام دراصل یہ ہے کہ سوئمنگ پول کے ساتھ ہی ایک شاندار ایرکنڈیشنڈ ریسٹ ہاؤس ہوگا ...."

"یعنی pent-house" ایس پی راجہ اورنگ زیب نے کہا۔

"پینٹ ہاؤس — خی خی" وزیر صاحب ہنسے

"یہ بات ہوئی نا" ایم این اے صاحب نے تائیدی کلکاری ماری۔

"واقعی اس منحوس شہر میں تو کوئی جگہ ہی نہیں تھی جہاں چار شریف آدمی دو چار گھڑی ......"

"اسی ریسٹ ہاؤس میں وزیر اعلیٰ کو ٹھہرایا جائے گا۔ میں نے اس کے ڈیزائن کے بارے میں بہت سوچا ہے۔ ان علاقوں میں اکثر دوسرے ملکوں کی ٹیمیں مثلاً ورلڈ بینک وغیرہ کی آتی رہتی ہیں۔ تھوڑا سا اپنے کلچر کا ٹچ باغ اور ریسٹ ہاؤس کے سیٹ اپ میں ہو جائے تو بہت اچھا لگے گا۔ یعنی کچھ کچھ مغلیہ سٹائل" شاہجہان نے کہا

"وہ تو ہونا ہی ہے ناں — شاہجہان جو ہوئے" ایس پی راجہ اورنگ زیب نے ہنس کر کہا — باقی سب بھی شاہجہان کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگے۔

"تو آپ سب اپروو کرتے ہیں نا — آپ کی تائید سمجھوں —"

"تائید ہی تائید خاں صاحب — تائید ہی تائید — مجھے تو خود بہت پسند ہے باغ باغیچہ" زمیندار صاحب بولے۔ "کبھی دن کو آکر میرا باغ دیکھیں۔ ایک سے ایک بوٹا لگوایا ہے میں نے۔ میرے ہرے گلاب اور کالے گلاب کی تو ریس ہی نہیں۔ کسی دن دکھاؤں گا آپ کو — ہاں خیال آیا۔ ایک کام تو آپ ضرور کروائیں۔ سڑک میرے گھر سے لے کر باغ تک نئی کروا دینا۔ تالاب بن گیا تو میرے لڑکوں کا تو صبح شام آنا جانا لگا رہے گا — بس کچھ ایسے کر لیں آپ کہ میرے گھر سے ہوتی ہوئی ایس پی ہاؤس سے لیکر ڈی سی ہاؤس سے ہوتی ہوئی باغ تک جائے۔ سب کا بھلا ہو جائے گا۔ پھر سڑک شڑک بن جائے تو ذرا کام نظر آتا ہے۔ جگہ کون سی ہے؟"

---

[1] STATUES

"جگہ تو بہت اچھی ہے۔ بڑی صاف ستھری۔ سٹیشن سے ادھر کو آؤ تو سیدھی طرف بہت بڑا میدان ہے خالی پڑا ہے۔ چھپڑ سا ہے وہاں۔ اسی کو دیکھ کر سوئمنگ پول کا خیال آیا۔ میں تو حیران ہوں جب سے پاکستان بنا ہے افسر یہاں آئے ہیں کسی کو آج تک علاقے کی ترقی کا خیال نہیں آیا۔ دراصل میرا کچھ آرٹسٹک سا رجحان ہے۔ پارک بن گیا تو میرے شوق کی بھی تسلی ہو جائے گی۔ اور کچھ سوشل خدمت بھی ہو جائے گی۔"

"جناب ضرور شوق پورا کریں آخر شاہجہان ہیں آپ۔ شاہجہان نہ کرے گا تو کون کرے گا۔" راجا رنگ زیب نے دوبارہ ہنس کر کہا۔

"بس اتنا ہے کہ میں چاہتا ہوں پروگرام مئی سے پہلے مکمل ہو جائے۔"

"پروگرام — کوئی ہے پروگرام؟" وزیر صاحب نے نیند سے چونکتے ہوئے کہا۔

"پروگرام — پروگرام کیوں نہیں۔ کیوں جناب راجہ صاحب — آپ نے ذمہ داری لی تھی۔" ایم این اے صاحب بولے — "کوئی ہے بندوبست؟"

"بندوبست ہے۔ کیوں نہیں۔ ابھی؟ یا ذرا ٹھہر کے۔"

"وقت بڑا مناسب ہے۔ آنے جانے میں بھی ٹائم لگتا ہے۔ بسم اللہ کریں۔"

"بس ذرا اشارہ دینا ہے۔ کدھر ہے فون!"



ڈی سی شاہ جہان خان کے سامنے میز پر باغ کا پلان پھیلا ہوا تھا۔ یہ بہت بڑے کاغذ پر بنا ہوا تھا اور تقریباً تین چوتھائی میز اس کے نیچے چھپ گئی تھی۔ وہ اس کے جزئیات پر آخری نگاہ ڈال رہا تھا۔ سوئمنگ پول کا منصوبہ فی الحال ملتوی کرنا پڑ رہا تھا کیونکہ ایک تو علاقے میں پانی کی پرابلم تھی جس کے لئے زیادہ وقت درکار تھا۔ دوسرے اس کے لئے ماہرین کو باہر سے بلوانا پڑتا تھا اتنا لمبا پروگرام وزیر اعلیٰ کے آنے سے پہلے تکمیل تک پہنچنا مشکل تھا۔ اس لئے جگہ کا تعین کر کے نشان لگا دیا اور باقی پلان جو اس کی ہدایات کے تحت ہی تیار ہوا تھا "او کے" کر دیا۔ باغ کے چاروں طرف چھوٹی چھوٹی چار دیواری جو سرخ کے خوبصورت ڈیزائن سے مزین ہو گی۔ گیٹ سے داخل ہوتے ہی گلاب اور چنبیلی کے قطعے اور چار دیواری کے ساتھ موسمی پھولوں کی کیاریاں۔ باغ کے وسط میں نصب بہت بڑے فوارے کی طرف جاتی ہوئی چھوٹی سرخ اینٹوں کی روشیں۔ روشوں کے دونوں اطراف میں مور پنکھ کے چھوٹے چھوٹے بوٹوں کی قطاریں۔ باغ کی چار دیواری کے ساتھ ساتھ سدا بہار درخت جن پر مختلف موسموں میں پھول آنے تھے۔ باغ کے مشرقی سرے پر مکمل طور پر ایئر کنڈیشنڈ ریسٹ ہاؤس کی عمارت جس کو وی آئی پی معیار کے مطابق آراستہ کیا جانا تھا۔ باتھ روموں میں امپورٹڈ فٹنگز دی جانی تھیں۔ اس ریسٹ ہاؤس کے بالمقابل سوئمنگ پول کے لئے جگہ تھی۔ وہاں موجود جوہڑ کو وقتی طور پر مٹی سے بھر دیا جانا تھا۔ باغ کے شمالی سرے پر بچوں کے لئے قطعہ رکھا گیا تھا جس میں جھولے اور سلائیڈز نصب ہونی تھیں تاکہ فیملی کے ساتھ آنے والے افسروں کے بچوں کی دلچسپی کا سامان ہو سکے۔

جب یہ باغ تیار ہو جائے گا تو یہ بے رنگ سا شہر دوسرے شہروں سے آنے والے افسروں کے لئے کم از کم قابلِ برداشت بن جائے گا۔ اس چھوٹے سے شہر میں سوئمنگ پول جیسی نعمت کا کون سوچ سکتا ہے۔ ڈی۔ سی شاہجہان نے مسکرا کر سوچا۔ بعد میں آنے والے یاد کریں گے کہ کوئی ڈپٹی کمشنر شاہجہان خان اس شہر میں آیا تھا۔

لیکن اس کے ذہن میں ایک خلش سی تھی۔ اس نے کئی بار اسے جھٹکنے کی کوشش کی لیکن وہ ایک بے نام سی کوفت کی صورت میں بار بار ذہن کے کسی کونے سے نکل آتی اور باغ کے پلان کا سارا مزا کرکرا کر دیتی۔ اس کی وجہ وہ ایک لمبی چوڑی درخواست تھی جو درجنوں دوسری درخواستوں کے ڈھیر کے اوپر دھری تھی ۔۔ کئی درخواستیں تھیں، کوئی نوکری کے لئے، کوئی ہسپتال کی ضرورت کے لئے۔ کسی میں گندے پانی کے جوہڑوں سے نجات کی خواہش تھی۔ کوئی گاؤں میں بجلی کی فراہمی چاہتا تھا۔ کسی میں سڑک کے لئے درخواست تھی۔ لیکن اس پختہ انگریزی میں لکھی گئی طویل درخواست نے براہ راست اس کے اعصاب کو متاثر کیا تھا۔ اس نے بے اعتنائی سے رد کر کے اسے ایک طرف ڈالنا چاہا تھا۔ لیکن دوبارہ پڑھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ ضروری القابات کے بعد اگر اس کا اردو میں ترجمہ کیا جائے تو کچھ یوں تھا:

"جناب والا۔ اتنا خستہ حال سکول: کیا اسے سکول کہا جا سکتا ہے؟ چند ٹوٹی پھوٹی دیواریں اور دو تین درخت جو چھت کا کام دیتے ہیں۔ بچوں کے بیٹھنے کے لئے نہ ٹاٹ نہ بیرطھی صرف دھول سے اٹی زمین۔ قوم کے نونہال، مستقبل کے پاکستانی جو اسی فیصد پاکستان ہیں، اسی زمین پر بیٹھ کر بے رحم موسموں کا مقابلہ کرتے ہوئے تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گرما کی دھوپ اور سردیوں کی شدت اور بارشوں کو برداشت کرتے ہیں کیونکہ ان کے والدین ان کو اپنی طرح جاہل نہیں دیکھنا چاہتے۔ لیکن کیا یہ کمسن بچے ان حالات میں تعلیم جاری رکھ سکتے ہیں؟ ایک تو معاشی بدحالی دوسرے تعلیمی سہولیات نہ ہونے کی وجہ سے بددلی۔ لہٰذا ان کی زیادہ تعداد پرائمری تک پہنچنے سے پہلے ہی تعلیم چھوڑنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ جناب والا۔ کسی بھی ترقی پذیر ملک میں محکمہ تعلیم کو ریڑھ کی ہڈی کا درجہ حاصل ہونا چاہیئے لیکن افسوس کہ اس ملک کے بیمار معاشرے میں تعلیم ریڑھی پر پڑے ہوئے کسی بغیر ہاتھ پاؤں کے بچے کی طرح ہے۔ کاش اسلام آباد، لاہور اور کراچی میں بیٹھ کر تعلیمی پالیسیاں بنانے والے کبھی ان پسماندہ علاقوں میں آکر بھی تعلیم کا حال دیکھتے، عالیشان سکولوں میں انعامات تقسیم کر کے ان سکولوں کو خراجِ تحسین پیش کرنے میں کبھی ان بغیر چھت کے سکولوں میں آکر (جن کی تعداد ہزاروں ہے) اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ ننھے منے ذہنوں میں جاگنے والی علم کی خواہش کو کس طرح پامال کیا جاتا ہے اور چمکتی پیشانیاں کس طرح جہالت کی سلاخوں سے ہمیشہ کے لئے داغی جاتی ہیں ۔۔ افسوس تو یہ ہے کہ عوام کے مسائل، ان کے لیے پالیسیاں بنانے والوں کے مسائل نہیں ہیں جن کے اپنے بچے بہترین اداروں میں بلکہ بیرون ملک بھی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور پاکستان کے یہ اسی فیصد بچے (شاید اس سے بھی زیادہ) جو ایک دفعہ تعلیم سے کٹ جاتے ہیں تو پھر ان کے سامنے عزتِ نفس سے عاری ایک بے ثمر زندگی کھڑی ہوتی ہے جس میں نہ خودی کی بلندی کا کوئی تصور ہوتا ہے نہ روحانی نشوونما کا کوئی راستہ ۔۔ بوجھ لادنے والے جانور کی حیثیت سے زندہ رہنے والے یہ لوگ محنت کی عظمت کے تصور سے عاری۔ ان میں سے جو نسلوں سے

پاؤں میں پڑی غربت کی بیڑیاں توڑنے کا تہیہ کر لیتے ہیں تو ان میں سے اکثر جرائم کے رستے پر چل نکلتے ہیں ۔ لاپروا اور خود غرض حکومتوں کے ہاتھوں چالیس سال سے مسلسل بوئے جانے والے ان زہریلے بیجوں کی فصل اب ایک تشدد پر مائل اور منفی اقدار کی حامل نسل کی صورت تیار ہے ۔ کیا اگلی نسل کا مقدر بھی یہی ہے ۔

جناب والا! مجھے اپنی ٹریننگ کے دوران بیرون ملک جانے کا اتفاق ہوا ۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں طالب علم اور بچے محترم ترین شہری سمجھے جاتے ہیں ۔ میں اپنے بچوں کے لئے اتنا نہ سہی لیکن کچھ نہ کچھ مقام ضرور مانگتا ہوں ۔ یہ کہنا کہ ہم تیسری دنیا کے ایک پسماندہ ملک سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا ہمیں یہاں کے بچوں کے لیے حقوق نہیں مانگنا چاہئیں' غلط ہے ۔ میں اسے تسلیم نہیں کرتا ۔ اپنے دعوٰی کی سچائی کے طور پر ایک ہی دن کے اخبار سے کاٹے گئے دو تراشے چسپاں کرتا ہوں ۔

۱۔ نور پور کے مسائل : یونین کونسل سرائے نعمت خان کا موضع نور پور جو کہ اس یونین کونسل سے صرف 3 کلومیٹر دور ہے گوناگوں مسائل کا شکار ہے ۔ بجلی پیسوال اور سلسٹاڑ تک پہنچ گئی ہے لیکن یہ موضع تاحال بجلی کی نعمت سے محروم ہے ۔ لوگ تربیلا ڈیم کی بجلی ایک طرف تربت اور مکران کے پہاڑوں میں اور دوسری طرف ہنزہ اور سکردو کے پہاڑوں میں جلا رہے ہیں لیکن تربیلا ڈیم سے صرف 8 کلومیٹر دور موضع نور پور اس نعمت سے محروم ہے ۔ یوں تو نور پور کے مقام پر طلباء کے لئے 1955ء کے خستہ حال پرائمری سکول کو مڈل کا درجہ دے دیا گیا لیکن کمرے ابھی تک مڈل کے برابر نہ بن سکے اور اس طرح معصوم اور چھوٹے چھوٹے بچوں کو سردیوں اور گرمیوں کے موسم میں نہایت تکلیف ہوتی ہے سردیوں کے موسم میں طلباء کو چھٹی دے دی جاتی ہے اور گرمیوں کے موسم میں وہ کھلے آسمان تلے ، درختوں کے سائے میں تعلیم کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں ۔ گراؤنڈ نہ ہونے کی وجہ سے طلبا نور پور کے گلی کوچوں میں کھیلتے ہیں اور یوں مقامی لوگوں کو سخت تکلیف ہوتی ہے ۔ سڑک جو کہ اپنے خرچ پر ستارہ چوک سے فدا حسین شاہ پل تک الحاج اسمٰعیل خان نے پہنچائی اسے براستہ جونیاں ٹھنڈا پانی لوہار دہ گلی کے ساتھ ملانے کی ضرورت ہے ۔ ہسپتال نہ ہونے کی وجہ سے بعض اوقات مریض ایڑیاں رگڑتے رگڑتے راستے میں ہی شہید ہو جاتے ہیں ۔ طالبات کے لئے ایک پرائمری سکول "ہنی" کے مقام پر منظور ہوا ۔ ٹھیکیدار آئے ڈھانچہ کھڑا کیا اور سکول کو تالا لگا کر چلے گئے ۔ اب پتہ نہیں وہ سکول کون سے سال شروع ہوگا ۔ یہ ہیں وہ مسائل جو کہ نور پور کے عوام کو درپیش ہیں لہٰذا میں علاقہ لوہر تناول کے اور ہزارہ کے وزیروں سے اپیل کرتا ہوں کہ اس علاقے کے غریب عوام پر رحم کھا کر انہیں کم از کم بنیادی سہولتیں ضرور بہم پہنچائیں تاکہ وہ ترقی کی راہ پر گامزن ہو کر خوشحال بن سکیں ۔

(یونین کونسل سرائے نعمت خان)

۲۔ اسلام آباد میں پولوگراؤنڈ اور پارک کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا
۵ کروڑ روپے کی لاگت سے تیار ہونے والا گراؤنڈ ۵ ماہ میں مکمل ہوگا

اسلام آباد (نامہ نگار) معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اسلام آباد کے ترقیاتی ادارے نے اسلام آباد کلب کے قریب ۶۰ ایکڑ رقبے پر محیط ایک پولوگراؤنڈ کی تعمیر کا کام شروع کر دیا ہے تیزی سے تکمیل کے مراحل طے کرنے والے اس گراؤنڈ پر لاگت کا تخمینہ دو کروڑ روپے ہے۔ ملک کی ایک اہم شخصیت کی ہدایت پر تعمیری کام انتہائی سرعت سے کیا جا رہا ہے۔ گراؤنڈ کی تیاری کے لئے ناہموار زمین پر تقریباً ۸ سے ۱۰ لاکھ فٹ مٹی بھرنی پڑے گی اور امید کی جا رہی ہے کہ آئندہ چند ماہ میں گراؤنڈ تیار ہو جائے گا۔ دریں اثنا وفاقی دارالحکومت کے سیکٹر ایف نائن میں بھی ایک بڑے پارک کی تعمیر کا کام شروع کر دیا گیا ہے جس پر کروڑوں روپے لاگت آئے گی یہ پارک اسلام آباد کے ماسٹر پلان میں شامل ہے اور اسے مختلف مرحلوں میں مکمل کیا جائے گا۔ ذرائع کے مطابق پولوگراؤنڈ کے منصوبے کی تعمیر کے بعد یہاں پر اعلیٰ نسل کے پولو والے قیمتی گھوڑے رکھنے کے لئے بھی انتظام کیا جائے گا۔ اسلام آباد کلب کی توسیع کا کام بھی تب تک مکمل ہو جائے گا اور امید ہے کہ دونوں کا افتتاح وزیر اعظم سے کرایا جائے گا۔

آخر یہ تضاد کیوں؟ یہ کس قسم کا دھوکا ہے جو اپنے آپ کو دیا جا رہا ہے۔ یہ تو اسی طرح ہے کہ جیسے کوئی شخص کئی روز کے فاقے سے ہو اور اسے روپے ملیں تو وہ ان سے کمرے کی سجاوٹ کے لئے گلدان خریدے۔

جناب والا۔ میں نے بیرونِ ملک سے آ کر اپنے اس پسماندہ علاقے میں سروس کرنے کو ترجیح دی تاکہ یہاں کے حالات کو سدھار سکوں۔ اپنی جمع پونجی سے سکول کے صرف ایک کمرے پر چھت ڈلوا سکا ہوں۔ اگر استطاعت ہوتی تو اپنے معیار کے مطابق اس سکول کو تعمیر کرتا۔ اب مجبوراً آپ سے درخواست کر رہا ہوں کہ کبھی آ کر اس سکول کا حال تو دیکھئے۔ کیا یہ سکول کہلانے کے لائق ہے؟ میری مؤدبانہ گذارش ہے کہ آپ خود بنفس نفیس آ کر سکول کا معائنہ فرمائیں۔ اس سکول کے سامنے ایک بڑا میدان خالی پڑا ہے جو بہتر مقاصد کیلئے استعمال ہو سکتا ہے۔ سکول میں توسیع کر کے اس کو ہائی سکول کا درجہ دیا جا سکتا ہے اور اس طرح ایک اچھے تعلیمی ادارے کی داغ بیل ڈالی جا سکتی ہے یہ خالی میدان ایک گندے پانی کے جوہڑ کی وجہ سے مچھروں اور بیماریوں کی آماجگاہ ہے۔ اس میں سکول کی نئی عمارت تعمیر کی جا سکتی ہے۔ بچوں کے لئے پلے گراؤنڈ بن سکتا ہے۔ امید ہے آپ تشریف لا کر مناسب احکامات صادر فرمائیں گے۔ شکریہ۔

نیازمند
عبدالمجید
ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ پرائمری سکول

"خالی میدان — یہ کس خالی میدان کی بات کر رہا ہے، بیوقوف" ڈی سی شاہجہان خاں نے کہا اور درخواست کو جھٹکے کے ساتھ دوسری درخواستوں کے ڈھیر پر ڈال دیا۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

وزیرِ اعلیٰ کے جلسہ عام کے دن قریب تھے اور باغ تقریباً تیار تھا۔ فوارے نصب ہو چکے تھے۔ ریسٹ ہاؤس میں ایئرکنڈیشنر لگ چکے تھے اور ان دنوں کارپٹ لگائے جا رہے تھے۔ باتھ روم بھی اس قدر خوبصورت تیار ہوئے تھے کہ ڈی سی شاہجہان خان کو ڈی سی ہاؤس کے باتھ روم ان کے مقابلے میں برے لگنے لگے تھے۔ اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ لگے ہاتھوں ڈی سی ہاؤس کے باتھ روم بھی بدلوا لیں۔ وزیرِ اعلیٰ کو اسی ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا جانا تھا۔ انہوں نے ایک رات اپنے عملے کے ساتھ وہاں قیام کرنا تھا۔ باغ میں رنگ برنگ کی چھتریاں نصب کی جا رہی تھیں اور رات کو روشنیوں کا انتظام کیا جانا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد گانے بجانے کا پروگرام تھا۔ ڈی سی شاہجہان خان باغ اور ریسٹ ہاؤس کا معائنہ کرنے آئے ہوئے تھے۔ مغلیہ طرز تعمیر پر بنایا ہوا ریسٹ ہاؤس مکمل ہو چکا تھا اور بہت دیدہ زیب نظر آ رہا تھا۔

"آپ نے ایسا کارنامہ کر دکھایا ہے سر، جو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ لوگ آپ کو برسوں تک یاد رکھیں گے۔ ان غریبوں نے یہ سب کہاں دیکھا تھا۔ شام کو دیوار کی جالیوں کے اوپر سے جھانک جھانک کر خوش ہوتے رہتے تھے۔ خدا آپ کو اجر دے گا۔ —— سر۔ میری ایک درخواست ہے کہ اس کا نام "شاہجہان گارڈن" رکھ دیں۔ آپ کا کیا خیال ہے سر، سارے عملے کی یہی رائے ہے۔" ڈی سی کے پرائیویٹ سیکرٹری نے کہا۔

"نہیں نہیں۔ یہ مناسب بات نہیں۔ نام تو بہت سے لوگوں نے تجویز کئے ہیں۔ کسی نے "فردوس بریں" کہا ہے "باغِ ارم" بھی کہا گیا ہے۔ ایم این اے صاحب نے "دلشاد گارڈنز" کہا ہے۔ کسی خاتون کے نام پر جو کبھی ...... لیکن میں ابھی سوچ رہا ہوں۔ آرام سے فیصلہ کروں گا۔ کوئی جلدی نہیں۔"

"سر یہ ہیڈ مالی بڑی دیر سے بات کرنا چاہ رہا ہے۔ اجازت ہو تو بلا لوں۔"

"ٹھیک ہے۔"

پی اے نے مالی کو اشارہ کیا۔ اور وہ جلدی سے لپک کر کئی دفعہ سلام کرتا ہوا آگے بڑھا۔

"ہوں" شاہجہان خان نے کہا

"عالی جناب۔ باغ بڑی محنت سے لگایا ہے۔ امید ہے حضور کو پسند آیا ہوگا۔ بڑی شو نکل آئی ہے۔ گھاس پھوٹنی شروع ہو گئی ہے۔ گلابوں پر بھی ڈوڈیاں آ گئی ہیں۔ لوگ لاہور کے باغوں کو بھول جائیں گے۔ پاکستان کا بہترین گلاب لگایا ہے۔" ہیڈ مالی نے پیلے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔"

"عالی جناب ایک عرض کرنی ہے۔"

"ہوں۔"

"یہ سامنے جو نظر بٹو کھڑا ہے۔ اس کا کچھ کریں۔"

"کیا مطلب" شاہجہان خان کو مالی کا بات کرنے کا انداز ناگوار گزر رہا تھا۔

"سر یہ سامنے جو ٹوٹا ہوا احاطہ سا ہے۔ اس سے باغ کی ساری شو خراب ہو رہی ہے۔ اس کا کوئی بندوبست کروا دیں۔

اپنے حکم سے جناب عالی۔"

شاہجہان خان نے خود بھی اس زرد مٹی سے لپی چار دیواری کا نوٹس لیا تھا لیکن نظرانداز کرنے کی کوشش کی تھی۔ اب مالی کے کہنے پر وہ عمارت اپنی تمام بدصورتی اور خستہ حالی کے ساتھ سامنے آکھڑی ہوئی۔

"ایسا کرو" شاہجہان خاں نے سوچتے ہوئے کہا "اس طرف اونچے اونچے پیڑ لگا دو تاکہ یہ چھپ جائے۔"

"لیکن سر، وزیراعلیٰ صاحب کے آنے تک تو درخت تیار نہیں ہو سکتے۔"

"ریسٹ ہاؤس کی کھڑکیاں بھی اس طرف کھلتی ہیں۔ یہ کچھ غلطی ہو گئی سر۔ ریسٹ ہاؤس باغ کی دوسری سائیڈ پر بنتا تو اچھا ہوتا۔" پی ایس نے کہا

"پھر کوئی تیزی سے بڑھنے والی باڑ لگا دو۔"

"باڑ تو لگ جائے گی سر۔ پر یہ احاطہ اس کے پیچھے چھپے گا نہیں۔ باڑ تو نیچی رہ جائے گی۔"

"تو پھر اپنا سر لگا دو ادھر پل کے اوپر ۔۔ میرا دماغ چاٹنے کیوں آگئے ہو۔ جانتے نہیں وہ سکول ہے۔ کیا سکول گرا دوں۔ سٹوپڈ ۔۔ فول ۔ جاؤ کام کرو جا کر۔" شاہجہان خان بھنا کر ریسٹ ہاؤس کے سامنے سے ہٹ گیا۔ پھر پلٹ کر اپنے سیکرٹری سے کہنے لگا "ایسا کرو۔ کوئی قنات وغیرہ لگا دو اس طرف۔ وزیراعلیٰ کی آمد پر یہ گند ہر حال چھپنا چاہیئے۔"

جاتے جاتے اس نے ایک بھرپور نظر اس خستہ حال عمارت پر ڈالی ۔۔ "گورنمنٹ پرائمری سکول" ایک دیوار پر موٹے موٹے حروف میں سیاہ رنگ کے ساتھ لکھا تھا۔

سکول کے دروازے کے پاس ایک شخص سفید شلوار قمیض اور واسکوٹ میں کھڑا تھا۔ اس نے عینک لگا رکھی تھی اور وہ شاہجہان خان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"۔۔۔۔ ضروری نہیں کہ وہی ہو ۔۔ جذباتی احمق ۔۔ لیکن مجھے کیا۔" شاہجہان خان منہ پھیر کر دوسری طرف پلٹ گیا۔ اس کے منہ کا مزا خراب ہو گیا تھا۔ غلطی ہو گئی ۔۔ بہت بڑی غلطی۔ ریسٹ ہاؤس کو باغ کے دوسرے سرے پر بنوانا چاہیئے تھا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ اس کی تعمیر کے دوران وہ ڈیڑھ ماہ کے لئے امریکہ چلا گیا تھا ورنہ وقت پر چیک کر لیتا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ عمارت نظر آتی ہی رہے گی۔ اس حسین ریسٹ ہاؤس کے مغلیہ طرز کے دریچوں سے یہ خستہ حال عمارت نظر آتی ہی رہے گی ۔۔ فواروں، سرسبز باڑوں، پھولوں بھرے درختوں قیمتی نیلی لائٹوں کی اوٹ سے اپنی تمام بدصورتی اور مفلسی کے ساتھ نظر آتی ہی رہے گی۔ شاید بعد میں کوئی درخت یا باڑ اس کو چھپا لے۔ یا بعد میں آنے والا کوئی ڈی سی اس کا حلیہ سنوار دے ۔۔ وہ خود تو وہاں سے جلد ہی کہیں اور پوسٹ ہونے والا تھا۔ اس کے پاس وقت نہیں تھا اور ابھی باغ کے نام کا مسئلہ باقی تھا ۔۔ اگر نام وزیراعلیٰ کے نام پر رکھ دیا جائے تو شاید ۔۔ شاید لاہور کی پوسٹنگ مل جائے۔

شاہجہان خان سوچتا ہوا سرخ اینٹوں کی روش پر آہستہ آہستہ چلتا بڑے فوارے کی جانب بڑھ گیا جہاں شفق کے گلابی رنگ اور نیلی لائٹس کے درمیان کنول کے پھول کی شکل کا فوارہ پرستانی سا ماحول پیش کر رہا تھا۔

ہوٹل سلازار

عطیہ سیّد

واشنگٹن سکوئر کے جنوب مشرقی کونے سے جو سڑک پھوٹتی ہے، اس پر چند فرلانگ کے فاصلے پر ہوٹل سلازار واقع ہے۔ یہ اس صدی کے اوائل کے طرزِ تعمیر کا نمونہ، ایک سادہ، بے رنگ عمارت ہے جس کی دیواریں مسلسل بارشوں سے کائی زدہ ہیں۔ اس کا اوپر والا حصہ کالے سیاہ رنگ کا ہے۔ سنا ہے کہ یہ بیس برس پہلے آگ کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ نجانے کیوں اسے اسی رنگ میں محفوظ کر دیا گیا، اور اب یہ خستہ حال سرمئی آخری منزل اپنی اندھی آنکھوں سے اردگرد کی جدید تر عمارتوں میں قدامت کی انفرادیت لیے، راہگیروں کی توجہ کھینچتی ہے۔

ہوٹل کی تنگ ڈیوڑھی میں داخل ہوتے ہی دائیں جانب لکڑی کا تنگ زینہ گزرے وقتوں کی یاد دلاتا ہے۔ بائیں جانب استقبالیہ (RECEPTION) کا لکڑی سے بنا ڈبہ نما کمرہ ہے جس کی کھڑکی ڈیوڑھی میں کھلتی ہے۔ اس کھڑکی میں ہر وقت یا تو تجیم شحیم جبشی مہماندار (RECEPTIONIST) یا موٹی توند والا برازیلین مینجر براجمان رہتا ہے۔ زینے اور اس لکڑی سے بنے ڈبہ نما کمرے کے درمیان ایک ننھی منی لفٹ موجود ہے۔ اگر کوئی چیز ہوٹل کی گذشتہ گھٹیا شان و شوکت کی یاد دلاتی ہے تو وہ ہوٹل کی یہی لفٹ ہے، جس کی اندرونی دیواروں پر سیاہی مائل کلیجی رنگ ویلوٹ منڈھی ہے۔ لفٹ کی تین دیواروں پر قدِ آدم آئینے بھی جڑے ہیں اور دروازے کا اہتمام یوں ہے کہ جب دونوں پٹ بند ہو جائیں تو دو نیم آئینہ یک جان ہو کر باقی تین دیواروں کی مانند ثابت و سالم قدِ آدم آئینے کا روپ دھار لیتا ہے۔ اس لفٹ کی خوبی یہ ہے کہ آپ نرگسیت کا شکار ہوں یا نہ ہوں اپنے عکس سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔

لفٹ بہت پرانی ہونے کے سبب ہر وقت کراہتی رہتی ہے۔ اس کے کل پرزے، چولیں، سب وقت کے ہاتھوں زخم خوردہ ہیں۔ اسی لیے یہ چوں چوں کرتی انتہائی سست روی سے اوپر کی طرف سفر کرتی ہے جیسے کوئی بڑھیا ہانپتی کانپتی چڑھائی چڑھ رہی ہو۔ ہوٹل کے اکثر گاہک اپنے حق میں بہتر سمجھتے ہیں کہ وہ لکڑی کے زینے سے اوپر نیچے آئیں جائیں۔ ویسے بھی لفٹ تنگیٔ داماں کی بنا پر ایک وقت میں صرف ایک مسافر بے سرو سامان کی متحمل ہو سکتی ہے۔ اگر مسافر مع سامان ہے تو وہ سامان کو بھیج سکتا ہے یا خود جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے یہ دونوں صورتیں عاقبت نااندیشی پر مبنی ہوں گی۔ اگر وہ سامان کو بھیجتا ہے تو اسے کون اتارے گا، اگر خود لفٹ میں چلا جاتا ہے تو سامان کیسے پہنچے گا۔ اس لیے اکثر گاہک لکڑی کے زینے کو آزماتے ہیں جو اپنی قدامت کے باوجود اتنا فراخ ضرور ہے کہ گاہک اور اس کے سامان دونوں کو سہار سکتا ہے۔

اوپر پہلی منزل پر پہنچنے کے بعد زینے کے دہانے سے دو کوریڈورز نکلتے نظر آتے ہیں۔ زینے کی بالکل سیدھ میں ایک لمبا بل کھاتا ہوا کوریڈور ہے، جس کے پیچ و خم کے سبب اس کا آخری سرا نظروں سے اوجھل ہے۔ جانے وہ کہاں جا کر ختم ہوتا ہے۔ دائیں جانب صرف دیوار ہے جس میں کوئی دروازہ نہیں۔ زینے کے بالکل ساتھ ہی لفٹ کا دروازہ ہے جس کے قریب سے زینہ بل کھاتا ہوا اوپر کی منزلوں کو چلا جاتا ہے۔ بائیں جانب جو کوریڈور ہے وہ آگے جا کر ایک لمبی گیلری کے ساتھ جڑتا ہے۔ اس میں کئی گیلریوں کے دروازے کھلتے ہیں

جو اس مرکزی گیلری کے ذریعے ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ باقی تمام منزلوں پر اسی نقشے کی تکرار نظر آتی ہے غرضیکہ کوریڈورز اور گیلریوں کی بھول بھلیاں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہوٹل سلازار کی تنگی کا جو تاثر اس کی ڈیوڑھی سے پیدا ہوتا ہے درحقیقت صحیح نہیں۔ اس کا گراؤنڈ فلور یعنی ڈیوڑھی والا حصہ یقیناً رقبے میں بے حد محدود ہے، لیکن جوں جوں ہم اوپر کی طرف جاتے ہیں اس کے پھیلاؤ میں پراسرار طریقے سے اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ شمالاً جنوباً، شرقاً غرباً، کمرے گیلریوں کے ذریعے سے ملے ہوئے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ کوریڈورز اور گیلریوں کا ایک معمہ بکس تیار کیا گیا ہے جس میں انسان بالکل اسی طرح بھٹک سکتا ہے جس طرح ماہرین طبیعیات کی تجرباتی بھول بھلیوں میں چوہا۔ بظاہر ہوٹل سلازار کی تعمیراتی ساخت کا اندازہ لگانا ممکن نہیں لیکن اس کے اندر گھومنے کے بعد تصور کی آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے کہ یہ ایک تکون کی طرح ہے جو اپنے کسی کونے پر سیدھی کھڑی ہو یا جیسے اہرام اپنی نوک کے بل کھڑے ہوں۔ غالباً یہ امریکن تجارتی ذہن کی توسیع پسندی کے رویے کا کرشمہ ہے کہ سلازار کے مالک کو جس ملحقہ عمارت کا کوئی اپارٹمنٹ حاصل ہوا وہ اسے ہوٹل میں شامل کرتا گیا اور گیلریوں کے ذریعے باہم ملاتا چلا گیا۔

مختلف منزلوں میں جو گیلریاں اور کوریڈورز ہیں ان میں گھسی پٹی دریاں بچھی ہیں جو جوتوں کی مسلسل رگڑ سے تار تار ہیں۔ ان دریوں کا کوئی خاص مقصد سمجھ میں نہیں آتا سوائے عذرِ زیبائش کے، جسے پورا کرنے میں یہ ناکام ہیں۔ گیلریوں کی دیواروں پر جو وال پیپر چڑھا ہے، وہ کبھی نکھرے آسمانی رنگ کا ہوگا، لیکن اب وہ مٹیالے نیلے رنگ میں ڈھل چکا ہے۔ اس وال پیپر پر ننھی جل پریوں کا نقش ہے، جو اس قدر گھس پٹ گئی ہیں کہ اپنے پیکر سے محروم ہو چکی ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ زمانے کے ہاتھوں کسی کا سر غائب ہے اور کسی کا دھڑ۔ عموماً آنے جانے والوں کو اتنی فرصت نہیں کہ وہ اس گھسیلی مخلوق کی طرف توجہ دے سکیں، لیکن کبھی ان پر بھولے سے نظر پڑ جائے کہ دل دہل جاتا ہے کہ دیکھنے والا شخص اپنے آپ کو سینکڑوں عجیب الخلقت اپاہج جل پریوں کے غول در غول میں گھرا پاتا ہے۔

بہزاد جب نوکری کی تلاش میں اس شہر میں وارد ہوا تو اس کی جیب بھاری تھی، چنانچہ وہ لنکن سنٹر کے بالمقابل ایک اونچے متوسط درجے کے ہوٹل میں آ کر اترا۔ مگر جوں جوں دن گزرتے گئے، نوکری ناپید رہی اور جیب ہلکی ہونے لگی تو اسے کسی ایسے ہوٹل کی جستجو ہوئی جو کم کرایے پر کمرے اٹھاتا ہو۔ بعد از بسیار دقت و تلاش اُسے گوہرِ مقصود ہوٹل سلازار کی شکل میں نصیب ہوا۔ اسے محض اتفاق کہیے یا خوبیٔ تقدیر سمجھیے کہ جس دن بہزاد نے پوچھا اُسی دن ایک کمرہ موجود تھا ــــ وہ فوراً وہاں اُٹھ آیا۔ یجیم حبشی نے اسے بتایا کہ جو کمرہ خالی ہے وہ چودھویں منزل پر واقع ہے۔ جب بہزاد اپنا سامان ڈیوڑھی میں حبشی کے حوالے کر کے کمرہ دیکھنے کی غرض سے لفٹ کے ذریعے اوپر جانے لگا، تو اُسے بے حد حیرت ہوئی کہ لفٹ میں منزلوں کی نمبر پلیٹ پر بارھویں منزل کے فوراً بعد چودھویں منزل کا نمبر لکھا تھا۔ اس نے سوچا کہ غلطی سے تیرھویں کو چودھویں لکھ دیا گیا تھا۔ اگرچہ اس قوم کی میکانکیت کی حد تک مکمل کارکردگی کی استعداد سے اس قسم کی غلطی کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ پھر بھی انسان انسان ہے اور خطا کا پتلا ہے۔ اس لیے بہزاد نے اپنی تیسری دنیا کی قدیم سوچ کے مطابق اسے انسانی کوتاہی جان کر کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ البتہ جب وہ ہوٹل کے عملے سے بات کرتے ہوئے کہتا کہ اس کا کمرہ تیرھویں منزل پر ہے تو وہ "لاحول" پڑھتے ہوئے غائب ہو جاتے۔ آخر اس سے رہا نہ گیا اور ایک دن اُس نے ہوٹل کے برازیلین مینیجر سے یہ پہیلی بجھوانے کی کوشش کی۔ مینیجر نے اُس کے سوال کے جواب میں اگرچہ "احمق" یا "جاہل" کا لفظ استعمال نہیں کیا، لیکن اس کی آنکھوں سے ظاہر تھا کہ وہ اُسے احمق یا جاہل یا دونوں کی آمیزش خیال کر رہا تھا۔ پھر بھی مینیجر نے زیادہ علم رکھنے کی بنا پر احساسِ برتری کے تحت اس پر یہ منکشف کیا کہ بے وقوف کیا تم نہیں جانتے کہ تیرہ کا عدد منحوس ہوتا ہے، اس لیے یہاں کسی عمارت میں بھی تیرھویں منزل کا ذکر نہیں ہوتا، بلکہ تیرھویں کو چودھویں کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

بہزاد کی سمجھ میں یہ منطق نہ آئی کہ اگر تیرھویں منزل موجود ہوتی نہ ہے تو اس کے چودھویں پکارنے سے آئی بلا کیسے ٹل جاتی ہے۔ بہرحال یہ منکشف ہوگیا کہ چاند پر پہنچنے والے انتہائی ترقی یافتہ امریکن ویسے ہی توہم پرست ہیں جیسے برصغیر کے کسی پسماندہ گوشے میں بسنے والے جہاں اب تک کوروؤں پانڈوؤں کی رتھ گڈ اور ریڑے کی شکل میں چل رہی ہے۔ اس طرح خلائی دور اور قرونِ اولیٰ کا باہم فاصلہ گھٹ کر صفر رہ جاتا ہے۔

جب بہزاد اپنے کمرہ میں پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ اُس نے بجلی کا بٹن دبا کر کمرے میں روشنی کی تو اس کا دل دہل گیا۔ کمرے کی دیواریں پُرہیبت سیاہ رنگ کی تھیں۔ کھڑکی سڑک کی جانب کھلنے کے بجائے ساتھ والی بلڈنگ کی چھت پر کھلتی تھی جس کی چادر زنگ کی وجہ سے کہیں سے بھورے رنگ کی تھی، اور بارش کا پانی جمع ہو جانے کے سبب کہیں سے سیاہ تھی اس کھڑکی میں جو شیشے لگے تھے وہ چھوٹے چھوٹے رنگ برنگے ٹکڑوں کی صورت میں تھے۔ لیکن کالی دیواروں کے پس منظر میں آگ کے دہکتے انگاروں کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔ کمرے میں ایک پلنگ، ایک تپائی، ایک کرسی اور ایک الماری تھی۔ کمرہ صاف ستھرا ہونے کے باوجود بہزاد کو بوسیدگی کے علاوہ عجیب طرح کی گھٹن کا احساس ہوا۔ کمرے میں کپڑوں کے ایسے بند ٹرنک کی سی بو تھی جسے بڑی مدت کے بعد کھولا گیا ہو۔ اس نے الماری کھولی تو اس میں سے بھی بند بو آرہی تھی۔ اُس نے فوراً الماری بند کردی۔ بستر میں بھی کافور کی گولیوں کی مہک تھی۔

بہزاد کو کمرے کی ہر چیز سے کراہت محسوس ہو رہی تھی۔ حالانکہ وہ بڑی محنت سے صاف کی گئیں تھیں۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا سو بستر پر لیٹ گیا، مگر نیند اُس سے کوسوں دور تھی۔ وہ سوچنے لگا آخر اسے اس کمرے اور اس میں رکھی ہر چیز سے تنفر کا احساس کیوں ہو رہا ہے جبکہ اس کی کوئی ٹھوس وجہ موجود نہیں۔ یقیناً یہ کمرہ آتش زدگی کی باقیات میں سے تھا لیکن اسے اُسی حالت میں محفوظ رکھنے کا کیا جواز تھا۔ بھلا کون اس کے آسیب زدہ ماحول میں رہنا پسند کرے گا۔ شاید ہوٹل کے مالک کو اس میں کوئی خاص کشش اور انوکھا پن محسوس ہوتا ہو۔ ویسے بھی اس ملک کے باسیوں کا احساس جمال ناقابل فہم ہے۔ جن چیزوں کو عموماً بھدا، بدصورت حتیٰ کہ کریہہ المنظر سمجھا جاتا ہے، یہ انہیں حسین، خوبصورت اور دلفریب تصور کرتے ہیں۔

بہزاد ساری رات عجیب کیفیت سے گذرا۔ ایک انجانے خوف سے اُسے ٹھنڈے پسینے آتے رہے، بالآخر وہ تھک ہار کر سویا بھی تو ایسی نیند کہ ذہن نیم بیدار تھا۔ وہ صبح سویرے اُٹھ گیا۔ انگ انگ ٹوٹ رہا تھا۔ سر میں شدید درد تھا۔ سوچا کہ تازہ دم ہونے کے لئے غسل کرلیا جائے۔ اس غرض سے جب غسل خانے گیا تو لاحول پڑھ کر پلٹ آیا۔ ہر چند کہ غسل خانے کی ہر چیز صاف ستھری تھی، لیکن اتنی پرانی تھی کہ گندگی کا تاثر دیتی تھی۔ ٹب، سنک اور فلش کی چینی جگہ جگہ سے اُکھڑ چکی تھی اور نیچے سے زنگ آلود سیاہی جھانک رہی تھی اس پر طرہ یہ کہ صفائی کے باوجود ناقابلِ برداشت بو آرہی تھی جیسے مردہ چوہے کا تعفن۔

آخر بہزاد کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ وہ بڑبڑاتا ہوا مینجر کے پاس پہنچا اور سارا ماجرا کہہ سنایا۔ موٹی توند والے برازیلین مینجر کو یقین تو نہ آیا کہ کوئی مردار چوہا غسل خانے میں لیٹا بدبو کے بھبکے اڑا رہا ہے، مگر بہزاد کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کے خیال سے اُس نے جنیٹر کو اُس کے ساتھ غسل خانے میں بھیجا تاکہ بدبو کا معمہ حل کیا جاسکے۔ جنیٹر نے لاکھ کوشش کی، کسی مردہ تو کیا کسی زندہ چوہے کا سراغ بھی نہ مل سکا۔ لیکن بہزاد اتنی جلد ہار ماننے کو تیار نہ تھا۔ اُس نے تہیہ کر لیا تھا کہ اس جھلسے ہوئے آسیب زدہ کمرے، بندبو والے بستر اور مرے ہوئے چوہے کے تعفن سے ہر صورت چھٹکارا حاصل کرے گا۔ سو وہ دوبارہ مینجر کے پاس پہنچا اور کچھ اس موثر اور قابلِ رحم انداز میں اپنی وکالت کی کہ اس کا دل پسیج گیا اور اُس نے پہلی منزل پر ایک ننھے منے سے کمرے کی پیش کش کی۔ بہزاد فوراً راضی

ہوگیا۔ اُس نے سوچا کہ ہر کمرہ اس کمرے سے بہتر ہوگا۔ چنانچہ وہ مینیجر سے چابی لے کر اپنا بکس اٹھائے ہوئے نئے کمرے میں آن پہنچا۔

یہ انتہائی چھوٹا یعنی ۷×۷ فیٹ کا کمرہ تھا جس میں بمشکل ایک بیڈ رکھا جا سکتا ہے۔ بیڈ کے علاوہ اس میں صرف ایک کرسی تھی اور بس۔ کمرے کی کل اوقات یہی تھی۔ اس کمرے سے منسلک غسل خانہ اعلیٰ درجے کا نہ سہی، مگر کم از کم قابل برداشت تو تھا۔ کمرے میں دو پٹوں والی ایک کھڑکی تھی جو باہر سڑک کی جانب کھلتی تھی۔ اس کھڑکی سے واشنگٹن سکوئر کے کچھ حصے کا نظارا بھی ممکن تھا بشرطیکہ کھڑکی میں سے اچک کے سر باہر نکال کر دیکھا جائے۔ اس کے علاوہ بستر پر لیٹے ہوئے کھڑکی سے سامنے والے چرچ کی بیل فری کا مینار بھی دکھائی دیتا تھا۔

بہزاد کو اس نئے کمرے میں منتقل ہوئے کئی روز بیت گئے۔ جوں جوں وقت گزرتا چلا گیا، مسافتوں کے در کھلتے چلے گئے، بہزاد ناسٹیلجیا کی زد میں آتا چلا گیا۔ اس اژدہا کی طرح بہت بڑے کاسموپولیٹن شہر کے روزمرہ سے بے ربطی کا احساس شدت اختیار کرتا چلا گیا۔ جتنا یہ احساس گہرا ہوتا گیا، اتنا ہی اپنے دیس کی یاد کسک کی شکل میں ڈھلتی گئی۔ شاید ان دونوں کے درمیان "برابر تناسب" کا رشتہ تھا۔ فاصلے ویسے بھی جذبوں کو منکشف کرتے ہیں۔ زیادہ قربت مانع بصارت اور قاطع بصیرت ہوتی ہے۔ جب گھر میں رکھی اشیاء ہر روز اپنے مقام پر ملیں، تو آہستہ آہستہ اپنی مانوسیت کی بنا پر جاذبِ توجہ نہیں رہتی ہیں، لیکن ان میں سے کوئی چیز اپنی جگہ سے غائب ہو، تو اس کی عدم موجودگی بری طرح کھٹکتی ہے۔ کچھ ایسی ہی صورت حال بہزاد کی تھی۔ جب وہ وطن میں تھا تو اس کی ہر چیز سے بیزار تھا، اور اب ان تمام چیزوں کے لیے بے قرار جنھیں اُس نے کبھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ پان سے اس نے ہمیشہ تنفر محسوس کیا، لیکن اب بعض دفعہ بیٹھے بٹھائے اس کی زبان پان کے پتے کا ذائقہ محسوس کرتی اور سونف سپاری کی خوشبو اس کے نتھنوں میں کہیں سے آ بستی۔ ایک دن ٹائم سکوئر کے قریب چلتے چلتے اچانک جانے کہاں سے چنبیلی موتیے اور گلابوں کی مہک اس کے ساتھ ہو لی۔ راتوں کو اکثر اُسے اپنے کمرے میں بستر پر لیٹے لیٹے نیچے سڑک پر لوگ اردو بولتے سنائی دیتے، جس پر وہ فوراً بستر سے اُٹھ کر کھڑکی سے جھانکتا، اور اسے بڑی مایوسی ہوتی یہ جان کر کہ نیچے سڑک پر اردو میں نہیں، انگریزی گفتگو ہو رہی ہے۔ اکثر اوقات صبح سویرے نیم بیداری میں وہ محسوس کرتا جیسے وہ اپنے دیس میں، اپنے گھر میں لیٹا ہوا ہے۔

غرضیکہ بہزاد کے دل و دماغ مکمل طور پر ناسٹیلجیا کی دلدوز گرفت میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس کے اعصاب مغلوب ہوتے جا رہے تھے۔ وہ عموماً غنودگی حالت میں رہتا۔ صبح جب گھڑی الارم بجاتی تو وہ آنکھیں کھولتا لیکن اس کا وجود ہلنے سے انکاری ہو جاتا، اس کے پپوٹے بند ہو جاتے، ذہن نیم غنودگی حالت میں ہوتا، اور جسم کے پٹھے مزید آرام کی خواہش میں ڈھیلے پڑ جاتے۔ یہ کیفیت سارا دن اس پر طاری رہتی، اور وہ اکثر بارہ بجے سے پہلے اُٹھنے کے قابل نہ ہوتا۔ اس نیم بیداری، نیم غنودگی کی نباتاتی حالت میں اس کا ذہن گم گشتہ ماضی کے پچھتاوے سے محفوظ رہتا۔ شاید یہ اس کے وجود کا دفاعی ہتھکنڈا تھا۔

اگرچہ بارہ بجے کے قریب اس کی آنکھ کھل جاتی، مگر روزمرہ میں شرکت سے گریز اب بھی موجود رہتا، سو وہ بستر پر لیٹے لیٹے کھڑکی سے باہر سامنے سکوئر کی پرلی طرف واقع چرچ کی بیل فری کو تکتا رہتا، جس میں لگی دیو ہیکل گھنٹی جب بج اٹھتی تو فری بیل میں بسیرا کرنے والے سفید کبوتر غول در غول پھڑپھڑاتے ہوئے بیل فری کی چاروں کھڑکیوں سے طوفان کی طرح پھٹ پڑتے اور آسمان کو پل بھر کے لیے برف کے گالوں کی طرح سفید کر ڈالتے۔ جانے کیوں بہزاد کو ان کبوتروں کو دیکھ کر بہاء الدین زکریا کے مزار کے گنبد پر اڑنے والے کبوتر یاد آتے جن کی ڈاریں چراغ والے صحن میں دانہ چگنے اترتی تھیں۔

ایک دن اسی کیفیت میں اُسے ساتھ والے کمرے سے باتوں کی آواز سنائی دی۔ اس کے اور ساتھ والے کمرے کے درمیان جو دیوار تھی وہ اس قدر پتلی تھی کہ آواز صاف آرہی تھی۔

"ہیلو لنڈا۔ سویٹ ہارٹ! ہاؤ آر یو؟"

غالباً فون پر گفتگو ہو رہی تھی، کیونکہ جواب میں مخاطب کی آواز نہیں آرہی تھی۔

"ہاں میں، میں ٹھیک ہوں۔"

گفتگو جاری رہی۔ "کیا؟ آج کل کیا لکھ رہا ہوں؟ ایک پرتگالی لڑکی اور سیاہ فام کی داستان۔ سیاہ فام کو ایک پرتگالی لڑکی سے بے پناہ محبت ہے اور وہ اسے پا بھی لیتا ہے، مگر وصل کی قربت ہی سے فراق کی شدت جنم لیتی ہے، جس کی کہانی میں لکھنا چاہتا ہوں۔ کیا کہا؟ وصل سے فراق کیسے؟ وہ یوں، لنڈا ڈیر! کہ پرتگالی طبعاً قنوطی ہوتے ہیں اور سیاہ فام بنیادی طور پر خوش طبع اور رجائی۔ اسی لئے ان کے تمدن کی روح اتنی مختلف ہے۔ یہی تمدنی اور نفسیاتی فاصلے ان کے درمیان بڑی ڈھٹائی سے حائل ہیں جن کا احساس اُس وقت زیادہ شدت سے ابھرتا ہے، جب دونوں فریق ایک ہی چھت تلے زندگی بسر کرنا شروع کرتے ہیں اور ان کے جسمانی ملن سے روحانی بیراگ جنم لیتا ہے ——"

"کیا؟ ہاں۔ یہ ایک مسحور کن موضوع ہے۔"

"اچھا۔ خدا حافظ۔ مجھے ابھی بہت سا کام کرنا ہے۔ پھر بات ہوگی۔ بائی ——"

کچھ دنوں تک بہزاد کو ساتھ والے کمرے میں ہونے والی روزمرہ کی گفتگو سننے کا موقع نہ مل سکا یا شاید گفتگو ہوئی ہی نہ ہو۔ غالباً کہانی نگار کمرے میں موجود نہیں تھا یا پھر اتنا مصروف کہ اُسے اپنی دوست لنڈا کو فون کرنے فرصت ہی نہ تھی۔ عموماً تخلیق کار جب کسی تخلیق کی زد میں ہوتا ہے تو تخلیقی عمل اُسے شاذ و نادر ہی معاشرتی میل جول اور رسمیات کی مہلت بخشتا ہے —— یہ بھی ممکن تھا کہ وہ سلازار سے جا چکا ہو۔

کافی عرصے بعد ایک دن بہزاد کو کہانی نگار کی آواز پھر سنائی دی۔ وہ حسب معمول لنڈا سے محو گفتگو تھا اور اپنی تحریروں کا ذکر کر رہا تھا۔

"یس۔ لنڈا ڈارلنگ! وہ پرتگالی اور سیاہ فام کی کہانی —— ہاں مکمل ہو گئی ——" اور پھر بہزاد کو کھسیانی ہنسی کی آواز آئی۔ "خیر۔ اس کا تذکرہ اب کیا۔ سنو، اس وقت میں نیویارک کے ٹی۔ وی نیٹ ورک نمبر ۲ کے لیے ایک سیریل لکھنے کی سوچ رہا ہوں۔ کیا؟ —— وہ کس قسم کا ہوگا؟ —— وہ سینٹ ہلز بلیو کی طرز پر لکھا جائے گا۔ مرکزی خیال؟ —— امریکن نوجوانوں میں ۱۹۶۰ء کے اردگرد جو تشخص کا بحران پیدا ہوا تھا اس کے سیاق و سباق پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا۔"

پھر ذرا توقف سے کہانی نگار بولا۔ "بس لنڈا میرے لیے دعا کرو کہ میں اس خیال کو خوبصورتی سے تحریر کر سکوں —— تم ایسا کرو گی —— یقیناً —— شکریہ مجھے خوش قسمتی کی انتہائی ضرورت ہے ——" اور پھر فون بند ہو گیا۔

ابھی تک بہزاد کو کہانی نگار کی شکل و صورت دیکھنے کا موقع نہ ملا تھا، اگرچہ وہ اس کا اور لنڈا کا مکالمہ اکثر سنتا تھا۔ لیکن ایک دن اُس نے کہانی نگار کو دیکھ ہی لیا۔ وہ اپنے کمرے سے نکل رہا تھا۔ بہزاد کو اپنی طرف متوجہ پایا تو اُس نے رسمی انداز میں مسکرا کر "ہائے" کہا۔ وہ ایک لانبے قد، چھریرے بدن، کریو (CREW) کٹ بالوں والا سادہ لوح سا شخص دکھائی دیتا تھا، جس نے ٹخنوں تک لمبا اوور کوٹ اور ہیٹ پہنے ہوئے تھے۔ اُس دن کے بعد وہ اکثر اُسے کوریڈور، لفٹ یا ہوٹل کی ڈیوڑھی میں ملتا اور رسمی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے

ہوئے، موسم کا ذکر کرتے ہوئے، ہلکورے کھاتے ہوئے تیزی سے اُس کے پاس سے گذر جاتا۔

کہانی نگار کا کمرہ بہزاد کے کمرے سے پہلے آتا تھا اس لیے بہزاد کو اپنے کمرے سے باہر جانے اور باہر سے اپنے کمرے کی طرف آنے کے لیے اُس کے کمرے کے سامنے سے گذرنا پڑتا تھا۔ وہ اکثر کہانی نگار کے کمرے کا دروازہ بند پاتا۔ مگر ایک دن جب وہ باہر جانے کے لیے کوریڈور میں سے گذر رہا تھا، تو اُس نے دیکھا کہ کہانی نگار کے کمرے کا دروازہ نیم وا تھا۔ تجسس نے اس کے پاؤں پکڑ لیے اور وہ بڑی دلچسپی سے کمرے کے اندر دیکھنے لگا۔ کہانی نگار مسلے ہوئے کاغذوں کے ڈھیر بیچ، فرش پر آلتی پالتی مارے گھٹنے پر کہنی ٹکائے، ہتھیلی پر ٹھوڑی جمائے کسی گہرے سوچ میں غرق اپنی دھن میں مگن بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بہزاد کی کھنگی نے اسے چونکا دیا۔ اُس نے ادھ کھلے دروازے میں سے بہزاد کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اداسی اور لبوں پر کھسیانی ہنسی تھی۔ اس سے پہلے کہ بہزاد ردی کے اُس ڈھیر کا راز دریافت کرتا جس کے بیچوں بیچ وہ براجمان تھا، وہ خود ہی بولا—— "دراصل میں کہانی لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

اس نے بڑی بے چارگی سے بکھرے ہوئے کاغذوں کے انبار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ عجیب واردات ہے کہ نازک سبک سوچیں الفاظ کے قالب میں ڈھل کر جب کاغذ پر سیاہ نقش کی صورت ابھرتی ہیں تو وہ بھدی، بے ڈول اور بے معنی ہو جاتی ہیں۔ جذبے عریانی اظہار کے بعد کس قدر بے جان اور افسردہ لگتے ہیں۔ خود مجھے ان کے جھوٹ کا یقین ہونے لگتا ہے—— اور ایک بے تکے پن، عجیب شرمندگی، اور خجالت کا احساس، جیسے میں بھرے بازار بیچ، لوگوں کے ہجوم کے سامنے گر پڑا ہوں اور کیچڑ سے لت پت ہو گیا ہوں —— ایک احساسِ زوال مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔"

"اور لنڈا—— ؟" بہزاد نے پوچھا۔

"ہاں۔ لنڈا؟" کہانی نگار نے چونک کر اُسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے دوہرایا۔

یکدم بہزاد کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اُسے یاد نہ رہا تھا کہ احترامِ خلوت کے آداب کے پیشِ نظر اُسے کہانی نگار اور لنڈا کی باتیں سننی نہیں چاہیے تھیں۔ لیکن کہانی نگار نے اپنے خلوت کے حق کی پامالی پر متوقع چڑچڑاہٹ کے بجائے عجیب گمبھیرتا سے جواب دیا۔ "میرے کمرے میں تو کوئی فون نہیں ہے۔"

اس بار بہزاد بھونچکا سا رہ گیا، کیونکہ کمرے میں نظر ہر طرف دوڑانے پر اُسے واقعی کہیں کوئی فون دکھائی نہ دیا۔

"تو اس کا مطلب ہے——"، بہزاد نے افسردہ حیرت سے باقی جملہ ہوا میں لٹکتا چھوڑ دیا۔ اُسے معصوم آنکھوں والے کہانی نگار پر بے حد رحم آیا، جو اتنا اکیلا تھا کہ اس بھرے شہر میں ایک خیالی دوست سے نادیدہ فون پر پہروں باتیں کرتا تھا—— اور اتنا بے بس تھا کہ لفظ اس کا ساتھ نہیں دیتے تھے۔ بہزاد کو ایک ناقابلِ فہم احساسِ ضیاع ہوا، اور اُس نے اداس شائستگی کے ساتھ کمرے کے کھلے دروازے کو بند کر دیا۔

اگلے دن بہزاد کہانی نگار کے کمرے کے سامنے سے گذرا تو صفائی کرنے والی عورت کو کمرے کی صفائی کرتے اور مسلے ہوئے کاغذوں کا ڈھیر پولتھین بیگ میں ڈالتے ہوئے دیکھا۔ گھڑی بھر کو بہزاد کمرے کے کھلے دروازے کے سامنے ٹھٹک گیا۔ صفائی کرنے والی عورت نے سر اٹھا کر اُسے غور سے دیکھا، پھر وہ جیسے اس کا عندیہ بھانپ گئی، کہنے لگی "وہ یہاں نہیں ہے۔ آج صبح سویرے اپنا بل ادا کرنے کے بعد ہوٹل چھوڑ گیا ہے۔"

"کہاں گیا ہے؟" بہزاد کے منہ سے بے ساختہ یہ سوال نکلا۔ غالباً یہ سوال صفائی کرنے والی کو احمقانہ اور ناپسندیدہ لگا کیونکہ اُس نے بڑی رکھائی سے جواب دیا "مجھے کیا معلوم؟"

اس پر بہزاد کو خیال آیا کہ کسی کی نقل و حرکت سے دلچسپی رکھنا یہاں کے آدابِ شائستگی کے خلاف تھا. نتیجتاً وہ خاموش ہوگیا اور کوریڈور میں لفٹ کی سمت چلنے لگا مگر اُسے کہانی نگار کی رخصتی سے ناقابلِ تشریح آزردگی ہو رہی تھی جیسے کوئی برسوں کا آشنا بچھڑ گیا ہو۔

ایک رات بہزاد سونے کی ناکام کوشش کر رہا تھا کہ اُسے سڑک سے لڑائی جھگڑے کی آوازیں سنائی دیں۔ اس نے اٹھ کر کھڑکی سے نیچے جھانکا۔ رات کے اس پہر سڑک سنسان پڑی تھی۔ کھڑکی کے عین نیچے فٹ پاتھ پر بھی کوئی نہیں دکھائی دیتا تھا. پھر بہزاد کو خیال آیا کہ شاید آوازیں ہوٹل کی ڈیوڑھی سے آ رہی تھیں، کیونکہ اس کا کمرہ ڈیوڑھی کے اوپر پہلی منزل پر واقع تھا اور کھڑکی عین صدر دروازے پر کھلتی تھی۔ اگرچہ صدر دروازے کے چھجے کی وجہ سے دروازے میں کھڑے لوگ نظر نہیں آتے تھے۔

اتنے میں آواز آئی "مجھے معلوم ہے کہ تم مجھ سے کیوں جلتے ہو" کسی نے سیٹی کی طرح چیختی ہوئی آواز میں کہا۔

"وہ بھلا کیوں؟" دوسرے نے پھنکارتے ہوئے پوچھا۔

"اس لیے کہ تم میرے رنگ سے جلتے ہو. یہ تمہارا کومپلکس ہے جو تم سے یہ سب کچھ کروا رہا ہے۔"

"اچھا، اور بھلا وہ کونسا رنگ ہے جس کی وجہ سے مجھے کومپلکس ہے" غصے سے دانت پیستے ہوئے دوسرا شخص بولا۔

اب بہزاد نے پہچان لیا تھا کہ یہ آواز ہوٹل کے حبشی کی تھی۔ ذہن پر ذرا زور دینے سے اُس نے شناخت کر لی کہ پہلی آواز ایک مدقوق نشئی کی تھی جس سے اکثر اس کی مڈبھیڑ زینے پر یا لفٹ میں ہوتی. یہ ایک مخنی پیلی آنکھوں، پیلے دانتوں والا میلا کچیلا سفید فام تھا جو اپنے یرقان زدہ وجود کے ساتھ آسیب کی طرح سلازار کے اردگرد منڈلاتا رہتا تھا۔

اتنے میں پھر آواز آئی "میرا رنگ سفید ہے اور تمہارا کالا. یہ ایک حقیقت ہے جسے تم جھٹلا نہیں سکتے، اور اسی لیے تم مجھ سے نفرت کرتے ہو۔"

ان کے درمیان نسل در نسل پھلتی پھولتی ہوئی نفرت ان کی آوازوں میں امنڈ آئی تھی۔

"بکواس بند کرو ورنہ ــــ" غصے سے رندھی ہوئی آواز میں حبشی نے چلاتے اور غالباً نشئی کو گریبان سے پکڑتے ہوئے کہا۔

"تم ایسا نہیں کر سکتے، کیونکہ میں نے کمرے کا ایک دن رات کا پورا کرایہ ادا کیا ہے ــــ پورے اکیس ڈالر، اس لیے مجھے حق ہے کہ میں پورے چوبیس گھنٹے کمرے میں گذاروں" نشئی نے اپنے نحیف پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چیخ کر کہا۔

جواب میں کچھ ایسی آوازیں آئیں جیسے ہاتھا پائی ہو رہی ہو. پھر قوی الجثہ حبشی نے اپنے آبا و اجداد سے ورثے میں ملی ہوئی قدیم طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے سفید فام نشئی کو اٹھا کر سڑک پر پٹخ دیا۔ وہ غالباً نشے کی ہذیانی سرمستی میں تھا سو سڑک پر لڑھک کر دوسرے کنارے کے فٹ پاتھ سے ٹکرایا اور گٹھڑی کی صورت وہاں ڈھیر ہو رہا۔ شاید وہ اتنا بے سدھ تھا کہ اُس میں اٹھنے کی ہمت نہ تھی، اور رات کے اس پہر ٹریفک مفقود تھا، سو اُس نے سوچا کہ اٹھ کر کیا کرنا ہے، رات یہیں بسر ہو جائے تو کیا مضائقہ مگر وہ آزاد کے خوجی کی طرح رات بھر بآوازِ بلند حبشی کو دھمکیاں دیتا رہا جس سے بہزاد کو کافی بے آرامی ہوئی۔ البتہ یوں لگتا تھا کہ حبشی غصہ فرو ہونے کے بعد ان گیدڑ بھبکیوں کو نظر انداز کر کے گہری نیند سو گیا، کیونکہ اس کے فلک شگاف خراٹوں کی آواز بہزاد کو پہلی منزل پر صاف سنائی دے رہی تھی۔

اس واقعے کے کچھ دن بعد بہزاد ہوٹل سلازار کی طرف بوجھل ذہن اور تھکے قدموں سے آ رہا تھا. دن بھر کی تھکاوٹ درد بن کر اس کے انگ انگ میں دھڑک رہی تھی. ہوٹل کی ڈیوڑھی میں داخل ہوتے ہی اُس نے سوچا کہ وہ لفٹ سے اوپر جائے گا۔

عموماً وہ لفٹ کا انتظار کیے بغیر زینے ہی سے اوپر چلا جاتا تھا۔ اس وقت اتفاقاً لفٹ مصروف نہیں تھی، نیچے ہی کھڑی تھی۔ اس کے اندر روشنی نہیں تھی، غالباً اندر کی لائٹس فیوز ہوگئی تھیں۔ یہ سوچتے ہوئے بہزاد لفٹ میں داخل ہوگیا۔ اس سے پہلے کہ وہ پہلی منزل کا بٹن دباتا۔ لفٹ کا دروازہ کھٹاک سے بند ہوگیا اور وہ خود بخود چلنے لگی۔

بہزاد نے دیکھا کہ لفٹ تیزی سے کسی منزل پر رکے بغیر اوپر چلی جارہی تھی۔ اس نے یکے بعد دیگرے مختلف منزلوں کے بٹن دبائے مگر لفٹ تھی کہ رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ لفٹ کی تیز رفتاری بھی حیران کن تھی۔ پھر لفٹ آخری منزل پر جھٹکے سے ٹھہر گئی۔ ابھی بہزاد سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ اس کی پشت سے کوئی چیز ٹکرائی۔ وہ تیزی سے پیچھے مڑا تاکہ معلوم کرسکے کہ وہ کس چیز سے ٹکرایا تھا۔ اسے اندھیرے میں کچھ سجھائی نہ دے رہا تھا۔ بدبو کا ایک بھبھکا اٹھا اور ساتھ ہی دو استخوانی بازوؤں نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ بہزاد نے بہتیری کوشش کی کہ اس بدبودار وجود کی بانہوں سے نکل جائے، مگر ان سوکھے ہوئے بازوؤں میں جنونی قوت تھی۔ ان کے آہنی چنگل سے فرار مشکل تھا۔ تھک ہار کے اُس نے یہ کوشش ترک کردی، لیکن وہ بہرصورت لفٹ میں لگے ایمرجنسی الارم تک پہنچنا چاہتا تھا جو اندھیرے میں اُس سے چمٹے ہوئے جسم کی وجہ سے دشوار تھا کہ وہ ایمرجنسی الارم اور بہزاد کے بیچ حائل تھا۔

ایک وقت طلب جسمانی کرتب کے بعد وہ اُس پرتعفن جسم کی بغل سے ایک ہاتھ نکالنے میں کامیاب ہوگیا اور اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے ایمرجنسی الارم کا سوئچ اون کردیا۔ فوراً الارم چیخنے لگا اور اس کے ساتھ ایمرجنسی لائٹس جل گئیں۔ ان کی مدھم مدھم سی روشنی میں بہزاد نے دیکھا کہ وہ مدقوق نشئی اس سے لپٹا ہوا تھا جس کا کچھ دن پہلے جبشی مہماندار سے جھگڑا ہوا تھا۔ نشئی کی آنکھیں بند تھیں اور سینے سے سانس کی کھڑکھڑاہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔ کسی وجہ سے اس کا جسم ٹھنڈا ہونے لگا تھا اور اُس نے اپنا سر بہزاد کے سر پر ٹکا دیا تھا۔ بہزاد کو یوں محسوس ہورہا تھا کہ وہ برف کے کسی بدبودار تودے سے لپٹا ہوا ہے۔ یہ ساری صورت حال اس کے لیے اذیت ناک تھی۔

تھوڑی دیر میں ہوٹل کا برازیلین منیجر زینے کے راستے اوپر آیا اور باہر سے بٹن دبا کر لفٹ کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ جام ہوگیا تھا۔ پھر اُس کی آواز آئی: "جو کوئی بھی اندر ہے مت گھبرائے، ہم نے لفٹ ٹھیک کرنے والے کو بلا بھیجا ہے۔"

بہزاد نے جواب میں کہا: "اچھا۔ مگر برائے مہربانی ذرا جلدی کریں۔"

"ہاں۔ ہاں۔ کوشش کریں گے۔"

اس گفتگو کے بعد برازیلین منیجر زینے کے راستے نیچے چلا گیا۔

پھر جیسے وقت ٹھہر گیا۔ بہزاد کو یوں لگا جیسے صدیاں گذر گئیں۔ وہ ادھر اُدھر کی سوچنے لگا ——— بیکار باتیں۔ اُس نے دنیا بھر کی باتیں سوچ ڈالیں، مگر عذاب کی ساعت تھی کہ ختم ہونے کو نہ آتی تھی ——— آہستہ آہستہ وہ خالی الذہن ہونے لگا۔ وقت قطرہ قطرہ رگِ جاں پر گرنے لگا ——— ہر قطرے میں، ہر پل میں ایک نہ ختم ہونے والی اذیت پنہاں تھی۔ اس کا جسم دکھنے لگا، ٹانگیں شل ہونے لگیں ہر مرتبہ اسے یوں محسوس ہوتا کہ وہ ابھی گر پڑے گا، کیونکہ اُس میں کھڑا ہونے کی مزید سکت نہ تھی۔

اسی عذاب کے دوران اُس کی نظر یکدم اُس آئینے پر پڑی جو لفٹ میں چاروں طرف لگا ہوا تھا، اور یوں آئینے کا ایک حصہ نشئی کی پشت پر بھی موجود تھا، جس میں اس کا چہرہ نظر آرہا تھا۔ مگر ——— کیا یہ اسی کا چہرہ تھا؟ کیا اس کے بال کنپٹیوں پر سے سفید تھے؟ کیا اُس کے ماتھے اور آنکھوں کے نیچے لکیروں کا جال بچھ چکا تھا؟ کیا اس کے ہونٹوں کی دونوں اطراف دو بڑی سوئیں پہلے

بھی موجود تھیں؟ ——— نہیں ——— ایسا تو نہ تھا ——— یا پھر شاید اس شہر میں آنے کے بعد یہ سب نشانیاں ظاہر ہوئی ہوں۔ اس شہر کے ظالم روزمرہ اور غمِ روزگار نے یہ سب کچھ دیکھنے کی مہلت ہی نہ دی ہو۔

ایک برقی جھٹکے سے بہزاد پر اس گھڑی ساری صورتِ حال کی مجہولیت یوں واضح ہوئی جیسے سورج سوا نیزے پر آگیا ہو، اور اس کی روشنی آنکھوں میں چبھنے لگی ہو، اُس نے سوچا "یہ کتنا مضحکہ خیز ہے کہ وہ کروڑوں کے اس شہر میں ایک گھٹیا ہوٹل کی بوسیدہ لفٹ میں ایک نشئی کے پُرتعفن وجود سے یوں بغلگیر ہے جیسے کوئی عاشق اپنی محبوبہ سے ——— اور نیچے سڑکوں پر ہجوم اسی طرح رواں ہے وال سٹریٹ میں لین دین اسی طرح زور شور سے جاری ہے۔ یو۔ این۔ او میں دنیا بھر کے ڈپلومیٹس جانے کن مسائل پر ہنس ہنس کر ایک دوسرے کو چھلنے کی کوشش میں مصروف ہیں، ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ اسی طرح سر اٹھائے کھڑی ہے، فلک بوس مجسمۂ آزادی اپنے ہاتھ میں مشعل لیے اپنی جگہ پر قائم ہے ——— اور کسی کو خبر تک نہیں کہ وہ ——— بہزاد ——— گھنٹوں سے تیسرے درجے کے ایک ہوٹل کی عمر رسیدہ لفٹ میں ایک مدقوق نشئی سے مجبوراً ہم آغوش، جانے کونسا عذاب جھیل رہا ہے۔"

انکشاف کی اس ساعت بہزاد نے آئینے میں دیکھا کہ ایک بھورا، ٹھنگنا، دیو قامت سفید فام اجنبی کے بدبودار جسم سے خود چمٹا ہوا ہے۔ اُسے اپنے آپ سے گھن آنے لگی۔ اُس نے سوچا "وہ یہاں اس شہرِ غدار، اس دیارِ غیر میں کیا کر رہا ہے جہاں کسی کو اس کے جینے مرنے کی نہ خبر ہے نہ پروا۔ یہ سرزمین جہاں اس کے آبا و اجداد کے خون کا ایک قطرہ بھی مٹی میں جذب نہیں ہوا جہاں اس کی جڑیں نہیں ہیں، وہ یہاں کیا کر رہا ہے؟ ان لوگوں کے درمیان جنھوں نے اسے گم گشتہ ماضی میں مدفون کر دیا ہے وہ یہاں کیا کر رہا ہے؟"

——— اور اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ واپس چلا جائے گا، اپنے وطن، اپنے گھر، اپنے عزیزوں کے درمیان۔

بیل فری میں نصب گھنٹی بج اٹھی۔ اس میں بسیرا کرنے والے کبوتر غول در غول پھڑپھڑاتے ہوئے، اس کی چاروں کھڑکیوں سے طوفان کی طرح پھٹ پڑے۔ آسمان پل بھر کے لیے برف کے گالوں سے سفید ہو گیا ——— پھر بہزاد نے دیکھا کہ بہاءالدین ذکریا کے مزار کے چراغ والے صحن میں کبوتر دانہ چگنے اتر آئے ہیں۔

غالباً لفٹ میں پیدا ہونے والا نقص مستری نے رفع کر دیا تھا۔ اس کا جام دروازہ کھٹاک سے کھل گیا۔

شجرِ ممنوعہ

منیر الدین احمد

ہمیں کمر فیلڈ والے مکان میں رہتے ہوئے تیرہ برس ہو چکے ہیں، اور اتنے ہی عرصے سے ہماری کتابوں کی چھانٹی نہیں ہوئی۔ اس سے پہلے ہم ہر تین چار برسوں کے بعد نقل مکانی کرتے رہے تھے، جس کے سبب سامان کی چھانٹی ہو جایا کرتی تھی۔ گھر کی دوسری چیزوں کے ساتھ مجھے کوئی واسطہ نہیں ہے، وہ تو ان سے اکیلی نپٹ لیتی ہے، صرف کتابوں کی چھانٹی میرے سپرد ہے۔ اور میں اس کام پر بہت وقت لگاتا ہوں۔ کتابوں کو نئے سرے سے ہاتھ میں لینے سے پتہ چلتا ہے کہ بعض کتابیں سرے سے اس قابل نہ تھیں کہ انہیں سنبھال کے رکھا جاتا۔ ان کا معاملہ آسان ہوتا ہے، مگر بعض دلچسپ کتابیں ایسی بھی نکل آتی ہیں جن کے وجود سے بھی میں ناواقف ہوتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ انسان ان کو آسانی کے ساتھ ایک طرف نہیں رکھ سکتا۔ میں ان کتابوں کی کم از کم ورق گردانی ضرور کرتا ہوں۔ اور بعض اوقات ان کو پڑھنے بیٹھ جاتا ہوں جس کے سبب مجھے بھول جایا کرتا ہے کہ نقل مکانی کی تاریخ دروازے پر کھڑی ہے۔ آخری ایک دو دنوں میں کتابوں کو افراتفری میں پیک کر دیا جاتا ہے۔ اس خیال سے کہ نئے گھر میں پیکٹوں کو کھولتے ہوئے چھانٹی کر دی جائے گی، مگر نئے گھر میں آدمی کو اتنے بے شمار کاموں سے نپٹنا ہوتا ہے کہ کتابوں کی چھانٹی پھر ملتوی کرنی پڑتی ہے۔ اس طرح آدمی نقل مکانی سے نقل مکانی تک بے تحاشا کوڑ کباڑ اپنے ساتھ ساتھ لئے پھرتا ہے۔

اب جب کہ ہمیں اس مکان میں رہتے ہوئے تیرہ برس ہو گئے ہیں اور کتابوں کی آمد کی رفتار کم ہونے کی بجائے بڑھتی جا رہی ہے اور نوبت یہاں تک آن پہنچی ہے کہ ہمیں لگتا ہے، جیسے ہم گھر میں نہیں کسی لائبریری میں رہتے ہیں۔ کوئی کمرہ ایسا نہیں ہے، جو کتابوں سے بھرا ہوا نہ ہو۔ الماریوں میں کوئی جگہ باقی نہیں رہی، اور میزوں اور کرسیوں پر بھی ڈھیر لگتے جا رہے تھے۔ چونکہ ہمارا ارادہ نقل مکانی کا نہیں ہے۔ اس لئے بادل نخواستہ ہمیں کتابوں کی چھانٹی نقل مکانی کے بغیر کرنی پڑ گئی۔ اور پھر پہلے ہی روز وہ حادثہ پیش آ گیا جس نے مجھے ماضی کی یادوں میں ڈبو دیا۔

ہوا یہ کہ میرے ہاتھ منصوری کی ''مختصر تاریخ'' نامی کتاب لگ گئی، جو عرصہ ہوا ڈیوڈ نے مجھے تحفے میں دی تھی۔ ڈیوڈ کو میں اپنی یادداشت سے قریب قریب محو کر چکا تھا۔ مگر وہ جاڑا مجھے خوب یاد تھا، جب ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ اس سال جرمنی میں اس قدر شدید سردی پڑی تھی کہ ہمبرگ کی جھیل آلسٹر یخ بستہ ہو گئی تھی، جیسا کہ اس سے قبل اور اس کے بعد بھی کئی بار ہو چکا ہے۔ مگر اس سال جھیل پورے دو ماہ تک یخ بستہ رہی تھی اور لوگ اس پر اسکیٹنگ کرتے رہے تھے۔ یونیورسٹی کے طالب علموں کے لئے جنہیں میری طرح اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے محنت مزدوری کرنی پڑتی ہے، وہ جاڑا بہت سخت تھا۔ ہم ہر روز اسٹوڈنٹ ایمپلائمنٹ آفس میں جاتے تھے اور گھنٹوں تک بے سود انتظار کے بعد ناکام واپس ہوسٹل میں لوٹ جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ طالب علموں نے وہاں جانا چھوڑ دیا تھا۔ اس طرح جب ایک روز فوری طور پر طالب علموں کے ایک گروپ کو بھجوائے جانے کی مانگ آئی تو ہم چار طالب علم وہاں حاضر تھے۔

گرڈلے، جو طالب علموں کو لینے کے لئے آیا تھا، ہمیں بتایا کہ اسے دو روز کے اندر اندر رکنی لاکو پنچنگ مشین کے کارڈوں کی پڑتال کروانی

تھی، جو پروگرام میں غلطی کے سبب گڈمڈ ہو گئے تھے۔ وہ ہمیں اپنی اسٹیشن ویگن میں لا کر ایک بنگلے میں لے گیا، جو ایک پارک نما باغ میں گھرا تھا۔ بنگلہ یقیناً کسی زمانے میں بہت شاندار تعمیر ہوا تھا، لیکن اس کی دیکھ بھال کی طرف عرصے سے بے توجہی برتی گئی تھی۔ ہمارا استقبال ایک بے حد نازک اندام عورت نے کیا، جس کی عمر ہمارے اندازے کے مطابق تیس اور پینتیس کے درمیان ہوگی۔ بنگلے کا فرنیچر کسی قدر بوسیدہ ہو چکا تھا، مگر ہر کمرے میں بیش قیمت آئل پینٹنگز لٹک رہی تھیں۔ دیوان خانے میں پنچ کارڈوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے، جن کی پڑتال کرنے اور ان کو نئے سرے سے ترتیب دینے کے لئے ہمیں لایا گیا تھا۔ عورت جس کا نام انگے بورگ تھا، ہمیں کام پر لگانے کے بعد کافی تیار کرنے کے لئے باورچی خانے میں چلی گئی۔ گرڈ ہمیں کام کی نوعیت سمجھانے کے بعد کمپیوٹر سنٹر کے لئے روانہ ہو گیا، جہاں پر اُسے پروگرام کو بھی درست کرنا تھا، جس کی غلطی نے ہمارے لئے مزدوری کا سامان پیدا کیا تھا۔

ہم چاروں طالب علم کارڈوں کو ترتیب دینے میں جٹ گئے، جو بالکل میکانکی عمل تھا۔ اس کام کے لئے آنکھوں کی چوکسی اور ہاتھوں کی پھرتی سے بڑھ کر کسی چیز کی ضرورت نہ تھی۔ اس لئے جوں جوں کام کی رفتار بڑھتی گئی، توں توں انگے بورگ، گرڈ، بنگلہ اور پنچنگ مشین کے کارڈوں کا معمہ ہماری توجہ کا مرکز بنتا چلا گیا۔ کیا گرڈ انگے بورگ کا خاوند تھا؟ کیا بنگلہ ان کا اپنا تھا یا کرائے کا؟ اور پنچنگ مشین کے کارڈوں کے ساتھ ان دونوں کا کیا تعلق تھا؟ ہم چاروں قیاس آرائیوں میں لگے ہوئے تھے، مگر اس بات کا اہتمام کرتے ہوئے کہ انگے بورگ جو تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کافی اور سینڈوچ پہنچانے آتی تھی، ہماری باتیں نہ سن لے۔ جرمن عام طور سے نجی باتوں کے بارے میں براہ راست سوال کرنے سے کتراتے ہیں۔ اس طرح ہماری قیاس آرائیوں کی بنیاد محض مفروضوں اور مشاہدات پر منحصر تھی۔ ہم نے یہ چیز نوٹ کی تھی کہ گرڈ نے دائیں ہاتھ پہ شادی کی انگوٹھی لگا رکھی تھی، جب کہ انگے بورگ کے، دونوں ہاتھوں کی انگلیاں انگوٹھیوں سے عاری تھیں۔ گویا نہ تو وہ گرڈ کے ساتھ شادی شدہ تھی اور نہ ہی اس کی منگیتر ہو سکتی تھی۔ انگے بورگ کا تعلق کارڈوں کے ساتھ بھی نہیں تھا۔ کیونکہ اسے بالکل علم نہیں تھا کہ کارڈوں کا مقصد کیا تھا اور پروگرام میں غلطی کی نوعیت کیا تھی۔ اس چیز کو گرڈ خوب سمجھتا تھا اور وہی کارڈوں کو وہاں لایا تھا، جو ایک تجارتی فرم کی ملکیت تھے۔ وہ غالباً اس فرم میں کمپیوٹر پروگرامنگ کا انچارج تھا۔ انگے بورگ نے شاید اس کے ساتھ دوستی کے ناتے سے اسے کارڈوں کو اپنے بنگلے میں لا کر غلطی کا ازالہ کرنے کی اجازت دی تھی۔

طالب علموں کا گروپ محض اتفاقی طور پر بن گیا تھا، ہم ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے۔ اس روز سے قبل ہم نے ایک دوسرے کو شاید دیکھا تک نہیں تھا۔ ڈیویڈ ہم میں سے عمر میں سب سے بڑا تھا، یہی کوئی تیس برس کے لگ بھگ۔ جب کہ دوسرے دونوں طالب علم ہانس اور فرانز یونیورسٹی میں نووارد تھے اور ابھی ابتدائی سمسٹروں میں پڑھ رہے تھے۔ ڈیویڈ امریکن تھا اور ایک سال کے لئے ہمبرگ یونیورسٹی میں آیا تھا۔ جرمن زبان پر اُسے پوری طرح قابو حاصل نہ تھا، جس کے سبب ہر چند منٹوں کے بعد ہمیں اس کے لطیفوں پر ہنسنے کا موقع مل جاتا تھا جس کا ارتکاب اس سے غیر ارادی طور پر ہوتا تھا۔ انگے بورگ ہر بار ہمارے قہقہوں کو سن کر بھاگ کر آتی تھی اور سبب جاننا چاہتی تھی پھر جب ڈیویڈ اپنے فقرے کو دہراتا تھا تو ہنستے ہنستے انگے بورگ کی آنکھوں سے آنسو ڈھلکنے لگتے تھے، جنہیں وہ ہاتھوں سے پونچھ دیتی تھی۔ ایک بار ڈیویڈ نے اس کو ایسا کرنے سے روک دیا اور اپنے ہاتھوں کا کٹورا بنا کر اس کی گالوں کے نیچے پھیلا دیا۔ اُس نے کہا وہ انگے بورگ کے آنسوؤں کو پی جانا چاہتا تھا۔ انگے بورگ پہلے تو کسی قدر جھجکی، مگر پھر اُس نے ڈیویڈ کو آنسو اپنے گالوں سے چن لینے کی اجازت دے دی۔ ڈیویڈ نے جھٹ سے اس کے گالوں کو چوم لیا۔ ظاہر ہے ہم تینوں اس انعام سے محروم نہ رہنا چاہتے تھے اور ایک دوسرے پر لطیفے سنانے میں سبقت لے جانے لگے۔ ہمیں بھی باری باری انگے بورگ کو چومنے کی اجازت مل گئی۔

گر ہم نے اس بات کو محسوس کیا کہ ڈیویڈ اور انگے بورگ کے درمیان ایک مختلف قسم کی کشش پائی جاتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے دونوں

مقناطیس کی طرح ایک دوسرے کی طرف کھنچے چلے جاتے تھے۔ انگے بورگ کو ڈیویڈ کی باتیں اچھی لگتی تھیں اور وہ بھی انگے بورگ کی ایک ایک ادا پر جان نچھاور کرنے کو پھرتا تھا۔ ہم اپنی آنکھوں کے سامنے دونوں کو محبت کرنے والے جوڑے میں بدلتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ شام ہونے تک وہ ایک دوسرے میں منہمک ہو کر ہماری موجودگی کو قریب قریب فراموش کر چکے تھے۔

کارڈوں کو ترتیب دینے کا کام ساری رات جاری رہا۔ سحری کے قریب ہم نے تین چار گھنٹوں کے لئے سونے کا پروگرام بنایا اور وہیں فرش پر لیٹ رہے۔ انگے بورگ نے ہمیں سرہانے اور کمبل مہیا کر دیئے تھے۔ ہم چونکہ شب خوابی کا لباس ساتھ نہ لائے تھے، اس لئے انہی کپڑوں میں سو گئے، جو ہم نے پہن رکھے تھے۔ صبح سویرے گرڈ نے آن کر ہمیں بیدار کیا۔ وہ بھی شاید ساری رات کمپیوٹر سنٹر میں پروگرام تیار کرنے میں لگا رہا تھا۔ اس نے ہمارے کام کا جائزہ لیا اور خوش ہوا۔ کیونکہ تین چوتھائی کارڈوں کو ترتیب دیا جا چکا تھا۔ باقی ماندہ کام کے لئے ہمیں صرف آدھا دن درکار تھا۔ گرڈ کو امید بندھ چلی تھی کہ اگلے روز اس کی فرم میں کام بغیر کسی قسم کی رکاوٹ کے ہو سکے گا۔ اس نے اس خوشی میں شام کو ڈانس پارٹی منانے کی تجویز پیش کی اور انگے بورگ سے کہا کہ اپنی سہیلیوں کو آنے کی دعوت دے دے۔

لڑکیاں سورج غروب ہونے تک بنگلے میں پہنچ گئیں، جہاں پر کارڈوں کی ترتیب کا کام مکمل ہو چکا تھا اور ہر کمرے میں موسیقی گونج رہی تھی۔ انگے بورگ نے کھانے پینے کا خوب انتظام کر رکھا تھا۔ جوں جوں شام ڈھلتی گئی، توں توں ڈانس کی دھنیں بجنے لگیں اور ڈانس کرنے والے جوڑوں کے پاؤں تھرکنے لگے۔ ہر کوئی باری باری ہر کسی کے ساتھ ناچ رہا تھا۔ صرف ڈیویڈ اور انگے بورگ ایک دوسرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ انہیں خدا جانے کون کون سی باتیں ایک دوسرے سے کرنی تھیں، جن کا سلسلہ ختم ہی نہ ہوتا۔ ایسے موقعوں پر عام طور سے گفتگو بہت سطحی قسم کی ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ اسی قسم کی گفتگو ہمارے گروپ اور لڑکیوں کے درمیان چل رہی تھی۔ ہر کوئی اپنے بارے میں کچھ بتانے سے گریز کر رہا تھا۔ ایسے موقعوں پر اگر کوئی کھل کے اپنے بارے میں باتیں کرنے لگے تو اُسے ڈھینگ باز قرار دے دیا جاتا ہے، اور جو کوئی اپنے کوائف کو چھپانے لگے، اس پر راز داری کا الزام لگتا ہے۔

ڈیویڈ کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جا سکتی تھی۔ اس کا باتیں کرنے کا انداز کچھ ایسا کھلا ڈُلا تھا کہ آدمی اس کی باتوں کو لن ترانی پر محمول نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا باپ جرمنی سے ہجرت کر کے امریکہ گیا تھا۔ شاید یہی سبب تھا کہ ڈیویڈ نے جرمن زبان میں ایم اے کرنے کا عزم کر رکھا تھا۔ اسے اپنے باپ کے خاندان کے بارے میں کچھ ایسی معلومات نہ تھیں۔ اسے صرف اتنا پتہ تھا کہ اس کا باپ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اور اس کے دادا اور دادی عرصہ ہوا مر کھپ گئے تھے۔ اس لئے رشتہ داروں کو جاننے اور ان کا سراغ نکالنے میں کوئی تُک نہ تھی۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ اسے اس شہر کے قبرستان میں باپ کے رشتہ داروں کی قبریں ملیں گی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس کا باپ لوٹ کر کبھی جرمنی نہ آیا تھا۔ دوسری عالمگیر جنگ کے آخری دنوں میں وہ امریکی فوجوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر پہلے ہالینڈ میں جنگی قیدی رہا۔ پھر اسے امریکہ لے جایا گیا۔ جہاں پر جلد ہی اس کو رہا کر دیا گیا۔ مگر اس نے جرمنی واپس جانے کی بجائے امریکی شہریت اختیار کر لی۔ وہیں پہ شادی کی اور وہیں کا ہو رہا۔

اب ہر کوئی اپنے اپنے خاندان کے بارے میں سُنانے لگا۔ دو لڑکیوں کے باپ جنگ میں مارے گئے تھے اور ان کی ماؤں نے دوسرے مردوں سے شادیاں کر لی تھیں۔ انگے بورگ کی ماں ساری عمر اس کے باپ کی واپسی کی راہ تکتی رہی تھی۔ مگر وہ جنگ سے واپس نہیں لوٹا تھا۔ اس کا کچھ اتا پتہ نہ چل سکا تھا۔ انگے بورگ نے اس کو دیکھا تک نہیں تھا۔ اس کی کوئی تصویر نہیں بچی تھی اور ان کا سارا اثاثہ جل گیا تھا۔ وہ بنگلہ اس کے نانا نے بنوایا تھا، جو بحری جہازوں کا کپتان تھا اور ساری عمر دنیا کے ملکوں میں گھومتا پھرا تھا۔ اپنے آخری سفر سے جو آسٹریلیا کا تھا، وہ واپس نہیں لوٹا تھا، اس کی نانی کو ایک خط ملا تھا، جس میں اسے اطلاع دی گئی تھی کہ اس کا خاوند آسٹریلیا کے ساحل پر

کشتی الٹ جانے کے سبب ڈوب کر مر گیا تھا۔ مگر اس کی نانی کو اس بات پر اعتبار نہ آیا تھا اس لئے کہ اُسے شبہ ہو گیا تھا کہ خط خود اس کے نانا کا اپنا لکھا ہوا تھا۔

دیر تک اس بات پر قیاس آرائیاں ہوتی رہیں کہ اگر انگے بورگ کے نانا نے بھاگنا ہی تھا، تو اسے خط لکھنے کی کیا ضرورت تھی اور اگر خط لکھنا ہی تھا، تو کسی اور سے لکھوا لیا ہوتا، مگر اس صورت میں دوسروں کو اس کے بھید کا پتہ چل جاتا۔ انگے بورگ کی نانی کا کہنا تھا کہ اس کے نانا کی ہر بندرگاہ میں ایک آدھ دلہن بیٹھی ہوتی تھی یہی وجہ تھی کہ وہ نانی کو کبھی اپنے ساتھ سفروں پر لے کر نہیں گیا تھا۔ ایک لڑکی نے کہا کہ مردوں پر انسان اعتبار کر ہی نہیں سکتا۔ اُس کے باپ نے ایک ہی شہر میں تین عورتوں کے ساتھ یاری لگا رکھی تھی۔ اس کی ماں کو اس بات کی خبر لگی، تو اس نے طلاق لے لی۔ گرڈ نے مردوں کا دفاع کرنا چاہا اور عورتوں کی مثالیں دینے لگا، جو بیک وقت کئی مردوں کے ساتھ منسلک تھیں۔ انگے بورگ کو اس کی باتوں پر طیش آ گیا، کیونکہ اس نے جانا کہ گرڈ پوشیدہ طور پر طنز کر رہا تھا۔ ان کے درمیان اچھی خاصی جنگ ہوتے ہوتے بچی۔ معلوم ہوتا تھا کہ انگے بورگ یوں بھی اس کو چھٹی دینے پر تلی ہوئی تھی۔ اسے اس طرح اسے ایک بہانہ مل گیا اور اس نے گرڈ سے کہا کہ اپنے کارڈ اٹھا کر جہنم رسید ہو جائے۔ یوں بھی آدھی رات گزر چکی تھی اور شراب کا نشہ دماغوں میں چڑھ چکا تھا۔

اس کے بعد ویک اینڈ انگے بورگ کے ہاں گزارنا ہمارا معمول بن گیا۔ انگے بورگ اور اس کی سہیلیوں کے ساتھ ہماری اچھی خاصی دوستی بن گئی تھی۔ مگر اس کی نوعیت ایسی ہی تھی، جیسی نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان اتفاقی ملاقات کے نتیجے میں پیدا ہو جانے والی موانست۔ جب کہ انگے بورگ اور ڈیویڈ کے مابین محبت کی آگ جل رہی تھی۔ ان کے لئے ایک دوسرے سے جدائی کا ایک ایک لمحہ گزارنا مشکل ہو جاتا تھا۔ ڈیویڈ اس عرصے میں میرے ہوسٹل میں منتقل ہو گیا تھا، اور ہمارے درمیان بے تکلفی پیدا ہو چکی تھی، ہم یوں بھی اس معاملے میں ایک دوسرے کے راز دان تھے۔ اس لئے مجھے اس کی انگے بورگ کے ساتھ بڑھتی ہوئی محبت کا حال خود ڈیویڈ ہی کی زبانی پتہ چلتا رہتا تھا۔

یونیورسٹی کا گرمیوں کا سمسٹر آیا، تو ہمارے گروپ کے دونوں جرمن طالب علم ہمبرگ کو خیرباد کہہ کر دوسری یونیورسٹیوں میں چلے گئے انگے بورگ کی سہیلیوں میں سے بھی دو تین نے اس عرصے میں اس کے ہاں آنا جانا چھوڑ دیا۔ شاید ان کی دلچسپیاں بٹ گئی تھیں، اس طرح ہمارا ٹولہ مختصر ہوتا چلا گیا، جس میں کبھی کبھار کوئی نئی لڑکی یا نیا لڑکا شامل ہو جایا کرتا تھا۔ مگر بنیادی طور پر انگے بورگ، ڈیویڈ اور میری تکون ایک مستقل اکائی بن چکی تھی۔ اس طرح مجھے سب سے پہلے دونوں نے بتایا کہ وہ شادی کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اگرچہ اس سے قبل انگے بورگ کئی بار محفلوں میں کہہ چکی تھی کہ شادی کرنے کی حماقت اس سے دوسری بار سرزد نہ ہو گی۔ وہ اس سے قبل ایک بار شادی کر چکی تھی، اور طلاق لے لینے کے باوجود اپنے سابقہ خاوند کا فیملی نام استعمال کرتی تھی جب کہ عام طور سے جرمنی میں عورتیں طلاق کے بعد اپنے باپ کے فیملی نام کو اختیار کر لیا کرتی ہیں۔ لطف کی بات تو یہ تھی کہ ڈیویڈ کا فیملی نام فلیپ عین وہی نام تھا، جو انگے بورگ کے باپ کا تھا۔ اس وجہ سے ہم انگے بورگ سے کہا کرتے تھے کہ یہ نام اس کی قسمت تھا اور اس سے اس کے لئے فرار ممکن نہ تھا۔ ڈیویڈ سے شادی کرنے پر اُسے یہ نام اختیار کرنا پڑے گا۔

ڈیویڈ چاہتا تھا کہ امریکہ واپس جانے سے پہلے ان کی شادی ہو جائے اور انگے بورگ اپنا بنگلہ بیچ کر اس کے ساتھ امریکہ منتقل ہو جائے۔ مگر بنگلے کی فروخت اتنی آسان نہ تھی۔ اس کام میں مہینوں لگ جایا کرتے ہیں۔ ہم کئی پراپرٹی ڈیلروں کے پاس بھاگتے پھرے جنھوں نے اندازہ لگایا کہ بنگلے اور اس کے پارک نما باغ کے لئے دس لاکھ مارک مانگے جا سکتے تھے۔ البتہ خریدار کو بنگلے کی مرمت پر مزید لاکھوں مارک لگانے پڑیں گے۔ اور اگر تعمیراتی فرم اس جگہ کو خریدنا چاہے گی، تو صرف اس صورت میں کہ اس کو وہاں کئی منزلہ اونچے

مکانات بنانے کی اجازت مل جائے، جس کے فلیٹوں کو کرائے پر چڑھایا جاسکے۔ بلدیہ کے متعلقہ محکمے سے پتہ چلا کہ بنگلے کو ... کا حامل قرار دیا جاچکا تھا۔ اس لئے اس میں کسی قسم کے تعمیراتی ردو بدل کی اجازت تھی اور نہ ہی بڑا بری کی نوعیت کو بدلا ... بھی اس علاقے میں کئی منزلہ مکانات بنانے کی ممانعت تھی۔

اس بھاگ دوڑ میں ہم بالکل بھول گئے کہ شادی کی رجسٹریشن کے لئے جرمنی میں بے شمار کاغذات مہیا کرنے پڑتے ہیں۔ انگے بورگ چونکہ ایک بار اس مرحلے سے گزر چکی تھی، اس لئے وہ جانتی تھی کہ دولہا اور دولہن کو نہ صرف اپنے شناختی کارڈ پیش کرنے ہوں گے، بلکہ ان کو اپنی پیدائش کے سرٹیفکیٹ، جس میں ماں باپ کے کوائف بھی درج ہوتے ہیں، دکھانے ہوتے ہیں۔ امریکہ میں شناختی کارڈ سرے سے ہوتے ہی نہیں، وہاں پر ڈرائیونگ لائسنس اس کام آتے ہیں، جرمن سرکاری محکمے کاغذات اور سندات کے سلسلے میں بہت سختی سے قانون کی پابندی کرتے ہیں۔ چنانچہ ڈیویڈ نے اپنی ماں کو لکھا کہ اس کی پیدائش کا سرٹیفکیٹ، بلکہ اگر ممکن ہو، تو خود اپنا اور ڈیویڈ کے باپ کا سرٹیفکیٹ بھی بھجوا دے۔

رجسٹریشن آفس نے جو تاریخ دے رکھی تھی، اس سے ایک روز قبل تک امریکہ سے کاغذات موصول نہ ہوئے تھے تاہم ڈیویڈ کی ماں نے اسے ٹیلی فون پر بتایا تھا کہ وہ انھیں کئی روز قبل رجسٹری سے بھجوا چکی تھی۔ اس لئے یہ طے پایا کہ میں انگے بورگ کے ہمراہ رجسٹریشن آفس چلا جاؤں اور ڈیویڈ اس دوران میں ڈاکئے کی تلاش میں نکل جائے۔ جب ہمیں رجسٹرار کے آفس میں داخل ہونے کو کہا گیا، تو ابھی ڈیویڈ وہاں پر نہیں پہنچا تھا۔ ہم اس صورت حال سے رجسٹرار کو مطلع کر ہی رہے تھے کہ اس کے کمرے کا دروازہ کھلا اور ڈیویڈ مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔ خط اس کے ہاتھ میں تھا، جسے اس نے ابھی کھولا بھی نہیں تھا۔ خط کی مہر رجسٹرار کے سامنے توڑی گئی جس میں سے ڈیویڈ کے علاوہ اس کے ماں باپ کے بھی پیدائش کے سرٹیفکیٹ نکلے۔

رجسٹرار نے پہلے انگے بورگ کے کاغذات کا معاینہ کیا، اور کوائف کو متعلقہ فارم پر درج کیا۔ پھر ڈیویڈ کے کاغذات کی باری آئی اور ہم نے دیکھا کہ ایکا ایکی رجسٹرار کا چہرہ جھریوں سے بھر گیا۔ اس نے دوبارہ انگے بورگ کے کاغذات پر نظر ڈالی، پھر دولہا اور دولہن کی طرف گھور کے دیکھا، عینک اتاری، اس کے شیشوں کو صاف کیا، پھر سے کاغذات کا ایک دوسرے سے مقابلہ کیا اور بالآخر کہا کہ معاملہ کسی قدر پیچیدہ تھا اور اس قابل تھا کہ مزید تفتیش کی جائے۔ پھر اس نے معمے کو کھولتے ہوئے بتایا کہ دولہا اور دولہن کے باپوں کا نہ صرف نام ایک تھا، بلکہ ان کے سارے کوائف ایک جیسے تھے۔ اس کا قیاس تھا کہ غالباً دونوں کا باپ ایک ہی شخص تھا۔ میں نے انگے بورگ اور ڈیویڈ کے چہروں پر نظر ڈالی، جو بے حد گھبرائے ہوئے تھے، تو دونوں کے خد و خال میں ایک گونہ مشابہت بہت واضح طور پر نظر آنے لگی، جس کی طرف اس سے قبل میری توجہ نہ گئی تھی۔

رجسٹرار نے کاغذات کو انگے بورگ اور ڈیویڈ کے سامنے رکھ دیا اور ہم نے باری باری ان کا معاینہ کیا، اور اسی نتیجے پر پہنچے جس پر رجسٹرار ہم سے قبل پہنچ چکا تھا۔ اس عرصے میں وہ بتا چکا تھا کہ جرمن قانونِ ازدواج ایک باپ کے بچوں کو ایک دوسرے کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

لیبن فیلز (آسٹریا) ۸ رمئی ۱۹۹۰ء

پھر کیا ہُوا؟

زین العابدین

"پھر کیا ہوا چاچا" کبیر نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے بوڑھے موتی سے پوچھا جو کہانی کہتے کہتے اس جگہ پہنچ کر رُک گیا تھا جہاں محل کے پچھواڑے غلاظت میں راجہ نے ایک خوبصورت پھول دیکھا تھا اور جب اس نے پھول توڑنا چاہا تھا تو پھول نے کہا تھا "سات بھائی چمپا جاگو رے" (سات بھائی چمپا اٹھو) اور جونہی راجہ نے پلٹ کر دیکھا سات پھولوں سے بیک وقت آواز آئی "کینو بون پارول ڈاکو رے" (کیوں بہن پارول ہمیں بلا رہی ہو)

لیکن بوڑھے موتی نے کبیر کے سوال کو نظر انداز کر دیا تھا کیونکہ وہ اس کہانی میں اُلجھ کر رہ گیا تھا جو اٹھارہ برس پہلے شروع ہوئی تھی، جس میں ایک گھر دو حصوں میں بٹ گیا تھا اور جس میں حاتم علی کی بیوہ کلثوم اپنی شناخت کھو بیٹھی تھی۔

کلثوم جب بیوہ ہوئی تو اس وقت بائیس سال کی تھی اس وقت اس کے چہرے پر رونق تھا، جسم کسا ہوا تھا اور سانولے پن میں ملاحت کی آمیزش سے وہ بڑی پُرکشش دکھائی دیتی تھی۔ گاؤں کے بوڑھے جوان سبھی اُسے دیکھتے رہ جاتے تھے۔ جدھر سے نکل جاتی بس بہار آجاتی۔ گویا وہ کرشن چوڑا کی سرخیوں سے پھوٹ کر نکلنے والا شعلہ تھی جس کی تپش سے سارا گاؤں سلگ رہا تھا مگر وہ کسی پر آنکھ نہ اُٹھاتی۔ دانتوں تلے چھوٹی ساڑی کا پلّو دبائے، نظریں نیچی کئے بھری کمر پر گھڑا اٹھائے گزر جاتی تھی۔

ایک دن مانک نے ہمت کر کے اس کی کلائی پکڑ لی اور نٹھو کے کھیت کے پاس واقع آم بگان میں لے گیا، جہاں اس نے کلثوم سے کہا کہ وہ حاتم علی کو چھوڑ دے اور اس کا گھر بسائے۔ کلثوم بپھر گئی، پانی سے بھرا مٹکا اس کے سر پہ دے مارا اور سینہ تانے چلی آئی مسکین مانک میں اتنی جرأت نہ ہوئی کہ اُسے روک لیتا۔ اس کے ساتھ دست درازی کرتا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ حاتم علی ایک سپاہی اور مکتی جودھا (فریڈم فائٹر) ہے جو عزت کی خاطر مرنے مارنے سے نہیں ڈرتا۔ جب اُسے پتہ چلے گا تو اس کا خون پی جائے گا۔ اسی لئے وہ گاؤں چھوڑ کر شہر چلا گیا۔

اور جب کلثوم گھر پہنچی تو اس نے حاتم علی کو غصہ میں لال پیلا پایا۔ وہ صحن میں ٹہل رہا تھا۔ جیسے ہی اس نے کلثوم کو دیکھا اس کی گردن پکڑ لی اور گھسیٹتا ہوا اپنے کمرے میں لے گیا جہاں اس نے کلثوم کو جی بھر کے پیٹا۔ سڑی سڑی گالیاں دیں، رنڈی، فاحشہ، ماگی اور جانے کیا کیا ناموں سے پکارا۔ وہ سر جھکائے گالیاں سنتی رہی، مار کھاتی رہی، لیکن شوہر کا ہاتھ تک نہیں پکڑا، البتہ اپنی پاکدامنی کا یقین دلانے کے لئے طرح طرح کی قسمیں کھائیں، مگر حاتم علی پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا، کیونکہ اس نے سن رکھا تھا کہ جھوٹ بولنے والے قسموں کا سہارا لیتے ہیں۔ اسی لئے اس نے کلثوم کو گھر سے نکال دیا اور اپنی بوڑھی ماں کو منع کر دیا کہ اس رنڈی کو گھر میں ہرگز نہ گھسنے دے۔ وہ منہ کالا کر کے آئی ہے اور اب پارسائی جتا رہی ہے۔

مگر ماں بھی تو عورت ذات تھی، کلثوم کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس کا من پسیج گیا۔ وہ سمجھ گئی کہ کلثوم چاہے کچھ بھی ہو

اپنے مرد کی اَنا کو ٹھیس نہیں پہنچا سکتی ۔ اسے نیچا نہیں دکھا سکتی ۔ اسی لئے جب حاتم علی طیش میں آکر مالک کی کھوج میں نکل گیا تو ماں نے کلثوم کو سینے سے لگالیا اور کہا "مت رو میری بیٹی، مت رو۔ حاتم کا غصہ پل بھر کا ہے ۔ وہ مٹی کا آدمی ہے دیکھنے میں سخت پر من کا ہے بڑا نرم ۔ چُپ ہو جا۔"

لیکن شام ہوتے ہی جب حاتم علی تھکا ہارا گھر لوٹا تو کلثوم کو دیکھ کر ماں پر برس پڑا۔ "چھی ماں گھر کی چوکھٹ پر بدنامی کی کیلیں ٹھونکتے وقت تمہیں اپنے سفید بالوں کا خیال تک نہ آیا۔" پھر اس نے کلثوم کو بالوں سے پکڑ کر جھٹکا دیا "چھنال کہیں کی۔ دن یار کے ساتھ گزار آئی ہے، اب رات بھتار کے ساتھ کاٹے گی۔ نکل یہاں سے رنڈی۔" اور اتنے زور سے دھکا دیا کہ وہ بانس کی کھونٹی سے ٹکرا گئی۔

دوسرے ہی لمحہ اس نے حاتم علی کے پاؤں پکڑ لئے اور گردن اونچی کر کے بولی "لو اپنے ہاتھوں سے گلا گھونٹ دو۔"

"تاکہ میں جیل چلا جاؤں" حاتم علی نے کلثوم کو پیچھے کی طرف دھکیلتے ہوئے جواب دیا اور کمرے سے نکل جانا چاہا۔

مگر وہ حاتم علی کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی اور دیوار سے رام داؤ کھینچتے ہوئے بولی "اگر تم نہیں مار سکتے ہو تو میں خود مار لوں گی۔"

اور پھر جونہی اس نے رام داؤ ہوا میں لہرایا حاتم علی نے بجلی کی کوند کے ساتھ لپک کر کلثوم کے ہاتھ سے رام داؤ چھین لیا اور کرخت لہجے میں بولا "پاگل ہو گئی ہو کیا۔"

"ہاں ہاں میں پاگل ہو گئی ہوں" کلثوم نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا "جس کا شوہر اپنی بیوی پر شک کرے تو اس کا دماغ کیوں نہ بگڑے ۔ میں پاگل ہو گئی ہوں، ہٹ جاؤ۔" پھر حاتم علی کے ہاتھ سے رام داؤ چھین لینا چاہا۔ اسی لمحے حاتم علی کا زور دار طمانچہ اس کے گال پر پڑا۔ وہ تیورا کر حاتم علی کے بالوں سے بھرے چوڑے چکلے سینے پر گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور حاتم علی ساری رات کلثوم کی پلکوں سے موتی چنتا رہا۔

اب رُت بدل چکی تھی ۔ بیساکھ کی طوفانی ہوا کے ساتھ جو بارش ہوئی تھی اس سے فضا میں نمی آگئی تھی ۔ وہ دونوں مستقبل کا خواب بُن رہے تھے اور ہر اُس کمرے کو کھول کھول کر جھانک رہے تھے جن کے دروازے مقفل نہ تھے ۔ جونہی انہوں نے ساتواں در کھولا تھا ان کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں ۔ ان کے سامنے چاول کے دانے ہیرے موتیوں کی مانند چمک رہے تھے ۔ حیران ہو کر انہوں نے چاول کے دانوں سے اپنی مٹھیاں بھرنا چاہیں مگر سارے دانے پھسل کر گر گئے اور ان کی مٹھیاں خالی کی خالی رہ گئیں ۔ اسی اثناء میں دروازے پر دستک ہوئی تھی ۔ کوئی اس کا نام لے کر پکار رہا تھا ۔ حاتم علی نے چاہا کہ دروازہ کھول کر دیکھے کہ کون اُسے بُلا رہا ہے ۔ کلثوم نے روک دیا کیونکہ خفیہ تنظیمیں جو سن اکتھر کی تحریک سے مطمئن نہ تھیں طبقاتی کشمکش کے نام پر چُن چُن کر مجیب حمایتی اور مکتی یدھاؤں کو قتل کر رہی تھیں، اور اپنے حامیوں کا انتقام لے رہی تھیں ۔ وہ تذبذب میں پڑا سوچ رہا تھا کہ دروازہ کھولے یا نہ کھولے —— کسی نے زور سے دروازہ تھپتھپایا اور کرخت آواز میں اس کا نام لے کر پکارا ۔ اس کے قدم خود بخود دروازے کی طرف اٹھ گئے اور جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا سنسناتی ہوئی گولیاں اس کے سینے میں پیوست ہو گئیں ۔ رات کا چیختا ہوا سناٹا کھیتوں کو اپنی باہنوں میں سمیٹے سو گیا ۔ حاتم علی خون میں لت پت پڑا تھا ۔ کلثوم کی کلائیاں سونی ہو گئی تھیں اور ماں کی آنکھوں کا نور جاتا رہا تھا ۔ اس کے ہر طرف اندھیرا پھیل چکا تھا ۔ وہ بھی حاتم علی کے ساتھ اللہ کو پیاری ہو چکی تھی ۔

اب کلثوم تنہا تھی ۔ اکیلی حاتم علی کی یاد لئے زندہ تھی ۔ سارا سارا دن روتی ۔ مالک کو کوستی ۔ اللہ سے دعائیں مانگتی کہ اُسے موت دے دے ۔

لیکن ایسا نہیں ہوا کیونکہ گناہ کی عمر لمبی ہوتی ہے۔ لہٰذا ٹھیک چہلم والی رات کو جب کلثوم اپنے شوہر حاتم علی کے کمرے میں اگربتی جلائے پارہ پڑھ رہی تھی تو مانک گھس آیا اور بولا "کہا تھا نا اُس حرامزادے کو چھوڑ میرا گھر بسا۔ لیکن تو نہ مانی۔ خیر سالا جان سے گیا تو سالی اب میری بانہوں میں آ" پھر کلثوم کو بڑی تیزی سے کھینچ کر اپنے سینے سے چپٹا لیا اور بھینچنے لگا۔ کلثوم چیخ رہی تھی منت سماجت کر رہی تھی، اللہ رسول کا واسطہ دے رہی تھی مگر مانک تھا کہ اُسے دبوچے چلا جا رہا تھا اور وہ پچکتی جا رہی تھی جیسے اس کے کٹے جسم سے ہوا نکل رہی ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ فرش پر بے ہوش پڑی تھی۔

صبح جب اُسے ہوش آیا تو اس کا بدن دُکھ رہا تھا۔ رات کی ایک ایک بات، ایک ایک واقعہ اس کے ذہن میں اُبھر رہا تھا۔ اس کا سب کچھ لُٹ چکا تھا۔ وہ بلک بلک کر رونے لگی، پھر وہ اٹھی اور ندی کی طرف بھاگی۔ لیکن رحمت اور دلاور نے اُسے خودکشی کرنے سے باز رکھا اور اپنی ناؤ پر لے آئے۔ پھر اُسے کھانے کو بھات اور پہننے کو ساڑی دی اور کہا۔

"بھابی حاتم علی ہمارا دوست ہی نہ تھا بلکہ کمانڈر بھی تھا۔ ہم نے ایک ساتھ جنگ کی تھی تب کہیں جاکر ہمیں آزادی ملی ہے۔" لیکن کلثوم نے نہ بھات کو ہاتھ لگایا اور نہ ساڑی کو۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ وہ سن اکہتر سولہ دسمبر کے بعد کے مکتی جودھا ہیں جو گاؤں گاؤں کھاتے پیتے لوگوں کو لوٹ رہے تھے۔ ان میں نہ رشتے کی پہچان تھی اور نہ آدمیت۔ ان کا ایمان بس دولت اکٹھا کرنا تھا۔

جب انہوں نے کلثوم کو خاموش بیٹھا دیکھا تو وہ بولے " وقت اور عزت ایک بار چلی جائے تو واپس نہیں آتی۔ اس لئے بھوکوں مرنے سے بہتر ہے کہ آدمی کھا پی کر جیئے۔ ہنس بول کر جیئے۔"

پھر کلثوم کی مزاحمت کے باوجود انہوں نے اس کے ساتھ وہی کچھ کیا جو مانک کر چکا تھا۔ پھر ناؤ گھاٹ بدلتی رہی۔ مانجھی بدلتی رہی۔ گھر کے دروازے اندھیرے میں کھلنے لگے اور سرگوشیاں سنائی دینے لگیں۔ پھر رفتہ رفتہ یہ سرگوشیاں گاؤں گاؤں پھیل گئیں اور ایک دن گاؤں میں پنچائت بیٹھی۔ "اس سالی کو جلدی گاؤں سے نکالو، ورنہ بہو بیٹیاں خراب ہو جائیں گی۔" چیئرمین نے پنچوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ اور جب کلثوم چپ چاپ پوٹلی اٹھائے ریلوے اسٹیشن کی طرف چلی گئی اور تمام الزامات کو اپنے وجود پر اس طرح اوڑھ لیا جس طرح جنگِ آزادی کے زمانے میں کسی کیمپ سے ملا ہوا کمبل ہو جس کے اندر مکتی جودھا اپنے پچھتاوے کی سیاہی کو لپیٹ کر سو جایا کرتے تھے۔ وہ چاہتی تو ان کی لنگیاں کھول کر انہیں ننگا کر دیتی جو رات کے اندھیرے میں اس کے دروازے تھپتھپایا کرتے تھے۔ ان مکتی جودھاؤں کے چہرے سے داڑھیاں نوچ لیتی جنہوں نے رشتے کی پہچان کھو دی تھی۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا کیونکہ بڑے بوڑھوں سے سن رکھا تھا کہ خدا کے نزدیک وہی سرخرو ہوتا ہے جو کسی کے گناہ کو معاف کر دے اور اُسے ذلیل کرنے کے بجائے اس کے ساتھ محبت سے پیش آئے۔

"پھر کیا ہوا چاچا۔" اس بار کبیر نے حقہ پر نئی چلم چڑھاتے ہوئے پوچھا۔ مگر بوڑھا موٗنی خاموش اپنے خیالوں میں گم اندھیرے کے پار کھیتوں کو تک رہا تھا جس میں ہوائیں کسی مریل بیل کی مانند سانسیں لے رہی تھیں۔ چونکہ گاڑی لیٹ تھی کلثوم ویٹنگ روم میں جا کر بیٹھ گئی اور حاتم علی کے بارے میں سوچنے لگی۔

حاتم علی ایک مکتی جودھا تھا۔ کملا سیکٹر سے اپنے چھاپہ ماروں کا دستہ لئے باگر ہاٹ کے اندر گھسا تھا اور وہیں اپنا پہلا کیمپ ڈالا تھا۔ جہاں ان لوگوں کو پکڑ کر لاتا تھا جنہوں نے مکتی باہنی کے ساتھ تعاون نہیں کیا تھا اور ان کے اڈوں کا پتہ بتایا تھا۔ ان میں وہ لوگ شامل تھے جن کا تعلق کسی سیاسی پارٹی اور مفاد پرست تاجروں سے تھا۔ جنہوں نے دشمنوں کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لئے مختلف

ناموں سے رضاکاروں کا دستہ بنایا تھا جو مکتی باہنی کے چھاپہ ماروں کو قتل کرتے پھر رہے تھے۔ ایک دن حاتم علی اور ان کے ساتھی گاؤں کے ایک بارسوخ شخص نوازش علی کو اس جرم میں پکڑ لائے کہ اس نے مخالف سپاہیوں کو کھانا کھلا کر اور پانی پلا کر اس اعلان کی خلاف ورزی کی تھی جو ان کے نیتا نے لاکھوں انسانوں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کیا تھا۔ چونکہ نوازش علی مذہبی آدمی تھا اور اپنے اللہ پر بھروسہ کرتا تھا وہ حاتم علی کے روبرو کھڑا تھا اور اس کے فیصلے کا منتظر تھا۔ اتنے میں کلثوم اپنی ماں کے ساتھ روتی پیٹتی کیمپ کے اندر داخل ہوئی اور حاتم علی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑاتے ہوئے بولی "میرے بابا کو چھوڑ دو۔ وہ بے قصور ہیں"۔

کلثوم پر نظر پڑتے ہی حاتم علی اس کے سانولے حسن میں کھو گیا۔ وہ اس کے ہونٹوں کی لکیروں اور آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوب گیا۔ خیالوں میں اس کے بالوں سے کھیلنے لگا۔ ندی کے کنارے گھروندے بنانے لگا اور ہر گھروندے میں کلثوم کو سجانے لگا۔ مگر ندی کی لہریں انہیں بہا لے گئیں۔ وہ چونک پڑا اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ نوازش علی کو جانے دیں۔ کلثوم نے حاتم علی کا شکریہ ادا کیا اور اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔

کھانا کھاتے کھاتے حاتم علی نے نوازش علی سے اس کی بیٹی کا ہاتھ مانگا۔ نوازش علی نے پہلے ذرا تامل سے کام لیا پھر کہا "مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔ بلکہ خوشی ہوتی۔ اچھا ہو تو آج ہی کلثوم کو دلہن بنا کر لے جا سکتے ہو۔ لیکن لوگوں کے منہ کیسے بند کرو گے جب وہ یہ کہیں گے کہ تم نے ایک "دلال" کی بیٹی سے شادی کر لی ہے"۔ نوازش علی کی باتیں بڑی چبھتی ہوئی تھیں۔ وہ تذبذب میں پڑ گیا کیونکہ کسی دلال کی بیٹی سے شادی کرنا گویا آزادی کو رسوا کرنے کے مترادف تھا اور وقت کو کھینچ کر دوبارہ پیچھے کی طرف لے جانے کے عمل میں شامل تھا۔ مگر ہم سب کو ایک ہی گھر کی چھت کے نیچے رہنا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ اختلافات خود بخود دور ہو جائیں گے۔ اس نے سوچا اور اس کی پیشانی پر کچھ دیر پہلے جو شکنیں پڑی تھیں وہ کافور ہو گئیں۔ اس نے مسکراتے ہوئے نوازش علی سے کہا "چاچا اس کی فکر نہ کیجئے۔ بس آپ بسم اللہ کہہ دیجئے"۔

دوسرے دن گنبد والی مسجد کے امام قاضی فرید نے دونوں کا نکاح پڑھایا اور اسی رات کو کلثوم کی بڑی بڑی آنکھوں اور گداز ہونٹوں کو چومتے ہوئے حاتم علی نے جانے اس کے کان میں ہولے سے کیا کہا کہ وہ شرماتی۔ لجاتی۔ سمٹی سمٹاتی اس کی باہنوں میں چھوئی موئی ہو گئی اور وہ کہکشاں روندتا ہوا پریوں کے دیس میں نکل گیا۔ حاتم علی اور کلثوم ایک ہو گئے اور وقت نے ان کے زخم بھر دیئے۔

"پھر کیا ہوا چاچا"۔ اس بار کبیر نے بوڑھے موتی کی طرف حقہ بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ لیکن بوڑھے موتی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کیونکہ وہ کش لگاتے ہوئے اس کہانی کی تفصیل میں کھو چکا تھا جس کا آغاز اٹھارہ برس پہلے ہوا تھا۔

کلثوم ویٹنگ روم میں بیٹھی اپنے ماضی کو کرید رہی تھی کہ اس کے خیالات منتشر ہو گئے کیونکہ ایک سست رفتار مال گاڑی اسٹیشن سے گزر گئی تھی۔ اب وہ ویٹنگ روم کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی جہاں شام کے سائے درختوں اور کھیتوں پر آسیب کی طرح پھیلے ہوئے سحر زدہ احساس کو بیدار کرنے کے بجائے دلوں پر مردہ خور گدھوں کی مانند بسیرے ہوئے تھے اور فضا کو بھیانک اور مہیب بنا رہے تھے۔ ایک قلی آیا اور سوئچ آن کر کے چلا گیا۔ پھر ویٹنگ روم ملگجی روشنی میں پُراسرار بن گیا اور وہ سوچ میں ڈوب گئی۔

کلثوم اسی گاؤں میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کے ٹیڑھے میڑھے راستوں سے بخوبی واقف تھی وہ ہر گھر پہچانتی تھی اور اس کے اندر کے ہر چہرے سے آشنا تھی۔ حتیٰ کہ گاؤں کے آخری سرے پر واقع جو قبرستان اور مسجد تھی وہ انہیں بھی جانتی تھی۔ اُسے یاد تھا کہ جب وہ اپنی سکھیوں کے ہمراہ ندی سے پانی لانے جاتی تو بانس کے جنگلوں میں پھدکتی ہوئی فاختاؤں کو دیکھ کر اس کے من میں بھی

نیلے آسمان میں اڑنے کا خیال پیدا ہوتا تھا۔ ندی کی بے کراں وسعتوں اور قُل قُل کرتی لہروں کو دیکھ کر وہ اس قدر خوش ہوتی تھی کہ اس میں غوطہ پر غوطہ لگاتی تھی۔ مانجھی کے منہ سے بھٹیالی اور مرشد کا گیت سن کر اسے محبت پر اعتبار اور خدا کی عظمت کا احساس ہوتا تھا۔ گویا اُسے اپنے گاؤں سے بے پناہ محبت تھی۔ پھر وہ اس گاؤں کو کیسے چھوڑ دے جس میں اس کے پرکھے دفن ہوں۔ جہاں تاریخ و ثقافت کی آبیاری کے لئے اس کے آباؤ اجداد خون دیتے چلے آئے تھے اور اب ایک نیا گھر بنایا تھا تاکہ کوئی کسی کا استحصال نہ کرے لیکن یہ عہد پورا نہ ہو سکا، خواب کی تعبیریں اُلٹی ہو گئیں۔ وہ گھر جو انہوں نے بنایا تھا وہ کلثوم کو پناہ نہیں دے سکا تھا۔ اس کے سر کو ڈھانپ نہیں سکا تھا کیونکہ انہوں نے گھر کی چہار دیواریاں اٹھائی تھیں، چھت نہیں ڈالی تھی۔ اس کے سر پر سورج چمک رہا تھا اور بارش کے پانی گر رہے تھے اور کلثوم ان پانیوں میں اتنی بھیگ چکی تھی کہ اس کا بدن سر سے پاؤں تک ایک نظر آ رہا تھا۔

کلثوم سوچتے سوچتے ویٹنگ روم سے باہر نکل آئی تھی اور ویران پلیٹ فارم پر کھڑی سیاہ رنگ کی ریل لائنوں کو تک رہی تھی جو مردہ سانپ کی مانند پڑی تھیں۔ یہ لائنیں بھی کتنی بے بس ہوتی ہیں جو گھومتی گھماتی ایک اسٹیشن کو چھوتی دوسری اسٹیشنوں کی طرف جاتی ہیں، مگر ان کی اپنی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ اگر اس نے گاؤں چھوڑ دیا تو اس کا بھی یہی حال ہوگا۔ وہ زمین، درختوں، ندیوں اور انسانوں سے کٹ کر رہ جائے گی۔ ان سے الگ تھلگ ہو جائے گی۔ پھر اُسے اپنے آپ سے ڈر لگے گا، ساری دنیا سے خوف آئے گا۔ حالات سے جنگ کرنے کا حوصلہ نہیں رہے گا۔ اس کی حیثیت مٹی کے ان تودوں کی مانند ہو گی جو راستوں میں پڑے ہر آنے جانے والوں کی ٹھوکریں کھاتے رہتے ہیں۔ ”اُسے ایسی زندگی نہیں چاہیے۔“ کلثوم نے سوچا اور پلیٹ فارم سے نیچے اُتر کر ریل لائن پر چلنے لگی۔

آسمان پر ستارے لرز رہے تھے اور چاند یرقان زدہ چہرے کی مانند ایک کونے میں اٹکا ہوا تھا۔ پلیٹ فارم کی بتیاں یوں ٹمٹما رہی تھیں جیسے کلثوم کے کانوں میں ایمیٹیشن کی بالیاں جھول رہی تھیں۔ اس نے چلتے چلتے کانوں کی لوؤں کو چھوا اور ناک پر جمے ہوئے پسینوں کو پونچھا پھر مڑ کر اسٹیشن کی طرف دیکھا جہاں سگنل کی سُرخ بتیاں حافظ نور الدین کی آنکھوں کی طرح دکھائی دے رہی تھیں جو رات کے پچھلے پہر چلّہ کشی کرتا تھا تاکہ گاؤں کو جن بھوتوں سے آزاد کرا کر چاند پور والے منشی غفور کی اکلوتی بیٹی خُجستہ بانو کو اپنی چوتھی بیوی بنائے۔ وہ چلتے چلتے اسٹیشن سے کافی دور نکل آئی تھی۔ اب تھکی تھکی سی لگ رہی تھی، سو وہ ریل لائن پہ بیٹھ گئی اور جھاڑیوں میں یوں گھورنے لگی جیسے وہاں چیئرمین کی آنکھیں اٹکی ہوں۔ وہ چیئرمین سے واقف نہ تھی۔ پہلی بار اُسے پنچائیت والے دن دیکھا تھا۔ لیکن وہ یہاں کیا کر رہا ہے، شاید اپنی تشفی کے لئے وہ گئی یا نہیں! اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا ”پر وہ جائے گی کہاں۔ شہر میں کون بیٹھا ہے اس کی مدد کے لئے۔ سب تو اپنے اپنے ہی میں ہوں گے۔“ وہ بے بسی کے عالم میں رو پڑی اور پھر بُڑبُڑائی۔ ”مر جاؤں گی، پر گاؤں نہیں چھوڑوں گی۔ یہ مٹی میری ہے، اس میں میرے سات پرکھوں کی قبریں ہیں۔ اس میں میرا بچپن ہے، میری جوانی ہے۔ کیسے اس زمین کو چھوڑ دوں۔ گاؤں سے ناتا توڑ دوں۔“

کلثوم نے بیٹھے بیٹھے مڑ کر اسٹیشن کی جانب دیکھا جہاں گھپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ سارے لیمپ بجھ گئے تھے۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور دو چار قدم گئی ہو گی کہ جھاڑیوں میں سرسراہٹ ہوئی۔ وہ رُک گئی۔ ایک سایہ نمودار ہوا اور اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ کلثوم ڈر گئی اور اپنی کانپتی آواز میں پوچھا۔ ”کون ہو تم؟“

”میں تمہیں لینے آیا ہوں۔“ سایہ نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے آنے کا مقصد ظاہر کیا۔

"کیوں؟ گاؤں والوں نے تو مجھے نکال دیا ہے۔ میں ایک فاحشہ ہوں۔"

"نہیں تم برہمپترا کے پانیوں کی طرح اُجلی ہو، تم ایک تاریخ ہو۔ ہماری آزادی کی، تم میرا مقصد بن چکی ہو، میں تمہیں پانا چاہتا ہوں۔"

"یہ ممکن نہیں، جاؤ یہاں سے۔" کلثوم نے سایہ کو جھڑک دیا اور اسٹیشن کی طرف چل پڑی، سایہ بھی پیچھے پیچھے ہو لیا اور بولا۔ "میں تم سے محبت کرتا ہوں کلثوم، تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

کلثوم چلتے چلتے رُکی اور بولی۔ "بکواس بند کرتے ہو یا نہیں" پھر تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے یوں چلنے لگی جیسے اس کے اندر ہوائیں سنسنا رہی ہوں۔ سایہ بھی اس کے ساتھ چل رہا تھا اور کہتا جا رہا تھا۔ "مجھ سے مت بھاگو۔ تم اس گاؤں کی امانت ہو کلثوم، مجھے معاف کر دو۔"

اب وہ بے تحاشا دوڑ رہی تھی۔ اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے تھے۔ اس کے باوجود آوازوں کی زنجیریں اس کے پاؤں کو جکڑنے کے لئے تعاقب کر رہی تھیں۔ اس کا دم پھول رہا تھا۔ سایہ پیچھے رہ گیا تھا۔ اچانک اس نے دیکھا کوئی سیاہ فام دیو ہیکل شے اندھیرے سے نکل کر اس کی طرف بڑھ رہی ہے۔ مارے خوف کے اس کی آنکھیں اُبل پڑیں، وہ پوری قوت کے ساتھ چیخ پڑی اور اندھیرے میں چھلانگ لگا دی۔

ایک تیز رفتار مال گاڑی کھٹ کھٹ کرتی ہوئی گزر گئی۔

بوڑھے موتی نے اطمینان کا سانس لیا اور جونہی آنکھیں کھولیں، کبیر نے اپنا وہی سوال دہرایا۔

"پھر کیا ہوا چاچا؟"

(ڈھاکا)

ریزہ ریزہ مہک

غلام جیلانی

تو لڑکیو، خدا تمہارا بھلا کرے، یہاں سے دور، بہت دور، سورج سے پورب میں، چاند سے پچھم میں، ستاروں کے بیچ، جو پرستان ہے وہاں کی ملکہ نے شہزادہ نیک بخت کو طلسمی آرسی دی کہ جا میرے بیٹے، تو اس میں جس کسی لڑکی کی صورت دیکھے گا، اس کی سیرت بھی دکھائی دے گی۔ بہت دیکھ بھال سے کام لینا — عورت ذات کو تو نہیں جانتا۔

شہزادے نے وہ آرسی لی اور اڑن کھٹولے پر اُڑتا گیا، دیس دیس . . . . صحرا صحرا۔

ایک گل بدن، مجسم جمال، رشک حور، فیروزہ پری، پرستان سے نہا کر نکلی تھی اور بادل پر بیٹھی گیلے بال سکھا رہی تھی۔ بادل بھی نیساں کا، جو کبھی بجلی بن جائے کبھی موتی برسائے، جو ہوا بھی تھا، روشنی بھی اور فیروزہ پری کی آنکھوں میں نرگس اور گالوں میں گلاب ڈول رہے تھے۔ لاہی جھلکاری کے پیرہن اور آب رواں کی اوڑھنی میں آذری مرقع لگ رہی تھی۔ ناگہاں چشم مضطر شہزادے پر جا پڑی، جو گوہر مقصود کی تلاش میں تھک کر نخلستان میں ایک کھجور کی ٹھنڈک میں سو رہا تھا۔ دیکھتے ہی ہزار جان سے فریفتہ ہو گئی۔ سامری اسم پڑھ کر دم کیا اور اسی عالم میں شہزادے کو پرستان لے گئی۔ سب کی نظروں سے بچا کر، سات پردوں کی اوٹ میں، اپنے سیماب محل میں چھپا کر رکھا۔

بیدار ہوا تو شہزادہ نیک بخت اپنے صیاد کے حسن بے مثل کو دیکھ کر خود ہی اسیر ہو گیا۔ ہوش و حواس کے ساتھ آرسی بھی کھو بیٹھا۔ مگر ایک آدم زاد، دوسری پری زاد! ملن ہو تو کیسے! — عشق کے بھید نرالے۔

فیروزہ پری نے شہزادے کو صدیوں، قرنوں قید میں رکھا، رات اور دن اس کے جلوۂ حسن پر فدا ہوتی، آہیں بھرتی اور اپنے پری زاد ہونے پر کف افسوس ملتی۔

مگر ایک دن پری کا دل پسیج گیا۔ شہزادے کو سیماب محل سے رہا کر کے مکمل آزادی دے دی کہ جا میرے دل و جان کے مالک! اپنی مرضی و مراد کی حسینۂ دل نواز کو تلاش کرے کہ آدم زاد کے لئے حوا کی نسل ہی چاہئیے۔

لڑکیاں بت بنی سُن رہی تھیں — "مگر اس کی آرسی؟" ایک نے پوچھا۔

اور دادی ماں نے غصے سے اسے دیکھا۔ "اے لڑکی۔ بیچ میں نہیں بولا کرتے۔ پری نے آرسی چھپا کر رکھی تھی — لا کر شہزادے کو دے دی اور ساتھ ہی بھوک پیاس کے لڈو بھی کہ اجنبی وقت میں، اجنبی لوگوں میں کوئی مشکل نہ ہو۔"

"تو پری کی قید میں شہزادے نے کتنے دن گزارے؟" ایک اور لڑکی پوچھ بیٹھی۔

بڑی بی نے سفید بگلا سر کھجایا، اور سوچ کر بولیں — جب شہزادہ چلا تھا تو سلیمان پیغمبر کو ہُدہُد نے اطلاع دی تھی اور جب پری نے آدم زاد کو آزاد کیا تو اولادِ آدم کے قدم چاند پر جا پہنچے تھے۔ اتنا عرصہ گزارا شہزادے نے فیروزہ

پری کے محل میں۔

"تو شہزادہ پھر بھی جوان رہا؟" بھولی بھالی، معصوم صورت والی ایک کچی کلی نے پوچھا۔

اے، ہے! دیدوں کا پانی مرگیا ہے، پٹر پٹر پوچھے جا رہی ہیں! کہا نا کہ بیچ میں ٹوکا مت کرو ـــ ایسی بھی کیا بے عقلی کہ یہ بھی پتہ نہیں، پرستان میں عمر کا پہیہ رُکا رہتا ہے۔ جو جیسا ہے ویسا ہی رہتا ہے۔

ساری بالیوں نے جھینپ کر نظریں نیچی کرلیں۔

تو خدا کی کرنی یہ ہوئی کہ شہزادہ زمین پہ اُترا تو نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ ہر چیز اجنبی تھی، ملک نئے، جنگل اور پہاڑ نئے، صحرا اور سمندر نئے، نئے نئے جزیرے نمودار ہو گئے تھے۔ شہزادہ نیک بخت جہاں گرد بنا دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھومتا پھرا ـــ محوِ حیرت تھا کہ لوگوں کا اتنا ہجوم کہاں سے آگیا کہ سطحِ ارض پہ پاؤں دھرنے کی جگہ باقی نہیں رہی۔ ادھر سر بہ فلک عمارتیں نظروں کی دیوار بنی یوں کھڑی ہیں کہ گھٹن سے ہواؤں نے چُپ سادھ لی ہے۔

چہروں کو دیکھتا تو سوچ میں پڑ جاتا، ان ترشے ہوئے گیسوؤں اور چُست لباسوں میں کیسے روپ کے، اور کس کی سیرت دیکھے آرسی میں! ـــ یہاں تو ہر چہرے پر بدحواسی اور بے زاری کھنڈی ہوئی ہے، جیسے خوف میں بھاگا جا رہا ہو۔

یہ لوگوں کے ریوڑ کہاں سے آئے ہیں؟ . . . . . کہاں جا رہے ہیں؟ . . . . . سیاہ، سفید اور زرد، ہر رنگ کے ڈھا پنچ رینگ رہے تھے ـــ ایک شہر سے دوسرے شہر، ایک سرحد سے دوسری سرحد، کس سے بات کرے کوئی!

جرأت کر کے ایک ناری کے پاس پہنچا۔ صورت اس کی موہنی تھی۔ آرسی میں صورت دیکھی تو دنگ رہ گیا ـــ سیرت کا پتہ ہی نہیں تھا۔ اچھی نہ بُری۔

"کیا تم سارے جذبات، سارے ارمان ـــ اپنی فطرت کو کھو بیٹھی ہو؟" ـــ اس نے پوچھا ـــ ابلا خالی خالی نظروں سے اسے تکنے لگی۔ جیسے دیکھ بھی رہی ہو اور نہیں بھی۔

"کیا میری بات تم سمجھ نہیں پا رہی ہو؟ ـــ کہاں سے آئی ہو تم؟"

بہت دور سے، ادھر پورب کے دیس سے، اس کی ساتھی ایک اور سندری نے کہا، نام بھی یاد نہیں رہا اب تو۔ ہم کب نکلے تھے، کیوں نکلے تھے . . . . نہیں، نکالے گئے تھے، سنگینوں کی نوک پہ . . . . ہمیں کچھ یاد نہیں ہے . . . . ہماری بھاشا، ہمارے لباس . . . . ہمارے نام تک یاد نہیں ہیں ـــ اس نے اپنا سر باہنوں میں تھام لیا۔ اس کے لتّے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے، پت جھڑ بہت جلدی آگیا تھا ـــ باہنوں کی مٹیالی زردی میں جگہ جگہ ننھے ننھے سوراخ جھانک رہے تھے، سوئیوں کے سے۔

اور پھر وہ باہنیں نیک بخت کی طرف بڑھیں ـــ 'تم کہاں سے آئے ہو؟ . . . . چلو گے ہمارے ساتھ؟' اور نظریں شہزادے میں پیوست ہوئی جا رہی تھیں۔

تو کیا وہ اکیلی تھیں؟ . . . . . ان کے ساتھ کوئی نہیں تھا؟ معصوم کلی نے پوچھا۔

وطن چھوٹنے کے بعد سب اکیلے رہ جاتے ہیں۔ جانے والے بھی اور پیچھے رہ جانے والے بھی ـــ' بڑی بی کا سفید بگلا سر یوں ہلا جیسے ہوا میں کپاس کا ڈوڈا۔

معصوم کلی سہم کر چپ ہوگئی۔

شہزادہ نیک بخت بوکھلا گیا، پیچھا چھڑا کر ایک بڑے اُونچے انسانوں کے ڈربے میں گھس گیا، بجلی کے جھولے میں چڑھ کر جانے کون سی اونچائی کے کابک میں جا پہنچا، بڑے قیمتی فرنیچر سے سجا سجایا کابک تھا، ایک اکیلا بوڑھا، چھوٹے سے پردے پر، چلتی پھرتی بات کرتی ہوئی رنگین تصویریں دیکھ رہا تھا۔

ہر طرف موت کی باس پھیلی تھی۔

شہزادے کو دیکھ کر بوڑھا چیخا ـ کون ہو تم؟ کیوں آئے ہو؟ —— خط لائے ہو؟

خط —— ! اور اس کے ساتھ ہی جانے کہاں سے ایک بڑھیا کابک میں بڑی خاموشی سے نمودار ہو گئی، جیسے روئی کا گالا ہوا میں اڑتا ہوا آ جائے —— روبی کو دیکھنے آئے ہو؟

روبی! —— اور شہزادہ بھاگ نکلا، وہ پاگل ہو جانا نہیں چاہتا تھا۔

مگر بھاگ کر جائے گا کہاں! —— اس کی بادشاہت کو ختم ہوتے تو سینکڑوں ہزاروں برس بیت چکے تھے، پہلی والی لڑکی نے دادی ماں سے پوچھا۔

کہیں بھی نہیں ـ بڑی بی بولیں ـ وہ جاتا کہاں؟ —— اب وہ گاؤں گاؤں، جنگل جنگل پھرتا گیا، صندل، ساگوان، مہوہ اور لوبان کی الہڑ خوشبوؤں نے اسے پھر سے زندگی میں جھلایا، من مست کی کنواری سگند نے ارمان جگائے، سر بلند پہاڑیوں نے حوصلے بلند کئے، سرسبز وادیوں میں سہیلیوں کی چہکار نے اسے خوش آمدید کہا، کہیں کوہسار کے ایک بادل نے سرگوشی کی —— کہیں نیستاں میں کسی گیت کے سُروں نے اس کے قدم لئے، جو پہاڑی سے اترنے والے چشمے کے کنارے کوئی اہیر بنسی میں بجاتا ہوتا ——

آبشاروں کی پھوار میں گوریاں بھی ملیں، جو کالے کالے، لانبے لانبے کیس شانوں پر کھولے، ہنستی گاتی، اشنان کرتی تھیں ـ لگتا چاندنی راتیں نہاتی ہوں —— چشم آہو، نگاہیں ہری دوب، پلکیں پیاؤ کی ٹھنڈک۔

شہزادہ سوچ میں پڑ جاتا —— آرسی میں دیکھتا تو صورت کے سوا کچھ نظر نہ آتا —— سیرت کا پتہ ہی نہیں تھا! —— نہ اچھا نہ برا ——!

ایسا کیوں ہے؟ —— وہ روہانسا ہو کر، سوچ میں ڈوبا آگے بڑھ جاتا —— اور آن کی آن میں لگتا، لو وہ سورج چھپا، وہ دن ڈوبا . . . . وہ اک قدم میں رات آ گئی!

اور لڑکیاں جو سر نیوڑھائے بیٹھی تھیں، اداسی کی رات میں اترتے لگیں۔

—— اور پھر ایک دن شہزادہ پھوٹ بہا ـ آنسوؤں کا سیل رکتا ہی نہ تھا، ہچکیاں بندھ گئیں ـ تب فیروزہ پری نے آن کر کہا ——

میرے دلبر، میری جان، یہ سیرت کس کے ہاتھ آئی ہے! . . . . یہ تو تریا چرتر ہے ـ کبھی آن ہے، کبھی موم ـ آدم کو اذنِ سفر سیرت کی وجہ سے ہی ملا تھا، وہ روز ازل سے سفر میں ہے۔ زادِ سفر میں اب صرف صورت لئے پھرتا ہے . . . ملک ملک، سرحد سرحد، سیرت اُتارہ پھینکی ہے ـ تو بھی آرسی پھینک دے۔

واعظاں کیں . . . . . .

قیصر تمکین

شبلی صاحب صبح سے لائبریری کے مختلف حصوں میں چھان بین میں مصروف تھے۔ کچھ پڑھنے اور دو ایک سطریں لکھنے کی بھی کوشش کی۔ جب تھک گئے تو یونیورسٹی کے مرکزی لیکچر ہال میں جا نکلے جہاں ان کو کچھ اپنائیت سی لگی کیونکہ بہت سے لوگ ایشیائی بھی تھے۔ سامنے اسٹیج پر کوئی مولانا عورتوں کے حقوق پر روشنی ڈال رہے تھے، خالص مذہبی نقطۂ نظر سے۔

شبلی صاحب ہال میں داخل ہو گئے اور خاصا متعجب ہوئے۔ وہ ایک طرف حاشیہ نشینوں میں شامل ہو کر مولانا کو دیکھنے لگے۔ انھوں نے ابھی تک اس ٹھاٹھ باٹھ کا مولوی نہیں دیکھا تھا۔ وہ صاحب چہرے مہرے سے تو امریکی لگ رہے تھے مگر لہجہ خاص بیلیول کالج (آکسفرڈ) کا سا تھا۔ ان کی نفیس بھوری فرنچ کٹ داڑھی سے ایسا لگتا تھا جیسے زیورخ کے کوئی ارب پتی ہوں۔ سوٹ ان کا یقیناً سیول رو کا ہی تھا جس کی تراش خراش یہاں شکاگو کی علاقائی یونیورسٹی کیا خود پیرس اور لندن کے فیشن پرست حلقوں کے لیے بھی نظر فریب تھی۔ وہ انگریزی اس روانی سے بول رہے تھے کہ شبلی صاحب کو اپنی روزمرہ کی امریکی لہجے میں ملفوف زبان پر کچھ ندامت سی ہونے لگی۔ وہ ہمہ تن متوجہ تھے اور موضوع سے مقرر کے چہرے مہرے اور شاندار لب و لہجے میں کھوئے ہوئے تھے۔ سوچتے سوچتے وہ معلوم نہیں کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔

کالج کے پیچھے دور دور تک پُراسرار بنگلے اور کاٹج بنے ہوئے تھے۔ ان میں رہنے والے لوگ کسی دوسری دنیا کی مخلوق لگتے تھے۔ وہ زیادہ تر ریلوں میں یا سرکاری چھاپے خانوں میں ملازم تھے۔ جو پڑھے لکھے تھے وہ وکیل اور جرنلسٹ تھے۔ کچھ لوگ ریاستی سکریٹریٹ میں کلرکی کرتے تھے۔ عام طور پر وہ سب لوگ ریس کورس جاتے یا ریلوے انسٹی ٹیوٹ میں ہوزی کھیلتے۔ بڑے اہتمام سے کرسمس مناتے۔ مہینے کے شروع میں اچھے اچھے ہوٹلوں میں شراب پیتے دیکھے جاتے۔ پھر تاڑی خانوں میں جاتے اور آخر مہینے میں سارا وقت بیویوں کو مارنے پیٹنے اور ایرے غیرے سے قرض ادھار مانگنے میں گذارتے۔ ان لوگوں کے گھروں کی عورتیں کالج کے لڑکوں اور شہر کے رنگین مزاج نودولتیوں کے لیے بڑی کشش رکھتی تھیں۔ جب ان گھرانوں کی لڑکیاں کالج کے سامنے سے گزرتیں تو لڑکے بیہودہ مذاق کرنے اور آوازے کسنے سے باز نہ آتے۔ ان لڑکیوں کی دلکشی کا بڑا سبب یہ تھا کہ شہر کے عام رسم و رواج کے خلاف یہ سب تقریباً عریاں رہتی تھیں۔ ان کے نئی تراش وضع کے کٹے ہوئے بال، دوپٹوں کی قید سے آزاد اور مواج سینے اور ننگی ننگی ٹانگیں سبھی لڑکوں اور رنڈوں کے لیے ہیجان انگیز ثابت ہوتیں۔ انھی میں ہر سال سوا سال بعد کوئی ایسی ماہ پارہ بھی نکلتی جس کے حسن کے چرچے لال باغ کی گلیوں سے نکل کر کرسچن کالج، آئی ٹی کالج اور یونیورسٹی سے ہوتے ہوئے نینی تال اور مسوری تک بھی پہنچتے۔ پھر وہ مس لال باغ، مس نینی تال اور مس مسوری کسی لکھ پتی کا رتھ دار کے ساتھ کچھ دنوں محمد باغ کلب اور ڈکپورز، میں کھاتی پیتی یا ناچتی گاتی دیکھی جاتی۔ ان میں سے بہت سی فلموں میں کام کرنے کی

آزردے کر بسی جاتیں اور وہیں کی زیر زمیں برادری میں فٹ ہو کر کھپ جاتیں۔

شہر کی اسی "بین السطور" قسم کی برادری میں ہیملن کا گھرانا بھی تھا۔

جن دنوں شہر میں سہانی کے لڑکوں نے ادھم مچا رکھا تھا اور چھبلانی، لوتھرا، اور کول گھرانوں کی لڑکیوں کے حسن و جمال کے چرچوں سے ادھیڑ عمر کے ممبران کونسل اور اسمبلی کی رالیں ٹپکتی رہتی تھیں اور بندریا باغ اور ریج بنگلہ میں رات گئے ٹیکسیوں کی پراسرار گھوں گھوں سنائی دیتی تھی۔ انہی دنوں شہر میں ایک زبردست بم پھٹا —— اس کا نام زائرہ تھا۔

زائرہ یا زہرہ ہیملن گھرانے کی پانچویں لڑکی تھی۔ اس کی عمر زیادہ سے زیادہ سولہ یا سترہ برس رہی ہوگی۔ شروع شروع میں یہ پس منظر میں یوں رہی کہ ہر جگہ اس کی بڑی بہنوں کی حکمرانی تھی۔ وہ سب ایک سے ایک بڑھ کر خوبصورت، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اسمارٹ تھیں۔ اس گھرانے کے ہر بچے نے ہائی اسکول اول درجے میں پاس کیا تھا۔ لڑکیاں ٹینس، بیڈمنٹن اور تیراکی مقابلوں میں ہمیشہ آگے آگے رہتی تھیں۔ بڑی بہنیں سبھی آئی ٹی۔ یونیورسٹی۔ نینی تال اور مسوری میں اپنے اپنے دنوں میں پری جمالوں میں رہ چکی تھیں۔ زائرہ تنہائی پسند تھی۔ وہ ایک بھدا سا لانبا فراک پہنے لال باغ اسکول جاتی اور رات گئے الجبرا اور جیومیٹری میں جان کھپاتی۔

ہیملن کے گھرانے کی گذر اوقات کا نمایاں ذریعہ وہ نفیس بلیرڈ سیلون تھا جو انھوں نے اپنے نیم کاٹج اور نیم بنگلہ نما گھر کے سامنے ہی کھول رکھا تھا۔ وہاں شہر کے سبھی پیسے والے جمع ہوتے بظاہر بلیرڈ اور اسنوکر کھیلنے مگر دراصل بستر نواز خواتین سے ربط و ضبط بڑھانے میں مصروف رہتے۔

سائرہ، ماریہ، اور فاریہ سبھی اپنے اپنے زمانوں میں خوب دھومیں مچانے کے بعد اور مختلف مذہب و ملت کے ارباب نشاط کی خواب گاہوں سے ہوتی ہوئی زندگی کی ان منزلوں میں پہنچ چکی تھیں جہاں عورتوں کے موضوعات "ڈبے کے دودھ کے فوائد" بچوں کے دانت نکلنے کی تکلیف "نیپی ریش" اور "ڈاکٹر سوبھی کے ہاتھوں میں اللہ نے شفا دی ہے" تک محدود رہ جاتے ہیں۔

جب چھبرانی، سہانی اور لوتھرا کے گھرانوں کی پری جمالوں کے ہنگامے شہر میں گونج رہے تھے تو ہیملن کے بلیرڈ سیلون کا وجود ہی خطرے میں پڑا ہوا تھا۔ رات کو کھیلنے آنے والوں کا آنا تو تقریباً بند ہی ہو چکا تھا۔ دن کو بھی لکڑی والوں، چمڑے والوں اور تمباکو والوں کے گھروں کے بدشوق لڑکے شارک اسکن کی بش شرٹ پہن کر اسکولوں سے بھاگ کر آتے۔ فنگر چپس اور کافی کا آرڈر دیتے۔ مشکل سے ایک آدھ ٹیبل کھیلتے اور چار بجنے سے پہلے ہی واپس چلے جاتے۔ یہی بلیرڈ سیلون تھا جو دوپہر کے وقت اشتہا انگیز کھانوں کی خوشبو سے معطر رہتا تھا۔ کھانوں کے ساتھ ہی ٹھنڈی بیئر کی بوتلیں بھی چلتی تھیں۔ مگر اب تو یہ حال ہو گیا تھا کہ مسٹر میلکم ہیملن دوبارہ وکالت شروع کرنے کی سوچ رہے تھے اور اسی خیال سے انھوں نے اب روشن الدولہ کی کچہری بھی جانا شروع کر دیا تھا۔

اس زمانے میں مسز ہیملن کو ایک اور دھکا لگا۔ شروع سال میں لال باغ کی کلچرل کمیٹی کا جلسہ ہوا اور انتخاب میں مسز ہیملن بری طرح ہار گئیں۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ان کو سازش کر کے نکالا گیا تھا۔ مسز ہیملن نے اس میں اپنے پورے گھرانے کی سبکی دیکھی اور غصے میں انھوں نے زائرہ کو وہاں سے اٹھا لیا اور لورٹو کانونٹ میں بھرتی کرا دیا۔

"دی ریورنڈ مدر سپیریئر" نے زائرہ کو داخلے کے دو مہینوں بعد ڈرامہ ریڈنگ کے موقع پر دیکھا۔ وہ ٹھٹکیں اور اس پر بھرپور نظر ڈالی اور بات ختم ہو گئی۔

کرسمس کی آمد آمد کے سلسلے میں جب رومیو اور جولیٹ کے لئے استانیوں نے تلاش شروع کی تو "دی ریورنڈ مدر سپیریئر" نے ایک آمر مطلق کی طرح حکم دیا "جولیٹ کا پارٹ زائرہ کرے گی۔"

"زائرہ! ---- کون؟" مسز بنیلے کا منہ کھلا رہ گیا۔

"زائرہ؟ یہ کون بلا ہے؟" استانیوں اور لڑکیوں نے تعجب سے ایک دوسرے سے شکایت آمیز لہجے میں استفسار کرنا شروع کر دیا۔

"وہی جو لمبا سا فراک پہن کر آتی ہے۔ سیدھی مانگ نکالتی ہے۔ بہت لمبے بال ہیں ----"

وہاں بالوں کی تراش خراش کے عجیب عجیب نمونے اور فیشن ایجاد ہوتے تھے۔ زائرہ کے بے تحاشہ لمبے بال اور سیدھی مانگ وغیرہ سے تو اس کی ذہنی اور سماجی پسماندگی کا ہی احساس ہوتا ہے۔

تمام خوبصورت اور چٹاخ پٹاخ قسم کی اسمارٹ قسم کی لڑکیوں میں عام ناراضگی پھیلی ہوئی تھی اور دن گذر رہے تھے۔ چپ چاپ کسی چور کی طرح۔

۲۱ر دسمبر کی رات کو شہر میں یہ بم پھٹا۔

مقامی اخباروں کے علاوہ دلی کے بھی تمام اخبارات توصیفی کالموں سے بھرے ہوئے تھے۔

ریاست کے چیف سکرٹری شری بھو ندو نساؤ آئی سی ایس نے جو مہمانِ خصوصی تھے۔ ڈرامہ کے اختتام پر کہا: "میں نے انگلستان اور یورپ میں تقریباً دو درجن رومیو اور جولیٹ دیکھے ہیں۔ اس کے باوجود میں پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس طرح کی قدرتی جولیٹ جو خود شیکسپیئر کے تصور میں رہی ہوگی، میں نے آج ہی دیکھی۔ آج اگر یہاں ہالی وڈ کا کوئی فلم ساز ہوتا تو اس کی چیک بک میں صفر کی تعداد بڑھانے کے لئے جگہ چھوٹی پڑ گئی ہوتی۔"

زائرہ جھکتی ہوئی شرماتی ہوئی گھر پہنچی اور تھکن سے بے حال ہو کر بستر پر گرتے ہی بے خبر سو گئی۔

اس کو صبح پتہ چلا کہ شہر میں ہنگامہ کیا تھا۔ کسی کو یہ یاد ہی نہیں تھا اور نہ اخباروں میں ہی ذکر تھا کہ رومیو بے چارہ کون تھا ہاں جولیٹ کا نام شہر کے بچے بچے اور ہر کشہ تانگے والے کی زبان پر اس طرح تھا جیسے راج کپور اور مدھو بالا کا۔

"نو جیون" اخبار کے سامنے براتی لال پنواڑی کی دکان تھی۔ اخبار کے مہاتما سب ایڈیٹر شری گوکل جی جب ادھا پان کھانے پہونچے تو براتی لال نے بڑے چاؤ سے پوچھا: "اور بابو جی آپ نے جلیٹ دیکھی؟"

گوکل جی سپادک مہورے کی پھٹکار سن کر نکلے تھے اس لئے بڑی تلخی سے بولے: "ہاں بھیا ہم نے بڑی بڑی جلیٹیں (ذلتیں) دیکھی ہیں ----"

بلیرڈ سیلون میں پھر بہار آگئی۔ کالج کے آس پاس لمبی لمبی پیکرڈ اور بیوک ایٹ گاڑیاں پھر منڈلانے لگیں۔ انہی دنوں "دعا گاہ" کے پاس نئی اور صاف ستھری عمارت میں ایک نیا ریستوراں بھی کھل گیا۔ جہاں شہر کے گانے بجانے والے، یونیورسٹی کے بے فکرے، اسکولوں سے بھاگے ہوئے لڑکے اور پڑھائی لکھائی چھوڑ کر "بکیتی" اور آوارہ گردی کرنے والے جوان فلمی گانوں کے ریکارڈ سننے، چائے پینے اور گپ بازی کرنے کے لئے جمع ہونے لگے۔ یہ چائے خانہ اسی راستے میں تھا جدھر سے گرلز کالج کی لاریاں، میلا و دیالے کے ٹھیلے اور رئیس گھرانوں کی طالبات کے رکشے اور تانگے گذرتے تھے۔ زیادہ تر نوجوان اسی ریستوراں میں جمع ہوتے کیونکہ اسی راستے سے زائرہ بھی اسکول جاتی تھی۔ وہاں اب صبح شام میلہ سا لگا رہنے لگا۔

حافظ سیتا کا اکلوتا لڑکا موجود علی جو ہائی اسکول میں کئی بار فیل ہونے کے بعد پڑھائی چھوڑ چکا تھا اور اب قیصر باغ کے چائے خانوں

میں کیرم کھیلتے کھیلتے اچھا خاصا چیمپین ہوگیا۔ ایک بار پھر طلباء کے عام فیشن کے مطابق سائیکل کے آگے ایک فائل لٹکائے گھومنے لگا۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ اس سال پرائیویٹ ہائی اسکول کا امتحان دے رہا ہے۔

ایک دوپہر کو موجود عام طالب علموں کی طرح سائیکل سڑک کے کنارے "خ کرشیڈی گردو" میں داخل ہوا۔ وہاں کالج کے انٹر فائنل کے طلبا کے ساتھ ہی یونیورسٹی کے بھی کئی لڑکے تھے جو سب موجود کے ساتھی رہ چکے تھے۔ وہ سب جولیٹ پر بڑی بحث کر رہے تھے۔ شیکسپیر کی جولیٹ نہیں۔

قصہ یہ تھا کہ زائرہ کی خوبصورتی، بھولے پن اور اس کے ایک ایک بُن مو سے ہویدا اندازِ مہ جبی نے تمام لاخیرے اور بے فکرے جوانوں کے سینے تو چھلنی کر ہی دیئے تھے دوسری طرف بڑے بڑے طرم خاں، کیسانووا، اور "ہی مین" بھی جھلائے ہوئے تھے۔ کیونکہ جہاں زائرہ کی سادگی، اس کے ملکوتی حسن اور ذہانت کے تذکرے عام تھے وہیں یہ چرچا بھی اچھی طرح ہوگیا تھا کہ وہ اپنی بہنوں کی طرح "دیالو" نہیں ہے۔ کسی ایسی جگہ جاتی ہی نہیں ہے جہاں لوگوں کو اس سے ربط ضبط بڑھانے کا موقع مل سکے۔

"برادر کہہ رہے تھے ......" نوازش علی نے کچھ نئی گپ ہانکنے کی کوشش کی۔ نوازش علی انٹرمیجیٹ میں فیل ہوگیا تھا۔ وہ اپنی ہر بات اپنے بھائی سے منسوب کر کے کہتا۔ اس کا بڑا بھائی پولیٹیکل سائنس میں ریسرچ کر رہا تھا۔ چونکہ وہ خاندان کا پہلا شخص تھا جو پی ایچ۔ ڈی کر رہا تھا اس لئے نوازش علی اس کو کوئی فوق البشر مخلوق سمجھتا تھا اور اپنا ہر جملہ "برادر کہہ رہے تھے ......" سے شروع کرتا۔

بھاگ سنگھ سمجھ گیا کہ نوازش علی اب کوئی اونچی گپ ٹھونکنے والا ہے اس لئے بات کاٹ کر موجود سے بولا: "ابے وہ تیرا منتری جی کا سپوت کیا ہوا؟ بہت بنتا تھا کہاں گیا بھکوا؟ ختم ہوگئی سب طرم خانی؟"

سنہا بولا! "اب وہ کیا اب تو سالا اس کا باپ بھی آہیں بھر رہا ہے۔ نہرو جی کو پرارتھنا بھیجی ہے کہ اس کو سنٹر میں بلا لیں۔ یہاں اُلٹے پردیس میں اس کا پانسہ سیدھا نہیں پڑ رہا ہے ——"

سب لوگ ہنسنے لگے۔ موجود علی نے موضوع زیر بحث کی عام روش سے کوئی اختلاف کئے بغیر کہا: "بھائیو، ہم کو تو اب کوئی ایسا سالا رومیو دکھائی نہیں دے رہا ہے جو اس جولیٹ کی ......" باقی جملہ اس نے بڑی رواں اور فصیح عوامی زبان میں ختم کیا۔ لوگ ہنسے بھی اور کھسیا بھی گئے۔

ڈاکٹر حمید معاملے کو قدرے سنجیدہ رخ دیتے ہوئے بولا: "اچھا بیٹا یہ بتاؤ تم میں کتنوں نے جولیٹ کا نفسیاتی ارتقا پڑھا ہے؟"

"جولیٹ کا نفسیاتی ارتقا" ایک ادبی مضمون تھا جو اسی ہفتے کے "پائنیر" میں رتن ساہنی کے نام سے چھپا تھا۔ صرف فیروز سعید الدین اور ہربرٹ سموئیل چارلس نے ہی اس سے واقفیت کا اظہار کیا۔ فیروز نے اس وجہ سے کہ وہ ایم اے پارٹ ٹو انگریزی ادب میں کر رہا تھا اور چارلس نے اس وجہ سے کہ وہ پولس سروس کے مقابلے کی تیاری کر رہا تھا اور اخبارات بڑی توجہ سے پڑھتا تھا۔

فیروز نے پر اسرار انداز میں کہا: "مضمون تو اچھا تھا۔ تم کو پسند نہیں آیا؟ مسٹر سیڈاک ہیملن تو تعریف کر رہے تھے۔"

سیڈاک ہیملن زائرہ کے بڑے بھائی تھے۔ اچھے تجریدی آرٹسٹ تھے اور کافی ہاؤس کے ادبی حلقوں کی جان تھے۔

ڈاکٹر حمید نے ذرا غور سے فیروز کو دیکھا اور بولا: "بیٹا رتن ساہنی اگر ایسا مضمون لکھ سکتا تو بی اے پاس نہ ہو جاتا۔ وہ کیا اس کی سات پشتیں بھی نہیں لکھ سکتی ہیں۔"

موجود معنی خیز انداز میں اپنا سر اوپر نیچے کرتے ہوئے بولا: "اچھا! تو یار شمز یہ بات ہے ......"

بھاگ سنگھ معلوم نہیں کیوں خفا ہوگیا۔ تلخی سے بولا "ہاں یہ سالے آرٹیکل شارٹیکل سے کچھ نہیں ہوتا۔ ونڈیا کر تو ......" اس کے بعد اس نے زندگی کے بعض بنیادی حقائق کی طرف اشارہ کیا۔

نوازش علی پھر چہکا: "بیٹا یہ سب بیکار ہے۔ وہ جا رہی ہے انگلینڈ۔ وہاں اس کا انکل سب فٹ کرآیا ہے۔ برودر کہہ رہے تھے ......"

"تو پھر ہم لکھنؤ والوں کے مقدر میں اس کے حسن کی زکوٰۃ نہیں لکھی ہے!" سہانے بے فکری سے سگرٹ مٹھی میں دبا کر اس طرح کش لیا جیسے چلم پی رہا ہو۔ اس کے بعد اس نے چٹکی بجا کر سگرٹ کی راکھ چائے کی پیالی میں جھاڑ دی۔

اس وقت پھٹ پھٹ کی آواز قریب آئی اور شیڈی گروو کے برآمدے میں موتی پھوچیہ اور رتن ساہنی تنگ موہریوں کے پتلون کسے ہوئے اور پھولے پھولے اون کے بھدی آستینوں کے سوئٹر پہنے داخل ہوئے۔ رتن کے ہاتھ میں اسکوٹر کی کنجی تھی جس کو گھماتا ہوا وہ ایسی بے فکر انانیت کے ساتھ آرہا تھا جیسے اس پورے علاقے کا زمیندار ہو۔

"آؤ، آؤ، بیٹا۔ سناؤ سالے۔ کیا گیم ہے ــــ" وغیرہ وغیرہ۔ ان سبھوں نے کہا۔ رتن وہاں چالیس، ڈفر حمید اور خاص طور پر فیروز کو دیکھ کر ذرا دھیما پڑ گیا۔ وہ تینوں اچھے ڈویژن سے پاس ہوتے تھے جبکہ وہ خود دوسری بار بی اے میں فیل ہوگیا تھا۔ پھر بھی کچھ اس اعتماد کی بنا پر جو جیب میں رقم ہونے کی وجہ سے خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ ایک خاص انداز سے کرسی الٹی کرکے بیٹھا اور اس کی پشت پر دونوں ہاتھ لٹکا کر اس نے چائے یا کافی کے بجائے ٹوٹی فروٹی منگوائی۔ یہ بات ان سب کو کھلی۔ نوازش علی سے ضبط نہ ہوا۔ بولا: "برودر کہہ رہے تھے تمہارا آرٹیکل بہت اچھا تھا پانیر میں۔"

رتن کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ فیروز کی موجودگی میں وہ اس حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ قبل اس کے کہ وہ کچھ کہتا بھاگ سنگھ نے اپنی مخصوص کلبیت سے کہا: "کاش سالے تم اتنے ہی لائق ہوتے اور فیروز کو زحمت نہ دینا پڑتی ــــ"

فیروز سعید الدین عام طور پر اردو اور انگریزی میں مضمون اور محبت نامے لکھا کرتا تھا جو مختلف طلبا اپنی محبوباؤں کے نام بھیجتے تھے۔ اس خامہ فرسائی کے صلے میں وہ سب لوگ فیروز کی چائے، کافی اور ناشتے وغیرہ سے معقول خدمت کرتے رہتے۔ بھاگ سنگھ کے کہنے پر رتن شرمندہ ہونے یا بات کاٹنے کے بجائے باقاعدہ اکڑ گیا اور بولا: "بیٹا اصل لیاقت یہ ہوتی ہے (یہ کہہ کر اس نے پتلون کی پیچھے کی جیب تھپ تھپائی جس میں رقم سے بھرا ہوا بٹوہ خوب ابھرا ہوا تھا) یہ نہ ہو تو ساری لیاقت دھری رہ جاتی ہے۔ ہالی وڈ کے سبھی ایکٹر اسی لیاقت سے اپنی اپنی آٹو بیوگرافی لکھواتے ہیں۔ یہی لیاقت تمہارے شاعروں کو پالتی ہے۔ جس سالے کو دو دھیلا دو وہی ہمارے ایسے دولہوں کا سہرا لکھ دے گا ــــ"

فیروز کے چہرے پر پسینہ آگیا۔ پھر بھی وہ چپ ہی رہا کیونکہ اس کو یقین تھا کہ نوازش علی، بھاگ سنگھ اور رتن ساہنی میں ہو رہی تھی اس کا خیال صحیح نکلا۔ نوازش علی نے بڑا اوچھا وار کیا: "بات سالے تم سو فی صد سچی کہہ رہے ہو۔ برودر کہہ رہے تھے کہ اسی لیاقت سے لوگوں کے اولاد بھی ہو جاتی ہے۔"

ایک ثانیے کو وہاں سناٹا چھا گیا۔ یہ اشارہ ساہنی کے قریبی رشتے داروں میں ایک مشکوک ولادت کی طرف تھا۔

موجود نے بات ٹالتے ہوئے ماحول کو شگفتہ بنانے کی کوشش کے خیال سے کہا: "اور جناب فیروز سعید الدین صاحب آپ کی یاسمین بیگم صاحبہ کے کیا حال ہیں؟ سنا ہے آج کل گوپال سے پھنسی ہوئی ہیں ــــ"

سہانے مصنوعی تشویش ظاہر کرتے ہوئے کہا: "یہ تو بادشہ کلیر فاؤل ہے ــــ"

"کیوں ——" نوازش علی نے واقعی تعجب سے پوچھا۔

سہتا نے ایک اور سگریٹ سلگائی۔ اپنے ساتھیوں میں وہ واحد طالب علم تھا جس کے پاس باقاعدہ سگریٹ کیس رہتا تھا۔ پھر اس نے حسب معمول سگریٹ مٹھی میں دبا کر چلم کی طرح کش لیا اور فلسفیانہ انداز میں بولا "دیکھو پارٹنر۔ لونڈیا بازی کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔ محمڈن لونڈیا کو محمڈن چھیڑے گا۔ اور ہندو لونڈیا کو ہندو۔ نہیں تو نتیجہ نہائیں نہائیں" یہ کہہ کر اس نے ڈرامائی انداز میں بائیں ہاتھ سے چٹکی بجائی۔

"اور جو سکھنی ہوئی ——" بھاگ سنگھ بہت ہی مستعدانہ شرارت سے آنکھیں چمکا کر بولا۔

"تو تم کیا سالے مر گئے ہو ——؟" سہتا نے ایسے فیصلہ کن لہجے میں کہا گویا گھر کا کوئی بڑا بوڑھا نالائق جوانوں پر خفا ہو رہا ہو۔

"اینڈ وہاٹ اباؤٹ ہم بلڈی کرسچین لوگ بابا؟" چارلس نے ریلوے اسٹی ٹیوٹ کے متعلقین کے مخصوص لہجے کی نقل کرتے ہوئے کہا۔ سب کو ہنسی آگئی۔

فیروز نے بہت ہی مصنوعی اور نمایاں بیزاری کے ساتھ جماہی لی اور بولا "اچھا پارٹنر۔ ہم تو چلے بلیرڈ کھیلنے ——"

نوازش بولا "برادر کہہ رہے تھے کہ مسز ہیملن ایک ایک کو پہچانتی ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتی ہیں کہ کون بلیرڈ کھیلنے آتا ہے اور کون شکار کھیلنے"

فیروز پہلے سے چڑھا ہوا تھا۔ اس کی مسٹر سیڈاک ہیملن اور ان کے والد سے جان پہچان تھی۔ وہ بلیرڈ بھی بہت اچھی کھیلتا تھا۔ اس نے جھلا کر بولا "دیکھتے رہو بیٹا۔ میں بھی وہ پیٹر ڈالوں گا کہ جولیٹ بھی کیٹ[1] بن کر رہ جائے گی۔ مابدولت تو اس کا انڈے کے حلوے کی طرح ناشتہ فرمائیں گے۔ صبح سویرے۔ نہار منہ ——"

سب لوگ بے تحاشا ہنسنے لگے۔ بات ہی فیروز نے ایسی انہونی اور حماقت کی کہی تھی۔ موجو نے اٹھ کر دونوں ہاتھوں سے فیروز کا چہرہ اس طرح تھاما جیسے کوئی فوٹوگرافر کسی چنچل بچے کو نچلا بٹھانے کی کوشش کر رہا ہو "خدا کی قسم، پارٹنر اگر تم نے اس کا تجا بھی لے کر دکھا دیا تو اپنے حصے کی ساری جائداد تمہارے نام لکھا دوں گا ——"

حافظ میتا آموں کی تجارت کرتے تھے۔ کاکوری اور ملیح آباد میں ان کے آموں کے باغات تھے۔ اسی تجارت سے انھوں نے خاصی بڑی جائداد بنا لی تھی اور اپنے کو فروٹ سپلائر لکھنے لگے تھے۔ موجو ان کا اکلوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے اس ساری جائداد اور تجارت کا حقدار تھا۔

ڈاکٹر حمید بولے "چڑھ جا بیٹا سولی پر اب سوچتا کیا ہے۔ جب کہہ دیا ہے تو پھر کر کے بھی دکھا دے۔ حافظ میتا کی جائداد میں حصہ دلانے کا ذمہ ہمارا"

سب لوگ مذاق ہی مذاق میں فیروز کو چڑانے لگے۔ وہ تقریباً روہانسا ہو گیا۔ اس وقت گھنٹہ بجنے کی آواز آئی۔ کالج کے لڑکے کلاسوں کی طرف اور چارلس اور بھاگ سنگھ سائیکلیں سنبھال کر منکی برج کی طرف چل دیئے۔

مگر بات وہیں تک نہ رہی بلکہ پورے شہر میں پھیل گئی۔ یونیورسٹی میں لوتھرا، منچندا، چھبلانی اور سہانی وغیرہ نے فیروز کا ناطقہ بند کر دیا۔ رتن ساہنی سے تو اس کی بات چیت بھی بند ہو گئی۔ خود اس کے کلاس میں لڑکیاں اس کو دیکھ کر معنی خیز انداز میں اپنی ہنسی چھپانے کی کوشش کرنے لگیں اور مسز ہیملن نے جب سنا تو اپنے بلیرڈ روم میں دونوں کولہوں پر ہاتھ رکھ کر چلائیں "اگر اب کی

---

[1] شیکسپیئر کے مشہور طربیہ THE TAMING OF THE SHREW کی ہیروئن کیتھرینا جو بہت ہی خودسر اور بد دماغ تھی۔ اس کو کیٹ کہا جاتا تھا۔ ہیرو نے اس کو اس طرح قابو میں کیا کہ ایک سیدھی سادی بیاہتا اور گھریلو عورت بن گئی۔

نواب صاحب نے یہاں قدم رکھا تو اتنی جوتیاں لگاؤں گی کہ طبیعت ٹھکانے ہو جائے گی۔ میری بیٹی کو حرامی نے کوئی رنڈی سنڈی سمجھ رکھا ہے۔ کھال نہ کھنچوا دوں تو میں بھی کھرے گھرانے کی کرشچین نہیں ــــــ"

ہال میں موت کی سی خاموشی طاری تھی۔

فیروز سعیدالدین کا شہر میں رہنا مشکل ہو گیا۔ وہ یونیورسٹی چھوڑ کر لاپتہ ہو گیا۔ بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ واپس مراد آباد چلا گیا ہے۔ سنہاتے اڑاتی کہ سالے نے خودکشی کر لی اور نوازش علی نے کہا "برو ور کہہ رہے تھے۔ بھینسا کنڈ سے سالے کی لاش نکلی۔ سناتن دھرم والوں نے کریا کرم کرا دیا۔"

سہ پہر کا وقت تھا۔ مسز ہیملن برآمدے میں کرسی پر بیٹھی تھیں۔ اپنے پیر انھوں نے ایک مونڈھے پر پھیلا رکھے تھے اور بڑی لگن سے پیروں کے ناخنوں کو کھرچے جا رہی تھیں۔ کبھی کبھی وہ اپنے بائیں ہاتھ سے مکھیاں بھی اڑاتیں۔ ستمبر کا مہینہ تھا مگر مانسون کا زور ابھی تک نہیں گھٹا تھا۔ اس وقت رِیں رِیں کرتی ہوئی بوندا باندی جاری تھی۔ مسز ہیملن کی طبیعت اتنی بیزار ہو رہی تھی کہ اسی بارش میں کہیں نکل جانے کی سوچ رہی تھیں۔ ریڈیو پوری آواز سے کھلا تھا اور گا نا بج رہا تھا "برسات میں۔ تاک دِنا دِن برسات میں۔"

سیلون میں گھنٹی بجی۔ مسز ہیملن جوتیاں سڑپڑ کرتی ہوئی خود ہی اٹھ کر گئیں۔ سیلون کے اندر نیم اندھیرے میں ایک خوش پوش اور بجیلا نوجوان سکھ کھڑا تھا۔ مسز ہیملن نے روشنی کا بٹن دبایا۔ پورا ہال جگمگا اٹھا۔ روشنی میں انھوں نے دیکھا وہ لانبا اور بجیلا سکھ جوان شرماتے اور ڈرتے ہوئے انگریزی میں کہنے لگا "میں کانپور سے آیا ہوں۔ اسنوکر کا شوق ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ آپ کے یہاں سے اچھا کوئی سیلون شہر میں ہے ہی نہیں ــــــ"

مسز ہیملن نے تجربہ کار نگاہوں سے اس کو جانچا۔ وہ ایک نیلی ہلمین منکس پر آیا تھا اور چہرے مہرے سے اچھے گھرانے کا لگ رہا تھا پھر انھوں نے اک ایسے تپاک سے جس میں نخوت کی واضح آمیزش تھی، اس کو اپنی میزیں اور کھیل کی سہولیات دکھائیں اور سرراہے یہ ذکر بھی کر دیا کہ کھانے پینے کا بھی عمدہ انتظام ہے۔

"میرا نام جی وکرم ہے ــــــ" اس سکھ جوان نے اس بار خالص سکھ لب و لہجے میں کہا۔

"وکرم ــــــ" مسز ہیملن کو ایسا تعجب ہوا جس میں استفسار بھی واضح تھا۔ سکھ جوان نے ان کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا "ہم لوگ لاہور کے فیلتھم گھرانے کے ہیں۔ اب اِدھر بمبئی، دہرہ دون، دِلّی میں ہیں۔ میرا پورا نام وکرم سنگھ فیلتھم ہے۔ میری ماں جی سکھنی تھی۔" وہ اب بھی پنجابی لب و لہجے میں بول رہا تھا۔

وکرم شاید کچھ اور کہتا مگر مسز ہیملن نے اس کے خاندان میں کوئی دلچسپی لینے سے ایک طرح کی معذوری، اپنے خشک رویئے سے، ظاہر کی۔ وہ خود ایک مسیحی تھیں اور دوسرے مسیحی گھرانوں سے اچانک بے تکلف ہو جانے میں ان کی کوئی اسی طرح کی نفسیاتی کمزوری مانع تھی جیسے دلّی میں جب کسی مسلمان کو سب کے سامنے کسی دوسرے مسلمان سے ملنا پڑتا تو وہ دونوں اسلام سے اپنی زیادہ سے زیادہ ناواقفیت ظاہر کرنا ایک طرح کا فخر سمجھتے۔ یہ کمزوری تقریباً ویسی ہی تھی جیسی ہٹلر کی ترقی کے دور میں تمام دنیا کے یہودیوں کا مایۂ حیات بنی ہوئی تھی۔

وکرم سیلون میں آنے والوں کے بارے میں سوالات کرتا رہا۔ پھر اس نے ایک آدھ ٹیبل کھیلنے کی بھی کوشش کی۔ اس سے مسز ہیملن کو صاف اندازہ ہو گیا کہ وہ بالکل ہی نوآموز تھا۔ اب انھوں نے قدرے شفقت سے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا "تم دوپہر کو آیا کرو تو اچھا ہو۔ اس وقت یہاں جوشوا، درانی، خسرو اور آہوجہ جیسے اچھے کھلاڑی ہوتے ہیں۔ جو تم کو اچھی طرح سکھا بھی سکیں گے۔ تمہارا اپنا فائدہ بھی ہو گا اور سستا بھی پڑے گا۔"

وکٹر نے وعدہ کیا کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔ اس نے دستور بنا لیا کہ وہ دوپہر کے وقت آتا۔ ہلکا کھانا کھاتا ایک آدھ بیم کھیلتا اور پھر غائب ہو جاتا۔ مسز ہیلن اپنے ہر اُس گاہک کو پسند کرتی تھیں جو اُن کے سیلون میں بلیرڈ کھیلنے کے ساتھ کھانا بھی کھاتا تھا وکٹر کو بھی وہ پسند کرنے لگیں۔

چند ہی دنوں میں روزمرہ کے آنے والے وکٹر کو اچھی طرح پہچاننے لگے۔ وہ تھوڑی بہت پنجابی بولنے کی کوشش کرتا مگر شاید اپنی زبان سے وہ اچھی طرح واقف نہیں تھا کیونکہ ایک آدھ جملے کے بعد ہی وہ روانی سے انگریزی بولنے لگتا جیسے وہی اس کی مادری زبان ہو۔ اس نے دلی اور جھانسی میں اپنے بڑے کاروبار کا ذکر کیا۔ جب بھی کسی سے تعارف ہوتا اس کو وہ ایک خوبصورت کارڈ دیتا جس پر لکھا ہوتا "وکٹر سنگھ۔ پروپرائٹر روز کراکری۔ جھانسی" کارڈ پر دو تین ٹیلی فون نمبر بھی درج ہوتے۔ ایک بار کسی نے جھانسی کے سفر کے دوران میں روز کراکری اور وکٹر سنگھ کے بارے میں سرسری طور پر کچھ پوچھا جس سے وکٹر کی باتوں کی تصدیق ہی ہوئی۔

مسز ہیلن نے چرچ پہونچ کر ایک موم بتی خریدی اور پادری کے قریب پہونچیں۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ وکٹر سنگھ گھٹنوں کے بل بیٹھا دعا میں مصروف تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کو اپنے گرد و پیش کی کوئی خبر ہی نہیں تھی۔ مسز ہیلن نجات حاصل کر کے چلی بھی گئیں مگر وکٹر کی دعا ختم ہی نہیں ہوئی۔

دوسرے دن جب وہ کھانا کھا رہا تھا تو مسز ہیلن نے ہنس کر پوچھا: "تم کو دو موم بتیاں جلانے کی کیا ضرورت پڑ گئی؟"

وکٹر کے بہت سفید اور گورے چہرے پر شرم کی ایسی سرخی دوڑ گئی جو گھنی داڑھی کے باوجود نمایاں تھی۔ اس وقت مسز ہیلن نے پہلی بار غور کیا کہ اس کے گلے میں چاندی کی صلیب بھی لٹک رہی تھی۔ وکٹر نے بہت آہستگی سے کہا: "میں بہت گناہگار ہوں۔ اپنے بے شمار گناہوں کے اعتراف کے طور پر میں نے دو موم بتیاں جلائی تھیں ــــــ"

یہ بات اس نے ایسی معصومیت سے کہی کہ مسز ہیلن ہنسنے کے بجائے متاثر ہو گئیں۔ پھر تھوڑی دیر بعد بولیں: "ابھی تو تم کم عمر لگتے ہو۔ ویسے بھی تمہارے کون سے گناہ ہو سکتے ہیں جن کی بنا پر تم اپنے کو قابل ملامت سمجھ رہے ہو۔ اور پھر خدا تو رحمان و رحیم ہے وہ تو سب کو معاف کرنے والا ہے۔"

"بات یہ ہے کہ میں نے اپنے ماں باپ کا کہنا کبھی نہیں مانا۔ اب جب میں سارے کاروبار کا مالک ہوں تو یہی سوچ کر شرمندہ رہتا ہوں کہ بغیر محنت کے عیش کر رہا ہوں۔"

"ارے خیر یہ کوئی بات نہیں۔ عام طور پر اولاد کبھی والدین کا کہنا نہیں سنتی۔ یہ تو جب ہم خود والدین بنتے ہیں تبھی محسوس کرتے ہیں۔ تمہارا یہ احساس ندامت ہی تمہاری نجات کے لئے کافی ہے۔ یقیناً تمہارے والدین کی روح بھی اب مطمئن ہی ہوگی ــــــ"

"کاش ایسا ہی ہو ــــــ" وکٹر نے ایسی افسردگی اور خلوص سے کہا کہ مسز ہیلن بالکل چپ رہ گئیں۔

"مجھے اسنوکر کھیلنے کا ہمیشہ سے جنون تھا۔ اسی شوق میں میں نے تعلیم بھی ادھوری چھوڑ دی ــــــ" وکٹر اب بھی افسردگی آمیز گمبھیرتا سے بول رہا تھا۔

"مگر ــــــ؟" مسز ہیلن نے کچھ کہنا چاہا لیکن زبردستی اپنی زبان کو لگام دے گئیں

وکٹر ہنس پڑا: "آپ غالباً یہی کہیں گی کہ اگر مجھ کو ایسا ہی شوق تھا تو پھر میں نے اچھی طرح کھیلنا کیوں نہیں سیکھا۔ یہی نا۔" مسز ہیلن اس طرح چپ رہیں جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ واقعی یہی سوال کرنے جا رہی تھیں۔

"میں اصل میں بہت اچھا کھلاڑی ہوں۔ مگر آپ کے یہاں آنے والے ایسے اچھے کھلاڑی ہیں نہیں جن سے کچھ جیتا کیا جا سکے۔"

"خسرو کے بارے میں کیا خیال ہے ——؟" مسز ہیلن نے بہت تیکھے سے کہا۔ صاف ظاہر تھا کہ ان کو وکٹر کی بات پر ذرا بھی اعتبار نہیں تھا۔ پھر خسرو تو ان کے سیلون کے سب سے اچھے کھلاڑی تھے۔

"ہاں وہ اچھا کھیلتے ہیں ..... مگر ....."

وکٹر کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی مسز ہیلن نے غصے اور استعجاب سے کہا: "یہ تم کیا کہہ رہے ہو ——؟"

وکٹر نے ہاتھ جوڑ کر کہا: "معاف فرمایئے گا غلطی ہو گئی۔ آپ کو خدا کا واسطہ کسی سے اس بات کا ذکر نہ کیجیے گا ——"

مگر مسز ہیلن نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا: "تم اگر میرے سامنے ایک بار بھی خسرو یا آہوجہ کو ہرا کر دکھا دو تو تم جو کہو میں ہارنے کو تیار ہوں ——"

"یہ آپ مجھ کو آزمانے کے لئے کہہ رہی ہیں یا واقعی سنجیدہ ہیں اس بارے میں ——؟"

"آپ تم جو کچھ بھی سمجھو۔ تم میرے سیلون کے بارے میں کہہ کر اتنی آسانی سے بچ کر نہیں نکل سکتے ——"

"اور اگر فرض کیجیے میں نے دونوں کو ہرا دیا تو آپ کیا انعام دیں گی؟"

"اگر تم جیت گئے تو ان دونوں سے رقم لے کر تم کو دیدوں گی اور اگر وہ جیت گئے تو تم سے لے کر ان کو دیدوں گی ——"

"رہنے بھی دیجیے، مجھے کیا فائدہ؟ میں نے اپنے والد سے وعدہ کیا تھا کہ جوا کھیلنا چھوڑ دوں گا اور محنت سے کاروبار میں لگا رہوں گا۔ اور پھر یہ کہ اگر میں نے آپ کے اکھاڑے کے رستموں کو پچھاڑ دیا تو آپ کا سیلون بھی مدھم پڑ جائے گا ——"

مسز ہیلن خفا ہو کر اٹھ گئیں: "مجھ سے بچوں والے مذاق برداشت نہیں ہوتے ہیں۔ اگر تم کو کھیلنا نہیں آتا ہے تو جی لگا کر سیکھو اور اگر واقعی کھیلنا جانتے ہو تو مردوں کی طرح مقابلہ کرو ——"

وکٹر سنگھ نے اٹھ کر ہاتھ دھوئے اور تولیے سے پونچھتا ہوا کھانے کے کمرے میں واپس آیا اور بولا: "مسز ہیلن مجھے آپ کی شکست سے بھی ڈر لگتا ہے۔"

"میری؟" انھوں نے پلٹ کر واقعی غصے میں کہا: "میری فکر آپ نہ فرمائیں تو بہتر ہوگا۔" یہ کہہ کر وہ امیرانہ نخوت کے ساتھ ساری کا پلو سنبھالتی گھر کے اندرونی حصے کی طرف چل دیں۔

وکٹر نے کہا: "ذرا ٹھہریے گا ——"

"کیوں ——؟"

"اگر میں خسرو اور آہوجہ کو واقعی ہرا دوں تو آپ کیا انعام دیں گی؟"

"یہ بعد کی بات ہے — پہلے تم ہرا کر تو دکھاؤ — ورنہ فضول باتیں مت کرو ——"

"اچھا تو پھر آپ ان دونوں سے طے کر کے مجھے بتایئے گا ——"

خسرو اور آہوجہ برآمدے میں بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ مسز ہیلن نے بہت چالاکی سے یہ صورت بنائی تھی تاکہ ان کی باتوں میں کوئی مخل نہ ہو سکے۔ ڈائننگ ہال میں کچھ نوجوان لڑکے زور زور سے کالی پرشاد اور وزیا ووشی کے فضیحتے پر بحث کر رہے تھے۔ بلیرڈ سیلون سے گیندوں کی ٹک ٹک کی آواز آ رہی تھی۔ اس پرسکون ماحول میں مسز ہیلن اچانک بول اٹھیں: "خسرو صاحب آپ کو یہاں کسی نے ہرایا بھی ہے ——؟"

"کیوں نہیں۔ راجہ نجمن پور بہت اچھے کھلاڑی تھے۔ پھر وہ آپ کا فیروز سعید الدین بہت اچھا جا رہا تھا۔ ہاں مگر اب کوئی تو ایسا ہے نہیں ——"

"اور آہوجہ؟"

"ان سے تو برابری کی بات ہے۔ کبھی وہ جیتتے ہیں کبھی ہم۔ مطلب یہ کہ کوئی ایسا نہیں ہے جو چاروں خانے چت کرکے مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا نکل جائے۔"

"اور اگر کوئی ہو تو ــــــ؟"

"یعنی؟ ناممکن! میں اپنا سب کچھ ہارنے کو تیار ہوں ــــــ"

"اچھے جنرل کسی میدان کو آسان اور کسی بھی جھڑپ کو بچوں کا کھیل نہیں سمجھتے ہیں۔ اسی طرح اچھے کھلاڑیوں کو بھی ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔" مسز ہیلن نے کچھ ایسے تماشی لہجے میں کہا کہ خسرو کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

وہ بولا: "کیا بات کیا ہے۔ آج آپ خواہ مخواہ ــــــ"

اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی آہوجہ نے کہا: "بھئی ہم تو خود ہی رو رہے ہیں کہ اچھے کھیلنے والے نہیں رہے۔ اور اگر کوئی ہو تو ہمیں خوشی ہی ہوگی۔ ہمارے شہر کا نام پھر اچھے مقابلوں میں آنے لگے گا ــــــ"

مسز ہیلن تو معاملہ طے کرنے پر تلی تھیں اس لئے خاموش نہیں ہوئیں اور بڑھتی سی چلی گئیں: "اگر ہمارے ہی سیلون کا کوئی آدمی آپ دونوں کو ہرا دے تو ــــــ؟"

دونوں نے کچھ عجیب نظروں سے مسز ہیلن کو دیکھا۔ دونوں کو یقین ہوگیا کہ عورت کا دماغ کچھ ڈھیلا ہوگیا ہے۔ آہوجہ نے کہا "میں تو غریب آدمی ہوں۔ زیادہ نہیں پانچ سو نقد گن دوں گا ــــــ"

"اور آپ؟" مسز ہیلن نے خسرو کی طرف دیکھا۔

وہ بولا: "ایک ہزار فوراً گن دوں گا۔ باقی خطِ غلامی لکھ دوں گا ــــــ"

"نا نا نا۔ بابا۔ ایسا بڑا فیصلہ بیکار ہے۔ بس ایک ہزار ہی کافی ہوگا ــــــ" مسز ہیلن نے دھیرے سے کہا۔ ان کے لہجے میں کوئی سرگرمی نہیں بلکہ سا ایک خوف تھا جو خسرو اور آہوجہ سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔

دوسرے دن جب وکرم آیا تو بلیرڈ سیلون بھرا ہوا تھا۔ مسز ہیلن اس کی کہنی میں دھکا مار کر اس کو اپنے ساتھ الگ لے گئیں اور بولیں "اگر تم نے خسرو اور آہوجہ کو ہرا دیا تو ڈیڑھ ہزار تمہارے ہیں ورنہ ــــــ"

ان کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی وکرم نے اپنی نفاست سے کسی ہوئی سرخ پگڑی پر دونوں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: "آپ کیوں میرا عہد تڑوانے پر تلی ہوئی ہیں۔ میں نے وعدہ کر رکھا ہے کہ جوا نہیں کھیلوں گا ــــــ"

"یہ جوا نہیں اب میری عزت کا مسئلہ ہے۔ اگر تم پیچھے ہٹ گئے تو میری بڑی کرکری ہوگی، کیونکہ میں خود بھی خسرو کا غرور شکست ہوتے دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"مگر میں نے اپنی شرط تو آپ کے سامنے رکھی ہی نہیں ــــــ سنیئے گا ــــــ؟"

"کہو ــــــ"

"اگر میں یہاں سب کو ہرا دوں تو کیا آپ زائرہ سے میری شادی کر دیں گی ــــــ؟"

"کیا ــــــ؟" مسز ہیلن سناٹے میں آگئیں۔ وہ وکرم کو عجیب نظروں سے دیکھتی رہ گئیں۔

وکرم جانے کے لئے مڑا اور بولا "میں خود ہزاروں کا بیوپار کرتا ہوں۔ یہ ڈیڑھ ہزار روپلی کی رقم ایسی نہیں ہے جس کے لئے میں اپنے مرحوم باپ سے کیا ہوا عہد توڑ دوں۔ آپ سوچ کر بتائیے گا ــــــ"

وہ چلا گیا ۔۔۔ اور پھر تین چار دن تک نہیں دکھائی دیا۔

اس مدت میں مسز ہیلن نے اپنے شوہر، بیٹیوں اور دامادوں سے بھی علاحدہ علاحدہ ذکر کیا۔ ان کو تعجب ہوا کسی نے بھی برا نہیں مانا۔ سب لوگ ایک طرح سے وکٹر کے ہی طرفدار نظر آئے۔ بڑے داماد مسٹر ولیون بیٹرک نے بیئر کا بڑا گھونٹ چڑھاتے ہوئے ہاتھ کی پشت سے منہ پونچھا (انھوں نے ایک انگریزی فلم میں ہمفرے بوگارٹ کو اسی طرح بیئر پیتے دیکھا تھا) پھر مخلصانہ طور پر بولے "اچھا لڑکا ہے۔ پیسے والا ہے۔ باقاعدہ شادی کے لیے کہہ رہا ہے تو کیا نقصان ہے۔ اگر وہ اچھا چیمپین بھی ثابت ہوا تو ہمارے سیلون کے لئے مفید ہی ہوگا۔ یہ بھی دیکھئے ممی ۔۔۔"

مسٹر ولیون بیٹرک جب کبھی اپنی ساس کو ممی کہتے تو وہ نہال ہو جاتیں اور ان کے لئے کوئی نیا سوئٹر یا پتلون خرید دیتیں۔

مسز ہیلن مرے اینڈ سے ولائتی وسکی لے کر نکل رہی تھیں تو انھوں نے ظہور کی گیراج کے سامنے وہ نیلی پلی مینکس دیکھی جس پر دہلی کی نمبر پلیٹ لگی تھی۔ وہ شراب کا تھیلا سائیکل میں لٹکائے کالی عینک چڑھائے موٹر کو دیکھتی رہیں۔ تھوڑے انتظار کے بعد انھوں نے دیکھا کہ وکٹر سنگھ چاپنا شو اسٹور کے پستہ قد مالک مسٹر داود کے ساتھ باتیں کرتا آ رہا تھا۔ مسٹر داود نے مسز ہیلن کو دیکھتے ہی زور سے "مورننگ" کہا وکٹر نے بھی قدرے جھجک کے ساتھ ان کو سلام کیا۔ مسٹر داود کے واپس مڑتے ہی مسز ہیلن نے بڑے محاربانہ انداز میں کہا: "مجھے تمہاری شرط منظور ہے۔۔۔"

"اگر میں ہار گیا تو آپ کیا کریں گی ۔۔۔؟" وکٹر نے شوخی آمیز سنجیدگی سے پوچھا۔

"تو میرے لڑکے اور داماد مار مار کر تمہارا گو نکال دیں گے ۔۔۔"

مسز ہیلن ہمیشہ یہ فخر سے کہتی تھیں کہ وہ ایک بہت ہی اعلیٰ گھرانے کی کرسچین ہیں مگر غصے میں زبان ہمیشہ وہی استعمال کرتی تھیں جس کا شہر کے کسی بھی بھلے گھرانے میں کوئی چلن نہیں تھا۔

وہ اپنی سائیکل پر چڑھ کر گھنٹی بجاتی کیپیٹل سینما کے راستے لال باغ کی طرف چل دیں۔ لیکن جب وہ گھر پہونچیں تو انھوں نے دیکھا کہ نیلی پلی مینکس بلیرڈ سیلون کے سامنے کھڑی تھی اور وکٹر سنگھ مسز ہیلن سے پچھلی رات کے ریڈیو مشاعرہ کی تفصیل سن رہا تھا۔ مسٹر ہیلن بھی اردو میں شاعری کرتے تھے اور جس سے بھی ذرا سے بے تکلفی ہو جاتی اس کو بہت قدیمی انداز کی غزلیں سنا سنا کر بور کرتے تھے۔ ان کے اچھے معاصر، کہا جاتا ہے، اسی بنا پر شہر چھوڑ چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ اتفاق سے اسی وقت زائرہ کا رکشہ بھی وہاں پہونچا وہ اسکول سے آدھے وقت میں ہی واپس آ گئی تھی، ماں کو سامنے دیکھ کر جلدی سے "اوہ ممی" کہہ کر ان کے گلے لگ گئی۔ پھر اس کی نظر وکٹر سنگھ پر پڑ گئی۔ اس کے چہرے پر نامعلوم خوشی۔ شرم اور جھجک کے ملے جلے اثرات دھنک کے رنگوں کی طرح پھیل گئے۔ مگر وکٹر نے اس کی طرف قطعی کوئی توجہ نہیں کی۔

مقابلہ تو خوب دھوم دھام کا رہا۔ اصل شرط کا علم نہ خسرو کو تھا اور نہ آہو جہ کو۔ اتوار کو دو بجے دن سے رات کے آٹھ بجے تک خسرو اور وکٹر برابر کھیلتے رہے۔ خسرو زیادہ تر قریم ہارتا رہا مگر شکست ماننے پر تیار ہی نہیں تھا۔ ایک بار تو ایسا ہوا کہ وکٹر نے "بریک" کیا اور پوری میز صاف کر دی۔ خسرو کی باری ہی نہ آ پاتی۔ یہ پہلا موقع تھا جب حاضرین نے وکٹر کے لئے بھی تالیاں بجائیں۔ ورنہ ابھی تک سب لوگ خسرو ہی کی ہمت افزائی کر رہے تھے اور اس کے ہر بریک پر تالیاں پیٹتی تھیں۔ خسرو جھنجھلایا ہوا تھا اور پسینے میں شرابور۔ وہ عمر میں وکٹر سے اٹھارہ سال بڑا تھا۔ اس وجہ سے تھکا تھکا بھی تھا جب کہ وکٹر ابھی تک تندہی سے کھیلے جا رہا تھا۔

آخر میں تھک کر مسز ہیلن ہی نے قطعیت کے ساتھ کہا: "ماننا نہ ماننا خسرو صاحب کی مرضی پر ہے۔ ہم نے بہر حال فیصلہ کر لیا کہ مقابلہ

بلکہ نہ ہی رہا اس لئے آج کا کھیل ختم ——۔،

خسرو پشیمانی اور غصے میں پسینہ پونچھتا ہوا ہال سے نکل گیا۔ سب لوگ اس طرح ساکت اور خاموش تھے جیسے اچانک کوئی مر گیا ہو۔ آہو جہ خاموشی سے چک بک نکال کر پانچ سو کا چک لکھا اور مسز ہیلن کے سامنے کرسی پر ڈالتے ہوئے بولا: "میں نے وکٹر کو اپنے سے بہتر کھلاڑی مان لیا ہے۔ فضول مقابلے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ——۔،

پائنیر کے چک صاحب، نیشنل ہیرالڈ کے بنجامن صاحب، رفاہ عام کلب کے قدوائی صاحب، میڈیکل کالج کے پروفیسر دینا ناتھ اور نادان محل روڈ کے خواجہ صاحب وغیرہ سب ہی افسردہ تھے کیونکہ خسرو کی شکست سے تو ان کے پیارے لکھنؤ کی ناک ہی کٹ گئی تھی۔

تھوڑے ہی دنوں بعد شہر کے اخباروں میں مسٹر اور مسز ہیلن کی چھوٹی بیٹی زائرہ کی منگنی کی خبر چھپی۔ شہر کے سارے کیسانووا، منچلے، رنگیلے اور عیش پرست حلقوں میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ سب کو یہی تاسف تھا کہ زائرہ کی بڑی بہنیں تو کچھ دن بہار جانفزا دکھلا گئیں مگر زائرہ —— وہ تو بِن کھلے ہی "ایک سیدھی سادی گرہستن بننے جا رہی تھی۔ اس کا ہونے والا شوہر اسنوکر کا ایک بلند پایہ کھلاڑی اور بہت پیسے والا کاروباری تھا شادی کے بعد ہی دونوں یورپ کے لئے روانہ ہونے والے تھے۔

شادی کے انتظامات خوب زور شور سے ہوئے۔ مسز ہیلن نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر جہیز کا انتظام کیا۔ سب بہنوں نے بھی قرض ادھار لے کر وکٹر کو شہزادہ بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

شادی کی تقریب کرسمس کے زمانے میں ہی ہوئی۔ یہ وہی دن تھے جب ایک سال پہلے زائرہ نے جولیٹ کا پارٹ کر کے شہر میں ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ اب آج کل ہر جگہ شادی کے دعوت ناموں کا ہی چرچا تھا۔ "کون بلایا گیا ہے اور کون نہیں بلایا گیا ہے" پر لامتناہی بحثیں ہو رہی تھیں۔

محمد باغ کلب میں شاندار ڈنر ہوا۔ وکٹر کی طرف سے کانپور کے کچھ بیوپاریوں نے شرکت کی۔ یونیورسٹی کے سارے منچلے اور شیطان بغیر بلائے ہی پہنچے ہوئے تھے اور عجیب عجیب فحش کلمات کے ساتھ وکٹر کی تعریف کر رہے تھے۔ اور آریہ سماج کے فرقہ پرست لیڈر نسری یادو نے فی البدیہہ سہرا لکھ کر لائے تھے اور اپنی "دو شاخہ" آواز میں ترنم کے ساتھ سنا رہے تھے۔

وکٹر نے کارلٹن ہوٹل میں شب عروسی بسر کی۔

دوسری رات کو دولہا دلہن دس بجے کی گاڑی سے دلی روانہ ہوئے۔ زائرہ کی بہنوں اور رشتہ داروں نے ایرکنڈیشنڈ ڈبے کو سجا کر حجلہ عروسی میں بدل دیا۔ مسٹر اور مسز ہیلن نے آنسو پونچھتے ہوئے دعائیں دیں۔ بہترین خواہشات، دعاؤں اور تمناؤں کے جلو میں گاڑی کوڑیالے سانپ کی طرح لہراتی رات کی تاریکی میں دلی کی طرف چل دی۔

صبح ہوتے زائرہ گہری نیند سے بیدار ہوئی۔ وکٹر وہاں نہیں تھا۔ وہ انتظار کرتی رہی۔ گاڑی چلنے لگی تو اسے وحشت ہوئی۔ اس نے زنجیر کھینچ دی۔ لوگ آئے۔ پوچھ گچھ ہوئی۔ زائرہ برابر یہی کہتی رہی کہ وہ اپنے دولہا کا انتظار کر رہی ہے۔ آخر میں ریلوے والوں نے جھنجھلا کر اس کا سارا سامان اتار کر غازی آباد پر رکھ دیا اور پولیس نے مسز ہیلن کو تار بھیجا کہ وہ اپنی بیٹی کو لے جائیں۔ وہ یہاں غازی آباد کے مسافر خانے بیٹھی اپنے دولہا کا انتظار کر رہی ہے!

مسز ہیلن کے داماد اپنی آستینوں میں ریوالور چھپائے وکٹر کی کھوپڑی توڑنے دہلی پہنچے۔

ایک نوجوان اور بے حد اسمارٹ عورت نے خفگی سے ان کا استقبال کیا۔ "وکٹر سنگھ وتم لوگوں کو اس سے کیا لینا ہے؟ اس نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ وہ تو ایک سال سوا سال سے لندن میں ہے۔ اپنے کاروبار کے سلسلے میں ....

مسز ہیلن کے داماد وں نے جلدی جلدی پلکیں جھپکاتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھا۔

مسز ویلون پیرک بولے: "معاف فرمایئے گا آپ کون ہیں ـــــ؟"

"میں؟ میں اس کی بیوی ہوں۔ اور یہ ـــــ ہمارا بچہ ہے۔" اس نے خفگی سے کہا اور پھر محبت سے ایک بہت ہی خوبصورت بچے کے بال سنوارنے لگی۔

فیروز سعید الدین کو شیڈی گرووز میں دیکھ کر بھاگ سنگھ زور سے چلّا اٹھا: "اخاہ۔ سالے آپ کہاں سے ٹپک پڑے، ہم تو سمجھے ڈوب مرے ـــــ"

پھر دوسرے لوگ بھی آگئے۔ سبھی لوگوں نے محبت اور گرمجوشی سے اس طرح فیروز کا استقبال کیا جیسے وہ واقعی کوئی یوسفِ گم گشتہ ہو جو اب کنعان لکھنؤ میں واپس آگیا ہو۔ رتن ساہنی بھی سب کچھ بھول کر بے ساختہ اس کے گلے لگ گیا۔ ڈاکٹر حمید نے فیروز کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "اور سنا بیٹا؟ تمہیں خبر بھی نہیں۔ وہ چڑیا اُڑ گئی۔ گئی ولایت ـــــ"

فیروز کو ہنسی آگئی۔ وہ ایک ثانیے کو ٹھٹکا اور خود بخود ہنسنے لگا۔ چند ہی ثانیوں میں اس کی ہنسی نے ایک سیلاب کا روپ دھار لیا۔ وہ ہنستا چلا جا رہا تھا۔ اس کا منہ بالکل لال ہو گیا تھا۔ وہ بیچ بیچ میں رک کر آنکھیں پونچھتا۔ ہنسی روکنے کی کوشش کرتا اور پھر بے ساختہ دونوں ہاتھ سے اپنا پیٹ دبا کر ہنسنے لگتا۔ اس کو ہنسی کا کوئی ایسا خوفناک دورہ پڑ گیا تھا کہ بھاگ سنگھ اور ڈاکٹر حمید ڈر سے گئے۔ دونوں کا خیال تھا کہ سالے کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔

صرف رتن ساہنی نے غور سے فیروز کو دیکھا۔ کچھ ہنسا اور اپنے اسکوٹر پر بیٹھ کر پھٹ پھٹ کرتا کسی طرف نکل گیا۔

شبلی صاحب چونکے۔ جلسہ ختم ہو چکا تھا۔ عورتوں کی مظلومی اور ان کے حقوق پر لن ترانی کرنے والے مولانا صاحب تو پتہ نہیں کب کے سدھار چکے تھے۔

جدیدیت کے پجاری

ٹووڈٹلیوسن
ترجمہ : نصر ملک

ٹووڈٹلیوسن، اُنیس سو اٹھارہ میں ڈنمارک کے دارالحکومت کوپن ہیگن میں پیدا ہوئی۔ اس کا بچپن اور جوانی شہر کے غریب ترین علاقے میں گزرا۔ اس کی نظموں کا پہلا مجموعہ ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا اور اسے شہرت سے سرفراز اور ادبی سطح پر بلند مقام کر گیا۔ اس کے بعد اُس کی نظموں اور کہانیوں کے کئی مجموعے یکے بعد دیگرے شائع ہوئے۔ اس کا ناول "گفتے" جو ڈینش زبان میں "شادی" اور "زہر" کے معنی دیتا ہے شہرتِ دوام حاصل کر چکا ہے۔ اس کی کہانیاں سماج کے ان پہلوؤں کی نشاندہی کرتی ہیں جو اکثر غائب رہ کر انسانیت کو دبوچے رکھتے ہیں۔ ڈینش ادب کی اس مشہور و معروف شاعرہ اور ادیبہ نے ۱۹۷۶ء میں اپنی زندگی اپنے ہاتھوں ختم کر ڈالی۔ (مترجم)

گریٹے مر چکی ہے۔

اس کو دفن بھی کیا جا چکا تھا اور تجہیز کے اس موقع پر میں پہلی بار اس کے خاندان والوں سے ملا۔ گریٹے کی ماں اس کی قبر پر کھڑی آنسو بہا رہی تھی۔ اس نے جب اپنی پرنم آنکھوں سے مجھے دیکھا تو مجھے وہاں سے کھسکنا پڑا۔ اب تک مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ گریٹے شکل و صورت میں اپنی ماں سے اس قدر گہری مشابہت رکھتی تھی۔ میرا سُسر ماتمی لباس پہنے اُدھر ایک طرف بیٹھا ہوا تھا اور اس نے ہاتھ گھٹنوں پر رکھ کر مٹھیاں بھینچ رکھی تھیں۔ وہ اپنے اردگرد کے سارے منظر سے کافی مزمن دتھرد دکھائی دے رہا تھا۔ "گریٹے زندگی بھر کبھی ایک دن کے لئے بھی تو بیمار نہیں پڑی تھی۔" اس نے آہستہ سے بمکلا بی کی۔ گریٹے کے تینوں بھائی جن کے بارے میں ہمیشہ سے میرا خیال تھا کہ وہ محض دیہاتی ہیں۔ اب مجھے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بھی کسی نہ کسی پہلو سے گریٹے کے ساتھ مشابہت ہی نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کی حرکات و سکنات بھی اس سے ملتی جلتی تھیں۔ میں ان سب میں پائی جانے والی اس مشابہت کو کسی بھی طرح قابو نہیں کر سکتا تھا کہ اُسے اپنی کتاب کے صفحوں میں ایک پھول کی طرح یادگار کے طور پر محفوظ کر لوں، بالکل اُسی طرح جیسے میں نے ایک بار گریٹے کے خدوخال کو اپنی کتابِ دل میں محفوظ کر لیا تھا۔ اس کے ہونٹوں کے کونوں سے چھلکتا ہوا تبسم، اس کی آنکھوں کے نور کی کرنیں، اس کا اپنے ہاتھ کو بلند کر کے اپنے سر کے گھنے سنہری بالوں کے اوپر سے اشارہ کرنا ـــ کتنا جاذب اور پُرکشش ہوا کرتا تھا ـــ ایسے موقع پر جہاں ہم سب آج اکٹھے تھے ـــ چپکے سے ایسی خاندانی مشابہت و مماثلت کی جھلک کا ظاہر ہونا اور پھر اچانک پلک جھپکتے ہی غائب ہو جانا ـــ میرے لئے ظاہری آنکھ سے نظارے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا!

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اب وہ سبھی ایک ایک کر کے رخصت ہو چکے تھے — اب یہاں مکمل سکوت اور خلوت تھی، بالکل اسی طرح جیسے میں اپنی ذات میں سکوت اور خلوت محسوس کر رہا تھا — لیکن نہیں۔ میری ذات میں یہ خالی پن یہ خلوت تو گریٹے کی موت سے کہیں پہلے ہی مجھے محسوس ہونی شروع ہو چکی تھی۔

گریٹے کی ماں، پادری کی طرف سے تجہیز و تکفین کی رسم ادا ہونے کے دوران میں مجھے مسلسل دیکھتی رہی تھی اور پادری بڑے عجیب و غریب طریقوں سے روحانی کرتب دکھا رہا تھا لیکن میں ان سے ذرا بھر بھی متاثر نہیں ہوا تھا۔ میرا باپ خود ایک پادری تھا اور اُسے اس طرح کے مذہبی فریضے اور رسوم ادا کرتے دیکھ دیکھ کر مجھے پادریوں کے خداؤں میں کوئی خاص دلچسپی اور تجسس نہیں رہا تھا۔ جب کبھی میرے باپ کا ایک گرجا گھر سے دوسرے گرجا گھر میں تبادلہ ہوتا یا وہ کوئی نیا عہدہ قبول کرتا تو اس کا بس ایک ہی کہنا ہوتا تھا کہ اس نے یہ سب کچھ خدا کی ہی ہدایت اور اُسی کی مرضی کی وجہ سے قبول کیا ہے، لیکن یہ بھی دلچسپ صورت حال تھی کہ خدا نے اُسے کبھی پہلے سے زیادہ آمدنی یا منافع والا موقع یا ملازمت مہیا نہیں کی تھی۔

گریٹے کی ماں شاید اس وجہ سے بھی مجھے بغور دیکھ رہی ہو کہ وہ میری آنکھوں میں گریٹے کی موت کی وجہ سے پیدا ہونے والے رنج اور افسوس کا اندازہ کرنا چاہتی ہو لیکن میری آنکھوں میں ایسا کوئی غم موجود ہی نہیں تھا۔ میں تو گریٹے کے لئے ہمیشہ ہی مغموم رہا کرتا تھا۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ میرے اس مستقل غم اور گریٹے کی بے وقت غیر ضروری موت کا ذمہ دار کون تھا!

میرے خیال میں گریٹے کی موت اس ڈاکٹر کی وجہ سے نہیں ہوئی تھی جسے گریٹے کی موت کے بعد اُس کی قیمت اپنے "پریکٹنگ لائسنس" کی ضبطی کی صورت میں ادا کرنی پڑی۔ میرے نزدیک وہ بھی ہماری طرح محض ایک بدقسمت تھا۔ کسی کی موت کے لئے حیلے بہانے کس کو یاد رہتے ہیں۔ اس خالی کمرے میں اب مجھے ڈر آنے لگا تھا اور میں اس سے دور بھاگ جانا چاہتا تھا۔ میرے سینے میں آگ کے آلاؤ بھڑک رہے تھے — کیا گریٹے میری وجہ سے مر گئی تھی؟ — اور گریٹے کیا تجھے محض اس لئے مرنا تھا کہ مجھے تمہارے پیٹ میں کسی اور مرد کے بچے کی موجودگی برداشت نہ تھی؟ اور میں اس بچے کی پیدائش کو ہرگز قبول نہیں کر سکتا تھا۔ کیا کسی ایک کی موت دوسرے کو مجرمانہ غلطی کا احساس دلاتی ہے یا یہ کسی ایک کا کسی دوسرے مرنے والے کے متعلق محض ایک واہمہ ہوتا ہے — گریٹے! کیا ہمیشہ موت کی ہی جیت ہوتی ہے؟ کیا تم اپنے کفن میں لیٹی مجھ زندہ کو الزام دے رہی ہو؟ نہیں نہیں! گریٹے تو کسی کو بھی الزام نہیں دے سکتی۔ اس کی ماں کا مجھے گہری نگاہوں سے دیکھنا آج خطرے سے خالی نہیں لگ رہا تھا — لیکن گریٹے کے خاندان والوں نے خود مجھ سے اس کی موت کے بارے میں کیوں کچھ نہیں پوچھا تھا؟ میرے ذہن میں سوالات کے یہ تابڑ توڑ حملے جاری تھے — کیا کوئی ماں اپنی بیٹی کی موت پر ایسی وضاحت سے مطمئن ہو سکتی ہے جیسی گریٹے کی ماں نے میری آنکھوں میں تلاش کرنے کی ناکام کوشش کی تھی؟

گریٹے سے میری ملاقات اُن دنوں ہوئی تھی جب میری پہلی کتاب شائع ہو کر بازار میں آئی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے عوام میں مقبول ہو گئی تھی۔ میری اس کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں ایک ڈاکٹر کی ادب نواز بیوی نے میری نہ صرف مدد کی تھی بلکہ اُس نے بعض ایسے ادیبوں، مصنفوں، مصوروں اور فنکاروں سے میرا تعارف بھی کرا دیا تھا جن کی وجہ سے میں خود کو بہت حد تک مطمئن اور ایک طرح سے خوش نصیب سمجھنے لگا تھا۔ کم و بیش ایک سال تک میں اپنے دوستوں کے حلقے میں خصوصی طور پر متحرک رہا اور ان سے استفادہ کرتا رہا۔ اسی دوران میں کوپن ہیگن کے نواح میں گریٹے سے میری ملاقات آماسکوائیر میں ایک پارٹی میں ہوئی۔ پہلے پہل گریٹے میں مجھے کوئی دلچسپی محسوس نہ ہوتی اور میں نے اُسے اٹھارہ بیس برس کی اُن

دوسری چھوکریوں کی طرح کی ایک چھوکری تھی جو ہمارے حلقے میں کبھی ایک تو کبھی دوسرے کے پہلو کی زینت بنتی اور پھر "خوب سے خوب تر" کی جستجو میں وہاں سے ایسے ہی غائب ہو جاتی تھیں جیسے چپکے سے داخل ہوتی تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ گریٹے پہلی نظر میں مجھے پُرکشش لگی تھی اور ابھی تک میرے کسی ساتھی کے ساتھ اس کی کوئی خاص دوستی بھی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن وہ جلد ہی میرے ذہن سے اُتر گئی اور جب کبھی ہمارے حلقۂ احباب میں "اس رات کی پارٹی" کا ذکر چھڑا کبھی اس کا تذکرہ نہ ہوا۔ اُن دنوں میں کوپن ہیگن میں ایک متوسط طبقہ کے علاقے میں رہ رہا تھا اور اکثر اپنے دوستوں کے ساتھ گھر سے باہر ہی رہتا تھا۔ لیکن ایک دن میں گھر لوٹا تو دیکھا کہ وہی لڑکی میرے دروازے کی دہلیز پر بیٹھی ہوئی ہے۔ میرے قدموں کی آہٹ سُن کر اس نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا اور مسکراتے ہوئے کہنے لگی "تم نے کبھی مجھے فون کیوں نہیں کیا؟" میں کچھ بھی وضاحت نہ کر سکا۔ وہ نہایت پُرکشش دکھائی دے رہی تھی اور میں نے دروازہ کھولتے ہوئے اسے اپنے ساتھ اندر آنے کی دعوت دی۔ مجھے ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ایسا کیوں ہوا — میں آج بھی اپنے ماضی پر جتنا غور کرتا ہوں الجھن اتنی ہی اور بڑھنے لگتی ہے۔ مجھے اپنے ماضی کی زندگی کے واقعات کے آغاز کی وجوہات جاننے اور یاد رکھنے میں سخت دشواری ہوتی ہے اور میں کبھی بھی یہ یاد نہیں کر سکتا کہ میری زندگی کا فلاں واقعہ کیسے رونما ہوا۔ اور میں زندگی کے جس موڑ پر ہوں یہ رُخ میں نے کیسے بدلا؟ شاید میرے ہی ساتھ ایسا نہیں، لوگوں کی زندگی میں اچانک کوئی اور نمودار ہوتا ہے اور ان کے محسوس ہوئے بغیر زندگی یک دم اتنی بدل چکی ہوتی ہے کہ اس کا احساس مشکل ہو جاتا ہے۔

گریٹے بھی میری زندگی میں بالکل ایسے ہی داخل ہوئی تھی — ہوا کے جھونکے کی طرح یا پھول کی خوشبو کی مانند — جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے گریٹے وہ پہلی لڑکی تھی جس نے مجھے اپنی بھرپور محبت سے نوازا تھا اور میرے ساتھ پیار کیا تھا۔ لڑکیوں کے سلسلے میں، میں نے ہمیشہ خواہشات کا قتل کیا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ کئی لڑکیوں نے مختلف پارٹیوں کے دوران مجھے اپنے ٹیلی فون نمبر خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر دیئے لیکن میں نے ان کو کبھی فون نہ کیا۔ ان لڑکیوں میں شاید کوئی نہ کوئی ایسی تو ہو گی جو آج تک میرے فون کرنے کا انتظار کر رہی ہو گی یا اس نے کیا ہو گا۔ میرا حلقہ احباب اخلاقی طور پر وسیع الذہن، قدامت گری کی ہڈیاں توڑنے والا، جدید اور بڑا کھلا تھا اور اگر اس میں کوئی اخلاقی پابندی تھی بھی تو میں ہمیشہ اس سے بے خبر رہا ہوں، شادی شدہ اور منگنی شدہ عورتوں سے میں ہمیشہ دور رہا ہوں۔ "جہاں بیکری میں تازہ کیک فراوانی سے مل جائیں وہاں باسی ڈبل روٹی کھانے سے فائدہ!" میں جانتا تھا کہ میرے بعض دوستوں کو میرا یہ طریق پسند نہیں ہو سکتا تھا۔

شروع شروع میں گریٹے کو میں محض دل کا ایک بہتر کھلونا سمجھتا رہا — مجھے اعتراف ہے کہ میں اس کے خیال میں ایک طرح سے کھویا کھویا بھی رہنے لگا تھا — وہ ہر معاملہ میں مجھ سے مشورہ لینے لگی تھی یہاں تک کہ اگر اس نے اپنے لئے کپڑے خریدنے ہوں، میک اپ کا سامان خریدنا ہو یا پھر کوئی فلم ہی دیکھنی ہو تو وہ میرا مشورہ ضرور طلب کرتی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے مشوروں پر بہت ہی زیادہ انحصار کرنے لگی تھی۔ میں اپنی رائے میں کبھی اپنے حکم کو شامل نہیں ہونے دیتا تھا اور محتاط رہتا تھا اور اپنے مشورے کی قبولیت کے لئے میں نے اس پر کبھی دباؤ نہیں ڈالا تھا۔ میرا مشورہ محض ایک رائے ہوتی تھی۔ لیکن یہ عجیب بات تھی کہ وہ کرتی وہی تھی جو میں کہتا تھا۔ اس طرح میری خود اعتمادی میں بھرپور اضافہ ہوا اور میں آہستہ آہستہ اس کی محبت میں گرفتار ہونے لگا لیکن شاید محض کہنا کہ "میں آہستہ آہستہ اس کی محبت میں گرفتار ہونے لگا" غلط ہو کیونکہ اس میں کسی بھی قسم کا کوئی "عاشقانہ پہلو" شامل نہ تھا۔ اپنی اس محبت کو میں گریٹے کے

لئے اپنی "ہمدردی" بھی نہیں کہہ سکتا — شاید آپ اسے "محبت و ہمدردی" دونوں ہی کہہ سکیں لیکن اس میں "عشق کا جنون" شامل نہ تھا۔ گریٹے بھی میری اس محبت یا ہمدردی سے سرشار تھی اور مجھ پر اتنا انحصار کرنے لگی تھی کہ اب ہر معاملہ میں مجھ پر تکیہ کرتی تھی — خود میں کبھی کبھی حیران ہوتا تھا کہ "اس شام" جب وہ میرے گھر کی دہلیز پہ میرا انتظار کرتے ہوئے مجھے ملی تھی تو اس سے پہلے، وہ کیسے گزارہ کرتی رہی ہو گی۔

گریٹے ایک دفتر میں ملازم تھی اور اچھی خاصی تنخواہ پاتی تھی۔ میں مختلف ادبی و علمی رسالوں اور جرائد کے لئے افسانے، کہانیاں اور مضامین لکھتا تھا — میرا لکھا ہوا ناول کافی شہرت حاصل کر چکا تھا اور اس کی وجہ سے میری تحریریں بھی کافی مقبول تھیں۔ میں اپنے اس پیشہ سے مطمئن تھا اور خوب کما لیتا تھا۔ ہم دونوں کے پاس اگرچہ اپنا اپنا الگ الگ فلیٹ تھا لیکن ہم روز اکٹھے رہتے تھے۔ کبھی اس کے ہاں اور کبھی میرے ہاں — پھر ایک دن ہم نے سوچا کہ جب رہتے ہم اکٹھے ہیں تو دو فلیٹ رکھنے کا فائدہ؟ ہم نے اپنے اپنے فلیٹ چھوڑ دیئے اور ایک بڑا فلیٹ مشترکہ طور پر لے لیا — مجھے معلوم نہیں کیوں، لیکن گریٹے اپنے خاندان والوں سے بدظن تھی۔ وہ انہیں منہ نہیں لگانا چاہتی تھی اس لئے ہم دونوں نے نہایت خاموشی سے اپنی شادی کی رسم پوری کی — شادی کی شام ہم نے اپنے ہی حلقۂ احباب کے ساتھ "بڑا کھانا" کھایا — اب ہم کوپن ہیگن کے نواح میں ایک خوبصورت فلیٹ میں منتقل ہو چکے تھے — دو کمروں پر مشتمل بڑی سی بالکونی، آرام دہ باورچی خانہ اور سب سہولتوں سے مزین غسل خانہ، ہمیں اور کیا چاہیئے تھا! ہاں ہمارا فرنیچر قدرے پرانا ضرور دکھائی دیتا تھا۔ میرے پاس میرے باپ کا دیا ہوا کچھ فرنیچر تھا جو وہ گرجا گھر میں بطور پادری استعمال کرتا رہا تھا اور گریٹے قدرے جدید طرز کا اپنا فرنیچر اٹھا لائی ہوئی تھی۔ یہ فرنیچر اس نے مختلف دکانوں سے خریدا ہوا تھا۔

ہم دونوں اپنے اس فلیٹ میں بہت خوش تھے۔ مجھے اعتراف ہے کہ شادی کے بعد مجھے زندگی کے بہت ہی عجیب و غریب مسرت و راحت آمیز لمحے میسر آئے — قدرت کی بنائی ہوئی — پتلی تماشا — گریٹے اب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی زندگی بھر میرے تحفظ میں تھی — مجھے اس سے خوشی کا احساس ہو رہا تھا — کبھی کبھی میں رات گئے — نیند سے بیدار ہو کر بتی جلا کر اُسے سفید چادر اوڑھے سوتی ہوئی دیکھتا رہتا — ایسے میں اس کا بچوں کی سی معصومیت سے درخشاں چہرہ، بجلی کی روشنی میں اور بھی چمکنے لگتا اور اس کے گال تو گویا گلاب لگنے لگتے تھے — میرا یہ احساس کہ میں اب کبھی اکیلا نہیں ہوں گا مجھے بہت تقویت دیتا۔ میں نے ایک مرتبہ اپنی شادی کے موضوع پر اپنی محبت سے بھرپور ایک نظم لکھنے کا ارادہ بھی کیا تھا — میں اس کی محبت میں ویسے تو کئی نظمیں لکھ چکا تھا لیکن میں نے اپنی یہ نظمیں اُسے کبھی پڑھ کر سنائی نہیں تھیں۔ آخر ایک بار میں نے اُسے اپنی ایک نظم سنائی جو اس نے مجھ سے لے لی اور پھر بڑے فخر سے اس نے میری وہی نظم، ایک موقع پر ہمارے دوستوں کو سنا ڈالی۔ اس موقع پر جب وہ نظم سنا رہی تھی میں کمرے سے باہر نکل گیا۔ اُسے جب معلوم ہوا کہ میں نے اس کی یہ حرکت پسند نہیں کی تو اُسے بہت صدمہ اور دُکھ ہوا — لیکن اُسے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ میں نے اس کی یہ حرکت پسند کیوں نہیں کی تھی۔ میرے خیال میں میری اپنی تخلیقات کے متعلق میرا اپنا رویہ ایک مخصوص نظریاتی رویہ رہا ہے۔ میری تحریروں میں یہ تاثر ملتا تھا کہ میں کسی سے "متاثر" ہوں۔ اپنے اس احساس پر مجھے بذاتِ خود ندامت محسوس ہوتی تھی اور میں اسے اپنے سینے میں ایک پھانس کی طرح محسوس کرتا تھا۔ مجھے اس وقت سخت کوفت اور اذیت ناک احساس کا سامنا کرنا پڑتا تھا جب

کوئی میرے اس پہلو کا تذکرہ کرنے لگتا تھا اس لئے میں نے کسی کو کبھی ایسا کرنے کے لئے موقع ہی نہیں دیا تھا۔ میرے پہلے ناول پر نقادوں اور تبصرہ نگاروں نے جس طرح اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا اس سے میں محض مطمئن ہی نہ تھا بلکہ اس سے میرے کندھوں پر میرا سر اور اونچا ہو گیا تھا۔ کتابوں کی کسی دکان کی کھڑکی سے مجھے اگر میری کتابوں کی ایک جھلک دکھائی پڑ جاتی تو میں ذرا رُک کر اُسے دیکھے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ میرے نزدیک ایک لکھاری کے لکھنے کا عمل اتنا عظیم اور اتنا شخصی ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے ہی لکھے ہوئے الفاظ میں اس کیفیت کو بیان نہیں کر سکتا جس سے گزر کر اس نے کوئی کہانی، افسانہ یا نظم تخلیق کی ہو ـــــ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ بعض اوقات قاری کسی مصنف کی تحریر میں " وہ اپنی بانہوں میں ایک عورت کو لئے کھڑا اس کے ہونٹوں پر اپنے بوسے نثار کر رہا تھا" کی طرح کے جملے پڑھتا ہے تو وہ ایسے جملوں سے حاصل کردہ اپنے لطف کا اظہار کرنے کی بجائے مصنف کے طرزِ بیان پر اس کے لئے ندامت محسوس کرنے لگتا ہے۔

میرے اپنے حلقہ میں شامل لڑکیوں کے علاوہ بھی ایسی درجنوں لڑکیوں سے میری ملاقات ہو چکی تھی جو میرے خیال میں "مجھے اچھی طرح سمجھتی تھیں" اور میری تحریروں پر میرے ساتھ بحث و مباحثہ اور تبادلۂ خیال کرنے کی خواہش مند بھی دکھائی دیا کرتی تھیں لیکن اس طرح کی ہی لڑکیوں سے تو میں دور بھاگتا تھا ـــ گریٹے کا کردار مجھے ان سب لڑکیوں سے کہیں الگ، منفرد اور اپنی جگہ پر مثبت محسوس ہوتا تھا۔ گریٹے نے آہستہ آہستہ میرے متعلق رائے قائم کر لی تھی کہ میری تحریریں محض پیسہ کمانے کے لئے ہوتی ہیں ـــــ میں اس دن خوب قہقہہ لگا کر ہنسا تھا جب گریٹے نے اپنی اس رائے کا مجھ پر انکشاف کرتے ہوئے مجھے مشورہ دیتے ہوئے پوچھا تھا کہ پھر میں کوئی ڈرامہ کیوں نہیں لکھتا ـــــ اس طرح میرے پاس رقم کی کمی نہ رہے گی ـــــ مجھے اب اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا ـــــ مجھے اپنی وہ چھوٹی سی نظم گریٹے کو نہیں دینی چاہیئے تھی جو اس نے بھری محفل میں اس رات سُنا دی تھی۔

گریٹے اور میری شادی کو ہوئے ابھی چھ مہینے ہی گزر رہے تھے کہ گریٹے کو اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑ گئے۔ میں ہی نہیں ہمارے جاننے والوں میں بھی ایسا کوئی نہیں تھا جو اُسے ذاتی طور پر کسی اور جگہ ملازمت دلا سکتا۔ اس کے بے روزگار ہو جانے پر میں کچھ زیادہ فکرمند نہیں تھا بلکہ میں اس سے لطف اندوز ہونے لگا ـــــ میں اکثر گھر پر ہی تو رہتا تھا ـــــ گھر میں اُسے اپنے اردگرد گھومتے، تیزی سے میز کرسیوں کی جھاڑ پونچھ کرتے، فرش دھوتے، کھانا بناتے اور میز پر لگاتے ہوئے ـــــ اُسے دیکھ کر مجھے عجیب سی مسرت و راحت ہونے لگتی تھی۔ وہ ایک معصوم ننھی بچی کی طرح جو بہت سے کھلونوں میں گھری ہو ـــــ خود کو ہر وقت مصروف رکھتی تھی اور اس کے اسی انداز پر میں خوش تھا ـــــ لیکن اب سوچتا ہوں تو یوں لگتا ہے کہ نہیں! گریٹے صرف وہی کام کرتی تھی جو بذاتِ خود اُسے پسند ہوتا تھا۔ وہ ایسے کسی کھلونے سے نہیں کھیلتی تھی ـــــ جو اُسے پسند نہ ہو۔

ہمارا ایک دوست "منصور" تھا اور وہ اکثر و بیشتر ہمارے ہاں آیا کرتا تھا۔ اس کی بیوی اونچے قد والی ایک ایسی نوجوان عورت تھی جو اپنے اطوار میں قوت کا عمل زیادہ رکھتی تھی۔ بعض اوقات اس کے ساتھ گفتگو اُس کے تند پنے اور لہجہ کی ترشی کی وجہ سے ناممکن ہو جاتی تھی۔ اس کمزوری کے باوجود نہ صرف وہ ذہین تھی بلکہ دیکھنے والوں کے لئے اس میں جاذبیت بھی تھی ـــــ مجھے اُس پر اس وقت غصہ آ جاتا جب وہ اپنی اس ذہانت و قابلیت کو گریٹے پر آزمانے لگتی تھی۔ ہمارے حلقے کی سبھی لڑکیوں میں آج کل ہمنگوے کی تازہ کتاب ـــــ "شیلے کی منتخب نظمیں" موضوعِ بحث بنی

ہوتی ہے لیکن گریٹے ان کی اس بحث وغیرہ میں شامل نہیں ہوتی تھی حالانکہ وہ دوسری لڑکیوں کی طرح اس "حقیقت کا اظہار" کر سکنے کے قابل تھی کہ "شیلے کی شہرہ نظمیں کیا ابدی پیغام دیتی ہیں ــــ لیکن نہیں، گریٹے تو ایسے ادبی موقعوں پر میرے پہلو میں صوفے پر بیٹھی میرے کندھے سے سر لگائے میرے سویٹر پر یوں ہاتھ پھیرتی رہتی جیسے ایک بلی کو سہلا رہی ہو وہ اس طرح کی ادبی محفلوں میں بھی اپنے ہی رنگ میں ہوا کرتی تھی ــــ "کل میری ملاقات ٹام سے ہوئی" ــــ "سیفرڈ بہت اچھا انسان ہے" وغیرہ وغیرہ ــــ گریٹے اس بات کا خیال کئے بغیر کہ لوگ یقیناً اس سے ادبی گفتگو کی توقع کرتے ہوں گے ــــ وہ ادھر ادھر کی ایسی باتیں کرنے سے ذرا بھر بھی ہچکچاتی نہیں تھی ــــ شاید میرے لئے اسے اپنی محبت پر ابھی تک بھرپور اعتماد تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ میں کیا چاہتا ہوں اور کیا پسند کرتا ہوں اور میں اس کی کس بات پر خوش یا ناخوش ہو سکتا تھا ــــ لیکن اُس کے اس غیر موضوعاتی رویے کی اگر کوئی اور وجہ ہو ــــ جیسا کہ میں سمجھتا ہوں ــــ ضرور کوئی وجہ ہوگی ــــ لیکن مجھے یہ وجہ کبھی بھی معلوم نہ ہو سکی۔

جس عمارت میں ہمارا فلیٹ تھا جونہی وہاں ایک اور فلیٹ خالی ہوا اور اس کے دروازے پر "کرائے کے لئے خالی ہے" کا بورڈ ہر آنے جانے والے کو متوجہ کرنے لگا ــــ سونیا اور آرنے اس میں آ گئے اور اس طرح ہم "احباب" ایک دوسرے کے مزید قریب ہو گئے ــــ اور عملی طور پر بھی دن ہو کہ شام ہم ایک دوسرے کے ہاں آنے جانے لگے اور اکثر راتوں میں تو کئی کئی گھنٹے اکٹھے بیٹھے رہتے۔ سونیا اور گریٹے تو اب اکثر و بیشتر اکٹھی ہی رہنے لگی تھیں۔ میں جب کبھی شہر سے گھوم پھر کر واپس آتا اور گریٹے اگر گھر پر موجود نہ ہوتی تو اُسے تلاش کرنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی ــــ میں آرنے اور سونیا کے فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹاتا اور دروازہ کھلتے ہی میرے سامنے گریٹے کھڑی مسکرا رہی ہوتی۔ سونیا اور آرنے دونوں کے ساتھ ہماری اس دوستی نے ہم دونوں کے لئے ایک مشکل کھڑی کر دی تھی اور وہ یہ کہ ہم دونوں اب زیادہ تر اپنا وقت اُن کے ساتھ گزارنے لگے تھے اور ہمارے پاس اپنے لئے، اپنے معاملات، معمولات اور ان سے بھی بڑھ کر اپنے ازدواجی تعلقات پر بات تک کرنے کا بہت ہی کم موقع ہوتا تھا بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ہمارے پاس اب خود اپنے لئے بالکل وقت نہیں ہوتا تھا۔ اب نہ تو ہم کبھی اپنے ہنی مون سفر کا ذکر کرتے تھے اور نہ ہی ہمیں بیتے دنوں کی یادوں میں مستقبل کے بارے میں بات کرنے اور سوچنے کا موقع ملتا تھا۔ گھریلو ضروریات اور باہمی دلچسپی کے پہلوؤں پر بات کئے تو ہمیں عرصہ ہونے والا تھا۔ میرے لئے یہ صورتِ حال اب شاید ایک الجھن میں بدل رہی تھی۔ لیکن پھر بھی میں نے گریٹے کے لئے اپنی توجہ کو جاری رکھنے کی کوشش میں فرق نہ آنے دیا۔ مجھے شک ہے کہ گریٹے کو میری یہ کوشش ایک طرح سے احسان مندی محسوس ہونے لگی تھی اور اسے کسی کا احسان مند ہونا اور خاص کر کسی مرد کا احسان مند ہونا تو کسی بھی طرح قطعی پسند نہیں تھا۔ اگرچہ میں بھی باتونی نہیں ہوں لیکن گریٹے تو اب بالکل ہی خاموش رہنے لگی تھی۔ آرنے اور میں ایک دوسرے کے پاس گھنٹوں کوئی بات کئے بغیر بیٹھے رہتے تھے۔ جب میں اور گریٹے اپنے گھر پر ہوتے تو میں اپنے ٹائپ رائٹر پر اپنے مسودے ٹائپ کرنے میں مصروف رہتا لیکن اب گریٹے نے میرے مسودوں کو پڑھنے کی خواہش کا بھی کبھی اظہار نہیں کیا تھا اور نہ ہی میں نے کبھی اُسے ایسا کرنے کو کہا تھا۔

اب آہستہ آہستہ ہم اپنے فلیٹ ہی میں خاموشی کی دھند کا شکار ہوتے گئے۔ ایسی خاموشی جس میں دم گھٹنے لگے اور انجان سا خوف لمحہ بہ لمحہ بڑھنے لگے اور آنکھیں سوال تو کریں لیکن ہونٹ جواب دینے کی قوت سے محروم ہو جائیں ــــ

گریٹے کی صورتِ حال کا تو مجھے اندازہ نہیں لیکن میرا حال ایسا ہی تھا جیسے اس طرح کے ماحول میں ہونا چاہیئے تھا۔ مجھے اس وقت خوفناک مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا جب گریٹے کو دیکھتے ہوئے بھی میری نظریں اس کی نظروں سے چار نہیں ہو پاتی تھیں۔ میں بعض اوقات ٹائپ کرتے کرتے اپنی نظریں گریٹے کے چہرے پر جما دیا کرتا تھا اور پھر ٹائپ رائٹر کو ایک طرف دھکیل کر کرسی پر بگلا بن کر بیٹھ جاتا تھا اور بس! ایک دن میں نے گریٹے کو اس کمرے میں جہاں میں اپنی لکھائی پڑھائی کا کام کرتا تھا، بلایا ــــ وہ آئی تو میں نے اس سے پوچھا کہ وہ یوں خاموش اور ناراض کیوں ہے؟ میرا اتنا پوچھنا تھا کہ گویا یکدم خزاں چھا گئی ہو یا ایسا طوفان آگیا ہو جس نے اپنے پیچھے درد و کرب کے سوا کچھ بھی نہ چھوڑا ہو۔

"میں بھی دوسری لڑکیوں کی طرح رہنا چاہتی ہوں" گریٹے بولی۔ اس کی آواز اور لہجے میں ایک طرح کا "دبدبہ" تھا۔ "میں بھی کسی سے کم نہیں ہوں ــــ مجھے بھی آزادی چاہیئے ــــ مکمل اور کھلی آزادی!" وہ بولے جا رہی تھی۔

میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں اور میرے سامنے ایسے مناظر گھومنے لگے جن کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے ایسے وسوسوں اور اندیشوں نے گھیر لیا جو میرے تحت الشعور میں تو شاید کبھی موجود رہے ہوں لیکن میرے ذہن یا لب پر کبھی نہیں آئے تھے۔ گریٹے کی طرف سے "مکمل اور کھلی آزادی" کے مطالبے نے میری "مردانگی" کے "مرمر" کو پاش پاش کر دیا تھا۔ گریٹے کے لیے مجھے اپنے مخلصانہ پن اور ایک "ایماندار شوہر" ہونے پر تو کوئی شک نہیں تھا البتہ مجھے اس کی طرف سے میری ہی بیوی نہ ہونے پر شبہ ہی نہیں بلکہ یقین ہونے لگا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو قابو میں رکھتے ہوئے گریٹے سے پوچھا "کیا اب تم مجھ سے محبت نہیں رکھتی ہو؟"

"یہ مجھے ابھی معلوم نہیں" گریٹے نے کہا ــ "ہاں تم اگر مجھے میری آزادی لوٹا دو تو شاید میں پہلے سے بھی کہیں زیادہ تمہیں محبت کرنے لگوں۔"

"تو کیا تم طلاق لینا چاہتی ہو؟" میں نے پوچھا ــ میری حیرانگی بڑھنے لگی تھی اور مجھے غصہ بھی آنے لگا تھا۔

"نہیں تو! یہ خیال تمہیں کیسے آیا؟ میں طلاق نہیں لینا چاہتی" گریٹے نے بڑی بے چینی اور اضطراب سے جواب دیتے ہوئے کہا "ایسے وہم اپنے دل سے نکال دو ــــ کیا تم نہیں سوچ سکتے کہ میں آزاد ہوں گی تو تم بھی خود بخود آزاد اور خود مختار ہو جاؤ گے"

ہماری بحث طوالت پکڑتے ہوئے تو تو میں میں پر اُترنے ہی والی تھی کہ میں نے خود کو اس سر درد سے بچانے کے لئے اپنے آپ کو پیچھے دھکیل لیا اور اُسے اس کی مرضی پر چھوڑ دیا ــــ میری طرف سے وہ مکمل آزاد اور خود مختار تھی ــ اس کے بعد گریٹے کو میں نے کبھی چھُوا تک نہیں تھا ــــ ہاں البتہ اس کی موت سے صرف چند لمحے پہلے ــــ میں نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ کیا چاہتی ہے؟

ہماری اس روز کی تو تو میں میں کے بعد بھی اگرچہ اس کے قہقہے ــــ ہمارے گھر کے کمروں میں مندر کی گھنٹیوں کی طرح سنائی دیتے رہے تھے۔ لیکن میرا ٹائپ رائیٹر خاموش ہو چکا تھا۔ میرے لئے کام کرنا اب بالکل ناممکن ہو چکا تھا۔ وہ جب بھی کبھی کمرے میں اِدھر اُدھر گھومتی میرے قریب آ کر اپنے بازو میری گردن کے گرد ڈالتی تو میں دانستہ اس کی گرفت سے آزاد ہو جاتا۔ اس کے لئے میرا رویہ ہمیشہ سرد رہنے لگا تھا۔ میں اس کے خلاف سختی کے اظہار کے لیے ہر موقع تلاش کرنے میں لگا رہتا اور کوئی ایسی وجہ یا بہانہ تلاش کر ہی لیتا جس کی بنا پر میں اُسے ایک آدھ تھپڑ لگا سکتا تھا۔ میں جو جنسی لحاظ سے اس میں کبھی بھی کوئی خاص کشش محسوس نہیں کرتا تھا اب اپنے دل میں اس کے لئے

خواہشوں کے آلاؤ لئے ہوئے تھا۔ لیکن اس کے باوجود میں نے کبھی اُسے تفریح تک کے لئے ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ میرے اس رویّے پر وہ کافی پریشان اور مشکل میں تھی۔ میرا ذہن اُس وقت مجھے نہایت پُرسکون اور بالکل اعتدال پر لگتا تھا جب میں اُسے اذیت و تکلیف سے دوچار کر دیتا تھا۔ ایسا کرتے ہوئے مجھے ایک طرح سے سکون اور مسرت ہونے لگتی تھی۔۔۔۔ معلوم نہیں وہ بھی کس مٹی سے بنی ہوئی تھی ۔۔۔۔ ایک دن وہ خود ہی کہنے لگی "ذرا سوچو تو، جب آپ گھر سے کہیں باہر جاتا ہے تو سونیا اس کی قمیض ہی استری نہیں کرتی بلکہ اس کی روانگی سے پہلے اس کی نکٹائی تک درست کر کے اپنی تسلی کر لیتی ہے کہ وہ بارعب اور پُرکشش دکھائی پڑے ۔۔۔۔ تمہارے خیال میں کیا یہ اچھا نہیں ہے؟" اتنا کہنے کے بعد وہ یوں ہنسنے لگی جیسے کسی شریر بچے کو ڈانٹ پلائی جائے اور وہ کمرے میں پردے کے پیچھے کھڑے ہو کر ہنسنے بھی اور رونے کی کوشش بھی کرے۔

میں نے محسوس کیا کہ گریٹے روز بروز سونیا کے انداز اپناتی چلی جا رہی ہے۔ اس کے چلنے۔ بیٹھنے اور باتیں کرنے کے انداز میں مدبرانہ پن پیدا کرنے کی کوشش کرنا، سبھی کچھ سونیا کی ہی طرح تھا۔ اس نے اب وہی کتابیں پڑھنا شروع کر دی تھیں جو سونیا کی الماری میں پڑی رہتی تھیں۔ اس کے کپڑوں اور میک اپ میں بھی سونیا کے ہی انداز کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔

میں وہ شام کبھی فراموش نہیں کر سکتا جب گریٹے پہلی بار گھر سے اکیلی باہر گئی تھی ۔۔۔۔ اس نے دیہاتی لڑکیوں والا روایتی لباس پہنا ہوا تھا۔ اپنے اس لباس میں وہ ایک پھول کی مانند لگتی تھی اور بے شک وہ جب بھی یہ لباس زیبِ تن کرتی تھی اُسے دوسری عورتوں کی طرح اپنے رخساروں پر پاؤڈر کی دھول جمانے اور ہونٹوں پر سرخی لگانے کی ضرورت نہیں رہتی تھی۔ اس شام جب وہ یہی لباس پہنے گھر سے چلنے ہی والی تھی تو میں نے پوچھا "کہاں جا رہی ہو؟"

"دیکھو! میرا خیال تھا کہ میں شاید تمہیں بتا ہی دوں ۔۔۔۔ لیکن اب جبکہ میں بالکل آزاد ہوں تو تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیئے اور نہ ہی کچھ پوچھنا چاہیئے کہ میں کہاں جا رہی ہوں یا کیا کرنے والی ہوں۔" اس نے بڑی بے رُخی سے جواب دیا تھا۔

اس کے اس جواب سے میرے اندر کوئی ایسی چیز رونما ہوئی کہ میں خود یہ بتانے سے قاصر ہوں کہ وہ کیا شے تھی ۔۔۔۔ پہلے تو میں غصّہ سے ایک طرح پاگل ہو گیا اور پھر بالکل یکسر حواس باختہ سا ۔۔۔۔ لیکن جونہی میں نے گریٹے کی غضب ناک آنکھوں میں دیکھا ۔۔۔۔ میرا سارا غصّہ ہرن ہو گیا اور میں خاموش بت بنے اُسے گھر سے باہر جانے کے لئے دروازے سے نکلتے دیکھتا رہا ۔۔۔۔ گھر سے باہر نکل کر جونہی اس نے اپنے پیچھے زور سے دروازہ بند کیا۔ مجھے طرح طرح کے خیالات نے آن گھیرا ۔۔۔۔ وہ کسی مرد کے ساتھ کسی رقص گاہ میں ناچ رہی ہو گی ۔۔۔۔ نہیں نہیں وہ یقیناً کسی کی آغوش گرم کر رہی ہو گی ۔۔۔۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ کسی مرد کے ساتھ ۔۔۔۔! نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا ۔۔۔۔ لیکن عین ممکن ہے کہ اگر وہ بذاتِ خود ایسا نہ بھی چاہتی ہو تو بھی کوئی مرد اُسے زبردستی ایسا کرنے پر مجبور کر دے ۔۔۔۔ لیکن کوئی زبردستی کیوں کرے گا ۔۔۔۔ آج کل تو وہ خود اس بات کی منتظر لگتی تھی کہ کوئی اُسے اپنی باہنوں میں لے لے ۔۔۔۔ میں اپنے انہیں خیالات کے بھنور میں اذیت ناک کرب کی شدت سے دوچار تھا ۔۔۔۔ اب تو یقیناً وہ کسی کا بستر گرم کر رہی ہو گی۔ میری اس کرب ناک حالت میں اب مزید اضافہ ہو رہا تھا۔

مجھے، ہمارے حلقے کے احباب کی وہ تقریب بھی یاد آ رہی تھی جس کے دوران میں گریٹے ہمارے ایک مصور دوست کے ساتھ فرش پر محوِ رقص تھی اور رقص کرتے کرتے اس مصور نے گریٹے کا بوسہ لینے کے لئے جونہی اپنے ہونٹ گریٹے کے رُخسار

کے قریب کئے تھے اس نے نہایت پھرتی سے اپنا چہرہ لٹو کی طرح دوسری طرف گھما لیا تھا ـــــ ہمارے حلقے میں یہ ایک نہایت ہی غیر معمولی بات سمجھی گئی تھی لیکن مجھے اس سے روحانی و قلبی خوشی کا احساس ہوا تھا۔ گریٹے کی اسی طرح کی دوسری باتوں اور طرزِ عمل سے اس کے لئے میری محبت ٹھوس اور مضبوط ہو گئی تھی۔ میں اسے اپنے لئے قدرت کا ایک عطیہ سمجھتا تھا۔

کبھی کبھی یہ سوچ کر میں خود کو تسلی دے دیتا تھا کہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے شاید وہ محض وقتی طور پر جدیدیت کی پٹڑی پر رواں ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ خود ہی سنبھل جائے گی۔ مجھے معلوم تھا کہ سونیا اور آرنے اور ہمارے "حلقۂ احباب" کے کئی دوسرے ساتھی بھی اپنی اپنی جگہ انفرادی و اجتماعی طور پر جدیدیت کی اسی راہ پر گامزن تھے ـــــ میں حلقے میں شامل تو ضرور تھا لیکن جدیدیت کی اس روش میں شریک نہ ہو سکا تھا۔ آج شام وہ سبھی اکٹھے ہوں گے ـــــ نجانے میرے بارے میں کیا کیا باتیں کر رہے ہوں گے۔ میں پھر خیالات کے دھارے میں بہنے لگا تھا ـــــ وہ جب کبھی اس طرح شام کو اکیلی باہر جایا کرتی تھی وسوسوں کے تیز خنجر مجھ پر حملہ آور ہو جایا کرتے تھے میں ان کھگائے ہوئے زخموں پر آنسو کا نمک چھڑک کر رات بھر کراہتا رہتا تھا اور دوسرے روز صبح اُسے پھر گھر میں اپنے ارد گرد گھومتے دیکھ کر میرے یہ زخم پھر ہرے ہو جاتے تھے۔

ہماری شادی کو اب تین سال ہونے والے تھے کہ ان ہی دنوں دارالحکومت کوپن ہیگن میں سیاسی بے چینی اور تعلیمی اداروں میں گڑبڑ کے کارن کرفیو لگا دیا گیا۔ ہم باہر شہر میں جانے سے قاصر تھے اور سارا سارا دن گھر کے اندر رہنا ہمارے لئے مشکل ترین تھا۔ ایسے میں صرف آرنے اور سونیا ہی تھے جن کے ہاں آنا جانا تھا۔ ہم دونوں ان کے ہاں اگر دن کے وقت چلے جاتے تھے تو وہ دونوں شام گئے رات ڈھلے تک ہمارے ہاں رہتے تھے۔ وہ جب تک ہمارے گھر میں ہوتے مجھے یوں لگتا کہ سونیا کی ذہین آنکھیں میری جانب سوالیہ انداز میں گھورتی رہتی ہیں۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگتا گویا وہ مجھ سے پوچھ رہی ہو "کیا مجھے کچھ خبر بھی ہے؟" لیکن مجھے یہ پتہ کبھی نہ چل سکا کہ وہ کس خبر کے متعلق پوچھ سکتی ہے۔ میرا دیہ سونیا کے لئے بھی ترش ہو چکا تھا اور میں اُسے اپنی بدقسمتی کی وجہ سمجھنے لگا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں اس کے بارے میں کچھ اس طرح بھی خیال کرنے لگا تھا کہ پہلے کبھی اس کے متعلق یوں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں سرکس کے ایک ایسے گھوڑے کی مانند تھا جس پر دائرے میں چکر لگاتے لگاتے اچانک انکشاف ہو کہ اس کی لگام تو کسی کے بھی ہاتھ میں نہیں۔ سونیا کے مدبرانہ جملے میرے لئے اتنے تکلیف دہ نہیں ہوتے تھے جتنا کہ گریٹے کے محبت بھرے بول۔

اب ایسے واقعات روز بروز خود بخود یوں رونما ہونے لگے کہ میں حیران ہوا جاتا تھا۔ یہ عمل کچھ اسی طرح رونما ہو رہا تھا جیسے جھیل کے کنارے کسی پرانی کشتی میں رس رس کر پانی داخل ہونے لگتا ہے ـــــ آہستہ آہستہ سونیا میری زندگی میں داخل ہو چکی تھی ـــــ نہیں نہیں ـــــ وہ تو اب ایک طرح سے میری ملکیت میں آ گئی تھی ـــــ وہ میری داشتہ تھی ـــــ ایک ذہین، مُدبّر اور محبت میں متشدد عورت ـــــ مجھے اس سے کچھ غرض نہیں تھی کہ سونیا کی اپنی بھی کوئی پسند تھی کہ نہیں۔ میں اس بارے میں لاتعلق ہی رہنا چاہتا تھا۔ سونیا کے ساتھ لگ کر بھی داد و عشرت کے لمحوں میں تو درکنار میں ویسے بھی کبھی گریٹے کا ذکر نہ کرتا تھا اور نہ ہی کرنا چاہتا تھا۔ ایک بار سونیا نے خود ہی قصہ شروع کرنا چاہا۔ "بیچاری گریٹے تو اپنی برداشت سے بھی زیادہ ستم زدہ ہے۔" میں فخریہ طور پر اس سے پوچھنے ہی والا تھا کہ اس سے اس کا کیا مطلب ہے کہ میرے فخر نے مجھ پر غلبہ پا لیا اور میں نے گریٹے کے "ستم زدہ" ہونے کے بارے میں پوچھنا تک گوارا نہ کیا۔ دراصل سونیا کی قربت کے اس لمحے میں میں گریٹے کو کسی بھی صورت اہمیت نہیں دینا چاہتا تھا ـــــ لیکن اب

خیال کرتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ ایسے وقت میں جب کسی انسان کے "ستم زدہ" ہونے کا مسئلہ اور معاملہ ہو اس وقت دوسرے کا اُس "ستم زدہ" کی صورتِ حال پر فخر یا غرور کرنا کتنا کمینہ پن ہوتا ہے ــــ لیکن تب مجھے کیا اندازہ تھا کہ سونیا کس انسان کی بات کر رہی ہے۔ میں سونیا کو کسی قسم کا الزام کیوں دوں ــــ جدیدیت کی پرستش تو اس کا مذہب تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ بذاتِ خود سونیا بھی آرنے کی ایک داشتہ کے بارے میں نہ صرف جانتی تھی بلکہ کبھی کبھی وہ اُس سے ملتی بھی تھی اور پھر اس کے ساتھ باتوں ہی باتوں میں نہایت دوستانہ طریقے سے آرنے کے متعلق ایسے راز فاش کرتی تھی کہ "سُننے والی دنگ اور انگشت بدنداں رہ جایا کرتی تھی۔ اپنی اس طرح کی گفتگو کے دوران میں وہ بار بار یہ جملہ دہرایا کرتی تھی کہ "تمہیں کیا معلوم خود میں نے آرنے کو محبت کی کن گہرائیوں سے چاہا ہے!" سونیا جب سو رہی ہوتی تھی تو اس کا چہرہ گریٹے کے مقابلے میں کشش و جاذبیت سے خالی تو دکھائی دیتا تھا لیکن مجھے اعتراف ہے کہ اس کے چہرے پر "ذہانت" اور اس کی وجہ سے "تحفظ" کی چمک نمایاں ہوتی تھی۔ لیکن یہ عجیب امر تھا کہ وہ سوتے میں اکثر یوں پہلو بدلتی رہتی تھی گویا نیند میں بھی اُسے سکون و آرام میسر نہ ہو ــ میں اب صرف عیش و عشرت ہی کے لئے نہیں بلکہ ویسے بھی ایک طرح سے سونیا کو ہی پسند کرنے لگا تھا بلکہ اب تو مجھ میں یہ خواہش بھی اُبھرنے لگی تھی کہ شاید ایک دن میں دوسری عورتوں کو بھی چاہنے لگوں...

گریٹے آج کل کچھ زیادہ ہی وقت گھر پر ٹھہرنے اور صرف کرنے لگی تھی لیکن مجھے اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں تو اس سے بالکل بے پروا تھا اور اس کی طرف قطعاً کوئی توجہ نہیں دیتا تھا ــــ ہاں اگر سونیا اتنی دیر میرے پاس ٹھہرا کرتی تو بات ہی کچھ اور ہوتی ــ لیکن یہ گریٹے! ــ یہ تو محض اس کا "خالصانہ" پن تھا جس سے مجھے کبھی پیار تھا۔ اب تو اس کی صرف ایک جھلک ہی میرے لئے غم و غصّے کے سوا کچھ نہیں ہوتی تھی ــ گریٹے کے لئے میرے جنسی جذبات میں کبھی ہیجان نہیں آتا تھا اور مجھے ہرگز ایسی کوئی خواہش یا تمنا نہیں تھی کہ میں اُسے اپنے بدن کا حصّہ بناؤں۔ ہاں وہ کبھی کبھی میرے خوابوں میں ضرور در آتی تھی ــــ میں اب اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ میں اگر کبھی گریٹے کے جسم سے بہت قریب بھی ہوا تو میرا وہ مردانہ ہیجان بھی یکسر جاتا رہے گا جو دراصل اسی کی نظروں کا دیا ہوا تھا۔

ایک رات، میں نے اچانک اُسے بستر میں آہستہ آہستہ کراہتے ہوئے سُنا۔ جس کا اب احساس کرنا میرے لئے سوائے ندامت کے اور کچھ بھی نہیں ــــ اسی رات میں نے ــــ اس کے دردآمیز کراہنے کی پروا ہی نہ کی حالانکہ اب میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس وقت گریٹے میری بھرپور توجہ کی مستحق تھی۔

وہ پہلی رات، جب گریٹے گھر سے اکیلی باہر گئی تھی کاش، اس رات میں اُسے روک لیتا اور اپنی جوانی کی لذت سے اُسے مخمور کر دیتا اور اسے وہ نعمت دے دیتا جو وہ تلاش کرنے کے لئے اکیلی ہی گھر سے چل پڑی تھی ــــ کیونکہ میرا یقین ہے کہ اس رات کے بعد صرف میں اکیلا ہی نہیں بلکہ گریٹے بھی واقعی ہی دُکھ جھیلتی رہی بلکہ شاید وہ مجھ سے زیادہ ہی اذیت میں مبتلا رہی ــ گو اس کا اظہار اُس نے کبھی نہ خود کیا اور نہ ہی میں نے کبھی پوچھا تھا ــ لیکن آج رات اس کی اذیت ایک نیا رُخ لے رہی تھی ــــ وہ بستر میں پڑی ابھی تک مسلسل کراہے جا رہی تھی۔

وہ ایک بچے کو جنم دینے والی تھی۔

مجھ سے اب رہا نہ گیا اور میں ایک طرح سے سرکتا ہوا اس کے بستر کے قریب پہنچا اور آنسو سے بھیگے ہوئے اس کے چہرے کو بے اختیار اپنے ہاتھوں میں لے کر خود بھی زار و قطار رونے لگا۔ مجھے اپنے بچپن سے ہی اس طرح رونے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ میری اپنی خواہش نہیں بلکہ میری حسرت تھی کہ میں خود گریٹے کے بچے کا باپ ہوتا لیکن میں نے جان بوجھ کر ایسا

محض اس لئے نہ ہونے دیا کہ میرے خیال میں گریٹے ابھی ماں بننے کی عمر میں پہنچی ہی نہیں تھی۔ میرا خیال تھا کہ گریٹے اس عمر میں ماں بن گئی تو اپنی جوانی کے نشے میں وہ معصوم بچے کی طرف بھرپور توجہ نہیں دے پائے گی اور محض ماضی کی یادوں میں کھوئی رہا کرے گی۔

میں نے ابھی تک اگر اُسے چاہا ہوتا تو ماضی کی تلخیاں اپنی کچھ بھی اہمیت نہ رکھتیں ـــــ محبت میں اُونچ نیچ تو آ ہی جاتی ہے ـــــ اگر کوئی ایک دوسرے سے محبت کرتا ہے تو پھر آگے بڑھنے کی راہیں خود بخود ہموار ہونے لگتی ہیں۔ لیکن مجھے تو اس سے محبت ہی نہیں تھی اور اب اس کی کوکھ سے پیدا ہونے والے "کسی اور کے بچے" کو تو میں ہرگز قبول نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنے ذہن میں سوالوں کا بھونچال لئے اور آنکھوں کے سامنے طرح طرح کے مناظر لاتے ہوئے میں گریٹے کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لئے ابھی تک رو رہا تھا ـــــ میرے ذہن میں ہتھوڑے بجنے لگے تھے۔ سونیا بتاؤ، کم بخت آرنے تم ہی جواب دو ـــــ میں تم سبھی جدیدیت کے پجاریوں سے پوچھتا ہوں ـــــ "تم ایسے بچوں کے ساتھ کیا کرتے ہو؟ تم کتنی بار اسقاطِ حمل کے غیر قانونی منحوس کلینکوں میں گریٹے جیسی کتنی عورتوں کو لاتے ہو؟ جواب دو ـــــ جدید دور کے جدید دانشورو، مدبرو ـــــ بولو ـــــ تمہارے لبوں پہ سکوت کی مہر کیوں لگ گئی ہے ـــــ بتاؤ، تمہاری اس بعید از قیاس "آزاد اور بے حد پُر لطف" طرزِ زندگی کے کیا معنی ہیں ـــــ کیا تمہاری اس دنیا میں ناکام دلوں اور مردہ بچوں کے لئے کوئی جگہ ہے؟

میں اب سونیا کے ساتھ ایک کلینک میں، گریٹے کے بستر کے قریب کھڑا تھا ـــــ اس نے ایک لمحے بھر کے لئے لمبی سانس لیتے ہوئے اپنی آنکھیں کھول دی تھیں اور ہم دونوں کو ایک ساتھ اپنے قریب کھڑے پا کر یوں دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو "مجھے تم دونوں کے بارے میں سبھی کچھ تو معلوم ہی ہے۔" اور پھر اس نے زیرِ لب مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بالکل سونیا ہی کے انداز اور اُسی کے ہی الفاظ دہراتے ہوئے کہا۔ SAY, YOU TWO — SWINGERS, HOW'S IT GOING?" ـــــ وہ ابھی تک زیرِ لب یہی جملہ دہرانے کی پھر کوشش کر رہی تھی کہ اس کا چہرہ یک دم سفید پڑنے لگا اور ہونٹ کانپنے لگے۔ اُس نے اپنی آنکھیں موند لی تھیں اور سونیا چپکے سے وہاں سے کھسک کر کمرے سے باہر نکل گئی تھی ـــــ مجھے ڈاکٹر نے وہیں ٹھہرنے کی درخواست کی اور خود اس نے گریٹے کو ایک انجکشن لگاتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ "کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس کے پیٹ کے بچے کا باپ کون ہے؟" میں نے اپنے شانے اُچکائے ـــــ میرا خیال ہے اب اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا ـــــ میرے وہاں ہوتے ہوتے تو وہ ہوش میں نہیں آئی تھی ـــــ اور نہ ہی مجھے اس کا امکان دکھائی دیتا تھا۔ لیکن میں ڈاکٹر تو نہیں تھا ـــــ میں نے وہاں سے چلنے سے پہلے گریٹے کو ایک بھرپور پیار دیا لیکن نہایت محتاط ہو کر ـــــ مجھے خوف تھا کہ وہ کہیں برا نہ مان جاتے ـــــ اسے کہیں دکھ نہ ہو ـــــ میں نے ایسا شاید اس لئے ہی کیا تھا کہ میں اُسے یہ آخری خطرناک کھیل کھیلنے سے باز نہیں رکھ سکا تھا ـــــ شاید!

اب میں پرسکون ہوں ـــــ کیونکہ میری تمام تر محبت، میری چاہتیں، میرا رنج اور دکھ اور سبھی شکوے شکایتیں ـــــ گریٹے کے ساتھ ہی دفن ہو چکی تھیں ـــــ یہی وجہ تھی کہ گریٹے کی ماں میرے چہرے پر وہ تاثر نہ پا سکی جسے دیکھنے کے لئے وہ اپنی گہری نیلی بڑی بڑی آنکھیں میرے چہرے پر جمائے ہوئے تھی ـــــ وہ گہری نیلی بڑی بڑی آنکھیں جو گریٹے کی آنکھوں سے اتنی مشابہ تھیں کہ میں ان کا سامنا ہی نہیں کر سکتا تھا۔

بارش

علی تنہا

گھاٹی کی پشت پر جھلسے باغ کو بارش نے زندہ کر دیا ہے۔ مینہ نہ ہوتا تو خوبانیوں کو ترس جاتے سب لوگ۔ کل تک ان پیڑوں کو دیکھ کے رونا آتا تھا۔

بارش میں نہاتے خوبانیوں کے درخت دیکھ کر اُسے پارسال کی برسات یاد آ گئی۔ برسات جو شروع ہوئی ہے تو سب پیڑوں کی شاخوں تک کو ننگا کر گئی۔

"یاد آئی پارسال کی بارش؟"

"ہاں یاد ہے۔ بارش اتنی کثرت سے ہوئی کہ مجھے درختوں سے زیادہ ترس تم پر آیا....."

"مجھ پر ترس کیوں کھایا تم نے؟"

"تم سے زیادہ سیانے تو یہ درخت ہیں ....؟"

مہاشے ہنس پڑا "سچ کہتے ہو یار محمد۔ آگے کی سنو۔"

"ہاں کہو۔ پھر کیا ہوا؟"

"بُرا ہوا، بہت بُرا۔ لبنیٰ کو بارش میں بھیگتا دیکھ کے، تو میری حالت گئی گزری ہو گئی۔ سب ہتھیار میرے گر پڑے۔ قادر نامڈ رہا تھا دیر سے یہ سب کچھ۔ لگا مجھے صلواتیں سنانے۔ میں نے گرمی کھا کے کہا۔ "بے تیری ماں لگتی ہے لبنیٰ؟"

"پھر؟"

"پھر قادر کی جون بدل گئی۔ میرے کام میں اسے کیڑے نظر آیا کئے۔ آبنوسی لکڑی سے مری بنی کیبنٹ میں کیڑے پڑنے لگے۔ لبنیٰ سے بولا "یہ مستری کی اولاد........ کشتی بنانے جوگا ہے سہی؟ اسے کہاں تمیز نفاست کی۔ آبنوس کی لکڑی پر بسولا پھیر کے ستیاناس کر دیا۔"

لبنیٰ کا ان دنوں نیا نیا بیٹ گرا تھا۔ چہرے پر ہلکی پیلاہٹ مگر مزاج میں بلا کی نرمی۔ کہنے لگی "تم مہاشے کو جانتے ہیں....."

"تم اتنی سی بات پر لٹو ہو گئے؟"

"کہاں۔ لٹو تو ہلکا لفظ ہے۔ میں نے ایک دیکھا نہ دو جھٹ صندل کی ایک ہرنی کندہ کر ڈالی۔ اُسے لبنیٰ نے پاگلوں کی طرح اُٹھا لیا۔ پھر میری طرف ابرو سے اشارہ کر کے کہا "منسوب منصور کو بناؤ گے؟" میں کہاں چوکنے والا تھا، آنکھیں بند کر کے حامی بھر لی۔

"مہاشے ....." وہ تیز بارش کے ترچھے جھالے سے بچ کر دیوار پر سایہ کیے خوبانی کی پھیلی شاخ تلے کھڑا ہو گیا۔

"یہاں کھڑے باتیں کرو گے تو پانی حشر کرے گا۔"

"حشر اور کس چڑیا کا نام ہے۔ میری تو سدھ بسر کے رہ گئی ہے۔"

"کیا؟"

میں کہہ رہا تھا، بینی کے کہنے پر میں نے مصلوب منصور میں اپنا آپ لگا دیا۔ مگر جانتے ہو جواب کیا ملا؟" سونے کی انگوٹھیوں سے بھری انگلیاں نچا کے مصلوب منصور کی لکڑی پر اعتراض کیا، کہ سیاہ شیشم سے کیوں منصور کو بنایا۔ میں نے بتیرا سمجھایا مگر اُدھر ایک ہی ضد۔ آخر میرا پارہ چڑھ گیا۔ میں بولا "شیشم کی پہچان آپ کو ہے؟" پاؤں پٹخ کے چلائی "اس مہاشے کے بچے کو فوراً یہاں سے دفان کرو۔"

"ارے یہ کیا کیا۔۔؟" یار محمد یہ کہتا ہوا پھیلی ٹہنی کی اوٹ سے باہر نکل آیا۔

"یہ ہونی تو تمام عاشقوں کے مقدر میں لکھی ہے ......"

"میں عاشق کب تھا۔ میں تو کچھ بھی نہیں۔ سیدھا سادھا مہاشے تھا میں تو ......"

"ہاں تم بہت سیدھے سادے ہو" یار محمد نے اسے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

"آؤ اب دیر ہو رہی ہے۔"

کس بات کی دیر ہو رہی ہے؟"

"جانے کی۔"

"ہاں بار جانے میں اکثر دیر ہو جاتی ہے۔ مگر یہ بارش تو جاتی دکھائی نہیں پڑتی ......"

وہ باغ کی دور جاتی دیوار کے ساتھ ساتھ میٹھے بیل کی طرح بادل نخواستہ قدم اٹھاتا رہا۔ شاید زمین اس کے کھروں سے چپک کے رہ گئی ہے۔ "یہ بارش ہے یا ......" وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"بارش بہت تیز ہے۔ بھاگو مہاشے" یار محمد کی آواز کے بلند ہوتے ہی، مینہ سے بھیگتا کوا اُس کے سر پر سے گزر گیا "شاید یہ حضرت نوحؑ کی کشتی والا کوا ہے اسے اب دوبارہ کشتی کہاں ملے گی؟"

"مہاشے ......" یار محمد کی زمانوں پرانی آواز پر اس نے پوچھا "کہاں ہو تم یار محمد ......؟"

"بھاگو، بارش بہت تیز ہو چلی ہے ......" مہاشے کو آواز نے کچوکا دیا۔ وہ باغ کی گولائی میں دور تک بھیگتی دیوار کے ساتھ بھاگتا چلا گیا۔ یار محمد کو پانے میں اُسے زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ بیری تلے دیو کی طرح بال بکھرائے کھڑا تھا۔ اس کے دائیں بائیں چٹانوں پر سے مٹیالے سانپوں کی طرح برساتی نالے پھنکارتے ہوئے گزر رہے تھے۔ مٹیالی چٹانوں کو چیرتے ہوئے پانی کی دھاریں دیکھ کے اس کو ہول آنے لگا۔ مینہ سے اکثر اس کے جی میں گھبراہٹ اور گھٹن بڑھ جاتی ہے۔ ایسے ہولناک پانی کو البتہ وہ اتنی شدت سے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ پلکوں پر ہلکی غنودگی کے سے عالم کو توڑنے کے لیے وہ چلایا۔

"یار محمد یہ تم ہو؟" اُسے اپنی آواز کی ویرانی گم کردہ راہ کتے کی طرح لگی۔

"کیوں کیا ہوا؟"

مہاشے نے آسمان میں گندھے بادلوں سے رستے پانی کی سمت اشارہ کیا "کوئی سبیل اُن کے جانے کی نہیں؟ خداوندا یہ بارش کب تھمے گی ......" مہاشے کو اپنے سوال پر شرم کے ساتھ ہنسی بھی آئی۔

گویا اس کی دعا کوئی سنتا بھی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ مہاشے کی نظروں میں اس وقت بارش ہی سب سے بڑی حقیقت تھی۔ ان دونوں کے برابر بالکل سامنے کھنڈروں کا دور تک جاتا سلسلہ تھا۔ یہ کھنڈر ایک زمانے میں آباد گھر بھی ہوتے ہوں گے۔ وہ روز ازادوں کی بوری کندھے پر لٹکائے یہاں سے گزرتا تھا مگر آج دھند اس بارش میں کھنڈروں کا حلیہ ہی بگڑ گیا تھا۔ تیز مینہ کے جالے میں، تاریکی سے پٹتے یہ کھنڈر لگتا تھا، چٹانوں کے کھوہ بن گئے ہیں۔

مہاشے کو بیری تلے کھڑا، خاموش پا کر یار محمد بولا "تمہیں محسن زمان یاد ہے؟"

وہ زور سے ہنس پڑا "ہاں ہاں کیوں نہیں"

"تم ہنس رہے ہو، خیریت ہے؟"

"ہاں یار، یہ خوبانیوں کا باغ اس نے لگوایا تھا نا۔ ایک ایک بوٹے پر دو دو دن صرف کرتا رہا۔ آخر اسی باغ میں مارا گیا۔ مجھے تو دن اور سال تک یاد ہے۔ لبنیٰ کی آنکھوں میں آنسو بھی یاد ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"کیا کہا ۔ ۔ ۔ ۔ وہ روئی بھی تھی اس کی موت پر؟"

"بہت روئی تھی۔ کیوں تمہارے خیال میں وہ انسان نہیں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔؟"

یار محمد کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ دانت کاٹتا ہوا، لبنیٰ کے بارے میں سوچتا رہا۔ شاید یہ نام مقدس ہوں۔ ناموں سے اُسے ہمیشہ دھوکا ہوا ہے۔ اس لئے اُن دونوں کے دھیان سے ہٹ کے وہ اپنے قادر کی نرت کاریوں کے بارے میں ہمیشہ چپ کر جاتا ہے۔ مگر مہاشے اس کے پیٹ گرائے جانے کے بارے میں جب بھی بتاتا ہے زمین پر آبادی بڑھ جاتی ہے اور بھوک مینہ کی طرح برسنے لگتی ہے۔ یہ عورت آخر کیا بلا ہے؟

"کیوں جی یہ عورت ہے یا لبنیٰ؟" مہاشے کا بلانہ غنودگی کے مارے، دونوں ہاتھ پیچھے باندھے بولا۔

"کیا خبر ہے یار محمد؟" اس نے اس کی ریزہ ریزہ آواز پر یقین کیا۔ وہ گھاٹی کے سرے پر بیری تلے کھڑا فرشتہ لگ رہا تھا بارش نے اس کے شفاف دودھیا چہرے کو رگڑ رگڑ کر چمکا دیا تھا۔ جگہ جگہ سے کھونسے ہوئے کرتے میں جگر جگر کرتی اس کی جلد کوندے کی طرح چمکی۔

"مہاشے؟"

"کیا ہے؟"

یار محمد نے مہاشے کی، دیوار کی طرح مضبوط اور بلند کاٹھی کو رشک بھری نظروں سے تولا۔ وہ چھ فٹ سے نکلتے قد میں سنگ مرمر کا ترشا ہوا بت تھا۔ اس کی گہری بھوری آنکھوں میں ہلکا سا خمار اس وقت عجیب لگ رہا تھا۔ وہ کتنی دیر اس کے سحر میں رہنے کے بعد جاگا۔

"مہاشے! مصلوب منصور کا وہ بت اب کہاں ہے؟"

"لبنیٰ کے کہنے کے بعد میں نے ہتھوڑے سے اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ ایسے لڑکی کے بت کو کوئی کرے گا کیا؟ جانو میں روم کا گورنر بن گیا تھا۔ قادر سے میں نے کہا بول۔ کہاں گیا تیرا منصور والا بت؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"پھر؟"

"پھر قادر نے بت کا سر برآمدے میں سے نکالا، جھاڑ کر اُسے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ ویسے قادر کا اپنا سر بھی جیب ہی میں رہتا ہے۔"

"کیا بک رہے ہو؟"

"تم یار محمد، ان باتوں کو کہاں جانو گے؟ یہ سب باتیں میں نے چھپ چھپ کر لبنیٰ سے اتنے سالوں میں سیکھ لی ہیں، پل بھر میں تم کیا جانو گے؟ حیران ہو رہے ہو ناں؟"

"ہاں، حیران تو میں نے ہونا ہی ہے۔ تم نے یہ باتیں سیکھ کر اپنے اوپر ظلم ڈھایا ہے۔"

مہاشے نے کرتا بگڑتے ناک چڑھائی "ہونہہ بڑا ظلم ڈھایا میں نے۔"

یار محمد چپ چپاتے ہاتھ ملتا ہوا دانت کچکچا کر بولا "بڑے تیس مار خاں ہو گئے ہو؟"

یار محمد کی بات سن کر مہاشے کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔

"ارے یہ تم مہاشے ہو۔ مسٹری مہاشے۔ یہ تم رو رہے ہو۔ سچ سچ رو رہے ہو؟"

یار محمد نے اس کی ہتھیلی اپنے ہاتھ میں لے کر زور سے دبائی "مہاشے، یار تم رو بھی سکتے ہو۔ کہو یار کیوں رو پڑے ہو؟"

"کیا بتاؤں؟" اس کی آواز میں لرزش تھی۔

"کیا بتاؤں کے بچے جانتے ہو تم کس کی اولاد ہو۔"

"کیا مطلب؟"

"تم لطیف مستری کے بیٹے ہو۔ چچا لطیف مستری کے بیٹے ہو، اور کہ تمہارے پہاڑوں سے آئے تھے۔ جفاکش اور مضبوط لوگ تھے ان کی اولاد ہو کر عورت کے ہاتھوں پتلے کی طرح بیں کر رہے ہو!"

"مت یاد دلاؤ میرے بزرگ مجھے، اپنے باپ قادر کی مار یاد ہے مجھے۔ مت یاد دلاؤ۔ مجھے وہ لوگ!"

"تم ان کی نالائق اولاد ہو۔"

"یہ بات تو قادر بھی کرتا تھا۔ میں شہر کے بارے میں تمہیں یا قادر کو کیا بتاؤں؟ لبنیٰ ہوتی تو میں بات بھی کرتا۔ مجھے تو اپنی اصل بھی یاد نہیں۔"

"تمہیں کیا یاد ہے۔؟"

"ہاں۔ مجھے کیا یاد ہے" مہاشے نے بھولپن سے دہرایا۔ وہ برساتی نالوں میں شور مچاتے پانی پر نظریں جمائے اسے دیکھ کر بولا "یار مہاشے تم میرے باپ کو جانتے ہو ناں، سیدھا سادہ امام مسجد ہے۔ ایک بار نوح کے طوفان کے بارے میں کہنے لگا حضرت نوح کے زمانے میں روئے زمین پر کوئی ذی روح سلامت نہیں بچا تھا سوائے ایک نوح کی کشتی کے۔ کتنے زمانوں کے بعد آپ نے کوے کو خشکی کی خبر لانے کو بھیجا۔"

"کوا تو یار محمد، یہاں بھٹک رہا ہے۔ وہ کیا خبر دے گا۔"

"لبنیٰ سے سیکھی باتیں نہیں دہراؤ۔ آگے کی سنو جب کوا واپس نہ آیا تو حضرت نے فاختہ کو کشتی میں سے نکل جانے کا حکم دیا کہ اڑ کر خشکی کی خبر لائے۔"

"مگر ہماری کشتی کا کیا بنے گا؟" اس نے زمین کی طرف اشارہ کیا۔

"اس کا وارث تو خدا ہے۔" ہر طرف پھیلا پانی دیکھ کر اس نے سوئی سوئی آواز میں جواب دیا۔ اب وہ دونوں، انجانے میں ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کیے کھڑے ہو گئے۔ یار محمد کے بالکل سامنے شمال سے مغرب تک پھیلے پہاڑوں پر یلغار کرتی بارش کے درمیان سے سورج کی ہلکی لکیر جھانک رہی تھی۔

"مہاشے، سورج !.... بارش میں دھوپ !....."

"دھوپ کہاں سے آگئی ؟"...... وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ گویا اور منہ کھولے گا تو نوحؑ کی کشتی سے اُڑنے والی فاختہ کی چونچ سے زیتون کی شاخ گر پڑے گی۔

موت کی طرح زمین پر مسلط بارش میں دھوپ دیکھ کر دونوں جون میں آگئے۔ "بھاگ مہاشے، بھاگ۔"

"کہاں یار محمد؟"

یار محمد نے مہاشے کو نفرت سے دیکھا "تو یہیں رہو گے کیا؟"

"ہاں۔"

"ہاں کے بچے، تو رہو یہیں پر۔" وہ موسلا دھار بارش میں نوحؑ کی کشتی کی طرح ڈولتا ہوا مہاشے کی نظروں سے دور ہوتا گیا۔ دور تک گھاٹیوں اور کڈھب راستوں پر بارش میں دھندلے درختوں کے درمیان دنیا عذاب جھیل رہی تھی۔ اس کے سر اور کندھوں پر اکا دکا قطرے لبنی کی آواز کی طرح آہستگی سے گرتے رہے۔ مہاشے کا جذبات سے خالی چہرہ بت کی طرح بارش پر مرکوز رہا۔ مینہ نے ساری دنیا کی اصلیت ہی بدل کے رکھ دی۔ اس کے دھیان بھی بارش کے قطروں کی طرح ٹوٹتے پھوٹتے رہتے ہیں۔ نگاہ کی حد تک بارش میں کہیں امان نہیں۔ مہاشے بولایا ہوا نوح کی کشتی کی طرح آخر کار بارش کے طوفان میں کود پڑا۔ اس کے تلوے زمین پر ٹک ہی نہیں رہے تھے۔ اس کا باپ زندہ ہوتا تو آج اس کی خوشی کی انتہا نہ رہتی۔ کیونکہ وہ مہاشے کی سست روی پر ہمیشہ کڑھتا۔ زمین پر وہ اس تیزی سے دوڑا ہی کب تھا؟ اس کا دل بادلوں کی طرح انہونی کے پانی سے بھرا سینے سے نکلا جا رہا تھا۔

بلبلے کی طرح مہاشے غیر ہموار زمین پر ابھرتا اور ڈوبتا رہا۔ یار محمد کے جانے کے بعد موسلا دھار بارش میں بھاگنے سے گھٹن کا، اتا احساس تک اس کے اندر دم توڑ گیا۔ ورنہ پہلے ہوتا یہ تھا کہ بارش یا لبنی کے ملنے پر اسے دم لینا دوبھر ہو جاتا تھا۔ بھاگتے بھاگتے دور ترائی میں اسے اپنے باپ کی آواز یکایک سنائی پڑی۔ وہ اپنے باپ کی گرج دار آواز سے لرز اٹھا۔

"یہ آواز کہاں سے آئی ؟" رک کر اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔

"ممکن ہے یہ میرا وہم ہو۔ باپو کو مرے تیرہ سال ہو گئے ہیں۔ شاید کوئی چرواہا ہو۔"

وہ چاروں سمت دیکھتا ہوا دوبارہ چل پڑا۔ زنجیر کی طرح پوری دنیا کو جکڑے اس مینہ میں رکنا موت کو بلانا تھا لیکن اسے جانا ہی کہاں ہے۔ کون جانتا ہے اس کے پُرکھا ناحق پہاڑوں سے اتر کر ان بارشوں میں گھر گئے۔ شاید ان کے خون میں پہاڑوں کی بلندی اور مضبوطی تھی ورنہ بلند و بالا عمارتیں وہ کیسے اسارتے۔ وہ پتھر کی طرح خاموش اور مضبوط اپنے بزرگوں کی پانچویں پشت کا کمزور اور کم گو آدمی تھا۔ اب پتھروں کی جگہ لکڑی کے برادے میں گھل رہا تھا۔ مہاشے کتنی دیر اپنے آپ میں گم چلا۔ املتاس کا جھنڈ دیکھ کر سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔

"یہ کون جگہ ہے، وہ یہاں اسیروں کی طرح بندھ کے رہ گیا ہے۔ اپنی جگہ سے ذرا نہیں ہل سکتا۔" مہاشے اپنے آپ سے بولتا ہوا لمبا چکر کاٹ کر لبنی کی استبل کوٹھی کی دیوار سے ملحقہ املتاس کے درختوں تلے کھڑا ہو گیا۔ کوٹھی کے آہنی دروازے کے پیچھے اچانک قادر کی ڈاڑھی ہلتی ہوئی نظر آئی۔ وہ آہستہ سے چلتا ہوا پھاٹک کے سامنے رک گیا۔

"کمبخت! تم پھر آگئے؟"

مہاشے نے کوئی جواب نہ دیا۔ قادر چھڑی تانے رنج لگی آواز میں غوخیایا۔

"گھوڑا اپنے تھان سے جا بھی کہاں سکتا ہے۔ وہ کیسے نہیں آئے گا۔"

"کیا کہا میں گھوڑا ہوں ؟"

"نہیں، مہاشے تم صرف دریائی گھوڑے ہو۔" قادر نے دانت نکوسے۔

"سنو قادر میں دریائی گھوڑا سہی لیکن اتنی بارش کے ہوتے تمہارے بدن پر ایک قطرہ بارش کا نہیں۔ تم نوح کی کشتی پر سوار بندر تو نہیں ہو ؟"

قادر نے جچی نظروں سے مہاشے کے سراپے کا جائزہ لیا۔ "کیا کہا کون بندر ہے ؟"

"تم، اور کون ہو سکتا ہے ؟"

"مہاشے تم پاگل ہو جاؤ گے۔ سچ مچ کے پاگل۔"

"میں کچھ بھی ہو جاؤں۔ تمہیں اس سے کیا ؟ اپنی فکر کرو تمہارے بدن پر ایک قطرہ بارش کا نہیں۔"

"کیا کہتے ہو۔ میں تمہاری طرح بارش میں جھک تھوڑی مارتا ہوں۔ کہو بارش کب ہوئی۔"

"ہاں میاں تم بارش میں رہتے ہی کب ہو۔"

مہاشے کی دھیمی آواز سن کے دروازے کی پرلی طرف قادر کا سر داہنے کندھے کی طرف جھک گیا ـــــ مصلوب منصور کی طرح۔ مہاشے نے اس کی طرف اسم اعظم پھینکا۔ "کیا ہو گیا تمہیں ؟ لبنیٰ کہاں ہے ؟" قادر اس کی آواز سے بے نیاز بے حس و حرکت کھڑا مہاشے کو برابر دیکھے گیا۔

"اے قادر ...... قادر ...... اے" وہ اپنی آواز کی ہیبت سے گھبرایا اِدھر اُدھر تکنے لگا۔ قادر کے جواب نہ دینے پر اس کا دل بیٹھ گیا۔ کھڑے کھڑے اسے کیا ہو گیا ہے۔ اگر وہ زندہ ہے تو بولتا کیوں نہیں۔ کہیں سچ مچ مصلوب تو نہیں ہو گیا۔ وہ دبدھے میں پڑنے کے باوجود پوچھنا چاہتا تھا کہ اسے کیا ہو گیا ہے ؟ لیکن زمین اور آسمان کے درمیان چادر تانے بارش کی تاریکی میں مہاشے کس سے پوچھتا ؟ کوئی جواب نہ پا کر نا امیدانہ اس نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا مگر اس میں آسمان دیکھنے کی تاب کہاں ہے۔ مہاشے کے سر پر بارش کے کانٹوں کا تاج ہے تو کیا اب وہ بھی قادر بن گیا ہے۔

مہاشے سوال کرنے کو منہ کھولنا چاہتا تھا کہ آناً فاناً اس کی آواز اور گلے کے درمیان طوفانِ نوح کا ریلا آ گیا۔

نام

طارق محمود

اس نے سُنبل کے نرم گداز تکیئے کو سر کے گرد لپیٹا اور سانولی کی طرف پیٹھ کر کے لیٹ گیا۔ سانولی کے بدن سے اُبھرتی تیزابی پسینے کی باس اور کلون کی ملی جلی خوشبو اس کے نتھنوں میں رچتی گئی۔ اُس نے تکیئے کو دوہرا کیا اور زور سے سر کے گرد دبایا۔ آنکھیں بھینچ لیں۔ کان کی لوؤں پر لمس سا محسوس ہونے لگا۔ گدگداہٹ سی ہوئی۔ جسم کو سکیڑ لیا۔ کبھی۔ کبھی۔ کبھی وہ تو کسی طور بھی اٹکھیلیوں سے باز نہیں آ رہی تھی، دبے لبوں ہنسے جا رہی تھی۔ "کیسے مرد ہو۔ اب ڈھیر ہو کر لیٹ گئے ہو۔" سانولی نے اس کے بازو پر چٹکی بھری۔ "کون کافر ڈھیر ہوا ہے۔ یونہی تکان دُور کر رہا ہوں۔"

"تکان ــــ ابھی کیا دور نہیں ہوئی۔"

"نہیں ــــ ابھی تو ابتدا ہے۔"

"ابتدا۔" سانولی نے اس کے بازو پر اپنا سر رگڑا اور ہنسنے لگی۔ وہ تھوڑی دیر یونہی لیٹا رہا۔ آنکھیں موندے۔ اعصاب کو ڈھیل دی ــــ "کہاں پہنچے ہوئے ہو" ــــ وہ پوچھنے لگی۔

"کہیں نہیں" ــــ وہ بولا "تمہارے ساتھ ہوں۔" اس نے سانولی کا ہاتھ تھام کر کہا۔ وہ نیم تاریکی میں اس کے سانس کی حرکت کو محسوس کر رہا تھا۔ وقت میاں اسلم کو کس موڑ پر لے آیا تھا۔ لیکن یہ تو اس کا اپنا فیصلہ تھا۔ یہاں اسے وقتی سکون اور قرار میسر تھا۔ ایک تجسس تھا جو اسے اس جگہ لے آیا۔ سانولی کے ہمراہ گزرنے والے لمحات تو اب اس کی احتیاج بن چکے تھے۔ وہ فیملی مین تھا لیکن دنیاوی آدمی بھی تھا۔ کامیابی کا متمنی ــــ اُسے گھریلو زندگی اور لمحاتی سُرور کو علیحدہ علیحدہ خانوں میں رکھنے میں یقین ہوتا جا رہا تھا۔

کال بیل کی آواز پر وہ چونکا۔ آنکھیں گھما کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ دل دُھک دُھک سے بجا۔ نجانے کیوں ایسے موقعوں پر خون کا دباؤ بڑھ جاتا ــــ وہ بستر سے اٹھا۔ پنجوں کے بل کھڑکی کے قریب پہنچا۔ دبیز پردوں کو ذرا سا سرکایا ــــ "کوئی ہے" ــــ اس کی آواز تھرتھرائی ــــ "آجائیں" سانولی آہستگی سے بولی "خورشید بیگم تسلی کر کے ہی دروازہ کھولیں گی۔"

"کون ہو سکتا ہے۔"

"کوئی مہمان بھی ہو سکتا ہے۔ آپ کی طرح"۔ وہ ہنسی۔

"ایک جیپ ہے۔" اس نے پردہ سرکا کر کہا۔

"سرکاری جیپ ہو گی"۔ سانولی نے نیم تاریکی میں کاجل بھری آنکھیں گھمائیں۔ میاں اسلم پر ہلکی سی گھبراہٹ طاری ہونے لگی . . . . "مطمئن رہیئے۔ ڈرائنگ سے ہو کر چلا جائے گا۔ نیا نیا پوسٹ ہوا ہے۔"

"کہیں اوپر نہ آجائے۔"

"تو پھر کیا! واہ اسلم صاحب!" وہ کہنیوں کے بل بستر سے اُٹھی۔ "آپ جیسا نازک دل مرد میں نے کم ہی دیکھا ہے۔" وہ بالوں کو جھٹک کر پلنگ کے سرہانے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

"تم سمجھتی کیوں نہیں۔ آخر خلوت بھی کوئی چیز ہے — پرائیویسی —"

"آپ کا مطلب ہے مجھے — خورشید بیگم کو یا پھر آنے والے مہمان کو پرائیویسی عزیز نہیں۔"

"میں ذرا احتیاط پسند ہوں۔" وہ جسم پھیلا کر کوچ پر بیٹھ گیا۔

"فکر نہ کریں — اپنی باری پر اوپر آئے گا۔ روزی اس وقت گھر پر نہیں ہے۔ اسے ملنے آیا ہے، لے جائے گا باہر گھمانے۔" وہ یہ کہہ کر پنجوں کے بل باتھ روم کی طرف قدم بھرنے لگی۔

"میرا خیال ہے اب میں چلتا ہوں۔" اسلم نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"پھر کب آئیں گے؟" — وہ چلتے چلتے رُکی۔

"جب اُداسی نے گھیرا۔" اس نے سانولی کا گال ہلکے سے تھپتھپایا۔

اُس نے سیڑھیاں اُتر کر اچٹتی نظروں سے ڈرائنگ روم کی طرف دیکھا۔ آنے والے شخص کی پیٹھ نظر آئی۔ "چل دیئے؟" خورشید بیگم اندر سے بولیں۔ اُس نے ہاتھ ہلا کر اس کی بات کا جواب دیا۔ "ٹھہریئے میں آکر رخصت کرتی ہوں۔" خورشید بیگم نے پان کی پیک سے بھرے دانت نکالے اور ڈیوڑھی تک آئی۔ "آتے جاتے رہیے۔ ملنے ناغے سے تو مجھے بھی پریشانی ہونے لگتی ہے۔ آپ ہی کے دم سے تو ہم لوگ آباد ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ جلد ملاقات ہوگی۔" اُس نے گاڑی میں بیٹھتے کہا۔

میاں اسلم ایک سیلف میڈ آدمی تھا۔ اس کے ہاتھوں کی چنڈیاں گواہ تھیں کہ گئے زمانے میں اس نے بڑی محرومی اور مجبوری دیکھی۔ پھر زمانہ اس کے قدموں میں سمٹ آیا۔ وہ اچھے سے میاں اسلم بن گیا۔ مزدور سے نوبلٹ سرکاری کانٹریکٹر، وقت، دولت اس کی انگلیوں پر تھی، دن رات پیسے کی دُھن — مسلسل محنت نے اسے بے کل بنا دیا۔ گھر میں بیوی بچے اُس کے منتظر رہتے۔ خندہ پیشانی سے خیر مقدم کرتے اور پھر اس نے ان کی کون سی ضرورت کو پورا نہ کیا تھا۔ آرام، آسائش، کھلا ہاتھ، جو ہر وقت ان کے دو بولوں کا منتظر رہتا۔ لیکن یہ سب کچھ کرنے کے لئے وہ دن رات جُتا رہتا — کیسے کیسے کشٹ کاٹے — جب آسائشوں نے اس کے قدم چومے تو دن رات کا کام پھر بھی اس کا مقدر ٹھہرا۔ جسم کی توڑ پھوڑ، انگ انگ کی تکان اب اسے یہاں لے آتی۔ پیسج میں خورشید بیگم اس کی منتظر ہوتی۔ اس کی آنکھ کا اشارہ پاتے ہی وہ سیڑھیاں عبور کرتا اور آرام دہ، پُرسکون نیم روشن کمرے میں سانولی کو اپنا منتظر پاتا۔ سانولی جواب اس کی ہی ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ کیا تھی — وہ کیا ہے — لیکن وہ تو اب محض ایک بات جان چکی تھی، اُس کا سب کچھ تو اب میاں اسلم کے لئے تھا۔ لگتا ہے اس کے اندر کی عورت کروٹ لیتی۔ بستر پر لیٹے وہ آنکھیں نیم وا کئے انہونے خواب دیکھتی۔ کھلے صحن میں دوڑتے بھاگتے ہنستے کھلکھلاتے شریر بچے، نجانے یہ موہوم خواہش کب پوری ہو۔ کبھی کبھی تو اسے یوں لگتا میاں اسلم ایک دن ضرور اسے ذہنی تحفظات کے بغیر قبول کرے گا۔ عقد میں لے لے گا۔

وہ راحت کا متمنی تھا۔ سادہ لوح بیوی — بچے — دوست — اب اسے کئی اور چیزوں کا تجسس سا ہونے لگا۔

زندگی ایک ایسے موڑ پر لے آئی جہاں کیف ہی کیف تھا۔

"دوبئی سے کال ہے۔" اسٹنٹ نے دوسرے کمرے سے بھاگتے آکر کہا۔ میاں اسلم فون کی طرف لپکا۔ فون تھامے کال سُنی۔ بیل دے کر سائیٹ انجینیئر کو بلا بھیجا۔ "راشد صاحب صبح کی فلائیٹ سے آ رہے ہیں۔ ہوٹل میں ٹھہریں گے۔ گاڑی بھجوا دینا۔" وہ چابیاں گھُماتا دفتر سے باہر نکل آیا اور دیر گئے سڑکوں پر یونہی گھومتا رہا۔ کچھ سوچتے ہوئے اس نے گھر کی راہ لی۔ چائے کی پیالی پی کر شام ہوتے ہی کام کا بہانہ بنا کر گھر سے نکل آیا۔

اس نے انگلیوں سے پپوٹوں کو دبانے کی کوشش کی۔ سر میں ہلکا سا درد تھا۔ سارا دن ٹینڈر کی منظوری کے سلسلے میں دوڑ دھوپ کرتا رہا۔ سانولی نے بیڈ ٹیبل کی دراز سے ڈسپرین کی گولی نکالی۔ اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ "پانی لے آؤ۔" اس نے سانولی کا ہاتھ ہلکے سے دبا کر کہا۔ وہ پانی کے چند گھونٹوں کے ساتھ ڈسپرین کی گولی نگل گیا۔ "آپ کا سر دبا دوں؟"۔ اس نے سر ڈھیلا کیا اور اس کے زانوؤں پہ رکھ دیا۔ سانولی کی نرم پوروں کا احساس اس کے ماتھے، گھنے بالوں، پپوٹوں میں اترتا گیا۔ وہ دھیرے دھیرے اس کا ماتھا سہلائے جا رہی تھی۔ وہ جس وقت سانولی کے ہاں داخل ہوا تو ایک نوجوان لڑکا خورشید بیگم کو سلام کر کے وہاں سے رخصت ہو رہا تھا۔

"وہ آج کون تھا۔" اس نے یونہی گفتگو کا آغاز کیا۔

"وہ ہدایت تھا۔"

"ہدایت؟ کیا کرنے آیا تھا؟"

"روزی سے ملنے آیا تھا۔ آپ تو جانتے ہیں روزی نے ایک بیکنگ سکول بھی کھول رکھا ہے۔ چند سہیلیوں کے ساتھ مل کر ــ یونہی اس نے دعوت دے دی ہوگی۔"

"کیا کرتا ہے؟" اسلم کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔

"ایک اشاعتی ادارے میں منیجر ہے۔"

"محتاط رہا کرو ــ ایسے لوگوں کا تو کوئی پتہ نہیں ہوتا۔"

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ میں اس سے کئی بار مل چکی ہوں۔ نہایت معقول لڑکا ہے۔ اسے کسی قسم کی غرض نہیں۔ اسے تو اس بات کی بھی خبر نہیں کہ یہاں کون آتا ہے، کیوں آتا ہے۔" اسلم کو یہ سنتے ہوئے قدرے اطمینان ہوا۔

"یہ روزی کیسی لڑکی ہے؟" اسلم نے نظریں گھمائیں۔

"کیوں کیا ہو گیا؟"

"گزشتہ روز کس قدر بے نیازی سے سلام کئے بغیر نکل گئی۔"

"وہ دراصل جلدی میں تھی۔"

"ایسی بھی کیا جلدی تھی۔" اس نے نظریں گھما کر دیکھا۔

"وقت کی پابندی بھی تو ضروری ہوتی ہے۔" سانولی کہنے لگی۔ "اور پھر ہماری دوستیاں تو محض اعتماد پر قائم ہوتی ہیں۔ ــ آج کل پریشان ہے۔"

"کیسی پریشانی؟" میاں اسلم نے بات کاٹتے پوچھا۔

"اس کا ملنے والا بڑا پیسے والا آدمی ہے۔ ہر سال باہر جاتا۔ ادھیڑ عمر ہے۔ روزی کا بڑا خیال کرتا۔ خرچہ اٹھائے رکھا۔ شرط یہی تھی کہ روزی اُس کی ہو کر رہ جائے۔ جیسے میں اب آپ کی ہوں۔" سانولی نے اس کے سینے پر اپنا سر رکھ کر کہا۔ "سال بھر دوستی رہی اور روزی کو چھوڑ کر کسی اور کے پاس چلا گیا ہے۔ بندھی آمدن کی تو اور ہی بات ہوتی ہے۔"

اسلم ٹکٹکی باندھے سانولی کو تکے جا رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر لشکتی لپ اسٹک کا چیپ شیڈ اس کا منہ چڑانے لگا۔ سانولی کے ہونٹوں پر گاڑھے سرخ رنگ کی سرخی دانوں کی صورت میں اُبھری۔ پھسلی۔ جیسے ہلکی ہلکی پھنسیاں اس کے ہونٹوں پر ناچ رہی ہوں۔ اسلم نے ٹشو پیپر تھاما۔ اس کے ہونٹوں پر پھیرا۔ ٹشو پیپر کو ایک نظر دیکھا۔ بھدے سرخ رنگ کا شیڈ، ٹشو پیپر پر منتقل ہو چکا تھا۔ اسلم نے ایک اور ٹشو پیپر اس کے ہونٹوں پر پھیرا۔ اب اس کے ہونٹوں پر شیڈ غائب تھا۔ نیگوں ہلکے سیاہی مائل ہونٹ اُبھرے۔ "کھی، کھی، کھی" سانولی کے قہقہے فضا میں بکھرنے لگے۔ سیاہی مائل ہونٹ اس کے سانسوں کے قریب تھے۔ "چلو باہر چلیں۔" اس نے ایڑی کے بل ایک چکر لیا۔

"ٹھیک ہے چلتے ہیں۔" اسلم نے عجب خود اعتمادی سے کہا!

وہ دونوں باہر نکل آئے۔ شام پھیل چکی تھی۔ سٹریٹ لائٹ روشن ہو چکی تھی۔ اسلم نے گاڑی کا اے سی آن کر دیا۔ انگریزی دُھن پر سٹریو بجنے لگا۔ وقفے وقفے کے بعد ٹریفک کی جلتی بجھتی لال پیلی روشنیاں ان کی گفتگو کا تسلسل توڑ دیتیں۔ اس نے کار کی رفتار میں اضافہ کر دیا۔ کچھ دیر کے بعد پھل کی دوکان کے قریب بریک لگائی اور انار کا جوس منگوایا۔ ایک بچے نے گدلے کپڑے سے کار کی صفائی شروع کر دی۔ اسلم نے بل کی ادائیگی کی۔ بچے کو پانچ روپے کا نوٹ تھمایا اور گاڑی کا رُخ سیوک سنٹر کی طرف کر دیا۔ سیوک سنٹر پہنچ کر کار پارکنگ کی اور مختلف شوکیسوں کا جائزہ لینے لگے۔ "نئے ڈیزائن کے بوتیک ہی دیکھ لوں۔" سانولی بولی۔ وہ دونوں بوتیک شاپ میں داخل ہو گئے۔ اے سی سُپر کول پر چل رہا تھا۔ خریداری کے لئے آئی خوبرو لڑکیاں دوکان میں گھوم رہی تھیں۔ کچھ اپنے اپنے شوہروں کے ہمراہ اُلٹ پلٹ کر جوڑوں کے پرائس ٹیگ دیکھ رہی تھیں۔ سانولی نے پل بھر میں تین جوڑے پسند کئے۔ میاں اسلم نے بل ادا کیا اور دوکان سے باہر نکل آئے۔

دھیمی روشنی اور کھلے کھلے ماحول میں وہ اوپن ایئر ریستوران میں بیٹھ گئے۔ میزوں کے گرد لوگ کھانے پینے میں مصروف تھے۔ اسلم نے بیرے کو آرڈر دیا۔ کچھ ہی دیر میں کوئلوں پر بھنے چکن پیس تھامے وہ کھانے میں جُت گئے۔ قریب ہی چند بلیاں غرائیں۔ پاس پڑی ہڈیوں پر پل پڑیں۔ "ایک بات تو بتاؤ۔" سانولی نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ "اگر کوئی واقف حال تمہیں یہاں دیکھ لے تو؟"

"یہی سوچے گا کہ تم ۔ ۔ ۔ ۔!"

"بیوی ہوں" سانولی نے گرہ لگائی۔

"بیوی۔" اسلم دبے لفظوں بولا اور پھر خاموش ہو گیا۔

"کیا آپ مجھے اپنانا پسند نہ کریں گے؟" سانولی کھوتے لہجے میں بولی۔

"اپنانا؟ بھئی اور کس طرح کا اپنانا ہوتا ہے۔"

"شادی ۔۔!"

"دیکھو سانولی میں تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں ۔ میں تمہاری ہر ضرورت کا خیال رکھتا ہوں ، رکھوں گا۔ معلوم نہیں تم یہ موضوع کیوں چھیڑ دیتی ہو۔" میاں اسلم کو الجھن سی ہونے لگی ۔" میں جانتا ہوں تمہیں میرا یوں کہنا اچھا نہیں لگتا۔ لیکن دیکھو ۔ یہ بات میرے لئے ممکن نہیں ہو پائے گی ۔ اس کا سن لینا ہی میرے لئے ایک کرب بن جاتا ہے۔"

"جانے کیوں میں بھولے سے اس خواہش کا اظہار کر دیتی ہوں ۔" وہ بولی

"تم ہزار خواہشوں کا اظہار کرو! میرے لئے یہ کیا کم تکلیف دہ ہے کہ تمہاری تمام خواہشات پوری کرتے ہوئے بھی میں یہ خواہش نہ پوری کر پاؤں گا اور ویسے بھی میں نے تمہیں اب اپنا سمجھ لیا ہے ۔۔! اور کیا اپنانا ۔"

"اپنانا ۔۔! وہ تو اپنا نام دینے سے ہوتا ہے ۔۔! عورت کا گھر بسانے سے ۔۔ میں تو یہی سوچتی ہوں ، جس طرح میں آپ کی ہو کر رہ گئی ہوں ۔ اب کوئی امر مانع نہیں ہونا چاہیے۔"

"اور وہ میرے بیوی بچے ؟"

"میں انہیں کچھ بھی نہیں کہوں گی ۔ ان کی راہ میں بھی نہ آؤں گی۔"

"کیا ہم کسی اور موضوع پر گفتگو نہیں کر سکتے؟" اسلم کو گفتگو اب بوجھل سی محسوس ہونے لگی۔

"معافی دے دیجئے گا ۔ کچھ مان ہے تو یہ سب کچھ کہہ جاتی ہوں ۔ میں ہر حال میں آپ سے بہت خوش ہوں۔" اسلم کو اس کی گفتگو میں سچائی سی دکھائی دی ۔ وہ وہاں سے اُٹھے اور سانولی کے ہاں لوٹ آئے ۔ میاں اسلم رات گئے وہاں سے لوٹا ۔ ساتھ والی گلی سے چوکیدار کی آواز گاہے گاہے سنائی دے رہی تھی ۔

اسے خاصے دن لاہور سے باہر قیام کرنا پڑا ۔ نئے کنٹریکٹ کے سلسلے میں شہر سے دور رہا ۔ سڑک کی توسیع کے ایک بڑے منصوبے کا ٹھیکہ تھا ۔ نیا منصوبہ خاصا وقت لے رہا تھا ۔ اتنے دنوں کا وقفہ اسے عجیب سا لگا ۔ اس نے سوچا کیوں نہ سانولی کو سرپرائیز دے اور بغیر اطلاع پہنچ جائے ۔ اس بار سانولی کو اپنی آمد کی اطلاع ہی نہیں دی ۔ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی ایک عجیب تعلق تھا ۔ خورشید بیگم نے دروازہ کھولا اور واری صدقے ہونے لگی۔ بچھا در ہوئے جا رہی تھی ۔

"میاں جی ۔۔ آپ تو اُداس کر جاتے ہیں نہ میرا دل لگا اور نہ سانولی کا ۔۔ یہ چھوٹی موئی الگ اُداس رہی ۔ سارا دن دھیمے سروں میں ڈیک پہ پرانے درد بھرے گیت سنتی رہی ۔" خورشید بیگم نے میاں اسلم کو کرسی تھمائی ۔ صحن میں بٹھایا ۔ وہ مسلسل بولے جا رہی تھی ۔

"خورشید بیگم ، سچ پوچھو تو میں بھی کئی دنوں سے اب آپ لوگوں کا ہی سوچ رہا تھا ۔۔ سیدھا آپ کے ہاں ہی آیا ہوں ۔"

"سچ میاں جی ۔۔ قربان ۔۔ اتنی مصروفیت میں بھی ہم نہ بھولے ۔"

"اچھا آپ نے اسے اطلاع نہیں دی ؟ میں خود ہی چلا جاتا ہوں اوپر ۔" میاں اسلم کرسی سے اٹھا۔

"تشریف رکھیں میاں صاحب ۔۔ وہ دراصل کہہ گئی تھی کہ جلدی آجائے گی ۔ ابھی تک آئی نہیں ۔ اسے پتہ

ہوتا آپ کو آنا ہے تو دہلیز سے قدم ہی نہ نکالتی۔"

"قصور میرا ہے مجھے اطلاع کرنی چاہیئے تھی۔"

"فون ہی کر لیا ہوتا۔" خورشید بیگم نے بھرے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ وہ جیسے ہی ہنستی اس کا فربہ پیٹ اور سینہ اوپر نیچے تھرکنے لگتے۔ "میاں صاحب کچھ پیسے ہوں گے؟" وہ قدرے توقف سے بولی۔

"کیوں خیر ہے؟" میاں اسلم کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

"دراصل بجلی کا بل اس بار کچھ زیادہ آگیا ہے۔ آپ کے کمرے میں اے سی بہت چلتا رہا نا۔"

"کتنے؟"

"بس دے دیجیئے دو ہزار — دیکھیئے، سانولی کو خبر نہ ہو۔ اب ایک ہی اے سی چلتا ہے، روزی کے کمرے میں جو تھا، وہ لے گیا،" وہ چیکی۔ "حرام زادہ۔ اس نے کوٹھی اور ٹھکانہ ڈھونڈ لیا۔ روزی کو چھوڑ گیا ہے۔ اے سی بھی اُتروا کر لے گیا ہے۔ لوگوں میں مروت ہی نہیں رہی۔ لحاظ ہی غائب ہو گیا — نودولتیا!"

"کہاں گیا؟"

"بس اس نے کہیں اور جگہ تلاش کر لی۔ لیکن دیکھیں اس رئیس زادے کی نیچ حرکت۔ جاتی دفعہ سامان لیتا گیا۔ بھلا چھوڑ جاتا۔ یادگار رہتی — سانولی کے یہاں آنے سے پہلے مظفر گڑھ کا ایک رئیس حضور بخش آپ والا کمرہ استعمال کرتا رہا۔ انگ انگ اس کی تعریف کرتا ہے۔ اے سی لگوایا۔ قالین بچھوایا۔ جاتی دفعہ سب کچھ چھوڑ گیا۔ ہوئی نا بات — خاندانی تھا —! جگرا دکھایا۔ جب تک اپنی کوٹھی نہ بنالی اس جگہ کو اپنا گھر سمجھا۔ نیو ٹاؤن میں کوٹھی خرید لی۔ بدو تق میلہ اب وہیں کرتا ہے۔"

"لیکن میں نے بھی تو اے سی لگوا دیا ہے۔ وہ حضور بخش والا کدھر گیا؟"

"میاں جی — کمال ہے! اب پرانے اے سی میں تو میں نے آپ کو نہیں سُلانا تھا۔ بڑی آواز کرنے لگا تھا، بیچ دیا،" خورشید بیگم نے جھبا کو دانتوں تلے دبا کر کہا۔ "ویسے حضور بخش عجب من موہنی مخلوق تھی۔ تن من دھن سب کچھ لٹا دیتا۔ سر پر شملہ اور چہرے پر مسکراہٹ قائم رہتی۔ پر یہ نودولتیے —" اس نے غلیظ گالی دے کر کہا۔

میاں اسلم کو یوں لگا جیسے ان نودولتیوں میں وہ بھی شامل تھا۔ گفتگو غیر ضروری طور پر طویل ہوتی جا رہی تھی۔ میاں اسلم نے خورشید بیگم کے ہاتھ میں نوٹ تھمائے اور گھڑی کی طرف دیکھا۔ "سانولی کو میرا پیار کہہ دیں، لگتا ہے وہ فلم دیکھنے چلی گئی ہو گی۔

"وہ ہدایت ہے نا — وہ لڑکا — کل روزی کو لینے آیا تھا۔ کسی فلم کی بڑی تعریف کر رہا تھا،" خورشید بیگم نے اٹھتے اٹھتے کہا۔

"کیا وہ بھی ساتھ تھا؟" اسلم نے بھویں تان کر پوچھا۔

"نہیں — یہاں سے تو دونوں اکیلی گئی ہیں —! معلوم نہیں کب لوٹیں۔"

"بس حاضری لگ گئی — آئے گی تو بتا دیں۔ گھر بھی نہیں گیا۔ بچوں کو دیکھے بھی بڑے دن ہو گئے ہیں۔" وہ چلتے چلتے کہنے لگا۔ خورشید بیگم نے اثبات میں سر ہلایا —!

دروازے پر غیر معمولی تبدیلی دکھائی دی۔ سماجی بہبود کی تنظیم کا بورڈ آویزاں تھا۔ میاں اسلم کی سمجھ سے یہ بات بالاتر تھی۔ صحن میں کرسیوں پہ کئی خواتین دکھائی دیں۔ کچھ خواتین گھر سے نکل رہی تھیں۔

"میاں صاحب ـــ آیئے ڈرائنگ روم میں تشریف لے آیئے گا۔" خورشید بیگم جلدی سے ان کی طرف بڑھی۔ "میاں صاحب رفاہی کاموں میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔" خورشید بیگم نے وہاں موجود دوسری خواتین سے اسلم کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

اسلم پھٹی پھٹی نظروں سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ایک علمی رسالے کی ورق گردانی کرنے لگا۔ کچھ توقف کے بعد خورشید بیگم کمرے میں داخل ہوئیں۔ "یہ جھگھٹا کیسا؟" اس نے پوچھا۔

"میاں صاحب ہم نے محلے کی بہبود کے لئے ایک تنظیم قائم کی ہے۔ خواتین نے مجھے صدر چن لیا ہے۔ رضاکارانہ کام کیا جائے گا۔"

"خورشید بیگم یہ بیٹھے بٹھائے نظروں میں کیوں آ رہی ہو؟"

"میاں جی یہ نظروں میں آنے کا نہیں بُری نظروں سے بچنے کا سامان ہے اور ویسے بھی ایسا اکٹھ مہینے بھر کے بعد ہوا کرے گا۔"

"خواتین ایک ایک کر کے وہاں سے جا چکی تھیں۔ میاں اسلم اور خورشید بیگم ہی رہ گئے تھے۔" آپ جایئے اوپر۔ وہ بے چاری نجانے کب سے آپ کی منتظر ہو گی۔" خورشید بیگم نے گھاگ نظروں سے دیکھا۔

وہ اوپر چل دیا۔ کمرہ نیم تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ سڑک پر اکا دکا رکشے کی آواز سنائی دیتی۔ اسلم نے ہاتھ بڑھا کر قریب ہی سٹیریو آن کر دیا۔ سانولی نے اپنے ہاتھ اس کے شانے پر پھیرے۔ انگلیوں سے اس کے چٹکیاں لیں۔ "سانولی ایک بات تو بتاؤ۔"

"پوچھیئے۔"

"تم یہاں کیسے پہنچیں؟ میرا مطلب ہے خورشید بیگم کے ہاں۔"

"اسلم صاحب یہ تو ایک لمبی کہانی ہے۔ اب اس کا ذکر نہ ہی کریں تو بہتر ہے۔"

"پھر بھی کچھ تو بتاؤ۔"

"کچی عمر تھی۔ بس پہنچ گئی۔ اب تو آپ کی ہو کر رہ گئی ہوں۔ صرف آپ کی۔"

"آخر ایسی بھی کون سی بات ہے۔"

"کیا ہی اچھا ہو ہمارا اپنا گھر ہو۔ ہم کھلے بندوں گھومیں پھریں ـــ میرے بچے ہوں۔ مجھے ماں کہیں ۔ آپ کو باپ کہیں۔"

"سنی ـــ کئی بار کہہ چکا ہوں ـــ الجھن سی ہونے لگتی ہے۔"

"آپ کو میری یہ بات اچھی نہیں لگتی۔"

"دیکھو ـــ میں نے تمہارے لئے کیا نہیں کیا۔ آرام۔ آسائش ـــ یہ سب کچھ تمہارے لئے وقف کر دیا۔ زندگی ایک جھمیلا ہے اس میں اور اضافہ کیوں کرنا چاہتی ہو؟"

"آپ کیوں نہیں سمجھتے۔ میں اپنے آپ کو اب سجانے کیوں نامکمل محسوس کرتی ہوں۔ آپ آتے ہیں تو وقت گزرتے پتہ ہی نہیں چلتا۔ لیکن آپ کے جانے کے بعد ایک، ایک پل بہت بھاری گزرتا ہے۔ تھیٹر میں کام۔ وہ تو دل لگانے کا ایک بہانہ ہے۔ میں ایک ہنستے بستے گھر کا خواب دیکھ رہی ہوں۔ اپنا گھر، کھلے آنگن میں کھیلتے ننھے منے بچے ـــ میں نامکمل ہوں ـــ مجھے مکمل بنائیے ـــ میں کب مکمل ہوسکوں گی ـــ؟" اس کی آواز بھرائی ـــ "آپ کی ذات ہی مجھے تکمیل کے مراحل سے گزار سکتی ہے ـــ! کاش آپ میرا درد جان سکتے۔"

"لیکن تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں دنیاوی بندھنوں کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ میں دوسری شادی کے بارے نہیں سوچ سکتا" اسلم نے کہا۔

سانولی سمٹ سی گئی۔" لیکن آپ کیوں نہیں سوچتے۔ مجھے اب ایک نام چاہیے"۔!

"نام ـــ یہ رٹ تمہارے ذہن پر سوار ہوچکی ہے۔" اسلم نے اس کی بات کاٹی۔

"میں تو آپ کی ہوکر رہنا چاہتی ہوں، آپ کے نام کی مالا جپتی رہوں گی۔"

"تم سمجھا کرو ـــ میری اولاد جوان ہو رہی ہے۔ میں ایک نئے مسئلے میں نہیں پڑ سکتا ـــ اور پھر تمہاری ہر ضرورت پوری کرتا رہتا ہوں۔" وہ یہ کہہ کر دیر گئے تک خاموش بیٹھا رہا۔

گزشتہ کئی روز سے وہ شہر سے باہر تھا۔ نیا نیا کام شروع کرایا تھا۔ پلانٹ کی تنصیب، مشنری کی فراہمی، ہنرمند کاریگروں کی دستیابی، ان جھنجھٹوں کی وجہ سے وہ سانولی کے ہاں کئی دنوں سے نہ جاسکا۔ اس قدر طویل غیر حاضری تو اس نے کبھی نہ کی تھی۔ فون پر حال پوچھ لیا۔ سانولی نہ جانے کیا سوچ رہی ہوگی۔ پچھلے چند دنوں سے تو اس نے فون پر بات کرنے سے بھی اجتناب کیا۔ کوئی بات نہیں۔ اس نے سوچا آخر اسے منا ہی لے گا۔ یہ سب کچھ ایسے ہی سہانا تھا۔ وہ دل ہی دل میں مسکرانے لگا۔ شہر پہنچتے ہی اس نے خورشید بیگم کے گھر کا رُخ کیا۔ بیل دی ـــ "آئیے تشریف لائیے۔" خورشید بیگم اسے ڈرائنگ روم میں لے آئی ـــ "اتنے دن لگا دیئے۔" اس کے لہجے میں شکایت سی تھی۔

"بس سائیٹ پر بہت کام تھا۔ فرصت ملی تو سیدھا ادھر آرہا ہوں۔ ابھی اپنے بیوی بچوں کے پاس بھی نہیں گیا۔ "سانولی کہاں ہے؟" میاں اسلم نے پوچھا۔

"اوپر اپنے کمرے میں ـــ"

"میں ہو آؤں؟ وہ تو نیچے نہیں آئی۔" وہ کہنے لگا۔

"سانولی کے پاس ـــ" وہ بولتے بولتے رُکی۔

"کیوں خیر تو ہے نا۔"

"خیر ـــ آپ ہو آئیے گا ـــ یہ لڑکی اب میری باتیں تو سمجھنے سے رہی۔"

اس نے سیڑھیوں کی راہ لی ـــ دروازے پر دستک دی اور کمرے میں داخل ہوگیا۔

"آپ ـــ کب آئے؟" اس کے چہرے پر مہین سی مسکراہٹ تھی۔

"ابھی ابھی ـــ دیکھو سیدھا تمہارے پاس چلا آیا ہوں۔"

"اچھا کیا آپ آگئے۔" وہ کہنے لگی۔
"مجھے معلوم تھا تم اداس ہو گی اور ناراض بھی۔"
"نہ میں اداس تھی نہ ناراض"۔ اس نے بڑے ٹھہرے لہجے میں کہا۔
"کیوں خیر ہے نا۔"
"ہاں خیر ہے۔ آپ کو ایک ضروری فیصلہ سنانا ہے۔"
"کیسا فیصلہ؟"
"میں نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔"
"دیکھو ساوِلی وہی پرانی ضد!" اس نے اسے بازوؤں میں تھام کر پاس بٹھاتے کہا۔
"اس بار آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" وہ بولی۔
"کیا مطلب؟"
"میں نے اپنے لئے ساتھی کا انتخاب کر لیا ہے۔"
"کیسا انتخاب؟ کون ہے وہ؟" اسلم نے حیرت سے اس کی طرف تکتے ہوئے کہا۔
"ہدایت ۔۔!"
"ہدایت؟ وہ کنگلا؟" میاں اسلم نے مبہوت انداز میں اسے پھر سے دیکھا۔
"کنگلا" وہ تیزی سے بولی "وہ مجھے اپنے عقد میں لے رہا ہے۔"
"کیا خوبی ہے اس میں؟" اسلم کے نتھنے پھولے۔
"اس میں؟ وہ مجھے اپنا نام دے رہا ہے اور ایک روز میرے شکم میں دھڑکتی روح کو بھی اپنا نام دے گا۔ کیا آپ یہ کر سکتے تھے؟" اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔
"اسلم صاحب فیصلے کا وقت آن پہنچا ہے۔ ہر عورت اپنا گھر بسانا چاہتی ہے۔ کوئی شخص بھی عورت کی اس خوابیدہ خواہش کو اس سے چھین نہیں سکتا۔"
"لیکن اگر اسے تمہاری اس زندگی کا پتہ چل گیا تو ۔۔؟"
"وہ یہ جان چکا ہے ۔۔ اسلم صاحب ۔۔ اس روز سے، جب میں نے یہ فیصلہ کیا، میرے وجود کو کسی نے نہیں چھوا ۔۔ نہ کوئی چھو پائے گا ۔۔ آپ بھی نہیں۔"
"تم فیصلہ کر چکی ہو تو مجھے اور کچھ نہیں کہنا"۔۔ میاں اسلم نے ہارے لہجے میں اس سے کہا اور سیڑھیوں سے اُتر آیا۔
خورشید بیگم سامنے صحن میں کھڑی تھی۔ "کیا ہوا؟" وہ سوالیہ انداز سے ہڑبڑ تک رہی تھی۔
"وہ فیصلہ دے چکی ہے۔"
"اس لڑکی کو دیکھو۔ اس کے سر پر شادی کا بھوت سوار ہے۔ دو کوڑی کا ملازم اسے کیا رکھے گا۔ میاں جی آج کل ان لڑکیوں کو نجانے کیا ہو گیا ہے۔ کام میں دل ہی نہیں لگاتیں۔ شادی کا خبط سوار ہو جاتا ہے۔ خواہ وہ

کوئی فقرا ہی کیوں نہ ہو۔" خورشید بیگم بڑبڑائے جارہی تھی۔" جانے دیں اسے چلی جائے۔ روزی گئی۔ یہ بھی چلی جائے۔ آگے بھی چلی گئی تھیں۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں دو تین روز میں کوئی اور بندوبست کر لوں گی۔ ہر طرح سے آپ کا خیال رکھے گی۔"

"نہیں خورشید بیگم ۔ آپ کو اب کوئی انتظام کرنے کی ضرورت نہیں۔" میاں اسلم بولا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ۔ میں اب یہاں نہیں آؤں گا۔"

"میاں صاحب ۔ آپ بھی ہمیں یوں چھوڑ جائیں گے؟ ایسی بات آپ کے منہ سے"! خورشید بیگم نے روہانسا ہو کر کہا۔

"ہاں میں اب اس گھر میں نہیں آؤں گا۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔"

"کیا آپ کا فیصلہ اٹل ہے؟" خورشید بیگم گھبراہٹ میں تھی۔

"ہاں یہ میرا حتمی فیصلہ ہے۔"

وہ بدستور بڑبڑاسے تکے جارہی تھی۔" میاں جی ایک بات پوچھوں۔"

"ہاں ۔ پوچھو۔"

"آپ اپنا ڈبل بیڈ، اے سی اور ٹیلی ویژن تو اٹھوا کر نہیں لے جائیں گے نا۔"

"خورشید بیگم ۔ میں یہاں سے کوئی چیز بھی اٹھا کر نہیں لے جاؤں گا۔ اب اس گھر کی ہر چیز تمہاری ہے۔"

"سچ میاں جی؟ آپ تو رئیس حضور بخش کی طرح عظیم انسان ہیں۔ وہ بھی اپنا قالین، اے سی اور صوفہ یہاں چھوڑ گیا تھا۔" خورشید بیگم نے ایک لمبا سا سانس لیا۔

میاں اسلم نے اس کے بعد ۔ پیسٹل کی طرف دیکھا اور تیز تیز قدموں سے وہاں سے نکل آیا۔

یہ جہنم

عرفان علی شاد

دیال میرا دوست تھا۔ وہ ہندو تھا۔ میں مسلمان تھا۔ ہم دونوں اُس زمانے میں بمبئی کی ایک خستہ چال بلڈنگ کی ایک تنگ و تاریک کھولی میں بیس روپے ماہوار کرائے پہ رہتے تھے۔ کھولی کا فرش جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ دیواریں سیلی ہوئی تھیں۔ دیمک زدہ دھنیوں کی چھت تھی جس سے چوبیس گھنٹے برادہ جھڑتا رہتا تھا اور بے شمار کھٹمل رات بھر ہمارا خون چوستے رہتے تھے۔ پوری چال کا صرف ایک غسل خانہ تھا جس میں صبح ہی سے بھانت بھانت کی عورتیں میلی کچیلی دھوتیاں باندھے پانی بھرنے کے لئے جمع ہو جاتی تھیں۔ کبھی کبھی ان میں لڑائی بھی ہو جاتی تھی اور نوبت گالی گلوچ تک پہنچ جاتی تھی۔ مجھے یہ سب کچھ دیکھ کر بہت کوفت ہوتی تھی لیکن اس معاملے میں نہ میں کچھ کر سکتا تھا اور نہ دیال اور نہ وہ بڈھا پارسی جو اس بلڈنگ کا مالک تھا اور جو ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو کرایہ وصول کرنے آتا تھا اور پھر اپنی موٹر میں بیٹھ کر نہ جانے کہاں چلا جاتا تھا۔ کھولیوں میں رہنے والے اُس کی موٹر کو حسرت سے دیکھتے ہی رہ جاتے تھے۔

اس مایوس دنیا میں اُمید کی بس ایک ہی کرن تھی مسز فرنانڈس ——— جو ہم سب کی ماں تھی۔ ہم سب اُسے "مدر" کہتے تھے۔ ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ ایک ڈھیلا ڈھالا اسکرٹ پہنتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی تیز تیز چلتی تھی۔ نہ جانے قدرت نے اس کے سینے میں کون سا دل فٹ کر دیا تھا کہ جس میں ساری دنیا کا درد سمایا ہوا تھا۔ چال میں رہنے والے ہر شخص کا بالکل اسی طرح خیال کرتی تھی جیسے کوئی شفیق ماں اپنے بچوں کا خیال کرتی ہے۔ سب کی خدمت کرتی تھی۔ سب کے کام آتی تھی۔ سب کے دُکھوں کو بانٹتی تھی۔ یہی حال اس کے شوہر کا تھا جو ایک قریبی گرجا گھر کے سامنے فٹ پاتھ پہ موم بتیاں بیچا کرتا تھا۔ اس کی موم بتیوں سے گرجا کی مقدس فضا میں ایک پُر سکون اُجالا پھیل جاتا تھا۔ اس متحرک اُجالے میں ہال کی سامنے دیوار پہ صلیب پہ لٹکے ہوئے یسوع کی تصویر بڑی پُراسرار سی لگنے لگتی تھی۔ بوڑھا فرنانڈس جب عقیدت سے اس تصویر کے آگے اپنی گردن جھکا کر دعا کے لئے ہاتھ باندھتا تو اس کی بند آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے۔ وہ دل ہی دل میں کہتا ——— "اے یسوع! تمہاری سولی کو روشن کرنے کے لئے تو وہ چراغ موجود ہیں جو میں دن بھر فٹ پاتھ پہ کھڑے ہو کر بیچتا ہوں مگر ابھی تک دنیا میں وہ چراغ نہیں بن سکے، جو اُن سولیوں کو روشن کر سکیں جن پہ دنیا کے ہر کونے میں بے شمار زندگیاں لٹکی ہوئی درد سے کراہ رہی ہیں . . . . یسوع! ان کو سولی سے اتار لو . . . . . . ان کو سولی سے اتار لو . . . . . ." فرنانڈس بہت جذباتی ہو کر چلانے لگتا تو لوگ دھکے دے کر اسے چرچ سے باہر دھکیل دیتے تھے . . . . . . "موم بتیاں بیچتے بیچتے پاگل ہو گیا ہے

بڈھا . . . . گیٹ آؤٹ یو فول . . . . " فرنانڈس لڑکھڑاتا ہوا باہر آجاتا، کچھ دیر بھو بچکا سا کھڑا رہتا جیسے پہلی بار دنیا میں آیا ہو۔ پھر اپنی میلی قمیص کے کھلے کفوں سے آنکھیں پونچھ لیتا اور دوبارہ چھوٹی بڑی رنگ برنگی موم بتیاں بیچنے لگتا۔ وہ کالی پتلون پہنتا تھا جس کے پائنچے اس قدر گھس گئے تھے کہ ٹخنوں سے اوپر آگئے تھے اور نچلے حصے میں صرف دھاگے لٹکے رہ گئے تھے، اس ڈھیلی ڈھالی پتلون کو وہ ایک باریک بیلٹ کے سہارے زبردستی کمر پہ لٹکائے رہتا تھا جیسے بہت سے لوگ زندگی کو لٹکائے رہتے ہیں۔ پھر بھی کسی کسی وقت اس کی پتلون اپنی جگہ سے پھسل جاتی تھی جیسے کبھی کبھی زندگی پھسل جاتی ہے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے پتلون کو اوپر کر لیتا اور اب اس کے جوتے نمایاں ہو جاتے جو اس قدر میلے اور اس قدر پھٹے ہوتے تھے کہ نہ ان کا رنگ پتہ چلتا تھا اور نہ شکل نظر آتی تھی۔ خود فرنانڈس کی اصل شکل بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس کے سفید بال حجامت سے بے نیاز رہتے تھے اور کانوں کے اوپر سے ایک جھالر کی طرح لٹکے رہتے تھے اور اس کی داڑھی میں نہ جانے کہاں جذب ہو جاتے تھے۔ بالوں کو چھپانے کے لئے یا شاید گرمی سے بچنے کے لئے وہ وکٹورین عہد کا ایک ملگجا سا ہیٹ سر پہ پہنتا تھا۔ یہ ہیٹ بالکل اس طرح اس کے سر کا حصہ لگتا تھا جیسے وہ اسی کے ساتھ پیدا ہوا ہو۔ بس کبھی کبھی جب لوگ کچرے کی ٹوکری کی طرح اسے چرچ سے باہر پھینک دیتے تو وہ گھبرا کر اپنا ہیٹ سر سے اتار پھینکتا تھا اور بدحواس ہو کر اپنے بڑھے ہوئے ناخنوں سے سر کھجانے لگتا تھا۔

پھر جب دن کی روشنی کو رات کے اندھیرے نگل لیتے، ہوا خنک ہو جاتی اور آسمان پر ستارے آنکھیں جھپکانے لگتے اور پھیلے ہوئے سناٹوں میں رات بالکل اکیلی رہ جاتی تو بوڑھا فرنانڈس اپنے تھیلے سے، جو عام طور پر پارک کی ریلنگ سے ٹنگا رہتا تھا، اپنا وائلن نکال لیتا اور دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر کوئی اُداس دھن بجانا شروع کر دیتا۔ اس آواز میں خدا جانے کہاں سے اتنا درد سمٹ آتا تھا کہ آس پاس کے لوگ کھنچے چلے آتے تھے ـــــ انہیں لمحوں میں دیال جو میرے برابر ہی کھڑا ہوتا، ایک سرد آہ بھر کر میرے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر کہتا ـــــ " بندھو! یہ جنم تو اکارت گیا ـــ"۔ دیال کا یہ جملہ میری سماعت سے اس طرح ٹکراتا جیسے جنگلوں کی ہوا ویرانوں سے ٹکراتی ہے۔ میں کوئی جواب نہیں دیتا تھا کیونکہ میرے لئے تو یہی جنم پہلا اور آخری جنم تھا ـ!

دیال دن بھر اسٹوڈیو میں ایڈیٹنگ کرتا تھا اور میں فلم کے اسکرپٹ کو درست کرنے میں سر کھپاتا رہتا تھا لیکن جب فلم ریلیز ہوتی تھی تو ٹائٹل پر نہ اس کا نام ہوتا تھا نہ میرا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم دونوں چھوٹے آدمی تھے اور چھوٹے آدمی ہمیشہ بڑے آدمیوں کی خدمت کرتے ہیں۔ پوری دنیا کا یہی دستور ہے لہٰذا ہم بھی اسی دستور کے مطابق کام کر رہے تھے۔ اس کام کے بدلے بڑے لوگ نام کما رہے تھے، شہرت حاصل کر رہے تھے، وہ جدھر سے گزرتے تھے لوگوں کی بھیڑ ان کے گرد جمع ہو جاتی تھی، لاتعداد کیمروں کی فلیش لائٹیں ان کے چہروں پہ پڑتی تھیں، ان کے انٹرویو لئے جاتے تھے، آٹوگراف لئے جاتے تھے، وہ بھیڑ کو چیرتے ہوئے بڑی مشکل سے اپنی کار تک پہنچتے تھے اور پھر یکایک غائب ہو جاتے ہیں اور مجھے اور دیال کو بس اتنا معاوضہ ملتا تھا کہ ہم جوں توں کر کے اپنے آپ کو زندہ رکھے ہوئے تھے۔ جو کچھ ملتا تھا وہ کھولی کے بھاڑے، کھانے پینے اور بسوں کے کرائے میں نکل جاتا تھا، بچتا کچھ بھی نہیں تھا۔ بلکہ کسی کسی مہینے تو نوبت فاقوں تک پہنچ جاتی تھی۔ ان دنوں میں ہم دونوں اپنے آپ ہی میں کھوئے رہتے تھے۔ دیال کو بھی چپ لگ جاتی تھی اور میں بھی خاموش رہتا تھا۔ بس کچھ ایسا لگتا تھا جیسے ہم دونوں زندگی کی بھیڑ میں اچانک ایک دوسرے سے بچھڑ گئے ہوں۔ میں کھڑکی میں بیٹھا رہتا تھا۔

یونہی خالی خالی نظروں سے باہر دیکھنے لگتا تھا جہاں ایک دھواں سا پھیلا رہتا تھا۔ اس دھوئیں میں کچھ کمرے نظر آتے تھے اور کمروں میں عورتوں، مردوں، بچوں اور بوڑھوں کے عجب بے جان سے سائے چلتے پھرتے محسوس ہوتے۔ ان میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا تھا اور یوں بھی رات کے وقت بہت سے چہرے اور بہت سے لوگ ایک جیسے ہی دکھائی دیتے ہیں۔ پھر اچانک مانوس قدموں کی ایک آہٹ ابھرتی تھی۔ اس آہٹ پر ہم دونوں چونک پڑتے تھے۔ گھبرا جاتے تھے اور اگلے ہی لمحے مسز فرنانڈس یعنی "مدر" دروازہ کھول کر اندر آجاتی تھی۔

"تم نے کھانا کھایا؟" وہ آتے ہی پوچھتی۔

"کھالیا تھا مدر!" ہم دونوں ایک ساتھ بول اُٹھتے۔

مگر "مدر" جہاں دیدہ تھی اس لئے ہمارے اُترے ہوئے پریشان چہروں سے سمجھ جاتی تھی کہ ہم جھوٹ بول رہے ہیں فوراً بگڑ جاتی تھی۔

"تم دونوں مدر کو ایڈیٹ سمجھتا، تم سمجھتا ہم کچھ نہیں جانتا، تم ہمیں الّو بناتا؟"

"ایسی بات نہیں ہے مدر" میں کمزور سا احتجاج کرتا۔

مدر رو پڑتی تھی، کہتی "جب مدر بولتا تو ہم کو بلف کائے کو کرتا؟ تم بھوکا سوئے گا تو مدر بڑا خوش ہوئیں گا نا؟"

"مدر، دنیا میں کتنے ہی لوگ بھوکے سو جاتے ہیں تم کس کس کو کھانا کھلاؤ گی؟" میں کہہ دیتا۔

"پر ہم تمہیں تو کھلا سکتا، ہم جو کرنے کو سکتا تم ہمیں اس سے نہیں روک سکتا، ہم ابی کھانا لاتا" یہ کہہ کر وہ تیزی سے واپس پلٹ جاتی۔

مدر کا لایا ہوا کھانا کھا کر جب ہم دونوں کھولی کے فرش پر سونے کے لئے لیٹتے تو دیال اپنے بازو سر کے نیچے رکھے بہت دیر کچھ سوچتے رہنے کے بعد کہتا —— "بندھو! یہ جنم تو اکارت گیا"!

اُس کا جملہ خاموشیوں میں گم ہو جاتا۔ پھر وہ داہنی کروٹ لے لیتا، میں سمجھ جاتا کہ اب وہ سونے والا ہے کیونکہ وہ اسی کروٹ سے سوتا تھا، تھوڑی دیر بعد اندھیرے میں اس کے خراٹے گونجنے لگتے۔ اب میں بالکل اکیلا ہو جاتا تھا۔ اندھیرے میں نظریں گاڑے میں بہت کچھ سوچا کرتا تھا۔ کہیں کوئی سخت ہی ادھورا پن، محرومی اور خلا رہ گیا تھا زندگی میں، شاید یہ ہر انسان کی تقدیر ہے۔ اس دنیا کی ساری خوشیاں کسے ملتی ہیں، کس کی زندگی مکمل ہے، سبھی اُدھورے ہیں، وہ بھی جو بظاہر کامیاب ہیں اور وہ بھی جو ناکام ہیں —— کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی گوشے میں ضرور اندھیرا رہ جاتا ہے۔ زندگی کے راستے بہت اُلجھے ہوئے ہیں اسی لئے انسان کا ایک پاؤں کہیں ہوتا ہے تو دوسرا کہیں، لیکن کہیں پر کوئی محبت کا احساس دیتا ہے تو اس احساس میں پھول کھلنے لگتے ہیں اور ایک خوشبو سی پھیلنے لگتی ہے۔ آج کی دوڑتی بھاگتی اور بدحواس دنیا میں یہ خوشبو ایک روشنی ہے اور اسی روشنی کی بدولت اندھیرے دلوں میں یکایک کوئی چراغ تڑپ کر جلنے ہی لگ پڑتا ہے۔ سوچتا ہوں دیال نہ ہوتا یا مدر نہ ہوتی تو کیا میں جی سکتا تھا؟ . . . . انہی کی وجہ سے تو جئے جا رہا ہوں . . . . شعر کہہ رہا ہوں، گیت اور کہانیاں لکھ رہا ہوں، . . . . شاید کبھی تقدیر بھی مہربان ہو جائے، تقدیر کو مہربان ہوتے کون سی دیر لگتی ہے . . . . یہی زندگی اچانک بھی بدل سکتی ہے اور پھر وہ دن بھی آسکتا ہے جب میرے لکھے ہوئے گیت میرے ہی نام سے بجنے لگیں گے اور دیال کی ایڈٹ کی ہوئی فلمیں اُسی کے نام سے ریلیز ہونا شروع ہو جائیں —— کیا خبر . . . . کیا خبر . . . . . .

کھٹمل مچھر کاٹنے لگتے — چھت سے برادہ گرنے لگتا — چال میں اندھیرا چھا جاتا تو میں بھی سو جاتا۔

اگلی صبح جب میں دیال کو اسٹوڈیو میں دیکھتا تو رات والا اُداس اور کڑھتا ہوا دیال غائب ہو چکا ہوتا تھا۔ اب وہ خاکی نیکر اور سفید بنیان پہنے اپنے کمرے کے فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوتا تھا اور فلم کی مختلف ریلیں کاٹ کاٹ کے جوڑ رہا ہوتا تھا۔ بہت ڈبے اور بے شمار ریلیں اس کے چاروں طرف بکھری ہوتی تھیں اور وہ اتنی دلچسپی اور انہماک کے ساتھ انہیں جوڑ رہا ہوتا، جیسے کسی ٹوٹی ہوئی زندگی کو جوڑ رہا ہے۔ اس وقت وہ بہت ہشاش بشاش نظر آتا۔ وہی دیال جو بسوں اور لوکلوں میں دھکے کھاتا تھا، جس کا جوتا بہت دن سے پھٹا ہوا تھا، جو لمبی کیو کی وجہ سے نل پر منہ دھونے سے بھی محروم رہ جاتا تھا اور جس کی قمیض مدتوں سے نہیں دُھلی تھی، اس وقت سٹوڈیو میں موجود اپنی ہی طرح کے لوگوں میں بہت مگن بیٹھا ہوتا، خوش گپیاں کرتا، لطیفے سناتا اور قہقہے لگاتا۔ میں اسٹول پر بیٹھ کر جب گیت لکھ رہا ہوتا اور فلور پر شوٹنگ چل رہی ہوتی تو مجھے دیال کو دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی۔ میں کشمکش و پیچ میں پڑ جاتا کہ یہ کون سا دیال ہے — مگر دیال تو وہی ہے، کوئی نیا آدمی نہیں ہے جیسے یہ دنیا وہی ہے کوئی نئی دنیا نہیں ہے، جیسے چاند سورج اور ستارے وہی ہیں، آسمان وہی ہے اس کی وسعتوں میں اڑتے ہوئے پرندے وہی ہیں اور سماج وہی ہے — اس طرح دیال بھی وہی ہے!

مگر وہی دیال جب دھواں دھواں اُداس راتوں میں کھولی میں زمین پر لیٹ کر اپنے بازو سر کے نیچے رکھے بہت دیر خود میں کھوئے رہنے کے بعد کہتا کہ — "بندھو، یہ جنم تو اکارت گیا!" تو مجھے وہ کوئی دوسرا ہی شخص نظر آتا، مجھے لگتا جیسے وہ کسی گہرے کنوئیں سے بول رہا ہے، میں کنوئیں میں نہ جھانکتا اور خاموشی سے سگریٹ پہ سگریٹ پھونکتا رہتا۔ کھولی میں عجیب پُراسراری دُھند چھا جاتی تو اچانک مدرا آجاتی اور مجھ سے سگریٹ چھین کر کھڑکی سے باہر پھینک دیتی — "یو ایڈیٹ کائے کو مرنے کو مانگتا!"

اور میں سوچنے لگتا کہ میں جیا ہی کب تھا۔ چپ رہتا ہوں تو مدرا ڈانٹتی ہے "تم بولتا کیوں نہیں؟"

"کیا بولوں مدرا!" میں سر اُٹھا کر پوچھتا ہوں "کیا بولوں؟"

"ابی سے تو دل کائے کو چھوٹا کرتا، ابی تیرے کو رائٹر بننے کا ہے بابا، بڑے بڑے کام کرنے کا ہے، تیرے کو چانس ملیں گا، ضرور ملیں گا۔"

وہ کتنی نادان اور بھولی تھی کہ اسے اب تک یہی نہیں معلوم تھا کہ تقدیر بھی کوئی چیز ہوتی ہے، اور میں ان لوگوں میں سے ہوں جو اس طرح تقدیر کے بغیر دنیا میں آجاتے ہیں، جیسے سرکس یا مداری کا تماشا دیکھنے آئے ہوں۔ کاتبِ تقدیر سب کی تقدیر نہیں لکھتا جیسے افسانہ نگار سب کے افسانے نہیں لکھتا۔ کچھ لوگوں کو وہ محض دنیا کی رونق بڑھانے کے لئے تفریحِ طبع کے طور پر بھیج دیتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو زندگی کے افسانے میں صرف مرکزی کرداروں کو اجاگر کرنے کے لئے آتے ہیں اور خود تاریک کھولیوں میں گمنام مر جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کا ایک سر، دو ہاتھ اور دو ٹانگیں اور ایک پیٹ ہوتا ہے، جن کی کوئی شکل نہیں ہوتی یا ہوتی بھی ہے تو یوں نظر آتی ہے جیسے ہے بھی اور نہیں بھی، جیسے تجریدی آرٹ یا علامتی افسانہ ہوتا ہے۔ مدرا کو میں کیا بتاتا کہ چانس کے لئے میں نے کتنے احمقوں کے آگے ناک رگڑی ہے اور کتنے گدھوں کو سلام کیا ہے، مگر کچھ بھی نہیں ہوا۔ بھولے بھٹکے کوئی چانس مل بھی گیا تو جس فلم کے گیت لکھ دیئے وہ ریلیز نہیں ہوسکی، یا اس کا ڈائریکٹر مر گیا یا پروڈیوسر اور فنانسر میں جھگڑا ہوگیا یا ڈسٹری بیوٹر نے اڑنگا لگا دیا اور اس طرح میری

تقدیر کی طرح میری فلمیں بھی ڈبوں میں بند رہ گئیں اور انہیں چوہے کھا گئے۔ اگر اس وقت میں مدر سے کوئی چوہے مار دوا مانگ لوں تو وہ مجھے پاگل خانے میں داخل کروائے بغیر ہرگز نہیں مانے گی اور پھر آج کل کے چوہے تو اس قدر صحت مند ہیں کہ بلیاں ان سے خوف کھاتی ہیں۔ لہٰذا چوہے مار دوا مانگنا بھی بیکار ہے۔ پھر میں مدر سے کیا مانگوں؟ کیا میری سوئی ہوئی تقدیر کو، جسے سماج کے موٹے موٹے چوہے کھا گئے، مدر پھر سے جگا سکتی ہے؟ ہرگز نہیں جگا سکتی تو پھر میں سگریٹ بھی نہ پیوں تو کیا کروں؟ —— ایک تو زندگی یونہی کیا کم مشکل ہے کہ سگریٹ چھوڑ کر اسے اور بھی مشکل بنا لوں؟ —— نہیں —— یہ مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔

میں نے مدر کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ اُس نے میرے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا —— "تو اتنا کائے کو سوچت؟ . . . . سب ٹھیک ہو جائیں گا . . . . سب ٹھیک ہو جائیں گا . . . ."

اس روز بھی مدر کی محبت سے میری آنکھیں بھیگنے لگیں اور میں سوچنے لگا انسان کو نفرتیں ہی نہیں رُلاتیں بعض اوقات محبتیں بھی رُلا دیتی ہیں۔ مدر بہت کچھ کہتی رہی۔ بہت کچھ سمجھاتی رہی مگر میں صرف اُس کے ہاتھ کا لمس ہی محسوس کرتا رہا۔ میں کچھ بھی نہیں سُن سکا۔ پتہ نہیں میں کہاں کھو گیا تھا۔ پھر وہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی ہوئی دروازے سے باہر نکل کر اندھیروں میں گم ہو گئی اور میں سلاخوں والی میلی کھڑکی میں اس طرح اکیلا بیٹھا رہ گیا جیسے سونی حویلی کے کسی بڑے کمرے میں کوئی پرانی تصویر چوکھٹے میں اکیلی رہ جاتی ہے!

میں بہت دیر یونہی خاموش اور خیالوں میں گم کھڑکی میں بیٹھا رہا۔ پھر دیال نے کہا —— "تو سگریٹ چھوڑ کیوں نہیں دیتا؟"

"نہیں چھوٹتی، کیا کروں؟"

"مر جائے گا، اس طرح مر جائے گا تو!" یہ کہتے کہتے اسے کھانسی آگئی۔

میں کچھ نہیں بولا۔

پھر کئی سال اور گزرے، اس عرصے میں زندگی میں کئی نشیب و فراز آئے۔ میں مر مر کے جیا، جی جی کے مرا، اور آخر کار کامیابی کے کچھ آثار نمودار ہونے لگے، زندگی کی رُت کچھ کچھ بدلنے لگی، دل کی مرجھائی ہوئی شاخوں پر کلّے پھوٹنے لگے اور ننھی ننھی کونپلیں نکلنے لگیں۔ اب میرے دو مجموعے شائع ہو کر مارکیٹ میں آچکے تھے اور ادبی حلقوں میں میری شہرت پھیلنے لگی تھی، مجھے پسند کیا جانے لگا تھا۔ اب یوں لگنے لگا تھا جیسے دکھ بھرے دن بیتنے ہی والے ہیں اور سرد ہواؤں اور سیاہ بادلوں کے مسلسل تھپیڑے کھانے کے بعد سورج نکلنے ہی والا ہے۔ پھر چاروں طرف حرارت بخش دھوپ پھیل جائے گی، آسمان صاف ہو جائے گا، نیلا اور چمکدار اور اس کی وسعتوں میں سبک اندام پرندے تیرتے پھریں گے۔ اسٹوڈیو میں بھی میری اہمیت بڑھتی جا رہی تھی۔ کوئی سین غلط ٹھیک ہونے لگتا تو ڈائرکٹر سہگل کا گنجا اسسٹنٹ دوڑا دوڑا میرے پاس آتا —— "ارے آپ چل کر انہیں سمجھائیے، وہ کسی کی نہیں مانتے، سب کو گالیاں دے رہے ہیں۔"

میں اُسی وقت لکھنا چھوڑ کر اُٹھ کھڑا ہوتا اور تیز تیز چلتا ہوا فلور پر پہنچ جاتا۔ میں عام طور پر تیز نہیں چلتا تھا اس لئے مجھے غیر معمولی رفتار کے ساتھ آتا دیکھ کر سہگل چوکنا ہو جاتا تھا اور سمجھ جاتا تھا کہ سین میں ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ یہاں یہ بتاتا چلوں کہ اُس زمانے میں پورے ملک میں سہگل کا طوطی بول رہا تھا۔ ایشیا میں اس کا اسٹوڈیو دوسرے نمبر پہ تھا۔

سینکڑوں آدمی اس کے ملازم تھے اور اس کی محض ایک جنبش نگاہ سے لوگوں کی تقدیر بدل جاتی تھی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ مٹی کے بُت سے بھی کام لے سکتا ہے اور واقعی اُس نے اگر کسی کو فٹ پاتھ سے اٹھا کر اپنی فلم میں چانس دے دیا تو وہ دیکھتے ہی دیکھتے سُپر اسٹار بن گیا۔ آج کے کتنے ہی ٹاپ کلاس ہیرو اور ہیروئنیں جو فلمی افق پر سورج بن کر چمک رہے تھے انہیں اُسی نے انٹروڈیوس کروایا تھا۔ وہ ذہین تھا، جوہر شناس تھا اور اپنے کام کا ماہر تھا۔ اس لئے وہ سیٹ پر ہوتا تو وہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا، اپنے فن میں وہ کسی کی دخل اندازی کو برداشت نہیں کرتا تھا کیونکہ اُسے خود پر مکمل اعتماد تھا اور یہ اعتماد اس لئے تھا کہ وہ یتیمی کی حالت میں صرف تین روپے لے کر ایک جان پہچان کے ریلوے گارڈ کی خدا ترسی کی بدولت اپنی قسمت آزمانے کاٹھیواڑ سے بمبئی پہنچ گیا تھا۔ بمبئی آکر وہ برسوں فٹ پاتھ پر سویا تھا۔ اُس نے فاقے جھیلے تھے، لوگوں کی ٹھوکریں برداشت کی تھیں۔ ایک عرصے تک ایکسٹرا کے طور پر کام کیا تھا اور خر دماغ ڈائریکٹروں کی گالیاں اور تھپڑ کھائے تھے، قدم قدم پر وہ مذاق کا نشانہ بنا تھا، معتوب کیا گیا تھا لیکن اس کے قدموں میں ذرا سی بھی لڑکھڑاہٹ یا لغزش نہیں آئی تھی اور بالآخر ترقی کرتے کرتے وہ آج اُس مقام پر تھا کہ زمانہ اس کے آگے ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ اس کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو یقیناً مغرور ہو جاتا مگر اُس میں غرور نام کو نہیں تھا۔ البتہ ڈسپلن کے معاملے میں سخت تھا، بے اعتدالی پسند نہیں کرتا تھا۔ اس لئے کبھی کبھی بہت غصے میں آجاتا تھا مگر وہ آدمی کو پہچانتا تھا اور ٹیلنٹ کی قدر کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب میں تیز تیز چلتا ہوا فلور پر پہنچا تو وہ گھبرا جاتا تھا اور پوچھتا تھا —— "ہاں بول کیا لفڑا ہے بابا؟"

میں کہتا —— "آپ کو معلوم ہے یہ کس ڈائریکٹر کی فلم ہے؟"

"یہ کیا پوچھتا ہے بابا؟" وہ گھبرا جاتا۔

میں کہتا —— "یہ ڈائریکٹر سنجوگ کی فلم ہے، آپ غلط سین اوکے کر کے کیوں اس کے نام کو ڈبونا چاہتے ہیں؟"

وہ مسکرانے لگتا، اس کا لہجہ دھیما ہونے لگتا اور وہ پھر اسکرپٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے پوچھتا —— "کیا غلطی ہے؟ اس میں غلطی کیا ہے؟"

میں اُسے سین سمجھاتا، سین کی ڈیمانڈ بتاتا، حقیقی زندگی کی روشنی میں جہاں وہ سین حقیقت سے ہٹ رہا ہوتا تھا بس وہیں میں انگلی رکھ دیتا اور سنجوگ کی یہ بڑائی تھی کہ وہ اپنی غلطی تسلیم کر لیتا تھا۔ ایک لمحے کے لئے وہ میرے چہرے کو غور سے دیکھتا اور اپنی کرسی چھوڑ کر پیچھے جا کر بیٹھ جاتا۔ سارا سین میری ہدایات کے مطابق پکچرائز ہوتا۔ اس دوران وہ محض ایک تماشائی کی طرح خاموشی سے بیٹھا رہتا۔ شاٹ "اوکے" ہو جاتا تو پورے یونٹ میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی، سنجوگ مجھے گلے لگا کر کہتا —— "تیرے کو مانتا ہوں بابا!"

انہی دنوں میں نے محسوس کیا جیسے چمپا مجھ میں دلچسپی لینے لگی ہے۔ میں جتنی دیر سیٹ پر رہتا اس کی نگاہیں میرا تعاقب کرتی رہتیں اور میں عجیب سی الجھن میں پڑ جاتا تھا۔ یہ میری غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے —— لیکن نہیں —— ایسا نہیں تھا۔ کچھ دن سے میں اپنی کتابیں بھی اس کے ہاتھوں میں دیکھ رہا تھا جنہیں وہ بڑے انہماک سے پڑھ رہی تھی —— پھر میں نے دیکھا کہ وہ اپنی ڈائری میں کچھ لکھتی رہتی ہے اور جب کوئی آتا ہے تو ڈائری کو فوراً چھپا لیتی ہے۔ اس کے بعد یہ ہونے لگا کہ شوٹنگ سے فارغ ہو کر وہ سیدھی میرے کمرے میں آنے لگی اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے کرتے اچانک خاموش ہو کر صرف مجھے دیکھنے اور مسکرانے لگی۔

اُس کی مسکراہٹ میں محبت کا اعتراف تھا، خوش آئند خواب تھے اور جذبات کا ایک اُمڈتا ہوا طوفان تھا ــــ لیکن میں نے چونکہ زندگی میں اتنی ناکامیاں دیکھی تھیں کہ اب محبت کی جوت جگاتے ہوئے جی ڈرتا تھا، اب میں اُس مقام پر پہنچ چکا تھا کہ چھوٹی سی ناکامی کو بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا، اب آنسو بہانے کی ہمت میرے جگر میں ہرگز نہیں تھی اور پھر سب سے بڑھ کر جو دیوار میرے اور جیہا کے درمیان حائل ہو گئی تھی وہ وقت کی دیوار تھی، وہ وقت کہ جب میں کسی کے عشق میں گرفتار ہونے کی آرزو کرتا تھا بہت پیچھے رہ گیا تھا، وہ آئی تو ضرور تھی مگر بہت دیر سے آئی تھی۔ وہ اُس وقت آئی تھی جب میرے جذبات کی بے قابو موجیں پتھروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر آخر کار ایک ایسی راہ پر آ گئی تھیں کہ جہاں پانی بہتا تو ضرور ہے مگر لہریں ہرگز نہیں اٹھتیں۔ اسی لئے جب میں جان بوجھ کر انجان بن جاتا تھا تو وہ پیار بھرے گلے شکوے شروع کر دیتی تھی، اس کے خوبصورت شکوے بھی بے اثر ہونے لگے تو ایک شام اُس نے اپنی ڈائری میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اسے پڑھ لیجئے گا!"

میں نے کہا ــ "میں نے جب آپ کو پڑھ لیا ہے تو پھر اس کے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے!"

وہ ہنسی ــــ "آپ سچ کہہ رہے ہیں؟"

"بالکل سچ کہہ رہا ہوں!"

"پھر آپ کا دل کیا کہتا ہے؟"

"دل اس منزل سے بہت دور نکل چکا ہے۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی "انسان منزلیں بدل بھی تو سکتا ہے!"

"لیکن میری زندگی میں اندھیرے ہی اندھیرے ہیں جبکہ آپ آج کی ٹاپ ہیروئین ہیں، پوری دنیا آپ کے لئے بانہیں پھیلائے کھڑی ہے، ہر خوشی آپ کی منتظر ہے، آپ خوش رہیں گی، آپ کو دیکھ کر میں خوش رہوں گا۔ ایسی صورت میں اگر میں اپنی منزل بدل بھی لوں تو بھی بات نہیں بن سکے گی ــــ وقت بہت پیچھے رہ گیا ہے!"

بہت دیر وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی، پھر اُس نے اپنی ڈائری جس کے اوراق ہوا سے پھڑ پھڑا رہے تھے اُٹھائی، ایک الوداعی نگاہ سے مجھے دیکھا اور آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش میں تیزی سے قدم اٹھاتی میرے کمرے سے باہر چلی گئی۔ میرے اندر کتنے ہی اندھیرے بھر کر چلی گئی مگر میں ان اندھیروں کو بالکل اس طرح برداشت کر گیا جیسے میں نے اب تک زندگی کو برداشت کیا تھا۔

انہی ڈوبتے اُبھرتے دنوں میں ایک فلم میں کچھ ایسی سچوایشن بن گئی کہ سنجوگ کی فلموں کا گیت کار فروغ رئیسانی لاکھ سر پٹکنے کے باوجود ویسا گیت نہیں لکھ سکا جیسا سنجوگ چاہتا تھا۔ آخر زچ ہو کر اُس نے مجھے بلوایا۔ میوزک ڈائریکٹر دُھن پہلے ہی بنا چکا تھا اور دُھن بہت خوبصورت تھی، مجھے سنائی گئی تو مجھے یوں لگا جیسے اچانک دل میں بہت سے چراغ روشن ہو گئے ہوں۔ سنجوگ نے کہا ــــ "یہ سالا بڑا شاعر بنتا، سالا گیت نہیں لکھ سکتا، تو لکھ بابا۔ یہ تو لکھ!"

اسٹوڈیو سے واپسی پر بس میں مسلسل بیٹھے بیٹھے اکتاہٹ محسوس ہونے لگی تو میں نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی، سگریٹ سلگا کر میں نے کھڑکی سے دھواں باہر اُڑا دیا، اچانک وہی دھن ذہن میں آ گئی اور الفاظ آپ ہی آپ جڑتے چلے گئے۔

میں نے سگریٹ کی ڈبیا پر پورا گیت لکھ لیا۔ اگلے دن اسٹوڈیو میں تہلکہ مچ گیا۔ گیت اس قدر عمدہ تھا کہ اس کے سامنے فلم کے باقی گیت جو فروغ ریشانی نے لکھے تھے بیکار لگنے لگے۔ میرے گیت میں شاعرانہ حسن تھا، نازک خیالی تھی، جدت تھی، یہ گیت دل سے نکلا تھا جبکہ فروغ کے گانوں میں وہی گھسی پٹی فلمی ضرورت کو پورا کرنے والی تگ بندی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اسی لئے میرے گیت نے سننے والوں کے دل پر اثر کیا۔ ایک جادو تھا جو سر چڑھ کے بول رہا تھا۔ سجوگ پر ایک وجدانی کیفیت طاری تھی۔ یونٹ کے دوسرے لوگ بھی جھوم رہے تھے لیکن فروغ ریشانی کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا، تلملا رہا تھا کیونکہ اس کی برسوں کی اجارہ داری پر یہ ایک کاری ضرب تھی۔ اس کی پلکوں کی جنبش صاف کہہ رہی تھی کہ میں ایک نامی گرامی اور مانا ہوا شاعر ہوں، عالیشان بنگلے میں رہتا ہوں، لاکھوں میں کھیلتا ہوں، شام کو بڑے ہوٹلوں میں بیٹھ کر شراب پیتا ہوں اور ہر شب ایک نئی لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ناچتا ہوں جبکہ تم کھولی میں رہتے ہو، گھٹیا سگریٹ پیتے ہو، بسوں میں دھکے کھاتے ہو، کئی کئی دن شیو نہیں کرتے، مہینوں حجامت نہیں بنواتے، تمہارے کرتے کے نیچے اکثر بنیان تک نہیں ہوتی، سردیوں میں جو ٹاٹ نما واسکٹ تم پہنتے ہو اس سے بہتر واسکٹ میرا آلیشن کتا پہنتا ہے۔ میرے مقابلے میں تم محض نالی کے کلبلاتے ہوئے کیڑے ہو جسے میں کسی بھی وقت اپنے چمکدار بوٹ سے مسل سکتا ہوں۔ فروغ کی کھا جانے والی نگاہیں دیر تک مجھے گھورتی رہیں۔ آج کی دنیا میں لوگ کتنے سطحی انداز سے سوچتے ہیں حالانکہ کسی کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے اس کے اندر جھانکنا پڑتا ہے مگر فروغ جیسے دنیا دار اور مفاد پرست لوگ جو وقت پڑنے پر گدھے کو بھی باپ بنا لیتے ہیں، ایک شاعر کے دل کو کیا سمجھ سکتے ہیں۔ مجھے جہاں اس کی کم نگاہی پر ہنسی آئی وہیں اپنی مفلسی کا سوچ کر میں اداس بھی ہو گیا۔ ریکارڈنگ کے بعد چاروں طرف سے لوگ مجھے مبارکباد دینے لگے اور میں بظاہر مسکرا مسکرا کر مبارکبادیں قبول کرتا رہا۔ لیکن جب دیال نے مجھے گلے لگایا تو نہ جانے کیوں مسکراہٹ کے بیچ میری آنکھیں بھی چھلک پڑیں۔ اُس نے تشویش سے پوچھا ــــ "کیا ہوا تجھے؟ تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

میں نے کہا ــــ "سب ٹھیک ہے، دیال آ گھر چلیں!"

میں اسے کھینچتا ہوا اسٹوڈیو سے باہر لے آیا۔ وہ ہکا بکا سا میرے ساتھ کھنچتا چلا آیا۔ اب ہم بس اسٹاپ کی طرف جا رہے تھے اور رات دھیرے دھیرے اپنا جال پھیلا رہی تھی۔ آسمان پر ستارے ٹمٹما رہے تھے، چاند مسکرا رہا تھا اور ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکوں میں زندگی ایک چابی دار کھلونے کی طرح اندھیروں اجالوں کے درمیان رواں دواں تھی۔ لوگ چل پھر رہے تھے، ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔ ایک سیلاب تھا جو موجیں مار رہا تھا لیکن مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے اس جگمگاتے جاگتے شہر کی بھیڑ بھاڑ سے بھرپور سڑکوں، سجی سجائی دکانوں اور فلک بوس عمارتوں کی گہما گہمی کے باوجود آج میں زیادہ اکیلا ہو گیا ہوں۔ کبھی کبھی مفلسی کا احساس بھی انسان کی تنہائیوں کو گہرا کر دیتا ہے۔

میں نے دیال کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا اور سر جھکائے چلتا رہا . . . . . چلتا رہا . . . . رات کا اندھیرا دل کے چاروں طرف ایک دھوئیں کی طرح پھیلتا چلا گیا اور میں اس میں اُلجھ کر رہ گیا۔ اپنی محرومیوں کا خیال آ گیا۔ اپنے شہر کی یاد آنے لگی، بہت سے بھولے بسرے چہرے بھی تصورات کی پرچھائیوں میں اُبھرنے ڈوبنے لگے۔ میں سوچنے لگا اس دنیا میں بے شمار لوگ کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیئے جاتے ہیں جبکہ یہ ان کی جگہ نہیں ہوتی بالکل اس طرح جیسے پیٹ بھرے لوگ بے سوچے سمجھے ڈبل روٹی کے سلائس پھینک دیتے ہیں اور آس پاس بہت سے بھوکے گھورتے ہی رہ جاتے ہیں۔ مالک بھی عجب کھیل

کھیلتا ہے جنہیں بھوک ملتی ہے انہیں روٹی نہیں ملتی اور جنہیں روٹی ملتی ہے انہیں بھوک نہیں ملتی۔ کوئی نہ کوئی چیز زندگی میں ضرور کم رہ جاتی ہے۔ یہ سوچتا ہوں تو دیال کی بات —— "بندھو! یہ جنم تو اکارت گیا۔" بالکل حقیقت نظر آنے لگتی ہے۔ آخر دیال کو اس سچائی کا گیان کیسے حاصل ہوا؟ جبکہ وہ بظاہر بالکل معمولی آدمی نظر آتا ہے۔ اُسے دیکھ کر کوئی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ وہ سوچتا بھی ہے کیونکہ آج کل کے سوچنے والے یعنی "دانشور" اپنا ایک خاص حلیہ بنائے رکھتے ہیں اور یہ حلیہ اتنا پیٹنٹ ہو چکا ہے کہ دیکھنے والے دور ہی سے پہچان لیتے ہیں کہ "دانشور" آ رہا ہے لیکن دیال پر کوئی بھی "دانشور" ہونے کا الزام نہیں لگا سکتا۔ اس لیے کہ وہ دیکھنے میں دھوبی، باورچی، ڈرائیور، چوکیدار یا چپڑاسی سے زیادہ کچھ نہیں لگتا اور اسے اس سے زیادہ لگنا بھی نہیں چاہیئے کیونکہ کوڑے پر پڑے پڑے صاف سے صاف چیز بھی ایک دن کوڑا نظر آنے لگتی ہے۔ دیال اوروں کے لیے چاہے کوڑا ہی ہو مگر میرے لیے وہ سلائس کا خوش ذائقہ ٹکڑا ہے جسے ساری دنیا مزے سے کھا سکتی ہے اور اپنی بھوک مٹا سکتی ہے اور توند پر ہاتھ پھیر کے مسکرا سکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سلائس کا ٹکڑا اُن دانشوروں سے کہیں بہتر ہے جو موٹے شیشوں کی عینکیں لگائے اپنے ابرو اُٹھا اُٹھا کر بڑی بڑی کانفرنسوں میں تقریریں جھاڑتے ہیں، اونچے اونچے آدرشوں کا پرچار کرتے ہیں اور اس کے بعد کسی خوبصورت بیڈروم میں بیٹھ کر بھنے ہوئے مرغ اور شراب سے لطف اندوز ہونے کے بعد اول فول بکنا شروع کر دیتے ہیں۔ مگر اگلے ہی دن پھر کسی کانفرنس میں تقریر کرتے پائے جاتے ہیں۔ دیال تقریر نہیں کرتا مگر صبح صبح جب وہ گیتا کا پاٹھ کر رہا ہوتا تو اس کی آنکھوں میں آنسو ہوتے۔ وہ ساری دنیا کو ایک گھر سمجھتا اور یہ گھر جب اُسے مایوس کر دیتا تو پوجا کرتے ہوئے اس کی آنکھیں چھلک پڑتیں۔ وہ سب کے لیے دعا کرتا، سب کا بھلا چاہتا، وہ کسی کو دکھی نہیں دیکھ سکتا تھا اسی لیے مہینے کی آخری تاریخوں میں جب میرے پاس پیسے ختم ہو جاتے تو وہ چپکے سے اپنی جیب کے پیسے میری جیب میں ڈال دیتا۔ میں واپس کرنا چاہتا تو ناراض ہو جاتا۔ چال میں رہنے والی کئی بیوہ عورتوں کو وہ ہر ماہ کچھ نہ کچھ رقم ضرور دیتا اور مجھے نہ بتاتا۔ کئی بچوں کو مفت پڑھاتا اور چھٹی کے دن وہ سارے بچوں کو اکٹھا کر کے انہیں سیر کرانے لے جاتا، انہیں چاکلیٹ دیتا، آئس کریم کھلاتا اور کبھی اُن کے ساتھ باقاعدہ کوئی کھیل کھیلنے لگتا۔ میں کھڑکی میں بیٹھ کر جب اُسے بچوں کے ساتھ اچھلتے کودتے اور قہقہے لگاتا دیکھتا تو یہ دنیا یکایک بڑی خوبصورت دکھائی دینے لگتی اور میرے دل کے سارے بوجھ ہلکے ہو جاتے۔

میں نے اپنے ساتھ چلتے ہوئے دیال کو غور سے دیکھا تو وہ مسکرانے لگا، پھر بولا "کیا سوچ رہا ہے؟"

میں نے کہا —— "کچھ نہیں۔"

"چمپا کا خیال آ رہا ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"نہیں، کلکتہ یاد آ رہا ہے!"

"ایسے موقعوں پر مجھے بھی کلکتہ یاد آتا ہے پر اب تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی خواب دیکھا تھا، سب کچھ بھولتا جا رہا ہے!" اُس نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"ایسے ہی ایک دن انسان زندگی کو بھی بھول جاتا ہوگا؟"

"ہاں بندھو یہی ہوتا ہے، جنم کسے یاد رہتا ہے؟"

"کتنے دکھ کی بات ہے!"

"دُکھ کی تو بہت سی باتیں ہیں پر آج تو خوشی کا دن ہے تیرا گیت ریکارڈ ہوا ہے!"
اُس نے میرے موڈ کو بدلنے کی کوشش کی۔ میں مسکرانے بھی لگا مگر اُداسی کا ایک بادل پھر بھی آسمان میں کہیں تیرتا رہ گیا۔ پھر بس آگئی اور ہم اس میں سوار ہو گئے۔
ایک دن جب میں اسٹوڈیو میں اپنے اسٹول پر بیٹھا ایک سین لکھ رہا تھا تو سہگل نے مجھے اپنے دفتر میں بلوا بھیجا۔ میں پہنچا تو وہ اپنی کرسی پر بیٹھا سگار کے تیز تیز کش لے رہا تھا اور کسی الجھن میں گرفتار تھا۔ اُس نے مجھے اپنے سامنے بٹھالیا۔ کچھ دیر وہ اسی ادھیڑبن میں رہا کہ بات کیسے اور کہاں سے شروع کرے۔ بلآخر اُس نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا ــــ "یار جلال کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا بولوں؟"
"کوئی خاص بات ہے؟" میں نے پوچھا۔
"ہاں وہ اپنا فروگ (فروغ) ریٹسائی ہے نا بابا!" اُس نے میری طرف جھکتے ہوئے کہا۔
"جی جی!"
"سارا لفڑا اُسی کا ہے" سہگل نے سگار کو بڑے زور سے ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے پہلی بار مجھ سے اس انداز سے نظریں ملائیں جیسے وہ میرا ردِعمل دیکھنا چاہ رہا ہو۔ میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں سمجھ گیا کہ میری قسمت کے پہلوان نے ضرور کوئی اڑنگا لگایا ہے۔ میں نے کہا ــــ "آپ کہہ دیجئے۔ میں بڑی خبروں کے لئے ہمیشہ تیار رہتا ہوں"
سہگل بولا ــــ "بات یہ ہے کہ جب سے تیرا گیت ریکارڈ ہوا ہے اُس نے کھانا نہیں کھایا ہے"
"کیوں؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔
"وہ بولتا ہے جلال کا گیت ضرور ہٹ ہوئیں گا"
"پھر ــــ؟"
"وہ ٹائیٹل پر تیرا نام نہیں مانگتا"
میں ذرا دیر کو سناٹے میں آگیا کیونکہ پہلوان کا یہ گھونسہ بڑا زوردار تھا۔ پھر میں نے خود کو سنبھال لیا، کرسی کی پشت سے آرام سے ٹیک لگاتے ہوئے میں نے کہا ــــ "کوئی بات نہیں میں اپنا گیت واپس لے لیتا ہوں، آپ اُنہی سے لکھوا لیجئے"
یہ سن کر سہگل میری جانب اور جھک گیا، اس کے ہونٹوں پر ایک خوشامدانہ سی مسکراہٹ پھیل گئی، اُس نے کہا ــــ "پر گیت میرے کو اچھا لگا واپس دینے کو نہیں مانگتا"
میں عجیب پریشانی میں پڑ گیا۔ سہگل میری ذہنی کیفیت کو سمجھ گیا، بولا ــــ "جلال میرے کو پتہ ہے تجھے دکھ ہوئیں گا پر وہ سالا میرے ساتھ بہت پرانا کام کرتا . . . . . مارکیٹ میں اُس کا نام چلتا . . . . اور . . . . ."
میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا ــــ "میں سمجھ گیا ہوں"
اُس کی آنکھوں میں یکایک اُمید کی چمک پیدا ہو گئی ــــ "فیر تُو کیا بولتا بابا؟"
میں نے کہا ــــ "میں کیا بولوں، جیسی آپ کی مرضی!"
میں واپس اپنے کمرے میں پہنچا تو دیال میرا منتظر تھا۔ میری حماقت پر وہ آگ بگولا ہو گیا ــــ "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ محنت تو کرے، کام تو کرے اور نام اس کا ہو، شہرت اُسے ملے"

میں نے کہا ـــ "دیال اگر تُو ذرا نظر اُٹھا کر دنیا کے حالات دیکھے تو ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ محنت کسی کی ہوتی ہے اور اس پر عیش کوئی دوسرا کرتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ بڑے بڑے زمیندار، صنعت کار، سرمایہ دار کہاں سے آتے؟"

اُس نے کہا ـــ "دنیا کو گولی مار، تو اپنی بات کر۔"

"میں بھی دنیا ہی میں تو ہوں، اس دنیا سے باہر تو نہیں ہوں!" میں نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"تو بالکل چغد ہے!"

"ہوں۔"

"اُلّو ہے!"

"ہوں۔"

"گدھا ہے!"

"ہوں۔"

وہ بہت دیر غصّے سے پیچ و تاب کھاتا رہا۔ مجھے بُرا بھلا اور خدا جانے کیا کیا کہتا رہا اور میں ہوں ہوں کرتا رہا۔ میں اسے کیسے سمجھاؤں کہ گدھوں میں رچ رہا ہوں، گھاس کھا رہا ہوں، پان کی جگالی نہ کروں تو مر جاؤں، کہانیاں اور گیت نہ لکھوں تو مر جاؤں۔ کبھی کبھی میں خود کو بالکل گدھا محسوس کرتا ہوں اور سوچتا ہوں یہ زندگی ہے یا گدھا گاڑی؟ کسی کسی وقت دل چاہتا ہے کہ کاش میں پورا پٹھان ہوتا۔ سر پھاڑتا اور سر پھڑوایا کرتا، لٹھ مارتا، نسوار کھاتا، ٹرک چلاتا اور پشتو گیت گاتا، کسی گل پہ عاشق ہوتا اور نگر نگر منڈلاتا۔ بعض اوقات زندگی کا زہر ایسا چڑھتا ہے کہ سوچوں پر ورم سا آجاتا ہے۔ جیسے کسی "بھڑ" نے ڈنک مار دیا ہو۔ زندگی کے یہ ڈنک کھانے پڑتے ہیں۔ دیال غلط نہیں کہتا۔ میں نے مسکرا کر اُسے دیکھا تو اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا اور مسلسل بڑبڑاتا رہا۔ اگلے دو تین دن وہ مجھ سے ناراض رہا اور کسی صورت میں قابو میں نہیں آیا اور میں بدحواسی کی حالت میں بار بار اپنے بستر سے کھٹمل جھاڑتا رہا۔ پھر جیسے ہر چیز وقت کے ساتھ ساتھ معمول پہ آجاتی ہے اسی طرح ہماری زندگی بھی معمول پہ آگئی۔ مدر کسی بے چین اور مضطرب روح کی طرح چال میں رہنے والے لوگوں کی خبر گیری کرتی رہی۔ کوئی بیمار پڑ جاتا تو وہ کہیں نہ کہیں سے کسی ڈاکٹر کو گھیر کرلے آتی اور پھر دوا دارو کے لئے ماری ماری پھرنے لگتی۔ کسی عورت کے بچہ پیدا ہوتا تو وہ ہسپتال چلی جاتی، کسی کھولی میں کوئی شرابی اپنی بیوی کو مارتا تو وہ درمیان میں ایک دیوار کی طرح آکھڑی ہوتی۔ کبھی معلوم ہوتا کہ وہ کسی کو ملازمت دلانے کے لئے بھاگ دوڑ کر رہی ہے ـــ "اوہ گاڈ! ـــ اپنے انسانوں پہ رحم کر!"

اُسی لمحے بوڑھا فرنانڈس کسی کھولی کے تھڑے پہ کھڑے ہو کر وائلن بجانے لگتا اور دیال کھڑکی کی سلاخوں سے باہر جھانک کر کہتا ـــ "بند ھو ـــ یہ جنم تو اکارت گیا۔"

ان دنوں دیال کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں رہتی تھی، کام کرتے کرتے اُسے اکثر چکر آجاتا تھا، ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو جاتے تھے، دیر تک وہ میرا ہاتھ تھامے ہانپتا رہتا تھا، چہرے کا رنگ پھیکا پڑنے لگتا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ پسینے میں بھیگ جاتا تھا۔ میں گھبرا کر اُسے ڈاکٹر کے پاس چلنے کو کہتا تو وہ ہنسنے لگتا ـــ "میں بالکل ٹھیک ہوں تُو تو یونہی گھبرا جاتا ہے۔" میں بہت سمجھاتا اور اسے اپنی صحت کی طرف توجہ دینے کو کہتا تو وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتا، پھر ایک عجب پُراسرار سی مسکراہٹ کے ساتھ کہتا ـــ "میں نے ڈاکٹر کو دکھایا ہے، علاج ہو رہا ہے۔" میں اس کے بیان کی سچائی ڈھونڈنے

کے لئے اس کی آنکھوں میں جھانکتا تو وہ جھکی جھکی نگاہوں سے مجھے یوں دیکھتا جیسے مجھ سے شرمندہ سا ہے۔ میں کچھ سمجھ نہیں پاتا تھا لیکن مجھے محسوس ہوتا تھا جیسے وہ مجھے بہت کچھ بتانا چاہتا ہے مگر پتہ نہیں وہ بتا نہیں پاتا تھا، بس شرمسار سا ہو جاتا تھا، جیسے وہ مجھ سے ہی نہیں ساری دنیا سے شرمندہ ہو، ساری زندگی سے شرمندہ ہو، جیسے وہ زندگی سے انصاف نہیں کر سکا ہو، جیسے اس کے بہت سے ارمان دل ہی میں رہ گئے ہوں اور جو کچھ وہ زندگی کو دینا چاہتا تھا وہ دے نہ سکا ہو۔ ان لمحوں میں میری ساری فن کاری دھری رہ جاتی تھی کیونکہ اس کے اکیلے چہرے میں اتنی لکیریں اور اتنے رنگ جمع ہو جاتے تھے کہ وہ چہرہ مجھے پوری دنیا نظر آنے لگتا تھا اور میں لکیروں اور رنگوں کی اس گھنی بھیڑ میں اپنے دوست دیال کو تلاش ہی کرتا رہ جاتا تھا۔

انہی دنوں سنجوگ کی فلم ریلیز ہوئی اور میرا گیت جو فروغ رئیسانی کے نام سے چلا تھا، ایسا ہٹ ہوا کہ اس نے شہرت کے سارے ریکارڈ توڑ دیے۔ دیال کو اس بات کا بہت دکھ تھا کہ میں نے محض اپنے لاابالی پن کی وجہ سے اتنا بڑا چانس کھو دیا۔ کبھی وہ مجھ سے جھگڑتا، کبھی سنجوگ کو بُرا بھلا کہتا اور کبھی فروغ رئیسانی کو گالیاں دینے لگتا۔ پھر غصے سے کہتا —— "سب سالے اپنا مطلب نکالتے ہیں، اس دنیا میں کوئی کسی کا نہیں ہے، سب الو کے پٹھے ہیں!" مجھے ہنسی آ جاتی تو وہ مجھ پر برس پڑتا، پھر اس کی سانس پھول جاتی اور وہ بے بس ہو کر پانی کا گلاس پی کر چُپ ہو جاتا تھا۔ اسی لمحے میں اُسے گلے سے لگا لیتا تھا اور وہ پھر سے مُسکرانے لگتا تھا۔

ایک روز میں اسٹوڈیو کے کمپاؤنڈ میں لگے ہوئے پانی کے فوارے کے پاس گھاس پر بیٹھا ایک کتاب پڑھ رہا تھا کہ دیال کا اسسٹنٹ چھوکرا جو اس سے کام سیکھ رہا تھا بدحواسی کے عالم میں دوڑا دوڑا میرے پاس آیا —— "جلال صاحب . . . جلال صاحب"

میں نے گھبرا کے اُسے دیکھا "کیا ہے؟ . . . . "کیا ہوا؟"

اُس نے کہا —— "دیال بھیا" . . . . وہ اپنے دیال بھیا"

میں نے گھبرا کر اوپر دیکھا تو سر پر آسمان ہی نہیں تھا اور اسٹوڈیو ایک کھنڈر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ چھوکرا آگے کچھ کہتا، میں نے کہا —— "ایک گلاس پانی!"

ڈاکٹر نے کہا —— "پہلا ہارٹ اٹیک بہت خطرناک ہوتا ہے!"

میں آنکھیں پھاڑے دیال کے مردہ جسم کو دیکھ رہا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ مجھے اکیلا چھوڑ کر یوں آناً فاناً چلا جائے گا۔ مجھے یوں لگنے لگا جیسے میری روح پرواز کر چکی ہے اور میرا جسم بے وزن ہو کر پوری کائنات پر پھیلتا جا رہا ہے۔ میں نیلے آسمان پر بادل کے ٹکڑے کی طرح اُڑ رہا ہوں اور ساری دنیا مجھے دیکھ رہی ہے لیکن یہ کوئی نہیں جانتا کہ میں کتنا اکیلا ہوں —— ! پھر میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ لوگ مجھے ہسپتال لے گئے اور جب مجھے ہوش آیا تو دیال کی چتا ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس نے اپنی بیماری مجھ سے چھپائی تھی اور بالکل اس طرح چھپائی تھی جیسے کوئی عورت ناجائز بچے کو چھپاتی ہے۔ اس کی بیماری کا علم صرف اس چھوکرے کو تھا جو اس کے ساتھ کام کرتا تھا اور دیال نے اُسے سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ یہ راز کسی کو نہ بتائے۔ جب اُس چھوکرے نے رو رو کر ساری بات مجھے بتائی تب مجھے معلوم ہوا کہ دیال مجھ سے نظریں کیوں چراتا تھا، مجھ سے شرمندہ شرمندہ سا کیوں رہتا تھا، مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ میں اپنی کھولی میں اکیلا لیٹا چھت کو دیکھ رہا تھا جس کی دیمک زدہ دھنیوں سے برادہ آج بھی جھڑ رہا تھا۔ میری طرح پوری چال جیسے

اکیلی ہوگئی تھی۔ ہر طرف گہرا اور کرب ناک سناٹا چھا گیا تھا۔ اُداسیوں کی آکاس بیل نے چال کے ہرے بھرے درخت کو مکمل طور پہ اپنے پنجے میں جکڑ لیا تھا اور درخت کی آنکھیں باہر نکل آئی تھیں ـــ!

اب میں لکھنؤ ایکسپریس سے واپس جا رہا ہوں۔ اندھیری رات کے سینے کو چیرتی ہوئی گاڑی پوری رفتار سے آہنی پٹڑیوں پہ دوڑ رہی ہے۔ تیز ہوائیں میرے چہرے سے ٹکرا رہی ہیں، میرے بال بکھرتے جا رہے ہیں اور میں کھڑکی میں خاموش بیٹھا باہر کے اندھیروں میں گم ہوں۔ میری انگلیوں میں سگریٹ سلگ رہا ہے اور گود میں وہ ڈائری پڑی ہے جو چمپا نے مجھے اس وقت دی تھی جب وہ بمبئی کے وی ٹی اسٹیشن پر مجھے رخصت کرنے آئی تھی۔ اُس نے آنسوؤں کے درمیان اپنی سُرخ ناک کو رومال سے صاف کرتے ہوئے کہا تھا "ہو سکے تو پڑھ لیجئے گا نہیں تو راستے ہی میں کہیں پھینک دیجئے گا۔" میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ڈائری کو کھولا جس کے ہر صفحے پر میری محبت کے فسانے لکھے تھے اور سناٹوں میں ڈوبے ہوئے جنگلوں سے دیال کی آواز آ رہی تھی ـــ "بندھو یہ جنم تو اکارت گیا۔" میں سوچ رہا تھا جنم چاہے لوٹ کر آئے نہ آئے مگر جنم کا تصور ضرور خوبصورت ہے۔ انسان کو اگلے جنم کی آس تو رہتی ہے، مرتے مرتے بھی وہ خواب تو دیکھتا رہتا ہے، اس کے ناکام سینے میں اُمیدوں کی شمع تو جلتی رہتی ہے، لیکن جس کے پاس یہ تصور ہی نہ ہو، وہ کیا کرے؟ زہر کے گھونٹ پی پی کر وہ کب تک جیئے، کیسے جیئے؟

میں نے اپنی بھیگی ہوئی آنکھیں پونچھ کر نئی سگریٹ سلگا لی، وہی سگریٹ جسے پینے سے دیال مجھے ہمیشہ روکتا رہتا تھا اور چمپا چھین کر پھینک دیا کرتی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ باتیں کسی پچھلے جنم کی تھیں اور اب جو جنم آیا ہے وہ میرے لئے اکارت ہے ـــ!!

سورج بجھا بجھا سا تھا

طلعت اخلاق احمد

رات بہت گہری ہو چکی تھی۔ بارش بھی برس رہی تھی۔ سردی بہت زیادہ تھی لیکن میری دوست کی مہمان قایل ہی نہ ہوتی تھی کہ روشنی بھی بعض مرتبہ بہت گہرے داغ دے جاتی ہے۔

میں ایک چھوٹے سے قصبے میں اپنی دوست بیگم راجہ کے پاس ٹھہری ہوئی تھی۔ آج شام ان کی ایک مہمان خاتون تشریف لائی تھیں۔ خدا جانے کہاں سے! مگر یہ بیگم راجہ کی طرح کوئی درمیانی عمر کی فربہ اندام خاتون نہیں تھیں بلکہ بمشکل ستائیس برس کی نازک اندام خوبصورت خاتون تھیں۔ وہ راجہ صاحب کے پاس کسی کی سفارش لے کر آئی تھیں۔ بیگم راجہ کے کسی پرانے جاننے والوں کی صاحبزادی تھیں۔

گفتگو مختلف موضوعات سے ہوتی ہوئی خدا جانے کب اور کیسے کرکٹ پر آ ٹھہری تھی "قصہ مختصر اس کھیل میں اور کچھ ہو یا نہ ہو لیکن گلیمر بہت ہے۔" نوجوان مہمان نے کہا۔

"اور یہ گلیمر بہت سے دلوں کی دنیا اندھیر کر دیتا ہے۔" میں نے افسردگی سے کہا تھا۔

پھر بحث چل نکلی۔ وہ خاتون کسی طرح قایل ہو کے نہ دیتی تھی کہ کبھی کبھی گلیمر بہت سے دلوں کی دنیا اجاڑ دیتا ہے۔ آخر مجھے ان کو اس واقعے کا حوالہ دینا پڑا جس کا ذکر میں نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ سب بتانا پڑا جو میری یادداشت کے مقبرے میں مدفون تھا۔

یہ آج سے غالباً پچیس برس پہلے کی بات ہے۔ کرکٹ کا کھیل اتنا مقبول تو نہ تھا جتنا آج ہے۔ تاہم چند ایک لوگ یہ کھیل کھیلتے تھے بعض دیکھنا پسند کرتے تھے بعض اس کے مداح تھے۔

ان دنوں ہم دونوں پڑھا کرتی تھیں یعنی میں اور یہ بیگم راجہ۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب تعلیم زیادہ عام نہیں تھی۔ اکا دکا گھرانوں میں اس کا چرچا تھا۔ اچھی تعلیم صرف شہروں میں میسر تھی۔ وہ بھی بڑے شہروں میں۔

میرے اور بیگم راجہ کے والدین روشن خیال بھی تھے اور کھاتے پیتے بھی۔ چنانچہ ہمیں شہر پڑھنے کے لئے بھیج دیا گیا۔ میں اور بیگم راجہ شہر چلی گئیں۔ ان دنوں کرکٹ کی دنیا میں ایک نام سنا جاتا تھا۔ کبیر خاں۔ ہم نے اس کو دیکھا تو کبھی نہ تھا۔ سنا بہت تھا۔ ستاروں جیسی روشن آنکھوں والا، دراز قد، سرخ و سفید کبیر خاں۔ جدھر بھی نکل جاتا لڑکیاں اس کے گرد جمع ہو جاتیں۔ آٹو گراف، باتیں، قہقہے، سرگوشیاں۔

یہ سب ہمیں اپنے سکول کی سب سے ایڈوانسڈ اور امیر لڑکی فرح احسان بتایا کرتی تھی۔ اس کے والد چائے کے بہت بڑے ایکسپورٹر تھے۔ تھوڑی بہت سیاست سے بھی دلچسپی رکھتے تھے چنانچہ کھلاڑیوں، طلبا اور دوسری ایسی ہی تنظیموں سے ان کا واسطہ رہتا تھا ـــــ وہ دو ایک مرتبہ کبیر خاں کو اپنے گھر مدعو کر چکے تھے ـــــ فرح احسان ذاتی طور پر اس سے مل چکی تھی اور گفتگو کر چکی تھی۔ چنانچہ کبیر خاں کی مداح لڑکیوں میں اسے بڑی اہمیت حاصل رہا کرتی تھی۔ اور وہ جب بھی موڈ میں ہوتی تو نئے سرے سے، نئے انداز سے کبیر خاں کی آمد سے لے کر رخصت

ہونے کے لمحے تک کی تفصیل بیان کرتی۔ اور لڑکیاں بھی اس ذوق و شوق اور دلچسپی سے سنا کرتیں جیسے آج پہلی مرتبہ سن رہی ہوں۔

اور جس دن میں نے کبیر خاں کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا وہ فروری کی ایک گرآلود سہ پہر تھی۔ طلبا کی دو ٹیموں کے درمیان کرکٹ کا میچ تھا۔ کبیر خاں بھی کھیل رہا تھا ــــ کھانے کے وقفے میں جب وہ وائس چانسلر کی طلبی پر گراؤنڈ میں آیا تھا۔ ان سے بات کرنے، تو سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹی سے ملحقہ دیگر اداروں کی لڑکیوں نے اُس پر آٹوگراف بکس کی بارش کر دی تھی۔ کبیر خاں دھیرے سے مسکرایا تھا۔ اُس کی مسکراہٹ، مجھے یوں لگا جیسے ـــــ جیسے ــــ

خیر چھوڑو کہ مجھے کیسا لگا ـــــ اُن دنوں ہمارے ساتھ ایک اور بہت ہی معصوم سی لڑکی پڑھا کرتی تھی۔ یہی ہماری فرح دسویں جماعت کی طالبہ تھی۔ بڑی کم گو، شرمیلی اور سہمی سہمی سی لڑکی تھی۔ گو ہماری ہی طرح کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی تھی جبھی تو شہر کے انگلش میڈیم سکول میں تعلیم حاصل کرنے آئی تھی ـــــ اُس کا نام تھا ـــــ چلو ناموں میں کیا رکھا تھا:

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے سب اُسی زلف کے اسیر ہوئے

اللہ جانے اُسے کبیر خاں کب اور کیسے اچھا لگنے لگا۔ خدا جانے وہ کب اور کیسے کبیر خاں کے لئے سوچنے لگی۔ اُس کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ مگر وہ جانتی تھی کہ کبیر خاں تک رسائی بہت مشکل ہے۔ وہ گلیمر کی دنیا کا چمکتا ستارہ اور وہ خود گاؤں کے کسی چودھری کی سہمی سہمی، بے اعتماد لڑکی جہاں اس کے چچا زاد اور خالہ زاد بھی آتے تو نظریں جھکائے بیٹھے رہتے۔ بڑوں کی قدمبوسی کو حاضر ہوتے اور وہیں سے نظریں جھکائے جھکائے واپس چلے جاتے۔

بابا نے پڑھنے کو شہر بھیج دیا تھا لیکن وہ اتنے آزاد خیال تھوڑی تھے۔ اُس لڑکی کے چہرے پر سب سے نمایاں اُس کی آنکھیں تھیں حیران حیران سی، کھوجتی، سوچتی آنکھیں۔ ورنہ وہ ایک قبول صورت لڑکی تھی اور بس۔ مگر اُس نے بھی خوابوں میں چاند کو دیکھنا شروع کر دیا۔ چاندنی خوشبو بن کر اُسے حصار میں لے رہی تھی ـــــ کبیر خاں مسکراتا تو اُسے یوں لگتا جیسے یہ مسکراہٹ اُس کے دل کے گرد دائرے بُنتی جا رہی ہے اور دل اس حلقہ در حلقہ، دائرہ در دائرہ مسکراہٹ کے جال میں جکڑتا جا رہا ہے۔

کبیر خاں اُن دنوں آرکیالوجی کے مضمون میں ایم۔ اے کر رہا تھا۔ یونیورسٹی کی اکثر تقریبات میں وہ مدعو ہوتا۔ اور جب بھی وہ سامنے آتا لڑکیوں میں ایک ہلچل سی مچ جایا کرتی۔ انہی دنوں ہمارے سکول کی پرنسپل صاحبہ نے لڑکیوں کا شوق اور دلچسپی محسوس کر کے کرکٹ ٹیم بنانے کا اعلان کیا۔ لڑکیوں کی کوچنگ کے لئے کبیر خاں کو زحمت دی گئی۔

جس دن وارڈن نے بتایا کہ کرکٹ کھیلنے والی لڑکیوں کے لئے کبیر خاں سے کوچنگ کے لئے کہا گیا ہے، لڑکیوں میں ایک دھوم سی مچ گئی ـــــ شام پانچ بجے کا وقت مقرر کیا گیا تھا اس لئے کرکٹ میں شامل چار عدد ایسی لڑکیوں کو بھی بورڈنگ ہاؤس میں داخل ہونا پڑا۔ جو گھر سے آتی جاتی تھیں لیکن پرنسپل صاحبہ کا حکم تھا کہ وہ بورڈنگ ہاؤس میں رہیں گی۔ ان چاروں میں فرح جمال بھی شامل تھی۔ سب لڑکیاں بہت خوش تھیں۔ کپڑوں کا انتخاب ہو رہا تھا۔ ایک دوسرے سے میچنگ دوپٹے، چپل، جوتے، جیولری کاسمیٹکس ادھار لی جا رہی تھیں۔ ہر ایک چاہتی تھی کہ کبیر خاں کی نظر اُس پر پڑے تو پھر وہیں ٹک جائے اور جب ٹک جائے تو پتھر کی ہو کر رہ جائے لیکن دوپہر کے کھانے پر جب ڈائننگ ہال میں نوٹس بورڈ پر نظر پڑی تو ایک نیا حکم درج تھا کہ تمام لڑکیاں بحکم پرنسپل صاحبہ اپنے سکول کا یونیفارم پہن کر کھیلیں گی ـــــ سب کے چہروں سے اداسی ٹپکنے لگی۔

شام کے پانچ بجتے ہی کبیر خاں آیا۔ کرکٹ ٹیم بلائی گئی، سب کا تعارف ہوا۔ کبیر خاں کے چہرے پر وہی ازلی سنجیدگی تھی۔ انتہائی کاروباری انداز میں وہ کوچنگ کر رہا تھا اور جب وہ چلا گیا تو اقامت گاہ کی ویرانی بڑھ گئی۔ تاریک راہداریاں

زیادہ تاریک لگنے لگیں ــــ اور رات گئے تک اُس کا چرچا رہا۔ وہ لڑکی سوچا کرتی کہ اے اللہ تو بعض شخصیتوں کو اتنا سحر کیوں دے دیتا ہے اور پھر دلوں کو اس سحر میں گرفتار کیوں کر دیتا ہے! اُسے خدا سے بڑی شکایت تھی۔

اُس کا دل چاہا کہ وہ بھی کرکٹ ٹیم میں شامل ہو جائے۔ لیکن ایک تو ٹیم کا چناؤ ہو چکا تھا ــــ دوسرے وہ کھیل ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ تو جماعت میں اساتذہ کو سوال کا جواب تک نہیں دے پاتی تھی۔ گلے میں پھندے پڑنے لگتے تھے۔ اور پھر بابا؟ وہ تو سر پر سے دوپٹہ ڈھلک جانے کو بھی ناپسند کرتے تھے۔ وہ کیسے برداشت کر سکیں گے کہ ان کی بیٹی کمر سے دوپٹہ کس کر کھیلے! وہ بھی ایک غیر مرد کے سامنے؟! اور پھر کبیر خاں کے سامنے اس کا دل یوں بھی غیر معمولی انداز سے دھڑکتا تھا۔ تو کھیلتی کیا خاک! بس ایک عجیب رُت اُس کے دل پر چھائی رہی۔ کبھی دھوپ چمکنے لگتی اور کبھی جیسے منوں برف تلے دبے ہونے کا احساس ہوتا۔

بورڈنگ ہاؤس کا سالانہ ڈنر تھا۔ کبیر خاں کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ اُس دن لڑکیوں کی تیاریاں دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ سب کی سب طلسماتی شخصیت رکھنے والے کبیر خاں کو حیران کرنا چاہتی تھیں۔ فرح جمال سب سے آگے آگے تھی۔ وہ یوں بھی کبیر خاں پر اپنا بہت حق سمجھتی تھی۔ وہ بڑی سجی سجائی رات تھی۔ بورڈنگ ہاؤس کو بڑے خوبصورت انداز سے آراستہ کیا گیا تھا۔ روشوں کے کناروں پر گلاب اور چنبیلی کے پودوں میں جلتی بجھتی روشنیاں۔ جیسے چھوٹے چھوٹے ستارے پودوں میں رکھ دیئے گئے ہوں۔

اُس رات بہت سی لڑکیوں نے کبیر خاں سے آٹوگراف لئے تھے۔ اُس لڑکی نے بھی ہمت کی۔ وہ آگے بڑھی۔ اُس کا دل غیر معمولی رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ اُس نے آٹوگراف بک بڑھائی۔ لڑکیوں میں سے کوئی لڑکی کسی بات پر زور سے ہنس دی تھی۔ آٹوگراف بک اس کے ہاتھ سے پھسل کر نیچے زمین پر جا گری۔ وہ اور کبیر خاں ایک ساتھ اُسے اٹھانے کے لئے جھکے۔ اس کا ہاتھ آٹوگراف بک سمیت کبیر خاں کے ہاتھ میں تھا۔ ایک لمحہ کے لئے۔ ایک لحظہ کے لئے۔ مگر اُسے ایسا لگا جیسے ستاروں سے بھرا آسمان نیچے اتر آیا ہے۔ صرف وہ اور کبیر خاں وہاں کھڑے ہیں۔ اور کوئی نہیں ــــ پھر کبیر خاں نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور وہ ایسی بدحواس ہوئی کہ آٹوگراف بک پھر اُس کے ہاتھ سے پھسل کر نیچے گر پڑی۔ اس مرتبہ کبیر خاں نے مسکرا کر اُس کی طرف دیکھا۔ جیسے کہہ رہا ہو "کوئی بات نہیں"۔ اس چمکتی دمکتی رات میں کبیر خاں کی طلسماتی مسکراہٹ اُسے یوں لگا جیسے اُس کے دل کے گرد سنہری روپہلے رنگین دائرے بن رہی ہو۔ پھر وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ کبیر خاں نے دستخط کر کے آٹوگراف بک کسی اور لڑکی کو پکڑا دی۔ دیکھا تک نہیں کہ یہ وہ لڑکی بھی ہے یا نہیں ــــ!

نارسائی کا دکھ اور محبت کرنے کا احساس عجیب دھوپ چھاؤں کا سماں اُس کے دل پر طاری رکھتا۔ لیکن پھر فرح جمال کی خودکشی کے واقعہ نے اسے اداس کر دیا۔ سہما دیا۔ فرح جمال بہت اچھا کھیلتی تھی۔ کبیر خاں کئی مرتبہ اُس کے کھیل کی تعریف کر چکا تھا۔ جس پر فرح کی آنکھوں کی چمک بڑھ جاتی۔ مگر گرمیوں کی وہ شام بڑی اداس کر دینے والی تھی۔ کبیر خاں کوچنگ کروا کے جا چکا تھا ــــ اُس رات فرح کھانا کھانے نہیں آئی تھی۔ اُس کی روم میٹ نے بتایا تھا کہ فرح کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور وہ آرام کرنا چاہتی تھی۔ اِدھر اُدھر گھوم پھر کر رات کے ساڑھے نو بجے جب اُس کی ساتھی کمرے میں آئی تو خواب آور گولیوں کی شیشی فرح جمال کے سرہانے کھلی پڑی تھی۔ وارڈن نے چیک کیا تو اقامت گاہ کی دواؤں کی الماری کا تالا ٹوٹا ہوا تھا اور خواب آور دوا کی شیشی غائب تھی۔

جب لڑکیوں کی آہوں، کراہوں اور فرح جمال کے لواحقین کی چیخوں کے درمیان، فرح جمال کو سفرِ آخرت پر لے جانے کے لئے گھر لے جایا جانے لگا تو اُس کی بند مٹھی سے ایک چھوٹی سی چٹ برآمد ہوئی۔

اچھی لڑکی!

تم بہت اچھی ہو۔ میں تمہیں اور تمہارے جذبے کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ لیکن ابھی مجھے بہت آگے جانا ہے۔ یہ میری منزل نہیں ہے۔ میرا راستہ نہ روکو مجھے آگے بڑھنے دو۔

تم بہت اچھا کھیلتی ہو۔ ان باتوں میں خود کو ضائع نہ کرو اور کرکٹ کو اچھی کھلاڑی سے محروم نہ کرو۔

نیک خواہشات کے ساتھ

کبیر احمد خاں

کبیر خاں کا کوچنگ کے لئے آنا بند کر دیا گیا۔ اخبارات نے حاشیے لگا کر خبر چھاپی۔ چمکتے بالوں اور دمکتی آنکھوں والی فرح جمال گلیمر کی چمکتی دمکتی وادی میں گم ہو گئی۔

وقت کتنا گزر گیا۔ کیا کیا موسم آئے۔ مگر اس لڑکی کے دل پر وہی ایک رُت چھائی رہی، پیار کی اداس رُت، نارسائی کا زرد مٹیالا موسم ـــــ بس ایک رات، ستاروں کا آنچل اوڑھے رِمگُک کرتی ایک رات اُس کا سرمایہ بنی رہی، ایک مسکراہٹ اس کے دل کے گرد دائرے کھینچتی رہی۔

فرح جمال کی خودکشی کے بعد تو کبیر خاں کے لئے سوچتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا۔ فرح جمال جیسی لڑکی! جب وہ کبیر خاں کو نہ پا سکی تھی تو وہ کیا کر لیتی؟ فرح کا نیلا چہرہ اور سوجے ہوئے پپوٹے، مٹھی میں دبا ہوا سزائے موت کا سندیسہ۔ سب اُس کے سامنے آ کر لہرائے۔ پھر وہ کبیر خاں کے بارے میں سوچتے ہوئے بھی گھبرانے لگتی۔

ہم لوگ سکول سے کالج پہنچ گئیں۔ کبیر خاں تعلیم چھوڑ کر قومی کرکٹ ٹیم میں شامل ہو گیا ـــــ پھر ہم نے سنا وہ برطانیہ میں رہائش اختیار کر چکا تھا۔

بہت سے دلوں کی دھڑکن، بہت سی امیدوں کا مرکز، بہت سے معصوم دلوں کی خواہش، کبیر خاں، گلیمر کا ایک نہ ختم ہونے والا باب تھا جس طرح سورج، چاند، ستارے اپنے اپنے مدار پر گھومتے رہتے ہیں اور اگر یہ اپنے مدار سے ایک انچ بھی سرک جائیں تو دنیا میں تباہی آ سکتی ہے! سورج بجھ جائے تو کیسی سرد مہر تنہائی اور یخ بستہ اندھیرا ہر طرف چھا جائے۔ اور یخ بستہ اندھیرے اور سرد مہر تنہائی میں کون جی سکتا ہے؟ کون ذی روح زندہ رہ سکتا ہے؟

کس طرح وہ لڑکی سوچا کرتی کہ اگر وہ اپنے مدار سے ہٹ گئی تو یہ دنیا تو جوں کی توں رہے گی مگر ایک چھوٹے سے دل کی چھوٹی سی دنیا تباہ ہو جائے گی۔ سرد مہر تنہائی و یخ بستہ اندھیرا ہر طرف چھا جائے گا۔ نہ کوئی آرزو سانس لے سکے گی، نہ کوئی تمنا زندہ رہے گی۔ سرد مہر تنہائی یخ بستہ اندھیرے میں کون جی سکتا ہے۔

اس نے سوچا کہ وہ اپنا سورج نہیں بجھنے دے گی۔ کبھی نہیں ـــــ کسی قیمت پر نہیں ـــــ اور پھر کتنے ہی شہزادے آئے مگر اُس کے دل کا قفل کسی سے نہ کھل سکا ـــــ کسی اور کے لئے سوچنا، کسی اور سے پیار کرنا ـــــ اپنا سورج خود اپنے ہاتھ سے بجھا دینے کے مترادف ہے ـــــ سو اُس نے اپنا سورج بجھنے نہ دیا۔ پیار کی اداس رُت، نارسائی کا مٹیالا موسم ہمیشہ اُس کے دل پر چھایا رہا۔ مگر کبھی کبھی ایک نام سورج کی طرح چمکنے لگتا اور نرم و سنہری دھوپ زندگی میں پھیل جاتی۔

پھر کبیر خاں کرکٹ کی دنیا سے علیحدہ ہو گیا۔ کرکٹ کو شریکِ حیات کہنے والے کبیر خاں نے اُسے چھوڑ کر ایک کنیڈین لڑکی سے

شادی کرلی۔ پھر وہ کرکٹ کی تاریخ کا ایک حوالہ بن گیا۔ تاریخ دہراتے ہوئے یہ نام کبھی کبھار لوگوں کی زبانوں پر آتا اور بس۔ اور تاریخ کتابوں تک محدود ہوا کرتی ہے۔ کتابیں لائبریریوں کی زینت ہوا کرتی ہیں۔ سو کبیر خاں کا نام بھی کسی لائبریری میں کسی کتاب میں دفن ہو کر رہ گیا۔ مگر وہ نام بہت سے دلوں میں زندہ تھا۔ اسی چمک دمک اور آب و تاب کے ساتھ۔

اب جب سے ٹی وی نے پرانے کرکٹرز کے انٹرویوز پر مبنی سلسلہ "درخشاں ستارے" شروع کیا تو وہ لڑکی بھی منتظر سی رہی کہ کبیر خاں کو بھی مدعو کیا جائے گا۔ اس لئے کہ اُس کے بغیر کرکٹ کی تاریخ ادھوری اور بے معنی تھی۔ پھر ایک شام جب اعلان ہوا کہ آج کبیر خاں سے انٹرویو ہوگا تو گئے دنوں کی سنہری خوشبو نے اُس کے دل کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیا۔ ستاروں کا آنچل لئے آنے والی البیلی رات پھر اتر آئی۔ ایک اجالا بکھیر دینے والی مسکراہٹ اُس کے گلے سے آلپٹی تھی۔

کبیر خاں۔ اونچا، لمبا، سرخ و سفید، چمکتی آنکھوں والا، سحر کر دینے والی نظروں کا مالک ——— ! خدا جانے ماہ و سال کی گرد میں وہ کبیر خاں کہاں رہ گیا تھا! یہ تو ایک فربہ اندام، قدرے پستہ قد سا گنجے سر والا کبیر خاں تھا۔ اس کی وہ ساحرانہ مسکراہٹ کہاں تھی! نہ آنکھوں میں وہ ستارے، نہ آواز میں وہ جادو

اُس لڑکی نے اپنی آنکھیں مل کر پھر دیکھا ——— دُہری ہوتی ہوئی ٹھوڑی، آگے کو بڑھتی ہوئی توند، مٹاپے کی طرف مائل ہوتا ہوا یہ شخص ——— ! کیا یہ کبیر خاں تھا؟ گلیمر کی وادی سے آنے والا جادوگر! بہت سے دلوں کے گرد دائرے بنانے والا۔ بہت سی روحوں پر قفل لگا دینے والا۔ فرح جمال اور وہ برطانوی اداکارہ، جو اس کے عشق میں خودکشی کر چکی تھیں ——— ! یہ کیسا کبیر خاں تھا؟ وہ گلیمر، وہ طلسماتی مسکراہٹ وہ چمکتی آنکھیں شاید وقت کا قافلہ انہیں اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

اُسے خود پر غصہ آنے لگا۔ اپنے دل پر، اپنے دل پر چھائی پیار کی اداس رُت پر ——— کبیر خاں پر، وہ اُس گلیمر کی حفاظت نہیں کر سکا تھا جس کی چمک میں فرح جمال گم ہو گئی تھی۔ وہ زندگی سے محبت کرنے والی لڑکی ——— وہ اُس روشنی کو نہیں بچا سکا تھا جس نے بیس برس کی اُس برطانوی اداکارہ کو نگل لیا تھا۔

"اُس نے میرا سورج بجھ دیا ہے"۔ اُس لڑکی نے دکھ سے سوچا۔ وہ دل پر بوجھ سا لئے کر باہر آگئی۔ گرمیوں کی شام تھی۔ صرف پانچ بجے تھے۔ سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا۔ اُس نے سورج کی طرف دیکھا۔ اسے سورج بجھا بجھا سا لگا۔ اُس کے دل پر چھائی پیار کی اُداس رُت کہیں نہیں تھی۔ نارسائی کا زرد مٹیالا موسم کہیں چل دیا تھا۔ نہ وہ دائرے تھے۔ سنہرے، روپہلے دائرے کہیں نہیں تھے۔ نہ اُن دائروں میں پڑے ہوئے قفل تھے ——— وہ البیلی رات دلہن کی طرح چمکتی حسین رات دور کہیں ہنس رہی تھی۔ شاید اُس کی کج فہمی پر۔

گلیمر کی چمک اُس کی زندگی کے حسین ماہ و سال نگل چکی تھی۔ اُسے اپنا دل بہت تنہا تنہا محسوس ہوا۔ نہ جانے وہ پیار کی رُت کہاں رہ گئی تھی۔ نارسائی کا وہ اداس مٹیالا زرد موسم انگلی چھڑا کر وقت کی بھیڑ میں گم ہو گیا تھا۔ وہ اُس کو روک بھی نہ سکی تھی۔ گلیمر کی روشنیاں دھیرے دھیرے بجھ رہی تھیں۔ یخ بستہ اندھیرا اور سرد مہر تنہائی تھی۔ وہ سوچا کرتی تھی کہ اپنے مدار سے ہٹ کر سوچنا گویا اپنے ہاتھوں اپنا سورج بجھانا ہوگا۔ مگر سورج تو آج بجھا بجھا سا تھا۔

اُس نے اپنے خالی ہاتھوں کو دیکھا خالی دل کو دیکھا، خالی زندگی کو دیکھا۔ کہیں کچھ تحریر نہ تھا۔ وقت سب تحریریں مٹا گیا تھا۔

میں جب خاموش ہوئی تو صبح ہو چکی تھی۔ بارش رک چکی تھی۔ سورج نکل رہا تھا۔ مگر ہم تینوں اداس تھیں۔ میں، بیگم راجہ اور وہ مہمان خاتون، راحت حیدر۔

"واقعی بگیر دلوں کی دنیا اجاڑ دیتا ہے۔" راحت حیدر نے کہا۔ "یہ سب آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ اس لڑکی نے تو بقول آپ کے کسی سے کچھ نہ کہا تھا اس بارے میں۔" مہمان بی بی نے استفسار کیا۔

"مگر وہ لڑکی مجھ سے ہمیشہ سچ بولا کرتی تھی۔ مجھ سے کچھ نہ چھپاتی تھی۔"

خدا جانے راحت حیدر کچھ سمجھی یا نہیں مگر پھر اس نے مزید سوال نہ کیا۔ بڑی دیر تک وہ پردہ سرکائے باہر جھانکتی رہی کھلی کھڑکی سے آنے والی ہوا اس کے بال اڑاتی رہی۔ جب وہ پلٹی تو میں نے اس کے چہرے ایک سورج بجھتے دیکھا۔

اس نے بڑی اداسی سے اعتراف کیا کہ "باہر موسم ابر آلود سا ہے اور سورج بجھا بجھا سا ہے۔"

مگر اس کے چہرے پر بجھتا سورج صرف میں نے دیکھا تھا۔

بیہودہ

راجہ محمد ریاض الرحمٰن

ہم سب نے یہ خبر نہایت حیرانی سے سنی کہ خلیق نے شادی کر لی ہے۔

خلیق ہمارے اس حلقے کا رکن تھا جو خود بخود ترتیب پا گیا تھا جس کا صدر دفتر کسی بھی سستے ہوٹل کا کمرہ ہوتا، جہاں ہر دو یا تین ہفتے بعد جمع ہو کر ہم دنیا بھر کے ادبی شہپاروں پر غیر معیاری تنقید کیا کرتے تھے۔

خلیق کا پورا نام خلیق بیہودہ تھا۔ میرا مطلب ہے ہمارے اس آٹو میٹک ادبی حلقے کی حد تک ـــ اس کی وجہ خلیق کا انتخاب تھا جس نے اسے رسوا کر دیا تھا۔ وہ چن چن کر ایسی کتابیں مطالعہ کرتا جو جنسیات کے مختلف پہلوؤں کو عیاں کرتیں۔ اس کا سرخ بک مارکر خاصا مقبول تھا۔ کتاب پڑھنا اور اپنے پسندیدہ مقامات کو سرخ مارکر سے انڈر لائن کرنا اس کی عادت تھی۔ وہ جب کوئی نئی کتاب پڑھنا شروع کرتا اس کی سرخ لائنیں ہمیں ضرور سناتا۔ ایک بار وہ منٹو کے افسانوں کا انتخاب ساتھ لایا اور یہ دیکھ کر ہم ہنستے ہنستے بے حال ہو گئے کہ "ٹھنڈا گوشت" پورے کا پورا سرخ ہے۔ پھر اس نے ہمیں ٹھنڈا گوشت پڑھ کر سنایا۔ دو مرتبہ یا شاید تین مرتبہ ـــ مجھے یقین ہے کہ اسے یہ افسانہ پورے کا پورا یاد ہوگا اور اس میں جو دو چار سخت مقام تھے انھیں وہ بڑے گمبھیر انداز میں بیان کرتا تھا۔ اور یہ فقرہ کہ "آجاؤ تاش کی ایک بازی ہو جائے" تو جیسے اس کا تکیہ کلام بن چکا تھا۔

"یار یہ سنا ہے کہ داغ دہلوی کی خالہ کسبی تھی" ایک دفعہ اس نے کہا۔

"یہ تم نے لوگوں کے ذاتی کردار کب سے کریدنے شروع کر دیئے" صفدر نے پوچھا۔

"یہ ضروری ہوتا ہے میرے بھائی۔ داغ صاحب طرز شاعر ہے۔ تم نے وہ انگریزی جملہ نہیں سنا؟"

"کون سا؟"

"Style is the Man"

"دیکھو جی ایک لفظ ڈکشن بھی ہوتا ہے" درمیان میں کوئی بولا۔

"ہاں ہوتا ہے۔"

"تو پھر تمہارا بھی ایک مخصوص ڈکشن ہے ـــ خلیق بیہودے۔"

"بکواس مت کرو۔" وہ گرم ہو گیا۔

اس کے بعد اس نے ڈکشن کو دو چار گالیاں دیں جو سب کی سب "ٹھنڈے گوشت" سے مستعار لی گئی تھیں۔ پھر وہ اٹھ کر چلا گیا۔

مجھے یاد ہے ایک بار ہم حسب معمول کسی ہوٹل کے کمرے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ساتھ ساتھ اردو افسانے پر بحث بھی جاری تھی عصمت چغتائی کا تذکرہ چل نکلا عصمت چغتائی کا نام لیا جائے اور "لحاف" کی گرمی محسوس نہ ہو ناممکن۔ سو ایسا ہی ہوا۔ پہل یقیناً خلیق نے کی "یار یہ جو بیگم جان ہے اس کا شجرۂ نسب "سیفو" سے ملتا ہوگا۔"

"بڑی تاریخی عورت ہے۔" امجد نے طنز کیا۔
"کون سیفو یا بیگم جان؟" خلیق اس بات کو سنجیدہ لے رہا تھا۔
"دونوں۔"
"دونوں تاریخی ہیں۔" خلیق نے زور دے کر کہا۔
"اس کا مطلب ہے کہ بیہودگی کی تاریخ خاصی قدیم ہے۔"
"تم نہیں سمجھ سکتے اس بات کو۔" بیہودگی کے لفظ پر خلیق ہمیشہ جھنجلا جاتا تھا۔
"تم جو سمجھ لیتے ہو — بیہودگی کو — اور جھوٹ — بیہودگی اور جھوٹ ہی تو ہوتا ہے شاعری میں Condensed اور افسانے میں Elaborate"
"جی صاحب — آپ سمجھ گئے ہیں اچھی طرح ادب کی روح کو — اب تم کو اردو ادب میں ایم اے کر لینا چاہیئے اور پھر اپنے نام کا ایک لیٹر ہیڈ چھپوا لینا چاہیئے — امجد عظیم ایم اے اردو۔"
"اور تم کو بھی اپنے نام کا ایک لیٹر ہیڈ چھپوا لینا چاہیے۔" خلیق بیہودہ"
اس جھڑپ کا یہ نقطۂ عروج تھا اور اس کا اختتام خلیق بیہودہ کا واک آؤٹ۔
پھر کافی دنوں تک ہم اکٹھے نہ ہو سکے۔ ایک دفعہ ملے بھی تو خلیق بیہودہ کے بغیر۔ لہٰذا ہم نے فیصلہ کیا کہ اگلے ہفتے جمعرات کے روز ذو درنج خلیق بیہودے کو منانے اس کے گھر جانا ہوگا۔ یہ پہلا موقع تھا ہم سب نام نہاد ادب دوستوں کا کسی ادب دوست کے ہاں جمع ہونے کا۔
"کیا پڑھ رہے ہو آج کل؟" اشرف نے نرم روی سے گفتگو کا آغاز کیا۔ امجد کو پہلے ہی بولنے سے منع کر دیا گیا تھا۔
"گلیورز ٹریول۔"
"سرخ مارک کے بغیر؟" امجد سے نہ رہا گیا۔
"سرخ مارک سمیت۔"
"تو گویا — " اشرف نے مصنوعی حیرانی کا اظہار کیا۔
"ہاں — خدا شکر خورے کو شکر ہی دیتا ہے۔" خلیق نے ہاتھ ملا کر جواب دیا۔
"مثلاً؟"
"مثلاً — گلیور کس خوبی سے Yahoos کی تصویر کشی کرتا ہے:

They had no tail nor any hair at all on their Buttocks except about The Anus which I presume Nature had placed there to defend them as they sat on the Ground...............

"یہ تصویر کشی ہے یا عضو کشی؟" ساجد نے ریمارکس دیئے۔
"اور یہ دیکھو" خلیق بیہودے نے تیزی سے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ اسے خطرہ تھا کہ گفتگو کا رخ کہیں بدل نہ جائے۔
پھر ایک ایک کر کے اس نے ہمیں گلیورز ٹریول کے تمام سرخ حصے سنانے شروع کئے۔ وہ حصہ جہاں نرس گلیور کے روبرو اپنے بچے کو دودھ پلاتی ہے اور گلیور دیو قامت نرس کے Dug کی کراہت آمیز تصویر کشی کرتا ہے۔ وہ حصہ بھی جہاں بورڈنگ نیگ عورتیں گلیور کی پروا کئے بغیر لباس تبدیل کرتی ہیں، پھر وہ حصہ جہاں لی پٹ جزیرے کے بادشاہ کے محل میں آگ بجھانے کے لئے گلیور بجائے پانی کے

پیشاب استعمال کرتا ہے ــــ غرض ایسے تمام حصے جو Scatological Obcenity کے ذیل میں آ سکتے ہیں، خلیق بیہودہ یوں لہک لہک کر سناتا چلا گیا جیسے وہ کوئی نثری پیراگراف نہیں "فنون" زہر عشق گا رہا ہو۔ آٹھ دس پیراگراف سنا کر اور ہمارے چہروں پر کچھ کچھ بوریت کے آثار دیکھ کر اس نے کہا "بس یا اور بھی؟"

"کیا اور بھی ہیں اقتباسات ـــــ،، امجد نے لفظ بیہودہ بڑی مشکل سے حذف کیا۔

"ہیں تو ہیں!" خلیق بیہودہ نے تقریباً ترشی سے کہا۔ وہ فقرے کے حذف ہونے سے سمجھ گیا تھا کہ اضافت کیا ہو سکتی ہے۔

"ایک بات ہے۔ ہمارے ہاں تو لفظ چھاتی پر مقدمہ چلتا ہے اور وہاں باقاعدہ Dug کی پیمائش ہو رہی ہے لیکن کوئی ہنگامہ نہیں،، اشرف نے ممکنہ جھڑپ کو بچانے کی غرض سے کہا اور اس کی یہ کوشش کامیاب رہی کر بحث ادب سے پھر کر عمرانیات سے سیاسیات اور سیاسیات سے لایعنی گفتگو پر ـــــ لیکن خلیق بیہودہ یہاں بھی ہاتھ دکھا گیا۔ اس نے ایسے ایسے جنسی لطیفے سنائے کہ شاید و باید ـــــ آخر کار جب خلیق بیہودہ کو سنا کر ہم باہر نکلے تو سب اپنے اپنے دل میں خلیق بیہودے کے لئے ابھرتا ہوا حسد محسوس کر رہے تھے۔

"اصل میں خلیق بیہودہ پڑھتا ورھتا کم ہے اور Show off زیادہ کرتا ہے۔" امجد نے سب سے پہلے دل کا بوجھ ہلکا کیا۔

"میرا بھی کچھ ایسا ہی خیال ہے۔" ساجد نے تیزی سے کہا۔

"دیکھو جی ایک پتے کی بات میں تم سب کو بتلانا چاہتا ہوں۔" اشرف نے بقراطی جھاڑنا شروع کی "فرائڈ کہتا ہے جو لوگ بہت زیادہ Sex بڑھتے ہیں وہ نامرد ہوتے ہیں۔"

اشرف نے فرائڈ کا ایک بھی آرٹیکل نہیں پڑھا لیکن Sex کا ہر مقولہ فرائڈ سے ضرور منسوب کرتا ہے اور ہم ہمیشہ اس کا Pro-Freudian مقولہ ہنس کر ٹال دیتے ہیں۔ لیکن آج حیرت انگیز طور پر سب نے اشرف کی بات حرف بحرف تسلیم کر لی۔ یقین کر لیا گیا کہ فرائڈ نے یہ بات ضرور کہی ہو گی۔ سب نے مان لیا کہ خلیق بیہودہ اصل میں بیہودہ نہیں، نامرد ہے ـــــ "He is Eunuch" ـــــ امجد دل کی گہرائیوں سے پکارا "Yea" ـــــ سب نے دل کی گہرائیوں سے تائید کی۔

• لیکن ـــــ ایک دن ـــــ ہم سب نے یہ خبر نہایت حیرانی سے سنی کہ خلیق نے شادی کر لی ہے ـــــ سب نے اشرف کے قول فیصل پر حرف زنی شروع کر دی۔ امجد نے تو فرائڈ کو ایک گالی بھی دی جس کا مطلب اشرف نے یہ لیا کہ گالی اصل میں فرائڈ کو نہیں اسے دی گئی ہے (اور واقعی تھا بھی یوں ہی) نتیجۃً آپ سے تم، تم سے تو ہونے لگی۔ آٹو میٹک ادبی حلقے کے پرخچے اُڑ گئے اور دوبارہ مل بیٹھنے کے تمام امکانات ختم ہو گئے اور یوں باقیوں کا تو مجھے پتہ نہیں لیکن کئی مہینوں تک خلیق سے میری ملاقات نہ ہو سکی۔

پھر اچانک ایک روز سرِ راہے اس سے ملاقات ہو گئی۔ رسمی فقروں کے تبادلے کے بعد میں نے پوچھا "کیا پڑھ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں یار۔ شادی کے جھنجھٹ ہی ایسے ہوتے ہیں کہ مہینوں فارغ نہیں ہونے دیتے۔ تمہیں تو پتہ ہی ہے۔"

"نہیں میں نے ابھی شادی نہیں کی۔"

"اچھا! ہوں ـــــ ہاں ـــــ خیر کوئی بات نہیں ـــــ اچھا اب میں چلتا ہوں۔" اس نے مصافحے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا۔ "ویسے تم تو کچھ نہ کچھ پڑھ ہی رہے ہو گے،، اس نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ ڈی ایچ لارنس۔" میں نے اس کی دکھتی رگ کو چھوا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ کچھ اور رک جائے "دی ووسن ان لو بائی ڈی ایچ لارنس" میں نے پھر دہرایا۔

"ایک بات کہوں یار" وہ ٹھہر گیا "یہ ڈی ایچ لارنس کچھ ضرورت سے زیادہ بیہودہ ہے!"

"کیا!" میں چونکا لیکن وہ جا چکا تھا۔

ایک سفر

مصطفیٰ ڈھلوں

کالج کی بوجھل بوجھل سی، اُداس اُداس سی فضا اس کی ہڈیوں میں اُتر رہی تھی۔ سارے ماحول پر گرانی سی چھائی ہوئی تھی۔ سڑکیں خشک، درخت مضمحل، کیاریاں مرجھاتی ہوئی اور عمارت سوگوار سوگوار سی لگ رہی تھی۔ اسے عمارت کی جگہ ایک بہت بڑا کھنڈر نظر آرہا تھا۔ ہڑپہ اور موہنجوداڑو سے بھی بڑا کھنڈر۔ اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کھنڈر میں دفن مردہ انسانوں کی بدروحیں اسے پکار رہی ہیں۔ اس خیال سے اس پر ایک وحشت سی طاری ہونے لگتی اور اس کا جسم ایک جھرجھری سی لے کر رہ جاتا۔ ٹھنڈک کی ایک لکیر چوٹی سے پاؤں تک لپکتی ہوئی محسوس ہوتی۔

"جب انسان اندر سے ٹوٹ جاتا ہے اور اس کا باطن کھنڈر بن جاتا ہے تو اسے شاید یوں ہی لگتا ہے۔" اس نے سوچا۔

پھر اسے یاد آیا کہ اسے ایک دوست نے کہا تھا "ناصر! تمہارا ستارہ گردش میں ہے تم جو بھی کام کرتے ہو اس کا الٹ نتیجہ تمہارا منتظر ہوتا ہے۔"

میرا ستارہ گردش میں ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ہو بھی سکتا ہے! بھلا کل ہی تو ہاسٹل میں چوری ہوئی تھی۔ چور میں نے ہی پکڑا تھا۔ ہاسٹل انتظامیہ کی نااہلی کی وجہ سے وہ بھاگ گیا اور اس کا سارا نزلہ مجھ پر ہی گرایا گیا اور مجھے ہاسٹل سے نکال باہر کیا گیا۔! اسے دوست کی بات پر یقین آنے لگا۔

علم نجوم ــــ علم نجوم بھی بکواس ہے۔ علم نجوم کیا ہے؟ ستارے بھلا کیا بتا سکتے ہیں۔ سب نجومی سچے نہیں ہوتے کہ سب کی ہر بات مان لی جائے۔ اور میرا دوست ــــ وہ تو پھر بھی ایک طالب علم ہے۔ کوئی نجومی تھوڑا ہے کہ وہ سچ . . . . نہیں، نہیں یہ سچ ہو بھی تو سکتا ہے! اسے ایک بات یاد آنے لگی تھی۔

کل ہی تو وہ فون کر رہا تھا مگر فون کرتے کرتے وہ کچھ اور ہی سوچنے لگ جاتا تھا اور فون ادھر ڈیڈ کر دیا جاتا تھا۔ "ادھر لاؤ! پہلے کبھی فون کیا ہے جو یوں بے وقوفوں کی طرح ہاتھ چلا رہے ہو۔" بوڑھے آپریٹر نے اس کے ہاتھ سے فون کھینچتے ہوئے کہا تھا۔

"میں دس چھوڑ، بیس چھوڑ سو دفعہ تمہاری بہن کو فون کر چکا ہوں۔" اس نے بھڑکتے ہوئے لہجے میں جواب دیا تھا اور آپریٹر نے اس کے گریبان پر ہاتھ بھی ڈال تھا۔ اس سے پہلے کہ دو دو ہاتھ ہوتے

اسے اس کے دوست نے بوتھ سے باہر کھینچ لیا تھا۔

"تمہارا دوست صحیح کہتا ہے کہ تمہارا ستارا گردش میں ہے۔ تم خواہ مخواہ سب سے الجھنے لگتے ہو۔" اس کے اس دوست نے کہا تھا جو اسے بوتھ سے باہر کھینچ کر لایا تھا۔

کالج کی آخری گھنٹی بجی تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے پرانے بوسیدہ اور پُر اسرار مندر میں ہزاروں گھنٹیاں جھنجھنا اٹھی ہوں۔ اسے پورا ماحول آسیب زدہ لگ رہا تھا، کسی اجاڑ مرگھٹ کی طرح جہاں بدروحوں کے رونے، ہنسنے یا ان کی خلط ملط چیخوں کی آواز ابھر آتی ہو گی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے پورا ماحول اس کی تاک میں لگا ہوا ہے اور موقع پا کر اسے کاٹنے کو دوڑے گا اور اپنے خوفناک دانتوں سے اس کی ہڈیاں تک پیس ڈالے گا۔

اس نے اپنی کتابیں جن کی تعداد وہ ہمیشہ کم رکھتا تھا، بغل میں دابیں اور دوستوں کے ساتھ پختہ روش پر کالج سے باہر کی طرف تیز تیز چلنے لگا، چلنے کیا دوڑنے لگا تھا۔ وہ جلد سے جلد کالج کی حدود سے باہر نکل جانا چاہتا تھا۔ وہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھ رہا تھا، کیونکہ اس کے ذہن میں کئی ایسی کہانیاں تھیں جن میں پیچھے مڑ کر دیکھنے پر شہزادوں کو پتھر کی مورتی بننا پڑا تھا۔ پورا ماحول اسے دیکھ رہا ہے۔ جونہی وہ پیچھے مڑ کر دیکھے گا، یہ سوگوار ماحول اس سے لپٹ جائے گا۔ اس خیال سے وہ تیز تیز چلنے لگا تھا بلکہ دوڑنے لگا تھا۔ وہ کشادہ سڑک پر آیا تو اس نے دو تین سانسیں لیں جیسے کسی جہنمی کو خدا نے دوزخ سے جنت میں منتقل ہونے کا حکم دیا ہو۔

بس سٹاپ پر کھڑے کھڑے اسے وحشت سی ہونے لگی۔ بسیں ایک دوسری کے آگے پیچھے چنگھاڑتی ہوئی گزر جاتیں، مسافروں کو کہ وہ بھی ان میں شامل تھا، نہیں اٹھاتی تھیں۔ بس یونہی گزرتی رہتی ہیں۔ لوگ کھڑے رہتے ہیں۔ یہ لوگ بسوں میں سوار کیوں نہیں ہوتے؟ نہ تو یہ ہاتھ بلند کرتے ہیں، نہ اشارہ کرتے ہیں۔ یہ بے حس، غیر متحرک اور جامد لوگ یہاں کیسے کھڑے ہیں؟ بسیں تو گزرتی ہیں اور تیزی سے گزر جاتی ہیں، انہیں کیا پڑی ہے کہ وہ بے حس مسافروں کو سوار کرائیں۔ ویسے ان بسوں کے کنڈکٹر تو ہونے چاہئیں ـــ ہوتے ہوں گے ـــ مگر بعض روٹوں پر کمپنیوں کی بسیں بھی تو چلتی ہیں۔ اس روٹ پر بھی کمپنی کی بسیں چلتی ہیں۔ کنڈکٹروں کو کمیشن کا لالچ تو ہوتا نہیں ہے تو پھر وہ اپنی جان کا وبال خود کیوں خریدیں۔ غلیظ اور گندے لوگوں کو بسوں میں سوار کرائیں جو اپنے پیروں پر تھوکتے ہیں اور ناک اپنے کف سے صاف کرتے ہیں یا بعض اوقات بس کے شیشوں پر مل دیتے ہیں۔

اس کے ایک دوست نے بس کو ہاتھ دیا اور وہ بھی اس کے ساتھ بس میں سوار ہو گیا۔ بس میں بے شمار لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ مسکرا رہے تھے، کچھ کے چہرے اترے ہوئے تھے، کچھ بیٹھے اونگھ رہے تھے۔

"جو مسکرا رہے ہیں یہ تو شروع سے اسی بس پر سفر کر رہے ہیں۔ جو کچھ ملول سے، اداس سے اور غمگین سے

نظر آتے ہیں یہ پہلے غلط بسوں کے مارے ہوتے ہیں، جو انہیں اِدھر اُدھر کے سٹاپوں پہ اتارتی چڑھاتی رہی ہیں۔ اب یہ صحیح بس پہ سوار تو ہو گئے ہیں مگر گزرے ہوئے دھکے اور تجل خواری بھی یاد آ رہی ہے اور جو یہ اونگھ رہے ہیں یہ شروع سے ہی غلط بس میں سفر کر رہے ہیں۔ انہیں یہ بھی خبر نہیں کہ جس بس میں وہ سفر کر رہے ہیں وہ صحیح بھی ہے یا نہیں۔" اس کے دوست نے ان لوگوں کی تشریح کی تو وہ حیران رہ گیا۔

عجیب بات ہے کہ ایک ہی بس کے مسافر غلط بھی ہیں اور صحیح بھی۔ یا سب مسافروں کی ایک ہی بس ہے جو غلط بھی ہیں اور صحیح بھی۔۔ خوراک مضر بھی تو ہوتی ہے اور مفید بھی۔ جو خوراک ہم کھاتے ہیں وہ مفید بھی ہوتی ہے۔ مگر بعض مریض آلو کھاتے ہیں تو وہ بیمار ہو جاتے ہیں اور بعض آلو کھانے سے موٹے ہوتے ہیں۔ سب انسان مریض ہیں یا سارے مریض انسان ہیں ۔۔ انہیں پرہیز کرنا چاہیئے ۔۔ کہ یہی ڈاکٹروں کا مشورہ ہے۔

بس کو ایک دھکا لگا اور وہ بس میں بیٹھے لوگوں کو دیکھنے لگا۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ وہ کب اور کیسے سیٹ پر بیٹھ گیا۔ باہر سے بس مسافروں سے بھری ہوئی لگ رہی تھی۔ کوئی سیٹ خالی نظر نہیں آ رہی تھی اور پھر بھی اسے سیٹ مل گئی تھی۔ "بس میں سوار ہونے والے تمام لوگوں کو سیٹ مل جاتی ہے۔" اس کے ساتھ بیٹھا ہوا اس کا دوست کہہ رہا تھا۔

ہر سواری کے لئے سیٹ موجود ہوتی ہے ۔ سیٹیں اتنی ہی بنائی جاتی ہیں جتنی سواریاں ہوتی ہیں یا اتنی ہی سواریاں سوار ہوتی ہیں، جتنی سیٹیں ہوتی ہیں ۔۔ اسی لئے تو اس سامنے والی لڑکی کو بھی سیٹ مل گئی تھی۔ بھری بس میں ایک ہی لڑکی تھی۔ حسن کا مرقع، بشرہ معصومیت کا پیکر تھا۔ دل اس کی کشش سے کھینچے چلے جا رہے تھے۔ پوری بس کے لوگ اسی پر نظریں گاڑے بیٹھے تھے اور وہ تھی کہ سب سے آنکھیں ملا رہی تھی اور سب کے دلوں کو لبھا رہی تھی۔

جو منس مکھ تھے انہوں نے ایک بار دیکھا اور پھر اپنی خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے جیسے ہوا ہی کچھ نہ ہو ۔۔ ملول اور اداس چہروں والے جن میں دیکھنے کی سکت نہیں تھی۔ پہلے تو یوں دیکھا کہ دیکھتے ہی رہ گئے۔ پھر جب اس کی نگاہ کے بسمل ہو گئے تو کنکھیوں سے دیکھنے لگے۔ اور جو اونگھنے والے تھے وہ اونگھتے ہی رہ گئے۔ وہ اس کے وجود سے بھی بے خبر تھے ۔۔ لڑکی تھی کہ ہر ایک کو اپنے حسن کا اسیر کئے ہوتے تھی۔ اس نے اپنا حنائی ہاتھ نکال کر جھٹکا اور سیٹ سے پیچھے لڑھکایا، جہاں ناصر بیٹھا ہوا تھا۔ ہاتھ پر بنے ہوئے سلیقے سے حنائی بیل بوٹے ناصر کے دماغ کے فوکس کی زد میں آ گئے۔ وہاں مہندی کا بوٹا اُگا، پتے نکلے، خشک ہوتے اور پھر حنا بنی۔ ساتھ ساتھ اسے ڈھولک کی تھاپ پر نقرئی قہقہے سنائی دیتے۔ پھر بینڈ باجے کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی اور پھر وہ چھپر کھٹ پر بیٹھ کر اپنی دلہن کا کومل اور نرم و نازک ہاتھ پکڑے اپنے ہونٹوں کے قریب لاتے ہوئے کہنے لگا " میں تمہارا یہ چاندی جیسا سفید ہاتھ ہمیشہ کے لئے اپنے ہونٹوں سے لگا لینا چاہتا ہوں۔ پھر اس کی بیوی کے ہاتھوں

جیسے خمیدہ ہونٹوں پر ہلکی سی شرم و حیا کی مسکراہٹ نے دھنک بنا دی۔ اس کی نرگسی آنکھیں ناصر کی طرف اٹھیں اور پھر جھک گئیں۔

پھر اس کے ہاتھ میں گدگدی سی ہوئی۔ حسینہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبا رہی تھی۔ اس کا جسم تھرتھرا اٹھا۔ اس نے چاہا اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لے مگر اب اس کا ہاتھ لمبا ہوتا جاتا تھا۔ یہ ہاتھ لمبا ہوتے ہوتے اس کی کمر کے گرد بل کھانے لگا۔ پھر اس نے ناصر کو اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ ناصر کھنچتا چلا گیا حتیٰ کہ اس کے سینے سے لگ گیا۔ اس کے دماغ پر غنودگی چھانے لگی۔ اس کا جسم بے حس ہونے لگا، اس کے قویٰ مضمحل ہونے لگے اور وہ پورا کا پورا شل ہو کر رہ گیا۔

جب اسے ہوش آیا تو وہ حسینہ کا اسیر ہو چکا تھا۔ اب وہ اس کا ہاتھ دبا رہا تھا اور وہ پیچھے کھینچ رہی تھی۔ اب اس کا ہاتھ لمبا ہوتا جا رہا تھا، اس کا ہاتھ لمبا ہوتے ہوتے اس کی کمر سے لپٹ گیا۔ اس نے اسے اپنی طرف کھینچا اور زور سے بھینچ لیا۔

جب اندھیرا چھا گیا تو بس میں بیٹھے مسافر بھی اندھیرے کی لپیٹ میں آ گئے اور اندھیرے میں گناہ بھلا کب نظر آتا ہے۔ بے شک گناہ ان کے درمیان موجود تھا۔ وہ اسے دیکھنے سے قاصر تھے یا وہ انہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کو خبر تک نہ ہوئی کہ سٹاپ آ گیا۔ اس نے اُترنے سے انکار کر دیا، وہ اس حسینہ کے ساتھ جانے پر بضد تھا۔

"یہ باتیں بس تک ہی محدود رکھنی چاہئیں، انہیں دل کا روگ نہیں بنانا چاہیے۔" اس کے دوست نے اسے سمجھایا، مگر وہ نہ اترا اور دوسرے اُتر گئے۔

کیا ضروری ہے کہ اپنے ہی سٹاپ پر اُترا جائے؟ سٹاپ تو اور بھی بہت ہیں۔ کسی اور سٹاپ پر بھی تو اترا جا سکتا ہے ـــ لیکن نہیں۔ پھر واپس اپنے سٹاپ کی طرف چلنا پڑتا ہے۔ گھر تو اپنے سٹاپ سے ہی نزدیک ہوتا ہے نا! ـــ کیا خبر کہ دوسرے سٹاپ سے گھر کتنی دور ہو؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کسی اور سٹاپ سے آدمی کو اپنے گھر کا بھی علم نہ ہو ـــ سب ٹھیک ہے مگر یہ ساتھی ـــ اس کے ساتھ تو جہنم میں بھی جانے میں کوئی قباحت نہیں۔

باہر گھُپ اندھیرا تھا، سٹاپ پر سٹاپ گزر رہے تھے، سٹاپ گزرتے گئے اور لوگ اُترتے گئے۔ جیسے جس سٹاپ پر اترنا تھا وہ اُتر گیا۔ کوئی بھی تو نہ تھا جو اپنے سٹاپ کی بجائے کسی اور سٹاپ پر اُترا ہو اور وہ سوچ رہا تھا "میں ہی اپنے سٹاپ سے چوک گیا ہوں۔"

اگلے سٹاپ پر حسینہ اُتر گئی مگر اُترتے ہوئے اس نے اسے کچھ اس طرح دیکھا کہ وہ بھی اُتر گیا جیسے ڈور سے بندھا ہوا ہو۔ بس آگے بڑھ گئی تو اس نے حسینہ کا ہاتھ پکڑنے کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا مگر وہ وہاں نہیں تھی! اس نے اسے بہت ڈھونڈا مگر بے سود، وہ پاگلوں کی طرح چلاتے لگا "مجھے اسے اس کے نام سے پکارنا چاہیے۔" معاً اسے یاد آیا کہ اسے تو اس کا نام ہی معلوم نہیں ہے۔ اندھیرا اس قدر تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ اسے تردد ہوا کہ یہ لڑکی تھی یا کچھ اور ـــ "یہ کچھ اور" کیا ہوتا ہے!

بھلا وہ کوئی بھوت پریت تھوڑی تھی۔ اس کے پاؤں دیکھنے چاہئیں تھے ــــ مگر پاؤں دیکھنے سے کیا ہوتا ہے؟

فتو ماچھی کے بیٹے راجو نے اسے ایک واقعہ سنایا تھا۔ اسے یاد آنے لگا۔ "چودھری! دھوپ اتنی تیز تھی کہ قسم اللہ کی۔ ایسا لگتا تھا جیسے تنور تپ رہے ہوں۔ اعتبار کرو چودھری جی! میں اپنا ریوڑ چراتا چراتا بیری کے اس بہت بڑے درخت تک پہنچا جو تمہارے کنویں سے پرے ہے۔ اچانک ایک خوبصورت عورت گھنگھرو چھنکاتی میرے سامنے آگئی۔ اللہ پاک کی قسم ــ اعتبار کرو چودھری جی! میں نے اسے دیکھا تو اس پر ریجھ گیا۔ مگر پھر میں نے اس کے پیر دیکھے۔ وہ پیچھے کو مڑے ہوئے تھے۔ بھلا ہو دادی اماں کا! اس نے تو مجھے پہلے ہی بتا رکھا تھا کہ جس عورت کے پیر پیچھے کو مڑے ہوئے ہوں گے وہ چڑیل ہو گی۔" میں تو بھاگ اٹھا۔ اعتبار کرو جی! پورے پانچ دن بیمار رہا۔ بابا گل شاہ کے تعویذوں سے اترا۔"

اسے محسوس ہوا جیسے اس کے قریب ہی کپڑے سرسراتے ہوں۔ "کون ہے؟" اس نے پوچھا۔ مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ مایوس ہو کر واپس جانے لگا۔ مگر اب وہ گھر کیسے پہنچے گا۔ اسے خیال آیا کہ سڑک پر چلنا چاہئے۔ مگر یہ محسوس کر کے وہ دم بخود رہ گیا کہ وہاں سڑک نہیں تھی۔ اسے تعجب ہوا کہ ابھی سڑک تھی ابھی کہاں گئی۔ بس ابھی سڑک پر ہی تو چل کر آئی تھی۔ آخر وہ سڑک کہاں گئی۔ ہر طرف ریت ہی ریت تھی جس میں اس کے پاؤں دھنسے جاتے تھے ــ اس نے سوچا عجیب سڑک ہے کہ جب بس گزر جاتی ہے تو مٹ جاتی ہے۔ آگے جانے کے لئے سڑک موجود ہے مگر پیچھے جانے کے لئے سڑک کا وجود ختم ہو چکا ہے۔ اس سڑک کے مسافر آگے ہی کی طرف سفر کر سکتے ہیں کیونکہ پیچھے تو کوئی سڑک ہی نہیں ہے۔

پھر اچانک دور سے اسے حسینہ کی آواز سنائی دی۔ وہ دیوانوں کی طرح آواز کی سمت بھاگنے لگا۔ کئی بار گرا۔ پھر اٹھا۔ مسلسل بھاگتا رہا۔ مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ جمعہ کے روز مولوی صاحب نے وعظ کرتے ہوئے کہا تھا کہ گناہ حسین و جمیل ہوتا ہے۔ یہ آنکھوں کو خیرہ کر دیتا ہے۔ آدمی دیوانوں کی طرح اس کے پیچھے بھاگتا ہے اور صراطِ مستقیم سے دور نکل جاتا ہے ــ "میں سڑک سے دور نکل آیا ہوں ــ بھلا اس سڑک اور صراطِ مستقیم میں کیا رشتہ ہے۔ گناہ اور اس حسینہ میں کیا رشتہ ہے۔ میں یہ کیا سوچنے لگا ہوں!" اس نے سر کو جھٹکا۔ وہ بھاگ بھاگ کر تھک گیا تھا۔ اس کی ہڈیاں دکھنے لگی تھیں۔ وہ ایک جگہ لڑکھڑا کر ڈھیر ہو گیا۔

اس نے سوچا، جو مسافر بس سے رہ جاتے ہیں تو وہ گاڑی تو پکڑ سکتے ہیں۔ اسی لمحے گاڑی کا بگل گونجا۔ وہ اٹھا اور تیزی سے آواز کی سمت بھاگنے لگا۔ وہ بھاگتا رہا، بھاگتا رہا، یہاں تک کہ اسے ایک چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن پر ایک گارڈ لالٹین لہراتا نظر آنے لگا۔ اسی اثنا میں گاڑی چھوٹ گئی۔ اب اس میں بھاگنے کی ہمت نہیں رہی تھی مگر پھر اس نے اپنے آپ کو پکارا "بھاگو! اگر یہ گاڑی نکل گئی تو تم ہمیشہ کے لئے رہ جاؤ گے۔ اور تم جانتے ہی ہو کہ پیچھے سے گاڑی نہیں آتی۔ جب گاڑی آتی ہے تو پیچھے سے پٹڑی اکھڑتی چلی جاتی ہے۔" وہ بھاگتا رہا۔ گاڑی تیز ہوتی گئی مگر وہ گرتا پڑتا اس کے پائیدان تک پہنچ ہی گیا۔

اب اس کے کانوں میں حسینہ کی پکاریں گونج رہی تھیں مگر وہ نہیں اترا۔ کیونکہ ایک تو صحیح گاڑی پر سوار ہو گیا تھا اور دوسرے اسے گزری ہوئی خجل خواری یاد تھی۔

بچھڑی ہوئی زندگی

عرفان احمد عرفی

یہ وہ دن تھے جب بچپن کی نرم اور کچی برف رفتہ رفتہ پگھل رہی ہوتی ہے، وقت کی کرنیں نیچے کی زمین کے سبھی نشیب و فراز اُبھار رہی ہوتی ہیں۔ موسموں میں ایک نیا پن سا محسوس ہونے لگتا ہے، زندگی اُس موڑ پر ہوتی ہے جہاں سے دور کھڑی منزلیں بھی سرنگوں دکھتی ہیں، درمیان کے سبھی راستے ایک ہی جست میں سر کرنے کا کھیل لگتے ہیں۔

اُس نے ڈاکٹر بننے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ وہ اپنے سکول میں بیالوجی کی بہترین طالبہ تھی۔ اس مرتبہ کے امتحانات مستقبل کے اہم ترین فیصلے کا پیش خیمہ تھے۔ شاید اسی لئے وہ ہر دوسرے، تیسرے روز ہونے والے بخار کا کسی کو پتہ نہ چلنے دے رہی ہیں۔ خاص طور پر بابا اور آپی کو۔ منّا تو ابھی چھوٹا تھا ـــ بابا اور آپی سے اس ایک سچ کو چھپانے کے لئے اُسے کتنی بے احتیاطی کرنا پڑتی تھی ـــ بہت پہلے اس کے گلے میں ایک چھوٹا سا آپریشن ہوا تھا۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ آئے دن ہونے والا بخار اُسی آپریشن کے بعد کے اثرات میں سے ہے ـــ جب بخار کا حملہ ہوتا تھا تو اُس کے جوڑوں میں درد کی ٹیسیں اُٹھنے لگتی تھیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے کوئی ہتھوڑے برسا رہا ہے۔ ایسے میں اُس کے پاؤں کے ٹخنے بھی سوج کر سُرخ ہو جاتے تھے۔

پچھلے کچھ دنوں سے بخار کے بے وقت پے در پے حملے اُس کے بدن میں کسی بیماری کا یوں راستہ بنا رہے تھے جیسے گئی رات سانپ رینگتا ہوا گھر میں آ گھسے اور مکین بے خبر سوئے رہیں ـــ شاید اسی لئے جیسے جیسے امتحان کی تاریخ قریب آ رہی تھی اس کی اُمیدیں اُس کا ساتھ چھوڑے جا رہی تھیں۔ بالکل ایسے جیسے ایک مرتبہ پکنک کے دوران اُس کی ہم جماعت لڑکیوں نے اُسے چھوڑ کر موٹر بوٹ میں فرار ہونے کا مذاق کیا تھا اور وہ شام تک جزیرے میں اکیلی گھومتی رہ گئی تھی۔ پتہ نہیں کیوں وہ مذاق اب اُسے سچ ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔

اب کئی روز سے خوابوں اور اُمنگوں کے سمندر میں اُس کے ہمراہ نہاتی ہوئی ہمجولیاں اُسے پانی کی تند و تیز موجوں میں چھوڑ کر ساحل کی طرف بھاگتی ہوئی دکھ رہی تھیں۔ رنگ رنگ کی تتلیوں کے پیچھے بھاگتا ہوا ہمقدم جلوس، اُسے خود سے الگ ہوتا محسوس ہو رہا تھا اور وہ راستہ بدلنے والے ایک مسافر کی طرح بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی بخانے کن اَن دیکھے راستوں پر ہو چلی تھی ـــ کالج سے گھر آتے ہی وہ بغیر کسی سے بات کئے سیدھا اپنے کمرے میں جاتی اور آتش دان پر رکھی گڑیا کو گھنٹوں دیکھتی رہتی ـــ

شام کو ہوا کا زور بڑھتا جاتا ـــ اور منہ زور جھونکے بے دھڑک کھڑکی کے کواڑ کھول کر میز پر رکھی کتابوں کے ورق اُلٹ پلٹ کرنے لگتے۔ ہوا کے تھپیڑوں کا مقابلہ کرتی ہوئی معصوم گڑیا بازو پھیلائے اُسے مدد کے لئے پکارنے لگتی اور اگلے ہی لمحے وہ گڑیا کو اپنے سینے کی نرم پناہوں میں چھپا لیتی۔ ایسے میں اس کی نظر دیوار پر لگے کیلنڈر پر پڑتی۔ پہلے پرچے

کی تاریخ دیکھتی تو اُسے لگتا جیسے وہ سامنے ایک بڑی سکرین پر اپنی طرف بڑھتے ہوئے تیز رفتار ٹرین کے انجن کو دیکھ رہی ہے جو اگلے ہی لمحے بہت بڑے حادثہ کا شکار ہونے والا ہے۔ روز بروز گڑیا سے اُس کی ایک بے نام سی وابستگی بڑھتی جا رہی تھی۔ اُسے لگتا جیسے وہ گڑیا کو سینے سے لگائے کسی انجانے سے خوف میں زینے پر پاؤں رکھے کھڑی ہے اور جیسے ہی وہ دوسرے، تیسرے اور چوتھے زینے پر پاؤں رکھے گی، سیڑھی ٹوٹ جائے گی۔

کچھ دنوں سے وہ بیالوجی کے پریکٹیکل کی کاپی پر آدمی کے صرف سر کا ہی سکیچ بنا سکتی۔ دھڑ کا خاکہ بناتے وقت حاشیہ اُس کی گرفت میں نہ رہتا۔ شاید اسی لئے آج کل کالج سے گھر جاتے ہوئے راستوں میں میڈیکل کالج اور ہسپتالوں کی عمارتیں اُسے اجنبیت کے نقاب اوڑھے بے رُخی کے بادلوں میں دُھندلاتی محسوس ہو رہی تھیں۔ کبھی یہی عمارتیں اُسے اپنی طرف بلایا کرتی تھیں لیکن اب اُسے لگتا جیسے وہ کبھی بھی ان کے مرکزی دروازوں میں سے سفید رنگ کے کوٹ پہنے داخل نہ ہو سکے گی۔

اُسے ماں کی کمی کا احساس بھی کچھ زیادہ ہی ہونے لگا تھا۔ اگرچہ بابا نے اُن سب کو ماں کی طرح پالا تھا اور اب تو آپی نے ماں کی جگہ لے لی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ آپی جوان ہے لیکن وہ اسے کبھی بھی جوان نہ دکھتی تھی۔ اُس نے گھر کو اور بابا کو یوں سنبھال رکھا تھا جیسے بڑی بوڑھیاں سنبھالتی ہیں۔ چھوٹے بھائی مُنّے کی دیکھ بھال میں تو وہ بھی آپی سے مُٹھی بھر ممتا پھانک لیتی تھی جیسے اذان کی آواز سن کر کبھی کبھی اُسے آپی کا دوپٹہ شیئر کرنا پڑتا تھا۔

بچپنے کے دُھندلکے میں اُسے اب بھی کبھی کبھی ماں کی موت کا حادثہ واضح طور پر لکھا ہوا نظر آتا تھا۔ سب سے واضح بابا کے چہرے پر ــــ اُسی دن سے وہ آپی اور ممتا اپنے اپنے پہلو میں دل نہیں بابا کا ہی چہرا دھڑکائے پھر رہے تھے۔ اگرچہ بابا کے چہرے پر اب وہ نقش مدھم ہو چکے تھے یا شائد اُن تحریروں پر نئی تحریریں جگہ لے رہی تھیں۔

اس مرتبہ کا بخار اُسے اپنے گرم بازوؤں میں دبائے ہمیشہ کے لئے سو چلا تھا۔ جسم کے ایک ایک جوڑ پر جیسے پتھروں کی بارش ہو رہی تھی اور پاؤں کے ٹخنے کوئلوں کی طرح سلگ رہے تھے۔ امتحان شروع ہونے میں صرف دو دن تھے، لیکن بخار نے اُسے اس قدر نڈھال کر دیا کہ مجبوراً اُسے بابا اور آپی کو بتانا پڑا۔

وہ ایک مرتبہ پھر ہسپتال کے بستر پر آ گئی ــــ اب اُس پر کھُلا کہ پچھلے کئی روز سے وہ اداسیوں کی جس دُھند میں راستے ٹٹول رہی تھی، ہسپتال کے اسی سفید اور نرم بستر کی اُداسی تھی جو اُسے بچھڑی ہوئی ماں کی طرح گود میں لئے ہوئے تھا۔ اگرچہ مُنّا، آپی اور بابا ہی ماں بنے اُس کے گرد کھڑے تھے۔

ایک رات بیماری نے ایسا شب خون مارا جیسے زوردار دھماکہ ہو جانے کے بعد عمارت آگ رہی ہے اور ملبے میں کوئی صرف اپنا سر ہی نکال سکتا ہے ــــ اُس کے جسم کی نس نس میں بے حسی کی دیمک اپنا گھر بساتے بساتے جال پھیلا چکی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے کسی نے اُس پر پتھر کی بھاری سلیں رکھ دی ہیں اور اب وہ بستر پہ پڑے پڑے اپنا سر بھی اِدھر اُدھر نہیں کر سکتی۔ جیسے کسی نے اُس کی گردن پر مضبوطی سے ہاتھ ڈال دیا ہو ــــ اب وہ سمجھی کہ بیالوجی کی کاپی میں وہ انسانی جسم کا سکیچ بناتے وقت سر سے نیچے کا دھڑ کیونکر ٹھیک طور سے کچھ بھی نہ بنا پائی تھی۔

کچھ مہینے ہسپتال میں کوشش ناتمام کے بعد اُسے گھر لایا گیا۔ آپی اُس کی دیکھنے، سننے، سوچنے اور بولنے والی، سانس لیتی لاش کے سرہانے بیٹھ گئی ــــ اور پھر اسی طرح دیوار پر چسپاں کیلنڈر پر کیلنڈر بدلتے چلے گئے۔

بہاریں دروازے پیٹتی رہ گئیں لیکن آپی نے ایک پل بھی کان نہ دھرا۔ کالی دھرتی بھی کیسے۔ اُس کے سامنے بیمار

بہن کے ڈھیروں کام شیر خوار بچوں کی طرح چلا رہے ہوتے اور جنہیں آپی اپنی باہوں میں جھول جھول اُن کی جوانی کے بے ثمر خواب دیکھتی رہی لیکن یہ شیر خوار تھے کہ کبھی اپنے پاؤں کھڑے نہ ہو سکے۔ یہ چھوٹے چھوٹے کام ایک دن بھی کم نہ زیادہ ہوئے، ٹس سے مس نہ ہو سکے —— آپی کو اُسے نہلانا پڑتا، اپنے ہاتھوں سے کھلانا پلانا ہوتا، اُس کے سرہانے کے سامنے نصب لکڑی کا مخصوص مطالعہ کا سٹینڈ (چوکھٹا) کھولنا اور بند کرنا ہوتا۔ سٹینڈ پر کھُلی کتاب یا رسالہ کا صفحہ پلٹنا ہوتا، اُس کے جسم کی خارش سہلانی ہوتی، اُس کے کپنے پر ٹی وی آن، آف کرنا ہوتا، اُس کے چہرے پر مکھی یا مچھر بیٹھ جائے پر اُڑانا ہوتا۔

آپی کے دھیان کا دریچہ ہر گھڑی اُسی سمت کھلا رہتا کہ ایک اُسی کی آواز تھی جس کا آنا جانا آپی کی زندگی کے خالی کمرے میں رہتا تھا ——

گورستان کی رکھوالن کی طرح آپی اُس کی قبر پہ مٹی ڈال ڈال پانی کا چھڑکاؤ کرتی رہی۔ کبھی گھاس کاٹتی، کبھی بیج بوتی، اُگے ہوئے پھولوں کو ترتیب دیتی، خام پڑے چراغ روشن کرتی، اگر بتی سلگاتی اور کتبے پر بیٹھ جانے والے چڑیوں، کوؤں کو اُڑاتی رہتی۔

وہ اپنی چلتی پھرتی آپی میں اپنی زندگی کر رہی تھی، اِک ایسی زندگی جو اس سے بہت دور تھی اور قریب بھی۔

کبھی کبھی آپی اُس کی خوشی کے لیے اُس کا بناؤ سنگھار بھی کرتی۔ اُس کی بھنویں باریک کرتی، کانوں میں ٹاپس لگاتی اور اب تو اس کے چہرے کے بال بھی بلیچ کرنا پڑتے، لیکن جب آئینہ اُس کے سامنے رکھتی تو وہ فوراً آنکھیں موند لیتی۔ آپی ہمیشہ کی طرح بھول جاتی کہ بیماری کے باعث جب سے اُس کے سر سے بال جھڑے ہیں اُسے اپنے منڈے ہوئے سر کے ساتھ آئینہ دیکھنا کسی صورت نہیں بھاتا۔

آپی اُس کے پہلو میں لیٹی اُس کی گڑیا کے بھی سبھی چاؤ پورے کرتی۔ روز اس کا لباس تبدیل کرتی۔ اس کا سنگھار تازہ کرتی —— کبھی کبھی تو اُس نے، آپی نے اور گڑیا نے ایک ہی رنگ کا لباس پہنا ہوتا جس پر ایک ہی رنگ کے پھول بھی ہوتے۔ اُس روز وہ جیل کی ایک ہی بیرک کے مجرموں کی طرح ایک دوسرے سے نظریں چُرا رہی ہوتیں کہ کہیں کوئی اُن میں چھپی سچائیاں پڑھ نہ لے —— پھر ایک روز اُس کی ضد پہ آپی نے گڑیا کے سر کے بال بھی صاف کر دیئے۔ اکثر آپی دونوں کو سجا کر انہیں ایک دوسرے کو دکھا دیتی۔

اسی طرح کئی برس اور وہ بستر پہ پڑی، چھت پہ نظریں جمائے خواہشوں کی سکاش کھیلتی رہی۔ مُنا اب مُنا نہیں رہا تھا، تعلیم مکمل کر کے ملازم ہو چکا تھا، بابا ریٹائر ہو گئے تھے۔

اب اس کی کوئی نہ کوئی سہیلی بھی وزنی پیٹ اور بھری ہوئی گود کے ساتھ وہاں آنکلتی تھی، پتہ نہیں کیوں اُس کا سر بھاری ہونے لگتا، اُسے لگتا جیسے آپی بھرے پیٹ سے اُس کے سر پہ بیٹھ گئی ہے۔ وہ فوراً سر جھٹک دینا چاہتی لیکن وہ ایسا بھی تو نہیں کر سکتی تھی —— اسی لئے ٹھہرے ہوئے اس تالاب میں کسی کا کنکر پھینکنا اُسے بالکل نہ بھاتا، آہستہ آہستہ اُس کی سہیلیوں نے اُس سے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔

جس روز بھائی کو ملازمت کی غرض سے دوسرے شہر جانا تھا اُس نے ایک مرتبہ پھر خود کو قافلے سے کٹا ہوا محسوس کیا۔ جیسے کسی سُست رفتار بحری بیڑے کے عرشے سے ساحل کی دُور ہوتی آبادیوں کا منظر۔ اُسی وقت اُس کی ضد پر آپی نے سکول کی کتابوں سے گرد ہٹا کر اُس کے سٹڈی سٹینڈ پہ رکھ دیا، جن میں میڈیکل کالجوں اور ہسپتالوں کی اُونچی اُونچی عمارتیں مسمار ہوئی پڑی تھیں۔ کسی کتاب کے درمیانی صفحہ کا کونہ مڑا تھا تو کسی کے نصف میں پنسل پڑی تھی، صحرا کے آدھے تک

ہی قافلے کے پیروں کے نشان تھے۔ پھر اس کے بعد قافلے کا کچھ پتہ نہ تھا ــــ شائد اسی لئے کبھی روز تک اُس نے آپی سے کتابیں کھولنے کا تقاضا نہ کیا اور اسی طرح انہیں واپس رکھوا دیا ــــ جب آپی اُس کی کتابیں واپس لے جارہی تھی تو اُسے اپنا آپ اُس بے بس خلا باز کی طرح لگا جو خلائی جہاز سے بچھڑ کر خلا میں قلابازیاں کھاتا رہ گیا ہو۔

بابا نہ چاہتے ہوئے بھی عُمر کے پہاڑ سے لُڑھک رہے تھے۔ شاید اسی لئے اُن سے آپی کے بالوں میں پھوٹتی چاندی کی لکیر دیکھی نہ گئی۔ اس عمر میں آپی کو پسند کا گھر ملنا اتنا آسان نہ تھا لہٰذا مجبوراً ایک جگہ آپی کا نکاح کر دیا گیا ــــ دوسری طرف بابا نے بیمار بیٹی کے علاج کے لئے اپنی تحقیق تیز کر دی، وقت جس پر اہرام مصر تعمیر کئے جا رہا تھا۔ اور جو ممی کی طرح بے حس و حرکت پڑی تھی۔ ان اہراموں پر بابا کی کوششوں کے کُدال بے سود ضربیں لگاتے رہے لیکن پتھر تھے کہ کٹتے ہی نہ تھے۔

دنیا کا شائد ہی کوئی بڑا ہسپتال ہو جہاں بابا نے اُس کی بیماری کے کاغذات نہ بھیجے تھے۔ جیسے جیسے آپی کے سسرال والے رخصتی کا تقاضا کرنے لگے، اُسے آپی بھی اس چڑیا کی مانند دکھنے لگی جس کے نئے نئے پَر اُگ آئے ہیں۔ اُنہی دنوں ٹی۔وی میں وہ پروگرام بھی شروع ہو گیا جس میں ایک ٹائم ٹنل کے ذریعے لوگ سینکڑوں سال پرانی دنیا میں چلے جاتے تھے۔ اب وہ سارا ہفتہ اُس پروگرام کے انتظار میں گزار دیتی۔

تازہ اخبار میں بھی اُس کے لئے وحشتیں لکھی ہوتیں۔ ریڈیو سُننا بھی اُس نے بند کر دیا۔ وقت کی لگام میں جُتی ہوئی ہر شے اُسے اپنے بے جان جسم پر سرپٹ دوڑتی محسوس ہوتی۔ لمحوں کی ایک ایک ٹاپ اُسے روندتی ہوئی جانے کہاں گم ہوئی جا رہی تھی۔ اُس کا جی چاہتا کہ تیز رفتار سرپھری اندھی ٹرین کی زنجیر کھینچ دے اور اس ایمرجنسی بریک سے اتنا بڑا حادثہ ہو کہ سب کے سب اُس کی گڑیا اور آپی بن جائیں۔

آخر ایک روز آسمان پر اُمیدوں کے ٹھنڈے بادل کہیں سے تیرتے ہوئے گھِر آئے جو انتظار کی دھوپ کو غٹاغٹ پی گئے۔ بابا کے چہرے پر یوں تبدیلی نمودار ہوتی جیسے کسی بے ثمر بوڑھے اور بانجھ پیڑ پر بے موسمی بُور آ جائے۔ بہت دور کسی ہسپتال سے اُڑتے ہوئے خوشخبریوں کے پرندے اُن کے گھر تک آ پہنچے۔

اب بابا آسانی سے کھائی میں لُڑھک سکتے تھے اور آپی بھاگ کر پہاڑ پر چڑھ سکتی تھی۔ مگر وہ . . . . . وہ کدھر جائے گی ــــ؟

آپی تو پانیوں کے آدھے میں تھی کنارے تک پہنچنے کا تصور کر سکتی تھی۔

لیکن وہ . . . . . . بے نشان قبر میں سے نکلی لاش کی طرح دوبارہ دنیا میں آ کر کیا کرے گی؟ اور جب اتنے سالوں بعد سٹریچر پر ڈال کر اُسے گھر سے نکالا گیا تو آسمان نے کسی بچھڑے ہوئے دوست کی طرح جھک کر اس کا ماتھا چوم لیا۔ پتہ نہیں آسمان کی آنکھ سے آنسو ٹپکا تھا کہ بادل اس کی آنکھوں میں بھر آئے تھے۔ ہر چیز دُھندلا سی گئی تھی۔ اِس وقت وہ کسی چوراہے پر ٹریفک کا اشارہ کھلنے کے انتظار میں رُکے تھے ــــ اُس کا جی چاہا کہ اشارہ کبھی نہ کھلے ــــ لیکن اگلے ہی لمحے اشارہ کھُل چکا تھا۔ دُھند گہری ہوتی گئی۔ آخری بار اُسے ایسے لگا جیسے آنکھوں کے دیئے، ریت کے ٹیلوں میں دب گئے ہوں۔

آنکھیں بند ہو چکی تھیں اور دیئے بجھ چکے تھے ــــ!

شاید اب وہ اُس زندگی سے کبھی بھی ملنا نہیں چاہتی تھی جو اُس سے بہت پہلے بچھڑ چکی تھی۔

ساجن اور سہاگن

شہزادی

میرے سامنے کی سیٹ پر ادھیڑ عمر کی ایک مدبر خاتون بیٹھی تھیں۔ بڑے کنّے کی ریشمی دھوتی ـــــ سیاہ پھولدار کرتی اور سر پر بوسکی کی بڑی سی چادر ـــــ اُن کے ماتھے پر سجدوں کا نشان اور چہرے پر ایک پُر نور تقدس تھا۔ شاید اُن کی زیادہ عمر عبادت و ریاضت میں گذری تھی۔ کانوں میں سونے کی بھاری ڈنڈیاں اور کلائیوں میں سونے کے موٹے کڑے اُن کی دولت و امارت کی داستان سنا رہے تھے۔

اُن کے ساتھ اٹھارہ انیس برس کی ایک نازک اندام، خوبصورت اور من موہنی لڑکی تھی جو شاید اُن کی بیٹی تھی۔ اور گورا چٹا خوش شکل ایک لڑکا تھا جس کی عمر زیادہ سے زیادہ نو دس برس ہوگی۔ لڑکے کے دائیں کان میں سونے کی بالی تھی۔ ان کے علاوہ چھینٹ کے کپڑوں میں ملبوس ایک عورت بھی تھی جو غالباً اُن کی ملازمہ تھی کیونکہ وہ اُن سے ذرا ہٹ کے دوسری سیٹ پر بیٹھی تھی۔ پلاسٹک کی تار سے بنی ہوئی ڈھکن دار ٹوکریوں میں انھوں نے کھانے پینے کی ڈھیر ساری الّم غلّم چیزیں بھر رکھی تھیں حتیٰ کہ آم کا اچار، روغنی نان، تلے ہوئے آملیٹ اور دیسی گھی کے پراٹھے تک اُن کے ساتھ تھے۔

گاڑی کی رفتار جب ذرا ہلکی ہونے لگتی تو اسٹیشن پر بھیڑ بھاڑ کے خیال سے وہ خاتون اپنے گھٹنے کے نیچے رکھا ہوا برقعہ نکال کر اپنے سر پر اوڑھ لیتیں۔ لڑکی احتیاط سے نقاب چہرے پر ڈال لیتی۔ لڑکا چونکہ ابھی بچہ تھا۔ وہ اسٹیشن پر متوقع چہل پہل اور رونق دیکھنے کے شوق میں کھڑکی میں جا کھڑا ہوتا۔ لڑکی فکر مند ہو کر اُسے دیکھتی اور پیار سے اُسے ڈانٹ دیتی۔ ایک بار اُس لڑکے نے کھڑکی سے سر نکال کر دیکھنا چاہا تو لڑکی نے بازو سے پکڑ کر اسے اندر کھینچ لیا۔
"باہر مت جھانکو، آنکھوں میں کوئی کنکر پڑ جائے گا۔ شریر کہیں کے ـــ!"

وہ ادھیڑ عمر خاتون بار بار لڑکے کو اپنے پاس بلاتیں۔ منہ بھر چومتیں اور لاڈ سے اپنے پاس بٹھا لیتیں لیکن بچے کی عمر کا تقاضہ تھا جو اُسے نچلا بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ وہ نٹ کھٹ لڑکا سب کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔

سفر کرتے ہوئے تقریباً دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ خاتون کو اب شاید چائے کی طلب تھی۔ کیونکہ گاڑی کی رفتار کم ہوئی تو وہ کھڑکی کے قریب سرک آئیں لیکن اُس اسٹیشن پر گاڑی رکی نہیں ـــــ بس ـــــ ذرا آہستہ ہوئی اور پلیٹ فارم عبور کر کے رفتار پھر تیز کر دی۔ میرا فلاسک گرم چائے سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے خوشبودار بھاپ اڑاتی گرم گرم چائے کا کپ اُن کو پیش کیا۔ وہ خوش ہوئیں۔ بڑی رغبت سے انھوں نے چائے پی۔ میرا جی چاہا اُس خوبصورت ساحرہ کو بھی چائے پیش کروں لیکن وہ کھڑکی سے سر ٹکائے آنکھیں بند کیے شاید سو رہی تھی۔

خاتون نے میرا نام پوچھا، میں نے بتا دیا۔ پھر میری رہائش گاہ کے متعلق اور میرے میاں کے کاروبار کے متعلق پوچھتی رہیں۔ میں نے وہ بھی بتا دیا۔

"ماشاء اللہ ـــ ماشاء اللہ ـــ" وہ بولیں۔

لیجیے صاحب ـــ ہماری اُن سے دوستی ہو گئی۔

سفر کی تکان لڑکی کے چہرے سے عیاں تھی۔ نیند سے بوجھل اُس کی بڑی بڑی غزالی آنکھوں پر پلکوں کی جھالریں سایہ فگن تھیں۔ مجھے وہ

لڑکی بہت پیاری تھی۔ خوبصورت ——— معصوم ——— اور بھولی بھالی ———

میں نے خاتون سے پوچھا "کیا یہ آپ کی بیٹی ہے ؟"

"یہ میری پوتی ہے" وہ بولیں ——— پھر انھیں احساس ہوا کہ یہ تعارف کچھ نامکمل سا ہے۔ اس لئے ذرا دم لے کر وہ بولیں "یہ میرے سب سے بڑے بیٹے کی اکلوتی اولاد ہے۔ بڑی منتوں مرادوں کے بعد یہ پیدا ہوئی۔ اب خیر سے انیسویں برس میں قدم رکھا ہے۔ ابھی تک میں اس کی منتیں اتارتی ہوں۔ سال کے سال دیگیں پکواتی ہوں۔ نیاز دلواتی ہوں۔"

"یہ لڑکا بھی آپ کا پوتا یا نواسا ہوگا" میں نے سوچا یہ ان کا بیٹا تو ہو نہیں سکتا۔

"جی ہاں ——" انھوں نے بڑے پیار سے لڑکے کو دیکھا "یہ میرا پوتا ہے۔ یہ میرے چھوٹے لڑکے کا بیٹا ہے۔"

"آپ نے اس کے کان میں سونے کی بالی کیوں پہنائی ہوئی ہے۔ ؟"

"میری چھوٹی بہو کے ہاں اوپر تلے چار بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ اتنی بڑی جائداد کا کوئی تو وارث ہوتا۔ بہت دوا دارو کئے۔ پیروں فقیروں سے دعائیں کروائیں۔ درگاہوں پر چراغ جلائے۔ اُس نیلی چھتری والے کی قدرت کے صدقے جاؤں۔ اُس نے میری مراد پوری کر دی۔ یہ ایک پوتا مجھے دے دیا۔ میں نے اس کان چھدوا کے سونے کی مُندر پہنا دی۔ اب ہر سال اس مُندر کی نیاز دلواتی ہوں۔ یہ لڑکا خیر سے بارہ برس کا ہو جائے گا تو منت پوری کروں گی۔ گاؤں بھر کی دعوت کروں گی۔ درگاہوں، خانقاہوں پر گھی کے چراغ جلاؤں گی۔"

ذرا دم لے کر وہ پھر بولیں "ہم لوگ زمیندار ہیں۔ تیس مربع زمین میرے خاوند کی ملکیت ہے۔ میرے دونوں بیٹے اب اس زمین کے مالک ہیں۔ ہمارے آم کے باغات ہیں۔ ہزاروں روپے سالانہ اُن سے آمدنی ہوتی ہے۔ ویسے میرے دونوں بیٹے دراصل پیری مریدی کرتے ہیں۔ ہماری بہت بڑی گدی ہے۔ دور دور سے لوگ فیض حاصل کرنے آتے ہیں۔ میرا چھوٹا بیٹا لنگر کا انتظام سنبھالتا ہے اور بڑا بیٹا اپنے باپ کی گدی پر بیٹھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بندہ نوازی ہے۔"

اتنے میں لڑکے کو شاید بھوک لگی۔ اس نے اپنی تایا زاد بہن کے کان میں کچھ کہا۔ لڑکی نے اپنی نیم خوابیدہ آنکھوں سے ملازمہ کی طرف دیکھا اور بولی۔ "چھوٹے شاہ ہوراں کو کھانے کے لئے کچھ دے دو۔"

ملازمہ نے پلاسٹک کی تاروں سے بنی ہوئی ٹوکری میں سے مٹھائی کا ڈبہ نکالا اور "چھوٹے شاہ ہوراں" کے آگے رکھ دیا۔

وہ خاتون بولیں "ایبٹ آباد میں ہمارے سینکڑوں مرید ہیں۔ ہمارے عقیدت مندوں میں ایک کرنل ہیں۔ اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔ کئی سال سے ان کا اصرار تھا کہ گرمیوں میں ہم ان کے ہاں جا کر رہیں۔ اُن کی بیگم جب بھی مزار پہ حاضری دینے آتی ہیں، تاکید کر کے جاتی ہیں۔ پہاڑ پر جانے کا کبھی اتفاق ہی نہیں ہوا۔ اب اس لڑکی کی وجہ سے مجھے مجبوراً جانا پڑا ہے۔"

لڑکی آنکھیں بند کئے کھڑکی سے سر ٹکائے خاموش بیٹھی تھی۔ شاید سو گئی تھی۔

"کیوں ؟" میں نے پوچھا "کیا بچی کو خدانخواستہ کوئی تکلیف ہے ؟"

"اللہ ہی جانے ——" وہ آہ بھر کے بولیں۔ "یہ لڑکی اچھی بھلی تھی۔ شوخ ایسی کہ پل بھر آرام سے نہ بیٹھا جائے ——— ہنستی کھیلتی تھی ——— خوش باش ——— سدا مسکرایا کرتی ——— گالوں پر گلاب کھلے رہتے تھے۔ اب نو سال بھر سے اسے ایسی چپ لگی ہے کہ مسکرانے کو اس کے ہونٹ ترس گئے ہیں۔"

"اوہو ——، مجھے یہ سن کر افسوس ہوا" "آپ کسی سیانے کو دکھا کر اس لڑکی کا علاج کروائیے نا ——"

"حکیم کا علاج کر لیا ہے۔ ٹونے ٹوٹکے بھی کر دیکھے۔ خود اس کے ابا سے تعویذ لینے کے لئے لوگ دور دور سے آتے ہیں۔ اسے تو میں نے

تعویذ گنڈے سب گھول گھول کر پلا دیئے ــــ"

"کسی ڈاکٹر سے مشورہ کیا ہوتا ــــ"

ہمارے اپنے قصبے کی لیڈی ڈاکٹر اچھی سیانی ہے۔ اللہ میاں نے اُس کے ہاتھ میں شفا بھی دی ہے۔ آج کل تو اس کا علاج کروا رہی ہوں۔ وہ کہتی ہے۔ بچی کو پہاڑ پر لے جایئے۔ گھمایئے ــــ پھرایئے ــــ اس کا جی بہلے گا تو خود بخود ٹھیک ہو جائے گی۔ اب اُسی کے کہنے پر اسے وہاں لئے جا رہی ہوں۔ اس کے ابا کو تو مریدوں سے فرصت نہیں۔ دن بھر لوگوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ میں اسے لئے جا رہی ہوں۔ وہاں کی آب و ہوا سے شاید ٹھیک ہو جائے۔ کرنل صاحب کو خط لکھ دیا ہے۔ پنڈی اسٹیشن پر ان کی موٹر گاڑی ہمیں لینے آ جائے گی۔"

لڑکی کی سیاہ و کنڈیالی پلکیں اُس کے سفید رخساروں پر جھکی ہوئی تھیں۔ میں نے سوچا یہ سلیپنگ بیوٹی کہیں اپنا دل تو نہیں ہار بیٹھی؟؟ اٹھارہ انیس برس کی عمر ویسے بھی خطرناک ہوتی ہے۔ اس پر یہ خوبصورتی۔ یہ حسن۔ یہ شباب ــــ دل لینے اور دل دینے کے کتنے ہی بہانے ہاتھ آتے ہیں۔ ایسے ہی کسی چکر میں یہ لڑکی بھی مبتلا ہو گئی ہوگی۔ ورنہ اسے کیا غم ہو سکتا ہے۔ یہ پندرہ مربع زمین کی اکیلی وارث ہے۔ ناز اٹھانے والی دادی۔ پیار کرنے والے ماں باپ۔ دولت تو اس کے گھر کی لونڈی ہے۔ اس کس بات کی کمی ہے۔

میرے دل میں خواہ مخواہ شوق پیدا ہوا۔ کیوں نہ اس بات کا کھوج لگاؤں !! ــــ کچھ سوچ کر میں نے پوچھا "آپ نے لڑکی کا رشتہ کہیں طے کر دیا ہے؟"

"ہاں ــــ"

یہ اتنا مختصر جواب تھا ــــ اب میں اور کیا پوچھوں ــــ !!

"کہیں اپنوں ہی میں رشتہ دیا ہوگا ــــ؟"

"ہاں۔ ہم لوگوں میں لڑکیوں کے رشتے باہر نہیں دیتے۔ اس طرح زمین اور جائداد باہر چلی جاتی ہے ــــ"

"کیا منگنی ونگنی کر دی ــــ؟"

"منگنی نہیں ــــ نکاح کر دیا ہے ــــ"

"ماشاء اللہ ــــ !!"

میں نے سوچا۔ اب اسے کس بات کا غم ہے۔ منگنی ہو گئی۔ نکاح بھی ہو چکا۔ مستقبل کے فکر سے نجات حاصل ہوئی۔ اب تو خیر سے گھر بار والی ہو گئی۔ سسرال والے بھی ایسے ہی دولت مند وڈیرے ہوں گے۔ جیسے ان کے ماں باپ ہیں۔ اور اس لڑکی کا منگیتر ہے ــــ؟ وہ یقیناً ویسا ہی ہوگا جیسی یہ خود ہے۔ خوبصورت۔ سمارٹ اور وجیہہ۔

اب رنج و غم کی پرچھائیاں اس کے چہرے پر کیوں سایہ فگن ہیں ــــ؟ اب یہ جوگ کس کی خاطر ــــ؟؟ رانی! کہیں تیرا راج کمار روٹھ تو نہیں گیا۔!!

لڑکی کی آنکھیں بند تھیں۔ پلکوں کو جنبش تک نہیں ہوئی۔ لیکن ایک ناگوار سا تاثر اُس کے چہرے پہ آیا اور غائب ہو گیا۔ پھر ماتھے پر سلوٹ ابھر آئی۔

تو ــــ یہ بات ہے۔ سلیپنگ بیوٹی درحقیقت جاگ رہی ہے ــــ !!

"رخصتی کا ارادہ کب تک ہے ــــ؟"

"رخصتی میں ابھی کافی دیر ہے ــــ لڑکا کسی قابل ہو جائے ــــ"

"کیوں ــــ کیا لڑکا ابھی زیر تعلیم ہے ــــ؟"

"زیرِ تعلیم نہیں ـــــ ابھی کمسن ہے ـــــ"

"کیا ـــــ ؟؟"

"جی ہاں ـــــ یہی تو ہے" انھوں نے سامنے بیٹھے ہوئے پوتے کی طرف اشارہ کرکے، جس کے دائیں کان میں انھوں نے سونے کی مُندری پہنائی ہوئی تھی۔

"یعنی ـــــ اتنے کمسن بچے کے ساتھ آپ نے اپنی پوتی کا نکاح کر دیا ہے ـــــ ؟"

لڑکی نے شرما کر چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔

اچھا ـــــ تو یہی تھا وہ راز ـــــ جسے وہ اپنے نہاں خانۂ دل میں چھپائے سلگ رہی تھی۔ اس راز کے افشا ہو جانے کے خوف سے وہ کسی سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکتی تھی۔ مبادا اُس کی ان خوف زدہ نگاہوں سے اُس کے دل کا بھید کوئی جان لے۔

"مجبوری تھی" یہ دادی بولی۔ "گھر میں دوسرا کوئی لڑکا نہیں تھا۔"

"خاندان میں تو کوئی اچھا لڑکا ضرور ہوگا۔"

"خاندان میں تو کئی لڑکے ہیں ـــــ ایک سے بڑھ کر ایک لائق ـــــ تعلیم یافتہ اور قابل نوجوان۔"

"بی بی۔ آپ نے اُن میں سے کسی کا انتخاب کیا ہوتا ـــــ!!"

"وہ لوگ ہمارے شریک ہیں۔ میں نے آپ کو بتایا ہے نا ـــــ یہ لڑکی پندرہ مربع زمین کی اور اپنے باپ کے حصے کی جائداد کی تنہا وارث ہے۔ یہ ساری جائداد ہمارے شریکوں کے پاس چلی جاتی ـــــ"

"لڑکی کی زندگی تو آپ نے تباہ کر دی۔"

"خدا نہ کرے۔ زندگی کی تباہی کا کیا سوال ہے۔ آٹھ دس سال کی بات ہے۔ دن گزرتے کیا دیر لگتی ہے۔ بہت دھوم دھام سے ہم اس کی رخصتی کریں گے۔ میں اس کے لئے سونے کی جھالروں والا چاندی کا چھپر کھٹ بنواؤں گی۔ لاکھوں کا جہیز اس کو دیں گے۔ اپنے چاہنے والے چچا کے گھر میں بہو بن کر جائے گی۔"

"کیا آپ نے یہ نہیں سوچا کہ اُس وقت اس لڑکی کی عمر کیا ہوگی ـــــ ؟؟"

وہ خاتون کچھ نہیں بولیں۔

"تیس سال ـــــ ؟؟ ہیں نا ـــــ ؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں ـــــ!! کمزور سی آواز میں انھوں نے اعتراف کیا۔

"جب آپ کا یہ گول مٹول پوتا نیا نیا جوان ہوگا۔ اُس وقت آپ کی یہ پوتی تیس سال کی ہو چکی ہوگی۔ چہرے پر جھریوں کا مدھم سا جال۔ ان سیاہ زلفوں میں چمکتے ہوئے بے شمار سفید بال۔ ڈھلتی جوانی۔ اور اُمنگوں سے خالی خولی دل ـــــ"

وہ چپ چاپ بیٹھی میرا منہ دیکھتی رہیں۔

"بی بی۔ یہ بے جوڑ ناتا جوڑتے ہوئے آپ نے اتنا نہیں سوچا کہ یہ گڈے اور گڑیا کا بیاہ نہیں۔ گوشت پوست سے بنے ہوئے دو انسانوں کا زندگی بھر کا ساتھ ہے۔ بی بی ـــــ یہ ساتھ کس طرح نبھے گا۔ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا۔ آپ کا یہ خوبصورت اور لاڈلا پوتا جوان ہوتا جائے گا اور غزالی آنکھوں والی اُس کی یہ بیوی بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ چکی ہوگی۔ میاں کی مسیں بھیگ رہی ہوں گی اور اس غریب کے گالوں کے گلاب مرجھا رہے ہوں گے۔ تعویذ گنڈے اور جادو ٹونے کروانے والی جوان، جوان عورتوں کے درمیان سونے کی مُندری والا یہ خوبصورت پیر زادہ، بنا

ہوا خوب خوب دادِ عیش دیا کرے گا۔ اور پندرہ مربع زمین اور آموں کے باغات کی یہ تنہا وارث سونے کے زیورات میں لدی پھندی اپنی ڈھلتی جوانی کو سہارا دیئے، چاندی کے چھپر کھٹ پر بیٹھی ہوئی چھوٹے شاہ ہوراں کا انتظار کیا کرے گی۔

یکایک مجھے وہ خاتون بہت بُری لگی ــــ چڑیل ــــ جس نے اپنی ہی پوتی کا کلیجہ نکال کر کھا لیا ہو۔ میں نے نفرت سے منہ پھیر لیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

ندی نالے ــــ لہلہاتے کھیت ــــ کھیتوں میں بل کھاتی پگڈنڈیاں اور تیزی سے پیچھے کی طرف بھاگتے خوبصورت نظاروں میں ایسی محو ہو گئی کہ مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا میری سامنے کی سیٹ پر بہت بڑی جائداد کی مالک ایک بڑی بدنصیب لڑکی بیٹھی ہے اور اُس کے قریب اس کی حریص دادی موجود ہے جس نے اپنی جیتی جاگتی لاڈلی پوتی کو روایات اور قرابت داریوں پر قربان کر دیا لیکن یہ پسند نہیں کیا کہ اس کی ایک بالشت زمین بھی اس کے کسی شریک کے پاس چلی جائے۔

بہت دیر کے بعد میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ بوڑھی خاتون ہاتھ میں پنکھا لئے اپنے سینے پر زور زور سے ہوا کر رہی تھی۔ شاید اس طرح وہ اپنے ضمیر کی آگ کی اُس تپش کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہی تھی جو اُس کا دل و جگر جھلسائے جا رہی تھی ــــ پھر میری نگاہ اُس بے زبان لڑکی پر جا رکی وہ حسن خوابیدہ اب واقعی سو چکی تھی۔ اُس کے برقعے کا سیاہ جارجٹ کا نقاب اُس کے آدھے ماتھے پر ڈھلک آیا تھا۔ نازک پتلی انگلیوں والے اس کے خوبصورت ہاتھ اُس کی گود میں رکھے تھے۔ اُس کی بھاری پلکوں کے نیچے سے پانی کی دو ننھی بوندیں جھانک رہی تھیں۔

ایک ٹھنڈی آہ میرے سینے سے اُٹھی اور ہونٹوں تک آ گئی۔ میں نے سوچا پلکوں کی جھالروں تک رُکے ہوئے یہ دو آنسو کتنے قیمتی ہیں۔ یہ اگر بہ نکلیں تو کیسی کیسی رسوائیاں ہوں، دادا کی گدی، باپ کا سنگھاسن سب ڈول جائے۔ ان آنسوؤں کے سیلاب میں سب کچھ بہہ جائے۔

بے اختیار اُس وقت میرے دل نے اُسے خاموش خراجِ عقیدت پیش کیا۔ خاوند کے ساتھ زندہ جل مرنے والی اے ستی ساوتری ــــ روایات کی صلیب پر چپ چاپ لٹک جانے والی ــــ مشرق کی عظیم عورت ــــ اے لج پال بیٹی ــــ تیری عظمت کو سلام ــــ ان آنسوؤں کو پلکوں ہی میں روکے رکھنا ــــ ان موتیوں کو بے آب نہ ہونے دینا ــــ،

چھک چھک کرتی گاڑی کی رفتار مدھم ہو رہی تھی۔

اور اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر ریڑھی میں سجی ہوئی مٹھی میٹھی گُڑیوں اور ٹافیوں کو "چھوٹے شاہ ہوری" للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

اختر حسین جعفری

ریت صحرا نہیں

ریت صحرا نہیں، ریت دریا نہیں
ریت بس ریت ہے
میں فقط نہیں، ہوں اور میری تصویر پر جو ہے مذکور
پہچان میری نہیں
مجھ میں کتنا ازل
مجھ میں کتنا ابد، کتنی تاریخ ہے
میں نہیں جانتا
ایسے دن رات کو دل نہیں مانتا، پور پر جن کی گنتی ٹھہرتی نہیں
آج بس آج ہے
کل سحر تک یہی آج تاراج ہے

(۲)

ریت صحرا نہیں، ریت دریا نہیں
ریت بس ریت ہے
چاہے مٹھی میں ہو، چاہے حلقوم میں
دن کی تقدیر میں
شب کے مقسوم میں
درد کی سطح پر، غم کے مفہوم میں
زیرِ خورشید یا یخ زدہ پانیوں کے تلے
ریت بس ریت ہے

(۳)

اے عدم کی درا★
دیر سے سُن رہا ہوں میں تیری صدا
ایک پل تو ٹھہر، اپنا چہرہ اسی سُست پڑتے ہوئے خُون
میں ڈھونڈوں
سر سے گرتے ہوئے بار سے پُوچھ لُوں
کس نے باندھا اسے؟ اور سر پر مرے کس نے
رکھا اسے؟
اس میں کیا ہے بندھا؟
ہاتھ پاؤں وہی، دھوپ چھاؤں وہی!
شہر گاؤں وہی!
میں نے دیکھا جنھیں، میں نے سوچا جنھیں، میں نے لکھا جنھیں
یا کچھ ان کے سوا
اے عدم کی درا
ایک پل تو ٹھہر
سر سے گرتے ہوئے بار سے پُوچھ لُوں

★ نظم کے مجموعی آہنگ کے تناظر میں یہاں اس فارسی علامت کے لیے صیغۂ تانیث کا استعمال زیادہ مناسب ہے — ا ج ج

محسن احسان

آسیب زدہ گھر میں

ادھر آؤ، اِدھر دیکھو
یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں دیکھو
ہوا سنسان کمروں میں
اُداسی کے دیئے دن بھر جلاتی ہے
خموشی انگلیاں چٹخا کے ہر سو دکھ بچھاتی ہے
نہ زنجیریں چھنکتی ہیں
نہ رونے کی الم انگیز آوازیں بکھرتی ہیں
نہ تصویروں کو کوئی صاف کرتا ہے
نہ شیشوں کو کوئی شفاف کرتا ہے
نہ چمگادڑ کوئی ہلچل مچاتی ہے
نہ پانی کے اُبلنے کی کوئی آواز آتی ہے
نہ کوئی چھپ کے دروازے کے پیچھے گنگناتی ہے
نہ آئینہ لرزتا ہے
نہ پرچھائیں کوئی چھت پر بلاتی ہے
مگر جب رات آتی ہے
کبھی در بولتا ہے
اور کبھی دیوار گاتی ہے
پلستر خود بخود گرتا ہے
مٹی ساتھ کرتی ہے
کبھی شعلہ لپکتا ہے
کبھی جگنو چمکتے ہیں
کبھی گھنگھرو کھنکتے ہیں
کبھی پازیب بجتی ہے
کبھی پتھر برستے ہیں
کبھی شانوں پہ کوئی ہاتھ دھرتا ہے
کبھی میزوں پہ کوئی رقص کرتا ہے
پلیٹیں کھنکھناتی ہیں
مگر کھانا نہیں آتا
کبھی اک بلب بجھتا ہے
کبھی اک بلب جلتا ہے
کبھی چھت پر کوئی رُک رُک کے چلتا ہے
کبھی بچہ بلکتا ہے
کبھی بوڑھا کوئی گھٹنوں میں سر دے کر سسکتا ہے

عجب گھمسان کا دن ہے کوئی لشکر نہیں آتا
میں شب بھر رات کے آسیب سے باہر نہیں آتا
مگر سورج نکلتا ہے تو گھر سے ڈر نہیں آتا

بلراج کومل

ہمارے شہر کا ایک آدمی

اس نے کہا تھا
بچپن کے رومان سے فارغ ہوتے ہی
وہ اپنے جینے کے
انداز بدل ڈالے گا

بچپن کے دن گزرے برسوں بیت گئے
سارے کے سارے رومان وہ بھول چکا
روز و شب وہ بازاروں اور گلیوں میں
زہر بانٹتا پھرتا ہے
شہر کے سارے
دنگوں، اغوا، ریپ، ڈکیتی، آگ زنی کی
خبروں میں
اس کا ماہر اور محفوظ بظاہر اجلا لمبا ہاتھ ہوتا ہے

جینے کے انداز، یہ سچ ہے، اس نے بدل ڈالے ہیں
چاروں طرف
اس کی لگائی
جنگل کی سی آگ پھیلتی جاتی ہے
وہ تو شاید بچ جائے گا
میں اور میرے آنگن کے
سب پودے، پتے اور پھول!
یہیں پہ جل جائیں گے
کون ہوگا سونی گلیوں میں
جس کو یاد آئیں گے

بریل

مری آنکھیں سلامت ہیں
مگر میں سینۂ قرطاس پر ابھرے ہوئے خاموش نقطوں کو
بریدہ انگلیوں کی بے نوا بیساکھیوں کے کرب سے بیدار کرنے کی
عجب کوشش میں غلطاں ہوں

کوئی مفہوم خوابیدہ ہے ان نقطوں میں، مجھ سے ماورا شاید
بصارت کی حدوں سے ماورا مبہم
اور اس کے پرفسوں اسرار کی لمبی مسافت میں
میں پیہم خوف و دہشت کے
جہنم سے گزرتا ہوں

بڑی مشکل ہے یہ تحریر، سجدہ ریز ہوتا ہوں
خدا کا شکر کرتا ہوں
کہ آنکھوں کی مجھے نعمت میسّر ہے
مگر یہ ماورائے چشم دستاویز ایسا رزم نامہ ہے
جسے بس لمس کے احساس سے، مجھ کو
بیاضِ خواب پر، مقدور کے امکان میں، پھر سے
بہ اندازِ دگر تخلیق کرنا ہے
جسے مجھ کو، فقط مجھ کو ہی پڑھنا ہے ——!
جسے مجھ کو، فقط مجھ کو سمجھنا ہے ——!

(نئی دہلی)

ادیب سہیل

عروس البلاد

جس راہ سے شہر کی گزرو گے
دیو ہیکل سا
دروازہ رستہ روکے گا
کوئی راہ بھی اس سے خالی نہیں
ہر راہ پہ ایک تماشا ہے
دیوار پہ لفظ جھگڑتے ہیں
پھر نیچے اُتر کر اپنے خوں میں نہاتے ہیں
یہ قاتل بھی مقتول بھی ہیں
اور قتل میں فخر کا پہلو ہے!
وہ دن بھی کیا بختاور تھے
جب شہر بہت آسان تھا رہنے والوں پر
ہر شام نکلتے تھے گھر سے
تو رات گئے گلگشت سے واپس آتے تھے
یہ رات گئے کی بات تو جیسے خواب ہوئی
سوتے میں کسی گولی کی صدا اسے پارہ پارہ کرتی ہے
جو، جاگتے میں ہوتے رہتے ہیں شاہراہوں، گلیاروں میں
ذرا آنکھ لگے تو نیند میں بھی وہ خونی کھیل ڈراتے ہیں
اور خواب کی اور بیداری کی
ہر حدِ فاصل ٹوٹ گئی
سورج بھی لہو سے لال ہوا
مہتاب کے دامن پر بھی لہو کے دھبے ہیں
کیا تاریکی، کیا روشنیاں

کیا خواب ہے اور کیا بیداری
پہچان ہے اس کی خونخواری
اب نیند بھی اپنی نیند نہیں
ہم نیند دوا کی سوتے ہیں
کوئی کہتا ہے "اس شہر میں دروازوں نے خوف کو جنم دیا
یہ خوف کی ایک علامت ہیں"
کوئی کہتا ہے کہ "خوف کے پیدا کردہ یہ دروازے ہیں"
کچھ کہتے ہیں "حالات کے دونوں پیدا شدہ
حالات کے دونوں جائے ہیں"
کچھ سوچتے ہیں، حالات پہ جب بس اپنا نہیں
تو کس کا ہے؟
کچھ سوچتے ہیں اور سوچتے ہی رہ جاتے ہیں
دروازہ!
خوف!
حالات!
پسِ پردہ قوت!
کس کس نے کس کو جنم دیا؟

عبد اللہ جاوید

سندھ

شاہ لطیف کے کلام کی مٹی
سائیں سچل کے
پیام کی مٹی
ہوشو شہید[1] کے
نام کی مٹی
مجھ جیسے کم نام کی مٹی

سندھ کی مٹی میری مٹی
میں اس مٹی کی خوشبو سے
اپنا من مہکاتا ہوں
اپنے تن میں، ہر بُن مُو میں
نس نس بہنے والے لہو میں
اس مٹی کو پاتا ہوں
سندھ کی مٹی رچی ہے مجھ میں
میں یہ مٹی کھاتا ہوں

سانس کے آنے جانے میں وہ
مجھ میں آتی جاتی ہے
میں اس کو اپناتا ہوں
اور وہ مجھ کو اپناتی ہے

اس میں میری ماں سوئی ہے
اس میں میرا باپ سمایا
ہے خوابیدہ اس مٹی میں
ایک میرا چھوٹا ماں جایا

اس کی گود میں سویا ہوا ہے
میرا اک ننھا سا بچہ
سندھ سے میرا سدا کا رشتہ
سندھ میرے تن من کا حصہ

سدا بہے یہ سندھو دریا
سدا رہے یہ سندھ کی مٹی
سدا جیئے یہ سندھ!

---

[1] سندھ کی فوج کا ہیرو ہوش محمد شیدی جو انگریزوں کے خلاف ڈٹ گیا تھا اور جس نے یہ مشہور فقرہ کہا تھا "سر دے دوں گا۔ سندھ نہ دوں گا۔"

احسان اکبر

ہوا سے بات کرو

کہو کہ اس کی لگائی ہوئی گرہ نہ کھلی
وہ دھول تھم نہ سکی، دل کے رُخ جو اُڑتی تھی
وہ گرد اُٹھی نہیں جو آئینوں پہ بیٹھی تھی

صبا سے بات کرو
صبا سے بات کرو، کیا سوال تھا اس کا
وصال جس کا تعین بدن سے دور ہوا
کسے پکار گیا؟

صدا سے بات کرو
یہی کہ جن کو سرِ دشت و بر پکار گیا
وہ سرکشیدہ قبائل کی سرپھری اولاد
وہ کس زمیں میں کھپی
کس فلک کا رزق ہوئی

قضا سے بات کرو
قضا سے بات مگر کیا کہ ہر قبیلۂ درد
اک ایسے جبرِ ازل یاب کا حوالہ ہے
جو پہلے دن کی گواہی سَنَد میں لاتا ہے
اگر جواب سے پھر اک سوال بنتا ہے
حیات کے لیے کیوں بابِ حرف باز رہے

بہا جہان کی ہے "لا" تو "لا" سے بات کرو
ابتدا سے بات کرو

احسن احمد اشک

تین مختصر نظمیں

(۱)

فیوجیٹو

کب آئینے میں چاند کے سنورے گی کہکشاں
پھر اک نئے افق میں نئی رات کی تلاش
انجانے ایک پارک میں لوہے کی بینچ پر
بھیگے ہوئے پھر اداس، سورج کا انتظار
ہر راستے کا موڑ نئے راستے کی سمت
طے ہو رہی ہیں پلکوں پہ خوابوں کی منزلیں
ہر خواب میں ہے ایک نئے خواب کی لگن
میرا نہ کوئی گھر ہے، نہ میرا کوئی وطن

(FUGITIVE)

(۲)

تمہارے جانے کے بعد

آئینہ گرد میں دھندلایا ہوا
پتیاں سوکھے ہوئے شجر کی
میز پر چاروں طرف بکھری ہوئی
سلوٹیں مسلی ہوئی چادر کی
ایک بے خواب شبِ غم کی گواہ
کوئی آہٹ نہ کھنک
منجمد ایک خموشی کے سوا
گھر میں اب کوئی نہیں

(۳)

ماں

سحر ہو چکی تھی
دسمبر کی سرد اور کٹیلی ہوائیں
تمہارے سرہانے کی کھڑکی کھلی تھی
اور اس نیلگوں چوکھٹے میں
بطوں کی سفید اک قطار اڑ رہی تھی
مگر تم تو ـــــ ماں! بے خبر سو رہی تھیں

(بنگلہ دیش)

اسلم انصاری

بے پایاں

(بحضورِ حافظِ شیراز)

حافظ! ترا سخن ہے ابد کی طرح عظیم
تیرا کلام گنبدِ افلاک کی طرح
تنہا، بخود گرفتہ و بے شل و بے کراں
ہر شعر تیرا آیۂ حسن و کمال ہے
ہر ابتدا میں حسن ہے ہر انتہا میں حسن
ہر مطلعِ غزل ہے طلوعِ حیاتِ نَو
ہر مقطع ہے اک اور تغزل کا پیش رو

تو شعر و انبساط کا وہ چشمۂ جمیل
امواجِ پے بہ پے کی تراوش سے جو رہے
نغمہ طراز و زمزمہ پرداز و موج زن
تو ذوقِ حسن و نغمہ و صہبا ہے سر بسر
دل تیرا مہرِ مہر رخاں سے ہے زندہ تر

اے حافظ، اے جہانِ لطافت کے رازدار!
بہرِ بہارِ ارضِ سخن، آسماں ہے تو
دنیا کے شاعروں پہ سدا حکمراں ہے تو
خواہش یہ ہے کہ ختم ہو جب دورِ آسماں
میں تیرا ہم جلیس رہوں، تیرا ہم زباں
جس طرح دو برادرِ توأم ہوں ساتھ ساتھ
پہلو میں تیرے بیٹھ کے ساغر بدست میں
جی بھر کے آبِ زندگی افروز پی سکوں
خواہش یہ ہے کہ میں بھی اسی طور جی سکوں
جیسی کہ تیری وضعِ حیات و نشاط تھی
یہ خواہشِ رفاقت و رندی و مے کشی
سرمایۂ حیات ہے میرے لیے یہی
اک آیۂ نشاط ہے میرے لیے یہی

ٹیگور
اسلم انصاری

یہی کربِ جُدائی ہے

یہی کربِ جدائی ہے جو دنیاؤں میں پھیلا ہے
وہی اس سے لانہایت صورتیں آفاق میں پیدا
یہی کربِ جدائی ہے جو شب کے گنگ لمحوں میں
ستارہ تا ستارہ دیکھتا ہے آسمانوں میں
یہی برسات کی بھیگی ہوئی تاریک تر راتوں کا نغمہ ہے
مہکتے سبزہ زاروں، سرسراتے برگ زاروں میں

یہ روز افزوں غمِ ہجراں جو گہرا ہوتا رہتا ہے
ہمارے روزمرہ رنج و غم میں خواہشوں میں اور محبت میں
ہماری راحتوں میں جو ہمیں گھر میں میسر ہوں
یہی کربِ جُدائی ہے جو مجھ شاعر کے سینے سے
پگھل کر بہ نکلتا ہے مرے نغموں کی صورت میں!

نذرانہ

میں اپنے اشکِ غم سے موتیوں کا ہار گوندھوں گا
تری گردن کی زینت کے لیے میری مقدس ماں!
ستارے روشنی کی جھانجھریں لائے ترے پاؤں سجانے کو
مگر جو ہار میں گوندھوں گا دمکے گا ترے پاکیزہ سینے پر

تجھی سے ملتی ہے دولت
تجھی سے ملتی ہے شہرت،
تو چاہے تو عطا کر دے
تو چاہے روک لے اِن کو ——
مگر میرا یہ غم تو سر بسر، اے ماں! مرا غم ہے
یہ غم جب نذر کرنے کو میں تیرے پاس آتا ہوں
صلے میں تُو عطا کرتی ہے لُطفِ بے کراں مجھ کو!

عرفانہ عزیز

مینائے تہی

دل کی مینائے تہی
سرنگوں رسمِ مناجات سے ہے
طاس فیروزہ لہو میری حکایات سے ہے
چشمِ خوں بستہ کہ مجبور روایات سے ہے
ترکِ اُلفت پہ ہے آمادہ ستم کوش حجاب
وہ نگوں سار اگر تلخیٔ حالات سے ہے
سایۂ چشم تلے درد ہے خوابیدہ ابھی
واسطہ دل کو فقط رسمِ مدارات سے ہے

سنگِ صدا

اب ثنا خوانِ لبِ دوست نہیں
گیت مرے
اب غمِ ذات ہے بادل ایسا
جو پہاڑوں سے گزرتا ہُوا پل بھر کے لیے
اُن گراں گوش در و بام پہ رُک جاتا ہے
جو تنا سا ہیں مرے سنگِ صدا سے لیکن
دلِ وحشی کی رسائی میں نہیں
ان گراں گوش در و بام کا کوئی نوحہ
میری آشفتہ نوائی میں نہیں

رحمان فراز

کبھی تم جو آنا

کبھی تم جو آنا
تو پھولوں بھرے موسموں کی نِدا بن کے آنا
کہ صحنِ چمن سُوکھے پتوں کے انبار سے اَٹ چکا ہے
درختوں کے ننگے بدن سبز پوشاک کے منتظر ہیں

کبھی تم جو آنا
تو برسات کی اوّلیں بارشوں کی گھٹا بن کے آنا
کہ موسم کی حدت نے چہروں کو جُھلسا دیا ہے
کہ مرجھائی شاخیں ہمکتی ہیں تپتے ہوئے آسماں کی طرف
کسی ابر پارے کو چھونے کی اُمید دل میں لئے

کبھی تم جو آنا
تو جلتی زمیں پر بس دُودھیا چاندنی کی طرح پاؤں دھرنا
کسی نیک خُو کی دعا بن کے ہم پر اُترنا
کہ ہم کتنی صدیوں کی محرومیوں کے سیہ جال میں جکڑے انسان
جب آسمانوں کو تکتے ہیں
تو لرزشِ لب ہمیشہ ترے واسطے ہی دعا مانگتی ہے

کبھی تم جو آنا
تو ممتا کے ہونٹوں پہ لوری کی صورت اُبھرنا
کہ ہم رتجگوں کے عذابوں میں ہیں
ہم پہ راتیں کڑی اور دن سخت ہیں
کہ ہم نقش ہیں تلخ ایام کے چوکھٹوں میں
کہ ہم صرف بے نام سی صورتیں ہیں
جو ماضی کے آئینوں میں قید ہیں

کبھی تم جو آنا
تو ہم کو رہائی دلانا

ڈاکٹر سعید اختر دُرّانی

دُکھ کا دُودھ

مَیں ہوں گوالا ، مَیں ہوں گوالا
دُکھ کے دُودھ کی دھاریں
میرے ہاتھوں جاری
ہے کوئی پینے والا ؟
دُکھ کے دُودھ کا امرت ، مورکھ
تیرے سارے سُوکھے پَودے
پھر سے کرے شاداب
تیری سوکھی دھرتی اُگلے
موتی موتی پھول چنبیلی
لعلوں لعل گُلاب
دُکھ کے رس سے سُوکھی مٹّی
ہردے کی سیراب
دُکھ کے باج ہیں نیناں اندھے
گ سُنسان
کر چھوٹیں
تر

میٹھے میٹھے ، دِھیمے دِھیمے
دُکھ کا امرت پی کر جب وہ آنکھیں موند کے کھولے
دھنک کے ساتوں رنگ دکھائے چِتر کار۱ دِدوان
دُکھ سے پھُوٹے گیان دھیان کی گنگا
دُودھ سے اس کے شوبھا گیانی۲ جلوان
مَیں ہوں گوالا ، مَیں ہوں گوالا ——
دُکھ کے دُودھ کی دھاریں
میرے ہاتھوں جاری
ہے کوئی دُودھ اَدھاری۳ ؟
مَیں ہوں گوالا ، مَیں ہوں گوالا
ہے کوئی پینے والا ؟

۱۔ مُحسن　　۳۔ غذا پانے والا

سیّد مُنیر

باقی نصف

لکھا تھا
راستوں پر لکھنے والوں نے
صفائی نصف ایماں ہے
جسے اربابِ حلّ و عقد نے پڑھ کر کہا
عُجلت ضروری ہے
کہ باقی نصف کے بارے میں بھی
کچھ فیصلہ کر دیں
خلا بھر دیں
نہیں تو
بے ادب،
خود سوچنے والے
غمِ انساں کے متوالے،
اِسے
اُلفت سے بھر دیں گے!

افسر رشیدی

چھلنی

چاہے بادل برسیں
صحرا پھر صحرا ہے
قطرہ قطرہ
توبہ توبہ!
اس کی چھاتی آگ ہے
سارا پانی پی جائے گی
چھلنی نہیں بھرے گی

وزیر علی بابو

ویٹو پاور

مرے سب خواب بے تعبیر ہیں اور خواہشیں ویٹو
میں فرسودہ اصولوں اور پرانے راستوں پر
چل نہیں سکتا
نئے خوابوں، نئے رستوں پہ پہرے ہیں
پرانے راستے محدود رستے ہیں
تعین یافتہ رستوں پہ میں چل ہی نہیں سکتا
مجھے رستہ بنانا ہے
نیا رستہ بنانا ہے

بڑے جلسے میں جانا بھی مجھے اچھا نہیں لگتا
بڑا کمرہ ــــ جہاں پر فاختہ مظلوم ہے، ویٹو کے
پنجے میں دبی ہے، پھڑپھڑاتی ہے
جہاں پر باز، کرگس اور کوّے حکم دیتے ہیں
جہاں زیتون کی حرمت سمجھتا ہی نہیں کوئی
جہاں چڑیاں ــــ سبھی مظلوم چڑیاں شانتی پانے کو
جاتی ہیں
تپسیا، بازی کرتی ہیں، جاں بخشی کراتی ہیں
وہیں کشمیر کے اور قبلہ اوّل کے وارث، کتنے برسوں
سے جبیں سائی کی حالت میں ہیں
اور سارے نمائندے وہاں سے تمغۂ تذلیل پاتے ہیں
مجھے ایسی مہذب قتل گہ سے خوف آتا ہے
مجھے واں پر نہیں جانا
میں جاؤں تو مری تجویز پر، تحریک پر، آواز پر ویٹو
کا ٹھپّہ ثبت ہوتا ہے
میں خود اپنا نمائندہ نہیں رہتا
سو میں زندہ نہیں رہتا
مجھے ویٹو سے خوف آتا ہے
ڈرتا ہوں کہ سانسیں بھی مری ویٹو نہ ہو جائیں
میں اکثر مشقِ حبسِ دم کیا کرتا ہوں اس ڈر سے!

زمان ملک

نظم

ہزار دن
تجھ سے دُور گزرے
ہزار ہا میل دُور دُنیا
وسیع تر تھی، حسین تر تھی
ہرے سمندر کے زمزمے تھے
زمیں سمندر کے شانے پر
سر رکھے کسی سوچ میں گڑی تھی
ہوا کے سینے میں ناریل تیرتے
کبھی نیلا آسماں
جُھک کے، کان میں
تیری بات کہتا
شریر بادل
ہزار شکلوں کا روپ دھارے
سمندروں کے پرے کنارے
تک اُڑتا جاتا
تو میری آنکھوں کے سیپ میں
آنسوؤں کے موتی چمکنے لگتے

اندھیری راتوں میں
کوئی روشن ستارہ
جب بھی مجھے بلاتا
تو نام تیرا پکارتا تھا

مگر یہ سب چیزیں
بکھری بکھری دکھائی دیتیں
انھیں میں جب خواب میں رلاتا
تو ہُو بہو تیری شکل بنتی

شاہین مفتی

یارِ مہرباں کو سلام

یہ میرے ہاتھ پہ قاصد نے کس کا خطہ رکھا
نہ کوئی نام، نہ اِس پر کسی گلی کا پتہ
نہ جانے کون سی بارش نے دھو دیا ہے اِسے
بس ایک بحرِ معانی، جو ورقِ سادہ کی
سیاہ آنکھ سے بین السطور بہتا ہے
زباں سے چپ ہے مگر دل کی بات کہتا ہے
تمام حرف سلامت رہیں، قیامت تک
خدا دراز کرے عمر لکھنے والے کی
قلم اُٹھا بھی دیا اور وَرق اُڑا بھی دیا
کہ چشمِ گریہ اب اس کا جواب لکھتی ہے
سلام پہنچے مرا، یارِ مہرباں کو سلام!

اپنے لئے ایک نظم

آنکھوں میں سُلگتا ہے اک لمحۂ گُم گشتہ
باندھی ہوئی آنچل سے جیون کی کمائی ہے
اور ہاتھ پہ روشن ہے اک ٹوٹا ہوا تارہ
لپٹی ہوئی پَیروں سے زنجیرِ عزاداری
ہونٹوں پہ مچلتا ہے، ایک نعرۂ مستانہ
اور ماتھے پہ لکھی ہے تعزیرِ وفاداری

مخلوق کے ہاتھوں کی طرف دیکھنا کیا ہے
بر دستِ دعا اب کے یہاں سنگ نما ہے
مقتل کی طرف دیکھ کہ وہ کیسے سجا ہے
میثاقِ محبت کے ہوں اوراق سلامت
یہ رسم سلامت ہے تو عشاق سلامت

شاہین مفتی

ایک بے عنوان سی نظم

اگرچہ اُس سے شرفِ ہمکلامی تو نہیں لیکن
سبھی تیور بتاتے ہیں
ہوائے ناشناساں کوچۂ بے گانگی سے ہو کے آئی ہے
بدن جُھلسائے دیتی ہے
ہمارے اور اس کے درمیاں بھی ایک رشتہ ہے
مگر اس بے گماں رشتے کو ہم معنی نہیں دیں گے
سُنا ہے اِن دنوں دریا ہماری سرحدوں سے دُور بہتا ہے
نہایت تشنگی ہے
نہایت تشنگی ہے اور موسم کا یہ کہنا ہے
سرِ ساحل، شبِ وعدہ، امیرِ بحر نے یہ حرف لکھے ہیں
کہ ہم صحرا نشینوں کو کبھی، پانی نہیں دیں گے
ہمارے دُشمنِ جاں کو نویدِ جانفزا دے دو
ہم اپنی پیاس اور صحرا اُسی کے نام کرتے ہیں
اور اپنی تشنگی کو آج سے پرنام کرتے ہیں

آہٹوں کے درمیاں

شہرِ جاں سے ایک اِک کر کے سبھی رُخصت ہوئے
اور صحرائے جنوں، دہلیزِ دل تک آ گیا
کون تھا جو اِس کا رستہ روکتا؟
(بارشیں ایسی زمینوں پر قدم رکھتی نہیں)
اب سوادِ وقت کے اُس پار بھی کیا دیکھنا!
آنکھ پر ضعفِ بصارت قرض ہے!!
اور ہوائے نیم شب مہتاب سے کہتی ہے یہ
منتشر ہونے کا موسم رائیگاں جاتا نہیں
(یہ بساطِ آسماں بھی اِک پہر کی بات ہے)

امجد اسلام امجد

ہم کو ہے تیری نظر میں رہنا

خواب بھی ایک مسافر کی طرح ہوتے ہیں
چشم در چشم سدا ان کو سفر میں رہنا
رنگ کی موج میں، خوشبو کے اثر میں رہنا
ان کی عادت ہی نہیں
ایک جگہ پر رُکنا
ان کی قسمت ہی نہیں
ایک نگر میں رہنا

ہم بھی اِک خواب ہیں، اے جان! تری آنکھوں میں
چند لمحوں کو جو ٹھہریں تو ہمیں
اپنی پلکوں کی اماں میں رکھنا
سایۂ ابرِ توجہ کے گماں میں رکھنا

دھیان کے طاق سے ہم کو نہ ہٹانا، جب تک
رات کے بام پہ تاروں کے دیے جلتے رہیں
دیکھنا ہم کو، ہمیں دیکھتے جانا، جب تک
ہم تری آنکھ کی وادی میں سفر کرتے رہیں

خواب کا شوق یہی، خواب کی قسمت بھی یہی
رنگ کی موج میں، خوشبو کے اثر میں رہنا
ہم مگر خواب ہیں کچھ اور طرح کے، جاناں!
نہ کوئی شوقِ سفر ہے نہ تلاشِ خوشبو
تیری آنکھوں میں جلیں اور انہی میں بُجھ جائیں
چشم در چشم نہیں ہم کو سفر میں رہنا
ہم کو ہے تیری نظر میں رہنا

امجد اسلام امجد

ستارے ٹوٹ کر جاتے کہاں ہیں

ستارے ٹوٹ کر جاتے کہاں ہیں -!
فلک کی شاخ سے جھڑتے ہوئے یہ اطلسی پتے
زمیں کی سمت آتے ہیں
تو ان کی آخری سانسیں دمکتی اور چمکتی روشنی
کے لہریوں کی شکل چلتی ہیں

بظاہر ایسا لگتا ہے، وہاں، بستی کے اُس جانب
کسی جنگل کی وسعت میں
کسی پربت کے سینے پر
گرا ہوگا کہیں ملبہ
اُسی خوش رنگ تارے کا
جو اب سے ثانیہ بھر قبل روشن تھا
چمکتا تھا، دمکتا تھا، فلک پر جگمگاتا تھا
(مگر اب اس کے ہونے کا نشاں تک بھی نہیں ملتا)
نظر حیران ہوتی ہے
کہ جو کوندا سا لپکا تھا، اُسے اب کس طرح ڈھونڈے
کہاں ڈھونڈے!

خلا اندر خلا اک خامشی ہے اور دہشت ہے
ستاروں کی گزرگاہوں میں بس وحشت ہی وحشت ہے
نظر کے واہمے ہیں یا گماں ہیں
کچھ نہیں کھلتا!
ستارے ٹوٹ کر جاتے کہاں ہیں
کچھ نہیں کھلتا!

میں گیا تھا اُس گلی میں کئی خواہشیں پہن کر

میں گیا تھا اُس گلی میں کئی خواہشیں پہن کر
وہ جو تھیں بہت شناسا
اُنہی کھڑکیوں کی جانب
کسی رُخ کی روشنی سے نہ کوئی چراغ لرزا
نہ ہوا کی دستکوں سے کوئی پردا سرسرایا
کسی خواب سے اُلجھ کر نہ تو چوڑیاں ہی چھنکیں
نہ کوئی ستارا چمکا نہ ہی پھول کوئی آیا
دلِ منتظر کی جانب
نہ اُٹھائی کوئی چلمن کسی دستِ پُرحنا نے
کسی آنکھ میں سمٹ کر نہ ہی چاند مسکرایا
میں گیا تھا اُس گلی میں
کئی خواہشیں پہن کر -!!

خالد احمد

دستخط کرنے سے پہلے سوچ لو

دستخط کرنے سے پہلے سوچ لو!
مُنہ سے نکلی بات، روٹھا یار، بچپن کی حدوں میں
آنکھ سے ٹپکا ہوا معصوم آنسو،
ہاتھ سے پھسلی ہوئی فائل، کبھی لوٹے نہیں!

سر پہ سُورج، زیرِ پا ریگِ سیہ تقدیر کی تپتی چمک
قیمتی کاروں کے تلوے چاٹتی ہموار قالینی سڑک
دیکھ لے ٹکسال سے نکلے ہوئے سکّے کی چمکیلی کھنک!
کان آنکھوں کی طرح حیران ہیں
کھڑکیاں خاموش، دہرے راستے سنسان ہیں

دن کے ڈھائی بج گئے
ایک زنائے کا سناٹا ہوا
تن بدن میں سوئیاں چبھنے لگیں
ایک نامعلوم اندیشہ رگ و پے میں سرایت کر گیا
کیا خبر، اگلی گھڑی کیا حکم ہو
کیا عجب، صاحب کوئی فائل نکالیں اور
کچھ رُکنا پڑے

دن، دہکتا گھومتا دن، دفتروں کے در پہ آکر رُک گیا
ایسا لگتا تھا، اس آبادی کی بربادی ہوئے، مدت ہوئی

پھر نہ جانے کیا ہوا
ایک ہلکم مچ گئی
تن بدن میں سنسنی سی بھر گئی
دفتروں کے بند دروازے کھلے
پاگرفتہ پیڑ کی چھاؤں میں لُو چلنے لگی

فائلوں کا پیٹ بھرنا کس قدر دشوار ہے
سرد خانوں میں سنبھالو، زندہ لاشوں کی پرانی، کرم خوردہ فائلیں

یہ ہمارا رزق ہیں، یہ فائلیں گل سڑ گئیں تو
زندہ لاشیں دفن کر دی جائیں گی

یہ ہمارا رزق ہیں
زندہ لاشیں دفتروں کی کھڑکیوں پر دستکیں دینے کو
گھر سے چل پڑی ہوں گی، چلو دفتر چلیں

دن نکل آیا، چلو دفتر چلیں
برکا سودا، دیگچی کے دودھ کی مانند ہے
سر پہ سورج رکھ کے پھرنا، دیگچی چولہے پہ دھرنا
اور اپنی دُھن میں سب کچھ
بھول جانا، ایک جیسے ظلم ہیں

گرمیٔ بازار تن پگھلا نہ دے
گرم لُو سے جسم کانسی کے اکہرے بینگ گھڑوں کی
طرح تپنے لگے
قیمتیں پارے کی صورت چڑھ گئیں
پارہ چڑھتی قیمتوں کا ساتھ کب دے پائے گا
کپکپاتا، ہانپتا اک آنچ میں، اک آن میں اُڑ جائے گا!

سر جُھلس کر رہ گیا
دن اُبل کر بہہ گیا
دن ادھکتا کھولتا دن، دفتروں کے در پہ آ کر
رُک گیا
دستخط کرنے سے پہلے سوچ لو!
مُنہ سے نکلی باتیں، روٹھے یار، بچپن کی حدوں میں
آنکھ سے ٹپکے ہوئے معصوم آنسو
زندہ لاشوں کی پرانی، کرم خوردہ فائلیں
آج تک کوئی کبھی لوٹا نہیں!

ظفر منصور

ابھی سورج نہیں نکلا

شبِ دیجور کی جانے سحر کب ہو
شبِ دیجور، تنہائی، سفر
خزانے پر ابھی تک سانپ کا پہرہ ہے اور
سورج نہیں نکلا

ابھی سورج نہیں نکلا
زمیں پاؤں پکڑتی ہے
ہوا آواز دیتی ہے
(پرندے گھونسلوں میں لوٹ کر آئے نہیں اب تک)
دعا بے سمت رستوں پر سفر میں ہے
ہمارے گھر خطر میں ہیں، ہمارے سر خطر میں ہیں
شبِ دیجور کی جانے سحر کب ہو
شبِ دیجور، تنہائی، سفر
ابھی تک اندمالِ آبلہ پائی کی کچھ صورت نہیں نکلی
کوئی جگنو، کوئی تارا، کوئی زادِ سفر
ہمیں زادِ سفر کے طور پر کچھ خواب ہی دے دو
ہماری بے اماں آنکھوں کو بھی کچھ خواب دے دو
ہماری بے اماں آنکھیں ابھی تک
تمہارے پاؤں کے نیچے سسکتی چیختی زیتون کی ڈالی کا
نوحہ ہیں

گواہی چاہتے ہو
گواہی چاہتے ہو تو گواہی کیلئے پوچھو
ہمارے پاؤں کے نیچے بلکتی خاک سے
جس نے ہمارا خون پہنا
کہ ہم نے اپنے خوں سے اس زمیں کی بیکسی کا نوحہ لکھا
گواہی چاہتے ہو تو گواہی کے لئے پوچھو
ہمارے چاکِ داماں سے
کہ ہم نے زخم کھائے
مگر ان کالے ہاتھوں پر کبھی بیعت نہ کی
شبِ دیجور کی جانے سحر کب ہو
شبِ دیجور، تنہائی، سفر
ہمیں زادِ سفر کے طور پر کچھ خواب ہی دے دو
ہماری بے اماں آنکھوں کو بھی کچھ خواب دے دو
شبِ دیجور ہے، تنہائی ہے، سورج نہیں نکلا
ابھی سورج نہیں نکلا ——— !

محمود علی محمود

مجھے قرضے چکانے ہیں

مری ماں کتنی بھولی ہے
محلے کے فساد آمادہ لڑکوں سے ڈراتی ہے
وہ کہتی ہے کہ :
"بیٹا! تو بھی آبا کی طرح افلاس زادہ ہے
انھوں نے جیسے تیسے زندگی کاٹی ہے — تو بھی دن
گذار اپنے
وگرنہ تیری تو کوئی ضمانت بھی نہیں دیگا"
میں چپ رہتا ہوں، لیکن دل میں، مَیں نے سوچ رکھا ہے
کہ میں پیاسا رہوں گا، بھوک کاٹوں گا مگر اپنے گھرانے
کے لیے قوت سمیٹوں گا
اگر اس ضمن میں مجھ کو
توانائی کے جوہر کیلیے افلاک تک جانا پڑا اور راستے میں
دلدلی رستے پڑے
پھر بھی
اس اندھی دوڑ میں، آگے نکلنے کے لیے میں جسم و جاں
کی ساری پونجی خرچ کر دونگا
مجھے آبا کے کاندھوں پر لدے قرضے چکانے ہیں
بڑے — قرضے
چکانے ہیں

مٹی — بالو

پھر بھی
ترے کہنے کے مطابق
یہ ریسرچ گہیں، یہ آبزرویٹری
خوشحالی کے دور، ترقی کی راہوں کو کھوج رہی ہیں
لیکن — یار! ان درس گھوں اور بلند اقبال مناروں
ان میناروں کو کس کا جذبہ اور قوت، یک جان و یک جا
رکھتا ہے
— مٹی ہی — وہ جذبہ اور قوت ہے
جو — انساں کے خمیر میں بھی اک اہم عنصر کی صورت زندہ رہ کر
خیر کی منزل کی جانب انسانی ضمیر کی راہ نما ہوتی ہے
کونپل کونپل شبنم میں ہر اُجلی کرن سوتی ہے
لیکن جب ابلیسِ آتش، ہوس ملک کے ساتھ، ریسرچ گھوں
سے اٹھ کر
اس عنصر پر شب خوں مارتا ہے تو —————
دھواں - دھماں - دھماکے
رہ جاتے ہیں!
باقی - سب کچھ "بالو"
ہو جاتا ہے ..... !!

ناہید قاسمی

ایک سوال

یہ کیسے دن ہیں دھواں دھواں سے!
کہ میری ہر سوچ تیرگی میں بھٹک رہی ہے
رفاقتوں پر بھی شک سا ہوتا ہے
اور بنجر زمین جس پر کھڑی ہوئی ہوں، تپی ہوئی ہے
میں ایک حصہ ہوں کیسے بے سمت کارواں کا!
میں کیسی ناپاکیوں کی لُو میں جھُلس رہی ہوں!
میں کیسے انصاف کُش زمانے میں جی رہی ہوں!
کہ میری پاکیزگی پہ الزام لگ رہے ہیں
وہ خواب میرے
جو غنچہ غنچہ چٹک رہے تھے
انہی پہ گولی چلائے جانے کا حکم ہونے لگا ہے جاری

میں کیا کروں، میرے قائدِ ذی وقار!
میں کس کے در پہ جاؤں؟
کہ راستے گُم ہوئے ہیں سارے
وہ میری آنکھوں میں سُوئیاں گاڑنے لگے ہیں
لہو لہو ہو گیا ہے دامن
تمام افکار ریت سے بھر گئے ہیں میرے
میں آنے والے حسیں دِنوں کی جمیل کونپل کہاں چھپاؤں؟
سنہرے خوابوں کا کھیت اب کس جگہ اُگاؤں؟

تصدق شعار

تلاش

کوئی ایسا نہیں ملتا
تہی داماں کو میرے جو متاعِ بے بہا سمجھے
سکوتِ لب کو حکمِ آخری کی منزلت بخشے
مرے بحرِ گماں کی وسعتوں کا جو شناور ہو
مرے اطوار کو مجھ سے فزوں جانے
مری آہٹ کو پہچانے
مری تحقیق میں ہر دم رہے غلطاں
خطا کو وصف کے پلڑے میں جو ڈالے
مرے ہر ہر نفس کی آمد و شد کی خبر رکھے
تمازت میں جو میرے سر پہ تن جائے
مرے دوزخ کا اپنی خُلد کے بدلے کرے سودا
مری خاطر اجل کے سامنے میری قبا پہنے
مرے اشکوں سے اپنے عارضِ گلرنگ دہکائے
مری یادوں کو جو چُومے
میں بے تاثیر بھی بولوں تو وہ جھُومے
مری پستی کو سرفراز رکھے اپنی رفعت پر
مری کج صورتی پر اپنی زیبائی فدا کر دے
جو مجھ پر زندگی کے قرض باقی ہوں، ادا کر دے

عکسِ ماہِ نو

اسے اک فرض یہ سونپا گیا ہے
وہ ہلالِ عید کی ساری حقیقت سے
عوام الناس کو آگاہ رکھے
اور بتلائے کہ ان کی عید کب ہو گی
ذرا پہلے ہلالِ عید کے روپوش ہونے کا فسانہ
اس نے اپنی محکمانہ مُسکراہٹ سے
رقم کردہ کسی قرطاس سے پڑھ کر سنایا تھا
مگر میں کس طرح یہ مان لوں
سکرین سے میرے تخیل کے اُفق پر
عکسِ ماہِ نَو
فرازِ شام سے اب تک
ہزاروں بار اُترا ہے

ایوب خاور

مرے دشمن، مجھے تجھ سے محبت ہے

مرے دشمن!
میں جینا چاہتا ہوں
ترے ہونٹوں میں مگر یہ تازہ کلیوں کا مہکتا
شبنمی جادو کچھ ایسا ہے کہ جس نے مجھ کو
اپنے لمس کی گرہوں میں کس کر باندھ رکھا ہے
گلِ رخسار کا آتش صفت رنگِ تکلّم
اور نزاکت کی سنہری ڈوریوں میں جو تلاطم
خیز یاں ہیں، میرے سینے کی کسی محراب
کے اندر دھڑکتے دل کی سطحِ غم نما کی سمت
لپکے آرہے ہیں، آتی جاتی سانس کی لہریں
تک اس آتش نمائی میں سلگ کر
ٹوٹی جاتی ہیں
نظر کے زاویوں میں
کوئی گہری بات کرنے، اور پھر اُسکو پرکھنے کے
لئے ہاتھوں کی پوروں میں کوئی معلوم حدت
منتقل کرنے، پھر اُس حدت کی شدت
کو رگوں میں جذب کر دینے
میں جو تجھ کو مہارت ہے، قیامت ہے

مرے دشمن!
میں تجھ سے اور ترے لشکر سے بچ کر کس طرف نکلوں
کہیں پر تیری پلکیں خیمہ زن ہیں
اور کہیں زلفوں کے سائے ہیں
نظر کے زاویئے خنجر بکف پہرے پہ فائز ہیں
گلِ رخسار کی آتش صفت رعنائی اپنے تیر و ترکش
سے مزیّن ہے
کہیں ہونٹوں کی شمعیں ہیں
کہیں آنکھیں ہیں، بے حد خوبصورت اور گہری
اک طلسمِ خاص میں ڈوبی ہوئی آنکھیں
یہ آنکھیں ایک ریشم کی طرح
میری انا کی سخت جاں دیوار کو اندر سے، باہر سے
پیٹتی جا رہی ہیں اور مجھے لگتا ہے، ذرہ ذرہ کر کے
یہ حصارِ ذات اب مسمار ہونے سے کہیں
بھی بچ نہیں سکتا

مرے دشمن !
بہت گہرے اندھیرے میں کوئی سالارِ لشکر
جس طرح اپنے پیادوں سے بچھڑتا ہے
اچانک خود کو اُس سالار کی صورت
اکیلا اور بکھرتا دیکھ کر میں اپنے تیر و ترکش و خنجر
گنوا بیٹھا ہوں' اب تو ہی بتا مجھ کو میں تجھ سے
اور ترے لشکر سے بچ کر کس طرف نکلوں !
چلو ہتھیار پھینکیں
اپنے لشکر سے کہیں سب اپنی زرہیں کھول کر رکھ دیں
میں اک ہارے ہوئے لشکر کی جانب سے
انا کی کرچیاں تھامے ترے خیمے میں آیا ہوں
مرے دشمن !
غرورِ فتح سے چمکا ہوا ماتھا اٹھا
میں اِس بھرے دربار میں
اپنی شکستِ فاش کو تسلیم کرتا ہوں

ایوب خاور

ایک تھکا ہوا سوال

ذرا اس نظم کے زینے اتر کر
میرے اندر جھانک کر دیکھو
متاعِ شہرِ جاں گر تم نہیں تو کون ہے آخر!
کہ جب تم شبنمیں لہجے میں مجھ سے بات کرتے ہو
تو لگتا ہے کہ جیسے تم مرے دل کو رفو کرتے ہو
خوابِ تازہ کی صورت مرے پندار کے ہر تار کو
رنگِ سخن سے مُشکبو کرتے ہو، میرے دل کی
رگ رگ سے امڈتی دھڑکنوں میں ڈوب کر،
میرے لبوں کے لمس میں گوندھے ہوئے نم سے
وضو کرتے ہو جانِ جاں! یہ آخر تم نہیں تو
کون ہے؟ —— تم ہو
مجھے آنچل کی خوشبو اور ہاتھوں کی سبک پوروں
کی حدت میں اور اپنی ساحر آنکھوں کی سبک انداز
جھیلوں میں ڈبونے والے آخر تم نہیں تو کون ہے !
تم ہو ——
ذرا اس نظم کے زینے اتر کر میرے اندر
اپنے اندر جھانک کر دیکھو
کہاں میں ہوں، کہاں تم ہو!
اور اتنے فاصلے پر ساکت و جامد کھڑے کیوں اتنے گم سم ہو!
یہ کیا تم ہو !!

ثمینہ راجہ

ہست و نیست

صنوبر کے درختوں میں
ہوا کا راستہ
گہری محبت کی طرح روشن
علم رات نے
اپنے گھنے گیسو بکھیرے
اور ان پر چاند اٹکایا
بہت دُوری سے پاس آتا ہُوا
اک سرمئی رستہ
تصوّر میں
حقیقت کی طرح
بڑی لمبی مسافت پر
بڑی لمبی مسافت پر
کوئی لمحہ
مرے ہونے نہ ہونے پر
دلالت کا
صنوبر کے درختوں میں پرندے
سو رہے ہیں
اور ابھی نکلا نہیں ہے
صبح کا تارا

تم کب میرے اپنے تھے

بادل!
تم کب میرے تھے
اک پل کی چھاؤں ہے تمہاری
اک پل کی برسات
من بھیگے، تن جلتا جائے
تن بھیگے، من راکھ
بادل! اپنا زور نہیں کچھ
تم پر اور اس ہستی پر
جاؤ تم دریا پر برسو
مت برسو اس بستی پر
تم درویش کی چادر ہوتے
آدھی اوڑھی
آدھی بچھائی، پھر بھی پوری!
تم کشکول فقیر کا ہوتے
جس میں مانگنا
اس میں کھانا، راضی رہنا!
تم تو مگر کفن ہی نکلے
اک مفلس کا
پاؤں ڈھکو تو سر ننگا ہو
سر ڈھانپو تو پاؤں
عمروں جتنی لمبی دھوپ
اور بس اک پل کی چھاؤں

ثمینہ راجہ

پیا باج پیالہ پیا جائے ناں

مجھے ایسی دُوری کی عادت نہیں تھی
کہ جو زندگی کی رگوں سے
جواں خون کی آخری بوند تک کھینچ لے
جسم کا کھیت بنجر کرے
اس لیے جب سے تُو اس سفر پر گیا
میں نے آئینہ دیکھا نہیں
ساری دنیا سے اور آسماں تک سے
پردا کیا
میں نے سردی میں، دھوپ اور گرمی میں
سائے کی پروا نہ کی
زندگی کو نہ سمجھا کبھی زندگی
عادتاً سانس لی
بھوک تو مر گئی تھی جدائی کی پہلی ہی ساعت میں
لیکن ابھی پیاس باقی ہے
اور ایسی ظالم کہ میرے بدن پر
ببول اُگ رہے ہیں
زباں پر بھی کانٹے پڑے ہیں
مجھے ایسی دُوری کی عادت نہیں ہے
کہ جو موت اور زندگی میں کوئی فرق رہنے نہ دے
پھر بھی یہ جان لے
گر مجھے چشمۂ آبِ حیواں بھی مل جائے
اک بوند
تیرے بنا مجھ پہ جائز نہیں

غم کی پہلی بہار میں

وہ جو غم کی پہلی بہار میں بنے آشنا
انہیں کوئی غم کا سندیس بھیج کے دیکھیے
انہیں پوچھیے
کہ نگاہِ وصل شناس میں کوئی اور ہے
جو ستارہ وار بُلا رہا ہے کسی طرف
کہ یہ اپنی ذات سے کشمکش کی دلیل ہے

کوئی کیا کہے کہ نئے جہان کی
آرزو کے طلسم سے ہے زبان گنگ
کوئی سُنے بھی تو کیا سُنے
کہ بلا کا شور اُمڈ رہا ہے
فصیلِ شہرِ خیال سے

یہ جو حدِ شہرِ خیال ہے یہ جنوں کے گرد
خرد کی ایک فصیل ہے
یہ دلیل ہے کہ وہ اپنی ذات
کے عشق میں رہے سرگراں

انہیں کوئی نامۂ عشق بھیج کے دیکھیے
کہ اِدھر بھی ایک ستارہ ہے
جو نئے جہاں کی سبیل ہے —
انہیں ڈھونڈیے
وہ جو غم کی پہلی بہار میں
بنے آشنا

رخسانہ شمیم

اٹلانٹک نے کیا لکھا ہے

کانچ کے ٹکڑوں کے مانند
کروٹیں لیتا ہوا، نیلا سمندر
مست خوشبو کی پھواروں میں بسی چنچل ہوا
جیسے آنے والی شام بھی صبحِ ازل کی شام ہو
گُل بدن سی چل پری کے جسم کی خوشبو لیے بادِ نسیم
ریشمی دھندلی پھواروں کے لبادے اوڑھ کر
اور سمندر کی مہک میں ڈوبے پیراہن لپیٹے
شوخ بچے کے شریر انداز میں
بال میرے منتشر کرتی ہوئی

کروٹیں لیتا ہوا، نیلا سمندر
آسماں کی کھوج میں سیماب پا
لہریں انتھک سی کسی جنبش میں ہیں
یوں کہ جیسے
"بیتھوون" کی طویل اک سمفنی
زیر و بم، اور حسنِ کامل کی نزاکت کو پہنچ کر گونجتی ہے
دھیرے دھیرے، ہولے ہولے مرتعش ہے
وقت بھی صبحِ ازل سے کچھ مشابہ ہو چلا ہے
آنکھ موندے، اک تسلسل سے یہ دُھن سنئے تو اک
احساس ایسا جاگتا ہے
جس طرح روح و بدن اک وجد میں ہیں

ذات کی انجانی، نامعلوم پرتیں کھل رہی ہیں
ہے عجب ردِ عمل جاری و ساری
دو عناصر کا جہاں سنجوگ ہے
(ریت اور پانی کا سنگم)
چکنے چکنے ساحلوں کی ریت پر
موج کے جھاگوں سے پیہم
نقش بنتے ہیں بگڑنے کے لیے
میرے تن کی ساری پرتیں اِس عمل، ردِ عمل کی
اک اکائی بن گئی ہے
میرے تن کے سب عناصر ریت اور پانی کی
اس گنجان حرکت میں کہیں
ضم ہو گئے ہیں
ساحلوں کی ریت پر
لہروں کے خامے
اور جھاگوں کی سیاہی سے لکھا
نیلی نیلے سمندر نے کوئی
پیغام ہے
اک نام ہے
زیست کا انجام ہے

(یہ نظم سویڈن، اسٹاک ہوم میں لکھی گئی)

رخسانہ شمیم

وصل

وصل، جیسے زرد پتے
خاک کے بستر پہ لیٹے
دھند کی چادر لپیٹے
سوچتے ہیں
کوئی دستِ معجزہ
ان کے سوکھے ڈنٹھلوں کو
پیڑ کی شاخوں سے پھر
پیوست کر دے!

ریت گھڑی

نسل جب اک ختم ہو گی
دُوسری آ جائے گی
زندگی کا دور بھی تو وقت کے ہاتھوں میں
گویا اِک گھڑی ہے ریت کی
اس کا بالائی سرا، جب ریت سے خالی ہوا تو
پھر گھما دی جائے گی

ہیونشر (جرمنی)

منصورہ احمد

جلسۂ عام

سروں کا ایک سیلِ بے کراں ہے
سروں کے نیچے جتنے جسم ہیں، بے اسم ہیں
جتنے بھی چہرے ہیں
سبھی پہچان اپنے گھر کی دہلیزوں کے اندر چھوڑ آتے ہیں
یہ سب آقاؤں کے اہرام کی زینت بڑھانے کے لیے
آواز کی لاشیں اُٹھائے، مصر کے بازار آئے ہیں
یہ بیلٹ باکس کی محبوس دنیاؤں کے قیدی ہیں
جو دو وقتوں کی بنجر بھوک مٹنے کے دلاسوں کے عوض
اپنی بھی سانسیں
چمکتی گاڑیوں کے ٹائروں کی دُھول میں
سستی سڑاندی سبزیوں کی چھابڑی میں
اور شفاخانوں کے جرثومے اُگلتے بستروں میں
رہن رکھ آئے

بھرے پنڈال میں اُڑتے ہوئے رنگیں غبارے
اور نعرے ہیں
مقرر آہن و فولاد کے لفظوں سے تصویریں بناتا ہے
نجومی کی مہارت سے
سہانے خوبرو خوابوں کی خوشخبری سُناتا ہے
گئے برسوں کے ٹوٹے خواب کے اِلزام میں
اغیار پر آتش گراتا ہے
جہاں بھی آگ بُجھتی راکھ میں تبدیل ہوتی ہے
مقدس آیتوں کے اسمِ اعظم سے
نئے جادو جگاتا ہے

سبھی ہیبت زدہ ساکت سروں پر
خوف کی پرچھائیاں سی اُگنے لگتی ہیں
تو آنکھیں کیمروں کی، برق رفتاری سے
سارے منظروں کو قید کرتی ہیں
کہ دُنیا بھی تو آخر دیکھ لے
آقاؤں کی طاقت کا نظارہ
مورخ کے لیے بھی ایک دستاویز بن جائے
وہ جس کی رہبری میں آنے والوں کو بتا پائے
خداؤں کے لبوں سے بُلبُلے نکلیں
تو کتنی دیر جیتے ہیں
بتاتے کہ یہ سارے سر ازل سے بادشاہ گر ہیں

یہ استقبالیہ محراب میں آراستہ قالین
اپنے خون سے رنگتے ہیں
اور اپنے کھُردرے سانسوں میں اٹکے
زرد جسموں کو اٹھائے
دلدلی گلیوں میں سر تک ڈوب جاتے ہیں
اُدھر آراستہ محراب کے سب اطلسی رستے
محلاتی خلاؤں میں نکلتے ہیں
محلاتی خلا سے دلدلوں تک فاصلوں کی کائناتیں ہیں

سو اب یہ ہے کہ ہم
ان فاصلوں کی رہگزر پر
اپنے بے پہچان چہروں اور آنکھوں کو سجادیں
اور دھڑکتے دل سے
اپنے بادشہ کا راستہ دیکھیں
کبھی جب ان خلائی گردشوں کے زیر و بم سے
تخت کے پائے ہلیں گے
تو توازن کی ضرورت سے
ہمارا بادشہ پھر سے ہماری دلدلی گلیوں میں آئے گا
سروں پر اُگنے والی خوف کی پرچھائیوں کو
جسم دے کر
آہن و فولاد کے لفظوں میں خوشخبری سنائے گا
سروں کا سیل پھر سے بادشہ کی دید سے سرشار ہو کر
اطلسی محراب میں اپنے لہو کی بھینٹ دے گا

اور پھر دونوں ——
ہمارا بادشہ اور بادشہ گر
اپنے اپنے راستوں پر لوٹ جائیں گے

یہ پل بھر کی رفاقت ہی اثاثہ ہے
اس اِک درشن کی خاطر، اے شہ دوراں!
ہمارے دیدہ و دل فرش رہ ہیں!!

منصورہ احمد

چلو اَب بادباں کھولیں

چلو اَب بادباں کھولیں
کہ اک دریائے خُوں کے پار جانا ہے
لہُو میں پُھوٹتی تاریک خواہش کی ندامت کو
کسی بے نام ساحل کے سرابوں میں چُھپانا ہے

مگر یہ بادباں کیسے کُھلیں گے
کہ پوروں نے تو صدیوں کی تھکن اوڑھی ہوئی ہے
رگوں میں بانجھ موسم کسمساتے ہیں
منداسی آنکھ کا نیلم
نجانے یاد کے کس اَن چھُوتے منظر پہ ٹھہرا ہے
سماعت میں تری آواز سے جھگڑے سے چلتے ہیں
وہ سارے لفظ جن سے خواب لکھنا تھے
بگولوں میں پھنسے پتّوں کی صُورت سر پٹختے ہیں
مجھے اپنی صدا سُننے کی خواہش میں

کسی سے بات کرنا ہے
مگر جب بولنا چاہوں
تو مٹّی کے لبوں سے بھُربھُرے الفاظ گر گر کر
شکستوں کی انوکھی الف لیلائیں سناتے ہیں

سفر آغاز کرنا ہے
مگر ان بادبانوں تک
بہت گہری، بہت لمبی شبِ بے ماہ کا
تاریکِ ساحل ہے
سبھی رستے اسی نادیدہ منزل کو نکلتے ہیں
جہاں پر کرچیوں کی ریت میں تنہائی اُگتی ہے

مسافت سرد ہے، بے نُور ہے
اور ایک جُگنو کی ضرورت ہے!

نوشی گیلانی

مری آواز سنتے ہو؟

میں تنہا ہجر کے جنگل کے غاروں میں
جلاتی ہوں سخن کے وہ دیئے جن کو
ابھی باہر کی زہریلی ہوائیں اجنبی محسوس کرتی ہیں
ابھی یہ روشنی جو سچ کی خوشبو کی حفاظت کے لیے
تاریکیوں سے لڑ رہی ہے
ناشناسی کے غبار آلود رستوں سے گزرتی ہے
ابھی جگنو شبوں میں اپنے ہونے کی گواہی تک
نہیں دیتے
ابھی تو تتلیاں میلے پروں سے دربدر پھرتی ہیں بے چاری
ابھی تو چاند بھی ٹھنڈک نہیں دیتا محبت کی
ابھی تو رات کے شانوں پہ ہیں حالات کی زلفیں

مجھے معلوم ہے، میں جانتی ہوں مجھ کو رہنا ہے
اسی غارِ اذیت میں
مگر سن لو
یہیں سے میرے ہونٹوں کو ملا ہے حرفِ بینائی
یہیں سے میں نے سچ کی روشنی خود میں اُتاری ہے
اسی غارِ اذیت نے مرے لفظوں کو آوازیں عطا کی ہیں
یہیں سے ایک دن خورشید نکلے گا
یہیں سے ایک دن حرفِ محبت بھی جنم لے گا
مرے لفظوں میں معنی کا اثر محسوس کرتے ہو؟
مری آواز سنتے ہو؟

یہاں تک ٹوٹ کر برسیں

کہاں تک خیمۂ دل میں چھپائیں
اپنی آسوں اور پیاسوں کو
کہاں تک خوف کے بے شکل صحرا کی ہتھیلی پر
کرید سے جائیں آنکھیں
اور لکیریں روشنی کی پھر نہ بن پائیں
ہم انساں ہو کے بھی سایے کی خوشبو کو ترس جائیں
چلو اک دوسرے کی خواہشوں کی دھوپ میں
جلتے ہوئے آنگن کی ویرانی میں آنکھیں بند کر لیں
اور برس جائیں

یہاں تک ٹوٹ کر برسیں کہ پانی
وصل کی مٹی میں خوشبو گوندھ دے اور پھر
سروں تک سے گزر جائے
زمیں سے آسماں تک ایک ہی منظر سنور جائے
ہمارے راستوں پر آسماں سچ کی گواہی بھیج دے
خوشبو بکھر جائے

زمیں پاؤں کو چھو لے
چاندنی دل میں اُتر جائے
ہوا گر ہجر کی سازش میں حصہ دار بن کر درمیاں آئے
ہمیں چھونے کی کوشش بھی کرے تو ——
ہجر کے پر بھیگ جائیں
اور ہوا پانی میں گل جائے

اشرف جاوید

لمس کی تحریر جھوٹی ہے

لہو روتے ہوئے لمحے
فصیلِ ہجر پہ روشن ستارا جل بجھا آخر!
بدن کے پار سانسوں کی تمازت کون چُنتا ہے
سرِ محضر لکھے دعووں کا پس منظر بدلتا ہے
ہوائے شام کے ہاتھوں میں اِک پیغام ہے
جس کی عبارت خط کشیدہ ہے
مگر ہم حرف کی تفہیم سے تو نابلد ٹھہرے

تری آنکھوں کے روشن پھول لفظوں کی طرح
مفہوم سے عاری

سفر کیسا!
کہ رستے رابطوں نے رہن رکھے ہیں
تعلق ریت کی دیوار ہے ـــــ اور ریت کی دیوار کو
گرنے سے کوئی روک سکتا ہے!
ہوا خودسر
حدِ ادراک تک چھائی ہوئی ریگِ رواں ـــــ اور
آسماں تک پھیلتا دشتِ فراقِ جاں
اندھیرا ہی اندھیرا ہے
بصارت چُبھتی آنکھوں میں لگی تصویر ٹوٹی ہے
کہیں پوروں میں عکسِ لمس کی تحریر جھوٹی ہے

لہو روتے ہوئے لمحے
بدن پر قرض لکھتے موسموں کے ساتھ زندہ ہیں
ہم اپنے آپ مجرم تھے
ہم اپنے آپ منصف تھے
ہم اپنے فیصلوں پر اب خطِ تنسیخ کیا کھینچیں
اگر محسوس، نامحسوس کو مرکز بنا ڈالے
تو کھیلتے دائروں کے جال سے باہر نکل آنا
کبھی ممکن نہیں رہتا

اشرف جاوید

ابھی تو آغاز ہے سفر کا

سفر ستارا
کہیں ورائے نظر کھلا ہے
ہواؤں نے بادبان میں گرہیں ڈال دی ہیں
سماعتوں پر اترتی آیات اپنے مفہوم سے تہی ہیں
ہتھیلیوں پر لکھی عبارت
کسی بشارت کی منتظر ہے
پرندے چُپ ہیں
کوئی نظارا!
کوئی اشارا!
سرِ نظر حرفِ وصل اترنے کے دن نہیں ہیں

ابھی تو سورج
صلیبِ شب پر براجماں ہے
ابھی افق پر
گلاب کی طشتری سجی ہے
ابھی لہو حرف حرف بن کر
فصیلِ شب پر ٹپک رہا ہے
یہ نیم وا دائروں کی قوسیں
عبارتوں سے تہی ہیں ـــــ لیکن
بصارتوں سے تہی نہیں ہیں

پرندے چُپ ہیں
زمیں کا سینہ پھٹا ہوا ہے
سفر ستارا
کہیں ورائے نظر کھلا ہے
ابھی تو یہ دن ڈھلا ہے
ابھی سے اندیشۂ طلوعِ بہار کیسا!
ابھی سے اندازہ کیا سحر کا!
ابھی تو آغاز ہے سفر کا!!

جاوید انور

بوڑھا شرابی —— ایک مکالمہ

(۱)

نہیں نہیں تُم مرے نہیں ہو

(۲)

طویل جنگِ عظیم دوئم
کہ برف کی نصف صد تہوں کے تلے دبی ہے
مری نہیں ہے
دھوئیں کی زد میں
پیڑ کی ڈھالیں
مگر خزاں پیڑ کی جڑوں میں پنپ رہی ہے

(۳)

صداقتیں زخم زخم گریاں
کہ سانحوردہ
جو پچھلے ستر برس سے بس موت جی رہا تھا
مرا نہیں ہے!

(۴)

بہت پرانی کہانیاں ہیں!

(۵)

سحر کے حصّے میں راکھ آئی
گناہ سارے شبوں کی فہرست میں لکھے تھے
پہ رات کس سے کہے کہ بھائی —،
"جو چاند نکلا
تو جھیل ویران ہو چکی تھی
چکور جاگا —
تو خواب آنکھیں چُرا چکا تھا

جو شاہزادی نے حوض میں اپنا پھول رکھا
تو دیپ خیمے جلا چکا تھا!
یہ رات کس سے کہے کہ بھائی — !"

سحر کے حصے میں راکھ آئی

(۶)

رفاقتیں حرفِ خنداں

کہ بارشوں میں پڑا ہوا بوٹ خود ہی گلدان بن گیا ہے۔
بخیل کمرہ
کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن
زبان رکھتے ہیں کان اور دل کہاں سے لاؤ
۵ فٹ × ۷ فٹ × ۸ فٹ جس میں چارپائی بھی
اور تنہائی بھی مقید

گلی میں آدم نہ بوئے آدم
کچن میں آؤ، کچن سے جاؤ
کہ کھیل کے لان میں، گلی میں، دکان میں ایڈز پھر رہی ہے
گھڑی کی سُوئی پہ بیٹھ کر سال کی مسافت
— پتہ چلے تم کو عمر گیا ہے — !

(۷)

رفاقتیں حرفِ خنداں
صداقتیں زخمِ گریاں
طویل جنگِ عظیم دوئم
سحر کے حصے میں راکھ آئی!

(۸)

نہیں نہیں میں — !
نہیں نہیں ہیں — !
نہیں نہیں میں نہیں ہُوں زندہ
نہیں نہیں میں مرا نہیں ہوں!

افتخار بخاری

بانٹ لو درد کی رات کو

بانٹ لو درد کی رات کو
نرم گالوں کے رومال سے آنکھیں پونچھو مری

آسماں خالی پن سے بھرا اک سمندر ہے
دل وسعتِ ہجر میں تیرتی اک سراسیمہ مچھلی ہے
اک اُداس چاند پھر جبلِ عماں کی شرقی سیڑھیوں میں
تمہیں ڈھونڈتا ہے
بہت دُور برفیلے ٹیلے ہیں
اور رات منحوس راگوں میں گاتی ہے
لاکھوں برس اوڑھ کر غمزدہ اُستخواں
دوزخِ سرد میں جلتے ہیں

ابھی دُور ہے نیند سو میرے سینے پہ سر رکھ کے
آہستہ آہستہ باتیں کرو
میرے آنگن کو دھوتی ہوئی بارشوں کی
مرے گیلے کپڑے سکھاتی ہوئی دھوپ کی
اور نرگس کے پھولوں کی باتیں کرو

مسکراتے ہوئے سبز و شاداب موسم تمہارے نگر کے
مرے دل میں اُترے تو غمگین کیوں ہو گئے!
ذبح خانے، لہو اور چڑیوں کے پر
چیختی خاموشی
یہ سیہ پوش آنکھیں تمہاری
وہ ہجرت زدہ گھونسلے ہیں
مرے خواب مایوس پنجرے ہیں
وہ کھڑکیاں جن میں اُمید ہنستی تھی
دہشت بھرے آئینے بن گئی ہیں

کہیں دور اک سرد و تاریک بستر میں لیٹا
کوئی جانے کیا سوچتا ہے
ابھی وقت ہے
نرم گالوں کے رومال سے آنکھیں پونچھو مری
بانٹ لو درد کی رات کو

افتخار بخاری

اسالٹ °

ناؤ اُن لہروں پہ رواں تھی
جن میں آتشیں گاؤدُم، والے چاند کا عکس لرزتا تھا
اور وہ سنگ سنگ اُڑنے والا
جس کے پر اُجلے تھے چاندی جیسے
جب اس کی پرواز کا سایہ لہروں کو چھوتا
ست رنگی قوسیں بنتی
ہم حیرت سے اس کو دیکھتے اور گاتے
"مانجھی پیارے مانجھی، سبز کنارا دور نہیں"
تب اک آسیبی بادل نے
چاند پہ اپنے دامِ ہوس کا سایہ پھینکا
جبری ہم آغوشی کے اس منظر سے جب
چاند تڑپ کر باہر آیا
پہلے والا چاند نہیں تھا
ناؤ لہریں کچھ بھی نہیں تھا
مریل مریل پیلاہٹ میں ریت پہ بکھرے
چاندی جیسے اُجلے پر اور خون کے دھبے
حدِ نظر سے بھی آگے تک پاگل صحرا
ہنستا تھا ــــ!
ٹھنڈے ٹیلوں کے پیچھے منحوس خموشی
روتی تھی ــــ!

° ASSAULT

افتخار بخاری

ڈائری

اک اچھے دوست کی بھیجی ہوئی
یہ خوبصورت ڈائری پاکر
خیال آیا ہے
اس تحفے کو استعمال میں لاؤں
تھکے بازو، بجھی آنکھیں لیے
کوہِ مشقت کاٹ کر جب رات گھر پہنچوں
تو اپنی آج کے دن کی کمائی
آج کے دکھ درد ان اوراق میں محفوظ کرلوں
وہ لکھوں جو آج کے اخبار میں لکھا نہیں
ان بستیوں میں جب کبھی ٹھنڈی ہوائیں
خوشبوئیں اور فاختائیں لوٹ آئیں
عہدِ آئندہ کا کوئی شخص تب اس کو پڑھے
اندازہ کر پائے کہ جب میں اس کے پیارے شہر میں تھا
جبر کے کن موسموں کے قہر میں تھا

پھر مگر یہ سوچتا ہوں
ڈائری کیوں!
اس ذرا سے کام کی خاطر تو اک صفحہ ہی کافی ہے
کہ میری عمر میں ہر روز سورج ایک ہی دن لے کے آتا ہے

ابرار احمد

تری دُنیا کے نقشے میں

تری دُنیا میں جنگل ہیں
ہرے باغات ہیں
اور دُور تک پھیلے بیاباں ہیں
کہیں پر بستیاں ہیں
روشنی کے منطقے ہیں ——
پہاڑوں پر اترتے بادلوں میں
رقص کرتا ہے سمندر چار سُو ——
پر اس انبوہ کا حصّہ نہیں ہوں میں

کہاں ہوں میں — ؟
میں تیرے لمس سے
اک آگ بن کر پھیلنا
تسخیر کی صورت، بکھرنا چاہتا تھا
اور اترا ہوں کسی بے مہر سناٹے کے میداں میں
ہزیمت کی دہکتی ریت پر
بکھرا پڑا ہوں شام کی صورت
میں جینا چاہتا تھا تیری دنیا میں
ترے ہونٹوں پہ کھلتے نام کی صورت
کہیں دشنام کی صورت
کہیں آرام کی صورت

میں آنسو تھا
ترے چہرے پہ آ کر پھول دھرتا تھا
ترے دُکھ پر، گرا کرتا تھا قدموں میں
اے چشمِ تر! کہاں ہوں میں
اندھیرے سے بھری آنکھوں میں
چلتی ہے ہوا، ہر سو
اور اڑتے جا رہے ہیں راستے اس میں
زمانوں کے کناروں سے
اَبد کے سرد خانوں تک
ہوا چلتی ہے ہر سُو
اور اس کے ہمرہی میں
دو قدم چلتا نہیں ہوں میں
ہجوم روز و شب میں
کس جگہ سہما ہوا ہوں میں
کہاں ہوں میں
تری دنیا کے نقشے میں
کہاں ہوں میں — ؟

تسلیم فیروز

تیسرا دھبّا

ابھی زمیں پر وہ جنگ جاری ہے
جس کی تہذیب
مذہب و فلسفہ نے کی ہے
حریف جذبوں کا اک جہنم
ابھی تلک
سینۂ بشر میں سُلگ رہا ہے
حیات کی دلنشیں دلہن نے
ابھی تلک
ہڈیوں کے زیور پہن رکھے ہیں
مشاہدہ ہے
کہ، زندگی کی ردائیں اب بھی
لہو کی جھالر لٹک رہی ہے
حسین شہروں کی فاختاؤں پہ
جنگلوں کے عقاب، اب بھی جھپٹ رہے ہیں
جہاں جہاں ہرنیوں کے رستے ہیں
خون آشام چیتے
اب بھی وہیں بسیرے کئے ہوئے ہیں
جہاں جہاں
زندگی کے شاداب سلسلے ہیں
وہیں وہیں
موت نے تباہی کے کالے کابوس بیج رکھے ہیں

ارضِ ہستی
عظیم ہستی
ہماری تاریخ کا ہمیں آئینہ دکھا کر یہ کہہ رہی ہے
کہ اب، مرے زخم خوردہ شانوں پہ
ناگا ساکی کا، ہیروشیما کا
کربلا کا
مزید بارِ گراں نہ رکھو
گھناؤنے جرم
امن کے نام پر جو تم اب بھی کر رہے ہو
وہ ننگِ انسانیت ہیں
دھوکا ہیں، ظلم ہیں، جبر ہیں، تمہاری منافقت ہیں
تمہاری تاریخ کیا ہے؟
دو عالمی فسادوں کی داستان ہے
کہیں انا ہے
کہیں تشدد ہے، ظلم ہے، جورِ ناروا ہے
تمہارے فردا کے آئینے میں
سیاہی کا ایک اور دھبا
جھلک رہا ہے ــــــــ!

اعجاز رضوی

آپس کی بات

آؤ سہیلی اپنا اپنا بر ڈھونڈیں
دُکھ سے بھرا صندوق اٹھائیں
جسم سمیٹیں،
اِک پلّو میں ماں کی محبت اِک میں باپ کی شفقت باندھیں
پاؤں میں خاک کے جوتے پہنیں
سر پر خواب کی چادر تانیں
اور خوشیوں کے اس بیباک سمندر کے ساحل پر
کچھ دن کاٹیں
پھر تنہائی کی کشتی لے کر ایسا جزیرہ ڈھونڈ نکالیں
جس کے باسی اپنی خواہش کی بھٹی میں تازہ
پھول نہ جھونکیں
جس کے باسی مال و زر کے زندانوں میں
جذبوں کو اور لفظوں کو
قیدی نہ بنائیں!

حصار میں گھری زندگی کیلئے

تیرے نام کا چلّہ ہم نے کاٹ لیا ہے
اے گہری خاموشی! ہم پر وارد ہو
دیکھ، ہمارے گرد حصار ہے لفظوں کا
اور حصار کے باہر جو آوازیں ہیں
ان کی شکلیں دیکھ کے جی گھبراتا ہے
یوں لگتا ہے جیسے لفظ بکھر جائیں گے۔ ٹوٹ پڑیں گے
یوں لگتا ہے جیسے یہ آوازیں مل کر
ہم پر وار کریں گی اور ہم مر جائیں گے!

اعجاز رضوی

شہر آشوب

شہر کے باسیو!
اُودک میں جتنے حرفِ دُعا تھے، بکھرنے لگے
آنگنوں کے کنوئیں خوں اُگلنے لگے
شہر کے باسیو!
اپنے آنگن میں کیاری سجاؤ مگر سوچ لو
شہر کے باغ تک اصطبل بن چکے
اپنی سڑکوں پہ گھومو، مگر ــــ سوچ لو
سیرگاہوں پہ شاہی سپہ خیمہ زن ہو چکی
اپنے گھر سے جنازے اٹھاؤ مگر ــــ دیکھ لو
گھر سے باہر سبھی راستے خوں نہائے ہوئے
شہر کے باسیو! اب بہت ہو چکا
اَب زمین گل نہ مہکائے گی
اور گھٹائیں برسنے سے پہلے ہی تحلیل ہو جائیں گی
شہر کے باسیو! مہربان باسیو!
اپنے ہتھیار رکھ دو، بہت ہو چکا!
اَب بہت ہو چکا!!

ستارہ، مقدر اور انسان

ستارہ چشمِ بینا میں کوئی وقعت نہیں رکھتا
کہ اُسکی جگمگاہٹ سے کوئی رستا چمکتا ہے
نہ بیکل دِل بہلتا ہے
کوئی آنسو بہائے یا کہیں پہ قہقہے پھوٹیں
یہ ہنستا ہے
نہ روتا ہے
ستارے کو کسی کے نام سے منسوب کر دینا
ادھوری جگمگاہٹ سے کسی کو حوصلہ دینا
خیالی تاجروں سے مال لینا ہے
اگر یوں ہے تو پھر اُن دُھول میں لپٹے ہوئے
لوگوں سے کہتے ہیں
چلو اس وہم کی زنجیر کو توڑ دو
فلک تاروں سے خالی ہے
نہ تاروں سے بندھی ہے اور نہ قسمت سے تمہاری عمر
پھر کس کی تمنا میں زمیں پر خاک کی صورت پڑے ہو تم
چلو اُٹھو فلک تاروں سے خالی ہے
چلو خالی فلک پر چاند بن جاؤ

یٰسین افضال

لَس

نشیبوں کی طرف بہتے ہوئے پانی کی لہریں
ریت پر تحریر ہیں تجریدہ ہو کر
قہر تھا سیلاب کا ریلا
مری مٹی بہا کر لے گیا تھا
کچھ نہ چھوڑا تھا تہوں میں
سنگریزوں کے علاوہ پانیوں نے
ریزہ ریزہ گھل رہا تھا میرے اندر
ڈھ رہا تھا میں

مجھے سورج نے باہر سے پیا ہے
مجھ میں کوئی لَس نہیں ہے اپنی مٹی کا
جو مجھ کو جوڑ کر رکھے
مرے یہ ڈھیر سارے بکھرے بکھرے ذرات
باہم دیکھنے کے ہیں
انھیں چھیڑو تو آپس میں الگ ہیں
میں انھیں ذرّوں کا پُراسرار
اک انبار
اپنے آپ پر ہوں

ریت پر لکھی ہوئی ہے
میری مٹی کی روانی
ایک تجریدی کہانی

پُرسہ

سبز تھا
جب ٹوٹ کر ڈالی سے
سوکھی گھاس پر پتہ گرا تھا
سوگوار آئی تھی سورج کی کرن
پُرسے کو اس کے
گرم آشفتہ ہوائیں چل رہی تھیں
چند لمحے بھی نہ گزرے تھے
کہ آوارہ ہوائیں
سبز پتے کی مدقوق سوکھی لاش
کھینچے جا رہی تھیں
چونٹیوں کی طرح
پھیلی گھاس مٹی میں گڑی
پتے کا دُکھ بھی
اپنے اُوپر سہہ رہی تھی

یسین افضال

جھمکے کا پھول

خبط کی دیوار سے ٹکرا کے
اندھی ہو گئیں
سنکی ہوائیں
چھت پہ چڑھتی
کاوشوں کی دھوپ کھاتی بیل
دستک دے رہی تھی
عافیت کی بند کھڑکی پر
کہ دھڑسے اپنے اوپر گر پڑے تھے
اُجلے ___ اودے ___
لال ___
خوشبودار جھمکے
اس کے بہرے سبز کانوں میں معلق
جھومتے تھے
ناک کو آواز دیں گی
خوشبوئیں جانے کہاں تک
خوشبوؤں کا خون چُوسیں گی
ہوائیں جانے کب تک
بے بسی کی دُھوپ کھاتے پھول
جانے اور کب تک دار پر لٹکے رہیں گے

رؤف امیر

گاؤں میں آخری شام

فلک پہ بادل
فضا میں جھونکے
ہر ایک سُو، سبز رُو پہاڑوں کا سلسلہ ہے
اور ان میں میرا عظیم گاؤں گھرا ہُوا ہے
طویل کھیتوں میں سبز فصلیں
ہوا کے جھونکوں سے جھومتی ہیں

جواں رُتیں اور حسیں فضائیں
خوشی کے بربط پہ گیت گائیں
مگر، پہاڑی کے ایک پتھر پہ میں کھڑا ہوں
اور ان کو حسرت بھری نگاہوں سے تک رہا ہوں

فلک پہ بادل، فضا میں جھونکے
جواں رُتیں اور حسیں فضائیں
کہاں بھلا شہر جا کے یہ سب نصیب ہوں گی
دوبارہ جانے یہ رونقیں کب نصیب ہوں گی
کہ اپنے گاؤں میں میری یہ شام، آخری ہے

سلمان صدیق

کرنیں قید نہیں ہوسکتیں

سبز رُتیں
اب چپکے چپکے
میرے گھر میں آنے لگی ہیں
سبز رُتوں میں تپتے سورج کی کرنیں بھی
روشن دانوں، کھڑکیوں اور دروازوں میں سے
جھانک رہی ہیں
تنہائی میں، خاموشی سے،
دیواروں پر جھلمل کرتی کرنوں کو مَیں دیکھ رہا ہوں
سوچ رہا ہوں
کاش میں کرنوں سے کچھ کہتا
وہ کچھ کہتیں
میں سنتا اور پھر چُپ بیٹھا
گھنٹوں اِن کو سوچتا رہتا!

سبز رُتوں میں
شام کا منظر
جھانک رہا ہے
کچھ لمحوں کے بعد یہ کرنیں
اپنے مرکز کے ڈھلتے ہی
کھو جائیں گی
مرکز کی آغوش میں چھپ کر
سو جائیں گی
لیکن میں اِن کرنوں سے مانوس بہت ہوں
سوچ رہا ہوں
میں چپکے سے
دروازوں کو مقفل کر دوں
مرکز سے کٹ جائیں کرنیں
میں ان کا مرکز بن جاؤں
لیکن کرنیں تو انسان نہیں ہیں
جو اپنے مرکز سے کٹ کر
دوسرا مرکز ڈھونڈ نکالیں
یہ کرنیں بے جان ہیں، لیکن
اپنے مرکز سے مخلص ہیں
اپنے مرکز سے کٹتے ہی
یہ سب
فوراً
مرجاتی ہیں

مختصر نظمیں

شاہدہ ناز

رات

رات میں کتنی اماں ہے
رات کتنی مہرباں ہے
گود میں سر رکھ کے اِس کی
سونے والے سو گئے
اور رونے والے رو لیے

دِل شکنی

میرے دِل کو
اُس نے توڑا
اس طرح
جیسے کوئی حکمراں
اپنے مطلب کے لئے
توڑ ڈالے ملک کے آئین کو

وجدان

آپ ہماری یاد میں تڑپیں
اور ہمیں معلوم نہ ہو!
یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

محمد مشتاق آثم

سوچ

وہ جون کی گرمیوں کے دن ہوں
کہ جنوری فروری کی صبحیں
میں دیکھتا ہوں
کہ خود کو اک شال میں چھپاتے
نجانے کتنی غلیظ نظروں کے سامنے سے
گزر کے جب بھی
وہ اپنے دفتر پہنچ گئی ہے
تو اُس نے اک گہری سانس لی ہے
وہ فائلیں کھولتی ہے
لیکن یہ سوچتی ہے
کہ اس کے خوابوں کو
جانے، تعبیر کب ملے گی
وہ سوچتی ہے
کہ رات کی سی سیاہ زلفوں کا ڈھیر آخر
کہیں سفیدی میں ڈھل نہ جائے
بدن کا سونا
پگھل نہ جائے
گلاب موسم
خزاں کی رُت میں
بدل نہ جائے

غافر شہزاد

یہ مرا پھول نہیں ہو سکتا

شہر میں کیسی تیز ہوا ہے !
مائیں دستک ہونے پر بھی
گھر کے دروازوں کو کھولتے ڈرتی ہیں

"نہیں — نہیں — یہ میرا پھول نہیں ہو سکتا
میں نے تو اس کے بازو پر
اسمِ اعظم باندھ کے باہر بھیجا تھا
اس کے رخساروں کی لالی
کب ایسی تھی رسنے والی
میں نے اس کا ماتھا چوم کے
سر کا صدقہ اتارا تھا
میں تو اس کی ہر آہٹ پہچانتی ہوں
پھر یہ لوگ مری دہلیز پہ کس کے جوتے چھوڑ گئے ہیں"

اپنے پاؤں زمیں پر رکھتے ڈرتا ہوں[1]

میں نے
سرخ لہو کو زمیں پر گرتے دیکھا ہے
گرم لہو جب سرد زمین پہ
کوئی نقش بناتا ہے
تو میری آنکھوں میں
اس کا اجلا چہرہ لہراتا ہے
اس چہرے کو ساتھ لئے
میں لمحہ لمحہ نیلے نیلے پانی کے پاتال میں جا کے اترتا ہوں
میں اپنے پاؤں زمیں پر رکھتے ڈرتا ہوں

---

[1] ۲۰ مارچ ۱۹۹۰ء کی صبح ناصر الدین (فائنل ایئر انجینئرنگ یونیورسٹی) گولی کا نشانہ بن گیا تھا

ایم یامین

ایک شام چائے پر

ایک شام چائے پر
بات پھر وہ چل پڑی
اُٹھ کے درمیان سے
وہ کہیں نکل گئی ——!

دس برس گزر گئے
بے تکان زندگی
پُر تکان ہو گئی
اُس کے اِک خیال سے
میں گمان ہو گیا
وہ مرے حساب سے
ایک دھیان ہو گئی

آج ایک شام ہے
چائے خانے میں رہی
تیز تیز باس ہے
دل بہت اُداس ہے
خامشی کے نصف میں
گفتگو خیال کی
گمشدہ سوال کی
بس کسی گمان سے
صرف ایک دھیان سے
کوئی بھی نہیں رہا
اُٹھ کے جو نکل پڑے
آج درمیان سے

چیونٹیاں

رات بھر
کپکپاتے ہوتے
جسم پر
اِک لکیر
ہانپتی، کانپتی، سنسناتی رہی

محمد محمود احمد

خالی ہاتھ

میں اک آئل مین کا سب سے چھوٹا بیٹا ہوں
اک تنگ و تاریک کوارٹر
بجلی کے چند ننگے تار
دیواروں پر بیٹھے کوّے
دور فلک پر اڑتی چیلیں
ڈبکیاں لیتے پیلے مینڈک
دن بھر دیکھتا رہتا ہوں
بارہ بج کر بیس منٹ پر
جب بھی شفٹ بدلتی ہے اور ریل کے ہُوٹر بجتے ہیں
خوش ہو کر میں امّی جان سے کہتا ہوں
آج یقیناً میرے ابو
میرے لیے اک گڑیا، باجا، سیل سے چلنے والی موٹر
ڈور پتنگیں، چھوٹا کیلکولیٹر اور چیونگم لائیں گے
لیکن جب وہ گھر آتے ہیں
ان کے تیل میں لتھڑے خالی ہاتھوں سے ڈر لگتا ہے!

محمد حنیف

خواب کی لوح پر لکھی ہوئی تحریر

ہوا کے ہاتھ پر بکھرے ہوئے پتّوں کا نوحہ ہے
تعاقب میں صدائیں ہیں
بڑی خونی بلائیں ہیں
نمو کی رُت اگر آئی
نئے پتّوں کی چہکاریں
درختوں کو جگائیں گی
خبر اُس دیو کی کس کو
ازل سے جو تعاقب میں ہمارے ہے
وہ کب آئے
نئی رُت آ بھی جائے تو خبر کس کو
کہ اُس کو کون دیکھے گا
مگر اک خواب ایسا ہے
کہ جس کی لوح پر سب کچھ
خیالوں نے رقم کر کے
مری آنکھوں پہ رکھا ہے
نئی رُت سے جو شاید خوبصورت ہے

جاوید احساس

کالے شاعر کے لئے ایک گوری نظم

میرے شاعر!
میری ساتھی!
تمہارے خون کی سرخی سے
جو طوفان اُٹھے گا
بہالے جائے گا اُس قصرِ ابیض کو
کہ جس میں سینکڑوں فرعون بستے ہیں
مجھے دیکھو!
تمہاری رُوح کندھے پر اُٹھائے
کب سے چوراہے پہ بیٹھا ہوں
کوئی مجھ کو بھی سولی دے
(کہ میرے شہر میں بھی سینکڑوں نمرود بستے ہیں)
مرے اس جسدِ خاکی کو مٹا کر بے نشاں کر دے
مگر لکھے ہوئے ہر لفظ کو میری زباں کر دے

فرخ یار

ایک نظم

کبھی ملو تو بتائیں کہ حال کیسے ہیں
سفر سے لوٹ کے آتے مسافروں کے جنوں
غبارِ شہر کی باہوں میں مر گئے کہ نہیں
وہ تیر جن سے ٹپکتے تھے آتشیں شعلے
کسی کے نرم بدن میں اُتر گئے کہ نہیں
جہاں نہ تو تھا نہ تیرے خیال روشن تھے
ہم اُس مقام پہ خود سے مُکر گئے کہ نہیں
وہ کوچۂ یار کو جاتی ہوئی اُداس گلی
وہ تار تار نظر کے سوال کیسے ہیں
کبھی ملو تو بتائیں کہ حال کیسے ہیں

احمد ندیم قاسمی

زندگی کے بارے میں ایک گفتگو

سب کی بات نہیں
یہ میری اپنی بات ہے
اپنا ذکر ہے
زندگی کے بارے میں میری اپنی فکر ہے
وہ میزان الگ رکھ دو
جو صدیوں صدیوں بُرے بھلے کو تولتے تولتے
وزن کو بھی بے وزن بنا دیتی ہے
یا بے وزن کو بھی باوزن دکھا دیتی ہے
میں تو اپنی بات کروں گا
اور اپنی میزان میں
اپنا اور پھر اپنی فکر کا وزن کروں گا
اپنا ذکر کروں گا

بات یہ ہے :
میں جب تک زندہ رہا
مجھے رشتے چار عزیز رہے
میں جب تک زندہ ہوں
یہ چاروں رشتے
میرا مقدر
میری مسرّت
میری محبت
میری عبادت ہیں !

اِک رشتہ جسم کا ہے
اِک جان کا ہے
وجدان کا بھی اِک رشتہ ہے
اور اِک رشتہ انسان کا ہے
میں ان چاروں کی ریشمی ڈور میں بندھا ہوا ہوں
اور خوش ہوں

میں اِتنا خوش ہوں
جتنا اک بچہ پانی میں چاند کے عکس کو چھو کر چھو لے
نہیں سماتا ہے
اور ہنستے ہنستے پاگل سا ہو جاتا ہے

جو رشتہ جسم کا ہے
وہ قدرت کی اِک دین ہے
ہر انسان اِس رشتے کی تخلیق ہے
آنے والا ہر انسان اِس رشتے کا مرہون ہے
اِس رشتے کے اپنے سُکھ اور اپنے دُکھ ہیں
سُکھ پانا اور دُکھ سہنا اس رشتے کی مجبوری ہے
ورنہ ہر بات ادھوری ہے

جو رشتہ جان کا ہے
دراصل وہ اپنی ہی پہچان کا ہے
انسان کا چہرہ اک آئینہ ہوتا ہے
پھر لاکھوں کروڑوں آئینوں میں سے اِک آئینے میں
جب اُس کو خود اپنا عکس دکھائی دیتا ہے
تو عرش بھی فرش پہ اُترا ہوا دکھائی دیتا ہے
یہ رشتہ جسم کے رشتے سے بھی مقدس ہوتا ہے
اور اتنا مقدس — جتنا کوئی مقدس ہو سکتا ہے

جو رشتہ وجدان کا ہے
وہ اِتنا لطیف ہے
اِتنا ہلکا پھلکا ہے
اور اتنا گداز ہے
اِتنا نرم ہے
اِتنا نازک ہے
جیسے اِک پھول کی پتّی پر
اک قطرہ اوس کا ہو
جس میں افلاک کا عکس
قریب و دُور کے سب پیمانوں کو بے معنی کر دے
ایک دیئے میں شمس و قمر کا سارا نور سمٹ آیا ہو
ایک ہی حرف میں ساری ابجد اُتر گئی ہو!

جو رشتہ انسان کا ہے
وہ میرے دل و دماغ کے۔ میرے ظاہر و باطن کے ایمان کا ہے
یہ نفی نہیں، اثبات کا رشتہ ہے
یہ خواب نہیں، حق بات کا رشتہ ہے
میں اس رشتے سے ٹوٹ کے کچھ بن سکتا ہوں تو پتھر
ہی بن سکتا ہوں
اور سانسیں لیتے انساں کا پتھر بن جانا
موت کا دوسرا نام ہے
اور مجھے یہ موت قبول نہیں
یوں جیتے جی مر جانا مرا اصول نہیں

ہم نفس — ۵

مسعود مفتی

(سلسلے کے لئے ملاحظہ ہو "فنون" نمبر ۳۰، جون، جولائی ۱۹۹۰ء)

جب فیض نے کہا تھا:

بڑے ہیں چرچے سنے ہیں سختی دیوارِ زنداں کے
چل اے جوشِ جنوں، دیوارِ زنداں ہم بھی دیکھیں گے

تو وہ صرف وطن کے محتسب اور زنداں کا سوچتے تھے۔ دشمن کی قید کا انھیں تصور بھی نہ تھا جو جوشِ جنوں کو بھی منجمد کر دیتی ہے خصوصاً جب دشمن سرتاپیر ریاکاری ہی ریاکاری ہو۔ تن کا اجلا اور من کا کالا ہو۔ جھوٹا انسان اور نقلی بھگوان ہو۔ ایسے دشمن کی قید ایک ناقابلِ بیان عذاب تھی جو رگوں میں دوڑتے پھرتے لہو کو آنکھوں سے بھی نہیں ٹپکنے دیتی، دم بدم سیال نفرت میں کشید کرتی رہتی تھی۔ چاروں طرف خاردار تاروں، پہرہ دار فوجیوں، بے صبر بندوقوں اور تیز مشام خونخوار کتوں کا محاصرہ بیگانوں کی دشمنی کا کھلا ثبوت بنا تھا، مگر اندر کیمپ کے منتظمین ذہنی مصنوعی یگانگت کے راگ الاپتے رہتے تھے کہ ہندوستان اور پاکستان کا کلچر ایک ہے اور ہم دو قومیں نہیں بلکہ ایک قوم ہیں۔ اس مقصد کے لئے دوچار مرتبہ ہندوستانی زعما ہمیں لکچر دینے بھی آئے۔ مگر سب سے بھونڈا طریقہ ہمارے ایک ساتھی، صغر بیگ کے ساتھ آزمایا گیا۔

اس کا پس منظر یہ تھا کہ جنیوا کنونشن کے تحت جنگی قیدیوں کو کچھ ماہانہ خرچہ دیا جاتا تھا۔ کنونشن کے مطابق فوجی قیدیوں کا پیمانہ کچھ ایسا تھا کہ فوجی نوجوان کو ۳۵ روپے، جی سی او کو ۹۰ روپے اور فوجی افسروں کو ۱۴۰ روپے ملتے تھے۔ مگر سویلین قیدیوں کو، چیف سکریٹری سمیت، صرف پانچ روپے ماہوار دیئے گئے۔ تاویل یہ تھی کہ جنیوا کنونشن میں سویلین قیدیوں کے لئے کوئی پیمانہ مقرر نہیں ہے اس لیے حکومت ہند پانچ روپے ماہوار دے کر بھی بہت کرم کر رہی ہے۔ جب کیمپ کے منتظمین کو کہا جاتا کہ جنیوا کنونشن میں صاف درج ہے کہ آپ سویلین لوگوں کو قید کر ہی نہیں سکتے اس لئے ان کے لئے کوئی پیمانہ مقرر نہیں، تو وہ کوئی جواب دینے سے گریز کرتے۔ کنونشن کے فوجی کیمپوں کے رواج کے مطابق البتہ انھوں نے کیمپ میں پرچون کی ایک چھوٹی سی دکان کھول دی تھی جس میں قیدیوں ہی کے راشن سے چرایا ہوا سامان قیمتاً قیدیوں کو فروخت کیا جاتا تھا تو ہم وہ پانچ روپے ماہوار اس سے خرید بھی کیا سکتے تھے۔ انٹرنیشنل ریڈ کراس والوں کو صرف ایک دفعہ ہمارے کیمپ میں لایا گیا تو ہم نے ان کو شکایت کی۔ اس وقت تو صرف اتنا ہوا کہ ریڈ کراس نے عالمی پریس میں بیان دیا کہ ہندوستان جنگی قیدیوں کے ساتھ ٹھیک سلوک نہیں کر رہا جس پر بین الاقوامی ریڈ کراس کے چیف کو ہندوستان چھوڑنے کا حکم دے دیا گیا اور بعد ازاں ریڈ کراس والوں کو کبھی ہمارے کیمپ میں تک نہیں لایا گیا (غالباً دوسرے کیمپوں میں بھی وہ دوبارہ نہیں گئے) مگر سال بھر بعد ہمیں یہ سہولت ملی کہ ہم میں جن قیدیوں کے عزیز پاکستان کے علاوہ دیگر بیرونِ ممالک میں تھے وہ ہمیں زرِ مبادلہ کی شکل میں کچھ رقوم بھجوا سکتے تھے۔ چنانچہ ہم لوگوں نے خطوط لکھے اور تھوڑے تھوڑے پیسے

باہر سے آنے لگے۔ اس طرح ہندوستان جنگی قیدیوں کی معرفت زرِ مبادلہ کمانے لگا۔

اس پس منظر میں اصغر بیگ، انگلستان میں، اپنے لڑکے کو بار بار خطوط لکھتے رہے لیکن، انہیں کوئی رقم وصول نہ ہوئی۔ کئی ماہ بعد انہیں لڑکے کی طرف سے بے بسی کا خط ملا کہ مختلف وقتوں میں ما کرین نے کم و بیش نوے پاؤنڈ بھجوائے تھے مگر ہندوستانیوں نے جان بوجھ کر آپ کو نہیں دئیے۔ اب میں کیا کر سکتا ہوں کیونکہ آپ دشمن کی قید میں ہیں اور میں کچھ کرنے سے قاصر ہوں۔

ڈاک سنسر کرتے وقت یہ خط پڑھا گیا اور متعلقہ قیدی کو کیمپ کمانڈنٹ کے دفتر میں طلب کیا گیا۔ وہاں انہیں خط پڑھوا کر سرزنش کی گئی کہ تم پاکستانیوں کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ ہندوستان پاکستان کا دشمن نہیں بلکہ دوست ہے۔ پھر طویل لیکچر کے بعد انہیں ہدایت کی گئی کہ وہ لڑکے کو خط لکھ کر یہ تاثر دور کریں اور واضح طور پر بتائیں کہ یہ ہمارے دوست ہیں:

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

کیمپ کی زندگی میں، اکثر اوقات مجھے وہ واقعہ یاد آتا جو بچپن میں والد مرحوم سے سنا تھا۔ قیامِ پاکستان سے پہلے وہ ہندو سرکاری افسروں کے ایک گروپ میں بیٹھے تھے اور نامانوس ہونے کی وجہ سے دوسروں کو اندازہ نہ تھا کہ اس گروپ میں وہ اکیلے مسلمان ہیں۔ اتنے میں ایک فقیر سوال کرتا ہوا ادھر آ نکلا۔ حاضرین میں سے ایک معتبر سے آدمی نے اسے بہت ڈانٹا، بھیک مانگنے پر شرم دلائی اور کچھ دیئے بغیر چلتا کیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور فقیر آن نکلا تو انہی صاحب نے خاموشی سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور چند پیسے نکال کر اسے دیئے۔ فقیر اس سخی شخص کو اپنا خیر خواہ سمجھ کر دعائیں دیتا ہوا آگے نکل گیا۔ حاضرین میں سے کسی نے متعجب ہو کر ان صاحب سے اس تضاد کی وجہ پوچھی کہ انہوں نے پہلے فقیر کو گالیاں اور دوسرے فقیر کو خیرات کیوں دی۔ تو وہ کہنے لگے کہ پہلا فقیر ہندو تھا اور میں اس کی عزتِ نفس کو جگا کر اسے سنوارنا چاہتا تھا۔ مگر دوسرا فقیر مسلمان تھا۔ یہ لوگ بھکاری رہیں تو اچھا ہے۔ ہم لوگوں کو بھیک مانگنے میں ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔

کیمپ کے منتظمین کی دوستی بھی کچھ ایسی ہی خیر خواہی تھی۔ ایک قوم کے متعلق ان کا تصور یہ تھا کہ ہندوؤں میں ذات پات کے چار درجوں کے بعد سب سے نچلا پانچواں درجہ مسلمان بھکاریوں کا ہو۔ جیسے ہندوستان کے بیشتر مسلمان آہستہ آہستہ ایسی ہی ایک قوم میں مدغم ہو رہے ہیں۔

قید پابندی ہوتی ہے، چاہے وطن میں ہو یا دشمن کے چنگل میں ہو۔ مگر وطن کی قید چھدرے بادلوں کی طرح نامکمل ہوتی ہے کیونکہ پابندیاں ڈھیلے قوانین نے تراشی ہوتی ہیں۔ ان پابندیوں میں بھی دوست یا عزیزوں کی ملاقات سہارا دے جاتی ہے اور جیل کا عملہ بھی رعب یا رشوت سے آگے نہیں جاتا مگر دشمن کی قید گھنگھور گھٹا کی طرح مکمل ہوتی ہے۔ بے داغ سیاہی۔ کڑکتی چمکتی بجلیوں سے لرزتی ہوئی۔ پابندیاں ظلم کی کوکھ سے نکلتی ہوئی۔ ملاقات کے تصور سے بھی خالی اور عملے کی جانی دشمنی سے سرشار ــــــ اردگرد انسان کہیں نہیں ہوتا۔ فقط دشمن ہوتا ہے۔ انسانیت اگر کہیں ہوتی ہے تو بندوقوں کی نالیوں سے مر جاتی ہے ــــــ قیدی یہ سمجھتا ہے کہ خدا دشمن کا ساتھ دے رہا ہے۔ دشمن یہ سمجھتا ہے کہ وہ خود خدا ہے۔ اور خدا؟؟ نہ معلوم چپکے سے کدھر چلا جاتا ہے۔ ظلم دیکھتا ہے، نہ فریاد سنتا ہے، نہ دعا وصول کرتا ہے ــــــ شاید خدا کو یہی انداز جہنم کہلاتا ہے کیونکہ خدا کے اس اندازِ تغافل سے ایک آگ سی بھڑک اٹھتی ہے۔ قیدی کے گھٹے ہوئے سینے کے اندر اور پھٹتے ہوئے دماغ کے اندر جس کے شعلے کسی کو بھی نظر نہیں آتے۔ مگر نظر آنے والے روایتی چمکیلے شعلوں سے کئی گنا زیادہ گرم ہوتے ہیں۔ اور ایک ہی دفعہ نہیں لمحہ بہ لمحہ مسلسل بھسم کرتے رہتے ہیں۔ اس کے ساتھ اندر ہی اندر سے اپنی ذات پر خود ملامتی اور بے بسی کے گرز برستے رہتے ہیں، اور جہنم کے عذاب کے سارے اجزا پورے ہو جاتے ہیں۔

اس لحاظ سے دشمن کی قید ایک شخص کے گرد جتنی خارجی ہوتی ہے اس سے کہیں زیادہ ساری شخصیت کے اندر داخل ہوتی ہے۔ جیسے بچھو اور دیمک کا اکٹھا حملہ ہو۔ باہر کی نسبت اندر کا حملہ بہت شدید ہوتا ہے کیونکہ باہر زیادہ تر شب و روز کی یکسانیت

سے اکتاہٹ ہے۔ بے مصرف لمحوں کی بوریت ہے اور اداسیوں کی بے رونقی ہے۔ مگر اندر ہر دم مسلسل زلزلے ہیں۔ امید اور ناامیدی کی دھینگا مشتی ہے۔ مایوسیوں کی باد سموم ہے۔ زندگی اور موت کے امکانات گتھم گتھا ہیں اور بے روح کے اتھاہ کرب کے مد و جزر ہیں۔ ان طوفانوں میں ماضی کی ڈھیروں یادیں اور مستقبل کی چند موہوم امیدیں بے وزن تنکوں کی طرح اڑتی، گرتی بھٹکتی رہتی ہیں۔

یادیں!!! نہ معلوم کتنے روپ بدل کر آتی ہیں اور کس کس روزن سے آنکھ لگا کر ذات کے اندر جھانکنا شروع کر دیتی ہیں —— کوئی گدگدانے والی، کوئی ہنسانے والی، کوئی رلانے والی —— ذات کی یادیں۔ احباب کی یادیں۔ قوم اور ملک کے حالات کی یادیں —— کہیں مسکراتے ہونٹ۔ کہیں پریشان چہرے۔ کہیں لہولہان جسم —— کبھی میٹھی سی پکار۔ کبھی رازدارانہ آہٹ۔ کبھی ہنسی کی جھنکار۔ کبھی دبی دبی آہ۔ کبھی گولیوں کی باڑ۔ کبھی بموں کے دھماکے۔ کبھی قوم کی بے بسی اور لیڈروں کی بے عملی اور بے رخی کے گلے —— امجد اسلام امجد پوچھتے ہیں:

ہواؤں کی تحریر کس نے پڑھی ہے!

مگر قیدی کی تو قیدی ہی یہ تحریر پڑھتے گزرتی ہے کیونکہ باہر کی دنیا سے صرف ہوا ہی اس کے پاس آزادانہ آسکتی ہے اس لئے ہوائیں یادوں کے قافلے لا لا کر بقول امجد:

چشم بے خواب کو سامان بہت

مہیا کرتی رہتی ہے۔

قید کے زمانے میں کئی دن اداس ہوتے تھے، بے کل ہوتے تھے اور بوجھ بن جاتے تھے۔

۲۰ نومبر ۱۹۷۲ء کی شام بھی ایسے ہی دن کا آخیر تھی جس کے دامن میں پچھلے کئی دنوں کے روگ تلملا رہے تھے۔ قید میں سال ہونے کو آیا تھا سیاسی محاذ پر تصفیے کا امکان نہ تھا۔ مقامی سطح پر ہندوستانی مختلف جیلوں سے قیدیوں کو تنگ کر رہے تھے تاکہ پاکستان میں بے چینی بڑھے اور حکومت کے خلاف جلوس نکلیں۔ چند ہی دن پہلے ریڈیو پاکستان نے بتایا تھا کہ صرف اکتوبر کے مہینے میں مختلف کیمپوں میں اٹھارہ جنگی قیدی ہندوستانی گولیوں کا نشانہ بن چکے تھے۔ خود ہمارے کیمپ میں سختی ہو رہی تھی۔ خاردار تاروں کے قریب جانے سے بھی منع کیا جاتا تھا ۱۹۴۷ء کی تقسیم ہند کے خلاف لیکچر دینے ایک صاحب آئے تھے۔ ان سے ہم نے ترکی بہ ترکی بحث کی تو اس کی سزا کے طور پر ہمارے اخبار بند کر دیئے گئے، خطوط روک دیئے گئے اور ہفتے میں صرف ایک دفعہ جو چھچھڑے نما گوشت کھانے کو ملتا تھا وہ بھی بند کر دیا گیا۔ اب گھاس نما ساگ اور کنکروں والی دال پر گزارہ تھا۔ اس کے علاوہ ہمیں بنگلہ دیش گورنمنٹ کے حوالے کرنے کی بھی بار بار دھمکیاں دی جاتی تھیں تاکہ وہ ہم پر مقدمہ چلا سکیں۔ کئی لوگ پژمردہ تھے کہ یہاں سے زندہ بچ نکلنے کے امکانات کم ہوتے جا رہے ہیں۔

ایسے میں ہندوستانی ریڈیو نے خبر سنائی کہ سابق مشرقی پاکستان کے گورنر عبدالمالک کو بنگلہ دیش کی عدالت نے نسل کشی اور دیگر جرائم کی پاداش میں عمر قید کی سزا سنائی ہے۔

سننے والوں کے دل و دماغ میں کئی پرانی یادیں تڑپ گئیں اور مجھے اس دردناک لمحے کو یاد کیا جب گورنر مالک مشرقی پاکستان کے آخری قیامت خیز دنوں میں صدر یحییٰ سے فون پر کوئی ضروری مشورہ کرنا چاہتے تھے تو انہیں جواب ملتا تھا کہ وہ مصروف ہیں اور بات نہیں کر سکتے۔

ریڈیو کی یہ خبر اس شام کو مزید بوجھل بنا گئی۔ یہ عدالت کا فیصلہ نہیں تھا بلکہ وقت کا فیصلہ تھا جو مختلف ناموں، جیلوں اور بہانوں سے ہر ہارنے والے کو سزا دیتا ہے۔ وقت صرف ان کا ساتھ دیتا ہے جو جیت جاتے ہیں یا ہار کر اپنی ہار سے سبق سیکھنے اور دوبارہ جیتنے کا حوصلہ رکھتے ہیں —— مگر فوری طور پر ہارنے والا وقت کی گود سے نیچے گر جاتا ہے۔

مغربی پاکستان کے ترانوے ہزار (۹۳) ہارنے والے ہندوستان بھر میں جنگی قیدیوں کے کیمپوں میں مصائب جھیل رہے تھے۔ ہندوستانی اخباروں کے مطابق اسی ہزار وہ مشرقی پاکستانی بنگلہ دیش کے جیل خانوں میں سڑ رہے تھے جو پاکستان کے شریک کار تھے۔ اپنی برتری کے زعم میں الگ تھلگ رہنے والے اور بالآخر ہارنے والے کئی لاکھ بہاری بنگلہ دیش میں بے ملک، بے گھر اور بے پہچان رہ گئے تھے۔

ادھر پاکستان میں پوری قوم اپنی ہار کے زخم چاٹ رہی تھی ــــــ اور ہم سب وقت کی گرد سے پیچھے دھکیل دیئے گئے تھے۔

کیا یہ سب اپنی ہار کو جیت میں بدلنے کا حوصلہ رکھتے ہیں؟؟ ــــــ یا ایک ہار کو بھول کر دوسری اور تیسری ہار کا سامان کریں گے ــــــ یہ سوال بھی ہمارے کیمپ کی اداسیوں میں گونج رہا تھا۔

مگر اس سوال کا جواب بھی وقت ہی دے گا۔

اور اس شام ــــــ وقت بہت ہی ناراض لگتا تھا۔

ہم سب اپنے اپنے جاننے والوں کے نام گن گن کر قیاس آرائیاں کرتے رہے کہ ان کے ساتھ کیا سلوک ہوا ہوگا۔ بھوٹو کا نام بھی آگیا۔ اس کے جاننے والے سبھی متفق تھے کہ کوئی معجزہ ہی اسے بدترین نتائج بھگتنے سے بچا سکتا ہے۔

وقت گزرتا گیا۔

کیمپ میں انگریزی اخباروں کے علاوہ کبھی کبھی ہندوستان کے آرمی ہیڈ کوارٹر کی لائبریری سے کتابیں بھی آیا کرتی تھیں۔ جن میں زیادہ تر پروپیگنڈہ والی کتابیں یا تھرڑ THRILLER قسم کے امریکن ناول ہوا کرتے تھے۔ اگر ہم دوسری قسم کی کتب یا کسی اور سنجیدہ کتاب کی درخواست کرتے تو وہ سلیقے سے ٹال دی جاتی تھی۔ ایک دن السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا کا ایک پرانا شمارہ نظر آیا جو خاص نمبر تھا اور دسمبر ۱۹۷۲ء میں بنگلہ دیش کی پہلی سالگرہ پر شائع کیا گیا تھا۔ اس میں کئی قابلِ توجہ مضمون تھے جیسے بنگال نے مغربی پاکستان سے کیسے نجات حاصل کی، دو قومی نظریہ باطل ہو چکا ہے وغیرہ۔ مگر ایک مضمون مجھے خاص طور پر دلچسپ لگا جو رسالے کے مدیر خشونت سنگھ نے لکھا تھا۔ پورے صفحے کے اس مضمون میں مصنف نے اپنے بنگلہ دیش کے سفر کے حالات لکھے تھے جو انھوں نے بنگلہ دیش کے قیام کی پہلی سالگرہ پر وہاں کے حالات دیکھنے کے لئے کیا تھا۔ مضمون کا آغاز اس طرح تھا کہ گذشتہ ایک سال میں بنگلہ دیش میں دو چیزوں کی موت واقع ہوگئی ہے۔ ایک تو ہندوستان کے لئے بنگالیوں کی محبت۔ اور دوسرے بنگلہ دیش کے لئے ان کا جوش و خروش ــــــ بعدازاں مصنف رقم طراز تھا کہ میں ڈھاکہ کے ہوائی اڈے پر پہنچا تو وہاں کوئی ٹیکسی نہ تھی۔ بمشکل ایک رکشا لے کر ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل کی طرف چلا۔ راستے میں رکشا والے سے پوچھا کہ یہاں ٹیکسیاں کیوں نہیں ہیں، تو وہ تلخی سے کہنے لگا "اس لئے کہ ساری کاریں آپ لوگ اٹھا کر ہندوستان لے گئے ہیں"۔ ہوٹل میں پہنچ کر ایک رات کاٹی۔ اگلی صبح ہوٹل کا ملازم کمرے میں چائے لایا تو میں نے اسے بنگالی انداز میں کہا "جے بنگلہ"۔ مگر اس نے جواب دیا "گڈ مارننگ"۔ میں نے ٹوکا کہ تم "جے بنگلہ" کیوں نہیں بولتے۔ تو وہ کہنے لگا "اس لئے کہ ہمارے لئے بنگلہ دیش میں کوئی JOY یا خوشی نہیں رہی" ــــــ بات چیت آگے چلی تو اس نے احتجاجاً کہا کہ "پاکستان تھا تو میں ایک دن میں دس سگریٹ پی لیتا تھا۔ اب بنگلہ دیش ہے تو دس دنوں میں بھی ایک سگریٹ نہیں ملتا۔ مجھے اس سے کیا خوشی ہو سکتی ہے۔" وغیرہ وغیرہ۔

میں سوچتا رہا۔ خدا معلوم یہ مضمون بنگلہ دیش اور پاکستان میں لوگوں کی نظر سے گزرا یا نہیں ــــــ کیا عطاء الحق اور ستار نے بھی پڑھا ہوگا! ــــــ نہ معلوم ان کا ردِ عمل کیا ہوگا۔

مگر چند دنوں کے بعد اندازہ ہوا کہ ستار تو بنگلہ دیش میں تھا ہی نہیں۔ ایک ہندوستانی اخبار میں مختصر سی خبر تھی کہ ڈاکٹر عبدالستار پاکستان میں نظربند تھے اور وہاں سے فرار ہو کر افغانستان جانے کی کوشش کر رہے تھے مگر سرحد کے پاس گرفتار کر لئے گئے۔

وقت گزرتا گیا ...

دو سال نکل گئے۔

پاکستان

قید سے رہائی ملی تو ہم تیرہ جنوری ۱۹۷۴ء کو پاکستان واپس پہنچے

مگر وطن پہنچ کر ایک نئی ذہنی اور جذباتی اذیت سے واسطہ پڑا ـــــ لوگ ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیتے۔ ہمدردی کرتے۔ ہماری باتیں بار بار سنتے ـــــ مگر سمجھتے نہ تھے ـــــ اس لئے کہ ملک کے اس حصے میں قوم کو اندازہ ہی نہ تھا کہ مشرقی پاکستان میں کیا ہوتا رہا تھا۔ کیسے ہوتا رہا تھا۔ اور کیوں ہوتا رہا تھا۔

قوم بے لاگ تجزیے کے قابل نہ تھی کیونکہ اول تو تعلیم کی کمی تھی اور حکمرانوں کی مسلسل تعلیم دشمنی نے تجزیے کی قابلیت پیدا ہی نہ ہونے دی تھی۔ دوسرے، قوم حسبِ سابق سیاسی تربیت سے محروم تھی۔ سنسر کی وجہ سے اصل حالات سے لاعلم تھی۔ اور تیسرے، پڑھے لکھے طبقے میں بھی زیادہ تر تجزیے کی رسم نہ تھی۔ فقط الزام تراشی کی رسم تھی اور وقت کی نئی کروٹ کے باوجود کوئی بھی نئی رسم شروع نہ کرنا چاہتا تھا۔ حکمرانوں کے انداز پرانے تھے۔ فقط نئے لیبل چسپاں ہو گئے تھے۔ قوم حسبِ سابق ملک کی ترقی اور تحفظ چاہتی تھی اور حکمران حسبِ سابق اپنی ذات کا پھیلاؤ اور تخت کا دوام چاہتے تھے۔ حسبِ سابق دونوں کی ترجیحات میں فرق تھا اور حسبِ سابق حکمران زدہ کھلونا قوم بے بس تھی۔

وقت چلتا گیا.....

اگست ۱۹۷۵ء میں بنگلہ دیش میں قوم نے شیخ مجیب الرحمان کو قتل کر دیا۔

حسبِ سابق پاکستان کے لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہ آ رہی تھی کہ بنگالی قوم نے اپنے بابائے قوم کو "آزادی" کے صرف ساڑھے تین سال بعد کیوں قتل کر دیا ـــــ ۱۹۷۱ء کے مشرقی پاکستان کے حالات سے لاعلمی کی وجہ سے پاکستانی یہ بھی نہ سمجھ سکتے تھے کہ پاکستان کی حمایتی خاموش اکثریت جو ۱۹۷۱ء میں مرکز کی پالیسیوں کی وجہ سے سہم کر دبکی ہوئی تھی، اب بول پڑی تھی کیونکہ وہ مرکز نہ رہا تھا۔[1]

شیخ مجیب الرحمان کا قتل گویا بھولا کے ہر احتجاج اور کرب کی تاریخی تصدیق تھی۔

مگر یہ تصدیق بعد از وقت تھی۔

اور وقت ـــــ طنز سے مسکراتا ہوا ـــــ چلتا گیا۔

دن ـــــ رات ـــــ ہفتے ـــــ ماہ ـــــ سال

ہر لمحہ گزرتے ہوئے میرے کان میں سرگوشی کرتا گیا کہ قوم اور حکمرانوں نے مشرقی پاکستان کے سانحے سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔

میری بے خواب راتوں میں تاریخ کی گونج ابھرتی کہ جو قوم اپنے قومی سانحوں سے سبق نہیں سیکھتی اسے وہی سانحے دہرانے کی سزا ملتی ہے۔

یہ سزا بعید از قیاس نہ تھی کیونکہ دشمن بدستور گھات میں تھا۔

پھر میں سوچتا کہ بڑا دشمن کون ہے؟ ـــــ ہندوستان؟! یا ہم خود؟؟

یہ ماحول ہماری وہ مایوسیاں نہ دھو سکا جو شکست کے دھچکوں اور قید کی تنہائیوں نے ہمیں دی تھیں ـــــ بقول میر:

قفس میں جو ٹوٹے تھے وہ پر نہ نکلے

---

[1] دوسرے بین ثبوت شیخ صاحب کے قتل کے بعد کے حالات ہیں جن کا ہلکا سا عکس ضمیمہ نمبر ۹ میں دیا گیا ہے۔ یہ واقعات ایک کتاب (بعنوان "خون کی میراث") میں سے لئے گئے ہیں جو ایک اخبار نویس نے لکھی ہے۔ اس کتاب کی واضح خامی یہ ہے کہ مصنف کا نقطۂ نظر پاکستان کے خلاف اور ہندوستان کے موافق ہے، اور وہ کتاب کے متن میں بار بار کوشش کرتا ہے کہ بنگلہ دیش میں ہندوستان کی مسلسل مداخلت کی تردید کرے۔ مگر اس خامی کے باوجود قاری کو یہ تاثر ملتا ہے کہ شیخ مجیب الرحمان کے قتل کے بعد اگر ہندوستان ریشہ دوانیاں کر کے حکومت کا تختہ نہ الٹتا تو شاید ۱۹۷۵ء میں ہی بنگلہ دیش کے لوگ پاکستان کے ساتھ کوئی نہ کوئی سیاسی تعلق جوڑ لیتے۔ اس لحاظ سے ہندوستان پاکستان کو دوسری دفعہ توڑنے کا ذمہ دار ہے۔

اس مایوس کن ماحول میں ایک دن ماضی کی مایوس تر گونج ابھری ـــ میرے دفتر میں زاہدہ سلطانہ بیٹھی تھیں اور شکایت کناں تھیں کہ پاکستان کا محکمہ تعلیم تو مشرقی پاکستان کے محکمہ تعلیم سے بھی زیادہ بے رحم نکلا۔

”میرا خیال تھا میں اپنوں میں جا رہی ہوں مگر یہ تو مجھے پہچاننے سے بھی صاف انکاری ہیں۔ بتایئے میں کدھر جاؤں ـــ میرا کیا قصور ہے؟“

میں کیا جواب دیتا۔ میرا یہاں کے محکمہ تعلیم سے کوئی تعلق نہ تھا ـــ پھر یہاں والوں نے مشرقی پاکستان کا درد نہ سہا، نہ دیکھا فقط اس کی موت کی خبر سنی اور وہ بھی یک طرفہ مفروضوں کے شور و غوغا میں۔ انہیں اس غم کی جاں گدازی کا اندازہ ہی نہیں۔ یہ غم خواری کیا کریں گے۔

”مجھے پاکستان آئے ہوئے قریباً دو برس ہو گئے ہیں“ وہ دھیرے دھیرے بول رہی تھیں ”مگر ملازمت کہیں نہیں ملتی کیونکہ حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ جو لوگ مشرقی پاکستان کی صوبائی حکومت میں ملازم تھے ان کو پاکستان کے محکمہ تعلیم میں جذب نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے کہا گیا ہے کہ جب کبھی نئی آسامیاں نکلیں، آپ نئے امیدواروں کے ساتھ درخواست دیں ـــ میں نے ایسا کیا بھی۔ مگر نئے امیدواروں کے مقابلے میں انہیں میری زیادہ عمر تو نظر آ جاتی ہے مگر زیادہ تجربہ نظر نہیں آتا۔“

ـــ انہیں قریباً ڈیڑھ برس بنگلہ دیش سے بچ نکلنے میں لگا تھا اور اب یہاں دو برس سے محکمہ تعلیم سے لڑ رہی تھیں۔ موت سے بچ کر جو زندگی ملی تھی وہ اور بھی کٹھن ہو گئی تھی۔

بنگلہ دیش سے چھٹکارا پانے کی کہانی ان کے الفاظ میں یوں تھی۔ سولہ دسمبر ۱۹۷۱ء کو میں اپنے سرکاری فلیٹ میں تھی اور سقوط کے بعد بہت خوفزدہ تھی کیونکہ وہ بستی ایسے سرکاری ملازموں کی تھی جو زیادہ تر بنگلہ دیش کے حامی تھے۔ اس کے علاوہ میں مکتی باہنی کی نظر میں بھی کھٹکتی تھی کیونکہ بنگالن ہونے کے باوجود اردو میڈیم سکول کی ہیڈ مسٹریس تھی اور سکول کی عمارت کے معاملے میں مارشل لاء انتظامیہ اور سول انتظامیہ دونوں نے میری مدد کی تھی۔

شکست کی خبر پھیلنے لگی تو ہمسایوں کے تیور بھی بدلنے لگے۔ چنانچہ میں نے ایک عزیز کو فون کیا جو اسی سہ پہر ایک جیپ میں لینے آ گئے ان کے ساتھ دو بنگالی دوست بھی تھے۔ میں نکلنے لگی تو لوگ اکٹھے ہو گئے کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ ہم نے کہا ذرا شہر کا چکر لگانے جا رہے ہیں تھوڑی دیر میں واپس آ جائیں گے۔ وہ بظاہر مطمئن ہو کر چلے گئے تو ہم نے اپنی جیپ سرپٹ دوڑا دی۔ پرانے پلٹن میدان کے پاس ایک آبادی تھی جس میں زیادہ تر بمبئی کے لوگ رہتے تھے۔ میرے عزیز نے وہاں کسی با اعتماد دوست سے بات چیت کر لی تھی اور میں وہیں رہنے لگی۔

چند روز بعد اعلان ہوا کہ تمام سرکاری ملازمین فلاں تاریخ کو اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہو جائیں۔ جو نہیں آئیں گے وہ مغربی پاکستانیوں کے معاونین شمار کئے جائیں گے اور ان پر مقدمہ چلایا جائے گا ـــ مجھے ہر طرف تاریکی نظر آتی تھی کیونکہ پاکستان جانے کی تمام کوششیں ناکام ہو گئی تھیں اس لئے حالات کا رخ جانچنے کے لئے میں مقررہ تاریخ پر ڈیوٹی پر حاضر ہو گئی۔

سکول میں وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ آدھا دن گزرنے پر مکتی باہنی کے غنڈوں نے سکول پر حملہ کر دیا۔ مجھے ہوش نہ تھا کہ باقی سٹاف پر کیا گزری۔ مگر میں خود ایک بنگالی ٹیچر کی مدد سے بڑی مشکل سے جان اور عزت بچا کر نکلی اور پھر کبھی سکول کا رخ نہ کیا۔ ویسے بھی سنا تھا کہ وہ سکول کا آخری دن تھا۔

میں اس بستی میں دو ماہ سے زیادہ نہ رہ سکی کیونکہ مجھے کئی دفعہ اطلاع ملی کہ مخبر مجھے تلاش کر رہے ہیں۔ ان کا اندازہ تھا کہ میرے تمام قریبی عزیز پاکستان میں تھے اور میں خود بھی ملازمت سے غیر حاضر ہو کر وہاں جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ خوش قسمتی سے ان کے ہاتھ مجھ تک نہ پہنچ سکے۔

مگر جب خطرہ زیادہ بڑھا تو میں پرانے شہر میں اپنی ایک شاعر ممبر کے گھر منتقل ہوگئی اور وہاں پورا ایک سال چھپ کر گزارا۔

"اس زمانے میں کئی ایک ایجنٹ یہ کاروبار کر رہے تھے کہ جو لوگ بنگلہ دیش سے بھاگنا چاہتے تھے، ان سے دو ہزار سے چھ ہزار ٹکے (روپے) لے کر سرحد پار کروا دیتے۔ مگر ان میں سے کئی ایک ایسے بھی تھے جو لوٹ کر مار ڈالتے یا بھاگنے والوں کو حکومت یا مکتی باہنی کے حوالے کر دیتے۔

"میری سر توڑ کوشش کے باوجود کوئی قابلِ اعتماد ایجنٹ نہ مل سکا۔ ساتھ ہی پاسپورٹ بنوانے میں بھی کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ دریں اثنا کراچی میں میرے سگے بھائی کا انتقال ہو گیا جنہیں یہ خبر ملی تھی کہ مجھے ڈھاکہ میں قتل کر دیا گیا ہے۔ صدمے سے انہیں دو دفعہ دل کا دورہ پڑا اور وہ جانبر نہ ہو سکے ——— بالآخر میری بنگالی بیزبان پاسپورٹ بنوانے میں کامیاب ہو گئی جس کے لئے کئی بنگالیوں کو اعتماد میں لینا پڑا اور میں فروری ۷۳ء میں کلکتہ پہنچ گئی اور کافی عرصہ چھپ کر گزارا کیونکہ ہندوستانی حکومت بنگلہ دیش سے بھاگنے والوں کو گرفتار کر رہی تھی جو نیپال جانا چاہتے تھے۔

"جب نیپال جانے کی کوئی صورت نہ بنی۔ تو میں انتہائی خطرہ مول لے کر چند غیر ملکی لوگوں کے ساتھ ٹورسٹ TOURIST بس میں نیپال کے لئے روانہ ہو گئی۔ بعض لوگوں نے پہلے بھی ایسا کیا تھا۔ ان میں سے کچھ کامیاب ہوئے مگر زیادہ تر گرفتار ہوئے تھے۔ کیونکہ ہندوستان اور نیپال کی سرحد پر ہندوستانی بہت نگرانی کر رہے تھے۔ خوش قسمتی سے میرا داؤ چل گیا اور میں نیپال پہنچنے میں کامیاب ہو گئی ——— وہاں پاکستانی سفارت خانے نے کراچی میں میرے عزیزوں کو اطلاع بھیج کر تصدیق چاہی۔ انہوں نے تصدیق بھی کر دی اور ٹکٹ بھی بھیج دیا۔"

مغربی پاکستان میں اس کہانی کو ایسے سنا گیا جیسے یہ ہماری قوم بیتی نہ ہو بلکہ فلمی قسم کی جگ بیتی ہو۔ اسے بے اثر پاکر زائرہ سلطانہ نے کہانی سنانا ترک کر دی مگر ملازمت کی تلاش جاری رکھی جسے ترک کرنا ممکن نہ تھا۔

بالآخر انہیں کنٹریکٹ کی ملازمت ملی جس میں پچھلی ملازمت یا تجربے کی کوئی مراعات شامل نہ تھیں۔

اب وہ کئی برسوں سے ان حقوق کے لئے لڑ رہی ہیں۔

زائرہ سلطانہ ایک علامتی المیہ تھیں ——— اس قومی بے حسی کا جو مغربی پاکستان نے وفادار بنگالیوں کے ساتھ روا رکھی۔ ہم نے ہر وقت اس بنگالی کے متعلق سوچا جو ہم سے علیحدہ ہونے کے لئے ہنگامے کر رہا تھا مگر اس بنگالی کو مسلسل نظر انداز کرتے رہے جو ہمارے ساتھ رہنے کے لئے تڑپ رہا ہے اور مرکز کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے سہم کر خاموش تھا۔

بھولا بھی ایسا ہی المیہ تھا اور ان تمام وفادار بنگالیوں کی نمائندگی کرتا تھا جو ۱۶ دسمبر کو سقوطِ ڈھاکہ کے وقت بھی بھاری اکثریت میں تھے۔

اس سے بھی بڑا المیہ ان بہاریوں اور وفادار بنگالیوں کا تھا جو بنگلہ دیش کے قیام کے بعد پاکستان آنا چاہتے تھے مگر پاکستان نے انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا اور وہ وہاں مہاجر کیمپوں میں انسانوں سے کم تر زندگی بسر کرتے رہے ——— اگر اسے زندگی کہہ سکتے ہیں ——— اس کے مقابلے میں افغانستان سے ۳۰ لاکھ مہاجرین کو قبول کیا، حالانکہ پاکستان کی پیدائش کے وقت ہی سے افغانستان کی تمام پالیسیاں ہندوستان کے موافق اور پاکستان کے مخالف رہی ہیں۔

مگر پاکستانی قوم کو ان حقائق اور المیوں کا احساس نہ تھا ——— اور وہ حسبِ سابق اپنی ریغ کنی میں مصروف تھی۔

وقت ایک اور زقند لگا گیا۔

چھ برس گزر گئے۔

اپریل ۱۹۸۰ء میں قسمت مجھے فلپائن لے آئی۔

فلپائن

ایشیائی ترقیاتی بنک کی ملازمت میں میرا ہیڈ کوارٹر منیلا میں تھا۔ مگر چارج کی نوعیت کے مطابق مشرق بعید کے کئی ملکوں میں دورے کرنے کا موقع ملتا تھا۔ انڈونیشیا، تھائی لینڈ، ملائشیا اور سنگاپور سے گہرا واسطہ رہا۔ ان ملکوں کی ترقی دیکھ کر جہاں ایک خوشگوار حیرت ہوتی تھی، وہاں دل کی یہ پژمردگی بھی تھی کہ چند برس پہلے یہ ممالک پاکستان سے کہیں پیچھے تھے، مگر چند ہی برسوں میں انھوں نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ ہمیں کہیں پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ اور یہ سب کچھ صرف ان کے لیڈروں کے خلوص اور نیک نیتی کی وجہ سے تھا۔ ان کے سیاسی نظام میں بھی کئی خرابیاں ہیں مگر ان کے لیڈر اپنی ذات کو ملک اور قوم پر اس طرح ترجیح نہیں دیتے کہ اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے تعلیم کا دانستہ قتل کریں اور قوم کو جاہل رکھیں تاکہ ان کی آنکھیں نہ کھلیں۔ وہ سوال نہ پوچھ سکیں اور احتساب نہ کر سکیں۔ اس کے برعکس انھوں نے ٹھوس کام سے اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کی کوشش کی۔ ان کی حکومتوں نے تعلیم کی طرف خاص توجہ دی اور کئی سیاسی خرابیوں کے باوجود ان کی ترقی کا راز یہی ہے۔ صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

منیلا کی سانٹو تھامس (Santo Thomas) یونیورسٹی چھ سو سال پرانی ہے۔ ایک شام دفتر سے فارغ ہو کر میں وہاں چلا گیا۔ شہر کے پرانے علاقے میں پرانی دو منزلہ عمارتوں کے چند بلاک خاصی خستہ حالت میں ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ بیچ میں چھوٹے چھوٹے لان تھے جو طلبا سے بھرے پڑے تھے۔ میں نے ایک سے پوچھا کہ میں شام کے وقت کوئی کورس کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے متعلق کہاں سے پتہ چلے گا۔ وہ سامنے والی عمارت کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"وہاں رجسٹرار سے مل لیں۔"

رجسٹرار؟؟ ——— میں چونک گیا۔ ہمارے ملک میں تو رجسٹرار تک پہنچنے کے لیے انتظار یا سفارش کی ضرورت ہوتی ہے۔

"میں نے تو ان سے ملاقات کا وقت نہیں لیا۔"

"کوئی بات نہیں" وہ کہنے لگا "آپ کسی بھی وقت مل سکتے ہیں۔"

تھوڑا تعجب کرتے کرتے میں اس طرف چل دیا۔ عمارت میں داخل ہوا تو ایک بڑے ہال میں چالیس پچاس کے قریب میزیں تھیں جن کے ساتھ سٹاف کے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اکثریت عورتوں کی تھی۔ ادھر ادھر رجسٹرار کا کمرہ دیکھنے کی کوشش کی، تو نظر نہ آیا۔ ایک خاتون سے پوچھا تو انھوں نے ہال کے کونے کی طرف اشارہ کیا۔ ادھر گیا۔ تو اسی کمرے میں کونے والی میز پر رجسٹرار کی تختی پڑی تھی۔ اور ایک ادھیڑ عمر خاتون کرسی پر بیٹھی تھی۔

"میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟" اس نے شائستگی سے پوچھا۔

میں نے بتایا کہ شام کے کورسوں کے سلسلے میں معلومات چاہتا ہوں۔

"آپ پی ایچ ڈی کرنا چاہتے ہیں یا کوئی اور کورس؟" وہ نرمی سے پوچھنے لگی۔

"اگر آپ مجھے سب کورسوں کے متعلق کوئی پمفلٹ دے سکیں، تو مجھے انتخاب میں آسانی رہے گی۔ میرے پاس محدود وقت ہوگا۔"

وہ مسکرائی "آپ یہاں نئے آئے ہیں؟"

"جی۔ ایک مہینہ ہوا ہے۔"

"تبھی آپ کو ہمارے سسٹم سے واقفیت نہیں۔ آپ کو انتخاب کی تکلیف نہ کرنا پڑے گی۔ آپ صرف اپنی ضرورت بتا دیں۔ باقی

انتظام ہم اس کے مطابق خود کر لیں گے۔"

مجھے حیران دیکھ کر اس نے تمام سسٹم سمجھایا۔ یونیورسٹی میں کورسوں کے مختلف مدارج ہیں۔ ہر درجے میں ہر لیکچر دن میں پانچ دفعہ دیا جاتا ہے۔ صبح۔ دوپہر سے پہلے۔ دوپہر کے بعد۔ شام کو اور پھر رات کے وقت۔ طالب علم کی سہولت کے مطابق اسے کسی لیکچر میں ڈالا جا سکتا ہے۔ جو لوگ کسی وجہ سے عام دنوں میں نہیں آ سکتے۔ ان کے لئے چھٹی کے دو دنوں (ہفتہ اور اتوار) میں لیکچر دیئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ منیلا سے باہر رہنے والوں کے لئے سپیشل کورس ہیں۔ وہ ٹرین اور بس پر ہفتے کی صبح کو آتے ہیں۔ دن بھر کلاس میں مصروف رہتے ہیں۔ رات کسی ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں۔ اور اتوار کی شام فارغ ہو کر واپس گاؤں چلے جاتے ہیں۔

"آپ کی کوئی بھی مجبوری ہو۔ ہمارے پاس اس کا علاج ہے۔ آپ صرف مضمون کا انتخاب کریں۔ اور اپنی مصروفیات کا اندازہ دے دیں۔ آپ کے تعلیمی معیار کے مطابق مناسب درجے کا چناؤ کر کے ایسا ٹائم ٹیبل بنا دیں گے جو آپ کی فراغت کے عین مطابق ہو گا۔" اس نے پیشہ ورانہ فخر سے بات ختم کی۔ "اسی لئے ہماری یونیورسٹی میں ہر عمر اور ہر پیشے کے لوگ اپنا تعلیمی معیار بلند کرنے کے لئے آتے رہتے ہیں۔"

میں نے اس نظام کے لئے پسندیدگی کا اظہار کیا۔ تو وہ مسکرا کر کہنے لگی۔ "یونیورسٹیاں لوگوں کے لئے ہوتی ہیں۔ نہ کہ لوگ یونیورسٹیوں کے لئے۔"

پاکستان کی طرح فلپائن دوسری جنگ عظیم کے بعد آزاد ہوا۔ نظام تعلیم کی اس طرح تنظیم کر کے ان کے ہاں خواندگی کا تناسب اسی (۸۰) فی صدی تک پہنچ چکا ہے۔ جبکہ پاکستان میں یہ ابھی تک چوبیس (۲۴) فی صدی ہے۔ مزید براں فلپائن کے اسی فی صدی میں غالب اکثریت اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی ہے۔ جبکہ پاکستان کے چوبیس فی صدی میں غالب اکثریت ان کی ہے جو صرف قرآن پڑھ سکتے ہیں۔ اسی لئے اس ملک میں Peoples Power ایک فعال قوت ہے۔ جو کہ پاکستان میں زیادہ سے زیادہ ایک Mob Power ہے۔ جسے چالاک لیڈر اپنے مقصد کے لئے استعمال کر کے خالی بوتل کی طرح پھینک دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے پاکستان کے لیڈروں کے لئے قوم کی جہالت ایک نعمت ہے۔

مشرق بعید کے تمام ممالک میں تعلیم کی طرف اسی قسم کی ترجیحی توجہ دی جاتی ہے۔ بلکہ سنگاپور اور ملائیشیا میں تو تعلیم یافتہ جوڑوں کو زیادہ بچے پیدا کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے اور جاہل والدین کو کم بچوں کی۔

۱۹۶۲ء میں کوریا پاکستان سے اتنا پیچھے تھا کہ ایک سرکاری وفد ہمارے ہاں یہ دیکھنے آیا کہ پاکستان اتنی ترقی کیسے کر رہا ہے۔ بنیادی جمہوریت کا راز سیکھنے کے بعد گاؤں کو فعال بنانے کی وجہ سے کوریا ترقی کی اس منزل پر پہنچ گیا ہے جس کا پاکستان ابھی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اب کوریا میں خواندگی کا تناسب چھیانوے (۹۶) فی صدی تک پہنچ گیا ہے۔

ان ملکوں کی ترقی پر داد دیتے اور اپنے ملک کے تنزل پر کڑھتے ہوئے مجھے قریباً ڈیڑھ سال گزر گیا۔

ایک دن ایک طویل میٹنگ سے لوٹا۔ دفتر کے کمرے میں گھسنے لگا تو میری سکرٹری کہنے لگی۔

"کوئی صاحب۔ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"کون؟" میں نے پوچھا۔

"معلوم نہیں ــــ میں نے تو بتا دیا تھا کہ میٹنگ لمبی ہو گی۔ مگر وہ ایک گھنٹے سے آپ کے کمرے میں بیٹھے ہیں۔"

کمرے میں داخل ہوا۔ تو میں بے یقینی سے منجمد ہو گیا۔

دونوں ہاتھوں میں پھیلے ہوئے اخبار کے اوپر سے بھولا کا گول مٹول چہرہ مسکرا رہا تھا۔ اور چپ چپ آنکھیں جھپک رہا تھا۔

"یقین نہیں آتا کہ ہم دونوں زندہ ہیں" مجھ سے گلے ملتے ہوئے وہ اتنی بلند آواز میں بولا کہ ارد گرد کے کمروں سے لوگ نکل کر جھانکنے لگے۔

ہم ٹھیک نو سال بعد ملے تھے۔

کبھی دنیا کی سب سے بڑی مسلمان سلطنت کے ہم وطن ——— مگر اب!

گو واں نہیں، پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

اس ٹوٹے ہوئے کعبے کے دو سینہ چاک ذرے پھر سے آن ملے تھے ——— ایسی ملاقات جس کا کبھی تصور بھی نہ کیا تھا ——— مگر اب نہ کعبہ جڑ سکتا تھا اور نہ ذرے ہم وطن بن سکتے تھے۔

بھولا چند برسوں سے تھائی لینڈ میں، اقوام متحدہ کے ادارے ایسکیپ (Escap) میں کام کر رہا تھا۔ کسی سرکاری کام سے غب ٹی آنا پڑا تو اپنے بنگالی دوستوں سے ملنے ہمارے بنک میں آ گیا۔ باتوں باتوں میں میرا پتہ چلا تو اٹھ کر میرے کمرے میں آن بیٹھا کہ جب تک ملاقات نہ ہو گی، ہلوں گا نہیں۔

دفتر سے واپسی پر وہ میرے ساتھ ہی گھر آ گیا۔ بیگم اور بچوں کو ملا، پھر رات کے کھانے کے بعد دیر تک باتیں کرتا رہا ——— لیکن ادھر ادھر کی نیم سرکاری یا سرکاری۔

میں نے دو ایک دفعہ کریدنے کی کوشش کی "بھولا ۱۹۷۱ء کے بعد تمہارے ساتھ کیا گذری؟"

مگر وہ ایسی باتوں کے موڈ میں نہ تھا "تم نے قید میں بُرے دن دیکھے، میں نے بنگلہ دیش میں بُرے دن دیکھے۔ خدا کا شکر ہے وہ دن ختم ہو گئے۔ یوں سمجھو خدا نے ہم دونوں کو نئی زندگی دی ہے ——— پرانے دن اب بھول ہی جائیں تو بہتر ہے"[1]

اگلی صبح بھولا نے واپس جانا تھا۔ اس لیے ملاقات تشنہ سی رہی۔ گو دوستوں کے متعلق تفصیل سے بات ہوتی رہی۔ میں نے اسے بتایا کہ رشید بلوچستان ہائی کورٹ کا جج بن گیا تھا۔ مگر جب ۱۹۸۱ء میں عبوری دستور نافذ ہوا تو اسے حلف لینے کے لیے نہیں بلایا گیا اور فارغ کر دیا گیا۔

"وہ کیوں؟" بھولا تڑپ کر پوچھنے لگا۔

"کیونکہ کچھ عرصہ پہلے اس نے عدالت میں فیصلہ دیا تھا، جو مارشل لاء کے تسلسل کے خلاف جاتا تھا کہ مارشل لاء غیر قانونی ہے۔"

بھولا سناٹے میں آ گیا ——— کافی لمحوں کے بعد دھیرے سے کہنے لگا۔

"رشید نے ہمارے گروپ کی لاج رکھ لی ——— اسے میرا سلام لکھ دینا ——— بلکہ میری طرف سے سیلوٹ کرنا۔"

پرانے ساتھیوں کے متعلق بات جاری رہی تو اس نے ستار کے متعلق بتایا کہ وہ بنگلہ دیش میں شیخ مجیب الرحمان کے ذاتی سٹاف میں تھا۔ اور اقتصادی امور کے لیے پریذیڈنٹ کا سکرٹری اور مشیر تھا۔ مگر شیخ کے قتل کے بعد ملک سے باہر چلا گیا۔ آج کل ملائشیا میں کسی بین الاقوامی ادارے

---

[1] بعد ازاں بھولا کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ شیخ مجیب الرحمان کی ہندوستان نوازی اور سخت گیری کے باوجود پاکستان سے ہمدردی رکھنے والے بنگالی ایک دوسرے کی درپردہ بہت مدد کرتے رہے۔ گویا The Train فلم کی کہانی بنگلہ دیش میں چلتی رہی — صرف فرق یہ پڑا کہ خاموش مدافعت کرنے والے لوگ اب بنگلہ دیش کے حامی نہ تھے بلکہ پاکستان کے حامی تھے۔ اور بھولا جیسے محب وطن پاکستانیوں کی جان بھی اسی وجہ سے بچتی رہی۔

میں کام کر رہا ہے۔

"وہ تو یہاں آتا رہتا ہے۔ تمہیں یقیناً ملے گا کسی دن" بھولا کہنے لگا۔ "اسے ابھی پتہ نہیں ہو گا کہ تم یہاں ہو۔"

اور کچھ عرصے بعد واقعی ستارہ کا فون آگیا ——— وہ منیلا ہی سے بول رہا تھا۔

ستارے سے بھی ملاقات اتنی ہی گرمجوشی سے ہوئی جتنی کسی بھی بچھڑے ہوئے دوست سے ہو سکتی ہے۔ مصافحے۔ معانقے۔ مزاج پرسی۔ قہقہے۔ گپ بازی ——— مگر گھنٹے ڈیڑھ کی ملاقات میں ماضی کی تلخی کی طرف اشارہ بھی نہ ہوا جیسے ۱۹۷۱ء کا سال ہمارے ماضی میں تھا ہی نہیں۔ وہ آج کل کوآلا لمپور۔ ملائشیا میں فیملی پلاننگ کا بین الاقوامی ادارہ ICOMP چلا رہا تھا۔ اور پاکستان سمیت سارے خطے کے چکر لگاتا رہتا تھا۔

خیال نہ تھا کہ بھولا اور ستارے سے ملاقاتوں کا سلسلہ چل سکے گا کیونکہ ہم تین مختلف ممالک میں کام کر رہے تھے۔ اس لئے خط و کتابت کے وعدوں پر ہی رخصت ہوئے تھے۔

مگر قدرت کا کرنا یوں ہوا کہ میرا چارج تبدیل ہو گیا اور میرا واسطہ تھائی لینڈ سے رہنے لگا۔ چنانچہ میں ہر دو چار ماہ بعد وہاں جانے لگا۔

تھائی لینڈ

اس کے بعد بھولا کبھی منیلا نہیں آیا اور ہمیشہ تھائی لینڈ میں ہی ملاقات ہوئی۔ وہاں میرا ہر دورہ عموماً آٹھ دس روز کا ہوتا تھا۔ جن میں دو تین دفعہ ضرور بھولا سے ملاقات ہو جاتی۔ کبھی میرے ہوٹل میں۔ کبھی اس کے دفتر یا گھر میں۔ اور کبھی کسی ریستوران میں۔

وہ اب کافی بدل گیا تھا۔ اول تو عمر کی منزل کی وجہ سے۔ سقوط ڈھاکہ کے وقت وہ سینتیس (۳۷) برس کے قریب تھا اور اب سینتالیس (۴۷) کو پہنچ رہا تھا۔ کنپٹی پر بالوں کی سفیدی چھت پر نئے جھنڈے کی طرح بتا رہی تھی کہ درون خانہ عناصر کی نئی ترتیب ہے اور مہ و سال کے مینار پر بلند تر ہو کر تجربے کے مناظر بھی پھیل رہے ہیں اور شعور کے پرت بھی ——— دوسرے یوں لگتا تھا کہ ۱۹۷۱ء کے سانحے نے اس کی شخصیت میں مستقل گڑھے ڈال دیئے ہیں۔ ہم نے پاکستان کا ایک حصہ کھویا تھا۔ مگر اس نے پورا پاکستان کھو دیا تھا۔ ہمارا خطہ ایک ملک کی مکمل شخصیت بن سکتا تھا۔ مگر اس کے چھوٹے سے گنجان آباد خطے کے وسائل محدود اور مسائل لامحدود لگتے تھے۔ اور پورے ملک پر بھی ادھورے گھر کا گماں گزرتا تھا۔ ساری چھوڑ آدھی پر گزارہ والی مجبوری ایسے شخص کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہے جس کے بچپن نے ساری کے لئے جدوجہد کی۔ اور جوانی نے اسے اپنا آئیڈیل بنایا۔ اور اپنا تن من اس کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ ہمارے لئے نصف ملک کا نقصان عظیم سانحہ تھا۔ مگر بھولا کے لئے عظیم تر تھا۔ کیونکہ اس کے المیے میں وہ تلخی بھی شامل تھی جو دسمبر ۱۹۷۱ء میں اس نے روتے ہوئے میرے اوپر انڈیلی تھی کہ تم لوگ ہمیں علیحدگی کی طرف دھکیل رہے ہو ——— مجروح اعتماد کی تلخی۔ سہاروں کے دغا کی تلخی۔ توقعات کے ٹھکرائے جانے کی تلخی۔ "جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے" والی تلخی۔ اپنی غلطیاں مانتے ہوئے دوسرے بھائی سے بلوغت نظری کی کمی کا گلہ۔ گویا یہ نا امیدی کہ

گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

ان تمام احساسات کے ساتھ ایک اور تبدیلی بھی شامل تھی۔ یہ احساس کہ دونوں اب ہم وطن نہ تھے بلکہ غیر ملکی تھے جن سے اپنے گھر کی بات ویسے کھل کر نہیں ہو سکتی جیسے گھر والوں سے۔ کہاں ملحقہ چھت تلے بسنے والا ہمسایہ اور کہاں ایک ہی چھت تلے بسنے والا بھائی۔ کچھ یہی حال اب ہمارا تھا۔ دونوں افراد وہی۔ دونوں کی شخصیتیں وہی۔ ایک دوسرے کا ویسا ہی دم بھرنے والے۔ مگر بیچ میں سے کوئی شے گم ہو گئی تھی۔ اس کی جگہ اب ایک ناقابل بیان موہوم سے حجاب نے لے لی تھی۔ جو اپنے اپنے ملک کی بات کرتے وقت زبانوں کی روانی روک

لیتا تھا۔ خیالات کا آزادانہ بہاؤ کاٹ دیتا تھا، اور ذہن کے کسی تہ خانے میں سرگوشی کرتا رہتا تھا کہ گو ہم وہی ہیں، مگر وہ نہیں۔۔۔ چنانچہ جہاں ہم ذاتی، عالمی اور مذہبی معاملات پر پہلے کی طرح بے حجابانہ بات کرتے تھے۔ وہاں اپنے اپنے ملک اور قوم کے موضوع پر تکلف، رکھ رکھاؤ اور رواداری غالب آنے لگی۔ اس لئے پاکستان یا بنگلہ دیش کی اندرونی سیاست پر کبھی گفتگو نہ ہوتی تھی اور زیادہ تر گفتگو عالم اسلام کے متعلق ہوتی رہتی تھی۔ ذاتی مسائل پر البتہ ہم قریب تر تھے۔ کیونکہ ان کی نفسیاتی نوعیت یکساں تھی۔

میرا بنکاک آنا جانا شروع ہوا تو شروع کے دو تین دوروں کے دوران میں نے بھولا سے ۱۹۷۱ء کے مشرقی پاکستان کے متعلق بات کرنے کی کوشش کی، مگر وہ اس موضوع سے بچتا ہی رہتا تھا کیونکہ ایک تو اس سانحے پر اب گیارہ برس کی گرد جم چلی تھی، اور دوسرے بھولا کے دل میں یہ ماضی کا المیہ نہ تھا بلکہ ایک مسلسل المیہ تھا جو ۱۹۷۱ء میں شروع ہوا۔ اور اس کی ذات پر مسلسل اثرات کی وجہ سے اب تک جاری تھا۔ مسلسل سانحے تسلسل نہیں دیتے ہیں۔ اور کسی بھی تسلسل کا نقطۂ آغاز کبھی یاد نہیں رہتا بلکہ سلسلے کی آخری کڑی پیش نظر رہتی ہے۔ جس کی پیش رو کڑیاں اپنی اہمیت کے باوجود نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ مغربی اور مشرقی پاکستان کے لوگوں میں ۱۹۷۱ء کے بعد یہ بنیادی فرق تھا جو بھولا کی ذات سے واضح ہوتا تھا کہ مغربی پاکستان والے اس کو ماضی کا سانحہ سمجھ کر بھول چکے تھے۔ مگر مشرقی پاکستان والے اس کے منفی اثرات سے نہ تو چھٹکارا پا سکے تھے اور نہ ہی سنبھل سکے تھے جیسے دو ٹانگوں والا آدمی ایک ٹانگ کھو کر عمر بھر کے لئے چال کا توازن بگاڑ دے۔ اسی لئے بھولا ۱۹۷۱ء کے ذکر سے اس طرح بچتا تھا جیسے کوئی حال کی تلخ حقیقتوں سے فرار ڈھونڈتا ہے۔

مگر ایک دن وہ اس موضوع میں ایسے گھر گیا جیسے کوئی اَن جانے میں گڑھے میں گر جاتا ہے۔

باتوں باتوں میں کہیں جی ڈبلیو چوہدری کا ذکر آ گیا تو میں نے بات کاٹ کر پوچھا۔

"بھولا! تم نے ان کی کتاب پڑھی ہے؟"

"کون سی؟ پہلی یا دوسری؟"

"متحدہ پاکستان کے آخری دن (Last days of United Pakistan)"

"ہاں پڑھی ہے۔" وہ کہنے لگا۔

"کیا خیال ہے تمہارا کتاب کے متعلق؟"

وہ خاموش رہا۔ میں نے اصرار کیا تو کہنے لگا "تمہیں کیسی لگی؟"

"مجھے تو یوں لگا جیسے مصنف نے یہ کتاب یحییٰ خاں کی صفائی میں لکھی ہے کہ اس کے چہرے سے بدنامی کی گرد دھوئی جا سکے۔"

"ہاں" بھولا کہنے لگا "میرا بھی یہی تاثر ہے ۔۔۔ مزید براں یہ کتاب انگلستان میں ایک فیلوشپ (Fellowship) کے تحت لکھی گئی ہے۔ نہ معلوم مصنف کا نقطۂ نظر کس حد تک مالی مدد دینے والوں کے خیالات سے متاثر ہوا ہے ۔۔۔ مگر بدقسمتی یہ ہے کہ پاکستان اور بنگلہ دیش میں ان دونوں کے ریکارڈ کی باقاعدہ تحقیق کر کے غیر جانبدارانہ تجزیے سے کوئی مستند کتاب نہیں لکھی گئی۔"

"ہاں یہ درست ہے۔ بھرپور ریسرچ کے بعد تو کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ مگر دو کتابیں میرے پاس ایسی ہیں جن سے اس موضوع پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ وہ تمہیں دوں گا۔"

"کیا ہے ان کتابوں میں؟" وہ پوچھنے لگا۔

"ان کتابوں نے بھی وہی سوال اٹھائے ہیں۔ جو ۱۹۷۱ء میں تم پوچھا کرتے تھے۔"

"اور جوابات؟" وہ اشتیاق سے پوچھنے لگا۔

"جوابات ریسرچ کے بغیر نہیں ملتے اور پچھلی کئی صدیوں سے مسلمانوں نے ریسرچ کو ننگ سا کر دیا ہے ـــــ اس لئے مسلمانوں کی تواریخ زیادہ تر سوالوں کی تواریخ ہے ـــــ چنانچہ ان کتابوں میں بھی واضح جواب نہیں ہیں مگر کچھ واضح اشارے ضرور مل جاتے ہیں۔"
"میں ضرور پڑھوں گا۔" وہ آنکھیں جھپکتے ہوئے بولا۔

بنکاک سے ملیلا واپس پہنچا تو کسی جانے والے کے ہاتھ میں نے بھولا کو دونوں کتابیں بھجوا دیں جن میں ایک جنرل فضل مقیم خاں کی لکھی ہوئی تھی (Pakistan's Crisis in Leadership) اور دوسری ڈاکٹر صفدر محمود کی لکھی ہوئی تھی (The Deliberate Debacle)۔

دو تین ماہ بعد جب بنکاک گیا تو بھولا سے ملاقات ہوئی۔
"میں نے دونوں کتابیں پڑھی ہیں۔" وہ کہنے لگا "اور کئی حصے تو بار بار پڑھے ہیں۔"
"پھر؟"
"ان میں اتنی تحقیق تو نہیں ہے کہ سب سوالوں کا جواب مل جائے۔ مگر پھر بھی اتنا مواد ضرور ہے کہ میں پڑھتے پڑھتے روئے بغیر نہ رہ سکا۔"
"کوئی نئی چیز ملی؟"
اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میرے لئے دو چیزیں نئی تھیں۔"
"کیا؟"
"پہلی تو یہ کہ مغربی پاکستان میں بھی جنگ اتنے ہی عجب اور نافہم انداز میں لڑی گئی جتنی مشرقی پاکستان میں لڑی گئی تھی۔"
وہ خاموش ہو گیا۔
"اور دوسری؟" میں نے قدرے انتظار کے بعد پوچھا۔
"شاید تمہیں یاد ہو کہ ایک اخبار نویس نے مشرقی حصے پر حملے کے فوراً بعد جنگ کے متعلق تین قیاس آرائیاں لکھ کر اپنے اخبار کو بھجوائی تھیں۔"
میں نے اثبات میں سر ہلایا۔
"یہ کتابیں تاثر دیتی ہیں کہ تیسری قیاس آرائی کے درست ہونے کا امکان ہے۔ شاید اسی لئے مغربی پاکستان کی طرف سے بھی جنگ دھیمی رکھی گئی۔ اور ہندوستان پر بھرپور حملہ نہیں کیا گیا تاکہ ہندوستان کو مشرقی پاکستان میں آسانی سے فتح ہو جائے ـــــ مگر اسے ثابت کرنے کے لئے کافی تحقیق اور ریسرچ کی ضرورت ہو گی ـــــ ڈاکٹر صفدر محمود کی تو کتاب کا نام اس قیاس آرائی کے عین مطابق ہے یعنی دانستہ تباہی (The Deliberate Debacle)[1] اور کتاب کے متن میں بھی یہی قیاس آرائی بار بار سر اٹھاتی ہے کہ جنگ شروع ہوتے ہی یحییٰ خاں نے فیصلہ کر لیا کہ مغربی پاکستان میں فوج کا اقتدار قائم رکھنے کے لئے مشرقی پاکستان میں ہتھیار ڈال دیے جائیں گے۔ مگر مجھے یوں لگتا ہے کہ یہ فیصلہ جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی کیا جا چکا تھا۔ اور اسی لئے حکومت کے اکثر اقدامات سے باغیوں اور شرپسندوں کی حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔ ہمیں ریسرچ کی ضرورت ہے۔"

---

[1] صفحہ ۱۸۸ اور ۱۹۳

ہم دونوں اپنے اپنے خیالات میں کھو گئے۔
مگر کتابیں میں نے واپس لے لیں کیونکہ ان پر نشانات وغیرہ لگائے گئے تھے۔
میں اگلی چھٹیوں میں پاکستان آیا تو بھولا کے لئے ان کتابوں کی دو دو جلدیں لے گیا۔
"دوسری کس لئے؟" اس نے پوچھا۔
"دوسروں کے لئے۔۔۔ بنگلہ دیش میں۔۔۔ شیخ مجیب الرحمان قتل ہو چکے ہیں۔ بھٹو پھانسی پا چکے ہیں۔ اب شاید لوگ ٹھنڈے دل سے ان پر غور کر سکیں۔"
وہ مسکرایا۔
"میں جانتا ہوں بھولا! بنگلہ دیش کے لوگ ہمیشہ سے ایسی کتابیں پاکستان کے لوگوں کی نسبت زیادہ پڑھتے ہیں" میں نے کہا۔
بھولا کافی دیر خاموش بیٹھا رہا۔ پھر کہنے لگا "چوہدری کی کتاب اور یہ دو کتابیں پڑھنے کے بعد میں کئی دنوں سے سوچ رہا تھا کہ تین اہم فیصلوں نے پاکستان کی تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ اور اس کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ پہلا فیصلہ تھا۔ ون یونٹ کا خاتمہ۔ دوسرا تھا۔ ایک فرد ایک ووٹ کا اعلان۔ اور تیسرا تھا اسمبلی میں دو تہائی اکثریت سے فیصلوں کی بجائے سادہ اکثریت۔ یہ فیصلے ۔۔۔ اور یہ تینوں فیصلے یحییٰ خاں نے خود کئے۔ بغیر کسی کے مشورے کے۔ اور کافی مخالفت کے باوجود۔ اگر یہ فیصلے نہ ہوتے تو شاید کوئی سیاسی حل نکل سکتا تھا اور علیحدگی نہ ہوتی۔۔۔" وہ خاموش ہو گیا۔ پھر کہنے لگا۔ "اب تم خود ہی سوچو کہ یحییٰ خاں کے سارے فیصلوں کا رخ ایک ہی جانب کیوں ہے۔"
"ہاں یہ تو سوچنے کی بات ہے۔"
"اور پھر جس انداز میں پاکستان کے دونوں حصوں میں جنگ لڑی گئی اس کا رخ بھی انہی فیصلوں کی جانب ہے۔" وہ دھیرے سے کہنے لگا "یہ فیصلے ایسے کیوں ہوئے ۔۔۔ یہ جنگ ایسے کیوں لڑی گئی؟ خدا معلوم ان سوالوں کا جواب کب ملے گا؟"
"کبھی بھی نہیں بھولا!" میں نے کہا۔
"کیوں؟"
"مسلمانوں کی ریسرچ دشمنی کی وجہ سے ۔۔۔ عرصہ پہلے جب مصلحت کاروں نے دین میں غلط روایات داخل کیں، اور کسی نے حقیقت کو روایت سے الگ کرنے کے لئے ریسرچ کی تو وہ گردن زدنی ٹھہرا کیونکہ اس سے مصلحت کاروں کا اسلام خطرے میں آ جاتا تھا۔ بعد ازاں جب مصلحتیں ہماری عادت بنتی گئیں تو ریسرچ دشمنی ہمارا مزاج بنتا گیا۔"
وہ سوچ میں ڈوب گیا۔
ایک اور موقع پر باتوں کا رخ ایک دفعہ پھر اس طرف مڑ گیا کہ مشرقی پاکستان کے حالات نے کوئی دیرپا اثرات ہم پر چھوڑے ہیں یا نہیں۔ اس پر تو ہم دونوں متفق تھے کہ داخلی شخصیت پر ہونے والے اثرات ہم نہیں بھی سکتے۔ بلکہ دیکھنے والے بہتر اندازہ کر سکتے ہیں مگر اس کے علاوہ بھولا نے تسلیم کیا کہ جب بھی بنگلہ دیش کے قومی وسائل کی کمی کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ وہ ۱۹۷۱ء کے پہلے کے زمانے کو یاد کرتا رہتا ہے۔ اور اس ضمن میں ۱۹۷۱ء کے واقعات اسے ذہنی اور جذباتی طور پر ہراساں کرتے رہتے ہیں۔ یہ تو محض داخلی تجربہ تھا۔ مگر اس کے علاوہ بھی خارجی حالات اثرانداز ہوتے تھے۔ بنگلہ دیش میں تو اس کی سابقہ پاکستانیت حکومت کی طرف سے الزام کی شکل میں ہمیشہ اس کے سر پہ معلق رہی۔ مگر بین الاقوامی ادارے ESCAP میں بھی بعض لوگ اسے اس جرم کی سزا دینے میں مصروف رہتے تھے۔
میں اس کا مطلب سمجھ گیا اور کہا "میں اس کی تصدیق کر سکتا ہوں۔ کیونکہ بین الاقوامی ادارے میں میرا تجربہ بھی تمہارے جیسا ہی ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"میری کتاب 'چہرے' معلوم نہیں پاکستان میں اکثر لوگوں نے پڑھی ہے یا نہیں۔ مگر ایشیائی ترقیاتی بنک کے چند سینیئر ہندو افسران نے خوب غور سے پڑھی ہے۔ اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو ۱۹۴۷ء سے پہلے تعلیم مکمل کر لینے کی وجہ سے اردو پڑھ سکتی تھی۔ اس کتاب کی وجہ سے وہ میرے اس قدر مخالف ہیں کہ قدم قدم پر میرے راستے میں رکاوٹ پیدا کرتے رہتے ہیں —— اور تم جانتے ہو کہ اس بنک کی ساخت میں ہی ہندوستان کا بہت زیادہ کنٹرول بنایا گیا ہے۔"

بھولا چند منٹ سوچتا رہا۔ پھر کہنے لگا "ایسی رکاوٹیں ہمارے بزرگوں کو برعظیم کے سٹیج پر بہت شدت سے پیش آئی تھیں۔ جس کا علاج انھوں نے یہ کیا کہ پاکستان بنا ڈالا۔ اب ہم بین الاقوامی سٹیج پر اسی تجربے سے گزر رہے ہیں۔ مگر یہاں کوئی علاج نظر نہیں آتا کیونکہ بین الاقوامی سطح پر شہریوں کی عزت ملک سے ہوتی ہے۔ اور اگر ہمارے ملک کمزور ہیں تو اُن کے شہری خوار ہی رہیں گے اور طاقتور ملکوں کے ہاتھوں زک اٹھاتے ہی رہیں گے —— یہ بھی ۱۹۷۱ء کا شاخسانہ ہے۔ مگر یہ بات پاکستان والے سمجھتے ہیں نہ بنگلہ دیش والے۔"

سلسلہ روز و شب چلتا رہا۔

دو تین ماہ گزر گئے۔

ایک دفعہ میں بنکاک پہنچا تو ماہ رمضان کے آخری دن تھے۔ بھولا کے گھر افطاری کرتے کرتے عید کی نماز کا پروگرام بنا۔ اور عید والے دن بھولا گاڑی لے کر صبح صبح میرے ہوٹل پہنچ گیا۔

عید کی نماز ایک چھوٹی سی مسجد کے باہر کھلے میدان میں تھی۔ مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے چار پانچ سو کے قریب مسلمان جمع تھے جن میں اکثر —— تھائی لینڈ کے لوگوں کی تھی۔ میں حیران ہوتا رہا کہ یہ ملک مشرق بعید میں واقع ہے جہاں مذہب کے بندھن پاکستان کی نسبت خاصے ڈھیلے ہیں اور سماجی ماحول بھی ہمارے ملک کی طرح سخت گیر نہیں بلکہ گرم جوشی ہے۔ اور مسکراہٹ اور خوشی کا گلا دبانے کی بجائے اسے صحیح مقام دیتا ہے۔ مگر پھر بھی یہ تہوار ویسا ہی بے جان اور بے روح ہے۔ جیسے مسلمانوں کے اکثر تہوار ہمارے ہاں ہوتے ہیں —— مسلمان جہاں بھی ہے۔ زندگی سے اتنا دور کیوں ہے؟!

نماز سے واپسی پر گاڑی میں بھولا نے بتایا کہ بنکاک میں ساٹھ کے قریب مسجدیں بیان کی جاتی ہیں۔

"مسلمانوں کی آبادی کافی ہے یہاں؟"

"اتنی زیادہ نہیں کہ اعداد و شمار میں خاص ذکر ہو۔ مگر پھر بھی کافی لگتی ہے۔ کئی دکانوں پر قرآنی آیات ٹنگی نظر آتی ہیں کئی ٹیکسیوں میں اللہ یا محمدؐ لکھا ہوا نظر آتا ہے۔" بھولا کہنے لگا۔

"سماجی طور پر کیسے ہیں؟"

ویسے ہی جیسے مسلمان ہر جگہ ہیں پس ماندہ، جاہل، ترقی اور تعلیم دونوں سے دور بھاگنے والے۔ چھوٹے چھوٹے کاروبار چھوٹی چھوٹی نوکریاں —— بنکاک میں بھکاری زیادہ نہیں —— مگر جتنے ہیں ان میں مسلمان زیادہ ہیں —— میں اکثر سوچتا ہوں۔ ایسا کیوں ہے؟"

"منیلا میں بھی اکا دکا بھکاری نظر آ جاتا ہے۔" میں نے کہا، "مگر جب مسلمانوں کے علاقے مہارلیکا (Maharlika) میں نماز کے لیے جاتے ہیں تو وہاں بھکاریوں کے غول کے غول ہیں۔"

گاڑی چلتی رہی۔

بھولا خود ہی بولا "آج کل ایسی سوچیں بہت تنگ کرتی ہیں ــــ نہ معلوم کیوں؟"

"اس لئے کہ تم نے اسلامی تواریخ کی ایک بڑی شکست اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔" میں نے یاد دلایا۔

"وہ تو تم نے بھی دیکھی ہے ــــ کیا تم بھی یہی سوچتے ہو؟"

"ہاں سوچتا بھی ہوں اور نتیجے پر بھی پہنچ چکا ہوں کہ مسلمان ہر جگہ پس ماندہ کیوں ہے۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ مسلمان خودکشی کر رہے ہیں ــــ کسی مورخ نے لکھا ہے کہ جس طرح افراد خودکشی کرتے ہیں، اسی طرح قومیں بھی خودکشی کرتی ہیں ــــ اور مسلمان جہاں بھی ہے خودکشی میں مصروف ہے ــــ پاکستان سمیت۔"

بھولا نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ میں نے بات جاری رکھی "خودکشی کرنے والا فرد اپنے گلے میں رسی کا پھندا ڈالتا ہے جو اس کا سانس روک دیتا ہے۔ مسلمانوں نے اپنے گلے میں اپنے ہی منفی رویوں کے پھندے ڈالے ہوئے ہیں جو ہمارا سانس بھی روک رہے ہیں۔ اور سوچیں بھی ــــ ہم خود بھی یہ بتدریج موت محسوس کرتے ہیں۔ مگر پھندے کھولنے کی ہر کوشش کی مخالفت کرتے ہیں۔ اور یہی خودکشی ہوتی ہے۔"

"کون سے منفی رویے ہیں؟" وہ پوچھنے لگا۔

"سب سے پہلے تو یہی کہ مذہب کے بارے میں سوچ یا غور و فکر کی نفی۔ اگر روایات کے بھوسے میں سے کوئی شخص حقیقت کی سوئی تلاش کرنا چاہے تو اس پر کفر کے الزام لگ جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ تلاش از حد ضروری ہے ــــ کیونکہ اسلام دسویں صدی پر منجمد ہو چکا ہے۔"

"وہ کیسے؟" بھولا پوچھنے لگا۔

"وہ ایسے کہ چاروں فقہیں پہلے تین سو سال کے اندر اندر مرتب ہو چکی تھیں۔ اور ریسرچ کے بعد صحیح حدیثیں بھی مرتب ہو چکی تھیں۔ پھر دسویں صدی میں علما نے مل کر اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا۔ اور سوچ کو دفن کر دیا۔ اب پچھلے ایک ہزار برس سے حقیقت پر روایات اور مصلحتوں کی مٹی پڑ رہی ہے۔ مگر اسے ہٹانے کے لئے سوچ یا ریسرچ کی مخالفت ہوتی ہے کہ اس سے اسلام خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ یہ عجیب منطق ہے کہ پہلے تین سو سال میں تو ریسرچ کی ضرورت تھی مگر اگلے ایک ہزار سال میں ریسرچ کی ضرورت نہیں رہی۔ نتیجہ یہ کہ آج بیسویں صدی میں مسلمان ذہنی طور پر دسویں صدی میں ہی رہ رہے ہیں۔ اور اسلام کے نام پر وہ کچھ قبول کر رہے ہیں جو اسلام نہیں ہے ــــ علامہ اقبالؒ بھی یہی احتجاج کرتے کرتے مر گئے کہ

اسلام ہے محبوس مسلمان ہے آزاد"

ہم دونوں کی گفتگو کا انداز اب کچھ ایسا ہی رہنے لگا تھا۔ ماضی کو کب تک یاد کرتے۔ ملک بھی جدا جدا تھے۔ اور قومی سیاست موضوع نہ بن سکتی تھی۔ غم روزگار پر بہت بات چیت ہو چکی تھی۔ غم دل سنانے کا بھی زمانہ گزر چکا تھا کہ ہوسٹل کی شام میں مولانا حسرت موہانی کی طرح فرمائش کرتے؛

آؤ حسن یار کی باتیں کریں زلف کی، رخسار کی باتیں کریں

یوں لگتا تھا کہ عام انداز کی باتیں ختم ہی ہو گئی ہیں۔ اور اپنی ذات جس کا پھیلاؤ عام طور پر لا محدود ہوتا ہے۔ نہ تو موضوع ہی بنتی تھی اور نہ ہی دوسرے ہر موضوع میں گھس پڑتی تھی بلکہ کچھ عجیب سے انداز میں اپنی ذات کی نفی سی ہو گئی تھی اور ہم اپنے ذاتی گرد و پیش اور مسائل کے متعلق گفتگو کرنے کی بجائے زیادہ تر عالمِ اسلام کی بات کرتے رہتے۔ شاید اس لئے کہ اب ہم دونوں میں یہی ایک قدر مشترک تھی۔ نہ ہم وطن رہے تھے۔ نہ دفتر میں ہم پیشہ رہے تھے، اور نہ پیشے میں ہم قدم رہے تھے۔ صرف ہم امت ہی رہ گئے تھے اور امت بھی ایسی جو ساری دنیا میں پریشان حال تھی۔ اس کی تاریک ترین حالیہ پریشانی میں ہم دونوں ہم سفر تھے۔ تجربہ تلخ تھا اس لئے ہو سکتا

ہے کہ بقولِ اقبالؒ؛

جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا

والا معاملہ ہو اور خونِ جگر سے ماضی کی ہم خیالی اور رہبریِ مستقبل کی ہم نظری میں بدل گئی ہو. بہر حال زیادہ تر بات چیت دنیا بھر میں مسلمانوں کی زبوں حالی کی طرف چل پڑتی. اس گفتگو کا ماحصل مختصراً کچھ یوں تھا.

عالمِ اسلام کو عرصہ سے دو دشمن اندر ہی اندر سے کھوکھلا کر چکے ہیں. پہلا بادشاہت یا ڈکٹیٹرشپ. اور دوسرا جہالت.

اس وقت چھپن (۵۶) مسلمان ممالک اقوامِ متحدہ کے ممبر ہیں. مگر ان میں سے صرف ایک میں جمہوریت ہے[1]. باقی سب صدیوں سے بادشاہوں یا ڈکٹیٹروں کے تحت کراہ رہے ہیں جن کی مطلق العنانی ہر قسم کے احتساب سے بالا ہے. ان کا واحد مقصد اپنے اقتدار کو قائم رکھنا. اور اپنی گرفت کو مضبوط تر کرنا ہے. اس کے لئے یہ انتہائی بے شرمی سے غیروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن جاتے ہیں اور بڑی دلیری سے قوم فروشی اور قوم کشی سے اپنوں کا استحصال کرتے ہیں.

دانستہ ظلم اور استبداد کے علاوہ یہ بادشاہ قوم کو دانستہ جاہل رکھتے ہیں تاکہ لوگ سوچنے، پرکھنے اور سوال کرنے کے قابل نہ ہو سکیں آج کل دنیا میں سب سے کم تعلیم اور سب سے زیادہ جہالت اسلامی ملکوں میں ہے. کیونکہ تعلیم دشمنی حاکموں کی مستقل اور مسلسل پالیسی ہے. اس لحاظ سے عالمِ اسلام میں صدیوں سے ملکی نسلوں کا قتلِ عام ہو رہا ہے.

جاہل امت کا دوسرا حاکم جاہل ملّا ہے. جو دین کی تشریح بادشاہ کے مفاد کے مطابق کرتا ہے. اس ملی بھگت سے دونوں جاہل عوام پر بھرپور حکومت کرتے ہیں. ایک خدا کے نام پر اور دوسرا سلطنت کے نام پر. ہر وہ چیز جس سے ان کے مشترکہ اقتدار کو خطرہ ہو سکتا ہے. غیر اسلامی قرار دی جاتی ہے. چاہے وہ جمہوریت ہو. تعلیم ہو. سوچ ہو یا تحقیق ہو. بلکہ بعض اوقات تو اسلام کو بھی غیر اسلامی قرار دے دیتے ہیں. اس طرح کسی بھی قسم کی روشن خیالی اور روشن ضمیری کو دنیائے اسلام کی ریاکارانہ فضا میں نہیں آنے دیتے. یہ دونوں ہاتھ مل کر معصوم مسلمانوں کا مسلسل گلا دبا رہے ہیں اور ساتھ ہی منفی رویوں کی مسموم فضا برقرار رکھتے ہیں تاکہ قوم کو ہوش نہ آسکے.

ان کی مصلحت کوشی کی وجہ سے اسلام کی صورت اتنی بگڑ گئی ہے کہ اصل اسلام کا پتہ ہی نہیں چلتا ——— قرآن خدا نے دیا، سنت نبیؐ نے دی. اور فقہ انسان نے بنائی. مگر ملا صرف انسان کی بنائی ہوئی فقہ کو اسلام سمجھتے ہیں اور بقولِ اقبالؒ

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں

اس طرح انھوں نے اسلام کو ایک غیر فطری مذہب بنا دیا ہے. جو دن بدن زندگی سے دور ہوتا جا رہا ہے. اس کی ایک مثال یہ ہے کہ جمالیات کے بیکراں امکانات کو صرف فنِ تعمیر، خطاطی اور قوالی تک محدود کر دیا ہے.

چنانچہ مجموعی صورتِ حال یہ ہے کہ پچپن (۵۵) بادشاہوں اور چند سو ملاؤں کے ہاتھوں میں دنیا بھر کی آبادی کا قریباً پانچواں حصہ صدیوں سے یرغمال بنا ہے. جس پر وہ جہالت، منفی رویوں، نقلی اسلام اور جبر کی مدد سے بدترین قسم کی حکومت کر رہے ہیں.

اسلام اور مسلمانوں کی بقا صرف اسی میں ہے کہ وہ ملوکیت اور ملا کے خلاف جہاد کریں. اور تعلیم کو فروغ دیں. اسلامی دنیا کا ہر فرد اسلام کی سب سے بڑی خدمت یہی کر سکتا ہے کہ اپنے بچوں کو اپنی استطاعت کے مطابق زیادہ سے زیادہ تعلیم دلائے. اور اسلامی تواریخ کے مطالعے پر بھی اتنا ہی زور دے جتنا کتاب و سنت کے مطالعے پر دیا جاتا ہے تاکہ مسلمان اسلام فروشی، قوم کشی اور غداری کے ان ہتھکنڈوں

---

[1] یہ ملائشیا ہے. غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں ۵۵ فی صد مسلمان ہیں اور باقی ۴۵ فی صد غیر مسلموں کی وجہ سے جمہوریت لازمی ہو گئی ہے.

سے واقف ہو سکیں جن کے اسلامی تواریخ میں ڈھیر لگے ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ذرائع ابلاغ ہمیشہ سے اسلامی تاریخ کا صرف وہ حصہ بتاتے رہتے ہیں جو عہدِ رسالت اور خلافت راشدہ کے اٹھائیس (۲۸) برس اور واقعہ کربلا کے متعلق ہے۔ باقی تیرہ سو برس کی تاریخ سے قوم ناآشنا ہی رہتی ہے اور اسی وجہ سے بادشاہوں کے ہاتھوں بار بار وہی دھوکے کھاتی ہے جو ماضی میں بار بار ہوتے ہیں۔

بادشاہوں کا تختہ الٹ کر جمہوریت لانے اور عوامی تعلیم سے ملا کا مقابلہ کرنے کے بعد ہی مسلمان کی سوچ آزاد ہوگی اور پروان چڑھے گی۔ اسی حالت میں علامہ اقبال کا یہ خواب پورا ہو سکے گا کہ ہمیں اجتہاد کے ذریعے اسلامی شریعت کو جدید علوم کی روشنی میں از سرِ نو مرتب کرنا چاہیے[1] یہی مسلمان ملکوں کا آئیڈیل ہونا چاہیے تاکہ وہ دسویں صدی سے زقند لگا کر بیسویں اور اکیسویں صدی میں پہنچ سکیں۔

اپریل ۱۹۸۳ء میں میرا چارج پھر تبدیل ہو گیا۔ تھائی لینڈ سے تعلق ٹوٹا تو ہنکاک جانا ہی بند ہو گیا، اور یوں ستار سے ملاقات کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ نئے چارج کے مطابق اب میں ملائشیا جانے لگا۔

ملائشیا

ملائشیا کے دارالحکومت کوالالمپور میں گھومتے ہوئے میں شہر اور لوگوں کو خوشگوار حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

ہوٹل، کلب، بازار، شراب خانے، سبھی کچھ دیکھا۔ مسجدوں میں نمازیں پڑھیں۔ سرکاری دفاتر سے رابطہ رہا تو حیرت کے ساتھ خوشی بھی ہوئی کہ عالم اسلام میں یہ واحد ملک ہے جہاں مسلمانوں نے اپنی زندگی کو فرسودہ خول میں بند نہیں کیا بلکہ عصر حاضر کی دھڑکن اپنے سینوں میں اتارنے کی کامیاب کوشش کر رہے ہیں۔ وہ بڑے مذہبی ہیں۔ مگر مذہب کو انھوں نے ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنایا۔ تعلیم ان کی اولین ترجیح ہے۔ اور وہ اسلام کے روایتی تصورات کو تنقیدی پرکھ سے تولنے کی طرف مائل ہیں۔ چنانچہ ۱۹۸۵ء میں حکومت نے پاکستانی انداز کے برقعے کو اس دلیل کے ساتھ ممنوع قرار دے دیا کہ یہ اسلامی حکم کے مطابق نہیں بلکہ عربی رسم کے مطابق ہے جو عالم اسلام نے محض رواجاً اپنائی تھی۔ وہاں کا مسلمان دسویں صدی میں رہنے کی بجائے بیسویں صدی میں ابھرنے کی جرأت آمیز کوشش کر رہا ہے —— مسلمان عورتیں سادہ لباس پہنتی ہیں، مگر تعلیم میں پیش پیش ہیں اور دفاتر، دکانوں، تجارتی اداروں اور ہوٹلوں میں دھڑا دھڑ کام کر رہی ہیں، مگر اس سے قوم کا اسلام خطرے میں نہیں پڑتا۔

شروع شروع میں یہ میرے اپنے تاثرات تھے۔ مگر پھر ستار نے بھی پرزور تصدیق کی جو کئی برسوں سے یہاں رہ رہا تھا "یہاں کئی سرکاری اور پرائیویٹ اداروں میں پرانے اسلامی تصورات پر ریسرچ کا کام ہو رہا ہے اور لوگ بڑی احتیاط سے پرانی زنگ آلود زنجیریں توڑنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ پرانے تصورات کو محض چومنے چاٹنے کی بجائے انھیں نئے خون سے زندہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔" اس نے اپنے مخصوص دھیمے اور نرم لہجے میں بتایا۔

ستار سے بھی عالم اسلام کے متعلق زیادہ بات ہوتی تھی اور برصغیر کے متعلق کم، کیونکہ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے خواب بھی چکنا چور ہو گئے ہیں۔ ۱۹۷۱ء نے انھیں وہ کچھ نہیں دیا جو ان کے نعروں نے مانگا تھا یا دنیا کو سنایا تھا —— گو وہ میرے سامنے تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا، مگر امیدوں کے لاشوں کو لاکھ چھپاؤ، وہ آنکھوں کی پتلیوں میں نظر آ ہی جاتے ہیں۔

۱۹۷۲ء میں ستار اسلام آباد میں نظر بندی سے فرار ہوا تو افغانستان کی سرحد کے پاس گرفتار کر لیا گیا تھا۔ پھر وہ لاہور میں قید رہا۔ مگر کچھ عرصہ بعد وہاں سے فرار ہو کر واہگہ کی سرحد پر پہنچا اور مشرقی پنجاب میں سے سفر کرتا ہوا دلی پہنچ گیا۔ جہاں سے ہندوستانی حکومت نے

---

[1] علامہ اقبال کی کتاب The Reconstruction of Religious Thought in Islam میں چھٹا لیکچر۔ ۱۹۸۲ء کے نقش ثانی میں صفحہ ۱۷۰، مطبوعہ شیخ محمد اشرف۔ لاہور

ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بنگلہ دیش پہنچتے ہی ستار کو شیخ مجیب الرحمان کے ذاتی سٹاف میں بطور معاشی مشیر شامل کر لیا گیا۔

بقول ستار ــــ وہ لاہور سے فرار نہ ہو سکتا تھا اگر اسے حکومت پاکستان میں کام کرنے والے چند دوستوں سے مدد نہ ملتی۔

"جس رات شیخ مجیب الرحمان کو قتل کیا گیا" ستار مجھے بتا رہا تھا "میں اپنے گھر پہ نہ تھا۔ میری بیوی ہسپتال میں تھی۔ اور میں بھی وہیں تھا ــــ اگر میں گھر پہ ہوتا تو میرا کوئی بھی حشر ہو سکتا تھا۔"

ملائیشیا کا ایک چکر لگا کر میں واپس منیلا آ گیا۔

چند ماہ بعد دوبارہ پہنچا تو وہ نومبر ۱۹۸۳ء کے دن تھے۔

بے تاب اور مضطرب دن!

جس سے بات کی وہ دلگیر نظر آیا۔ کیونکہ مسلمان ہر جگہ مضطرب تھے۔

لبنان کے شہر طرابلس کے پاس کیمپ بدادی میں فلسطینی تنظیم آزادی کے صدر یاسر عرفات پر چند باغیوں اور شامی فوج نے بھرپور حملہ کیا ہوا تھا۔ امریکہ، روس اور اسرائیل ان کو شہ دے رہے تھے اور مسلمان حکمران اس انداز میں تماشہ دیکھ رہے تھے کہ خس کم جہاں پاک۔ مغربی اخبار خوشی سے بغلیں بجاتے ہوئے یاسر عرفات کے مرنے یا سیاسی موت یا فوجی شکست کے امکانات پر بڑی بڑی سرخیوں سے تبصرے کر رہے تھے۔

کئی دن بم اور راکٹ برستے رہے ــــ ہزار سے زیادہ لوگ مارے گئے۔

ہوٹل کے کمرے میں ٹیلی ویژن پر اس جنگ کے دردناک مناظر دیکھتے دیکھتے میں نے قلم اٹھایا اور بھولا کو خط لکھا کہ مسلمانوں کی خودکشی کا ان ــــ واضح ثبوت کیا چاہیئے کہ عالم اسلام کے واحد جابر کو سارے مسلمان بادشاہ ش کرکے بعد دیگرے اپنے اپنے علاقے سے مار بھگا رہے ہیں۔ اور کروڑوں مسلمان اس سے پوری ہمدردی رکھنے کے باوجود بے بس ہیں کیونکہ عالم اسلام میں جمہوریت نہ ہونے کی وجہ سے بادشاہوں پر عوام کا کوئی زور نہیں چلتا۔

خطوط ڈاک کے حوالے کرنے کے بعد میں ستار سے ملنے چلا گیا۔

ستار اور اس کی بیگم ایلن حسب معمول بڑے تپاک سے ملے۔ گفتگو یاسر عرفات سے چلی اور میرے خط پر ختم ہوئی جو میں بھولا کو پوسٹ کر کے آیا تھا۔

ستار ایک دم بول اٹھا "ہمارا ایک ہم وطن کوئی دو ماہ پہلے بنکاک سے آیا تھا اور اس نے بتایا تھا کہ بھولا پھر ہسپتال میں ہے"

"وہی تکلیف ہے کیا؟" میں نے تشویش سے پوچھا۔

ایلن نے اثبات میں سر ہلایا۔ "وہی ہے۔ اور بہت بڑھی ہوئی کینسر اندرونی نظام بگاڑ دیتا ہے۔"

اس کی آنکھوں میں مایوسی تیر رہی تھی۔

میں سوچ رہا تھا۔ بدقسمتی سے مسلمانوں کو بھی وہی تکلیف ہے اور بہت بڑھی ہوئی۔

پھر ہم کتنی ہی دیر بھولا کی باتیں کرتے رہے۔

اگلے دن میں منیلا واپس آ گیا۔ بھولا کے گھر فون کیا تو کوئی جواب نہ تھا۔ میں نے بیمار پرسی کے لئے ایک خط لکھا ــــ اور جواب کے انتظار میں دن گزرنے لگے۔

منیلا

فلپائن میں ۱۹۸۴ء کا نیا سال روایتی دھوم دھڑکے سے طلوع ہوا۔ ساری رات آتش بازی، گولوں اور پٹاخوں کے شور کی

وجہ سے سونا ممکن نہ تھا۔ اگلے دو چار دن لوگ پچھے بیٹنے بھرکی پارٹیوں اور رت جگوں کی تھکاوٹ اتارتے رہے۔ اس لئے دفتروں میں حاضری بہت کم تھی۔ اور سڑکوں پر ٹریفک بہت کم تھی۔ لہذا یہ ہفتہ اڑی اڑی رنگت اور اداس ماحول والا ہفتہ تھا جیسے ساری فضا جمائی لے کر کسل اتار رہی ہو۔

میں دفتر کے کمرے سے نکل کر کیفے ٹیریا میں کھانا کھانے گیا تو وہاں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو بنگلہ دیش گورنمنٹ کی طرف سے ایشیائی ترقیاتی بنک سے قرضے کی گفت وشنید کے لئے آئے تھے۔

کھانے کے دوران میں نے پوچھا "آپ لطف الرحمان کو جانتے ہیں؟"

اس نے چبھتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا "آپ اسے کیسے جانتے ہیں؟"

میں نے اسے مختصراً بتایا اور پھر پوچھا کہ اس کی صحت کی انہیں کچھ خبر ہے یا نہیں۔

"وہ تو فوت ہو چکے ہیں"۔

"کب؟" میں سناٹے میں آگیا۔

"کوئی دو تین ماہ پہلے"۔

پھر وہ مجھے دیر تک تفصیلات بتاتے رہے۔

کمرے میں واپس آکر میں بے دم سا بیٹھا تھا۔ دور گویا خالی الذہن تھا۔ مگر اچانک خیال ابھرا کہ نہ معلوم بھولا نے یا سرعفات کے متعلق میرا خط پڑھا بھی تھا یا نہیں۔

میں نے حساب لگانے کی کوشش کی — جواب یوں نکلا کہ جب میں اسے خط لکھ رہا تھا تو وہ اس دنیا میں نہ تھا۔

بھیگی ہوئی آنکھوں سے میں کھڑکی کے پار ڈگمگاتے ہوئے افق کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے اچانک یوں لگا کہ بھولا کا گول مٹول چہرہ کھڑکی سے ابھرا۔ چپ چپ آنکھیں جھپکاتا رہا۔ اور پھر مسکرا کر کہنے لگا۔

"میرے لئے مسلمانوں کی ایک ہی شکست کافی تھی۔ کیا میں خوش قسمت نہیں کہ کچھ اور دیکھنے سے پہلے ہی چل دیا۔"

ضمیمہ ۶

بنگلہ دیش کے حالات

ایک اخبار نویس Anthony Mascarenhbs نے کتاب لکھی ہے جس کا عنوان ہے "Bangladesh: A Legacy of Blood" ۔کتاب کے تمہیدی نوٹ میں مصنف اسے "بنگلہ دیش کے دس سال کی افسوسناک تواریخ" لکھتا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی تھی اور اس کے پہلے ایڈیشن سے مندرجہ ذیل واقعات کا پتہ چلتا ہے۔

شیخ مجیب الرحمان کا قتل

(دور حکومت ساڑھے تین سال۔ جنوری ۱۹۷۲ء سے اگست ۱۹۷۵ء تک)

شیخ مجیب الرحمان کے قتل کی منصوبہ بندی میجر فاروق رحمان (بنگال لانسرز) نے کی تھی جس میں اس کا ہم زلف میجر خندکار عبدالرشید (سیکنڈ فیلڈ آرٹلری) بھی شامل تھا۔ ۱۴ اور ۱۵ اگست ۱۹۷۵ء کی درمیانی رات کو ساڑھے چار بجے کے قریب ۵، اور ۵:۱۰ کے درمیان

افراد پر مشتمل تین جتھے اپنے اپنے ہدف کی طرف روانہ ہوئے۔ میجر محی الدین، سابق میجر ہدیٰ اور سابق میجر نور نے لانسرز کی ایک کمپنی کے ساتھ ۳۲ دھان منڈی روڈ پر شیخ مجیب کے مکان کو گھیر لیا اور سامنے میرپور روڈ پر ایک توپ نصب کر دی۔ سابق میجر ڈالم کا گروپ عبدالرب سرنیابت (مجیب کا بہنوئی اور کابینہ میں وزیر) کے گھر پہنچا۔ اور رسالدار مصلح الدین کا گروپ شیخ فضل حق مونی کے گھر پہنچا (جو مجیب کا بھتیجا، منہ چڑھا سیاست داں اور بنگلہ دیش ٹائمز کا ایڈیٹر تھا) ان تینوں گروپوں کے علاوہ ایک ٹینک ڈھاکہ ایرپورٹ کی رن وے پر رکاوٹ بن کر کھڑا ہو گیا تاکہ کوئی ہوائی جہاز اتر نہ سکے۔ ایرپورٹ کے کنارے توپیں نصب کر دی گئیں جن کے نشانے مجیب کی ذاتی فوج راکھی بھاہینی کے ہیڈکوارٹر پر قائم کر دیئے گئے۔ میرپور روڈ کے پل پر فوج تعینات کر دی گئی۔ دیگر فوجی دستوں نے ریڈیو سٹیشن، ایوان صدر اور نیو مارکیٹ کے قریب فوجی بیرکوں کو گھیرے میں لے لیا۔ میجر فاروق اپنے ساتھ ۲۶ ٹینک لے کر راکھی بھاہینی کے ہیڈکوارٹر کی طرف روانہ ہو گیا تاکہ ضرورت پڑنے پر انھیں قابو کر سکے۔لہ

مجیب کے گھر جانے والا دستہ مسلح سنتریوں پر آسانی سے قابو پا کر کمپاؤنڈ میں داخل ہو گیا۔ مگر برآمدے میں مجیب کے ذاتی باڈی گارڈ کے سپاہی سو رہے تھے۔ جلد سے بیدار ہو کر انھوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ پھر باقاعدہ لڑائی شروع ہو گئی۔ باہر سے توپ نے آٹھ فائر کئے مگر کوئی بھی گھر کو نہ لگا۔ مجیب کے دونوں لڑکے (کمال اور جمال) سٹین گن سے حملہ آوروں کو چند لمحوں کے لئے روکنے میں کامیاب ہو گئے مگر جلد ہی خود بھی گولیوں کا نشانہ بن کر مارے گئے۔ اوپر کی منزل سے شیخ مجیب الرحمان نے راکھی بھاہینی، فوج کے کمانڈر انچیف جنرل شفیع اللہ اور اپنے ملٹری سکرٹری بریگیڈیر مشہود الحق کو فون کئے اور پھر سیڑھیوں سے نیچے اترتے ہوئے اس کا میجر محی الدین سے سامنا ہو گیا جسے شیخ مجیب نے ڈانٹنا شروع کیا اور باتوں میں لگانا چاہا تاکہ کچھ وقت مل جائے اور کمک پہنچ جائے ـــــ مگر اتنے میں سابق میجر نور موقع پر پہنچ گیا اور اس نے کچھ چیختے ہوئے سٹین گن سے برسٹ مارا اور شیخ مجیب الرحمان سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا منہ کے بل نیچے آن گرا۔

اس وقت صبح کے پانچ بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے۔ پھر باقی گھر والوں کا قتل عام جاری رہا جس کے بعد قاتلوں نے جی بھر کر گھر کی تلاشی لی اور ہر قیمتی شے لوٹ لی۔

شیخ مجیب کا چہرہ دیکھنے کے لئے ایک فوجی نے گردن کے نیچے پاؤں ڈال کر رخ سیدھا کیا۔ چند گھنٹے بعد انفرمیشن ڈیپارٹمنٹ والوں نے اسی حالت میں فوٹو لے کر اخباروں کو دیئے۔

دریں اثنا سرنیابت اور شیخ مونی بھی قتل ہو چکے تھے ـــــ مجموعی طور پر اس المیے میں شیخ مجیب کے گھرانے کے اکیس (۲۱) افراد قتل ہوئے۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے کتاب کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں۔

"قوم نے شیخ مجیب کے لئے کوئی آنسو نہ بہائے ...... لندن میں چند بنگلہ دیشی نوجوانوں نے (بنگلہ دیش) کے ہائی کمیشن پر یلغار کی، شیخ مجیب کی تصویریں پھاڑ ڈالیں، اور اس کے ذاتی سٹاف آفیسر کو زدوکوب کیا۔ ہائی کمشنر سید عبدالسلطان شیخ مجیب کا انتہائی معتبر اور معتمد افسر تھا اور ہمیشہ شیخ کی وفاداری کا برملا اعلان کرتا تھا۔ مگر اس نے کبھی ان نوجوانوں کو لاقانونیت اور غنڈہ گردی کے لئے گرفتار کرانے کی کوئی کوشش نہ کی بلکہ ان کے ساتھ مل کر شیخ مجیب کی باقی سب آرائشی تصاویر بھی اتار پھینکیں اور انھیں اپنے ساتھ چائے پلائی" (صفحہ ۸۲)

مجیب، سرنیابت اور مونی کے گھرانے کے مقتولوں کو ڈھاکہ چھاؤنی کے قبرستان میں خاموشی سے دفنا دیا گیا۔ صرف شیخ مجیب کی نعش ایرفورس کے ہیلی کوپٹر میں آبائی گاؤں ٹونگی پاڑا بھیجی گئی اور خاندانی قبرستان میں دفن کی گئی۔ انقلاب اور قتل کی خبر پہنچتے ہی گاؤں والوں

لہ مزے کی بات یہ ہے کہ یہ ایمونیشن حاصل کرنے میں ناکام رہے تھے اور فائر نہ کر سکتے تھے۔ مگر ان میں سے صرف دو کے نقارے کی دہشت سے ہی راکھی بھاہینی کا پورا بریگیڈ (۳۰۰۰ افراد) سہم کر رہ گیا۔ حالانکہ وہ پریڈ کی حالت میں پوری طرح مسلح کھڑے تھے۔

نے شیخ مجیب کے آبائی گھر پر یلغار کی اور سب کچھ لوٹ لیا۔" (صفحہ ۸۴)

"شیخ مجیب کی موت کے دس سال بعد (اس کی لڑکی حسینہ نے مجھے بتایا کہ آبائی گاؤں ٹنگی پاڑا میں وہ (ابھی تک) رشتہ داروں اور ہمسایوں کو رضامند نہیں کر سکی تھی کہ شیخ مجیب کی قبر پر مناسب یادگار بنائی جائے۔" (تمہید صفحہ ۵)

"اپنا عہدہ سنبھالنے کے ایک ماہ کے اندر اندر مجیب نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ ہندوستان کے دوستی اور باہمی امداد کا ۲۵ سالہ معاہدہ کیا۔ (ماضی میں) ہندوستان کی فوج نے بنگلہ دیش بنانے میں مدد کی تھی مگر مجیب (آئندہ کے لئے بھی) بیرونی جارحیت کے موقع پر ہندوستان کا تحفظ چاہتا تھا۔ اس لحاظ سے یہ معاہدہ بنگلہ دیش کی فوج کو فالتو بنا دیتا تھا جو محض آرائش کے لئے یا اندرونی امن برقرار رکھنے کے لئے رہ جاتی تھی۔" (صفحہ ۳۶)

"شیخ مجیب کے قتل کا منصوبہ بنانے کے متعلق میجر فاروق نے اس کتاب کے مصنف کو اپنے ذاتی انٹرویو میں بتایا "میں کافی عرصہ تک سوچتا رہا کہ کیا شیخ مجیب کو (قتل کرنے کی بجائے) صرف اقتدار سے علیحدہ کیا جائے۔ اور انڈونیشیا کے صدر سکارنو کی طرح گھر میں نظر بند کیا جائے (مگر اس میں قباحت یہ تھی کہ) اگر ہم اسے محض قید کر دیتے تو اس کے حامی ہمیں ختم کر دیتے۔ میں جانتا تھا کہ شیخ مجیب ہندوستان پر بہت بھروسہ کرتا ہے۔ اس کا قوی امکان تھا کہ مجیب کا کوئی حامی ہندوستان کو مداخلت کی دعوت دیتا یا ہندوستان خود ہی اپنی فوج بھیج دیتا تاکہ مجیب کو دوبارہ اقتدار دلایا جائے...... مگر میں نے محسوس کیا کہ اگر مجیب کو قتل کر دیا جائے تو ملک میں کوئی ردِ عمل نہ ہو گا اور ہندوستان کو مداخلت کا بہانہ نہ مل سکے گا۔ درحقیقت مجیب نے ہندوستان سے اپنی محبت کی پینگیں اس قدر بڑھالی تھیں کہ اس کے قتل کے علاوہ اور کوئی راستہ نہ تھا۔ اس طرح اس نے خود ہی اپنی موت کو بلایا تھا۔" (صفحہ ۵۰)

خوندکر مشتاق احمد

(دورِ حکومت ۸۳ دن — ۱۵ اگست ۱۹۷۵ء سے ۳ نومبر ۱۹۷۵ء تک)

اس کتاب کے مطابق خوندکر مشتاق عوامی لیگ کا نائب صدر تھا اور ۱۹۷۱ء میں فوجی کارروائی کے وقت فرار ہو کر ہندوستان چلا گیا تھا۔ کلکتہ میں بنگلہ دیش کی جلاوطن حکومت (مجیب نگر حکومت) قائم ہوئی تو تاج الدین احمد وزیرِ اعظم تھا اور اس کی کابینہ میں خوندکر مشتاق احمد وزیرِ خارجہ تھا۔ مگر ۱۹۷۱ء کے دوران میں ہی امریکہ اور ہنری کسنجر نے کوشش کی کہ عوامی لیگ میں پھوٹ پڑ جائے اور پاکستان ٹوٹنے سے بچ جائے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے خوندکر مشتاق احمد کا انتخاب کیا[1] اور اس سے ساز باز کرنے لگے (صفحہ ۶۲) اسی وجہ سے جب بنگلہ دیش کے قیام کے بعد مجیب نگر حکومت ڈھاکہ منتقل ہوئی تو وزیرِ اعظم تاج الدین احمد نے خوندکر مشتاق احمد کو وزارتِ خارجہ سے برطرف کر دیا۔ مگر جب شیخ مجیب نے واپس آ کر اپنی پہلی کابینہ بنائی تو خوندکر مشتاق احمد کو شامل کر لیا اور جب ۱۹۷۵ء میں شیخ مجیب نے صدارتی نظام نافذ کیا تو خوندکر مشتاق احمد کو وزیرِ تجارت بنا دیا۔

شیخ مجیب کے قتل کی سازش کے دوران ہی میجر فاروق رحمان اور میجر خوندکر عبدالرشید نے خوندکر مشتاق سے طے کر لیا تھا کہ حکومت کی تبدیلی کی صورت میں صدر کا عہدہ اسے دیا جائے گا۔ خوندکر مشتاق اور خوندکر رشید آپس میں رشتہ دار ہرگز نہ تھے مگر خوندکر مشتاق کا انتخاب اس لئے کیا گیا تھا کہ وہ نیک نام اور بالغ نظر سیاست دان تھا جس کے خلاف بے ایمانی اور کرپشن کا کوئی الزام نہ تھا۔ (صفحہ ۶۳)

---

[1] جی ڈبلیو چوہدری نے بھی اپنی کتاب Last days of United Pakistan کے صفحہ ۱۹۸ پر اس کوشش کا ذکر ذرا مختلف انداز میں کیا ہے جو صدر نکسن کی طرف سے ہو رہی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ کوشش (عوامی لیگ میں پھوٹ ڈلوانے کے لئے نہ تھی) کسی کھلی مفاہمت کے لئے تھی اور مجیب نگر حکومت میں سے صرف تاج الدین احمد اس کا مخالف تھا البتہ خوندکر مشتاق احمد اور سیکرٹری امور خارجہ مسٹر عالم بہت شدت سے کسی راضی نامے کے خواہاں تھے۔ اسی لئے بنگلہ دیش کے قیام فوراً بعد دونوں کو وزارتِ خارجہ سے ہٹا دیا گیا۔

مجیب کے قتل کے فوراً بعد سابق میجر دالم نے ریڈیو پر اعلان کر دیا کہ شیخ مجیب قتل ہو چکے ہیں۔ فوج نے خوندکر مشتاق کی رہنمائی میں اقتدار سنبھال لیا ہے۔ مارشل لاء نافذ ہو چکا ہے اور آئندہ ملک کا نام اسلامی جمہوریہ بنگلہ دیش ہوگا (اسلامک ری پبلک آف بنگلہ دیش) چند گھنٹے بعد جب صدر مشتاق نے ریڈیو پر تقریر کی تو اسلامی جمہوریہ کے بارے میں تو کچھ نہ کہا مگر بسم اللہ پڑھنے کے بعد تقریر شروع کی اور خاتمے پر اردو میں "بنگلہ دیش زندہ باد" کہا (صفحہ ۸۱) اس وجہ سے کافی دنوں تک دنیا بھر کے اخباروں میں اور بنگلہ دیش میں چہ میگوئیاں ہوتی رہیں کہ آیا بنگلہ دیش سیکولر ہے یا اسلامی۔

خوندکر مشتاق نے اپنی پہلی کابینہ میں مجیب کے حواریوں میں سے کوئی بھی شامل نہ کیا اور شیخ مجیب کے معتبر افسروں کو بھی معطل کر دیا (صفحہ ۸۲) اس کے علاوہ سابقہ مجیب نگر حکومت کے چاروں نمایاں سربراہوں کو گرفتار کر لیا (تاج الدین احمد، سید نذر الاسلام، منصور علی اور قمر الزماں) کیونکہ یہ ہندوستان کی حمایت سے حکومت تبدیل کر سکتے تھے (صفحہ ۸۵) صدر مشتاق نے نہ صرف قاتل میجروں کی معافی کا اعلان کیا بلکہ انھیں ترقی دے کر لیفٹیننٹ کرنل بنا دیا، اور ریڈیو پر اپنی تقریر کے دوران انھیں "درخشندہ فوج کے روشن سپوت" کہا۔ بعد ازاں اپنے ذاتی سٹاف میں شامل کر لیا۔

صفحہ ۹۱ پر مصنف لکھتا ہے "خوندکر مشتاق احمد بظاہر پاکستان سے دوبارہ الحاق نہیں چاہتا تھا مگر اپنے ہر عمل سے اس تاثر کو تقویت دیتا تھا۔ مجیب کی موت کے بعد عہدہ سنبھالنے کے بعد مشتاق نے بنگلہ دیش کو واضح طور پر پاکستان کی حمایت میں رنگ دیا۔ اس کے وزیر خارجہ جسٹس ابو سعید چوہدری نے مجھے بتایا کہ ہماری خارجہ پالیسی پاکستان کی حامی ہے۔ اسلامی ممالک کی حامی ہے اور امریکہ کی حامی ہے۔ مشتاق نے پیر صلاح الدین (دادو میا) کو اپنی حکومت کا خاص سفیر بنا کر اسلام آباد بھیجا اور پاکستان کے ساتھ فوراً سفارتی تعلقات قائم کر لئے، حالانکہ مجیب نے سفارتی تعلقات قائم کرنے سے اس وقت تک پرہیز کرنے کا اعلان کیا تھا جب تک پاکستان بنگلہ دیش کو قومی اثاثوں کا حصہ نہیں دے گا۔ مزید براں مشتاق نے اپنے گرد ان تمام افسروں کو جمع کر لیا جو بنگلہ دیش کی جنگ آزادی میں پاکستان کا ساتھ دے رہے تھے"۔

غالباً یہی وجہ تھی کہ حکومتِ پاکستان کے خاص مشیر محمود علی (جو بنگالی ہیں)، مجیب کی موت کے تین ہفتے بعد لندن پہنچ گئے اور فون پر ڈھاکہ سے رابطہ قائم کر لیا۔ اس کے علاوہ بھی مختلف ایلچیوں کے ذریعے ان کا مشتاق سے رابطہ تھا۔ محمود علی بڑے پُر امید تھے کہ کسی بھی وقت ڈھاکہ سے دونوں ملکوں کے "اتحاد کا اعلان" ایک جھنڈے اور ایک نام" کے ساتھ ہو جائے گا۔ مگر تین ہفتے انتظار کرنے کے بعد نامراد واپس چلے گئے (صفحہ ۸۷) اس وقت کے چیف آف آرمی سٹاف جنرل ضیاء الرحمان نے مصنف کو کو بتایا تھا کہ انھیں قوی شک تھا کہ مشتاق پاکستانیوں کے ساتھ سازباز کر رہا تھا۔ (صفحہ ۸۸)

چنانچہ جلد ہی افواہیں پھیلنے لگیں کہ ہندوستان مشتاق کی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کر رہا ہے۔ بقول صدر مشتاق "۲ نومبر سے پہلے رکشا چلانے والے بھی کہتے تھے کہ کچھ ہونے والا ہے" (صفحہ ۹۰) لوگوں کا شک عام طور پر جنرل ضیاء (چیف آف آرمی سٹاف) یا بریگیڈیر خالد مشرف (چیف آف جنرل سٹاف) کے بارے میں تھا کہ یہ ہندوستان سے سازباز کر رہے ہیں (صفحہ ۹۱)

بریگیڈیر خالد مشرف

(دورِ حکومت ۴ دن)

دو نومبر ۱۹۷۵ء کی رات کو ایوان صدر کی حفاظت کرنے والے تین سو فوجی چپکے چپکے غائب ہو گئے۔ کرنل فاروق اور کرنل رشید نے (جو اب ترقی پانے کے بعد صدر مشتاق کے مشیر تھے) فوراً ٹینکوں کو ایوان صدر کے گرد حفاظت کے لئے کھڑا کر دیا۔ پو پھٹتے ہی چھاؤنی

سے پیدل فوج کے دستوں نے آکر ایوانِ صدر کا محاصرہ کر لیا اور خانہ جنگی کے لئے میدان بچ گیا مگر طرفین فائر کرنے میں ہچکچاتے ہے۔

تھوڑی دیر بعد بریگیڈیر خالد مشرف کا ایلچی وفد ایوانِ صدر میں مطالبات لے کر پہنچا جن میں سے ایک مطالبہ یہ تھا کہ بنگلہ دیش کی پالیسی تبدیل کر کے ان ملکوں سے تعاون کیا جائے جو ماضی میں ہمارے دوست رہے ہیں (صفحہ ۹۰) ہندوستان کی واضح مداخلت کے سامنے ایوانِ صدر میں محصور لوگ بے بس ہو گئے۔ کئی گھنٹوں کی گفت و شنید کے بعد کرنل فاروق اور کرنل رشید سمیت ان سترہ لوگوں کو ملک چھوڑ کر جانے کی اجازت دے دی گئی جنھوں نے مجیب کو قتل کیا تھا (خوندکر مشتاق بھی ملک چھوڑ کر جانا چاہتا تھا، مگر بریگیڈیر خالد مشرف نہ مانا) چنانچہ تین نومبر کی شام کو ایک فوکر جہاز ان کو بنکاک لے گیا۔

تین، چار اور پانچ نومبر ۱۹۷۵ء کو صدر کے طور پر نام تو خوندکر مشتاق کا ہی چلتا رہا مگر وہ درحقیقت ایوانِ صدر میں بریگیڈیر خالد مشرف کا قیدی تھا جو لوگوں کے ردعمل کو کند کرنے کے لئے مشتاق کو فوراً صدارت سے علیحدہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بالآخر چھ نومبر کو اس نے جسٹس عبدالسادات صائم کو بنگلہ دیش کا صدر مقرر کر دیا۔

بریگیڈیر خالد مشرف پر عام الزام یہ ہے کہ اس نے بنگلہ دیش کو دوبارہ ہندوستان کے چنگل میں لانے کے لئے بغاوت کی (صفحہ ۱۰۴) ویسے یہ حقیقت ہے کہ صدر مشتاق اور مجیب کے قاتلوں کے خلاف بغاوت پر ہندوستان میں خوشی کے شادیانے بجائے گئے۔ ہندوستانی پریس اور سرکاری ریڈیو اس بغاوت کی تعریف میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش کر رہے تھے (صفحہ ۱۰۵) جس سے یہ خیال تقویت پکڑتا گیا کہ بریگیڈیر خالد مشرف سے یہ بغاوت ہندوستان نے کرائی تھی۔ ڈھاکہ شہر میں کئی جلوس مجیب کے گھر کی طرف چلے جن میں ایک کی قیادت بریگیڈیر خالد مشرف کی ماں اور بھائی کر رہے تھے اور دھان منڈی روڈ پر شیخ مجیب کا گھر پھولوں اور ہاروں سے بھر دیا گیا۔ (صفحہ ۱۰۵)

مگر چھ نومبر کی رات کو فوج کے سپاہیوں نے بغاوت کر دی۔ رات ہی رات میں ڈھاکہ چھاؤنی اور بنگلہ دیش کے چیدہ چیدہ شہروں میں بارش کی طرح اشتہارات پھیل گئے کہ بریگیڈیر خالد مشرف غدار ہے۔ اور ہندوستان کا ایجنٹ ہے (صفحہ ۱۰۷) سات نومبر کی صبح کو بریگیڈیر خالد مشرف کو اس کے دو افسروں نے گولیوں سے چھلنی کر دیا۔

ایک اہم واقعہ یہ ہوا کہ جیسے ہی بریگیڈیر خالد مشرف کی بغاوت کی خبر پھیلی تو سابقہ مجیب نگر حکومت کے چاروں نمایاں سربراہ (تاج الدین احمد، سید نذرالاسلام، منصور علی اور قمرالزماں) جیل میں ہی قتل کر دیئے گئے۔ ایک دوسرے مصنف نے لکھا ہے کہ تاج الدین احمد نے ہندوستانی ہائی کمشنر کو خط لکھا تھا جس میں خالد مشرف کی بغاوت کی اطلاع پیشگی دی گئی تھی۔ اور یہ چاروں لیڈر میرون کر جیل سے نکلنے کی تیاریاں کر رہے تھے جب انھیں قتل کیا گیا۔ (صفحہ ۹۷)

انشائیہ

معمول کی چھتری

سیّد مشکور حسین یاد

عام طور پر آدمی ہوتا کچھ ہے اور اپنے آپ کو سمجھتا کچھ ہے۔ اگر وہ اپنے اس سمجھنے اور ہونے کے فرق کو ذہن میں رکھے تو بہت سی پریشانیوں اور تکلیفوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ لیکن آدمی کی زندگی میں ایسے لمحے بہت ہی کم آتے ہیں جب وہ اپنے آپ کو وہی سمجھتا ہو جو اصل میں وہ ہے۔ گویا ان پُرشعور لمحوں کی تعداد اتنی کم ہے کہ جس کو ہم نہ ہونے کے برابر سمجھ لیں تو یہ کوئی غلط بات نہ ہوگی۔ لہٰذا اس مسئلہ کا بہترین حل یہی ہے کہ آدمی جو کچھ اپنے آپ کو سمجھتا ہے وہ بھی سمجھتا رہے اور فی الحقیقت وہ جو کچھ ہے اس کو بھی فراموش نہ کرے۔ لیکن جیسا کہ ابھی ابھی عرض کیا گیا ہے۔ آدمی عموماً اپنے اصل ہونے کو یعنی اپنی اصلیت کو نظر انداز ہی کرتا ہے اور جو کچھ اپنے آپ کو سمجھتا ہے اُسی کو اصل حقیقت نہ صرف خود ماننے لگتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی منوانا چاہتا ہے۔

ہم آدمی کے اس رویے کو عیاری اور فریب پر مبنی اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ کوئی اپنے آپ کو کچھ بھی سمجھتا رہے، دوسرے لوگ اُس کی اصلیت کو عام طور پر سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہاں کسی کو دھوکا دینے کی نسبت آدمی اپنے آپ کو دھوکا زیادہ دیتا ہے بلکہ سچ پوچھئے تو وہ اس صورتِ حال میں صرف اپنے آپ ہی کو دھوکا دیتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی معمولی لکھنے والا اپنے آپ کو بہت بڑا ادیب سمجھتا ہے تو اُس کے اس طرح سمجھنے سے دنیا والے اُس کو بڑا ادیب کبھی نہیں سمجھیں گے اور جب ایسا نہیں سمجھیں گے تو ظاہر ہے اُس کی وہ قدر و منزلت بھی نہیں ہو گی جو ایک بڑے ادیب کی قدر و منزلت ہوا کرتی ہے۔ غرض اس تمام صورتِ حال میں دوسروں کو نہ کوئی تکلیف پہنچتی ہے اور نہ ہی وہ کسی قسم کے دھوکے میں آتے ہیں۔ یہاں تو وہ شخص خود ہی تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے۔ جو خواہ مخواہ اپنے آپ کو بڑا ادیب سمجھ رہا ہے۔ یہ مثال محض لکھنے والوں تک محدود نہیں۔ ہر شعبۂ حیات کا آدمی اپنے بارے میں غلط فہمی کا شکار رہتا ہے۔ خواہ کوئی معمولی فن کار ہو یا کوئی اہل کار، وہ اپنے آپ کو سمجھتا وہی کچھ ہے جو اصل میں وہ نہیں ہے۔ غرض کوئی معمولی پہلوان ہو یا کوئی معمولی اداکار، معمولی تاجر ہو یا کوئی معمولی عہدہ دار کسی نہ کسی انداز میں وہ خود کو بڑا سمجھے بغیر باز نہیں آتا۔

ایک اعتبار سے دیکھا جائے تو آدمی کا اس طرح اپنے آپ کو کچھ سمجھنا اُس کی عام زندگی میں ترقی کے لئے بہت ضروری ہے۔ اگر اس طرح آدمی اپنے آپ کو کچھ نہ سمجھے تو اُس کی ہمت کے ٹوٹ جانے کے بہت امکانات ہیں اور ظاہر ہے جب ہمت نہ رہی تو اس کے قدم آگے کس طرح بڑھ سکتے ہیں۔! لہٰذا یوں آدمی کا اپنے آپ کو کچھ سمجھنا خواب دیکھنے کے مترادف ٹھہرتا ہے اور آپ جانتے ہیں زندگی کے من مانے اور من بھاونے حقائق

کو سامنے لانے کے لئے خواب دیکھنا شرطِ اولین ہے ـــــ آدمی خواب نہ دیکھے تو زندگی کی دل فریب حقیقتیں جلدی سے بے نقاب نہیں ہوتیں۔ غرض آدمی اگر اپنے آپ کو وہ کچھ سمجھتا ہے جو اصل میں وہ نہیں ہے لیکن اصل میں وہ ہونا چاہتا ہے تو یہ کوئی ایسی خرابی کی بات نہیں۔ خرابی کی بات یہ ہے کہ وہ اپنی اصلیت کو بالکل ہی فراموش کر دے اور جو کچھ اپنے آپ کو سمجھتا ہے بس وہی سمجھتا رہ جائے۔ اس طرح سمجھنے سے نہ صرف آدمی کا شخصی ارتقا رک جاتا ہے بلکہ وہ دھوبی کا کتا بن جاتا ہے جو گھر کا رہتا ہے نہ گھاٹ کا۔ اس کے علاوہ وہ مسلسل کرب میں جو مبتلا ہو جاتا ہے یہ ایک الگ عذاب ہے۔

اس عذاب کی تمازت اور اس کرب کی ژالہ باری اور مینہ سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے معمول کی چھتری یعنی آدمی اپنے آپ کو ایسا اور ویسا سمجھنے کے بجائے عام آدمی سمجھے۔ جیسے ہی وہ اپنے آپ کو عام آدمی کی سطح پر لے آتا ہے اُس کے بہت سے دکھ اور غم خود بخود ختم ہونے لگتے ہیں۔ معمول کی چھتری کے نیچے آنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی دنیا میں اپنے آپ کو تنہا محسوس نہیں کرتا۔ یوں خواہ عام آدمی کے سر پر ہر روز لاکھوں طرح کے غم و آلام کے سورج آگ برساتے رہیں لیکن اُس کی فضا میں تنہائی کا سورج کبھی سوا نیزے پر نہیں آتا۔ ہمدردی کی چھاؤں نصیب ہوتی ہو یا نصیب نہ ہوتی ہو لیکن یہاں اُسے اپنی طرح کے دکھوں میں شریک اور مبتلا دوسرے بہت سے افراد نظر آتے ہیں، اور تنہائی کے غم کو دور کرنے کے لئے یہ ابتلا اور شراکت عام ہونے کے باوجود کوئی کم حیثیت چیز نہیں، بڑی طاقت ور اور توانائی سے بھرپور چیز ہے۔ غیر معمولی بننے کے شوق میں آدمی عموماً رفاقت کے اس سرچشمے کو فراموش کر جاتا ہے۔ معمولاتِ زندگی میں آدمی کے لئے رفاقت کی اتنی زیادہ صورتیں موجود ہوتی ہیں کہ وہ اُن سے بہرہ ور ہونے کے بجائے بے اعتنائی برتنا شروع کر دیتا ہے اور عموماً یہ بے اعتنائی غفلت کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ معمول کی چھتری کے نیچے آ کر دوسرا بڑا اطمینان کا سانس آدمی یہ لیتا ہے کہ اُس کی ذات سے وابستہ تصنع اور بناوٹ کی تمام بیڑیاں ایک ایک کر کے ٹوٹ گرتی ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے بے ساختہ پن کے سارے حیرت آفریں سوتے معمولاتِ زندگی سے پھوٹتے ہیں ـــــ بے ساختہ پن کا آزادی کے ساتھ براہِ راست تعلق ہے۔ جس قدر آدمی بے ساختگی اور بے تکلفی کی فضا میں آزادی سے تخلیقی کام لے سکتا ہے کسی دوسری فضا میں آزادی سے اس قدر کام نہیں لے سکتا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو معمولاتِ زندگی ہمیشہ گوناگوں امکانات سے لدے پھندے رہتے ہیں۔ کہنے کو ہر روز حسبِ معمول مشرق سے سورج طلوع ہوتا ہے یعنی ہر روز صبح ہوتی ہے اُس صبح کی دوپہر اور شام بھی ہوتی ہے، لیکن ہر روز کی صبح دوپہر اور شام کے دامن میں امکانات کی دولت و ثروت کا ایک الگ ہی خزانہ جگ مگ کر رہا ہوتا ہے۔ آج کی صبح کے امکانات اور ہیں کل کی صبح کے امکانات اور ہوں گے۔ وہی بات کہ معمولاتِ زندگی کے ہاتھ کبھی خالی نہیں ہوتے وہ زندگی کے ہر لمحے کی جھولی میں ہر وقت کچھ نہ کچھ ڈالتے رہتے ہیں۔ آدمی کو معمول کی امارت کا احساس کیوں نہیں ہوتا۔ وہ غیر معمول کی طرف کیوں بھاگتا ہے یا غیر معمول کی تلاش میں کیوں رہتا ہے؟ اس سوال پر بھی اگر ذرا توجہ کے ساتھ غور کیا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ سوال خود اپنا جواب آپ ہے یعنی آدمی کا معمول سے غیر معمول کی جستجو میں رہنا یہ بتاتا ہے کہ اُسے معمول سے بہت کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔ معمولاتِ زندگی معمولی نہیں ان کا دامن غیر معمولی اشیا سے بھرا پڑا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ معمولاتِ زندگی خواب نہیں ہیں لیکن اس میں بھی ذرہ برابر شک نہیں کہ معمولاتِ زندگی خوابوں کا ایک بڑا مضبوط اور قابلِ اعتبار ٹھکانہ ہیں۔ معمولاتِ زندگی کے خلِّ عاطفت ہی میں خواب پھلتے پھولتے اور پروان چڑھتے

ہیں۔ معمولات کا سایہ نہ پڑے تو آدمی کے خواب پل بھر میں جل کر راکھ ہو جائیں۔ حقیقت حال کچھ اس طرح ہے کہ معمول کی چھتری کے نیچے آکر ہی صحیح معنی میں آدمی کی آنکھیں کھلتی ہیں۔ اس سے پہلے وہ اپنے بارے میں خواہ کچھ بھی سوچتا رہے، حق آگاہی کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ آپ معمول کو بلاخوفِ تردید فرش سے تشبیہ دے سکتے ہیں لیکن یہ ایک ایسا فرش ہے جس کے تعلقات عرش کے ساتھ کبھی منقطع نہیں ہوتے۔ فرش عرش کو پل پل کی خبریں پہنچاتا ہے تو عرش کی جانب سے بھی فرش کو پل پل کی خبریں پہنچتی رہتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس وقت آدمی معمولاتِ زندگی سے بے خبر ہو کر اپنے بارے میں اُلٹی سیدھی یا بڑی اونچی اونچی باتیں سوچتا ہے تو گویا وہ اُس وقت فرش سے کٹ کر عرش پر پہنچنا چاہتا ہے اور یہی بات ناممکن ہے لیکن اسی ناممکن بات کو ممکن سے بھی کوئی ہلکی بات سمجھتے ہوئے آدمی عرش اور فرش کے مضبوط تعلقات کے درمیان آکھڑا ہوتا ہے۔

معمول کی چھتری آدمی کو اپنے سائے میں لینے کے لئے ہر وقت تیار رہتی ہے لیکن آدمی اکثر اس کی طرف سے غفلت برت کر بزعمِ خویش بہت خوش ہوتا ہے جبکہ اُس کو اس غفلت کی سزا بھی عام حالات میں جلدی ہی مل جاتی ہے۔ آدمی کی ایک خوش فہمی کی دلیل یہ بھی ہے کہ وہ سزا کو اپنے آپ سے ہمیشہ دور سمجھتا ہے۔ معمول کی چھتری آدمی کو اور بے شمار تمازتوں سے محفوظ رکھتی ہے لیکن خوش فہمی کی تمازت کے سامنے اس کی کچھ نہیں چلتی۔ یہ تمازت آر پار ہو کر سیدھی آدمی کے بھیجے کو بھون ڈالتی ہے یہ اور بات ہے کہ آدمی کو اس کا پتہ نہیں چلتا اور اُس کے ہوش مارے جاتے ہیں ـــــ اسی بے ہوشی کے عالم میں وہ اللہ کو تو پیارا نہیں ہوتا، البتہ شیطان کو پیارا ہو جاتا ہے ـــ کہتے ہیں شیطان سے بچنے کے لئے آدمی کو پھر معمولی سے غیر معمولی کی طرف سفر کرنا پڑتا ہے لیکن اس سفر میں واقعات بہت معمولی پیش آتے ہیں۔ لہٰذا غیر معمولی کی ہوس میں آدمی دوبارہ اپنے معمول کی چھتری کھولنے کے لئے ایک دوڑ لگاتا ہے ـــ اُس وقت اُس کے تمام خواب ایک گٹھڑی کی شکل میں اُس کی بغل میں دبے ہوتے ہیں ـــ معمولاتِ زندگی کے سرچشمے سے سیراب ہونے کے لئے اُس کی جان لبوں پر آئی ہوتی ہے ـــ دراصل اُس وقت اُس کو یہ بالکل یاد نہیں ہوتا کہ معمول کی چھتری کس طرح کھُلتی ہے ـــ آپ جانتے ہیں معمول کی چھتری بہت مضبوط ہوتی ہے۔ جس طرح یہ مشکل سے بند ہوتی ہے۔ اسی طرح مشکل سے کھلتی بھی ہے۔ جرأت و ہمت کے ساتھ طاقت دونوں صورتوں میں درکار ہے۔ اب یہ آدمی آدمی پر منحصر ہے کہ وہ معمول کی چھتری کھُلی رکھتا ہے یا بند۔ اور اگر یہ چھتری کھُلی رکھتا ہے تو کتنی مدت کے لئے۔ بند رکھنے کی بات نہ کیجئے۔

کچھ کھانا کھانے کے بارے میں

محمد یونس بٹ

کہتے ہیں شادی وہ معاہدہ ہے جس میں دو مل کر پوری زندگی، دن رات محبت دریافت کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں اور اسی کوشش میں ان کی جان نکل جاتی ہے۔ مگر لگتا ہے میرے دوست "ف" کی شادی ہوتے ہی اس کی بیوی نے اس کی جان نکال لی ہے۔ اسی لئے تو آج کل وہ اسے "میری جان" کہہ کر بلاتا ہے۔ کل مجھے ملنے آیا تو بڑا خوش تھا۔ اس نے خلافِ معمول "بھوک لگی ہے" کی بجائے "رومینٹک ہو رہا ہوں" کہہ کر مجھے بھی خوش کر دیا اور پھر بولا "دنیا کی وہ کون سی محبت ہے جس کے سامنے سب محبتیں ہیچ ہیں؟" میں نے کہا "اگر بیوی سامنے ہو تو بیوی کی محبت" فرمایا "میں سب سے ہیچ محبت نہیں پوچھ رہا۔ وہ محبت جس کے سامنے سب محبتیں ہیچ ہوں یہاں تک کہ خدا کی محبت بھی"

میں چپ ہو گیا کیونکہ احمق اور عقل مند میں اس وقت تک کوئی فرق نہیں ہوتا جب تک وہ چپ ہوں۔ مگر "ف" چپ نہ رہ سکا اور بولا "دنیا کی سب سے لازوال محبت کھانے کی محبت ہے اور جلدی کرو میں اس وقت بڑا رومینٹک ہو رہا ہوں"۔ پھر مجھے کھانے والی نظروں سے دیکھنے لگا۔

یہ سچ ہے کہ دنیا میں انسان جس چیز کے بارے میں سب سے زیادہ باقاعدہ سوچتا ہے وہ کھانا ہی تو ہے۔ یہ دنیا کا واحد کام ہے جو انسان ساری زندگی کرتا رہتا ہے مگر پھر بھی نہیں اکتاتا۔ اگر وہ اس کام سے اکتا جائے تو یقین کر لیں وہ بیمار ہے یا عاشق، یعنی اس کی طبیعت خراب ہے یا نیت۔

کھانے کی وجہ سے تو خدا نے آدم کو جنت سے نکال کر زمین پر بھیجا اور کھانے ہی نے یہ زمین جنت بنا رکھی ہے۔ اگر انسان کھاتا نہ ہوتا تو وہ انسان ہی نہ ہوتا، فرشتہ ہوتا۔ خدا نے تو انسان کو بنایا ہی کھانے کے لئے ہے۔ اسی لئے تو اس کے بازوؤں پر کھانے کے لئے کانٹے لگا دیئے ہیں اور دنیا میں کھانا جمع کرنے کا سب سے بڑا برتن پیٹ ہی تو ہے۔ کھانا اتنا اہم ہے کہ اللہ نے جنت میں بھی جن چیزوں کے دینے کا وعدہ فرمایا ہے ان کے ذکر سے ہی ہر قسم کی بھوک مچل اٹھتی ہے۔

پودے وہ جاندار ہیں جو پاؤں سے کھاتے ہیں اور جہاں سے کھائیں ساری عمر دھوپ میں اس پر سایہ کرتے ہیں جبکہ انسان جس سے کھائے اس کا فوراً احسان اتارنا چاہتا ہے۔ اسی لئے دوسرے کو فوراً اس قابل بنانے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کا احسان اُتار سکے۔

منہ بچے کی پہلی جیب ہوتی ہے اور جیب اس کا دوسرا منہ، وہ ہر چیز منہ میں ڈال کر اس کے ذائقے سے دوست دشمن کا پتہ چلاتا ہے۔ امریکی اتنے بچے ہیں کہ وہ بھی ہر جگہ دوست دشمن کا ایسے ہی پتہ چلا رہے ہوتے ہیں۔

جانور اور انسان میں یہ فرق ہے کہ انسان پکا کر کھاتا ہے۔ جس دن انسان نے معدے کا کام ہانڈی اور پریشر ککر

سے لینا شروع کیا وہ جانور سے انسان بنا۔

کھانا ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو کمزور ہو۔ کمزوری کا دوسرا نام کھانا ہے۔ کھانا سب کی کمزوری ہے اور کمزور سب کا کھانا۔ خالی پیٹ ہو تو بھرے پیٹ والے یاد آتے ہیں۔ پیٹ بھرا ہو تو خالی پیٹ والے کبھی یاد نہیں آتے۔ جس کا کھانا دوسرا کھا جائے اسے بھوکا نہیں کہتے بلکہ جو دوسرے کا کھانا کھا جائے اسے بھوکا کہتے ہیں۔ خالی پیٹ سوچتا اور بھرا پیٹ سوتا ہے۔

کہتے ہیں موسیقی روح کی غذا ہے اور اس غذا کے ذائقے کا اندازہ گانے والے کے لمحہ لمحہ بگڑتے منہ سے لگایا جا سکتا ہے۔

میرا پسندیدہ کھانا وہ ہے جیسے کھانے والا میری پسند کا ہو۔ مزیدار کھانا وہ ہوتا ہے جو مزید نہ ہو۔ کھانا پکانے کے لئے عقل کی بجائے پریشر ککر استعمال ہوتا ہے البتہ کھانے کے لئے عقل چاہیئے۔ اسی لئے بُرا کھانا پکایا تو جا سکتا ہے مگر کھایا نہیں جا سکتا۔ سنا ہے اچھا کھانا بُرے خیالات پیدا کرتا ہے اسی لئے ہندو پروہت نوجوان بیواؤں کو وہ کھانا نہیں دیتے جو خود کھاتے ہیں۔

میرا دوست "ف" کہتا ہے جب دل کے درمیان ایک لکیر کھینچی جائے تو دال بنتی ہے اور وہ گھر میں دال یوں کھاتا ہے جیسے کسی دعوت میں مرغ کھا رہا ہو یعنی تھوڑی سی کھائی باقی کھائی میں پھینک دی۔ کہتا ہے کسی قوم یا قبیلے کے کھانے کے آداب سے ان کے رہن سہن کا پتہ چلتا ہے۔ اسی لئے کسی قوم یا قبیلے کے بارے میں غلط رائے دینے سے پہلے ان کے ہاں کا کھانا ضرور کھا لیتا ہے۔ لیکن کہتا ہے میں نے کبھی کسی کا نمک نہیں کھایا۔ اس لئے دوسرے "نمک خوار" کی بجائے صرف "خوار" ہی سمجھتے ہیں۔

انسانوں میں جسے دوسرے کھلائیں وہ بڑا آدمی کہلاتا ہے اور جانوروں میں جسے جب تک دوسرے کھلائیں بچہ کہلاتا ہے۔ انسان دنیا آنکھوں سے نہیں معدے سے دیکھتا ہے۔ معدہ خالی ہو تو دنیا میں کہیں کچھ نظر نہیں آتا۔

جب عمر غم کھا کھا کے تھک جائے تو پھر غم عمر کو کھانے لگتا ہے۔ یوں ہی ہفتوں اور مہینوں کے لقمے بنا کر موت زندگی کو کھاتی ہی رہتی ہے۔

ہماری شاعری دراصل شاعر کا مینو ہی تو ہے جس میں محبوب و رقیب سے ڈانٹ، حسد، غصہ اور غم کھانے کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ان کی شاعری تاریخ کی بجائے محبوب کا جغرافیہ ہی ہوتی ہے۔ اس میں اگر تاریخ ہو بھی تو اسے انگریزی میں زیادہ سے زیادہ "ڈیٹ" ہی کہہ سکتے ہیں۔

کہتے ہیں جو چربی آپ کھاتے ہیں دراصل وہ چربی آپ پہنتے ہیں۔ یوں کھانا جسم کا لباس بنتا ہے۔ شاید اسی لئے عورتیں ڈائٹنگ کرتی ہیں۔

بوفے کرنا میرا پسندیدہ کھیل ہے۔ میرا دوست "ف" کہتا ہے بوفے کھیل نہیں، یہ تو کھانا کھانا ہے۔ بالکل غلط! یہ تو کھانا اکٹھا کرنا ہے۔ کھانا کھانا بھی تو ایک ورزش ہے یقین نہ آئے تو "ف" کو کھانا کھاتے دیکھ لیں۔ بیاہ شادیوں پر تو کھانا کھانے کے ٹورنامنٹ بھی ہوتے ہیں۔

میرا دوست "ف" جو کہتا ہے کر کے دکھاتا ہے اور وہ کہتا ہے لڑنا اور کھانا کھانا دونوں وحشیانہ عمل ہیں۔ کہتے ہیں مولوی، پروہت اور "ف" کھانا یوں کھاتے ہیں جیسے آخری بار کھا رہے ہوں۔ حالانکہ یہ درست نہیں۔ وہ کھانا یوں کھاتے ہیں جیسے پہلی بار کھا رہے ہوں، بلکہ وہ تو صرف اسی چیز کو حلال مانتے ہیں جسے کھا سکیں۔ میرا دوست "ف" کہتا ہے "میں حرام نہیں کھاتا" ٹھیک کہتا ہے۔ شاید ہی اس نے کبھی گھر کا کھانا کھایا ہو۔

اکیلے کھانا دراصل خود کلامی کرنا ہے۔ چھری کانٹوں سے کھانا ایسے ہی ہے جیسے بندے نے گفتگو کے لئے ترجمان رکھا

ہو کسی کے ساتھ کھانا دراصل اس سے محبت کرنا ہے۔ اسی لئے بندہ ہر کسی کے ساتھ ہم کلام تو ہو سکتا ہے ہم طعام کسی کسی کے ساتھ ہوتا ہے۔

سر بڑھ جائیں تو دماغ کم ہو جاتے ہیں۔ محبوب بڑھ جائیں تو محبت کم ہو جاتی ہے۔ رفتار بڑھ جائے تو عمر کم ہو جاتی ہے اور کھانے بڑھ جائیں تو بھوک کم ہو جاتی ہے۔

غریب کے لئے دوا بھی غذا ہے اور امیر کے لئے غذا بھی دوا ہے۔ دنیا میں بدقسمت شخص وہ ہوتا ہے جس کے پاس بھوک ہو مگر کھانا نہ ہو اور اس سے بڑا بدقسمت وہ ہوتا ہے جس کے پاس کھانا ہو اور بھوک نہ ہو۔

"آئی لوّ یُو" کہنا

محمد یونس بٹ

کہتے ہیں اس دنیا میں محبت پہلے پیدا ہوئی اور انسان بعد میں۔ شاید اسی لئے وہ بچہ جس کی عمر اس دنیا میں ایک دن ہوتی ہے وہ جس محبت کا نتیجہ ہوتا ہے اس کی عمر مہینوں میں ہوتی ہے۔ میں لفظ محبت کی تصویر بناؤں تو جو تصویر بنے گی وہ یقیناً کسی بچے کی ہوگی۔ یوں بھی بچے کا پیدا ہونا دراصل اللہ کا دنیا والوں کو "آئی لو یو" کہنا ہی ہے کیونکہ جس دن اسے محبت نہ رہی پھر یہاں کوئی بچہ نہیں آئے گا، قیامت آئے گی۔ لیکن "ف" کہتا ہے جب محبت شروع ہوئی اس وقت بچہ کہاں تھا؟ پہلی محبت حوا سے ہوئی تھی اور آخری بھی اسی سے ہوگی۔ محبت اور عورت لازم و ملزوم ہیں۔ یہی نہیں دنیا میں سب سے پہلا مکمل فقرہ جو بولا گیا وہ جس زبان میں بھی تھا وہ "آئی لو یُو" ہی تھا اور وہ حوا ہی کے لئے تھا کیونکہ عورت سے پہلے تو دنیا میں مکمل خاموشی تھی۔

لفظ انسان کی سب سے بڑی ایجاد ہیں۔ جس کام کے لئے وہ پہلے سارا جسم ہلاتا، اب صرف زبان ہلاتا ہے۔ جب انسان جنگلی تھا وہ آئی لو یُو کہنے کی بجائے کرتا تھا۔ مادہ کے لئے خوراک لاتا، اس کے سامنے ناچ کر عجیب حرکتیں کر کے یہی اظہار کرتا۔ جب اسے یہ کام مشکل لگا تو اس نے سوچا کھُل جا سم سم کی طرح ایسا اسم اعظم ہونا چاہیئے جس سے عورت کے دل کا دروازہ کھل جائے تو اس نے یہ فقرہ ایجاد کیا۔ اس دنیا کی آدھی ترقی اس فقرے کو بولنے کی وجہ سے ہوئی ہے اور باقی آدھی اسے نہ بولنے کی وجہ سے۔

"آئی لو یُو" وہ چراغ ہے جسے رگڑنے سے بندہ خود الہ دین کا جن بن جاتا ہے اور کسی مالک کو حاضر کر کے اس کا حکم مانتا ہے۔

دنیا میں وہ لفظ جسے کہنا بیک وقت سب سے آسان اور سب سے مشکل ہے وہ "آئی لو یُو" ہی ہے۔ وہ لوگ بھی جو بحیثیت حکمران، بحیثیت دوست، بحیثیت باپ، بحیثیت خاوند، غرضیکہ ہر حیثیت سے عظیم رہے وہ بھی اچھے لوور نہیں رہے۔ "ف" کہتا ہے اس لئے کوئی بڑا آدمی کبھی بڑا لوور نہیں ہوا کہ کوئی بڑا لوور کبھی بڑا آدمی نہیں ہوا۔ یہ غلط ہے انہی بڑے آدمیوں کے نام سکولوں کالجوں میں طلباء کو مار مار کر یاد کرائے جاتے ہیں جب کہ عاشقوں کا ذکر کسی نصاب میں نہیں ہوتا، مگر وہ ملکی لیول کی بجائے محلہ لیول کا ہی کیوں نہ ہو اس کا نام سب کی زبان پر ہوتا ہے۔ بڑے آدمی دماغ میں رہتے ہیں تو عاشق دل میں۔

محبت اس سے ہوتی ہے جس کی خامیاں بھی اچھی لگیں اور شادی اس سے جس کی خوبیاں اچھی لگیں۔ شادی میں ایک اور ایک گیارہ بلکہ اس سے بھی زیادہ ہو جاتے ہیں جبکہ محبت میں ایک اور ایک مل کر ایک ہوتے ہیں۔ محبت انسان ہمیشہ اپنے جیسے سے کرتا ہے یعنی جو بُری عورت سے محبت کرتا ہے وہ اچھا آدمی نہیں ہو سکتا اور جو بُرے آدمی سے

محبت کرتی ہے وہ ماں کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ ماں اور محبوبہ میں یہ فرق ہے کہ ماں چلنا اور بولنا سکھاتی ہے اور محبوبہ رکنا اور چپ رہنا۔ محبت میں عورتوں نے بڑی بڑی بے وقوفیاں کی ہوں گی مگر وہ اس سے کہیں کم ہیں جو شاعروں نے محبت کے بارے میں اپنے شعروں میں کی ہیں۔

کہتے ہیں محبت اس سے ہوتی ہے جو خوبصورت ہو، حالانکہ خوبصورت وہ ہوتا ہے جس سے محبت ہو۔ جس نے ایک بار بھی "آئی لو یو" نہیں کہا وہ قابلِ اعتبار نہیں اور جس نے بار بار یہ فقرہ کہا وہ بھی قابلِ اعتبار نہیں۔ اسے کاغذ کی بجائے زمین پر لکھا جائے تو اسے تاج محل کہتے ہیں۔ درخت اپنی شاخوں پر یہ فقرہ لکھ دیں تو اسے پھول کہتے ہیں اور پھول "آئی لو یو" کہیں تو اسے خوشبو کا نام دیا جاتا ہے۔

میرا دوست "ف" کہتا ہے میں کئی بار محبت میں مبتلا ہوا اور ہر بار صحت یاب ہو گیا۔ کہتا ہے محبت اندھی ہوتی ہے۔ اس کی محبوبہ دیکھ لو تو آپ کو اس کی بات کا یقین بھی ہو جائے گا۔

جو صرف دوسروں سے محبت کرتا ہے وہ ہرگز محبت نہیں کرتا۔ آئی لو یو صرف وہ شخص کہہ سکتا ہے جو اپنے آپ سے محبت کرتا ہے۔ یہ کہنا آسان نہیں۔ شاعر یہ ایک فقرہ کہنے کے لئے پورا دیوان کہہ دیتے ہیں مگر پھر بھی نہیں کہہ پاتے۔

محبت میں جب آدمی محبوب کی تعریف کرتا ہے تو دراصل وہ اپنی تعریف کرتا ہے کہ میں نے کتنا اچھا انتخاب کیا۔ "ف" کہتا ہے محبت اس سے ہوتی ہے جسے آپ یوں ہی دیکھیں جیسے خود کو دیکھتے ہیں۔ مزید کہتا ہے کہ غسل خانے نہ ہوتے تو بندہ خود کو کبھی نہ دیکھ سکتا۔ مزید براں کہتا ہے آدمی کو محبت کرنی چاہیئے، چاہے اس کے لئے شوہر ہی کیوں نہ بننا پڑے۔ دنیا میں ایک خوبصورت عورت مرد کو کئی عورتوں سے بچالیتی ہے لیکن کسی ایک عورت سے محبت کرنے کی بجائے تمام عورتوں سے محبت کرنا آسان ہے۔

اس دنیا میں آج تک جتنے بھی جھوٹ بولے گئے ہیں۔ ان میں سے آدھے جھوٹ بولنے کے لئے آئی لو یو کہا گیا، کیونکہ دنیا کے آدھے جھوٹ خاوند بولتے ہیں اور باقی آدھے سنتے ہیں۔

کہتے ہیں محبت میں کامیابی کے لئے عورت کو چاہیئے کہ مرد کو زیادہ سے زیادہ سمجھے اور کم سے کم پیار کرے۔ اور مرد کو چاہیئے کہ عورت کو زیادہ سے زیادہ پیار کرے اور کم سے کم سمجھنے کی کوشش کرے۔ مرد اس سے پیار کرتا ہے جس کے بارے میں اچھی رائے رکھتا ہو اور عورت اس سے پیار کرتی ہے جو اس کے بارے میں اچھی رائے رکھتا ہو۔ کوئی عورت اس وقت تک مرد سے محبت نہیں کر سکتی جب تک وہ اسے اس سے کئی گنا خوبیوں والا نہ سمجھے جتنا کہ وہ ہوتا ہے۔ اور کوئی مرد اس وقت تک کسی عورت سے محبت نہیں کر سکتا جب تک وہ اسے اس سے کئی گنا کم خامیوں والی نہ سمجھے جتنی کہ وہ ہوتی ہے۔

کسی مغربی مفکر نے کیا خوب کہا ہے کہ کون کہتا ہے محبت کوئی سائنس دان لیبارٹری میں پیدا نہیں کر سکتا۔ محبت لیبارٹری میں پیدا ہو سکتی ہے بشرطیکہ لیبارٹری اسسٹنٹ واقعی پیاری ہو۔ کہتے ہیں آج کل بے لوث محبت کرنے والا نہیں ملتا۔ یہ غلط ہے۔ وہ تو آپ کو ہر گلی اور سڑک پر مل جائے گا جو آپ کی محبت میں جان تک قربان کر سکتا ہے، مگر اس کی اس لئے کوئی قدر نہیں کہ وہ دُم ہلا کر پاؤں تو چوم سکتا ہے، زبان ہلا کر "آئی لو یو" نہیں کہہ سکتا۔

ہائے یہ مشورے

پروفیسر افضل علوی

کوئی احباب کا مارا ہوگا تو کوئی حالات کا اور جو ان سے بھی بچ نکلا تو بیگمات کا۔ مگر جہاں تک ہماری ذات کا تعلق ہے تو ہم صرف مشوروں کے مارے ہوئے ہیں۔ جن سے ہماری جان، جب سے ہم نے ہوش سنبھالا ہے آج تک نہیں چھوٹی اور جب تک جان میں جان ہے چھوٹتی نظر بھی نہیں آتی۔

سچ پوچھیں تو ان مشوروں نے ہمیں کہیں کا نہیں رہنے دیا۔ ہم نے جب بھی کوئی کام کرنا چاہا کسی نہ کسی مشورے نے اُس میں ایسی ٹانگ اڑائی، کوئی نہ کوئی ایسا دھوبی پٹڑا مارا کہ ہمارا مجوزہ کام تو دھرے کا دھرا رہ گیا، البتہ اس کے بجائے ایک ایسا کام سرانجام پا گیا جو ہمارا منشا تھا نہ مقصد۔ اور پھر ستم یہ ہے کہ اگر مشورہ نتائج بخشی کے لحاظ سے مفید و مثبت ثابت ہو تو اس کا سارا کریڈٹ صاحب مشورہ لینے پر مصر ہوتے ہیں۔ لیکن اگر مشورہ الٹا پڑ جائے تو مشورہ دینے والے صاحب کوئی ذمہ داری قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتے، الٹا ہمیں مطعون کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"یار کچھ اپنی عقل سے بھی کام لینا تھا، مشورہ ہی دیا تھا کوئی حکم تو نہیں دیا تھا کہ جس سے سرتابی جرم قرار پاتی۔ تمہیں چاہیئے تھا کہ ہمارے مشورے پر عمل کرنے سے پہلے سو دفعہ سوچتے کہ یہ ٹھیک بھی ہے یا نہیں، مگر رونا تو یہی ہے کہ تم نے سوچ سمجھ سے کام لینا ہی چھوڑ رکھا ہے۔ سچی بات ہے کہ اب تو تمہیں مشورہ دیتے ہوئے بھی ڈر لگنے لگا ہے۔"

اب ان جیسے ستم ظریفوں کو کون بتائے کہ تم نے ہمیں اپنی سمجھ بوجھ سے کام لینے کے لائق رہنے ہی کہاں دیا ہے — ہمیں تو آج تک یہ حسرت ہی رہی کہ ہم اپنا کام یا اپنا کوئی منصوبہ اپنی مرضی، اپنے منشا اور اپنی عقل و فہم کے مطابق بھی کبھی پورا کریں۔ اور کچھ نہیں تو شادی ہی سہی مگر توبہ کیجئے جو ہمارے مشورہ بازوں نے کبھی ہماری یہ حسرت نکلنے دی ہو۔

چلیں شادی تو پھر قدرے اہم بات ہے مگر بھلا اب یہ بھی کوئی بات ہے کہ آدمی اپنی پسند کا جوتا یا اپنی پسند کا کپڑا بھی نہ خرید سکے۔ مانا کہ اکیلے کوئی چیز خرید نہ پانا ہماری کمزوری ہے کیونکہ ہمیں وہم سا ہو گیا ہے کہ دوکاندار اکیلے دکیلے گاہک کو دیکھ کر شیر ہو جاتے ہیں اور نہایت گھٹیا مال بھی اپنی چرب زبانی اور گاہک کی نادانی کی وجہ سے نہایت گراں قیمت پر گاہک کے سر منڈھ دیتے ہیں اور بعض اوقات تو ایسا کرتے ہوئے زبردستی کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ لیکن ہماری اس کمزوری یا وہم کا یہ مطلب بھی تو نہیں ہونا چاہئے کہ پیسے تو ہم خرچ کریں اور چیزیں لائیں اپنے ساتھیوں کی پسند کی۔ جو "ہماری مانو تو" — "ہماری سنو تو" — "ہمارا مشورہ ہو تو" کہہ کہہ کر ہر وہ چیز ہمیں خریدنے پر مجبور کر دیں جو ہمارے پروگرام ہی میں نہیں ہوتی۔ یہ ان "مشورہ بازوں" ہی کی وجہ سے تو ہوا ہے کہ بوٹ لینے گئے تو چپل خرید کر لوٹے، تولیہ کا پروگرام تھا تو رومال

پر اکتفا کرنا پڑی۔ بعض اوقات صرف جراب خریدنا ہوتی ہے تو مشورہ دینے والے جوتا خرید وا دیتے ہیں۔ کپڑا کسی رنگ کا لینا ہوتا ہے مگر یہ مشوروں کے زور سے بالکل ہی کسی اور رنگ کا کپڑا خریدنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اب ہم کیا بتائیں کہ مشوروں کی وجہ سے ہمارے اپنی پسند کے رنگ میں کتنی مرتبہ تھگ پڑی اور ہم کیسے کیسے واہیات رنگ کا کپڑا خرید کر لائے جسے دیکھ دیکھ کر کپڑے ہی کو دیا سلائی دکھانے کو جی چاہا مگر ہر دفعہ ہوشربا مہنگائی ہمارے اس عزم میں حائل ہو گئی۔

ابھی پچھلے دنوں ہم ایک سیکنڈ ہینڈ کار خریدنے کا پروگرام بنا بیٹھے۔ بس کچھ نہ پوچھیں کہ پھر ہم پر کیسے کیسے مشوروں کی یلغار اور بھرمار ہوئی۔ کبھی کہیں سے مشورہ آیا کہ زنہار جو سیکنڈ ہینڈ کار خریدنے کا سوچا بھی کہ یہ عمر بھر کا روگ خریدنے کے مترادف ہے۔ "غم نداری بز بخر" تو محاورہ ہی محاورہ ہے۔ جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ بکری زیادہ ہی ستائے تو چھری اور قصائی ہر دو ہر وقت مدد کو تیار ہیں لیکن جو چیز واقعتاً غم دنیا و غم آخرت ہر دو خریدنے کے مترادف ہے وہ سیکنڈ ہینڈ کار ہے۔ جس کو دین دنیا کا نہ رہنے دینا ہو اُسے سیکنڈ ہینڈ کار خرید وا دو۔ نتیجہ سو فیصد نکلے گا۔ بس آدمی — آدمی ہو کر بھی گھر کا رہے گا نہ گھاٹ کا صرف پٹرول پمپ یا ورکشاپ کا ہو کر رہ جائے گا — یا پھر قرض خواہوں کا۔ البتہ ورزش وغیرہ کا شوق ہو تو ایسی کار لینے میں قباحت کوئی بھی نہیں۔ کیونکہ اسے چلانے کی بجائے کھینچنا پڑتا ہے، اور یوں آدمی کا اچھا خاصا "سٹیمنا" بن جاتا ہے۔ ابھی اس مشورے کے مطابق سیکنڈ ہینڈ کار خریدنے کے ارادے سے توبہ کر کے نئی نویلی کار خریدنے کے لئے اپنی ساری جمع جتھا کے علاوہ دوست احباب سے قرض مانگنے کا پروگرام بنا ہی رہے تھے کہ اس کے خلاف ایک اور مشورہ لڑھکتا آیا۔

"خبردار جو ڈرائیونگ میں اناڑی بلکہ ناواقف ہوتے ہوئے نئی کار خریدنے کا سوچا بھی۔ کیا پیسے بہت فالتو آ گئے ہیں؟ تمہیں پتہ نہیں کہ پہلے پہل کار کے ایکسیڈنٹ بہت ہوتے ہیں۔ نئی کار میں ان کی وجہ سے ایک دو ڈینٹ پڑے تو دو تین لاکھ کی رقم گھٹ کر ستر اسی ہزار رہ جائے گی۔ لہٰذا عقل کا تقاضا ہے کہ پہلے کوئی کھٹارا سی کار لو اور اسے خوب چلاؤ۔ جہاں ٹکراتی ہے ٹکرانے دو، ایکسیڈنٹ ہوتا ہے تو ہونے دو۔ جب ڈرائیونگ میں جھجک دور ہو جائے اور اس میں مکمل طاق ہو جاؤ اور سب سے بڑی بات کہ زندگی بچ رہے تو پھر بے شک نئی نویلی کار لے لو۔"

ابھی اس صائب مشورے کے بعد سوچنا شروع ہی کیا تھا کہ کار نئی لیں یا پُرانی کہ ایک اور مشورہ عطا کیا گیا:۔

"وہ تو بعد کی بات ہے کہ کار نئی ہو یا پرانی۔ پہلے تو یہ فیصلہ ہونا چاہیئے کہ کون سی کار لینی ہے اور کس ماڈل کی۔ جب تک یہ فیصلہ نہیں ہوتا کوئی دوسری بات سوچنا ہی بے کار ہے۔"

یہ خیال کر کے کہ بات تو یہ درست ہے ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ کون سی کار لیں۔ جب بھانت بھانت کے مشورے ملنے شروع ہوئے اور لطف یہ کہ ہر مشورہ بڑی بڑی وزنی دلیلوں کے جلو میں ملا جن میں کار کی ظاہری ہیئت، قیمت اور پٹرول کی فی میل کھپت کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔

اب ان مشوروں کی یلغار میں ہمیں نہیں سوجھ رہا کہ ہم ٹیوٹا کرولا ماڈل ۱۹۷۴ء لیں یا ۱۹۷۶ء یا ۱۹۸۲ء یا پھر اسی کا تازہ ترین ماڈل لے لیں یا پھر ڈاٹسن ۱۲۰Y خرید لیں یا ڈاٹسن سنی یا سوزوکی ایئر کنڈیشنڈ لیں یا سادہ سوزوکی پر گزارہ کر لیں۔ بہرحال ان مشوروں کے بعد ہماری پہلے ہی سے کمزور قوتِ فیصلہ اب مکمل طور پر دم توڑ گئی ہے۔ اب ہمارے

لئے کار کا خریدنا اتنا مسئلہ نہیں رہا جتنا یہ مسئلہ کہ اگر خدانخواستہ کار خریدنی پڑ گئی تو وہ کون سی کار ہوگی۔ اور ہمیں یوں معلوم ہوتا ہے کہ جب تک مشوروں کی یلغار رہے گی ہم کبھی فیصلہ نہیں کر پائیں گے۔

ویسے ہمیں مشورہ دینے والوں کو ہمارے منصوبوں کی نجانے کیسے بھنک پڑ جاتی ہے کہ شادی بیاہ کی تقریبوں میں بن بلائے بھانڈوں کی طرح رنگا رنگ مشوروں کے ساتھ آموجود ہوتے ہیں۔ ہماری جان کو کھاتے۔ کہ بھئی! یوں نہیں یوں کرو" اور پھر ان کے حسبِ منشاء "یوں" کرنے سے ہمارے کاموں اور منصوبوں پر جو پانی پھرتا ہے اور جس طرح ہماری حسرتوں اور ارمانوں کا خون ہوتا ہے اگر یہ قابلِ دست اندازی پولیس ہوتا تو ہم جیلوں کی جیلیں بھروا دیتے مگر افسوس کہ تیرِ نگاہ سے قتل کرنے کی طرح اس پر بھی قانون کی کوئی دفعہ اور کوئی شق لاگو نہیں ہوتی۔ اے کاش کہ ہوتی۔ یا پھر کم از کم ہمیں ہی اپنی عقل کے بارے میں بدظنی اور دوسروں کی عقل کے بارے میں خوش فہمی نہ ہوتی۔ کیونکہ مشورہ لینے، قبول کرنے یا سننے کی تہ میں جو نفسیات کار فرما ہے وہ یہی تو ہے کہ مشورہ دینے والا زیادہ عقل مند، زیادہ دور اندیش اور زیادہ معاملہ فہم خیال کیا جاتا ہے۔ دراصل اگر بغور دیکھا جائے تو مشورے کا مطلب ہی یہ ہے کہ اپنے کام کو اپنی عقل کے مطابق نہیں بلکہ کسی دوسرے شخص کی عقل کے مطابق کیا جائے خواہ اُس دوسرے کے پاس عقل نام کی کوئی چیز ہی نہ ہو۔ خود کو، کودن، احمق، ہونق اور دوسرے کو افلاطون اور پیکرِ تدبر و فراست خیال کیا جائے۔ اب بھلا بتایئے کہ خود کو اپنی ہی نظروں میں اتنا گرانا اور دوسرے کو اتنا بڑھانا کہاں کی صحت مند ذہنیت ہے اور پھر اپنی عقل کو اپنے معاملات میں فیصلہ کن عنصر نہ بننے دینا کہاں کی دانائی ہے لیکن دہائی ہے کہ یاروں نے اپنے کاموں میں اپنی عقل سے کام لینے والوں کو اس کثرت اور تواتر سے ہٹ دھرم، ضدی، خود سر، خود رائے وغیرہ کے خطابات دیئے ہیں کہ کوئی بھی مردِ معقول اب معقولیت سے یعنی اپنی عقل سے کام لینے کو تیار نہیں ہو پا رہا اور دوسروں کی عقل اور سوجھ بوجھ سے کام لینے پر تلا ہے اور اس کا نام مشورہ رکھ چھوڑا ہے۔

مگر ہم نے مشوروں کی مسلسل مار کھا کر اب یہ مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ یار لوگ ہمیں خواہ کوئی سا خطاب دیں، خود سر کہیں، ضدی کہیں، ہٹ دھرم یا کچھ اور، مگر ہم جو کام کریں گے وہ اپنی مرضی اور اپنی عقل سے کریں گے اور کسی کو اپنی مرضی میں بعنوان مشورہ دخیل ہونے کی اجازت نہیں دیں گے۔ جب سے ہم نے یہ ارادہ کیا ہے ہمارا یہ حال ہو گیا ہے کہ اُدھر کسی نے مشورہ کرنے یا مشورہ لینے کو کہا نہیں اور اِدھر ہم سیخ پا ہوئے نہیں۔ جس کی وجہ سے اکثر اوقات بہت دلچسپ صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے۔

ابھی کچھ دن جاتے ہیں مرزا صاحب یہی غلطی کر بیٹھے اور ہمارے کسی پروگرام کے بارے میں کہہ بیٹھے کہ بہتر یہی ہے کہ اس معاملے میں پہلے احباب سے مشورہ کر لیں۔

بمجرد لفظ "مشورہ" سنتے ہی ہم تو جناب اپنے آپے اور جامے دونوں سے باہر ہو گئے اور دیر تک باہر ہی رہے۔ مرزا صاحب بیچارے حیران کہ اُن سے ایسی بھی کیا غلطی ہو گئی جو ہم مزاجِ یار کی طرح بے سبب ہی بگڑ بیٹھے۔ سو ڈرتے ڈرتے پوچھنے لگے "میاں! مجھ سے ایسی کیا گستاخی ہو گئی ہے؟ مشورہ لینے ہی کو کہہ بیٹھا تھا، کوئی گالی تو نہیں دے دی تھی؟"

"ویسے اس سے تو بہتر تھا کہ تم ہمیں گالی ہی دے لیتے، کم از کم تمہیں پتہ تو ہوتا کہ تم نے ہمیں گالی دی ہے۔ یہ تو نہ ہوتا کہ ہمیں گالی بھی دے لو اور تمہیں پتہ بھی نہ چلے کہ تم نے ہماری شان میں گستاخی کی ہے۔"

مرزا نے پہلے سے بھی زیادہ حیران ہو کر کہا "یار یہ آج تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ میں تمہاری بات سمجھ نہیں پا رہا۔ میری کسی

بات کو تم نے گالی اور گستاخی پر محمول کیا ہے ؟ ذرا کھل کر بتاؤ"

"مرزا ابھی تم نے مجھے مشورہ لینے کو کہا تھا نا!"

"ہاں کہا تھا۔ مگر کیا یہ گالی ہے ؟"

"بالکل، بالکل، ہمارے نزدیک یہ گالی سے کم نہیں۔"

"بھلا وہ کیسے، ذرا مجھے بھی تو بتاؤ" ــ مرزا نے ہمیں مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بھئی مشورہ لینے کا مشورہ دینے کا مطلب سوائے اس کے اور کیا ہے کہ تم ہمیں کم عقل، معاملہ نافہم اور غیر مدبر سمجھتے ہو۔"

"لاحول ولا قوۃ ــ بھلا تم نے مشورہ لینے کی بات سے یہ گستاخانہ مفہوم کیسے اخذ کر لیا ؟"

"یہ اخذ کر لینے کی بھی ایک ہی کہی۔ میں تو کہتا ہوں کہ اس کا مفہوم اس کے علاوہ کچھ ہے ہی نہیں۔"

"بھلا وہ کیسے ؟" مرزا نے استفسار کیا۔

"یہ تو ہم بعد کو بتائیں گے پہلے یہ بتاؤ کہ اگر تمہاری اپنی جیب میں ہزار دو ہزار روپے ہوں تو تم پچاس روپے کسی ایسے شخص سے مانگو گے جس کے پاس بیس روپے بھی بمشکل ہی ہوں ؟"

"میری بھلا مت ماری ہوئی ہے جو میں ایسا کروں، مگر یہ میری بات کا جواب تو نہیں" ــ مرزا بولے

"اگر تمہاری جیب میں پیسے نہ ہوں اور اگر ہوں بھی تو بہت تھوڑے تو بتاؤ پھر کیا کرو گے ؟" ہم نے ایک اور سوال داغا۔

"جس کے پاس پیسے ہوں گے اُس سے مانگ لوں گا" مرزا نے کہا۔

"اللہ بھلا کرے۔ اب آئے تم راہِ راست پر" ہم نے کہنا شروع کیا۔

"جس طرح آدمی کسی سے پیسے اُس وقت مانگتا ہے جب وہ سمجھتا ہے کہ اُس کے پاس پیسے نہیں اور دوسرے کے پاس ہیں اور بہت ہیں ایسے ہی آدمی مشورہ بھی اُسی وقت کسی سے مانگتا ہے جب وہ سمجھتا ہے کہ اُس کے پاس عقل نہیں اور اگر ہے تو اتنی نہیں، جتنی چاہیئے جبکہ دوسرے کے پاس بہت عقل ہے۔ لہٰذا تم ہمیں مشورہ لینے کا کہہ کر دراصل یہی کہنا چاہتے ہو کہ ہم عقلمند نہیں یا اگر ہیں تو اتنے تھوڑے کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ ہیں بھی یا نہیں۔"

"یار یہ تم نے آج عجیب اور انوکھا ہی نتیجہ نکال لیا۔ ویسے میں نے مشورہ کے اس پہلو پر کبھی غور ہی نہیں کیا تھا ؟"

"میاں مرزا اگر واقعی غور کرو تو تمہیں معلوم ہو کہ جسے تم انوکھا نتیجہ قرار دے رہے ہو یہ انوکھا نہیں بلکہ منطقی نتیجہ ہے ہم کہتے ہیں کہ ہم اپنے معاملات میں اپنی عقل کو کام میں کیوں نہ لائیں۔ کیوں دوسروں کی عقلوں سے استفادہ کریں جبکہ ہمیں پوری طرح پتہ بھی نہیں ہوتا کہ مشورہ دینے والوں کے پاس عقل نام کی کوئی چیز ہے بھی یا نہیں اور پھر مرزا جی، ہم تو خوش فہمی میں دوسروں کی عقلوں سے استفادہ کر کے (جسے یار لوگوں نے مشورہ کا نام دے رکھا ہے) جس حال کو پہنچے ہیں کچھ ہم ہی جانتے ہیں ــ اے کاش کہ ہم دوسروں کو عقلمند سمجھنے کے بجائے خود ہی کو عقلمند سمجھتے۔ بے شک لوگ اس بنا پر ہمیں بے وقوف سمجھتے کہ ہم خود کو عقلمند کیوں سمجھتے ہیں۔ پڑے سمجھا کرتے مگر ہم پوچھتے ہیں کہ خود کو بے وقوف سمجھنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ اگر لوگوں کے نزدیک یہی عقلمندی ہے تو ہم باز آئے ایسی عقلمندی سے کہ جس کی وجہ سے آدمی اپنے آپ کو احمق اور دوسروں کو عقل مند سمجھے اور نتیجتاً اپنی عقل سے کبھی کام نہ لے، مرزا جی! دنیا میں اکثر ایسے اپنی عقل کے بجائے دوسروں کی عقل سے کام لینے

بنا سے رونما ہوتے ہیں۔ چنانچہ مورخین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ شاہِ انگلستان چارلس اوّل اگر اپنے مشیروں کے مشوروں پر عمل کرنے کی بجائے اپنے ذاتی فیصلوں پر عمل درآمد کرتا جو ان مشوروں کے تحت کیے گئے فیصلوں سے بدرجہا بہتر ہوتے تھے تو اس کا وہ حشر نہ ہوتا جو ہوا کہ رعایا کو اس کا سر تن سے جدا کرنا پڑا۔ مرزا جی یہ سب کچھ مشوروں کی وجہ سے ہوا اور تم چلے ہو مجھے مشورہ لینے کا مشورہ دینے۔ مرزا وہ تو شکر ہے کہ ہم بادشاہ نہیں۔ اگر بادشاہ ہوتے تو ہمارا بھی سر کب کا تن سے جدا ہو گیا ہوتا۔ اب یہ سر تن سے جدا تو نہیں مگر لوگوں کے مشوروں پر عمل کرنے کی وجہ سے مارے ندامت اور غصّے کے بارِ دوش ہے۔ مرزا ہم کیا بتائیں کہ مشوروں کی وجہ سے ہمارے کون کون سے کام دھڑن تختہ ہو کر رہ گئے مگر نمونے کے طور پر اس مکان کے اُس کونے میں تمہیں جو ایک تعمیر سی نظر آ رہی ہے نا! بس اسی کو غور سے دیکھ لو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ مشوروں کی وجہ سے ہمارے ساتھ کیا کچھ نہیں بیت گئی۔ تو ذرا غور سے دیکھ کر بتانا کہ بھلا یہ کیا چیز تعمیر ہوئی ہے؟"

ہماری اس بات پر مرزا نے صحن کے کونے کی تعمیر کی طرف نہایت ہی غور سے دیکھا۔ پھر کچھ دیر سوچا اور پھر یوں گویا ہوئے۔ "زینے دیکھ کر تو مجھے یہ سیڑھی کی قسم کی کوئی چیز لگتی ہے گو اس میں اس کے علاوہ سیڑھی والی کوئی بھی بات نہیں مگر جس عمودی انداز سے یہ اوپر کو اٹھی یا بنائی گئی ہے اور جس طرح کے بے ڈھنگے اور چھوٹے بڑے زینے سے ہیں اُس سے اس پر چٹان ہونے کا شبہ بھی ہوتا ہے گو اس میں چٹان والی بھی کوئی بات نہیں۔"

ہم نے ہنس کر کہا: "ارے مرزا صاحب یہ جو آپ کو کبھی چٹان لگے ہے تو کبھی سیڑھی، حقیقتاً سیڑھی ہی ہے مگر یہ معمولی سی بدیہی بات منوانے کے لئے بھی ہمیں یاروں سے بحث کرنا پڑتی ہے، تب کہیں جا کر وہ مانتے ہیں اور وہ بھی یوں بے دلی سے جیسے مجھ پر احسان کر رہے ہوں۔"

"مگر میں تو بغیر بحث کے مانے لیتا ہوں کہ یہ سیڑھی ہے" مرزا نے کہا "لیکن یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ تم نے سیڑھی کا یہ نادر نمونہ حاصل کہاں سے کیا۔ جسے دیکھ کر آدمی کو یوں لگتا ہے جیسے وہ زمانۂ ماقبل تاریخ کے طرزِ تعمیر کو دیکھ رہا ہو۔"

"یہ نمونہ وہیں سے لیا ہے جس کا ابھی تم مشورہ دے رہے تھے۔" ہم نے مرزا کی بات پر قدرے روہانسے ہو کر جواب دیا۔

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا" مرزا نے سوالیہ نشان بنتے ہوئے کہا۔

"مطلب یہ ہے کہ سیڑھی کا یہ نادر نمونہ جو بقول تمہارے زمانۂ ماقبل تاریخ کی یادگار نظر آتا ہے، مختلف لوگوں کے مختلف بلکہ متضاد مشوروں کے طفیل معرضِ وجود میں آیا ہے اور خیر سے کچھ ایسے نادر نمونے کے طور پر ظہور میں آیا ہے کہ اب بیک وقت یہ سیڑھی معلوم ہوتا ہے اور چٹان بھی۔ چھت پر چڑھنا چاہو تو سیڑھی خیال کر لو اور سر پھوڑنا چاہو یا ماؤنٹینیرنگ کا شوق ہو تو چٹان سمجھ لو اور یوں چل تو جہانے برخیالے ہیں رواں۔"

"مگر ذرا اس اجمال کی تفصیل ہو جائے تو بہتر ہو گا۔" مرزا نے اپنی تفصیل پسند طبیعت کے ہاتھوں مجبور ہو کر فرمائش کی۔

"میاں تفصیل کیا بتاؤں ساری بات یاد آتی ہے تو مارے غصّے کے خون کھولنے لگتا ہے اور مارے پشیمانی کے سر کے بال نوچنے کو جی چاہتا ہے۔ ہماری شومیِ قسمت کہ سیڑھی اٹھاتے وقت بہت سے لوگ ملنے چلے آئے۔ سیڑھی بنتے دیکھی تو سب کی زبانوں پر مشوروں کی کھجلی ہونے لگی۔ سو ہر ایک نے مشورہ دیا۔ کسی نے مستری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"بھئی مستری کیا پہلی دفعہ سیڑھی بنا رہے ہو جو اتنے چھوٹے چھوٹے زینے رکھنے لگے ہو۔ کیا علوی سے کوئی بدلہ لینا ہے کہ بے خیالی میں پاؤں ذرا بڑھا کر رکھ بیٹھے تو زینوں کے جنجال سے جان ہی چھوٹ جائے اور منہ کے بل سیدھا چلا آئے فرش پر۔ بھئی خوب مستری ہو۔ خدا کا خوف کرو اور زینہ اتنا چوڑا اور کھلا رکھو کہ علوی جیسا موڈی آدمی عین بیچ سیڑھی ہی آکر آرام کرنے کا موڈ بنا لے تو زینے کو آغوشِ محبوب سے کم نہ پائے اور لیٹ جائے۔"

مستری کا نے ہمارے مہربان کے زوردار مشورے سے گھبرا کر اور سیڑھی کے بارے میں اپنا حساب و تخمینہ بھول کر ایک دو نہایت چوڑے زینے رکھے ہی تھے کہ ایک اور صاحب وارد ہو گئے اور ان نو تعمیر زینوں کو غور سے دیکھ کر کہنے لگے،

"یار علوی یہ کیا بنوا رہے ہو؟"

"بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ دیکھتے نہیں سیڑھی بن رہی ہے۔" ہم نے پہلے زینے کی لمبائی چوڑائی کی کشادگی دیکھ کر سینہ پھلاتے ہوئے کہا۔

"مگر بھلے مانس معقول لوگ سیڑھیوں پر چارپائیاں تو نہیں بچھایا کرتے۔" دوست نے کہا۔

"مگر تمہیں کس نے کہا ہے کہ ہم نے سیڑھی پر چارپائی بچھانی ہے۔"

"کہا تو کسی نے نہیں۔ بس زینے کی لمبائی چوڑائی دیکھ کر خیال آگیا۔ میاں جب چارپائی نہیں بچھانی تو زینے کو اتنا چوڑا رکھنے کی کیا ضرورت۔ کیا پہلے کبھی کسی کے گھر سیڑھی نہیں دیکھی۔ بھلا اتنے چوڑے زینے بھی کبھی دیکھے ہیں۔ چلو مانا کہ تم تو ہو ہی اناڑی مگر اس مستری کی عقل کو کیا ہو گیا ہے تب پھر مستری کو مخاطب کر کے کہنے لگے۔" مستری! خدا کا خوف کرو، تمہیں پتہ نہیں کہ زینے کی چوڑائی پاؤں سے قدرے چھوٹی نہیں تو برابر ہونا چاہئے مگر تم نے اتنا چوڑا زینہ۔ لگتا ہے جیسے اس پر دو تین آدمیوں نے بیک وقت آگے پیچھے کھڑا ہونا ہو۔ چلو پہلے جو ہونا تھا ہو گیا اب اگلے زینے ٹھیک سے بناؤ۔"

مستری نے اگلے زینے ٹھیک سے بنانے شروع کئے ہی تھے کہ ایک اور صاحب آدھمکے جو خیر سے دو ایک ذاتی مکان بنوانے کا تجربہ رکھتے تھے۔ سیڑھی کو غور سے دیکھ کر کہنے لگے "آدمی کی عقل اور ذوق کا پتہ اُس کے گھر کی سیڑھی کو دیکھ کر لگتا ہوں۔ جس طرح کی سیڑھی تم بنوا رہے ہو اس سے تو تمہاری اور مستری دونوں کی عقل اور ذوق کے بارے میں اشتہارِ گمشدگی دینے کو جی چاہتا ہے۔ میاں! بڑے بڑے زینوں یا پاؤں کے ناپ کے برابر زینے رکھنے کا رواج، قدامت پرستی اور گنوار پنے کی دلیل ہے، بلکہ یوں کہئے کہ جہالت کی دلیل ہے۔ میاں! جدید ترین فیشن اب یہ ہے کہ زینہ پاؤں سے قدرے چھوٹا رکھا جائے۔ اس میں تعمیراتی نفاست و بانکپن کے علاوہ کچھ طبی فوائد بھی مضمر ہیں۔ ایسے زینوں والی سیڑھی اترتے چڑھتے جسم کا سارا بوجھ اگلے پنجوں پر ڈالنا پڑتا ہے، اس سے پنڈلیاں مضبوط ہوتی ہیں۔ پٹھوں میں طاقت آتی ہے۔ کمر چیتے کی کمر کی طرح پتلی اور جاذبِ نظر بن جاتی ہے اور اپنے تجربے کی بنیاد پر میں تو یہ تک کہوں گا کہ دل کے مختلف عوارض سے بھی آدمی محفوظ رہتا ہے۔ اب مجھے ہی لے لو۔ چونکہ میرے گھر کی سیڑھی "پٹڑے" جیسی ہے۔ چھوٹے چھوٹے زینے ہیں۔ اس پر پنجوں کے بل چڑھتے اترتے میں میری پنڈلیاں سڈول ہو گئی ہیں۔ کمر کی فالتو چربی پگھل گئی ہے اور مجھے دل کی بھی کوئی تکلیف نہیں ہوئی جبکہ میرے ہمسائے کی سیڑھی نہایت چوڑی اور انتہائی چوڑے اور لمبے زینوں والی ہے وہ اُس پر چڑھتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے اپنے کسی کمرے ہی میں پھر رہا ہو ۔۔ اُس پر چڑھتے ہوئے ورزش والی کیفیت طاری ہوتی ہی نہیں (اور ویسے ورزش کی میری طرح اُسے بھی فرصت نہیں) نتیجہ یہ ہے کہ اُس کی ٹانگوں میں وہ جان یا مضبوطی نہیں جو میری ٹانگوں میں ہے اور دل کے تو کئی دورے پڑ چکے ہیں، صرف اس لئے کہ

اُسے سیڑھیوں سے پنجوں کے بل چڑھنا اترنا نہیں پڑتا۔ مگر فوائد کا سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ تنگ زینے رکھنے کا ایک اہم فائدہ یہ ہے کہ آدمی کو پھونک پھونک کر قدم رکھنے اور محتاط ہو کر چلنے کی عادت پڑ جاتی ہے جو انسان کی عملی زندگی میں بہت کام دیتی ہے۔ کیونکہ زندگی بجائے خود ایک سیڑھی ہے۔ ایک ایسی سیڑھی جس کا ایک زینہ دوسرے زینے سے نہیں ملتا۔ اور بعض اوقات کئی کئی زینے درمیان سے ویسے ہی غائب ہوتے ہیں۔ اب جنہیں گھر کی سیڑھیاں بے خیالی سے چڑھنے اُترنے کی عادت ہو زندگی کی سیڑھی پر بھلا خاک خیال سے قدم رکھیں گے۔ نتیجہ کیا ہو گا؟ منہ کے بل گریں گے۔ جیسے میرے ہاں آنے والے بعض مہمان میری سیڑھی سے گرتے ہیں۔ عادت جو محتاط ہو کر چڑھنے اُترنے کی نہیں رہتی۔ سیڑھی نہ ہوئی کوئی سیرگاہ ہو گئی۔ سو میاں! تم بھی اس سیڑھی کو اپنے مستقبل کی سیڑھی کا زینہ بناؤ اور اسے ایسا بناؤ کہ اس پر چڑھتے ہوئے تمہیں پتہ چلے کہ تم کوئی چوٹی سر کر رہے ہو۔ کوئی معرکہ مار رہے ہو۔ یہ معرکہ مارنے کی عادت پختہ ہو گئی تو پھر آئندہ زندگی میں سارے معرکے تمہارے پاؤں کے نیچے ہوں گے، ایسے ہی جیسے اس سیڑھی کے زینے ہوتے ہیں۔"

ہم نے جو اپنے مہربان دوست کا یہ حکمت بھرا اور فلسفہ زدہ مشورہ سنا تو ہمیں یوں لگا جیسے ہم نے آج تک جتنی زندگی گذاری تھی وہ جھک مارتے گذاری تھی جو پتہ ہی نہ چلا کہ زندگی میں کامیابی و کامرانی کی سیڑھی پر باسانی چڑھنے کے لئے گھر کی سیڑھی کی کتنی اہمیت ہے نیز یہ سیڑھی کیسی ہونی چاہیئے۔ ہم نے اپنے مہربان کو احترام و مرعوبیت سے دیکھا اور مستری پر قہر کی نظر ڈالتے ہوئے کہا:۔

"مستری جی! سن لی آپ نے حکمت سے لبریز باتیں، عقل والوں کی صحبت میں بیٹھتے تو پہلے ہی سیڑھی ایسی بناتے۔ مگر چلو جو ہونا تھا ہو گیا، اب اگلے زینے ان کے مشورے کے مطابق بناؤ۔"

لہٰذا مستری بیچارے نے بقیہ زینے ان کے مشورے کے مطابق بنا دیئے۔ ایسے جیسے چٹانوں میں لوگ پاؤں رکھنے کے لئے جگہ بنا لیتے ہیں۔

دو چار مشورے دینے والے بعد کو بھی آئے۔ اُن کے مشورے بھی اپنی اپنی جگہ باکمال تھے۔ لہٰذا تھوڑا بہت ان پر بھی عمل کیا گیا اور یوں یہ سیڑھی تیار ہو گئی۔ ویسے جاتے جاتے وقت مستری نے ہاتھ جوڑ کر ہم سے یہ گزارش ضرور کی "میری روزی اور ساکھ کا سوال ہے۔ خدا کے لئے کسی کو یہ نہ بتایئے گا کہ یہ سیڑھی کس نے بنائی ہے۔"

ہمیں تو اس وقت اس کے ہاتھ جوڑنے اور گھگھیانے سے کچھ پتہ نہ چلا کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہا ہے لیکن بعد کو جو بھی آیا سیڑھی دیکھ کر ہنسا۔ بعض نے ہنستے ہنستے ہماری پیٹھ تھپتھپائی اور کہا "معلوم ہوتا ہے بڑے پیر کاریگر سے سیڑھی بنوائی ہے۔ بہرحال جو ہونا تھا ہو گیا اب رد بلا کے طور پر روز تھوڑا بہت صدقہ دے دیا کرو۔"

اُدھر جو بھی مہمان آتے ہیں وہ اوپر کے کمروں میں جانے کو بے قرار ہوتے ہیں لیکن جونہی سیڑھی کے قریب آتے ہیں تو اُسے مشکوک سی نظروں سے دیکھتے ہیں، پہلے زینے پر قدم بھی دھرتے ہیں اور پھر نجانے کیا سوچ کر کچھ سہم سے جاتے ہیں اور پھر کہتے ہیں "ابھی نیچے ہی بیٹھتے ہیں اوپر جا کر کیا لینا ہے۔"

بیگم الگ کئی دفعہ اس سیڑھی کی وجہ سے موچ کا شکار ہوئی ہیں اور بچے جو ابھی تک گر گر کر بچ رہے ہیں تو صرف صدقہ کے صدقے۔ "اور میاں یہ سب کیا دھرا مشوروں کا ہے اور کیا تم اس کے بعد بھی کہو گے کہ مشورہ کر لو۔ میاں مشورہ کرے وہ جو عقل سے کورا ہو، جیسے جگ ہنسائی کا ڈر نہ ہو یا جو اپنی حماقت و جہالت کو بھی جدید فیشن ثابت کرنے کی خاطر توانائی رکھتا ہو۔ مگر میاں! ہم سے لوگوں کو بے وقوف نہیں بنایا جاتا۔ وہ بیچارے پہلے ہی کون سے تھوڑے ہیں جو مزید بنائیں۔"

اس پر مرزا صاحب خوب ہنسے اور کہنے لگے "اب سمجھا تم مشورے کے لفظ پر کیوں سیخ پا ہوئے تھے۔ تمہیں حق پہنچتا ہے ایسا کرنے کا۔"

"خیر یہ تو ایک سیڑھی کے جلیلے کے بگڑنے کا قصہ ہے۔ ہمیں تو مرزا جی بعض ایسے مشوروں کے مارے احباب کا بھی پتہ ہے جن کی پوری کی پوری عمارت مشوروں کے سیلاب میں بہہ گئی اور وہ بیچارے بعد کو ہاتھ ملتے اور سر پیٹتے رہ گئے۔ چنانچہ ہمارے ایک دوست نے ہمیں اپنی کوٹھی بنانے سے پہلے اس کا نقشہ دکھایا۔ نیرے سے بہت خوب تھا۔ کوٹھی تیار ہو چکی تو ہم دیکھنے گئے اور یہ مایوس و حیران ہو کر رہ گئے۔ دوست نے مایوسی و حیرانی کی وجہ پوچھی تو ہم نے کہا "جس کوٹھی کا نقشہ تم نے ہمیں دکھایا تھا کیا وہ کسی اور جگہ بنائی ہے۔"

قدرے روہانسے سے ہو کر کہنے لگے "نہیں وہ یہی تو ہے۔"

"اگر وہ یہی ہے تو پھر اس کا وہ خوبصورت نقشہ کیا ہوا جو تم نے مجھے دکھایا تھا۔"

کہنے لگے "مشوروں کی نذر ہو گیا۔"

اور صاحب کچھ ایسے نذر ہوا کہ اب ان کی کوٹھی، کوٹھی سے زیادہ فوجی جوانوں کی بیرک یا اجناس کے لئے گودام وغیرہ قسم کی چیز معلوم دیتی ہیں۔ مگر یہ تو ایک مجوزہ کوٹھی کی بات ہے جس سے صاحب نقشہ کو اس لئے ہاتھ دھونے پڑے کہ مشورہ دینے والے کئی مہربان ان کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے تھے۔ تاریخ نے تو مشوروں کی وجہ سے سلطنتوں اور جانوں سے ہاتھ دھونے کے واقعات بھی محفوظ رکھے ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ جانگداز وہ چند مشورے ہیں جو آخری عباسی خلیفہ مستعصم کے وزیر اعظم ابن علقمی نے دیئے تھے۔ ان میں سے دو تو اُس نے اپنے محسن اور ولی نعمت امیر المومنین کو دیئے تھے۔ جس کی وجہ سے اتنی عظیم سلطنت کا خاتمہ ہوا اور امتِ مسلمہ پر جو قیامتِ صغریٰ بیتی اس کے نتیجے میں دریائے دجلہ میں پانی کی بجائے خون بہہ گیا — دوسرے دو مشورے اُس نے ہلاکو کو دیئے تھے جس کی وجہ سے اُسے خلافتِ عباسیہ کا چراغ گل کرنے کی جرأت ہوئی اور خلیفہ کی جان نہایت عبرتناک طریقے سے لی گئی۔

ابن علقمی نے اپنے ولی نعمت کے احسانات کا بدلہ چکانے کے لئے جو مشورہ دیا اور یہ دلائل دیا وہ یہ تھا کہ ہمیں اتنی بڑی فوج رکھنے کی کیا ضرورت ہے کس کی جرأت ہے کہ آپ جیسے باجبروت اور صاحبِ شان و شوکت خلیفہ کی طرف آنکھ بھی اٹھا کر دیکھے۔ لہٰذا بہت بڑی فوج خزانہ عامرہ پر ایک بلا جواز بوجھ ہے اسے چلتا کرنا چاہیئے اور یوں خزانے جیسی اہم چیز کو بچانا چاہیئے (سنا گیا ہے کہ ملکی خزانے اور مستحکم معیشت کے حوالے سے ایسے مشورے وطنِ عزیز میں دینے والے اب بھی موجود ہیں۔)

نیک دل بلکہ سادہ لوح خلیفہ نے اپنی عقل سے کام لینے کے بجائے وزیر اعظم کی عقل پر بھروسہ کرتے ہوئے مشورے کو شرفِ پذیرائی بخشا۔ جس پر ابن علقمی نے دوسرا مشورہ ہلاکو کو بھجوایا کہ میاں تم کس خلیفہ سے خائف ہو کر ابھی تک بغداد کا رُخ نہیں کر پا رہے۔ ہمت کرو، خلافتِ عباسیہ کا تخت تمہاری راہ دیکھ رہا ہے۔ اس کا دفاع کرنے والی فوج تو رخصت کی جا چکی ہے۔ اس بات پر تمام مؤرخین متفق ہیں کہ عالم اسلام میں ہلاکو کو اپنی تمام تر فتوحات کے باوجود بغداد کا رُخ کرنے کی جرأت نہیں ہو رہی تھی۔ ابن علقمی کے مشورے پر اُسے ذرا حوصلہ ہوا تو اُس نے اپنے وزیر نصیر الدین طوسی سے مشورہ کیا۔ اُس نے کہا "نجوم کے ذریعہ تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ بغداد پر آپ کا قبضہ ہو جائے گا۔"

اور پھر اس مشورہ کے تحت اُمتِ مسلمہ کے ساتھ بالخصوص اہلِ بغداد کے ساتھ جو بیتی وہ تاریخ امتِ مسلمہ کا ایک نہایت ہی خوں چکاں باب ہے جس پر سعدیؒ کو تڑپ کر کہنا پڑا تھا۔

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں
بر زوالِ ملک مستعصم امیر المؤمنین

مگر ابن علقمی نے اپنے ولیٔ نعمت کو یہی ایک مشورہ دینے پر اکتفا نہیں کی بلکہ ابن علقمی کی اندر خانے کی جاسوسی کے طفیل جب ہلاکو دھاوا مارتا بغداد کی دیواروں کے نیچے پہنچ گیا تو وہ شہر سے نکل کر ہلاکو سے ملا اور صرف اپنے لئے امان طلب کر کے واپس آگیا اور پھر خلیفہ کو دوسرا مشورہ دیا۔ "میں نے آپ کے لئے بھی امان حاصل کر لی ہے۔ آپ بھی ہلاکو کی خدمت میں حاضری دیں۔"

اس مشورہ کو قبول کرنے کی دیر تھی کہ پھر قیامت ہی تو ٹوٹ پڑی جس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں بس اتنا جان لیں کہ اس مشورے کے صدقے صرف ایک کروڑ چھ لاکھ مسلمان قتل ہوئے تھے۔ اب تو آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ دریائے دجلہ میں پانی کے بجائے خون بہنے لگا تھا تو یہ کوئی شاعرانہ مبالغہ نہیں بلکہ ایک سنگین حقیقت ہے جو ابن علقمی کے مشورے کی بدولت ظہور پذیر ہوئی۔

مگر ابن علقمی نے ہلاکو کو جو دوسرا مشورہ دیا تھا وہ تو انتہائی ستم ظریفانہ تھا اور ایسا مشورہ صرف ابن علقمی جیسا شخص ہی دے سکتا تھا (ویسے کہتے ہیں اس مشورے میں اس کا دوسرا ساتھی نصیر الدین طوسی بھی شریک تھا)

خلیفہ کے قتل پر جب اتفاق ہو گیا تو ابنِ علقمی نے انتہائی معصومانہ خباثت کہئے یا شرارت کے ساتھ مشورہ دیا "امیر المؤمنین مسلمانوں کے نزدیک انتہائی محترم و رفیع ہستی ہیں لہٰذا احترام کا تقاضا ہے کہ ان کے خون سے تلوار کو آلودہ نہ کیا جائے بلکہ انہیں نہایت احتیاط سے نمدے میں لپیٹ کر (کہ اس کے بغیر بے احترامی ہوگی) لاتوں سے کچلوایا جائے۔"

چنانچہ اس انوکھے احترام کے تمام تر تقاضے پورے پورے انصاف کے ساتھ پورے کئے گئے اور یوں نمک حلال اور نیک دل وزیر اعظم نے اُن تمام احسانات کی لاج رکھ لی جو اُس نے اُسے عظیم سلطنتِ اسلامیہ کا وزیر اعظم بنا کر کئے تھے۔ اور تلوار کے ایک ہی وار سے سر قلم اور قصہ پاک ہونے کے برق آسا عمل سے بچا کر طرح طرح کی ایک ایسی اذیت ناک موت سے دوچار کیا جس سے خلیفہ کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہونے سے پہلے ایک دفعہ تو مکمل طور پر کھل گئیں اور ہمارے نزدیک آنکھوں کا کھل جانا اگر چہ وہ موت سے کچھ دیر پہلے ہی کیوں نہ ہو، بہت بڑی بات ہے اور خلیفہ کے معاملے میں اس بڑی بات کے لئے ہم ابنِ علقمی جیسے نیک دل اور مخلص وزیر اعظم کے از حد ممنون ہیں۔

ویسے ملتِ اسلامیہ کے ساتھ عرصے سے یہ کھیلا ہو رہا ہے کہ اس کے اربابِ اقتدار کی آنکھیں ہمیشہ بند رہتی ہیں اور اگر کھلتی ہیں تو اُس وقت جب پانی سر سے گزر جاتا ہے اور کسی نہ کسی ابنِ علقمی کا مشورہ کارگر ہو چکا ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات واضح ہو جانی چاہیئے کہ ملتِ اسلامیہ کو مار یا مات کبھی باہر کی طاقت نے نہیں دی بلکہ اندر ہی سے کسی پھوڑے کی طرح کسی ابنِ علقمی کے نمودار ہونے، پھر دیکھتے ہی دیکھتے اُس کے صاحبِ اثر و رسوخ بننے اور پھر اُس کے مشوروں پر عمل پذیر ہونے نے دی ہے۔

ہمیں جب تک مشورے کی ان تباہ کاریوں (جو تابکاری سے بھی زیادہ خطرناک ہیں) اور خطرناکیوں کا شعور نہیں تھا، ہم مشورے کے بغیر گھر سے قدم بھی باہر نہیں نکالتے تھے۔ گھر کا سودا سلف بغیر مشورے کے نہیں خریدتے تھے۔ کئی کئی دن گوشت نہیں پکاتے تھے۔ کیونکہ مشورہ نہیں ہو پاتا تھا کہ دالوں اور کمر توڑ مہنگائی کی موجودگی میں اس کے کھانے کا کچھ فائدہ ہے بھی یا نہیں۔

مگر ہماری نادانی بلکہ جہالت کے دن ختم ہو گئے۔ اب ہم باشعور ہو گئے ہیں۔ بالغ نظر اور عاقل بن گئے ہیں۔ اب وہ دن گئے کہ یار لوگ ہمیں "مشورہ زوری" سے گمراہ یا بے راہ یا قائلِ نامعقولیت کر لیں۔ مشوروں کی وجہ سے جو کھونا تھا کھو چکے مگر اب ایسا نہیں ہونے کا — ہرگز نہیں ہونے کا — بہت ہو چکی!

ایک اندھا سفر

محمد کبیر خان

خوشحال خان خٹک بڑے حکیم بھی تھے۔ فرماتے ہیں تپتی دوپہر اور شدید سردی میں سفر نہ کیا کر و معاملہ محبت کا اور تقاضا خلوص کا نہ ہوتا تو ہم بلاچوں وچراں اس قولِ دانش پر عمل کرتے۔ ایک تو اس لئے کہ ہم نے آج تک پریشان خٹک کی کوئی بات نہیں ٹالی۔ پھر خوشحال خان خٹک کے فرمان سے سرتابی کیسے کرتے۔ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ شدید سردی تو کیا خفیف سردی میں بھی ہم احتیاطاً سفر نہیں کرتے۔ مبادا زکام شکام ہو جائے۔ لیکن افتخار مغل کا اصرار تھا کہ اب کے ملک آؤں تو چکار کا چکر ضرور لگاؤں، چنانچہ شدت کی سردی میں ہم بیوی جی سے امام ضامن بندھوا کر گھر سے نکل پڑے۔ چکار براستہ مظفر آباد۔

سرما میں آزاد کشمیر کا موسم بھی بلغمی مزاج اختیار کر لیتا ہے۔ راولاکوٹ سے چلے تو روکھی روکھی دھوپ تھی، پچن کوٹ میں بارش۔ کوہالہ، دھوپ۔ دلائی، بارش۔ بارڑہ، گرد و غبار۔ سیکرٹریٹ، گرج چمک۔ دومیل، دھوپ چھاؤں۔ قائدِ اعظم برج پار کیا تو آگے ٹریفک جام تھا۔ معلوم ہوا سائیں سہیلی سرکار کے سالانہ عرس کے موقع پر نکالا جانے والا جلوس آ رہا ہے۔ سڑک کے کنارے روک کر گاڑی میں ہی جلوس کے گزر جانے کا انتظار کرنے لگے۔ جلوس کے آگے ایک گاڑی پر نصب لاؤڈ اسپیکر کثرتِ استعمال یا استعمال کنندگان کی کثرت پر احتجاج کر رہا تھا۔ چنانچہ اس سے بلند ہونے والی آوازیں الفاظ کی بجائے چیخوں کی صورت میں سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔ سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ یوں بھی ارادت مندی سمجھ میں نہ آنے والا وہ جذبہ ہے جس کے آگے ہوش ہیچ ہوتا ہے۔ اُدھر عقیدت مندوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ ایسا ہی ایک جلوس ہم نے بڑی سرکار کی قوالی لے کر جاتے دیکھا تھا۔ کچھ "ملنگ" رقص کر رہے تھے، کچھ "مست" سرِ جلوس "ساوی" پی رہے تھے۔

بھر بھر پیتیاں تے گلاں رب نال کیتیاں

ایندھن اور چرس کے دھوئیں سے فضا اس قدر "معطر" تھی کہ پہلے سر چکرایا اور پھر وہ کچھ ہوا جو اصولاً بحالتِ مردانگی ہونا نہیں چاہیئے۔ یہ بات اب سمجھنے کی رہی ہے نہ سمجھانے کی کہ اولیاء کرام کے مزاروں سے وابستہ اور تکیوں پہ تکیہ کرنے والے اس نوع کی مست ملنگی کیوں کرتے ہیں؟ عقیدت کے اظہار کا یہ دھواں دار طریقہ کہاں تک جائز ہے؟ اس کا علم تو ہمیں بے شک نہیں۔ لیکن اتنا معلوم ہے کہ بزرگانِ دین، اولیاء کرام اور صوفیاء عظام نے کبھی بھی منشیات کے فروغ کی تعلیم نہیں دی۔

مظفر آباد سے نکلتے نکلتے شام ہوگئی۔ دراصل یہ شہر ہے ہی کچھ ایسا۔ اس میں داخل ہونے میں جتنا وقت لگتا ہے، نکلنے میں اس سے زیادہ لگتا ہے۔ چنانچہ وہ اقتدار گزیدہ جو "سالوں" کی کوششوں کے نتیجے میں یہاں آتے (یا پھر) جاتے ہیں، مظفر آباد اُن کے ہاتھ سے نکل بھی جاتے وہ مظفر آباد کی گرفت سے نہیں نکل پاتے۔ یہیں کے ہو رہتے ہیں:

میں نیئں جاناں کھیڑیاں دے نال

شام کے جھٹ پٹے میں چکار کے لیے روانہ ہوئے تو جھاجوں برس رہا تھا (یہ تو خوفِ خلقِ خدا سے لکھ دیا ورنہ چھاج پھٹک کر گیٹے گُڈ ہی گراتا ہے . . . . . پانی میں سے سرسائی) دریا کنارے ڈرائیو کرنا ایک روح افزا فعل ہے لیکن ہمارے لئے "وہی کام" روح فرسا ثابت ہو رہا تھا۔ تیز بارش، گُپ اندھیرا، سردی اس قدر کہ لائٹ ہم بھی ٹھٹھری ٹھٹھری سی لگے۔ اس پر سامنے سامنے سے آنے والے چک پڑے ٹرک . . . . . مزاحمتی ادیبوں کی طرح . . . . . نظر کہیں نظرِ کرم کہیں . . . . . سرگوشے میں دھڑ کچے پر۔ فُل مارتے ہوئے آنکھیں چندھیا جاتیں (عجیب بات ہے، روشنی کے بغیر چلنا دشوار، تیز روشنی میں دشوار تر) جواباً ہم نے بھی کئی بار مدِمقابل پر فُل ماری لیکن ہماری فُل بھی اُن کے مقابلے میں ڈِم لائٹ ہی ثابت ہوئی:

اللہ اللہ یہ جمالِ یار کی ضوپاشیاں

دل یہ کہتا ہے کہ گھر بھر میں اندھیرا کیجیے

قریب سے گزرتے ہوئے چھینٹوں کے علاوہ ٹھٹھے بھی اڑاتے۔ ونڈ شیلڈ پر پڑنے والے کیچڑ کے چھینٹے تو ہم صاف کر ہی لیتے لیکن شیشۂ دل پر نقش ہونے والے ٹھٹھے اڑانے کے لئے ہمارے پاس کوئی وائپر نہ تھا۔ ایسے کئی مواقع پر ہمارے اندر کی پٹھانی (رگ) بارہا پھڑکی مگر اپنی گاڑی کی بے وزنی، سڑک کی پھسلن اور بائیں کھبی کے عین نیچے بہتا دریا آڑے آجاتا۔ چنانچہ صبر شکر کے ساتھ رُکتے رُکتے چلتے رہے۔ ٹائم پاس کرنے کے واسطے اپنے ہمسفر اور رہبر شاہد بہار کو چھیڑا۔ پہلے تو وہ

تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

کی عملی تصویر بنا رہا۔ پھر کچھ سوچ کر خود ہی "رواں" ہوگیا۔ شاہد بڑا محتاط اور خاموش نوجوان ہے۔ لیکن جس طرح ہر خاموشی کے پیچھے ایک طوفان ہوتا ہے، اُسی طرح شاہد کی چُپ میں بڑا شور تھا۔ چنانچہ جب کھُلا تو بظاہر سیدھا سادا نظر آنے والا وہ نوجوان بباطن ٹیپکل کشمیری نکلا۔ بے انتہا ذہین، فرماں بردار اور قوم پرست۔ قوم پرستی کو بعض لوگ تعصب سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں کوئی شخص خواہ کتنا ہی لبرل کیوں نہ ہو، قوم اور وطن کے حوالے سے تھوڑا بہت متعصب ضرور ہوتا ہے۔ وطن سے محبت کا تقاضا بھی یہی ہے۔ شاہد بہار بھی دیگر کشمیری نوجوانوں کی طرح ایسا دل رکھتا ہے جو آزادی کے لئے دھڑکتا ہے جو ان جذبوں اور بلند حوصلوں کا حامل وہ نوجوان اگرچہ کم کم مگر اچھے شعر بھی کہتا ہے۔

شاعری کے ہیر قومے کے علاوہ اس میں خال خال وہ "اوصافِ حمیدہ" بھی پائے جاتے ہیں، جن کی بدولت شاہد بہار لیڈر بن سکتا ہے۔ چنانچہ اس کی رہنمائی میں ہم آسانی کے ساتھ چکار کی بجائے ہٹیاں بالا پہنچ گئے۔ راستے

میں ہم نے دبی زبان میں راہ سے بھٹکنے کے خدشے کا اظہار بھی کیا ہے لیکن وہ کچھ زیادہ ہی پُراعتماد تھا۔ بولا:

"آپ گاڑی سنبھالے رہیئے کہ ایکسلریٹر کی بجائے آپ کا پاؤں مستقلاً بریک پہ جما ہوا ہے راستے کا تعین میری ذمہ داری ہے۔"

کہا:۔ "ہماری اطلاعات کے مطابق مظفرآباد سے چکار تک ڈیڑھ گھنٹہ اور زیادہ سے زیادہ پانچ لٹر پٹرول صرف ہونا چاہیئے۔"

بولا:۔ "بارش، پھسلن، اندھیرے اور اپنی کج رفتاری کو بھی اس حساب میں شامل کر لیجئے۔"

بٹیاں بالا پہنچ کر شاہد نے ایک مقامی دوکاندار کے ساتھ تبادلۂ شکوک کیا تو معلوم ہوا کہ باتوں ہی باتوں میں ہم چکار جانے والے راستے کو کوسوں پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ ہم نے اس گمراہی پر احتجاج کیا نہ ہی متعجب ہوئے کہ کشمیری قوم باتوں ہی باتوں میں بارہا منزلِ مقصود کو جانے والے راستے سے بھٹکی ہے۔ لیکن الحمدللہ اب تیرہ شبی، سامنے سے پڑنے والی چکاچوند، راستے کی پھسلن، زادِ راہ کی قلت اور لیڈروں کی راہنمائی کے باوجود منزل کو جانے والے راستے پر چل پڑی ہے۔ ہم نے بھی اپنی قوم کی تقلید میں منزلِ گم گشتہ کو پانے کے لیے گاڑی اور گردشِ ایام کو پیچھے چھوڑ دیا۔ بٹیاں سے واپسی کے سفر میں گاڑی کی ہیڈلائٹس نامعلوم وجوہات کی بنا پر ہمارے ساتھ تعاون کرنا چھوڑ گئیں۔ محض دل کی روشنی کے برتے پر ہم رینگتے چلے جارہے تھے۔ یہ ایک اندھا سفر تھا، تاریک ماضی میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے مترادف۔ واپسی کے اس اندھے سفر میں بتیاں تو بجھیں، پر ہمارے "دیدۂ بینائے قوم" نے اپنی آنکھیں کھلی اور منہ بند رکھا۔ چنانچہ کئی میل پیچھے آنے کے بعد ہم نے چکار کی رابطہ سڑک پالی۔ ثابت ہوا کہ رہبر آنکھیں کھلی اور منہ بند رکھیں تو راہروؤں کو آسانی کے ساتھ راستے مل جاتے ہیں۔ سڑک پر لگے بیریئر اور نہ دکھائی دینے والے اسپیڈ بریکر پر سے دیوانہ وار گزرتے ہوئے زور کا جو جھٹکا لگا تو ہمارا سرِ پُرفتور چھت سے ٹکرایا۔ آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ "دانائی" کا ایک گومڑا ابھر آیا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ گاڑی کی ہیڈلائٹس ہی نہیں، درونِ خانہ وہ تمام بتیاں بھی آپ ہی آپ روشن ہوگئیں جنہیں بجھے زمانہ بیت گیا تھا۔ معلوم ہوا راہِ شوق میں محبت کے دھکے کبھی کبھی تمام کام کر جاتے ہیں تو دھکے کی محبت کام تمام۔

اگرچہ ایفائے عہد کے پاس، چکار پہنچنے کی دُھن، رات کی تاریکی اور شاہد بہار کی روشن خیالی نے ہمیں محسوس نہ ہونے دیا۔ لیکن چکار اللہ میاں کے کتنے قریب واقع ہے؛ اس کا اندازہ دوسری صبح واپسی پر ہوا ہمیں کامل یقین ہے کہ ایفائے عہد، منزل کو پا لینے کی دُھن اور اچھی رفاقتوں کی بدولت ایک لمبا اور اندھا سفر طے کرنے کے بعد عنقریب کشمیری قوم ایک دن آزادی کے سورج کو طلوع ہوتے دیکھے گی۔ ہانپتی کھانستی گاڑی نے ہمیں جیسے تیسے چکار پہنچا دیا۔ بارش رُکے کافی دیر ہو چکی تھی لیکن غالبؔ کی چھت کی طرح ہماری گاڑی کی چھت ابھی تک ٹپک رہی تھی، جس کی وجہ سے کوٹ وغیرہ کافی حد تک بھیگ چکے تھے۔ کسی گڑھے یا کلوٹ سے گزرتے تو سڑک سے چھینٹے اُڑ اُڑ کر ہمارے زیرجامے تک کو بھگو دیتے کہ گاڑی کا فرش بھی

ہمارے دامن کی طرح دریدہ تھا۔

آزاد کشمیر کے اکثر شہروں میں دوکاندار شام ڈھلتے ہی اپنی دوکانیں بڑھا دیتے ہیں۔ چکار کے کوچہ و بازار سنسان تھے۔ بہت دور کہیں کتوں کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں (سردیوں میں کشمیری کتے بھونکنے کی بجائے کھانستے یا زیادہ سے زیادہ روتے ہیں) شہر چکار ہمیں اپنے دل کی طرح سیاہ اور ارمانوں کی طرح اُجڑا اُجڑا لگا۔ اس سے پہلے کہ ہم یاس کی لپیٹ میں آ جاتے، آس کی ایک کرن نظر آئی۔ مفلس کا ایک چراغ سا ایک طرف سے ہماری جانب بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ قریب پہنچا تو وہ ہمارا میزبان اور مہربان افتخار مغل تھا۔ لالٹین کے پیچھے پیچھے باادب باملاحظہ "ہوشیار" ہم نے گاڑی ایک مکان کے پچھواڑے کچرے کے ڈھیر پر جا پارک کی۔ ہمارے میزبان کو شکایت تھی کہ۔

سجن سویرے منگائے، سجن چڑھ کے کیوں آئے

جبکہ ہمیں گلہ تھا کہ چکار اتنی دور تھا تو مظفر آباد کو قریب لا کیوں نہ بسایا۔ میزبان موصوف کے محبت بھرے کوسنے اس وقت ہمیں قیمہ بھرے کریلے لگ رہے تھے۔ اس لئے کہ بھوک زوروں پر تھی۔ اُدھر سردی کا یہ عالم تھا کہ میزبان کی گرمجوشی کے سوا کسی شے میں حرارت کی بُو تک نہ تھی۔ ہر شے ہمارے ایمان کی صورت تھی۔ ہم نے بریف کیس نکالنا چاہا تو افتخار مغل نے کہا "ضروری نہ ہو تو یہ ٹرنک گاڑی میں ہی رہنے دیں کوئی خطرے کی بات نہیں"۔ اس پر ہمیں یاد آیا کہ لاہور میں دن دہاڑے ایک مارکیٹ میں تھوڑی دیر کے لئے رُکے تو عطاالحق قاسمی نے بریف کیس اٹھا کر ڈگی میں رکھ دیا۔ ہم نے کہا سیٹ پر ہی پڑا رہنے دیتے، اس میں کوئی خاص چیز نہیں ہے۔ بولے "تمہارے بریف کیس کا نہیں، میری گاڑی کے شیشے کی سلامتی کا سوال ہے"۔

افتخار مغل نے لالٹین اپنے ہاتھ میں اور ہم دونوں کو ایک قطار میں آگے آگے رکھا۔ "سیدھے چلتے رہو، جہاں ٹھوکر کھا کر گر پڑے وہی میرے گھر کی دہلیز ہو گی"۔ افتخار مغل نے عقب سے ہماری راہنمائی کی۔ ہم ٹھوکر کھائے بغیر جہاں گرے وہ واقعی دہلیز ہی تھی مگر کسی اور کی۔ اس کا اندازہ ہمیں تب ہوا جب اندر سے آواز آئی۔ "کیہڑا ایں رات انار رہتے پئے" (کون ہو شب کو رہ کہیں کے، اپنا رستہ لو) کیچڑ سے لتھڑے اٹھے اور پیچھے مڑ کر جو دیکھا تو لالٹین بہت دور ٹمٹما رہی تھی۔ کشمیری قوم بھی یوں ہی گرتی پڑتی آگے نکل گئی اور اس کے راہنما ہاتھوں میں لالٹینیں لئے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ امام اقتدار پر مجبور ہو گئے۔ رہبری پچھلے دنوں میں ہی گم ہو گئی تھی)

نی میں ہاسیاں اچ یار گوایا تے ہنجواں اچ لبھدی پھراں

اصولاً افتخار مغل کی دہلیز پر پہنچنے کے لیے ٹھوکر کھا کر گرنا چاہیے تھا لیکن ہم میں مزید گرنے کی اہلیت تھی نہ ٹھوکریں کھانے کی ہمت۔ منزلِ مقصود تک پہنچ کر ٹھوکریں کھانا یوں بھی اچھا نہیں لگتا۔ چنانچہ مزید "بگتے گوڈے" تڑوائے بغیر ہی ہم دروازے تک پہنچ گئے۔ ابھی درِ دولت کدہ ہم پر کھلنے نہ پایا تھا کہ ایک بار پھر بارش شروع ہو گئی، عجیب موسم تھا

جھلمل تارے منہ منہ چھپیاں

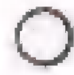
سردی سے بچنے کے لئے شرافت کے جو جو لبادے اوڑھ رکھے تھے۔ وہ ہم نے ایک ایک کر کے اتار پھینکے، مگر سردی کم نہ ہوئی۔ تاہم گیلے جوتے اتارے تو مفلسی میں کچھ افاقہ ہوا۔ بیٹھک میں دو مہمان ہم سے پہلے بیٹھے تھے۔ میزبان موصوف نے اُن سے ہمارا غائبانہ تعارف کروا چھوڑا تھا۔ چنانچہ بوجہ سردی ہمارے جسم کے تھر کنے کو بھی انہوں نے مزاح یا کامیڈی جانا۔ اسی لئے حفظِ ما تقدم کے طور پر وہ "تبسم زیر لب" فرماتے رہے۔ اگرچہ اُن سے گفتگو خاصی دیر رہی مگر پوری عدم توجہی کے ساتھ۔ کہ ہم ہمہ تن گوش و ناک باورچی خانے کی طرف متوجہ تھے۔ بھانڈے بیالے کھڑکنے کی آوازیں اور مختلف النوع کھانوں کی لپٹیں بڑی صبر آزما تھیں۔ ایک اشتہا انگیز وقفے کے بعد ماحضر تناول فرمانے کی نوید ملی تو ہم محکمہ زراعت کے سلوگن پر عمل پیرا ہو گئے:

لحاف دی بُکل مار کے "پھلاں ماردا" جا

منل بچے نے کشمیری کھانوں کے "ہفت خواں" سجا رکھے تھے۔ جن کے ساتھ ہم نے منلئی آداب کے عین مطابق انصاف کیا۔ یعنی جو سامنے آیا ملیامیٹ کر کے رکھ دیا۔ پیٹ اور نیت دونوں حلق تک کبھی کے بھر چکے تھے، لیکن میزبان کا تقاضا تھا کہ ہل "مِن" مزید۔ اُدھر ہم میں مزید خلوص برداشت کرنے کی ہمت نہ تھی۔ اس حد سے آگے "خلوص بالجبر" کا مرحلہ آتا تھا۔ چنانچہ ہم میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔

صبح اُٹھے تو مطلع بالکل صاف تھا، مخلص وجدانی کی نیت کی طرح۔ چکار کی اس چوٹی سے گرد و نواح کو دیکھا تو عجب نظر نواز نظارہ تھا۔ سامنے ترائیوں اور چڑھائیوں میں حویلی نما مکانات کی جستی چھتیں یوں چمک رہی تھیں جیسے منظم بے ترتیبی کے ساتھ کسی الہڑ دوشیزہ کی پیرہنی پہ ہیرے جڑے ہوں۔ افتخار منل کا کہنا تھا کہ "ٹھہر جاؤ" کچھ دن اور۔ لیکن ہمیں مظفر آباد پہنچنے کی جلدی تھی۔ جہاں ہم اپنی بچی کو آمنہ بہار روتا کے اصرار پر اُسی کے رحم و کرم پر چھوڑ آئے تھے۔ اگرچہ شاعری کی طرح روتا کی گفتگو بھی خاصی سوادلی ہوتی ہے لیکن کبھی کبھی وہ بہت ادب ناک ہو جاتی ہے۔ ایسے میں چائے کے ساتھ اسپرین کی ضرورت بھی پیش آجاتی ہے۔ چنانچہ ہمیں خوف تھا کہ بچی جو پہلے ہی نزلہ زکام میں مبتلا تھی، کہیں سہ غزلہ کلام کا شکار بھی نہ ہو جائے۔ لیکن ہمارا یہ خدشہ غلط نکلا۔ بچی حسبِ معمول خوش و خرم تھی۔ اُسے دیکھ کر ہم بھی کانوں تک خوش ہو گئے۔ روتا بچی کے ساتھ بچی ہی کی طرح ڈیل کر رہی تھی۔

خاقان خاور



رنگ تیرے ہوں، تری خوشبو بھی ہو
اب تو ہر منظر میں شامل تو بھی ہو

خشک جھیلوں میں کہاں اتریں طیور
آنکھ میں پھیلا ہوا آنسو بھی ہو

میں بھٹک تو جاؤں کالی رات میں
اِس اندھیرے میں کہیں جگنو بھی ہو

بے بسی میں گھر کے سوچا بارہا
آدمی کا کوئی تو بازو بھی ہو

بات دِل میں ہی رہے تو فائدہ
پھول ہو تو پھول کی خوشبو بھی ہو

آگ میں کودو مگر یہ دیکھ لو
بچ نکلنے کا کوئی پہلو بھی ہو



ہر نئی داستان میں رہنا
لفظ ہے تُو، اڑان میں رہنا

اک ستارہ یہ کہہ کے ٹوٹ گیا
کیا سدا آسمان میں رہنا!

جسم کچا ہے، ٹوٹ جائے گا
لاکھ پختہ مکان میں رہنا

روز تیروں سے ہونا چھلنی بھی
پھر اُسی خاندان میں رہنا

دست و بازو ہی جب نہیں اپنے
کیا کسی کی امان میں رہنا

خاقان خاور



اپنے خوابوں سے نکلتا ہی نہیں
ساتھ دنیا کے وہ چلتا ہی نہیں

وہ ہوا ہے کہ دیا چاہت کا
دل کی دیوار پہ جلتا ہی نہیں

خاک اڑتی ہے ہمیشہ دل میں
کیسا موسم ہے، بدلتا ہی نہیں

کتنا سنسان ہے سیدھا رستہ
جیسے اس پر کوئی چلتا ہی نہیں

وہ تپش ہے کہ زمیں پر خاور
سایا دیوار سے ڈھلتا ہی نہیں

اقبال کوثر



ترے دُکھ میری باتوں میں چمکتے
یہ جگنو سب کی راتوں میں چمکتے

کبھی خوابوں میں آتیں اگلی صُبحیں
کبھی سُورج بھی راتوں میں چمکتے

ہماری محنتیں پُرزوں میں ڈھلتیں
ہُنر ہاتھوں کئے دھاتوں میں چمکتے

بلندی سے اُتر آتے ستارے
غریبوں کی بھی راتوں میں چمکتے

کسی زنجیر کے حلقے ہیں کوثر
خطِ تقدیر ہاتھوں میں چمکتے

رفیق سندیلوی



ایک تبدیلی تہہِ جاں میں ابھی کرنی ہے
پاک کرنا ہے بدن، نفس کُشی کرنی ہے

اِس اندھیرے سے بچانا ہے مجھے کوئے بدن
پھر چراغوں سے مزیّن یہ گلی کرنی ہے

مجھ کو معلوم ہے، کس شے کا ہے کرنا اثبات
اور کس شے کی سرے ہی سے نفی کرنی ہے

اِک طرف تشنہ لبی، دوسری جانب پانی
بیچ میں صبر کی دیوار کھڑی کرنی ہے

توڑ دینی ہے یہ زنجیرِ تحیّر اِک رات
یہ جسارت دلِ وحشی کو کبھی کرنی ہے

عالمِ غیب کی منزل نہیں طے ہونے کی
اِس کو طے کرنے کی کوشش تو بڑی کرنی ہے

چُپ نہیں رہنا، اعادہ بھی نہیں ہے کرنا
بات کرنی ہے مگر بات نئی کرنی ہے



ازل کے ساتھ ہی راہِ ابد بنا دی ہے
لکیر کھینچی ہے اور ایک حد بنا دی ہے

کیا ہے آخری سانسوں سے اِک ستارہ خلق
اور اُس ستارے پہ اپنی لحد بنا دی ہے

ہم آگ پھانکنے والوں نے اپنے گرداگرد
بدن سے اُونچی فصیلِ حسد بنا دی ہے

طلسمِ موجِ نظر نے بنا دیا ہے چاند
اور ایک کیفیتِ جزر و مد بنا دی ہے

دیا ہے مَیں نے اندھیرے میں خود کو پھر ترتیب
عجب شکل پسِ خال و خد بنا دی ہے

حسن ناصر



ہر شخص کی زباں پہ شناسائیاں تری
پھیلی ہوئی ہیں شہر میں رسوائیاں تری

اِک حلقۂ جنوں میں مہکتا ترا بدن
شاخوں کی طرح جھومتی پرچھائیاں تری

پھر یوں ہُوا کہ سارے مناظر بدل گئے
پل بھر میں محو ہو گئیں رعنائیاں تری

تصویر ہو گیا ترا موتی اُچھالنا
پایاب ہو گئیں سبھی گہرائیاں تری

مَیں نے کہا نہ تھا کہ رہے فاصلہ بھی کچھ
راس آئیں گی نہ تجھ کو پذیرائیاں تری

اَب جا، زمیں پہ بکھری ہوئی پتیاں سمیٹ
خوشبو اُڑا کے لے گئی تنہائیاں تری

اُس کے لئے بھی قتل کا سامان ہو گئیں
ناصرؔ فرازِ دار پہ سچائیاں تری



نمائش کے لئے تازہ حوالے سوچ لینا
پھر اس کا فن حوالوں سے بے چہرے سوچ لینا

اتاروگے زمینوں پر اگر بے وقت بارش
پرندے پیڑ پر بھُوکے رہیں گے سوچ لینا

سحر سے پہلے تم مجھ کو جگانے آ گئے تو
ادھورے خواب رہ جائیں گے سارے سوچ لینا

ابھی اِک اور ہوگا موسمِ دستار بندی
عدو پھر سے بجائے گا ترانے سوچ لینا

گلی میں سرسراتی صبح کی تازہ ہواؤ!
کبھی ان بند دروازوں کے بارے سوچ لینا

کوئی گھر بھی رہے گا منتظر ان دلدلوں میں
حسن ناصرؔ ابھی سے سارے رستے سوچ لینا

امجد اسلام امجد



ہم تھے ، ہمارے ساتھ کوئی تیسرا نہ تھا
ایسا حسین دن کہیں دیکھا سُنا نہ تھا

کچھ ایسے اس کی جھیل سی آنکھیں تھیں ہر طرف
ہم کو سوائے ڈوبنے کے ، راستہ نہ تھا

ہاتھوں میں دیر تک کوئی خوشبو بسی رہی
دروازۂ چمن تھا وہ بندِ قبا نہ تھا

اس کے تو انگ انگ میں جلنے لگے دیے
جادو ہے میرے ہاتھ میں ، مجھ کو پتا نہ تھا

آنکھوں میں اس کی تیر رہے تھے حیا کے رنگ
پلکیں اُٹھا کے میری طرف دیکھتا نہ تھا

اس کے بدن کی لو سے تھی کمرے میں روشنی
کھڑکی میں چاند ، طاق میں کوئی دیا نہ تھا

کل رات وہ نگار ہوا ایسا ملتفت
عکسوں کے درمیان کوئی آئنہ نہ تھا

سانسوں میں تھے گلاب تو ہونٹوں پہ چاندنی
ان منظروں سے میں تو کبھی آشنا نہ تھا

رویا کچھ اس طرح مرے شانے سے لگ کے وہ
ایسے لگا کہ جیسے کبھی بے وفا نہ تھا

ہے عشق ایک روگ ، تعلق عذاب ہے
اک روز یہ خراب کرے گا ، کہا نہ تھا؟

امجد وہاں پہ حد کوئی رہتی بھی کس طرح
رکنے کو کہہ رہا تھا مگر روکتا نہ تھا



کسی کی دھن میں جینا ہے کسی کے ڈر میں رہنا ہے
بتا اے زندگی ، کب تک اسی چکر میں رہنا ہے

تمنا اور حسرت میں ہے فرق اظہار کا ، یعنی
جو شعلہ جل نہیں سکتا اُسے پتھر میں رہنا ہے

دھنک بنیاد تھی جن کی ، وہ بام و در نہ بن پائے
تذبذب نام ہے جس کا ، ہمیں اُس گھر میں رہنا ہے

ترے باغِ توجہ کی فضا میں زندگی کرنا
رمِ خوشبو میں چلنا ہے ، گُلِ منظر میں رہنا ہے

کہانی ایک ہے لیکن جدا ہیں واقعے اپنے
تمھیں محشر اُٹھانا ہے ، ہمیں محشر میں رہنا ہے

تمنا نے ہمیں پایا ، تغافل اُس کو راس آیا
کہ ہر احساس کو امجد کسی پیکر میں رہنا ہے

جمشید مسرور



دل نہ دکھانے کی خاطر ہم خود کو ہی سمجھا لیتے ہیں
ایک مرض سے بچتے بچتے کتنے روگ لگا لیتے ہیں

بنجر آنکھوں والے ساتھی میرا خواب چُرا لیتے ہیں
مجھ سے بھی پہلے منڈی میں جا کر دام بنا لیتے ہیں

شہر پناہ پہ آہٹ سن کر کارکنانِ شاہ ہمیشہ
اپنے خنجر دھو لیتے ہیں اور دشنے چمکا لیتے ہیں

چشمۂ آبِ حیات سے جا کر میرے اہلِ قبیلہ اکثر
پانی بھی لانے نہیں پاتے، بازو بھی کٹوا لیتے ہیں

ہم وہ امینِ موسمِ گل ہیں، حکم ملے تو قتل گھروں میں
شاخ قلم کرنے کی بجائے ہاتھ قلم کروا لیتے ہیں

خواب جو کٹ گرتے ہیں زمیں پر پھر جمشید نہیں کھل پاتے
اور گزرتی ہوئی رُتوں کے پتے انہیں چھپا لیتے ہیں



جب جاں پہ لبِ جاناں کی مہک اک بارشِ منظر ہو جائے
ہم ہاتھ بڑھائیں اور اُس میں مہتاب گلِ تر ہو جائے

کب دل کا لڑکپن جائے گا، ہر وقت یہی ہے ضد اس کی
مانگیں تو وہیں پر مل جائے، سوچیں تو وہیں پر ہو جائے

اک عالمِ جاں وہ ہوتا ہے، تخصیص نہیں جس میں کوئی
اُس وقت ہماری باہوں میں جو آئے وہ دلبر ہو جائے

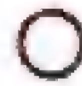
آشوبِ محبت کا آنسو رکھتا ہے تلوّنِ فطرت میں
آنکھوں میں رہے تو قطرہ ہے، ٹپکے تو سمندر ہو جائے

جتنا بھی سمیٹیں آنکھوں میں رہتا ہی نہیں کچھ یاد ہمیں
یارب وہ طلسمِ عارض و لب اک روز تو ازبر ہو جائے

جمشید متاعِ حسنِ جہاں سب اہلِ نظر کا حصہ ہے
جو چاہے قلندر ہو جائے، جو چاہے سکندر ہو جائے

(اوسلو، ناروے)

سعید کوکب



جب اُس کا ہاتھ مِرے ہاتھ میں نہیں ٹھہرے
تو کس اُمید پہ آخر مِرا یقیں ٹھہرے

کبھی تو سَر سے مِرے، آسماں سرک جاتے
کبھی تو پاؤں کے نیچے مِرے زمیں ٹھہرے

خود اپنی سانس سے ہلتی ہوں جس کی دیواریں
پھر اُس مکان میں کیسے کوئی مکیں ٹھہرے

دہکتی ریت پہ جھلمل شعاعوں سے، سُورج
بنا رہا ہے وہ منظر، نظر نہیں ٹھہرے

میں برف برف ہوں، مجھ کو طلب تمہاری ہے
مِرے بدن کی حرارت فقط تمہیں ٹھہرے

ہمیں تھے جن کی زباں کاٹ دی گئی کوکبؔ
ہمیں وہ لوگ کہ حق گوئی کے امیں ٹھہرے



یُوں احساس کو جلنا تھا
وقت کا کام پگھلنا تھا

یاد کا موسم آنے پر
ہجر کا کانچ نگلنا تھا

ہمیں بھی آگ تماشے میں
موم مثال پگھلنا تھا

کن رستوں پر چل نکلے
کن رستوں پر چلنا تھا

ٹیڑھے میڑھے رستوں میں
گرنا اور سنبھلنا تھا

(دہلی)

نجیب احمد



دل کی جیب میں کیا خدشے، کیسے دھڑکے نکلے
اپنا کل سرمایہ اپنے اندیشے نکلے

پل بھر سستانے ٹھہرے تھے، عمر گزار چلے
شہرِ فراق کی دیواروں کے سائے گھنے نکلے

کارگہِ دنیا میں نقدِ حیات گنوا کر بھی
اپنے ذمّے ترے کھاتے میں کچھ قرضے نکلے

رات ہوا کی انگلی تھامے بستی میں نکلی
ہم بھی ہاتھوں کی محراب میں رکھ کے دیئے نکلے

پَر کھولے تو فرش سے اک دو ہاتھ پہ عرش لگا
تیلیاں توڑ کے جب سے پکھیرو پنجرے سے نکلے

آج بھی ہم کو چاہ کی سمت دھکیل رہے ہیں نجیب
بھائی نصیب ہوئے تو بھائی یوسف کے نکلے

نذیر احمد راہی

○

ہر اک ہاتھ میں کتبہ ہے، ہر کتبے پہ زنجیر
یعنی ہم کو قتل کرو، ہم ٹھہرے بے تقصیر

ہر اک جام میں خون ہے، ہر اک بند میں اک انساں
کتنی نیندیں قتل کرو گے، کتنے خواب اسیر!

ہر اک سانس میں گونج رہی ہے چیلوں کی پکار
مَیں ہوں وقت فریم کے اندر لاش کی اک تصویر

ہر اک آنکھ میں تَیر گیا ہے ایک نیا سندیس
ذات اُفق سے جھانک رہی ہے روشن سُرخ لکیر

ہر اک شعر میں ایک علامت، ہر اک لفظ میں ہُوک
اپنے آپ سے بچھڑ گیا ہے شاید آج نذیر

غلام محمد قاصر



دِل دُکھانے پہ بھی تیار نہیں ہے کوئی
تم چلے آؤ تو دیوار نہیں ہے کوئی

دُور تک ریت کے ذرّوں کی ندی بہتی ہے
اور پھر دشت کے اس پار نہیں ہے کوئی

بے نیازانہ مسیحا کی سواری گزری
جیسے اس شہر میں بیمار نہیں ہے کوئی

اُس نے اِک ایسی کہانی میں مجھے کاسٹ کیا
جس میں میرے لیے کردار نہیں ہے کوئی

ہم خیالوں میں، وہ اپنے ہی اُجالوں میں مگن
یعنی اس دَور میں بے کار نہیں ہے کوئی

پھر بھی سب جمع ہوئے تیری اداؤں کے خلاف
ان میں گو میرا طرف دار نہیں ہے کوئی



بیاباں دُور تک میں نے سجایا تھا
مگر وہ شہر کے رستے سے آیا تھا

دیئے کی آرزو کو جب بجھایا تھا
پھر اس کے بعد آہٹ تھی نہ سایا تھا

اُسے جب دیکھنے کے بعد دیکھا تو
وہ خود بھی دل ہی دل میں مسکرایا تھا

دل و دیوار تھے اک نام کی زد پر
کہیں لکھا، کہیں میں نے مٹایا تھا

ہزاروں اس میں رہنے کے لیے آئے
مکاں میں نے تصور میں بنایا تھا

جہاں نے مجھ کو پہلے ہی خبر کر دی
کبوتر دیر سے پیغام لایا تھا

بس اب اک کینچلی اور کچھ لکیریں ہیں
جہاں اک سانپ نے مسکن بنایا تھا

چلے ملاح، کشتی، گیت، امیدیں
کہ جیسے سب کو ساحل نے بلایا تھا

غلام حسین ساجد



وجودِ غیر سے بے زار ہو چکا ہوں میں — اک آئینے کا گرفتار ہو چکا ہوں میں
خوش آئے گی نہ مجھے گھر کی چار دیواری — کہ صیدِ کوچہ و بازار ہو چکا ہوں میں
کسی کو روز نیا راستہ سجھاتا ہوں — کسی کی راہ کی دیوار ہو چکا ہوں میں
الگ ہوئی ہے کہاں خاک میرے قدموں سے — اگرچہ کوچ کو تیار ہو چکا ہوں میں
یقین آیا مجھے اپنے آپ سے مل کر — کسی کے ہجر میں بیمار ہو چکا ہوں میں
بہت عزیز تھا جس شخص کا سکون مجھے — اُسی کے درپئے آزار ہو چکا ہوں میں
نیا نہیں ہے مرے واسطے جہاں میں کچھ — کہ اُس گلی سے بھی اک بار ہو چکا ہوں میں
بُھلا چکا ہوں سبھی دوستوں کے نام و نسب — اسیرِ صحبتِ اغیار ہو چکا ہوں میں
سجھائی دیتا نہیں کوئی راستہ مجھ کو — یہ کس طلسم سے دوچار ہو چکا ہوں میں
اُتر چکے ہیں مرے دل سے یہ زمان و مکاں — کہ اپنے آپ سے بے زار ہو چکا ہوں میں
بہت دنوں سے گلِ ہجر کی تلاش میں ہُوں — کسی کے وصل سے سرشار ہو چکا ہوں میں

گزر رہا ہُوں کسی خواب سے ابھی ساجدؔ
نہیں کہ نیند سے بیدار ہو چکا ہوں میں

غلام حسین ساجد



نگاہ پاک نہیں اور دل کُشادہ نہیں
سو میری خاک میں تنویر کچھ زیادہ نہیں

میں صُلح نامے پہ کیوں دستخط نہیں کرتا
عدو سے جنگ بھی کرنے کا جب ارادہ نہیں

قبائے شعر ہے میری برہنگی کا علاج
کہ میرا جسم مری رُوح کا لبادہ نہیں

تمیز خوب اُسے اپنے نیک و بد کی ہے
وہ سادہ ہے تو مگر اس قدر بھی سادہ نہیں

کلام کرتا نہیں کوئی آئینہ مجھ سے
چراغ طاق پہ جس دن سے ایستادہ نہیں

نہیں ہے فکر مجھے سلطنت بچانے کی
خُدا کا شکر ہے میں کوئی شاہزادہ نہیں

مگر یہ بھید بہت دیر میں کھُلا ساجد
کہ موت صرف شبِ وصل کا اعادہ نہیں



شگفتِ خواب سے آسودہ ہو نہیں سکتے
ہماری طرح ستارے بھی سو نہیں سکتے

ہنسیں گے کھل کے کبھی اپنی بے بسی پر ہم
کہ رونا چاہتے ہیں اور رو نہیں سکتے

دھرے ہوئے ہیں مرے دوش پر زمان و مکاں
بہت سے لوگ یہی بوجھ ڈھو نہیں سکتے

بنیں گے رزق کسی اجنبی ستارے کا
غبارِ کوچۂ جاناں تو ہو نہیں سکتے

ہیں ایک نقشِ حقیقت کے رُو برو سو ہم
تصورِ رخِ جاناں میں کھو نہیں سکتے

تمام رات سُلگتے ہیں آئینے لیکن
کسی کے ہجر میں آنکھیں بھگو نہیں سکتے

مری طرح یہ عناصر بھی جیتے جی ساجد
طلسمِ خاک سے آزاد ہو نہیں سکتے

غلام حسین ساجد



اُٹھا شکستہ دلوں سے دُھواں محبت کا
ملا ہے اُس کی گلی میں نشاں محبت کا

ہجوم بڑھنے لگا ہے فصیل پر، جیسے
پلٹ پڑے گا ابھی کارواں محبت کا

بجھی بجھی سی ہیں اُس خوب رو کی آنکھیں بھی
فقط مجھے ہی نہیں ہے گماں محبت کا

چلو کہ جمع کریں اپنے آپ کو ہم سب
کہ ہو چکا ہے بہت کچھ زیاں محبت کا

طلوع ہونے لگیں شہرِ خواب کی پریاں
دکھائی دینے لگا آسماں محبت کا

گریز پائی کا الزام کیوں دھروں اُس پر
تھا اعتبار مجھے بھی کہاں محبت کا

جب اپنے آپ کو رد کر چکیں گے ہم دونوں
کھلے گا پھول کہیں درمیاں محبت کا

کسی حسیں کے وسیلے سے آج آخر کار
ہمیں نصیب ہوا سائباں محبت کا

بہت دنوں سے کنارے پہ منتظر تھے ہم
بہت دنوں میں کھلا بادباں محبت کا

بہت کڑی ہیں زمانے کی سختیاں ساجد
میں ہاتھ تھام نہ لوں مہرباں محبت کا



شگفتہ ہو کے زرِ وصل کی دمک سے میں
گریز کرتا ہوں اپنے وجود تک سے میں

اُلجھ رہی ہے ستاروں سے میری بینائی
اگرچہ دُور، بہت دُور ہوں فلک سے میں

یقیں نہیں ہے مجھے اپنے آپ پر شاید
کہ دیکھتا ہوں ہر اک آئینے کو شک سے میں

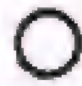
مرے دُکھوں کا مداوا تو ہو چکا، لیکن
سُلگ رہا ہوں کسی اور ہی کسک سے میں

یہ جی میں ہے کہ تری خوابگاہِ ناز کے گرد
حصار کھینچ دوں تلوار کی چمک سے میں

مجھے یہ وہم ہوا آسمان کو چھو کر
لپٹ رہا ہوں ترے جسم کی مہک سے میں

بسا ہوا ہے مری روح میں فقط لاہور
بہت قریب تھا اُس شہر میں دھنک سے میں

سرور انبالوی



کر کے تزئینِ زمین و آسماں گم ہو گیا
ثبت کر کے اپنے قدموں کے نشاں گم ہو گیا

آئینہ احساس کا سُولی پہ ہے لٹکا ہُوا
اور ضمیرِ انسان کا جانے کہاں گم ہو گیا

مکڑیوں نے وقت کی آنکھوں پہ جالے تن دیے
حرفِ حق بھی مصلحت کے درمیاں گم ہو گیا

ایک بچہ جو کھلونوں کو ترستا تھا بہت
گھر سے نکلا تھا پکڑنے تتلیاں، گم ہو گیا

ولولوں کے ساتھ دل میں جو جواں داخل ہُوا
بن کے وہ اک روز چمنی کا دھواں گم ہو گیا

آشیانوں سے پرندے کر گئے ہجرت سرورؔ
ڈھونڈنے نکلا تھا اُن کو باغباں، گم ہو گیا



جب سے ہم پر آپ کی نظرِ کرم ہونے لگی
زندگی کچھ اور بھی وقفِ اَلم ہونے لگی

آئینے ہی مصلحت کی قبر میں دفنا دیے
اپنے خال و خد کی اب پہچان کم ہونے لگی

جس پہ ہے لکھا ہُوا شجرہ مرے اجداد کا
کیوں مرے گھر کی وہی دیوار خم ہونے لگی

ماؤں نے بیٹوں کی شفقت سے چُرا لی جب نظر
چادرِ دُختر وہیں نامحترم ہونے لگی

جب مرا قد میرے سائے سے بھی گھٹ کر رہ گیا
خود مرے گھر میں مری توقیر کم ہونے لگی

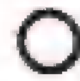
جب پرندے مر گئے گھٹ کر تو اُن کی جستجو
کوچہ کوچہ قریہ قریہ یم بہ یم ہونے لگی

ایوب خاور

کیا جانئے کیا ہوا ہے مجھ میں
اک باغ سا کھل رہا ہے مجھ میں
اے لشکرِ ماہتابِ جاں! دیکھ
کیسا یہ دیا جلا ہے مجھ میں
اک دل ہی نہیں کہ تیرے دم سے
سب کچھ ہی بدل گیا ہے مجھ میں
اک حرفِ وصال مثلِ دریا
چپکے سے آ ملا ہے مجھ میں
طغیانی ربطِ باہمی سے
کیا کیا نہ چھلک پڑا ہے مجھ میں
سب کچھ ترے پاس رہ گیا ہے
اب کیا ہے! کیا بچا ہے مجھ میں!
رخصت کی گھڑی سے لے کے اب تک
یہ کیا کہرام سا ہے مجھ میں
تنکا تنکا مجھے جما کر
تو نے گھر کر لیا ہے مجھ میں
میں تُجھ سے بچھڑ کے جی سکوں گا
کیا اتنا حوصلہ ہے مجھ میں!
اک بس نظر کی لے پہ خاور
اک شخص سخن سرا ہے مجھ میں

کیا ہے جو ابھی ہُوا نہیں ہے
لیکن تجھے کچھ پتہ نہیں ہے
دیوار سی اک کھنچی ہوئی ہے
اور اُس کا کوئی سرا نہیں ہے
میں خود سے اُلجھ رہا ہوں جاناں
تجھ سے تو کوئی گلا نہیں ہے
کھڑکی میں کھلے ہیں جتنے تارے
کوئی بھی تری طرح نہیں ہے
میں جس کی سزا بھگت رہا ہوں
وہ جرم ابھی کیا نہیں ہے
اس قریۂ عشق و آگہی میں
رونے کا کوئی صلہ نہیں ہے
ہر رنگ کا پھول کھل رہا ہے
اک حرفِ وفا کھلا نہیں ہے
تُو مجھ میں سما چکا ہے، پھر بھی
میرے لیے سوچتا نہیں ہے
میں تیرے بغیر کچھ نہیں ہوں
تو پھر بھی مرا خدا نہیں ہے
جس ڈھنگ سے میں نے تجھ کو دیکھا
اُس ڈھنگ سے تو ملا نہیں ہے
اس دل میں نقب لگانے والا
تو ہے، کوئی دوسرا نہیں ہے
میں تیرے ضمیر میں ہوں زندہ
کیا تُو مجھے جانتا نہیں ہے
مر جانے کی حد پہ آ چکا ہوں
کیوں مجھ کو سنبھالتا نہیں ہے!

خالد اقبال یاسر



کس طرح گردش سے نکلے پھر بھی ہمت آئی نہیں
سلطنت کرنے چلے ہیں سلطنت آئی نہیں

زاویہ ایسا ہے یا وہ نقش ہی اتنا ہے بس
سامنے پل بھر میں پوری کیفیت آئی نہیں

تخت سے آئے گا رفتہ رفتہ لہجے میں جلال
چار دن کی سلطنت سے تمکنت آئی نہیں

کوئی سُر سیدھا نہ پڑنے دے مغنی کا یہاں
ایسے نومشقوں کی سنگت جن کو گت آئی نہیں

فقر یاسر اس قدر رچ بس گیا ہے خون میں
طبع میں کوشش سے بھی درباریت آئی نہیں



اجاڑ کنج گلوں سے نہال کر دوں گا
ملول چہرے خوشی سے گلال کر دوں گا

دلوں سے دور کروں گا کدورتیں ساری
میں اپنی دوستیاں لازوال کر دوں گا

مرا ہنر ہے فقط اعتماد کا طالب
کمال چاہو گے مجھ سے کمال کر دوں گا

رگوں کے سارے لہو کو پسینہ کر کے میں
زمیں کی تہہ سے دفینہ نکال کر دوں گا

بہت کثیف ہوا شہر آئینہ یاسر
ہوا کے راستے اک دن بحال کر دوں گا

زمان ملک

○

کیا دیوار تھی، کیسا در تھا
جس کا چرچا نگر نگر تھا
میرے گھر سے تیرے گھر تک
میری تنہائی کا سفر تھا
گہرے نیل گگن کا سایہ
میرے دل، تری آنکھوں پر تھا
میرے چراغِ چشم سے روشن
تیری یاد کا ہول نگر تھا
سُرخ، سنہرے غم کا قصّہ
لکھا میرے ماتھے پر تھا
خوشیاں بانٹنے والے میرا
لمحہ لمحہ دست نگر تھا
یا مرے گھر میں آگ لگی تھی
یا پھر آگ پہ میرا گھر تھا
آگ کی دیواریں تھیں ساری
آگ کی چھت تھی آگ کا در تھا
میں نے خود ہی بنائی جنّت
میں ہی زماں جہنم گر تھا

○

تیرگی جلتی رہی، دن کٹ گئے
روشنی ڈھلتی رہی، دن کٹ گئے

کیا ہوا تھی فصلِ گُل میں شاخِ گل
ہاتھ ہی ملتی رہی، دن کٹ گئے

زندگی کو بھی تری خوُ تھی مگر
برف سی گلتی رہی، دن کٹ گئے

موت کے خواہاں تھے تیرے منتظر
موت بھی ٹلتی رہی، دن کٹ گئے

شاخِ رنجِ رائیگاں دل میں زماں
پھُولتی پھلتی رہی، دن کٹ گئے

صفدر سلیم سیال



بہت گریز کیا ہے ترے نشانوں سے
سنبھال رکھا ہے دل کو کئی بہانوں سے

ابھی تو رات ہے باقی، چراغ گُل نہ کرو
دراز دست نکل آئیں گے ٹھکانوں سے

حصارِ نجات کی زد میں ہے تیرے لُطف کی لَو
بتا رہا ہے مجھے کوئی آسمانوں سے

تُو مجھ سے دُور نہ ہو، وقت آنے والا ہے
ترا سراغ ملے گا مرے فسانوں سے

بپاسِ حسنِ رفاقت زباں نہیں کھولی
گِلے بہت تھے ہمیں اپنے مہربانوں سے

کسی کو ہوش نہیں کشتیاں کہاں ٹھہریں
اُلجھ رہے ہیں مسافر تو بادبانوں سے

قریب آ، تجھے حسنِ دوام دے جاؤں
یہ رسم آج بھی قائم ہے ہم دوانوں سے

ملا تو وہ بھی کسی اور کی تلاش میں تھا
جسے میں ڈھونڈ رہا تھا کئی زمانوں سے

شکاریوں نے بچھائے تھے جال جن کے لئے
نکل گئے تھے پرندے وہ آشیانوں سے



جو مرا حق ہے، مجھے وہ مرے شیدائی دے
میزباں ہے، تو مجھے کچھ تو پذیرائی دے

تُو نے جس شخص کو چاہا، اُسے چاہا میں نے
داد اس بات پہ کچھ تو مرے ہرجائی دے

ترے اصرار پہ رستے میں کیا ترکِ سفر
اس اندھیرے میں مرا ساتھ مرے بھائی دے

سب کو اِک بوئے ندامت نے کیا ہے تنہا
کوئی اِس شہر کو اب تھوڑی سی دانائی دے

میں تو اک عمر سے ہوں تیرے لئے وقفِ جہاد
اے خدا کچھ تو مجھے تُو بھی توانائی دے

دل کے بچنے کی فقط ایک ہی صورت ہے خدا
اس کڑے وقت میں ذوقِ حصارِ تنہائی دے

صفدر سلیم سیال



اپنے ناکردہ گناہوں کی صفائی دیتا
اتنی مہلت تو مجھے میرا خدائی دیتا

تُو نے رکھا ہی نہیں سینۂ صد چاک پہ سر
زندگی بھر کی تجھے ساری کمائی دیتا

اس سے پہلے کہ جھلس جاتا ہوا کا آنچل
شہر کا شہر کھڑے ہو کے دُہائی دیتا

تیری قربت میں وہ آزار ملے ہیں دل کو
پئے تسکین کوئی لطفِ جدائی دیتا

چاندنی اب بھی بکھرتی ہے بیابانوں میں
کوئی اس دشت سے دریا کو رہائی دیتا

لوگ اِس طرح بچھڑ جائیں گے ویرانوں میں
کچھ تو اس غولِ بیاباں میں دکھائی دیتا

سب کے اعصاب پہ اک حسرتِ نالش ہے محیط
کوئی اس شہر کو خوابوں سے رہائی دیتا

دم گھٹا جاتا ہے اس جشنِ مراسم میں سلیم
کیا یہ ممکن ہے مجھے کچھ نہ سنائی دیتا



ختم کیا ہوں گے نہ ملنے کے بہانے اُس کے
پھر بھی مشتاق ہیں کیوں لوگ نہ جانے اُس کے

ابھی اُترا نہیں سر سے اُسی قربت کا خمار
ہم بھی کچھ روز رہے یونہی دوانے اُس کے

ابھی تحقیق طلب ہے شبِ فرقت کا سلوک
ابھی دیکھیں گے کئی رُوپ زمانے اُس کے

اپنی چاہت سے ہی مغلوب ہوا جاتا ہے
ابھی پھیلے نہیں دُنیا میں فسانے اُس کے

اے صبا تیرے سبب بوئے وصال آتی ہے
اتنے آساں تھے کہاں ورنہ ٹھکانے اُس کے

مجھ سے بگڑا تو اُسے بعد میں محسوس ہوا
مری یادوں سے ہی تھے خواب سہانے اُس کے

کون آتا ہے یونہی ابرِ رواں کی زد میں
راستے کاٹ دیئے کالی گھٹا نے اُس کے

جلیل عالی



کوئی دردشعار کرو تو پھر دیکھو
دلِ درویش کو یار کرو تو پھر دیکھو

سب آہنگ بھلا کر اندر کی دھن پر
رقص سرِ بازار کرو تو پھر دیکھو

جھوٹے سارے خواب انا کے ساحل پر
اِس دریا کو پار کرو تو پھر دیکھو

جیت کا اپنا ایک سُرور سہی لیکن
کبھی جیت کو ہار کرو تو پھر دیکھو

دنیا کیسے خود ہی رستہ دیتی ہے
شوقِ جنوں آثار کرو تو پھر دیکھو

عالیؔ دل کی دل میں رکھنے سے حاصل!
حرفِ طلب اظہار تو پھر دیکھو



جب بھی موسمِ ہجر حرفِ بیاں لے جائے
یوں لگے جسم سے جیسے کوئی جاں لے جائے

ہم کہ ہیں نقشِ سرِ ریگِ رواں کیا جانے
کب کوئی موجِ ہوا اپنا نشاں لے جائے

ایک آزادی کہ خود کھینچ لیں خواہش کے حصار
اک اسیری کہ کراں تا بہ کراں لے جائے

وحشتِ شوق مقدر تھی سو نبھتے کب تک
اب تو یہ سیلِ بلاخیز جہاں لے جائے

ایک پرچھائیں کے پیچھے ہیں ازل سے عالیؔ
یہ تعاقب ہمیں کیا جانے کہاں لے جائے

ڈاکٹر انعام الحق جاوید

○

بجھنے نہیں دیتا کبھی جلنے نہیں دیتا
سوچوں کو کسی سمت نکلنے نہیں دیتا

منزل بھی بتاتا ہے کہ ہے اور طرف کو
اور ساتھ میں رستہ بھی بدلنے نہیں دیتا

مضبوط گرفت ایسی ہے لمحات پہ اسکی
سورج کو سرِ شام بھی ڈھلنے نہیں دیتا

رکھتا ہوں میں ہمراہ جسے خضر کی صورت
وہ شخص مری ایک بھی چلنے نہیں دیتا

کر دیتا ہے الفاظ کو مفہوم سے عاری
چشمہ کوئی ذہنوں میں اُبلنے نہیں دیتا

برگد کی جبلت ہے کہ وہ سائے میں اپنے
پودوں کو کبھی پھولنے پھلنے نہیں دیتا

○

سخن کے سارے سلیقے زباں میں رکھتا ہے
"نہیں" کا عکس نہاں اپنی "ہاں" میں رکھتا ہے

اگرچہ بات ہمیشہ زمیں کی کرتا ہے
مگر یقین فقط آسماں میں رکھتا ہے

ہر ایک سمت، ہر اک رُخ پہ راج ہے اس کا
ہوائیں بند کفِ بادباں میں رکھتا ہے

نگاہ جس پہ ذرا مہرباں ہو جائے
تمام عمر اُسے امتحاں میں رکھتا ہے

یہ کارواں کبھی منزل پہ کیوں نہیں جاتا
وہ کون ہے جو ہمیں درمیاں میں رکھتا ہے

الفت رسول



ہے کوئی دِل، مرے دلِ بے زار کی طرح
کارِ نشاط ہے اسے بے گار کی طرح

کیا شخص ہے کہ رہتا ہے آنکھوں کے سامنے
دل میں ہے پھر بھی حسرتِ دیدار کی طرح

جس رنگ میں بھی دیکھیے لب بستہ کائنات
کچھ کر رہی ہے کوششِ اظہار کی طرح

میں اس کو وار کرنے سے کس منہ سے روکتا
دشمن مرا تھا میرے طرفدار کی طرح

تقدیس و احترام و تحفظ کے باوجود
کیا شے ہے دل میں اس کیلئے پیار کی طرح

کیسا تھا رکھ رکھاؤ کا ماحول ہر جگہ
جینا پڑا ہے مجھ کو اداکار کی طرح

کوئی ثبوت پاس نہ تھا ورنہ، میری جاں:
تجھ کو خدا سے مانگتا حقدار کی طرح

میں نے گنوا دی عمر اسی کو سنبھالتے
سر پر انا کو رکھ لیا دستار کی طرح

پھر آنکھ دیکھ پائی نہ کچھ تجھ کو دیکھ کر
تو سامنے رہا مرے معیار کی طرح

پھر اس کے احتراز کا الفت گلہ ہی کیا
اک بار جس کا ملنا ہے سو بار کی طرح



یہ میرے ساتھ گریہ کناں اور کون ہے
ہے میرا دل شریکِ فغاں، اور کون ہے

مہر و مہ و نجوم تو جلوہ نما ہوئے
پردے میں آسماں کے نہاں اور کون ہے

میں نے تو کر دیا تھا ترے غم کو جاں بدر
دِل میں مثالِ سنگِ گراں اور کون ہے

اعلانِ حق ہے صرف مری ہی زبان پر
اک میں ہی سر پھرا ہوں یہاں، اور کون ہے

بستے ہیں جو زمین پہ، ماں جائے ہیں سبھی
سب کی زمین ہی تو ہے ماں، اور کون ہے

تو لاکھ سات پردوں میں خود کو چھپا کے رکھ
تجھ سے زیادہ مجھ پہ عیاں اور کون ہے

جچتا نہیں جو چشمِ اطاعت پسند میں
میں ہوں وہ کج کلاہِ زماں، اور کون ہے

ثمینہ راجہ



اُس سے کہہ کر بھی مُدّعا دل کا
رنج دل ہی میں رہ گیا دل کا

ہم نے بھی ہر گریز پا کی طرح
کب کیا عمر بھر، کہا دل کا

شہرِ دل سے چلے تو بالآخر
پھر وہی شہر آ گیا دل کا

اس کے حق میں بُرائی کرتے رہے
چاہتے تھے مگر بھلا دل کا

دشمنِ دل کے چند لفظوں سے
ہو گیا خوں بہا ادا دل کا

گنبدِ بے صدا رہا برسوں
بارے پھر ایک در کُھلا دل کا

سخت بے مہر ہیں یہ آدم زاد
اب خُدا ہی بنے خدا دل کا



غموں کی فصل کی یوں آبیاری کرنی ہے
کہ دل سے آنکھ تلک نہر جاری کرنی ہے

عجیب رسم چلی ہے کہ قتل کرنا ہے
پھر اس کے بعد بہت آہ و زاری کرنی ہے

بس اب بساطِ محبت لپیٹ لاؤ گے
کہ اپنے عہد کی کچھ اور خواری کرنی ہے

بہت اُداس سہی موسمِ خزاں کا چاند
کسی کو وقفِ خزاں عمر ساری کرنی ہے

بس ایک بار قریب آ گئے تھے یہ کہنے
کہ دُور ہی سے تمنّا ہماری کرنی ہے

ہمیں خود اپنے کہے کا بھرم بھی رکھنا ہے
اور اس کی بات کی بھی پاسداری کرنی ہے

یہ ٹھیک ہے کہ بغاوت ہمارے خوں میں ہے
مگر رواج یہ ہے، باری باری کرنی ہے

مقبول عامر

○

ہاں کچھ تو مزاج اپنا جنوں خیز بہت ہے
اور کچھ یہ رہِ عشق دل آویز بہت ہے

مرنے کے لیے تیشۂ فرہاد ہے کافی
جینے کے لیے حیلۂ پرویز بہت ہے

اَب کے نہ کوئی قصر نہ ایوان بچے گا
اب کے جو چلی ہے، وہ ہَوا تیز بہت ہے

آنکھوں میں دیئے، دل میں ستارے ہیں فروزاں
ورنہ یہ شبِ تار غم انگیز بہت ہے

کچھ بزم کے آداب بھی ملحوظ تھے اُس کو
اور کچھ وہ مزاجاً بھی کم آمیز بہت ہے

تم رنگ ہو، خوشبو ہو، ذرا دھیان سے رہنا
صحرائے محبت کی ہَوا تیز بہت ہے

○

رنگ اور نور کی دُنیا میں ذرا لے جائے
کوئی تو ہو جو مجھے شہر بَسا لے جائے

وہ مجھے ڈھونڈنے نکلے تو اُسے کہہ دینا
دُھوپ ہے تیز بہت، سر پہ گھٹا لے جائے

یوں تری یاد مجھے ساتھ لیے جاتی ہے
جیسے پھولوں کی مہک بادِ صبا لے جائے

تری محفل کی طرف جائے کہ مقتل کی طرف
ہم تو جائیں گے جدھر راہِ وفا لے جائے

کب سے ویران جزیرے پہ کھڑا ہوں عامرؔ
کوئی موج آئے، مجھے ساتھ بہا لے جائے

مقبول عامر

دل دریا کے پار اک ایسی وادی تھی
جس میں سارے جذبوں کی آزادی تھی

آگ بجھا کر بھی کچھ ہاتھ نہیں آیا
اِک جھونکے نے ساری راکھ اُڑا دی تھی

دریا پر پہنچا تو کتنا رویا تھا !
وہ جس نے صحرا میں عمر گنوا دی تھی

میں اُس کے انبوہ میں اکثر کھو جاتا
میرے اندر اِک ایسی آبادی تھی

میری چُبھتی نظروں نے اِک دن عامر
اُس پیکر کو عریانی پہنا دی تھی

○

چرواہا بستی والوں سے کہتا ہے
پربت کے اُس پار بھی کوئی رہتا ہے

جس دریا کے رستے میں دیوار نہ ہو
وہ دریا کس خاموشی سے بہتا ہے

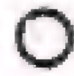
مولا جیسی فطرت ہے اُس بندے کی
دیکھتا ہے سب کچھ لیکن چُپ رہتا ہے

غم کی موجیں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں
دل کا ساحل دھیرے دھیرے ڈھتا ہے

میری بھیگی آنکھوں میں اُس کا پیکر
جھیلوں میں مہتاب کی صورت رہتا ہے

چاند نے کل شب دریا سے سرگوشی کی
ساحل میرے بارے میں کیا کہتا ہے

رخسانہ شمیم



بڑے دلکش رنگ ہیں مٹی کے
جھونکے آہنگ ہیں مٹی کے

نیلا آکاش اکیلا ہے
اور ہم سب سنگ ہیں مٹی کے

لالہ، سوسن، نرگس، جوہی
اُف، کتنے رنگ ہیں مٹی کے

کنکر، پتھر، کوہ و صحرا
کتنے نیرنگ ہیں مٹی کے

دہلیز پہ اس کی تکیہ ہے
یہ پیر، ملنگ ہیں مٹی کے

طوفان میں سینہ سپر ہیں شجر
سب اسلحۂ جنگ ہیں مٹی کے



اک سنسنی عجیب فضا کے بدن میں ہے
ہمراہ جیسے گل کے، خزاں بھی چمن میں ہے

دو شاخوں کو شیشۂ جاں میں نظر پڑا
جو زرد رو چھپا ہوا گل کی پھبن میں ہے

میری ہی خاک پھر میرا کارِ نمو بنی
تریاق و زہر جیسے کہ افعی کے پھن میں ہے

ہے حالتِ سکون میں بھی در پئے خرام
ہر شے یہاں بس ایک سفر کی لگن میں ہے

تنہا مجھے ہی خدشۂ پژمردگی نہیں
جاری شکستِ ریخت یہاں ہر بدن میں ہے

کوشاں رہی سدا کہ کبھی کر سکوں عبور
وہ فاصلہ جو مجھ سے مرا میرے تن میں ہے

یونسٹر (جرمنی)

رخسانہ شمیم

○

جب بھی بھٹکی خوشیوں کی کوئی قاز اُڑے
اس کے درپے اندیشوں کا باز اُڑے

یہ تفریحِ وقت گذاری لوگوں کی
پہلے لُڑہ لگائیں اور پھر راز اُڑے

دل ویرانہ، کس کا ٹھکانا، کیا پروا!
بوم و ہما منڈلائیں یا شہباز اُڑے

کل کی خیر خدا کے ہاتھ ہے لیکن کیوں
دل میں پھر اندیشۂ دور و دراز اُڑے

شدتِ سوزِ نغمہ کا وہ عالم ہے
دستِ نغمہ گر سے جیسے ساز اُڑے

پیڑ کے زخمِ نمو پہ بنا ہی تھا انگور
جھونکے خزاں کے لے کر برگ و ساز اُڑے

○

ہلکی بارش کی سلکِ ریشم سے
گل کے رخسار ہیں ملائم سے

ان کا انداز دوستانہ ہے!
جانے کیا کام پڑ گیا ہم سے

رات آنکھوں میں خواب کا کپڑا
بُنتا جاتا تھا جالِ ریشم سے

حوّا نے کتنی تلخیاں چکھیں
لے کے اک سیب دستِ آدم سے

غم، خوشی ہیں فقط اضافی نام
دل ہی پتھرا گیا ہو جب غم سے

جانے کن پہلوؤں سے ہو تفسیر
کچھ اشارے ہوئے تھے مبہم سے

(جرمنی)

ظفر منصور



اور اک مجھ پہ کرم طوفانِ باراں کر گیا
پہلے دیواریں گری تھیں، اب کے پورا گھر گیا

آج پھر اک قتل کا الزام اس کے سر گیا
آج پھر گھٹ گھٹ کے اک انسان مجھ میں مر گیا

صحن میں بکھری ہوئی پرچھائیاں بھی بجھ گئیں
دور افق میں ڈوبتے سورج کا بھی منظر گیا

آسمانوں سے اگر کوئی عذاب اترا نہیں
کس لیے پھر شاخ پر بیٹھا پرندہ ڈر گیا

گھومتا رہتا تھا جو اک اک گلی میں رات بھر
شہر کے لوگوں پہ بابِ آگہی وا کر گیا

تھا نہاں منصورؔ لوحِ خاک میں میرا وجود
اپنے ہونے کا جنوں مجھ کو ہویدا کر گیا



کھلی جو آنکھ مری، اک عجیب منظر تھا
زمیں کہیں بھی نہ تھی دور تک سمندر تھا

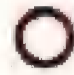
کسی کے نام کا نوحہ ہوا کے لب پر تھا
کسی کا روپ فصیلِ ہوا کے اندر تھا

تمہارا چہرہ تو ہر در پہ نقش تھا لیکن
ہمارے نام کا اک خار تھا نہ کنکر تھا

تمہارے سر یونہی الزام آ گیا، ورنہ
ہماری روح کے اندر بھی اک ستمگر تھا

یہ شہرِ سنگ ہے، گھبرا گئے ہو کیوں منصورؔ
تمہاری سمت ابھی تو یہ پہلا پتھر تھا

ڈاکٹر زبیر فاروقی



ذہن سے دھیرے دھیرے آخر اُترا کاغذ پر
بنتے بنتے بن گیا تیرا چہرہ کاغذ پر

تیری یاد کی برکھا برسی رات وہ اشک بہے
گیلا ہر اک حرف تھا جو بھی لکھا کاغذ پر

تب کتنے خاموش تھے دونوں جب ہم بچھڑے تھے
بعد میں تُو نے کیا کیا لکھ کر بھیجا کاغذ پر

تیرے ہر خط کی تحریر غموں میں ڈوبی تھی
تیری آنکھ کا کاجل دیکھا پھیلا کاغذ پر

فن کی خاطر کون کرے گا اتنی قربانی
دل کو خون کیا تو شعر اُتارا کاغذ پر

اک ایسی تصویر بھی میں نے دیکھی تھی فاروقؔ
یوں لگتا تھا، رقص میں ہے اک شعلہ کاغذ پر



سر بکف چلنا پڑے گا قاتلوں کے شہر میں
دل کی قیمت کچھ نہیں ہے پتھروں کے شہر میں

سر چھپانے کے لیے اک سائباں تو چاہیے
بھیگتے کب تک رہو گے بارشوں کے شہر میں

سچ کی قیمت کچھ نہیں ہے جھوٹ کے بازار میں
عقل کی وقعت کہاں ہے سرپھروں کے شہر میں

ہوشمندی کا لبادہ اوڑھ کر آیا تھا میں
اور پاگل ہو گیا ہوں پاگلوں کے شہر میں

کوئی در بھی وا نہیں ہوتا یہاں تیرے لیے
مل نہ پائیں گی پناہیں بزدلوں کے شہر میں

مجھ کو بھی مہنگی پڑی ہے اُن گلی کوچوں کی سیر
دل گنوا آیا ہوں میں بھی گل رُخوں کے شہر میں

(دوبئی)

اشرف جاوید

○

عجیب رنگ ہیں خوشبو کے منظروں کے بھی
زرِ بہار میں شامل ہیں دُکھ رُتوں کے بھی

ترے بھی اذنِ تکلّم پہ لب نہیں کھُلتے
ابھی سے دُور کریں کیسے ڈر دلوں کے بھی

اس ایک آس پہ ٹہنی ہری رہی برسوں
کبھی تو پھُول کھلیں گے نئے دنوں کے بھی

سحابِ ہجر رواں ہے سرِ فراتِ ملال
بچھڑتے جاتے ہیں لمحے رفاقتوں کے بھی

ہوا کے ہاتھ میں روشن ہے حرفِ سطرِ گماں
چراغِ راہ میں رکھے ہیں جگنوؤں کے بھی

سحر کا خیمہ لگے یا نہ لگ سکے ___ لیکن
قدم اکھڑنے لگے ہیں تری شبوں کے بھی

○

سرِ شاخِ چشمِ نہال بھی کوئی خواب لکھ
مری تشنگی! سرِ آب رقصِ سراب لکھ

کھِلی ساعتوں میں تمازتِ گلِ زخم ہو
پسِ برگِ حرفِ وصال نجمِ شباب لکھ

کبھی صبحِ غم کا جواز دے، کوئی راز دے
نئے راستوں میں اترنے والے عذاب لکھ

تہی سانس ہوں، میں زمیں پہ ہوں کہ خلا میں ہوں!
کہیں صورتِ گلِ آب میرا جواب لکھ

کبھی بارشوں کا سمندروں پہ پڑاؤ کر
کہیں سیپیوں کے دہان میں دُرِ ناب لکھ

سوئے شہرِ جاں، تری آہٹوں کے گماں پر
جو گزر گئے انہی رتجگوں کا حساب لکھ

مرے مُو قلم کی زباں پہ حرفِ بہار ہو
مرے موسموں کی ہتھیلیوں پہ گلاب لکھ

منور عزیز



اِک تحیر سنگ پاروں میں سمونا ہے مجھے
اس خرابے میں کہاں آباد ہونا ہے مجھے

منتشر ہے روز و شب کی کرچیوں سی ڈور میں
ساری سانسوں کو سلیقے سے پرونا ہے مجھے

مَیں کہ صحرا میں ہُوں، صحرا میں کہاں دیوار و در
اپنی چھاؤں اوڑھ کر کچھ دیر سونا ہے مجھے

ہمنوا ہونا نہیں جب اُس تہی احساس کو
کیا خلش ہے، کس لئے پانی بلونا ہے مجھے

کیا کروں ذوقِ نظر میرے تماشائی کا ہے
اب خسِ جاں روبرو اُس کے ڈبونا ہے مجھے

ڈھونڈھتا ہے وہ منوّر مجھ کو آنکھیں میچ کر
اور اسی بے درد پل میں اُس کو کھونا ہے مجھے



حدِ ادراک پہ مبہم سا اشارہ کوئی
ڈوبتے شخص کو تنکے کا سہارا کوئی

کوئی جھونکا تو کسی رُخ سے اِدھر آ نکلے
پھر مری راکھ میں روشن ہے شرارہ کوئی

اِس کی وحدت میں بھی کثرت کے قرینے کتنے
کاوشِ درد میں ہر فرد ادارہ کوئی

خاتمِ شب ہے اندھیروں میں سفارت میری
میرے پرچم پہ بنا چاند ستارہ کوئی

کسی رُت نے بھی روایت نہ نبھائی ہم سے
کسی رُت نے بھی یہاں رُوپ دھارا کوئی

پارۂ سنگ بنا تھا میں منوّر لیکن
سینۂ سنگ میں یک لخت پکارا کوئی

عدیم ہاشمی



سخاوت کا نمود افروز منظر ہی نہیں آیا
سخی بیٹھے رہے، کوئی گداگر ہی نہیں آیا

یہ سوچا تھا، تری خاطر کئی موتی نکالوں گا
میں جس رستے میں تھا اس میں سمندر ہی نہیں آیا

دیا ہی جب نہیں ہوگا، ہوا کس کو بجھائے گی
چراغِ راہ اب کے میں جلا کر ہی نہیں آیا

چمک جس کی بُلا لیتی عقابِ دل کو سینے سے
فضاؤں میں کوئی ایسا کبوتر ہی نہیں آیا

بڑھیں بیلیں، جھڑے پتے، لگے جالے دریچوں پر
مکیں ایسا گیا گھر سے، پلٹ کر ہی نہیں آیا

عدیمؔ آپس میں لڑ کر ہی پیادے مر گئے سارے
مقابل جس کو آنا تھا وہ لشکر ہی نہیں آیا



پلٹ کے اس کو دیا ہے جواب میں نے بھی
چُکا دیا ہے کچھ اب کے حساب میں نے بھی

محبتوں کا سبق نفرتوں سے یاد نہ کر
پڑھی ہوئی ہے بہت یہ کتاب میں نے بھی

ذرا سا تُو بھی تڑپ اب مری جدائی میں
سہا ہے دیر تلک یہ عذاب میں نے بھی

وہ اپنے واسطے کوشش میں مبتلا تھا عدیمؔ
اُسی کو ہونے دیا کامیاب میں نے بھی

ہر ایک شاخ نے کانٹوں کے تیر برسائے
عدیمؔ چوم کے چھوڑا گلاب میں نے بھی

عدیم ہاشمی



جب کہا اُس کو: پلٹ کر، وہ مکیں آیا نہیں
بات اُس نے مان لی، اُس کو یقیں آیا نہیں

بے جھجک سی اک نمی آنکھوں میں پھیلی رہ گئی
اشک پلکوں پہ کوئی مثلِ نگیں آیا نہیں

ریت تڑپی بھی سرِ صحرا بگولے اُڑ کر
کوئی بھی چشمہ مگر زیرِ زمیں آیا نہیں

احتیاطِ خاص اُس کے پیار میں شامل رہی
وہ قریں آیا مگر اتنا قریں آیا نہیں

سات برسوں کی جدائی اور پھر ملنا عدیمؔ
زندگی میں کوئی پَل اتنا حسین آیا نہیں



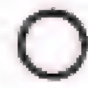
دُور سے ہنستا رہا میرے قریں آیا نہیں
لاکھ سمجھایا مگر اُس کو یقیں آیا نہیں

مدتوں آتی رہی ہے جس کے قدموں کی صدا
میں نے سمجھا، آ گیا، لیکن نہیں، آیا نہیں

یہ جہاں ہے یا مکاں آسیب میں ڈوبا ہوا
جو مکیں گزرا یہاں سے، وہ مکیں آیا نہیں

ہر جگہ ہیں یادگاریں اُس کے وعدوں کی عدیمؔ
ہر جگہ اُس نے کہا لیکن کہیں آیا نہیں

تسلیم الٰہی زلفی



قصے مری آشفتہ نوائی کے بہت تھے
چرچے تری انگشت نمائی کے بہت تھے

دنیا کی طلب نے ہی کہیں کا نہیں رکھا
ارمان ترے در کی گدائی کے بہت تھے

اب خاک نشینوں پہ بُرا وقت پڑا ہے
رُتبے کبھی شاہی میں گدائی کے بہت تھے

ہم نے بھی سنے ہیں ترے شکوے سرِ دربار
انداز تخاطب میں دُہائی کے بہت تھے

ہم اہلِ جنوں چاک قبائی میں رہے مست
چرچے تری پوشاک طلائی کے بہت تھے

تھک کر سفرِ شوق میں پہلے وہی بیٹھے
ارمان جنہیں آبلہ پائی کے بہت تھے



رات پچھلے پہر آندھیاں تھک گئیں
اتنی بارش ہوئی بدلیاں تھک گئیں

چلتے چلتے بھنور تک تو آئیں مگر
بیچ منجدھار میں کشتیاں تھک گئیں

اے ہوا رُک بھی جا، اب تو ہر پیڑ کی
جھُومتے جھُومتے ڈالیاں تھک گئیں

اب دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھتے نہیں
اور سجدوں میں پیشانیاں تھک گئیں

سوچتے سوچتے نیند آنے لگی
لکھتے لکھتے مری انگلیاں تھک گئیں

بعد مدت کے زلفی اُسے دیکھ کر
اتنا دیکھا، مری پُتلیاں تھک گئیں

(کینیڈا)

قائم نقوی



قصۂ سود و زیاں وہم و گماں ہونے لگا
دشمنِ جاں رفتہ رفتہ مہرباں ہونے لگا

آنکھ آنسو میں کہیں پھر اِک کہانی کھو گئی
ایک لمحے کا فسانہ داستاں ہونے لگا

ہو گئے گُم اپنی اپنی ذات کے گنبد میں ہم
فاصلہ یُوں قربتوں کے درمیاں ہونے لگا

سب اکٹھا ہو گئے چوپال میں جب شب ڈھلے
بے زبانی میں نیا قصہ بیاں ہونے لگا

اُس کے ہونے سے تھی قائم شہر کی سب ہاؤ ہُو
وہ گیا تو شہر سارا بے زباں ہونے لگا

اُس کے جانے کا یقیں قائم ہے تم کو کس لئے
جس کے آنے کا نہیں پھر سے گماں ہونے لگا



بچھڑ رہے ہیں لمحہ لمحہ بیٹے کتنی ماؤں سے
شہروں شہروں بکنے والے مزدوری کے ناؤں سے

رات کی گہری تاریکی میں اِک سرگوشی پھیل گئی
کوئی تو ہے جو بول رہا ہے خوں آشام فضاؤں سے

شہروں میں اِک عمر گزاری پھر بھی تنہا تنہا ہیں
اب بھی یاد آتے ہیں وہ لمحے جب نکلے تھے گاؤں سے

سُورج ڈوبا، شام کی سُرخی حدِ اُفق پر ٹھہر گئی
اور تھکن کی زہری ناگن آ کے لپٹ گئی پاؤں سے

ایک ہی دُھن میں چلتے رہنا منزل کی مجبوری کیا
رستے رستے دیپ جلاؤ قائم تم آشاؤں سے

عباس تابش



یہ کیسا جبر ہے، اپنا کہا ہونے نہیں دیتا
بُرا کہتا تو ہے لیکن بُرا ہونے نہیں دیتا

تُو وہ بیساکھیاں لے لے اگر کوتاہ قامت ہے
ہمیں کیوں اپنے پیروں پہ کھڑا ہونے نہیں دیتا

بیاں تو وُہ بہت دیتا ہے موسم کی حمایت میں
مگر تبدیلیِ آب و ہَوا ہونے نہیں دیتا

یہ گھر ہم کو چھپاتا ہے دَر و دیوار کے پیچھے
کبھی دُنیا کی نظروں میں بُرا ہونے نہیں دیتا

محبت کا مرض تو اُس نے لاحق کر دیا ہم کو
مگر حسبِ ضرورت مُبتلا ہونے نہیں دیتا

یہ مَیں ہی وقت سے آگے نکل کر بچ گیا ورنہ
وہ ظالم تیر تو کوئی خطا ہونے نہیں دیتا

بہت سے کام خود کرنے کو جی کرتا نہیں تابشؔ
بہت سے کام ہونے کے خُدا ہونے نہیں دیتا



(نذرِ غالب)

چاند چمکا جنگلوں پر آسماں کا دَر کھُلا
یہ عجب قیدی شبِ تاریک کے اندر کھُلا

آتشِ نوروز سے کچُھ فاصلے پر پھُول تھے
لوگ منظر پر گئے اور مجُھ پہ پس منظر کھُلا

دل کو ناکارہ سمجھ کر رکھ دیا تھا شام سے
جب ہوئی کمرے میں تاریکی تو یہ پتھر کھُلا

اے تکلّف کیش دُنیا، میری مجبُوری سمجھ
مَیں تو اپنے آپ سے بھی تیرے کہنے پر کھُلا

وصل کی صُورت بھی نکلی کتنے دروازوں کے بعد
چوڑیاں ٹوٹیں اچانک اور پہلا دَر کھُلا

مَیں ہی کیا، اس کو بھی اَب زعمِ شناسائی نہیں
وُہ نہیں مجھ پر کھُلا تو میں بھی کب اُس پر کھُلا

یہ غنیمت ہے کہ اُس سے گفتگو کرتا ہُوں مَیں
تابشؔ اُس بت کے مقابل کوئی تو خود سر کھُلا

عباس تابش



یہ عجب ساعتِ رخصت ہے کہ ڈر لگتا ہے
شہر کا شہر مجھے رختِ سفر لگتا ہے

جس پہ چلتے ہوئے لگتا تھا کہ لوٹ آؤں گا
اب وہ رستہ بھی مجھے شہر بدر لگتا ہے

مجھ سے تو دل بھی محبّت میں نہیں خرچ ہوا
لوگ کہتے تھے کہ اس کام میں گھر لگتا ہے

ہم کو دل نے نہیں، حالات نے نزدیک کیا
دھوپ میں دور سے ہر شخص شجر لگتا ہے

جمع ہوتی ہیں کئی حسرتیں اس دل کے قریب
ایک میلہ سا یہاں شام و سحر لگتا ہے

وقت لفظوں سے بنائی ہوئی چادر جیسا
اوڑھ لیتا ہوں تو سب خواب ہنر لگتا ہے

ایک مدّت سے مری ماں نہیں سوئی تابشؔ
مَیں نے اِک بار کہا تھا، مجھے ڈر لگتا ہے



کئی دہکتے سمے ہوتے باریابِ دنیا
مگر ابھی کم نہیں ہوئی آب و تابِ دنیا

کھِلے کوئی پھول اور اُس کو خموش کر دے
کہ ہم سے تو بن نہیں پڑے گا جوابِ دنیا

ہماری مٹھی میں مہلتِ عمرِ یک نفس تھی
سو ہم نے بے باق کر دیا ہے حسابِ دنیا

یہاں روایت ہے دشت کی سو وہی چلے گی
ہمارے گھر میں نہیں کھِلے گا گلابِ دنیا

نکل نہیں پائے تیری حدِ کشش سے باہر
بچھڑ کے تجھ سے ملے کئی پیچ و تابِ دنیا

یاسمین گُل



یہ سُورج کے ڈھلتے ہی کیا ہو گیا ہے، چلو چل کے دیکھیں
فلک خُون میں کیوں نہایا ہُوا ہے، چلو چل کے دیکھیں

مری رُوح میں خشک پتوں کے اڑنے کی سی آہٹیں ہیں
یہ مَیں ہوں، کہ تم ہو، کہ موجِ صبا ہے، چلو چل کے دیکھیں

پرندے درختوں پہ حیرت زدہ گنگ سے ہو گئے ہیں
زمیں پر ہواؤں نے کیا لکھ دیا ہے، چلو چل کے دیکھیں

زمینیں تو مانگے کے لفظوں پہ ہی اپنے لب کھولتی ہیں
اُدھر آسماں کس طرح بولتا ہے، چلو چل کے دیکھیں

گیا بھی تو اپنی نظر چاند تاروں کو دے کر گیا ہے
یہ سُورج لگاتار کیا دیکھتا ہے، چلو چل کے دیکھیں

ہے برسات اور آنکھ کی جھیل پھر سانس لینے لگی ہے
سرِ شاخِ مژگاں کنول پھر کھِلا ہے، چلو چل کے دیکھیں

مجھے دیکھنا ہے گلابوں کی مانند جسموں کا کھِلنا
سُنا ہے تمہیں راستوں کا پتہ ہے، چلو چل کے دیکھیں



دشتِ تنہائی کا ایک لمبا سفر، یُوں ہوئی ہے غزل
تھے کھُلے آسمانوں میں لفظوں کے پَر، یُوں ہوئی ہے غزل

تیسری آنکھ نے ذوقِ پرواز سے جانے کیا کہہ دیا
منظروں سے تھی دو ہاتھ آگے نظر، یُوں ہوئی ہے غزل

رُوح کے چاک پر، ذات کو گوندھ کر جس گھڑی رکھ دیا
اُس گھڑی دَرد کے ہاتھ میں تھا ہُنر، یُوں ہوئی ہے غزل

پاؤں میں یاد کی جھانجنیں، جھنجھناتی ہوئی خامشی
رقصِ تنہائی کا کرب کی تال پر، یُوں ہوئی ہے غزل

اوڑھنے کو تو سب طرزِ گفتار کو اوڑھ کر چل پڑے
پھر بھی تھا کس قدر بے لباسی کا ڈر، یُوں ہوئی ہے غزل

مَیں تہی دست تھی، سوچ منجدھار میں ڈوبنے جب لگی
لفظ لے کر فرشتہ سا آیا اتر، یُوں ہوئی ہے غزل

غضنفر ہاشمی



سحر آثار، روشن، سبز کرنیں چھین لے گا
یہ منظر، اب تو لگتا ہے کہ آنکھیں چھین لے گا

فقط اِک راستہ باقی ہے وہ بھی اُدھ کھُلا ہے
سو اَب یہ راستہ ساری دلیلیں چھین لے گا

تجھے کتنا کہا تھا، سچ کو پس انداز کرنا
وگرنہ وقت تجھ سے تیری سوچیں چھین لے گا

سکھاوے گا سلیقہ ہاتھ پھیلانے کا پہلے
پھر اس کے بعد جھولی سے مرادیں چھین لے گا

ہیں اس سفاک رُت میں بھی ثمر آور جو نکلا
وہ میرے جسم سے سرسبز شاخیں چھین لے گا

ہوائے تازہ پر خوش ہے غریبِ شہر لیکن
امیرِ شہر اب کے بار سانسیں چھین لے گا

کسی حاسد نجومی نے کہا تھا مجھ سے اک دن
غضنفر کوئی تجھ سے یہ لکیریں چھین لے گا



خود سے آنکھ چُرانا بھی آ جائے گا
تجھ کو وقت بِتانا بھی آ جائے گا

پہلے پہلے جھوٹ میں لکنت آئے گی
اس کے بعد نبھانا بھی آ جائے گا

کچھ دن آنکھ میں جگراتے مہمان بنا
تجھ کو خواب بنانا بھی آ جائے گا

پہلے سر کو اونچا رکھنا سیکھ تو لے
پھر مصلوب کرانا بھی آ جائے گا

کبھی غضنفر اپنی جانب چل کے دیکھ
تیرے ساتھ زمانہ بھی آ جائے گا

ناھید شاھد



دیے کو پھر بجھانا چاہتی ہے
ہوا کوئی بہانہ چاہتی ہے

سُجھانا چاہتا ہے راہ تارا
مگر شب بیت جانا چاہتی ہے

نئی شاخیں شجر پہ کب اُگیں گی
کہ چڑیا آشیانہ چاہتی ہے

نئے گاؤں بیاہی ہیر لیکن
وہی رانجھا پُرانا چاہتی ہے

مجھے تسخیر کر لینے سے پہلے
وفا زنداں بنانا چاہتی ہے

یہی ساعت ہے سب کچھ مانگنے کی
دُعا پھر مسکرانا چاہتی ہے



عجب رستوں پہ نکلا کارواں پھر
مسافت ہو نہ جائے رائیگاں پھر

میں خوابوں سے نکلنا چاہتا ہوں
مری منزل محبت کا جہاں پھر

افق کے پار سب کی خیر، مولا :
نہ جانے سُرخ ہے کیوں آسماں پھر

کسی طوفاں کی دستک ہوئی ہے
ہوا جاتا ہے کوئی مہرباں پھر

سوا نیزے پہ سورج آ گیا ہے
دعاؤں کا سروں پر سائباں پھر

تسلیم فیروز



ذرّے سے صحرا دریافت کیا کرتے ہیں
ہم گہرائی تک جا کر دیکھا کرتے ہیں

ہنسنے پر مجبور اُسے کر دیتے ہیں ہم
پتھر توڑ کے آگ نکال لیا کرتے ہیں

رات کے پیڑ کا سایہ کس نے دیکھا ہوگا
ہم تو ہاتھ سے چھو کر دیکھ لیا کرتے ہیں

جانے لوگ شکایت کیوں کرتے ہیں میری
سچے لوگ تو سچے کام کیا کرتے ہیں

اچھے پیڑ کی چھاؤں بھی اچھی ہوتی ہے
ہم اس آس پہ تیرے پاس آیا کرتے ہیں

اُن کی بات سے کیسے کوئی راہ پر آئے
کچے پھل جو پیڑ سے توڑ لیا کرتے ہیں

جس کو دیکھ کے لوگوں کے دِل جل اُٹھتے ہوں
ہم اُس پھول کو خار شمار کیا کرتے ہیں



اُس تنگ دل کی تنگ گلی میں صدا نہ دے
ممکن ہے بازگشت ہی تجھ کو دغا نہ دے

گھنگھرو بندھے ہوئے ہیں خوشی کے پاؤں میں
یہ رتجگا مجھے کہیں پاگل بنا نہ دے

چھپتا ہوں پھول میں کبھی پتوں کی اوٹ میں
قطرہ ہوں اوس کا، کہیں صحرا صدا نہ دے

دہلیز پر لگے ہوئے پردے کا دھیان رکھ
حالات کی ہوا اِسے آکر اڑا نہ دے

فیروز اپنی سوچ میں کھوئے ہوئے ہو تم
الزام بے رُخی کا وہ لیکن لگا نہ دے

زمان کنجاہی



برسی فلک سے آگ تو دھرتی پگھل گئی
اور آدمی کی خوف سے صورت بدل گئی

اک کرب تھا کہ جس نے نہ جینے دیا مجھے
اک یاد تھی کہ جو مرے دل کو نگل گئی

سورج نے مسخ کر دیئے چہرے گلاب سے
حدت تھی وہ کہ شہر کی ہر چیز جل گئی

رنگوں کا لمس رہ گیا پھولوں کے ہاتھ میں
تتلی چمن سے جانبِ صحرا نکل گئی

چڑیاں بھی گھونسلوں کی طرف اڑ چلیں زمانؔ
دن کو زوال آگیا اور دھوپ ڈھل گئی



ہر لمحہ سوچوں میں ڈوبا رہتا ہوں
اَن دیکھے خوابوں میں کھویا رہتا ہوں

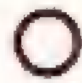
میری آنکھیں مجھ کو ڈھونڈتی رہتی ہیں
خود سے اپنی ذات چھپاتا رہتا ہوں

میرا عکس بھی اب تو میرا عکس نہیں
ٹوٹا آئینہ ہوں، بکھرا رہتا ہوں

آنکھوں کے دریا تو کب سے خشک ہوئے
یادوں کے سیلاب میں ڈوبا رہتا ہوں

فکرِ زمانؔ کبھی اپنی بھی رہتی تھی
اب دنیا کے غم میں گھلتا رہتا ہوں

حسن عباس رضا



تمہارے ہجر کے اسباب اگر معلوم ہو جاتے
دکھاوے کو سہی، کچھ دن تو ہم مغموم ہو جاتے

تعلق توڑنے میں کوئی مشکل تھی، تو کہہ دیتے
کہ ہم تو پانیوں پر نقش تھے، معدوم ہو جاتے

بھلا ہم کو فنا ہونے میں کتنی دیر لگنی تھی
کہ تم ارشاد کرتے، اور ہم معصوم ہو جاتے

چلو چھوڑو اسے، جو ہو چکا، سو ہو چکا، لیکن
یہ خواہش تھی کہ ہم تم لازم و ملزوم ہو جاتے

رضاؔ اُن کو تمناؤں کے کن قریوں میں ہم رکھتے
وہ آئینے جو سنگِ وحشت کا مقسوم ہو جاتے



بامِ طلب پہ تیرا سراپا دکھائی دے
گر تو نہیں تو پھر کوئی تجھ سا دکھائی دے

ایڑی پہ گھومنے کی سزا یوں ملی کہ اب
تُو بھی فصیلِ چشم سے گرتا دکھائی دے

کن حیرتوں کی دُھول میں دُھندلا گئی ہے آنکھ
اپنا وجود بھی مجھے سایا دکھائی دے

اب دل زدوں میں شام گزرتی ہے اس لئے
شاید وہاں کوئی مجھے اپنا دکھائی دے

تجھ سے بچھڑ کے آئینہ دیکھا نہیں گیا
جانے خود اپنا آپ بھی کیسا دکھائی دے

افتخار بخاری



تلاشِ رزق میں رزقِ خس و خاشاک ہونے تک
تڑپتی ہے بہت یہ خاک زیرِ خاک ہونے تک

سمجھ جاتا ہوں لیکن دیر سے سب داؤ پیچ اُس کے
وہ بازی جیت لیتا ہے مرے چالاک ہونے تک

کسی بھولی ہوئی خوشبو سے نکھرا ہے ذرا منظر
بدل جائے گا موسم آنکھ کے نمناک ہونے تک

مرے ہونے سے پہلے وسعتیں بے نام سب ہوں گی
زمانے لگ گئے ہوں گے انہیں افلاک ہونے تک

پرندہ، پھول اور تارا مری آنکھوں نے کاڑھا ہے
جہاں تھا چادرِ سادہ مری پوشاک ہونے تک



ہر اک منظرِ آرزو بُجھ گیا
چراغِ طلب! کیسے تُو بجھ گیا

چمکتا تھا جس سے مرا شہرِ شوق
وہ سورج ترے رُو برو بجھ گیا

فقط جاگنا ہے مجھے راکھ میں
تھا جو کچھ مرے چار سُو، بجھ گیا

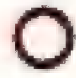
کوئی بات کہنی تھی اُس شوخ سے
مگر دل، دمِ گفتگو بجھ گیا

یہ کیسی رفاقت تھی، اے دل بتا
مَیں جلتا رہا اور تُو بجھ گیا

میں خود سے ہی لڑتا رہا عمر بھر
یہاں تک کہ میرا لہو بجھ گیا

• HE FOUGT HIMSELF UNTIL HIS BLOOD WAS EXTINGUISHED

افتخار بخاری



کوئی طائر، کوئی پھول، کوئی مہتاب نہیں دیکھا
کئی دنوں سے مَیں نے کوئی اچھا خواب نہیں دیکھا

اپنے ساتھ سفر میں آخر اک دن یوں تو ہونا تھا
اس کی آنکھیں یاد رکھیں اپنا اسباب نہیں دیکھا

حدِ نظر تک پھول ہی پھول تھے فصلوں کی ہریالی میں
کوئی چہرہ گاؤں میں لیکن شاداب نہیں دیکھا

ایسا بھی اک صحرا آیا پیاسی عمر کے رستے میں
دریا کا تو ذکر ہی کیا ہے، کوئی سراب نہیں دیکھا

رات گئے خالی سڑکوں پر سائے ماتم کرتے ہیں
سونے والو! تم نے یہ شہرِ بے خواب نہیں دیکھا



ایک سفر میں چاند اکیلا ایک سفر میں شام
کیسی بکھری بکھری سی ہے آج نگر میں شام

یاد کرو دو ملتے وقتوں میں ہم بچھڑے تھے
رُکی ہوئی ہے آج بھی جیسے میرے گھر میں شام

آنکھوں میں بے وجہ نمی سی تیرنے لگتی ہے
بھید بھرے دُکھ رکھ دیتی ہے ہر منظر میں شام

تم نے کبھی ساگر میں سورج ڈوبتے دیکھا ہے
صدیاں یاد دِلا دیتی ہے لمحے بھر میں شام

بھولی بسری چڑیاں چہکیں دِل کی ٹہنی پر
اب مجھ کو اُلجھانا چاہے کس چکر میں شام

یحییٰ خالد



درد فراق کے سارے لمحے گھر رکھ لینا
پیار کتاب میں تم تتلی کے پر رکھ لینا

کب اصرار ہے، میری ہر اک بات قبول لو
عیب مجھے لوٹانا اور ہنر رکھ لینا

راہ نما ہیں یاد کے جگنو، پیار ستارے
پیش آئے جو کوئی اور سفر، رکھ لینا

وقت کو جب تقسیم کرو تو ایسا کرنا
شام مجھے بھجوانا اور سحر رکھ لینا

کیسا پاگل پن ہے، اک راہی کی خاطر
آنکھ چراغ جلانا، راہوں پر رکھ لینا

دھوپ غموں کی چھائے تو اک عادت سی ہے
اپنی ماں کی گود میں خالدؔ سر رکھ لینا



اپنی ذات کو اب جو ڈھونڈنے نکلا ہے
برسوں اپنے آپ سے ڈر کے بھاگا ہے

منظر کے پس منظر کس کس کرب میں ہیں
من آنگن میں کس نے جھانک کے دیکھا ہے

چہرے ہیں غماز مگر یہ کیا معلوم
کوئی کونسا چہرہ پہن کے بیٹھا ہے

ہر سو ایک فریب نے چادر تانی ہے
خود کو دیکھ کے بھی اب ڈر سا لگتا ہے

وہ میری استاد ہے میری ماں ہے وہ
میں نے اک اک لفظ اسی سے سیکھا ہے

پیار مرا بیوپار، خلوص مرا ایمان
میں نے خالدؔ انسانوں کو چاہا ہے

توقیر چغتائی



تکلف کے مراحل سے گزرنا چاہیے مجھ کو
کسی دن اُس کی آنکھوں میں اُترنا چاہیے مجھ کو

وہ بچھڑا ہے تو اس میں کوئی میری بھی خطا ہو گی
سبھی الزام اُس پر ہی نہ دھرنا چاہیے مجھ کو

میں اُس کے سامنے ساری زبانیں بھول جاتا ہوں
نہیں معلوم، کیسے بات کرنا چاہیے مجھ کو

یہ لہریں ایک دن جا کر بھنور میں چھوڑ آئیں گی
سمندر کے کنارے سے بھی ڈرنا چاہیے مجھ کو

کئی دن سے تو وہ بھی لاتعلق سا گزرتا ہے
بس اب تو اپنے وعدوں سے مکرنا چاہیے مجھ کو



مجھے بھی ساتھ لیے جا رہی ہے عمر کہیں
اس اہتمام میں کوئی شریک بھی تو نہیں

وہ شور تھا کہ زبانیں ہوا سے ہار گئیں
وہ بھیڑ تھی کہ کوئی کھو گیا کہیں نہ کہیں

اُسے یہ ضد تھی کہ میں ساتھ چل نہیں سکتا
سو لوٹ آیا ہے آخر کو تھک کے وہ بھی یہیں

سفر کی شام تھی اور رات کے پڑاؤ میں
وہ خود نہیں تھا مگر اُس سے خوب باتیں کیں

احمد لطیف



کون ہماری دکھ نگری گنجان کرے
تارے چلنی پلک پلک عنوان کرے

پتھر عہد کا پتھر بھی وہ کر نہ سکا
جو کچھ میری بستی کا انسان کرے

وصل سے لاکھ سنہرا عرصۂ ہجر ہوا
ایک خرابی دونوں طرف امکان کرے

مُس ، مُس کرتی آنکھوں میں کیا بات ہوئی
رنگ برنگا رقص بہت حیران کرے

کس کے نام نے آنکھیں کھولیں یار لطیفؔ
زنگی چڑیا اندر مست اڑان کرے

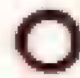


سحر کے رنگ مجھے ڈولنے نہیں دیتے
کرن، کرن یہ گماں ہونے نہیں دیتے

قفس کو ساتھ ہی میں کب کا لے اُڑا ہوتا
یہ نیم پَر مجھے پَر تولنے نہیں دیتے

پلک پلک پہ ستارے لرز رہے ہیں لطیفؔ
کوئی تو ہیں جو تجھے بولنے نہیں دیتے

شرافت عباس



صبا کا جھونکا تھا ظلِ سحاب تھا، کیا تھا
وہ شخص پھول تھا خوشبو تھا، خواب تھا، کیا تھا

کسی کو کچھ نہ بتایا، کسی سے کچھ نہ کہا
تمام عمر ہمیں اضطراب تھا، کیا تھا

وہ آرزو تھی کہ حسرت تھی خوف تھا کہ ملال
ہر اک سفر میں کوئی ہم رکاب تھا، کیا تھا

گماں ہے خواب میں کل رات اُن سے باتیں کیں
مگر جو سیج پہ تازہ گلاب تھا، کیا تھا

سوادِ کوچۂ جاناں کا لطف آنے لگا
ہوا کے ہاتھ میں جامِ شراب تھا، کیا تھا

سلگتی شام تھی، یادوں کی راکھ تھی، ہم تھے
پھر اُس کے بعد مسلسل عذاب تھا، کیا تھا

افتخار شہزاد



میرا مجرم بھی تھا، محسن بھی مرا لگتا تھا
دستِ قاتل میں بھی وہ جلوہ نما لگتا تھا

کس لیے مانا ہے ہر بات کو اُس کی میں نے
سوچتا ہوں کہ وہ ظالم مرا کیا لگتا تھا

دل دکھاتا تھا وہی اور تھا مسیحا بھی وہی
کبھی ہرجائی، کبھی جانِ وفا لگتا تھا

دیکھنے والے اُسے دیکھتے رہ جاتے تھے
یعنی وہ شخص محبت کا خدا لگتا تھا

پوچھتا پھرتا ہے وہ آج مرے گھر کا پتہ
میں جسے سارے زمانے سے بڑا لگتا تھا

اُس کی باتیں تھیں روایات سے ہٹ کر شہزاد
سب میں شامل تھا مگر سب سے جدا لگتا تھا

اختر عثمان



ہمارے سامنے پستی بلندی ہو رہی ہے
نکوں کی یہاں دستار بندی ہو رہی ہے

کھڑے ہیں آئینے ہاتھوں میں لے کے مسخ چہرے
نگریں آج مشقِ خود پسندی ہو رہی ہے

ہُوا کا نام لے کر حبس نافذ ہو رہا ہے
درونِ قند شامل زہر خندی ہو رہی ہے

تصوّف پانیوں میں آ گئے ہیں سنگ زن بھی
محمد بخشؒ والی جھیل گندی ہو رہی ہے

مؤرخ وقت آنے پر غلط ثابت کرے گا
ہمارے معجزوں کی عکس بندی ہو رہی ہے



پھر سرِ کوہ تکلّم نہیں بولا، چُپ ہے
تابِ نظّارہ نہیں اسلیے موسیٰ چُپ ہے

کو تلے کھلئے تو پروانۂ گویائی ملا
دیکھ فرعون کے آگے کوئی بچّہ چُپ ہے

پُوچھتا ہوں کہ بتا کون ہوں کب سے بُتوں میں
میرے آگے مگر آبا کا حوالہ چُپ ہے

میری جانب کوئی گنگا نہیں بہنے دیتا
ایک مُدّت سے مری کشتِ تمنّا چُپ ہے

لب کُشائی کی یہاں جیسے کبھی رسم نہ تھی
شہر پہلے کی طرح آج بھی ایسا چُپ ہے

اختر عثمان



مسادِ صبح کے سب سلسلے بھی دیکھتا ہوں
مَیں سامنے بھی، افق سے پَرے بھی دیکھتا ہوں

جہان دیکھنا پڑتا ہے اِک نگہ میں مجھے
مَیں شش جہات کو، خود کو، تجھے بھی دیکھتا ہوں

عجب رسائی و پسپائی کا زمانہ ہے
ترے قریب بھی ہوں، فاصلے بھی دیکھتا ہوں

میں دیکھتا ہوں جو، اندھے کو دیکھنا پڑ جائے
جو دیکھنا نہیں ہوتا، اُسے بھی دیکھتا ہوں

مرے لیے تو غیاب و شہود کوئی نہیں
تُو اوٹ میں ہے، تجھے سامنے بھی دیکھتا ہوں

عطا کیا ہے مجھے تُو نے دیکھنے کا مذاق
سنور کے بیٹھ، کوئی دَم تجھے بھی دیکھتا ہوں



ترے بغیر کہاں کی غزل سرائی ہے
صدا سے پہلے کبھی بازگشت آئی ہے؟

ترے جمال کی تشکیل سہل کام نہ تھا
یہ معجزہ تو مرے شعر کی صفائی ہے

میں اپنے آپ کو ترتیب دے رہا ہوں ابھی
مرا مقام وہاں ہے جہاں اکائی ہے

زمیں کے ہجر میں رہنا مجھے قبول نہیں
فلک سے آگے بھی یوں تو مری رسائی ہے

میں شعر شعر مصور کروں ترے جلوے
مری غزل نے تجھی سے حیات پائی ہے

ترے نگر کا پتہ میں نے جب کہیں پوچھا
ہر ایک شخص نے مقتل کی رہ دکھائی ہے

نصرت صدیقی



یاد اس کی ضبط کی دیوار سے ٹکرا گئی
بحرِ دل سے موج اُٹھی، آنکھ کو چھلکا گئی

پیڑ بھی ننگے بدن ہیں میرے بچوں کی طرح
میرے گھر کی مفلسی صحنِ چمن تک آ گئی

چارہ سازو! کچھ علاجِ دیدہ و دل چاہیے
دل تو پتھرائے ہوئے تھے آنکھ کیوں پتھرا گئی

ان مکانوں کی جگہ تھیں لہلہاتی کھیتیاں
شہر کی وسعت پسندی گاؤں کتنے کھا گئی

رہ گئی محدود ہو کر، فکر کی پرواز بھی
مصلحت کوشی عجب زنجیر سی پہنا گئی

میری آنکھوں کی بصیرت دل کی تابانی سے تھی
شمعِ دل بجھ کر جہاں میں تیرگی پھیلا گئی

حسن عباس رضا



میں اُس کے شہر میں جانے کا سوچتا ہی رہا
یہ مسئلہ تھا انا کا، سو مسئلہ ہی رہا

بس ایک بار میں اُس کی گلی سے گزرا تھا
پھر ایک عمر وہ کھڑکی سے جھانکتا ہی رہا

جو سدِّ رہ تھے وہ سائے درخت کاٹ دیے
مگر فراق کا موسم ہرا بھرا ہی رہا

شبوں کی نیند کہیں میرے خواب اُجاڑ نہ دے
تمام عمر میں اس ڈر سے جاگتا ہی رہا

مرے جلو میں سلامت تھا روشنی کا جلوس
مگر جو دل کا دیا بجھ گیا، بجھا ہی رہا

جو ایک بار ہجومِ طلب میں بچھڑا تھا
اُسے میں یاد کے میلے میں ڈھونڈتا ہی رہا

فگار ہو گئیں سب انگلیاں مری، لیکن
میں شیشہ شیشہ تمنائیں جوڑتا ہی رہا

گھروں میں جتنی بھی دوری تھی ختم ہوتی گئی
دلوں کے بیچ مگر ایک فاصلہ ہی رہا

حسن رضا، جو لُٹے عین موسمِ گُل میں
دوبارہ اُن کے سنورنے کا مسئلہ ہی رہا

رؤف امیر

○

اگر نہ تُو خود امیرؔ مزدُوریاں کرے گا
تو کون تیری ضرورتیں پُوریاں کرے گا

یہ ایک پہلُو تو دل کے بھی اختیار میں ہے
بیان ہر اِک سے اپنی مجبُوریاں کرے گا

بچھڑنے والوں کے قُرب میں سوچ تک نہ پائے
کہ وقت ہم میں بھی اِس قدر دُوریاں کرے گا

اگر ہمیں عشق ہے تو ہم عجز میں رہیں گے
وُہ خوبرُو ہے تو پھر وہ مغرُوریاں کرے گا

وفا کی عرضی کو ایک عرصہ گزر گیا ہے
امیرؔ کیا جانے کب وہ منظُوریاں کرے گا

○

جنازہ گاہ سے بازار مِلتا جُلتا ہے
تمام شہرِ دلآزار مِلتا جُلتا ہے

عجب طِلسم زدہ ہے مکان کا منظر
وہ کوئی دَر ہو کہ دیوار، مِلتا جُلتا ہے

بڑا نمایاں، بڑا واضح فرق ہوتا تھا
اور اب تو دشت سے گلزار مِلتا جُلتا ہے

میں کِس کو اپنا کہوں کِس کو غیر ٹھہراؤں
مرے عدُو سے مرا یار مِلتا جُلتا ہے

ہر ایک شام کی خبریں امیرؔ اک جیسی
ہر ایک صبح کا اخبار مِلتا جُلتا ہے

انجم سلیمی



خوں پسینہ کیا جن کی تعمیر پر، بیچ ڈالے گئے
جب مکانوں کو گھر کر لیا تو وہ گھر بیچ ڈالے گئے

بارشوں میں ٹپکتی ہوئی اُن چھتوں کی کسے فکر ہو
جن کے معمار اور جن کے تزئین گر بیچ ڈالے گئے

کچھ تو گمنام مارے گئے اپنی پہچان کے زُرخ پر
اور کچھ تو گلوں میں پٹے باندھ کر بیچ ڈالے گئے

ادھ پکے جسم مقروض ماؤں کے پیٹوں میں گروی ہوتے
بکنے والے، خریدار سے بے خبر بیچ ڈالے گئے

قرض کے موسموں میں یہ ممکن نہیں کُھل کے پُھولیں پھلیں
بیج بونے سے پہلے ہی جن کے ثمر بیچ ڈالے گئے

کاروبارِ سیاست چمکتا رہا ظُلم کی گود میں
امن کی بستیاں، چاہتوں کے نگر بیچ ڈالے گئے



پھُول نوچ پھینکے ہیں تتلیاں اُڑا دی ہیں
کس نے صحنِ گلشن میں زردیاں بچھا دی ہیں

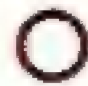
چیختے ہوئے بچّے آگئے ہیں سڑکوں پر
پھاڑ دیں کتابیں اور تختیاں جلا دی ہیں

دُوسرے کنارے سے ہم نے موج میں آکر
موج موج دریا میں کشتیاں بہا دی ہیں

دُھوپ میں جُھلستے ہیں اب کھُلی چھتوں پر ہم
اور کسی نے نیچے سے سیڑھیاں ہٹا دی ہیں

جانتے تو ہیں انجمؔ اُس کی خوش بیانی کو
پھر بھی ہم نے خوش ہو کر تالیاں بجا دی ہیں

کرامت بخاری



شجر نہ بیچ، کوئی سائبان رہنے دے
گئے زمانے کا کچھ تو نشان رہنے دے

تجھے نہیں ہے ضرورت تو کیوں گراتا ہے
مرے لئے تو مرا آستان رہنے دے

ترا تو تیر بھی بھاری ہے اُس پرندے سے
نہ کھینچ زور سے اتنی کمان، رہنے دے

خمارِ آخرِ شب کا مزاج جو بھی ہو
دل و دماغ کو اس کا تو دھیان رہنے دے

مَیں اب کی بار کسی سے مدد نہ مانگوں گا
بھنور کے رُخ پہ مرا بادبان رہنے دے



کوئی صُورت بہم نہیں ہوتی
تشنگی ہے کہ کم نہیں ہوتی

کوئی نیچی نظر نہیں کرتا
کوئی دستار خم نہیں ہوتی

فکر فاقوں سے اور بڑھتی ہے
سوچ سوچوں سے کم نہیں ہوتی

کونسی ساعتِ حیات ہے جو
وقفِ یاس و الم نہیں ہوتی

اِک کہانی ہے زندگانی کی
وہ بھی ہم سے رقم نہیں ہوتی

مسعود احمد (اوکاڑہ)



نئے مرے سے جنھیں استوار کرنا ہے
انہیں پرانے تعلق شمار کرنا ہے

ابھی تو سوچ رہا ہے صفوں میں گھسنے کی
پھر اس کے بعد مجھے بے قطار کرنا ہے

بجھانا چاہتی ہے بادِ بے لحاظ جسے
اسی دیے نے اسے شرمسار کرنا ہے

کوئی بلا نہیں اُترے گی آسمانوں سے
زمیں کو اہلِ زمیں نے شکار کرنا ہے

نظر نظر سے ملانی ہے بے دھیانی میں
شریکِ جُرم اُسے بار بار کرنا ہے

شجر شجر میں بجھارت ہے زرد موسم کی
اب اور کیسے تجھے ہوشیار کرنا ہے

چلی جو بات گریباں کے چند تاروں سے
بڑھی تو سارا بدن تار تار کرنا ہے

اچھال دینا ہے موجوں پہ تختۂ جاں کو
خود اپنے پاؤں پہ دریا کو پار کرنا ہے



زیبِ تن نت نئے زخموں کا لبادہ کرنا
اور پھر دھوپ میں چلنے کا ارادہ کرنا

تنگ سے تنگ کیے جانا دریچے دل کے
گھر کے دالان شب و روز کشادہ کرنا

جانتا کون نہیں کارگزاری اُس کی
کام کم کرنا مگر شور زیادہ کرنا

زندگی کافی نہیں جس کی تلافی کے لیے
پھر اُسی جرم کا بے وجہ اعادہ کرنا

اور کیا کرنا ہے اک حرفِ تسلی کے لیے
صبح پر ٹالنا، پھر شام کا وعدہ کرنا

کیسا دشوار لگا کوششِ بسیار کے بعد
کورے کاغذ کی طرح ذہن کو سادہ کرنا

محمد مسعود احمد



جدھر بھی دیکھوں اُجاڑا کسی کا لگتا ہے
یہ شہر سارے کا سارا کسی کا لگتا ہے

میں لوٹ آتا ہوں واپس کھلے سمندر میں
مجھے ہمیشہ کنارا کسی کا لگتا ہے

کبھی نہ لاتے تری بد دعا کو خاطر میں
مگر یہ لہجہ تمہارا، کسی کا لگتا ہے

ہوائیں روز کہاں بادبان پھاڑتی ہیں
سمندروں کو اشارہ کسی کا لگتا ہے

لہو کے طشت اٹھائے ہیں آسمانوں نے
سروں سے قرض اتارا کسی کا، لگتا ہے

اکھڑ چکے ہیں مرے میسرہ بھی، میمنہ بھی
اور اب تو قلب بھی سارا کسی کا لگتا ہے



میری آنکھوں میں خواب تیرتے ہیں
پانیوں میں گلاب تیرتے ہیں

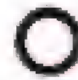
کشتیاں ڈوبنے کے بعد اکثر
دائروں میں حباب تیرتے ہیں

کربلائیں زمین پر ہیں بپا
آسماں پر سحاب تیرتے ہیں

تم جنہیں ساحلوں پہ ڈھونڈتے ہو
وہ کہیں زیرِ آب تیرتے ہیں

محمد مسعود احمد اس سے پہلے مسعود ادکاروی کے نام سے لکھتے تھے ـــــ ادارہ

تصدق شعار



عمر جس ڈھنگ سے بھی ہم نے گزاری اپنی
اُس میں شامل تھی رضا کم ہی ہماری اپنی

اک پری زاد کو ساحل پہ اُتار آئی ہے
بوجھ ہلکا ہے مگر ناؤ ہے بھاری اپنی

اس لئے ہم سے سروکار نہیں دنیا کو
دولتِ صبر و قناعت سے ہے یاری اپنی

شوقِ پیغام رسانی میں رواں رہتی ہے
ورنہ کیا لگتی ہے یہ بادِ بہاری اپنی

روز تکرار ہے بالشت کے اک کمرے پر
اور کہنے کو تو دھرتی ہے یہ ساری اپنی

آج کی لُوٹ میں مصروف ہے ہر پیر و جواں
فکرِ فردا سے مگر قوم ہے عاری اپنی



یہ چارہ گر بھی نرالی دوا بتاتے ہیں
اب اس کے شہر کی آب و ہوا بتاتے ہیں

کمالِ ضبط و تحمل ہے ان کے حصے میں
ہمیں جو لوگ ترا راستہ بتاتے ہیں

میں اختصارِ سفر کے سبب نہیں جاتا
جہاں کا لوگ بہت فاصلہ بتاتے ہیں

منافقت سے نہیں چُوکتے کسی لمحے
وہ لوگ بھی جو مجھے دیوتا بتاتے ہیں

مرے فراق کے موسم میں تجھ پہ کیا گزری
وہ کیفیت بھی ترے نقشِ پا بتاتے ہیں

سکوتِ لب سے وہ تمہید باندھتے ہیں شعارؔ
زبانِ اشک سے پھر مدعا بتاتے ہیں

قمر رضا شہزاد



کسی چشمِ ہُنر کی پاسبانی میں نہیں رہنا
ستارے کو زیادہ دیر پانی میں نہیں رہنا

یہ مٹی کیوں مرے پیروں سے لپٹی ہے کہ جب میں نے
ہمیشہ کے لئے دُنیائے فانی میں نہیں رہنا

کہیں اِس داستاں میں ایک ایسا موڑ آئے گا
جہاں کردار نے اپنی کہانی میں نہیں رہنا

تجھے ہمراہ تو رکھ لوں گا لیکن دلِ سادہ!
تری بابت زیادہ خوش گمانی میں نہیں رہنا

مجھے ایک ایسی دُنیا بھی بسانی ہے جہاں شہزاد
کسی نے بھی کسی کی حکمرانی میں نہیں رہنا

ہَوا کو اپنے خلاف میں کر رہا ہُوں
چراغ کا اعتراف میں کر رہا ہُوں

جو ہو سکے میرے لفظ محفوظ کر لو
بیان سے انحراف میں کر رہا ہُوں

مجھے نہیں چاہیے رفاقت کسی کی
ابھی تو اپنا طواف میں کر رہا ہُوں

مجھے خبر ہے تری سرشت آتشی ہے
مگر تجھے بھی معاف میں کر رہا ہُوں

ابھی تو آغازِ گفتگو ہے نجانے
ابھی سے کیوں اختلاف میں کر رہا ہُوں

حافظ بشیر آزاد



گراں گذرنے لگی ہو، تم اے صداؤ! مجھے
اب ایک خواب سمجھ کر ہی بھول جاؤ مجھے

میں دوسروں کی خوشی کے لیے لڑا لیکن
تباہ کر گئے میرے ہی رکھ رکھاؤ مجھے

بس اک نگاہ کی خیرات میں نے مانگی تھی
یہ کب کہا تھا کہ صورت بھی مت دکھاؤ مجھے

میں ایک گوہر نایاب تھا مگر اس نے
گلی میں بیچ دیا کوڑیوں کے بھاؤ مجھے

ہر ایک دوست اندھیرے کا تیر بن کے لگا
ہر ایک شخص نے بخشے ہیں کتنے گھاؤ مجھے

مجھے تو سارے تعلق سراب لگتے ہیں
تم اس سراب کے مت فائدے بتاؤ مجھے



ہر سو گہرا سناٹا تھا، شب کا ایک بجا تھا
اور میں کوہ کے پیچھے چھپتے چاند کو دیکھ رہا تھا

نام کمانے کی خاطر، ہر سال جو حج کرتا تھا
اس کا اک بیمار پڑوسی برسوں سے بھوکا تھا

شعری مجموعے پر چھ رنگوں کا بوجھ لدا تھا
لیکن اندر شعر نہیں تھے بھوسہ ہی بھوسہ تھا

پورے شہر میں ناداروں کے کوئی کام نہ آیا
خلق کی خدمت کے شعبوں کا یوں تو جال بچھا تھا

پھر میری محروم آنکھوں نے کوئی صبح نہ دیکھی
پہلی بار مری خواہش کا سورج ڈوب گیا تھا

کمزوروں پر گر جاتا تھا، تعزیرات کا نزلہ
دولت والا لیکن ہر اک جرم سے مستثنیٰ تھا

آصف ہمایوں



رہنے والوں کی طرح لوگ یہ رہتے کب ہیں
دل میں ٹھہرے ہیں کہاں، آنکھ سے نکلے کب ہیں

خانۂ ہجر سے دیکھا کرے ہر سمت کوئی
اپنے زنداں میں مگر اتنے دریچے کب ہیں

کتنا بے ربط ہے آنکھوں سے لہو کا رشتہ
اب وہ چہرے ہیں کہاں اور وہ رشتے کب ہیں

ایک جگنو بھی نہیں، ایک ستارہ بھی نہیں
جن کو آنا تھا سرِ شام وہ آئے کب ہیں

اپنے آنگن میں بکھیرو گے یہ دانے کب تک
اُڑنے والے کسی دیوار پہ بیٹھے کب ہیں

یہ بھی سچ ہے کہ سبھی لوگ نہیں ہیں اپنے
یہ بھی سچ ہے کہ سبھی لوگ پرائے کب ہیں

زاہد نوید



اس تُند خو سے واسطہ گو میں نے کم رکھا
لیکن اسی کے ہجر میں، آنکھوں کو نم رکھا

کیا جانے کب بجھانی پڑے آپ اپنی آگ
آنکھوں میں آبِ غم کو ہمیشہ بہم رکھا

ایسا ہی تھا کہ مجھ کو زمیں گھومتی لگی
جب شہرِ زرنگار میں پہلا قدم رکھا

ہر زاویے کو آخری نقطے پہ رُخ کیا
ہر قوس، ہر عمود میں تھوڑا سا خم رکھا

شہرِ بقا کی راہ بھی تھی زیرِ پا نویدؔ
رُخ اپنا میں نے آپ ہی سوئے عدم رکھا

منصور آفاق

○

اب تک انا سے ربطِ مسلسل نہیں ہوا
شاید مرا جمال مکمل نہیں ہوا

ہر چیز آشنائے تغیر ہوئی مگر
قانونِ ہست و بود معطل نہیں ہوا

گرچہ اجل نے کی ہے تگ و دو بہت مگر
دروازۂ حیات مقفل نہیں ہوا

پھر ہو گی فتح مند زمانوں کی بازیافت
میں مات کھا کے وقت سے پاگل نہیں ہوا

ممکن نہیں ہے جس کا ذرا سا مشاہدہ
میری نظر سے وہ کبھی اوجھل نہیں ہوا

ہر چند جی رہا ہوں بڑے کرب سے مگر
جیون میرے لیے کبھی بوجھل نہیں ہوا

بس اس لیے کہ میں بڑا باطن شناس ہوں
کوئی بھی خوبرو مرا سانول نہیں ہوا

منصور اپنی ذات شکستہ کیے بغیر
پانی کا بلبلہ کبھی بادل نہیں ہوا

○

بت کوئی اور دلِ زار میں آباد کریں
جو ہمیں بھول گیا ہے اُسے کیا یاد کریں

زندگی اور خدا دونوں ہیں بتور مزاج
کس کو ناشاد کریں اور کسے شاد کریں

ہے ازل سے ہی وفا اپنے قبیلے کی سرشت
وہ بصد شوق مجھے ٹوٹ کے برباد کریں

ایک لمحہ کے لیے وہ مجھے اپنا کہہ دیں
پھر وہ جس شخص کو چاہیں اُسے آباد کریں

کیا فقط اہلِ ستم کی ہے رسائی اس تک
آسماں والے سے کیا عدل کی فریاد کریں

منصور آفاق



خود اپنی ذات کی بے منظری کو منظر کر
یا میری آنکھ کی تاریکیاں منوّر کر

میں کائنات سے باہر خود اپنی کھوج میں ہوں
سو مجھ کو وسعتِ کون و مکاں کا محور کر

یہ عقلیت کا تماشا تو نامکمل ہے
مرے شعور کو وجدان سے معطر کر

ہوں احتساب کی منزل پہ معتبر شاید
مرے وجود پہ حاکم مجھے مقرر کر

یہ تیرے برف کے تودے پگھل ہی جائیں گے
تو چاہے جتنا پہاڑوں کو قامت آور کر

مجھے فرازِ ہمالہ کی سربلندی دے
مرے ضمیر کو منصور اپنا ہمسر کر



اسمِ اعظم ذات میں آباد کر
زندگی کو موت سے آزاد کر

قریۂ تشکیک کی سرحد پہ ہوں
صاحبِ لوح و قلم! امداد کر

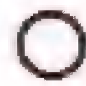
خشک سالی حد سے گزری لے چکور
پانیوں کے واسطے فریاد کر

جب محیطِ کن نکاں تھی تیری ذات
ان ازل کی ساعتوں کو یاد کر

بے خبر تحسین اور تنقیص سے
تیری مرضی، درد دے یا شاد کر

گوش بر آواز ہیں کون و مکاں
لمحۂ تخلیق! کچھ ارشاد کر

شاہدہ ناز



نفس کی کر کے غلامی، عشق کا دعویٰ نہ کر
دھیان میں رکھ کر کسی کو، تو مری پُوجا نہ کر

دیکھ جاناں! دِل گرفتارِ جنوں ہو جائے گا
یاد کی بارش میں اتنی دیر تک بھیگا نہ کر

سنگ دل بھی ہے تو کیا ہے یعنی وہ جیسا بھی ہے
برسرِ محفل مگر اُس شخص کو رُسوا نہ کر

یُوں تو میرے سب کے سب جذبے امانت ہیں تری
اِس قدر گہری نگاہوں سے مگر دیکھا نہ کر

جب بھی تجھ کو بھول جانے کا اِرادہ کر لیا
ملتجی ہو کر کہا دِل نے، نہیں، ایسا نہ کر

ثمینہ اسلم



گلستان ویران دیکھا
دشت پُر امکان دیکھا

جب بھی جھانکا شہرِ دل میں
یہ نگر سنسان دیکھا

اُس کو پا کر یوں لگا ہے
اِک کھرا انسان دیکھا

کھنکھناہٹ کی دُھنوں پر
ناچتا ایمان دیکھا

پُھونک کر تحریر اُس کی
پہروں آتشدان دیکھا

تھا دُہی دِل کا غنی جو
بے سرو سامان دیکھا

شاہدہ صدف



ادائیں ان کی ہیں مخصوص کچھ انہی کے لئے
دکھائیں آگ، بلائیں ہمیں بدی کے لئے

جو دشمنوں کی صفوں میں مرا مقابل تھا
اسے چُنا ہے مرے دل نے دوستی کے لئے

مری نظر میں مری خواہشوں کے عکس نہ ڈھونڈ
ہُوا یہ آئینہ بے آب ہر کسی کے لئے

جو بس چلے تو خود اپنے لہو سے گھونٹ بھریں
پہنچ کے رہ گئے لب بوند بھر نمی کے لئے

یہ آندھیوں کا سفر ہے، بجھے چراغ کے ساتھ
کسے فراغ یہاں شامِ زندگی کے لئے

گھنے درختوں کے سائے کا فیض اپنی جگہ
ترس گیا مرا آنگن تو چاندنی کے لئے

وُہ گلبدن کہ جو پتھر سرشت[1] بھی تھا صدف
اِک استعارہ کامل تھا زندگی کے لئے



کیفیت دل کی اب پُوچھتے بھی تو کیا
ایک شعلہ سا ہے، اُدھ جلا، اَن بجھا

تیرے بخشے ہوئے غم تجھے سونپ دوں
وقتِ رخصت ہے، بارِ امانت اُٹھا

کچھ تو بادِ حوادث مخالف چلی
کچھ ہمیں کج رَوی کا نہ تھا تجربہ

اب تو اپنے لئے زندگی چاہیئے
دوسروں کے لئے تو بہت جی لیا

رُوح میں ڈوب کر چُپ کی آواز سُن
خواب گاہوں کی سرگوشیوں پر نہ جا

جانے کس سوچ نے سب کے لب سی دیئے
گو کسی کے مقابل نہ تھا آئینہ

استعارہ تو ہو زندگی کا صدف
کوئی نجمِ سحر —! کوئی بانگِ درا —!

[1] اب اس طرح کی ترکیب میں کوئی مضائقہ نہیں —— ادارہ

آصف ڈار



پرائے پر تھے میں اڑتا کہاں تلک جاتا
بھنور میں آن گرا جانبِ فلک جاتا

کٹی ہے عمر محبت کی گاگریں بھرتے
تمہارے پاس نہ آتا، اگر چھلک جاتا

پھر اُس نے یاد کہاں ویسی چاہتوں سے کیا
کہ اُس کے شہر میں چل کر لپک لپک جاتا

یہ اور بات کہ تُو ساتھ ہی رہا ورنہ
ترے حصار میں رہتا جہاں تلک جاتا

وہ آندھیاں تو کڑا امتحان تھیں آصف
میں سر بچاتا، مگر سائباں ڈھلک جاتا



میرے ہمراہ مجھ کو چلنے دے
اب مجھے راستہ بدلنے دے

کل کا سورج نجانے کیسا ہو
آج کی رات کو نہ ڈھلنے دے

کیا خبر کوئی آہی جائے یہاں
یہ دیا میرے ساتھ جلنے دے

بستیوں پر کہیں نہ ٹوٹ پڑے
اے زمیں، آسماں سنبھلنے دے

تیرا سایہ پنہ سہی لیکن
میرا قد بھی ذرا نکلنے دے

مرزا مبشر بیگ



اُجڑ چکا ہے جو شہرِ وفا بسائے کون
انا کے تخت سے نیچے اُتر کے آئے کون

حصارِ جبر میں جب مطمئن ہے سب کا ضمیر
پھر اختیار کی خاطر لہو بہائے کون

کہاں کا عشق، سبھی اپنے اپنے ساتھی ہیں
اُداس شام! یہاں تیرا دُکھ بٹائے کون

ہر ایک شخص کو خواہش ہے روشنی کی مگر
سوال یہ ہے کہ پہلا دیا جلائے کون

مجھے خبر ہے مبشّر وہ حرف سُنتا ہے
مگر دعا کے لیے اپنے لب ہلائے کون



عشق میں خود کو اتنا تنہا کر رکھا ہے
ہم نے سارے شہر سے جھگڑا کر رکھا ہے

جس لمحے تو پہلی بار ملا تھا، جاناں!
ہم نے آج بھی قید وہ لمحہ کر رکھا ہے

ممکن ہے اُس شخص کا موم سا دل ہو جس نے
اپنا لہجہ پتھر جیسا کر رکھا ہے

اتنی بے آواز نہ تھی یہ بستی پہلے
کس نے سب ہونٹوں پر قبضہ کر رکھا ہے

کون ہے تیرے ساتھ سفر میں یار مبشّر
کس نے تیرے سر پہ سایہ کر رکھا ہے

نصرت صدیقی

○

اس قدر شہر میں سایوں کی کمی لگتی ہے
پیڑ کیا، شاخ کی چھاؤں بھی گھنی لگتی ہے

اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو تو پڑھ لوں پہلے
ایک تحریر جبیں پر بھی لکھی لگتی ہے

جھکنا چاہا نہ جنھوں نے لبِ دریائے فرات
تشنگی ان کے ہی ہونٹوں پہ بھلی لگتی ہے

اتنی مشکل بھی نہیں دار و رسن کی منزل
میرے اپنے ہی تجسس میں کمی لگتی ہے

جس نے دیکھا تمھیں، میری ہی نظر سے دیکھا
میری بینائی زمانے میں بٹی لگتی ہے

کیا کہوں کیا نہ کہوں سوچ رہا ہوں نصرت
ظلم کے سامنے چُپ بھی تو بُری لگتی ہے

○

یوں تو ہر اشک پہ احساسِ زیاں ہوتا ہے
ضبط لازم ہے مگر ضبط کہاں ہوتا ہے

لذتِ دردِ جدائی سے بھی محروم ہیں ہم
ہجر میں بھی ترے ہونے کا گماں ہوتا ہے

ہو چکا درد کے رشتوں کا تقدس پامال
اپنا غم اپنے ہی چہرے سے عیاں ہوتا ہے

اُن سے اُمیدِ وفا اے دلِ ناداں، کیسی!
دشت میں سایۂ دیوار کہاں ہوتا ہے

دن کے چھپتے ہی چلے آنا کہ دل والوں پر
شام کا وقت جدائی میں گراں ہوتا ہے

آگ سی جیسے لگا دی ہو کسی نے نصرت
یوں سرِ شام فضاؤں میں دھواں ہوتا ہے

محمد حنیف

○

محبت اک سہارا مانگتی ہے
کوئی جھوٹا دلاسہ مانگتی ہے

تری خوشبو ہوا سے مانگتا ہوں
ہوا مجھ سے سلیقہ مانگتی ہے

غمِ دوراں کا جھگڑا اس لیے ہے
حیات اپنا کرایہ مانگتی ہے

رہائی مانگتی تھی جو قفس سے
وہ چڑیا ایک دانہ مانگتی ہے

سمندر تک پہنچ جانے کی خاطر
ندی صحرا سے رستہ مانگتی ہے

میں کافر تو نہیں، پھر کیوں یہ دُنیا
یہاں رہنے کا جزیہ مانگتی ہے

چراغوں کی حفاظت لازمی ہے
ہوا شاید بہانہ مانگتی ہے

کسی پر کیا گزرتی ہے اسے کیا
یہ بستی تو تماشہ مانگتی ہے

○

ایسی خوش فہمی رقصاں تھی اُس کے پاگل ہاتھوں میں
ٹوٹ کے جیسے پیڑ سے خود آجائیگا پھل ہاتھوں میں

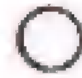
اپنے گھر سے دُور افق کو ایسے دیکھ رہا ہے وہ
جیسے وہاں پہنچا تو آجائیں گے بادل ہاتھوں میں

اُس کی آنکھوں نے ایسے اشعار سنائے تھے مجھکو
داد کی خاطر خود ہی حرکت آئی تھی شل ہاتھوں میں

کس کی آہٹ سے چمکا ہے یہ میرا ویران سا گھر
کون آیا ہے دروازے پر لے کر مشعل ہاتھوں میں

مَیں نے خالی کر ڈالے کُٹھوار سبھی اپنے گھر کے
چڑیاں جب آنگن میں اتریں دیکھ کے چاول ہاتھوں میں

عطاء اللہ



حُسن بھی دیکھا ہو بہو خالی
ناز دکھلائیں خوبرُو خالی[1]

ہم بھی ہیں اور گرمیٔ بازار
جیب میں ایک آرزو خالی

شعرگوئی ہے آسمانی فن
اس سے ملتی ہے آبرو خالی

کچھ تو ہے اُن گلابی ڈوروں میں
یوں اُبلتا نہیں لہو خالی

دوسرے سال پوچھا نام اس کا
چار برسوں میں گفتگو خالی

چل عطا عشق اگلے سال سہی
وہ ہی فارغ ہے اب نہ تُو خالی



ایسا نہیں کہ شہر میں قلت زیادہ ہے
ہم کو محبتوں کی ضرورت زیادہ ہے

مجھ کو خبر ہے حُسن کہانی ہے عارضی
وہ جانتا ہے، عشق حقیقت زیادہ ہے

کچھ یوں کہ وہ حواس پہ چھایا ہے آج شب
کچھ یوں کہ چاندنی ہے، سو وحشت زیادہ ہے

اس واسطے قبول نہیں وصلِ یار کا
محنت بہت ہی کم مگر اُجرت زیادہ ہے

اس کی چُھٹی نہ یاد جھمیلوں میں بھی عطا
اور آج کل تو خیر سے فرصت زیادہ ہے

[1] "صرف" یا "فقط" کے معنوں میں

افشاں عباس



کل کہاں گلشن کی یہ رعنائیاں رہ جائیں گی
سبز شاخوں کی فقط پرچھائیاں رہ جائیں گی

ہنستے ہنستے رو پڑو گے رتجگوں کے خوف سے
خواب زاروں میں بھیانک زردیاں رہ جائیں گی

یہ سمندر ہیں مگر اک دن ہوا ہو جائیں گے
ریت پر بے جان سی کچھ سیپیاں رہ جائیں گے

خواب آئینے سجائے تو نے بھی میری طرح
تیری پلکوں پر بھی اک دن کرچیاں رہ جائیں گی

شب کے در پہ دستکیں دے کر جو لوٹے گی ہَوا
گنگ پیڑوں کے لبوں پر سسکیاں رہ جائیں گی

ٹوٹ جائیں گے قلم اور راکھ ہو جائیں گے لفظ
آگ میں میری پگھلتی انگلیاں رہ جائیں گے



اپنا افسانہ کبھی مجھ سے بیاں کیوں نہ ہوا
جو نہاں تھا مری ہستی میں، عیاں کیوں نہ ہوا

دستکیں دیتا رہا جو درِ دل پہ برسوں
اُس کی آہٹ پہ مجھے اس کا گماں کیوں نہ ہوا

میرے ہاتھوں پہ لکیریں تو ترے نام کی تھیں
پھر ترا خانۂ دل میرا مکاں کیوں نہ ہوا

تیرے ہونٹوں کے کناروں پہ تھا لفظوں کا ہجوم
اُن میں جو لفظ مرا تھا، وہ بیاں کیوں نہ ہوا

خواب دیکھے تھے بہت جل کے سبھی راکھ ہوئے
اور میں حیران کھڑی ہوں کہ دھواں کیوں نہ ہوا

جو لہو دوڑتا پھرتا تھا بس دید افشاںؔ
اُس کے جانے پہ، وہ آنکھوں سے رواں کیوں نہ ہوا

سعید احمد

○

احتساب ذات کا ہر سلسلہ اچھا لگا
خود کو دل کے آئینے میں دیکھنا اچھا لگا

ہم بھی کیسے لوگ ہیں، سورج کو گُل کر کے ہمیں
تیرگی کے دوش پر جلتا دیا اچھا لگا

دل کے کیا کہنے، اسے تو اک خوشی کی چاہ میں
ہر کہانی درد کی ہر واقعہ اچھا لگا

ہاتھ کانٹے آ گئے پھولوں کی چاہت میں مگر
چھوٹی عمروں میں بڑے غم جھیلنا اچھا لگا

جس سے نالاں تھے اسی کی بہتری کے واسطے
لب تلک آتا ہوا حرفِ دعا اچھا لگا

پھول، پتے اور ہوا باتیں کیے جائیں سعید
خامشی میں یوں کسی کا بولنا اچھا لگا

○

زیست کے معیار کیسے منظروں میں رکھ دیئے
اس نے مٹی کے کھلونے بارشوں میں رکھ دیئے

ایک نقشِ غائبانہ کے سوا وہ کچھ نہ تھا
عکس جس کے میں نے سارے آئنوں میں رکھ دیئے

بے سبب ہے اب حرارت کا تقاضا خون سے
جب بدن ہی برف کی ٹھنڈی سلوں میں رکھ دیئے

انتظارِ فصلِ گل تھا، پر ہوا نے کیا کیا
خشک پتوں کے ذخیرے آنگنوں میں رکھ دیئے

اس نے محنت کی عدالت میں کھڑا کر کے ہمیں
فیصلے تقدیر کی الماریوں میں رکھ دیئے

ناصر بشیر

○

عجب یہ زندگی کا معرکہ ہے
تنِ تنہا مجھے لڑنا پڑا ہے

مرے پیشِ نظر سو منزلیں ہیں
مگر پیروں تلے اک راستہ ہے

میں اپنے خال و خد کو ڈھونڈتا ہوں
مرا آئینہ دھندلا ہو گیا ہے

جہاں سے یاد رکھنا تھا ضروری
مجھے قصہ وہیں سے بھولتا ہے

کبھی دیکھا تھا اک زخمی پرندہ
لہو آنکھوں میں اب تک ناچتا ہے

اچانک ناصرِ آشفتہ سر کو
کسی آواز نے چونکا دیا ہے

○

میں خواب گہِ ذات کے اندر نہیں رہتا
انسان ہوں، ماحول سے کٹ کر نہیں رہتا

رل جاتی ہے ملبے سے کسی نام کی تختی
دستار تو رہتی ہے مگر سر نہیں رہتا

وہ پھول ہے، گلچیں کی رسائی نہیں اُس تک
آہو ہے مگر تیر کی زد پر نہیں رہتا

اُس وقت ستاتی ہے ہمیں نیند کی دیوی
جب ایک ستارہ بھی فلک پر نہیں رہتا

اسباب سفر لے کے نکلتے نہیں گھر سے
اس واسطے لٹنے کا ہمیں ڈر نہیں رہتا

ہر شخص کی باتوں سے یہ اندازہ ہوا ہے
اس شہر میں کوئی بھی قد آور نہیں رہتا

کشتی کا سفر اچھا لگا ہے مجھے ناصر
اب پیشِ نظر ایک ہی منظر نہیں رہتا

انوار فطرت



فضا کی لوح سے حرفِ گماں ہٹتا نہیں ہے
مرے رستے سے تیرا آسماں ہٹتا نہیں ہے

میں چوتھی سمت میں چل کر کہیں بکھرا نہ جاؤں
مرے سر سے یہ خوفِ ناگہاں ہٹتا نہیں ہے

مرے ہونے کی دستاویز پر حرف آ رہا ہے
کہ منظر سے ہجومِ بے سراں ہٹتا نہیں ہے

ہوا کی گود میں سسکارتا رہتا ہے پل پل
مرے آنگن سے اک نخلِ فغاں ہٹتا نہیں ہے

میں بیتی ساعتوں کی قید میں رہتا ہوں فطرتؔ
مرے دل پر دھرا سنگِ زیاں ہٹتا نہیں ہے

جواز جعفری

کبھی دیوار کو ترسے، کبھی در کو ترسے
ہم ہوئے خانہ بدوش ایسے کہ گھر کو ترسے

جھوٹ بولوں تو چپک جائے زباں تالو سے
جھوٹ لکھوں تو مرا ہاتھ ہنر کو ترسے

قریۂ نامہ براں! اب کے کہاں جائیں کہ جب
تیرے پہلو میں بھی ہم اُس کی خبر کو ترسے

سب کے سب تشنۂ تکمیل ہیں اس شہر کے لوگ
کوئی دستار کو ترسے، کوئی سر کو ترسے

شہرِ بے مہر میں زندہ ہیں ترے بن جیسے
دھوپ کے شہر کا باشندہ شجر کو ترسے



بے ہُنر رکھا گیا، نامُعتبر رکھا گیا
شہرِ بینائی میں مجھ کو بے بصر رکھا گیا

چار سُو اپنے، اُٹھائی گرچہ دیوارِ انا
اک درِ امکاں مگر کچھ سوچ کر رکھا گیا

پھر ہُوا ایسے کہ مجھ کو دربدر کرنے کے بعد
نام اُسی بستی کا میرے نام پر رکھا گیا

طے نہ کر پایا جو گردن سے ہتھیلی تک کی رہ
سُست رو کیسا مرے شانوں پہ سر رکھا گیا!

میرے بارے میں مرے سب فیصلے اُس نے کیے
اور مجھے اِن فیصلوں سے بے خبر رکھا گیا

عقیل عباس جعفری



کہاں ہوتا ہے تُو، ہوتے ہوئے بھی
مَیں پیاسا ہوں سبو ہوتے ہوئے بھی

اسی کی جستجو ہر ایک سُو ہے
اسی کے چار سُو ہوتے ہوئے بھی

اسی کو ڈھونڈتی پھرتی ہیں نظریں
اسی کے رُو برُو ہوتے ہوئے بھی

اسی سے گفتگو کی آرزو ہے
اسی سے گفتگو ہوتے ہوئے بھی

خموشی ہی خموشی ہر طرف ہے
مسلسل ہاؤ ہو ہوتے ہوئے بھی

بہت کارِ رفو باقی ہے دل میں
بہت کارِ رفو ہوتے ہوئے بھی



دھوپ کا دھیان گر نہیں آتا
راستے میں شجر نہیں آتا

جو بھی جاتا ہے تیرے کوچے میں
وہ کبھی لوٹ کر نہیں آتا

دل وہ آوارہ گرد لڑکا ہے
جو کبھی راہ پر نہیں آتا

ایک چہرے کو جب سے دیکھا ہے
کوئی چہرہ نظر نہیں آتا

بعض اوقات اپنی حالت پر
گریہ آتا ہے پر نہیں آتا

زندہ رہنا عجب ہنر ہے عقیلؔ
یہ ہنر عمر بھر نہیں آتا

سیّد طاہر عباس بخاری



جب مری تجھ سے شناسائی نہ تھی
روز و شب میں اتنی رعنائی نہ تھی

لے گئی اُس کو اڑا کر بادِ صُبح
پھول کی خوشبو تو ہرجائی نہ تھی

جس قدر یاروں نے مطلب لے لئے
بات میں اتنی تو گہرائی نہ تھی

روشنی آئی مگر اُس وقت، جب
شہر کی آنکھوں میں بینائی نہ تھی

لوگ طاہرؔ کس قدر ہمدرد تھے
جب مری باتوں میں سچائی نہ تھی



اپنی تنہائی کو آباد تو کر سکتے ہیں
ہم تجھے مل نہ سکیں، یاد تو کر سکتے ہیں

اور کچھ کر نہ سکیں تیری محبت میں تو کیا
خانۂ زیست کو برباد تو کر سکتے ہیں

یہ الگ بات، بجالا نہیں سکتے ہیں مگر
دل کے ہر حکم پہ ہم صاد تو کر سکتے ہیں

قیدِ آلام سے ممکن نہیں چھٹنا، پھر بھی
خواہش موسمِ آزاد تو کر سکتے ہیں

کون کرتا ہے عدالت کا تکلف طاہرؔ
یہ غنیمت ہے کہ فریاد تو کر سکتے ہیں

اسماء راجہ



ایک ہی ہے خیال آٹھ پہر
اے مرے دل! نہ اتنا سوچا کر

کیوں برستی نہیں ہے کھل کے گھٹا
سوکھتے ہیں گلاب ٹہنی پر

کون دیکھے گا اس کمال کے ساتھ
اس نے دیکھا تھا جیسے ایک نظر

کون سنسان کر گیا یہ شہر
لوگ اُجڑے ہوئے شکستہ گھر

دیکھنا چاہتی ہوں آخری بار
پھر وہی چہرے، پھر وہی منظر



اڑتے ہیں اس طرح سے پرندے خیال کے
جیسے کسی کا بھی نہ انھیں ڈر ہوا کرے

ملنے کی کیا سبیل کریں اے خیالِ یار!
تیرا گمان ہم کو جو خود پر ہوا کرے

دیکھا ہے میں نے ہنس کے بھی اور شاد ہو کے بھی
بارش سی غم کی ذہن کے اندر ہوا کرے

کیا پائے گی وہ آنکھ حقیقت کے بھید کو
جو خواب دیکھنے کی نہ خوگر ہوا کرے

میری تو یہ دعا ہے کہ یارب، کبھی کبھی
ملنا کسی سے مجھ کو میسر ہوا کرے

زکریا شاذ



وہ تو میرے دھیان میں دیر تک رہا نہیں
میں کسی گمان میں دیر تک رہا نہیں

بات کچھ ضرور تھی، گفتگو کا سلسلہ
آج درمیان میں دیر تک رہا نہیں

ناز اِس قدر نہ کر جسم کے جمال پر
کوئی اِس مکان میں دیر تک رہا نہیں

پھر نواحِ دل میں شاذ شام وہ ہوا چلی
ربطِ جسم و جان میں دیر تک رہا نہیں



دُور آنکھوں سے مری جب یاد کا سایا ہُوا
رُوح گھبرائی ہوئی تھی، ذہن چکرایا ہُوا

جی لرز اُٹھتا ہے میرا اِک ذرا سی چاپ پر
اِس قدر اِک وہم نے ہے خوف پھیلایا ہُوا

دُوریوں کے سحر کی کیفیتیں بھرپور تھیں
مَیں ترے نزدیک جب آیا تو بے سایا ہُوا

تیرے ماضی کی تلافی پر مگر قادر ہے شاذ
یہ جو اِک لمحہ ہے تیرے ہاتھ میں آیا ہُوا

(آزاد کشمیر)

شہزاد اظہر

○

تمہارے حُسن کو ہم خواب کرنا چاہتے ہیں
پھر اپنے آپ کو بے تاب کرنا چاہتے ہیں

یہ دیکھنا ہے کہ لہروں کے اضطراب کے بعد
اب اور کیا بھلا گرداب کرنا چاہتے ہیں

وہ مرحلہ ہے کہ سوتے بہا کے آنکھوں سے
ہم اس زمین کو شاداب کرنا چاہتے ہیں

یہ بزمِ ناز نہیں ہے سو ہم، دلِ سادہ!
تجھے بھی واقفِ آداب کرنا چاہتے ہیں

عدو کے ظرف کے شایانِ شان بھی تو نہیں
جو دشمنی مرے احباب کرنا چاہتے ہیں

ہم اپنے گرد یونہی بے سبب، اکیلے میں
حصارِ رونقِ احباب کرنا چاہتے ہیں

یہ راز کچھ نہیں کھُلتا کہ رُوح سے اظہر
سلوک کیا مرے اعصاب کرنا چاہتے ہیں

○

الفاظ نئے، حیطۂ اظہار پُرانا
خبریں تر و تازہ مگر اخبار پُرانا

دُنیا ہے کہ اس کرب سے مانوس نہیں ہے
دیدہ ہے کہ خونبار کا خونبار پُرانا

کچھ ہم تری توفیق کے شایاں نہیں ٹھہرے
کچھ ہاتھ میں کاسہ بھی تھا بے کار پُرانا

کچھ تیری سماعت ابھی بیتاب نہیں ہے
اور کچھ مرا لہجہ بھی ہے بیزار، پُرانا

طُوفان سے پہلے کہیں غرقاب نہ کر دے
یہ خوف کہ کشتی کا ہے پتوار پُرانا

اِک طرزِ تغافل ہے ترے پاس سو کب تک!
ہو جائے گا اِک روز یہ ہتھیار پُرانا

ہم ہیں کہ ہے پیہم وہی اصرارِ محبت
تُو ہے کہ مسلسل وہی انکار پُرانا

رفیق اظہر



اپنے ہی سورج سائے میں پھیلا
ہر منظر آیا دیوتا جیسا

پتّا پتّا ہتھیلیوں کی طرح
خوبصورت درخت پیپل کا

فاختہ اس طرف نہیں آئی
سرو ہے دیر سے اُداس کھڑا

سر پہ آکاس بیل کی چادر
سبز بیری کا رنگ اور کھُلا

تھی کھجوروں کے ہاں کوئی تقریب
زرد کنگن ہر ایک نے پہنا

جانتے ہیں درخت املی کے
لڑکیاں ہیں کھٹاس کی شیدا

یوکلپٹس کی تیز تیز مہک
اُس کے بدن کو دیر تک سونگھا

دیکھتے دیکھتے دھریک بڑھی
بیٹیاں باپ کو کریں بوڑھا

چیڑ کے جنگلوں میں شام ہوئی
اور آگے پہاڑ کا رستہ!



ٹھہری ندیا، بہتا پانی
کچھ سویا کچھ جاگا پانی

چھیڑ دیا پھر کسی ہوا نے
اپنے آپ سے الجھا پانی

بارش کے جھرنے کے نیچے
بھیگے پتّے، روتا پانی

آؤ چلیں دریا کے کنارے
سنتے ہیں کچھ اترا پانی

کن یادوں کے خالی گھونگے
چھوڑ گیا ہے جاتا پانی

کس کے بدن کا آئینہ ہے
روشن روشن نکھرا پانی

ہاتھ لگے میلا ہوتا ہے
گدرایا چمکیلا پانی

جانے کس صحرا کا پیاسا
ساحل توڑ کے نکلا پانی

سیّدہ آمنہ بہار رُونا



پُرانے زخم دھونا چاہتی ہُوں
میں گہری نیند سونا چاہتی ہوں

تمہارے خواب آنکھوں میں بسا کر
تمہی سے دُور ہونا چاہتی ہُوں

مجھے درکار ہیں مرجھائی کلیاں
میں اِک مالا پرونا چاہتی ہوں

بھنور سے پیار کی خواہش بجا ہے
وجود اپنا ڈبونا چاہتی ہوں

دریچے سبز موسم کے کھلے ہیں
دوپٹے کو بھگونا چاہتی ہوں

فصیلیں درمیاں اُٹھنے سے پہلے
تمہیں دل میں سمونا چاہتی ہُوں

کسی شانے پہ مَیں سَر رکھ کے رُونا
بس اِک لمحے کو رونا چاہتی ہُوں



سارے دَر نہ کرنا بند، ایک دَر کھلا رکھنا
لوٹ کر تو آنا ہے، بس دیا جلا رکھنا

انگلیوں کی پوروں میں کیوں جلن سی دَر آئے
سوچ کے صحیفوں کا سبز حاشیہ رکھنا

دُور دُور رہنے سے پیار اور بڑھتا ہے
قربتوں میں بھی یعنی ایک فاصلہ رکھنا

وقت کے یزیدوں سے داد کس لئے چاہیں
پیشِ جاں ہر اِک لمحہ شامِ کربلا رکھنا

گھر اُداس مت کرنا چاند کی تمنّا میں
ہر طرف گلابوں کو صحن میں سجا رکھنا

(آزاد کشمیر)

شعیب آفریدی



ہر اک پڑاؤ پہ رہنے لگا یہ ڈر مجھ کو
کہ ڈھونڈ لے نہ کہیں پھر سے میرا گھر مجھ کو

چلی ہَوا تو ستونوں کا زعم ٹوٹ گیا
بچھا کے لیٹ گئے میرے بام و دَر مجھ کو

اُسی کے حکم پہ لہروں سے رسم و رہ کی تھی
وہی جو ڈھونڈ رہا ہے بھنور بھنور مجھ کو

مَیں پھول سارے ہواؤں کو سونپ دیتا ہُوں
مرے خلوص نے رکھا ہے بے ثمر مجھ کو

نئی نویلی کرن تھی کہ چاپ تھی، کیا تھی!
جو کر گئی ہے اندھیرے سے باخبر مجھ کو

نگر نگر کی ہواؤں نے دستکیں دی تھیں
حصارِ ذات نے گھیرے رکھا مگر مجھ کو

میں اپنے طور طریقے بدل نہیں سکتا
کہ اپنے آپ میں رہنا ہے بے خطر مجھ کو



کریں ترکِ مراسم بھی ذرا آہستہ آہستہ
ہوئے تھے جس طرح ہم آشنا آہستہ آہستہ

ذرا سی جنبشِ مژگاں سے منظر ٹوٹ جاتے ہیں
جنہیں تعمیر کرتی ہے ہَوا آہستہ آہستہ

سُبک رفتارِ عہدِ نو ذرا انجام ہونے دے
ملے گی چار سُو میری صدا، آہستہ آہستہ

بڑی رفتار سے سمٹا نظر میں منظرِ افلاک
کھُلا مجھ پر مگر اپنا خلا آہستہ آہستہ

خلا سے ماورا، حدِ نگہ سے بھی پرے پہنچا
یہ انساں، مرحلہ دَر مرحلہ آہستہ آہستہ

مہ و انجم کو اپنے حوصلے بھی آزمانے دو
ڈھلک ہی جائے گی شب کی ردا آہستہ آہستہ

زمیں تا آسماں سب وسعتیں اُسکے کرشمے ہیں
جو ڈر دل میں تھا بچپن سے بسا آہستہ آہستہ

اختلافات

رشید ملک ، سیّد مشکور حسین یاد ، منیر الدین احمد، مصطفیٰ کریم، غلام محمّد، شہزاد منظر، آصف ثاقب، عبداللہ جاوید، طاہر اسلم گورا، شعیب آفریدی، زاہد حسن، اسعد بدایونی، احمد ضیاء، راغا غلام شبیر، اقبال ناظر، انور جاوید ہاشمی، امتیاز علی خاں حبیب نثار، حیدرالدین انصاری، شجاعت علی راہی، محمد زکریا شریف

چند وضاحتیں

سروانٹیز کا ہیرو "ڈوان کوہیٹے" کثرت مطالعہ کا متحمل نہیں ہو سکتا اور ہوائی چکیوں کو جن بھوت سمجھ کر اسلحہ سے لیس ان پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ "فنون" کے گزشتہ شمارے میں کچھ ایسی ہی واردات جناب ابوالنعمان صاحب کے ساتھ پیش آئی ہے۔ تصور ہی تصور میں انہوں نے بعید از حقیقت چند مفروضے تیار کئے ہیں اور اپنے تخیل کے تیار کردہ مخالفوں پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ "وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا۔ وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے۔"

ان کے ارشادات سر آنکھوں پر لیکن ان کے پیچھے جھلاہٹ اور خفگی کے جذبات نے ایک علمی بحث کو مناظرے کا رنگ دے دیا ہے۔ ایسے مراسلات جو نقطہ نظر کی بجائے محض خفگی کے اظہار کے لئے یا محفل مناظرہ برپا کرنے کے لئے ذاتیات کی سطح پر آکر لکھے جائیں چنداں قابل اعتنا نہیں ہوتے۔ علمی بحث کا مقصد ایک دوسرے کے نقطہ نظر کی تفہیم ہوتا ہے اور ایسی بحث ذاتیات کی سطح پر نہیں اترتی۔ لیکن اس کے برعکس مناظرہ بازی کا مقصد دوسرے فریق کو پچھاڑنا اور شکست دینا اور اگر بس چلے تو اپنے مخالف کو ذلیل کرنا ہوتا ہے۔ اس حرفت میں درس نظامی کے خطوط پر تربیت یافتہ ذہن بڑے حاذق ہوتے ہیں۔ سات سو سال پہلے عباسیوں کے عہد میں جب اس نصاب کی تشکیل ہوئی تھی تو مناظرہ برپا کرنا شاید اس کا ایک جزو تھا۔ یہ روایت آج بھی پشت در پشت چلی آرہی ہے۔ لیکن حالیہ معاملے میں (بقول ایک پٹھان کے) یہ ہمارے ابوالنعمان صاحب کا پہلا وار ہے اس لئے اسے خالی نہیں جانا چاہیئے۔

انہیں ترقی پسندی یا یہ اصطلاح اچھی نہیں لگتی۔ شاید ترقی پسندی کو وہ اس کے وسیع تر تناظر میں نہیں دیکھتے۔ ان کی نظر میں وہ ترقی پسند ادبی تحریک ہے جو تیس کی دہائی میں اردو ادب میں درآمد کی گئی تھی۔ اس تحریک کو مارکسی تحریک بھی قرار دیا گیا۔ رواداری سے عاری اور برداشت کا حوصلہ نہ رکھنے والے حلقوں میں کھلے ذہن کے ادیبوں اور شاعروں کے لئے یہ گالی کے معنوں میں استعمال ہوتی تھی، اور جناب ابوالنعمان نے بھی اس اصطلاح کو شاید انہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ لیکن ان معنوں میں ترقی پسندی کے مفاہیم بڑے محدود تھے۔

میری نظر میں ترقی پسندی اس ترقی پسند تحریک سے مختلف ہے۔ میں اسے ایک ذہنی افتاد، رجحان، صلاحیت یا روش خیال کرتا ہوں جو فطرت کی طرف سے ودیعت کی جاتی ہے۔ تعلیم و تربیت سے اسے جلا دی جا سکتی ہے۔ اس روش کے مظاہر ساری انسانی تاریخ میں پھیلے ہوئے ہیں جن کو دیکھ کر واضح ہوتا ہے کہ "جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود ــــ کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں

جہاں پیدا" جس قوم یا فرد میں یہ تازہ کاری تھی یا وہ ان معنوں میں ترقی پسند تھی، زمام وقت اسی کے ہاتھوں میں رہی۔

اس ترقی پسندی کے اجزائے ترکیبی میں حرکت ایک ازلی جزو ہے، لیکن یہ حرکت معکوس نہیں ہوتی اس کا رُخ ہمیشہ مستقبل کی طرف ہوتا ہے۔ ترقی پسند ذہن جمود کو برداشت نہیں کر سکتا اور نہ ہی کسی رجعتی حرکت سے کوئی سمجھوتا کرتا ہے۔ "حاضر و موجود سے بیزار" کسی نے یا ہونے کا نام ترقی پسندی ہے۔ یہ ترقی پسندی تقلید کی ضد ہے اور اس کے داعی ہمیشہ غیر مقلدانہ روش پر کاربند رہے۔ اجتہاد ترقی پسندی کی روح ہے انقلاب ترقی پسندی کا دل۔

اس ترقی پسندی کی تعریف ہم یوں کر سکتے ہیں، ترقی پسندی ایک انقلابی انسانی رویہ ہے جو تحرک اور اجتہاد پر مبنی ہے اور تقلید سے متنفر ہے۔

ترقی پسندی کے مفاہیم اس وقت مزید واضح ہو جاتے ہیں جب ہم اس کی متضاد روش رجعت پسندی کے معانی کا تعین کرتے ہیں۔ جیسا کہ خود لفظ سے ظاہر ہے، رجعت کا مطلب ہے واپسی یا لوٹنا۔ یعنی ماضی کی طرف لوٹنا۔ یعنی یہ خواہش کرنا کہ جو حالات و ماحول اور معاشرہ، عقائد اور اقدار ماضی میں تھیں پھر وہی پیدا کی جائیں یا ہو جائیں، گو فطرت اس امر کی اجازت نہیں دیتی، رجعت پسندی تاریخ کا پہیہ واپس گھمانے پر شدید اصرار کرتی ہے، چونکہ ایسا نہیں ہو سکتا اس لئے اور کچھ نہیں تو رجعت پسندی زمانے کے ساتھ قدم ملا کر چلنے سے انکار کر دیتی ہے۔ یوں جمود اور حرکت کا فقدان رجعت پسند افراد، جماعت یا معاشرے کی فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے۔ اس صورت کا نقشہ لیوس کیرول نے بڑے خوبصورت انداز میں کھینچا ہے جب وہ کوئین آف سپیڈز کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ وہ بے حد تیز رفتاری سے دوڑتی ہے تاکہ ایک ہی جگہ پر کھڑی رہ سکے۔ رجعت پسندی جمود ہے، عدم تحرک ہے جس میں تبدیلی کی خواہش اور انقلاب کا مکمل فقدان ہے، اس کا نعرہ ہے "دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو":

اس ترقی پسندی کا اپنا منشور ہے جو ازلی ابدی ہے اور اس کے اغراض و مقاصد میں عدل اپنے وسیع ترین مفہوم میں، انصاف، انسانی حقوق یعنی جیو اور دوسروں کو جینے دو، رواداری، "آدمیت احترام آدمی"، "کس نہ گردد در جہاں محتاج کس" اور "عروج آدم خاکی" وغیرہ شامل ہیں۔

اس نقطہ نظر سے دیکھیں تو تبدیلی کی دعوت دینے والے سب لوگ ترقی پسند تھے، مثلاً تمام انبیائے کرام نے اپنے اپنے معاشروں میں تبدیلیاں لانے کی کوشش کی۔ وہ اپنے اپنے وقت کے انقلابی تھے، ترقی پسند تھے اور غیر مقلد تھے۔ ہمارے اپنے نبی کریمؐ نے اپنے معاشرے میں بہت بڑا انقلاب برپا کیا۔ رجعت پسند عناصر بنو امیہ سے لے کر آج تک اس کی انقلابی روح کو ختم کرنے کی سر توڑ کوشش کرتے رہے لیکن اس انقلاب کی یہ صفت آج بھی زندہ ہے اور فعال ہے۔ ان معنوں میں پیغمبر اسلام بہت ترقی پسند اور ماڈرن انسان تھے جن کی ترقی پسندی کو آج تک کوئی نہیں پہنچ سکا۔

مصلح اور سائنس دان بھی اسی زمرے میں آتے ہیں، بہت سے فلسفی بھی اسی ذیل میں آتے ہیں اور وہ لوگ جو انقلاب کا نعرہ لگاتے ہیں اسی ذیل میں آتے ہیں۔

میں نے ترقی پسند تحریک کے تیس سال بعد لکھنا شروع کیا۔ میں ترقی پسند ہوں اور میرا عقیدہ ہے کہ "عروج آدم خاکی ز تازہ کاری ہاست مہ و ستارہ کنند آنچہ پیش ازیں کردند" میں جمود کا قائل نہیں، جمود موت ہے اور حرکت زندگی۔ سوچنا صرف رجعت پسندی میں حرام ہے اور اس نے اس اہم انسانی عمل پر قدغنیں عاید کی ہوئی ہیں اور اگر ایک رجعت پسند انسان سوچتا ہے تو اس کی سوچ اس سرنگ سے باہر نہیں جا سکتی جو رجعت پسندی نے اس کی فکر کے لئے تیار کر رکھی ہے۔ کلام پاک بار بار تفکیر کی دعوت دیتا ہے اور اس کی تلقین کرتا

ہے لیکن ہماری بدنصیبی ہے کہ تفکیر کو چھوڑ کر ہم تکفیر کی چھریاں چلا رہے ہیں اور وہ چھریاں بھی زمانہ حال کے ابوجہلوں کے ہاتھوں میں ہیں۔

جن لوگوں نے مارکس کو پڑھا نہیں اور اگر پڑھا ہے تو اسے وہ ہضم نہیں کر سکے۔ ان لوگوں کے لئے مارکس انسان نہیں بلکہ شیطان کا بڑا بھائی ہے۔ اس لئے اگر کسی کی توہین مقصود ہو تو اس کو مارکسی، اشتراکی کوچہ گرد، کمیونسٹ وغیرہ نام دے دیئے جاتے ہیں اور اس طرح ان کے خلاف ہر طرح کی بدسلوکی کی راہ ہموار ہو جاتی ہے۔ پاکستانی اسلام میں تو سب سے بڑا ہتھیار کسی کو کافر کہہ دینا ہے اور ہمارے ترقی پسند ملتانہ راہنماؤں کا یہ مخصوص اعزاز رہا ہے۔ اس کے بعد ان کا قتل جائز ہو جاتا ہے اور مارکسی کہلانا بھی کفر سے کم نہیں۔

ایسا کہنے والے مارکس سے واقف نہیں۔ وہ اس کے خیالات نظریئے اور فلسفے سے آگاہ نہیں۔ ان لوگوں میں وہ ذہن ہیں جن کی تربیت درس نظامی پر ہوتی ہے۔ ان میں مارکس کی تفہیم کی اہلیت ہی نہیں۔ وہ صرف اتنا جانتے ہیں اور وہ بھی ان کی شنید ہے کہ وہ مادہ پرست تھا، دہریہ تھا اور خدا کی ہستی کا قائل نہیں تھا۔ لیکن جنہوں نے پڑھا اور اسے سمجھا ہے ان کی نظر میں وہ "نیست پیغمبر ولیکن دربغل دارد کتاب" اور "پیغمبرے بے جبرئیل" ہے جس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ "قلب او مومن دماغش کافر است"۔

انسانی تاریخ میں یہ مقام بہت بلند ہے لیکن یہ بھی انسان کی بدنصیبی ہے کہ اس کے تعصبات اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتے ہیں۔ وہ حق کو دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھتا، کفر اور کیا ہے۔

اشتراکیت یا کمیونزم کوئی نیا تصور نہیں۔ تاریخ میں اس کا پہلا داعی مزدک تھا جس نے محروم لوگوں کو "نعمت گم گشتہ خود را ز خسرو باز گیرد" کی تلقین کی تھی۔ ہر زمانے میں یہ تصور موجود رہا اور حکیم اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے رہے۔ مارکس نے تو اس تصور کو ایک سائنسی اور فلسفیانہ بنیاد فراہم کی۔ یہ ایسے ہی ہے کہ گریویٹی کا تصور تو پہلے سے موجود تھا، گیلیلیو نے اس کے قوانین وضع کئے اور سو سال بعد نیوٹن نے ان قوانین کی ریاضیاتی تشکیل کی۔

اسلام اور اشتراکیت میں فاصلہ کوئی زیادہ نہیں۔ ترقی پسندی کی ایک فرع ہونے کے علاوہ ان میں کئی اور عناصر بھی مشترک ہیں، جیسے "لاسلاطین، لاکلیسا، لاالٰہ"۔ بقول اقبال اشتراکیت میں اگر خدا کا تصور داخل کر دیا جائے تو یہ عین اسلام ہے۔

جناب ابونعمان صاحب سمجھتے ہیں کہ میری سوچ اشتراکی ہے۔ اگر میں اشتراکی ہوتا تو میرے لئے یہ بہت بڑا اعزاز ہوتا۔ میں اشتراکی اس لئے نہیں ہوں کہ "دانم مشکلات لاالٰہ را"۔

سوویٹ یونین کے موجودہ حالات سے جناب ابونعمان کو ناحق تشویش لاحق ہو رہی ہے۔ موجودہ واقعات مارکس کی مادی جدلیات کے عین مطابق ہیں اور مستقبل کی طرف اگلا قدم ہیں۔ ویسے اس موضوع پر ان کے جملوں سے ان کا خوشی کا احساس مترشح ہے۔ میرے لئے یہ امر باعث اطمینان ہے کہ چلئے اس ملک میں کوئی تو خوش ہے ورنہ یہاں ہنسنا تو درکنار مسکرانا بھی منع ہے۔

بحیثیت قاری طعنہ زنی (جسے پاکستان میں تنقید کا نام دیا جاتا ہے) جناب ابونعمان کا حق ہے۔ مجھے اس سے کوئی تعرض نہیں اور پھر طعنہ یا گالی دینے والا کسی کا کچھ نہیں بگاڑتا بلکہ بقول جوش ملیح آبادی وہ جو کچھ کہتا ہے دراصل اپنے اوپر ہی فیصلہ صادر کرتا ہے۔ ان کی برہمی کی ممکنہ وجوہات جناب محمد حسن عسکری سے کچھ معاملات میں اور ڈاکٹر وزیر آغا سے ان کے نظریات سے میرا اختلاف ہو سکتا ہے۔ "فنون" کے صفحات میں جناب محمد حسن عسکری کی جدیدیت پر بحث چلی تھی۔ جناب محمد ارشاد کی نگارشات کی بنا پر اس بحث کی سطح میری ذہنی سطح سے بہت بلند تھی اس لئے میں نے اس میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ لیکن جب مجھ پر الزام عائد کیا گیا تو ایک مختصر سا احتجاج ضرور کیا تھا۔ البتہ موسیقی پر ان کے ارشادات (وقت کی راگنی) سے میں نے اختلاف کی جسارت کی تھی اور وہ بھی اس لئے کہ انہوں نے علم کے اس

میدان میں قدم رکھا جس کا انہیں قطعاً کچھ علم نہیں تھا۔ اس لئے ان کے قلم نے اس میدان میں بار بار ٹھوکر کھائی۔ دوئم وہ مقالہ انہوں نے کسی علمی نقطۂ نظر سے نہیں لکھا تھا بلکہ اس کے محرکات میں ایک شخصی عناد بھی مخفی تھا اور جو لوگ اس موضوع سے واقف ہیں انہیں معلوم ہے کہ ان کا روئے سخن کدھر تھا اور ان کا ہدف کون، اس پر میں نے گرفت کی تھی۔ میرا یہ مقالہ مجلہ "فنون" ہی میں "اندیشۂ عجم" کے نام سے شائع ہوا تھا۔

اس دوران جدیدیت میں بیان کردہ سائنس کے موضوعات پر پھر کوئی گفتگو نہ ہوئی۔ اختلافات (فنون شمارہ ۲۹ نومبر دسمبر ۱۹۸۹ء) میں پاکستان میں سائنسی فضا کے بارے میں گفتگو کرتے وقت میری گزارش صرف یہ تھی:۔

"اس ظلمات پرستی کی تحریک میں نادانستہ حصہ لینے والے وہ لوگ ہیں جو علم کے ان شعبوں پر دست درازی کرتے ہیں جن کی ان دانشوروں کے پاس بنیادی یا ابتدائی معلومات بھی نہیں ہوتیں۔ اس کی بہترین مثال پروفیسر محمد حسن عسکری کی کتاب جدیدیت ہے جو پچھلے چند برسوں سے ہمارے دانشوروں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائے ہوئے ہے۔ اس کتاب میں سائنس کے بہت سے مسائل مبہم زیر بحث آئے ہیں۔"

"ہمارے یہ فاضل مصنف ملک کے نمایاں دانشور تھے اور ان کا خاص میدان انگریزی اور فرانسیسی ادب تھا۔ رینے گینوں کے زیر اثر وہ مابعد الطبیعیات کی طرف راغب ہو گئے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ جدید سائنس کے خلاف یہ کتاب ایک فرد جرم ہے اور یہ جناب ڈاکٹر درانی، پروفیسر ہود بھائی اور ڈاکٹر مجاہد کامران کا فریضہ بنتا ہے کہ وہ اس استغاثے میں سائنس کی صفائی پیش کریں اور اس کو ان الزامات سے بری کرائیں۔"

اس میں کون سی بات جناب ابو نعمان کو بار خاطر گزری؟ انہیں چاہیے تو یہ تھا کہ وہ بجائے خفا ہونے کے یہ ثابت کرتے کہ

۱۔ جناب حسن عسکری کو سائنس اور موسیقی کا بنیادی علم تھا اور انہوں نے ان شعبوں میں اگر فارمل تربیت نہیں پائی تو کم از کم بحیثیت ایک عطائی کے ان شعبہ ہائے علم میں اتنی رسائی حاصل کر لی تھی کہ مذکورہ مسائل پر وہ اپنی رائے کا اظہار کر سکتے تھے اور جو کچھ انہوں نے سائنس اور موسیقی کے بارے میں فرمایا وہ شہادت اور تجربات پر مبنی تھا۔ آخر کئی صاحب علم لوگ ہیں جنہوں نے اپنے اپنے وقت کے جید سائنس دانوں سے اختلاف کیا۔ وائٹ ہیڈ نے آئن سٹائن پر زبردست تنقید کی۔ میکس پلانک کے نظریات کی آئن سٹائن نے آخری وقت تک مخالفت کی۔ فرائیڈ کے نظریات پر آج بھی بحث چل رہی ہے۔ ڈارون کے نظریات کو ایک طرف برحق مانا جاتا ہے تو دوسری طرف اس پر شدید تنقید کی جاتی ہے اور اس موضوع پر متخصصین دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔

۲۔ جناب ابو نعمان صاحب یہ ثابت کرتے کہ عسکری صاحب نے نادانستہ نہیں بلکہ دانستہ اس ظلمات پرست تحریک میں حصہ لیا تھا۔ میں نے نادانستہ کہہ کر عسکری صاحب کی بریت کی گنجائش رکھی تھی جو شاید ابو نعمان صاحب کو پسند نہیں آئی۔

ان موضوعات پر میں نے ابھی تک اظہار خیال نہیں کیا اور یہی وجہ تھی کہ نے ڈاکٹر مجاہد کامران، پروفیسر ہود بھائی اور ڈاکٹر درانی کو صرف یہ کہا تھا کہ "وہ اس استغاثے میں جدید سائنس کی صفائی پیش کریں اور اس کو ان الزامات سے بری کرائیں۔" (فنون محولہ بالا) جو جناب حسن عسکری نے اس پر عائد کئے ہیں۔

میں نے ادب میں پروفیسر محمد حسن عسکری کے ایک تخلیقی فن کار، نقاد اور مترجم کے مقام کے بارے میں یا مابعد الطبیعیات

سے بطور ایک طالب علم کے ان کی وابستگی اور دیگر امور سے متعلق کوئی گفتگو نہیں کی کیونکہ ان شعبوں میں میری معلومات بہت ہی کم ہیں۔

اب اس میں برہمی کی کیا گنجائش ہے؟ جناب علی تنہا اور محترم ابو نعمان اس امر کی شاید کچھ وضاحت فرمائیں۔ شاید ان حضرات کو علم ہو کہ بعل پرستی بت پرستی کے بہت قریب ہے اور اس سے حذر احسن ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی وکالت کرنے سے بیشتر چند موضوعات کے متعلق وہ ڈاکٹر وزیر آغا کے ارشادات عالیہ پر ایک نظر ڈال لیتے تو شاید ابو نعمان ان کی وکالت بہتر طریقے سے کر سکتے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے والد محترم جناب آغا وسعت علی خاں (و۔ع۔خ) اپنشدوں کے بڑے قائل تھے کہ ان سے چھ مکاتب نے جنم لیا (وزیر آغا "شام کی منڈیر سے") ان چند مکاتب میں مادہ پرستی کا فلسفہ سانکھیہ درشن بھی ہے جو ثنویت کے ابتدائی قسم کے تصورات اور دہریت پر مبنی ہے اور جس کے مطابق یہ کائنات، یہ دنیا اور یہ حیات، پرش (مرد یا اصول مذکر) اور پرکرتی (عورت یا اصول مونث) کے باہمی اختلاط سے وجود میں آئے۔ تین چار ہزار سال پہلے جب انسانی سوچ اپنی طفولیت میں تھی اور مرد عورت کے اس فلسفے کے دائرے میں مجرد تصورات جیسے خیر و شر، روشنی و تاریکی، حیات و ممات وغیرہ شامل کر دیئے گئے تو اس زمانے میں اس انداز فکر کی خوبصورتی اور رسائی مثالی خیال کی جاتی تھی۔

ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:۔

> پھر رفتہ رفتہ ایک عجیب احساس نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا جو زراعت کے تجربے نے مہیا کیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ فطرت کا سب سے بڑا مقصد ہی زندگی کی تجدید یا تسلسل تھا اور وہ اس کے لئے تمام جانداروں کو آلۂ کار بنا رہی تھی۔ اسے جو اقدام زیادہ ضروری محسوس ہوتا وہ اس کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے والے کو زیادہ "لذت" بطور رشوت یا معاوضہ عطا کرتی اور پھر جب وہ آلۂ کار بن جاتا تو اپنی شرارت پر مسکرانے لگتی، خوشبو اور رنگ اور لمس اور آواز اور ذائقہ یہ سب اس کے ہتھیار تھے اور بھونرے تتلیاں پرندے مویشی اور انسان یہ سب اس کے کارکن جن کا سب سے بڑا فرض نسل کو آگے بڑھانا تھا تاکہ زندگی کی بقا ہو۔ (شام کی منڈیر ۹۱)

دھرتی سے میری وابستگی کی یہ ابتدا تھی۔ یہ وابستگی نہ صرف آج تک باقی ہے بلکہ اس نے ادب اور زندگی کے بارے میں میرے تصورات پر بھی گہرے اثرات مرتسم کئے۔ (شام کی منڈیر: ۹۰)

سانکھیہ درشن کی طرف ان کا اگلا قدم:۔

> دو میں بٹنے کا یہ احساس میری ازدواجی زندگی کی دین تھا۔ بے شک ابتدا میں تو کچھ عرصے کے لئے مجھے محسوس ہوا کہ ہم دو نہیں بلکہ ایک ہیں یعنی فراقِ منزل و گام کا کوئی قضیہ موجود نہیں مگر پھر جلد ہی تعینات کی صورت بدل گئی اور میں بٹا ہوا نظر آنے لگا۔ میرا خیال ہے کہ "ثنویت" کے اس تصور سے میں اس وقت آشنا ہوا جس نے آگے چل کر میری اردو شاعری کا مزاج کے لئے بنیاد مہیا کرنا تھی۔ (شام کی منڈیر: ۱۱۱، ۱۱۲)

اور یوں وزیر آغا کی کتاب "اردو شاعری کا مزاج" ہندوؤں کے سانکھیہ درشن کا ضمیمہ بن جاتی ہے۔ سانکھیہ درشن اور وزیر آغا کے درشن میں ایک فرق ضرور ہے۔ سانکھیہ سراسر ذہنوں تک محدود ہے۔ اس میں پرش اور پرکرتی میں وہ جنسی اختلاط نہیں ہوتا جو وزیر آغا کے ہاں پایا جاتا ہے۔ گھوڑوں کی نسل کشی اور زراعت سے وابستگی کی بنا پر جنس اور اس کے متعلقات ان کی سوچ کا محور بن گئے ہیں اور وہ اس جنسی خبط میں یہاں تک مبتلا ہو چکے ہیں کہ انہیں بے جان اشیاء میں بھی نر اور مادہ دکھائی دیتے ہیں۔ جس اسم کے ساتھ یائے تصغیر یا تانیث ہوگی اور جس کے لئے مونث کا صیغہ استعمال ہوگا وہ ان کی نظر میں پرکرتی یعنی عورت کا مظہر ہے۔ جیسے کھیت سے کھیتی، بل سے بلی، کوٹھے سے کوٹھی وغیرہ وغیرہ (یہ مثالیں ڈاکٹر صاحب کی نہیں ہیں بلکہ میری طرف سے اضافے ہیں)

یوں ڈاکٹر صاحب کے لئے یہ ساری کائنات جنسی فعل سے عبارت ہے۔ ان کی نظر میں اس کے تحرک میں وہی حرکت ہے جو جنسی فعل میں پائی جاتی ہے۔ چنانچہ جنس کے ان تصورات کو انہوں نے تہذیبوں اور ثقافتوں پر بھی مسلط کر دیا۔ وزیر آغا ایرانی النسل (شام کی منڈیر ۱۲۰) ہونے کے ناتے خود بھی "آریا" ہیں اور "آریائی" نسل اور تہذیب پر ان کا یقین راسخ ہے۔ وزیر آغا کی نظر میں آریا تہذیب مذکر ہے کیونکہ یہ پدری نظام پر استوار تھی اور اس میں وہ تمام ارفع و اعلیٰ صفات پائی جاتی ہیں جو مردوں سے مخصوص ہیں۔ ہندوستان میں اس تہذیب کا تصادم وادی سندھ کی تہذیب سے ہوا جو ان کی نظر میں دراوڑی تہذیب ہے۔ ان کے خیال میں یہ تہذیب مادری نظام پر استوار تھی، اس لئے سانکھیہ فلسفے کی ان کی اپنی تعبیر (جو ایک مجرد فلسفے کی جنسی فلسفے میں تقلیب ہے) کے مطابق مونث قرار پائی۔ ان کا اختلاط بھی جنسی اختلاط کے مماثل تھا۔ نطفہ مرد سے عورت کو منتقل ہوتا ہے۔ اس طرح تہذیبوں اور ثقافتوں میں حرکت ان کے اختلاط سے ہوتی ہے۔ کتاب میں مادری نظام اور پدری نظام کی اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں۔ شاید ہمارے ماہر علم الانسان ڈاکٹر وزیر آغا کو علم نہیں تھا کہ مادری نظام کا تصور اور اصطلاح اہل علم رد کر چکے ہیں اور اب ان کا استعمال علم الانسان میں متروک ہو چکا ہے۔ (یہ بحث انڈالوجی کے تحت مفصل طور پر آئے گی اور میں جناب یوسف حسن کے اعتراض کا جواب دینے کی کوشش کروں گا۔ مجھے بھی قلق ہوا تھا کہ محترم علی عباس جلالپوری بھی اس مسترد نظریئے کے قائل ہیں)

آریا ہونے کی وجہ سے ان کا عقیدہ ہے کہ آریا دنیا کی افضل ترین قوم یا نسل ہے اور اسے دنیا کی تمام اقوام یا نسلوں پر فضیلت حاصل ہے (ان کہی یہ بات کہ وہ آریا نسل کا ایک فرد ہونے کے ناتے ان تمام صفات کے حامل ہیں) آریا محبت، مفاہمت، تیاگ، بے نیازی، علم اور عرفان کے علم بردار تھے۔ وہ خانہ بدوش تھے اور اقوام کو علم، معرفت، محبت اور مفاہمت کا درس دیتے رہے اور ان اقوام کی ذہنی روحانی اور اخلاقی تربیت کا اہتمام بھی کرتے رہے۔ اس دنیا کی تمام ترقی آریاؤں کی مرہون منت تھی۔

آریایت کے نظریے کے پرچار میں ڈاکٹر صاحب انسانی تاریخ اور تاریخ مذاہب کو پیچھے چھوڑ کر اپنے بے لگام خیال کے سہارے اپنی دل پسند وادیوں کو نکل گئے ہیں۔ ان کی نظر میں یہ آریا تھے جن کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ار سے ہجرت کی اور ان کے ساتھ ہی خدا کے یہ برگزیدہ پیغمبر مصر گئے جہاں آریاؤں نے ان کی ذہنی روحانی اور اخلاقی تربیت کی۔ حضرت موسیٰ بھی ایسے ہی پیغمبر تھے جو آریاؤں کی تعلیمات سے متاثر ہوئے۔ ان کی ذہنی اور اخلاقی تربیت بھی آریاؤں نے کی اور یہ اثرات حضرت عیسیٰ تک نفوذ کر گئے۔ حضرت عیسیٰ نسلاً سامی ضرور تھے لیکن ان کی تربیت آریاؤں نے کی تھی۔ "جن میں تیاگ اور بے نیازی کی صفات عام تھیں اور وہ سورج کی روشنی کی تقلید میں محبت اور مفاہمت کے مبلغ تھے" (اردو شاعری کا مزاج ۴۸۰) حضرت عیسیٰ نے سامی پیغمبروں کا طریقہ تبلیغ چھوڑ دیا اور آریائی طریقہ کار اپنایا جس کی پاداش میں وہ مصلوب ہوئے۔ شکر ہے خدا کا کہ ڈاکٹر وزیر آغا کے آریاؤں کی تحسین و

و آفریں کا یہ رخش یہیں رُک گیا اور انہوں نے پیغمبر اسلام کے بارے میں یہ کھل کر کہنے سے گریز کیا کہ ان کی ذہنی تربیت بھی (نعوذ باللہ) آریائی تصورات کے تحت ہوئی تھی اور قرآن حکیم (نعوذ باللہ) دراصل رگ وید ہی کی تفسیر ہے۔ ویسے انہوں نے اپنے قاری کی فکر کو یہ مہمیز ضرور لگائی ہے کہ وہ ڈاکٹر وزیر آغا کی منشا کے مطابق منطقی نتیجہ خود ہی اخذ کر لے۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ آریایت کا نظریہ انیسویں صدی میں بہت مقبول تھا اور کچھ استعماری طاقتوں کے لئے از حد مفید بھی جیسا کہ ہندوستان میں، لیکن اب نسل انسانی کے ماہرین، علم الانسان کے متخصصین اور مورخوں نے اسے قطعی طور پر مسترد کر دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آریا نام کی کوئی قوم یا نسلِ انسانی نہیں تھی۔ آرین سے مراد محض زبان ہے جس کے بولنے والے آریا کہلائے۔ اب اس لفظ کا استعمال شاذ ہی ہوتا ہے۔

رہ گیا کسی نسل انسانی کی فضیلت کا دعوٰے تو جناب ابونعمان صاحب کی خدمت میں التماس ہے کہ وہ حجۃ الوداع کے موقع پر میرے نبی کریمؐ کے ارشادات پر نظر ڈالیں تو ڈاکٹر وزیر آغا کی قلعی کھل جائے گی۔ اور جناب ابونعمان پر وزیر آغا کے موقف کا کھوکھلا پن ظاہر ہو جائے گا۔ نبی کریمؐ کے ارشادات کے بعد وہ دور جدید کے حکماء کی آرا بھی دیکھ سکتے ہیں۔ جن کے مطابق نسلی فضیلت انسانی ترقی میں کوئی کردار ادا نہیں کرتی کیونکہ ایک نسل کی دوسری نسل پر برتری ایک باطل تصور ہے۔

جناب ابونعمان فرماتے ہیں کہ میں "۔۔۔۔۔ کبھی ڈاکٹر وزیر آغا کو مادری نظام کے صنم کدے کا بنیادی پتھر ثابت" کرتا ہوں۔ وزیر آغا پر میرے اعتراضات کا یہ معکوس مشاہدہ ہے۔ میں تو الٹا اس بات پر احتجاج کرتا رہا ہوں کہ ڈاکٹر وزیر آغا کے فکری سومنات کا بنیادی پتھر مادری نظام ہے اور احتجاج اس بنا پر ہے کہ انیسویں صدی میں رائج ہونے والا مادری نظام کا تصور کبھی کا رد ہو چکا ہے اس لئے مادری نظام کو بنیاد بنا کر جو استدلال بھی ڈاکٹر صاحب نے کیا ہے اور جو نتائج مرتب کئے ہیں وہ باطل اور گمراہ کن ہیں۔ اس کے لئے میں "پیاز کا چھلکا" بھی بار بار ان کی خدمت میں پیش کر چکا ہوں لیکن جہاں پتھر بھی کارگر نہ ہوں وہاں پیاز کا چھلکا کیا کرے گا۔ کچھ لوگوں پر "کلام نرم و نازک بے اثر" ہی رہتا ہے۔ ویسے میں ابونعمان صاحب کے طرز مطالعہ اور بصیرت کی داد دیتا ہوں جس کے ذریعے سیدھی چیز انہیں اُلٹی دکھائی دیتی ہے۔

ثنویت کو وزیر آغا یہاں تک کھینچ کر لے گئے ہیں کہ جانداروں کے علاوہ انہیں بے جان اشیاء مثلاً موسیقی کے راگ راگنیوں اور سازوں مثلاً طبلے اور "بعض نغماتی آلات میں" (اردو شاعری کا مزاج ۱۰۸) بھی عورت اور مرد دکھائی دیتے ہیں اور راگ تو سراسر جنسی فعل کے مماثل ہے:-

> اگر کسی راگ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اس کے دو واضح حصے نظر آئیں گے۔ پہلا الاپ استھائی اور انترہ کا حصہ جو بلمپت یعنی دھیمی لے میں گایا جاتا ہے اور دوسرا درت جو تیز لے میں ادا ہوتا ہے۔ راگ میں الاپ کا حصہ جنسی فعل کے اس حصے سے مماثل ہے جس میں پیار اور چھیڑ چھاڑ کو اہمیت ملتی ہے، درت خالص جنسی فعل کا مماثل ہے اور ایک انتہائی نکتے پر پہنچ کر دوبارہ اسی مقام پر آجاتا ہے جہاں سے اس نے سفر کا آغاز کیا تھا اور یوں جنسی فعل کے آغاز، عروج اور زوال کی پوری داستان کو پیش کر دیتا ہے۔ (اردو شاعری کا مزاج ۱۱۶)

موسیقی ایک غیر جانبدار فن ہے اور ازل سے ہی مذہب کی باندی رہا ہے۔ صدیوں تک بطور ایک مستقل فن کے اس کا اپنا کوئی مقام نہیں تھا، مذہبی کتب کی تلاوت، دعاؤں اور مناجاتوں اور دوسری مذہبی رسومات کی ادائیگی میں مددگار ہونے

کے علاوہ ڈرامے کی معاونت بھی اس فن کے ذمے تھی اور اب تو یہ زندگی کے ہر گوشے میں سرایت کر گیا ہے۔ یہ عوام کے جذبات کے خوبصورت اظہار کے لئے بھی استعمال ہوتا رہا ہے۔ افلاطون، ارسطو، بوعلی سینا، الفارابی، امام غزالی، حضرت داتا گنج بخش اور کئی عظیم حکماء اور اہلِ نظر اس فن پر گفتگو کر چکے ہیں۔ اہلِ نظر کے لئے تو موسیقی خاص الخاص ذریعۂ معرفت تھا۔ مولانا جلال الدین رومی فرماتے ہیں:۔

سرِ پنہاں است اندر زیر و بم فاش اگر گویم جہان برہم زنم

اور اقبال کا خیال ہے:۔

نوا ز پردۂ غیب است اے مقام شناس نہ از گلوے غزل خواں نہ از رگِ ساز است

اور ہمارا "مقام شناس" راگ کو جنسی فعل کے مماثل قرار دیتا ہے۔

وزیر آغا کی فکر کے یہ چند ستارے میں نے جناب ابو النعمان کی خدمت میں بطور نمونہ پیش کئے ہیں۔ میں درخواست کروں گا کہ وہ وزیر آغا کی کتاب "اردو شاعری کا مزاج" کا بالاستیعاب مطالعہ کریں۔ اس سے ان کے علم میں خاطر خواہ اضافہ ہو گا اور اس پر تبصروں پر مبنی کتاب "اردو شاعری کا مزاج دوسروں کی نظر میں" کے مطالعے سے ڈاکٹر وزیر آغا کی ذہنی ساخت اور پاکستان کی دانشوری کا پول کھل کر ان کے سامنے آجائے گا۔ انہیں ڈاکٹر وزیر آغا کے اس دعوے کا بھی علم ہو گا کہ اس وقت وہ عالم کل شوجی کی طرح علم کے) کیلاش پر براجمان ہیں (وزیر آغا: شام کی منڈیر سے: ۲۷۲، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶) اور (شوجی کی طرح ہی) اپنی "تیسری آنکھ" (محولہ: ۲۷) سے کائناتوں کے بننے بگڑنے کے عمل کو دیکھ رہے ہیں۔ یہ تعلی ہے، خوش فہمی ہے، نرگسیت کا کوئی روپ، خود پرستی یا کسی ذہنی یا دماغی بیماری کی علامت؛ فیصلہ جناب ابو النعمان ہی کریں۔

چونکہ بات موسیقی پر چل نکلی ہے تو اس لئے دوسرے اصحاب کی خدمت میں جنہوں نے ڈاکٹر داؤد رہبر کے بارے میں وضاحت طلب کی ہے، کچھ معروضات:

ڈاکٹر داؤد رہبر نے اپنی کتاب میں یہ واضح اعلان کیا ہے:۔

> راقم نقاد ہرگز نہیں اور کوئی ایسا راگ ودوان بھی نہیں۔ ان سطور کا مقصد یہ تھا کہ جو مزہ راقم نے پایا ہے اس کا کچھ بیان ہو جائے تاکہ وہ لوگ جو راگ کی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں، ہمارے قصۂ شوق سے محظوظ ہوں اور وہ لوگ جو پکے سنگیت کو مضحکہ خیز یا بے مزہ یا لایعنی سمجھتے ہیں اس تحریر کو پڑھ کر اس سوچ میں پڑ جائیں کہ راگ میں کچھ مزہ تو ہوگا کہ اس کے جنونی دنیا میں موجود ہیں۔ (باتیں کچھ سریلی سی: ۲۷، ۳۷)

موسیقی کے معاملے میں سب سے بڑی مشکل اس تجربے کا موضوعی ہونا ہے۔ چنانچہ کسی بھی نقاد کی کسی فن پارے یا غنائی تجربے کے بارے میں رائے بھی موضوعی ہی ہوگی۔ اس صورت میں تنقید محض ایک ذاتی رائے بن جاتی ہے اور اس طرح اس کا حقیقت پر مبنی ہونے کا اعلان اتنا ہی سچا یا جھوٹا ہوگا جتنا کہ کسی دوسرے نقاد کا۔ اس دلیل کا ایک جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ ہماری ساری زندگی موضوعی تجربات سے ہی عبارت ہے۔ اس لئے موسیقی کے موضوعی تجربہ ہونے کی کمزوری کا اطلاق یا تو دوسرے تجربات پر بھی کرنا پڑے گا یا پھر موسیقی کے ایک موضوعی تجربہ ہونے کی بنا پر نااہلیت کو نظرانداز کرنا ہو گا۔

مثال یہ کہ اپنی ڈاکٹر داؤد رہبر نے تیس چالیس سال پہلے اپنے ایک مضمون "ہمارے وقت کی گائیکی" میں جو پہلے

ادبی دنیا لاہور اور بعد میں ان کی کتاب "نسخہ ہائے وفا" میں شائع ہوا، محترمہ روشن آرا بیگم کے فن پر یوں اظہار خیال کیا:

عبدالکریم خاں کی دختر معنوی روشن آرا بیگم ہیں۔ اگر گانے میں مجھے کسی عورت کی شاگردی پر مجبور کیا جائے تو میں روشن آرا کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کروں (بشرطِ اجازت) گلے کی پھرتی اور دیانتداری میں کوئی مرد ان کا پاسنگ نہیں۔ اگر صرف معجزہ پیغمبری کے لئے کافی ہوتا تو روشن آرا پیغمبر ہوتیں۔ میں نے ان کو دیکھا نہیں لیکن اس کی ("ان کی" کہنے کو اب جی نہیں چاہتا) گائیکی ایک عجیب الطرفہ اور چنچل صورت کا وعدہ یاد دلاتی۔ درت میں بڑے بڑوں کے قدم اکھڑنے لگتے ہیں مگر روشن آرا سے کبھی لغزش نہیں ہوتی۔ خاصے منجھے ہوئے استاد بھی اکثر سم کے قریب آکر محتاط اور منتظر ہو جاتے ہیں۔ مگر روشن آرا کے اعتماد کا یہ عالم ہے کہ عین آخری لمحے میں توقع کے خلاف ایک لمبی اور ٹیڑھی تان میں پڑتی ہے اور اسے سہولت سے ختم کر کے پھر چوک میں آن کھڑی ہوتی ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ اس کی آواز میں سنجیدگی بڑھتی جا رہی ہے۔ (نسخہ ہائے وفا، ص ۵۹)

اور تقریباً چالیس سال بعد:

روشن آرا بیگم: آپ نے استاد عبدالکریم خاں سے فیض روحانی پایا۔ خاں صاحب سے سیکھے ہوئے راگوں میں سے چار کو بین کراں کو ریکارڈوں پر گایا۔ بسنت، شدھ کلیان، شنکرا اور جھنجھوٹی۔ حقیقت یہ ہے کہ روشن آرا کا مزاج خاں صاحب کے مزاج سے بہت مختلف تھا۔ عبدالکریم خاں اداس اور سنجیدہ بزرگ تھے، روشن آرا کا سبھاؤ چنچل اور شوخ تھا۔ روشن آرا کو سن کر راقم کو ہمیشہ یوں لگا جیسے بلی تانیں مار رہی ہے۔ (باتیں کچھ سریلی سی، ص ۱۷)

ایک ہی فن کار کے بارے میں ایک ہی نقاد کی مختلف مواقع پر آرا کا مختلف ہونا موسیقی کی تنقید کا موضوعی ہونا ثابت کرتا ہے۔ ہمارے ہاں اس ضمن میں ڈاکٹر وزیر آغا کی مندرجہ بالا رائے کہ موسیقی کا عمل جنسی فعل کے مماثل ہے اور جناب حسن عسکری کا یہ کہنا کہ موسیقی معرفت کا ذریعہ ہے، دونوں متضاد اور موضوعی آرا ہیں جن کی بنا ان حضرات کے ذاتی بصیرت اور مخصوص ماحول اور تجربات نے فراہم کی۔

چنانچہ موسیقی کی تنقید میں مشکل سوال یہی ہے کہ ایک نقاد اپنے نظریے کو حقیقت پر مبنی ہونا کیسے ثابت کرے اور پھر مختلف نقادوں کی آرا مختلف ہو سکتی ہیں۔ جب تک کوئی نقاد اپنے بیان کو سچا ثابت کرنے کے لئے واضح اور معروضی دلائل نہ لائے، تنقید کا مسئلہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ غنائی تجربے کے وجدانی ادراک کو عقلی بنیاد فراہم کرنے کا نام غنائی تنقید ہے جو ہمارے ہاں آہ، آہ، واہ، واہ اور سبحان اللہ سے آگے نہیں بڑھی۔

اس تناظر میں دیکھیں تو غنائی تجربے اور صوفیانہ تجربے میں ایک قدر مشترک ہے۔ صوفیانہ تجربے کی نوعیت سراسر موضوعی ہوتی ہے اور یہ انتہائی داخلی، نجی، قطعی شخصی اور ہر لحاظ سے منفرد ہوتا ہے۔ یہ ہمارے روزمرہ کے دنیاوی تجربات سے اس قدر مختلف ہوتا ہے کہ اس کے بیان کے لئے الفاظ نہیں ملتے اور ہماری زبان خواہ وہ فلسفے، نفسیات یا سائنس کی زبان ہو یا کوئی اور زبان ہو یا اس کی لطیف ترین شکل یعنی شاعری ہی کیوں نہ ہو، قطعی ناکافی ہیں۔ انسان یا صوفی حضرات ابھی تک

وہ زبان وضع نہیں کر سکے جو صوفیانہ تجربے کا مکمل احاطہ کر سکے اور اس کو کماحقہٗ بیان کر سکے۔

غنائی تجربے کی نوعیت گو اتنی بلند یا اتنی شدید تو نہیں لیکن اپنی نوعیت میں وہ صوفیانہ تجربے سے مختلف نہیں۔ ایک مبتدی سامع کو موسیقار سے ابلاغ کا رشتہ قائم کرنے کے لئے تربیت کے کئی منازل طے کرنی پڑتی ہیں۔ لیکن جب وہ تربیت کے بعد ذہنی طور پر تیار ہو جاتا ہے اور موسیقار یا کسی غنائی تالیف سے اس کا ابلاغ کا رشتہ استوار ہو جاتا ہے تو وہ بھی "ذہنی یا روحانی" طور پر ایسے ہی تجربے سے دوچار ہوتا ہے۔ یہ تجربہ بھی موضوعی، داخلی، نجی اور ذاتی ہوتا ہے۔ اس سے گزرنے کے بعد سامع کے پاس الفاظ نہیں ہوتے کہ وہ ان کو بیان کر سکے۔ چنانچہ اس کا مبہم اور غیر واضح اظہار آہ آہ اور واہ واہ میں ہوتا ہے۔ اس سے یہ تو پتہ چلتا ہے کہ متعلقہ شخص کسی قلبی واردات سے دوچار ہے۔ لیکن اس پر کیا بیت رہی ہے، وہ سمجھانے سے قاصر ہے اور دیکھنے والے سمجھنے سے قاصر۔ یہ سراسر قلبی یا روحانی واردات ہے جس کا تعقل سے کوئی رشتہ نہیں بنتا۔

چنانچہ غنائی تجربے کی یہ نوعیت غنائی تنقید کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ جس طرح صوفیانہ تجربے کو تعقل کی بنیاد فراہم نہیں کی جا سکتی۔ اسی طرح غنائی تجربے کے بارے میں بیان یا رائے کو تعقل کے مروجہ سانچوں میں ڈھالا نہیں جا سکتا۔ یوں ہر شخص کا غنائی تجربہ ذاتی اور نجی ہوگا جسے متعلقہ شخص کی ذاتی بصیرت کی روشنی میں ہی دیکھا جا سکتا ہے۔

تصوف اور موسیقی کا رشتہ دلچسپ بھی ہے اور پر اسرار بھی۔ لیکن یہ چیز کبھی سہی، موسیقی اور زبان کا رشتہ گہرا بھی ہے اور پیچیدہ بھی۔ دونوں کا مصدر ایک ہے اور دونوں اس لحاظ سے بہنیں ہیں کہ دونوں کا وظیفہ ایک ہے یعنی ذریعۂ اظہار۔ خام مال دونوں کا ایک ہی ہے یعنی نطق۔ یہاں سے ان کی اپنی اپنی قلمرو ہے جہاں ان کے اپنے اپنے قوانین اور ضابطے ہیں جو کچھ آپ اپنی روزمرہ زبان میں کہہ سکتے ہیں مثلاً لطیفے، مذاق، گالی وغیرہ ان سب کی ادائیگی موسیقی میں بھی ممکن ہے (ویسے ہمارے بیشتر فنکار سٹیج پر آ کر اور کیا کرتے ہیں؟) لیکن اس سے فن کی لطافت مجروح ہوگی۔ نطق اور موسیقی کے رشتوں پر بابر کی دانش گاہوں میں کام ہو رہا ہے۔

میرے زیر نظر "مقالے" میں ذکر مخصوص حلقوں کے منفی رجحانات کا ہو رہا تھا۔ اس ضمن میں علما کا منفی رجحان زیر بحث آیا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا اشرف علی تھانوی کا کردار چونکہ منفی نہیں تھا اس لئے وہ زیر بحث نہیں آئے۔ یہاں ان کے محرکات پر گفتگو کی گنجائش نہیں۔ رہ گیا دیوبند پر حملے کا سوال تو یہ لفظ پوری تحریر میں ایک دفعہ واقع ہوا ہے اور وہ بھی مولانا حسین احمد مدنی کی نسبت اور بزرگی کے اظہار کے لئے۔ میں لال قلعہ فتح کرنے کا خواب نہیں دیکھتا اس لئے مجھے دیوبند پر حملہ کرنے کی ضرورت؟ یہ کام تو مولانا مودودی مرحوم اور بریلوی مکتب فکر نے پہلے ہی اپنے ذمے رکھا ہے۔

دس کروڑ نہیں بلکہ اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی موجودہ پاکستان سے زیادہ ہے۔ اس ضمن میں میرا جواب تو یہ ہے کہ یہ سوال ہی مجھ سے متعلق نہیں۔ میں نے ان معاملات پر کبھی کچھ نہیں لکھا۔

دوئم اگر ہندوستان کے مسلمانوں میں اتحاد ہوتا اور ان میں وہ منفی رجحانات نہ پائے جاتے جن کی مثال مولانا حسین احمد مدنی، جماعت اسلامی، بریلوی، دیوبندی بحیثیت مجموعی جمعیت علمائے ہند اور دوسرے مذہبی حلقوں نے تاریخ میں قائم کر دی تو آج یہ مسئلہ کھڑا نہ ہوتا اور جناب ابونعمان یہ سوال نہ کرتے۔ ان حالات میں پاکستان کی صورت حال کچھ اور ہوتی۔ اغیار نے ہمارے نفاق سے فائدہ اٹھایا اور ہمیں کٹا پھٹا پاکستان قبول کرنا پڑا۔

سوئم مولانا حسین احمد مدنی نے جو روش ہندی مسلمانوں کے تحفظ کے لئے اختیار نہیں کی تھی۔ اس کے محرکات کچھ اور تھے میری

زبان سے نکلے ہوئے الفاظ شاید ان کے لئے برہمی کا باعث بنیں اس لئے وہ ان حضرات کی طرف رجوع فرمائیں:

۱۔ سر محمد یامین خان، نامۂ اعمال، لاہور، ۱۹۷ ص ۱۹۸۶ء ۲ / ۱۱۰ اور ۱۹۴۳ء جہان ہندوستانی لیجسلیٹو اسمبلی میں مولانا شوکت علی کی تقریر کا حوالہ درج ہے جس میں مولانا نے بتایا کہ ان کے قبضے میں جواہر لال نہرو کا وہ خط ہے جس میں مولانا حسین احمد مدنی کا کانگرس سے روپیہ وصول کرنے کا ذکر ہے۔

۲۔ عبدالوحید خان: انڈیاز فریڈم ۔۔۔ دوسرا رُخ، کراچی ۱۹۹۱ء ص ۹۲

۳۔ فتح محمد ملک، اقبال ۔۔۔ فکر و عمل، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۸۵ء ص ۸۲، ۸۳

جہان ایم۔ اے ایچ اصفہانی کی کتاب قائد اعظم ۔۔۔ ایز آئی نیو ہم کے حوالے سے اس امر کی مزید تصدیق ملتی ہے اور خلیفہ عبدالحکیم کے کتابچے اقبال اور ملا کے ص ۱۷، ۱۸ سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے۔

۴۔ سید نور محمد قادری، اقبال کا آخری معرکہ، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، گنج بخش روڈ، ۱۹۸۷ء پر بھی ایک نظر ڈالنا سود مند ہوگا تاکہ اس زمانے میں مسلمانوں کے مذہبی راہنماؤں کے سیاسی کردار کا تھوڑا بہت پتہ چل سکے۔ اس مقصد کے لئے "الجمعیت" اور "المدینہ" کے پرانے پرچے بھی سود مند ہو سکتے ہیں۔ الرجل الفاجر، الرجل الفاسق اور کافر اعظم کے الفاظ ہندو کی زبان سے نہیں نکلے تھے، اور یہ سب کچھ مسلمانوں کی تاریخی روایات کے عین مطابق تھا۔

بات دراصل یہ ہے کہ یہ ملا حضرات مذہب کے متخصصین ہوتے ہیں اور دو متخصص مر جائیں گے لیکن کبھی ایک نقطے پر اتفاق نہیں کریں گے۔ یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ متخصص ایک آدھ جزو کا بہت وسیع علم رکھتا ہے، اس سے اس کا ذہنی تناظر تنگ سے تنگ تر ہو جاتا ہے اور وہ کسی مسئلے کے صرف مخصوص جزو ہی کو دیکھ سکتا ہے اور پورے کل کو نہیں۔ اس بنا پر دو متخصصین میں ایک معاملے میں اتفاق محال ہو جاتا ہے۔ یہ مذہبی جماعتوں کی مذہبی آویزشوں کی نفسیاتی توجیہ ہے۔

چہارم اگر مسلمانوں کو زمین کا یہ ٹکڑا بھی نہ ملتا جس کی بربادی کے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے درپے ہیں، تو آج ان مسلمانوں کا بھی اور ہمارا بھی حال بدتر ہوتا۔ ہندو آٹھ سو سال کی ذلتوں کو بھلا نہیں سکتا اور آپ نے بھی اس عرصے میں ان کے ساتھ کچھ مناسب سلوک نہیں کیا۔ یاد فرمائیں محترمہ اندرا گاندھی کی وہ تقریر جو انہوں نے سقوطِ ڈھاکہ کے بعد کی تھی اور برملا کہا تھا کہ ہمیں ایک ہزار سال کے بعد وجے پراپت ہوئی ہے۔ اس فقرے میں ہندو کی سائیکی پوری فصاحت و بلاغت سے بول رہی ہے یہی وہ ذہنیت تھی جس کی بنا پر آپ نے علیحدگی کا مطالبہ کیا۔ اقبال نے کہا تھا کہ تاریخ گواہ ہے کہ جو بھی قوم باہر سے آئی ہندو مذہب اسے نگل گیا۔ اب آزادی کے بعد ہندو اکثریت مسلمان اقلیت کو نگل جائے گی۔ یہ خوف تھا جس کی بنا پر آپ نے علیحدگی کا مطالبہ کیا، نادر نشین اور مذہبی پیشوا جن کے سیاسی تصورات نظام الملک کے سیاست نامے کی پیداوار تھے۔ اس زمانے کے تقاضوں کو سمجھنے سے قاصر تھے اور روپے کا لین دین تو ان کی نیتوں کو بھی مشتبہ بنا دیتا ہے اور اعمال کی واحد اور آخری کسوٹی انسان کی نیت ہی ہے۔

جناب ابو النعمان نے مجھے طعنہ دیا ہے کہ میں دوسروں کے علم و دانش کا خوشہ چین ہوں۔ انہوں نے بالکل صحیح فرمایا ہے، مجھے اوریجنیلٹی کا کوئی دعویٰ نہیں۔ میں تو برملا اپنے ماخذوں کی نشان دہی کرتا ہوں۔ وہ اور حضرات ہیں جو لوگوں کے خیالات اور بیانات بغیر حوالے کے اٹھا لیتے ہیں۔ یہ سرقے سے بھی بدتر ہے اور کئی دفعہ ذکر آچکا ہے کہ امریکی ادیب واشنگٹن ارونگ (خوشہ چینی) کے الفاظ میں یہ کفن دزدی ہے۔ دوسری طرف یہ لوگ اپنے قاری کے ساتھ فریب کے گھناؤنے جرم کا ارتکاب

کرتے ہیں۔ جبر یہ سازی کا موضوع درس نظامی میں شامل نہیں ہے۔ شاید جناب ابونعمان کے علم میں نہ ہو کہ کافروں کی درس گاہوں میں اگر کوئی طالب علم اس کا ارتکاب کرے تو اسے درس گاہ سے نکال دیا جاتا ہے اور اگر کسی معلم سے یہ جرم سرزد ہو تو اس پر تدریس کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند کر دیئے جاتے ہیں۔

اور پھر ایک آدھ کو چھوڑ کر آپ نے کون سا آئن سٹائن، میکس پلانک، ہائزنبرگ، ڈائرک یا سٹیفن ہاکنگ پیدا کئے ہیں کہ میں اپنے آپ کو ان کے دامن سے وابستہ کروں۔

رہا پیاز کا چھلکا تو مجھے جناب ابونعمان سے اختلاف ہے۔ مجھے شدید احساس ہے کہ میرے پاس وہ چھلکا بھی نہیں۔ کاش پیاز کا وہ چھلکا ہوتا تو میں فخر سے کہہ سکتا کہ:

مرا سبوچہ غنیمت ہے اس زمانے میں — کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو

سات سو سال بعد مسلمانوں میں ایک شخص پیدا ہوا جس کے علم و فضل کو ساری دنیا نے سلام کیا۔ آپ نہ مانیں یہ آپ کی مرضی کیونکہ:

تری نگاہ فرومایہ ہاتھ ہے کوتاہ — ترا گنہ کہ نخیل بلند کا ہے گناہ

پروفیسر عبدالسلام پاکستانی ہیں۔ آپ بے شک نہ مانیں "باغ تو سارا جانے ہے" ساری دنیا ان کے علم و فضل کی معترف ہے۔ آپ کے انکار سے کون سی تقدیر بدل جائے گی۔ آپ کی آنکھ بند کرنے سے حقیقت نہیں بدلے گی۔ چرچ کے کہنے پر گیلیلیو کی زبان بند ہوئی اور نہ زمین کی گردش رکی۔ آپ اور میں کس باغ کی مولی ہیں اور ہمارا علم و فضل کی دنیا میں کیا مقام ہے کہ کسی پر اتنی بڑی رائے رکھیں۔

جناب محمد ارشاد، جناب سید علی عباس جلالپوری اور سید محمد کاظم میرے استاد ہیں۔ ان میں سے ہر شخص سورج ہے اور دوسروں کے لئے منبع نور اور میں دیگر حضرات کی طرح ان سے بھی کسب نور کرتا ہوں۔ میں ان کا چراغ کیسے گل کر سکتا ہوں؟ حالیہ "فنون" میں جناب محمد ارشاد کا مقالہ دیکھئے۔ اقبال پر برسوں سے جو کام ہو رہا ہے اس بیشتر کام پر یہ مختصر تحریر بھاری ہے۔ جناب محمد ارشاد نے تفہیم اقبال پر بنیادی سوالات اٹھائے ہیں جن کے بارے میں "اقبال انڈسٹری" سے متعلق حضرات قطعاً نہ صرف لاعلم تھے بلکہ انہیں احساس تک نہ تھا کہ رومی اور اقبال کے رشتے کے بارے میں اس وضاحت کی ضرورت ہے۔ تفہیم اقبال میں یہ تحریر بہت اہم ہے۔ منصور حلاج کا مسئلہ الجھا ہوا تھا جب جناب اسلم سراج الدین کا جمیلہ ہاشمی کے ناول "چہرہ بچہرہ روبرو" پر تبصرہ "فنون" میں شائع ہوا تھا کہ منصور کا اصل قصہ وہ نہیں جو ہمیں بتایا جاتا ہے بلکہ اصل معاملہ اقتصاد کا ہے (یعنی کارل مارکس یہاں بھی آدھمکا) بہت سر مارا کہ حقیقت تک پہنچنے کا کوئی راستہ ملے لیکن ناکام رہا۔ اس صاحب بصیرت اور صاحب علم شخص کی ایک ضرب کلیمی سے راستہ صاف ہو گیا۔ آگے "ہمت کو شناوری مبارک — پیدا نہیں بحر کا کنارا"

میرے لئے یہ بھی مسئلہ تھا کہ وحدت الوجود کو اسلام میں متعارف کرانے والے ابن عربی تھے۔ حلب میں قائم کردہ ان کے مدرسے میں مولانا روم کی تربیت ہوئی۔ اقبال نے اپنے آپ کو مولانا کے دامن سے وابستہ کر دیا۔ پھر اقبال کے ہاں وحدت الوجود کا عقیدہ کیوں نہیں؟ برسوں اس پر غور کیا، لوگوں سے پوچھا۔ اقبال انڈسٹری کے پیشہ وروں کے پاس گیا اور سب جگہ سے مایوس لوٹا۔ پھر یکدم "فنون" میں اس علم کے نور کا ظہور ہوا اور میرا مسئلہ چشم زدن میں حل ہو گیا۔

یہ ہیں وہ ہستیاں جن کے دم سے پاکستان کے علمی حلقوں میں روشنی ہے ورنہ یہاں "دھرا کیا ہے بجز موعظہ و پند"

اور میں ان معزز اور محترم ہستیوں کا بھی خوشہ چین ہوں اور اس پہ فخر کرتا ہوں۔ محترم ابوالنعمان کو تو پتہ ہی ہوگا کہ علم بڑی اضافی چیز ہے یہاں تک کہ نبی کریم بھی اس میں اضافے کی دعا مانگتے تھے۔

جناب ابوالنعمان کے مراسلے میں امور کو غلط تناظر میں دیکھنے کی مثالیں ملتی ہیں۔ دو کی نشاندہی اوپر ہو چکی ہے۔ تیسری مثال ان کا یہ کہنا ہے کہ میں دوسروں کی ٹانگ کھینچتا ہوں۔ اگر ان کی نظر سے میری تحریریں گزری ہیں تو ان کو یہ احساس ہونا چاہئے کہ میں تو "سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را" کی اذیت سے دوچار ہوں اور میری بدنصیبی یہ ہے کہ میرا واسطہ "انوار سہیلی" والے سنگ پشتوں سے ہے۔

پروفیسر ہود بھائی کا پورا نام ڈاکٹر پرویز امیر علی ہود بھائی ہے۔ میری ان سے ملاقات نہیں، صرف نام سنا ہوا ہے، وہ مجھے نہیں جانتے۔ اس بحث سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ ان کے کام کی بنا پر میں ان کو ایک اہل علم اور روشن خیال انسان سمجھتا ہوں۔ اگر محترم ابوالنعمان کی ان سے کوئی پرخاش ہے تو وہ جانیں۔ جو جملہ انہوں نے پروفیسر ہود بھائی کے بارے میں لکھا ہے وہ ذوقِ سلیم کے خلاف ہے۔ ایک صاحبِ علم کے قلم سے دوسروں کے لئے ایسے جملے نہیں نکلتے۔ ویسے مجھے چڑانے کے لئے اگر ابوالنعمان صاحب نے انہیں ہودا کہا ہے تو یہ بھی اچھی بات نہیں۔ نبی کریم نے منع فرمایا ہے۔ اچھے بچے دوسروں کا نام نہیں بگاڑتے۔

"فنون" کے دیگر احباب نے جو جواب طلبیاں کی ہیں اب ان کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ یہ سطور ویسے ہی بھاری بھرکم ہو گئی ہیں، کہ بہرہ "اختلافات" میں شاید ہی ان کے لئے گنجائش نکلے۔ ان احباب کی خدمت میں معذرت کی درخواست ہے۔

میں نے پوری کوشش کی ہے کہ حد ادب کو سامنے رکھا جائے۔ پھر بھی مجھ سے اگر کوئی گستاخی سرزد ہوئی ہو تو اسے میری نااہلی اور جہالت سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے اور میری پیشگی معذرت قبول کی جائے۔ اس تحریر سے کسی کی دل آزاری مقصود نہیں۔

رشید ملک (لاہور)

"فنون" کے دو شمارے

"فنون" کا ہر شمارہ ایسا ہوتا ہے کہ اُس کے ایک ایک حصے پر کھُل کر لکھنے کو جی چاہتا ہے اور آپ اس کو سراہتے بھی ہیں لیکن مجھ ایسا قاری اپنی نااہلی کو کہاں لے جائے کہ کبھی وہ عدیم الفرصتی کو بہانہ بنا لیتا ہے، کبھی اپنے عجزِ تحریر کی بات سامنے لے بیٹھتا ہے کہ صاحب ایسے عمدہ مقالات اور ایسے لاجواب افسانوں پر ایسی خوبصورت نظموں پر آدمی دو چار جملے لکھ کر کیسے چپ ہو جائے۔ اب فنون شمارہ ۲۹ نومبر دسمبر ۱۹۸۹ء کو لے لیجئے۔ ہمارے رشید ملک صاحب جس طرح بظاہر دیکھنے میں میری طرح ایک الھڑ اور لاابالی نوجوان نظر آتے ہیں اور اندر سے بہت سنجیدہ اور سنجیدگی لئے ہوئے انسان ہیں اور ان کی نثر بھی بے حد سنجیدہ ہونے کے باوجود سمجھ میں آنے والی دلچسپ اور معلومات افزا ہوتی ہے، اب وہ مسلسل "انڈالوجی" پر "فنون" میں مضامین تحریر فرما رہے ہیں۔ تازہ "فنون" آیا تو حصۂ مقالات میں سب سے پہلے میں نے ملک صاحب کا مقالہ ہی پڑھنا شروع کیا۔ ابھی دو تین صفحے پڑھے تھے کہ کسی وجہ سے درمیان میں چھوڑنا پڑا۔ اُس کے بعد سے آج تک ملک صاحب کا یہ مضمون ختم نہیں کر سکا۔ مضمون اپنی جگہ نہایت عمدہ اور فکر پرور ہے۔ فکر انگیز میں نے جان کر نہیں لکھا۔ شاید کبھی اس کی وجہ بیان کر سکوں۔

حصہ مقالات کا دوسرا مضمون میں نے جناب محمد کاظم کا مضمون "مشاہیر بہاول پور پر ایک نظر" پڑھا۔ مسعود حسن شہاب (افسوس کہ وہ اب مرحوم ہو چکے ہیں) کی یہ کتاب کتنی دلچسپ ہو گی یہ میں نہیں کہہ سکتا لیکن شہاب صاحب کے تغافل بردوش اندازِ تحریر نے کاظم صاحب کے تبصرہ کو دلچسپ اور شگفتہ ضرور بنا دیا ہے۔ ویسے مجھے کئی جگہ محمد کاظم صاحب سے پورا پورا اتفاق نہیں مثلاً وہ فرماتے ہیں کہ بہاول پور میں جو ڈپٹی کمشنر یا کمشنر رہے ان میں سے کچھ حضرات نے اچھی خاصی شہرت حاصل کی۔ ان کا ذکر تمہیدی باب میں نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ "ابر رواں" کے باب میں ہونا چاہیئے تھا — " میں سمجھتا ہوں یہاں شہاب صاحب صد فی صد درست ہیں۔ ہماری نوکر شاہی میں خواہ کوئی کیسا ہی ادیب یا شاعر یا نثر نگار پیدا ہو جائے وہ اپنی افسری کسی حال میں چھوڑنا پسند نہیں کرتا۔ مصطفیٰ زیدی مرحوم اچھے شاعر تھے لیکن کرسی چھننے کا غم انہیں آخر وقت تک بری طرح پریشان کرتا رہا۔ اگر مصطفیٰ زیدی کی افسری قائم رہتی تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان کی موت اس طرح واقع نہ ہوتی جس طرح کی ہوئی۔ جن لوگوں کا ذکر اس ضمن میں محمد کاظم صاحب نے کیا ہے ان میں سے کئی حضرات کو میں بھی جانتا ہوں لیکن مجھے وہ ادیب یا لکھنے والے کم اور افسر زیادہ نظر آتے ہیں۔ ان حضرات سے کبھی آپ اختلاف کیجئے اور پھر دیکھئے ان کی ناک بھوں کس طرح چڑھتی ہے۔ اسی طرح میں کاظم صاحب سے اس ضمن میں بھی متفق نہیں ہوں کہ شفیق الرحمٰن محمد خالد اختر اور خود محمد کاظم صاحب کے ذکر کے لئے شہاب صاحب نے ادبی سیارے کے عنوان سے الگ باب کیوں قائم کیا اور ان تینوں حضرات کو ادبا و شعرا کے باب میں کیوں نہ رکھا۔ پہلی بات تو یہی ہے کہ شفیق الرحمٰن صاحب اور محمد خالد اختر صاحب سے تو میں بعد میں پوچھوں گا۔ پہلے مجھے محمد کاظم صاحب ہی جواب دیں کہ وہ کہاں کے ادیب اور شاعر ہیں۔ ممکن ہے کاظم صاحب نے کوئی شعر کہا ہو۔ میں نے آج تک اُن کا کوئی شعر نہیں سُنا یا پڑھا۔ بہرحال جس طرح کے وہ چلت قسم کی نثر (میری مراد سفرنامہ سے ہے) لکھتے ہیں۔ اسی طرح ان کا نام 'ادبی سیارے' کے باب میں آ گیا کہ سیارے بھی تو سیر کرتے رہتے ہیں۔ سیارے کے ساتھ ادبی کا لفظ بڑھا کر ایک تو شہاب صاحب نے ان تینوں حضرات کو آسمان پر پہنچا دیا اور پھر اوپر سے کاظم صاحب ان سے ناراض ہو رہے ہیں۔ ادبی سیارہ ایک ادیب اور شاعر سے اونچی چیز ہوتا ہے۔ کیا سمجھے؟ امید ہے کاظم صاحب ہی نہیں تینوں سیاروں نے میری بات سمجھ لی ہوگی۔

خیام الہند حضرت حیدر دہلوی کا ایک زمانہ میں واقعی دلی شہر میں طوطی یا "طوطا" بہت بولتا تھا۔ لیکن یہ سارا طنطنہ مرحوم کے شاگردوں کے حلقے تک محدود تھا۔ ویسے جہاں تک میں سمجھتا ہوں مرحوم کی شعر گوئی کا سارا زور ظاہری محاسن یعنی علم بیان و عروض تک محدود تھا۔ کبھی کبھی اچھے شعر بھی نکل جاتے تھے۔ میں یہ عبارت لکھ رہا ہوں اور مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے کہیں رات کو خواب میں آ کر مرحوم کی روح یا خود مرحوم مجسم ہو کر مجھے ڈانٹ نہ پلا دیں۔ ۱۹۴۰-۴۱ء میں دہلی میں میرا جانا بہت ہوتا تھا۔ کئی بار استاد حیدر دہلوی سے ملنے کو جی چاہا لیکن ان کے رعب و دبدبہ کی وجہ سے خاموش ہو رہا۔ ماہر القادری مرحوم نے بھی اُن کا ذکر یادِ رفتگاں میں اسی لئے نہیں کیا ہو گا کہ اُس زمانے کے دوسرے شعرا حیدر صاحب سے کوئی زیادہ خوش یا متاثر نہیں تھے۔ البتہ حیدر صاحب نے اپنے شاگردوں کو کچھ زیادہ ہی سحر زدہ کر رکھا تھا۔ بہرحال کاظم صاحب کی مشاہیر بہاول پور پر ایک نظر خاصے شگفتہ انداز میں پڑھی ہے جس کے باعث مجھے بھی اسی انداز میں یہ چند سطور تحریر کرنا پڑیں۔

اصل میں اس بار میں "فنون" کی خواتین شعرا اور افسانہ نگاروں پر خصوصیت کے ساتھ کچھ لکھنا چاہتا تھا۔ رشید ملک اور محمد کاظم صاحبان خواہ مخواہ درمیان میں آ گئے اور ابھی ایک اور صاحب یعنی اختر حسین جعفری درمیان میں آ رہے ہیں۔ ان حضرت کی نظموں سے میں متاثر تو بہت ہوتا ہوں اور یہ اپنی نظموں میں شاعری کی فضا بھی خوب قائم کرتے ہیں۔ لیکن کیا شاعری کا کمال یہی ہے کہ شاعر ایک بھرپور قسم کی فضا قائم کر دے اور بس۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے پیارے

اختر حسین جعفری کی نظموں میں تشبیہات و استعارات تو بہت انوکھے انداز میں اپنا جلوہ دکھاتے ہیں لیکن ان کی نظمیں عموماً معانی اور مفاہیم کی کوئی جہت متعین نہیں کرتیں۔ جعفری صاحب کی نظموں کے مصرعوں اور تشبیہات و استعارات پر تو داد دینے کو بہت جی چاہتا ہے اور جی چاہتا ہی نہیں سننے والا یقیناً داد بھی دیتا ہے لیکن اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ کم از کم میرا حال اکثر ایسا ہوتا ہے۔

میں نے "فنون" ہی میں جعفری صاحب کی ایک دو غزلیں بھی پڑھی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں جہاں تک ابلاغ کا سوال ہے ان کی غزلیں مجھ ایسے کم فہم قاری کو زیادہ سمجھ میں آئی ہیں۔ کاش وہ غزلیں بھی لکھا کریں لیکن وہ غزلیں کیوں لکھیں گے جبکہ آپ ایسے معتبر اور مقتدر، ادیب و شاعر ان کی نظموں ہی پر انہیں بے تحاشا داد دے رہے ہوں۔

میرا خیال تھا کہ اختر حسین جعفری کے بعد میں اپنے اصل موضوع کی طرف آسکوں گا کہ اتنے میں محمد علی صدیقی اور ان کا مضمون "غالب انگریزی عملداری اور شاہ ولی اللہ کی تحریک" درمیان میں آکُودے۔ مضمون بڑے شوق سے پڑھا اور جب اُس کے آخری جملہ کو ختم کیا تو ساتھ ہی صدیقی صاحب کے مضمون کی ساری عمارت دھڑام سے گر پڑی۔ صدیقی صاحب اپنے آخری جملہ میں فرماتے ہیں ۔ "غالب اپنی تمام غلط اندازی، کج روی اور تن آسانی کے باوجود ایک نابغۂ روزگار فن کار ہیں جو اپنی غلطیوں سے بہرصورت بڑا ہے اور ان غلطیوں سے غلط ثابت نہیں ہو پاتا۔" اس آخری جملے کے آخری الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ صدیقی صاحب نے مضمون لکھنا تو شروع کیا تھا غالب کو غلط ثابت کرنے کے لئے لیکن وہ ایسا نہ کر سکے۔ چلئے اگر مضمون لکھ بھی لیا تھا تو پھر اُسے چھپوانے کی کیا ضرورت تھی۔ ایک تو ہمارے بڑے نقادوں اور دانشوروں کے ساتھ شعوری یا لاشعوری طور پر یہ مصیبت لگی ہوئی ہے کہ وہ ہمارے بڑے شعرا و ادبا کو کسی نہ کسی انداز سے نیچا دکھانے پر تلے بیٹھے ہوتے ہیں۔ اور دوسرے مغربی تنقید کو پڑھنے کے باعث اور پھر اُسے حرفِ آخر سمجھنے کے ناتے سے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ کسی ادیب یا شاعر کی اعلیٰ تخلیقات کو اُس کے ذاتی حالات و واقعات کے پیشِ نظر ضرور دیکھا جائے۔ حالانکہ جب ایک اعلیٰ معیار کا ادب پارہ یا کوئی نظم اور غزل ہمارے سامنے آگئی ہے اور ہم اُس سے پوری طرح متاثر اور لطف اندوز بھی ہو رہے ہیں تو اب یہ کیا ضروری ہے کہ اُس کے لکھنے والے کی کمزوریوں کو بھی دیکھا جائے۔ لکھنے والا آخر گوشت پوست کا آدم زاد ہوتا ہے اور وہ اخلاقی، سماجی اور تہذیبی اعتبار سے اپنے معاشرے سے متاثر بھی ہوگا لہٰذا اس میں کمزوریاں اور خامیاں بھی ہوں گی۔ مگر آپ تو اُسے اُس کی عمدہ تخلیقات کے باعث پسند فرما رہے ہیں اور وہ اُس کی طرف سے آپ کو موصول ہو رہی ہیں۔ کیا لکھنے والے کی کمزوریاں معلوم کر کے اُس کی عمدہ تخلیقات کے اثر کو کمزور کرنا مقصود ہے۔ تنقید ادب کے بارے میں حضرت علیؓ کا قول ہے اور کیا خوب قول ہے " یہ دیکھو کیا کہا ہے یہ مت دیکھو کس نے کہا ہے" مگر ہمارے نقاد اس قول پر کیوں غور فرمانے لگے۔ حضرت علیؓ اگر انگلستان یا امریکہ یا کسی دوسرے ترقی یافتہ ملک میں پیدا ہوتے تو پھر یقیناً ان کی بات پر ہمارے نقاد ضرور غور فرماتے۔ اب چونکہ مغربی تنقید میں یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ لکھنے والے کی تخلیقات کو اُس کے ذاتی حالات و واقعات کے پیشِ نظر بھی دیکھنا چاہیئے لہٰذا ہمارے یہ دوست ذاتی حالات کی کھوج کی مصیبت میں بُری طرح سے گرفتار ہیں اور جا و بے جا دھڑ دُکتے رہتے ہیں۔ محمد علی صدیقی صاحب سے میں ابھی تک ایک بار ہی ملا ہوں اور میں ان کی پیاری شخصیت کا شدت سے قائل بھی ہوں۔ لیکن کیا کروں یہ بات تو ہمارے عام نقادوں کی بات ہے۔ اسی لئے یہاں اس کا کھُل کر ذکر کر دیا ہے۔ اور ہاں صدیقی صاحب کو یہ بھی اچھی طرح معلوم ہونا چاہیئے

کہ سمجھدار لوگ مغرب کو جدید علوم کی وجہ سے نہیں بلکہ اوٹگے بونگے مغربی علوم کی وجہ سے گردن زدنی قرار دیتے ہیں اور اب تو خود مغرب میں بھی ایسے سمجھدار لوگ پیدا ہو گئے ہیں جو اپنے خود ساختہ علوم یعنی ظن [illegible] پر مبنی خیالات و آراء سے دامن کشاں ہیں۔

یہ لیجئے یاد آیا وہ جو میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ محمد علی صدیقی ہی کی بات نہیں ہمارے عام نقاد تخلیق کے ساتھ خالق کا کھوج بھی لگاتے ہیں تو اِسی "فنون" میں ڈاکٹر آغا سہیل صاحب نے بھی اپنے مضمون غالب کا نظریۂ شعر میں نئی تنقید کے حوالے سے تو نقادوں کو ڈانٹ پلا دی ہے کہ وہ POEM IS THE THING کے کیوں قائل ہیں۔ آغا صاحب کو بہت غصہ ہے کہ شکاگو اور آکسفورڈ کے یہ نئے نقاد تخلیق میں سے مصنف کو کیوں منہا کر دیتے ہیں۔ حالانکہ بغور دیکھا جائے تو ہر ادب پارہ اپنا ایک الگ وجود رکھتا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے اس کے مصنف کو درمیان میں لانے کی قطعی ضرورت نہیں کیونکہ اگر آپ مصنف کو درمیان میں لائیں گے تو اُس کے ساتھ اور بہت سی ایسی باتیں بھی آجائیں گی جن کا اس ادب پارہ سے کوئی تعلق نہ ہوگا مگر پھر قاری کے ذہن پر ان لاتعلق باتوں کا اثر ضرور ہوگا جس کی وجہ سے اس ادب پارہ کو سمجھنے میں آسانی کے بجائے اُلجھن پیدا ہوگی۔ مثال کے طور پر ایک بہت عمدہ نظم ہے لیکن اُس کا لکھنے والا شاعر معمولی درجہ کا ہے تو اس بات پر قاری ضرور حیران ہوگا اور بہت ممکن ہے وہ یہ سمجھنے لگے کہ یہ نظم اُس شاعر کی نہیں بلکہ اس نے چوری کی ہوگی یا کسی سے لکھوائی ہوگی۔ یہ مثال میں نے ویسے ہی سطحی انداز میں پیش کردی ہے۔ ورنہ انسانی ذہن کی کمزوری اور توانائی کا آپ کوئی اندازہ نہیں لگا سکتے۔ عام ذہن بھی بعض وقت بہت اونچی بات کہہ سکتا ہے۔ غالباً اسی لئے حضرت علیؓ نے فرمایا تھا کہ "یہ دیکھو کیا کہا گیا ہے یہ مت دیکھو کس نے کہا ہے"۔ اس مقولے سے یہ ہرگز مراد نہیں ہے کہ بے چارے مصنف کو بالکل صفر کر دو۔ مطلب یہ ہے کہ کسی ادب پارے یا تخلیق کو انصاف کے ساتھ پرکھو۔ کسی قسم کے تعصب کا شکار نہ ہو جاؤ۔ اور اس کا بہترین حل یہی ہے کہ وقتی طور پر مصنف کو فراموش ہی کر دو اور نظم غزل یا کسی ادبی تخلیق کو اُس کے اپنے وجود کے حوالے سے دیکھو۔ محترم ڈاکٹر آغا سہیل نے اپنے اس مضمون میں تو ایک غیر محتاط نقاد کی طرح چوکے اور چھکے بھی لگا ڈالے ہیں۔ مثلاً ایک پیراگراف کا آغاز اس طرح کرتے ہیں "ساختیاتی اور لسانیاتی زاویوں سے کلامِ غالب کا مطالعہ بکثرت ہوا ہے نہ" حضرت کم از کم مجھے تو ساختیات سے فائدہ اٹھانا تو بڑی بات ہے اردو میں اس پر پہلا مضمون ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا "ماہِ نو" میں پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اور اگر کسی نے ساختیات پر کھُل کر کچھ لکھا ہے تو وہ بھی بتائیں اور غالب کو ساختیات کے حوالے سے مزید کس کس نے دیکھا اُس سے بھی مطلع فرمائیں، بہت مہربانی ہوگی۔

یہ لیجئے اس قدر لکھنے کے باوجود جو لکھنا چاہتا تھا وہ ابھی تک نہیں لکھا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے منصورہ احمد کی پانچ نظمیں پڑھنے کے بعد ایسے لگا جیسے ان پانچ نظموں نے "فنون" کے اس پورے شمارہ کو اپنے ہاتھوں سے سر پر اٹھا رکھا ہے۔ کیا تاثر، کیا ابلاغ، کیا تشبیہات و استعارات کی ندرت، کیا دردمندی، کیا معانی کے جہات کا تعین، ہر اعتبار سے یہ نظمیں بہت خوبصورت ہیں۔ ان نظموں میں شاعری کی فضا بھی قائم ہوتی ہے اور محض شاعری کی فضا قائم ہو کر ہی نہیں رہ جاتی مفاہیم کی ترسیل بھی بدرجہ اتم ہوتی ہے۔ میرا مطلب ہے منصورہ کی نظموں میں ہم محض شاعری کی خوبصورت بھول بھلیوں ہی میں کھو کر نہیں رہ جاتے، ہمارے قدم بھی آگے بڑھتے ہیں۔

دوسری طرف ناہید قاسمی کی نظموں میں حسبِ سابق مشرقیت اپنے پورے جمالِ حجاب کے ساتھ جلوہ گر ہے جس میں

پاکیزگی خیال و کردار نے عجب طرح کے رنگ اُبھارے اور نکھارے ہیں۔

افسانوں میں مجھے محترمہ نیلوفر اقبال کے افسانوں کے بارے میں خاص بات یہ کہنا ہے کہ وہ جو کبھی ژونگ نے کہا تھا کہ ہر مرد میں ایک عورت پنہاں ہوتی ہے اور ہر عورت میں ایک مرد۔ تو ہماری اس عمدہ افسانہ نگار کی ذات میں جو مرد چھپا ہوا ہے وہ ان محترمہ کو ایک مرد کی ساری اچھی بری نفسیات سے آگاہ کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کئی برس ہوئے نیلوفر اقبال کا افسانہ "رس گلے" فنون ہی میں شائع ہوا اور میں نے اسے پڑھا تو کئی دن تک میں اپنے آپ سے منہ چھپائے پھرتا رہا، بلکہ سچ پوچھیے تو خود کو بری طرح سے لعنت ملامت کرتا رہا اور یوں لگا جیسے یہ افسانہ مجھ پر ہی لکھا گیا ہے حالانکہ اُس وقت تک نیلوفر صاحبہ سے میری ملاقات تو کیا میں نے انہیں کبھی دُور سے بھی نہیں دیکھا تھا۔ اسی طرح اب ان کا تازہ افسانہ "بدمعاش میاں" پڑھ کر بھی مجھے تو یہی لگا کہ میں بھی ایک بدمعاش میاں ہی ہوں۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ اخلاقی بندشوں کے باعث آج تک ہم کبھی بدمعاش نہ بن سکے۔ اور ناصر کاظمی مرحوم کا یہ شعر پڑھ کر جی ہی جی میں خوش ہوتے رہے۔

میں ہاتھ اُسے نہیں لگایا اے بے گنہی گواہ رہنا

اگر واقعی ہاتھ نہ لگانا ہی بے گناہی ہے پھر تو میں بھی خود کو بڑی حد تک بے گناہ اور معصوم کہہ سکتا ہوں۔ ورنہ جہاں تک ذہنی عیاشی کا تعلق ہے مجھ سے بڑا گناہ گار شاید ہی کوئی ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں عورت ایک مرد کی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہوتی ہے، سب سے بڑی بہار، سب سے بڑی رونق، سب سے بڑی لذت و مسرت۔ اس لئے اگر وہ اس کے بارے میں کھل کھیل کر سوچے بھی نہ تو شاید اس کا زندہ رہنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جائے۔ یقیناً میں جنسی آزادی کا قائل نہیں لیکن جنسی جذبات کو گلا گھونٹ کر مار دینے کا بھی قائل نہیں اور جنسی جذبات اپنی تمام توانائی اور منہ زوری کے باوجود اتنے بھولے اور نرم خو ہوتے ہیں کہ آپ انہیں اپنی متخیلہ کے ذریعے خاصی حد تک خوش کر سکتے ہیں۔ چنانچہ مجھ ایسا "شریف" آدمی اسی تکنیک پر گزارا کرتا ہے۔

فنون کا تازہ ترین شمارہ جون، جولائی ۱۹۹۰ء بھی سامنے ہے۔ اس کے مضامین نظم و نثر پر بھی بہت کچھ کہنے کو جی چاہتا ہے لیکن وہی بات کہ پہلے کچھ نہ کہنے کے باوجود خاصا کچھ کہہ دیا گیا ہے۔ بہر حال محمد ارشاد صاحب کی "بات سے بات" پر بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ میں فلسفہ کا ایک بہت ہی ادنیٰ سا قاری ہوں یعنی عام قاری سے بھی نچلی سطح کا، لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ فلسفیانہ موشگافیاں خواہ دیکھنے میں کتنی ہی بھول بھلیاں کیوں نہ نظر آئیں ان کا جواب دینا بہت آسان ہوتا ہے۔ قباحت یہ ہوتی ہے کہ اطمینان کسی کو بھی اور کسی صورت میں بھی حاصل نہیں ہوتا سو محمد ارشاد صاحب نے اپنی باتوں میں توازن قائم رکھنے کی کوشش تو کی ہے۔ لیکن ان کی بات سے بات میں سے کئی باتیں نکل رہی ہیں۔ اقبال شیخ الاکبر سے کس طرح معاملہ طے کرتا اور وہ رومی کو کیسے نہ اپنا پیر مانتا کہ شاعری میں یہی تو کمال ہے کہ وہ تضادات کو یک جا کر دیتی ہے۔ اصطلاحات خواہ فلسفہ کی ہوں یا تصوف کی وہ ہمارے ذہنوں کو ایک حد تک ہی مطمئن کر سکتی ہیں۔ ادھر ہم اصطلاحات قائم کر کے یہ سمجھتے ہیں جیسے ہم نے معانی کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ مثال کے طور پر ارشاد صاحب فرماتے ہیں: "اقبال از اول تا آخر خودی کی حقانیت (REALITY) کا قائل رہا ہے۔ وحدۃ الوجود میں خودی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ وحدۃ الوجودی صوفیا خودی کو گمراہی اور نفی خودی کو صحیح موقف خیال کرتے ہیں"۔ لیکن وحدۃ الوجود کو اگر وسیع معنی میں دیکھا جائے تو اس میں انسانی خودی کی کسی طرح بھی نفی نہیں ہوتی بلکہ وہ وحدۃ الوجود کے اثبات کا اعلان ثابت ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر خودی کے منفی معنی لئے جائیں یعنی انا مزود۔ تو پھر ہم اس کو سراسر گمراہی بھی کہہ سکتے ہیں۔ ارشاد صاحب نے آگے چل کر خود مان لیا ہے: "دوسری انسانی خودیوں کی حقیقت کے قائل ثابت کئے جا سکتے ہیں اور اسی بنا پر وہ اقبال کے مرشد بھی

ٹھہرے ہیں:"

میں نہیں سمجھتا انا الحق کہنے والے شخص یعنی حسین بن منصور حلاج کے بارے میں ارشاد صاحب نے یہ کیسے لکھ دیا کہ "حسین بن حلاج کے نزدیک ابلیس قابلِ رشک شخصیت کا مالک ہے" حق سے بڑھ کر بھی کوئی چیز قابلِ رشک ہو سکتی ہے۔ واقعی اپنی سمجھ میں یہ بات بالکل نہیں آئی ـــ اور انہوں نے حلاج کی جس کتاب طاسین الازل والالتباس کا حوالہ دیا ہے اُس کے سیاق و سباق کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ابلیس کا مقامِ تفرید پر آ کر گمراہی اگر کوئی قابلِ رشک بات ہے تو یہ ایک الگ بحث ہے۔ ورنہ جو گر گیا وہ قابلِ رشک کہاں رہا ـــ اسی طرح ملا صدرا کے اُستاد شیخ بہائی آملی کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ "شیطان نفسِ امارہ کا دوسرا نام ہے اور نفسِ امارہ کے تمائلات ہی اُس کی اولاد ہیں" ابلیس یقیناً تخلیقِ آدم سے پہلے موجود تھا لیکن شیطان موجود نہیں تھا۔ ابلیس اور شیطان ایک شخصیت کے دو نام نہیں ہیں۔ یہاں ارشاد صاحب کو دھوکہ ہوا ہے۔ اسی لئے وہ شیخ بہائی آملی سے اس تنقیح کا جواب مانگ رہے ہیں کہ ابلیس تو تخلیقِ آدم سے پہلے موجود تھا۔ اگر ابلیس نفسِ امارہ کا نام ہے تو نفسِ امارہ اس سے پہلے کیونکر موجود ہو گیا؟ اوّل تو اسی قسم کی فلسفیانہ تنقیحات پر مجھ ایسے عام قاری کو ہنسی آتی ہے، دوم ابلیس میں بھی شیطان جو پیدا ہوا تھا وہ تخلیقِ آدم کے بعد ہی ہوا تھا جب اُسے اللہ نے آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا ورنہ اس سے پہلے تو وہ ایک عبادت گزار جن ہی تھا جس نے اپنی عبادت کے باعث ملائک کی صف میں مقام حاصل کر لیا تھا۔ ابلیس کے جن ہونے کی خبر بھی اللہ میاں نے سورۂ کہف کی اُسی آیت میں دی ہے جس کا حوالہ نمبر ارشاد صاحب نے غلط دیا ہے۔ یعنی وہ آیات ۴۸، ۴۹ نہیں بلکہ ۵۰، ۵۱ ویں آیات ہیں۔ نہایت ادب کے ساتھ ارشاد صاحب کی خدمت میں گزارش ہے کہ جہاں وہ فلسفہ، تصوف، تاریخ اور نہ جانے کون کون سے علوم کی کتابیں بڑے غور سے مطالعہ فرماتے ہیں وہاں قرآن پاک کو بھی احتیاط اور غور سے مطالعہ فرمائیں۔ مجھے اس سے کوئی غرض یا دلچسپی نہیں ہے کہ حسین بن منصور حلاج شیعہ تھا یا سُنّی کیونکہ بحیثیت مسلمان مجھے یہ دونوں منافاتی نام فضول اور فالتو نظر آتے ہیں۔ پھر بھی اگر شیعہ کے معنی طرف دار کے ہیں تو علی کا طرف دار یعنی شیعہ کون ذی شعور مسلمان نہیں ہے۔ ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ ارشاد صاحب نے جو حلاج کو غیر شیعہ ثابت کرنے کے ضمن میں حلاج ہی کا ایک بیان بطور ثبوت پیش کیا ہے اس ضمن میں اطلاعاً یہ عرض کر رہا ہوں کہ شیعہ حضرات حضرت علی کو صدیق بھی کہتے ہیں اور صدیق ہی نہیں فاروق بھی۔ وہ اس لئے کہ حضرت علی کے صدق سے اور تمیزِ حق و باطل یعنی حق و باطل میں فرق کرنے کی صلاحیت سے کون مسلمان انکار کر سکتا ہے۔ منصور حلاج کے بارے میں یہ پڑھ کر کہ وہ غریب کسانوں اور مزدوروں کا زبردست حامی تھا، میرا یقین تو اس کے شیعہ ہونے میں مزید پختہ ہو گیا ہے کیونکہ حضرت علی سے لے کر امام غائب تک سب آئمہ پر کڑی نگرانی اور ظلم و ستم اور قید و بند اسی لئے لاگو رہے کہ یہ بزرگ ہستیاں عامۃ المسلمین کی حمایت اور طرف داری میں کبھی پیچھے نہیں ہٹیں اور ان ہستیوں سے ہمیشہ حکومتِ وقت یعنی ملوکیت کو خطرہ رہا۔ اسلام میں ملوکیت کس طرح در آئی ہر مسلمان کو اس سوال کے پیشِ نظر تاریخ کا عادلانہ مطالعہ کرنا بے حد ضروری ہے۔ ورنہ سچی بات یہ ہے کہ ہم اسلام کو کبھی بھی اُس کی صحیح سپرٹ کے ساتھ سمجھ نہیں سکتے اور ہمیشہ اسی طرح کے دو غلے مسلمان بنے رہیں گے جیسا کہ الّا ماشاءاللہ آج کل ہیں اور جیسی کہ آج کل مسلم اُمّہ کی حالت ہے اور ہم عیاش مسلم حکومتوں کو نہ جانے کیسے کیسے عمدہ خطابات دینے سے ہرگز باز نہیں آ رہے ہیں۔ میرا مطلب ہے عادلانہ تاریخی مطالعہ کے بغیر ہم کھرے مسلمان نہیں بن سکتے۔ کسی نہ کسی بہانے ہم میں منافقت یعنی غلط قسم کی دنیا داری موجود رہے گی۔ آخر میں ارشاد صاحب نے ابلیس کے کردار کے ضمن میں علامہ اقبال

کی وہ نظم پیش کی ہے جو ابنِ عربی سے ماخوذ ہے۔ یہ نظم ابلیس اور جبریل کے درمیان مکالمے کی صورت میں ہے اور لاریب کہ یہ نظم شاہکار ہے لیکن اس نظم پر کچھ عرض کرنے سے پہلے ارشاد صاحب کے اس ارشاد کا ایک جملہ میں جواب دینا چاہتا ہوں کہ "بے شک اللہ نے کسی کو خبث پیدا نہیں کیا حتیٰ کہ ابلیس کو بھی"۔ لیکن اللہ نے جن و انس کو یہاں تک اختیار بھی تو دیا ہے کہ وہ اُس کی ہر چیز کو اپنے عمل سے خبث اور بے کار بنا دیں حتیٰ کہ خود اپنی ذات کو بھی۔ ابلیس کو اللہ نے یقیناً خبث پیدا نہیں کیا تھا لیکن خود ان حضرت نے اپنے عمل سے اپنے آپ کو خبث ضرور بنا کر دکھایا۔ اب رہا علامہ اقبال کی شاہکار نظم کا سوال اور شیخ الاکبر کے خیالات عالیہ کی بات کہ جن سے یہ نظم ماخوذ ہے تو اس بارے میں یہ عرض ہے کہ اگرچہ چھوٹا منہ بڑی بات والا معاملہ ٹھہر جائے گا لیکن کیا کیا جائے جب بڑے منہ سِل گئے ہوں تو پھر غریب چھوٹے منہ ہی کھُلا کرتے ہیں۔ کسی نظم کا شاہکار ہونا ایک الگ بات ہے اور قارئین پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے یہ دوسری بات ہے۔ اس نظم کے آخری شعر ہی کو لے لیجئے جس کی تعریف ارشاد صاحب نے بہت کی ہے اور واقعی جہاں تک اُس کے شعر ہونے کا تعلق ہے وہ شعر ہے بھی اچھا۔ ابلیس جبریل سے کہتا ہے۔

میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ھُو اللہ ھُو اللہ ھُو

شاعری کی بات اور ہے۔ میں پوچھتا ہوں کیا ابلیس واقعی دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے؟ عام قاری بے چارہ تو اس طرح کے شعروں کو پڑھ کر اپنے شر کا جواز تلاش کرتا ہے، جس طرح دل سے متعلق اقبال کا وہ شعر ہمیں اپنی عام ڈگر سے ہٹاتا ہے جس کا ایک مصرع ہے، "لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے"۔ اگر ذرا غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ارشاد صاحب کی یہ تشریح بھی درست نہیں ہے کہ "اگر شر نہ ہوتا تو خیر کی پہچان کیسے ہوتی"۔ "یا آدم کی زندگی میں ساری بہار ابلیس کے دم سے ہے"۔ شر کے لئے تخلیق ابلیس کی ضرورت نہ تھی۔ شر تو اللہ نے جن و انس کو جو اختیار دیا ہے اُس سے پیدا ہوتا ہے اور اب ابلیس راندۂ درگاہ ہو کر اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کرتا کہ وہ آدم کو اُس کے اختیار کے صحیح استعمال سے روکتا ہے۔ بہرحال علامہ اقبال کی اس شاہکار نظم کا مطلب میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ابلیس ایک طاقت ہے جس کو قابو میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ باقی رہا صوفیانہ شاعری میں اس نظم کا مقام تو اس ضمن میں اس حقیقت پر غور کرنے کی بہت ضرورت ہے کہ شیخ الاکبر سمیت ہمارے اکثر صوفیا نے قرآنِ پاک پر غور کرنے کی نسبت اپنی فکری صلاحیتوں میں "قیاس" اور "ظن" سے زیادہ کام لیا ہے جس کی وجہ سے ان کے افکار حقائق سے قریب ہونے کی بجائے دور ہوتے چلے گئے ہیں۔ نیز صوفی اور عارف میں پہچان کرنا بھی لازم ہے کہ عارف صوفی کی طرح قیاس اور ظن سے کام نہیں لیتا۔ وہ قرآن کی روشنی میں حقائق پر غور کرنے کا عادی ہوتا ہے اور یوں سلوک کی راہیں طے کرتا ہے۔

فنون کے اس تازہ شمارہ میں اور بھی تو بہت سے مضامین نثر و نظم ہیں جن پر بات کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن میں تو پہلے ہی بہت کچھ لکھ گیا ہوں۔ اس شمارہ کے افسانوں میں پھر نیلوفر اقبال کا ایک فکر انگیز بلکہ عبرت انگیز افسانہ ہے۔ عطیہ سید کا بھی ایک عمدہ افسانہ ہے۔ عطیہ سید اردو افسانے کو ایک نئی فضا اور نئی جہت سے آشنا کرتی نظر آتی ہیں اور اس دفعہ تو ایک طویل عرصہ کے بعد اشفاق احمد کا بھی افسانہ شامل ہے۔ بستر مرگ پر بھی ایک دنیادار آخر وقت تک دنیا دار رہتا ہے۔ اور اللہ میاں کو خدا اپنے پاس نہیں پھٹکنے دیتا فاعتبروا یا اولی الابصار۔ اسی طرح ممتاز مفتی بھی فنون میں ایک عرصۂ دراز کے بعد نظر پڑے ہیں۔ ضیاء جالندھری کی شخصیت پر کیا رواں دواں تبصرہ فرما دیا ہے۔

غزلوں میں کیا جوان اور کیا نوجوان سبھی شعراء کی غزلیں خوب ہیں۔ جوان شعرا سے میری مراد بڑی عمر کے شعرا ہیں جن میں آپ کی

سب سے آخر میں غزل ہے جس کا مطلع ہے ۔ ہر تغیر سے ماورا ہونا ۔۔ کتنا دشوار ہے خدا ہونا ۔۔ اب بتایئے جناب احمد ندیم قاسمی صاحب آپ کے اس شعر پر پورا ایک مضمون لکھنے کو جی چاہتا ہے ۔ بظاہر اس مطلع کے مصرعہ اوّل سے یوں لگتا ہے جیسے خدا شناسی کے ضمن میں آپ نے ایک عام سا خیال پیش کر دیا ہے ۔ لیکن دوسرے مصرع کے اس ٹکڑے نے "کتنا دشوار ہے . . . . ." مضمون کو ایک نئی جہت دے دی ہے ۔ اگرچہ بظاہر وہ بھی جرأت مندانہ ہے یعنی آپ نے خدا ہونے کو ناممکن نہیں بتایا بلکہ محض دشوار کہا ہے حالانکہ بات آپ نے یہ کہی ہے کہ آدمی بھی اگر چاہے تو ہر قسم کے تغیر سے ماورا ہو سکتا ہے کم از کم خیالوں ہی خیالوں میں ۔۔ اور اسی سوچ کو اگر ہم ذرا اور بلندی پر لے جائیں تو تنزیہہ الٰہی کی منزل کا آغاز ہو جاتا ہے ۔ خدا شناسی کے ضمن میں آدمی کی سب سے بڑی غلط فہمی یہی ہے کہ وہ خالق کو مخلوقات کے معیارات ادراک سے سمجھنا چاہتا ہے ۔ اللہ ہر تغیر سے ماورا ضرور ہے لیکن آدمی نے جو تصور تغیر قائم کیا ہے وہ اس کائنات پر لاگو ہوتا ہے ۔ آپ اس تصور کو یعنی تغیر یا عدم تغیر کو اللہ پر لاگو نہیں کر سکتے ۔ اللہ کیا ہے اور کیسا ہے؟ ہم نہ یہ تصور کر سکتے ہیں اور نہ سوچ سکتے ہیں البتہ اس کی ہمیں خواہش ضرور ہوتی ہے اور میں سمجھتا ہوں یہی خواہش اس زندگی اور حیات بعد ممات کے تمام تر ارتقا کی بنیاد اور اساس ہے ۔

حصہ نظم میں اس دفعہ اختر حسین جعفری کی کمی بُری طرح کھٹک رہی ہے جبکہ منصورہ احمد کی نظموں کی کمی کھٹک رہی ہے (معقول عبارت لکھنے میں بھی کچھ ہوتا ہے) اور ہاں علامہ طالب جوہری کی غزلیں اور قصیدہ بھی تو تازہ شمارہ میں شامل ہیں ۔ یہ شخص بھی نابغۂ روزگار ہے کہ تقریر کے علاوہ تحریر میں بھی نظم و نثر دونوں میں کمال کے جوہر دکھاتا ہے ۔ باقی پھر کبھی سہی ۔

سید مشکور حسین یاد (لاہور)

رام لال کا سفر نامہ

جناب رام لال فنون شمارہ ۲۹ صفحہ ۲۵۱ پر رقمطراز ہیں : "ہندوستان ایک ہزار سال کی غلامی کے بعد قریباً ایک سو سال کی سیاسی جدوجہد کے بعد ابھی چالیس برس پہلے آزاد ہوا ہے ۔ غلامی کی اس طویل مدت نے اس کی سماجی اخلاقیات ، خودداری معاشیات اور دیگر وجہ اقدار پر بہت گہرے اثرات مرتب کئے ہیں ۔"

فاضل مصنف نے جس ہزار سال کا ذکر کیا ہے وہ ایک اہم دور ہے ۔ عرب ، موجودہ افغانستان (غزنی اور غور) ازبکستان (فرغانہ) کے بادشاہ یا راجے ، جن کا مذہب اسلام تھا ، ہندوستان پر حملہ آور ہوئے اور پھر اس سرزمین پر بس گئے ۔ گر دہلی سے انہوں نے ہندوستان پر حکومت کی تو ایک ہندوستانی کی حیثیت سے کی ۔ جس کی سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستانی عوام کی محنت سے پیدا کی ہوئی دولت کو ہندوستان کے باہر اپنے آبائی ملکوں کو نہیں روانہ کیا ۔ وہ اگر اپنے ساتھ فارسی زبان لائے تو ہندوستان کی تاریخ میں یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی ۔ چونکہ ان سے پیشتر اسی وسط ایشیا سے جو آرین آئے تھے ان کی زبان سنسکرت تھی (یا اس سے بالکل ملتی جلتی تھی)

کسی بھی فرد ، افراد ، قبیلہ یا فرقہ کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مذہب پر نہ صرف قائم رہے بلکہ اس کے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرے ۔ اس لئے یہ تصور کرنا کہ ہندوستانی مسلمانوں نے ہندو مذہب اختیار نہیں کیا ۔ اس لئے وہ غیر ہندوستانی حکمران تھے ، جنہوں نے ہندو عوام کو غلام رکھا ۔۔ نہ صرف ایک مہمل تصور ہے بلکہ ان تصورات میں سے ایک ہے جس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو علیحدہ قومیت کا احساس دیا ۔ اس سلسلے میں یہ لکھنا بھی غلط نہیں ہوگا کہ اب تک ہندوستان

میں یہ تصور عام ہے کہ اس ملک میں اسلام بزورِ شمشیر پھیلا۔ دنیا کی تاریخ میں کسی عقیدہ کو جب بھی مقبولیت حاصل ہوتی ہے، تو اس میں کم یا بیش جبر کا پہلو ضرور رہا ہے۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے اس کی بابت غیر مسلم اور معتبر تاریخ دانوں نے اعتراف کیا ہے کہ ہندوستان میں اسلام صوفیوں اور ہندوؤں میں چھوت چھات کی تفریق کی وجہ سے پھیلا اور اس میں جبر کو بہت کم دخل تھا۔

ہزار سال کی غلامی کی سوچ کے تحت ہندوستان کے بعض حلقوں میں یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے دورِ حکومت میں ہندوؤں کی اکثریت مفلوک الحال رہی۔ یہ مفلسی مسلمانوں کی اکثریت کا بھی مقدر رہی۔ بادشاہت کہیں بھی ہو اور بادشاہ مطلق العنان ہو تو وہاں کی اکثریت غریب ہی رہتی ہے۔ گر طبعاً نہیں تو ذہنی سطح پر یقیناً۔ (مثلاً خلیج کی تمام عرب حکومتیں)

۱۹۸۹ء میں رام لعل کا یہ لکھنا کہ ہندوستان صرف سو سال سیاسی جدوجہد کے بعد آزاد ہوا غلط ہے۔ اس جہد کا آغاز ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے ہوا تھا۔ آل انڈیا کانگرس پارٹی میں فرقہ پرست حلقہ بہت وسیع اور توانا تھا۔ اس کو مزید تقویت گاندھی جی کے رام راج کے اعلانوں سے ملتی تھی۔ گاندھی جی ہندوستان کی آزادی کو رام راج سے مناسبت دیتے تھے۔ بقول ان کے اس طرح ہندوستان کا ان پڑھ طبقہ آزادی کی افادیت کو جلد سمجھے گا اور آزادی کی جدوجہد کو تیز کر دے گا۔ مختصراً یہ سب کچھ اور انگریز حکمرانوں کی حکمتِ عملی نے ہندوستان کی ہزار سال کی غلامی کے تصور کو فروغ دیا اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کو بغاوت قرار دے دیا۔ ۱۹۴۷ء سے قبل یہ نکات بھی فرقہ پرستی کے مضبوط بنیاد تھے۔

رام لعل ایک روشن خیال ادیب ہیں انہیں ہندوستان کی تاریخ پر ہمیشہ ناقدانہ نگاہ رکھنی چاہیئے۔

مصطفیٰ کریم (برطانیہ)

رپورتاژ "ہم نفس" کے سلسلے میں

"فنون" میں مسعود مفتی کا رپورتاژ میں نے پڑھا (ہم نفس -۳) پہلے کی دو قسطیں بھی میں پڑھ چکا ہوں۔ زیر بحث قسط ہم نفس -۳ میں چند باتیں کھٹکتی ہیں جن پر میرے خیال میں کچھ گفتگو ہونی چاہیئے۔ صفحہ ۲۳ پر آیا ہے "مگر کیا ایک نظریاتی سلطنت کی نئی نسل کو یہ احساس بھی ہے کہ ان کے ساتھ ان کے بزرگوں نے بے ایمانی کی ہے؟" نظریاتی سلطنت" غور طلب بھی ہے اور وضاحت طلب بھی۔ اس سے مراد متحدہ پاکستان ہے۔ نئی نسل سے مفہوم متحدہ پاکستان کی نئی نسل ہے نہ کہ سابقہ مشرقی پاکستان کی نئی نسل، جس کے نمائندہ کے طور پر عطار الحق ہمارے مطالعے میں آتا ہے۔ کیا سابقہ مغربی پاکستان کی نئی نسل بھی مراد ہے اور ایسا ہے تو اس کی نمائندگی کیسے ہوتی ہے؟ یہاں معاملہ کچھ اُلجھا اُلجھا محسوس ہو رہا ہے جو آگے چل کر بزرگوں کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی اُلجھ جاتا ہے۔ اسی صفحے پر یہ بھی آیا ہے "پاکستان سے غداری اسی نسل نے کی ہے جس نے پاکستان بنایا تھا" زد پہ سابقہ مشرقی پاکستان اور سابقہ مغربی پاکستان کے سبھی بزرگ آجاتے ہیں۔ مگر حاشیئے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ موردِ الزام سابقہ مشرقی پاکستان کے گورنر عبدالمنعم خاں ٹھہرتے ہیں جن کی سرپرستی صدر ایوب فرماتے تھے۔ ان حضرات نے مسعود مفتی کے نزدیک پاکستان بنایا تھا۔

لہ INDIA BY PERCIVAL SPEAR

INDIA — CLIVE TO NEHRU BY DURGA DAS

کہ غالباً ان کا جملہ یہ تھا۔ ہندوستانی عوام ایسی ہی باتیں سمجھتے ہیں۔

اور قدرت اللہ شہاب کے نزدیک یہی حضرات (بحوالہ ضمیمہ) پاکستان کی معمار نسل ٹھہرتے ہیں۔ یہاں بے شمار سوالات فوراً اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ سر فہرست یہ سرخی لگتی ہے کہ صدر ایوب خاں پاکستان کے کیسے معمار تھے کہ پارلیمانی جمہوریت ان پر ختم ہوتی ہے اور انہی سے فوجی حکومت کی باقاعدہ ابتدا بھی ہوتی ہے۔ صدر ایوب خاں کے سلسلے میں بات میں اس سوال پر ختم کر کے آگے بڑھتا ہوں کہ ایوب خاں برسر اقتدار آئے۔ بظاہر ایسے حالات میں جن سے ملک کا وجود خطرے میں نظر آتا ہے۔ ان کا بہت خیر مقدم ہوا۔ مگر کیا وہ حالات بہتر تھے جب وہ جنرل یحییٰ کو اپنا جانشین مقرر کر کے اپنی مرضی سے دست بردار ہو گئے۔ اس کا انتہائی کار انجام کیا ہوا۔ گورنر عبدالمنعم خاں کا ستارہ سابقہ مشرقی پاکستان کی سیاست پر ایوب خاں کے ساتھ چمکا اور انہی سے سابقہ مشرقی پاکستان کے تعلیمی اداروں میں دہشت پسندی کا آغاز ہوا۔

مسعود مفتی نے جن بزرگوں کا ذکر کیا ہے۔ سابقہ مشرقی پاکستان کے سیاق و سباق میں وہ کون لوگ تھے۔ یہیں پر صوبۂ بنگال کی تاریخ کا غیر جانب دار اور گہرا مطالعہ شرط ٹھہرتا ہے جس کے گھیرے میں پلاسی سے پاکستان تک کے واقعات آتے ہیں۔ خصوصی طور پر بنگال کے مسلمانوں پر ۱۷۵۷ء کے بعد کیا گزری اور وہ کن حالات سے دوچار ہوتے اور ۱۹۱۴ء تک پہنچے۔ پھر ۱۹۱۴ء تا ۱۹۳۵ء کی تاریخ۔ بعدہٗ سن ۱۹۴۷ء تک کے معاملات۔ محترمہ لطیفہ آکنڈ ۱۹۷۱ء میں ڈھاکا یونیورسٹی میں شعبۂ تاریخ کی پروفیسر تھیں۔ انہوں نے صوبۂ بنگال کی تاریخ کے اس مخصوص دور پر خصوصی توجہ دی ہے۔ یہاں تاریخی طور پر یہ نکتہ صاف واضح ہو جاتا ہے کہ بنگال کے جسٹس سید امیر علی اور نواب عبداللطیف جو سر سید احمد خاں کی تحریک سے وابستہ تھے۔ صوبہ بنگال میں مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کا نقطۂ آغاز کا درجہ رکھتے ہیں۔ ۱۹ویں صدی عیسوی کے اختتام پر ضلع مہلٹ کے مولوی عبدالکریم انہی بزرگوں کی روایت اپنے سینے سے لگائے آگے بڑھے اور نامساعد حالات کے باوجود وہ ۱۹۳۵ء تک سرگرم عمل رہے۔ ان کے بعد مولوی فضل الحق کا زمانہ آتا ہے جنہوں نے لاہور میں قرارداد پاکستان پیش کی تھی اور آپ تا دم آخر عقیدتاً پاکستانی تھے۔

پاکستان درحقیقت ۱۹۴۷ء میں وجود میں آنے کے بعد ہی دو لخت ہو چکا تھا۔ جس کا عمل جیسے ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ہوا۔ زبردست خون ریزیوں کے بعد۔

تمدن مجلس بنگلہ دیش کی قدیم ترین ادبی و ثقافتی انجمن ہے۔ اس انجمن سے جو ادیب و شاعر اور دانشور وابستہ رہے، دو قومی نظریے پر ان کے ایمان اور اسلام میں ان کے ایقان پر انگلیاں نہیں اٹھائی جا سکتی ہیں۔ بلکہ ادیبوں شاعروں اور دانشوروں کا یہ گروہ اپنے اسی ایمان و ایقان کے واسطے۔ سوائے زمانہ ہوا۔ ہمارے بزرگوں کی روایت کا گہوارہ یہی انجمن تھی۔ تمدن مجلس آج ایک فعال انجمن کہلاتی ہے۔ پروفیسر عبدالغفور کی نگرانی میں جو ۱۹۴۷ء میں زیر تعلیم ہونے کے باوصف تمدن مجلس کے معاملے میں انتہائی واضح COMMITMENT رکھتے تھے اور تبھی سے وہ تمدن مجلس کے لئے برابر کام کرتے چلے آ رہے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ۱۹۴۷ء تک پہنچ کر، ہمارے بزرگوں کی روایت جس انجمن نے سر آنکھوں پر رکھی وہ تمدن مجلس ہے۔ دیگر کوئی ادارہ نہیں نہ کوئی سیاسی پارٹی۔ پروفیسر غفور اس کے گواہ ہیں مع دستاویزات کے۔

پہلی ستمبر ۱۹۴۷ء کو تمدن مجلس نے ایک بنگالی اجلاس بلایا تھا اور صوبۂ بنگال کی تاریخ کی روشنی میں اپنے موقف کا اعلان کیا تھا اور یہ مطالبہ کیا تھا کہ اردو کے ساتھ بنگلہ زبان کو مملکت کی سطح پر اس کا جائز اور جمہوری مقام دیا جائے۔ تمدن مجلس کے اس موقف کے پیچھے جو تاریخی عوامل نہایت شدت کے ساتھ کار فرما تھے ان پر غور و خوض کرنے کی گھڑی آئی ہے۔ زبان کے معاملے میں بنگالی مسلمان دو دھوکے جلے واقع ہوئے تھے۔ دو یوں کہ زبان ہی کے چلتے وہ صوبہ بنگال میں ہندوؤں کے پیچھے

رہ گئے تھے تو جس پر بنگال کی اسلامی نشاۃ الثانیہ کے سربراہوں نے خصوصی توجہ دی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں ان پر انگریزی کی جگہ اردو مسلط کر دی گئی تو بنگالی مسلمانوں کا یہ شک و شبہ ناگزیر تھا کہ جہاں مملکت کا دارالحکومت ہے وہاں اردو بولی جاتی ہے، تو کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ انگریز گئے اور ان کی جگہ سابقہ مغربی پاکستان ان پر مسلط ہو گیا۔ تمدن مجلس نے صورتِ حال کا صحیح تجزیہ بروقت کیا تھا۔

پورے نو سال بعد قومی زبان کے فیصلے میں ترمیم کر لی گئی۔ اس عرصہ میں یہ ہوا کہ سیاسی معاملات ان بزرگوں کے ہاتھ سے نکل گئے جو دو قومی نظریئے پر نہ صرف ایمان رکھتے تھے بلکہ اس کے محافظ بھی تھے۔ اپنے بزرگوں کی روایت کے حوالے سے "نتیجتاً" قیادت جن ہاتھوں میں جانا تھی چلی گئی۔ بھارت کی جگہ اگر پاکستان ہوتا تو پاکستان اپنے قومی مفاد میں یقیناً وہی کرتا جو بھارت نے کیا اور اسی میں دانشمندی تھی۔ الزام اپنے اوپر لینے کی بجائے بھارت یا ان پر الزام کس لئے منڈھ دیا گیا جنہوں نے دو قومی نظریے کو تسلیم ہی نہیں کیا تھا۔ نو سال کا وقفہ یعنی ۱۹۴۷ء یا ۱۹۵۶ء کا زمانہ نئی مملکت کے لئے بڑا نازک تھا۔ پھر دونوں بازوؤں کے درمیان فاصلے اور تاریخی تقاضوں سے مجرمانہ حد تک غفلت، چاپلوسی، بے حسی، اقتدار کی جنگ وغیرہ۔

بہاریوں کا مسئلہ بھی قومی زبان کے ساتھ ضمنی طور پر اُٹھ کھڑا ہوا۔ سن ۱۹۵۲ء میں جب بنگلہ زبان کے حامیوں پر گولیاں چلا دی گئیں تو بہاریوں کے مسئلے میں بھی حالات کے تناسب سے تقویت پہنچی۔ پہلا بنگالی بہاری فساد سابقہ مشرقی پاکستان میں ۱۹۵۶ء کے دوران ہوا جس نے سن ۱۹۷۱ء عیسوی میں بھیانک شکل پکڑی۔

بنگالیوں پر یہ تاثر پڑتا رہا کہ بہاری PREVILEGED لوگ ہیں جس میں بہاریوں نے فخر محسوس کیا۔ بات بڑی ناگوار ہے مگر ایسی ہے کہ اس سے چشم پوشی کرنا ممکن نہیں۔ بہاریوں نے اپنے تئیں بنگالیوں سے ہر معاملے میں برتر جانا اور اس کا اظہار بھی کیا اور بنگالیوں کے OPPRESSED CULTURE سے ہمدردی نہ کی۔ نہ ان سے اپنی یگانگت کا ثبوت دیا۔ بلکہ انہوں نے کھلے بندوں بنگالیوں کا تمسخر اڑایا۔

جب حکومت کی بات چلتی ہے تو چند بنیادی باتیں اٹھتی ہیں۔ ایوب خاں ہوں یا کوئی بھی خاں، وہ محض اپنی ذات گرامی سے حکومت نہیں چلاتے۔ ہمارے جیسے ملکوں میں اقتدار پر چند گروہوں کا تسلط ہوتا ہے۔ مثلاً فوج، سول بیوروکریسی، صنعت کار، دانشور، غیر ملکی ادارے وغیرہ۔ مسعود مفتی کے رپورتاژ میں فوج، سول بیوروکریسی اور کسی حد تک دانشوروں کا ذکر ملتا ہے۔ صنعت کار و تاجر اور غیر ملکی ادارے اور ایسے دیگر گروہوں کا ذکر ان کے رپورتاژ میں مفقود ہے اگرچہ انہی عناصر کے مفادات زیادہ IMMEDIATE ہوتے ہیں، اور یہی عناصر سیاسی جماعتوں کو منظم یا منتشر بھی کرتے رہتے ہیں۔ اپنے مقاصد کے حصول کی غرض سے ان کا تعلق سول بیوروکریسی اور فوج سے براہِ راست ہوتا ہے۔ رپورتاژ اس مقام پر نہایت کمزور نظر آتا ہے۔

سابقہ مشرقی پاکستان میں فوج کی بالا دستیوں کا ذکر بار بار آیا ہے۔ صفحہ ۲۴۴ پر مسعود مفتی رقمطراز ہیں " میں نے سول انتظامیہ کے دیگر افسروں کو فون کیا مگر کسی کو علم نہ تھا۔ چنانچہ ریڈیو لگا دیا۔ اس پر تھوڑی دیر بعد یہ اعلان ہوا کہ کرفیو تا حکم ثانی رہے گا۔ دریں اثنا تمام مشتبہ گھروں کی تلاشی لی جائے گی تاکہ اسلحہ برآمد کیا جائے۔" فوج کا یہ رویہ تھا خود سابقہ مغربی پاکستان کے اعلیٰ سول حکام کے سلسلے میں جن کی وفاداری غیر مشکوک تھی۔ تو فوج کا رویہ سابقہ مشرقی پاکستان کے سول حکام کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے اس پر غور کرنا چاہیئے بلکہ وہ تجزیئے کا متقاضی ہے۔

جائے واردات پر میں بھی موجود تھا۔ میں ان دنوں سرکاری ملازمت کر رہا تھا اور میرا تعلق ایک صوبائی کاڈر سے

تھا۔ پھر یہ کہ میرا خاندان ایسا ہے جس میں بنگالی بھی تھے اور "بہاری" بھی۔ قیام بنگلہ دیش تک میرے خاندان کے دو افراد اعداء کی زد پر آئے۔ ان میں ایک مکتی باہنی کا کمانڈر تھا اور دوسرا اردو کا افسانہ نگار — واحد نظامی۔ واقعات پر میری دونوں آنکھیں پڑی ہیں۔

اس وقت کی حکومت کی یہ پالیسی دیکھی گئی کہ ۲۴ مارچ ۱۹۷۱ء تک ارباب حل وعقد کی خاموشی اور مسائل کو پس پشت ڈالنے کا رجحان عام ہو چکا تھا۔ انتخابات (۱۹۷۰ء) اگرچہ مملکت کے پیمانے پر ہوئے مگر تیاریاں صوبائی پیمانے پر کی گئیں اور یوں ایک ہی مملکت میں دو اکثریتی پارٹیوں کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا اور یہ اقتدار کی جمہوری منتقلی کی راہ میں مانع ہوا۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ہمارے رہنماؤں نے مملکت کے پیمانے پر سوچنا ترک کر دیا اور ان کے غور و فکر کا محور ان کا اپنا اپنا صوبہ قرار پایا اور جنہوں نے صوبۂ بنگال کے بزرگوں کی روایت کو ۱۹۵۶ء تک وعدہ نو سال میں SUPERSEDE کیا تھا۔ وہی لوگ اذلی طور پر منظر عام پر آ چکے تھے۔ جس کے منطقی جوانہ بھی دریں اثنا پیدا ہو چکے تھے۔ کیا یہ ایک سوچا سمجھا منصوبہ نہیں تھا؟

مسعود مفتی یقیناً اس تاریخی واقعے سے باخبر ہوں گے کہ ۱۹۱۴ء تا ۱۹۳۵ء ڈھاکا "الوشیلن" اور کلکتہ "جگانتر" کی شکل میں ایک دوسرے سے متصادم ہوتے رہے اگرچہ حیرت انگیز طور پر یہ دونوں ادارے ہندوؤں کے تھے۔ الوشیلن اور جگانتر کے واقعات کا حوالہ اس لئے دیا گیا ہے کہ ڈھاکا ہر دور میں اپنی جداگانہ شناخت پر اصرار کرتا رہا۔ آزاد و خود مختار بنگلہ دیش کی تازہ ادبی صورتحال یہ ہے کہ بنگلہ دیش کے مشہور شاعر فرہاد مظہر نے اپنے پردتی بکھو کے پلیٹ فارم سے بنگلہ ادب میں کلکتے کی اتھریٹی کو چیلنج کیا ہے اور بنگلہ دیش کے اخبارات فرہاد مظہر کے اس موقف کی تائید کرتے ہیں۔ فرہاد مظہر نے جب اپنے رسالے کا بنگلہ ہی میں اردو نمبر پیش کیا اور بنگلہ دیش کے ڈانڈے تاریخی طور پر ماضی سے ملا دیئے اور اس عمل میں انہوں نے اپنی اردو دوستی کا اعلان کیا تو بنگلہ دیش کے اخبارات میں اس کا ایسا خیر مقدم ہوا کہ ہم لوگ خود حیران رہ گئے۔ بنگلہ کے اسی پلیٹ فارم سے اب ایک اردو رسالے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ تو مسعود مفتی ہمیں یہ بتائیں کہ درمیانی وقفے میں ایسا کیا ہوا تھا کہ لوگ حب علی کی بجائے بغض معاویہ پر مجبور ہوئے؟ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں میں بھی جائے واردات پر موجود تھا اور ایک دفعہ میری موت کی خبر بھی اڑی تھی۔ جو واقعات میرے تجربے میں آتے رہے ہیں انہیں رقم کرنا تو ممکن ہے، مگر کیا ان کی اشاعت بھی ممکن ہے؟ کسی مخصوص علاقے کے باشندوں، ان کی زبان، طرز زندگی اور دیگر معاملات کا بیان، کچھ اس طور پر کہ تضحیک، غلط بیانی یا حقارت کے پہلو اس بیان سے نکلتے ہوں، ایک ادیب یا دانشور کو زیب نہیں دیتا۔ "ہم نفس" کی یہ خوبی رہی ہے کہ وہ ۱۹۷۱ء کے بعد کی عام تحریروں سے ذرا بلند تر ہے۔ "ایک صدی اور تین چار نسلوں کی ذلت و آزار" کا سفر جو مسعود مفتی کے تجزیے میں آتا ہے، واقعتاً صحیح نظر نہیں آرہا۔ ایک نئے اور صحیح ادبی و ثقافتی موقف کا اعلان ہمارے ہاں ہو چکا ہے اور غالباً آگے چل کر یہی اعلان انتہائی برق رفتاری سے اپنا کام کر جائے گا کیونکہ اسے تقریباً ہر خاص و عام کی کھلی تائید حاصل ہے اور اس کی حیثیت نشاۃ ثانیہ کی ہے۔

سابقہ مشرقی پاکستان کے لوگوں نے ۲۴ مارچ ۱۹۷۱ء تک پاکستان سے علیحدگی کے متعلق کبھی نہیں سوچا تھا۔ مگر ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کی فوجی کارروائیاں کچھ یوں ہوئیں اور پھر یکے بعد دیگرے ایسے واقعات نمودار ہوتے چلے گئے جن سے خود مسعود مفتی جیسے اعلیٰ بیورو کریٹ بے خبر تھے کہ ہتھیار اٹھا لینے کے علاوہ دیگر چارہ بھی نہ تھا۔ تمام توجیہات اردو میں ۱۹۷۱ء پر پڑتی دکھائی دیتی ہیں ان کے اپنے تاریخی محرکات و اسباب سے جدا ہو کر مسئلہ بنیادی طور پر اقتصادی نوعیت رکھتا تھا۔ جس پر تمدن مجلس نے ابتداء ہی میں توجہ مبذول کرائی تھی۔ اس پر فوراً سیاسی یلغار ہوئی اور اقتدار کی جنگ انتہائے کار ایک رنگ دکھا گئی اور وہ گروہ

نظروں سے ہمیشہ اوجھل رہا یعنی صنعت کار و تاجر اور غیر ملکیوں کے نمائندے جن کے مقاصد میں ہمیشہ R G E N C Y رہا ہوتی ہے۔

سانپ تو نکل گیا اور ہم لوگ ہیں کہ جھاڑیوں پر جنون اپنی اپنی لاٹھیاں برسا رہے ہیں۔

کیا ان جھاڑیوں کی جستجو بحیثیت ادیب و دانش ور کے ہمارے ذمہ داری نہیں ٹھہرتی ہے جہاں وہ سانپ روپوش ہو گیا ہے؟ اس سانپ کی شناخت بھی ہماری ذمہ داری ٹھہرتی ہے۔

اگر گورنر منعم خاں ہمارے بزرگ ٹھہرائے جائیں اور وہ سپہ سالار جس پر ایک طرف پاکستان کا جمہوری PROCESS تمام ہوتا ہے اور دوسری طرف فوجی انقلاب کی ابتدا ہوتی ہے، معمار پاکستان کی نسل میں شمار کیا جائے تو ہم لوگ تاریخ سے باہر کہیں دور جا گریں گے اور بحث و مباحثے میں اشتعال پیدا ہو جائے گا اور دنگے فساد کے خطرات پائے جائیں گے اور سانپ جھاڑیوں سے نکل کر شاہراہوں پر پھرنے لگے گا۔

غلام محمد (ڈھاکا، بنگلہ دیش)

کچھ شمارہ نمبر ۲۸ کے بارے میں

"فنون" اردو کے ان چند جرائد میں شامل ہے جس میں ہمیشہ اعلیٰ پائے کے علمی و ادبی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ فنون میں شائع ہونے والے افسانے اور دیگر شعبے میں شامل تحریریں خواہ بہت بلند معیار کے نہ ہوں، علمی و ادبی مقالات کے بارے میں وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بہت بلند پائے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں سب سے پہلے فنون کے مقالات کا مطالعہ کرتا ہوں۔ اس کے بعد دوسرے شعبے کا مطالعے کے بعد ہر دفعہ کچھ نہ کچھ لکھنے کو جی چاہتا ہے لیکن اتنا وقت کہاں کہ ہر مقالہ، ہر نظم اور ہر افسانے کے بارے میں اظہار خیال کروں۔ اس لئے جب تک لکھنے کے لئے مجبور نہیں ہو جاتا ہوں، میں "اختلافات" کے کالم کے لئے کچھ نہیں لکھتا۔ "فنون" کے گزشتہ دو شماروں (شمارہ ۲۸ اور ۲۹) کے بارے میں اتنا کچھ مواد جمع ہو گیا ہے کہ اب اظہار خیال کئے بنا چارہ نہیں۔ محترمہ شبانہ محمود اور ڈاکٹر سعید اختر درانی کے مضامین کے بارے میں چند معروضات رقم کر رہا ہوں۔

محترمہ شبانہ محمود نے اپنے مقالے "انگارے — ایک جائزہ" (شمارہ ۲۸) میں بعض ایسی باتیں تحریر کی ہیں جو قطعی درست نہیں ہیں، مثلاً مصنفہ کا یہ خیال غلط ہے کہ "انگارے" کے دفاع میں مصنفین انگارے کا مشترکہ بیان (جو الہ آباد کے روزنامہ "لیڈر" میں شائع ہوا) انجمن ترقی پسند مصنفین کے پہلے منشور کی بنیاد بنا۔ میرا خیال ہے کہ مصنفہ نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے اور مجلہ "...." (مطبوعہ ۱۹۳۶ء) کا مطالعہ نہیں کیا۔ (روزنامہ "لیڈر" میں شائع ہونے والا بیان بھی منظر عام پر آچکا ہے) یہ منشور اختر حسین رائے پوری کے مجموعۂ مضامین "ادب اور انقلاب" (پہلے ایڈیشن) اور سہ ماہی "گفتگو" بمبئی (مدیر: علی سردار جعفری) کے "ترقی پسند ادب نمبر" اور دیگر کتابوں میں شامل ہے جس "لیگ آف پروگریسو رائٹرز" کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس کا کوئی تنظیمی وجود نہیں تھا۔ اس لئے ترقی پسند ادبی تحریک کا باقاعدہ آغاز ۱۹۳۶ء میں کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاس کے انعقاد اور منشور کی اشاعت کے بعد ہوتا ہے۔ اس کے بعد سارے ہندوستان میں اور ہندوستان کی مختلف زبانوں میں اس کی شاخیں قائم ہوئیں (مصنفہ نے آگے چل کر خود اعتراف کیا ہے کہ انجمن کا باقاعدہ قیام لندن میں ہوا)۔ پروفیسر احمد علی نے خود اعتراف کیا ہے کہ "انگارے" شائع کرتے وقت ہمارے سامنے کوئی متعین شدہ مقاصد نہیں تھے، بجز اس کے کہ ہماری کہانیاں ایک مجموعے کی صورت میں شائع ہو جائیں۔ جب "انگارے" کی اشاعت کے پیچھے کوئی مقصد ہی نہ تھا تو "انگارے" کے افسانے ترقی پسند مصنفین کے پہلے منشور کی بنیاد کس طرح بن سکتے

ہیں؟ واضح رہے کہ سجاد ظہیر اور احمد علی خود "انگارے" کے افسانوں کو ادبی نقطہ نظر سے کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے ہیں۔ "انگارے" میں شامل افسانے فنی اعتبار سے بہت ہی خام اور بچگانہ ہیں۔ اس کی صرف تاریخی اہمیت ہے ادبی یا فنی قدر و قیمت کوئی نہیں۔

محترمہ شبانہ محمود برٹش میوزیم لائبریری سے وابستہ ہیں۔ اس لئے انہیں "انگارے" کا اصل متن پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ بلکہ مصنفہ نے صرف افسانوں کے خلاصے سے کام لیا ہے۔ علاوہ ازیں مصنفہ نے مضمون کو بلاجواز طول دیا ہے اور "انگارے" کے مندرجات سے بحث کرنے اور اس کا تجزیہ کرنے کے بجائے اردو ادب اور اردو افسانے کی تاریخ بیان کی ہے حالانکہ ان کا موضوع "انگارے" تھا۔ مصنفہ کو یہ معلوم ہی نہیں کہ سجاد ظہیر صرف افسانہ نگار، ناول نویس، شاعر اور سیاست داں نہیں، بہت اچھے ناقد بھی تھے اور انہوں نے ترقی پسند اور مارکسی تنقید نگاری میں اہم کردار ادا کیا تھا، ورنہ وہ یہ ہرگز نہ لکھتیں کہ "اس کے علاوہ سجاد ظہیر نے متعدد سیاسی نوعیت کے پمفلٹ بھی لکھے"۔ مصنفہ نے یہ غلط لکھا ہے کہ ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں منعقدہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کی صدارت سجاد ظہیر نے کی۔ اس کی صدارت تو منشی پریم چند نے فرمائی تھی۔

اس شمارے کا دوسرا اہم مضمون (یا لیکچر) ڈاکٹر سعید اختر درانی کا "مذہب اور سائنس" ہے۔ سعید اختر درانی صرف سائنسداں نہیں، اچھے شاعر اور ناقد بھی ہیں اور اقبالیات کے سلسلے میں ان کی تحقیق اعلیٰ پائے اور بنیادی نوعیت کی ہے۔ انہوں نے مذہب اور سائنس کے رشتے اور تضاد اور تصادم کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بہت ہی بصیرت افروز ہیں۔ بہت مدت کے بعد اس موضوع پر اتنا اچھا مضمون پڑھنے کا اتفاق ہوا اور دل خوش ہوا۔

انہوں نے سائنس کی جس انکساری کا ذکر کیا ہے، وہ درست ہے۔ سائنس ہمیشہ نئی تحقیق اور نتائج کی روشنی میں اپنے مفروضے (ہائی پوتھیسس) کو بدلنے کے لئے تیار رہتا ہے، جبکہ مذہب اس کے لئے آمادہ نہیں ہوتا۔ جو لوگ مذہبی عقائد کو سائنس کے ذریعے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان کا جو حشر ہوتا ہے اس کا ڈاکٹر سعید درانی نے خوب صورتی سے ذکر کیا ہے۔ مذہب (تصوف یا مابعد الطبیعیات) دراصل یقین و اعتبار کا معاملہ ہے۔ یہاں دلائل و براہین کے ذریعے خدا یا روح کے وجود کو ثابت کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ بہت سی ایسی حقیقتیں ہیں، جن کا ادراک خارج کے ذریعے ممکن نہیں۔ انسانی شعور و فہم اس کا صرف حسیات کے ذریعے ہی عرفان حاصل کر سکتا ہے۔ اس لئے درمیان میں سائنس کو لانے کی ضرورت نہیں۔ بہت سے اوہام کس طرح مذہب کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ڈاکٹر سعید درانی نے اس کا بھی بہت دلچسپ پیرائے میں ذکر کیا ہے۔ ان کا یہ فقرہ بہت دلچسپ ہے کہ "لاعلمی بعض اوقات فلسفہ یا مابعد الطبیعیات اور مذہب کی ہم نام ہو گئی اور علم اور سمجھ بوجھ سائنس کہلائی"۔ ڈاکٹر درانی اسی کے ساتھ مذہب کی بھی مدافعت کرتے ہیں اور اسے انسان کی غلطی قرار دیتے ہیں کہ وہ اپنی لاعلمی کو مذہب کے سر تھوپ دیتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ علم یا ادراک یا صداقت کو حرف آخر سمجھنا خطرناک یا خام مفروضہ ہے۔ اس لئے کہ سائنس کے اندر ہمیشہ غیر تکمیلیت موجود رہتی ہے۔ انہوں نے سائنس اور مذہب کا تقابل کرتے ہوئے درست فرمایا ہے کہ سائنس کی بنیادی خوبی آزادیٔ فکر و اظہار ہے جبکہ مذہب کے بارے میں ایسا نہیں کہا جا سکتا۔ مذہب میں سب سے پہلے یقین اور اعتبار کا سوال آتا ہے اور اس کے بعد کچھ اور۔

اس مضمون کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ مصنف نے سائنس اور مذہب کے درمیان تصادم کے سوال کو مسترد کر دیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ دونوں حقیقت کی تلاش و جستجو میں ایک دوسرے کے معاون و شریک کار ہیں یعنی دونوں کی اپنی اپنی محدودات ہیں۔ سائنس اور مذہب کی مدد سے انسان، دنیا اور اس کی مادی اشیاء اور اس کائنات میں خود اپنے (یعنی انسان کے)

مقام اور خدا اور انسان کے باہمی تعلقات، مقامِ کبریا کے تعین یا ادراک اور خالق و مخلوق کے باہمی رشتوں کی سمجھ بوجھ حاصل کر سکتا ہے۔

ڈاکٹر درانی نے سائنس کی محدودات کا ذکر کرتے ہوئے تسلیم کیا ہے کہ انسان کا ذہن بڑی محدود قوت ہے۔ اسے اگر ان باتوں کی سمجھ نہیں آسکی کہ "جب ازل میں کچھ نہ تھا تو یہ کائنات بلکہ اس کا اولین ذرہ کہاں سے معرضِ وجود میں آیا ہے یا ذاتِ باری کی سی پُر قوت ہستی ابتدائے آفرینش کے وقت یا اس سے پہلے کیسے موجود تھی؟ تو یہ فہمِ انسانی کا نقص اور اس کے عجز و بے مائگی یا نارسائی کی دلیل ہے۔" ڈاکٹر درانی سائنس اور مذہب کے مابین مفاہمت کرانے کی کوشش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سائنس دانوں کو چاہیئے کہ وہ اپنی کوتاہیوں کو تسلیم کر لیں، لیکن ان کی خواہش ہے کہ علمائے دین بھی تسلیم کر لیں کہ بعض نکاتِ علم، معتقد انسان یعنی مومن اور عاجز انسانوں کے فہم اور ادراک سے بالاتر اور ماورا ہیں۔

ڈاکٹر درانی کا یہ مضمون بلاشبہ ہر ذہین قاری کو انسان، حیات اور کائنات کے بارے میں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ اردو میں کتنے ایسے مضامین شائع ہوتے ہیں جن میں یہ خوبی موجود ہو؟ میں ڈاکٹر درانی سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اردو میں گاہے گاہے ایسے موضوعات پر لکھتے رہیں تاکہ ہم جیسے قارئین ان کے علم سے استفادہ کر سکیں۔

شہزاد منظر (کراچی)

ہزارہ کے شاعر

فنون کے صفحات میں بکھرے ہوئے نشاطِ مطالعہ کے امکانات "صحبتِ مستعجل" سے گرفت میں نہیں آسکتے۔ انہیں پڑھنے کے لئے ذہنی ریاضت اور قلبی لگاؤ کی تفصیل درکار ہے۔ اس جریدۂ مبارک بنیاد کی ہر تصویر خوش سواد، ہر تحریر آباد ہے۔ تحصیلِ مزاج کی مزدوروں کو پورا کرنے کا فن کچھ "فنون" ہی کا حصہ ہے۔

تازہ شمارے میں جلیل حشمی کی غزلیں پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ حشمی کی غزل کی وضع قطع میں دردمندی کی کیفیات اتھکے قرینوں سے تشکیل پاتی نظر آتی ہیں۔ بلاشبہ جلیل حشمی اپنا آہنگ ترتیب دینے میں خاصا بام ادا ہے۔ مانگے ہوئے پروں میں مور بنا پھرنا اس کے مزاجِ شعری کو گوارا نہیں۔ مقبولِ عام کی شاعری مقبولیت کی منزلیں بڑی تیزی سے طے کر رہی ہے۔ اس کے دل میں انگڑائیاں لیتا ہوا جذبہ خوش اطوار لفظی رعایتوں اور علامتی مناسبتوں میں دید کی دلربائیاں پیش کرنے میں کامیاب ہو رہا ہے۔ عاتم نے کمال محنت سے اپنے شعر کو اعتبار کی توانائی بخشی ہے۔ یعنی بقول کسے ایسی خوش عنوانی سے کہنا کہ بات بڑھنے نہ پائے اور مطلب حاصل ہو جائے، اسے نصیب ہے، گواہی "دیئے کی آنکھ" سے لیجئے۔

صوفی عبدالرشید کی نعت بعد زیب و زینت دل میں نقش ہو گئی۔ عقیدتوں کا ایسا "سچا" اظہار صفائے قلب و ضیائے رُشد ہی سے مل سکتا ہے۔ یوں تو "فنون" کی سبھی تحریریں ادبِ عالیہ کی نمائندگی کرتی ہیں۔ جن کا ذکر میں "اختلافات" کے حصے میں بقدرِ مقدور کرتا رہتا ہوں۔ مگر اس صحبت میں سرحد کے شعراء کا بیان زبان پر آگیا۔ صوفی عبدالرشید تو اپنے ہزارہ کے ہیں۔ ان کا نام بطورِ خاص لیتا ہوں۔ ہزارہ کے اور بھی معتبر نام ہیں جن کے مضامین نظم و نثر فنون کی بدولت ذی شان ٹھہرے۔ مثلاً محمد ارشاد سلطان سکون، ارشاد شاکر اعوان، ریاض ساغر، یحییٰ خالد، نوجوانوں میں امتیاز الحق امتیاز، محمد حنیف اور راجہ ریاض الرحمٰن۔

رؤف امیر کی چھ فعلن (بارہ ماترائیں) والی غزل بہر طور درست ہے۔ لَے کے حساب سے بعض مصرعے بارہ ماترا کی

میں اور بعض گیارہ ماتراؤں میں ہیں بارہ ماتراؤں کے ہمراہ، گیارہ ماتراؤں کا التزام روایت میں پایا جاتا ہے۔ اس موضوع پر "فنون" کے بہرۂ اختلافات میں کاٹنے کی بحثیں ہوتی رہی ہیں۔ جن میں یہ ناچیز بھی جو پیچ لڑاتا رہا ہے۔

"اختلافات" میں نیلوفر اقبال کے افسانوں کے بہت چرچے ہوتے ہیں۔ چشم بددور یہ افسانے غور و فکر کے تقاضے رکھتے ہیں۔ افسانہ "مسلمان" شدتِ احساس کا نمونہ ہے۔ جانے کیا بات ہے۔ اس افسانے کا آخری جملہ "تم مسلمان تو نہیں ہو گئے" جان کو آگیا۔ شاید میری مسلمانی اسے برداشت نہ کر سکی۔

اب کے کتابت کی خامیاں دیکھنے میں آئی ہیں۔ میرے مصرع

اٹھتا طوفاں اس پہ سمندر انجانا

میں "پہ" "پر" ہو گیا ہے۔

بیمار رہنے لگا ہوں اس لئے "اختلافات" کے ذیل میں پوری بات نہیں کر پاتا۔ بہت سے دوستوں کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ آخر پر طاہر اسلم گورا اور ظفر منصور کا شکریہ ادا کر دوں، انہوں نے مجھے اچھے لفظوں سے یاد کیا۔

آصف ثاقب (ایبٹ آباد)

نیا شمارہ

'فنون' شمارہ جون، جولائی ۱۹۹۸ء پیشِ نظر ہے۔ بات شروع کرتے ہیں 'حرفِ اول' سے جس کا حرف حرف خطرے کی گھنٹی کی مانند ادیبوں، ناقدوں اور ادب شناسوں کو خبردار کر رہا ہے۔ ہر کسی کو اپنا فرض ادا کرنا ہے ورنہ بصورت دیگر معاشرے کی مائل بہ زوال قدریں، ادبی اقدار کو بھی ان پستیوں میں دھکیل دیں گی جہاں نہ تو ادب، ادب رہتا ہے اور نہ ادیب' ادیب۔ انشا اور مصحفی، غالب کے طرف دار اور سخن فہم، داغ اور امیر، نوح ناروی اور سائل دہلوی کے مابین ہونے والی ادبی جھڑپوں، دشنام طرازیوں اور نوک جھونک کی روایت کے پس منظر میں 'حرفِ اول' کو دیکھا جائے تب بھی موجودہ صورتحال کی سنگینی میں کوئی قابلِ ذکر کمی واقع نہیں ہوتی۔ علمی و ادبی اختلافات کو ذاتی اختلافات کی صورت دینا نہ صرف غلط بلکہ فعل مکروہ ہے لیکن ہمارے موجودہ زوال پذیر معاشرے میں قابلِ فہم بھی ہے۔ بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ ذاتی اختلافات ادبی اختلافات کا بہروپ دھار لیں۔ اس سلسلے میں قرۃ العین حیدر کی مثال لیجئے۔ جن دنوں اُن کا ناول "آگ کا دریا" شائع ہوا تھا۔ ان ہی دنوں ایک سرکاری محکمے میں درجۂ اول کی ایک اسامی خالی ہو رہی تھی جس کے دو ہی اُمیدوار تھے۔ ایک قرۃ العین اور دوسرے اس وقت کے ایک معروف شاعر اور نظم نگار۔ قرین قیاس یہی تھا کہ متذکرہ اسامی قرۃ العین حیدر کو ہی ملتی لیکن دوسرے امیدوار نے یہ حکمت عملی اختیار کی کہ "آگ کا دریا" کے خلاف اپنے حلقۂ بگوش ادیبوں اور صحافیوں کے ذریعے ایک مہم چلائی کہ مصنفہ نے نظریۂ پاکستان کی مخالفت کی ہے اور وہ غیر محبِ وطن ہے۔ حکمتِ عملی کامیاب ثابت ہوئی۔ قرۃ العین حیدر ہندوستان چلی گئیں اور مطلوبہ اسامی پر دوسرے امیدوار فائز ہو گئے۔ یہ واقعہ بلکہ سانحہ بہت پرانا ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ صورتِ حال بہتر ہونے کی بجائے بد سے بدتر ہوتی گئی اور بقیجہ 'فنون' کا زیرِ نظر 'حرفِ اول'، سوال باقی رہ جاتا ہے کہ اس ضمن میں کیا کیا جائے؟ اس سوال کے جواب میں راقم الحروف کی تجویز یہ ہے کہ کیچڑ اچھالنے میں جو تو پیں استعمال کی جا رہی ہیں، ان کے مالکوں کو یا ایسے توپ خانے کے عمائدین اور توپچیوں کو کسی ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے یا ان کی خدمت میں درخواست گزار ان کر صورتحال کی بہتری کی جانب ان کی ہمدردانہ توجہ مبذول کی جائے۔ یہ عین ممکن ہے کہ کچھ وقت کے لئے کیچڑ قدرے زیادہ اچھلے لیکن جی کی بھڑاس نکل جانے کے بعد حالات خاصے بہتر ہو جائیں۔ راقم الحروف بطور مثال اپنا ذاتی تجربہ پیش کرے تو شاید نامناسب

نہ خیال کیا جائے۔ راقم الحروف کا شعری مجموعہ "موجِ صد رنگ" ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔ مختلف جرائد اور اخبارات میں حوصلہ افزا تبصرے شائع ہوئے۔ البتہ "اخبارِ خواتین" میں جو تبصرہ بڑے اہتمام سے شائع ہوا اس کا عنوان تھا (جلی حروف میں) "ایسی کتابوں کی اشاعت خوش ذوق قارئین کے ساتھ زیادتی ہے"۔ اردو زبان و ادب میں ایسی کوئی مثال موجود نہ تھی البتہ قریباً اس سے ملتا جلتا اور اسی عنوان کا حامل تبصرہ انگریزی زبان کے بلیک ووڈ میگزین میں چھپا تھا جس میں انگریزی زبان کے عظیم رومانی شاعر کیٹس کے اولین شعری مجموعے پر کیچڑ اچھالی گئی تھی۔ دونوں تبصروں میں ایک قدرِ مشترک یہ بھی تھی کہ تنقید کا معیار "تذکروں کی نکتہ چینی" جیسا اور تبصرہ نگار کی بددیانتی اور بہلووں سے بھی ظاہر ہوتی تھی۔ راقم الحروف نے مدیر کو ایک مختصر سا خط لکھا جس میں ان سے درخواست کی کہ "اخبارِ خواتین" کی اصل قاری خواتین ہیں اس لیے براہِ کرم ان کی آرا حاصل کر کے پرچے میں شائع کریں کیونکہ تبصرہ نگار "الف۔ نون" شائد کوئی مرد ہیں۔ مزید یہ کہ اس جریدے کے پسندیدہ اشعار کے صفحے پر "موجِ صد رنگ" کے اشعار کافی تعداد میں شائع ہو رہے ہیں۔ مدیرِ موصوف نے خط کا جواب نہیں دیا۔ البتہ "الف۔ نون" صاحب کو ان کے اس منصب سے ہٹا دیا۔ بعد میں یہ اشارے ملے کہ مذکورہ تبصرے کے عقب میں ایک بوتل بدیسی شراب اور کیفے رومانسہ میں کیبرے اور عشائیہ کارفرما رہے تھے جس کا اہتمام معروف شاعر میم۔ بے نے شین۔ عین کی ایما پر کیا تھا۔ اس سلسلے میں تین اور قدرے کم معروف شعراء کے نام بھی آئے جنھوں نے الف نون کو سکھر کے مشاعرے میں مدعو کر کے یہ کھچڑی پکائی ان کے نام بے۔ میم۔ جیم اور میم الف سمجھ لیجیے۔ "موجِ صد رنگ" والے واقعے کا ذکر اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ راقم الحروف کے خیال میں ایسی باتیں ریکارڈ پر لانا محض درگزر کرنے سے بہتر ہے۔ خاص طور پر اس سبب سے بھی کہ واقعے میں ملوث افراد یا فرد نے تاحال معذرت نہیں کی۔

آج کے دور میں حبیب جالب کی ہیرو ورشپ کے بہانے اور نام نہاد "مزاحمتی ادب" کا نعرہ بلند کر کے یار لوگوں نے شعر و ادب کے چند معتبر ناموں کے خلاف اپنے جلے دلوں کے پھپھولے پھوڑنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔

آئیے مکاتبِ فکر کے مسئلے پر بھی بات کر لیتے ہیں۔ پاکستان سے قبل دہلی، لکھنؤ اور پنجاب کے مکاتبِ فکر کا چرچا تھا۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد آہستہ آہستہ کراچی کا مکتبۂ فکر بساطِ ادب پر نمودار ہوا اور کافی عرصے بعد سرگودھا کا مکتبۂ فکر سامنے آیا۔ ان دنوں پاکستان کے ادبی افق پر لاہور، سرگودہا اور کراچی کے مکتبہ ہائے فکر نمایاں ہیں۔ یوں دیکھئے تو یہ تینوں مکاتب اپنی شناخت کے لئے ابھی تک کوئی مثبت نشانِ امتیاز پیش کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ البتہ لاہور اور سرگودہا باہم دیگر دست و گریباں ضرور نظر آتے ہیں۔ یہ صورتحال ایک مدت سے اصلاح کی طلب گار ہے اور اب وقت آگیا ہے کہ دونوں مکتبہ ہائے فکر کے ادیبوں کو باہم شیر و شکر کیا جائے۔ اس سلسلے میں نوجوان طبقے کو آگے بڑھ کر دونوں جانب کے اکابرینِ ادب کو انتہائی ادب و احترام کے ساتھ کشاں کشاں باہم دیگر معانقے کی حالت میں پہنچا کر دم لینا چاہیئے۔ چلتے چلتے اس حقیقت کی جانب اشارہ کرنا ضروری ہے کہ "پیراں نمی پرند مریداں می پرانند" کے مصداق اکابرینِ ادب باہم دیگر کم ہی دست و گریباں ہوتے ہیں البتہ ان کے مریدان کو اس کارِ خیر میں مصروف دیکھتے ہیں۔

اب آئیے زیرِ نظر شمارے میں شامل مضامینِ نظم و نثر کی جانب۔ حمد کے باب میں مشکور حسین یاد اور طیب منیر کی حمدیات انفرادیت کی حامل ہیں۔ پہلی حمد میں ردیف 'لامحدود' اور قافیوں کے ساتھ اس کا ورود بہت لائقِ ستائش ہے۔ دوسری حمد 'پیاری' دلکش، ملکی اور معنی آفریں نظم ہے۔ اقبال کوثر کی نعت میں کوئی مدھم سی چیز دل کو کھینچتی ہے۔ فنون میں 'نوحے' کی صفت نئے نئے پیرایۂ اظہار اختیار کرتی نظر آتی ہے۔ زیرِ نظر شمارے میں توقیر چغتائی کا نوحہ "شبیر افضل جعفری کے لئے" پڑھنے کی چیز ہے۔ دل سے کہا ہے اور دل کی زبان میں کہا ہے۔ خیال، جذبہ، موضوع اور فارم، راقم الحروف کے عقیدے کے بموجب تخلیق کے نہاں خانے سے ایک غیر اختیاری عمل کے نتیجے میں

ایک ساتھ وارد ہوئے ہیں۔ اس کا نام شاعری ہے باقی خرافات۔

روٹھا رانجھ
تخت ہزارے لوٹ گیا

نوحہ پڑھنے سے نثیر افضل جعفری سامنے آگئے۔ وہ جو زمین سے اُگے تھے (کیا واقعی نثیر افضل جعفری نے اپنی ماں کی کوکھ سے جنم لیا تھا؟)

شاہین مفتی نے "فیض اور ہمارے فکری مغالطے" میں موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور بقول خود "گول مول اور الجھا ہوا مضمون" قارئین کی نذر کیا ہے۔ ان کے مضمون سے یہ ضرور انکشاف ہوتا ہے کہ ان کا معاشرتی مطالعہ اور مشاہدۂ حیات کافی وسیع اور عمیق ہے۔ ان کے قلم کے تیور تیکھے اور جرأت مندانہ ہیں۔ کاوش عباسی نے "مقبول شاعری اور نامقبول شاعری" کے تحت جو تحریر کیا ہے وہ شاہین مفتی کی تحریر سے زیادہ الجھا ہوا ہے۔ مضمون میں فراز، افتخار عارف اور ساحر لدھیانوی کا دفاع کرنے میں اتنی گرمجوشی دکھائی ہے کہ فیض کی شاعری کے بارے میں حکم لگا دیا "ساحر لدھیانوی فنی اور فکری لحاظ سے فیض سے یقیناً کم سہی لیکن کچھ مخصوص معنوں میں فیض کے لہجے یعنی انداز کی ایک سی تکرار اور ایک سی مٹھاس ساحر کے پسماندہ اور مفلس و مقہور زندگی جیسے "تلخ و ترش" مگر زندہ اور ہر صورت حال کے سینے میں دل کی طرح دھڑکتے ہوئے انداز کے مقابلے میں یکساں اور بے اثر حتیٰ کہ بور کر دینے والی لگتی ہے۔" ایک اور مقام پر وہ لکھتے ہیں "لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آنے والا کوئی بھی عہد اگر اسے عظیم اور عہد ساز ادب تخلیق کرنا ہے۔ وہ فیض کی کم کلامی اور سست طبعی کا بارِ گراں زیادہ دیر تک نہیں اٹھا سکتا۔" مضمون نگار نے فیض کے اسلوب شعر پر عجیب عجیب اعتراضات کئے ہیں مثلاً ان کے ہاں محنت اور مرکھپائی نہیں ملتی۔ وہ سُست ہیں۔ زورِ بیان کی کمی ہے۔ آسودہ حال طبقے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ان کے لہجے میں سرمستی پائی جاتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اُن کے ان اعتراضات پر معمولی غور کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ موصوف فیض اور ان کی شاعری دونوں کو سمجھنے میں یکسر ناکام ہو گئے ہیں۔ زیر نظر شمارے ہی میں صفحہ ۲۹ سے۔ انتظار حسین کے مضمون "قرب و دوری کا کرشمہ" سے ایک اقتباس شائع ہوا ہے۔ راقم الحروف کے خیال میں مضمون نگار کو اور کچھ نہ ہو سکے تو محض اس اقتباس کو بغور پڑھنا چاہیئے۔ انتظار حسین کے فقرے "فیض آہستہ بولے اور بلیغ بولے" میں وہ سب کچھ ہے جس کو سمجھے بغیر کم از کم مضمون نگار کے لیے فیض کو سمجھنا محال ہے۔ اس کے علاوہ مضمون نگار نے "مقبولیت" کو جتنی زیادہ وقعت دی ہے وہ بھی اتنی وقیع نہیں ہے۔ ایم اسلم اپنے عہد کے ناول نگاروں میں سب سے زیادہ مقبول تھے لیکن کیا وہ حقیقت میں بھی ناول نگار تھے؟ شعر و ادب کی تاریخ میں کتنے ہی ایسے ادیب و شاعر ہیں جو ایک یا ایک سے زائد دہائیوں میں۔ بے حد مقبول رہے لیکن آج کے زمانے میں ان کا نام لینے والے شاذ ہی ملیں گے۔ اس کے برعکس بعض شاعر اور ادیب اپنے عصر میں اور اس کے فوراً بعد طویل عرصے تک گمنامی کے پردے میں روپوش رہنے کے بعد ادب کے آسمان پر سورج، چاند اور ستارے بن کر چمکے۔ امریکی ناول نگار "مل ویلے" کو لیجئے جس کی کتاب "موبی ڈک" طویل عرصے تک گمنامی میں رہنے کے بعد اور مصنف کی وفات کے قریباً پانچ دہائیوں کے بعد عظیم ترین امریکی ناول کے طور پر سندِ افتخار سے بہرہ ور ہوئی۔ مقبولیت کو ادبی تخلیقات پرکھنے کی کسوٹی سمجھنا اور سمجھانا ایسی غلطی ہے کہ جس کا مرتکب کسی بھی نام سے نوازا جا سکتا ہے ماسوائے نقاد کے۔ جہاں تک احمد فراز کا تعلق ہے، راقم الحروف کا خیال ہے مجموعی طور پر فراز اکتسابی رنگ کا شاعر ہے اور اکتسابی رنگ کا کوئی بھی شاعر صفِ اوّل میں جگہ نہیں پا سکا۔ فراز کے ساتھ کیا ہونے والا ہے یہ آنے والا وقت ہی بتلائے گا۔ البتہ فراز کے طرفداروں کو پہلے سخن فہمی سے بہرہ ور ہونا چاہیئے تاکہ وہ طرفداری کا حق ادا کر سکیں۔ راقم الحروف

ساقی فاروقی کے بارے میں خاموش ہے لیکن چاہتا ہے کہ اس کی خاموشی کو طرفداری پر محمول نہ کیا جائے۔

حصّہ نظم کی ابتداء آپ نے عزیز حامد مدنی سے کی ہے لیکن ان کی نظم گواہ پڑھ کر یوں لگا جیسے ن۔م۔راشد نے کوئی پابند نظم کہی ہو۔ احمد ظفر، جلیل عالی، مقبول عامر، شاہین مفتی، منصورہ احمد، جاوید انور، خاور اعجاز، اقبال حیدر، فیصل محفوظ اور ابوذر کی منظومات قابلِ ذکر ہی نہیں بلکہ لائق تعریف ہیں۔ مدیرِ فنون کی نظم "میرا اپنا" کے بارے میں یہ کہنا ہے کہ نہ جانے کتنے لوگوں کے وہ خود "میرے اپنے ہوں گے"۔ شاید انہیں خود معلوم نہ ہو۔

افسانوں میں منیر الدین احمد کا افسانہ "سنوور کا سفر" مغربی تہذیب کا المیہ ہے جبکہ عطیہ سید کا افسانہ "پریزاد" امریکی تہذیب کا المیہ ہے۔ اس خاتون افسانہ نگار کو فنِ افسانہ نگاری کے قدیم و جدید اسالیب سے کامل آگاہی ہے اور اسی سبب سے موضوع کی بنیادی یکسانیت کے باوصف زندگی کا تمام تہہ در تہہ تنوع اس کی تحریروں میں موجود رہتا ہے۔ اُم عمارہ کا افسانہ "کیا کیا رنگ محبت کے ہیں" مصطفیٰ کریم کا "دو شاخیں لچکتی ہوئی" محمد سعید شیخ کا افسانہ "رشتے درد کے" یوسف چوہدری کا افسانہ "دو کٹی ہوئی انگلیاں" ایوب اختر کا افسانہ "پیلی سرسوں" ایسے افسانے ہیں جو کسی بھی اچھے انتخاب میں آج کے نمائندہ افسانوں کے تحت شریک کئے جا سکتے ہیں۔

غزلوں کے حصّے میں ضیا جالندھری، احمد ظفر، محبّ عارفی، محشر بدایونی، جلیل حشمی، مظفر حنفی، شہزاد احمد، صمد انصاری، رشید قیصرانی، خلیل رامپوری، صوفی عبدالرشید، خاقان خاور، صبیحہ خاتون صبا، شفیق سلیمی، تنویر سپرا، ڈاکٹر زبیر فاروق، صابر ظفر، ستار سید، سید گلزار بخاری۔ مخلص وجدانی۔ مقبول عامر۔ اسلم فیضی۔ عابد ودود۔ صفدر صدیق رضی اور ایوب پیام کی غزلوں میں جدید و قدیم غزل کے قریب قریب تمام رنگ اور ان رنگوں کی روشن اور مدھم پرچھائیاں کچھ اس طرح گڈ مڈ ہوئی ہیں کہ زیر نظر شمارہ غزلیہ شاعری کا نمائندہ کہلانے کا مستحق ہو گیا ہے۔ "انحرافات" کے تحت یہ تحریر کچھ طولانی سی ہو گئی ہے۔ لیکن چلتے چلتے چند اشعار نذرِ قارئین کرتا چلوں۔ ظاہر ہے کہ شعروں کا انتخاب خاصا ذاتی سا معاملہ رہتا ہے۔ ؎

جلتے ہو پر قدم اٹھنے سے پہلے دھیان رہے	عمر کا فاصلہ ہو سکتا ہے پیر اور پیر کے بیچ	(ضیاء جالندھری)
یہ جانتا کہ نہیں ہوں، یہ مانتا بھی کہ ہوں	کسی کو میرے سوا یہ ہنر نہ آئے گا	(محبّ عارفی)
تعزیے ڈالنا اور آگ لگاتے رہنا	اپنے گھر کی بھی مگر خیر مناتے رہنا	(محشر بدایونی)
پھول، پتے، پھل سبھی مٹی ہوئے	پیڑ پر احسان برساتوں کے ہیں	(مظفر حنفی)
ہم کو تو اس جہان نے تسخیر کر لیا	روزِ ازل سے جس کو مسخر کہا گیا	(صمد انصاری)
میرے جوتے پہن لئے تم نے	چال بھی میری چل سکو گے کیا	(خاقان خاور)
جو وقتِ رخصت قرارِ جاں کی دعا سے ہم کو نوازتے ہو	قرارِ جاں اس دعا پہ ہم بھی تمہیں دعائے قرار دینگے	(صبیحہ خاتون صبا)
جمہوریت پسند تھے جب تک نحیف تھے	طاقت ملی تو شہر کے سلطان ہو گئے	(تنویر سپرا)

ایک بات اور۔ اس بزم سے اگر کسی کی مکمل غزل کا انتخاب کرنا پڑے تو میں صبیحہ خاتون صبا کی غزل پر انگلی رکھوں گا۔

عبداللہ جاوید (کراچی)

اس بار بھی فنون پڑھنے کا آغاز افسانوں سے کیا۔ سب سے پہلے اشفاق احمد کا افسانہ "خود بدولت" صرف اس لئے نہیں پڑھا کہ ترتیب کے لحاظ سے وہ پہلا افسانہ تھا بلکہ اس لئے پڑھا کہ وہ جناب اشفاق احمد کا تھا۔ یہ بلاشبہ قارئین کی خوش قسمتی ہے کہ اشفاق احمد صاحب نے بہت عرصے بعد اوپر تلے کچھ افسانے لکھے ہیں۔ خاص طور پر ان کے ایک افسانے "مسرور مرثیہ" نے اپنے عنوان جیسے

گہرے تاثرات چھوڑتے ہیں۔ مگر فنون میں شائع ہونے والا افسانہ "خود بدولت" کسی قسم کے تاثرات نہ چھوڑ سکا۔ اپنے خاص اسلوب، موضوع اور فلسفے کے باوجود اگر یہ افسانہ متاثر نہیں کر سکا تو اس کا ایک سبب یہ ہے کہ فلسفے کا جذباتی آہنگ کہانی پر حاوی ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں کہانی کہانی بھی نہیں رہتی اور ٹھیک سے "لیکچر" بھی نہیں بن پاتی۔ کہیں کہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے کردار سازی میں تیسرے درجے کے نام نہاد تاریخی ناولوں سے کردار مستعار لئے ہیں جیسے بابے گاموں کا کردار ہے۔ میں بابے گاموں کے کردار سے اختلاف "بابے" کی وجہ سے نہیں کر رہا بلکہ اس لیے کہ اس کردار کو خواہ مخواہ کی عقیدت کے جذباتی خول میں بند کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جب اشفاق صاحب اپنے فلسفے کے بابوں کو کہانی کے رچاؤ کے ساتھ پیش کرتے ہیں تو وہ بہت خوب طریقے سے آتے ہیں۔ مگر اس افسانے کو تو باقاعدہ فارمولے کے تحت لکھا گیا ہے۔ زندگی کا رچاؤ غائب ہے۔ اب بھی اگر جناب اشفاق صاحب کہانی کا آخری ڈیڑھ صفحہ زندگی کی حقیقی منظر کشی کو پیش کرتے ہوئے دوبارہ لکھیں تو کہانی خوب بن سکتی ہے۔ وہ بےشک تصوف کی اخلاقیات کو ہی کلائمکس میں پینٹ کریں مگر سلیقے کے ساتھ۔

اشفاق احمد کے افسانے کے بعد نیلوفر اقبال صاحبہ کا افسانہ دوسرے نمبر پر اس لیے پڑھا کہ وہ گزشتہ کئی شماروں سے اپنے نہایت خوبصورت افسانوں کی بدولت متاثر کرتی چلی آ رہی ہیں۔ اُن کا یہ افسانہ "مہمان" پڑھنا شروع کیا تو دوسرے صفحے پر پہنچتے ہی گمان ہوا کہ "کہیں اس کی کہانی وہی نہ ہو" اور جُوں جُوں کہانی پڑھتا گیا گمان یقین میں بدلنے لگا کہ اس کی کہانی ایک پرانی روایت پر مبنی ہے۔ لیکن کہانی کے اختتام تک پہنچتے ہوئے یہ تجسس بھی رتی برابر نہ رہا کہ کیا واقعی یہ وہی کہانی ہے۔ اگرچہ ہر تخلیق کار کی ہر تخلیق اہم نہیں ہوتی، اُس کی چیزیں کمزور بھی ہو سکتی ہیں۔ مگر نیلوفر اقبال جیسی باکمال افسانہ نگار خاتون کی کوئی چیز اتنی کمزور بھی نہیں ہونی چاہیے۔ جتنی کمزور ان کی یہ تحریر ہے۔ ان کا خوبصورت ٹریٹ منٹ بھی کہانی میں کہیں نظر نہیں آتا جو اُن کی پہچان بنتا جا رہا تھا۔

"پربزاد" کے عنوان سے مجھے عطیہ سید صاحبہ کا دوسرا افسانہ دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ چونکہ اس سے پہلے اُن کے افسانے "شہرِ ہول" نے خاصا متاثر کیا تھا۔ متاثر کرنے کی اس شدت نے ان کا تازہ افسانہ تیسرے نمبر پر پڑھنے کو مجبور کیا۔ یہ افسانہ اپنے ٹریٹ منٹ، کہانی، کردار نگاری، منظر نگاری اور فلسفے کے لحاظ سے تو کمال ہے ہی جبکہ اس کہانی کے بیک گراؤنڈ ماحول نے بھی اسے انفرادیت بخش دی ہے۔ دنیا کے سب سے بڑے ترقی یافتہ خطے کے رہن سہن کو عصری شعور کے ساتھ سمجھنا اور اُسے فن میں برتنا مشکل بھی ہے اور ضروری بھی۔ ضروری اس لیے کہ اس طرح کسی بھی زبان کے ادب میں لینڈ سکیپ کا بڑا گرانقدر اضافہ ہوتا ہے جو انسانوں کو انسانوں کے مزید قریب کرتا ہے۔

چوتھے نمبر پر یوسف چوہدری کا افسانہ "دو کٹی انگلیاں" اس لیے پڑھا کہ یوسف چوہدری بھی کچھ عرصہ سے خوبصورت افسانے پڑھنے کو دے رہے ہیں۔ انہوں نے ایک اور خوبصورت افسانہ اپنے قارئین کو دیا۔ اُن کے اس افسانے کو پڑھتے ہوئے بے اختیار خیال آیا کہ جیسے کچھ افسانہ نگار ایک دم سے اچھوتا موضوع دیتے ہیں اور کچھ اچھوتا موضوع نکال لیتے ہیں جبکہ یوسف چوہدری نے بھی کمال ہنرمندی اور اپنی تخلیقی توانائیوں سے اس افسانے میں ایک اچھوتا موضوع نکالا ہے۔

یوسف چوہدری کے افسانے کے بعد نیلم احمد بشیر صاحبہ کے افسانے "میں اور میرا ساتھی" کو پڑھنے کا فیصلہ اس لیے کیا کہ ان کے بھی چند ایک اچھے افسانے اس سے پیشتر نظر سے گذرے تھے۔ جن میں "ٹرن آن" کے عنوان سے ایک خوبصورت افسانہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ "میں اور میرا ساتھی" میں نیلم احمد بشیر صاحبہ نے عورت (خصوصاً ہماری مشرقی

عورت بلکہ مشرقی عورت کہنے کی بجائے مشرق کی عورت کہنا زیادہ مناسب ہے۔ چونکہ اس کردار کی عورت روایتی "مشرقی" نہیں لیکن وہ "مشرق کی فرد" ہے اسے سائیکی سٹرکچر کی اپنے حالات کے بناؤ پر جو بنتگ کی ہے وہ خوب ہے اور اسے ایک بہت اچھا افسانہ بنا دیا ہے۔

محترمہ ام عمارہ صاحبہ کے افسانہ "کیا کیا رنگ محبت کے ہیں" نے بڑا متاثر کیا۔ افسانے کے موضوع اور تکنیک میں اتنا چولی دامن کا ساتھ تھا جتنا ایک آئیڈیل لیول پر ہونا چاہئے۔ یہ افسانہ کلاسیکل اور ماڈرن ڈکشنز کا بھی حسین سنگم ہے۔

نگہت مرزا کے افسانے کی کہانی کے تاثر کا اپنے عنوان "خبر ہونے تک" سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ یہ ان افسانوں میں سے تھا جنکے موضوع کا اپنے عنوان کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے (چونکہ ایسے افسانے بھی ہوتے ہیں جنکا اپنے عنوانات کے ساتھ کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا یا پھر سرے سے ہوتا ہی نہیں) اس کے علاوہ بھی یہ افسانہ اپنے موضوع کے اعتبار سے بڑا اچھوتا اور بولڈ تھا۔ افسانہ نگار نے کردار نگاری بھی خوب کی ہے اور انسانی رویوں کو بھی ریلیزم کے جاندار فلسفے کے ساتھ پیش کیا ہے۔

منیر الدین احمد صاحب کا افسانہ بھی غیر ملکی لینڈ سکیپ میں لکھا گیا ایک خوبصورت افسانہ ہے۔ افسانے میں سو فیصدی غیر متوقع ڈرامائی اختتام کی جو تکنیک استعمال کی گئی ہے وہ یورپین فکشن میں زیادہ استعمال ہوتی ہے۔ منیر الدین احمد صاحب نے اس تکنیک کو اپنے افسانے "منوور کا سفر" میں بہت خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔ وہ اس طرح کہ یہ تکنیک صرف برائے تجربہ ہی نہیں برتی گئی بلکہ یہ افسانے کی رگ رگ کے ساتھ JUSTIFIED ہے۔ افسانے کی بنت بھی خوب ہے۔

بلقیس ظفر صاحبہ کے افسانے "دل دریا" نے متاثر نہیں کیا۔ اس کا بنیادی مسئلہ وہی ہے کہ چند ایک کرداروں کو پیش کرتے وقت جذباتی تعصب نے حقیقت نگاری کی تصویر کو دھندلا دیا ہے۔

ضیاء بٹ بھی ان لکھاریوں میں سے ہیں جن کے قاری انہیں پرچوں میں ترجیحاً پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ مجھے خوش قسمتی سے اُن کے افسانے تواتر کے ساتھ پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ جس کی بدولت مجھے اُن کے فنی لہجوں کا بھی بھرپور تعارف ہے۔ سو میں اب کبھی کبھار فنون میں ان کا افسانہ دوسرے افسانہ نگاروں کو پڑھنے کے بعد بھی پڑھ لیتا ہوں۔ کیونکہ جن چند دوسرے افسانہ نگاروں کے فنی لہجوں سے میں بھرپور متعارف نہیں ہوتا اُن سے بھرپور متعارف ہونے کے خیال سے انہیں پہلے پڑھ لیتا ہوں۔ اس بار فنون میں شامل ضیاء بٹ کے افسانے "دانش ور" کا اپنے عنوان اور افسانے کے آخری جملے میں "جاگتے رہو" کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے۔ دانشور کا حقیقت ہر حال میں جاگتے رہنا ہی بہت ضروری ہے اور اُسے ایک طرف سے چوکیدار کا کردار بھی ادا کرنا ہوتا ہے۔ ضیاء بٹ کے اس افسانے میں بھی اُن کے موضوعات کے لحاظ سے متنوع مزاج کا مزید اندازہ ہوتا ہے۔ یہ افسانہ اُن کے خوبصورت افسانوں کی ورائٹی میں ایک اور اضافہ ہے۔

ضیاء بٹ کی طرح محمد سعید شیخ کی بھی افسانوی روشوں کا بغور مطالعہ کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اُن کے اس مطالعے کا اتفاق اُن کی کتب "تلافی" اور "تسخیر" کی وساطت سے ہوا۔ اسی کی روشنی میں ان کا افسانہ "درد کے رشتے" تازہ فنون میں دیکھا۔ گو کہ یہ افسانہ بھی اُن افسانوں میں سے تھا جنکے اختتام کا اپنے عنوان کے ساتھ گہرا ربط ہوتا ہے اس کے باوجود ایسے افسانے پڑھ کر اس طرح کے جملے ذہن میں آتے ہیں کہ "ایک آنچ کی کسر رہ گئی ہے"۔ اگر فقط ایک آنچ کی کسر نہ رہ گئی ہوتی تو یقیناً یہ ایک اچھا افسانہ ہو سکتا تھا۔

مصطفیٰ کریم کا افسانہ " دو شاخیں لچکتی ہوئی " بھی مکمل فارن لینڈسکیپ میں لکھا گیا ہے۔ دو سہیلیوں کا پرانے دیس (اگرچہ جوان کا بھی دیس ہو چکا ہے) میں ایک دوسرے کو ہر طرح سے شیئر کرنے کا احساس ہے اور یہ احساس ان دونوں سہیلیوں میں شاید اس لئے بھی ایک جیسا ہے کہ دونوں کے پرابلمز ایک سے ہیں۔ یہ یوں ہی ہے کہ لچکتی ہوئی دونوں شاخیں ایک دوسرے کو چھو لیتی ہیں۔ مصطفیٰ کریم کا یہ اچھا افسانہ ہے۔ ایوب اختر کے افسانے " پیلی سرسوں " نے متاثر نہ کیا۔ نہ کوئی خاص سبق، نہ کوئی تہہ دار ٹریٹ منٹ، نہ کوئی اچھوتا خیال۔ البتہ ایوب اختر صاحب سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ آئندہ وہ مزید محنت کریں گے۔

روبینہ راجہ صاحبہ کا افسانہ " ناٹے پتھر " مونولاگ کی تکنیک میں لکھا گیا ہے۔ اگرچہ یہ تکنیک ابھی اتنی مانوس نہیں ہوئی بہرحال روبینہ راجہ نے اس تکنیک میں شعریت داخل کر کے اسے نثری نظم سا بنا دیا ہے۔ اگر نثری نظم کوئی چیز ہوتی ہے تو۔ خیر اگر نثری نظم کوئی چیز نہیں بھی ہوتی تو بھی یہ نثر پارہ ضرور ہے۔ اور پھر ایسا نثر پارہ جس میں مونولاگ کی تکنیک میں کہانی بھی ہے۔ نقادوں کا یہ بھی خیال ہے کہ نثر الگ لکھنی چاہئیے اور نظم الگ۔ بہرکیف شعریت سے رچاؤ والی اس نثر میں کہانی کا یہ ایک زاویہ بھی خوب لگا کہ انسان خود کلامی اور SELF ANALYSIS کی مدد سے اس مقام پر بھی پہنچتا ہے جب بے کسی والے غصے سے اُس کی فزیکل ہسٹری والی گاڑی کھول رہی ہو تو بے بسی والی بارش تیز ہو جاتی ہے۔ اس بارش کی مدد سے گاڑی پھر اصل راستے یعنی طے شدہ لائف پیٹرن کی طرف مڑ جاتی ہے۔

طاہر اسلم گورا (لاہور)

فنون کا موجودہ شمارہ نمبر ۳۰ پیش نظر ہے۔ سرِدست جو چیزیں نظر سے گزریں اُن پر اظہارِ خیال کی جسارت کرتا ہوں۔ ساری چیزیں ابھی نہیں پڑھیں۔ کیونکہ بقول عدمؔ:

ڈوب کر پڑھ اس بدن کی ہر لکیر
اے عدمؔ اوراق گردانی نہ کر

میں بھی "فنون" کی ایک ایک لکیر چسکے لے لے کر پڑھا کرتا ہوں۔ ویسے بھی کون سا یہ روز روز پڑھنے کو ملتا ہے۔ پڑھتے وقت یہی خواہش ہوتی ہے کہ جلد جلد ختم نہ ہو۔

محمد ارشاد کی تحریریں پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کس قدر آپ کو پڑھنے، سوچنے اور اپنی سوچوں کو خوبصورتی سے دوسروں تک پہنچانے کی صلاحیت بخشی ہے۔ ہم جیسے کم فہم لوگوں کے لئے آپ کی شخصیت نعمتِ خداوندی سے کم نہیں۔ سوچتا ہوں اگر یہ شخص قدرے تسلسل سے کسی بڑے پراجیکٹ پر کام کرنا شروع کر دے تو کتنا ہی اچھا ہو۔ اگرچہ تنقید و تبصرے کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

شاعری میں آصف ثاقب اور یوسف حسن کا مقام ہے۔ آصف ثاقب خوبصورت غزل کہہ رہے ہیں۔ فن پر آپ کی گرفت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ انہیں کسی بھی بحر کے مخصوص آہنگ اور مزاج میں مصرعہ کہنے کا ملکہ حاصل ہے اور شعر کی مالا میں لفظوں کے پرونے کا قرینہ آصف ثاقب کا اپنا ہے جس پر اور کسی کو اختیار نہیں۔ لہٰذا سطحی ذوقِ سلیم پر کچھ مضمون کی گرانی قدرتی امر ہے۔ گزشتہ چند شماروں میں غزلیات کے مطالعے سے اُن کے لہجے میں قدرے تبدیلی کا احساس ہوتا

ہے۔ یہ تبدیلی خوش آئند بھی ہے اور ان کا غزل کے اصل آہنگ کی طرف رجوع حیران کن بھی۔ چنانچہ آپ کی غزل جس کا مطلع ہے

فلک پہ تارِ نفس کی نظیر چھوڑ گیا جہانہ کوئی دھوئیں کی لکیر چھوڑ گیا

سے لے کر موجودہ شمارے میں شامل اُن کی غزلیات تک کا بغور مشاہدہ کیا جائے تو ایک تغیر کا احساس ہوتا ہے۔ یہ تغیر اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنی ذات کے رنگوں سے بلکہ آسمانِ روایت پر بکھری شعاعوں سے بھی قوسِ قزح کی تشکیل کا فن جانتے ہیں۔ یہ نکتہ یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ جو لوگ یہ مفروضہ قائم کر لیتے ہیں کہ اصل شاعری جوانی اور نو عمری کا ثمر ہے، وہ پوری طرح درست نہیں۔ یوسف حسن کیا خوب غزل کہہ رہے ہیں۔ آپ کی غزل میں ایک بھرپور اُٹھان ہے جو کہ قاری کو اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے اور مصرعوں کی روانی سحر کا سا کام کرتی ہے۔ آپ کا لہجہ نہ صرف عام قاری کو بلکہ فن کے منجھے ہوئے قارئین تک کو متاثر کرتا ہے۔ گزشتہ چند شماروں کی غزلیں پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کی لفظوں پر گرفت بتدریج بڑھتی جا رہی ہے جو کہ مسلسل محنت کا ثمر ہے۔ آپ فن کے اس مقام پر ہیں جہاں حرف دھوکا دینے سے قاصر ہو جاتے ہیں اور فن کار جو کچھ سوچتا ہے اُسے خوبصورتی سے کہنے پر قادر ہو جاتا ہے۔ یہی مقام فن کی معراج ہے۔

سید نور محمد قادری کے لئے عرض ہے کہ قرآن خونی رشتوں سے زیادہ نظریاتی اور عملی رشتوں کا قائل ہے۔ حضرت نوحؑ کے واقعہ کے ضمن میں آیات (۱۱: ۴۱ تا ۴۴، ۲۵۰: ۳۷، ۵: ۱۱ تا ۱۶، ۳۱: ۸۲، ۷۰: ۴۶، ۷۳: ۱۰، ۱۱: ۴۴، ۴۸: ۲۱، ۷۶: ۲۵، ۷۷: ۳۷، ۲۶: ۱۱۹، ۱۲۰، ۲۹: ۱۴، ۱۵، ۳۷: ۷۶، ۸۲، ۵۳: ۵۲، ۷۱: ۲۵) اور فاطمہ کی چوری کے سلسلے میں نبی کریمؐ کی مشہور حدیث مثال کے طور پر لی جا سکتی ہے۔ لہٰذا محمد ارشاد کا مہیا کردہ "آل" کا ترجمہ "پیروکار" زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔ رہا دو ترجموں کا معاملہ تو اس کی وجہ محمد ارشاد نے "بنو ہاشم کا پراپیگنڈہ" بیان کر دی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ ہمیں اندھی تقلید کی بجائے تحقیق اور کامن سنس سے کام لینا چاہیئے۔ جہاں تک حُبِ علیؓ کا تعلق ہے تو اس بارے میں عرض ہے کہ اگر "آل" کا ترجمہ پیروکار یا متبعین بھی لیا جائے تو بھی علیؓ اور ان کے اہلِ خانہ کو اس سے باہر نہیں رکھا جا سکتا۔ لہٰذا اس ترجمہ سے علیؓ کے مقام و مرتبہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

نوٹ:۔ بہتر نتائج کے لئے بطور حوالہ دی گئی آیات کو اور اس کے علاوہ بھی نوحؑ کے متعلق آیات کو ترتیب میں رکھ کر مطالعہ کیا جائے۔ اسی طرح حضرت لوطؑ اور فرعون کے متعلق آیات نیز حضرت ابراہیمؑ کے متعلق آیات کا لغت کے حوالے سے مطالعہ کیا جائے۔

شعیب آفریدی (راولپنڈی)

فنون کے جملہ مندرجات خوب تھے۔ اجمالاً عرض ہے کہ موحد صاحب کے ٹائیٹل نے جس طرح توجہ چاہی، دراصل وہ موحد کی تخلیقی لطافتوں اور ارتقار کے ساتھ ساتھ ان کی فن پر مکمل دسترس کا بھی غماز ہے۔ ویسے تو حمد کا حصہ خدائے قدوس کی فطرت تا بال کا مظہر تھا لیکن سید مشکور حسین یاد کا ایک شعر لطف دے گیا (تیرے حسن و خوبی کی انتہا نہیں مولا! ممکنات سے آگے، ممکنات لامحدود) حصہ نعت میں حضرت امیر خسروؒ کی رباعی نعتیہ شاعری کی ایک گراں قدر مثال ہے۔ (رفتگاں) میں شیر افضل جعفری کے لئے جناب توقیر چغتائی اور مولانا راسخ عرفانی کے لئے ثاقب عرفانی کا ہدیہ تہنیت ___ موج فرازی کی لطافتوں اور راسخ عرفانی کی حیرتوں سے مملو غزل اچھی لگی۔

مقالات میں 'بات سے بات' کے تحت محمد ارشاد صاحب نے رومی، ابن عربی اور اقبال کے وحدت الوجود اور وحدت

الشہود کے فلسفے سے متعلق ترجیحات کو خوبصورتی سے بیان کیا۔ میرے لئے یہ ایک انکشاف تھا کہ ابلیس کی بیوی پرندوں کی طرح انڈے دیتی ہے اور ابلیس کے بچے انہی انڈوں میں سے نکلتے ہیں۔ مضمون ہذا میں ہی حلاج کے شیعہ یا سُنّی ہونے کے متعلق مفصل بحث تھی جبکہ حسین بن روح اور حسین ابن حلاج کے علیحدہ علیحدہ تشخص تھے۔ اسماعیلی فرقے کے بانی مہدی باللہ کی قیروان (افریقہ) میں خلافت کا آغاز، قرامطیوں اور فاطمیوں کے متعلقات، حلاج کا داعی قرامطہ قرار دیا جانا اور آخر کار اس کے پیرو حنابلہ کا انجام سب معلومات افزا تھا۔ "فیض اور ہمارے فکری مغالطے" میں شاہین مفتی صاحبہ نے عصری آشوب کے سماجی، مذہبی اور نفسیاتی ماخذات کے رُجحانات کی کمال ہنرمندی کے ساتھ تصویر کشی کی ہے (بعض جگہوں پر کتابت کی غلطیاں رہ گئی ہیں)۔ "مقبول شاعری اور نامقبول شاعری" میں کاوش عباسی نے ساقی فاروقی کی تحریر کے ردِ تحریر کے طور پر احمد فراز، ساحر لدھیانوی اور افتخار عارف کے بارے میں دانشورانہ مشورہ فراہم کیا ہے۔

"کھوج" کے تحت رشید ملک صاحب نے انڈالوجی، اہم (اساطیر-۲) میں اساطیر سے متعلق مباحث کو ممکنہ زاویوں سے مثبت اور منفی ہر دو طرح کے واضح دلائل دے کر نہایت مدلل پیرایۂ اظہار میں بیان کیا ہے۔ تشنگی محسوس نہیں ہو رہی (پوٹھوار کی وادی اور اس کی ثقافت) میں امین راحت چغتائی نے بیرونی حملہ آور اقوام، وہاں کے لوگوں کی طرز بود و باش، اور ان کے رہن سہن کے بارے میں تفصیلی انداز سے لکھا ہے۔ چغتائی صاحب نے وہاں کی زبان کے لہجوں اور لوک ادب کی جملہ اصناف پر روشنی ڈالی ہے۔ البتہ لوک ناچ میں "سمی" صرف پوٹھوہار کے علاوہ ملتان اور جھنگ ہی میں نہیں سرگودھا اور فیصل آباد سمیت ساندل بار کے دیگر کئی علاقوں میں بھی شادی بیاہ کے ایام میں آج تک ایک من پسند لوک ناچ رہا ہے۔ "سوویٹ انڈالوجی" میں جناب وصال طاؤس نے آثارِ قدیمہ کے روسی ماہرین کے حوالے سے، قدیم آریاؤں کی روایتی ثقافتوں، باختر، سوغدیانہ، اور خوارزم کے علاقے (گندھارا) اور سندھو (سرحد اور سندھ) وغیرہ نیز کوہ قاف کے مشرق میں آباد آرمینائی لوگوں کی اساطیر اور لوک کہانیوں میں مذکور ہندی اثرات اور مشترک علامات کا بحُسن و خوبی ذکر کیا ہے۔

"شعراء اور ان کی شاعری" کے حصے میں ممتاز حسین نے شبنم رومانی کے یہاں ارتقاء پذیر رجحانات کا رومانیت، کلاسیکیت اور حقیقت پسندی کے کینوس میں خوبصورت تجزیہ کیا ہے۔ محسن بھوپالی کی شاعری کے بارے میں احمد ہمدانی نے اُن کی واردات قلبی اور ذاتی کیفیات کی تجرباتی اساس کو بنیاد بنا کر خوبصورت انداز میں گفتگو کی ہے۔ رام ریاض کے بارے میں صلاح الدین حیدر (موسم صلیب کا شاعر) میں جہاں ان کے ذاتی اسلوبِ نگارش میں موسیقیت کی گونج اور پورے شعری رویّوں کا اظہار ملتا ہے وہاں ان کی غزل کی کلاسیکل اسلوبیات اور عصری آشوب کے ساتھ ان کی زندگی کے ذاتی المیئے ان کی غزل میں جس رچاؤ اور سبھاؤ کا باعث بنے، بہت تفصیل اور خوبصورتی سے بیان کئے گئے ہیں۔ "انتخاب کلام" کے سلسلے میں اکبرالٰہ آبادی کا خوبصورت اور جاذبِ نظر کلام پڑھنے کو ملا۔ ہر دو رویّوں کے عکاس اس شعری انتخاب میں ایک شعر معمولی تبدیلی کے ساتھ دوبارہ درج ہو گیا۔ "تراجم" میں سیندور پیتوفی کی نظم عشق و آزادی دوبارہ کے تراجم کے باوجود اپنی بھرپور شدت کے ساتھ لطف دے گئی۔

نظمیں عمومی طور پر سب خوبصورت تھیں۔ عزیز حامد مدنی کی "گواہ" اپنی داخلی اور خارجی واردات کے ابلاغ، سید منیر کی "یادِ شہرِ جاناں" لندن کے اپنی تاریخ سے پیوستہ داستانوی اُسلوب کے پس پردہ حکایات کا خوبصورت جزئیات نگاری کے ساتھ بیان ہے۔ احمد ظفر کی "گوری کا چکی پیس رہی ہے" اپنی مخصوص معنوی دلکشی کی نظم تھی۔ جمیل ملک کی نظم "خدا۔ یا خدا" بھی خوبصورت نظم ہے۔ علامہ طالب جوہری کا حکیم سنائی اور حضرت اقبال کے حضور قصیدہ کا ابتدائیہ اپنی آئندہ کی تخلیقی جولانیوں کا مظہر تھا۔ محمود علی محمود

کی "ایک لمحے کی بادشاہی" عرفانہ عزیز کی "سخنوری کا عذاب" بہت ہی خوبصورت نظمیں تھیں۔ امجد اسلام امجد کی نظم "یکم جنوری ۱۹۹۰ء" گو اپنے خارج اور داخل میں بھرپور شعریت لئے ہوئے ہے۔ خصوصاً آخری مصرعہ میں۔ لیکن اگر چشمِ تصور سے دیکھا جائے تو یکم جنوری ۱۹۹۰ء کی صبح واقعتاً ایسی ہی صورت حال سے دوچار تھی۔ گویا امجد اسلام امجد نے یکم جنوری ۱۹۹۰ء کی صبح کے حوالے سے اپنے داخل اور خارج کے ماحول کی فوٹو گرافی کی ہے۔ میرے نزدیک یہ بہت اچھی نظم ہے۔ "اے شعلۂ جاں! دیکھ" اپنی معنویت کے اعتبار سے ہمارے پُرآشوب عہد میں لکھی جانے والی جدید شاعری کے زمرے میں آتی ہے۔ جس میں یاس کے ماحول کا باقاعدہ جواز بھی ملتا ہے۔ مقبول عامر کی "ملازمت" اور ایوب خاور کی "یہاں ایک نظم رکھی تھی" اپنے اسلوب کے ساتھ ساتھ جولانیٔ فکر کے لحاظ سے بھی بھرپور نظم تھی۔ ناہید قاسمی کی دونوں نظمیں رواں اور فکری تدبر لئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنی نظموں کو تلازماتی التزام سے مرصع کرکے جملہ فنی محاسن کے ساتھ ساتھ فکری پرتیں بھی وا کی ہیں۔ منصورہ احمد کی "آشوب" ایک جنوط شدہ بانجھ لبستی کے المیے کی داستان بن کر سامنے آئی۔ "گواہی" میں انہوں نے اُس ماحولیاتی نظام کی عکاسی کی ہے جو ہماری مجموعی معاشرتی، سبوتاژ کا باعث ہے۔ یہ بہت خوبصورت نظمیں تھیں۔ ڈاکٹر جاوید انور کی ہر نظم ہی اچھی ہوتی ہے۔ "دیکھئے آسٹریا مزید ان میں اور ان کی نظموں میں کس طور جلوہ گر ہوتا ہے۔ رتائم نقوی کی نظم بھی خوب تھی۔ اعجاز رضوی کی نظمیں پچھلے کچھ عرصے سے ہمیں ایک نئے داستان گو اعجاز رضوی سے متعارف کروا رہی ہیں۔ ان کی فنون میں شامل نظمیں بھی وہی اسلوب لئے ہوئے ہیں۔ طریقۂ اظہار عمدہ ہے۔ ابرار احمد کی "مٹی سے ایک مکالمہ" اور افتخار بخاری کا "ہم پیشہ" اچھی نظمیں تھیں۔ قمر رضا شہزاد کی "مراجعت" بھی اسی ذیل میں آتی ہے۔ "میرا باپ" لپنے آفاقی رشتوں کی جانب مراجعت اور نفرت آلود سوچوں سے مغائرت کے رویوں کی ترجمان ایک خوبصورت نظم تھی۔

افسانوں میں اشفاق احمد صاحب کے "خود بدولت" کا مرکزی کردار بختیار خاں جس نفسیاتی خود پرستی کا شکار ہے۔ اس کو بنیاد بنا کر اشفاق احمد نے اردگرد کے ماحول اور ساتھ میں ظفر علی خاں، مہاتما بدھ، سکندر اعظم، نپولین، ماؤزے تنگ اور خصوصاً قائد کی ذات کے حوالے سے اچھا محاکمہ کیا ہے جو بختیار خاں کی ذات کے نفسیاتی خلجان اور ہیجان کی جانب اشارہ کرتا ہے۔

"کیا کیا رنگ محبت کے ہیں" میں ام عمارہ نے ہمارے ایک بہت بڑے معاشرتی بگاڑ کا بہت خوبصورتی کے ساتھ تجزیہ کیا ہے۔ خصوصاً "اماں" کا کردار ایک ایسی حقیقت بن کر سامنے آتا ہے جو ہمارے تہذیبی ماحول کی یک رُخی اقدار کے نشیب و فراز کا عکاس ہے۔ "نیر ہونے تک" میں نگہت مرزا نے افسانے کا آغاز خوبصورت کردار نگاری سے کیا۔ بے اختیار داد دینے کو جی چاہا۔ لیکن افسانے کے آخر میں ماحول کچھ بوجھل سا ہوگیا۔ منیر الدین احمد کا "بنورر کا سفر" افسانے سے زیادہ سفر نامہ لگا۔ جس میں خوبصورتی کے ساتھ جرمن تہذیب اور ماحول کے بارے میں تاثر نگاری کی گئی ہے۔ "دل دریا" میں بلقیس ظفر صاحبہ نے امیر علی کی جلاوطنی، سماجی پستی اور انسان کے داخل کے رویوں پر اچھا افسانہ لکھا ہے۔ "دانش ور" میں ضیا بٹ نے موچی کے بیٹے کے کردار کو اچھے انداز سے نبھایا ہے۔ لیکن بعض جگہوں پر بے جا دلائل نے موضوعی اور تکنیکی لحاظ سے افسانے کو خشک سا کر دیا ہے۔ "مسلمان" میں نیلوفر اقبال صاحبہ نے ایک عام روایت کو بنیاد بنا کر افسانے کو مکمل کرنے کی کوشش کی ہے۔ پچھلے افسانوں کی نسبت یہ افسانہ کوئی یادگار تاثر نہیں چھوڑ سکا۔

"پہلی نماز" عطیہ سید کی افسانوی پُراسراریت سے ملو ایک خوبصورت کہانی تھی جو جدید سائنسی تناظر، ہمارے ماحول کے مجموعی نفسیاتی الجھاؤ اور زندگی کی دیگر کئی جہتیں کھولتی ہے۔ میرے خیال میں فنون کی اس اشاعت کی سب سے اچھی کہانی یہی تھی۔ کہانی ایک اچھے منطقی انجام کو پہنچی۔ مصطفےٰ کریم کی "دو شاخیں لچکتی ہوئی" صرف روشن، نیلو اور وشن کے دکھ ہی کی کہانی نہیں بلکہ یہ ایک مجموعی

کائناتی بگاڑ ہے جو سارے ماحول کی رگوں میں سرایت کر چکا ہے۔ "رشتے درد کے" میں سعید شیخ نے آخری حصے میں افسانے کو خوبصورت بچھڑ دیئے ہیں۔ گو یہ ایک بوسیدہ اور بار بار لکھا جانے والا موضوع تھا لیکن انہوں نے کرداروں کے خصوصاً جمیل کے اپنی سیکرٹری اور مریم کے اپنے پچھلے شوہر الیاس کے بارے میں داخلی کیفیات کو خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ اپنے فنکارانہ انداز سے انہوں نے افسانے میں نیا پن پیدا کر دیا ہے۔ "میں اور میرا ساتھی" میں نیلم احمد بشیر نے اگر مرکزی کردار کو سندباد کی تلمیح میں پیش کیا ہے تو ابھی کتنی معصوم بیٹیاں، بہنیں، محبوبائیں، بیویاں اور مائیں، سندباد کی صورت میں اُس خبیث بوڑھے کی قید میں ہیں۔ "دو کٹی ہوئی انگلیاں" میں یوسف چودھری نے علیحدہ علیحدہ حصوں میں مشینوں پر موجود لوگوں کے قلبی احساسات اور ان کے ذہنی معیارات کو اچھی طرح پیش کیا ہے۔ دراصل محمد خاں کی سوچ دھن سے کٹے ہر انسان کی سوچ ہے۔ جو اکثر سہاگ رات کو پایۂ تکمیل تک پہنچ جاتی ہے۔ "پیلی سرسوں" میں ایوب اختر نے اختتام پر جو ڈرامائی کیفیت پیدا کی ہے وہ بہت اچھی تھی۔ افسانہ فنکارانہ چابکدستی کا متقاضی تھا جسے انہوں نے نبھایا ہے۔ اگر ایئرپورٹ پر غلام حسین کو تنہا ہی دکھایا جاتا جو شادو سے پہلے سا ہی پیار کرتا تو بھی افسانہ بھرپور ہوتا۔ "ٹانٹے پتھر" روبینہ راجہ کی ایک خوبصورت تاثراتی تحریر ہے جو عورت کے داخل کو سامنے لاتی ہے۔

بیشتر غزلیات لطیف جذبات کی نمائندگی کرتی ہیں۔ جملہ شعری لطافتوں سے مرصع ان غزلوں میں واردات قلبی کے ساتھ ساتھ اپنے خارج کے ماحول کو خوبصورتی سے موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ خصوصاً عزیز حامد مدنی، قتیل شفائی، ضیاء جالندھری، صہبا اکبرآبادی، محشر بدایونی، جمیل ملک، محسن احسان، شہزاد احمد، آفتاب اقبال شمیم، اقبال کوثر، جعفر شیرازی، غلام حسین ساجد، عرفانہ عزیز، نجیب احمد، احمد اسلام امجد، جلیل عالی، یوسف حسن، صابر ظفر، ستار سید، عباس تابش، اعجاز رضوی، افتخار بخاری اور عطا اللہ کی غزلیں لطیف محسوسات سے معمور، حاضر رجحانات اور عصری شعور کی ترجمان تھیں۔

تشخص کے سلسلے میں ممتاز مفتی (خوش گفتار) ضیاء جالندھری کے جمالیاتی، فکری، فنی، خوش گفتاری اور کسی قدر خانگی پہلوؤں کو نہایت شگفتہ پیرائے میں منصۂ شہود پر لایا ہے۔ رپورتاژ "ہم نفس۔۴" کے سلسلے میں مسعود مفتی صاحب اپنی ذاتی یادداشت پر مبنی کرب انگیز حقائق سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ جن سے چشم پوشی کسی صورت ممکن نہیں۔ ان یادداشتوں کا کتاب کی صورت منظر عام پر آنے کا شدت سے انتظار کیا جائے گا۔

"رفتید وے نہ از دل ما" میں تسنیم سلیم چھتاری صاحبہ (میرے ہمدم، میرے دوست) نے اپنے معذور بیٹے کے حوالے سے جس پرسوز انداز میں لکھا ہے۔ وہ صرف ایک دردمند دل رکھنے والی ماں ہی لکھ سکتی تھی۔ کہیں کہیں تو نوید کی شوخیوں سے ممیز باتوں نے رُلا رُلا دیا۔ "آہستہ برگ گل بہ فشاں" میں ڈاکٹر صبیحہ خاتون صبا صاحبہ بھی دل پذیر انداز میں اپنے خاندانی پس منظر و پیش منظر اور اپنے والد محترم سے نہایت درجہ عقیدت و محبت کو حیطۂ تحریر میں لائی ہیں۔

انشائیہ کے حصے میں سید مشکور حسین یاد "نزاکتوں کا مرقع" میں پتھر کے حوالے سے صحیح انشائی انداز میں بہت سی اَن کہی باتیں کہہ گئے ہیں۔ "نثر پارے" میں ارشد علی نے نہایت عام فہم انداز میں بہت سی فلسفیانہ موشگافیوں کو صفحۂ قرطاس کی زینت بنایا ہے۔

اختلافات میں جناب رشید ملک نے "مسعود حسن شہاب دہلوی" کی کتاب "مشاہیر بہاولپور" کے متعلق پُرمغز باتیں کی ہیں۔ عارف محمود نے سید معین الرحمان کے مضمون (اردو کا پہلا افسانہ نگار) کے حوالے سے ٹھیک ٹھاک لکھا۔ انہوں نے پچھلے فنون کا تجزیہ اس تفصیل سے پیش کیا کہ یقین ہو گیا کہ عارف محمود محفل میں طویل خاموشی کے بعد جب صرف ایک

جملہ کہتا ہے تو محفل کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ وہی عارف محمود اگر لکھنے پہ آجائے تو بنا ایک نقطے کا وقفہ دیئے لکھتا ہی چلا جائے ـــــ !! مہر دو نیم (افتخار عارف) پہ جناب فتح محمد ملک نے خوبصورت تجزیاتی تبصرہ لکھا ہے۔
فنون کے سال میں تین چار شماروں کی اشاعت بہت بڑی خبر ہے۔ دُعا ہے فنون اپنی اعلیٰ روایات کے ساتھ زیادہ تعداد میں منظرِ عام پر آئے (آمین)

زاہد حسن (لاہور)

فنون کا تازہ شمارہ پڑھا۔ حسبِ معمول حصہ شعر معیاری ہے۔ اس بار آپ نے نصف صدی قبل کی مشہور افسانہ نگار محترمہ تسنیم سلیم چھتاری کی جو ذاتی تحریر شائع کی ہے وہ انتہائی متاثر کن ہے۔ رشید ملک صاحب نے "انڈالوجی" کا جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ نہ صرف معلوماتی ہے بلکہ اس سے ماضی کی بہت سی گرہیں بھی کھلتی ہیں۔ آپ کا اداریہ پاکستان کے ادبی منظر نامے کے ایک ایسے حصے پر روشنی ڈالتا ہے جو یہاں بھی ہاتھ پاؤں نکال رہا ہے۔ یعنی ادیبوں کی ذاتی چپقلش کی تشہیر سے ادبی فضا کو مکدر کرنے کا کام یہاں کے اخبارات اور ماہناموں نے بھی شروع کر دیا ہے۔ مگر یہ سلسلہ ابھی پاکستانی ادبی صحافت کے اعلیٰ معیار تک نہیں پہنچا ہے۔

اسعد بدایونی (علی گڑھ)

ایک غزل کا سرقہ

"فنون" کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ صفحہ نمبر ۴۶۵ پر رفعت عباس کی دو غزلیں شائع کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک غزل:۔

چاہیے کچھ ہو آئینہ دکھلا مجھے
تجھ میں گر سچائی ہے جھٹلا مجھے

یہ دراصل میری ایک پرانی غزل کے چار اشعار ہیں۔ میرے ریکارڈ کے مطابق میری یہ غزل یکم مارچ ۱۹۸۲ء کے روزنامہ "پاسبان" حیدر آباد کے ادبی صفحہ میں شائع ہو چکی ہے (فوٹو اسٹیٹ منسلک ہے)
میری اس غزل میں ۷ اشعار ہیں۔ یہ غزل مکمل حالت میں میری غزلوں کے عنقریب شائع ہونے والے مجموعے "خالی رستہ خالی گھر" صفحہ نمبر ۱۳۶ اور ۱۳۷ پر شائع ہو رہی ہے (اس کی نقل بھی روانہ کر رہا ہوں) رفعت عباس نے جو چار اشعار اڑائے ہیں ان میں سے صرف ایک شعر میں تبدیلی کی ہے۔

شہر میں تھا میری آوازوں کا شور   اور صدا دیتا رہا صحرا مجھے
جبکہ میرا شعر تھا
بستیوں میں شور میں کرتا رہا   اور صدا دیتا رہا صحرا مجھے

اب سارا معاملہ آپ کے سامنے ہے۔ اب یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ اس ادبی سرقے کی کھلی واردات کا جائزہ لیں اور فیصلہ فرمائیں کہ رفعت عباس نے یہ کیا گل کھلایا ہے؟
آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہم لوگوں کے پاس اور کیا اثاثہ ہوتا ہے۔ یہی چند ٹوٹی پھوٹی غزلیں اور کچھ آڑی ترچھی نظمیں۔

اب اگر لوگ ان کو بھی اڑانے لگ جائیں تو پھر ہم لوگوں کے پاس کیا رہ جائے گا۔ اُمید ہے کہ آئندہ اشاعت میں آپ میری یہ گزارشات ضرور شائع فرمائیں گے۔ اگر رفعت عباس یہ چار اشعار لینے پر ہی بضد ہوں تو میں باقی ماندہ تین اشعار بھی ان کی نذر کرنے کو تیار ہوں۔

احمد ضیا (نواب شاہ)

نیا شمارہ (مزید)

اپنی زندگی کے ثبوت کے طور پر یہ مختصر سا عریضہ لکھ رہا ہوں۔ آپ نے کویت کا انجام دیکھ لیا۔ ہم یہاں بیٹھے لرز رہے ہیں کہ جانے ہمارا کیا بنے گا۔ "فنون" کا شمارہ نمبر ۳۰ ایک دوست کے بدست ملا۔ اس سے پہلے کا شمارہ بھی پڑھ چکا ہوں مگر آج، بقول حفیظ تائب،

اعصاب جواب دے گئے ہیں

میں ویسے بھی کمزور آدمی ہوں اوپر سے جب امریکن فوجوں کے بوٹوں کی دھمک سنتا ہوں تو لگتا ہے جیسے میں ویت نام میں ہوں اور امریکی حملے کی زد میں ہوں۔ اس کے باوجود ادب کے بارے میں بات کرنے کو جی چاہتا ہے۔ سو عرض ہے کہ افسانوں میں ام عمارہ، نگہت مرزا، بلقیس ظفر، نیلوفر اقبال، عطیہ سید، نیلم احمد بشیر اور روبینہ راجہ نے اپنی فنی گرفت سے مبہوت کر دیا۔ چودہ افسانوں میں سے سات خواتین کے ہیں، اور ساتوں کے ساتوں، ذرا سی ڈگری کی کمی بیشی کے ساتھ دل میں اُتر جانے والے۔ مرد افسانہ نگاروں میں سے اشفاق احمد نے ایک مرتے ہوئے بوڑھے کا ایسا سچا نقشہ کھینچا ہے کہ داد کے الفاظ نہیں ملتے۔ اسی طرح منیر الدین احمد اور مطلوب کریم اور یوسف چودھری نے موہ لیا۔

مقالات کا حصہ بھاری بھرکم ہے۔ جہاں مجمد ارشاد اور رشید ملک موجود ہیں وہاں کی بلند علمی سطح کا بآسانی اندازہ ہو سکتا ہے۔ شاہین مفتی بھی کامیاب رہیں اور امین راحت چغتائی نے بھی اپنے محققانہ تبحر سے حیران کر دیا۔ اسی طرح رسول طاؤس نے انڈالوجی کے موضوع پر نئے زاویے سے نظر ڈالی ہے۔ کاوش عباسی نے کھرا مضمون لکھا ہے مگر احمد فراز اور ساحر لدھیانوی وغیرہ کا دفاع کرتے ہوئے یہ بھول گئے ہیں کہ باقی فاروقی بھی اپنے اسلوب اور اپنے اندازِ فکر کا منفرد شاعر ہے اور اس دور کا ایک اہم شاعر ہے۔

نظموں میں سید منیر نے بے حد متاثر کیا۔ خدارا بتایئے یہ صاحب یکایک کیسے نمودار ہوئے ہیں اور ان کی عمر کیا ہے۔ ان کی قادر الکلامی ان کے معمر ہونے کی غماز ہے۔ مگر ان کی فکر جوان ہے۔ احمد ظفر اور جمیل ملک بھی خوب ہیں مگر علامہ طالب جوہری تو گزشتہ دو شماروں سے مجھ غریب کو ورطۂ حیرت میں ڈالے دے رہے ہیں۔ اتنا بڑا عالم دین اتنا بڑا شاعر بھی ہو سکتا ہے! یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ غزل گو حسن اختر جلیل کی دو نظمیں ان کی غزل کا ایک ایک شعر معلوم ہوتی ہیں، سچی اور دلگداز۔ محمود علی محمود کا اسٹائل بہت متاثر کن ہے۔ امجد اسلام امجد اور ایوب خاور کا فن بھی ارتقا کی طرف رواں دواں ہے۔ ناہید قاسمی، شاہین مفتی اور ثمینہ راجہ ـــ تینوں نے حیرت انگیز حد تک کامیاب نظمیں کہی ہیں۔ منصورہ احمد کے بارے میں شاعری کے ایک قاری کی حیثیت سے میری جو رائے چار پانچ سال پہلے تھی، وہ صحیح ثابت ہوئی ہے یا نہیں؟ "آشوب" صرف پاکستان کی صورت حال کا فنکارانہ محاسبہ نہیں ہے بلکہ تیسری دنیا کے ہر ملک کا یہی المیہ ہے جو منصورہ احمد کی اس بھرپور

نظم میں صورت پذیر ہوا ہے۔ اسی طرح "گواہی" بھی ایک شاہکار نظم ہے۔ میں اسے اردو کی جدید اور باشعور شاعری میں اضافہ قرار دوں گا۔ منصورہ احمد کے علاوہ جاوید انور بھی مسلسل آگے بڑھ رہا ہے اور اس کے پیچھے اعجاز رضوی ہے، افتخار بخاری ہے اور افشاں عباس ہے۔ یہ سب لوگ بڑی شاعری کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

غزلوں میں مدنی، قتیل، ضیا جالندھری، محب عارفی، سید منیر، گوہر ہوشیارپوری، رشید قیصرانی، آفتاب اقبال شمیم، الفت رسول اور رشک خلیلی وغیرہ کی حیثیت اب اساتذہ کی ہے مگر صحیح حظ غزلوں کے دوسرے اور تیسرے حصے میں حاصل ہوا جہاں خاقان خاور، عالمتاب تشنہ، مختار جاوید، شفیق سلیمی، تنویر سپرا، نجیب احمد، امجد اسلام، شہزاد قمر، مقبول عامر، راشد مراد، اسلام عظمی کے علاوہ نکہت یاسمین گل، عباس تابش، ثمینہ راجہ، وزیر علی بابو، منصور آفاق، عطاء اللہ، اختر عثمان اور شاہدہ صدف کی غزلوں نے مسحور کر لیا۔ افشاں عباس کی دونوں غزلیں اس کی ذہانت اور فنی گرفت کا پتہ دیتی ہیں۔

ان غزلوں کے علاوہ دیگر شعرا نے بھی اپنی اپنی غزلوں میں نزاکتِ احساس اور جدتِ فکر کے بے شمار گل کھلائے ہیں۔ ان کے اشعار منتخب کرنے کو جی چاہتا ہے مگر آپ ہمیشہ کاٹ دیتے ہیں اس لئے میں کیوں وقت ضائع کروں۔

اور ہاں ـــــ ہمارے خالد احمد کہاں ہیں؟ انہوں نے تو مسلسل چپ سادھ رکھی ہے۔ سنا تھا وہ تصوف کی طرف مائل ہو رہے تھے تو کیا مکمل صوفی ہو گئے؟ مگر صوفی لوگ تو بڑے پیارے لوگ ہوتے ہیں۔ وہ ملاؤں کی طرح انسانوں سے نفرت نہیں کرتے۔ ان سے محبت کرتے ہیں اور ان کا وقار بڑھاتے ہیں۔ خالد احمد کو اپنے قارئین کے جذبات کا لحاظ کرنا چاہیئے اور اتنی طویل خاموشی اختیار نہیں کرنی چاہیئے ورنہ خود ان کا دم گھٹ جائے گا ـــ اور میرے بلکہ ہمارے اختر حسین جعفری؟ وہ اب کے غیر حاضر ہیں اور یہ مجھ ایسے شیدائیوں پر ظلم ہے۔ میرے لئے دعا کرتے رہیں۔

امتیاز علی خاں (دستارجہ)

"حرفِ اوّل" میں آپ نے جن مسائل کا احاطہ کیا ہے اُن سے اختلاف کی گنجائش نہیں مگر یہ مصرع بھی اپنی جگہ درست ہے۔ ؎ کون سنتا ہے فغانِ درویش! آپ کہتے ہیں کہ "ادب کے میدان کارزار میں اُترے ہوئے تمام کے منصوبہ ساز اپنے ضمیر کو بیدار کریں، اپنے اپنے 'حامیوں' کے منہ میں لگام دیں اور انہیں بتائیں کہ تاریک اندیشی کے علاوہ ایک چیز روشن خیالی بھی ہوتی ہے اور شعر و ادب ہمیشہ روشن خیالی ہی کے ماحول میں پنپتے ہیں۔" مگر محترم! ضمیر ہوگا تو بیدار کریں گے جب اُن کے فتنہ و فساد اور مشاغل کی آپ مثبت انداز میں نشان دہی کر چکے ہیں تو پھر ؎ کون سنتا ہے فغانِ درویش۔ آپ کا مقدمہ اپنی جگہ درست مگر آپ کسی کی دریدہ دہنیوں کو بے نیازی سمجھ کر تسلیم کی خو ڈالنے والی روایت سے دور ہی رہیں۔

حافظ لدھیانوی کی حمد باری تعالیٰ، مشکور حسین یاد، خواجہ رحمت اللہ جری، عبداللہ جاوید اور طیب منیر کی حمدیہ شاعری میں ان تمام کے اپنے اسلوب و آہنگ کی جھلک نظر آئی۔ البتہ الجنیئر خواجہ رحمت اللہ جری کی حمد کے تیسرے شعر میں سہو کتابت ہے۔ غالباً یہ مصرع اس طرح ہے ؎

تو میرے سامنے، رہوں میں ترے سامنے

"رہے" سے یہ غیر متعلق ہو جاتی ہے! موحد کی خطا طلی بھی حمد اور نعت کا شعور احاطہ کرتی ہیں۔ سید منیر، امیر خسرو (ترجمہ صبا اکبر آبادی ـــ فہرست میں صبا ہو گیا) صوفی عبدالرشید، اقبال کوثر، غلام محمد قاصر، سحدیہ روشن، ضمیر اظہر اور غفار بابر کی نعتوں میں گلہائے عقیدت کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ ؎ ایں سعادت بزور بازو نیست۔ البتہ عبداللہ جاوید نے اس حوالے

سے فکری اجتہاد کیا ہے جو عصری ضرورتوں کا حصہ ہے۔ نعتیہ شاعری میں اس روایت کو آگے بڑھنا چاہیئے۔

خیر افضل جعفری (جھنگ کے ملنگ) کے لئے ہمارے ساتھی توقیر چغتائی نے اُسی رنگ و آہنگ کو ملحوظ رکھا ہے جو جھنگ کے ملنگ کا خاصہ تھا اسی طرح گوجرانوالہ کے شاعر راسخ عرفانی کی رحلت پر ان کے بھائی ثاقب عرفانی نے نوحہ گری کی ہے نیز اُن کا خط جو مرگ سے قبل لکھا گیا ص۲۸۲ اور غزل جو غالباً اس تاثر کو بے نقاب کرتی ہے کہ انہیں وقت آنے کا پتہ چل گیا تھا ؎

میں اگلے موڑ پہ تجھ سے بچھڑنے والا ہوں　　یہ چند گام غنیمت سمجھ سفر میرا

اسی طرح احمد لطیف کی نظم اپنے بھائی شبیر احسن کی یاد میں "سرخ گلاب اور وحشی پاؤں" فنون کے قلمکاروں اور قارئین کے جذبات کی ترجمان ہیں۔ آپ نے احمد فراز مرحوم اور ان مرحومین کی یاد میں تمام گلہائے عقیدت شائع کر کے ادب شناسی اور انسان دوستی کی روایات کو نبھانے کا حق ادا کر دیا ہے۔

"بات سے بات" میں محمد ارشاد کا مطالعہ حسین بن حلاج کے حوالے سے توجہ طلب ہے۔ اپنے دلنشین، موثر اور علمی انداز سے انہوں نے بات سے بات نکالی ہے۔ ابلیس کے بارے میں تقابلی نظریات اور عقائد و روایات کا مطالعہ دلچسپی کا حامل ہے: "یہ اقبال کا مقدور و مقدر تھا بے شک اللہ نے کسی کو عبث پیدا نہیں کیا حتیٰ کہ ابلیس کو بھی" ربنا ما خلقت هذا باطلا، "مگر ایسا ہی تو ہے اقبال کی یہ نظم ابلیس کے وجود کا بہترین جواز ہے": اس تحقیق پر فاضل مقالہ نگار کو جتنا خراج تحسین پیش کیا جائے کم ہے۔ اسی تناظر میں شاہین مفتی کا "فیض اور ہمارے فکری مغالطے" نیز شمارہ زیر نظر میں ندیم ہاشمی کی غزل کا یہ شعر بھی دامنِ دل کو کھینچتا ہے ؎

درونِ صحنِ مسجد ہر نظر سے خوف آتا ہے
خدا کے گھر میں جا کر بھی بشر سے خوف آتا ہے

ساقی فاروقی کے شعری نظریات پر کاوش عباسی کا جذباتی نقطہ نظر بھی سامنے آیا۔ جوش، فیض، ندیم، قتیل شفائی اور احمد فراز وغیرہ کی تعریف یا تنقید (تنقیص) سے لکھنے والے کا قد تو بلند یا پست ہو سکتا ہے مگر یہ تمام اہل علم و فن اب ان تمام حربوں اور چاپلوسیوں کے مراحل سے اُسی طرح دور ہیں جیسے آغاز سفر میں ہوا کرتے تھے۔ خدا جانتا ہے آپ اسے سلامت سمجھیں، آپ کو اس صف سے نکالنا میرے بس کی بات نہیں ہے، ساقی فاروقی کا مجموعہ زندہ پانی سچا شائع ہوا ہے اس کے فلیپ پر ان کے نظریات واضح ہیں ایک ہی بات مختلف انداز میں ہر شاعر، ہر لکھنے والا کرتا ہے۔ آپ کے دستار والے شعر ؎

آپ دستار اتاریں تو کوئی فیصلہ ہو
لوگ کہتے ہیں کہ سر ہوتے ہیں دستاروں میں

اس مضمون پر آٹھ، دس شعر تو میں پیش کر سکتا ہوں مگر یہ توارد یا ٹکراؤ نہیں۔ فکر، سوچ اور خیال کی ہم آہنگی یا تجربوں کی بازگشت کے حوالے سے اردو شاعری کا حصہ ہیں۔ کسی کو رد یا قبول کرنا ہمارے ذوق اور معیار کے مطابق ہے یا تو وہ شاعری ہے یا نہیں ہے۔ کاوش عباسی کی بچگانہ خواہش پر مسکرانے کو جی چاہتا ہے — "ابھی تک میں نے اُن (ساقی فاروقی) کی کوئی اہم نظم نہیں پڑھی۔ لیکن نظم کے حوالے سے ان کا یہ پہلو بہت روشن، خوش آئند اور پُر امید ہے کہ وہ ن۔م راشد کے پرستار اور اُن کے اعلیٰ شعری محاسن کے پُرجوش علمبردار ہیں۔ کاش ہمارا عہد اپنی شاعری میں ن۔م راشد کی آزاد نظم کی بے پناہ ادبی قوت اور گہرے مگر بہرحال براہ راست انداز سے صحیح اور مکمل حقہ اکتساب کر سکے اور نتیجتاً اپنے "تخلیقی سرچشموں"

سے کچھ نئے بڑے شاہکار ہمیں عطا کر سکے — "کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ کنوئیں کا مینڈک اپنی آواز کے سحر سے کبھی آزاد نہیں ہو سکتا۔ ادب زندگی کا ترجمان ہوتا ہے، زندگی جامد اور محدود شئے نہیں ہے۔ ن۔م راشد نے جو کچھ تخلیق کیا وہ تخلیقی سرچشموں کی حیثیت نہیں رکھتے۔ ان کی قوت اور اہمیت بجا۔ بلاشبہ وہ ہمارا اعظیم شعری سرمایہ ہے۔ ہم اس پر ناز کر سکتے ہیں مگر تخلیق اور تزئین میں نمایاں فرق ہے۔ کیا کاوش عباسی نے اس تخلیقی سرچشمے سے براہ راست انداز سے صحیح اور کما حقہ، اکتساب کر لیا جو وہ ہمارے عہد کے شاعروں سے یہ توقع رکھتے ہیں؟

رشید ملک کا مطالعہ اساطیر۔ ۲، امین راحت چغتائی کا پوٹھوہار کی وادی اور اس کی ثقافت، رسول طاؤس کا مقالہ سوویٹ انڈالوجی (قسط اول) سرسری طور پر دیکھنے کے باوجود اپنی اہمیت منوا رہے ہیں۔ شبنم رومانی، محسن بھوپالی اور رام ریاض کی شخصیت و فن پر ممتاز حسین، احمد ہمدانی اور صلاح الدین حیدر کی تحریریں ان شعراء کے اسلوب اور فکری ارتقاء کی تفہیم میں شعر و ادب کے طلبہ کے لئے رہنما تحریریں ہیں۔ گاہے گاہے باز خواں — یہ قصہ پارینہ نہیں آج بھی ہم اس کو منطبق کر سکتے ہیں اگر بقول آپ کے "اپنے ضمیر کو بیدار کر لیں"۔ مگر ضمیر ہو تو! عزیز حامد مدنی، سید منیر، احمد ظفر علامہ طالب جوہری، ادیب سہیل، عرفانہ عزیز، عبداللہ جاوید، امجد اسلام امجد، شاہین مفتی، منصورہ احمد (گواہی) جاوید انور (مستقبل کے نوجوان شاعر ہے) اور احمد ندیم قاسمی کی "میرا اپنا" نظموں نے متاثر کیا۔ افسانوں میں نگہت مرزا کا "فجر ہونے تک" اچھا بیانیہ ہے۔ انجام تک کہانی دلچسپی کے ساتھ پڑھنے والوں کو ساتھ لے کر چلتی ہے۔ "ہنود کا سفر" (منیر الدین احمد) میں رنڈی اور بھڑوے جیسے الفاظ گراں گزرے۔ اس لئے کہ میرا دس سالہ بچہ (چھٹی جماعت کا طالبعلم) شعر و ادب، بچوں کی کہانیوں اور خود میری تخلیقی سرگرمیوں میں دلچسپی کا اظہار کرتا ہے اور اس کو پڑھنے کا ابھی سے چسکہ لگ گیا ہے۔ معلوم نہیں اور کتنے بچے بھی اس کو اپنے والدین کی موجودگی یا غیر موجودگی میں پڑھیں گے۔ اگر ڈھکے چھپے الفاظ میں بیان کر دیا جاتا تو کیا حرج تھا۔ جسم فروشی اور دلالی جیسے الفاظ سے بھی ابلاغ ممکن ہے۔ ضیاء بٹ کا "دانشور" ایک زمانے میں خود راقم السطور بھی ہوا کرتا تھا۔ عرصہ ۵ سال سے نماز پر مرحوم والدین اور بیگم کے والد سے کئی جھڑکیوں کے باوصف قدم مسجد کی طرف نہیں بڑھتے اور قرآن کا مطالعہ کرنے کے باوجود اذان کے وقت دل و دماغ میں شورشیں برپا ہوتی رہتی ہیں۔ مجاہد کی اذان سننے کو کان ترس گئے —

اذاں میں روح بلالی نہیں مؤذن کی
شکستگی کا سبب ہے دلوں کی بدحالی

نیلوفر اقبال نے "مسلمان" لکھ بھی دیا اور آپ نے شامل اشاعت بھی کر لیا۔ یہ باتیں کس قوم کے لئے لکھی جاتی ہیں! ان کے لئے جنہیں یہود بھی دیکھ کر شرمائیں! یہ افسانہ نگار خوب لکھ رہی ہے۔ عطیہ رشید کا "پریزدا" پڑھ کر محویت کا عالم طاری رہا۔ "اس شہر میں ہجوم کی شدت اور جسموں کی قربت کے باوجود کوئی کسی کو نہیں جانتا"، مصطفیٰ اکریم کا "دو شاخیں لچکتی ہوئی" یوسف چودھری کا "دو کٹی ہوئی انگلیاں" اور ارشد علی کے نثر پارے پسند آئے۔

میرا انتخاب یا پسند اس طرح ہے۔ متعدد اشعار ذہن و دل کو براہ راست متاثر کر گئے، مگر آپ تو منتخب اشعار شائع ہی نہیں کرتے اس لئے صبر شکر کئے لیتے ہیں۔ علامہ طالب جوہری کا قصیدہ مسلسل اور تینوں غزلیں مکمل پسند آئیں۔

ع۔ یہ گوہر نایاب کہاں سے ڈھونڈا؟

انور جاوید ہاشمی (کراچی)

گذشتہ شمارہ

فنون میں حرفِ اوّل کے عنوان سے جو تحریر شامل ہوتی ہے، اسے محض اداریہ نہیں بلکہ پورے میگزین کی جان کہنا چاہئے۔ یہ جاننا انتہائی ضروری ہے کہ ادبی مجلے کا اداریہ اخبارات کے وقتی نوعیت کے اداریے سے حد درجہ مختلف ہوتا ہے۔ یہ حقیقت باعثِ اطمینان ہے کہ فنون کے حرفِ اوّل ہمیشہ اہم ترین امور، شخصیات، مسائل یا ادبی رجحانات پر مبنی ہوتے ہیں، اس موضوع پر اس حد تک تنوع ہے کہ قاری مدیر کی یکساں گفتگو سے بچ جاتا ہے جو اکثر رسائل کا پسندیدہ طریقہ ہے۔ مثلاً شمارہ ۲۷ میں "ہمارے مخاطب کون ہیں؟" جیسا ہمہ گیر موضوع حرفِ اوّل کے تحت آیا ہے۔ اس میں فاضل مدیر نے ذیلی عنوانات کے ذریعے نہایت واضح انداز میں ادبی مسائل کی گرہ کشائی کی ہے۔ ان عنوانات پر سرسری نگاہ ڈالنے سے ہی مدیر کی علمی فضیلت اور ادبی کمال کا معترف ہونا پڑتا ہے: "ہمہ گیر تحسین ناممکن ہے۔" "تعلیم اور تحسینِ فن لازم و ملزوم" "فن کار کا اپنے مخاطبین سے تعارف" یہ وہ امور ہیں جن کا جاننا ادب کے قارئین کے لئے بالعموم اور ادیبوں کے لئے بالخصوص انتہائی ضروری ہے۔ ایک یا ڈیڑھ صفحے کے اِن اداریوں میں اختصار کے ساتھ اُن موضوعات پر کھل کر بات کرنا ممکن نہیں لیکن فنون کے اداریوں میں دریا کو کوزے میں بند کر دیا جاتا ہے اور مسائل و موضوعات پر اشاروں اور اختصار کی مدد سے قاری کو متوجہ کیا جاتا ہے۔ ادب کے قاری اور اخبار کے سرسری مطالعہ کے عادی قاری میں بہر حال فرق ہوتا ہے، اس لئے ادبی رسائل کے اداریے متنوع اور کثیر المقاصد ہوتے ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں ہرگز تامل نہیں کہ فنون کے حرفِ اوّل مدیر کے تبحرِ علمی کے آئینہ دار ہوتے ہیں، شمارہ ۲۸ میں "منٹو کی یاد میں" ایک بلند پایہ اور فکر انگیز اداریہ ہے .... "میری رائے یہ ہے کہ جب تک ان حضرات کو منٹو کے افسانوں میں پھیلی ہوئی بد اخلاقی کی دھند میں اخلاق کا وہ چمکتا ہوا تارا نظر نہیں آئے گا، جس کی دریافت نے منٹو کو بڑا اور سچا افسانہ نگار بنایا، اس وقت تک منٹو کے فن کے جائزے اور اس کے کرداروں کے تجزیے خام نہیں تو ادھورے ضرور رہیں گے۔" یہ مدیر کے اندازِ تخاطب کا کمال ہے کہ اس نے قاری کو ایک اہم مسئلے کی طرف متوجہ کیا اور پھر اس مسئلے کا حل قاری پر چھوڑ دیا۔

"وفیات" کے عنوان سے مرحوم ادیبوں کی یاد میں محض الفاظ کا ذخیرہ جمع نہیں ہوتا، بلکہ مختصر انداز میں خلوصِ دل سے انہیں ہدیہ عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔ یہ چند سطور بڑے بڑے "مخصوص گوشوں" پر بھاری ہوتی ہیں۔ خود میں نے شیر افضل جعفری مرحوم پر متعدد مضامین لکھے ہیں جو مختلف رسائل کی زینت بنے لیکن فنون شمارہ ۲۸ میں اُن کے بارے میں پانچ سطور دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے جذبات کی آئینہ دار ہیں۔ جو اس درویش منش قلندر صفت شاعر کے لئے موزوں ترین ہیں ..... اس سے ایک اقتباس قابلِ غور ہے۔

"شیر افضل جعفری مجسم شرافت تھے اور اس گئے گزرے دور میں بھی دوستی اور خلوص کے رشتوں کا احترام عبادت کی حد تک کرتے تھے۔ مجید امجد اور جعفر طاہر کے بعد شیر افضل کی رحلت نے بظاہر جھنگ کو ویران کر دیا، مگر دراصل اُردو میں ایک دلاویز نوعیت کے طرزِ سخن کا باب ختم ہو گیا۔" کاش ہمارے ادیبوں اور ادبی رسائل کے مدیرانِ گرامی کو مرحوم ادیبوں کے بارے میں اس طرز کے چند فقرے لکھنے کے توفیق ہو۔

شمارہ: ۲۹ کا اداریہ سجاد سرور نیازی کے بارے میں ہے۔ اس موضوع پر فاضل مدیر نے ایک منفرد انداز کے حامل فنکار کے اسلوب پر روشنی ڈالی ہے۔ لیکن ایک بات کی طرف توجہ مبذول کرانا ضروری ہے کہ "باقی حرفِ اوّل صفحہ ۳۸۲ پر ملاحظہ فرمائیے"

فنون کی اعلیٰ روایات سے مطابقت نہیں رکھتا۔ حرفِ اوّل بہر طور مسلسل ہونا چاہیئے۔

حمد و نعت کا انتخاب عقیدت کا مہکتا ہوا گلدستہ ہے، جو ذہنوں کو بالیدگی اور قلب و نظر کو طراوت فراہم کرتا ہے۔

انڈالوجی (۴۰) اساطیر (۱) ایک مفید علمی مقالہ ہے جو لائق مصنف کی علمی فضیلت اور تحقیقی کمال کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

"مشاہیر بہاولپور پر ایک نظر"۔ ایک معلومات افزا مقالہ ہے۔ غالب انگریزی عملداری اور شاہ ولی اللہ کی تحریک" تاریخی حوالے سے یہ مضمون حقائق کو منظرِ عام پر لا کر قاری کو حقیقی صورتِ حال سے روشناس کراتا ہے۔ اس موضوع پر ایک جامع کتاب بھی آ چکی ہے: "غالب اور انقلاب اٹھارہ سو ستاون" جس کے مصنف ڈاکٹر سید معین الرحمٰن ہیں۔ مذکور بالا مضمون اسی تسلسل کی ایک کڑی ہے، جسے فاضل مضمون نگار نے اپنے خاص انداز میں تحقیق کی روشنی میں پیش کیا ہے۔

اُردو ادب کے طالب علم کی حیثیت سے میں نے مضمون "اردو کا پہلا افسانہ نگار" انتہائی مفید پایا ہے۔ مصنف نے تحقیق کے ذریعے ثابت کیا ہے کہ سید سجاد حیدر یلدرم اردو کے پہلے افسانہ نگار ہیں، اس طرح ایک پرانے مفروضے کا خاتمہ ہو گیا، جس کے مطابق پریم چند کو اردو کا پہلا افسانہ نگار قرار دیا جاتا رہا۔ یہ مضمون تحقیق کی عمدہ مثال ہے۔

۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو غالب کی وفات ہوئی۔ اتفاق سے فنون شمارہ ۲۹ بھی ۱۵ فروری کو ملا۔ اس میں غالب کے فکر و فن پر دو بلند پایہ مقالات شامل ہیں۔ اردو کے عظیم ادیبوں اور شاعروں کے ادبی مقام پر تحقیق اور تنقید کی شمع روشن رکھنا ایک ایسا منصب ہے جس میں ادارہ فنون کا کوئی شریک نہیں۔ "غالب کا نظریہ شعر" غالب کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ لگانے میں صحیح سمت میں رہنمائی کرتا ہے۔ "غالب کے نظریہ شعر کو سمجھنے کی ضرورت اس لئے ہے کہ اولاً تو غالب کی شخصیت متقدمین، معاصرین اور متاخرین سب میں منفرد و ممتاز ہے۔ ثانیاً ان کی فکر اور اسلوب دونوں میں وہ تنوع ہے جو کہیں اور نہیں ملتا۔ ثالثاً ان کا احساس جمال ماورائی نہیں ارضی ہے۔ رابعاً وہ روایت شکن اور مجتہد ہیں خامساً فارسی گویان اور ریختہ گویان دونوں میں ان کا مقام اس لئے بلند ہے کہ تخیل کے آمیزے میں تفکر اور جذبے کو جس طرح وہ خمیر کرتے ہیں کوئی دوسرا شاعر اس پر قادر نہیں" یہ غالب پر یہ ایک جامع مضمون ہے، جس میں غالب کے نظریۂ شعر کا مکمل احاطہ کیا گیا ہے۔

اسی طرح "سعادت حسن منٹو اور روسی ادب" منٹو پر ایک نئے انداز سے کام کا پیش خیمہ بن سکتا ہے، اس موضوع پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ درحقیقت منٹو کے افسانوں پر نگاہِ عکس ریز ڈالنے کی اشد ضرورت ہے۔ منٹو کے فکری اور فنی ارتقاء کے سلسلے میں یہ مضمون تمام ماخذ منظرِ عام پر لانے میں کافی حد تک مددگار ہے۔ "فیض اور اردو شاعری میں رنگ کی روایت" مسلسل مضمون ہے اس کی پہلی قسط پڑھی۔ تحریر میں روانی اور موضوع سے مطابقت متوجہ کرتی ہے۔

شمارہ ۲۹ کا حصہ مقالات بے حد زوردار اور مفید ہے۔ یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ اس دفعہ حصہ مقالات ہی فنون میں اولیت کا حامل ہے۔ درحقیقت اس قدر بلند پایہ علمی، ادبی اور تحقیقی مقالات نے فنون کو دنیائے ادب میں وہ مقام عطا کیا ہے جو اوروں سے تقلیداً بھی ممکن نہیں۔ اس حصہ میں شامل ہر تحریر اپنی افادیت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے اور یہ محقق افقِ ادب پر تابندہ ستاروں کی مانند ہیں، جن کی ضیاء پاشیوں سے اردو ادب کے طالب علموں کو ٹامک ٹوئیاں مارنے سے نجات مل گئی۔ تنقید و تحقیق کی یہ روایت فنون کا طرۂ امتیاز ہے۔

گذشتہ شمارہ ۲۸ میں خالد اقبال یاسر کا مضمون "جدید پنجابی نظم کی تین آوازیں" جدید اردو اور پنجابی ادب پر

ان کی گہری نظر کا غماز تھا۔ غلام حسین ساجد، مشتاق صوفی اور نجم حسین سید کی شاعری پر مشتمل یہ خوبصورت تنقیدی مضمون ہے۔ وہ پاکستان کی علاقائی زبانوں کے ادب کو ملکی یک جہتی کے لیے ناگزیر تصور کرتے ہیں وہ کہتے ہیں "یہ بات ایسی حیران کن نہیں ہونی چاہیئے کہ ہمارے ادب اور فنونِ لطیفہ میں کسی باقاعدہ اعلان نامے پر مخصوص لوگوں کے دستخط کئے بغیر ایک ایسی ادبی تحریک فطری طور پر پھل پھول رہی ہے جو ہمارے اجتماعی شعور کی عکاس ہے، بالکل اسی طرح جیسے اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ہمارے صوفی شعرا اور سیاسی مفکرین برصغیر کے دور افتادہ گوشوں میں ایک دوسرے سے کسی رابطے کے بغیر ایک جیسے افکار اور نظریات کا تخلیقی اور فکری سطح پر احیاء کرنے میں مصروف تھے۔ یہ محض اتفاق نہیں ہو سکتا کہ سندھ میں شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ، سرحد میں رحمان بابا، پنجاب میں بلھے شاہ اور وسط ہند میں شاہ ولی اللہؒ کے عہد اور اندازِ فکر میں اس قدر یکسانیت ہو۔ اسی طرح آج بھی کراچی سے لے کر پشاور تک فنونِ لطیفہ اور ادب کی مختلف اصناف کے اسلوب میں لوک تہذیبی ایمائیت کا دستک دیئے بغیر در آنا بلاوجہ نہیں ہو سکتا"، صفحہ ۳۸۰ فنون ۲۷ (۱۹۸۸ء) میری دعا ہے کہ ارضِ وطن کے باشندوں میں یہ سوچ پروان چڑھے اور نمو پائے۔ ملی اتحاد اور قومی یک جہتی آج اقتضائے وقت ہے، ہمارے ادیبوں اور شاعروں کی یہ تعمیری اور مثبت سوچ ہر لحاظ سے لائق تحسین اور قابلِ فخر ہے۔

"پاکستانیت اور اردو کا نثری ادب" (ص ۱۹۹ فنون دسمبر ۱۹۸۶ء) فکر و نظر کے لئے مہمیز کا درجہ رکھتا ہے خالد اقبال یاسر نے اس مضمون میں ادیبوں اور دانشوروں کو ان کے فرائض کی جانب متوجہ کیا ہے: "کسی ملک کی تعمیر و ترقی اور علمی و ثقافتی روایتوں کی تشکیل، فروغ اور استحکام اس ملک کے ادیبوں اور دانشوروں کے فرائض میں داخل ہے۔ انہیں حق حاصل ہے کہ زندگی کے بارے میں اپنی آزادانہ رائے کا اظہار کریں ان کا منصب معاشرے پر تنقید اور قومی ضمیر کا تحفظ ہے تاکہ معاشرہ اپنی کوتاہیاں پہچان کر مثبت اور صحت مند راستوں پر گامزن رہے۔" میں سمجھتا ہوں کہ وطنِ عزیز کے موجودہ حالات اس امر کے متقاضی ہیں کہ ادیب اور دانشور اپنی ذمہ داریاں اور فرائض بطریقِ احسن بنھائیں تاکہ قومی اقدار اور ملی تشخص کو برقرار رکھا جا سکے اور علاقائی، لسانی اور فرقہ وارانہ عصبیتوں کا سر کچلا جا سکے۔

فنونِ لطیفہ پر تینوں مضامین موضوع کی مناسبت سے موزوں ہیں۔ رام لال کا سفر نامہ (صفحہ ۱۲۵ شمارہ ۲۹) مخصوص سوچ اور عجیب دلچسپیوں کا مرقع ہے لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی اور خدا جانے اس کی تہہ میں کونسی سوچ کارفرما ہے۔ "ہندوستان ایک ہزار سال کی غلامی کے بعد قریباً ایک سو سال کی سیاسی جدوجہد کے بعد ابھی چالیس سال پہلے آزاد ہوا ہے"......

۳۲۲ ق.م تا ۱۸۲ ق.م، برصغیر میں موریا خاندان کی حکومت تھی۔ زندگی کا تیز گام کارواں چلتا رہا۔ اس کے بعد ۱۲۰ء تا ۱۶۲ء کنشک کا دورِ حکومت آتا ہے۔ یہ سلسلہ مختلف صورتوں اور مختلف حکمرانوں کی شکل میں راجہ داہر تک چلتا رہا۔ یہاں تک کہ آفتابِ اسلام کی ضیا پاشیوں سے اکنافِ عالم کا کونہ کونہ منور ہو گیا۔ تاریخ پاکستان و ہند کا بے حد اہم اور عہد آفریں موڑ ورودِ اسلام تھا جس کی بدولت یہاں سے ISOLATION کی وہ فضا ختم ہو گئی، جو ہندوؤں نے یہاں مسلط کر رکھی تھی۔ یہاں کے باشندے دولتِ اسلام سے فیض یاب ہوئے اور

اس طرح معاشرے کی کایا پلٹ گئی۔ یہاں کے باشندوں میں اسلام کے حیات آفریں پیغام کے اعجاز سے احتسابِ ذات، بالغ نظری، ثقافت آشنائی، علم دوستی اور نفاست ظہور پذیر ہوئی۔ برِصغیر میں اسلام کا پیغام حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں پہنچ چکا تھا۔ لیکن بالآخر راجہ داہر کی شکست کے بعد یہاں اسلام کا بول بالا ہوا اور اس طرح ۷۱۲ء میں سندھ جو ہند کا تقدیر گر تھا، اسلام کے زیرِ نگیں آ گیا۔ مقامی باشندے جوق در جوق حق کی آواز پر لبیک کہنے لگے۔ غزنوی، غوری غلاماں خاندان، خلجی خاندان، تغلق خاندان، سادات، لودھی اور مغلیہ خاندان تک یہ عرصہ ۱۱۴۵ سال بنتا ہے، اس عرصے کو دورِ غلامی قرار دینا حقائق سے چشم پوشی کے مترادف ہے۔ تاریخ کے اوراق میں یہ بات محفوظ ہے کہ برِصغیر پر مسلمانوں کی حکمرانی کے دور میں یہاں ہندوؤں کے ساتھ منصفانہ سلوک کیا جاتا تھا نہ کہ جیسے اب بھارت میں ہندو حکومت کے عہد میں جو صورتِ حال ہے۔ بابری مسجد اس سلسلہ کی حالیہ مثال ہے۔ یہ فہرست بہت طویل ہو جائے گی۔ پوری دنیا ان حقائق سے آگاہ ہے کہ ہندو اکثریت نے مسلم اقلیت کا ہندوستان اور مقبوضہ کشمیر میں کیا حشر کر رکھا ہے۔ یہاں تک کہ اکبر نے تو راجہ مان سنگھ کو افواج مغلیہ کا سالارِ اعلیٰ مقرر کیا۔ ان خونچکاں واقعات کا علم کسے نہیں کہ برِصغیر پر ظلم و استبداد کی جو سیاہ رات ۱۸۵۷ء میں مسلط ہوئی وہ ہندوؤں کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ تھا۔ سانحہ ۱۸۵۷ء کے بعد برِصغیر کے نہتے مسلمانوں پر مظالم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ـــــ جب برطانوی استعمار کے خون آشام پنجے مسلمانوں کی گردنوں تک پہنچ چکے تھے ہندو محفوظ تھے، یہاں تک کہ مسلمانوں کو طویل عرصہ تک غنڈہ گردی کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔ ایک منظم منصوبہ بندی کے ذریعے سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی اعتبار سے مسلمانوں کی بیخ کنی اور قلع قمع کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی۔ اس صورتِ حال کا ڈاکٹر ہنٹر نے اپنی کتاب OUR INDIAN MUSLIMS میں تفصیلی نقشہ کھینچا ہے۔ یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ برطانوی استعمار کے ظالمانہ استحصالی نظام نے اپنی مقصد براری کے لئے برِصغیر کے ہندوؤں کی حمایت حاصل کر لی، کیونکہ دونوں قوتوں کا ہدف مسلمان تھے اور دونوں کے مفادات یکساں تھے۔ ہندوؤں نے اپنے سودی کاروبار کا ایک جال پھیلا رکھا تھا اور مسلمان انتہائی سادگی سے اُن کی عیاری کی بھینٹ چڑھتا چلا آ رہا تھا۔ ایک مورخ جادو ناتھ سرکار نے تو برِصغیر پر برطانوی تسلط کو ہندوؤں کے لیے ایک انقلاب سے تعبیر کیا اور کیشب چندر سین نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ " برِصغیر پر انگریزوں کا غلبہ محض ایک فتح نہیں تھی بلکہ یہ ہندوؤں کے لئے آزادی تھی "۔ دراصل یہ مظلوم مسلمان تھے، جنہوں نے آزادی کے حصول کے لیے قربانیاں دیں۔ میں سفرنامہ " ننھی جل پری کے دیش میں " کے خالق سے مدیر فنون کے توسط سے گزارش کروں گا کہ سو سال کی جس جدوجہد آزادی کا آپ تذکرہ فرما رہے ہیں اس کی کیا حقیقت ہے؟ میری استدعا ہے کہ فنون کے صفحات کو اس قسم کے یک طرفہ اسلوب کے حامل ادیبوں کے منفی اندازِ فکر سے بچائیں۔ میں نے اپنے دل کی بات کہہ دی ہے۔ ریکارڈ کی درستی بھی مقصود تھی۔

نظموں میں سے " ہجرت "، " آبِ حیات، " " یہ سوادِ قریۂ جاں مرا "، اور " شہرِ نفاق " نے متاثر کیا۔ قائم نقوی کیوں فنون سے غیر حاضر ہیں ان کی نظمیں، " دروازہ کھلا رکھنا " اور " اے اسرافیل آ " جو فنون دسمبر ۱۹۸۶ء میں شامل تھیں آج بھی بار بار پڑھنے کا تقاضا کرتی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے ادیب اور دانشور ان اسباب کا کھوج لگائیں جو بے یقینی اور اضطراب کے محرک بنتے ہیں جن کے باعث قوتِ عمل مسدود

ہو جاتی ہے۔ یہی وہ دلخراش کیفیت ہے جو حساس شاعر کو سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ حالات کی سنگینی اس جانب متوجہ کرتی ہے کہ ہم نوشتۂ دیوار پڑھیں۔

اب وہ یقین وہ صلابت کہاں سے لاؤں۔
جس کے دم سے ہر پل دائمی لگتا تھا۔
ہر شے بامعنی ہوتی تھی۔
اب دھند ہے اور سناٹا ہے۔
اور نامعلوم مسافت ہے۔
اور دُور آفاق پہ لکھی ہوئی،
اک بے مفہوم عبارت ہے

(ایک اداس لمحے کی نظم ـــ احمد ندیم قاسمی)

افسانوں میں سے "جس رات ستارے ٹوٹے" اثر آفرینی کے اعتبار سے بے مثال ہے۔ "چابی" میں جنس کی آمیزش سے اثر کو دو آتشہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہیں کہیں منٹو کے اثرات نمایاں بھی مگر مثبت انداز میں افسانہ "بدمعاش میاں" بہت موثر ہے۔ اس میں مثبت انداز میں اصلاح کا پہلو بھی موجود ہے۔ افسانہ نگار کی محنت کا معترف ہونا پڑتا ہے۔ لیکن اسلوب میں کسی حد تک عریانی محل نظر ہے۔

"پاؤں تلے آدمی" ایک عمدہ افسانہ ہے۔ علی تنہا کے افسانوں کے کردار متوسط طبقے کے یا دیہات کے سادہ اور کھرے لوگ ہیں جو سادہ خمیر اور سچے ضمیر کے ساتھ زندگی کی تلخیوں اور آلام و مصائب کے سامنے سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔ اس افسانے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ افسانہ نگار کا فن مسلسل مائل بہ ارتقاء ہے۔ "بہشت میں پہلا قدم" ایک کامیاب انشائیہ ہے۔ نئے انشائیہ لکھنے والوں کو اس طرح کافی رہنمائی فراہم ہو سکتی ہے۔

حصۂ نظم و غزل حسبِ معمول کی جان ہے۔

رانا غلام شبیر۔ جھنگ شہر

فنون کا تازہ شمارہ نظر سے گزرا، حمد و نعت کے بعد نظر جناب رشید ملک کے مقالے "اساطیر" پر ٹھہرتی ہے، یہ مقالہ معلومات کا گنجینہ ہے اور مجھ جیسے تحقیق ناآشنا کے لیے ایک قیمتی دستاویز۔ اس سلسلے کے مزید حصوں کا انتظار رہے گا۔

کاظم صاحب نے مسعود حسن شہاب دہلوی کی کتاب "مشاہیر بہاولپور" پر بڑی گہری اور متنوع نظر ڈالی ہے۔ مقالہ "غالب انگریزی عملداری اور شاہ ولی اللہ کی تحریک" "غالبیات" کے سلسلے کی عمدہ کڑی ہے جس میں جناب محمد علی صدیقی نے غالب کی زندگی کے کئی گوشے منور کئے ہیں اس کے لئے انہیں یقیناً داد ملنا

چاہیے، "اردو کا پہلا افسانہ نگار" کے عنوان کے تحت ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے جس کڑی محنت کے بعد حقائق تلاش کیے ہوں گے اس کے لیے ان کی اس محنت کا اعتراف نہ کرنا ادبی بخل ہوگا۔

"سعادت حسین منٹو اور روسی ادب" ڈاکٹر برزج پریمی کا ایک پرمغز مقالہ ہے۔ جس کے مطالعے کے بعد نہ صرف منٹو کی زندگی کے مختلف ادوار سامنے آتے ہیں، بلکہ منٹو پر کیے گئے تحقیقی کام پر بھی مرحلہ وار روشنی پڑتی ہے جو یقیناً نقادوں، محققوں اور دانش وروں کے لیے تحقیق اور تلاش کے نئے در وا کرے گی۔

اس دفعہ فنون میں "فیض اور اردو شاعری میں رنگ کی روایت" کے عنوان سے شامل شاہین مفتی کا مقالہ ایک منفرد اور عظیم مقالہ ہے۔ اس مقالے میں مجھے دو خاص باتیں نظر آئیں ایک شاہین مفتی کا انداز بیان اور دوسرا اردو شاعری کا مرحلہ وار تذکرہ۔ اس مقالے کی دوسری قسط کا انتظار رہے گا۔ مجھے امید ہے کہ شاہین مفتی یہ سلسلہ جدید شعرا تک لائیں گے۔

ڈاکٹر آغا سہیل کا مقالہ "غالب کا نظریۂ شعر" غالب کی فکر پر ایک دقیق تحقیق ہے جو ان راہوں پر سفر کرنے کے لیے مشعل کا کام دے گی۔ بلاشبہ غالب ادب کی منزلوں کا وہ سنگِ میل ہے جس نے نہ صرف فنی اعتبار سے شاعری کو ایک نئی جہت عطا کی بلکہ فکر کو بھی نئی وسعتوں سے ہمکنار کیا۔

مقالات کے بعد غزلیات کا حصہ اوّل سامنے آتا ہے۔ جو اس دفعہ ترتیب کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ اپنے مواد کے لحاظ سے بھی اوّل قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس حصے میں شامل کہنہ مشق اور مشاق شعراء کا فکر و فن قدم قدم پہ نت نئے پھول کھلاتے نظر آتے ہیں۔ اس حصے کی خاص بات عصری فکر کا خوبصورت اظہار، خوبصورت تشبیہوں، منفرد استعاروں اور خوبصورت لفظی ترکیبوں کا چناؤ ہے۔ جناب امتیاز علی خان (شارجہ) کی طرح اگر مجھے شعری انتخاب کی قلم زدگی کا ڈر نہ ہوتا تو یقیناً اس حصے سے بیس پچیس اشعار ایسے نکالے جا سکتے ہیں۔ جنہیں قندِ مکرر کے طور پر سنا اور چھاپا جا سکتا ہے۔

افسانوں میں انور عنایت اللہ نے "آج اور کل" کو جس منظر میں فٹ کیا ہے وہ آج کا منظر ہے۔ زندگی کی امنگ اور جینے کی تمنا اس افسانے کی پہچان ہے۔ موصوف نے کرداروں کے حوالے سے جن معاشرتی، معاشی اور سماجی مسائل کا ذکر کیا ہے۔ وہ بلاشبہ آج کے مسائل ہیں۔ سلطان جمیل نسیم کے افسانے کا پلاٹ بڑی خوبصورتی سے بُنا گیا ہے۔ اس افسانے کی کہانی قاری کو ساتھ ساتھ لیے آگے بڑھتی ہے۔ عطیہ سید نے "شہر ہول" کے نام سے اس معاشرے کا پردہ چاک کیا ہے جسے ہم آج بھی سر و سامان سجائے پھر رہے ہیں اور جسے ایک مثالی، جمہوری اور آزاد معاشرے کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس افسانے کے کرداروں کی ٹوٹ پھوٹ، اصل میں اس معاشرے کی ٹوٹ پھوٹ ہے۔ محمد جمیل آفاقی نے صغریٰ کے افسانے کا بنیادی موضوع انسان کی سرشت میں چھپا ہوا مثبت کردار کا وہ پہلو ہے جسے ہم اکثر نظر انداز کرتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر کا افسانہ "جس رات ستارے ٹوٹے" ایک شاندار افسانہ ہے۔ انہوں نے جس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اس کی زمین خشک اور سنگلاخ ہے۔ مگر یہ ڈاکٹر صاحب کا کمال ہے کہ انہوں نے اپنی فنکارانہ چابک دستی سے اس زمین کو نخلستان میں تبدیل کر دیا۔ میرے نزدیک اس افسانے کے پس منظر میں جو واقعات جھلکتے ہیں ان پر سوچنے کی ضرورت ہے۔ اسد محمد خان کو میں ایک عرصہ سے پڑھ رہا ہوں، ان کا ہر افسانہ پلاٹ کے اعتبار

ے انسان کو ایسے ماحول میں لے جا کر کھڑا کرتا ہے۔ جس کا خیال عام طور پر ذہن میں موجود نہیں ہوتا۔ اس دفعہ بھی انہوں نے مردہ خانے میں مکاشفہ لکھ کر ایک منفرد پلاٹ پر کامیاب افسانہ لکھا ہے۔

اس دفعہ نیلوفر اقبال کے دو افسانے "بدمعاش میاں" اور "چابی" شامل اشاعت ہیں۔ "چابی" کو پڑھنے کے بعد "بدمعاش میاں" کی چمک کچھ کم ہو جاتی ہے۔ دونوں افسانے موضوع کے لحاظ سے اردو فکشن کی اعلیٰ قدروں کے ترجمان ہیں، نیلوفر اقبال کے اسلوب نے مجھے یہ افسانے دوبارہ پڑھنے پر مجبور کیا ہے۔

جناب علی تنہا کا افسانہ "پاؤں تلے آدمی" (سچی بات ہے) سر پر سے گزر گیا۔ میں نے اسے اول سے آخر تک پڑھا مگر میری سمجھ میں یہ نہ آیا کہ مصنف کیا کہنا چاہتے ہیں۔ ضیا بٹ کا افسانہ "چھیا" خوبصورت افسانہ ہے جو معاشرتی سطح پر سوچنے کے لیے کافی مواد بہم پہنچاتا ہے۔ افسانوں کے سلسلوں کی آخری کڑی نوجوان افسانہ نگار ظفر شہزاد نے "بندھے ہوئے لوگ" میں ایک اہم موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔

ضیاء جالندھری کی نظم "شہرِ نفاق" انور مسعود کی "یہ مواد قریۂ جاں" نغمگی اور آہنگ کے ارتباط سے خوبصورت شہہ پارے ہیں۔ ادیب سہیل نے "خوف کی دانائی" کے عنوان سے ایک خوبصورت نظم تراشی ہے۔ ہڑپہ کے نام سے علی اکبر عباس کی نظم سوچ کا نیا در وا کرتی ہے۔

اختلافات میں رشید ملک کے مراسلے بعنوان "مذہب اور سائنس" کے موضوع کی اہمیت نے توجہ کھینچ لی۔ اور اب ایک نظر فنون کے دوسرے حصے کی نظموں پر۔ محترمہ پروین شاکر کی نظم "ایک اداس نظم" پڑھ کر دل واقعی اداس ہو جاتا ہے۔ یہ ایک بھرپور تاثراتی نظم ہے۔ "چاچا جان" کے متعلق مقبول عامر کی نظم ہمارے سیاسی سماجی اور فکری نظام کے لیے سوچ کا کافی مواد مہیا کرتی ہے۔ اگرچہ منصورہ احمد کی دونوں نظمیں "مجھے راستہ نہیں ملتا" اور "میں مجرم ہوں" خوبصورت تخلیقات ہیں۔ لیکن "میں مجرم ہوں" میں انہوں نے نسوانی سوچ کو جس نسوانی رنگ میں پیش کیا ہے وہ بھرپور ستائش کے قابل ہے۔ اشرف جاوید کی نظم فکر و فن کا حسین مرقع ہے۔ جسے بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ لہو کی مہکتی ہوئی لہر کو احمد لطیف نے اختر حسین جعفری کی نذر کیا ہے

احمد لطیف کی نظموں کا آہنگ اور تاثر قابلِ توجہ ہے۔ اس کی نظموں کا ہر لفظ موتیوں کی طرح سامنے آتا ہے اور آخر میں ایک خوبصورت خیال فکری پہنائیوں میں بکھیر جاتا ہے۔ "تو نے کیا دیکھا ہے" کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے احمد لطیف نوجوانوں کی صف سے نکل کر بزرگوں کی صف میں جا رہے ہیں۔ جو ایک اچھی مثال ہے۔

افتخار بخاری صاحب نے اڑتے ہوئے کاغذ پر نظم کو بطور علامت استعمال کر کے ایک اچھا تاثر اور خیال قلم بند کیا ہے۔ ان کی دوسری نظم "نظم اتفاقاً مل جاتی ہے" بھی خوبصورت ہے۔ کاوش عباسی کی نظم "بیٹی بور ہو رہا ہو" فنی اور فکری اعتبار سے ایک اچھی کاوش ہے۔ یوں تو اعجاز رضوی کی چاروں نظموں کو خوبصورت کہا جا سکتا ہے۔ مگر "محاذ زندگی" اس لیے خوبصورت ترین ہے کہ اس میں ہر شخص کو اپنی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ سید یٰسین قدرت کی "اسے کہنا" عمدہ نظم ہے جسے بار بار پڑھنے کو جی چاہا۔ محمد منصور آفاق کی نظم "ایڑیوں کے بل چلنے کی اذیت" اگرچہ فنی اعتبار سے ایک خوبصورت نظم ہے۔ مگر فکری اعتبار سے آپ اسے کیا کہیں گے؟ ان کی دوسری نظم "عہد خوف میں تربیت پانے والی شاعری" میں وطن عزیز کے پچھلے دس سال جھلک رہے ہیں۔

یوسف عزیز نے "یرقان" کو علامت بنا کر ماحول کے جس کرب کا ذکر کیا ہے۔ وہ ایک منفرد خیال ہے۔

شاہدہ ناز نے بڑی فنکارانہ مہارت سے پنجاب کی جس حسین روایت کو اپنی نظم "مشرقی لڑکیاں" میں پیش کیا ہے اس کے لیے وہ ڈھیروں داد کی مستحق ہیں۔ نظم کے آخری شعر سے جو بے ساختگی اور سچائی ٹپکتی ہے۔ وہ خوب بلکہ خوب تر ہے۔

اقبال ناظر۔ جہلم کینٹ

آلِ ابراہیم کی تفسیر اور اقبال کا نظریۂ تقدیر ـــ ایک ناخوشگوار بحث

ابو العلا معرّی کی بیدینی کے حوالے سے "فنون" (جون جولائی ۸۹ء) میں اپنے ایک مراسلے میں، میں نے لکھا تھا کہ قرآن میں آل کی اصطلاح متعدد مقامات پر استعمال ہوئی ہے اور جہاں کہیں بھی استعمال ہوئی ہے۔ اس سے مراد پیروکار اور [illegible]ن ہیں۔ بنو ہاشم کے پروپیگنڈے کا اثر یہ ہے کہ آج بھی آلِ فرعون (قرآن) اور آلِ لوطؑ (قرآن) سے مراد لوطؑ اور فرعون کے پیروکار ہوں تو ہوں آلِ محمدؐ سے مراد آنحضرت کے رشتے دار ہی ہیں۔

'فنون' کے ایک قاری سید نور محمد قادری صاحب نے اس بحث کو ناخوشگوار محسوس کیا اور لکھا ہے کہ قرآن میں یہ اصطلاح اولاد اور خاندان کے معنوں میں بھی آئی ہے۔ مثلاً فقد اتینا ال ابراہیم الکتاب والحکمہ (النسأ) اور قرآن کے سبھی مستند مترجمین شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر، محمود الحسن، احمد رضا خان، اشرف علی تھانوی وغیرہ نے اس آیت کا ترجمہ کرتے آل کا ترجمہ اولاد اور خاندان ہی کیا ہے۔

ہم نے حضرت ابراہیم کے خاندان کو کتاب بھی دی ہے اور علم بھی دیا ہے۔ اشرف علی تھانوی

تو ہم نے ابراہیم کی اولاد کو کتاب اور حکمت عطا فرمائی۔ احمد رضا خان

کیا یہ سب مترجمین عربی زبان سے لابلد اور ناواقف محض ہیں یا حبِ علیؓ سے سرشار ہو کر انہوں نے ایسا کیا ہے؟

بلاشبہ یہ سب مترجمین عربی زبان سے لابلد اور ناواقف ہرگز نہیں، باعتبار لغت انہوں نے درست ترجمہ کیا ہے لیکن یہ حبِ علیؓ سے سرشار چہ معنی؟ کیا رسولؐ کے بارہ چچاؤں میں سے، صرف ایک چچا کے چار بیٹوں میں سے صرف ایک بیٹا، رسول اللہؐ کا خاندان یا اولاد ہے؟ کیا خاندان و اولاد کا لفظ ہم ہمیشہ اسی مفہوم میں استعمال کرتے ہیں؟ اگر خاندان سے مراد وہ افراد ہیں جو آپس میں نسلی قرابت قریبہ رکھتے ہیں تو عبداللہؓ (والد ماجد رسول اللہؐ) کے دادا ہاشم اور حرب (والد ابوسفیان) کے دادا عبدالشمس آپس میں نہ صرف سگے بلکہ جڑواں بھائی تھے۔ اس طرح کا رشتہ اگر ہمارا کسی سے ہو تو ہم کبھی اسے اپنے خاندان سے باہر کا نہیں سمجھتے لیکن جب رسول اللہؐ کے خاندان کی بات ہوتی ہے تو ہم سخن سازیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

پھر آیتِ منقولہ میں لفظ آل کا ترجمہ خاندان و اولاد کر بھی دیا جائے کہ عربی لغت اس کی اجازت دیتی ہے اور یہی مفہوم تسلیم کر بھی لیا جائے تو اس حوالے سے خاندان و اولاد سے وہ لوگ مراد ہوں گے جن کا سلسلۂ نسب براہِ راست حضرت ابراہیمؑ سے ملتا ہے یعنی جو اُن کی صلبی اولاد ہیں۔ آلِ ابراہیمؑ میں حضرت ابراہیمؑ کے بھائیوں کی اولاد شامل نہ ہو گی۔ ہم آلِ اسحٰقؑ کو آلِ اسماعیلؑ اور آلِ اسماعیلؑ کو آلِ اسحٰق نہیں کہتے۔ حالانکہ اسحٰقؑ اور اسماعیلؑ ایک دوسرے کے ابنِ عم

نہیں ابن اب تھے۔ دریں صورت خاندان کے ایک مفہوم (صلبی اولاد) کو خاندان کے ایک دوسرے مفہوم (رشتے دار) کا حوالہ کیونکر بنایا جا سکتا ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ آلِ ابراہیمؑ (صلبی اولاد) کا ترجمہ خاندانِ ابراہیمؑ کیا گیا ہے اس لیے خاندانِ محمدؐ (رشتہ دارانِ محمدؐ) کو آلِ محمدؐ کہنا درست ہے۔

عربی زبان میں آل کا لفظ اولاد اور خاندان کے معنوں میں شروع سے بولا جاتا چلا آیا ہے۔ "آل کی اصل اہل ہے اور اس کی تصغیر اہیل، تو اس کی ہا الف سے بدل گئی اور اہل سے آل بن گیا۔ (کشاف۔ زمخشری)۔ اہل کے ایک معنی بیوی بچوں کے بھی ہیں۔ تاہل کے معنی تزوج اور متاہل کے معنی بیوی بچوں والا ہونا کے ہیں۔ اردو زبان میں اہلیہ کا لفظ استعمال ہی بیوی کے لئے ہوتا ہے۔ لفظ اہل کسی ایک وصف سے موصوف یا جگہ سے منسوب افراد کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ اسی معنی میں اہلِ اسلام، اہلِ کتاب، اہلِ وفا، اہلِ بدعت، اہلِ مصر، اہلِ لاہور، اہلِ بیت (افرادِ خانہ۔ گھر والے) بولے جاتے ہیں۔ لیکن جب ہم حبِ علیؓ سے سرشار ہونے لگتے ہیں تو اہلِ بیت سے بیویوں کو نکال دیتے ہیں اور آل سے پیروان و متبعین کو۔

چنانچہ اسی آیت: فقد اتینا ال ابراہیم الکتاب والحکمۃ واتینا ھم ملکاً عظیما یعنی ہم نے آلِ ابراہیم کو کتاب و حکمت دی اور عظیم مملکت بھی: کی تفسیر میں جلال الدین السیوطیؒ نے 'الدر المنثور' میں ایک روایت یہ بھی نقل کی ہے کہ ایک موقع پر حضرت عباسؓ (خلفائے عباسیہ کے مورثِ اعلیٰ) نے امیر معاویہؓ سے کہا: الکتاب سے مراد قرآن ہے اور الحکمت سے مراد سنت اور مملکت عظیم (ملکاً عظیما) سے مراد نبوت اور خلافت کا اجماع ہے: آلِ ابراہیم محمدؐ ہیں اور ہم ان کے وارث۔ پس ہم اگر خلافت کے مستحق نہیں تو پھر کس کے مستحق ہیں: قطع نظر اس سے کہ آیت کی یہ تفسیر تحریف عن المواضع الکلم یعنی کلام کو اپنی جگہ سے ہٹا کر مطلب اخذ کرنے کا دلچسپ نمونہ ہے، بنو عباس کے کسی فرد کی قوتِ فکر کا نتیجہ ہے۔ اس من گھڑت مونولاگ کو ڈائیلاگ کی صورت دیتے ہوئے روایت کا "بقیہ" حصہ یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

یہ سن کر امیر معاویہ نے سر اٹھایا اور یوں گویا ہوئے "اے سید بنی ہاشم! اگر محمدؐ صرف بنی ہاشم کی طرف مبعوث ہوئے ہیں، جیسے انبیائے بنی اسرائیل صرف بنی اسرائیل کی طرف مبعوث کئے گئے تھے تو بے شک آپ محمدؐ، قرآن اور سنت کے وارث ہیں۔ لیکن اگر محمدؐ بنی ہاشم کی بجائے بنی آدم کی طرف مبعوث کئے گئے ہیں تو پھر محمدؐ سے قرابتِ قریبہ کی بنا پر آپ مجھ سے اور میں دیگر قریشیوں سے اور دیگر قریشی بلال حبشیؓ اور صہیب رومیؓ سے زیادہ محمدؐ، قرآن اور سنت کے وارث نہیں ٹھہرتے۔ رہی بات مملکت عظیم کی کہ مابہ النزاع یہی ہے تو بے شک آپ کے بھتیجے اور میرے چچا اور بہنوئی محمدؐ نے تمام جزیرہ نمائے عرب کو زیرِ نگیں کر لیا تھا لیکن ان کے وصال کے ساتھ ہی قبائل عرب نے موقع سے فائدہ اٹھا کر تمرد اور سرکشی اختیار کی اور تمام علاقے اطاعت سے نکل کر آزاد ہو گئے اور مملکت مدینہ کی ایک گلی تک محدود ہو کر رہ گئی۔ مسیلمہ کذاب، اسود عنسی، طلحہ اور سجاح کے لشکری ہر طرف دندناتے پھر رہے تھے اور انہیں روکنے ٹوکنے والا کوئی نہ تھا۔ تب بنی تیم کے ابوبکرؓ نے تلوار اٹھائی، ہم نے ساتھ دیا اور قبائل عرب کو دوبارہ مطیع کیا۔ ان کے بعد بنی عدی کے عمرؓ نے بہت سے ممالک و اقوام کو سرنگوں کیا اور ان میں سے بہت سے علاقے میرے بھائی یزید بن ابوسفیانؓ نے فتح کئے تھے۔ پھر میرے ابن عم عثمانؓ کی باری آئی اور مملکت کی سرحدیں اور بھی دور

دور تک جا پہنچیں۔ محمدؐ کے دنیا سے رخصت ہوتے ہی بنو ہاشم نے اپنی تلواریں نیام میں ڈال لیں اور گھروں میں بیٹھے رہے۔ محمدؐ کے بعد وہ نہ کوئی لڑائی لڑے، نہ کوئی زخم کھایا اور نہ کسی کو زخم لگایا۔ اب یہ مملکت عظیم جسے بچانے، بنانے اور بڑھانے میں بنو ہاشم نے رتی بھر حصہ نہیں لیا، آپ کہتے ہیں بنو ہاشم کی ملکیت ہے اور اس پر حکومت کا حق انہی کا ہے تو مجھے میری جان کی قسم آپ نرالی بات کہتے ہیں۔"

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا جو ازراہِ تفنن بیچ میں آ گیا تھا۔ مقصود یہ دکھانا ہے کہ بنو ہاشم کا پروپیگنڈا اس حد تک دور رس ہے کہ قرآن کی آیات تک ان کی سیاسی تاویلات سے محفوظ نہیں رہیں۔ پھر 'الدر المنثور' کی اس روایت کی رو سے تو آل کا مفہوم اولاد اور خاندان نہیں، اس لئے کہ نہ صرف رسول اللہؐ بلکہ خود عباسؓ اور معاویہؓ حتیٰ کہ ابولہب اور ابوجہل کا سلسلۂ نسب بھی حضرت ابراہیمؑ سے جا ملتا ہے۔ مزید برآں سارے یہودِ مدینہ اور سارے مشرکین مکہ حضرت ابراہیمؑ کی نسل ہیں۔ 'محمدؐ آلِ ابراہیمؑ ہیں' کہنے کی بجائے 'آلِ ابراہیم محمدؐ ہیں' کہنے سے کہنے والے کی مراد یہی ہے کہ آل کا مطلب خاندان اور اولاد نہیں کچھ اور ہے۔ واقعی آل کا مطلب خاندان اور اولاد نہیں کچھ اور ہے لیکن یہ کچھ اور اُس کچھ اور سے مختلف ہے جو بنو ہاشم ہمیں باور کرانا چاہتے ہیں۔

پس آیتِ محولہ بالا میں لفظ آل کا ترجمہ خاندان اور اولاد کر بھی دیا جائے کہ عربی لغت اس کی اجازت دیتی ہے تو بھی خاندان اور اولاد سے معنوی خاندان و اولاد ہی مراد ہو گی یعنی پیروان و متبعین ابراہیمؑ اس لیے کہ قرآن لفظ آلِ ابراہیم کے صرف یہی معنی تسلیم کرتا ہے۔ سورۂ ابراہیمؑ میں خود حضرت ابراہیمؑ کے حوالے سے آیا ہے۔ فمن تبعنی فانہ منی۔ جس نے میری اتباع کی وہی مجھ سے ہے۔ اور ان اولی الناس بابراھیم للذین اتبعوہ وھذا النبیؐ والذین آمنو واللہ ولی المومنین۔ ابراہیم کے ساتھ اصل نسبت ان کے متبعین کو اور اس نبی کو اور اس نبی پر ایمان لانے والوں کو ہے اور اللہ دوست ہے ایمان لانے والوں کا۔ ان آیات میں یہود کو براہِ راست مخاطب کیا گیا جن کا نسل ابراہیمؑ سے ہونا یقینی ہے۔ اللہ قرآن میں سورہ النساء کی ایک آیت میں یہود پر جو آلِ ابراہیمؑ ہونے کے مدعی تھے لعنت بھیجتا ہے۔ اولٰئک الذین لعنھم اللہ ومن یلعن اللہ فلن تجد لہ نصیرا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی اور جس پر اللہ لعنت کر دے اس کے لیے تو کسی کو مددگار نہ پائے گا۔ جب کہ آلِ ابراہیمؑ کو قرآن نے برگزیدہ قرار دیا ہے۔ ان اللہ اصطفیٰ آدم ونوحا وآل ابراہیم۔ اللہ نے بے شک آدم کو نوح کو اور آلِ ابراہیم کو برگزیدہ کیا۔ آل عمران ۳۳۔ اگر آلِ ابراہیم سے مراد آنحضرتؐ کی صلبی اولاد ہے تو کیا جن لوگوں (یہود) پر اللہ لعنت کر رہا ہے انہی کو برگزیدہ بھی کہہ رہا ہے؟ قرآن تضادات سے پاک ہے۔ فتور ہماری اپنی سمجھ میں ہے۔ آلِ ابراہیمؑ سے مراد ملتِ ابراہیم ہے نہ کہ نسل ابراہیمؑ۔

قل صدق اللہ فاتبعوا ملۃ ابراہیم حنیفا وما کان من المشرکین۔ کہہ اللہ نے سچ کہا ہے تو تم ملتِ ابراہیمؑ کی پیروی کرو جو سیدھی راہ چلنے والا تھا اور مشرکوں میں سے نہ تھا۔ آلِ عمران ۹۵۔ اور قالو کونوا ھودا او نصاریٰ قل بل ملۃ ابراہیم حنیفا۔ وہ کہتے ہیں یہودی یا نصرانی بن جاؤ تب سیدھی راہ پاؤ گے۔ کہہ نہیں ہم نے ابراہیم کی راہ پکڑی جو سیدھی راہ پر تھا۔ البقرہ ۱۳۵۔ ما کان ابراھیم یہودیا ولا نصرانیا ولکن کان حنیفا مسلما وما کان من المشرکین۔ ان اولی الناس بابراہیم للذین اتبعوہ وھذا النبی والذین آمنو، ابراہیم نہ تو یہودی تھا اور نہ نصرانی

ہی وہ تو سیدھی راہ چلنے والا اللہ کا فرمانبردار تھا اور مشرکین میں سے کبھی ہرگز نہ تھا۔ ابراہیم کے ساتھ اصل نسبت ان کو ہے جو اس کے متبعین ہیں اور اس نبی کو اور اس نبی پر ایمان لانے والوں کو (آل ۶۷، ۶۸)۔ نہ کہ ان سے نسلی تعلق رکھنے والوں کو، ان آیات میں یہود و مشرکینِ قریش دونوں کو یکجا مخاطب کیا گیا ہے اور آلِ ابراہیم سے ان کا قطع تعلق واضح کر دیا گیا ہے۔ جب کہ رسول اللہؐ پر ایمان لانے والوں کو آلِ ابراہیمؑ میں شامل کیا گیا ہے۔ بلال حبشیؓ، سلمان فارسیؓ، صہیب رومیؓ اور انصار مدینہ، جن کا سلسلۂ نسب ابراہیمؑ تک نہیں پہنچتا، آلِ ابراہیمؑ ہیں اور ابوجہل قرشی اور کعب الاشرف یہودی آلِ ابراہیمؑ سے باہر، آلِ ابراہیمؑ سے مراد اہلِ دینِ ابراہیمؑ ہیں نہ کہ نسلِ ابراہیم۔

کہ دریں راہ فلاں ابنِ فلاں چیزے نیست

نسلِ ابراہیم دو شاخوں پر مشتمل ہے۔ نسلِ اسحٰق جو بنی اسرائیل کہلاتی ہے اور نسلِ اسمٰعیل جو بنی اسمٰعیل کہلاتی ہے۔ پہلی شاخ میں بشہادتِ قرآن، یعقوب سے عیسیٰ تک کئی پیغمبروں اور صحفِ سماوی کا طویل سلسلہ چلا آتا ہے۔ ووھبنالہ اسحٰق ویعقوب وجعلنا فی ذریتہ النبوۃ والکتاب۔ ہم نے ابراہیم کو اسحٰق اور یعقوب بخشا اور اس کی ذریت میں نبوت اور کتاب رکھی۔ عنکبوت ۲۷۔ واورثنا بنی اسرائیل الکتاب اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب کا وارث بنایا۔ مومن ۵۳۔ اسی لئے قرآن اس شاخ کو اہلِ کتاب کہتا ہے۔ دوسری شاخ بنی اسماعیل میں حضرت اسماعیل کے بعد اور رسول اللہؐ سے پہلے کسی نبی اور کتاب کی بعثت و نزول کا ذکر قرآن میں نہیں ملتا۔ قرآن اس شاخ کو امیون (اُمّی کی جمع) کہتا ہے اور رسول اللہؐ کو نبی اُمّی۔ ھوالذی بعث فی الامیین رسولا منھم یتلوعلیھم ایاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ وان کانوا لفی ضلال مبین۔ وہی ہے جس نے امیوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو انہیں اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا، انہیں پاک کرتا اور کتاب و حکمت سکھاتا ہے اگرچہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں تھے (جمعہ ۲) ہر دور میں بنی اسرائیل یعنی اہلِ کتاب میں سے کچھ لوگ ہر آنے والے نبی پر ایمان لاتے اور اس کی پیروی کرتے رہے لیکن زیادہ تر لوگ انکار ہی کرتے رہے۔ فمنھم مھتدو کثیر منھم فاسقون۔ بنی اسرائیل یا امیوں میں سے تقریباً سبھی نے شرک و بت پرستی شعار کرلی تھی۔ (کانو لفی ضلال مبین) تاہم رسول اللہؐ سے پہلے بھی اکا دکا ایسے لوگ ان میں موجود رہے ہیں جو اسی فطرت کی بنا پر شرک و بت پرستی سے بیزار اور خدائے وحدہٗ لاشریک لہ کے پرستار تھے، جیسے حضرت عمرؓ کے بھائی زید۔ اس طرح دینِ ابراہیم کی روایت نہایت غیر مربوط اور غیر مسلسل طور پر ہی بغیر کسی نبی اور کتاب کے امیوں میں بھی موجود رہا ہے۔ یہ لوگ حنیف کہلاتے تھے۔ قرآن حضرت ابراہیمؑ کو اسی نام سے پکارتا ہے۔ قرآن کے براہِ راست مخاطبین انہی دو شاخوں اہلِ کتاب اور امیوں کے افراد تھے۔ قرآن انہیں ملتِ ابراہیمؑ کی پیروی کی دعوت دیتا ہے۔ بنی اسرائیل میں مبعوث ہونے والے سبھی پیغمبر اسی کی دعوت دیتے تھے۔ واتبعت ملۃ ابآءی ابراہیم واسحٰق ویعقوب وما کان لنا ان نشرک باللہ من شیءٍ۔ اور میں اپنے باپ دادوں، ابراہیم، اسحٰق اور یعقوب کی ملت کا متبع ہوں۔ ہمارا کام نہیں کہ کسی کو اللہ کا شریک ٹھہرائیں (یوسف ۳۸)۔ یہی دین رسول اللہؐ کا بھی تھا اور اسی کی دعوت وہ بھی دیتے تھے۔ ثم اوحینا الیک ان اتبع ملۃ ابراہیم حنیفا وما کان من المشرکین۔ پھر ہم نے تیری طرف وحی بھیجی کہ تو ابراہیم کے دین کی اتباع کر جو سیدھی راہ پر تھا اور مشرکوں میں سے نہ تھا۔ النحل ۱۲۳۔ اسی بنا پر آپؐ کو اہلِ کتاب سے یہ کہنے کا حکم ہوا تھا قل یا اہل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک

بہ شیا ولا یتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون اللہ۔ کہہ اے اہلِ کتاب ایک بات کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں برابر ہے کہ ہم خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے سوا پروردگار نہ ٹھہرائے (آل عمران ۶۴)۔ درانحالیکہ اہلِ کتاب نے حق کو چھپانا اور حق میں باطل کو ملانا شروع کر دیا۔ یا اہل الکتاب لم تلبسون الحق بالباطل وتکتمون الحق وانتم تعلمون۔ اے اہلِ کتاب کیوں حق میں باطل کو ملاتے ہو اور حق کو چھپاتے ہو جان بوجھ کر۔ آل عمران ۷۱۔ البقرہ ۴۲۔ چنانچہ حق میں باطل کو ملاتے ہوئے اور جان بوجھ کر حق کو چھپاتے ہوئے ان لوگوں نے رسول اللہؐ کے مقابلے میں مشرکینِ مکہ سے ایکا کر رکھا تھا اور یہ کہتے تھے کہ رسول اللہؐ کی نسبت مشرکینِ مکہ زیادہ سیدھی راہ پائے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں کو سب سے زیادہ جلن اس بات کی تھی کہ سلسلۂ وحی و نبوت تو بنی اسرائیل کا خاصہ ہے۔ جو اہلِ الکتاب اور آل ابراہیم ہیں۔ امیوں میں نبی کیونکر مبعوث ہو گیا۔

چونکہ بنی اسرائیل میں پیغمبروں اور کتب سماوی کا طویل سلسلہ چلتا رہا ہے اور ہر پیغمبر اور اس پر نازل ہونے والی وحی کے ذریعے دینِ ابراہیم کی تجدید ہوتی رہی ہے اور ان پیغمبروں پر ایمان لانے والے متبعینِ ابراہیم ہونے کی بنا پر آلِ ابراہیم کہلاتے تھے اور چونکہ ایسا کوئی سلسلۂ نبوت وکتب سماوی بنی اسماعیل میں جاری نہیں رہا، اس لئے وہ آلِ ابراہیم نہیں کہلاتے تھے۔ اس لئے اسی زعم میں کہ یہود اہل الکتاب اور آلِ ابراہیم (متبعین) ہیں، دینِ ابراہیم پر اپنے آپ کو اتھارٹی سمجھتے تھے اور رسول اللہؐ اور مشرکین مکہ کے درمیان قضیے میں انہوں نے اپنا فیصلہ حسد کی بنا پر مشرکین مکہ کے حق میں دیا تھا۔

الم تر الی الذین ...... کیا تو نے ان (یہود) کی طرف نہ دیکھا جنہیں کتاب میں سے کچھ حصہ ملا ہے کہ وہ بتوں اور شیطان پر ایمان لاتے ہیں اور کفار (قریش) کے حق میں کہتے ہیں کہ یہ رسول اللہؐ اور ان پر ایمان لانے والوں کی نسبت زیادہ راہِ راست پر ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے اور جس پر اللہ لعنت کر دے تو اس کا کوئی مددگار نہ پائے گا۔ کیا ان (یہودیوں) کا اس سلطنت (ملک) میں کچھ حصہ ہے؟ (جو ہم نے آل ابراہیم کو دی) وہ تو کسی کو تل بھر نہیں دینے کے۔ کیا یہ لوگ (بنی اسماعیل) سے اس چیز پر حسد کرتے ہیں جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دی ہے۔ سو ہم نے تو ابراہیم کی آل کو کتاب اور حکمت دی اور مملکتِ عظیم بخشی تھی (فقد اتینا ال ابراہیم الکتاب والحکمۃ واتیناھم ملکا عظیما)۔ پھر ان میں سے کوئی (مابعد کے پیغمبروں پر) ایمان لایا اور کوئی ہٹا رہا اور (ہٹنے والوں کے لئے) شعلہ زن جہنم کافی ہے۔ النسا ۵۱ - ۵۵

پس سورہ النسأ کی اس آیت سے کہ ہم نے آل ابراہیم کو کتاب اور حکمت دی اور انہیں مملکت عظیم بخشی تھی (۵۴) سے اس موقف کی تائید نہیں ہوتی کہ آل سے مراد متبعینِ ابراہیم نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جن کا سلسلۂ نسب حضرت ابراہیم سے جڑتا ہے۔ آلِ ابراہیم یا متبعینِ ابراہیم کو تو کتاب وحکمت اور مملکت عظیم عطا کی گئی تھی اور ان یہود کے پاس کتاب میں سے کچھ حصہ ہے اور حکمت کا مذکور ہی کیا۔ رہی مملکت عظیم تو یہ تیرہ کا تل بھر کے بھی مالک نہیں۔ قرآن ان لوگوں کے آلِ ابراہیم ہونے سے انکار کر رہا ہے اور آلِ ابراہیم کے ذکر سے پہلے ہی پوچھ رہا ہے، کیا ان کا اس مملکت میں کچھ حصہ ہے؟ (ام لہم نصیب من الملک؟)، جو ہم نے آلِ ابراہیم کو عطا کی تھی اگر نہیں تو یہ آلِ ابراہیم کیونکر ہو گئے؟ آلِ ابراہیم تو متبعینِ ابراہیم ہیں۔ یہ یہودی آلِ ابراہیم نہیں ہیں اس لئے

کہ انہوں نے بتوں اور شیطان پر ایمان لا کر کفار مکہ کو سیدھی راہ پر چلنے والا کہا ہے اور اس نبی کی مخالفت کر کے ملت ابراہیم کی اتباعت ترک دی ہے۔ یہ لوگ حق کو چھپانے والے ہیں اور ان پر اللہ کی لعنت ہے اور ان کا ٹھکانا شعلہ زن جہنم ہے جب کہ آلِ ابراہیم کو اللہ نے برگزیدہ کیا ہے۔ پس رسول اللہ کے بعد آل ابراہیم وہ لوگ ہیں جو آپ پر ایمان لائے اور آپ کے ذریعے دین ابراہیم کی پیروی کرتے ہیں۔

بنا بریں اگر قرآن کے مترجمین نے اس آیت کا ترجمہ کرتے وقت آل کا ترجمہ اولاد یا خاندان کر ہی دیا ہے تو اس آیت کا سیاق و سباق یہ وضاحت بھی کر رہا ہے کہ اولاد یا خاندان سے اس موقعے پر حضرت ابراہیم کی معنوی اولاد و خاندان مراد ہیں نہ کہ ان کی صلبی اولاد یعنی یہود یا کفارِ قریش، جن کے نسلِ ابراہیم ہونے سے کسی کو انکار نہیں اور یہ لوگ بہ صراحتِ قرآن آلِ ابراہیم سے خارج ہیں۔

میں نے اپنے مراسلے میں "ابو العلا معرّی کی بیدینی اور بنو امیہ کے دور میں ماقبل اسلام کے عربوں کی بیدینی کے احیا کے حوالے سے ابو العلا معرّی کی شاعری کا جائزہ" لینے کے سلسلے میں یہ بھی کہا تھا کہ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ بنو امیہ کی تاریخ ان کے دشمنوں کے دور میں لکھی گئی اور آج تیرہ صدیاں بعد ممکن ہے ہمارے لئے سچ کو جھوٹ سے علیحدہ کرنا ممکن نہ ہو۔ میری بات جو ناخوشگوار تھی، فاضل مراسلہ نگار کو بھی ناگوار لگی اور انہوں نے 'بنی امیہ کی حکومت کیسی تھی اور اس کے حکمران کیسے تھے' کا سوال قائم کر کے جواب میں اقبال کی 'تشکیلات' کے باب 'جبر و قدر' سے ایک اقتباس بھی نقل کیا ہے۔ گویا اقبال بنو امیہ کے معاملوں کے چشم دیدہ گواہ تھے۔

> 'دمشق کے موقع شناس اموی فرمانرواؤں کو بھی جو عملاً مادہ پرستی اختیار کر چکے تھے کسی ایسے عذر کی ضرورت تھی جس سے وہ کربلا کے مظالم پر پردہ ڈال سکیں تاکہ اس طرح عوام کو موقع نہ ملے کہ ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور انہیں امیر معاویہ کی بغاوت کے ثمرات سے محروم کر دیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے جب معبد نے حسن بصری سے کہا اموی مسلمانوں کو قتل کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ کی مرضی یوں ہی تھی تو حسن بصری نے کہا یہ اللہ کے دشمن جھوٹے ہیں۔'

اقبال بادشاہ آدمی تھے اور بادشاہی کی موج میں کبھی کبھی ایسی باتیں بھی کہہ جاتے تھے جن کا سر پیر ڈھونڈھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ چونکہ وہ بیرسٹر ایٹ لا بھی تھے، اس لئے اگر وہ زندہ ہوتے تو میں ان سے یہ قانونی سوال پوچھتا کہ اگر کسی مملکت میں 'کو دیتا' کے نتیجے میں برسر اقتدار آنے والی حکومت کو اس مملکت کے کسی صوبے کی حکومت تسلیم نہیں کرتی تو کیا اس صوبے کی حکومت کے اس رویے کو بغاوت پر محمول کیا جائے گا؟ درانحالیکہ نئی حکومت کا اقتدار نہ صرف یہ کہ مستحکم نہیں ہے بلکہ جلد ہی یہ ایک صوبائی سطح کی حکومت بن جاتی ہے۔

بنو امیہ کے حکمران فرشتے اور دیوتا تو یقیناً نہیں تھے بلکہ اسی طرح کے حکمران تھے جس طرح حکمران ہوا کرتے تھے ان میں اچھے بھی تھے اور برے بھی۔ اسی طرح کے لوگ بنو ہاشم بھی تھے، ہم ہاشمیوں پر امویوں کی زیادتیوں کو یاد بھی رکھتے ہیں اور بڑھا چڑھا کر پیش بھی کرتے ہیں اور امویوں پر ہاشمیوں کی زیادتیوں کو بھول جاتے ہیں۔ یاد دلائی جائیں تو پھر ہم مگر کرتے ہیں۔ ظلم ظلم ہے چاہے کسی دیوتا سے سرزد ہوا ہو یا راکشش سے، اور مظلوم مظلوم ہے چاہے ہاشمی

ہو یا اموی، بنو امیہ کے دفاع میں بہت کچھ کہا جاسکتا ہے لیکن اس سے بنو امیہ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا اور میں اس خیال کا آدمی ہوں کہ:

ہر کہ با زندہ از پے مردہ می کند جنگ ناداں است

بنو امیہ کو اگر بدترین خلائق بھی ثابت کر دیا جائے تو اس سے بنو ہاشم کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ جس تخت و تاج کے لئے دونوں گروہ برسرِ پیکار تھے اسے ہلاکو خان نے مٹی میں ملا دیا تھا۔ آج بنو امیہ اور بنو ہاشم کی نزاع میں حصہ لینا اتنا ہی بے سود ہے جتنا کہ پانی پت کی پہلی لڑائی میں بابر یا ابراہیم لودھی کی طرف سے شرکت کرنا۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ روایات و حکایات جو ہاشمی پروپیگنڈسٹوں نے بطور اسلحہ بنو امیہ کے خلاف ڈھالی تھیں، چلے ہوئے کارتوس ہیں ان سے بنو امیہ کو دوبارہ نہیں مارا جاسکتا۔ ہمارے بزرگ رات کو الف لیلہ سنا کرتے تھے اور صبح اٹھ کر تواریخ لکھنے بیٹھ جاتے تھے۔ ذی فہم اصحاب کے لئے اتنا اشارہ کافی ہے کہ انہی اموی حکمرانوں اور ان کے جرنیلوں کا مقابلہ جب بنو ہاشم کی بجائے کسی اور سے ہوتا ہے تو وہ ہیں محافظِ اسلام اور ان کے کارنامے شوکتِ اسلام کا مظہر نظر آنے لگتے ہیں محمد بن قاسم نیکی و شرافت اور غیرت و حمیت کا پیکر تھا اور طارق بن زیاد جرأت و شجاعت کا مجسمہ اس لیے کہ ان کے مقابلے میں کوئی ہاشمی نہیں تھا۔ اگر کوئی ہاشمی اور اس کا لشکر ان سے تہ تیغ ہو جاتا تو یہی دو جرنیل ہمیں چنگیز اور ہلاکو کے باوا نظر آتے۔ انہی امویوں کی تعمیر کردہ مسجد قرطبہ پر اپنی شاہکار نظم میں اقبال کو یہی اموی جلیل و جمیل اور بندگانِ مولا صفات نظر آتے ہیں۔ ان مواقع پر یہی رویہ سید امیر علی کا بھی ہوتا ہے۔ میں ان ارشادات پر مزید اضافہ نہیں کروں گا:

در خانہ اگر کس است یک حرف بس است

البتہ اقبال کے اقتباس کے حوالے سے ان کے تصورِ تقدیر کے بارے میں چند اشارے ضرور کروں گا۔ اقبال 'تشکیلات' میں کہتے ہیں کہ مسئلہ تقدیر کو عالم اسلام کے اندر اور باہر درست طور پر کبھی کوئی نہیں سمجھ سکا۔ وہ سچ کہتے ہیں۔ اس لئے کہ اس سے قبل کسی نے برگساں کی ارتقائے تخلیقی اور مارگن کی ارتقائے بروزی کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ تقدیر سے اقبال کی مراد وہی ہے جسے برگساں کی اصطلاح میں 'مرورِ محض' کہا جاتا ہے۔ یہ مرورِ محض یا زمانِ خالص تب اب اور جب سے پاک ہے۔ اسے ممیز اور متفرق لمحات کا مجموعہ سمجھنا عقلِ عیار کا کرشمہ ہے۔ یہ عضویاتی کل ہے جس میں ماضی حال سے ممیز نہیں بلکہ حال کے ساتھ حرکت کناں اور اس میں عمل کناں ہے۔ مستقبل کوئی سامنے پڑی چیز نہیں جس تک پہنچنا باقی ہو۔ چونکہ مرورِ محض ان گنت لمحات و آنات کا مجموعہ نہیں، مستدام الآن ہے، اس لیے مرورِ محض کے حوالے سے مستقبل کا مطلب اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ یہ کسی واقعے کے وقوع پذیر ہونے کا واضح امکان ہے۔ لیکن یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ اس کی وقوع پذیری کے پیچھے کوئی سلسلۂ علل موجود ہے۔ اقبال سلسلۂ علل کی موجودگی کا انکار اس لئے کرتے ہیں کہ سلسلۂ علل زمان مبنی بر آنات (SERIAL TIME) کو مستلزم ہے اور یہ عقل عیار کا فریب ہے۔ پس کائنات کا اونٹ جب جس کروٹ بیٹھتا ہے، اس کروٹ اسے کوئی شتربان نہیں بٹھاتا۔ وہ اسی کروٹ بیٹھتا ہے جس کروٹ بیٹھنے کو اس کی طبیعت کا میلان ہوتا ہے۔ شترِ کائنات کی طبیعت کے میلانات ہی اس کی تقدیر ہیں۔ فی الخارج کوئی شتربان موجود نہیں، جس کی مرضی کو شترِ کائنات کی حرکات کی علت قرار دیا جائے۔ خدا کا کائنات سے وہ تعلق نہیں جو بڑھئی کا کرسی سے ہے۔ جو لکڑی کے ایک خاص ٹکڑے پر ایک خاص غایت

کے تحت ایک خاص صورت دینے کے لئے ایک خاص فعل انجام دیتا ہے۔ اقبال کے نزدیک خدا کا کائنات سے وہی تعلق ہے جو شخص کا اس کے کیریکٹر سے ہے۔ کائنات خدا کا کیریکٹر اور اس کی عادت و سنت ہے۔ خدا اور کائنات میں اس طرح کا کوئی امتیاز نہیں جس طرح کا امتیاز بڑھئی اور اس کی تخلیق کرسی میں ہے۔ کرسی بڑھئی سے اور بڑھئی کرسی سے ماورا ہے۔ خدا کائنات سے اور کائنات خدا سے ماورا نہیں۔ خدا کائنات کی تاریخ یا ڈرامے کا مصنف نہیں کہ ہر واقعہ اسی طرح پیش آتا اور ہر کردار وہی رول ادا کرتا ہے جیسا ڈرامہ نگار نے لکھ دیا ہے۔ اگر اقبال سے یہ پوچھا جائے کہ علیؓ اور معاویہؓ ایک دوسرے کے ہمعصر کیوں تھے تو اقبال کا جواب یہ نہیں ہے کہ اللہ کی مرضی یونہی تھی کہ ایسا کہنا سلسلۂ علل کے اثبات کے ساتھ سلسلۂ غایات کا بھی اثبات ہے۔ ان کا جواب یہ ہے کہ حقیقت بروزِ کناں کی ماہیت کچھ اس طرح ہے کہ اس کے بروز کے لامتناہی امکانات میں سے دو امکان، حیاتِ علیؓ اور حیاتِ معاویہؓ کی صورت میں اپنے آپ کو ایک ساتھ رونما کریں۔ اگر ایک آدمی بادشاہ کے گھر اور دوسرا خاکروب کے گھر پیدا ہوتا ہے تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ اللہ کی مرضی یونہی تھی۔ خدا کے پاس پہلے سے معین پروگرام اور کوئی طے شدہ مقصد اور منصوبہ نہیں جس کے مطابق اور جس کی خاطر وہ نظام کائنات چلا رہا ہے۔ کائنات کا نظام چل رہا ہے چلایا نہیں جا رہا۔ (یہ ایک عضویاتی کُل ہے) چلایا جانا FATALISM ہے اور تقدیر کا یہ مفہوم اقبال کے نزدیک قرآن اور اسلام کے منافی ہے۔ تقدیر کے بارے میں اپنے اس موقف کی تائید میں انہیں وہ روایت بھی مل گئی جو معتزلہ (قدریہ) نے جبریہ کے خلاف گھڑ رکھی تھی: کہا جاتا ہے جب معبد نے حسن بصری سے کہا کہ بنو امیہ مسلمانوں کو قتل کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں اللہ کی مرضی یونہی تھی حسن بصری نے کہا کہ یہ اللہ کے دشمن جھوٹے ہیں۔

یہ "اللہ کے دشمن" جھوٹے سہی، اللہ تو جھوٹا نہیں ہے جو یہ کہتا ہے: اللہ خلقکم و ما تعملون (اللہ تمہارا اور تمہارے اعمال کا خالق ہے)۔ کیا یہ پٹی (نعوذ باللہ) اللہ کو بھی بنو امیہ نے پڑھائی تھی؟

اقبال کو یہ روایت نقل کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ اللہ کی مرضی یونہی تھی کی تردید ایک پارسا تابعی سے منسوب قول سے ہوتی ہے۔ اللہ کی مرضی یونہی تھی کہنے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کائنات کے ڈرامے کا مصنف ہے۔ اقبال کے خیال میں گویا آثارِ تابعین سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ خدا کائنات کے ڈرامے کا مصنف نہیں۔ کائنات جو اقبال کے نزدیک انائے مطلق کا کیریکٹر اور اس کی عادت اور سنت ہے اور انائے مطلق سے ماورا نہیں، ارتقاپذیر کائنات ہے۔ یہ ارتقا میکانکی اور جبری نہیں تخلیقی ہے، پس اسے سلسلہ علل کے حوالے سے یا پہلے سے طے شدہ مقصد اور منصوبے کے حوالے سے سمجھنا خطا کاری ہے۔ لیکن یہ کہنا بھی غلط ہوگا کہ عمل ارتقا سرے سے بے غرض عمل ہے۔ یہ اغراض سے عاری نہیں۔ لیکن ان اغراض کی تعیین و تکمیل ارتقا کے اثنا میں ہوتی رہتی ہے۔ مثال کے طور پر جانداروں کی وہ انواع جو بصارت سے محروم تھیں، دورانِ ارتقا اس عمل کی بدولت جو بصارت پر منتج ہوتا تھا، آنکھوں والی ہوگئیں۔ ارتقا کے ابتدائی مراحل میں چشم و بینائی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا[1]۔ ارتقا اسی مفہوم میں تخلیقی ہے۔

اقبال کا یہ موقف جو بتمام و کمال برگساں سے ماخوذ ہے، ایک ایسا مسئلہ کھڑا کرتا ہے جس پہ برگساں اور اقبال

---

[1] یہ مثال اقبال نے نہیں دی، برٹرینڈ رسل نے برگساں کے حوالے سے اس کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے دی ہے۔

کی توجہ نہیں رہی۔ ارتقا میکانکی ہو یا تخلیقی، مفہوم ارتقا سے اسی صورت ہمکنار ہو سکتا ہے جب serial time کو حوالہ بنایا جائے۔ مرورِ محض یا زمان خالص کے حوالے سے جوششِ حیات کی جہد و پیکار کو ارتقا کہنا ہے معنی اور مفہوم سے عاری بیان ہے۔ اقبال خود کہتے ہیں۔

Existence in spatialised time is spurious existence.¹

جواب میں کہا سکتا ہے۔

If such is the case then evolution, even if it is creative, of what exists is as in spatialised time, it is spurious too.

اگر اقبال کا موقف درست ہے تو جوششِ حیات (elan vital) کی جہد و پیکار کو ارتقا سمجھنا عقل عیار کا فریب ہے۔ لیکن انہوں نے اس طرف توجہ ہی نہیں دی۔

اقبال کا موقف، بہر حال، اس بات کا مقتضی ہے کہ نہ صرف شر کو بلکہ خیر کو بھی خدا سے منسوب نہ کیا جائے۔ اقبال کا موقف خیر و شر کی اصطلاحات کو مذہبی اور روایتی اخلاقیاتی مفہوم سے عاری کر کے حیاتیاتی مفہوم کا حامل بنا دیتا ہے۔ ہر وہ عمل جو تکامل میں معاون ہے خیر ہے، بصورت دیگر شر۔ اقبال کا موقف انہیں یہ سہولت فراہم کرتا ہے کہ وہ خدا کا انکار کئے بغیر نیطشے کے افکار سے استفادہ اور انہیں اپنے موقف سے ہم آہنگ کر سکیں۔ نیطشے کا فلسفہ جہد و پیکار کا فلسفہ ہے۔ اس میں خیر و شر کے مذہبی اور روایتی اخلاقیاتی مفاہیم اور اخلاقیات کے مذہبی اور روایتی معیارات کو دخل نہیں۔ حیاتیاتی ارتقا سے ماخوذ اخلاقیات میں خدا پر اعتقاد کی گنجائش نہ ہونے کی بنا پر نیطشے کے لئے "خدا مر چکا ہے"۔ برگساں کے نزدیک چونکہ ارتقا تخلیقی ہے، اس بنا پر وہ جوششِ حیات اور مرورِ محض کے حوالے سے خدا کے لئے گنجائش ڈھونڈ نکالتا ہے۔ اقبال کا تصورِ الٰہ وہی ہے جو برگساں کا ہے۔ شاید ارتقا کی اسی برگسانی تفسیر کے زیر اثر اقبال نے دعویٰ کیا تھا:

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے۔

اقبال یقیناً نیطشے کو فلسفۂ برگساں پڑھاتے۔ اس فلسفے میں کبریا کا جو مقام بنتا ہے، نیطشے کو سمجھاتے۔ اس پس منظر میں، منقولہ اقتباس میں بنوامیہ کے بارے میں جملوں کا، اقبال کے ممکن اخلاقیاتی موقف سے جوڑ ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ یہ جملے فلسفی کے قلم سے نہیں مفتی کے قلم سے ٹپکے ہیں۔ اس موقعے پر پاسبانِ عقل نے انہیں ان کی خواہش پر تنہا چھوڑ دیا تھا۔

محمد ارشاد (ہری پور)

جناب محمد ارشاد نے اپنے تازہ ارشادات میں "بات سے بات" نکالتے ہوئے اور حضرت علامہ اقبال، مولینا رومی، ابن عربی، منصور حلاج اور وحدت الوجود پر اپنے خیالات سے مستفیض فرماتے ہوئے قارئین فنون کو ابلیس کے خاندان سے بھی خوب متعارف کروایا ہے۔ بندہ اپنی کم علمی کے باعث ان گہرائیوں تک تو نہیں جا سکتا، اور نہ ہی ان موضوعات

---

¹ Reconstruction of Religious Thought. M. Ashraf, May 1971, p. 47

پر کچھ کہنے کی طاقت رکھتا ہے لیکن ایک بات جوان کے افکار میں بُری طرح کھٹکتی ہے وہ ہے ان کی منصور حلاج کی شخصیت کے سلسلے میں غلط خیالی۔ ان کا کہنا ہے۔

"حلاج کے قتل کی اصل وجہ اس کا دعویٰ انا الحق نہ تھا بلکہ ان کا اصل قصور کسانوں اور مزدوروں کی وکالت کرنا اور ان کے مفاد کا تحفظ کرنا تھا"

بالفاظ دیگر منصور حلاج کا تختۂ دار پر لٹکایا جانا ایک سیاسی فعل تھا۔ آج سے گیارہ سو سال قبل خلافت عباسیہ کے دور میں اس طرح کے سیاسی افکار اور ان پر عمل کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور اگر یہ مان بھی لیا جائے تو اُن شخصی حکومتوں کے دور میں حکومتِ وقت کے کسی شخص کو راستہ سے ہٹانا کوئی مشکل امر نہیں تھا۔ برعکس اس کے منصور حلاج کو دوبار اس کے عقائد کی بنا پر گرفتار کیا گیا اور محمد بن داؤد نے جو اس وقت بغداد کے محکمہ قاضی القضاۃ میں قاضی تھا، حلاج کو محاکمہ کے لیے طلب کیا اور اس کے مخصوص عقائد کی بابت دریافت کیا۔ لیکن وہ اس کی سزا کے لئے کوئی جواز پیدا نہ کر سکا اور جرم ثابت نہ ہونے کی بنا پر حلاج کو رہا کرنا پڑا۔

۳۰۱ھ میں حلاج کی دوبارہ گرفتاری سے قبل اُس وقت کے حالات کا مختصر سا ذکر کر دوں۔ اس وقت کی اسلامی حکومتوں میں اعلیٰ ترین عہدے دو تھے۔ وزارت اور حجابت۔ اس وقت بغداد میں حامد بن عباس وزیر تھے اور نصر حاجب تھا۔ حامد اور نصر میں باہم چشمک تھی۔ وزیر حامد، منصور کا سخت ترین مخالف تھا۔ اگر کوئی واقعہ، تحریر یا گواہ اُسے حلاج کے خلاف ملتا تو اسے فوراً طلب کر لیتا۔ اس نے ربیع الآخر ۳۰۱ھ میں حلاج کی گرفتاری کے بعد سے حلاج کو کئی بار محاکمہ کے لئے بلایا تھا اور اس سے اس کے اِن افکار کی بابت دریافت کیا تھا۔

(۱) میں قرآن کا مقابلہ کر رہا ہوں۔ (۲) کعبہ کو گرا دے

(۳) میں قرآن کا مثل بنانے پر قادر ہوں۔ (۴) انا الحق

لیکن باوجود کوشش کے، وزیر موصوف آٹھ سال تک علماء اور فقہاء سے ابن منصور کے لیے قتل کا فتویٰ نہ لے سکا۔

۳۰۹ھ میں قصبہ دینور میں ایک شخص آیا۔ جس کے پاس ایک تھیلا تھا جسے وہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا۔ لوگوں نے اس کی تلاشی لی تو اس میں حلاج کا ایک خط تھا، جس کا عنوان تھا۔

من الرحمن الرحیم الی فلاں ابن فلاں

یہ خط بغداد بھیج دیا گیا تو حلاج کو طلب کیا گیا اور خط کی بابت دریافت کیا گیا۔ اس نے اقرار کیا کہ یہ خط اسی کا ہے۔ اسے کہا گیا کہ تم اب تک نبوت کے مدعی تھے، اب خدائی کا بھی دعویٰ کرتے لگے ہو۔ ابن منصور نے کہا "معاذ اللہ میں نہ خدائی کا دعویٰ کرتا ہوں نہ نبوت کا۔ میں تو ایک آدمی ہوں، اللہ کی عبادت کرتا ہوں، نماز روزے کی کثرت کرتا ہوں، اس کے سوا کچھ نہیں جانتا" اس پر اس سے اس کے دیگر اقوال کی بابت جرح کی گئی۔ یعنی "ادائے حج کے لئے کعبۂ دل کی نذر و زیارت کافی ہے" اسی جرح کے دوران ابو عمر القاضی کے منہ سے غصے میں حلاج کے لئے "اے حلال الدم" کا فقرہ نکلا۔ وزیر حامد نے، جو کسی ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھا، فوراً قاضی سے کہا کہ یہ لکھ دیں۔ قاضی وزیر حامد کی نیت کو بھانپ گیا، اس نے بات کو ٹالنے کی کوشش کی، لیکن اس کی ایک نہ چلی اور وزیر حامد نے قاضی سے فتوے کو لکھوا لیا۔ اسی طرح دوسرے حاضرین سے بھی دستخط کرا لئے۔ پھر اس محضر نامہ کو خلیفہ کو بھیج دیا، جن کی عمر اس

وقت ۲۵ سال تھی۔

دو دن تک خلیفہ مقتدر باللہ نے جب دستخط نہ کئے تو وزیر حامد کو پریشانی ہوئی۔ خود خلیفہ کے حضور جا کر حالات کا ایسا نقشہ کھینچا کہ خلیفہ کو مجبوراً دستخط کرنے پڑے۔ اس طرح حلاج کو محمد بن عبداللہ کوتوال کے سپرد کر دیا گیا کہ وہ اپنی نگرانی میں پہلے حلاج کو ہزار تازیانے لگائے اور اگر اس سے وہ ہلاک نہ ہو سکے تو پھر اس کی گردن اڑا دی جائے۔ آخر منگل کے دن ۲۴ ذی قعدہ ۳۰۹ھ کی صبح اسے میدان میں لایا گیا اور جلاد کو تازیانے مارنے کا حکم دیا گیا۔ ہر تازیانے کی ضرب پر حلاج احد احد کہتے رہے۔ جب یہ عمل پورا ہوا تو پھر ان کے ہاتھ کاٹے گئے۔ پھر پاؤں کاٹے گئے۔ پھر سر تن سے جدا کیا گیا اور آخر جسم کو نذر آتش کر دیا گیا۔

منصور کی شہادت کے یہ مختصر سے حالات اس لئے تحریر کر دیئے گئے ہیں کہ قارئین اندازہ کر سکیں کہ یہ ایک سیاسی فعل نہ تھا۔ ہزار تازیانہ کی ضرب اور ہاتھ پاؤں کاٹنے اور سولی پر لٹکانے کی واردات کے دوران جو صبر و استقلال حلاج سے ظاہر ہوا اور محبت و عشقِ الٰہی میں ڈوبے ہوئے اشعار و کلمات اور عارفانہ اقوال و ارشادات جو اس کی زبان سے ادا ہوئے، وہ خاص اسی کا حصہ ہے۔ یہ کسی زاہدِ خشک یا ساحر و زندیق یا سیاسی لیڈر سے ممکن نہیں۔

جناب محمد ارشاد نے تمام حقائق اور تاریخی شہادتوں کو نظر انداز فرما کر گیارہ سو سال سے موجود تصور کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، وہ لکھتے ہیں "حلاج کے مخالفین اس پر شعبدہ باز ہونے کا الزام لگاتے ہیں۔ اور ان کے پھیلائے ہوئے افسانے زمانہ مابعد کے حنبلی امام ابن جوزی، امام ابن تیمیہ تک نے قبول کر لئے۔"

جہاں تک اس کے مخالفین کے الزامات کا تعلق ہے مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ صوفیہ پر لعن و طعن ہر دور میں ہوتی رہی ہے۔ ابن منصور کی بدنامی کا سبب اسی کے معتقدین کا غلو بھی تھا جس سے خود ابن منصور عاجز تھا۔ دشمنوں نے اسے بدنام کرنے کی غرض سے اس کی تحریروں میں بعض نامناسب عبارات کا الحاق بھی کر دیا تھا۔ اس کے معاصرین میں سے اکثر نے اسے اس لئے بھی رد کر دیا تھا کہ وزیر حامد بن العباس اس کے قتل کے درپے ہو چکا تھا۔ وہ جس کو بھی اس کی تائید اور موافقت میں پاتا، اس کے درپے ہو جاتا۔ اس بنا پر کوئی بھی اس کی موافقت کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔

کسی شخص کے متعلق اس کے بعض معاصرین کے سخت کلمات یا بعض مورخین کی ضعیف روایات یا بعض علماء کے فتاوے اس کے مردود ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتے۔ اگر ایسا ہوتا تو کوئی بھی عالم یا ولی کبھی مقبول نہ ہو پاتا۔ بہتر ہو گا کہ میں یہاں جماعت صوفیہ کے ان چند بزرگوں کا ذکر کر دوں جنہیں اپنے زور میں رد کیا گیا۔

- حضرت ابو یزید بسطامی کو سات مرتبہ اپنے شہر سے جلا وطن کیا گیا۔
- حضرت ذوالنون مصری کے گلے میں طوق اور پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر بغداد میں خلیفہ کے سامنے پیش کیا گیا۔
- شیخ ابو سعید خراز کی تحریر کے بعض الفاظ پر تکفیر کی گئی۔
- حضرت سہیل بن عبداللہ کو کافر کہہ کر اپنے وطن سے نکال دیا گیا۔
- حضرت جنید بغدادی نے جب علم توحید پر تقریر فرمائی تو لوگوں نے اُن کے خلاف شہادت دی، جس کے بعد انہوں نے اپنے آپ کو علم فقہ میں چھپا لیا۔

حضرت امام سبکی کے خلاف بارہا کفر کی شہادت قائم کی گئی۔
شیخ ابن ابی جمرہ نے جب یہ فرمایا کہ مجھے بیداری میں حضورؐ سے شرف اجتماع حاصل ہوتا ہے، تو ان کے خلاف محاذ قائم کر لیا گیا جس پر وہ خانہ نشین ہو کر رہ گئے۔
شیخ ابوالحسن مصری پر کفر کا حکم لگا کر جامع مسجد میں وعظ سے روک دیا گیا۔
امام غزالی کی بھی تکفیر کی گئی اور ان کی کتاب احیاء کو جلایا گیا۔
امام احمد بن حنبل کے ساتھ مسئلہ خلق قرآن پر کیا کچھ نہیں کیا گیا۔ بہت کم علماء نے ان کا ساتھ دیا اور زیادہ علماء نے قرآن کو مخلوق کہہ کر خلفاء وقت کے ظالمانہ برتاؤ سے اپنی جان بچائی۔
ابن منصور کی برأت کے لئے اس کے ہمعصر دو گواہ ہی کافی ہیں۔ اول حضرت ابوبکر شبلی جنہوں نے فرمایا کہ میں اور حلاج ایک ہی چیز ہیں۔ لوگوں نے مجھے دیوانہ قرار دیا اور یوں میری نجات ہوگی۔ حسین بن حلاج کو اس کی عقل نے ہلاک کر دیا۔ دوسرے ہمعصر گواہ حضرت ابوعبداللہ خفیف ہیں جن کا فرمان ہے کہ حسین منصور عالم ربانی تھے۔
بہتر ہوگا کہ یہاں چند مزید اولیاء کرام کا تذکرہ اور اقوال پیش کر دوں۔ جنہوں نے حلاج کی عظمت کا اقرار کیا ہے اور اس کے افکار بیان کئے ہیں۔
حضرت جنید بغدادی (۲۹۸ھ) حلاج کو نصیحت فرمایا کرتے تھے۔ کہ صبر سے کام لیں۔
ابوالعباس بن عطا (۳۰۹ھ) نے منصور کی تائید و موافقت کی اور اسی میں اپنی جان دے دی۔
امام ابوبکر شبلی (۳۳۴ھ) نے فرمایا کہ میں اور ابن منصور دونوں ایک ہی ہیں۔ انہوں نے اپنا حال ظاہر کر دیا۔ میں نے چھپائے رکھا۔
امام ابوالقاسم نصیر آبادی (۳۶۹ھ) نے ابن منصور کو موحد تسلیم کیا ہے۔
امام محمد بن خفیف شیرازی (۳۷۲ھ) نے حسین بن منصور کو عالم ربانی کہا ہے۔
امام ابوالقاسم قشیری (۴۶۵ھ) نے فرمایا کہ حسین بن منصور مغلوب الحال تھے اور وہ ارباب معانی وحقیقت میں سے تھے۔
سید علی بن عثمان ہجویری (۴۶۸ھ) نے اپنی تصنیف کشف المحجوب میں فرمایا کہ ہمارے زمانے میں شیخ ابوسعید ابوالخیر شیخ ابوالقاسم گرگانی اور شیخ ابوالعباس شقانی آپ کو صاحب سر اور ایک کامل بزرگ مانتے تھے۔
امام ابو حامد غزالی طوسی (۵۰۵ھ) نے حلاج کے عقائد پر بحث کی ہے اور اس کی شطحیات کی تاویلیں پیش کی ہیں۔
حکیم سنائی غزنوی (۵۲۵ھ) نے حلاج کو ایک بزرگ ہستی قرار دیا ہے۔
سید عبدالقادر جیلانی (۵۶۱ھ) نے فرمایا کہ ابن منصور کو ایک دشواری پیش آگئی تھی۔ اس وقت کوئی ایسا نہ تھا جو اس کا ہاتھ تھام لیتا۔
شہاب الدین سہروردی (۵۸۲ھ) نے بھی حلاج کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔
شیخ فریدالدین عطار (۵۸۹ھ) نے انہیں مرشد بزرگ لکھا ہے۔
روزبہان شیرازی (۶۰۶ھ) نے اپنی تفسیر لطائف البیان میں جا بجا حلاج کے اقوال درج کئے ہیں۔

صوفی فخرالدین عراقی، مولینا رومی، مولینا جامی، حافظ شیرازی سبھی منصور کے معتقد تھے۔ انہوں نے اس کے اقوال کو جا بجا بیان کیا ہے۔

حضرت ابن عربی، علامہ عبدالوہاب شعرانی، صوفی فخرالدین عراقی، حضرت محمود شبستری سبھی اس کی تعظیم کرتے ہیں۔

پاک و ہند میں حضرت فریدالدین گنج شکر، قطب الدین بختیار کاکی، نظام الدین اولیا، نصیرالدین چراغ دہلوی، شیخ عبدالقدوس گنگوہی، شیخ عبدالحق ردولوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا اشرف علی تھانوی وغیرہ بے شمار بزرگانِ دین اس کا تذکرہ بڑی عقیدت سے کرتے ہیں۔

شبلی نے اپنے مریدوں سے کہا کہ حلاج کی شہادت ایک ایسا گوہر ہے جس کا ہاتھ آنا آسان نہیں، اس کی عزت کرنی چاہیے، اور سینے میں محبت پنہاں رکھنی چاہیئے، تاکہ یہ ابدیت کے لئے زاد راہ ہو۔

ولی کے چہرے کو اللہ تبارک و تعالیٰ زندہ جاوید بنا دیتا ہے اور اس کی عظمت موت کے بعد پہچانی جاتی ہے۔ اور یہ حقیقت حلاج پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ ولی کی سب سے بڑی کرامت یہی ہے کہ شدائد و مصائب میں بھی محبتِ الٰہی پر قائم رہے اور اس میں ذرا برابر کی کمی نہ آئے۔ حسین بن منصور حلاج کو اس دولت سے بھرپور حصہ ملا تھا۔ انہیں سولی پر چڑھایا جا رہا ہے اور ان کی بات بات سے محبت و عشقِ الٰہی کے شرارے نکل رہے ہیں۔

"میرا من، میرے اور تیرے درمیان پردہ بن گیا ہے
پس تو اپنے من سے میرے من کا پردہ اٹھا لے"

"واحد کو اتنا ہی کافی ہے، کہ وہ واحد کے ساتھ ایک ہو جائے"

"ہم تیرے دیدار کو آ رہے ہیں"

"اے رب، اگر تو اسے دوست رکھتا ہے جو تجھے آزار پہنچاتا ہے۔
تو تو کس طرح اسے دوست نہ رکھے گا، جو تیری راہ میں دکھ اٹھاتا ہے"

حسین بن منصور حلاج کے اقوال اور تصانیف کا انکار فہم ناقص کی بنا پر کیا جاتا ہے۔ ان کے مخالف کی بابت بے خبر ہیں اور حلول کے چکر میں پھنسے ہوئے ہیں۔ درحقیقت کسی کے کلام کو سمجھنے کے لیے اس مقام تک رسائی اشد ضروری ہے شیخ محی الدین ابن عربی نے فرمایا ہے۔ "بسا اوقات قلوب عارفین پر تجلیات الٰہیہ کی ہوائیں چلتی ہیں، اگر وہ ان کو زبان سے بیان کر دیں تو بعض دفعہ عارفین کاملین بھی ان کو نہیں سمجھتے اور اہل ظاہر تو رد ہی کر دیتے ہیں"۔

اور بقول ذوقی :-

"اس شان کے بلند مرتبہ عارفوں کے کلام کی عبارتیں ایسی مشکل اور مبہم اور پیچیدہ ہوتی ہیں۔ کہ اصطلاحات و اشارات و کنایات سے ناواقف، اور ان کے خاص انداز بیاں سے ناآشنا علمائے ظواہر چالیس چالیس سال تک شکوک کی پیچیدگیوں میں الجھے رہتے ہیں اور بداعتقادی کی دلدل میں پھنسے رہتے ہیں"۔

آخر میں حسین ابن منصور حلاج کی شہادت کے بارے ایک لطیف نکتہ کی طرف اشارہ کرتا چلوں۔ منصور حلاج

نے اپنے آخری قید کے ایام میں اسرار و رموز اور حقائق تصوف پر جو کتاب تصنیف فرمائی، اس کا نام انہوں نے قرآن الحکیم کے حروف مقطعات میں سے طس (الطواسین) رکھا اور یہی حرف طس = ۳۰۹ ان کی شہادت کی تاریخ بنی۔

اب محمد ارشاد صاحب سے ان کے ارشادات "بات سے بات" کی بابت بقول شاعر یہ عرض کرتے ہوئے اجازت چاہوں گا:۔

"کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے۔۔"

میاں سعید الرحمن (پشاور)

پوٹھوہار کی ثقافت

"فنون" کے شمارہ جون، جولائی ۱۹۹۰ء میں امین راحت چغتائی صاحب کا مضمون "پوٹھوہار کی وادی اور اس کی ثقافت" اپنے موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کر پایا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مصنف کے ذہن میں بعض چیزیں واضح نہیں ہیں۔ جغرافیائی اعتبار سے وہ اس سطح مرتفع کے بارے میں لکھ رہے ہیں جس میں چکوال، جہلم اور راولپنڈی سے اٹک تک کا علاقہ شامل ہے۔ وہ اسے پوٹھوہار کا علاقہ قرار دیتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کا متعین کردہ تلفظ "پٹھوار" درست نہیں ہے۔ اصل تلفظ ن فتح کے ساتھ "پٹھوہار" ہے۔ لسانی اعتبار سے وہ اس سارے علاقے کو ایک اکائی سمجھ رہے ہیں اور وہاں پر بولی جانے والی زبان اور مختلف لہجوں کو پوٹھوہاری قرار دیتے ہیں۔ جب کہ حقیقتاً پوٹھوہاری صرف اس زبان کا نام ہے، جو راولپنڈی سے مغرب کی طرف ٹیکسلا تک، شمال کی طرف مری اور کہوٹہ تک، مشرق میں تحصیل گوجر خان اور تحصیل جہلم میں دینہ اور ڈومیلی تک بولی جاتی ہے۔ یہی زبان پونچھ کے ایک بڑے حصے میں اور آزاد کشمیر کے مقامات کوٹلی اور میرپور کے گردونواح میں استعمال ہوتی ہے۔ چکوال سے شاہ پور تک، پنڈی گھیپ اور فتح جنگ میں پنجابی کے دوسرے لہجے مستعمل ہیں۔ جناب احمد ندیم قاسمی کے بارے میں "افکار" کے ندیم نمبر میں ان کی بیٹی ناہید نے اپنے بھائی نعمان کے حوالے سے لکھا تھا کہ "ہم لوگ اباجی سمیت گھر میں پوٹھوہاری پنجابی بولتے ہیں"۔ میں نے اس بارے میں برادرم ندیم سے استفسار کیا، تو انہوں نے کہا کہ وہ اپنی زبان کو کیمبل پور کی پنجابی قرار دیتے ہیں جس کا پوٹھوہاری کے ساتھ کوئی واضح واسطہ نہیں لگتا۔ اس لئے حیرت کی بات ہے کہ امین راحت چغتائی نے کیونکر ان مختلف لہجوں کو جن کا نہ صرف تلفظ مختلف ہے بلکہ جن کا ذخیرۂ الفاظ بھی جداگانہ ہے، ایک زبان قرار دے کر اس پر پوٹھوہاری کا نام چسپاں کر دیا ہے۔

پھر اس سے بھی زیادہ قابلِ اعتراض چیز یہ ہے کہ وہ گکھڑوں کو پوٹھوہار کی "تمام تر تہذیب، ثقافت، شجاعت اور دلیری" کا اصل وارث قرار دے رہے ہیں۔ ان کے سوا انہیں سارے علاقے میں اور کوئی قوم نظر ہی نہیں آتی۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ گکھڑ نہ تو اپنی تعداد کے اعتبار سے وہاں کی اہم ترین قوم بنتے ہیں اور نہ ہی ان کی اکثریت اس علاقے میں آباد ہے۔ تعداد کے اعتبار سے وہاں پر راجپوت، جاٹ، گوجر اور اعوان کہیں زیادہ ہیں۔

اس طرح ان کا یہ خیال کہ پوٹھوہاری، فارسی اور پراکرت کے بولنے والوں کے میل جول سے پیدا ہوئی ہے، درست نہیں لگتا۔ پوٹھوہاری میں ایک ترکی لفظ اور دو تین فارسی الفاظ کا حوالہ دے کر یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا۔ اگر یہ امر درست

ہوتا تو ساری دنیا کی زبانوں کا فارسی سے ماخوذ ہونا ثابت کیا جا سکتا۔ (بعض لوگ سچ مچ یہ دعویٰ کرتے ہیں) انگریزی اور فرانسیسی میں پوٹھوہاری سے زیادہ الفاظ فارسی زبان سے ملتے جلتے پائے جاتے ہیں۔ شمالی ہندوستان کی ساری زبانوں میں فارسی اور ترکی الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔ پوٹھوہاری میں ان کی تعداد دوسری زبانوں کے مقابلے میں نسبتاً کم ہے۔

افسوس کی بات ہے کہ پاکستان میں تاریخی اور لسانی تحقیقات کے سلسلے میں کوئی قابلِ ذکر کام نہیں ہو رہا۔ پوٹھوہاری کے بارے میں جو کچھ امین راحت چغتائی نے لکھا ہے، وہ آج سے پچاس برس قبل اس غیر علمی اور غیر تنقیدی رنگ میں لکھا جاتا رہا ہے۔ یہ مکھی پر مکھی مارنے کا سلسلہ کب ختم ہوگا؟

"فنون" کے اسی شمارے میں ایوب اختر کے افسانے "پیلی سرسوں" میں پوٹھوہار کی فضا سانس لے رہی ہے۔ اگرچہ ان کا افسانہ ایک مبتدیانہ کوشش سے اوپر نہیں اُٹھ پایا۔ اشفاق احمد اور عطیہ سید کے افسانوں میں مجھے ریاضتِ فن کی جھلک دکھائی دی۔

منیر الدین احمد (ہمبرگ، جرمنی)

کس کی مانوں؟

میں عرصہ دراز سے ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کے مطالعہ میں مصروف ہوں۔ بہت عرصہ ہوا اُن کی ایک تنقیدی کتاب شائع ہوئی جس کا نام ہے "اُردو شاعری کا مزاج" جو بلاشبہ ایک نہایت دلچسپ تنقیدی کتاب ہے۔ اس کتاب میں موسیقی پر بحث بہت دلچسپ ہے اور ہماری موسیقی میں راگ راگنیوں کی بڑی خوبصورت وضاحت کرتی ہے۔ آپ کا رسالہ یہاں آسانی سے نہیں ملتا ہے۔ ایک دوست سے مانگ کر دیکھا تو اس میں ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "راگنی کے تصور کا ارتقاء" لکھنے والے جناب رشید ملک صاحب ہیں۔ اس مضمون کو پڑھ کر ذہن بہت منتشر ہوا۔ پتہ نہیں لگتا کہ کس کی بات مانوں۔ اس پریشانی کا صرف ایک ہی علاج ہے کہ آپ یا ڈاکٹر صاحب یا رشید ملک صاحب یا آپ کا کوئی قاری اس بات کی تشریح کرے کہ کس دانشور کی بات پر کان دھرا جائے۔ یعنی راگ راگنیوں کو تسلیم کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ اُمید ہے کہ آپ اس معاملے میں مدد فرمائیں گے۔

حبیب نثار (بنجارہ ہل، حیدرآباد
بھارت)

تازہ شمارہ

تازہ اشاعت میں محمد ارشاد نے "بات سے بات" میں بڑی مفید اور کارآمد باتیں کہی ہیں۔ مجھ ایسوں کے لئے تو اس میں وہ باتیں بھی ہیں جن کو ہم انکشاف کا درجہ دے سکتے ہیں۔ حسین بن منصور حلاج کے بارے میں انہوں نے جو باتیں کہی ہیں وہ تاریخ کی عام کتابوں میں دیکھنے کو نہیں ملتیں۔ میرے لئے یہ بات حیرت کی نہیں ہے کہ ان کا بہت سا کلام وضعی ہے۔ دراصل استحصالی طبقوں کا ازل سے یہ وتیرہ رہا ہے کہ اس شخص کو خوب بدنام کرو جس کے ہاتھوں ان کے اقتدار کو گزند پہنچنے کا خطرہ ہو۔ محمد ارشاد کی باتیں پڑھ کر تو یوں لگتا ہے کہ حسین بن منصور حلاج ایک زبردست

انقلابی انسان تھے جن کے دل میں غریبوں کا درد ہر دم کروٹیں لیتا رہتا تھا۔ وہ اس راہ میں اتنے ثابت قدم رہے کہ انہوں نے اپنی جان تو گنوا دی لیکن اپنے نظریات سے سرمو انحراف نہ کیا۔ ماضی میں اسلم سراج الدین نے ان کے بارے میں جو مقالہ "فنون" میں سپردِ قلم کیا تھا اس میں بھی کچھ ایسی ہی باتیں کہی گئی تھیں۔ کاوش عباسی نے مقبول شاعری اور نامقبول شاعری میں بڑی اچھی باتیں کہی ہیں۔ شعر کے ذریعے عوام سے گفتگو کرنا کوئی گناہ نہیں ہے۔ میر تقی میر نے جسے لوگوں نے خدائے سخن کا لقب دے رکھا ہے صاف کہا تھا

شعر میرے ہیں گو خواص پسند   پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

افسانوں میں اشفاق احمد اور رام عارہ کے افسانے پڑھ کر خیال گزرا کہ ہمارے افسانہ نگاروں میں تصوف کا رنگ گاڑھا ہوتا جا رہا ہے۔ ان دونوں افسانوں میں انسان کے باطن کی کھوج لگانے کی کوشش کی گئی ہے۔ دونوں کا تجربہ بھی کافی ہے اس لئے دونوں نے موثر انداز میں باتیں کی ہیں۔ نگہت مرزا کا "خبر ہونے تک" فنی جانکاری کی غمازی کرتا ہے۔ بلقیس ظفر نے اختصار کو بروئے کار لاکر اپنی بات میں اثر پذیری پیدا کر دی ہے۔ کچھ لوگوں کو وہ فن پارہ قطعاً پسند نہیں آتا جس میں کوئی مقصد ہو۔ میں حیران ہوں کہ بغیر کسی مقصد کے کوئی بھی بات کہی جا سکتی ہے۔ علامہ اقبال نے لکھا تھا "ادب برائے ادب کا تصور انحطاط اور زوال کی عیارانہ ایجاد ہے کہ اسی کے زیرِ اثر ہم زندگی اور قوت سے محروم ہو کر رہ جائیں" ۔ ضیا بٹ کا افسانہ "دانشور" مقصدی افسانہ ہے۔ اس میں وہ جیتا جاگتا ماحول ہے جس میں ہم، تم اور افسانہ نگار سانس لے رہے ہیں۔ ہم سبھی اس ظلم اور ناانصافی کا شکار ہیں جس کا افسانے میں تذکرہ ہے۔ اس لئے یہ افسانہ ہم ایسوں کو پسند آئے گا اور ہم بھی اس وقت تک "جاگتے رہو" کی ہانک لگاتے رہیں گے جب تک اس دھرتی پر بسنے والے سبھی مظلوم جاگ نہیں جاتے۔

نیلوفر اقبال خوب لکھتی ہیں اور انہیں مناسب پذیرائی بھی مل رہی ہے "مسلمان" فنی تقاضوں کو تو پورا کرتا ہے۔ اس کا پلاٹ بھی سلیقے سے ترتیب دیا گیا ہے اور بات کو موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے لیکن ممکن ہے بعض لوگوں کو اس سے شکایت بھی ہو۔

اب بہت سے پاکستانیوں کو بیرونِ ملک جانے کا موقع ملتا ہے یہ مواقع افسانہ نگاروں کو بھی ملتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کے افسانوں میں غیر ملکی ماحول در آتا ہے۔ عطیہ سید کا "پریزاد" اور مصطفےٰ کریم کا "دو جھکتی ہوئی شاخیں" اسی نوعیت کے افسانے ہیں۔

محمد سعید شیخ ایک اچھے افسانہ نگار ہیں وہ اچھی موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں جن سے ان کی قلبی موانست ہوتی ہے۔ نیلم احمد بشیر بھی آگے بڑھ رہی ہیں۔ "میں اور میرا ساتھی" آج کے دور کی کہانی ہے۔ لگتا تھا کہ MANORIENTED سوسائٹی کے خلاف بغاوت کا مظاہرہ کریں گی۔ لیکن گاڑی کی چابی اپنے بیٹے کے ہاتھ میں تھما کر COMPROMISE کی صورت پیدا کر دی ہے۔ یوسف چودھری کا "دو کٹی ہوئی انگلیاں" غیر ملک کی آسائشات پر اپنے ملک کے دکھوں کی برتری کا احساس دلاتا ہے۔

ممتاز مفتی نے خوش گفتار میں اپنی نثر نگاری کے جوہر خوب دکھائے ہیں اور اپنے موصوف کی شخصیت کو اُجاگر کر دکھایا ہے۔ درمیان میں انہوں نے شعر کو گاجر کا حلوہ اور نثر کو گڑ سے تشبیہ دی ہے۔ لیکن ان کی اپنی نثر میں شعر کی تاثیر اور

جاذبیت موجود ہے۔ گو اس جملے کو ہم شعر نہیں کہہ سکتے۔ لیکن اس میں شعریت کا مزا موجود ہے۔ مسعود مفتی "ہم نفس" میں بہت سے اسرار پر سے پردہ اٹھا رہے ہیں اور اپنے ہم وطنوں کو سقوط ڈھاکہ کے اصل حالات سے آگاہ کر رہے ہیں۔

"اختلافات" میں ابو نعمان کا مکتوب غیظ و غضب سے مملو تھا۔ اس میں بات کہنے کا اسلوب ادبی سے زیادہ صحافتی تھا۔ رشید ملک مبارکباد کے مستحق ہیں کہ ان کے مضامین رجعتی حلقوں میں کھلبلی ڈال دیتے ہیں۔

خیر الدین انصاری (جھنگ)

ایوب صابر کا تذکرہ

اب کی بار آپ نے "فنون" کا ایک گوشہ استاد محترم ایوب صابر مرحوم کے لئے وقف کر کے کارِ خیر کیا۔ ایوب صابر ایک روشن ضمیر، روشن گہر، صاحبِ دل اور صاحبِ نظر شخصیت تھے۔ مرحوم صوبہ سرحد میں اربابِ سخن کے امام تھے۔ وہ شہر زیبا کے باسیوں کے لئے تیغِ صاعقہ خو اور شہر وفا کے رہنے والوں کے لئے توانائی کا سرچشمہ تھے۔ وہ شر کے خلاف زندگی بھر آتش بجان رہے اور ٹوٹے پھوٹے لوگوں کے حوصلے بڑھاتے رہے۔ انہوں نے پارے کی سی سیمابی کیفیت اور سمندر کی لہروں کا سا مزاج پایا تھا۔ وہ ہواؤں کی طرح آزاد اور برق کی طرح روشن تھے۔ ان کا آئیڈیل سید الشہداءؑ اور ابو ذر غفاریؓ تھے۔ اپنے ایک نامے میں انہوں نے مجھے لکھا:

"دل میں دو ارمان ہیں ـــ حج کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا مگر حضرت امام حسین علیہ السلام اور حضور نبی کریمؐ کے روضوں کی زیارت کی شدید خواہش رکھتا ہوں۔ مگر خدا جانے میرے یہ شوق پورے ہوں گے یا نہیں۔ حضرت امام حسینؑ میرے آئیڈیل ہیں اور میری یہ زبردست خواہش ہے کہ میرا سر بھی انہی کی طرح نیزوں میں پرو دیا جائے۔ میں سقراط کی طرح زہر کا پیالہ نہیں پینا چاہتا۔ منصور حلاج کی طرح سنگسار بھی نہیں ہونا چاہتا۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ اس بیسویں صدی میں بھی میرا وہی حشر ہو جو آج سے چودہ سو سال قبل کربلا میں حضرت امام حسینؑ کا ہوا تھا۔ ویسے اگر میں حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ہوتا تو حضرت ابو ذر غفاریؓ کا ساتھ دے کر جلا وطنی میں مرنا پسند کرتا اور وصیت کرتا کہ میری لاش کو وہ شخص غسل دے جو کسی دربار سے منسلک نہ رہا ہو اور میری نمازِ جنازہ وہ عالم پڑھائے جو سرکاری خطیب نہ رہا ہو۔" (۱۱ مارچ ۸۷ء)

اپنی وفات سے چند ہی روز قبل ۲ فروری ۹۰ء کو انہوں نے مجھے جو آخری نامہ تحریر کیا، اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"میں کوہاٹ کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ کوہاٹ کی نئی نسل کی تربیت کرنا چاہتا ہوں۔ کوہاٹ کی نئی نسل میں جمہوریت کی روح پھونکنا چاہتا ہوں۔ ان سے حسینی اوصاف کا تعارف کرانا چاہتا ہوں۔ اپنے اخبار "اذان" کو ایک انسٹی ٹیوشن بنانا چاہتا ہوں اور انسٹی ٹیوشن اور انڈسٹری میں جو فرق ہے اُس کو واضح کرنا چاہتا ہوں۔"

بدبختی دیکھئے کہ وہ اپنے ہفت روزہ "اذان" کا پہلا شمارہ منظرِ عام پر لانے سے چند ہفتے قبل ہی اپنے ابدی سفر پر روانہ ہوگئے ؏ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

پچھلا ایک آدھ برس اہلِ کوہاٹ پر بڑا بھاری رہا۔ شعیب قریشی، رحیم گل اور عطوف شفیق کے بعد ایوب صابر بھی ہمیں خون کے آنسو رُلا گئے۔ خداوند عز و جل ان سب اربابِ وفا کو ابدی سکون عطا کرے! "فنون" میں انجم یوسفزئی کی نظم "یارِ سبک گام" اور ڈاکٹر سلیم اختر کے مقالے "ایوب صابر کی بیاضِ شعر" نے مرحوم صابر کی یاد تازہ کر دی۔ زخم ہرے ہوگئے۔ سو اس مردِ بے ریا کا ذکر کئے بغیر نہ رہ سکا۔

شجاعت علی راہی (جدہ)

بیورلے نکلس کی کتاب

"فنون" کا تازہ شمارہ پیشِ نظر ہے۔ حصہ "اختلافات" میں طیب منیر صاحب کے تبصرے میں لکھا ہے کہ بیورلے نکلس کی کتاب VERDICT ON INDIA کے پہلے مترجم بشیر احمد انصاری ہیں۔ حالانکہ اس کا پہلا ترجمہ سابق ریاست حیدر آباد میں تقسیم سے پہلے غالباً ۱۹۴۴ء میں "فیصلہ ہندوستان" کے عنوان کے تحت جناب قدوس ہاشمی نے کیا تھا اور اگر میرا حافظہ خطا نہیں کرتا تو ادارۂ اشاعت اردو حیدر آباد دکن نے شائع کیا تھا۔

اس شمارے میں نیلوفر اقبال کا افسانہ "مسلمان" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اشفاق احمد، ام عمارہ، نگہت مرزا اور محمد سعید شیخ کے افسانے بھی لائقِ مطالعہ ہیں۔ ایک عرصے سے ہاجرہ مسرور کا کوئی افسانہ "فنون" میں نہیں چھپا۔ اس طرف توجہ دیجئے۔ رسالے میں غزلوں کے سخت انتخاب کی ضرورت ہے۔ سرورق موجد کا ہے اور اچھا ہے۔ لیکن اس میں "فنون" کو "ماہنامہ" بتایا گیا ہے جو حقیقت سے دور ہے۔ اسے صرف "مجلہ" لکھا جا سکتا ہے۔

محمد زکریا شریف (بمبئی)

تبصرے

الیاس عشقی، مشفق خواجہ، ڈاکٹر سلیم اختر، پروفیسر نظیر صدیقی، ستار طاہر، سیّد مشکور حسین یاد، سیّد رشید احمد، طارق زیدی، پروفیسر انور رومان، ناصر بشیر، زاہد منیر عامر، احمد ندیم قاسمی، اختر علی،

ناگزیر (شعری مجموعہ) قیمت:
مصنف: محسن احسان ناشر:

محسن احسان اس دور کا ایک جانا پہچانا شاعر ہے۔ خوش فکر، خوش گو، خوش مزاج، خوش مذاق، خوش شکل، خوش لباس، خوش وضع ـــ اس کی ان صفات کا ذکر بلا وجہ نہیں ہے۔ یہ سب صفات کسی نہ کسی طرح اس کی شاعری پر اثر انداز ہوئی ہیں۔ ان سے اس کی زندگی میں ایک خاص سلیقے اور قرینے کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ایک صاف شفاف فکر کی نہج کا سراغ ملتا ہے۔ جو فن کی صورت میں اس کی شاعری میں جھلکتا ہے۔ جو لوگ اس سے واقف ہیں وہ اس کی شاعری کو اس کے کردار کی طرحداری اور اس کے مزاج کی سحر کاری کے اثر میں پڑھتے ہیں جو اسے نہیں جانتے انہیں اس کی شاعری میں ان [illegible]ت کی دریافت میں زیادہ دقت نہیں ہوتی۔ اس سے مل کر اس کی شاعری کا مطالعہ کر کے ایک نفاست کا احساس ہوتا ہے۔ یہ اس کی فطرت کا تقاضا ہے اور یہی اس کے فن کی کلید ہے۔ سچا فن اچھی شخصیت کی طرح آہستہ آہستہ سرایت کرتا ہے، احسا[illegible] کا حصہ بنتا ہے، اور اس کا اثر دیر پا ہوتا ہے۔ وہ شراب خانہ ساز کی طرح اعصاب پر ایک دم حملہ آور نہیں ہوتا [illegible] کی طرح طبیعت میں رچتا چلا جاتا ہے۔ محسن [illegible] فن کی کیفیت بھی ایسی ہی ہے۔

اس کے [illegible] مجموعے "ناگزیر" کے مطالعے سے اس [illegible] کو مزید [illegible]ت حاصل ہوتی ہے کہ اس کے فن کی بنیاد گہرے جذبات اور جدید حسیت پر استوار ہے۔ شاعری کے لئے اسے اہتمام [illegible] کرنا پڑتا۔ یہ اس کے معمولات کا حصہ ہے۔ زندگی کے دوسرے لوازمات کی طرح ایک فطری تقاضا ہے۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے وہ عینک اتار دیں جو شاعروں کو بڑا اور چھوٹا کر کے دکھاتی ہے تو محسن اور اس کی شاعری کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

محسن زندگی کو امکانات کی سرحد سے دیکھتا ہے اس لئے اس کا نقطۂ نظر منفرد ہے۔ وہ زندگی کے حسن و قبیح اور سیاہ و سفید کو اضداد میں تقسیم کر کے درسی الفاظ میں نہیں ڈھالتا بلکہ ہمراہ و ہمزاد جانتا ہے۔ اس کے نزدیک ایک کی دوسرے سے شناخت ہے۔ ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہے۔ ایک دوسرے کی معنویت میں اضافہ کرتا ہے۔ یہ اس کے مزاج کی نرمی اور اس کی طبیعت کی نفاست کا تقاضا ہے۔ مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ معنویت کے اعتبار سے نور و ظلمت میں امتیاز نہ کرتا ہو۔ بس اتنا ہے کہ اس کے ہاں اس امتیاز میں روایتی سختی اور درشتی نہیں ہے بلکہ ایمائیت اور معنویت ہے جس کی وجہ سے توازن قائم رہتا ہے۔ وہ نفرت نہیں کر سکتا۔ اس کی نفرت شدید ناپسندیدگی کی سرحد سے آگے نہیں بڑھتی۔ قابلِ نفرت چیزوں اور منظروں کو بھی وہ سرحدوں سے دیکھتا ہے۔ حدود

کو پھلانگ کر انہیں میگنی فائی نہیں کرتا اور ایسا کرنا جرأت کے فقدان کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ترسیلے کی اسیر حاصلی اور جذبے کے توازن کی وجہ سے ہے۔

محسن اپنے بہت سے ہمعصر شعراء کی طرح شعر کو پبلسٹی کے لہجے میں نہیں ڈھالتا۔ ویسے بھی زندگی کا ادراک شاید اشتہار بننے کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ کم از کم محسن کے ہاں تو ایسا نہیں ہے۔ اہلِ قلم (شاعر ہوں یا ادیب) اپنے عہد کی دانش میں زندہ رہتے ہیں۔ ادیبوں اور شاعروں کی ہی خصوصیت نہیں، عام ذہنوں تک بھی دانشِ حاضر صرف تحصیل ہی کے ذریعے نہیں پہنچتی۔ ان گنت ذرائع ہیں، جن سے ذہن سیراب ہوتے رہتے ہیں۔ پھر محسن تو انگریزی ادب کا استاد ہے وہ تو علمی طور سے بھی فن و ادب کے رجحانات و تحریکات اور فکر و دانش سے باخبر ہے۔ اس کے کلام کے مطالعے کے دوران مجھے محسوس ہوا کہ کہیں کہیں اس کے خیالات پر وجودی فکر کا پرتو پڑتا ہے۔ اگرچہ اس کا سلسلہ بہت مستحکم اور مربوط نہیں ہے۔ ویسے بھی وجودی فکر فلسفے سے زیادہ ایک طرزِ زندگی ہے۔

دو عالمگیر جنگوں کے بعد جہاں زندگی کے ہر شعبے میں غیر معمولی ترقی ہوئی۔ وہاں بے پناہ ذہنی انتشار اور اس کے نتیجے میں بے اعتقادی اور بددلی بھی پیدا ہوئی۔ جو جنگ کی شکست و ریخت کا لازمی نتیجہ تھا۔ خوابوں کے چکنا چور ہونے سے حوصلے پست ہو جاتے ہیں۔ ایسے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں، جن کا حل کسی کے پاس نہیں ہوتا۔ ان حالات میں بڑے پیمانے پر بے اعتقادی ذہنوں میں گھر کر جاتی ہے۔ اسی کیفیت کا ادب میں ظاہر ہونا ناگزیر تھا۔ اس انتشار نے ایک مخصوص نقطۂ نظر اور فکر کی صورت اختیار کر لی جو ایک رجحان اور رویہ بن گیا۔ جس کے زیرِ اثر سوچنے والے ذہن تنہائی اور اجنبیت کا شکار ہو گئے۔ وجودی نقطۂ نظر اسی صورتِ حال کی پیداوار ہے۔

محسن کے کلام میں تنہائی کا احساس واضح صورت میں موجود ہے۔ اجنبیت خارج سے تعلق کی کمزوری کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے جو رفتہ رفتہ کلبیت اور قنوطیت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ جس کے اثرات کو صرف احساسِ ذمہ داری اور انتخاب (choice) ہی سے رد کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجودی فکر کا مثبت پہلو ہے۔ لیکن اس صورتحال میں احساسِ ذات کو تقویت ملتی ہے اور اپنی ذات ہی اہم مرکزِ فکر بن جاتی ہے۔ فرد خود کو زندگی کے میدانِ کارزار میں ہر طرف سے مخالف قوتوں کے درمیان گھرا ہوا پاتا ہے۔ وجودی فکر ذہن کی اسی کیفیت میں زندگی گزارنے کا طریقہ سجھاتی ہے اور انسان یہ سوچنے لگتا ہے کہ اس پر بحیثیت فرد کس قسم کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس نہج کی فکر میں موجودہ اخلاقی اور سیاسی نظام سے سمجھوتا ممکن نہیں رہتا۔ اس منزل پر زندگی میں ذمہ دار کردار ادا کرنے کے لئے کسی راہ کا انتخاب ایک کٹھن مرحلہ ہوتا ہے۔ بڑے لکھنے والے اس صورتِ حال پر قابو پا لیتے ہیں۔ وجودیت سے محسن کا تعلق علمی ہے فکری نہیں۔ اس کے ہاں نہ وجودی تصوف کا روحانی تجرد ہے نہ فکری الحاد و انکار اور نہ سیاسی اور نہ فکری غیر مذہبی اخلاق۔ اس کی فکر کی اساس مذہب اور وطن پر ہے اور یہ فکر اس کے لئے ناگزیر ہے۔ لیکن وجودی اہلِ قلم کی طرح وہ اس صورتِ حال سے ہر حالت میں برسرِ پیکار نہیں۔ اس کی پیکار میں کسی حد تک "ناگزیر" کی بعض صورتوں کو قبول کرنے کی گنجائش موجود ہے۔ یہاں اس کا راستہ وجودی فکر سے مختلف ہو جاتا ہے۔ پھر بھی وجودی فکر کے کچھ عناصر کا سراغ اس کے ہاں مل جاتا ہے۔ اجنبیت کے احساس کی بہترین مثال اس کی نظم "لیڈی میکبتھ" ہے جہاں اجنبیت کا شدید احساس قتل پر منتج ہوتا ہے اور اجنبیت قتل کے ساتھ اپنے نقطہ

عروج پر پہنچ جاتی ہے۔

روح اور ذہن کی اس کشمکشِ پیہم سے — دل میں تکلیف ہے کیا آنکھ میں نم کتنا ہے
ہوسِ جان نے کس موڑ پہ لا ٹھہرایا — پسِ دامانِ وفا رنج و الم کتنا ہے

سوچنے والا ذہن ہر دور میں اجنبی رہا ہے۔ غالب اپنے دور میں تنہا تھا۔ اس کی ذات اجنبیت کی منفرد مثال ہے۔ محسن بھی اجنبیت کے احساس سے خالی نہیں ہے۔ اسی لئے غالب کی اجنبیت میں وہ اپنی اجنبیت کے احساس کی جھلک دیکھتا ہے اور معاً اس کے لب پر آجاتا ہے۔

لفظ و معنی کو جلا مل نہ سکی تیرے بعد — نالۂ حرف و سخن اب بھی وہی ہے کہ جو تھا
مستیٔ ابر کے بارصفت سر دشتِ جنوں — صرصرِ غم کا چلن اب بھی وہی ہے کہ جو تھا
تجھ کو تھا شکوۂ بے مہریٔ یارانِ وطن — حالِ اربابِ وطن اب بھی وہی ہے کہ جو تھا

اجنبیت کا یہ احساس شدید تنہائی کا شاخسانہ ہے۔ محسن کی تنہائی میں احساس کی شدت ہے مگر اس کی طبیعت کا توازن اور اس کے احساس کی نفاست اس کے کلام کو ایک جداگانہ انفرادیت کا رنگ دیتی ہے۔

بولتا ہے فضا کا سناٹا — دل ہے اور کس بلا کی تنہائی
دار تک آکے بھی نہ ختم ہوئی — عشقِ صبر آزما کی تنہائی
رہروؤں کو تلاش کرتی ہے — گردِ دشتِ وفا کی تنہائی
کوئی گزرا تھا شہرِ دل سے کبھی — آج تک ہے بلا کی تنہائی

تنہائی کا احساس محسن کی شاعری کے محرکات میں سے ایک اہم محرک ہے۔ اسے خود بھی اس کا احساس ہے:۔

بہت دنوں سے — تری یاد کی لپیٹ میں ہے
مری غزل، مرا فن، میرا کربِ تنہائی

محسن کے ہاں احساسِ تنہائی کی فراوانی ہے، لیکن وہ "انڈر اسٹیٹمنٹ" کا شاعر ہے۔ احساسِ تنہائی کتنا ہی جان لیوا کیوں نہ ہو اس کا اظہار اس کے ہاں اس کیفیت سے آگے نہیں بڑھتا۔

چار جانب سے صدا آئی مری — شعبدہ بن گئی تنہائی مری
رات پھیلی تو سرِ خلوتِ غم — بکھراں بن گئی تنہائی مری

زندگی میں اس کے بہت سے غم اس کے اپنے انتخاب کی وجہ سے ہیں۔ وہ انا پرست نہیں ہے۔ پھر بھی ایک فرد کی حیثیت سے اس کو اپنی اہمیت کا احساس ہے مگر اس کے اظہار سے اسے دلچسپی نہیں ہے۔ وہ اظہارِ ذات کو پسند نہیں کرتا۔ اس کے ہاں اگر انا اور اظہارِ ذات کا کوئی موقع آتا بھی ہے تو دبے دبے لہجے میں اس طرح جیسے وہ اس اظہار میں خود کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ اپنی کامرانیوں اور ناکامیوں کا اقرار شدت سے قبول کرتا ہے۔ لیکن اس کے اظہار کے نادر طریقے اختیار کرتا ہے۔ ایک جگہ اس کے لئے PARALLEL تلاش کر کے خود کو منطقی طور پر اس تکلیف اور کرب کو برداشت کرنے کے قابل بنا لیتا ہے۔

زمانے والوں کو شاید ابھی نہیں معلوم — ہے کیٹس کی طرح محسن کا نام نقش بر آب

خود کو ثانوی حیثیت دے کر گویا وہ کینوس کے پیچھے چُھپ گیا ہے۔ اس کا اظہار، ذات انانیت نہیں بننے پاتا، لیکن وہ اپنی "چوائس" پر مستحکم رہتا ہے اور اس احساس ذمہ داری سے بھی عاری نہیں ہے جو اس چوائس کی وجہ سے اس پر عائد ہوتی ہے (اس کا موثر اور خوبصورت اظہار اس کی اس نظم میں ہوا ہے جو اس نے دلّی میں کہی تھی) وہ ملت دوستی اور وطن پرستی کے جذبے سے سرشار ہے۔ اس سلسلے میں اس کی فکر کا ایک خاص سیاسی اور اخلاقی اور شاعرانہ پہلو ہے۔ متضاد سیاسی نظریات اور تصورات میں جو خاص نقطۂ نظر اس کا اپنا "انتخاب" ہے وہ اس پر ثابت قدم ہے اور اسے ترک کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس وجہ سے اس کے کلام میں احساسِ ذمہ داری کا اظہار موجود ہے۔ یہی احساس ہے جو اس کی نظم "نوا تلخ تر می زن" میں اس طرح اس کی زبان پر آجاتا ہے۔

ہم اہلِ قلم اب اپنے فن کا کاندھوں پہ اٹھائے ہیں جنازہ
پاؤں میں ہیں بیڑیاں قسم کی چہروں پہ سجا ہوا ہے غازہ
سنولا گئے پھول گلشنوں کے کچھ ایسی چلی ہوائے تازہ
سینے میں گھٹی ہوئی ہیں سانسیں یوں موجِ نسیم نے نوازا

اس سلسلے میں احساس ذمہ داری جگہ جگہ ظاہر ہوا ہے، مگر اس کا سب سے شاعرانہ اظہار اس نظم میں ہوا ہے جس کا عنوان ہے "وقت کب وہ آئے گا" جس میں وہ روح قائداعظم کی زبانی جو کچھ سنتا ہے ہمیں بھی سناتا ہے:

وقت کب وہ آئے گا چاند کب وہ نکلے گا
نور کب وہ برسے گا جب زمین کا سینہ
تھاپ سے کدالوں کی خوش لباس گندم کی
بالیاں اُگائے گا جب ترستے ہاتھوں میں
ان کے کام کا ثمرہ بے عرق جبینوں سے
آسماں کے زینوں سے باوقار آئے گا

- - - - - - - - -

جب ترستی آنکھوں میں لہر لہر اندیشہ
بوند بوند آنسو کو بے نشان پائے گا
روشنی سجائے گا وقت کب وہ آئے گا

محسن ناکامیوں سے بددل نہیں ہوتا بلکہ ان کی وجہ سے ایک نیا عزم لے کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے صعوبتیں اس کے حوصلے کو مہمیز کرتی ہیں اور وہ اپنے ماضی سے حال کو سنوارنے کے لئے تقویت حاصل کرتا ہے۔

ہم سایۂ شاخ گل کے باوصف آلام کی دھوپ میں کھڑے تھے
ہاتھوں پہ تھی گردِ دشتِ فرقت آنکھوں میں نگینے سے جڑے تھے
گو بارشِ تیرِ غم تھی پھر بھی ہر گام پہ ظلم سے لڑے تھے
ہم دیکھ چکے ہیں سب مصائب ہم کاٹ چکے جو دن کڑے تھے

اس سلسلے میں سب سے پُراثر نظم وہ ہے جو محسن نے دلی میں کہی تھی۔ اگرچہ وہ بظاہر قنوطی نوٹ پر ختم ہوتی ہے، لیکن قریبی جائزے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس میں قنوطیت نہیں ہے بلکہ شاعر کے اپنے انتخاب کے نتائج کا احساس ہے جو تاریخ کی دین ہے۔ اس احساس ذمہ داری کے پورا نہ ہو سکنے کا ملال ہے جو تاریخ کا جبر ہے اور جسے تاریخ نے بڑی صفائی سے تقسیم کر دیا ہے۔ وہ برصغیر کی تحریک آزادی میں اپنے اس انفرادی یا اجتماعی کردار پر متاسف یا شرمندہ نہیں ہے جس کے نتیجے میں آزادی اور ایک علیحدہ وطن نصیب ہوا ہے، جان، عزت آبرو اور مال و متاع کی قیمت پر حاصل کئے ہوئے اس وطن اور اس کی آزادی کے لئے اب بھی وہ بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے تیار ہے۔ یہی احساس اس نظم میں سادہ الفاظ اور پُراثر انداز میں ادا ہوا ہے۔ دلی میں اس کا یہ تاثر فطری بھی ہے اور تاریخی بصیرت کا آئینہ دار بھی:

مجرم کی طرح ہر ایک در پر میں سر کو جھکائے چپ کھڑا ہوں
آنکھوں میں ندامتوں کے آنسو ہونٹوں پہ ہزیمتوں کی آہیں
اور خود سے یہ کہہ رہا ہوں مجھ کو جتنی بھی سزا ملے وہ کم ہے

دراصل شاعر کا یہ تاثر وقت گذر جانے کے بعد دلی پہنچنے پر اس کے جذباتی ردِّعمل کا نتیجہ ہے۔ اسے اس آزاد اور عظیم دلی نہ دیکھ سکنے کا غم ہے جو اس عظیم شہر کو اس کے دور میں حاصل تھا جب یہاں اس کے اسلاف کی حکومت تھی۔ اس کے حافظے میں تقسیم سے قبل کی دلی کی ادبی، سماجی، اقتصادی اور سیاسی حالت کا نقشہ ابھرتا ہے۔ جو اس کے اسلاف کی دلی کی عظمت کی یاد دلاتی تھی۔ اس نظم میں بین السطور اور تحت اللفظ یہ سب کچھ ہے جس کا اظہار اس طرح ہوا ہے:

فریاد کناں مزار مجھ سے کہتے ہیں سوال اب آتے ہو تم
جب رونقیں ساری لٹ چکی ہیں جب مشعلیں ساری بجھ چکی ہیں
جب بستیاں راکھ ہو چکی ہیں جب ہستیاں خاک ہو چکی ہیں

یہی وہ "ناگزیر" ہے جسے محسن طوعاً و کرہاً ہی سہی تاریخی جبر کے طور پر قبول کر لیتا ہے لیکن اصولی طور پر اس کی فکر اُسی نظریے سے مربوط ہے جو برصغیر کی تاریخ نے اسے دیا ہے اور جس کی آخری سرحد پہ کھڑا وہ تاریخ کے نتائج کا مشاہدہ کر رہا ہے کہ یہی اس کی سیاسی تقدیر اور جدوجہد آزادی میں اس کے سیاسی خوابوں کی تعبیر کا دوسرا رُخ ہے جو اُس سرزمین کی صورت میں اس کے سامنے ہے جو اس کے آباؤ اجداد کا وطن ہے اور جسے اب وہ اپنا وطن نہیں کہہ سکتا۔ یہ سب اس مختصر، سادہ اسلوب، آسان زبان اور پُراثر طرزِ بیان میں اس نے بیان کر دیا ہے۔ یہی اس کا فن ہے۔ آخری تجزیے کے طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کا نقطۂ نظر نیم وجودی اور شاعرانہ اعتبار سے قومی اور نظریاتی ہے۔

محسن کے مجموعۂ کلام "ناگزیر" میں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے جو اس کی انسان دوستی، جدید حسیاتی، فنی، تاثراتی اور جذباتی سطحوں پر اس کے خیالات و افکار سے روشناس کراتا ہے۔ اور ہمیں اس مانوس اور خوبصورت دنیا میں لے جاتا ہے جس کے تلخ ترش اور شیریں سے شاعر کا جذباتی تعلق ہے اور جو اس کے خوابوں کی دنیا ہے۔

"ناگزیر" کے مطالعے کے دوران ہم شاعر کے ساتھ اس دنیا کی سیر کرتے ہیں۔

الیاس عشقی

آئینہ کیوں نہ دوں (طنزیہ ومزاحیہ مضامین) قیمت:- ۱۰۰ روپے

مصنف:- اظہر حسین صدیقی ناشر:- میکون اینڈ کمپنی صدر کراچی - ۳

کسی کسی کتاب کے ظاہری محاسن سے متاثر ہو کر یا دھوکا کھا کر ہم اس کے باطن میں بھی جھانک لیتے ہیں جس کا نتیجہ کبھی کبھار خوشگوار بھی ہوتا ہے۔ اس وقت ایک ایسی ہی کتاب ہمارے سامنے ہے، جس کا نام ہے "آئینہ کیوں نہ دوں" اور مصنف کا نام نامی ہے اظہر حسین صدیقی۔ کتاب کا نام تو ہمارے لئے نیا نہیں، کیونکہ یہ غالب کے ایک مصرعے کا جزو اوّل ہے، البتہ مصنف کا نام پہلی بار سنا ہے، اگر یہ بھی غالب کے کسی مصرعے کا جزو اوّل یا جزو آخر ہوتا تو ہم اس سے بھی مانوس ہوتے۔

مصنف بننے کا عام قاعدہ یہ ہے کہ پہلے اخباروں کے ادبی صفحے پر اپنا نام اچھالا جاتا ہے۔ پھر ادبی رسالوں میں ان کے مدیروں کی تعریف میں خطوط چھپوائے جاتے ہیں اور آخر میں ان رسالوں کو سالانہ چندہ بھیج کر تخلیقات شائع کرائی جاتی ہیں۔ اظہر حسین صدیقی نے یہ طویل راستہ اختیار نہیں کیا، بلکہ راست اقدام کے ذریعہ ایک عدد کتاب کے ساتھ ادبی دنیا پر حملہ آور ہوئے ہیں۔ حملہ آور دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک تو وہ جو مالِ غنیمت سمیٹ کر واپس چلے جاتے ہیں اور دوسرے وہ جو حملے کے بعد خطۂ غیر میں مستقل طور پر آباد ہو جاتے ہیں۔ اظہر صاحب دوسری قسم کے حملہ آور معلوم ہوتے ہیں، ادبی دنیا میں وہ مستقل طور پر بود و باش کا ارادہ رکھتے ہیں۔

ہم نے مصنف کے ذاتی حالات سے واقف ہونا چاہا، تو کتاب نے کوئی رہنمائی نہ کی۔ اِدھر اُدھر سے پوچھا، تو صرف اتنا معلوم ہوا کہ موصوف "جنگ" کراچی میں "ماذح" کے گریہ آور ثقیل قلمی نام سے طنزیہ ومزاحیہ مضامین لکھتے رہے ہیں اور انکم ٹیکس کے محکمے میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز رہے ہیں۔ اس کے بعد مزید کچھ جاننے کی ضرورت نہ رہی، کیونکہ انکم ٹیکس والے دوسروں پر ٹیکس لگانے یعنی انہیں اذیت پہنچانے کے عادی ہوتے ہیں۔ اسی عادت کے تحت کبھی کبھی وہ کتابیں بھی لکھ دیتے ہیں۔ لیکن اظہر صاحب کی کتاب پڑھ کر اندازہ ہوا کہ یہ محکمانہ عادت کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ یہ ان کے صاف ستھرے ادبی ذوق کی آئینہ دار ہے۔ اس کا مقصد اذیت رسانی نہیں مسرت خیزی ہے۔

یہ کتاب ان طنزیہ ومزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے، جو مصنف نے گزشتہ ۱۰-۱۵ برسوں میں وقتاً فوقتاً لکھے ہیں۔ ان مضامین کے موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ بے شمار معاشرتی برائیوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ جن میں ادب اور سیاست بھی شامل ہیں۔ معاشرے کے بہت سے تاریک پہلوؤں اور منافقانہ رویوں پر پڑے ہوئے تہ در تہ نقاب اس ہنرمندی سے اٹھائے گئے ہیں کہ مصنف کے مشاہدے کی گہرائی اور اندازِ تحریر کی دل کشی کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ وہ معاشرتی برائیوں کی نشان دہی اس طرح نہیں کرتے، جس طرح انسدادِ منشیات کے اشتہاروں میں کی جاتی ہے، یعنی خوف ناک اور عبرت انگیز انجام سے ڈرا کر برائیوں کی بیخ کنی کی دعوت نہیں دیتے، بلکہ وہ مسئلے کے مضحک پہلوؤں کو اجاگر کر کے قاری کو مثبت انداز میں سوچنے کی راہ دکھاتے ہیں۔ انہوں نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا ہے، لکھنے کا حق ادا کر دیا ہے۔

اوپر کے پیراگراف میں ہم نے کتاب اور مصنف کی اتنی تعریف کر دی ہے کہ اپنے لکھے پر ہمیں کسی پیشہ ور دیباچہ

نگار کی تحریر کا گمان ہو رہا ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ کتاب کا ایک آدھ اقتباس دعوے کے ثبوت کے طور پر پیش کر دیا جائے تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہم جب کسی مصنف کے عیب گنواتے ہیں تو بے شمار ثبوت پیش کرتے ہیں اور تعریف کرتے ہیں تو دعویٰ ثبوت کے بغیر ہوتا ہے۔

آج کل شادیوں میں ویڈیو فلم بنانے کا ایسا رواج ہو گیا ہے کہ شادی کا مقصد خانہ آبادی سے زیادہ فلم سازی نظر آنے لگا ہے۔ اس سلسلے میں جناب مصنف لکھتے ہیں ـــ "شادی بیاہ میں نکاح کی تقریب تو ایک ثانوی سی شے ہو کر رہ گئی ہے، جبکہ اصل تقریب فوٹو اور ویڈیو فلم کی تیاری کا ہے۔ کیونکہ فلم بنانے والے کے بغیر نہ تو برات روانہ ہو سکتی ہے اور نہ نکاح ہو سکتا ہے۔ ہم خود ایک ایسی تقریبِ نکاح میں شریک ہو چکے ہیں جہاں ویڈیو فلم بنانے والے کے وقت پر نہ پہنچنے کے سبب تمام تقریب مع تفصیلات کے دوبارہ منعقد ہوئی۔ . . . ان حالات کو دیکھتے ہوئے، ہم نے یہ طے کیا ہے کہ آئندہ بچوں کی شادی کی تقریب کے کارڈ کا مضمون کچھ اس طرح کا ہوگا۔

> "محترمی! ہمارے بیٹے کی ویڈیو فلم بننا طے پایا ہے اور اس سلسلے میں ایک چھوٹی سی تقریب نکاح بھی ہوگی۔ ہم آپ کے بے حد ممنون ہوں گے اگر آپ اس تقریبِ سعید میں شرکت فرما کر ہمیں اپنی فلم بنانے کا موقع دیں گے، اور ہمارے اہلِ خانہ کے ساتھ فلم سازی میں شریک ہوں گے۔ نوٹ:۔ فلم رنگین بنے گی، اس لئے گزارش ہے کہ لباس اسی مناسبت سے پہن کر آئیں۔"

مصنف سے ہمیں ایک شکایت ہے کہ انہیں خامہ فرسائی کا ضرورت سے زیادہ شوق ہے، نہ صرف یہ کہ پوری کتاب انہوں نے خود لکھی ہے، بلکہ ہر ورق پر جہاں کہیں خالی جگہ نظر آئی ہے، اُسے بھی اپنے ارشادات و ملفوظات سے پُر کر دیا ہے۔ دیباچہ اور فلیپ عموماً مشاہیرِ ادب سے لکھوائے جاتے ہیں تاکہ کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو، یہ چیزیں جناب مصنف نے خود ہی لکھی ہیں، نتیجہ یہ نکلا کہ کتاب کی قیمت ہی میں اضافہ ہو سکا، قدر کا معاملہ التوا میں پڑ گیا۔

دائیں طرف کے فلیپ پر جناب مصنف لکھتے ہیں:

> "دستور کے مطابق کتاب کے فلیپ پر ممتاز دانشوروں اور نامور ادیبوں کی آراء کتاب اور صاحبِ کتاب کے بارے میں چھپنا ضروری ہیں۔ اوّل تو کوئی مستند نقاد اور ادیب ہمارے اور ہماری کتاب کے بارے میں لکھ کر ادب میں اپنا مقام کھونے پر تیار ہی نہیں ہوا، البتہ کچھ لوگوں کو ہم نے تعلقات ختم کرنے کی کامیاب دھونس دے کر راضی بھی کر لیا تھا، مگر جتنی تعریف ہم چاہتے تھے وہ کرنے پر تیار نہیں ہوئے۔ اس درمیان میں یہ ہوا کہ . . . ہمارا ضمیر ایک دم جاگ اُٹھا اور اس نے للکارا۔ "اپنے ذرا سے فائدے کی خاطر کیوں دوسروں کو خوار کراتے ہو؟" اور ہم نے پہلی دفعہ بے چون و چرا اس کی بات مان لی اور فلیپ نہیں لکھوایا۔"

اظہر صاحب کو شاید یہ معلوم نہیں ہے کہ آج کل فلیپ نگاری کی "صنعت" خاصی ترقی کر چکی ہے۔ ایسے ایسے ممتاز دانشور اور نامور ادیب موجود ہیں، جنہوں نے فلیپ لکھنے کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں کیا، بلکہ یہ کام بھی وہ خود نہیں

کرتے، صاحب کتاب ہی سے فلیپ لکھواتے ہیں اور آنکھیں بند کر کے دستخط کر دیتے ہیں۔ اظہر صاحب نے ضمیر کے جاگنے والی، جو بات کہی ہے، اسے بھی آرائش بیان سمجھنا چاہیئے۔ دوسروں سے چند سطریں لکھوانے پر جن کا ضمیر جاگ اٹھتا ہے، حیرت ہے کہ وہ خود پوری پوری کتابیں لکھ دیتے ہیں، مگر ضمیر سوئے کا سویا ہی رہتا ہے۔

دوسرے فلیپ پر اظہر صاحب نے اپنے کوائف ان الفاظ میں درج کئے ہیں . . . . "فلیپ کے اس حصے پر آج کل کے رواج کے مطابق مصنف کا سنِ پیدائش (اب اتنی پرانی باتوں کا کیا ذکر کرنا) جائے پیدائش (جو سارے جھگڑوں کی جڑ ہے) . . . . اس کا پیشہ (جو کوئی قابلِ فخر بات نہیں ہے) . . . . یہ تمام باتیں لکھی جانی ضروری خیال کی جاتی ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ صرف کتاب ضروری ہے، سو وہ حاضر ہے۔"

ہمارے خیال میں یہ سطریں لکھ کر بلا ضرورت مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہر مصنف کو اپنا سالِ پیدائش ضرور بتا دینا چاہیئے۔ ورنہ جس طرح علامہ اقبال کے سالِ پیدائش پر محفلوں میں طویل معرکہ آرائیاں ہو چکی ہیں، ویسی ہی معرکہ آرائیاں ہر مصنف کے سالِ پیدائش کے مسئلے پر ہوتی رہیں گی۔ نتیجتہً اس کی پیدائش ہی مشکوک ہو کر رہ جائے گی۔ ہر مصنف کو اپنی جائے پیدائش بھی ضرور ظاہر کر دینی چاہیئے۔ اس طرح مصنف کی اولاد کو بیروزگار ہونے کی صورت میں یہ معلوم ہو جائے گا کہ بیروزگاری کا سبب کوٹہ سسٹم نہیں، غلط جائے پیدائش ہے۔ ہر مصنف کو اپنا اصل پیشہ بھی ضرور بتا دینا چاہیئے تاکہ پڑھنے والوں کو معلوم ہو جائے کہ موصوف کس قسم کی پریشانیوں کی وجہ سے اپنے پیشہ ورانہ فرائض کو نظر انداز کر کے ادب کی خدمت فرما رہے ہیں۔

مذکورہ اقتباس کا آخری جملہ ("صرف کتاب ضروری ہے، سو وہ حاضر ہے") بھی لکھنے والے کی خوش فہمی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے اور بڑی حد تک مبہم ہے۔ مصنف کو صاف صاف بتانا چاہیئے تھا کہ کتاب کی اشاعت کس کے لئے ضروری ہے، خود اس کے لئے یا دوسروں کے لئے۔ جہاں تک دوسروں کا تعلق، ان کی اکثریت تو دیوانِ غالب کو بھی غیر ضروری سمجھتی ہے۔

سرورق کے بائیں جانب کے صفحے پر ایک خالی چوکھٹا چھاپا گیا ہے — اور اس کے نیچے مصنف نے تفصیل سے بتایا ہے کہ انہوں نے اپنی تصویر سے چوکھٹے کی عزت افزائی کیوں نہیں کی۔ انہوں نے اگرچہ اس کی کئی معقول وجوہ بیان کی ہیں، لیکن اصل وجہ نہیں بتائی۔ اصل وجہ وہی ہے، جو ہم کچھ عرصہ قبل کسی دوسری کتاب پر تبصرہ لکھتے ہوئے بیان کر چکے ہیں اور وہ یہ ہے کہ . . . ہمارے بیشتر مصنف اپنی جو تصویریں چھپواتے ہیں، انہیں دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ شاید پولیس کے ریکارڈ سے نکال کر چھپوائی گئی ہیں۔ (بشکریہ ہفتہ وار "تکبیر" کراچی)

مشفق خواجہ

ماہنامہ "انتشار" کلکتہ

ناشر: انشا پبلی کیشنز، ۲۵ بی زکریا سٹریٹ کلکتہ ۷۰۰۰۷۳ (بھارت)

مدیر: ف۔س۔ اعجاز

میر تقی میر کا یہ شعر ہماری غزل سے مخصوص عشق کے آئیڈیل کی صورت اختیار کر چکا ہے:

دور بیٹھا غبارِ میرؔ اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

لیکن کیا عملی زندگی میں بھی ایسا ہی والہانہ مگر باادب عشق کیا جاتا ہے، تو اس کا جواب اوّل تو نفی میں ہو

گا، اگر قطعی نفی نہ بھی ہو تو کم از کم مشروط اثبات میں ہوگا۔ خود میر تقی میر ہی کو لیں تو جیسے وصلِ محبوب کے بجائے جنون کے ہفت خواں طے کرنا پڑے۔ مومن اور داغ کامیاب عاشق بھی نہ تھے بلکہ ہرجائی تھے۔ اس انداز کی اور مثالیں بھی ملیں گی۔ حتیٰ کہ ہم میراجی تک آجاتے ہیں جس کی ناکامی نے اسے جنسی کجروی کی دلدل میں پھنسا دیا اور اس کو اس نے اپنی لیجنڈ کی تشکیل دی۔

اگر مشرق کے قدغنوں والے معاشرہ میں بھی حکایاتِ دل تخلیقی سطح پر تحریر کی جاتی ہیں تو پھر یورپ کا کیا کہنا۔ جہاں مرد عورت نارمل انداز میں سماجی روابط رکھ سکتے ہیں۔ اس کے باوجود کیٹس۔ فینی براؤن کی بنا پر خون تھوکتا مرا، شیلے اور براؤننگ کے الگ قصے ہیں اور ان سب پر مستزاد بائرن جس کے بقول —— محبت دو احمقوں کے درمیان بجز ایک غلط فہمی اور کچھ بھی نہیں!

جب میرے محترم دوست قتیل شفائی نے "انشاء" کا ادیبوں کی حیاتِ معاشقہ پر مشتمل خصوصی نمبر عنایت کیا تو میں نے حیرت سے یہ خوبصورت پرچہ دیکھا جو موضوع کی مناسبت سے دیدہ زیب انداز میں سلیقہ در نفاست سے مرتب کیا گیا ہے۔

"انشاء" کلکتہ سے نکلتا ہے اور بھارت کے معروف جرائد میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے مرتب ف س اعجاز یقیناً جدت پسند مدیر ہیں جنہیں ایسے اہم مگر مشکل موضوع پر خاص نمبر ترتیب دینے کی سوجھی اور ایک ایسا نمبر ترتیب دینے میں کامیاب ہو گئے جو یقیناً حوالہ کی چیز قرار پائے گا۔ چار سو صفحات پر مشتمل اس خاص نمبر کے مقالات پر ایک نگاہ ڈالنے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ فراہمیِ مواد کے لئے اعجاز صاحب نے کتنی محنت کی ہوگی۔

"ادیبوں کے رومان" ایک تجزیہ	(ڈاکٹر محمد حسن)
"عشق حقیقت سے مجاز تک"	(پروفیسر عنوان چشتی)
"ہمارے ادب و کلچر میں معاشقے کا تصور"	(ڈاکٹر قمر جہاں)
"حسن کے نظریات"	(ف۔ س اعجاز)

یہ تو ہیں ایسے مقالات جو حسن و عشق سے وابستہ مسائل کا تحقیقی یا فلسفیانہ سطح پر احاطہ کرتے ہیں۔ اصل اور مزیدار وہ اعترافات ہیں جو معروف اہلِ قلم کے قلم سے نکلے ہیں، بلراج ورما، خالد سہیل، م م راجندر، آغا جانی کاشمیری، اقبال متین، ہمت رائے شرما۔ ادھر ف س۔ اعجاز نے قتیل شفائی کی مطربہ کو یاد کیا تو سرور تونسوی نے ایک خوش جمال شاعرہ کی حکایت لذیذ سنائی۔

کچھ مقالات معروف کتابوں سے ماخوذ ہیں جیسے جوش کی یادوں کی برات یا ڈاکٹر وحید قریشی کی شبلی کی حیاتِ معاشقہ۔ الغرض ساٹھ مقالات اور نظموں پر مشتمل اس نمبر میں میر، مومن، غالب، داغ، اقبال، فانی، اختر شیرانی، مجاز، پریم چند، میراجی، منٹو، جگر، نہرو، مولانا آزاد، ساحر، فراق —— اردو اور مغرب کے معروف اہلِ قلم کی اوراقِ ماضی کی کتاب سے بابِ دل کھولا گیا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نمبر کی ترتیب کا کیا مقصد ہے۔ کیا یہ صرف سکینڈلز کے لئے ہے؟ اس کی سوانحی اور اس سے بڑھ کر ادبی اہمیت بھی ہے؟ میرے خیال میں اس خصوصی اشاعت کی نہ صرف یہ کہ ادبی اہمیت ہے

بلکہ نفسیاتی نقاد کے لئے تو یہ تخلیق کاروں کی نجی زندگی کے بارے میں معلومات اور خفیہ امور کے بارے میں معلومات کی کان ہے اور خود مدیر کو بھی اس نمبر کی نفسیاتی اہمیت کا احساس ہے کیونکہ انہوں نے اس کی ذیلی سُرخی "ایک نفسیاتی مطالعہ" قائم کی ہے۔

مقالات کا موضوع بننے والی شخصیات کی ادبی اہمیت دیکھیں، ان کا تخلیقی مقام مد نظر رکھیں تو پھر یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ تخلیق کے مھول کھلانے کے لئے انہیں کیسے کیسے جذباتی المیوں کی "کھاد" مہیا کرنا پڑی۔ اس نمبر میں رو سو اور مارکس جیسے مفکر بھی ہیں اور پنڈت جواہر لعل نہرو جیسے سیاست دان بھی ـــــ مگر یہ سب زندگی کے کسی نہ کسی دور میں دل کے ہاتھوں مجبور بھی ہوئے اور اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ دیوتا نہ تھے گوشت پوست کا جسم رکھتے تھے اور دھڑکتے دل کے مالک تھے۔ خواب دیکھتے تھے اور پھر انہی خوابوں نے ارتفاع پا کر تخلیق کا روپ پایا۔ کیا کوئی تصور کر سکتا ہے کہ ایسا خوبصورت فقرہ نہرو جیسا سیاست دان بھی کسی کو لکھ سکتا ہے:

"تم کو میرا پیار! ـــــ پھول بہار دکھا رہے ہیں اور تم کو تہنیت بھیج رہے ہیں"

ڈاکٹر سلیم اختر

نام کتاب:۔ گرز
قیمت:۔ ۲۰ روپے

مصنف:۔ رفیق سندیلوی
ملنے کا پتہ:۔ بک ورلڈ جی ۸/۴ آئی اینڈ ٹی سنٹر اسلام آباد۔

"گرز" دورِ حاضر کے جواں سال شاعر رفیق سندیلوی کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے۔ یہ صرف غزلوں پر مشتمل ہے جس طرح اس مجموعے کا نام بالکل نیا ہے اسی طرح اس مجموعے میں شامل کلام بھی بالکل نئے رنگ کا ہے۔ نیا پن ان کی شاعری کا سب سے نمایاں پہلو ہے جو اُن کے پہلے مجموعۂ کلام "سبز آنکھوں میں تیر" کا بھی امتیازی وصف تھا۔ اردو کے جن ادیبوں اور شاعروں نے "سبز آنکھوں میں تیر" پر اظہارِ خیال کیا ہے ان کے خیالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ رفیق سندیلوی کی شاعری میں خیال، بیان اور اسلوب غرض کہ ہر چیز میں ندرت پائی جاتی ہے۔ وہ اردو کے دوسرے تمام شاعروں سے الگ تھلگ رنگ کے مالک ہیں۔ اُن کی انفرادیت کو اُن کے بارے میں رائے دینے والوں نے کئی طریقے سے ظاہر کیا ہے۔ یہ رائے دینے والے سب کے سب اردو تنقید کے معتبر نام نہ سہی مگر اردو ادب کے ممتاز نام ضرور ہیں۔ مثلاً ضمیر جعفری لکھتے ہیں کہ "ایسا طاقت ور اور تحیر انگیز لہجہ فطرت کی موسلا دھار بخشش کے بغیر کسی انسان کو نصیب نہیں ہو سکتا" عشرت رحمانی کہتے ہیں کہ "انہوں نے پوری غزل کی روایت سے بغاوت کی ہے" ڈاکٹر سہیل بخاری لکھتے ہیں کہ "آپ کے لہجے کی مردانہ صلابت اور توانائی، تخیل کی ندرت اور مخصوص مضامین کی جدت نے اردو شاعری خصوصاً اردو غزل کو ایک نئی دنیا اور نئی جہت سے روشناس کرایا ہے" اردو ادب کے بڑے ناموں میں ڈاکٹر وحید قریشی کہتے ہیں کہ "ندرتِ فکر اور احساس و ادراک کے نئے وسیلے رفیق سندیلوی کا مقدر ہیں۔ وہ نئی دنیا کی تخلیق پر قادر ہے۔" ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ "مستقبل کے افق پر ان کی شاعری کا روشن ستارہ مجھے جگمگ جگمگ کرتا نظر آتا ہے"

اگرچہ آج کل کتابوں کے فلیپ پر لکھی ہوئی رایوں کا اعتبار باقی نہیں رہا لیکن جب ہم رفیق سندیلوی کی کتابیں پڑھتے ہیں تو یقین کرنا پڑتا ہے کہ اُن کے بارے میں جو رائیں ظاہر کی گئی ہیں وہ کلام نے لکھوائی ہیں نہ کہ صاحبِ کلام نے۔

رفیق سندیلوی کا دوسرا مجموعہ کلام "گرز" اِن کے پہلے مجموعہ کلام "سبز آنکھوں میں تیر" سے بالکل مختلف ہے۔ "گرز" میں

انہوں نے غزل کی روایت سے نہ صرف بغاوت کی ہے بلکہ غزل میں ایک بالکل نیا تجربہ کیا ہے۔ 'گرز' کی تمام غزلیں ایک وزن پر ہیں جس کے ارکان ہیں مفاعی لن مفاعی لن فعولن۔ 'گرز' کی ہر غزل کو غزلِ مسلسل کہنا شاید غلط نہ ہوگا۔ اردو شاعری میں غزلِ مسلسل کوئی نئی چیز نہیں لیکن غزلِ مسلسل میں جو کام رفیق سندیلوی نے کیا ہے اُس نے اُسے ایک نئے انداز کی غزلِ مسلسل بنا دیا ہے۔ غزلِ مسلسل کا موضوع بھی ایک ہوتا ہے اور اس کی فضا بھی یکساں ہوتی ہے۔ یہ دونوں خصوصیتیں 'گرز' کی غزلوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ لیکن جو چیز 'گرز' کی غزلِ مسلسل کو اردو کی غزلِ مسلسل سے الگ کرتی ہے وہ ہے موضوع کا انتخاب جس کے ذریعے رفیق سندیلوی نے ایک بہت بڑے مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس مقصد کو انہوں نے ایک جملے میں یوں ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے: "اس مجموعے میں کائنات کے مظاہرات کا زائچہ سامنے آتا ہے"۔ "مظاہرات کا زائچہ" سے ان کی مراد یقیناً مظاہر کا زائچہ ہے کیونکہ مظاہرات کوئی لفظ نہیں۔ اس مقصد کی تفصیل رفیق سندیلوی کے لفظوں میں کتاب کے فلیپ پر درج ہے اور یہاں گنجائش نہیں کہ وہ تفصیل آپ کو سنائی جائے۔ 'مظاہر کا زائچہ' بنانے کے سلسلے میں طریقِ کار یہ رہا ہے کہ ہر غزل کے مطلع میں ایک مخصوص لفظ کو مرکزی موضوع کی حیثیت سے استعمال کر کے اس کے متعلق مظاہر اور مناظر بیان کئے گئے ہیں اور ان مظاہر و مناظر کے ذریعے ایک خاص قسم کی حسیت کو بیدار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً اژدہا، ریچھ، بندر، خرگوش، کوا، چڑیا، چیتا، کتا، گیدڑ، جگنو، بھیڑوں اور گایوں کے ذریعے انسان کے ابتدائی اور وسطی ذہن یعنی ازمنۂ وسطیٰ کے ذہن کی تصویریں پیش کی گئی ہیں اور صلیب، قرآن، دعا، اونٹ، عبادت، صدقہ، فرشتہ، گرز، عزرائیل جیسے لفظوں کے ذریعے مسلم معاشرے کی حسیات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ مثلاً پہلے بندر کے حوالے سے ایک غزل سنیئے:

جمورا خون میں نہلا گیا تھا / مداری اپنی چھاتی پیٹتا تھا
سبھی پیڑوں نے مٹی چھوڑ دی تھی / اکیلا ریچھ چرخہ کاتتا تھا
ٹکا کر ٹوکری پر گال اپنے / خلا کی سمت بندر دیکھتا تھا
گلے کی کھردری رسی چھڑا کر / زمیں پر بکرا ٹکّر مارتا تھا
کہیں اک کاٹھ کی گڑیا پڑی تھی / کہیں خیرات کا کپڑا بچھا تھا

اب مسلم معاشرے کی حسیات کے حوالے سے ایک غزل سنیئے:

فضا خاموش تھی، وقتِ دعا تھا / میں قرآں کی تلاوت کر رہا تھا
لبوں پر سورۂ یاسین تھی اور / مرا سینہ گرجنے لگ گیا تھا
کئی دن سے نہیں برسی تھیں آنکھیں / کہیں اندر ہی آنسو رک گیا تھا
اُسی جانب ہی سیدھے راستے تھے / جدھر رُخ اونٹنی نے کر لیا تھا
قریب المرگ تھا تو اس نے مجھ کو / شفا دی تھی، سکونِ دل دیا تھا

یہ دونوں غزلیں رفیق سندیلوی کے مجموعۂ کلام 'گرز' کی نمائندہ غزلیں کہی جا سکتی ہیں۔ ان غزلوں کو اگر اُن کے شعری مقاصد کی روشنی میں دیکھا جائے تو ان کے مقاصد بہت بڑے اور اُن کی شاعری بہت چھوٹی معلوم ہوتی ہے بلکہ شاعری کا قاری یہ محسوس کئے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ رفیق سندیلوی کی شاعری میں شاعری کے سوا اور سبھی کچھ ہے۔ رفتی

خامیوں سے قطع نظر اُن کی شاعری میں شعری اظہار اور معنویت آفرینی کی کمی نمایاں ہے۔ رفیق سندیلوی دوسرے شاعروں سے مختلف ضرور ہیں لیکن شعروادب میں صرف دوسرے سے مختلف ہونا کافی نہیں ہوتا۔ تاج محل کے مقابلے میں جھونپڑے کی قدر و قیمت کیا ہے؛ نوجوان شاعروں کو اس سوال پر کچھ غور کرنا چاہیئے خصوصاً اس لئے کہ اُن کی پیدائش سے پہلے دنیا کے شعروادب میں بہت سے تاج محل وجود میں آچکے ہیں۔ رفیق سندیلوی کے سینے میں ایک بڑا یا چھوٹا کوہ آتش فشاں موجود ہے۔ اس بنا پر میں ان سے مایوس نہیں ہوں۔ وہ اب بھی تخلیقی شاعری کے اہل ہیں۔

نظیر صدیقی

ایک رات کا ذکر (مجموعہ غزلیات) قیمت :۔ ۴۰ روپے

مصنف :۔ رفیق سندیلوی ناشر :۔ منیب پبلی کیشنز اسلام آباد

اگرچہ ۱۹۸۶ء سے لے کر ۱۹۸۸ء کے دوران رفیق سندیلوی کے تین شعری مجموعے منظرعام پر آچکے ہیں۔ پھر بھی مجھے ایسا لگتا ہے کہ ابھی تک سنجیدہ دلچسپی کے ساتھ ان کے شاعرانہ وجود کا نوٹس نہیں لیا گیا ہے۔ شاید اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ وہ اردو ادب کے موجودہ حلقوں میں کسی حلقے کے حلقہ بگوش نہیں۔ وہ ایک آزاد، خود مختار، خودپسند اور خود کفیل شاعر ہیں۔ یگانہ کی طرح یگانہ کے الفاظ میں ؎

خضرِ منزل اپنا ہوں، اپنی راہ چلتا ہوں
میرے حال پر دنیا کیا سمجھ کے ہنستی ہے

رفیق سندیلوی کی شاعری پر ہنسنے والے بھی ہوں گے اور اس سے برہم و بیزار ہونے والے بھی۔ لیکن رفیق اپنی شاعری کے معاملے میں ایسوں سے بے نیازانہ گزرتے رہے ہیں۔ انہیں اپنی ذات پر، اپنے فن پر اور اپنے امکانات پر پورا اعتماد رہا ہے۔

جو لوگ رفیق سندیلوی کو نہیں جانتے یا نہیں جاننا چاہتے ان کی بات اور ہے اور جن لوگوں کی نظر سے ان کا کلام یا مجموعۂ کلام گزرا ہے ان میں رئیس امروہوی، ڈاکٹر وحید قریشی، ضمیر جعفری، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر سہیل بخاری اور پریشان خٹک جیسے بزرگوں سے لے کر جلیل عالی، رشید قیصرانی، اکبر حمیدی اور تنویر سپرا جیسے جواں سال شعرا تک رفیق کو ایک جینوئن شاعر اور ایک باغی شاعر تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ رفیق ایک باغی اور ایک اوریجنل شاعر ہیں۔ ایک جدید شاعر ہونے کے باوجود انھوں نے غزل کو اپنا ذریعۂ اظہار بنایا ہے لیکن انھوں نے غزل کی شرائط کو تسلیم نہیں کیا بلکہ خود اپنی شرائط پر غزل کو قبول کیا ہے۔

پرانوں میں میرؔ اور غالبؔ جیسے عظیم شعرا غزل کے روایتی حدود سے نکلنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ انھوں نے غزل کے فریم ورک میں رہ کر ہی اپنی طباعی اور اپنے کمالات کا مظاہرہ کیا۔ حالیؔ نے غزل کے روایتی موضوعات اور اسالیب سے روگردانی کی تو ان کی شاعری غیر شاعرانہ ہو کر رہ گئی۔ غزل کے معاملے میں اقبالؔ پہلے مجتہد تھے جنہوں نے اس کے موضوعات، اس کی زبان اور اس کے لہجے کو یکسر بدل دینے کے باوجود غزل کی غزلیت اور شاعری کی شعریت کو برقرار رکھا۔ شاد عظیم آبادی سے لے کر یگانہ چنگیزی تک داغؔ، امیرؔ، حسرتؔ موہانی، فانیؔ بدایونی، اصغرؔ گونڈوی، جگرؔ مرادآبادی اور فراقؔ گورکھپوری جیسے غزل کے ممتاز شعرا نے غزل کے روایتی حدود میں رہتے ہوئے غزل کو بہت سی

اہم تبدیلیوں سے آشنا کیا۔ ان کے بعد کچھ ایسے شعراء نظر آتے ہیں، جو غزل میں چھوٹے موٹے تجربے کرتے رہے ہیں۔ شعر و ادب میں چھوٹے موٹے تجربے کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں ہوتا اور اس میں دیرپا کامیابی تو قسمت ہی سے میسر آتی ہے۔ پھر غزل میں ایک اشتعال انگیز رنگ سلیم احمد کے ساتھ آیا۔ ظفر اقبال جیسے اچھے غزل گو نے بھی غزل میں توڑ پھوڑ کے علاوہ اردو اور پنجابی زبان کو ملا کر غزل کہنے کی کوشش کی۔ فارغ بخاری اور مظہر امام سے اور کچھ نہ بن پڑا تو ان دونوں نے آزاد نظم کی طرح آزاد غزل کی طرح ڈالی جس میں شعر کے دونوں مصرعے عروضی اعتبار سے مساوی نہیں ہوتے۔ صلاح الدین محمود بھی غزل میں تصوف کی ایک عجیب و غریب شکل لے کر نمودار ہوئے۔ پچھلے چند برسوں کے دوران ثروت حسین اور اظہار الحق جیسے شعرا غزل کو مسلم نفسیات (سائیکی) کے اظہار کا وسیلہ بناتے رہے ہیں۔ غرضیکہ غزل میں بیسیوں طرح کے تجربے ہوتے رہے ہیں جبکہ بظاہر غزل میں تجربے کی گنجائش نظر نہیں آتی۔

اب غزل میں ایک نہایت چونکانے والے تجربے کے ساتھ رفیق سندیلوی سامنے آئے ہیں۔ انہوں نے غزل کے موضوعات، اس کی زبان، اس کے اسلوب اور استعاروں کو بالکل بدل دیا ہے۔ وہ بالکل ایک نئی SENSIBILITY کے ساتھ غزل پر حملہ آور ہوتے ہیں جس کا سب سے نمایاں پہلو غالباً یہ ہے کہ وہ نہ تو ایک رومانی شخص کی حیثیت سے غزل کہہ رہے ہیں نہ ایک سماجی اور سیاسی انسان کی حیثیت سے۔ ان کی غزل کا 'میں' دراصل خود نوعِ انسان ہے جو زمین و زماں کے اساطیر و امکانات دونوں سے نبرد آزما ہے۔

رفیق سندیلوی کی شاعرانہ کاوشوں کو سمجھنے کے لئے ان کے دوسرے مجموعۂ کلام 'گرز' کے فلیپ کو سامنے رکھنا، جو خود انہی کا لکھا ہوا ہے، معاون ثابت ہوگا۔ زیر تبصرہ مجموعۂ کلام 'ایک رات کا ذکر' کا دیباچہ بھی جو پروفیسر احسان اکبر کا لکھا ہوا ہے۔ رفیق کی شاعری کا اچھا تعارف ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ رفیق نے اپنی غزلوں کے ہر حصے کے آغاز میں جو ایک ایک شعر لکھ دیا ہے وہ ان کے زیرِ بحث مجموعۂ کلام کا بہترین پیش لفظ ہے۔ مثلاً ان اشعار پر ایک نظر ڈالتے چلیے:

برس رہا ہے جو مجھ پر وجود میرا ہے　　یہ آبِ لمس یہ ابرِ کبود میرا ہے

صورتِ اوّلین ہو جاؤں　　خاک میں جاگزین ہو جاؤں

عجب اک بے سکونی ہے، عجب اک بے خیالی ہے
کہ میری گردشِ باطن مکمل ہونے والی ہے

پڑاؤ کرنے بس لامکاں رُکا تھا میں　　ٹھکانہ جس جگہ کوئی، وہاں رُکا تھا میں

میں اک مکلوم دریا ہوں بہاؤ بھی نہیں میرا
بدل سکتا نہیں رُخ بھی یہ آبِ نیلمیں میرا

فلک بھی میرے لئے ہے زمیں بھی میرے لئے
نہیں ہے کوئی رکاوٹ، کہیں بھی میرے لئے

مزارِ روح پہ اک بھی دیا جلا نہ سکا   یہ اعتکافِ نفس، یہ مراقبہ دل کا

زمیں گردش میں ہے، سارا زمانہ چل رہا ہے   ہمیں سے روز و شب کا کارخانہ چل رہا ہے

دروازۂ وحشت سے گزرے گا بدن میرا   سالم نہیں رہ سکتا، بکھرے گا بدن میرا

"گمرز" کے نلیپ اور "ایک رات کا ذکر" کے مندرجہ بالا اشعار سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بے جا نہ ہو گا کہ رفیق سندیلوی اپنی شاعری کا ایک AMBITIOUS PLAN رکھتے ہیں۔ اس پلان کو عمل میں لانے کے لئے غیر معمولی شاعرانہ صلاحیت کی ضرورت ہے۔ ضمیر جعفری نے رفیق کی شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا ہے کہ ایسا طاقت ور اور تحیر انگیز لہجہ فطرت کی موسلا دھار بخشش کے بغیر کسی انسان کو نصیب نہیں ہو سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ فطرت نے انہیں ایک خاص طرز احساس عطا کرنے میں بڑی فیاضی کا ثبوت دیا ہے۔ لیکن جب تک فطرت کی فیاضی ایک اعلیٰ درجے کی فن کاری میں جلوہ گر نہ ہو گی وہ رائگاں بھی جا سکتی ہے۔ کسی ملک میں صرف قدرتی وسائل کا ہونا کافی نہیں۔ ان وسائل کا اعلیٰ درجے کی انسانی ہنر مندی کے ساتھ اتصال بھی ضروری ہے۔ رفیق اپنے VISION کو ایک مکمل فن پارے کی شکل عطا کرنے کی جدوجہد سے گزر رہے ہیں۔ اس جدوجہد میں انہیں کہیں کہیں خاصی بڑی کامیابی حاصل ہو رہی ہے مثلاً میں اُن کے اس شعر کو ان کی ایک بڑی کامیابی سمجھتا ہوں:۔

مرے جسم میں بھی کہیں کہیں مری روح تھی   مری روح میں بھی کہیں کہیں مرا جسم تھا

ان کی چھوٹی کامیابیوں میں ان کے یہ اشعار بھی شمار کئے جا سکتے ہیں:۔

جو کلیدِ قفلِ نجات ہے وہی شے عطا نہیں ہو رہی
کسی ڈھنگ سے کسی کام کی کوئی ابتدا نہیں ہو رہی

کسی ایک نقطے پہ رُک گیا ہے نظامِ کون و مکاں بھی
کوئی شے جنم نہیں لے رہی، کوئی شے فنا نہیں ہو رہی

آشنائے مسِ عزرائیل ہو جائیں گے ہم
غیر مرئی شکل میں تبدیل ہو جائیں گے ہم

ابھی تک بازیابی کا عمل معکوس لگتا ہے
میں جب بھی ڈھونڈنے جاتا ہوں خود کو کھو کے آتا ہوں

سرحدِ مرگ سے اب واپسی ناممکن ہے
اور آگے کی طرف جانا بھی ناممکن ہے

رفیق سندیلوی کی یہ کتاب پڑھنے کے قابل ہے اور ان کا شاعرانہ ارتقا توجہ کا مستحق ہے۔

نظیر صدیقی

گھنگھرو (گیتوں کا مجموعہ)

مصنف: قتیل شفائی

قیمت: ۶۰ روپے

ناشر: سنگ میل پبلی کیشنز لوئر مال لاہور

بعض مسلّمہ حقیقتوں پر خامہ فرسائی کرنا یقیناً ستم ظریفی کے مترادف ہوتا ہے۔ لیکن اسے کیا کہئے کہ مسلّمہ حقیقتوں اور اقدار کو بدلتی بگڑتی دنیا میں بار بار دہرانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تاکہ معاشرے میں حسن و خیر کو فروغ حاصل ہو۔

اردو گیت کی صنف میں قتیل شفائی کا مقام ایک مسلّمہ حقیقت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس صنف میں ان کی کُل زادِ سخن مقدار اور معیار دونوں اعتبار سے بے مثل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شعری اصناف میں گیت کی صنف ایک ایسی صنف ہے جس کا رشتہ زمین اور انسان کے ساتھ بہت گہرا اور سچّا ہے۔ کیونکہ گیت ایک ایسی صنف ہے جس کے اوّلین معمار وہ لوگ تھے، جو ساری دنیا کے ہر ملک اور خطّے میں موجود رہے ہیں اور اپنے گیتوں کے باوجود خود گمنام رہے۔ ان لوک فنکاروں اور شاعروں نے نہ صرف انسان کے جذبات و احساسات اور زمین کے ساتھ انسانوں کے گہرے رشتے کو ہی گیت کے ذریعے امر کیا، بلکہ تہذیب اور اقدار سازی میں بھی نمایاں اور فعال کردار ادا کیا۔ انسانی تہذیبوں کا مطالعہ کبھی اس زاویے سے کیا جائے تو بہت دلچسپ اور انوکھے انکشافات سامنے آسکتے ہیں۔

قدیم ترین مصری تہذیب میں بھی گیت ملتے ہیں اور ہندوؤں کے ویدوں اور شاستروں کے بھجن گیت ہی کی ایک صورت ہیں۔ داؤد کے مزامیر کتاب مقدس کا ایک ناگزیر حصہ بن چکے ہیں اور لحن داؤدی ایک استعارے، علامت اور ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ خداؤں کے حضور میں مجبور انسان ـــــ اپنی شکائتیں، اپنی تکلیفیں، کلفتیں، مسرتیں اور خوشیوں کی وارداتیں گا کر سناتے تھے۔ دیوداسیوں کے تھرکتے ہوئے جسموں کا سارا لوچ اور حُسن، ان الفاظ میں سمویا گیا تھا، جو ان کے لبوں سے مترنم سروں اور دھنوں کی صورت میں پھوٹتے تھے۔ انسان نے صدیوں سے جانوروں اور پرندوں کے ساتھ زندگی بسر کی ہے، اپنے مخصوص حالات میں ان جانوروں اور پرندوں کو منحوس اور نیک شگون والا بھی قرار دیا ہے۔ گیتوں میں ہمیں یہ پرندے اور فطرت کا سارا حسن ملتا ہے۔

اردو میں گیت نگاری کی روایت بہت قدیم ہے اور دنیا کی ہر زبان کے گیتوں کی طرح اردو گیت کا سرچشمہ بھی لوک گیت ہیں۔ دکنی دَور ۱۳۵۴ سے ۱۷۰۷ تک پھیلا ہوا ہے۔ اردو گیت کی روایت بھی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد اگر اردو میں گیت لکھنے والوں کا ذکر کیا جائے تو گیت نگاروں کی ایک کہکشاں ترتیب دی جا سکتی ہے۔ محمد قلی قطب شاہ سے ناصر شہزاد تک اردو میں بڑے بڑے گیت نگار پیدا ہوئے ہیں۔ ان سب بڑے گیت نگاروں میں ایک منفرد نام قتیل شفائی کا ہے۔

قتیل شفائی کی گیت نگاری میں انفرادیت ایک مسلّمہ حقیقت کی طرح ہے۔ جناب احمد ندیم قاسمی قتیل شفائی کے گیتوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

"یہ گیت خود اپنی کامیابی کی ضمانت ہیں۔ کیونکہ ان میں اردو کی پرانی شاعری کی سادگی و پُرکاری، جدید ادب کی بے تکلفی و شگفتگی اور آنے والے دور کی رفعت و ہمہ گیری شامل ہے۔"

قتیل شفائی کے گیتوں کا نیا مجموعہ "گھنگھرو" بھی اس مسلمہ حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ قتیل شفائی نے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے، قتیل شفائی گیت نگاری میں اپنی تکنیکی انفرادیت سے پہچانا جاتا ہے۔ وہ اپنے موضوعات کے تنوع، تجربات، مشاہدات اور تکنیکی انفرادیت کی بنا پر اہم ترین گیت نگار ہے۔

قتیل شفائی کی انفرادیت کے ایک اہم پہلو کی نشاندہی ڈاکٹر وزیر آغا نے یوں کی ہے۔

"قتیل شفائی کے گیتوں کا امتیازی وصف ان کی نغمگی اور جھنکار ہے۔ . . . . جس طرح رقص کی جھنکار نے قتیل شفائی کے گیتوں کا احاطہ کیا ہے اس کی مثال عام طور سے ناپید ہے . . . . قتیل کا گیت اس لحاظ سے گیت کے مزاج سے نسبتاً زیادہ ہم آہنگ ہے کہ اس میں فطرت کی چہکار اور رقص یکجا ہو گئے ہیں۔"

گھنگھرو کے گیت یہ ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ قتیل کے ہاں جو موضوعاتی تنوع ہے اور اس تنوع کو وہ جس غنائیت کے ساتھ پیش کرتے ہیں، اس میں وہ یکتا ہیں۔ ان کے ہاں جذبات کی سادگی و پُرکاری ہے۔ قتیل کے گیتوں نے ایک بنیادی تقاضے کو پورا کیا ہے، قتیل شفائی کو موسیقی کا گیان حاصل ہے۔ "گھنگھرو" کا ہر گیت یہ شہادت دیتا ہے کہ جو موسیقیت اور غنائیت قتیل کے ہاں ہے اس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔ اگر مثال کا تقاضا کیا جائے تو پھر "گھنگھرو" میں شامل سارے گیت ہی بطور مثال پیش کرنے ہوں گے۔

قتیل کے گیت صدیوں کے انسانی ورثے اور تجربے کے امین ہیں۔ یہ گیت تمام تر غنائیت، رس اور لوچ کے حامل ہیں، یہ زندگی کے ہر تجربے، ہر احساس ہر جذبے کا احاطہ کرتے ہیں۔ قتیل کا مسلک خیر و حسن کی سربلندی ہے۔ انصاف اور امن کی علمداری ہے۔ سماجی ناانصافیوں کے خلاف احتجاج ہے۔ ان گیتوں میں انسان کے سارے جذبے ملتے ہیں اور اس کی کٹھن جدوجہد کا سراغ بھی ملتا ہے۔ انسان کے خواب ان گیتوں میں پوری شعری صداقت اور غنائیت کے ساتھ ڈھل گئے ہیں۔

قتیل ہمارے دور کا اہم ترین گیت نگار ہی نہیں بلکہ مقبول ترین گیت نگار بھی ہے۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے اور اس کا تازہ ثبوت قتیل شفائی کے گیتوں کا مجموعہ "گھنگھرو" ہے۔

ستار طاہر

قفس رنگ (مجموعۂ غزلیات)　　　قیمت: درج نہیں

مصنف: حزیں صدیقی　　　ناشر:

فن خواہ کوئی سا بھی ہو اُس کا بنیادی تقاضا نظم و ضبط ہے۔ اس کے بغیر فن تخلیق ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن فن میں نظم و ضبط کی بے شمار صورتیں ہیں مثلاً شاعری میں ایک نظم و ضبط علم عروض کا ہے، ایک علم بیان کا ہے، پھر صنائع بدائع آتے ہیں اور ان تمام کے مجموعے کو ہم شاعری کی تکنیک کے نام سے یاد کرتے ہیں، مگر یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا

شاعری کی تکنیک پر قدرت حاصل کرنے والے شخص کو اچھا شاعر کہا جا سکتا ہے ؛ یا ان تمام علوم سے واقف شخص جبکہ وہ محض ان کا علم ہی نہ رکھتا ہو بلکہ ان جملہ علوم کو استعمال بھی کر سکتا ہو، ایک عمدہ شاعر بن سکتا ہے ؛ یقیناً اس کا جواب یہی ہے کہ صرف ان علوم کی واقفیت اور ان کو استعمال کرنے کا تجربہ کسی شخص کو عمدہ شاعر نہیں بنا سکتے۔ اچھی شاعری کے لئے اس ظاہری نظم و ضبط کے علاوہ بھی بہت کچھ درکار ہے اور وہ بہت کچھ قدرت کی طرف سے ودیعت کردہ صلاحیت، نظم و ضبط ہے جو کسی شخص کو واقعتاً ایک عمدہ شاعر بناتی ہے۔

"قفسِ رنگ" کے شاعر حزیں صدیقی ان ہر دو قسم کے نظم و ضبط کی صلاحیت سے بہرہ ور ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لیجئے کہ وہ اکتسابی اور وہبی دونوں طرح کے نظم و ضبطِ شاعرانہ کے مالک ہیں یعنی وہ ہر لحاظ سے مضبوط شعر کہتے ہیں اور اُن کی شاعری مضبوط قسم کی شاعری ہے۔ مضبوط شاعری کیا ہوتی ہے، ہم اس کی مثال بھی حزیں کے اشعار ہی سے پیش کرتے ہیں۔ ان اشعار کے انتخاب میں کسی قسم کا اہتمام نہیں کیا گیا۔ بس کتاب کھول کر صفحات اُلٹے گئے ہیں، اور پھر جو شعر سب سے پہلے سامنے آگیا وہ درج کر دیا۔

شبنم تو نہیں جس کو بکھر جانے کا ڈر ہو — شعلہ ہوں بجھے اور ہوا اور ہوا ہے

میں سر سے قدم تک ایسی تصویر بنا دوں — چہرہ نہ دکھائے کوئی آواز سنائے

اور پھر موت اور زندگی کے کتنے بڑے اور اہم سوال کا کس مضبوطی کے ساتھ جواب دیا ہے :

اک پردۂ نظر کے سوا موت کچھ نہیں — ہے زندگی ازل سے ابد تک رواں دواں

یہ کائنات کیسے وجود میں آئی۔ اس سوال کا جواب بھی ملاحظہ فرمائیے :

چشمِ فطرت سے خواب ٹپکا تھا — بن گئی کائنات کی صورت

انسانی تجربات کا کیا مقصد اور کیا معنی ہیں :

بر نا دیے سے میرے خد و خالِ ذات کو
بر کھا نگار خانۂ لیل و نہار نے

شاعری کو آپ جذبہ کا اظہار کہیں یا جذبہ و فکر دونوں کا اظہار، اصل بات دیکھنے کی یہ ہوتی ہے کہ شاعر ان دونوں کے بارے میں اپنے شعور و ادراک کا اظہار کیا اور کیسے کرتا ہے۔ حزیں صدیقی نے ایک شاعر کی حیثیت سے اپنے اس فرض سے کہیں بھی چشم پوشی نہیں کی۔

سید مشکور حسین یاد

رُت بدلنے دو (مجموعۂ کلام) — قیمت: ۲۰ روپے

مصنف: احمد ضیا — ناشر: قافلہ پبلی کیشنز نواب شاہ

رُت بدلنے دو، جناب احمد ضیا کا نو مطبوعہ مجموعۂ کلام ہے جو زیادہ تر معرا یا غیر مقفّٰی نظموں اور قطعات پر مشتمل ہے۔ ان نظموں اور قطعوں سے جناب احمد ضیا کی وہ تمام بے چینیاں اور اداسیاں مترشح ہیں جو موجودہ نسل کے ادیبوں اور فنکاروں کا خاصہ ہیں۔ اپنے دور سے بے اطمینانی اور موجودہ معاشرے پر عدم اعتماد اور اس سے کسی حد تک بیزاری

احمد ضیاء کے کلام میں صاف جھلکتی ہے اور جیسا کہ مجموعہ کے نام سے ظاہر ہے ان کی تغیر پسندی ان کے اس مجموعہ کا جوہر ہے۔ کلام معنوی لحاظ سے ادب کے جدید ترین تقاضوں سے ہم آہنگ ہے جس میں روایت پرستی اور اسلوبِ قدیم سے اجتناب ہے۔ پیرایۂ کلام کے لئے معرا اور غیر مقفیٰ اصناف کا انتخاب بھی ان کی جدیدیت کا غماز ہے۔ کیونکہ نئے خیالات کو پرانے اسلوب میں پیش کرنا مشروبِ نو کو کہنہ بوتلوں میں ڈالنے کے مترادف ہے جس سے خطرہ ہے کہ پیمانے ٹوٹ جائیں اور مشروب تلف ہو جائے۔

ان نظموں اور قطعوں میں سیاسی اشارات بھی ہیں اور سماجی تنقید بھی۔ رومان بھی ہے اور رنگ و نکہت بھی، لیکن سب کچھ بہت ہلکا اور لطیف ہے۔ انہوں نے اپنے کلام کو ثقیل اور شدید افکار سے گراں بار کرنے کی کوشش نہیں کی ہے، اور نہ بوئے گل کو بارود بنانے کی۔ وہ بس کچھ اشارات کرتے چلے گئے ہیں، یہ اشارات قاری کے ذہن کے اوپر سے بھی گزر سکتے ہیں اور اس میں ہلچل بھی پیدا کر سکتے ہیں۔ ذکاوتِ احساس کی بات ہے۔ بقول غالب

ہر کس نہ شناسندۂ راز است وگرنہ　　　　اینہا ہمہ راز ست کہ معلوم عوام است

مثال کے طور پر ان کی نظم "اب کے برس" جس میں تنہائی اور انتظار کی کیفیت نہایت لطیف اور موثر انداز میں پیش کی گئی ہے، اس طرح "وہ" اور "ایک محفل" کی نظم جن میں رومان اپنی تمام رعنائی اور لطافت کے ساتھ موجود ہے۔ "ایک سوال" میں موجود نفرت اور دہشت پسندی کے خلاف ایک مدہم مگر معنی خیز آواز ہے یا "حرف حرف پرچھائیں" جس میں پرانی یاد کی کسک کروٹیں لیتی ہے۔

مجموعہ میں قطعات بھی خاصے معنی آفریں اور موثر ہیں۔ مجھے امید ہے کہ زیرِ نظر کتاب جدید اور ترقی پسند ادب میں ایک قابلِ ذکر اضافہ ثابت ہوگی۔

سید رشید احمد

وسلموا تسلیما　　　　قیمت: ۹۵ روپے

مصنف: حفیظ تائب　　　　ناشر: مقبول اکیڈمی شاہراہ قائد اعظم لاہور

ذکرِ رسولؐ ایک ایسا موضوع ہے جس سے زیادہ وسعت کسی اور موضوع میں نہیں، حبِ رسولؐ ایک ایسا جذبہ ہے جس سے زیادہ شدید جذبہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا، اور شعر نام ہے زبان و بیان اور ہیئت کی بہت سی پابندیوں کا، ان پابندیوں میں رہ کر اس وسیع ترین موضوع اور شدید ترین جذبہ کا بیان ہی نعت کہلاتا ہے۔ نعت کہنا دراصل پل صراط سے گزرنے کے مترادف ہے۔ اس پر سے گزرتے ہوئے ایک جانب تو یہ خطرہ ہے کہ کہیں کوئی بات، بیان کا کوئی انداز سوءِ ادب نہ ہو کیونکہ اگر ایسا ہوا تو قرآن مجید کے مطابق اعمال کارت ہو جائیں گے، دل ایمان سے خالی ہو جائے گا اور ہمیں اس کا شعور تک نہ ہوگا۔ دوسری جانب شرک کے فتووں کے ڈھیر ہیں جو مفتیوں نے صدیوں سے تیار کر رکھے ہیں۔

حفیظ تائب کی کتاب "وسلموا تسلیما" کا سرسری مطالعہ ہی ہمیں اس بات سے آگاہ کر دیتا ہے کہ حفیظ تائب نے مختلف النوع ہیئتوں میں کامیاب نعتیں کہی ہیں۔ یہ بات صرف اردو میں مستعمل ہیئتوں تک محدود نہیں، انہوں نے پنجابی شاعری میں مستعمل ایک بحر میں بھی نعت کہی اور پنجابی کی ہیئت سی حرفی میں بھی نعت کہی۔ یہ اور بات ہے کہ اردو میں سی حرفی کو برتتے ہوئے اس کی شکل کو بھی بدلا۔

تائب کے لئے شراب صرف نعت ہے لہذا ان کے لئے شعر ہر جذبے کا اظہار نہیں بلکہ صرف ان جذبوں کا اظہار ہے جو ترفع یافتہ ہیں۔ ان ترفع یافتہ جذبوں میں تنوع ہے اور اس تنوع کی وجہ وہ ہمہ گیر تعلق ہے جو حفیظ تائب کو ذاتِ رسولؐ سے ہے۔ اسی تعلق کی بدولت ان کی نعت مختلف ہیئتوں میں متشکل ہوتی ہے۔ 'وسلموا تسلیما' میں جو ہیئتیں استعمال ہوئیں ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ ہیئتیں جو ہماری تہذیب کی دی ہوئی ہیں اور دوسری قسم ان ہیئتوں کی ہے جو ہم نے مغرب سے حاصل کیں۔ میری مراد سانٹ اور آزاد نظم سے ہے۔ سانٹ کی ہیئت میں ایک نعت اس کتاب میں موجود ہے۔ یقیناً یہ نعت بہت خوبصورت ہے۔ ہیئت مغربی، بحر پنجابی اور زبان اردو۔ اس طرح اس نعت میں تین مختلف المزاج زبانوں کے مختلف تجربوں کو یکجا کیا گیا ہے۔ آزاد نظم کی ہیئت میں جو نعتیں ہیں۔ ان میں بھی سرورِ کائناتؐ کے مختلف اوصاف اور ان کی کائناتی و آفاقی حیثیتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ آزاد نظم اور سانٹ کی [illegible] میں لکھی گئی نعتوں میں ایک بات مشترک ہے کہ ان میں شاعر اپنے محبوبؐ کے بارے میں باتیں کرتا ہے۔ ان [illegible] کرتا ہے لیکن اپنے محبوبؐ سے مخاطب نہیں ہوتا کہ

زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

حفیظ تائب نے ہیئتوں کی قلب ماہیت بھی کی ہے۔ ایک تو سانٹ کو پنجابی بحر میں لکھ کر اور دوسرے پنجابی ہیئت سی حرفی کے اصول کو عام بنا کر۔ اگر سی حرفی کی یہ قلب ماہیت نہ کی جاتی تو بھی حفیظ تائب اس میں کامیاب نعت تو کہہ سکتے تھے مگر وہ نعت کم از کم اردو کے قارئین کی زبان پر یوں رواں نہ ہوتی۔ یہ سب حفیظ تائب کی زبان شناسی اور شعری ہیئت سے آگاہی کی دلیل ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر ہیئت کا جبر ایسا ہی تھا تو حفیظ تائب نے اس کو اپنایا کیوں۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم موضوع کے حوالے سے حفیظ تائب کی نعت کو سمجھیں۔ اس تفہیم کے لئے میں اسے دو حصوں میں تقسیم کرتا ہوں۔ ایک وہ حصہ جس میں خطاب مسلمانوں سے ہے، اور دوئم وہ حصہ جس میں مخاطب رسولؐ خدا ہیں۔

پہلے حصے کو پھر دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ حصہ ہے جس میں تائب اپنے قاری سے خطاب کرتے ہوئے سرکارؐ کے اوصاف اور [illegible] بیان کرتا ہے اور دوسرا وہ حصہ ہے جس میں تائب نے سرکارؐ سے اپنے مختلف الجہت رشتوں کو بیان کیا ہے یا اس میں اپنی کیفیات کا بیان ہے۔

جس حصے میں شاعر اس ذاتِ عالی سے مخاطب ہے، وہاں بھی اس کی شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک حصہ وہ ہے جہاں سرکارؐ کی ثنا کرتا ہے اور دوسرا وہ جہاں فریاد کرتا ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ شاعر کی فریاد کا آہنگ تک بلند نہیں۔ اس کی وجہ میری سمجھ میں تو یہ آتی ہے کہ اسے حضوریٔ قلب میسر ہے۔ لفظوں کے آہنگ کا بلند ہونا تو دور کی بات ہے۔ اس کا عالم تو یہ ہے:

اس زور سے دھڑکنا یہاں پر روا نہیں
ان کا حرم ہے اے دلِ بے تاب سامنے

حفیظ تائب شکوے کے لئے موزوں فرد نہیں کہ اس کے لئے ایسے شخص کی ضرورت ہے جو گستاخی و بے باکی کو بھی محبت کی رمز سمجھے۔ حفیظ تائب التجا و فریاد کے شخص ہیں، وہ اپنی التجا و فریاد عجز کے ساتھ ہی بارگاہِ رسالت

میں پیش کرتے ہیں۔ یہ التجا اول تو ذاتی نہیں اجتماعی ہے کہ اس کا تعلق اُمتِ رسولؐ سے ہے۔ اُمتِ رسولؐ کا درد رسولِ خدا کے دل سے زیادہ کسی بھی اور دل میں نہیں ہو سکتا۔ حفیظ تائب جو بار بار اس کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس کی وجہ اپنے عصری شعور کا اظہار نہیں بلکہ یہ ہے کہ :

بات کر طبعِ پیمبر کی نفاست دیکھ کر

فریاد کا لہجہ دھیما نہیں ہونا چاہیئے اور نہ ہی اسے کوئی پابندی قبول کرنی چاہیئے، لیکن حفیظ تائب کے کلام میں نالہ ہمیں پابندِ نے نظر آتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو تصورِ حرمِ رسولؐ ہے جو ہمہ وقت حفیظ تائب کے سامنے ہے، اور دوسری اہم وجہ وہ احساسِ مسلسل ہے کہ اس حالت کے ذمہ دار ہم خود ہیں۔ لہٰذا فریاد محض فریاد نہیں اعترافِ جرم بھی ہے :

پامالِ ستم ہم ہیں تری راہ سے ہٹ کر
رسوا ہوتے اغیار کے دامن سے لپٹ کر
حال اپنا ہے تیرے کرمِ خاص کا محتاج
اے صاحبِ معراجؐ

سو بات یہ سمجھ میں آئی کہ سرکارؐ کے اوصاف اس قدر ہیں کہ انہیں ہر ہیئت میں بیان کیا جا سکتا ہے، لہٰذا حفیظ تائب نے تمام ہیئتوں میں نعت لکھی، لیکن قرآن مجید کا حکم ہے کہ انہیں ایسے نہ پکارو جس طرح تم ایک دوسرے کو پکارتے ہو، لہٰذا حفیظ تائب نے ہر نعت میں سرکارؐ کو مخاطب نہیں کیا۔

کیفیتِ حضوری حفیظ تائب کی نعت کا اصل امتیاز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ان کی نعت چونکاتی نہیں اور اگر شعری ذوق ٹھیک نہ ہو تو فوراً متاثر بھی نہیں کرتی۔ کیونکہ حفیظ تائب نے اپنی نعت میں موجود جذبوں پر فن کا پردہ ڈال رکھا ہے اور فن کے پردے پر سادگی اور سلاست کے دبیز پردے پڑے ہیں۔

میں نے کہا تھا کہ نعت کہنا پل صراط سے گزرنا ہے۔ پل صراط سے پرے تو بس جنت ہی جنت ہے۔ تائب نے اس پل صراط کو کامیابی سے عبور کیا ہے۔ لہٰذا اس جنت کے باسی کو صرف رشک سے دیکھا جا سکتا ہے اور ہم ان کی خدمت میں ہدیۂ تبریک و سلام کے سوا کیا پیش کر سکتے ہیں۔

طارق زیدی

قراردادِ پاکستان۔ صحافتی محاذ پر — قیمت : درج نہیں
مصنف : ڈاکٹر انعام الحق کوثر — ناشر : سعد پبلی کیشنز، کوئٹہ

قرارداد پاکستان کو منظور ہوئے نصف صدی گزر چکی اور امسال اس کی گولڈن جوبلی ہے اور ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے اسی قرارداد کو اپنی اس کتاب کا موضوع بنایا ہے اور اس کے لیل و نہار کو اُس وقت کے ہندوستان بھر کے مسلم اخبارات (بالخصوص جو قرارداد مذکورہ کے حامی تھے) کے حوالے سے اُجاگر کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے جس کام کو ہاتھ لگایا وہ اصل میں فردِ واحد کا کام نہیں بلکہ ایک اکادمی یا بورڈ کا کام ہے۔ کیونکہ تقریباً ساڑھے سات سالہ دور (مارچ ۱۹۴۰ء تا اگست ۱۹۴۷ء) کے ہندوستان بھر کے ۱۳ اخبارات کی کھوج لگانا اور اُن تک رسائی

حاصل کرنا ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے ۔ ہم لوگوں کا حال تو یہ ہے کہ اسی دور کے موجودہ پاکستان کے ۔ ہم اخبارات کی فائلیں نہیں ملتیں چہ جائیکہ ۴۷-۱۹۴۶ء اخبارات گرفت میں آسکیں ۔ انڈیا آفس لائبریری میں تو یہ فائلیں ممکن ہے میسر آسکیں لیکن ہندوستان و پاکستان میں ان کو تلاش کرنا بہت مشکل ہے ۔

ان حالات میں ڈاکٹر صاحب جتنے اخبارات تک پہنچ سکے اُن سے ملنے والی خبروں اور معلومات سے انہوں نے فائدہ اٹھایا اور جتنے نہ مل سکے ان کے لئے ثانوی یعنی تاریخی و مسوداتی منابع سے استفادہ کیا اور یوں اپنے قارئین کے سامنے اس دور کی ایک مسلسل تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ۔ اس کتاب سے نہ صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ تحریک پاکستان میں ہماری صحافت اور ہمارے صحافیوں کا کردار کتنا بامعنی اور جاندار تھا بلکہ اس دور کے واقعات بھی ہماری آنکھوں کے سامنے ایک زندہ اور متحرک فلم کی صورت میں پھرنے لگتے ہیں ۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کا دن ہماری قومی تاریخ میں سب سے زیادہ یادگار دن ہے ۔ اس لئے کہ اُس دن ہماری سیاسی جدوجہد کا پہلا مرحلہ تکمیل آشنا ہوا اور قرارداد پاکستان اپنی مرئی صورت میں نمودار ہوئی ۔ اس پر جو اور جتنی خوشی اُس وقت محسوس ہوئی وہ ناقابلِ بیان تھی ۔ اس کے بعد یہ خوشی تین چار سال تک زندہ و تابندہ رہی اور پھر کہیں دبک گئی اور اس کی جگہ ایک جعلی مصنوعی اور نمائشی خوشی آگئی جو اصلی خوشی کا عشرِ عشیر بھی نہ تھی اور اب تو وہ بالکل ایک رسم سی بن کر رہ گئی ہے ۔ لیکن ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی خوشی نہ رسمی تھی نہ جعلی و مصنوعی بلکہ اصلی خوشی تھی ۔ قلبی و روحانی خوشی تھی جس کی حلاوت و حرارت اُس نے بھی محسوس کی جو براہِ راست جدوجہد میں شریک تھا اور اُس نے بھی جو بالواسطہ اس کے حلقۂ ارتعاش میں آیا ۔ اُسے ہمارے دور افتادہ دیہات کے کسانوں نے بھی محسوس کیا اور شہر میں رہنے والے محنت کاروں نے بھی ، ہمارے نوجوانوں نے بھی اور ہمارے دانشوروں نے بھی ، ہمارے بچوں نے بھی اور بڑوں نے بھی اور ہمارے مردوں نے بھی اور عورتوں نے بھی کیونکہ اس میں ہر ایک کو اپنے ہی سہانے خواب کی تعبیر نظر آئی ۔ کیا ہم آج بھی وہ سچی اور سُچی خوشی محسوس کر سکتے ہیں ؟ ڈاکٹر کوثر جیسے قلمکار قوم کے ضمیر پر صرف دستک ہی دے سکتے ہیں ، اور اسے یاد دہانی ہی کرا سکتے ہیں ۔

انور رومان

دیے کی آنکھ (شعری مجموعہ)　　　قیمت ۱۰۰/۷ روپے

مصنف :- مقبول عامر　　　ناشر :- زرتاب پبلی کیشنز ۸۰۸-۴/۹ بی اسلام آباد

غزل اور دیگر اصناف میں یہ فرق ہے کہ غزل اگرچہ اختصار پسند صنف ہے مگر زندگی کی طرح اس میں بھی بڑی جامعیت ہے ۔ غزل زندگی کا ساتھ دینے پر قادر ہے اس میں زندگی کی سی وسعت ہے اس میں وہ تمام جذبے ، حقائق ، رنگ ، چہرے ، موسم ، المیے اور نظریات سموئے جا سکتے ہیں جو زندگی کا حصہ ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ غزل نے ہر دور کا ساتھ دیا ہے ، اور ہر دور میں یہ ایک ممتاز صنف رہی ہے ۔ کبھی میر اس کی زلفوں میں انگلیاں پھیرتے نظر آتے ہیں تو کبھی غالب اس کے اسیر دکھائی دیتے ہیں ۔ کبھی فیض اس کی رگوں میں اپنا لہو دوڑاتے ہیں تو کبھی ندیم اس کی مانگ میں ستارے ٹانکنے کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں ۔ انہی کے پہلو بہ پہلو نئی نسل کے نمائندے اسے اپنا لہو دیتے ہوئے ملتے ہیں ، نئی نسل کے انہی نمائندوں میں ایک نام مقبول عامر کا بھی ہے ۔ ان کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ جو " دیئے کی آنکھ " کے نام سے شائع ہوا ہے ، یہی جواز لے کر آیا ہے کہ اس میں ہمیں زندگی

کا تحرک نظر آتا ہے۔ "دیئے کی آنکھ" اس حساس انسان کے جذبات کا تخلیقی اظہار ہے جو معاشرے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا زبردست شعور رکھتا ہے۔ میں فی الوقت "دیئے کی آنکھ" میں شامل غزلوں پر بات کروں گا۔ اس کی غزل کا تر و تازہ اور شگفتہ لہجہ احساس کے تاروں کو لرزاں کر دیتا ہے اور اس امر کی دلیل بھی ہے کہ غزل ہر دور میں اسی طرح اپنی انفرادیت کا احساس دلاتی رہے گی۔ غزل پر اعتراضات وارد کرنے والے عامر کی غزل پر غور کریں تو انہیں اندازہ ہو جائے گا کہ غزل ہر دور میں کیوں زندہ رہی ہے۔ بقول احمد ندیم قاسمی "ان کے ایک ایک لفظ میں روح عصر سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے" ان پر فیض احمد فیض کے کہے ہوئے الفاظ کی صداقت بھی ثابت ہو جائے گی کہ "جذبے اور شعور کا ایسا خوبصورت امتزاج کم ہی دیکھنے میں آیا ہے"۔ احمد فراز کی رائے بھی غلط محسوس نہیں ہوتی کہ "خلاؤں میں پر مارنے کے باوجود اُن کے قدم زمین سے پیوست ہیں"۔

شعور اور جذبے کا امتزاج اور قدموں کا زمین سے پیوست ہونا بھی روح عصر ہی کی دو مختلف شکلیں ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مقبول عامر کی غزل کا فنی مرتبہ بھی بہت بلند ہے۔ سادگی و پرکاری کا امتزاج اسے رفعت عطا کرتا ہے۔ گویا اس نے "دیئے کی آنکھ" کی غزلوں میں اپنے عصری شعور کا فنی پیرائے میں اظہار کیا ہے:

ہم اہلِ شب کے لئے صبح کا حوالہ ہے
دیئے کی آنکھ میں آنسو نہیں اُجالا ہے

وہ ان لوگوں میں سے ایک ہے جو آدھا گلاس خالی ہونے کے باوجود اسے آدھا بھرا ہوا دیکھتے ہیں۔ وہ رات کی تیرگی سے خوف زدہ نہیں ہوتا نہ ہی اسے اپنے بے سمت سفر کا دکھ ہے۔ وہ ماحول کی تیرگی میں رہتے ہوئے بھی اہلِ شب کو روشنی کی اُمید دلاتا ہے۔ غالب نے بھی تو یہی کہا تھا:

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

مقبول عامر کی شاعری میں مادہ پرست معاشرہ میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا پختہ احساس ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش اور ماحول سے بے خبر نہیں۔ وہ کھلی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور مناظر کی خوبصورتی اور کراہت دونوں کو بیک وقت اپنے اندر جذب کر لینے کی شدید خواہش رکھتا ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں جو آنکھیں رکھنے کے باوجود دیکھ نہیں سکتے۔ وہ ہر نئی آواز سننے کو بے تاب ہے اور گوشِ سماعت نامعلوم سمت سے آنے والی آواز پر لگائے بیٹھا ہے۔ وہ جہاں معاشرہ میں مادی طور پر رونما ہونے والے تغیر و تبدل کا احساس رکھتا ہے وہاں وہ انسانی ذہن، اخلاق و اقدار اور اطوار و عادات کو بھی بدلا ہوا پاتا ہے۔ مادہ پرستی ہی کسی شخص کو اس قدر بے ضمیر بناتی ہے۔

مرے خلاف گواہی میں پیش پیش رہا
وہ شخص جس نے مجھے جرم پر ابھارا تھا

مشینی دور میں زندگی کی بے معنویت کھل کر سامنے آتی ہے:

زمیں کے کام اگر میری دسترس میں نہیں
تو پھر زمیں پہ مجھے کس لئے اتارا تھا

غرض یہ کہ وہ اپنے گرد و پیش میں ہونے والے تغیر و تبدل سے کلی طور پر آشنا ہے مگر چونکہ وہ خود بھی اس معاشرہ

کا حصہ ہے اس لئے کہیں کہیں بےبسی و بےکسی سے مفاہمت کر لینے پر مجبور بھی ہو جاتا ہے :

زمانے والوں سے مایوس ہو گیا شاید
وہ شخص گھورتا رہتا ہے اب خلاؤں میں

وہ انقلاب کی خواہش رکھتا ہے مگر حالات کی تندی و تیزی اسے سمجھوتا کرنے پر اکساتی ہے :

زخم پر وقت کا مرہم تو لگا دیتی ہے
اور کیا اس کے سوا گردش ایام کرے

اس کی شاعری کبھی اس کی مایوسیوں اور ناکامیوں کا درد لئے ہوئے نظر آتی ہے اور کبھی وہ مژدۂ فتح بن جاتی ہے۔ یہاں قاری یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ایک شخص ایک ہی وقت میں کس طرح دو الگ الگ کیفیات سے ہم آہنگی پیدا کر سکتا ہے۔ اس کا جواز یہ پیش کیا جا سکتا ہے کہ ترقی یافتہ دور میں انسان جہاں ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے ہیں وہاں ایک دوسرے سے بہت دور بھی چلے گئے۔ ان کے درمیان فاصلے کم بھی ہوتے ہیں اور بڑھتے بھی ہیں۔ اپنی ذات کے خول میں بند رہنے والوں کو کوئی خبر نہیں ہوتی کہ ساتھ والے مکان میں ایک عمر رسیدہ شخص موت کی دہلیز پار کرنے والا ہے۔ انہیں یہ بھی علم نہیں ہوتا کہ ان کے پڑوس میں ایک دوشیزہ سر میں چاندی بکھیرے کسی اجنبی شہزادے کا انتظار کر رہی ہے۔ فاصلے بڑھنے کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہوگی کہ ایک مکان میں شادیانے بج رہے ہوتے ہیں ایک میں آہ و فغاں ہو رہی ہوتی ہے۔ دوسری طرف صورت حال یہ ہے کہ امریکہ میں موجود سی آئی اے کے افسروں کو بہت پہلے معلوم ہو جاتا ہے کہ کس ملک کی حکومت کی تختہ الٹنے والا ہے اور انہیں یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ کون سا ملک ان کے دوست ملک پر حملہ کرنے والا ہے۔ کیا یہ فاصلوں میں کمی نہیں۔

یہ دونوں اگرچہ الگ الگ کیفیات ہیں مگر ان میں آپس میں گہرا تعلق ہے۔ وہ دونوں جدید سائنسی دور کی عطا ہیں۔ ایک شخص جو منطقی اور سائنسی ذہن کا مالک ہو، جو حالات کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، خود کو ان دونوں کیفیات سے آشنا پاتا ہے۔ کبھی وہ خود کو زندگی کے سفر میں تنہا محسوس کرتا ہے اور کبھی اپنے گرد چہروں کا ہجوم دیکھتا ہے۔ مقبول عامر بھی منطقی اور سائنسی ذہن رکھنے والا شاعر ہے۔ صرف جذبات پر یقین نہیں رکھتا بلکہ عصری شعور کو بھی اہم جانتا ہے۔ وہ ایک ایسے مقام پر کھڑا ہوا شخص ہے جہاں سے وہ اگر ایک قدم ادھر بڑھائے تو تنہائی اس کا استقبال کرتی ہے اور ایک قدم ادھر بڑھائے تو چہروں کا ہجوم اسے خوش آمدید کہنے کو تیار نظر آتا ہے۔ اس خوش گوار تجزیے نے اسے زندگی کے دونوں رخ دیکھنے کا حوصلہ بخشا ہے۔ یوں اس کی شاعری تیرگی و روشنی، شکست و فتح اور رزم و بزم کا حسین امتزاج بن گئی ہے۔ اپنی تنہائی کا اظہار وہ یوں کرتا ہے،

نظر میں نقش ہے صبح سفر کی ویرانی
بس اک میں تھا اور اک صبح کا ستارہ تھا

کبھی اسے اپنے علاوہ کوئی دوسرا وجود بھی صدا دیتا ہے :

قفس میں میرے سوا جب کوئی نہیں عامر
تو پھر یہ کس نے جوابا مجھے صدا دی ہے

مگر پھر یکدم اسے خیال آتا ہے کہ یہ دوسری صدا اس کی آواز کی گونج ہے اور بڑے اعتماد کے ساتھ تنہا ہی منزل تک پہنچ جانے کا مصمم ارادہ کر لیتا ہے :

کیوں نہ اک الگ اپنا راستہ تراشیں ہم
کس کا نقش پا ڈھونڈیں کس کی راہ پر جائیں [3]

مقبول عامر کے ہاں سفر زندگی کا استعارہ ہے۔ وہ حرکت پذیری کو زندگی کا عمل قرار دیتا ہے اور جمود اس کے نزدیک موت کی علامت ہے۔ اس لئے وہ خود بھی ہر وقت سفر پر آمادہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ اپنے سفر کا آغاز کرنے کے لئے یہ بھی نہیں دیکھتا کہ زمانے والے اس کا ساتھ دیتے ہیں یا نہیں۔ وہ اس بات کا انتظار بھی نہیں کرتا کہ کارواں والے اسے دعوتِ سفر دیں اس لئے کہ وہ ان کے ساتھ مل کر سفر نہیں کرنا چاہتا۔ اس کا راستہ ان سے الگ ہے اس کی منزل بھی ان سے جدا ہے۔ وہ ظلم و جبر، منافقت و ریاکاری اور تصنع کی روش پر چل کر حرمتِ سفر پامال نہیں کرتا جبکہ اسے یہ بھی علم ہے کہ دنیا اسی کی ہے جو ان راستوں پر چلے۔ وہ منزل سے دوری قبول کر لیتا ہے مگر غلط روش نہیں اپناتا، لیکن سفر اس کی مجبوری ہے۔ وہ تنہا اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے :

عجب طرح کا مسافر تھا اپنا عامر بھی
اکیلا چلتا رہا کارواں کے ہوتے ہوئے

تم قیام کے خوگر، ہم سفر کے شیدائی
بستیاں تمہاری ہیں، راستے ہمارے ہیں

یہ بات اگرچہ مقبول عامر کی غزل کے بارے میں کہہ رہا ہوں مگر اس کے زاویۂ نظر کی تفہیم اور پرکھ کے لئے اس کی ایک مختصر نظم کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے :

فقیہہِ شہر بولا بادشہ سے
اسے مصلوب ہی کرنا پڑے گا
بڑا سنگین مجرم ہے یہ آقا
کہ اس کی سوچ ہم سے مختلف ہے   (فردِ جرم)

گویا وہ سچ کے راستے پر چلنا چاہتا ہے اور اگر اس راستے پر چلتا ہوا وہ گردِ راہ میں تحلیل ہو جائے تو اس کے لئے یہی منزل ہو گی۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ جس معاشرہ میں سانس لے رہا ہے وہاں سچ کا ساتھ دینے والوں کی تعداد بہت کم ہے مگر وہ پھر بھی اپنے مؤقف پر ڈٹا ہوا ہے۔ اسے مصلوب کئے جانے کا بھی خوف نہیں۔ کیا سچ کے سفر میں تنہائی کا عذاب جیسا مصلوب ہونے سے کم تر درجہ کا عمل ہے؟ وہ جھوٹے، ریاکار، ظالم اور جابر قبیلوں سے تنہا لڑ رہا ہے :

یہ جنگِ صدق و صفا یادگار ٹھہرے گی
عدو ہے تیغ بکف، میرا ہاتھ خالی ہے

گویا تنہائی کے باوجود وہ اپنے اندر تمام توانائیاں بحال رکھے ہوئے ہے۔ اسے اعتماد ہے کہ وہ انسانیت کے دشمنوں

کو شکست دے دے گا۔ دوسری صورت میں اگر وہ کسی وجہ سے کامیاب نہیں ہوتا تو اس کا لہو زمین پر نئے راستوں کی نشاندہی کرے گا۔ اس کے جذبے اور حوصلے نئے لوگوں تک منتقل ہو جائیں گے:۔

گام گام پر عام مشعلیں جلائیں گے
آنے والوں کی خاطر روشنی تو کر جائیں

اس کی شاعری کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس میں رومان اور حقیقت آپس میں گلے ملتے نظر آتے ہیں۔ وہ ہرگز ہرگز اس معاشرہ سے فرار نہیں چاہتا لیکن کبھی کبھی فطرت کی کشش اسے اپنی طرف کھینچتی ہے تو وہ اپنے قدموں کو اٹھنے سے نہیں روک پاتا اور بے اختیار آگے بڑھتا ہے:۔

ایک تتلی ہے کہ بے چین اڑی پھرتی ہے
تیرے آنگن سے مرے دل کے پری خانے تک

آنکھ میں رنگ بھریں، روح کو تازہ کر لیں
شہر سے دور کسی بن میں بسیرا کر لیں

خوشبوؤں کی بارش تھی چاندنی کا پہرا تھا
میں بھی اس شبستان میں ایک رات ٹھہرا تھا

کنارِ آب کھڑے اک اُداس پیکر نے
ندی میں چپکے سے اک پنکھڑی بہا دی ہے

غزل مقامیت یا علاقائیت کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ غزل تو آفاقی جذبوں اور صداقتوں کے تخلیقی اظہار کا نام ہے لیکن شاعر اپنے ارد گرد سے علامات و استعارات ضرور اخذ کرتا ہے اور انہیں بھی آفاقیت سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ مقبول عامر کی ڈکشن پر غور کیا جائے تو ندی، کہسار، جھیل، بادِ شمال، چنار، وادی اور پھر پشتو زبان کا لفظ جالا (بمعنی گھونسلہ) جیسے الفاظ مقامی اثرات کے ثبوت کے طور پر نظر آتے ہیں۔ لیکن اس کی خوبی یہ ہے کہ ان الفاظ کو اس نے آفاقی پیرایہ بخشا ہے۔ یہ الفاظ اس کے ذہنی رجحانات کی عکاسی تو کرتے ہیں مگر کسی خاص علاقہ سے اس کی وابستگی کا اعلان نامہ نہیں بنتے۔ اس کی شاعری میں لفظی سطح پر علاقائیت یا مقامیت تلاش کی جا سکتی ہے۔ لیکن معنوی شناخت کے حامل الفاظ کو استعارہ کے طور پر استعمال کیا جائے تو وہ علاقائیت کی حدود سے نکل آتے ہیں اور آفاقی صداقتوں اور جذبوں کے پیامبر بن جاتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ اس کے ان شعروں سے لگایا جا سکتا ہے:

بخت والوں کو راس آتے ہیں
عشق، بادِ شمال، تنہائی

جبینِ سنگ پہ دو نام کس نے لکھے ہیں
یہ کیسا نقشِ مہر کوہسار باقی ہے

ناصر بشیر

نام و نسب

قیمت:۔ دو سو روپے

مصنف:۔ سید نصیر الدین نصیر گیلانی ناشر:۔ مکتبہ مہریہ، درگاہ گولڑہ شریف اسلام آباد

ملک کے علمی و ادبی حلقوں پر سید نصیر الدین نصیر گیلانی کا نام شعر کی قدیم و جدید روایت سے آشنا ایک خوش گو شاعر کی حیثیت سے معروف ہے۔ ان کا اردو، عربی، فارسی اور پنجابی کلام ان کے شعری مجموعوں "آغوشِ حیرت"، "پیمانِ شب"، "دیں ہمہ اوست" اور "فیضِ نسبت" کے ذریعے اہلِ ذوق تک پہنچ کر داد پا چکا ہے۔ زیرِ نظر کتاب ان کی نثری نگارشات کے سلسلے کی تیسری کڑی ہے۔ اس کتاب میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی سیادت کے مسئلے پر بحث کی گئی ہے۔ مولف نے مختلف حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نجیب الطرفین سید تھے اور صرف یہی نہیں، ان کی نسبت اصحابِ ثلاثہ یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمان غنیؓ سے بھی ثابت ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے آپ کا نسب والد کی طرف سے چھٹی پشت پر جا ملتا ہے۔ جبکہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ سے بھی مختلف حوالوں سے آپ کو نسب کا امتیاز حاصل ہے۔

سلسلۂ نسب کی یہ بحث باب یازدہم کے صفحہ ۵۹۸ سے ۶۱۲ تک پھیلی ہوئی ہے۔ بقیہ کتاب حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے سوانح کے استناد کے ساتھ علمی لطائف، سنجیدہ مباحث، اشعار، اقوال اور تحقیقی نوعیت کے اختلافات سے پُر ہے۔

مولف بہت وسیع المطالعہ اور صاحبِ علم شخصیت ہیں۔ ان کے مزاج پر قدیم طرزِ تصنیف و تالیف کا غلبہ محسوس ہوتا ہے۔ وہ ہر بات کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کرتے ہیں، جا بجا اردو، عربی، فارسی اشعار کا استعمال نظر آتا ہے پھر ان اشعار کے بطن سے پھوٹنے والے مباحث پر گفتگو طول پکڑتی جاتی ہے

اس انداز سے کتاب دلچسپ مباحث، علمی نکات اور تحقیقی افکار کا ایک رنگا رنگ گلدستہ بن گئی ہے۔ لیکن آج کے دور میں جبکہ تصنیف و تحقیق کے اطوار بدل کر بہت آگے نکل چکے ہیں، زندگی مصروف ہو گئی ہے اور "ٹو دی پوائنٹ" بات کرنے کا رواج عام ہو چکا ہے۔ یہ قدیم اسلوب قاری کو کچھ زیادہ گرفت میں نہیں لیتا

اپنی تمام تر حکمت افروزی کے باوصف اس اسلوب کا ایک منفی پہلو یہ بھی ہے کہ اس سے کتاب کے قاری کا تعین نہیں ہو پاتا کہ کہیں تو دقیق علمی موضوعات پر تحقیقی بحثیں ہیں اور کہیں عام اور مشہور اشعار کی شرح کی جا رہی ہے۔

کتاب کی کتابت، کاغذ، طباعت، جلد بندی، تصاویر اور آرائش اس قدر بلند پایہ ہے کہ بلاشبہ اسے مطبوعات کی دنیا میں ایک معیار قرار دیا جا سکتا ہے۔

کتاب کے آخر میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے حضور شعرا کا خراجِ عقیدت اور کتابیاتی فہرستیں شامل کی گئی ہیں۔ عربی، فارسی، اردو اور پنجابی کے مدحیہ اشعار ۹۰ صفحات پر اور انڈکس اور کتابیات وغیرہ قریباً ڈھائی سو صفحات پر مشتمل ہیں۔

اگرچہ اپنے مخالفین کے لئے مولف کے لہجے میں خاصی سختی ہے لیکن اپنے موضوع سے ان کی محبت، محنت اور تحقیق میں نکتہ سنجی بہر طور قابلِ داد ہے۔

زاہد منیر عامر

آبِ گم (مزاح)

مصنف: مشتاق یوسفی

قیمت: ۱۵۰ روپے

ناشر: مکتبہ دانیال، وکٹوریہ چیمبرز ۲، عبداللہ ہارون روڈ کراچی ۵

اردو زبان میں مزاح نویسی کی روایت خاصی شاداب ہے۔ جس زبان میں پطرس بخاری، عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی، کرنل محمد خان، شفیق الرحمٰن، محمد خالد اختر، ابن انشاء اور عطاالحق قاسمی کے مرتبے کے مزاح نویس موجود ہیں، اسے کم سے کم اس صنفِ ادب کے معاملے میں تشنہ نہیں کہا جا سکتا۔ اور اگر کسی کو تشنگی کی شکایت ہے تو اسے مشتاق احمد یوسفی کی کسی بھی تصنیف، خاص طور پر "آبِ گم" سے پیاس بجھا لینی چاہیئے۔

ادب و فن میں حرفِ آخر کا کوئی وجود نہیں ہے لیکن مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اردو کے اب تک کے مزاحیہ ادب کا حرفِ آخر مشتاق احمد یوسفی ہیں۔ انہیں مزاح کا ایسا اسم ہاتھ لگا ہے کہ مجال ہے جو ان کی تحریر کا کوئی ایک جملہ بھی پڑھنے والے کو گدگدائے بغیر مکمل ہوتا ہو، اور اس گدگداہٹ میں اتنی بے ساختگی ہوتی ہے جیسے کلی چٹکتی ہے۔ بعض لوگ کلی کو چاقو کی نوک سے بھی چٹکاتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ لوگ اس شگفتگی سے فیض یاب ہوں گے۔ حالانکہ کسی بھی تخلیقی فن میں اگر تکلف در آئے تو اس کے اثرات منفی ہوتے ہیں۔ یہ تکلف نہ شاعری میں چلتا ہے، نہ موسیقی میں اور نہ مصوری میں، اور مزاح نویسی میں تو بالکل نہیں چلتا کیونکہ آورد سے برآمد ہونے والے مزاح سے لطف کی بجائے کوفت حاصل ہوتی ہے۔

مشتاق احمد یوسفی نے بے ساختگی اور بے تکلفی سے اردو کے مزاحیہ ادب میں اتنے روشن اور بھرپور اضافے کئے ہیں کہ اب اگر کوئی نیا ادیب مزاح کے میدان میں قدم رکھنا چاہے گا تو سوچ سمجھ کر رکھے گا کیونکہ یوسفی کے معیاروں سے آگے نکلنا تو بجائے خود رہا، اس کا ہم قدم رہنا بھی بے حد دشوار کام ہے۔ سچا، کھرا اور بے ساختہ مزاح پیدا کر نا دیسے بھی ہر کسی کا کام نہیں ہے۔ مثال کے طور پر آپ نے دیکھا ہوگا یا کم سے کم سنا ضرور ہوگا کہ پاکستان ٹیلی ویژن نے اتنے بے شمار وسائل کے باوجود اور اتنے لاتعداد اہلِ قلم کے تعاون کے علی الرغم اپنی تاریخ کی ربع صدی میں اگرچہ سو دو سو مزاحیہ پروگرام پیش کئے ہوں گے۔ مگر ان میں سے الا ماشاءاللہ کوئی ایک بھی پروگرام ایسا نہیں تھا جو مزاح کی ان بلندیوں کو چھو سکے جہاں پطرس کے بعد مشتاق احمد یوسفی کے قلم نے اسے پہنچایا ہے۔

یہ مثال دینے کا مقصد محض یہ ہے کہ مزاح تخلیق کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اوّل تو جب تک لکھنے والے کو قدرت کی طرف سے ہنسنے ہنسانے کی صلاحیت ودیعت نہ ہوئی ہو، وہ مزاح تخلیق کرنے کی کوشش میں اپنا ہی چہرہ بگاڑ لے گا۔ پھر اس صلاحیت کے علاوہ وہ سلیقہ درکار ہوتا ہے جو صدیوں کے تہذیبی ارتقاء کی دین ہے۔ اس سلیقے کے بغیر مزاح پھکڑ پن کی حد تک بھونڈا ہو سکتا ہے اور فن کی کسی بھی صنف میں اگر پھکڑ پن داخل ہو جائے تو وہ فن پارے کے مرتبے سے گر جاتی ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کا سا تہذیب یافتہ مزاح پیدا کرنے کے لئے اسی طبعی رجحان اور اسی سلیقے کی ضرورت ہے۔ یوں سمجھیے کہ یوسفی صاحب نے ہمیں ایسا مزاحیہ ادب عنایت کیا ہے جو ہماری تہذیب کی پہچان ہے۔ اس مزاح میں کسی کی تضحیک نہیں کی جاتی اور اگر کوئی مضحک صورتِ حال پیدا ہوتی ہے تو مصنف اپنے آپ کو ہی اس تضحیک کا نشانہ بنانے کے بعد آگے بڑھتا ہے۔ اس کے باوجود مشتاق احمد یوسفی کے مزاح میں چھپے ہوئے طنز کے نشتر ہمارے معاشرے کے ناسوروں میں اُتر اُتر جاتے ہیں۔ ہر کردار معاشرے کے ایک طبقے کی نمائندگی

کرتا ہے۔اس کی حیثیت ایک علامت کی ہوتی ہے اور علامت کی مثال آئینے کی ہے جس کے مختصر وجود میں ایک دنیا منعکس ہوتی ہے۔ یوسفی صاحب کے فن کی دنیا میں داخل ہونا ایک آئینہ خانے میں داخل ہونا ہے اور یاد رکھئے کہ فن کے آئینہ خانے انسان کے صرف چہرے کا عکس نہیں دکھاتے، ہر رُخ دکھاتے ہیں اور اکثر صورتوں میں انسان کے باطن کو بھی سامنے لے آتے ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی کے مزاح نے ہمارے معاشرے پر پڑے ہوئے منافقتوں کے اَن گنت پردے نوچ ڈالے ہیں اور یاد رکھئے کہ جب بے ساختہ ہنسی کی کوئی حد نہیں رہتی تو آنکھوں میں آنسو بھی آجاتے ہیں۔ خدا ہمارے اس بے مثال طلسم کار کو سلامت رکھے۔

احمد ندیم قاسمی

کلیاتِ میراجی قیمت:۔ ۲۵۰ روپے

مرتب:۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ناشر:۔ اردو مرکز لندن

شخصی سطح پر میراجی سے میری کوئی خاص رسم و راہ نہ تھی۔ جب وہ رسالہ "ادبی دنیا" کی مجلس ادارت میں شامل تھے تو ہمارے درمیان چند خطوط کا تبادلہ ہوا۔ انہوں نے میری چند نظمیں "ادبی دنیا" میں شائع کیں اور پھر ان میں سے بعض نظموں کا تجزیہ بھی کیا۔ ان تجزیوں میں سے دو میراجی کی کتاب "اس نظم میں" کے مندرجات میں بھی شامل ہیں۔ مختار صدیقی میرے دوست تھے۔ ہم دونوں اکثر شاموں کو میر، سودا، نظیر، غالب اور مومن وغیرہ کا مطالعہ کرتے تھے اور ان بڑے کلاسیکل شاعروں کے اسلوبِ فن پر دیر تک گفتگو کرتے تھے۔ ایک روز میراجی بھی مختار کے ہاں آنکلے مگر ان کی حالت نارمل نہیں تھی۔ مختار نے انہیں سمجھا بجھا کر رخصت کر دیا کہ گھر جا کر آرام کیجئے۔ وہ چلے گئے اور جب خاصی دیر کے بعد مختار مجھے خدا حافظ کہنے کے لئے باہر سڑک پر آئے تو ہم نے دیکھا کہ میراجی سڑک کے کنارے بکھرے ہوئے لکڑی کے بہت سے شہتیروں میں سے ایک بڑے سے شہتیر پر گہری نیند سو رہے تھے۔ بعد میں جب میں دہلی میں منٹو کا مہمان تھا اور ان کے ہمراہ ریڈیو سٹیشن آتا جاتا تھا تو وہاں کرشن چندر اور ن۔م۔ راشد اور اوپندر ناتھ اشک اور مولانا چراغ حسن حسرت کے علاوہ میراجی سے بھی اکثر مڈبھیڑ ہوتی تھی۔

میراجی کی شخصیت سے میرا تعارف بس اسی قدر تھا، مگر ان کے کلام، ان کے مضامین، ان کی تنقید اور ان کے تراجم سے تعارف بھرپور تھا۔ انہیں ان کی زندگی ہی میں شعر و ادب کی اہم شخصیت تسلیم کر لیا گیا تھا۔ البتہ ان کے موضوعات ان کی لفظیات، نظم اور نثر میں ان کے اسالیب اپنے تمام معاصرین سے مختلف تھے۔ فیض اور راشد کی زبان و بیان میں بظاہر خاصا تفاوت ہے لیکن بباطن یہ دونوں شعراء شاعری کی عجمی یعنی فارسی روایت سے متاثر تھے۔ فیض کے بیشتر کلام پر خواجہ حافظ شیرازی کا پرتو ہے تو راشد جدید فارسی شعراء سے متاثر ہیں۔ مگر میراجی کی زندگی کا بیشتر حصہ عربی اور فارسی الفاظ اور فارسی شاعری کی تشبیہات و استعارات سے الگ رہتے اور شاید شعوری طور پر، الگ نظر آنے کی کوشش میں گزرا۔ ان کا لہجہ اور ان کا آہنگ ہندی روایت میں ڈوبا رہا اور وہ خاص طور پر اپنے گیتوں میں ہندی دیومالا کی علامات سے کام لیتے رہے۔ پھر اس دیومالا میں جنس کا جو برملا اظہار ہے، وہ میراجی کی تخلیقات میں بھی در آیا بلکہ وہ ابتدا میں کچھ زیادہ ہی کھل کھیلے اور شاید یہی وجہ ہے کہ میراجی کو اردو شاعری میں جنسی کجروی، تلذذ پرستی اور مریضانہ داخلیت کا پرچارک قرار دے دیا گیا۔ اب سوچتا ہوں تو شبہ سا ہوتا ہے کہ شاید میں بھی اسی وجہ سے میراجی سے

قریبی تعلقات استوار نہ کر سکا ورنہ آخر مختار صدیقی بھی تو اسی قبیلے کے فرد تھے اور وہ میری جان و جگر تھے۔ جب میراجی بمبئی چلے گئے اور وہاں سے اختر الایمان کی رفاقت میں رسالہ "خیال" جاری کیا تو اس رسالے میں میراجی کا کلام اور نثری تحریریں بطور خاص "کتاب پریشان" پڑھ کر مجھے وہ خاصے بدلے ہوئے نظر آنے لگے اور یہ تبدیلی اس لحاظ سے مثبت بھی تھی کہ میراجی نے اردو شاعری کی کلاسیکی روایت کی طرف مراجعت شروع کر دی تھی۔ جس میراجی نے کہا تھا کہ،

اندھی دنیا آدھی، سادھو، اندھی دنیا آدھی
سوچ سمجھ کر جان لے مورکھ، بیٹھ لگا کے سمادھی
ہاتھ کو ہاتھ نہ سوجھے کسی کا، چھایا گھور اندھیرا
گپت بھون میں بیٹھے روئیں مل کر سب اپرادھی

وہی میراجی اب یہ کہہ رہے تھے:

کیفیت خانہ بدوشانِ چمن کی مت پوچھ
یہ وہ گلہائے شگفتہ ہیں جو برباد نہیں

اور اس سے بھی بڑھ کر وہ غزل جس کا مطلع ہے:

زندگی کشمکشِ حاصل و ناحاصل ہے
ماسوا اس کے ہر اک نقشِ جہاں باطل ہے

اور اس غزل میں وہ غالب کے رنگ میں یوں تک کہہ گئے ہیں:

یہ تماشائے چمن نقشِ خط و رنگ نہیں
بر تقاضائے حیا کاہشِ آب و گِل ہے

یہ وہی میراجی تھے جو ہندی لہجے اور آہنگ اور ہندی دیومالا کے علاوہ اگر کسی سے متاثر ہوئے تھے تو وہ صرف میر تقی میر تھے — "میر ملے تھے میراجی سے" — اور وہی میراجی اب مرزا غالب کے انداز میں غزل کہہ رہے تھے،

عشرتِ حسنِ نظر ہے بازگشت
اور تفکر اک فریبِ رائیگاں
اک تخیل کے سوا کچھ بھی نہیں
رشتۂ دورِ زماں، دورِ مکاں

یہ وہ طرزِ سخن ہے جو اردو فارسی شاعری کی عظیم روایت سے کسبِ فیض کا نتیجہ ہے۔

میں نے اب تک میراجی کے ہاں صرف زبان کے تیوروں اور لفظیات میں ایک بڑے تغیر کی طرف اشارہ کیا ہے ورنہ سوچ کی جو لہر میراجی کی غزلوں کے ان اشعار میں نمایاں ہے، وہ ان کے ابتدائی اور وسطی دور کی سادہ اور سلیس شاعری میں بھی پوری شدت سے رواں ہے، مثلاً وہ کہتے ہیں:

پاس اور دور کا بھید انوکھا، دور کی مہک سہانی ہے

میری آنکھوں کو نظر آتا ہے روزن کا دھواں
اور دل کہتا ہے یہ دردِ دل سوختہ ہے
ایک گھنگھور سکوں ، ایک کڑی تنہائی
میرا اندوختہ ہے ،

یا

اتھاہ کائنات کے خیال کو غلط سمجھ رہے ہیں ہم ستاروں کی مثال سے
اتھاہ کائنات اک کنواں نہیں ، یہ بحر ہے

میراجی میں باطن پرستی اور اس کے نتیجے میں خود پرستی کے آثار تو یقیناً موجود ہیں اور فن کی دنیا میں یہ کوئی گناہ نہیں ہے۔ مگر ان کے ابتدائی کلام پر خود لذتی اور ابنارمل جنسیت کے ایک حد تک جائز الزام اور ان کے ڈھیلے ڈھالے اور کمزور مصرعوں کی عام شکایت کے باوجود اس الزام کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میراجی کے کلام میں ابہام ہے۔ میری رائے میں تو میراجی کا کلام کسی ایک مقام پر بھی مبہم نہیں ہے۔ ہاں اگر ان کی علامتوں کو خاص طور پر ہندوی دیومالا کی علامتوں کو کما حقہ نہ سمجھا جائے تو ابہام پیدا ہو سکتا ہے۔ اس طرح کا ابہام تو علامت نگاری کے بغیر بھی پیدا ہو جاتا ہے اور اس کی مثالیں قدیم و جدید اردو شاعری میں بھی کثرت سے موجود ہیں۔

بہر حال یہ طے ہے کہ باطن پرست میراجی عمر بھر شدید تنہائی کے شکار رہے اور تنہائی کے اس لق و دق صحرا میں اپنی تلاش یا اپنے معیاروں کی تلاش میں مصروف رہے۔ البتہ یوں ہوا کہ ابتدا میں یہ تنہائی ویران و سنسان تھی تو بعد میں انہوں نے اسے آباد کر لیا۔ اُس وقت ان کی تنہائی، تنہائی نہیں رہتی جب وہ کہتے ہیں کہ :-

لچکتی ہوئی ٹہنیوں کی گھنی پتیوں میں گھنا اور گہرا سکوں ہے

ساتھ ہی جب وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ :-

مرے دل کے گہرے سکوں میں ہوا سرسرانے لگی ہے

تو یہ تنہائی کی نفی کی سرسراہٹ ہے اور یہ میراجی کے اندر ایک تغیر کی نشان دہی کرتی ہے۔ نظم "خدا" میں وہ نفی سے اثبات کی طرف یوں سفر کرتے ہیں :-

میں تجھے جان گیا روحِ ابد
تو تصور کی تمازت کے سوا کچھ بھی نہیں
اور مرے دل کی حقیقت کے سوا کچھ بھی نہیں
اور مرے دل میں محبت کے سوا کچھ بھی نہیں

یوں انہوں نے خدا کو محبت کی تجسیم قرار دے کر اپنا سفر تمام کیا۔ اپنے رسالہ "خیال" میں دامودر گپت کی نظم شامل کی اور اداریے میں لکھا کہ "دامودر گپت" کی پیروی میں آج ہم ایسی چیز ہرگز نہیں لکھیں گے لیکن ایسی چیز پڑھیں گے ضرور۔ تاکہ ہماری دنیا میں وہ ماحول نہ رہے جو محض لذت کو حیات بناتا ہے۔ کاش آج مولانا عبدالماجد دریابادی زندہ ہوتے تو میں ان کی خدمت میں عرض کرتا کہ آپ جس میراجی کو آئے دن بُرا بھلا کہتے رہتے تھے وہ تو آخری دنوں میں منزلِ طہارت کی طرف گامزن تھا۔

آخر میں ایک بالکل ذاتی بات ـــــ محترم الطاف گوہر صاحب نے "کلیاتِ میراجی" کے آغاز میں میراجی کو مخاطب کر کے

محبت اور اپنائیت سے بھری ہوئی جو چند سطور لکھی ہیں۔ ان میں انہوں نے کلام کی یکجائی کے سلسلے میں میراجی سے یہ بھی کہا ہے کہ

"ویسے یہ کام آپ کے دوستوں نے نہیں جمیل جالبی صاحب نے کیا ہے۔"

صرف یاد دہانی مقصود ہے کہ میراجی کی وفات کے بعد حلقہ اربابِ ذوق کے ہر سالانہ اجلاس میں حلقے کے عہدہ دار حضرات اور میراجی کے دوست، پڑھے لکھے معاشرے کی بدذوقی کا ماتم کرتے تھے اور اس امر پر انتہائی غم و غصہ کا اظہار کرتے تھے کہ میراجی کے اتنے بہت سے کلام کو کتابی صورت میں شائع کرنے کی کسی کو توفیق حاصل نہیں ہوتی۔ اس شکایت کا برسوں تک اعلان ہوتا رہا۔ اور آخر کار میں نے جس کا حلقۂ اربابِ ذوق سے کبھی کوئی تعلق نہیں تھا، اپنی بے سروسامانی کے باوجود میراجی کی دو کتابیں "پابند نظمیں" اور "تین رنگ" اس زمانے کی بہترین کتابت اور گیٹ اپ کے ساتھ شائع کیں۔ اور محترم الطاف گوہر صاحب کی طرف سے ٹیلی فون کے ذریعے مجھے اس اقدام کی داد بھی ملی۔ مگر میراجی کی ان دو کتابوں کے ایک ایک ہزار کے ایڈیشن برسوں تک میرے ہاں ڈھیر پڑے رہے اور میراجی کے دوستوں کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ میرے اشاعتی ادارے کے بند ہو جانے کے برسوں بعد آج بھی یہ کتابیں کرم خوردہ حالت میں سہی، خاصی تعداد میں کہیں رکھی ہوں گی۔ میراجی کے دوستوں اور ان سے محبت کرنے والوں کا یہ طرزِ عمل میری سمجھ میں بھی نہیں آیا۔ اور اب اگر "کلیات میراجی" کی ترتیب و تدوین کا تاریخی اہمیت کا کام میراجی کے دوستوں کی بجائے ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے کیا ہے جو میراجی سے کبھی بھی نہیں ملے تھے، تو مجھے اس پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔

احمد ندیم قاسمی

نکاتِ فن (عروض، زبان، موسیقی)

مصنف: آغا صادق

قیمت: درج نہیں

ناشر: انسٹی ٹیوٹ آف تھرڈ ورلڈ (لندن)

پاکستان میں: مکتبہ دانیال وکٹوریہ چیمبر-۲ عبداللہ ہارون روڈ کراچی

آغا صادق مرحوم کے ساتھ میرے تعلقات کی نوعیت دوگونہ تھی۔ وہ بھی اپنے دور کے ایک بے مثال انسان، مولانا عبدالمجید سالک مرحوم کے عقیدت مند تھے اور میں بھی ادب و صحافت کی اس دلآویز شخصیت کا مرید تھا۔ پھر آغا صادق اور میں قریب قریب ایک ہی دور میں شعر کہتے رہے۔ عمر میں وہ مجھ سے سات آٹھ سال بڑے تھے مگر اس معمولی تفاوت سے ہم دونوں کی ہم عصری میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پھر میں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ رسائل و جرائد کی ادارت میں گزارا ہے اس لئے بحیثیت مدیر بھی آغا صاحب سے مستقل رابطہ رہا۔ میں جب روزنامہ "امروز" کا مدیر تھا تو اس اخبار کے علمی و ادبی صفحات پر آغا صاحب مسلسل جلوہ گر ہوتے رہے۔ ملاقاتیں گنتی ہی کی رہیں۔ مگر جب بھی وہ ملے، اتنے والہانہ خلوص اور اتنی سچی اپنائیت سے ملے جیسے ہم برسوں جلیس رہ چکے ہوں۔ اس نوع کی اپنائیت صرف ان شخصیات کے ہاں ملتی ہے جنہوں نے اخلاق و تہذیب کی روشن قدروں کو اپنے وجود میں کھپا رکھا ہوتا ہے اور جو کھرے اور بے لوث ہوتے ہیں۔ اسی لئے تو کتنے بے شمار لوگ آغا صادق کے گرویدہ تھے۔ ان سے محبت کرتے تھے اور ان کا احترام کرتے تھے۔

عروض کے بعض مسائل کے بارے میں جب آغا صاحب نے "امروز" میں چند مضامین لکھے تو مجھ پر انکشاف

ہوا کہ وہ اس پیچیدہ علم کی باریکیوں پر کتنی استادانہ مہارت کے ساتھ حاوی ہیں۔ اگرچہ "جوہرِ عروض" کو ۱۹۶۸ء میں "جائزہ" کو ۱۹۷۲ء میں اور "راگ رنگ" کو بھی ۱۹۷۲ء میں کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا تھا مگر مجھے اپنی کوتاہی کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ میں ان سے بالکل بے خبر تھا۔ جب آغا صادق مرحوم کے لائق فرزند سرجن نوید حسن صاحب (کرامویل ہسپتال لندن) کی طرف سے مجھے "نکاتِ فن" کا نسخہ موصول ہوا تو مجھ پر آغا صادق کے حوالے سے اکٹھا بہت سے انکشافات ہوئے۔ اوّل تو وہی علم عروض کے سے دقیق علم میں مہارت کا انکشاف، دوم اردو زبان و بیان پر حیرت انگیز عبور کا انکشاف، سوم علم موسیقی کے سلسلے میں آغا صاحب کے عالمانہ تبحر کا انکشاف۔ نوید حسن صاحب نے آغا صاحب کی ان تینوں مختصر کتابوں کو ایک بڑی کتاب کی صورت میں یکجا کر کے دراصل شعر و ادب اور علم و فن پر بڑا احسان کیا ہے۔ اگر وہ اس طرف توجہ نہ دیتے تو یہ قیمتی تحریریں آہستہ آہستہ ناپید ہو جاتیں اور اس طرح علم و فن کو شدید نقصان پہنچتا۔

سچی بات ہے میں تو اب تک آغا صاحب کو صرف ایک شاعر سمجھتا تھا۔ صرف شاعر ہونا بھی بہت بڑا اعزاز ہے۔ میں صرف یہ عرض کر رہا ہوں کہ اگر کوئی شاعر عروض اور موسیقی اور لسانیات کے سے علوم پر بھی حاوی ہو تو اس کی شاعری کے آفاق وسیع ہو جاتے ہیں اور اس کی تخلیقی شخصیت زیادہ بھرپور اور ہمہ گیر ہو جاتی ہے۔

"نکاتِ فن" کا پہلا مقالہ "جوہرِ عروض" ہے۔ عروض کو شعری آہنگ کی بنیاد مانا جاتا ہے۔ اس آہنگ کے بغیر شاعری اور نثر کا فرق مٹ جاتا ہے یعنی باقی صرف نثر رہ جاتی ہے۔ پابند شاعری کے علاوہ نظم آزاد اور نظم معریٰ کے بھی عروضی مطالبات ہوتے ہیں۔ یار لوگوں نے محض تن آسانی کے تحت اور ریاضت و کاوش کی مصیبت سے چھٹکارا پانے کے لئے عروض کی پابندیوں سے بغاوت کر کے مغرب کے بعض شعراء کے تتبع میں ایک نئی صنف "نثری شاعری" اختیار کر لی ہے جبکہ اس صنف کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ یہاں اجتماعِ ضدین ہوا ہے۔ اگر کسی شاعری میں "آہنگ" مفقود ہے تو اس کے نام کے سلسلے میں "نثری شاعری" کا تکلف برتنے کی بجائے اسے "شاعرانہ نثر" کہنے پر اکتفا کر لینا چاہیئے۔ علم عروض بے حد مشکل سہی مگر اس کے بغیر چارہ بھی تو نہیں ہے۔ البتہ میری رائے میں بڑی شاعری تو کسی صورت میں اکتسابی نہیں ہوتی مگر عروض کا علم وہبی بھی ہو سکتا ہے اور اکتسابی بھی۔ مثلاً میں شاعر ہونے کے باوجود علم عروض کی تفاصیل سے بے خبر ہوں۔ مگر جانتا ہوں کہ اگر میں اس "آہنگ" کی پابندی نہیں کروں گا جو علم عروض نے مرتب کیا ہے تو "بے وزنا" اور "بے بحرا" ہو جاؤں گا۔ میں نے اپنے ایک شعر میں کہا تھا:

لے جو ٹوٹی تو صدا آئی شکستِ دل کی
رگِ جاں کا کوئی رشتہ ہے رگِ ساز کے ساتھ

یہ "لے" ہی عروض ہے اور یہ "لے" ٹوٹی تو سمجھیئے شعر پھسل کر نثر میں جا پڑا۔ شاعری اور موسیقی میں یہی "لے" ایک مشترک عنصر ہے۔ جب تک شاعری میں "لے" اور "آہنگ" زندہ ہیں، عروض کی افادیت قائم رہے گی، اور جب تک عروض کی افادیت قائم ہے آغا صادق کے اس مقالے "جوہرِ عروض" کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔

"نکاتِ فن" کے دوسرے مقالے کا عنوان "جائزہ" ہے۔ اس میں "اردو زبان کی تحریر و تقریر کے عامۃ الورود اغلاط" کی تصحیح کی گئی ہے اور زبان کے قواعد، معانی، تلفظ، اعراب، املا، تذکیر و تانیث، متروکات اور دیگر لسانی تصرفات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اگر اردو کے حوالے سے اس طرح کا عالمانہ جائزہ پنجاب کے جالندھر اور کپور تھلہ کے

آس پاس پیدا ہونے والا ایک شخص لے اور یہ جائزہ خود "اہلِ زبان" کے ہاں بھی قابلِ قبول ٹھہرے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ آغا صادق نے صحتِ زبان کے سلسلے میں رہنمایانہ کردار ادا کیا ہے۔

تیسرا مقالہ "راگ رنگ" سے موسوم ہے۔ جب جناب نوید حسن صاحب کی طرف سے بھجوائی ہوئی یہ کتاب مجھے دفتر میں ملی تو میرے پاس دیگر احباب کے علاوہ اس دور میں علمِ موسیقی کے ایک بہت ثقہ عالم جناب رشید ملک بھی تشریف فرما تھے۔ رشید ملک صاحب کی ایک تصنیف "امیر خسرو کا علمِ موسیقی اور دیگر مضامین" پندرہ بیس برس پہلے شائع ہو کر موسیقی کی پُرسکون سطح پر نتیجہ خیز تموّج پیدا کر چکی ہے۔ میں نے انہیں "نکاتِ فن" کا یہ حصہ پڑھنے کو دیا تو وہ آغا صاحب کے فنی تبحر کے قائل نظر آنے لگے۔ انہوں نے فرمایا کہ موسیقی کے بارے میں آغا صادق کے ارشادات میں انفرادیت ہے اور یہ انفرادیت ہر پہلو سے مثبت معلوم ہوتی ہے۔ مجھے حیرت انگیز مسرت ہوئی کہ شاعر آغا صادق اور ماہرِ عروض آغا صادق اور ماہرِ لسانیات آغا صادق، علمِ موسیقی پر بھی اس انتہا تک حاوی ہیں کہ اس سلسلے میں ان کے ارشادات کو بطور سند پیش کیا جا سکتا ہے۔

اگر آغا صادق کے فرزند ارجمند نے انگلستان میں بیٹھ کر اور قطعی طور پر ایک الگ شعبۂ علم سے متعلق ہو کر بھی اپنے والدِ محترم کے ان علمی کارناموں کو کتابی صورت میں یکجا کر دیا ہے اور یکجا بھی اس سلیقے سے کیا ہے کہ کتاب کی معنوی اہمیت تو واضح ہے ہی، اس کی صوری خوبیاں بھی قابلِ رشک ہیں تو اہلِ علم کو اسے نوید حسن کا کارنامہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ انہوں نے بظاہر اپنے والدِ گرامی کی مختلف تحریروں کو کتابی صورت میں شائع کیا ہے، مگر دراصل انہوں نے ایک محقق [illegible] علمی نگارشات کو دستبردِ زمانہ سے محفوظ کیا ہے۔ اپنے والدِ گرامی کے حوالے سے یہ ان کی سعادت مندی سہی مگر [illegible] کتاب کی افادیت کے لحاظ سے یہ کہنے میں کوئی مبالغہ نہیں کہ انہوں نے اردو کے علمی اور تحقیقی خزانے میں ایک گراں بہا اضافہ کیا ہے۔ اہلِ علم کو جناب عاشور کاظمی اور جناب باقر نقوی کا بھی ممنونِ احسان ہونا چاہیئے کہ انہوں نے ابنِ آغا صادق کو یہ کارنامہ انجام دینے پر اُکسایا اور یوں اردو کو کچھ اور پرمایہ بنایا۔

احمد ندیم قاسمی

داغوں کی بہار (مضامین)

قیمت:- ۹۹ روپے

مصنف:- ملک غلام نبی

ناشر:- سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور

ملک غلام نبی پاکستان کی ایک اہم سیاسی شخصیت ہیں۔ ان کا تعلق مسلم لیگ سے اور بعد میں پیپلز پارٹی سے رہا ہے اور پیپلز پارٹی کے دورِ اقتدار میں ملک صاحب پنجاب کے وزیرِ تعلیم بھی رہ چکے ہیں۔ دورِ آمریت میں انہوں نے روزنامہ "نوائے وقت" میں سیاسی اور قومی موضوعات پر مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔ "داغوں کی بہار" انہی مضامین کا مجموعہ ہے۔ سیاست، قومی صورتِ حال، تہذیب، کلچر، آزادئ اظہار اور آمریت کے جبر کے بارے میں ان مضامین کی حیثیت تاریخی ہے اور مستقبل میں یہ کتاب مؤرخین کو حوالے کی کتاب کا کام دے گی۔ ملک صاحب کا اسلوبِ تحریر رواں اور شستہ ہے اور وہ کسی بھی مقام پر حق بات سے کترانے کا تاثر نہیں دیتے بلکہ اعلائے کلمۃ الحق کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ پاکستان سے انہیں عشق ہے اور قائداعظم سے غیر فانی ارادت ہے۔ یوں یہ کتاب ملک کی نوجوان نسل کے لئے مشعلِ راہ کا کام دے سکتی ہے۔

اختر علی

پاکستان اسٹیل

اعلیٰ معیاری مصنوعات
جدید ترین ٹیکنالوجی میں مہارت کی دلیل

پاکستان اسٹیل اپنی مصنوعات کی تیاری کے لئے جدید ترین ٹیکنالوجی استعمال کرتا ہے اور اس کے پاس ایسی بہترین تربیت یافتہ افرادی قوت بھی موجود ہے جو اس سے بخوبی کام لے سکتی ہے۔ ہمارے کارگزار عملے نے ۸۰ء کے عشرے کی ترقی پذیر دھاتی ٹیکنالوجی میں مہارت حاصل کرنے کے لئے شدید محنت کی ہے۔ ہمیں اپنے لوگوں کی پیشہ ورانہ کارکردگی پر فخر ہے۔

پاکستان اسٹیل کی تمام مصنوعات قابل اعتماد ہوتی ہیں۔ چاہے وہ پگ آئرن، بلٹس، ایچ۔ آر۔ پروڈکٹس، سی۔ آر۔ پروڈکٹس، گیلوانائزڈ پروڈکٹس، فارمڈ سیکشنز اور چیکرڈ پلیٹیں ہوں یا کولتار، گرینولیٹڈ سلیگ، بولڈر سلیگ اور اموئیم سلفیٹ۔ آپ پاکستان اسٹیل سے جو کچھ بھی لیں گے اُسے دی ہوئی قیمت کا بہترین بدل پائیں گے۔

پاکستان اسٹیل پر آپ آج بھی بھروسہ کرسکتے ہیں اور کل بھی۔ ہم اعلیٰ ترین عالمی معیار کی مناسب قیمت مصنوعات کے خریداروں کی ضروریات کو سمجھتے ہیں اسی لئے ہم نے ایسی طویل المعیاد حکمتِ عملی اختیار کی ہے جو ہماری مصنوعات اور خدمت کو سال بہ سال آپ کی طلب اور خواہش کے مطابق بناتی رہے۔

آپ کے اعتماد کا نشان۔ پاکستان اسٹیل



پاکستان اسٹیل

قوم کی خدمت، قوم کی تعمیر

REGD. L NO. 7579 **THE FUNOON** QUARTERLY PH. 215763